دربارِ ملّی

(اُردو ترجمہ)

قومی زندگی کی کہانی معاصرین کی زبانی

منتخبہ و مُرتّبہ

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ اکرام

ڈاکٹر وحید قریشی

ترجمہ و تعلیقات و حواشی

از

خواجہ عبدالحمید یزدانی

مجلسِ ترقیٔ ادب۔ کلب روڈ۔ لاہور

طبع اول : جون ۱۹۶۶ ع

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقی ادب ، لاہور

مطبع : شفیق پریس ، لاہور

مہتمم : ایس - ایم۔ شفیق

حرف آغاز

چوتھی صدی ھجری کے آخر سے لے کر چودھویں صدی ھجری کے آغاز تک برصغیر پاکستان و ھند میں جو فارسی نثر لکھی گئی 'دربار ملی' اس کا انتخاب ھے ۔ اس میں تصوف ، تاریخ ، علم و ادب ، مکاتیب ، انشاء ، سوانح ، غرض بیسیوں مختلف موضوع آ گئے ھیں ۔

ایک مصنف کی یا ایک ھی موضوع پر کتاب ھو تو اس کو کسی دوسری زبان میں ڈھالنا اتنا دشوار کام نہیں جتنا اس قسم کی مختلف موضوعات پر مشتمل کتاب کا ھے کہ ایک مصنف کے مزاج اور انداز کو سمجھنے کا ابھی موقع بھی نہیں ملا کہ دوسرے کا انتخاب شروع ھوگیا ــ اس پر مستزاد یہ کہ اس برصغیر میں جو فارسی کتب لکھی گئیں ان کے صحیح متون کے عدم وجود کے سبب (یوں تو ان کتب کے کئی کئی ایڈیشن شائع ھو چکے ھیں ، لیکن ھر اشاعت بے شمار فاحش اغلاط سے پُر ھے) اس کتاب میں بہت سے مقامات پر مفہوم کو سمجھنے میں خاصی دشواری پیش آئی ۔ ناچار ایسی جگہوں پر موقع کی مناسبت کا خیال رکھ کر عبارت کے تسلسل کو قائم رکھنے کی کوشش اپنی طرف سے کی گئی ھے ۔

جو کتابیں 'دربار ملی' میں شامل ھیں ان میں سے چند ایک کے ترجمے انگریزی اور اردو میں ھو چکے ھیں ۔ راقم نے ترجمہ کرتے وقت کئی مواقع پر ان تراجم کو سامنے رکھا اور ان سے استفادہ بھی کیا ۔ مذکورہ کتب کے مترجمین نے بہت سی اھم اور پیچیدہ عبارات کا ترجمہ ھی حذف کر دیا ھے ۔ راقم نے ایسی عبارات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد ان کے مفہوم کو اردو میں ڈھالا اور اس کے علاوہ اکثر تراجم سے

اختلاف بھی کیا ھے۔ اس قسم کے تمام اختلافات کا ذکر اگر حاشیے میں کیا جاتا تو اس کے لیے خاصی ضخامت درکار تھی ، اس لیے 'مشتے نمونہ از خروارے' کے مصداق صرف چند ایک کا ذکر حواشی میں کر دیا ھے۔ مثال کے طرر پر 'میثاق برھمناباد' کے ذیل میں ایک جگہ یہ عبارت ھے :

''و بعض دل برگزید نہادند ، و بر کیش اسلاف می رفتند ، و ضیاع و اسبان از ایشان تحویل نہ شد۔''

راقم نے اس کا ترجمہ یوں کیا ھے :

''اور بعض (اپنے آبائی مذھب پر قائم رھتے ھوئے) جزیہ دینے پر راضی ھو گئے۔ ایسے لوگوں کی تمام املاک اور گھوڑوں وغیرہ کو انھی کے پاس رھنے دیا گیا۔''

مگر 'چچ نامہ' کے اردو مترجم محمد حفیظ الرحمان حفیظ بہاول پوری نے اسے اردو میں اس طرح ڈھالا ھے :

''لیکن باقی لوگ اپنے مذھب کو بچانے کے لیے بھاگ گئے۔ ان کے گھوڑے ، خانگی سامان اور دوسرا مال ان سے لے لیا گیا۔''

مذکورہ ترجمہ 'چچ نامہ' کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ھے۔ یہ انگریزی ترجمہ مرزا قلیچ بیگ نے کیا تھا۔ معلوم ھوتا ھے انگریزی کے مترجم نے لفظ 'گزید' کو ، جس کے معنی جزیہ اور ٹیکس کے ھیں ، 'گریز' بہ معنی فرار پڑھا اور اس طرح بقیہ عبارت کا حلیہ بھی بگاڑ دیا۔

اسی طرح 'توزک بابری' میں ایک جگہ لفظ 'نُوّاب' (جمع نائب) آیا ھے ، جسے انگریز مترجمین جون لیڈن اور ولیم ارسکن نے نواب (Nawab) پڑھ کر اس عبارت کی شکل بدل ڈالی ھے۔

بعض مقامات پر ترجمے کی مزید تشریح حاشیے میں دے دی ھے ، اس لیے کہ اگر یہ تشریح متن میں دی جاتی اور اصل عبارت کا لفظی ترجمہ نہ دیا جاتا تو لطف نہ رھتا۔ ایسے ترجموں میں 'سہ نثر ظہوری' اور 'رسائل طغرا' ایسی کتب کے منتخبات کے تراجم آتے ھیں۔

کہیں کہیں عبارت کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے اپنی جانب سے چند الفاظ بڑھا کر خطوط وحدانی میں لکھ دیے ہیں اور جہاں کہیں فقرے کے طویل یا پیچیدہ ہو جانے کا ڈر تھا ، وہاں خود متن کے بعض الفاظ کو بھی بریکٹ میں لکھ دیا ہے ۔ دو چار ایسے سخت مقام بھی آئے جہاں عبارت بے حد مشکوک تھی ۔ ایسی عبارت کو اردو کا روپ تو دے دیا ہے ، لیکن آخر میں (؟) کا نشان لگا دینا مناسب معلوم ہوا ۔

آیات قرآنی کا ترجمہ بیشتر مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ترجمے پر مبنی ہے ۔

'دربار ملی' کے فاضل مرتبین نے ہر مصنف کے بارے میں شروع میں جو چند تعارفی سطور دی ہیں ، انہیں بہ ادنیٰ تصرف ویسے ہی رہنے دیا ہے ۔

اگرچہ راقم نے ترجمہ کرتے وقت بڑی محنت سے کام لیا ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ ترجمہ ایسا ہو کہ مصنف کا مطلب و مقصد صحیح اور واضح طور پر قاری تک پہنچ جائے ، پھر بھی دو ایک منتخبات کے ترجمے میں مجھے اپنے عجز کا اعتراف ہے ، کہ ان کا جیسا ترجمہ ہونا چاہیے تھا ویسا نہیں ہو پایا ۔ ایسے منتخبات میں 'اعجاز خسروی' وغیرہ کا نام آتا ہے ۔ سبب اس کا بے حد گنجلک عبارتیں ، بڑے بڑے طویل فقرے اور الفاظ کا ہیر پھیر اور ان (الفاظ) کا اپنا مزاج ہے اور جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں ، صحیح متون کی غیر موجودگی بھی میری کوششوں میں حائل رہی ۔

اب کچھ باتیں تعلیقات و حواشی کے متعلق ۔ دربار ملی ، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ، بہت سے موضوعات پر مشتمل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ شاید ہی کوئی صوفی ، کوئی ادیب ، کوئی شاعر ، کوئی بادشاہ اور تاریخ کا کوئی اہم واقعہ رہ گیا ہوگا جس کا ذکر اس میں نہ آیا ہو پھر کئی ایک فرقوں کے ذکر کے علاوہ اس میں تصوف وغیرہ کی بھی بیسیوں اصطلاحات آ گئی ہیں ۔ ظاہر ہے اس قسم کی کتاب کے حواشی بذات خود ایک کتاب کی صورت اختیار کر سکتے تھے ۔ شروع میں راقم کا

خیال تھا کہ حواشی صرف دو دو تین تین سطور پر مشتمل ہونے چاہئیں ، لیکن چند ایسے حواشی لکھنے کے بعد محسوس ہوا کہ یہ بے حد تشنہ ہیں اس لیے قدرے تفصیل سے کام لینا پڑا ۔ اس کے لیے صرف ایک ایک یا دو دو ماخذوں پر ہی اکتفا نہ کیا ، بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکا زیادہ سے زیادہ ماخذ کو کھنگال کر مجمل و مستند معلومات فراہم کیں ۔ حواشی کا کچھ حصہ بہاول پور میں بیٹھ کر لکھا گیا ہے ۔ وہاں اصل ماخذ دستیاب نہ ہو سکتے تھے جس کے باعث بعض حواشی کے لیے متعلقہ ماخذ کے تراجم کو سامنے رکھنا پڑا ۔

ماخذ کے سلسلے میں تا بہ مقدور کوشش کی گئی ہے کہ مستند اور معاصر یا قریب العہد ہوں ۔ ہر حاشیے کے آخر میں اس کے ماخذوں کے نام اور صفحات کے نمبر دے دیے ہیں تا کہ جو اصحاب متعلقہ شخصیت یا اصطلاح کے بارے میں تفصیلی مطالعہ کرنا چاہیں تو وہ مذکورہ کتب کی طرف رجوع کر سکیں ۔

'دربار ملی' میں جہاں صحابۂ کرام رض کا ذکر آیا ہے وہاں سیکڑوں مقامات پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم مبارک کی بھی تکرار ہوئی ہے ۔ حواشی میں صحابۂ کرام رض اور دیگر عظیم ہستیوں کے تو مختصر سے حالات دے دیے ہیں ، لیکن سرکار دو عالم صلعم کے سلسلے میں دل اس اختصار پر رضا مند نہ ہوا ؛ اس لیے کتاب کے ضخیم تر ہو جانے کے احساس کے تحت حضور پر نور ص کے حالات دینے سے اجتناب کیا ہے ، کہ تقریباً ہر مسلمان آنحضرت صلعم کے احوال مبارکہ سے تھوڑا بہت ضرور آگاہ ہے ۔

چنانچہ تعلیقات و حواشی کا حصہ اگرچہ خاصا ضخیم ہو گیا ہے ، اس کے باوصف بہت سی ایسی شخصیات ، مقامات اور مصطلحات رہ گئی ہیں جن کے متعلق عدم گنجایش کی وجہ سے کچھ نہیں لکھا جا سکا ۔ اگر زندگی نے وفا کی اور کتاب کا پہلا ایڈیشن زیور قبول سے آراستہ ہوا تو ان شاء اللہ العزیز دوسرے ایڈیشن میں مزید اضافہ کیا جائے گا ۔ وما توفیقی الاّ باللہ ۔

تعلیقات میں بعض جگہ مآخذ کا پورا نام دینے کی بجائے اختصار سے بھی کام لیا گیا ہے - ایسے ماخذوں کے پورے نام مندرجہ ذیل ہیں :

منتخب : منتخب التواریخ از ملا عبدالقادر بدایونی

توزک : توزک جہانگیری (اردو ترجمہ)

لطیف / لاھور : Lahore: Its History, Architectural Remains and Antiquities *by* Syad Muhammad Latif, The Late, Khan Bahadur, Shams-ul-ulma

شفق : تاریخ ادبیات ایران از دکتر رضا زادہ شفق

صفا : تاریخ ادبیات در ایران از دکتر ذبیح اللہ صفا

ایڈمنسٹریشن : Administration of the Sultanate of Delhi *by* Dr. Ishtiaq Husain Qureshi

حجازی / خلاصہ : خلاصۂ تاریخ ایران از مطیع الدولہ حجازی

این ایڈوانسڈ : An Advanced History of India *by* R. C. Majumdar, *M.A.,Ph.D.* H. C. Raychaudhuri, *M.A.,Ph.D.* Kalikinkar Datta, *M.A.,Ph.D.*

براؤن : A Literary History of Persia *by* Edward Granville Browne

مختصری : مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی از دکتر ذبیح اللہ صفا

میں جناب شیخ محمد اکرام سی - ایس - پی اور استاد محترم جناب ڈاکٹر وحید قریشی کا بے حد ممنون ھوں جنھوں نے ترجمے کے سلسلے میں میری راھنمائی فرمائی -

خواجہ عبد الحمید یزدانی

لاھور

۲۵ - جنوری ۱۹۶۶ء

فہرست عناوین دربار ملی

مضمون | صفحہ

جزو اول : دورۂ سلاطین

جزو دوم : دورۂ تیموریان ہند

مضمون	صفحہ

مضمون | صفحہ

جزو سوم : دورۂ متأخرین

مضمون	صفحہ
۵۳ - محمد صادق اختر	۵۴۳ تا ۵۵۰
امجد علی شاہ فرماں روائے اودھ کے دور کے حالات و اطوار	۵۴۳
۵۴ - مرزا محمد حسن قتیل	۵۵۱ تا ۵۶۵
(ا) شاہ مدار ، سخی سرور اور مسعود سالار غازی کے حالات	۵۵۱
(ب) سلطان سخی سرور کے حالات	۵۵۴
(ج) مسعود سالار غازی	۵۵۸
(د) ایران و توران میں فارسی زبان	۵۶۰
(ہ) متقدمین اور متاخرین کے اشعار اور اہل ہند و اہل زبان کی نثر میں فرق کے بیان میں	۵۶۱
(و) پاک و ہند میں فارسی	۵۶۲
۵۵ - غلام حسین	۵۶۶ تا ۵۸۳
(ا) خطبۂ لاہور کے بارے میں	۵۶۶
(ب) مہابت جنگ کی وفات اور اس کے بعض اخلاق و انتظام اوقات کا تذکرہ	۵۶۷
(ج) جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء	۵۷۴
۵۶ - میر تقی میر	۵۸۴ تا ۵۸۶
(ا) میر کا آگرہ میں دوسری مرتبہ آنا اور اس شہر کا احوال	۵۸۴
(ب) میر کی افسردہ خاطری	۵۸۵
۵۷ - درگاہ قلی خاں	۵۸۷ تا ۵۸۸
محمد شاہ کے عہد کے مغنی	۵۸۷

مضمون	صفحہ

جزو اول

دورهٔ سلاطین

میثاق برھمنا باد

(۷۱۳ع)

[فاتح سندھ محمد بن قاسم نے برھمناباد کی فتح کے بعد سندھ کے غیر مسلموں سے جو تصفیہ کیا وہ ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔ بت پرست ہندوؤں اور بودھ مت کے پیروؤں سے مسلمانوں کے سیاسی تعلقات کا یہ پہلا موقع تھا اور غیر مسلم آبادی کے متعلق جو طریق کار اس وقت اختیار کیا گیا ہندوستان کی اسلامی حکومت کے لیے وہ چراغ راہ بنا ۔ محمد بن قاسم نے بت پرست آبادی کو اہل کتاب کے برابر بلکہ ان سے کسی قدر بڑھ کر حقوق دیے ۔ ان انتظامات کی تفصیل ایک نہایت قدیم (قریب قریب معاصرانہ) عربی تاریخ میں درج ہے ۔ یہ اصل کتاب تو کھو گئی ہے لیکن شمالی ہندوستان میں اسلامی حکومت کے آغاز کے زمانے میں اس کا فارسی ترجمہ ناصر الدین قباچہ والئی سندھ و ملتان کے لیے کیا گیا جو فتح نامۂ سندھ یا چچ نامہ کے نام سے مشہور ہے ۔ اس کے کچھ اقتباسات کا اردو ترجمہ ذیل میں کیا جاتا ہے]

بعض روایت کرتے ہیں کہ جب قیدیوں میں داھر کے خاندان والوں کا پتا نہ چل سکا، تو محمد بن قاسم کے آدمیوں نے شہر کے رئیسوں سے ان کے متعلق دریافت کیا ؛ کوئی بھی ان کا اتا پتا نہ بتا سکا ؛ آخر دوسرے دن کوئی ایک ہزار کے قریب برھمن سر اور ڈاڑھیاں منڈائے محمد بن قاسم کے حضور میں پہنچے ۔

محمد بن قاسم نے ان کے بارے میں استفسار کیا کہ یہ لوگ کس فوج سے متعلق ہیں اور انھوں نے یہ ہیئت کذائی کیوں اختیار

کر رکھی ہے ؟ وہ برہمن خود ہی جواب میں بولے ''اے مہربان امیر! ہمارا بادشاہ برہمن تھا ؛ جب اس کے جنگ میں مارے جانے کے سبب یہ سلطنت اس کے ہاتھ سے جاتی رہی تو کچھ برہمنوں نے تو اس کی وفاداری میں خود کو ہلاک کر دیا اور باقی ماندہ نے اس کے ماتم میں زرد لباس پہن کر ڈاڑھیوں اور سروں کو منڈا ڈالا ۔ اب جبکہ خدائے بزرگ و برتر نے یہ ملک حضور کے قبضے میں دے دیا ہے تو ہم حضور ایسے منصف امیر کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں تاکہ ہمیں معلوم ہو سکے کہ ہم باقی ماندگان کے متعلق حضور کا کیا فرمان ہے؟'' محمد بن قاسم نے کچھ دیر تامل کیا اور پھر بولا ''مجھے اپنے سر اور جان کی قسم! یہ لوگ بڑے وفادار ہیں ؛ ہم انہیں امان بخشتے ہیں ، لیکن اس شرط پر کہ یہ جہاں کہیں بھی داہر کے رشتہ داروں کو دیکھ پائیں ، انہیں پکڑ کر ہمارے پاس لے آئیں ۔''

محمد بن قاسم کا برہمنوں سے عہد کرنا اور انہیں امان بخشنا

محمد بن قاسم کے اس پختہ عہد پر برہمن ، داہر کی بیوی لادی (لاڈی) کو کسی خفیہ گوشے سے نکال لائے ۔ اس کے بعد باقی رعایا پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق جزیہ لگایا گیا ۔ جو لوگ تو مشرف بہ اسلام ہوئے انہیں غلامی اور ہر قسم کے جزیہ وغیرہ سے معاف کر دیا ، جو لوگ ایمان نہ لائے ان پر اس طرح سے ٹیکس لگایا کہ پہلی اور سب سے اونچی جماعت والوں کو اڑتالیس درم چاندی ، دوسرے درجے کی جماعت والوں کو چوبیس درم چاندی اور تیسرے درجے کی جماعت والوں کو بارہ درم چاندی فی کس ادا کرنے ہوں گے ۔ بعد ازیں محمد بن قاسم نے اعلان کیا کہ جو کوئی حلقہ بگوش اسلام ہو جائے اس پر کوئی جزیہ نہ ہوگا اور جو کوئی اپنے مذہب پر ہی قائم رہنا چاہتا ہے ، وہ جزیہ دینا قبول کرے اور اپنے آبا و اجداد کے دین ہی کو اپنائے رکھے ۔ چناں‌چہ بعض نے تو اسلام قبول کر لیا اور بعض (اپنے آبائی مذہب پر قائم رہتے ہوئے) جزیہ دینے پر راضی ہوگئے ۔

ایسے لوگوں کی تمام املاک اور گھوڑوں وغیرہ کو انھی کے پاس رہنے دیا گیا۱ -

ملک کے برہمنوں اور امانت داروں کا تقرر

محمد بن قاسم نے ان میں سے ہر ایک کو اس کے مرتبے اور حالات کے مطابق مختلف آمور پر مقرر کیا ؛ قلعے کے چاروں دروازوں پر فوج متعین کی اور اس کے داخلی معاملات کا تمام انتظام خود ان کے سپرد کیا ، پھر ہر ایک کو خلعت اور تیز رفتار گھوڑا عطا کیا ؛ ہاتھ پاؤں میں ہندوستان کے شاہی زیور پہنائے اور ہر ایک کو اپنے دربار میں عزت کی نشست بھی عطا کی -

صنعت کاروں ، تاجروں اور کسانوں کی گنتی

سب سے پہلے سوداگروں ، صنعت کاروں اور کسانوں کو شمار کیا گیا ؛ عوام الناس میں سے کوئی دس ہزار آدمی ان پیشوں سے متعلق نکلے - چوں کہ ان لوگوں کا مال اسباب لٹ چکا تھا ، اس لیے ان پر محمد بن قاسم نے صرف بارہ درم چاندی فی کس جزیہ لگایا -

مالیے کی وصولی کے لیے مال افسروں کا تقرر

اس کے بعد اس نے نمبرداروں اور بستی کے سرداروں کو مالیہ وغیرہ کی وصولی پر مقرر کیا ، تاکہ وہ شہروں اور دیہاتوں سے مالیہ وصول کریں ، جس سے آنھیں قوت اور پشت پناہی حاصل ہو -

برہمنوں کی عرض داشت

جب برہمنوں نے یہ دیکھا کہ محمد بن قاسم نے نمبرداروں اور سرداروں کو نوازا ہے تو وہ فکر مند ہوئے اور ایک عرض داشت لے کر ، جس پر شہر کے بڑے بڑے لوگوں نے یہ گواہی دی تھی کہ پچھلے دور حکومت میں یہ لوگ صاحبان عز و جاہ تھے ، محمد بن قاسم کے حضور میں پہنچے - چناں چہ اس نے بھی ان کی عزت کی اور یہ حکم جاری کیا کہ ان لوگوں کی پہلے کی طرح عزت اور قدر و منزلت کی جائے - ہر معاملے میں انہیں ڈانٹ ڈپٹ اور تشدد و تکلیف سے آزاد کر دیا -

ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی کام پر مامور کیا اور اس حقیقت کو جان لیا کہ ان لوگوں سے کسی قسم کی برائی یا خیانت نہیں ہوگی ۔

مختلف عہدوں پر تقرر

چچ کے راجا کی طرح محمد بن قاسم نے بھی ان برہمنوں کو مختلف عہدوں اور اشغال پر مامور کیا ۔ اس نے تمام برہمنوں کو طلب کرکے ان سے اس طرح خطاب کیا ''داہر کے زمانے میں تم بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز تھے ، جس کے سبب تم شہر اور اس کے گرد و نواح سے بہ خوبی واقف ہو ، لہٰذا تمھاری نظر میں اگر کوئی مشہور صاحبان علم و کمال ہوں جن کی ہم پرورش و تربیت کر سکیں تو ہمیں ان کے متعلق آگاہ کرو تاکہ ان پر مہربانی و نوازش کی جا سکے اور انھیں انعام و اکرام سے نوازا جائے ۔ اور چوں کہ ہمیں تمھاری امانت اور دیانت پر پورا پورا بھروسا ہے ، ہم تمھیں تمھارے سابقہ عہدوں پر مستقل کرتے اور تمام ملکی معاملات کا انتظام تمھارے ہاتھ میں دیتے ہیں ۔ یہ عہدے اسی طرح تمھاری اولاد اور آئندہ نسلوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے ہیں ؛ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہ ہوگا ۔''

برہمنوں کا دل جمعی کے ساتھ دیہات میں جانا

چناں چہ برہمن اور عمال ، مملکت کے گوشوں میں پہنچ گئے اور یہ اعلان کیا کہ اے ملک کے صاحبان علم و کمال ! تم سب کو یہ معلوم ہے کہ داہر مارا گیا ، سلطنت کفار کا سلسلہ اب منقطع ہو چکا اور تمام سندھ اور ہندوستان میں عربوں کا فرمان جاری ہو گیا ہے ۔ ملک کے تمام اشراف اور ارذال برابر ہوگئے ہیں ۔ تمام شہریوں اور دیہاتیوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمیں عرب سردار نے بڑے اچھے وعدوں کے ساتھ آپ لوگوں کی جانب بھیجا ہے ۔ اگر ہم لوگ عربوں کا حکم نہیں مانیں گے تو نہ تو ہمارے پاس دولت رہے گی اور نہ کوئی ذریعۂ معاش ، بلکہ ہر چیز میں حاجت مند رہیں گے ؛ ہاں اپنے آقاؤں کی بزرگی و بخشش کے طفیل ، ممکن ہے ہمیں کوئی بلند مقام حاصل

ہو جائے اور اس وقت اپنے وطن میں ہمیں کسی قسم کی بربادی و ہلاکت کا سامنا نہ کرنا پڑے ۔ اگر ہم اس مقررہ خراج کے متحمل نہیں ہو سکتے اور اس کے ادا کرنے سے قاصر ہیں تو پھر ہمیں چاہیے کہ ہم موقع پا کر اپنے اہل و عیال سمیت ہندوستان یا سندھ میں کسی ایسی جگہ چلے جائیں جہاں ہماری جانیں محفوظ رہیں ، اس لیے کہ جان کی سلامتی سے بڑھ کر انسان کو اور کوئی شے عزیز نہیں ہے ۔ جب ہم اس مہلک بھنور سے نکل جائیں اور فوج کی سختیوں سے امن میں ہو جائیں تو ہماری دولت اور ہمارے بال بچے محفوظ ہو جائیں گے ۔

دیہات اور شہر پر جزیہ مقرر کرنا

اس پر تمام شہری اور دیہاتی لوگ حاضر ہوئے اور انھوں نے جزیہ دینا قبول کیا - انھوں نے محمد بن قاسم سے دریافت کیا کہ انھیں حکومت کو کتنا جزیہ دینا ہوگا اور ان برھمنوں کو کتنا جنھیں مالیہ جمع کرنے کے لیے مقرر کیا گیا ہے ؟ محمد بن قاسم نے اپنے افسروں سے کہا ''بادشاہ اور رعایا کے درمیان دیانت داری اور سچائی کا خیال رکھو ۔ اگر کوئی تقسیم درکار ہو تو اسے انصاف سے کیا جائے ، بہ قدر حیثیت ٹیکس لگاؤ ۔ آپس میں بنا کر رکھو ، ایک دوسرے کی مخالفت نہ کرو تاکہ مملکت برباد نہ ہو ۔''

محمد بن قاسم کا لوگوں کو تسلی کے الفاظ کہنا

اس نے ہر ایک شخص کو علیحدہ علیحدہ تسلی کے الفاظ کہے اور ان سے کہا کہ ہر طرح خوش و خرم رہو ، کسی قسم کا اندیشہ یا خوف نہ رکھو ، تم پر کسی قسم کی گرفت نہ ہوگی ۔ ہم تم سے کوئی بھی تحریر یا قبالہ نہیں لیتے ، جو کچھ مقرر اور وعدہ کیا گیا ہے ، بس وہ ادا کرتے رہو ۔ تمھارے حق میں ہر طرح کی مہربانی اور آسانی روا رکھی جائے گی ۔ تم میں سے جو کوئی جس قسم کی بھی درخواست کرنا چاہتا ہے ، وہ پیش کرے ، ہم اسے پوری طرح سے سنیں گے ، اس کا تسلی بخش جواب دیں گے اور ہر ایک کی مراد پوری کی جائے گی ۔

محمد بن قاسم کا برھمنا باد کے لوگوں کو پروانہ دینا

برھمنوں کی جاری کردہ یہ رسم کہ تاجر، کفار اور ٹھاکر انھیں صدقے وغیرہ دیا کرتے، اور بتوں کی عبادت میں خوشی کا اظہار کرتے— اس سلسلے میں مندر کے پجاریوں کو سرکار کی طرف سے باقاعدہ پروانہ حاصل ہوتا تھا—ختم ہو گئی[۲]۔ جب لشکر کے خوف سے وہ تمام صدقات وغیرہ ان تک پہنچنے بند ہو گئے تو وہ پجاری بھوکے، مفلس اور کنگال ہو گئے۔ آخر مجبور ہو کر وہ اس کے حضور میں آئے اور اسے دعا دیتے ہوئے یہ پیغام بھجوایا ''امیر عادل کو خدا زندگانی عطا کرے! ہم مندروں کے پجاری ہیں، ہماری روزی اور معاش بدھ مندروں کی مجاوری سے ہے۔ چوں کہ حضور نے تاجروں اور کافروں پر کرم گستری کی ہے، ان پر جزیہ لگا کر انھیں ذمی قرار دیا ہے، تو ہم غلام بھی اپنے آقا و مولیٰ سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ انھیں اس بات کا حکم دیں گے کہ وہ حسب سابق اپنے معبود کی عبادت اور بدھ کا مندر آباد کریں۔''

محمد بن قاسم نے جواب دیا ''پایۂ تخت ارور[۳] ہے اور یہ تمام مقامات اس کے گرد و نواح میں ہیں۔'' ہندو بولے ''اس علاقے کی آبادی اور مرفہ الحالی برھمنوں پر منحصر ہے؛ یہ لوگ ہمارے علما اور حکما ہیں، ہماری شادی اور ماتم کی تمام رسمیں انھی کے ہاتھوں انجام پاتی ہیں۔ ہم نے جو یہ جزیہ اور مالیہ وغیرہ دینا قبول کیا تو یہ اس امید پر تھا کہ ہر کوئی اپنے اپنے مذہب پر قائم رہے گا۔ ہمارا بدھ کا مندر ویران ہو چکا ہے اور ہم اپنے بتوں کی پوجا سے محروم ہو چکے ہیں۔ ہم اپنے عدل پسند امیر سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اس مندر کو آباد کرنے کی اجازت فرمائے تاکہ ہم اپنے قاعدے کے مطابق اپنے بتوں کی پوجا کر سکیں اور اس طرح ہمارے وسیلے سے برھمنوں کی روزی کا سامان مہیا ہو سکے۔''

چناں چہ محمد بن قاسم نے اس سلسلے میں حجاج سے خط و کتابت کی۔ چند روز کے بعد اس کی جانب سے جواب ملا: ''عزیز چچا زاد بھائی کا خط ملا؛ تمام احوال سے اطلاع پائی۔ برھمنا باد کے شہریوں کی،

بدھ مندر کی آبادی اور اپنی قوم کی تعمیر کے متعلق درخواست کے بارے میں یہ ہے کہ چوں کہ یہ لوگ پورے طور پر مطیع اور فرماں بردار ہو چکے ہیں ، اور انھوں نے پایۂ تخت کا جزیہ وغیرہ دینا اپنے اوپر واجب ٹھہرا لیا ہے ، اور چوں کہ جزیہ اور مالیہ کے علاوہ ان پر اور کوئی پابندی عاید نہیں ہو سکتی ، اس لیے انھیں اس امر کی اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اپنی مورتیوں کی پوجا کریں ۔ علاوہ ازیں کسی کو بھی اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے سے روکا نہ جائے تاکہ یہ لوگ اپنے گھروں میں امن کی زندگی بسر کریں ۔"

جس وقت حجاج کا خط محمد بن قاسم کو پہنچا ، اس وقت وہ شہر سے باہر آ کر قیام پزیر تھا ؛ اس نے اسی وقت تمام سرداروں ، نمبرداروں اور برھمنوں کو اجازت دے دی کہ وہ اپنی مورتیوں کی پھر سے تعمیر کر لیں اور مسلمانوں کے ساتھ خرید و فروخت کریں ؛ مطمئن رہیں اور اپنی بہتری اور بھلائی کے لیے کوشاں ہوں اور فقیروں اور برھمنوں کے حق میں پہلی سی نیکی اور احسان روا رکھیں ۔ اپنے تیوھار اور دیگر رسوم اپنے آبا و اجداد کے طریقوں پر منائیں اور ادا کریں ۔ وہ صدقات جو پیش ازیں برھمنوں کو دیے جاتے تھے ، قدیم طریقے کے مطابق اور حسب دستور سابق انھیں پھر سے دیے جایا کریں ۔ اصل مال کے تین فی صد درم میں سے جتنے واجب سمجھیں انھیں دیں ، باقی رقم متعلقہ اصحاب کی باقاعدہ تحریر کے ساتھ نائبوں کی موجودگی میں خزانے میں محفوظ کروایا کریں ۔ اشخاص متعلقہ اور امرا کے لیے روزینہ اور تنخواھیں مقرر کریں ۔ ان شرطوں اور وعدوں پر تمیم ابن زید القیسی، اور حکم بن عوانہ کلبی کو درمیان میں لایا گیا اور برھمنوں سے یہ طے پایا کہ وہ (صدقات وغیرہ) کے حصول کے لیے تانبے کی زنبیل ھاتھ میں لیے لوگوں کے دروازوں پر جایا کریں تاکہ لوگوں کو جو کچھ غلہ وغیرہ میسر ہو اس میں کا واجب حصہ ان کو مل جایا کرے[۳] اور اس طرح وہ بھوکوں مرنے سے بچ جائیں ۔ یہ رسم کافروں میں اُس وقت سے رائج ہے ۔

محمد بن قاسم کا برھمنا باد کے لوگوں کو امان اور معافی کا پروانہ دینا

تب محمد بن قاسم نے برھمنا باد کے گرد و نواح کے لوگوں کی درخواست کو قبول اور ان کی خواہش کو پورا کیا اور اپنے پاؤں مضبوط کرنے کے لیے عراق و شام کے یہودیوں ، آتش پرستوں ، مغوں اور مجوسیوں کی طرح انھیں اپنے اپنے گھروں کو واپس کر دیا۵ اور ان کے نمبرداروں کو ''رانہ'' (رانا) کے نام سے موسوم کیا ۔

'فتح نامہ سندھ' المعروف بہ 'چچ نامہ'
(از صفحہ ۲۰۷ تا صفحہ ۲۱۴)

علی هجویری لاهوری

[فارسی نثر کی سب سے قدیمی کتاب جو برصغیر پاکستان و هند میں پایۂ تکمیل کو پہنچی 'کشف المحجوب' ہے جسے حضرت داتا گنج بخش علی هجویری قدس سرہ نے قبۃ الاسلام لاہور میں مکمل کیا۔

معنوی حیثیت سے بھی اس کتاب کا درجہ بہت بلند ہے۔ ہم اس میں سے دو مختصر اقتباسات ، جن سے اس زمانے کی زندگی، تصوف کے اہم مسائل اور حضرت داتا صاحب کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے ، کا اردو ترجمہ درج کرتے ہیں]

۱۔ طریقت اور مقامات تصوف کی کیفیت

ابو سعید هجویری ملتمس ہے کہ آپ (علی هجویری) میرے لیے ذیل کے مسائل پر روشنی ڈالیں :

۱۔ طریقت و تصوف کی تحقیق اور ان کے مقامات کی کیفیت۔

۲۔ صوفیوں کے مختلف فرقوں ، ان کے اقوال اور اشاروں کنایوں کے اظہار کا بیان۔

۳۔ خدائے بزرگ و برتر کے عشق اور مختلف دلوں پر اس کے تأثر کی کیفیت۔

۴۔ خدا کی حقیقت و ماهیت تک عقلوں کی رسائی نہ ہونے کا سبب اور اس کی حقیقت معلوم کرنے سے نفس کا اجتناب کرنے کا باعث کیا ہے ؟

۵۔ روح کو اس کی پاکیزگی و برگزیدگی سے سکون اور طمانیت

کیوں حاصل ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ جو دیگر باتیں اس سے متعلق ہیں وہ اور دوسرے معاملات وغیرہ پر سے پردہ اٹھائیں ۔

اب مسئول علی بن عثمان کہ جلاب[1] کا رہنے والا ہے ، جواباً معروض ہے کہ اس دور اور خصوصاً ہمارے ملک میں ، جہاں تمام لوگ ہوا و ہوس کا شکار اور رضائے الٰہی کے راستے سے گریزاں ہیں اور جہاں مدعیان تصوف و معرفت نے اس کے بالکل برعکس راستہ اختیار کر رکھا ہے ، یہ علم فرسودہ ہوچکا ہے ۔ لہٰذا اس صورت حالات میں سوائے خدائے لم یزل[2] کے اور کسے یہ قوت و اختیار ہے کہ دنیا والوں کی اس کھوئی ہوئی باطنی اور روحانی چیز کو پھر سے ان تک پہنچا دے ۔ جب کہ تمام ارادت مندوں کی توقعات اس سے منقطع ہوچکی ہوں اور تمام عارفوں کا ذوق معرفت اس سے محروم اور بیگانہ ہو چکا ہو ، علم تصوف سے تمام مخلوق ، کیا خواص اور کیا عوام ، سند لیتی ہے اور دل و جان سے اس کی طالب و خریدار ہے ۔ لیکن معاملہ کچھ ایسا ہے کہ لوگ ، باوجود اس طلب و خریداری کے ، غلط فہمیوں کی بنا پر تحقیق کی راہ سے ہٹ کر تقلید کی راہ پر گامزن ہیں ۔ اور ان کے دور میں تو گویا تحقیق نے بھی اپنا چہرہ ان سے چھپا لیا ہے ۔ عوام انھی باتوں اور رسم و رواج کا سہارا لے کر کہنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمیں معرفت ایزدی حاصل ہوگئی ہے ، اور خواص ان کے اس دعوے پر اس لیے خوش رہتے ہیں کہ چلو اور کچھ نہیں تو کم از کم ان کے دل میں حق سبحانہ کی خواہش و تمنا تو موجود ہے ، اور ان کے سینوں میں اس مقصد کے لیے ایک تحریک اور ایک رغبت تو موجزن ہے ۔ اس شغل کو وہ 'شوق رویت' کا نام دیتے اور اپنے سینوں میں موجود اس نیک اندیشے کو 'سوز محبت' سے تعبیر کرتے ہیں ۔ لیکن اس کے برعکس جو لوگ تصوف و عرفان کا محض دعویٰ کرنے والے ہیں ، وہ ان تمام حقیقتوں سے دور رہتے ہیں ۔ چناں چہ اکثر مریدوں نے عبادت اور مجاہدے سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنے 'ظن معلول' کو 'مشاہدہ' کا نام دے رکھا ہے ۔

اس سے قبل میں نے اس موضوع (تصوف) پر کئی ایک کتابیں

لکھی تھیں جو بدقسمتی سے سب کی سب ضائع ہوگئیں ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تصوف کے جھوٹے دعوے داروں نے ان کتابوں میں مذکور بعض امور کے ذریعے خدا کے بندوں سے کئی ایک ناجائز قسم کے فائدے اٹھائے اور ان میں سے انہوں نے ایسے مسائل و مضامین کو ، جو کسی صاحب طبع کے لیے حسد کا باعث اور نعمت ایزدی کے انکار کا سبب ہو سکتے تھے ، محو کر دیا اس لیے کہ ایسے مضامین ان کے مذکورہ ذوق کے قطعاً خلاف تھے - ایک گروہ ان مضامین کو لکھنے بیٹھا مگر ان کے 'پڑھنے' سے قاصر رہا - کچھ لوگوں نے انہیں پڑھا تو سہی لیکن ان کے معانی کو نہ پا سکے - البتہ ان لوگوں نے ان عبارات کو بہ طور سند لیا تاکہ انہیں لکھ کر یاد کریں اور پھر یہ کہیں کہ ہم تو عرفان و تصوف کا علم بیان کر رہے ہیں - ایسے لوگ عین انکار کی حالت میں ہیں - یہ باتیں میں نے اس لیے یہاں بیان کی ہیں کہ یہ معانی گویا کبریت احمر کا حکم رکھتے ہیں ، اور یہ بہت نادر چیز ہے ، اس لیے کہ یہ مل جائے تو سمجھو کہ کیمیا مل گئی - اور اس کی ذرا سی مقدار بھی تانبے اور کانسی کی حد سے زیاد مقدار کو سونا بنا دیتی ہے - غرض کہ ہر شخص صرف وہی دوا چاہتا ہے جو اس کی تکلیف دور کر دے اور اس کے علاوہ اسے کسی دوسری دوا کی ضرورت نہیں ہوتی - جیسا کہ کسی بزرگ کا قول ہے ''فکل من فی فواده وجع یطلب شیئاً یوافق الوجعا'' یعنی ہر شخص اپنے درد کے موافق علاج کا طالب ہوتا ہے - جس مریض کے لیے معمولی اور حقیر چیزیں فائدہ مند ثابت ہوں ، اسے دواؤں میں مروارید اور مرجان وغیرہ ملا کر دینا بے سود ہے - اور اس کتاب کے مطالب تو اس سے بھی زیادہ سود مند ، مفید اور پر بہا ہیں - مقصود اس سے یہ ہے کہ ہر کوئی اس سے پورے طور پر مستفید اور بہرہ مند ہو -

اس سے قبل بھی اس علم کے جاہلوں نے مشائخ کی کتب سے ایسا ہی سلوک روا رکھا تھا ، یعنی جب ایزد پاک کی حقیقتوں کے یہ خزانے ان کے ہاتھ لگے تو وہ چوں کہ ان کے معانی و مطالب سمجھنے سے قاصر تھے ، اس لیے انہوں نے وہ خزانے گنوار کلاہ دوزوں کے

سپرد اور ناپاک جلد سازوں کے حوالے کر دیے تاکہ وہ ان سے ٹوپیوں کا استر بنائیں یا پھر ابو نواس ایسے شعرا کے دواوین اور جاحظ کے مجموعۂ ہزلیات کی جلدیں وغیرہ بنائیں ۔ اس کی مثال تو بالکل اس شاہی باز کی سی ہوئی جو بادشاہ کے یہاں سے اُڑ کر ایک بڑھیا کی کٹیا پر جا بیٹھا تھا ، اور اس ناسمجھ بڑھیا نے از راہ ہم دردی اس کے پر نوچ ڈالے تھے ۔ حق سبحانہ نے ہمیں کچھ ایسے دور میں پیدا کیا ہے جس میں لوگوں نے نفسانی خواہشات کو شریعت سمجھ رکھا ہے ۔ وہ جاہ و منصب کے حصول اور کبر و نخوت کو عزت اور علم کا نام دیتے ہیں ۔ اپنی ریاکارانہ اور نمائشی عبادت کو خوف خدا سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اپنے دلوں میں کینہ چھپائے رہتے ہیں لیکن اسی کو پھر حلم اور بردباری کہتے ہیں ۔ اسی طور مجادلے (یعنی جھگڑا ، کج بحثی) کو مناظرے اور مجازیت و کمینگی کو عفت اور پاکیزگی قرار دیتے ہیں ۔ نفاق ان کے نزدیک زہد و پارسائی ہے ، خواہش و تمنا کو وہ ارادت کا نام دیتے ہیں ۔ وہ طبیعت کی یاوہ گوئی کو معرفت ، نفسانی خواہشات اور من گھڑت باتوں کو محبت ، الحاد و بے دینی کو فقر اور انکار کو صفوت کہتے ہیں ۔ اسی طرح 'زندقہ' ان کے مطابق 'فنا' ہے اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت مطہرہ کے ترک کرنے کو طریقت اور ابنائے زمان کی اعتقادی اور عملی آفات کو وہ 'معاملت' کہتے ہیں ۔ نوبت بہ این جا رسید کہ صاحبان علم و معانی ان جاہلوں سے دب کر رہ گئے ہیں اور انہیں ان پر پورا غلبہ حاصل ہوگیا ہے ، جس طرح کہ آغاز اسلام میں آل مروان نے حضور سرور کائنات صلعم کے اہل بیت پر غلبہ حاصل کیا تھا ۔ ارباب حقائق کے بادشاہ اور معرفتوں اور دقائق کے پیشوا جناب ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ :
''ہمیں ایک ایسے دور سے سابقہ پڑا ہے کہ جس میں نہ تو اسلام کے آداب ہیں ، نہ جاہلیت کے اخلاق اور نہ اہل مروت کی سی عادات و خصائل ہی ہیں'' ۔ شبلی کا اس شعر کے مصداق ایک قول ہے ؛

''لعنت ہو اللہ کی اس دنیا پر کہ جو سوار کے لیے پڑاؤ ہے۔ ہر بلند ارادہ شخص اس میں عذاب دیا جاتا ہے[۳]۔''

(کشف المحجوب ، صفحہ ۱۱ تا ۱۳)

۲- تجرد

پس ایک صوفی اور درویش کے لیے دنیا کی طلب میں پست طریقوں کا اختیار کرنا حرام ہے۔ اسے دل کے مشغلے سے ھاتھ نہ اٹھانا چاہیے کہ اس کے دل کی ویرانی و غیرآبادی میں اس کی اپنی ہلاکت ہے ، جس طرح کہ کسی مال دار کی بربادی اس کی املاک اور گھربار کی بربادی کے سبب ہوتی ہے[۴]۔ ایک دولت مند کی ویرانی و بربادی کے جو اسباب ہوتے ہیں ، ان کا حل اور بدل تو مل سکتا ہے ، لیکن اگر درویش کا دل ویران و خراب ہو جائے تو اس کا کوئی بدل نہیں ہے۔

ہمارے زمانے میں تو مطیع و فرماں بردار بیوی کا دست یاب ہونا نا ممکن سی بات ہے ؛ البتہ فضول گو ، محال چیزوں کی طالب اور مسرف قسم کی عورتیں بہت زیادہ مل جاتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک گروہ نے ازدواجی زندگی اختیار کرنے کی بجائے تجرد و تنہائی کو اپنا رکھا ہے اور ان لوگوں نے اس حدیث شریف کا گویا عملی طور پر احترام کیا ہے۔ آں حضرت صلعم نے فرمایا ''آخر زمانے میں سب سے اچھا آدمی وہ ہوگا جو 'خفیف الحال' ہوگا ؛ عرض کی گئی ''یا رسول اللہ خفیف الحال[۵] سے کیا مراد ہے ؟'' آپ نے فرمایا ''جس کی کوئی بیوی ہو نہ اولاد۔'' آپ صلعم نے یہ بھی فرمایا کہ ''چلو ، مجرد لوگ تم پر سبقت لے گئے اور وہ جمع کیے ہوئے ہیں[۶]۔'' چناں چہ مشائخ طریقت بھی اس بات پر متفق ہیں کہ مجرد اور مفرد اہل طریقت سب پر فضیلت رکھتے ہیں بہ شرطیکہ نفس کی آفات سے بچے رہیں اور حرص و شہوات کے ارتکاب سے پرہیز کریں۔ اور عوام شہوات کے ارتکاب میں آں حضرت صلعم کی مبینہ حدیث ـــ ''تمھاری دنیا کی تین چیزیں مجھے محبوب ہیں : خوش بو ، عورتیں اور

نماز جو کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے‘‘۔۔۔ کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب عورتیں آپ کو محبوب تھیں تو پھر نکاح کرنا افضل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ آں حضرت صلعم نے تو یہ بھی فرمایا ہے کہ ’’میرے دو مسلک ہیں: ایک فقر اور دوسرا فقر کی محبت۔‘‘ تو پھر کس لیے اس مسلک سے گریزاں ہو؟ اگر وہ (عورت) آپ کو محبوب ہے تو یہ بھی تو آپ ہی کے مسلک ہیں۔ مگر حرص و ھوا کے سبب تمھاری رغبت اس طرف زیادہ ہے۔ اس صورت میں اپنی ھوا و ھوس کو (خاکم بدھن) پیغمبر صلعم کا محبوب کہنا بہت بڑی ریاکاری ہے۔ اور وہ شخص جو پچاس برس تک اپنی حرص و آز کے تابع رھا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ وہ سنت کی پیروی کر رہا ہے تو ایسا شخص ایک بہت بڑی غلطی کا مرتکب ہوگا۔

مختصر یہ کہ سب سے پہلا فتنہ، جو بہشت میں آدم علیہ السلام کو پیش آیا، اس کا سبب عورت ہی تھی، اور سب سے پہلا فتنہ جو آدم کے زمین پر نزول کے بعد ھابیل اور قابیل کے درمیان وقوع پذیر ہوا، اس کا باعث بھی حوا ہی کی بیٹی تھی، اور جب خدا نے دو فرشتوں^ پر اپنا عذاب نازل کرنا چاھا تو اس کا موجب بھی اس نے اسی ’زن‘ کو ٹھہرایا۔ یہ سلسلہ یہیں تک نہیں رھا بلکہ آغاز دنیا سے لے کر خود ھمارے زمانے تک جو بھی دینی یا دنیوی فتنہ و فساد اٹھے، ان سب کی جڑ بھی عورت تھی۔ چناں چہ آں حضرت صلعم فرماتے ہیں: ’’میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر اور کوئی زیادہ نقصان دہ فتنہ نہیں چھوڑا۔‘‘ تو جب ان کا ظاھر ہی اس قدر فتنوں اور برائیوں سے آلودہ ہے تو ان کے باطن کا کیا حال ہوگا۔ مجھ علی بن عثمان جلابی کو حضرت حق سبحانہ نے کوئی گیارہ سال تک اس دام زن یعنی نکاح سے بچائے رکھا، لیکن ہونی شدنی تقدیر نے آخر مجھے بھی اس فتنے میں پھنسا کے ہی چھوڑا اور میرا ظاہر و باطن اس عورت کا شکار ہو کر رہ گیا۔ کوئی ایک سال تک میں اس فتنے میں غرق رہا، یہاں تک کہ قریب تھا کہ

میرا دین تباہ و برباد ہو جاتا ، مگر ایزد متعال نے اپنے نہایت فضل و کرم سے عفت و عصمت کو میرے دل زخم خوردہ کے استقبال کے لیے بھیجا اور اپنی رحمت سے میری اس فتنے سے گلو خلاصی کرائی۔ والحمد للہ علیٰ جزیل نعمائہ (اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمتوں پر اس کا شکر ہے)۔

(کشف المحجوب ، صفحہ ۴۲۵ تا ۴۲۷)

سدیدالدین محمد عوفی

[عوفی (پیدائش مابین ۱۱۷۱ء، ۱۱۷۶ء - وفات ۱۲۴۲ء) فارسی شعرا کے تذکرے لباب الالباب کا مرتب ہے - یہ فارسی شعراء کا قدیم ترین تذکرہ ہے۔ اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ابتدائی سلطانی دور کے ان شعرا کے حالات و کلام پیش کرتا ہے جو دست برد زمانہ سے محو ہو چکے ہیں اور ان میں سے اکثر کا کلام بھی ناپید ہے]

مسعود بن سعد بن سلمان کا ذکر

پیشوائے بزرگ ، دین اور سلطنت کی نیک بختی ، مسعود سعدِ سلمان رحمۃ اللہ علیہ :

مسعود بن سعد ایک بہت بڑا فاضل اور نادر روزگار تھا - اس نے خوش بختی کے بازوؤں کے ساتھ بزرگی کی فضا میں پرواز کی - کبھی اس نے صبح اور شام کے وقت زمانے کے حادثات کے ہاتھوں اپنے بازوؤں کو بندھے ہوئے پایا تو کبھی نیشکر کی مانند فضل و افضال کے شکر کے طور پر دنیا کی جان کے حلق میں مٹھاس گھول دی اور کبھی قلعہ نائے میں گردش ایام کے زہر کے تلخ گھونٹ پیے[1] - اس نے ہندوستان کی سر زمین میں بڑے بڑے کارنامے سر انجام دیے اور بڑی نیک نامی اور انسان دوستی سے زندگی بسر کی - وہ مملکت شعر کا اورنگ نشین تھا اور سائلوں کو ایک ایک رباعی اور قطعہ سے نعمتوں کی دنیا بخش دیتا - مدت ہوئی جب کسی نے کہا تھا :

''سخاوت جب بھی ثنا کے قہوے کا ذائقہ چکھتی ہے تو اس پر نشہ طاری ہو جاتا ہے اور وہ مال لٹاتی ہے -''

اگرچہ اس کا مولد ھمدان ھے لیکن چوں کہ اس نے اپنی ھمہ دانی سے بلاد شرق کو ایک خاص تازگی و شگفتگی بخشی ، اور اس دور کے فاضلوں میں اس کا شمار ھوا ، اور تاریخ کی کتابوں میں اسے اس شہر[۲] کے شاعروں کے زمرے میں جگہ دی گئی ھے ، اس لیے اس کا ذکر اس طبقے میں کیا گیا ۔ اور حق تو یہ تھا کہ وزرا کے سلسلے میں بھی اس کا تذکرہ کیا جاتا مگر چوں کہ دوسرے شعرا کی نسبت اس کے اشعار زیادہ ھیں اور یہ کہ اس کے تین دیوان ھیں : ایک تو عربی اشعار کا دیوان ، ایک فارسی اشعار کا اور ایک ھندی اشعار پر مشتمل ھے ، اس لیے اور اسی سبب سے اسے اس طبقے کے شعرا کی لڑی میں پرو دیا گیا ۔ اس کے جتنے بھی اشعار سننے کا موقع میسر آیا ھے ، وہ تمام کے تمام بڑے استادانہ اور دل کش ھیں ۔ اس کے چند نہایت لطیف اشعار یہاں درج کیے جاتے ھیں ۔ ذیل کا قطعہ اس نے ثقة الملک کے بارے میں اس وقت کہا جب کہ دیوان وزارت کی کرسی اس کے حسن سے آرائش پذیر ھوئی تھی ۔ اشعار یوں ھیں :

قطعه

(۱) ثقة الملک تـا بصدر نشست — دھر پیشش میان بطوع ببست[۳]

(۲) تا ھمایون دوات پیش نہاد — الفش را فلـک بتا پیوست

(۳) درد دشمن شدست داروے دوست — تاش ببسود آن مبارک دست

(۴) بـنـگر اکنون بتازگی عجبے — کاندرو لفظ درد و دارو ھست

قطعه

(۱) احوال جہان باد گیر ، باد — وین قصه ز من یاد گیر ، یاد[۳]

(۲) چون طبع جہان باشگونه بـود — کـردار ھـمـه باشگونه زاد

(۳) از روے عزیزیست بسته باز — وز خواری باشد گشاده خاد

(۴) در حوض و بیابانش چشم و گوش — ماند بشگفتے از آب و بـاد

ق

(۵) دیوانهٔ شوریده بـاد بـود — زنجـیر ھمـی آب را نہـاد

قطعۂ ذیل بھی اسی کا ہے:

قطعه

(۱) چو من جریدۂ اشعار خویش عرضه کنم[۵]
نخست یابم نام تو بر سر دیوان

(۲) سزد که نام من، اے نامدار، ثبت کنی
به کلک غفلت در متن دفتر نسیان

(۳) مرا مدار بطبع و هنر گران و سبک
که من بسایه سبک نیستم، بطبع گران

(۴) همیشه تا بجهان خالی و تهی نبود
جواهر از اعراض و عناصر از الوان

(۵) دو حال نیک و بد آید همی ز سمت فلک
بهفت کوکب و در پنج حس و چار ارکان

(۶) چوسرو و لاله بناز و چو صبح و باغ بخند
چوماه و مهر بتاب و چو عقل و روح بمان

(۷) خجسته دولت و فرخنده بخت تو همه سال
چو آفتاب منیر و چو نوبهار جوان

(۸) بخر مرا و نکوئی نکو بدار که من
بهر نکوئی حقّم بهر بها ارزان

اشعار[۶]

(۱) تاکی دل خسته در گمان بندم — جرمے که کنم باین و آن بندم[۷]
(۲) بدها که ز من رسد همی برمن — بر گردش چرخ و بر زمان بندم
(۳) ممکن نشود که بوستان گردد — گر آب در اصل خاکدان بندم
(۴) افتاده خسم، چرا هوس چندین — بر قامت سرو بوستان بندم
(۵) وین لاشۂ خر ضعیف بد ره را — اندر دم رفته کاروان بندم
(۶) این سستیٔ بخت پیر هر ساعت — در قوت خاطر جوان بندم

(۷) چند از پی وصل در فراق افتم — وهم از پی سود در زیان بندم
(۸) وزعجز ، دوگوش تا سپیدهٔ دم — در نعره و بانگ پاسبان بندم
(۹) چون اشک ز دیده بر دو رخ بارم — باران بهار در خزان بندم
(۱۰) جوی که ز سرخ لاله بگشایم — اندر تن زار ناتوان بندم
(۱۱) بر چهرهٔ چین گرفته از دیده — هرگاه که لعل ناردان بندم
(۱۲) گوئی که همه گزیده گوهرها — بر چرم درفش کاویان[۸] بندم
(۱۳) اندوه و نیاز دل چرا چندین — اندر تـن زار ناتوان بندم
(۱۴) از کالبد تن استخوان مـانـدم — امید درین تن از چه سان بندم
(۱۵) زین پس کمرے اگر بچنگ آرم — چون کلک کمر براستخوان بندم
(۱۶) وزضعف چنان شدم که گرخواهی — ز اندام گره چو خیزران بندم
(۱۷) در طعن چو نیزه‌ام که پیوسته — چون نیزه میان برایگان بندم
(۱۸) کار از سخنست ناروان ، تاکی — دل در سخنان ناروان بندم
(۱۹) در خور بودم اگر دهان بندی — مانند قرابه بر دهان بندم
(۲۰) یک تیر نماند و من کمان گشتم — تاکی زه چنگ بر کـمان بندم
(۲۱) نه دل تنگم شود از اندیشه — هر گاه که در غم گران بندم
(۲۲) شاید که دل از جهان بپردازم — در مـدح یگانهٔ جهان بندم
(۲۳) منصور ، که حرز مدح او دایم — برگردن عقل و طبع و جان بندم
(۲۴) ای آنکه ستایش تو در خامه — بـرباد جهنـدهٔ بـزان بندم
(۲۵) بر درج مـن آشکار بگشاید — بندے که ز فکرت نهان بندم
(۲۶) در وصف تو شکل بهرمان سازم — وز نعت تو نقش بهرمان بندم
(۲۷) ایـن سـاز مرصع مدیحت را — بر مرکب تیز تگ دوان بندم
(۲۸) هر گاه که بکر معنیٔ یابم — زود از نامت برو نشان بندم
(۲۹) پیوسته شراع صیت جاهت را — بر کشتئی بحر بی‌کران بندم
(۳۰) تـا دُرّ گرانبـهـای دریـا را — در گـوهـر قیـمتئی کان بـنـدم
(۳۱) گـردون همه مبهات بگشاید — چون همت خویش درمیان بندم
(۳۲) بس خاطر و دل که ممتحن گردد — چون خاطر و دل در امتحان بندم
(۳۳) صد آتش بـا دخان بـرانگیزم — چـون آتش کلک در دخان بندم
(۳۴) گر من ز مناقب تـو تعویذے — بـر بـازوی شرزهٔ ژیـان بـنـدم

(۳۵) در گرد و حوش من سپس ازآن ‌‌‌‌ سدّی ز سلامت و امان بندم
(۳۶) من گوهرم و چو جزع پیوسته ‌‌‌‌ در خدمت تو همی میان بندم
(۳۷) دارم گلها و راست پنداری ‌‌‌‌ کز دست هوای تو زبان بندم
(۳۸) ناچار امید کژ رود چون من ‌‌‌‌ در گنبد کژ رو کیان بندم
(۳۹) آن به که براستی همه تهمت ‌‌‌‌ در صنع خدای کامران بندم

اور یہ اشعار اس نے سیف‌الدولہ محمد بن مسعود کی مدح میں کہے ہیں ۔ اس قصیدے میں ، جو کہ مختلف شعری صنعتوں کے حسن اور فن کارانہ لطف سے آراستہ ہے ، اس نے لفظ 'ب' اور 'م' کو بالکل استعمال نہیں کیا ۔ چناں چہ یہ منظومہ پڑھتے وقت دونوں ہونٹ آپس میں نہیں ملتے ۔ ہم اس میں سے چند اشعار درج ذیل کرتے ہیں :

(۱) ای آذر تو یافته از غالیه چادر[۹]
اندر دل عشاق ز دست آذرت آذر

(۲) نه سرو سهی چون تو و نه لالهٔ خود روی
نه طرفهٔ چین چون تو، و نه صورت آذر

(۳) زلفین تو ریحان ، دل عشاق تو جنت
دیدار تو خور ، دیدهٔ عشاق تو خاور

(۴) اندر دل عشاق تو آنست ز عشقت
کاندر دل حسّاد شهنشاه ز خنجر

(۵) سیف دول ، آن شاه که از رای رفیعش
گشتست جهان هنر و رادی انور

(۶) آن شاه سخی دست که درگاه سخاوت
لفظش گهر افشاند و دستش زر وگوهر

(۷) ای شاه! تو خورشیدی زیرا که چو خورشید
نور تو در آفاق رسیدست سراسر

(۸) لرزان شده از ترس سر تیغ تو فغفور
ترسان شده از هول سر گرز تو قیصر

(۹) ای چتر ترا نصرت و تائید شده یار
وی تیغ ترا فتح وسعادت شده یاور

(۱۰) حیران شده از وصف تو وصّاف سخن گوی
عاجز شده از نعت تو دانای سخن ور

ذیل کا کلام بھی مسعود ھی کا ھے:

(۱) با من بتافت یار و بتابم زتاب آو[۱۰]
طاقت نماند بیش مرا باعتاب آو

(۲) از رشک آن نقاب که بر روی او رسد
گشت این تنم ضعیف چو تار نقاب آو

(۳) چون نوشم آید ارچه چو زهرم دهد جواب
زیرا که هست برلب واه جواب آو

(۴) داند که هست بسته بزلفین او دلم
هر ساعتی فزون کند آن پیچ و تاب آو

(۵) خوردم شراب عشقش یک جام و زان هنوز
اندر سر منست خمار شراب آو

(۶) چون زرّ پخته شد رخ و چون مشک خام تن
زان آفتاب تابان و ز مشک ناب آو

(۷) گر زر ز آفتاب زیادت شود همی
نقصان چرا شود زرم از آفتاب آو

(۸) چنگ عقاب زلفش و روی تذرو رخ
ایمن رخ تذرو ز چنگ عقاب آو

(۹) باز سپید روی و غراب سیاه زلف
وز بیم باز او شده لرزان غراب آو

اسی قصیدے میں یہ مدحیہ اشعار ملاحظہ ھوں:

(۱) تختش سپهر و در وے خلقش نجوم آو[۱۱]
چشمش اثیر و تیرش دروی شهاب آو

(۲) کفش سحاب و تازه ازو بوستان ملک
زحمت ندید صاعقه اندر سحاب او

(۳) باشد هوا گران چو سبک شد عنان او
گردد زمین سبک چو گران شد رکاب او

(۴) آبست و آتشست حسامش بگاه رزم
روی زمین و چرخ پر از موج و تاب او

(۵) صافی شدست آب جلالت ز آتشش
و افروخته ست آتش هیبت ز آب او

ذیل کی غزل کہ چمن لطافت کا پھول ہے ، اسی کے زور قلم کا نتیجہ ہے :

غزل

(۱) ای سلسلۂ مشک فگنده به قمر بر۱۲
خندیده لب پر شکر تو بشکر بر

(۲) چون قامت تو نیست سهی سرو خرامان
چون چهرۂ تو نیست گل لعل ببر بر

(۳) گل از سبق چهرۂ تو شسته بخون رخ
سرو از حسد قامت تو دست بسر بر

(۴) تا در سر من گشت که در بر کشمت تنگ
گه دست بسر بر زنم و گاه ببر بر

(۵) چندان غم و اندوه فراز آمده در دل
تا توده شدست انده و غم یک بدگر بر

(۶) دل شد سپر جان ز نهیب مژۂ تو
تا چون مژه زخمے زند آید بسپر بر

(۷) تا هجر نشست ست به نزدیک تو ساکن
آن وصل سراسیمه بماندست بدر بر

(۸) من بر تو همی هرچه کنم دست نیابم
ای رشک قمر دست که یابد بــه قمر بر

(لباب الالباب عوفی ، صفحه ۴۲۳ تا ۴۲۸)

[یه اقتباسات عوفی کی دوسری کتاب 'جوامع الحکایات' سے لیے گئے ہیں ۔ کتاب کا آغاز عوفی نے قباچہ کے دربار ھی میں کیا تھا ، لیکن جب ۱۲۲۸ء میں قباچہ اپنے انجام کو پہنچا اور ھند و سند میں التتمش کا دور دورہ ھوا تو یہ کتاب تکمیل کو پہنچی اور التتمش کے وزیر نظام الملک جنیدی کی دربار داری کی یادگار قرار پائی ۔ جوامع الحکایات ابھی پوری شائع نہیں ھوئی ؛ مندرجہ ذیل اقتباسات ، جن کا اردو تـرجمہ پیش کیا جا رھا ھے ، 'منتخب جوامع الحکایات' (مطبوعہ ایران) سے ھیں ۔]

ترکی سلطانوں کو شاھان ھند کی نصیحت

حکایت : میں نے کسی کتاب میں پڑھا ھے کہ ترکستان کے چند سلاطین نے اس مضمون پر مشتمل خطوط دے کر اپنے پیغام بر ھندوستان کی مملکت میں بھیجے کہ ''ھمیں معلوم ھوا ھے کہ ھندوستان کی سرزمین میں ایسی دوائیں موجود ھیں ، جن کے استعمال سے عمر طویل ھوتی ھے ؛ اس مملکت کے بادشاہ دراز عمر ھوتے ھیں اور سردار حفظان صحت کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ھیں ۔ چاھیے کہ آپ ھمیں بھی ان میں سے کچھ ادویات عنایت کریں اور اس کے ساتھ اس بارے میں بھی آگاہ کیجیے کہ آپ کی درازیٔ عمر کا سبب کیا ھے ؟'' جب یہ قاصد وارد ھند ھوئے اور پیغام کہہ سنایا ، تو وھاں کے راجا کے فرمان پر انھیں ایک ایسے پہاڑ کے دامن میں لے جایا گیا جس کی چوٹی آسمان سے باتیں کر رھی تھی ۔ پھر اس نے ان سے کہا کہ ''جس وقت یہ پہاڑ پھٹ جائے اور اس کی پشت اور کمر ایک دوسرے سے علیحدہ ھو جائیں تو اس وقت تمھیں جواب دیا جائے گا

اور تمھیں واپس جانے کی اجازت ہوگی ۔'' ان لوگوں نے جب یہ بات سنی تو سمجھ گئے کہ اب وہ گھروں کو لوٹ نہیں سکتے اور نہ عزیز و اقارب ھی سے ملنے کی اب کوئی توقع ھے ۔ انھوں نے پہاڑ کے قرب میں خیمے نصب کر لیے اور ہر روز بارگاہ رب العزت میں اپنی حاجت روائی کے لیے دعا مانگنے لگے ۔ ان کی همت اب اسی بات تک محدود تھی کہ کب یہ عظیم پہاڑ پھٹے ، زمین پر گرے اور گونج پیدا ھو ۔ آخر ایک مدت کے بعد وہ عظیم پہاڑ پھٹ کر زمین پر آ رھا ۔ قاصدوں نے جب پہاڑ پھٹنے کا شور سنا اور وہ منظر دیکھا تو راجا کو اس صورت حال سے آگاہ کیا ؛ راجا نے ان سے کہا ''تمھارے پیغام کا جواب بس یہی حالت ھے کہ چند گنے چنے آدمیوں نے مل کر همت کی اور اس همت کی بدولت اس قدر مضبوط اور بلند پہاڑ زمین پر آ رھا ۔ تمھارے بادشاہ ظالم ھیں ، جس کے سبب عوام الناس اپنی تمام قوتیں ان کے استیصال پر صرف کرتے رھتے ھیں ، تو یقینی طور پر اس کا اھم نتیجہ یہی ھوگا کہ ایک دن ان کی بزرگی کا پہاڑ منہدم ھو جائے گا اور ان کے ملک و سلطنت کی بنیادیں تک مٹ جائیں گی ۔ اس لیے بادشاھوں ، سلاطین ، امانت داروں ، وزیروں اور حاکموں پر یہ واجب ھے کہ جب حکومت کی باگ ڈور ان کے قبضے میں آئے اور مخلوق خدا پر ان کو اقتدار حاصل ھو تو وہ نیکی اور انصاف کا راستہ اختیار کریں ، تاکہ اس وسیلے سے کمزور لوگ امن کے سائے میں آسودہ ھوں اور قوی لوگ آرام و آسائش کے باغ میں ٹہل سکیں ۔ اس لیے کہ دولت ایک بے وفا معشوق اور زندگی ایک گربز پا ساتھی ھے ۔ نہ تو اسے استقلال ھے اور نہ اسے دوام ۔ (منتخب جوامع الحکایات ، صفحہ ۴۷ تا ۵۰)

شمشیر و قلم

سلاطین ماضی کے عہد میں ایک امیر اور ایک دبیر (منشی) کے درمیان بیٹھنے کی جگہ پر تنازعہ ھو گیا ۔ امیر کہنے لگا ''میں نیچے نہیں بیٹھوں گا ، اس لیے کہ بادشاہ کو تم سے زیادہ ھماری ضرورت ھے ، اور سلطنت تلوار سے لی جاتی ھے ، قلم سے نہیں ۔''

دبیر بولا ''ھمیں چار چیزوں میں تم پر فضیلت حاصل ھے۔'' کسی مخبر نے یہ تمام ماجرا بادشاہ کو جا سنایا۔ بادشاہ نے دونوں کو اپنے پاس طلب کیا اور دبیر سے کہا ''اھل شمشیر کو اھل قلم پر ترجیح حاصل ھے، کیوں کہ مؤخر الذکر اصحاب سیف کے خدمت گذار ھوتے ھیں، لیکن تو جو اس کے برعکس اھل قلم کو ان پر ترجیح دیتا ھے تو تیرے نزدیک اس ترجیح اور برتری کا سبب کون سی فضیلتیں ھیں؟'' دبیر نے جواب دیا ''بادشاہ سلامت کی دولت و سلطنت تا ابد قائم رھے! تلوار دشمنوں کے لیے ھوتی ھے، دوستوں کے لیے نہیں، اور قلم نہ صرف دوستوں کے نفع کے لیے استعمال ھوتا ھے بلکہ دشمن کو دور رکھنے کے کام بھی آتا ھے، اور پھر یہ بھی تو ھے کہ بہت سے ارباب تیغ نے اپنے آقاؤں کے خلاف بغاوت کی اور معمولی سی حکومت ملنے پر انھوں نے نافرمانی اور سرکشی اختیار کی ھے، لیکن آج تک کسی صاحب قلم سے ایسی حرکت سر زد نہیں ھوئی۔ اس سے یہ ثابت ھوتا ھے کہ صاحب قلم تو ارباب وفا ھیں لیکن اھل شمشیر اس سے خالی ھیں۔ اس کے علاوہ ارباب قلم بادشاھوں کی آمدنی کا خزانہ اور صاحبان شمشیر خرچ کرنے والے ھوتے ھیں، اور جب تک خزانہ معمور نہ ھو خرچ کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا۔ لہٰذا جو چیز کہ آمدنی کا باعث ھے وہ ھر حال میں اس شے سے عزیز ھوگی جس پر کہ خرچ ھوتا ھے۔ چوتھی بات یہ ھے کہ اھل شمشیر لڑنا تو جانتے ھیں لیکن وہ درست رائے نہیں ھوتے اور دشمنوں کے قہر اور ظالموں کی زیادتی کو زیادہ تر درستئ رائے ھی سے دور رکھا جا سکتا ھے، محض قوت و شوکت سے نہیں۔'' بادشاہ کو اس کی یہ باتیں بہت پسند آئیں؛ اسے خلعت عطا کی اور امیر کو خوش کرکے واپس بھیج دیا۔ (منتخب، صفحہ ۲۷ تا ۲۸)

امام ابو حنیفہ رض کی دانائی

ابو حنیفہ رض کے زمانے میں کسی شخص کے پاس چند دینار تھے؛ اسے کسی پر بھی اتنا بھروسا نہ تھا کہ وہ اپنے دینار اس کے پاس امانت رکھتا۔ آخر اس نے وہ دینار ایک تھیلی میں ڈال کر کسی

درخت کے نیچے چھپا دیے ۔ کچھ عرصے کے بعد جب وہ تھیلی نکالنے کے لیے آیا تو اسے غائب پایا ۔ جس کسی سے بھی اس نے اس کا تذکرہ کیا ، وہ اس کا کوئی چارہ نہ بتا سکا ۔ آخر کسی نے اسے ابو حنیفہ رض سے ملنے کا مشورہ دیا ۔ یہ ان کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ آپ نے فرمایا ''تو واپس چلا جا ، میں کل تیری دولت حاصل کروں گا ۔'' اس کے بعد آپ ایک طبیب کے پاس پہنچے اور اس سے پوچھا کہ فلاں درخت کی جڑ کس بیماری کے لیے فائدہ مند ہے ؟ اس نے کہا فلاں مرض کے لیے ۔ پھر آپ نے شہر کے تمام طبیبوں سے دریافت کیا کہ آیا ان کے علاقے یں کوئی شخص اس بیماری میں مبتلا تھا ؟ اور انھوں نے اسے اس درخت کی جڑ کے استعمال کے لیے کہا تھا ؟ آخر ایک طبیب نے بتایا کہ ''ایک ماہ کا عرصہ ہوا جب ایک ایسا مریض میرے پاس آیا تھا اور میں نے اسے مذکورہ درخت کی جڑ تجویز کی تھی ۔'' ابو حنفیہ رض نے کسی کے ذریعے اس شخص کو بلوایا اور کسی نہ کسی طریقے سے اس سے یہ اقرار کروا لیا کہ مذکورہ دینار اس نے اٹھائے تھے ۔ اس کے بعد آپ نے وہ دینار اس سے لے کر متعلقہ شخص کو لوٹا دئے ۔

(منتخب جوامع الحکایات ، صفحہ ۲۸۰ تا ۲۸۱)

فخر مدبر

[فخر الدین مبارک شاہ المعروف بہ فخر مدبر غزنوی ، قطبی ، شمسی دور کے اہم مصنف ہیں ۔ ان کی کتاب 'سلسلۃ الانساب' کا ابتدائی حصہ قطبی دور کے بارے میں ، 'تاریخ فخر الدین مبارک شاہ' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ دوسری کتاب 'آداب الملوک و کفایت المملوک' (آداب الحرب و الشجاعت) ہے جو نظام حکومت اور فنون جنگ سے متعلق ہے]

بادشاہوں کے حقوق اور فرائض

(۱)

عالموں کے بعد سلاطین ہیں ، جنھیں خدائے بزرگ و برتر نے صاحب امر کہا اور دنیا کی بہتری ان کی ذات سے وابستہ ہے ۔ ان کی فرماں برداری اور اطاعت کرنا رعایا پر واجب ہے کہ خود اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے : ''اے ایمان والو! خدائے عزوجل کی اطاعت کرو اور اس کے رسول کی اور بادشاہوں ، امیروں اور والیان ملک کی (تاکہ تم سچے مومن بنو[1] ۔''

اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں : ''جس نے میری اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی ، اور جس نے امام کی اطاعت کی اس نے گویا میری اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی ، وہ خدا کا نا فرمان ٹھہرا اور جس نے امام کی اطاعت سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے روگردانی کی ۔'' آں حضرت صلعم ایک اور جگہ فرماتے ہیں : ''اپنے حاکم کی اطاعت کرو خواہ وہ کان اور ناک کٹا حبشی

غلام ہی کیوں نہ ہو۔'' اور یہ بھی سرکار دو عالم صلعم ہی کا قول ہے کہ ''اگر بادشاہ نہ ہوتا تو لوگ ایک دوسرے کو کھا جاتے۔'' آپ صلعم ہی کی حدیث ہے : ''بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہے ، جس میں مظلوم پناہ لیتے ہیں۔'' اور سائے سے مراد راحت و آسائش ہے ، اس لیے کہ وہاں انصاف اور امن ہوتا ہے اور یہ مظلوموں کے رہنے اور ظالموں سے بھاگ کر بادشاہوں کی پناہ و حمایت میں آنے کی جگہ ہے۔

احکام شرع میں سے چند امور بادشاہوں کی ذات اور ان کے فرمان سے متعلق ہیں۔ مثلاً جمعہ اور عیدین[۲] کا خطبہ ، حدود و جہات کا تعین ، خراج اور صدقات لینا ، جنگ کرنا ، فریقین کے درمیان جھگڑے کا فیصلہ کرنا ، مقدمے سننا ، ملک کو دشمن کی افواج سے محفوظ رکھنا ، لشکروں کو ترتیب دینا ، لڑنے والوں کی روزی کا انتظام کرنا ، رعایا کی بھلائی کے لیے مختلف احکام صادر کرنا ، مختلف سزاؤں کا نافذ کرنا ، عوام میں انصاف کرنا اور مظلوموں کی داد رسی کرنا۔ رسول اکرم صلعم کی حدیث ہے : ''ایک گھڑی کا انصاف ساٹھ سالہ عبادت سے بہتر ہے۔'' ایک اور جگہ آپ صلعم فرماتے ہیں: ''اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک پل کا انصاف اس شخص کی عبادت سے بہتر ہے جس نے مسلسل ساٹھ سال تک راتیں نماز میں گزاریں اور دن کو روزے رکھے ہوں۔'' علاوہ ازیں مفسدوں کی بیخ کنی کرنا ، مختلف بدعتوں اور ناپسندیدہ کاموں کو مٹانا ، لوگوں کی دولت و زندگی ، ان کی عورتوں اور جائداد پر ظالموں کی دست درازی کو روکنا ، اپنی رعایا کی غم خواری اور ان کے لیے روزی مہیا کرنا ، بیت المال کا مال ان مستحق لوگوں پر صرف کرنا جن کے بارے میں اللہ جل جلالہ' نے قرآن کریم میں فرمایا ہے : ''خیرات فقرا ، مساکین اور صدقات وصول کرنے والے کارکنوں ، ان لوگوں کے لیے جن کی تالیف قلب منظور ہے ، غلاموں ، قرض داروں ، اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے فرض ہے اور وہ جاننے والا دانا ہے۔''

(تاریخ مبارک شاہی ، صفحہ ۱۰۲ تا ۱۰۴)

(۲)

(ان سب کے علاوہ بادشاہ پر جو دیگر آمور واجب ہیں ، وہ یہ ہیں) مسجدوں ، مدرسوں ، پلوں اور سراؤں کی تعمیر جو کہ تنگ اور خطرناک راستوں اور عام گزرگاہوں پر واقع ہوں ۔ وہ قلعے اور شہر پناہیں بنوائے تاکہ مسلمان اور دوسرے آنے جانے والے مسافر لوگ امن میں رہیں ، اور ان کی عورتیں ، ان کی جان و مال چوروں اور فسادی عنصر کے ہاتھوں محفوظ رہے ؛ اس لیے کہ مخلوق خدا کی ، کہ خدائے بزرگ و برتر کی ایک بہت بڑی امانت ہے ، ذمہ داری بادشاہ پر عاید ہوتی ہے اور اسے رعایا کی بھلائی اور بہبود کا خیال تابہ مقدور رکھنا چاہیے ۔ چناں چہ اردشیر بابکان۳ ، جو ایک آتش پرست ایرانی بادشاہ تھا ، لیکن زمانے میں ابھی تک اس سے بہت سے قابل تعریف افعال اور اچھے خصائل یادگار ہیں ، کی دانائی کی باتوں میں سے ایک یہ بھی ہے : ''مردان کار کے بغیر بادشاہی قائم نہیں رہتی اور مردان کار مال کے بغیر نہیں رہ سکتے ، مال بغیر رعیت کے اور رعیت عدل و انصاف کے بغیر آسودہ نہیں رہ سکتی ، اور عدل و انصاف بغیر سیاست (احتساب ، سزا وغیرہ) کے قائم نہیں رہ سکتا ۔ اور پیغمبر علیہ السلام کا فرمان ہے کہ : ''عدل روے زمین پر اللہ تعالیٰ کی ترازو ہے ۔'' یعنی جب پتھر کا باٹ ، جس سے کہ ترازو میں وزن کرتے ہیں ، صحیح ہو تو اس سے جو کچھ وزن کیا جائے گا و درست اترے گا اور کسی قسم کی کمی وغیرہ نہ ہوگی ۔

(تاریخ مبارک شاہی ، صفحہ ۱۷ تا ۱۸)

بادشاہوں کے فرائض

بادشاہ کو مندرجہ ذیل اصولوں کے مطابق اپنی زندگی ڈھالنی چاہیے : اسے چاہیے کہ وہ رعایا اور ملک کے حال سے پوری طرح باخبر رہے اور اس میں کسی قسم کی غفلت نہ برتے کہ کتاب سلطنت کا اہم ترین باب یہی ہے ۔ موبد موبدان۴ کا کہنا ہے : ''بادشاہوں اور امیروں میں سب سے زیادہ اچھا وہی ہے جو ان قابل تعریف خصلتوں

کا حامل ہو جن کی تفصیل ہم بیان کر آئے ہیں ۔ بادشاہ مال خرچ کرنے میں سخی ہو ، غصے میں بھی راست گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دے ، اپنی رعایا پر مہربان اور اپنے وعدے کا پکا ہو ، امارت اور سلطنت کے ہوتے ہوئے بھی تواضع کو اختیار کیے رکھے ، غم زدوں کو تشفی و تسلی دے ، تمام جانوروں سے شفقت سے پیش آئے ، نیکوکاروں پر مہربانی فرمائے ، بدکرداروں کے ساتھ سختی برتے ، حاسد نہ ہو ، کینے سے پرہیز کرے ، جھگڑالو نہ ہو ۔ بادشاہ کے عدل اور رعایا کی دیکھ بھال میں ایک امر یہ بھی شامل ہے کہ وہ کسی وقت بھی اس امر کی اجازت نہ دے کہ اس کے لشکری رعایا کے گھروں میں داخل ہوں یا انھیں کسی قسم کا دکھ پہنچائیں تاکہ رعایا کی عورتیں اور بچے دست دراز اور غیر لوگوں کے ہاتھوں سے محفوظ و مامون رہیں ، تاکہ مسلمان عورتوں پر ، ان کی رغبت و خواہش سے یا زبردستی ہاتھ دراز نہ کریں ، تاکہ ملک اور لشکر زنا کی نحوست سے بچا رہے ۔ اس لیے کہ جو فوج زنا کی مرتکب ہوتی ہے اسے خداوند کریم کبھی فتح و نصرت عطا نہیں کرتا اور دشمن کو اس پر غالب کر دیتا ہے ۔

رعایا پر لشکریوں کے ظلم و ستم کے سلسلے میں یہ روا نہ رکھے کہ وہ رعایا سے کم قیمت پر کپڑے خریدیں یا اس کے عوض کم قیمت کے سکے دیں ۔ علاوہ ازیں رعایا کی طرف سے لشکریوں پر کیے گئے مخفی ظلم و ستم کو بھی پسندیدہ نظروں سے نہ دیکھے ، اور وہ اس طرح کہ جب فوجیوں کو اپنی اہم ضروریات زندگی حد سے زیادہ گراں قیمت پر خریدنی پڑیں ، مثلاً وہ کپڑا جو دس درہم کا ہے وہ مجبوراً بیس بائیس کے بھاؤ لیں ، تو ایسی صورت میں شہر کے حاکم کو حکم دے کہ وہ ہر ہفتے بھاؤ کا جائزہ لیا کرے ، اور ان کی ضروریات کی دیکھ بھال کرے ، اور اگر متعلقہ حاکم ، اپنے خبث کے سبب اسی بہانے سے اپنی اغراض پوری کرے اور لشکریوں کی ضروریات کی طرف توجہ نہ دے تو سب سے پہلے اس کا تدارک کرے تاکہ تمام پیسہ لشکریوں کے ہاتھوں سے نکل کر کاروباری اصحاب کے

پاس نہ چلا جائے اور وہ لوگ اسے دفینوں میں نہ رکھ چھوڑیں ، جس کے نتیجے کے طور پر چاندی خرید و فروخت میں کم ہو جائے اور مسلمانوں کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑے اور یہ امر اختلال کا باعث ہو ۔

سکوں کے بارے میں بھی پوری چھان بین کی جایا کرے اور صرافوں کو ہمیشہ اس بات پر تنبیہ کرتا رہے کہ وہ سکے کی قیمت میں فرق نہ آنے دیں ، اس لیے کہ اس سبب سے عوام کی دولت صرافوں کے ہاتھ آ لگے گی اور سکہ کھوٹا اور کم قیمت ہو کر رہ جائے گا جو ایک بہت بڑے خلل کا باعث ہوگا ۔

شاہ راہوں کو ہر قسم کے خطروں سے محفوظ رکھے ۔ اس سلسلے میں تھانے داروں اور دوسرے گماشتوں کو ہدایات جاری کرے کہ وہ اس معاملے میں سخت قدم اٹھائیں ۔ راستوں میں جو سرائیں محتاجوں اور قافلے والوں کے لیے پڑاؤ کا کام دیتی ہیں ، ان کو آباد رکھے تاکہ راستے ہمیشہ محفوظ اور رواں رہیں ، کیوں کہ عمدہ ، انوکھی اور عجیب و غریب اشیا یہ لوگ دور دور کے شہروں سے لاتے ہیں اور دوسرے شہروں کی خبریں راستوں کے پر امن ہونے ہی کے سبب پہنچتی ہیں ۔ تاجروں کی آمد و رفت زیادہ ہونی چاہیے اور تاجر وہ چیزیں بیچنے کے لیے لائیں جن کی لوگوں کو زیادہ ضرورت ہو ۔

جو بھی عامل اور گماشتے کسی علاقے پر متعین کیے جائیں انھیں اس امر کی تاکید کی جائے کہ جب وہ اپنے علاقوں میں جائیں تو جو بھی غلہ ، خراج اور مراعات وغیرہ وہ حاصل کریں ، وہ باقاعدہ شریعت اور رائج شدہ قانون کے مطابق ہو ، غیر قانونی طور پر اور ظلم و ستم کے ساتھ نہ وصول کریں تاکہ اس وجہ سے رعایا کنگال اور مفلس ہو کر نہ رہ جائے ، کہ یہ بات ملک و سلطنت کی بربادی اور تباہی پر منتج ہوتی ہے ۔

نوشیروان[۵] کے وزیر گویان نے ایک موقع پر اس سے کہا : ”اے بادشاہ ! اپنے عمال کا ہم خیال نہ ہونا کہ اس طرح وہ تیری بادشاہی کو ویران اور تیری رعایا کو فقیر کر دیں گے ۔ ایسی صورت

میں تو ویران سلطنت اور کنگال رعایا کا بادشاہ ہوگا ۔ اس وقت تجھ میں اور دشمن میں کوئی فرق نہ ہوگا ، اس لیے کہ اگر دشمن تیری سلطنت کو ہتھیا لے تو وہ اس سے زیادہ بربادی اور ویرانی نہیں کرے گا ۔"

چناں چہ نوشیروان نے اپنی تمام مملکت میں یہ فرمان جاری کر دیا کہ "میں رعایا کو نظر انداز کر کے اس معاملے میں اپنے کسی عامل کا ہم خیال نہیں بنوں گا کہ وہ اتنا مالیہ حاصل کرے کہ جو لوگوں پر بار اور نا واجب ہو ۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ میری مملکت میں زمین کا ایک چپہ بھی غیر آباد اور ویران رہے ۔ اور اگر آج سے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ میری سلطنت کے فلاں حصے میں زمین کا ذرا سا بھی ٹکڑا بے کار اور غیر آباد پڑا ہے تو وہاں کے والی کو پھانسی پر لٹکانے کا حکم صادر کروں گا ، کیوں کہ مملکت کی ویرانی کا سبب یہ دو باتیں ہیں : اول بادشاہ کا اپنی رعایا پر ظلم و ستم اور دوسرے بادشاہ کی سستی اور کاہلی ، اور یہاں یہ دونوں باتیں نہیں ہیں ، اس لیے کہ مملکت کی ویرانی ہی کے سبب رعایا مفلسی سے دوچار ہوتی ہے ۔"

کہتے ہیں ایک دن حاکم سیستان امیر[۶] خلف احمد گھوڑے پر سوار شکار کو جا رہا تھا ؛ راستے میں ، شہر کے نزدیک ، اس کی نظر زمین کے ایک ویران ٹکڑے پر پڑی تو وہیں ٹھہر گیا ؛ وکیلوں کو بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ یہ کس کی ملکیت ہے ؟ جواب ملا "ایک بیوہ عورت کی جو بے چاری خود بھی اس کی دیکھ بھال کرنے سے عاجز ہے اور اس کا کوئی عزیز بھی نہیں جو اس سلسلے میں اس کا ہاتھ بٹا سکے ۔" امیر بولا "ایک بیوہ کی ملکیت ہے اور اس کا کوئی بھی نہیں جو اس کی دیکھ بھال کر سکے ، اور تم اس کے ہمسائے ہو ؟ اگر تم سے اس کی اتنی بھی مدد نہیں ہوسکتی تو پھر تم سے کس نیکی کی توقع کی جاسکتی ہے ؟ قسم خدا کی اگر تم نے آج ہی اس زمین کو آباد اور اس عورت کی ہمسائگی کا حق ادا نہ کیا ، تو میں تمہیں اسی

جگه تختۂ دار پر لٹکا دوں گا ۔'' امیر خلف اپنے قول کا بڑا پکا تھا ، وہ جو کچھ کہہ دیتا اسے پورا کر کے چھوڑتا ۔ چناں چہ اس کے اسی ڈر سے وکیل نے دیہات کے تمام لوگوں کو طلب کیا اور انھیں سارا ماجرا کہہ سنایا ۔ انھوں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ ہم ابھی اور اسی وقت تمھاری اس پریشانی کو دور کیے دیتے ھیں ۔ یہ کہہ کر انھوں نے پل بھر میں زمین کا وہ ٹکڑا کھود ڈالا اور پھر ہر کوئی اپنے اپنے گھر اور زمین سے پھلوں پھولوں سے لدے ہوئے درخت اور پودے لے آیا ، اور اس طرح اس کے دوسرے روز اس عورت کی ہمسائگی کا پورا پورا حق ادا کیا ۔ امیر خلف بن احمد کو جب اس کی خبر پہنچی تو اس نے وکیل کو طلب کیا اور اسے خلعت سے نوازا ۔ ایسے واقعات ظاہر کرتے ھیں کہ سلاطین کس طرح اپنی رعایا کی دیکھ بھال کیا کرتے تھے ۔

فارس کا بادشاہ ارد شیر بابکان> بڑا منصف و عادل ، سخی اور کم آزار تھا ؛ وہ ایک جگہ کہتا ھے : ''ملک بغیر مردان کار اور لشکر کے قائم نہیں رھتا ، مردان کار کا بغیر مال کے رھنا ناممکن ، مال کا رعایا کے بغیر حاصل ھونا مشکل اور رعایا کا بنا عدل و سیاست کے مرفہ‌الحال اور آسودہ ھونا دشوار ھے ۔''

کہتے ھیں نوشیرواں کے زمانے میں ایک موقع پر کچھ لوگ تین مرتبہ چاندی کے ایک ایک ھزار درم لائے ؛ اصفہان کے خزانچی نے نوشیرواں کو جا کر یہ خبر دی کہ اصفہان میں بہت سا مال لایا گیا ھے ، بہتر ھوگا کہ یہ مال خزانے میں داخل کیا جائے ۔ اس نے جواب دیا ''اس علاقے کے لوگوں نے اس سال کا خراج ادا کر دیا ھے لہٰذا یہ مناسب نہیں کہ ان سے دو مرتبہ خراج لیا جائے ۔ ان سے کہہ دو کہ وہ واپس لے جائیں ۔'' اسے بتایا گیا کہ یہ خراج نہیں ھے بلکہ ایک شخص وفات پا گیا ھے اور چوں کہ اس کا کوئی وارث نہیں ، اس لیے یہ بیت المال کا مال ھے ۔ نوشیرواں نے کہا ''عامل سے کہو اس مال کو اسی شہر میں لے جائے اور ہر ممکن کوشش سے اس کے کسی عزیز کا پتا چلائے ؛ ممکن ھے اس طرح اس کا کوئی وارث مل ھی جائے ؛

اور جب اس جستجو میں کام یابی حاصل ہو تو سارا مال اس شخص کے حوالے کر دیا جائے ۔'' چناں چہ مال کو واپس لے جایا گیا ، کئی روز بڑی سرگرمی سے تلاش جاری رکھی گئی لیکن کوئی وارث نہ ملا ؛ بادشاہ کو اس کی اطلاع دی گئی ، اس نے لکھ بھیجا کہ اس مال کو درویشوں اور مستحق لوگوں میں بانٹ دیا جائے ۔ سرکاری آدمیوں نے چپہ چپہ چھان مارا لیکن کوئی درویش یا مستحق شخص بھی نظر نہ پڑا ؛ چناں چہ اس کی خبر بھی بادشاہ کو پہنچائی گئی ؛ اب کے اس نے یہ لکھا کہ ''یہ پیسہ اسی شہر میں پلوں ، سراؤں اور گھروں کی تعمیر پر صرف کیا جائے اور ہرگز شہر سے باہر نہ لایا جائے ، کیوں کہ جس شہر کی دولت وہاں سے باہر لے جائی جائے گی ، اس شہر کے لوگ کنگال ہو کر رہ جائیں گے ۔ نیز شہر میں تاجروں کا کاروبار کساد بازاری کا شکار ہوگا اور عوام الناس بہت سی پریشانیوں سے دوچار ہوں گے ۔''

بادشاہ پر واجب ہے کہ وہ لشکریوں اور ارباب قلم کے بارے میں پوری پوری احتیاط اور تحقیق و تفحص سے کام لے ۔ کسی ایسے شخص کو فوجی دستوں اور سواروں کا سردار نہ بنائے جس کے آبا و اجداد لشکری نہ رہے ہوں اور نہ انھوں نے کسی بادشاہ ہی کی خدمت کی ہو ؛ اس لیے کہ جس شخص نے اپنے بزرگوں کو مسلح ، گھڑ سوار ، فوجی لباس میں ملبوس اور لڑائی کرتے نہ دیکھا ہو ، وہ ایک اناڑی اور نا تجربہ کار سردار ہوگا اور اس کا کام بڑا بے ڈھب ہوگا ۔ اور جب موقع پڑنے پر میدان کار زار میں اس کا سامنا دشمن سے ہوگا تو وہ اپنی اس نا تجربہ کاری کے سبب اپنے ماہر اور گھاگ دشمن سے مات کھا جائے گا ، اور اس کا اسلحہ اور گھوڑا وغیرہ دشمن کے ہاتھ لگے گا ۔ نتیجتاً دشمن کا رعب و خوف چھا جائے گا ، لشکری بد دل اور ہراساں ہوں گے اور اس طرح بہت بڑے نقصانات وارد ہوں گے ۔

علاوہ ازیں جن لوگوں کے آبا و اجداد اہل قلم اور مختلف محکموں میں ملازم نہ رہے ہوں ، یا ان کے اسلاف نے بادشاہوں اور امرا کی

خدمت گزاری نہ کی ہو ، تو ایسے لوگوں کو اس امر کی اجازت نہ دے کہ وہ کسی قسم کا ادب یا حساب و سیاقت (اکؤنٹس) سیکھیں یا کوئی ہنر حاصل کریں ؛ اس لیے کہ یہ لوگ پھر اسی وسیلے سے محکموں اور عدالتوں کی محرری اور کلرکی اختیار کریں گے اور یوں آہستہ آہستہ ، ایک مدت کے بعد ، نائب بن جائیں گے اور کلیدی عہدوں پر پہنچ جائیں گے ۔

کمینہ لوگوں کی کمینگی ، غلام زادوں اور بھک منگوں کی خباثت ، گھٹیا پن ، شہدے اور لچے لوگوں کی خساست کو پھیلنے کی اجازت نہ دے تاکہ مسلمان رعایا آرام اور سکون کی زندگی بسر کر سکے ، کیوں کہ جب یہ لوگ برسر عمل آتے ہیں تو بادشاہ کا کام برباد ہو کر رہ جاتا ہے ، عوام کی اولاد اور شرفا کے بچے بے کار اور معطل ہو کر رہ جاتے ہیں اور ننگ و عار کے سبب انہیں ان کی دوستی قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے ۔ ایسے لوگ اپنی کم ظرفی اور نالایقی کے سبب کسی بھی معاملے میں پورے نہیں اتر سکتے ۔ یہ بادشاہوں کو مروت و بخشش اور دست گیری کرنے اور انعام و خیرات دینے سے باز رکھتے ہیں ۔ خود کو یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے ناصح مشفق ہوں ، اور چاپلوسی ، کنجوسی اور حیلہ گری کو دن رات اختیار کیے رہتے ہیں ۔ اسی وجہ سے یہ شرفا ، بزرگوں اور ان کے فرزندوں ، خدمت گاروں اور خواص پر زیادتی کرتے رہتے ہیں ۔ سلطنت کی تباہی ، مملکت کی بربادی اور لوگوں کی تباہ حالی کا باعث یہی لوگ ہوتے ہیں ۔ یہ لوگ معمولی سے اقتدار پر بے حد مغرور ہو جاتے اور ناقابل حصول چیزوں کی خواہش اور لالچ کرتے ہیں ۔ اور اگر ایسی اشیا تک ان کی رسائی نہ ہو سکے تو بہت جلد کفران نعمت پر اتر آتے ہیں ، یہاں تک کہ ملک کے دشمنوں کی طرف مائل ہو کر ان کے حضور میں التجا کرتے ہیں اور اپنے ملک کے اہم بھید معلوم کر کے دشمن کو ان سے آگاہ کرتے اور اسے اپنے ملک پر حملہ کرنے کی ترغیب دلاتے ہیں ۔ اگر انہیں کسی سے ذرا سی بھی تکلیف پہنچ جائے تو اس سے شدید انتقام لیتے ہیں ۔ عوام اور شرفا کے

قتل اور جاہ و مال کا قصد کرتے ہیں اور اپنی اس بدکرداری پر نادم ہونے کی بجائے الٹا فخر کرتے ہیں ۔

کہتے ہیں جب نوشیرواں نے روم پر حملے کا ارادہ کیا تو اس مقصد کے لیے بے شمار فوج فراہم کی ؛ جس وقت روم کی سرحد کے نزدیک پہنچا تو اپنے خزانوں کو پوری طرح پر رکھنے کی خاطر اس نے اپنے ایک خاص آدمی کو طلب کیا اور اس سے کہا کہ ''فوراً فلاں شہر کی طرف روانہ ہو جاؤ ؛ وہاں کے حکام نے ایک جگہ خزانہ دفن کر رکھا ہے ؛ پانچ اونٹ اپنے ساتھ لے جاؤ ، ان پر وہ خزانہ لادو اور اسی دن واپس چل پڑو ۔ یہاں سے اس شہر تک پہنچنے کے لیے قافلے کے واسطے ایک ماہ کی مدت درکار ہے ، تم پندرہ روز میں پہنچو ؛ پہنچتے ہی خزانہ اونٹوں پر لادو اور ادھر کا رخ کرو تاکہ ایک مہینے کے اندر تم یہاں لوٹ آؤ ۔'' خدمت گار آداب بجا لایا اور اجازت لے کر رخصت ہوا ؛ پانچ اونٹ اور کچھ سوار اپنے ساتھ لیے اور سفر کا آغاز کیا ۔ تین راتیں اور تین دن سفر کرنے کے بعد ایک صبح آذربائیجان کے ایک قصبے میں پہنچا ، جہاں اس کا کوئی دوست رہتا تھا ؛ اس کا اتا پتا معلوم کر کے اس کے گھر پہنچا ۔ گھر کیا تھا رئیسوں اور دولت مندوں کا محل تھا ۔ دوست اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوا اور بڑے تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا ۔ پھر خوشی و شادمانی سے بے خود ہو کر ایک پرتکلف ضیافت اس کے اعزاز میں برپا کی جس کے بعد رقص و سرود کی محفل جمی ۔ اس میں دوست احباب نے شرکت کی اور رقاصاؤں اور مغنیوں نے اپنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا ۔ شراب و بادہ کے دور چلے اور خشک و تر پھلوں سے اہل محفل کی تواضع کی گئی ۔ ان سب باتوں اور دوست کے اصرار کے باوجود شاہی خدمت گار نے شراب کو ہاتھ نہ لگایا ، آخر اس نے پوچھا ''اے دوست قدیم اور مہمان عزیز ! شراب سے اس قدر دوری کا سبب کیا ہے ؟'' بولا ''بادشاہ نے مجھے ایک نہایت ہی اہم اور نازک کام پر بھیجا اور اس کے لیے میعاد مقرر کر دی ہے ؛ میں سوچتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر تو میں شراب پیوں اور ادھر اس میعاد کے حکم کا خیال آ کر مجھے

ڈرائے ، جس کے سبب دل میں کراھیت پیدا ھو اور میرے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے ۔'' میزبان بولا ''محفل عیش و نشاط ھمیشہ باقی رھے! اگر خاکسار کو اتنا معلوم ھو جائے کہ آپ کون سے خاص کام پر متعین ھوئے ھیں تو شاید آپ کا عذر قابل قبول ھو ۔ اور اگر وہ کوئی ایسا کام ھے جو یہ خدمت گار سرانجام دے سکے تو میں بسر و چشم حاضر ھوں ۔'' مہمان نے اپنی اور خزانے لاد کر لانے کی تمام داستان بیان کر دی ۔ میزبان نے یہ بات سنی تو کہنے لگا ''دوست مکرم ! اس سلسلے میں خواہ مخواہ پریشان نہ ھوجیے ؛ یہ کام تو بہت ھی سہل ھے ۔ اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ خاکسار کے یہاں کم از کم تین دن ضرور قیام کریں گے اور اس دوران میں داد عیش و نشاط دیں گے تو بندہ پانچوں اونٹ خزانوں سے لاد کر یہیں سے آپ کو واپس بھیج دے گا تاکہ زیادہ مسافت بھی طے نہ کرنی پڑے اور بادشاہ کی خدمت میں بھی آپ جلد پہنچ جائیں ۔ بس آپ ذرا مہلت دیں کہ اس کام کو سرانجام دوں ۔'' شاھی ملازم نے جو یہ سنا تو خوشی سے جامے میں نہ سمایا کہ چلو چھٹی ھوئی ، تین دن ھی کی مسافت میں اپنا کام بن جائے گا ۔ بہت بڑی دولت بھی ھاتھ لگ جائے گی اور شاھی خزانے میں بھی کوئی خلل واقع نہ ھوگا ۔ علاوہ ازیں راستے کی صعوبتوں سے نجات مل جائے گی ۔ چناں چہ اس خیال سے وہ عیش و نشاط اور شراب خوری میں مشغول ھوگیا ۔ جب چند جام چڑھا چکا تو اپنے زمین دار دوست سے کہنے لگا ''تم مال و زر سے لدے ھوئے پانچ اونٹ دے رھے ھو ، کوئی خواھش ھو تو بتاؤ ؟'' وہ بولا ''میری درخواست بہت ھی معمولی اور سہل ھے ۔'' کہا ''بیان کرو؟'' دھقان بولا ''میرا ایک بیٹا ھے ، بہت ذھین ، ھوشیار ، ھنر مند اور خوش نویس ؛ اس نے ھر صنف ادب کا مطالعہ اور اس سے استفادہ کیا ھے ؛ میں چاھتا ھوں کہ بادشاہ سلامت کی طرف سے اس امر کی اجازت مل جائے کہ وہ تمام وہ کام سیکھ لے جو ایک اھل قلم کے لائق ھیں ۔ پھر چند روز تک عدالتوں میں محرری کرے اور یوں وہ آھستہ آھستہ کسی عہدے پر پہنچ جائے ۔'' شاھی خدمت گار نے

جواب میں کہا ''یہ کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے ، جلد ہی بن جائے گا۔'' وہ بولا ''اگر میری یہ درخواست قبول ہو جائے تو میں مال و دولت سے لدے ہوئے پانچ اونٹ اور دوں گا۔ اس کے علاوہ آپ کی خدمت میں بھی کچھ نذرانہ پیش کروں گا۔''

جب مہانی کے دن گزر گئے تو زمین دار نے اونٹوں پر زر و مال لاد کر اپنے دوست کو روانہ کر دیا۔ خدمت گر تیرھویں دن نوشیرواں کے پاس پہنچ گیا اور اسے زمین دار اور اس کی دولت کے متعلق سارا ماجرا کہہ سنایا ، اور ساتھ ہی اس کی درخواست بھی پیش کر دی۔ نوشیرواں نے اسی وقت حکم دیا ''یہ سب کچھ لے جا کر زمین دار کو واپس کردو اور جہاں سے تمہیں خزانہ لانے کو کہا ہے وہیں سے لے کر آؤ۔ آج اگر میں یہ اجازت دے دوں تو کل تمام دھقانوں اور زمین داروں ، حقیر اور کمینے لوگوں کے لڑکے اپنا خاندانی پیشہ چھوڑ کر علم و ھنر حاصل کرنا شروع کر دیں گے؛ پھر عدالتوں کی طرف رجوع کریں اور محرری سیکھیں گے ، یہاں تک کہ ایک دن صاحب منصب ہو جائیں ، اور یوں میری سلطنت میں پست اور نا اھل لوگ برسر اقتدار آ جائیں گے ، جس کے سبب ملک میں بہت بڑی خرابی واقع ہوگی۔'' چناں چہ خدمت گار نے وہ دولت اس زمیں دار کو لوٹا دی اور مذکورہ شہر سے خزانے لے کر واپس ہوا۔

وہ بادشاہ کس قدر بلند ہمت اور تجربہ کار تھا کہ اس نے اس زر خطیر کو قبول نہ کیا اور اس امر کی اجازت نہ دی کہ کوئی ایسا شخص شاہی کاموں کو اختیار کرے ، جس کے آبا و اجداد نے کسی بھی دفتر میں کام نہ کیا ہو ، اس لیے کہ اس سے مملکت میں بہت بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور نا اھل لوگ صاحب عزت بن جاتے ہیں ، جب کہ شرفا نکبت و زوال کا شکار ہو کر اقتدار سے محروم ہو جاتے ہیں۔

(آداب الحرب و الشجاعت (آداب الملوک) ورق ۵۱ تا ۵۳)

حسن نظامی

[قصب الدین ایبک کے معاصر ، تاج المآثر کے مصنف (آغاز تالیف ۱۲۰۵ء ۱۲۰۶ء) تھے۔ ذیل میں اس کتاب کے اقتباس کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کا ذکر کیا ہے]

جہاد میں ملک اور دین کی اعانت کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ شرع کے فتوے اور عقل کی رو سے دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرنا عین واجب اور لازم ہے اور جہاد کی فضیلت قرآن کریم کی نصوص ظاہرہ سے واضح ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے : ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو۱ ۔'' پھر وہ بلند و برتر فرماتا ہے : ''جو لوگ اللہ اور یوم قیامت پر ایمان نہیں رکھتے ان سے لڑو۲ ۔''اسی طرح فرمایا اس ذات برحق نے ''تمام مشرکوں سے لڑو۳ ۔'' نیز اس کا ارشاد ہے : ''اللہ نے ان مجاہدوں کو جو اپنی جان و مال سے جہاد کرتے ہیں ، پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت اور درجہ دیا ہے اور ہر ایک سے بھلائی کا وعدہ کیا ہے ، اور ایک بہت بڑے اجر کے لحاظ سے اللہ نے مجاہدوں کو پیچھے رہ جانے والوں پر فضیلت دی ہے۴ ۔'' سیدالبشر محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے : ''سب سے بہتر شخص وہ ہے جس نے اللہ کی راہ میں اپنے گھوڑے کی لگام تھامی ہوئی ہے ، اور جس طرف سے اسے للکار آتی ہے وہ ادھر مائل ہو جاتا ہے ۔''

عقل و خرد کی اصل کو 'حقیقت' سے متعلق سمجھا گیا ہے اور یہ یقینی اور طے شدہ امر ہے کہ دین و سلطنت کا قیام اور شریعت کی ارجمندی فقط جہاد کے نتائج اور لوازم میں سے ہے اور ملک و ملت کی

رونق و آبادی بھی اسی سے وابستہ ہے ۔ اگرچہ امور مملکت کی تنظیم تلوار کے بغیر ایک کٹھن کام اور زمانے کے احوال کا نظم و نسق قلم کے بغیر ناممکن ہے ، لیکن جب تک تلوار کے ساتھ ملک و سلطنت کی بنیادیں مضبوط و استوار نہ کی جائیں ، جب تک اسلام کے اطراف و جوانب کو دشمنوں اور مخالفوں سے پاک نہ کیا جائے ، جب تک حق و انصاف کے احکام اور قوانین رعایا اور زیر دستوں پر ، کہ پروردگار جل جلالہ کی امانتیں ہیں ، مضبوطی اور استحکام حاصل نہ کریں اور جب تک ظلم اور تعدی کا ہاتھ مسلمانوں کے خون اور اموال سے کوتاہ نہیں ہوتا ، اس وقت تک کسی طرح بھی صاحبان علم و فضل کے فتوے کا قلم ، کہ شرع نبوی کے وارث ہیں ، شان و شکوہ پیدا نہیں کر سکتا ، اور امور مملکت میں ترتیب و تنظیم اور زیب و زینت قائم نہیں رہ سکتی ۔ داناؤں نے اسی سلسلے میں یہ کہا ہے :

ملک را چون قرار خواهی داد　　تیغ را بے قرار باید کرد

(ملک کے قرار کے لیے تلوار کو بے قرار رکھنا ضروری ہے)

اس لیے کہ دین کے مراسم کی پائندگی اور سلطنت کی بنیادوں کا استحکام آپس میں لازم و ملزوم ، اور امور ملت کی تنظیم اور اعمال دولت کی ترتیب ایک دوسرے کے شریک عنان ہیں ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث : ''دین بنیاد ہے اور بادشاہ نگراں ، اور جس کی کوئی بنیاد نہ ہو وہ گر پڑتا ہے اور جس کا کوئی محافظ نہ ہو وہ تلف ہو جاتا ہے ۔'' ان اقوال اور ان کلمات کی پوری پوری تائید و تصدیق کرتی ہے ۔ **اشعار :**

(۱) بدان ای خردمند با آفرین　　برادر بود پادشاهی و دین

(اے دانا شخص جان لے کہ بادشاہی اور دین لازم و ملزوم ہیں)

(۲) نہ بی تخت شاهی بود دین بپای　　نہ بی دین بود پادشاهی بجای

(نہ تو شاہی تخت کے بغیر دین ہی قائم رہ سکتا ہے اور نہ بغیر دین کے بادشاہی برقرار رہ سکتی ہے)

(۳) دو دنیا است بریک دگر بافته   برآورده پیش خرد یافته

(یہ دو دنیائیں ہیں ایک دوسرے میں ملی ہوئی ، جنھوں نے اپنی قیمت عقل سے پائی ہے)

(۴) نه از پادشاهی نیا راست دین   نه بی دین بود شاه را آفرین

(نہ تو بادشاہی کے بغیر دین چلا ہے اور نہ بغیر دین کے بادشاہ ہی کو آفرین ملی ہے)

''دین اور بادشاہ تمہاری آرزوؤں کی ضیافت ہیں جن میں نہ ختم ہونے والی نعمتوں کے فوائد ہیں ۔''

''تنہا دین وضم[۵] پر پڑے ہوئے گوشت کی مانند ہے ، اور تنہا بادشاہ فقط ہڈی ہے جس کی کوئی رگیں نہیں ہیں ۔''

اور قرآن کریم کی بعض آیات میں بھی : ''جس میں نہ تو سامنے سے باطل آ سکتا ہے اور نہ پیچھے سے ۔ وہ دانا اور صاحب تعریف خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے[۶] ۔'' دین کی بقا اور شرع کی فتح مندی کی طرف اشارات ہیں جیسا کہ : ''قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں[۷] '' اور اسی طرح ''وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکوں سے بجھا دیں[۸] لیکن اللہ اپنے نور کا اتمام کر کے رہے گا ۔''

اس قول کی سچائی کی واضح اور روشن دلیل یہ ہے کہ گزشتہ ادوار میں ، جیسا کہ ہمیں مختلف تاریخوں سے پتا چلتا ہے ، جب کبھی دین کے مخالفوں نے بندگان حق سے ٹکر لینے کی کوشش کی اور ان کے ساتھ جنگ و جدل پر آمادہ ہوئے تو حق سبحانہ نے اسلام کے بعض پیروکاروں کو یہ ہمت و توفیق عطا فرمائی کہ وہ جہاد کر کے گم راہی اور فساد کے اس پودے کو جڑ سے اکھیڑ پھینکیں ، اور یہ آیت گویا انہیں کے لیے نازل ہوئی : ''اور (خدا نے) کافروں کی بات کو پست کر دیا ہے ۔'' اسی قسم کے واقعات و معاملات سے ملتا جلتا ایک واقعہ یہ ہے کہ ایزد پاک جل جلالہ نے خداوند عالم[۹] ، سلطان بنی آدم ،

خشکی اور تری کے فرماں روا ، دنیا اور دین کو عزت دینے والے ، اسلام اور مسلمانوں کے فریاد رس ، جن و انس کے لیے پناہ ، مشرق و مغرب میں سایۂ خدا ، اللہ کے دوستوں کے حامی ، خدا کے دشمنوں پر قہر کرنے والے ، دولت کے تاج ، ملت بیضا کے جلال کے غالب ، بلاد کے حامی ، بندوں کے نگہبان ، خلیفہ کے معاون ، مخلوق کی پناہ ، خلافت کے سہارے ، دنیا کے نظام اور بلندیوں کے آسمان ابوالمظفر[۱۰] محمد بن سام بن الحسین ناصر امیر المؤمنین (خدا اس کی سلطنت اور ملک کو تا ابد قائم رکھے اور اس کے حکم اور شان کو دوبالا کرے!) کے عہد سلطنت میں خداوند سلطان معظم[۱۱] صاحبقران عالم ، دین! اور دنیا کے قطب ، اسلام اور مسلمانوں کے رکن ، سلاطین اور بادشاہوں کے لیے پناہ ، کفر اور مشرکوں کے مٹانے والے ، سرکشوں اور بدکاروں پر قہر کرنے والے ، خلیفہ کے لیے صاف دل ، لوگوں کی خوشی ، ملت کے مددگار ، امت کو پناہ دینے والے ، آسمان کی طرف سے تائید یافتہ ، دشمنوں پر فتح دیے گئے ، بلندیوں کے تاج ، خلافت کے بازو ، غازی بادشاہ ، خسرو ہند ، ابوالحارث (شیر درندہ کا باپ) ایبک السلطانی[۱۲] نصرت امیر المؤمنین (خدا اس کی دولت کو پائندہ اور اس کے جھنڈوں کو بلند رکھے!) کو دنیا کے بادشاہوں اور سلاطین عالم میں سے انتخاب کیا ، اور اس کی عقل و دانائی اور مبارک ارادے کو اخلاق کی بزرگیوں کی فہرست اور دنیا کی ترتیب و تنظیم کا قانون بنا دیا ۔ اس کی ہمت بلند کو شریعت کی نشانیوں کے احیا اور سنت کے جھنڈوں کو بلند رکھنے پر مامور و وقف رکھا اور دین و دولت کے دشمنوں کو ملیامیٹ کرنے کے لیے فتح و نصرت کی نشانیوں کو اس کے مبارک جھنڈوں کے قریب کیا تا آنکہ اس نے اپنے مریخ ایسے خنجر کے ذریعے بدخواہوں کے 'نحوست نشان' جسموں کے لیے فرش خاک سے آرام گاہ بنائی اور اپنی آتش فشان تلوار اور سنان 'فتنہ نشان' سے سرزمین ہندوستان کو دشمنوں کے خون دل سے سیراب کیا ۔ شعر :

زمین هند چنان شد که تا بحشر برو   زخون بکشتی ای یابد رونده راه گزار

(ہندوستان کی زمین خون سے اس طرح بھر گئی ہے کہ قیامت تک اس میں چلنے کے لیے کشتی درکار ہو گی)

نھبت من الاعمار ما لو حویتہ
لھنئیت الدنیا بانک خالد[۱۳]

(تو نے اتنی زندگیاں لوٹی ہیں (قتل کیے ہیں) کہ اگر تو انہیں جمع کرتا تو دنیا تجھے مبارک باد دیتی کہ تو غیرفانی ہے -)

اس نے ہر اُس قلعے اور ہر اُس حصار کو کہ جس کی خندق کی انتہا مرکز زمین تک پہنچی ہوئی تھی ، جس کی دیواریں فلک بوس تھیں ، جس کے حد سے زیادہ ناقابل تسخیر ہونے کے سبب بادشاہوں کو اسے فتح کرنے کی خواہش نہ رہی تھی ، اور حادثات زمانہ بھی جس تک رسائی پانے سے عاجز رہے تھے :

''وہ ایک کنواری دلھن تھی ، کسی بھی خواستگار کا ہاتھ اس تک نہ پہنچ سکا -''

بڑے شاہانہ دبدبے اور سلطانی رعب و سطوت سے فتح کیا اور اپنے کوہ پیکر ہاتھیوں کی ٹھوکروں سے اس کی بنیادوں اور ستونوں کو تہس نہس کر دیا اور اُن کی حالت و صورت ''وکان لم تغن بالامس[۱۴]'' کی مانند ہو گئی

دلیل حملۂ پیلان اوست درصف جنگ
بیان 'یوم تسیر الجبال' روز شمار

('قیامت کے دن پہاڑ چل رہے ہوں گے' کا بیان اس کے ہاتھیوں کے صف جنگ میں حملہ کرنے کی دلیل ہے۔)

اس نے بڑے بڑے تاج دار راجاؤں کے سروں کو دار کا تاج بنا دیا اور بت پرستوں کی ایک دنیا کو ہندی تلوار کی آب[۱۵] سے آتش جہنم میں جھونکا اور تیز رفتار عربی گھوڑوں کی مدد سے ان کی کھوپڑیوں کی خاک کو آسمان تک پہنچا دیا ۔

در آفتاب جلال تو مرگ روز وغا
ز آب تیغ تو سر بر زند چو نیلوفر

(تیرے جلال کی دھوپ میں لڑائی کے دن ، موت تیری تلوار کی آب سے نیلوفر کی مانند سر باہر نکالتی ہے -)

دیار کفر میں کلمۂ توحید اور اسلامی طور طریقوں کو جاری و ساری کیا ، بت پرستی اور گم راہی کے دیگر رسم و رواج کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ، بت کدوں اور بت خانوں کی جگہ مسجدیں اور مدرسے تعمیر کیے اور انھیں منبر و محراب سے زینت و آرائش بخشی -

از تیغ او بجاے صلیب و کلیسیا   در دار کفر مسجد و محراب و منبر است
آں جا که بود نعره وفریاد مشرکان   اکنون خروش نعرۂ الله اکبر است[16]

اسلامی خطّوں میں خطبے اور سکے نے اس کے مبارک القاب سے ارزش و آرائش پائی اور اس کی بزرگیوں اور بلندیوں کا شہرہ تمام دنیا پر چھا گیا -

سپیده مهرۂ[17] صیتش چنان دمید جهان
که رخنه خواست شد این ، سر حقه ز آوازش

(تاج المآثر ، صفحه ۹۹ تا ۱۰۰)

قاضی حمیدالدین ناگوری دہلوی

[قاضی حمیدالدین ناگوری خواجہ بختیار کاکی کے مرید تھے ؛ التتمش کے زمانے میں ہوئے ہیں ؛ رسالہ عشقیہ میں واردات قلبی کا شاعرانہ پیرایے میں اظہار کیا ہے ۔]

ظہور عشق

ہیہات! ہیہات! جب اس نے (خدا) یہ چاہا کہ صحرائے ظہور میں محبت کی بساط بچھائے اور دنیا کے باغ میں عاشق و معشوق کی مانند اپنے رخساروں کے پھول سے عشق کا کھیل کھیلے اور 'من و تو' کے ساز پر محبت کے ترانے چھیڑے تاکہ اس نغمۂ دل افروز سے مسحور ہو کر عاشق اس کی شمع حسن پر پروانہ وار قربان ہو جائے ــــ لیکن روح عشاق میں تاب ہجر کہاں ! وہ دنیا کے زندان خانے اور جسم کے پنجرے میں مقید ہونے کو بالکل تیار نہ تھی ــــ تو اس وقت حق سبحانہ نے اس سے یہ وعدہ کیا کہ ہمارا کرم تمھیں فراموش نہ کرے گا۔ لیکن چوں کہ ہمارے اس کام میں بہت بڑی مصلحت ہے ، کہ وصل کی قدر ہجر کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی ، پس جاؤ اور 'صفات' کے گلشن میں 'ذات' کا مشاہدہ کرو ۔ زندگی اور ہماری قدرت کے کارناموں کو بہ غور دیکھو اور ہماری عطا کردہ رنگا رنگ نعمتوں کو اپنے استعمال میں لاؤ اور ہمارا شکر ادا کرو کہ یہ سب کچھ ہم نے تمھاری خاطر اور تمھیں اپنے لیے پیدا کیا ہے ۔ ہم سے اس دوری کے سبب پریشان خاطر نہ ہو اور مطمئن رہو کہ سلسلۂ محبت کو ہم نے 'یحبہم ویحبونہ'[1] کے مطابق استوار اور محکم رکھا ہے ، اور تمھارا ایسا ساتھی بنایا ہے جو کسی بھی حالت میں تم سے جدا نہ ہوگا ، یعنی 'وھو

معدم اینما کنتم۲' اور 'نحن اقرب الیہ من حبل الورید۳' کے مطابق لطف و مہربانی کا جوڑا تمھاری گردن سے نہ اتارا جائے گا ۔ خاموش رهو اور هر لحظه تم همارے ساتھ گفتگو کرو گی یعنی 'فاذکرونی اذکرکم۴ ۔' هر دم خود فراموشی میں جد و جہد کرو یعنی 'اذکر ربک اذا نسیت۵' تاکه هر وقت تم 'مشاهده' کی شراب نوش جان کرتی رهو ۔ دوسرے لفظوں میں ، تمھیں معلوم هو که 'جس طرف تم رخ کرو وهیں الله کا چهره هے۶ ۔'' ''کل من علیها فان ویبقیٰ وجه ربک ذوالجلال و الاکرام۷' کے مطابق همیشه 'دائرۂ جمع' میں مقیم رهو تاکه هر لحظه ساقیٔ باذوق اپنے دست ناز سے شراب عشق کے جام تمھارے حلق میں لنڈھائے یعنی 'و سقهم ربهم شراباً طهورا۸ ۔' پھر تھوڑی هی مدت میں وه وصل کا سلسله بنائے گا اور تم اس 'کثرت' کے سفر سے اپنے اصلی وطن 'وحدت' کو لوٹو گی ، یعنی قطرے کو جو صدف میں چھپایا گیا هے تو محض اس لیے که وه موتی بن جائے اور جب موتی بن جاتا هے تو پھر اس کا صدف میں رهنا مناسب نهیں هوتا ، بلکه اس وقت تو اسے بادشاه کے خزانے میں هونا چاهیے ۔ اور یه جو کها گیا هے 'الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی۹' تو یه اسی بارے میں کها گیا هے ۔

هیهات ! هیهات ! جب وه بیش بها موتی صدف میں آیا تو تیر بلا عین نشانے پر آ کر لگا ، یعنی 'ولقد خلقنا الانسان فی کبد۱۰' ۔ یه کیسا ظهور هے که سراپا حجاب هے اور حجاب بھی کیسا که عین 'ظهور' هے ۔ وه کیسا 'موجود' هے که وجود میں آیا اور وجود بھی کیسا وجود که به یک وقت 'بے شهود' بھی هے اور 'باشهود' بھی ۔ اس کی وحدت بھی عجب وحدت هے که جس کی نمود 'عدد بے حد' میں هے ۔ وه کیسا 'نمودار' هے که عدد میں بھی ایک هی دکھائی دیتا هے ۔ کیسی چیستان هے که اس کا حل کرنا کسی کے بھی بس کا روگ نهیں ، اور کیسا چهره هے که جس کے دیکھنے سے دل کے هوش اڑے جاتے هیں ۔ کیسی ربودگی هے که جس نے نابود کر دیا اور عجب نیستی هے که هستی میں لائی اور عجب هستی هے که 'هو'

ھی 'ھو' ہے اور کیسی باشندگی ہے جو اس میں سمائی ہے۔

(عشقیہ ۔ صفحہ ۲ ، ۳)

عشق حقیقی

عشقی کہ نہ عشق جاودانی ست
بازیچۂ شہوت و جوانی ست

(جو عشق جاودانی نہیں وہ شہوت و جوانی کا کھلونا ہے)

ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والا عشق ، عشق حقیقی ھی ہے ، عشق مجازی نہیں ۔ بلکہ عشق مجازی تو عاشق کو اس بوب لم یزلی سے دور اور مہجور رکھتا ہے ۔ ھاں! مجنوں کہ لیلیٰ کا عاشق ہے ، کل کو لیلیٰ ھی کا طلب گار ھوگا ، خدا کا نہیں ۔ بلکہ کہتے ھیں کہ جب موت کی ھوا نے لیلیٰ کے چراغ حسن کو بجھا دیا اور جان مجنوں کا پروانہ ھجر کی تاریکی میں محصور ھو کر رہ گیا تو وہ پکار اٹھا : ''اس ساری پریشانی و پشیمانی کے ذمہ دار ھم خود ھیں ؛ ھم نے ایسی ھستی سے ، کہ جسے فنا تھی ، دل ھی کیوں لگایا ۔ بس محبوب وھی ہے جو ہمیشہ ھمارے پہلو میں رہے ۔''

دل بروبند کو نمی میرد
آن کہ میرد برو چہ دل بندی

(دل اس سے لگاؤ جسے موت نہیں ہے ؛ اس سے کیا دل لگاتے ھو جسے فنا ہے)

'عشق معنوی' سے مراد عشق مطلق ہے اور 'عشق صوری' سے مطلب عشق مقید ۔ پس عشق مطلق 'ذاتی[۱۱]' اور عشق مقید 'صفاتی[۱۲]' ٹھہرا ۔ جب تک کوئی عشق مطلق اختیار نہیں کرتا ، عاشق حقیقی نہیں کہلا سکتا ۔ اور عشق حقیقی وہ ہے جس میں ھجر و فراق کو قطعاً دخل نہیں ۔ چناں چہ اس کے عاشق کی نظر میں سیاہ و سفید ،خوب و زشت ، مسجد و کنشت اور دوزخ و بہشت سب برابر ھیں اور اس کی نظر میں بجز محبوب کے اور کچھ نہیں ھوتا ۔

محقق همان بیند اندر امل
که در خوب رویان چین و چگل

حسن معنوی عاشق کی نگاہوں سے ایک لحظے کے لیے بھی دور نہیں ہوتا اور محبوب حقیقی ہر لمحہ نئے انداز میں جلوہ گر ہوتا اور ہر آن نئے لباس میں ملبوس ایک نئے حسن کی نمود کرتا ہے:

اگر ہر ساعتی صد بار رخسارش بصد دیدہ
ہمیں بینی، مشو قانع کہ رخسار دگر دارد

(اگر ہر گھڑی سیکڑوں آنکھوں سے سیکڑوں بار اس کا چہرہ دیکھو تو اسی پر قانع نہ ہو جانا کہ ابھی اس کے اور بھی رخسار ہیں)۔

کبھی وہ حسن بے نیاز از سر ناز اپنے چہرے پر نقاب معشوق ڈال لیتا ہے - یعنی عشق کی تلوار ہمیشہ اپنی ہی جان کے درپۓ قتل رہتی ہے کیوں کہ جب وہ 'محبوب' بن جائے تو اس کو نیستی ہے - کبھی محض لطف و کرم سے بہ کمال اشتیاق و مستیٔ تمام 'انا المشتاق الی المدبرین۱۳'' کے مصداق اپنی جانب کھینچتا ہے اور کبھی ایک عجیب انداز سے 'برقعۂ صفات' کو اتار ڈالتا ہے - جس کی کیفیت 'ابرار کا مشاہدہ تجلی اور پردے کے درمیان ہوتا ہے' والی ہے - لیکن عاشق کو دونوں حالتوں میں ذوق حاصل ہوتا ہے، اس لیے کہ جو اس سے ظاہر ہے وہ 'حقیقت' اور 'تجلی' میں غائب ہے - وہ محبوب کے 'مشاہدہ' کی شراب کا مست ہے اور عدم کے پردے، میں 'نابود' ہے - یعنی حیرانی کے ظہور میں اور غائب کے سوز میں، یعنی پردے میں غائب؛ دوسرے لفظوں میں وہ پردوں میں مستور اور اس طرح 'نابود' (غائب) ہو جاتا ہے - چوں کہ اس کی 'ہستی' کا قیام ان حجابات ہی کی موجوگی سے ہے اس لیے اس کی تجلی 'عین ذوق' ہے - اور ذوق کی مستوری عاشق کے نزدیک دونوں صورتوں میں 'ذوق' ہے - اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ 'ہجر کہاں ہے، کیا ہے اور کیوں ہے؟' تو حقیقی عاشقوں کے لیے اس کا سرے سے وجود ہی نہیں

ہے ۔ دراصل اس ہجر سے مراد عشق کی ناسیری ہے ، یعنی عشق بحر نا پیدا کنار میں غوطہ زن ہے ؛ جس قدر بھی اس میں سے نوش کرتا ہے ، اسی قدر اس کی تشنگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے ۔ گویا تشنگی دور ہونے کا نام ھی نہیں لیتی :

دل آرام در ہــر دل آرام جــو
لب از تشنگی خشک بــرطــرف جــو

(محبوب ہر دل میں آرام کا متلاشی ہے ؛ ہونٹ ندی کے کنارے پر بھی اپنی پیاس کی شدت کے سبب خشک ہے ۔)

یعنی سلطان عشق خود کو جس قدر حسین پاتا ہے اسی قدر و خرابی سے دو چار ہوتا ہے اور جس قدر خراب و برباد ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کے حسن میں نکھار آتا جاتا ہے ۔ اس کی یہ کیفیت ازل سے ابد تک ایسی ہی رہے گی ۔

وقتی نشد از دیدن تــو دیــدۂ ما سیر
الحق کہ درین شیوہ چہ نادیدہ گدائیم[۱۳]

(عشقیہ ، صفحہ ۲۰ ، ۲۱)

مولانا منہاج سراج

[قاضی منہاج الدین بن سراج الدین جو ۶۲۴ھ میں وارد ہند ہوئے اور ۶۵۸ھ میں انھوں نے 'طبقات ناصری' مکمل کی، دور شمسی کے اہم مؤرخ ہیں۔ ان کی کتاب اگرچہ ایک عمومی تاریخ ہے لیکن اس کے پانچ طبقات براہ راست پاک و ہند کی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں۔ خصوصاً معزّی فتوحات اور بنگال کی طرف پیش قدمی کی تفصیلات کا نہایت مفید ماخذ یہی کتاب ہے۔]

سلطان معز الدین غوری کی فتوحات

سلطان معزالدین نے غزنی کے گرد و نواح پر قابض ہونے کے بعد اس کے دوسرے سال ۵۷۰ھ میں گردیز کو فتح کر لیا، اور تیسرے سال ملتان پر حملہ آور ہو کر اسے قرامطیوں[1] سے آزاد کرا لیا۔ اسی سال، ۵۷۱ھ، سنقران کے لوگوں نے بغاوت کر دی اور ایک عجیب ہنگامہ و فساد کھڑا کیا۔ آخر ۵۷۲ھ میں اس نے سنقران پر چڑھائی کی اور بہت سے باغیوں کو تہ تیغ کیا۔ روایت ہے کہ سنقرانیوں کے کئی ایک گروہ، جنھوں نے اس ہنگامے میں جام شہادت نوش کیا، قرآن خواں رہے تھے، لیکن چوں کہ وہ فتنہ و فساد کا باعث ہوئے تھے اس لیے ملکی سیاست کی مصلحت نے انھیں یہ دن دکھایا۔

اس فتح کے بعد دوسرے سال سلطان معزالدین نے اوچ اور ملتان کے راستے نہروالہ پر لشکر کشی کی۔ اگرچہ یہاں کا راجا بھیم دیو خرد سال تھا، لیکن اس کے پاس ہاتھی اور ملازم بڑی تعداد میں تھے۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو اسلامی لشکر کو پیچھے ہٹنا

پڑا اور سلطان غازی بے نیل مرام واپس لوٹا ۔ یہ واقعہ ۵۷۴ھ کا ہے ۔

۵۷۵ھ میں فرشور[۲] پر چڑھائی کر کے اسے فتح کیا ۔ اس کے دو سال بعد لاهور کی طرف بڑھا ۔ چوں کہ غزنوی حکومت[۳] کے زوال کے دن شروع ہوچکے تھے اور اس خاندان کی سلطنت کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں ، اس لیے خسرو ملک نے صلح کے طور پر اپنے بیٹے کو اور ایک ہاتھی سلطان کی خدمت میں روانہ کیا ۔ یہ واقعہ ۵۷۷ھ میں رونما ہوا ۔ اگلے سال ۵۷۸ھ میں بادشاہ نے دیول پر لشکر کشی کی اور سمندر کے کنارے پر آباد اس تمام علاقے پر متصرف ہو کر مال غنیمت کے ساتھ واپس آیا ۔ ۵۸۰ھ میں پھر لاہور کا رخ کر کے اس تمام ولایت کو تاراج کیا ؛ واپسی پر قلعۂ سیال کوٹ تعمیر کرایا اور حسین خرمیل کو وہاں متعین کر کے مراجعت کی ۔

جب سلطان غازی واپس چلا گیا تو خسرو ملک نے ہندوستان کے تمام لشکروں اور کھوکھر قبیلے کے مختلف گروہوں کو جمع کر کے سیالکوٹ کا محاصرہ کر لیا ۔ گو اس محاصرے نے بہت طول کھینچا لیکن پھر بھی خسرو ملک کو بے نیل مرام لوٹنا پڑا ۔ سلطان معزالدین (شہاب الدین غوری) اس واقعے کے بعد ۵۸۲ھ میں لاہور کے دروازے پر پہنچا ۔ چوں کہ غزنوی حکومت کے آخری دن آن پہنچے تھے اور سبکتگین کی دولت و سلطنت کا خورشید مائل بہ غروب تھا ، اس لیے قضا و قدر کے منشی نے خسرو ملک کی معزولی کا پروانہ تقدیر کے قلم سے تحریر کیا ۔ خسرو ملک مقابلے کی تاب کھو بیٹھا ۔ آخر صلح کے لیے آگے بڑھا تاکہ سلطان سے ملاقات کرے ۔ جب شہر کے دروازے سے باہر نکلا تو گرفتار ہو کر مقید ہوا ۔ لاہور سلطان کے تصرف میں آگیا جس کے بعد تمام ہندوستان پر سلطان (غوری خاندان) کا قبضہ ہوگیا ۔ اس نے ملتان کے گورنر سپہ سالار علی کرماخ کو لاہور میں متعین کیا اور راقم حروف (منہاج سراج) کے والد بزگوار مولانا سراج الدین منہاج علیہ الرحمۃ ، کہ نادر زمان اور فصیح عجم

تھے ، ہندوستان کی افواج کے قاضی مقرر ہوئے۔ انھوں نے سلطان معزالدین کی خلعت پہن کر بارگاہ لشکر میں علم کی مجلس برپا کی - ان کی کرسی دوسری جگہ اٹھا کر لے جانے کے لیے بارہ اونٹ لگائے گئے - (ان پر اور تمام گزشتہ سلاطین اور بقیہ مسلمان بادشاہوں پر خدا کی رحمت ہو!)

فتح لاہور کے بعد سلطان نے خسرو ملک کو اپنے ساتھ لیا اور غزنین کی طرف مراجعت کی - غزنین سے اسے سلطان اعظم[۴] کے دربار فیروز کوہ میں بھجوا دیا - یہاں سے اسے بلروان کے قلعے میں لے جا کر محبوس کر دیا گیا اور اس کا بیٹا بہرام شاہ سیفرود غور کے قلعے میں نظر بند ہوا - ۵۸۷ھ میں جب سلطان شاہ خوارزمی نے علم بغاوت بلند کیا تو خسرو ملک اور اس کے بیٹے کو شہید کر دیا گیا - (ان سب پر خدا کی رحمت ہو!) اس کے بعد سلطان معزالدین نے اسلامی لشکر اکٹھا کیا اور قلعۂ تبرہندہ پر لشکر کشی کر کے اسے اپنے تصرف میں لے آیا - یہاں قاضی تولک ملک ضیاء الدین بن محمد عبد السلام نساوی تولکی[۵] کو مقرر کیا - یہ قاضی ضیاء الدین راقم حروف (منہاج) کے نانا کے چچا کا بیٹا تھا - قاضی مجدالدین تولکی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی درخواست پر ہندوستان اور غزنین کی افواج میں سے بارہ سو تولکی فوجی چن کر اس کی فوج میں شامل کیے - یہ فوجی اس شرط پر اس قلعے پر متعین کیے گئے کہ وہ آٹھ ماہ تک ، جب تک کہ سلطان غزنین سے واپس آئے ، اس قلعے کی حفاظت کرے گا - لیکن رائے کولہ پتھورا نزدیک آن پہنچا تھا ، سلطان معزالدین اس سے پہلے واپس تراین پہنچ گیا -

ہندوستان کے تمام راجے ، رائے کولہ کا ساتھ دے رہے تھے ؛ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تو سلطان غازی نے نیزہ باندھ کر ایک ہاتھی پر ، جس پر دھلی کا راجا گوبند رائے[۶] سوار تھا ، حملہ کردیا - یہی ہاتھی جس پر اپنے وقت کے حیدر اور رستم ثانی سلطان غازی نے نیزے سے حملہ کیا تھا ، دشمن کی صفوں کے آگے آگے حرکت کر رہا تھا - سلطان نے نیزے کے اس حملے سے گوبند رائے ملعون کے جو اس

هاتھی کی پشت پر سوار تھا ، دو دانت توڑ دیے ۔ اس نے جوابی حملے میں سلطان پر سیخ ماری جس سے اس کے بازو پر بڑا گھرا زخم آیا ۔ سلطان گھوڑے کا منہ موڑ کر واپس ھوا ۔ زخم کی شدت کے سبب اس میں گھوڑے پر بیٹھنے کی سکت نہ رھی ۔ نتیجے کے طور پر لشکر اسلام کو ھزیمت ھوئی اور کسی کی بھی پیش نہ چل سکی ۔ قریب تھا کہ سلطان گھوڑے سے گر پڑے کہ ایک دلیر اور ماھر خلجی؟ سپاھی نے سلطان کو پہچان لیا ۔ وہ آگے بڑھا اور سلطان کے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اسے اپنے پہلو میں لے لیا ؛ گھوڑے کو پچکارا اور میدان جنگ سے باھر لے آیا ۔ جب اسلامی لشکر نے سلطان کو میدان میں نہ پایا تو ان میں ایک ھنگامہ برپا ھوگیا ، اور جس وقت یہ شکست خوردہ لشکر ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں کفار کے تعاقب کا کوئی ڈر نہ تھا تو اچانک وھاں سلطان بھی آ پہنچا ۔ امیروں ، غوری سپاھیوں اور دیگر شناساؤں نے سلطان کو اس خلجی بہادر کے ساتھ دیکھا تھا ، اسے پہچان کر اس کے گرد جمع ھوگئے ۔ نیزہ توڑ کر انھوں نے ایک ڈولی سی بنائی اور اس میں سلطان کے آرام کرنے کی جگہ بنائی اور اسے سروں پر اٹھا کر منزل تک پہنچایا ۔ سلطان کو دیکھ کر لوگوں نے اطمینان کی سانس لی ، اور ایک دفعہ پھر دین محمدی کو سلطان کی زندگی سے تقویت حاصل ھوئی اور منتشر لشکر اس مجاھد سلطان کی قوت حیات سے ایک بار پھر اکٹھا ھوگیا ۔

سلطان نے وھاں سے واپس دیار اسلام کا رخ کیا ؛ قاضی تولک کو قلعۂ تبرھندہ میں چھوڑا ۔ رائے پتھورا نے اس قلعے کا محاصرہ کر کے کچھ اوپر تیرہ ماہ تک لڑائی لڑی ۔ غازی سلطان نے اگلے سال پھر لشکر اسلام جمع کیا اور گزشتہ سال کا انتقام لینے کے لیے ھندوستان کی طرف توجہ کی ۔ اس دعا گو (منہاج) نے ایک معتبر شخص کو ، جس کا لقب معین الدین اور جو بلاد تولک کے صاحبان علم و فضل[۸] میں سے تھا ۔ یہ کہتے سنا کہ ''میں اس لشکر میں بادشاہ کے ساتھ تھا ؛ اس وقت لشکر اسلام ایک لاکھ بیس ھزار مسلح سواروں پر مشتمل تھا ۔'' (ان پر اللہ کی رحمت ھو!)

جب مجاهد سلطان (خدا اس کی قبر کو معطر کرے!) اس لاؤ لشکر کے ساتھ رائے کولہ کے نزدیک پہنچا ، جس نے پہلے ہی صلح و صفائی کے ساتھ تبرہندہ کے قلعے پر قبضہ کرلیا تھا اور ترائن کے حدود میں ڈیرے جمائے بیٹھا تھا ، تو اس نے (سلطان) اپنے لشکر کو ترتیب دیا ۔ قلب[۹] ، ساز و سامان ، جھنڈے ، علامات ، چتر اور ہاتھی چند کوس کے فاصلے پر پیچھے چھوڑے اور صفیں درست کرتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا ۔ سوار برہنہ اور جریدہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور حکم دیا کہ دس دس ہزار تیر انداز سواروں پر مشتمل میمنہ[۱۰] ، میسرہ[۱۱] ، خلف[۱۲] اور قدام[۱۳] ، چاروں طرف سے دشمن پر غلبہ کریں اور جب ملعون دشمن کے سوار ، پیادہ فوج اور ہاتھی حملہ کریں تو تم پیٹھ دکھانا اور گھوڑے دوڑا کر ان کے سامنے سے دور ہو جانا ۔ اسلامی لشکر نے ایسا ہی کیا جس سے کفار عاجز آ گئے ۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح بخشی اور لشکر کفار کو ہزیمت و شکست کا منہ دیکھنا پڑا ۔ پتھورا ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہوا اور بھاگ نکلا لیکن سرستی کے قریب گرفتار ہو کر جہنم رسید ہوا ۔ گوبند رائے (دھلی) لڑائی میں مارا گیا ۔ سلطان نے اس کا سر ان دو ٹوٹے ہوئے دانتوں کی وجہ سے پہچان لیا ۔ بعد ازیں دارالخلافہ اجمیر ، ہانسی ، سرستی اور تمام دیگر علاقے سلطان کے زیر نگیں آ گئے ۔ یہ واقعات اور فتوحات ۵۸۸ھ میں وقوع پذیر ہوئے ۔ سلطان نے قطب الدین ایبک کو قلعۂ کہرام میں مقرر کر کے مراجعت کی ۔

قطب الدین کہرام سے میرٹھ کی جانب آیا ، اسے فتح کیا اور دھلی کے نواح کو بھی اپنے قبضے میں لایا ۔ اسی سال ، ۵۸۹ھ ، میں قلعۂ کول پر تصرف کیا ۔ ادھر سلطان ۵۹۰ھ میں غزنیں سے بنارس اور قنوج کی جانب بڑھا اور چنڈوال کے قریب رائے جے چند کو شکست دی ۔ اس فتح میں تین سو ہاتھی سلطان کے ہاتھ لگے ۔ اس عادل و مجاهد سلطان کی حمایت کے سائے میں (خدا اس کی قبر کو معطر کرے!) اس کے غلام ملک قطب الدین ایبک کو خدائے تعالیٰ نے فتح و نصرت عطا کی ۔ اس نے ممالک ھند کے اطراف کے علاقوں کو فتح کیا ،

چناں چہ نہروالہ ، تھنیکر ، قلعۂ گالیور اور بدایوں وغیرہ تمام ممالک اس کے تصرف میں آ گئے ۔ (طبقات ناصری)

فتح بنگالہ

پانچواں بادشاہ غازی محمد بختیار خلجی لکھنوتی میں : ثقہ لوگوں (ان پر خدا کی رحمت ہو!) کا کہنا ہے کہ یہ محمد بختیار خلجی ، غور اور گرم علاقے کا باشندہ اور بڑا چست ، چالاک ، دلیر ، بہادر ، دانا اور تجربہ کار تھا ۔ اپنے قبیلوں سے غزنیں اور سلطان معزالدین کے دربار میں پہنچا ۔ یہاں اسے 'دیوان عرض[۱۴]' میں محض اس سبب سے قبول نہ کیا گیا کہ 'دیوان عرض' کے افسر کو اس کی ہیئت کذائی اچھی معلوم نہ ہوئی تھی ۔ چناں چہ یہاں سے یہ ہندوستان کی جانب آیا ۔ جب دہلی دربار میں پہنچا تو وہاں بھی اسے ایسی ہی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ؛ ناکام ہو کر دہلی سے بدایوں کی طرف چلا گیا ۔ بدایوں کے مقطع (لوگوں کے دعوے اور معاملے کاٹنے چھانٹنے والا) سپہ سالار ھزبرالدین حسن ارنب کی ملازمت میں اس کی تنخواہ مقرر ہوگئی ۔ کچھ عرصہ بعد وہاں سے اودہ میں ملک حسام الدین اغلبک کی خدمت میں پہنچا ۔ اب اس کے پاس اسلحہ اور گھوڑے وغیرہ بہت اکٹھے ہو چکے تھے اور چوں کہ چند موقعوں پر اس نے اپنی دلیری و جواں مردی دکھائی تھی ، اسے سلہٹ اور سہلی کے علاقے دے دیے گئے ۔ اپنی بہادری اور شجاعت ہی کے سبب اس نے منیر اور بہار کو تاخت و تاراج اور مال غنیمت حاصل کیا ۔ اس طرح اس نے بہت سا اسلحہ ، گھوڑے اور لشکری فراہم کر لیے ، جس کے باعث اس کی جواں مردی اور دولت کی شہرت دور دور تک پھیل گئی ، اور ہندوستان کے اطراف سے خلجی لوگ دھڑا دھڑ اس کے پاس آنے شروع ہوگئے ۔ سلطان قطب الدین نے اس کا شہرہ سنا تو اسے خلعت بھیجی اور انعام و اکرام سے نوازا ۔ جب اسے اس طرح پشت پناہی حاصل ہوئی تو اس نے بہار پر لشکر کشی کی اور اسے تاخت و تاراج کیا ۔ دو ایک سال اسی طرح اس علاقے کے گرد و نواح میں لشکر لیے پھرتا رہا ، تا آں کہ قلعۂ بہار کو اپنے تصرف میں لے آیا ۔

معتبر اشخاص کا کہنا ہے کہ وہ دو سو گھڑسواروں کے ساتھ قلعۂ بہار کے دروازے پر پہنچا اور جنگ شروع کی۔۔۔۔محمد بختیار کی خدمت میں فرغانہ کے دو دانش مند بھائی نظام الدین اور صمصام الدین تھے؛ راقم حروف صمصام الدین سے ۶۴۱ھ میں لکھنوتی میں ملا اور یہ واقعہ اسی سے سنا تھا۔ یہ دونوں بھائی اس وقت ان جاں نثار غازیوں کی فوج میں شریک تھے۔۔۔۔دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پوری قوت و دلیری کے ساتھ خود کو اس قلعے کے دروازے کے کودال میں گرادیا اور اس طرح قلعے کو فتح کر لیا۔ بہت سا مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا۔ اس جگہ کے بیشتر لوگ برھمن تھے جن کے سر منڈے ہوئے تھے۔ یہ لوگ سب کے سب مارے گئے۔ یہاں کتابوں کی بھی کثرت تھی؛ جب مسلمانوں نے کتابوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھی تو انھوں نے ایسے لوگوں کو طلب کیا جو انھیں ان کتب کے معانی و مطالب سے آگاہ کرسکیں، لیکن ایسے لوگ سب کے سب مارے جا چکے تھے۔ معلوم کرنے سے پتا چلا کہ وہ قلعہ اور شہر، سب کا سب، مدرسہ تھا۔لفظ 'بہار' ھندی لغت میں مدرسے کے معنی میں استعمال ھوتا ھے۔ اس فتح کے بعد محمد بختیار بہت سا مال غنیمت لے کر واپس لوٹا اور سلطان قطب الدین کی خدمت میں حاضر ھوا۔ سلطان نے اسے اعزاز و اکرام سے نوازا۔

جب بختیار کی دلیری اور فتح مندی کا چرچا پھیلا اور درباری امرا کو اس بات کا علم ھوا کہ سلطان قطب الدین نے اسے انعام و اکرام سے نوازا ھے تو ان کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑک اٹھی۔ چناں چہ انھوں نے ایک محفل نشاط میں طعن و تشنیع کے طور پر اس پر کچھ پھبتیاں کسیں۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ (سلطان نے) اسے قصر سفید میں ھاتھی سے لڑنے کو کہا۔ بختیار نے ھاتھی کی سونڈ پر ایک ایسا گرز مارا کہ وہ بلبلا کر بھاگ نکلا۔ اس نے ھاتھی کا تعاقب کیا۔ جب سلطان نے اس کی یہ دلیری دیکھی تو اسے اپنی طرف سے انعام دیا۔ پھر سلطان ھی کے حکم پر امرا نے اسے اتنا انعام و اکرام دیا کہ احاطۂ تحریر سے باھر ھے۔ اس نے بھی اسی مجلس میں وہ تمام

دولت پاؤں میں پھینک دی اور بعد میں لوگوں میں بانٹ دی اور سلطان کی ذاتی خلعت لے کر واپس ہوا ۔ یہاں سے پھر بہار کی طرف نکل گیا ۔ اطراف لکھنوتی ، بہار اور بنگ ، کامرود کے کفار کے دلوں پر اس کا رعب و دبدبہ پوری طرح بیٹھ گیا ۔

با وثوق راویوں کے مطابق جب ملک محمد بختیار (رحمۃ اللہ علیہ) کی دلیری ، جنگوں اور فتوحات کی خبر راجا لکھمینہ تک پہنچی ، جو ایک بہت بڑا راجا اور ۸۰ سال سے تخت نشین تھا اور اس کا پایۂ تخت نودیہ تھا ۔ (پیشتر اس کے کہ ہم واقعات کے تسلسل کو جاری رکھیں) ہم اس موقع پر اس راجا کے حالات سے متعلق ایک داستان جو ہم تک پہنچی ہے ، یہاں بیان کرنا چاہتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ جب اس راجا کا باپ اس دنیا سے سدھارا تو اس وقت یہ ماں کے پیٹ میں تھا ۔ چناں چہ تاج اس کی ماں کے پیٹ پر رکھا گیا اور تمام درباری اس کی ماں کے سامنے کمر بستہ کھڑے ہوگئے ۔ ہندوستان کے راجاؤں کے نزدیک اس خاندان کی بہت قدر و منزلت تھی اور وہ اسے ہندوستان کا گویا خلیفہ جانتے تھے ۔ جب لکھمینہ کی پیدائش کا وقت قریب آیا اور اس کی ماں کو وضع حمل کے آثار ظاہر ہوئے ، تو اس نے تمام نجومیوں اور برھمنوں کو اکٹھا کیا تاکہ وہ شبھ گھڑی کو نظر میں رکھیں ۔ سب نے متفقہ فیصلہ دیا کہ اگر یہ بچہ اس گھڑی پیدا ہوگا تو پورے طور پر نحوست کا باعث ہوگا اور سلطنت سے محروم رہے گا ، لیکن اگر اس کے دو گھنٹے بعد اس کی ولادت ہوئی تو ۸۰ سال حکومت کرے گا ۔ جب اس کی ماں نے نجومیوں کی یہ بات سنی تو حکم دیا کہ اسے (ماں) دونوں پاؤں سے باندھ کر الٹا لٹکا دیا جائے ۔ اسے لٹکانے کے بعد نجومیوں کو اس کے قریب بٹھا دیا گیا ، تاکہ وہ مبارک ساعت کو دیکھتے رہیں ۔ جب منحوس گھڑی گزر گئی تو سب نے اس کے وقت ولادت کی آمد پر اتفاق کیا ۔ اب رانی کے حکم سے اسے (رانی کو) نیچے اتار لیا گیا ۔ وہی وقت لکھمینہ کی پیدائش کا تھا ۔ جب وہ باہر آیا تو اس کی ماں شدت تکلیف سے فوراً ہی مر گئی ۔ لکھمینہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا اور اس نے ۸۰ سال حکومت کی ۔ قابل اعتماد

اشخاص کا بیان ہے کہ اس نے کبھی بھی اور کسی پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا ۔ جو کوئی اس سے سوال کرتا ، یہ اسے ایک لاکھ عطا کر دیتا ، جس طرح کہ حاتم زماں سلطان فیاض قطب الدین (خدا اس کی قبر کو معطر کرے!) کیا کرتا تھا ۔ کہتے ہیں کہ اس کے ملک میں کودہ (کوڑی) چیتل کے عوض چلتا ہے ۔ جس کسی کو اسے بہت کم عطا کرنا ہوتا ، اسے ایک لاکھ کوڑی دیتا ۔ (خدا اس کا عذاب کم کرے!)

اب ہم پھر بختیار کے ذکر کی طرف آتے ہیں ؛ تو جب بختیار ، سلطان قطب الدین کی خدمت سے واپس آیا اور اس نے بہار کو فتح کیا اور اس کی خبر راجا لکھمینہ اور اس کے اطراف ممالک تک پہنچی تو سلطنت کے نجومیوں ، برہمنوں اور داناؤں کی ایک جماعت اس کے پاس آئی اور بیان کیا کہ قدیم برہمنوں کی کتابوں میں لکھا ہے کہ: ''اس سلطنت پر ترکوں کا قبضہ ہو جائے گا ؛ سو وہ وقت اب قریب آن پہنچا ہے ۔ ترکوں نے بہار پر قبضہ کر لیا ہے اور اگلے سال لازمی طور پر اس مملکت میں آ دھمکیں گے ۔ بہتر یہی ہے کہ حضور اس معاملے میں موافقت کریں کہ تمام رعایا اس ملک سے کہیں اور ہجرت کر جائے تاکہ ترکوں کے فتنے سے ہم لوگ محفوظ رہیں'' ۔ راجا نے ان سے پوچھا کہ ''کیا تمھاری کتب میں اس شخص سے متعلق ، جو اس مملکت پر قابض ہوگا ، کوئی نشانی بھی ہے ؟'' برہمن بولے ''اس کی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ جب وہ دو پاؤں پر سیدھا کھڑا ہو اور اپنے ہاتھ نیچے لائے تو اس کے دونوں ہاتھ گھٹنوں کے نیچے تک چلے جائیں گے اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اس کی پنڈلیوں کو چھوئیں گی ۔'' راجا نے کہا ''بہتر یہی ہے کہ ہم اپنے قابل اعتماد آدمی بھیجیں جو اس نشانی کی پورے طور پر تحقیق کریں ۔'' راجا کے فرمان پر معتمد بھیجے گئے ؛ انھوں نے اس معاملے میں پوری پوری چھان بین کی اور یہ تمام نشانیاں محمد بختیار کے قد و قامت میں پائیں ۔ جب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ، تو اس علاقے کے بہت سے برہمن اور ساہان

وہاں سے نقل مکانی کر کے سنکنات ، بنگ اور کامرود کے علاقوں میں چلے گئے لیکن راجا لکھمینہ مملکت چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا۔ اس کے دوسرے سال بختیار نے لشکر تیار کیا اور بہار کے راستے وہاں لشکر کشی کی اور اچانک شہر نودیہ کے دروازے پر اس حالت میں آن پہنچا کہ اس کے ساتھ صرف اٹھارہ سوار تھے ؛ باقی کا لشکر اس کے پیچھے آ رہا تھا ۔ جب وہ شہر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے کسی کو بھی کوئی تکلیف نہ دی اور کمال سکون و اطمینان کے ساتھ ، جس سے کسی کو یہ پتا نہ چل سکے کہ یہ محمد بختیار ہے۔بلکہ بہت سے لوگ تو اس گمان میں پڑ گئے کہ یہ لوگ کوئی سوداگر ہیں اور گھوڑے بیچنے آئے ہیں۔وہ راجا لکھمینہ کے محل کے دروازے تک پہنچ گیا ۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے تلوار سونت لی اور لڑائی شروع کر دی ۔ اس وقت راجا دسترخوان پر بیٹھا ہوا تھا ، اور اس کے آگے سونے چاندی کے تھالوں میں حسب سابق قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے کہ ایک دم راجا کے محل کے دروازے اور شہر کے درمیان سے شور اٹھا اور پیشتر اس کے کہ راجا کو اس معاملے کا پتا چلتا ، محمد بختیار اس کے محل اور حرم کے درمیان آ پہنچا ؛ وہ لوگوں کی ایک تعداد تہ تیغ کر چکا تھا ۔ راجا ننگے پاؤں ہی محل کی پچھلی طرف سے بھاگ نکلا ۔ اس کا تمام خزانہ ، حرم ، نوکر چاکر ، خواص اور اس کی عورتیں بختیار کے ہاتھ لگے ۔ اس کے علاوہ بہت سے ہاتھی بھی قبضے میں آئے ۔ مسلمان لشکر کو اس قدر مال غنیمت ہاتھ آیا کہ اس کا حیطۂ تحریر میں سمانا مشکل ہے ۔ جب اس کا تمام لشکر آ پہنچا اور وہ پورے شہر پر قابض ہوگیا تو اس نے وہیں قیام کیا ۔ راجا لکھمینہ ، سنکنات اور بنگ کے علاقوں کی طرف نکل گیا جہاں بعد میں وہ دوسری دنیا کو سدھار گیا ۔ اس کی اولاد اب تک بنگ کے ممالک میں حکم راں ہے ۔

جب بختیار نے اس مملکت پر قبضہ کر لیا تو شہر نودیہ کو ویران ہی رہنے دیا اور اس جگہ کو ، جہاں لکھنوتی ہے ، اپنا پایۂ تخت بنا لیا ۔ ان علاقوں کے اطراف پر قابض ہوا اور ہر علاقے

میں اپنے نام کا خطبہ اور سکہ جاری کیا - اور ان اطراف میں اس کی اور اس کے امیروں کی کوششوں کے طفیل مدرسے ، مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں -

(طبقات ناصری

امیر خسرو دہلوی

[امیر خسرو کی اصل شہرت بطور شاعر کے ہے لیکن انھوں نے نثر میں بھی کئی قابل ذکر چیزیں لکھی ہیں ۔ 'خزائن الفتوح' میں عہد علائی کی فتوحات کا ذکر ہے ؛ دیوان غرۃ الکمال کے طویل دیباچے میں شعر و سخن کے متعلق انھوں نے ایسی چیزیں لکھی ہیں جنھیں ہماری تنقید نگاری کا پہلا باب سمجھنا چاہیے ۔ انھوں نے موسیقی میں بھی عملی جدتیں کیں اور اس موضوع پر ان کے خیالات کو ایک تاریخی دل چسپی حاصل ہے ۔]

اعجاز خسروی

تیسرا باب : موسیقی کے اصل و فرع کے بارے میں[1] ۔ مصرع

ہست این ہمہ حرف نسبت موسیقی

حمد : ھو الغفور ! شاہی محفل کے بزم آراؤں کی نوازش[2] نے ، کہ اپنی تری نم[3] سے زہرہ کے چنگ کے ترنم کو بیکار کر دیتے ، دف کی گرمی خیز حرارت سے سورج کو آتش رشک میں جلاتے ، بانسری کے زمزموں سے راحت روح کا زمزم صاحبان ذوق تک پہنچاتے ، اور اپنے گلے کی آگ کے دمدمے سے ارباب عشرت کو دمدم[4] شراب روح پلاتے ہیں اور اپنے دل کش و دل ربا نغموں کی تازگی و طراوت سے اہل رقت کی آنکھوں میں موتیوں کا فرش بچھاتے ، اپنے شیریں سروں کی مٹھاس سے فرشتے کو سرود کے جلاب گیر میں ، شہد میں پھنسی ہوئی مکھی کی مانند پھانس لیتے ہیں ، کبھی اپنے حجازی قولوں[5] سے ، کہ عرب کا ریگ زار ان سے عبیر[6] ہے ، کچھ ایسی حیرت برپا

کرتے ہیں کہ بغداد و مصر کے گویوں کی زبان بھی لکڑی کی مضراب بن کر رہ جاتی ہے ، اور کبھی وہ فارسی غزلوں کے ساتھ ایسے ناخن (مضراب) سے کہ جو نکیسا^۷ ایسے مغنی کے پنجے میں گرفتگی پیدا کر دے ، گرفت لاتے ہیں کہ باربد^۸ ایسے بہت بڑے گویے کی مضراب بھی اس کی انگلی میں الجھ کر رہ جاتی ہے ۔ وہ بادل کے سے ھاتھوں والے جنھوں نے بربط کی خشک ندی میں ایک سمندر رواں کر دیا اور سحر پھونکا ، جو ایسے ھاتھوں کے ساتھ بارش اور بادل کی طرح پانی کو گم اور روانی کو پیدا کرتے ہیں ، اور سمندر مزاجوں نے ، کہ جنھوں نے ورق کو سارنگی کے سہ بحری کاغذ کی طرح دو بحری روش میں رکھا اور جادو کا سا کام کیا کہ اتنی تہ بہ تہ موجوں کے ساتھ بھی انھوں نے ورق نہ اُلٹا :

بجفت سازد و زیر مہین کہیں شان جاے
عــذا المثــل آغــانی بعقدۂ زیــریــن

(اور گانے والوں کی طرح اس نے زیریں عقدے میں مشابہت پیدا کی)

ہمیشہ۹ ھی عا۔ل سلاطین کے سامنے غلط مضرابیں چلائی ہیں اور دھوکا دیا ہے ۔ اور ہمیشہ بیدل درویشوں کے حال پر زباں گیری کرتے ہوئے لٹس بجائی ، اور ان کی جان کو غارت کیا ہے ۔

اگر وہ نیند پیدا کرنے والے ساز کی رگوں کو کھجلائیں تو عشاق کی چشم بیدار کو زمین پر لوٹائیں ۔ اگر رونے والے کے راستوں کو آبیاری کریں تو بوجھل آنکھوں کو پہاڑوں کے چشموں کی طرح ٹپکائیں اور اگر ھنسی لانے والے ساز کے ساتھ ہونٹ کھولیں تو پنجے کے غم ناکوں کے ھاتھوں پر چیونٹیاں باندھتے ہوئے عجب رود (ساز) کی طرح سفید دانت کھولیں ۔ شعر

''خوش بختی ہو گانے والے کے لیے کہ وہ ایک ہی وقت میں مجلس کو رلاتا ، ھنساتا اور آسے سلا دیتا ہے ۔''

ھماری ھنر پسند مجلس کے مختلف طریقوں میں سے ایک یہ ہے کہ

شاهانه لطف و کرم نے ہمارے معانی شناس عارف کی رہنمائی میدان کی جانب کی ۔ میں نے چاہا کہ اس علم کے سرداروں میں سے ہر ایک باریک بال کی طرح اپنے اپنے شعور کی مقدار کے مطابق اس باریک بینی میں ہمارے زبردست نواز کے خزانۂ کار سے مراد حاصل کرے اور خوش ہو ۔

اس خیال کے مطابق مبارک مجلس کے مبارک پرندہ ، یعنی ترمتی خاتون کو ، کہ ندیمۂ خاص ہے ـــــ وہ سلطنت کی مقبولہ ، بزرگی کے احسانات کی مکرمہ ، سلیمانی پرندوں کی شکاری ، بکھرے ہوئے خیالات کو اپنے لطف و کرم سے جوڑنے والی ، فتح مندی کے ناخنوں سے بلبلوں کو زخمی کرنے والی ، صبر و قرار کے چھیننے کے ساتھ عندلیبوں کو قتل کرنے والی ، گانے کے دن شوق کے آئین کے ساتھ عاشقوں کو دوست رکھنے والی اور مشتاقوں کی مغنیہ ہے کہ جس نے ایسی آواز کے ساتھ تمام اوصاف کے ہوتے ہوئے خواہشات کے پرندوں کو شکار کیا ، اور لوگ اس کی انگلیوں کے پوروں کے ہمیشہ صید ہوئے ، جس کی آوازوں کی پرواز ایک دست گاہ[۱۰] ہے کہ جب وہ آواز نکالتی ہے تو عنقا کو اپنے پنجے کی گرفت میں لے آتی ہے اور مضراب کے زخموں سے قمری کے جگر کو چھیلتی ہے ۔ اس کی آواز اور غنا جو بلبلوں کے دل کے لیے باعث رشک ہے ، انھیں (بلبلوں کو) بلبلے کی طرح خون کے آنسو رلاتی ہے ۔ وہ اپنے ہاتوں میں بلبلوں کے ہزار مکر و فریب کو ھاتھ پر سدھائے ہوئے پرندے کی مانند نائے ابریشم کے ساتھ قید کر دیتی ہے ۔ جب چنڈول کی سی نوا نکالتی ہے تو کنجشک[۱۱] کی روح اس کی سارنگی کے گرد چکر لگاتی ہے اور جس وقت وہ فاختہ کی سریں نکالتی ہے تو محمد شاہ مرغک[۱۲] از سر نو زندہ ہو جاتا اور اس کے ھاتھوں پر جان دے دیتا ہے ۔ **شعر :**

’’جب اس کے گانے کی آواز بلند ہوتی ہے تو قریب ہوتا ہے کہ ہوا کے پرندے کھلی فضا سے نیچے گر پڑیں ۔‘‘

(اور یہ علم موسیقی میدان فلک سے بھی زیادہ وسیع ہے ، اس لیے

کہ وہاں صرف نو پردے[۱۳] ہیں اور یہاں بارہ ۔ اس فن کے ماہر دقیقہ شناسوں نے 'موسیقی' سے 'مو[۱۴]' اور بوسلیک[۱۵] سے 'بو' حیلے کے ساتھ حاصل کی) ۔ وہ کامل زماں اس وقت جاہ و مرتبہ کو پہنچی جب اس نے بڑے بڑے سلاطین کی محفلوں میں اکٹھے ملے ہوئے راگوں اور سروں کو، کہ پردۂ گل سے بھی زیادہ آپس میں ملے ہوئے تھے، ایک ہی سانس میں باد صبا کی مانند ایک دوسرے سے بغیر کسی دقت اور زحمت کے جدا کر دیا ، پھر غنچے کی طرح سب کو ملا دیا ۔ اور مضراب ، جو کنگھی کے دندانوں کی طرح موشگاف[۱۶] ہے ، کے بالوں ایسے باریک تاروں کے درمیان ایک ایک بال کو جدا کرکے پھر انہیں آپس میں گوندھ دیا ۔ زہرۂ فلک باوجود اس قدر ماہر فن ہونے کے تین پردوں[۱۷] سے آگے نہ بڑھ سکی لیکن اس زمین کی زہرہ[۱۸] نے بارہ پردوں کو ریشم کی طرح انگلیوں کے پنجے سے پانچ کر دیا ۔ وہ زہرہ تو آسمان پر ستارہ بن کر روشن ہوئی اور اس زہرہ نے اس دنیا میں چوبیس مرتبہ[۱۹] اپنی ہر انگلی سے سو سو فن دکھائے ، یہاں تک کہ کسی میں بھی ذرا سی بھی فرو گذاشت نہ کی ۔ اور بہت سے قسم قسم کے راگوں ، طرح طرح کے نغموں ، رنگا رنگ آوازوں ، مختلف النوع ترانوں اور اونچے سروں کو مرحوم خلیفہ حسینی اخلاق (خدا اسے بہشت کے باغوں میں جگہ دے!) کے سرا پردے میں ہزاروں مرتبہ مقید کیا ۔ اور بیان کے ارادے کے ساتھ سلیمان کی پریوں اور جنوں کو حاضر اور اس مجلس میں داخل ہونے کے لیے تولنے کے موقع پر خفیف ترازو کو ثقیل کیا اور ہمارے سمع مبارک کو بغیر سرود کے اپنے مقبول 'قول' سنا کر روح کو خوش کرنے اور ہیجان پیدا کرنے والی ہوئی ۔ یہاں تک کہ شعر :

> ''جب کہ ہماری دولت کو اکٹھا کیا تو آن کے تمام لوگ اپنے سونے کی جگہ پر سو گئے ، جیسے کہ صبح و شام سوتے ہیں''——

ہم[۲۰] نے شاہانہ نواخت[۲۱] کی طرف راہ[۲۲] دی ۔ دربار اور مملکت کے دور و نزدیک کے مغنیوں کی سرداری کا عہدہ اسے عطا کیا اور

بزرگی کے سمندر کا یہ فرمان جو زمین کی وسعت اور آسمانوں کے دائروں میں جاری و ساری ہے ، نافذ ہوا ، تاکہ وہ عجوبۂ زمان اس عہدے کی ادائیگی میں اس طرح چنگ زنی کرے کہ باخرز[۲۳] اور نہاوند[۲۴] کے مغنی اس کے بلند سروں سے ہاتھ پر ہاتھ ماریں ۔ اصفہان و عراق کے استادان فن اس کے دائیں اور بائیں جانب کی سروں میں ہاتھ پر ہاتھ نہ مار سکیں اور وہ اپنی رعایا کو اس کی طاقت کے مطابق کام سپرد کرے ، تاکہ وہ (گویے) فارسی زبان والوں کو اس طریقے پر سازگار کریں کہ وہ تیز رفتار مضراب کے ساتھ عرب و عجم کے موجدوں کو باوجود ان کی پوری معرفت کے ، رباب کی معروفک[۲۵] کی مانند تاروں کی شکلوں میں لے آئیں ۔ زیر و زبر کے ماہر سازندوں کو باوجود تمام تصنیفات[۲۶] کے ایک ہی غیر مناسب آواز کے ساتھ پیچ اور بل کھانے والے سرود کی طرح زیر و زبر کریں اور ہندوستان کے گویوں کو جو آلاون[۲۷] کے تاروں سے عبدالمومن[۲۸] کو زنار باندھتے ہیں ، اس طریقے پر برانگیختہ کریں کہ ایک ہی دفعہ مرگ پیر[۲۹] کی سی خوشی رونے والوں کے دل میں پیدا کردیں ۔ اور پیکان[۳۰] بجانے والوں ، چہرہ بازوں[۳۱]، عجب رود[۳۲] نوازوں ، ڈھول بجانے والوں اور دوسرے خوشی طلب کرنے والے گویوں کے گروہوں کو جو بے نوائی[۳۳] کی بنا پر پرانے[۳۴] مغنیوں کے چنگ (پنجہ) میں ، کہ اپنے ساز کے سروں کی مانند ہوگئے ہوتے ہیں ، رباب کے ورقوں کو شیریں بیان بنا کر مگس گیر اور مکڑی کے جالے تنتے ہیں (بلکہ وہ ورق بہت کمزوری کے سبب خود مکڑی کی طرح بن جاتے ہیں) اور اپنی دف کو عمدہ طریقے سے بجاتے اور پرانی زین کی پشتک کی مانند بے پوست کی لکڑی رہ جاتے ہیں اور ان کی آواز میں بوڑھے کی کھانسی کی بنا پر جو کہ بلغم دل کی خبر گیر ہوتی ہے ، کوئی دل گیری نہیں رہتی ـــــ اس طرح کردے کہ ان کے ساز ہمارے 'زبان گیر' نقیبوں سے سارنگی کے تاروں کی طرح ، جو لوہے ، پیتل اور چاندی کے ہوتے ہیں ، آزاد رہیں ۔ شعر :

''ہماری مجلس دراز نے ایک نئی آواز نکالی ، اور ان بے نواؤں کو یہ آواز پہنچائی ۔''

برکت والے زمانے میں کسی کو بھی اجازت نہ دے کہ وہ واجب احترام سازوں کو، کہ مضراب ان کے حق میں ایک نوازش[٣٥] ہے بجانے کی خاطر بغل میں لے ، بلکہ احتساب کی بنا پر ان کے اوزاروں وغیرہ پرایسی شکستگی ڈال دے ، جس سے بڑے بھی چھوٹے ہو جائیں ۔ جو کوئی بھی لکڑی کی مضراب کو عود[٣٦] پر لگاتا ہے : ع

''اس کی پیٹھ لکڑی کے زخم سے دوھری ھو جاتی ہے ۔''

''اور ایسے موسم میں جو کوئی گنا گاتا ہے وہ اس طرح گاتا ہے جیسے وہ ھمیشہ گاتا ہے ۔''

وہ بادشاہ کے جشنوں اور ھماری پوشیدہ محفلوں میں ، کہ فرشتوں کی پرواز گاہ ھیں ، ان زھرہ ایسی سریلی زبان رکھنے والے مزمار نوازوں کو حاضر کرتی ہے کہ جن کے ھر ھر تار سے لاکھوں 'تناتن' کرنے والے باھر دوڑتے ھیں اور ان کی جان بخش مزمار کے دم سے سارنگی کے پر طنبور کی طرح خوش ھوتے ھیں اور انھیں 'اصول[٣٧]' کا پانی (یعنی مقوی دوا) حاصل ھوتا ہے ۔ **شعر :**

''خدا تعالیٰ اس قوم کو معاف کرے کہ جب وہ گنی ہے تو آن کے گانے سے حشر برپا ھو جاتا ہے اور تم لوگوں کو مست دیکھتے ھو ۔''

اور جب 'مرحمت' ھر بے نیاز گوّیے کی معنی پذیر دست گیر بنتی ہے اور ھر ایک کی مراد اس کی گود میں رکھتے ھوئے اس پر رباب کی طرح آوازہ کستی ہے تو بادشاھی مجلس کے لوازمات کو درم خواھی کا محتاج نہیں رھنے دیتی اور یوں کر دیتی ہے کہ ان کا (گویوں) خرح اپنے چنگ[٣٨] کے خزانے سے ھوتا ہے اور ان کا ھاتھ اپنے بربط کے پیالے کے سامنے بڑے چمچے یا سانپ کے پھن کی طرح دراز ھو جاتا ہے ، ان کی انگلیاں اپنے رباب کے چمڑے کے پیالے پر پھیل جاتی ھیں ، ان کی سانس بغیر اپنی بانسری کے اور کہیں نہیں نکلتی ، وہ بغیر اپنی مسکک[٣٩] کے کسی کو دھوکا نہیں دیتے اور ان کے بہت سے ساز ، جو

اینٹ کا ٹکڑا۳۰ ہیں اور جن کے نقش سے وہ معمولی سا مال و دولت حاصل کرتے ہیں :

(لفظ) 'مغنی' 'معنی' کا ہم شکل ہے ، اگر اس میں خست کا تل نہ ہو اور جب وہ تل مغنی کے چہرے سے چلا گیا تو وہ صحیح طور پر 'معنی' ہو گیا ۔''

اور اس شغل کے موافق رباب ، سارنگی ، نائے ، طنبور ، قوال ، خشت ، شہنائی ، بابگک ، مسککک ، سرفی ، دمدمہ ، بتیرۂ ہندی ، دھل غازی ، دھلک زناں ، دھل زن۳۱ اور اس قسم کے جتنے دوسرے ساز لیے جا سکتے ہیں آن سے اور جو کچھ قانونی اور آئینی ہو ، اس سے اپنے آپ کو مسلم اور مشرع سمجھتے ہیں شعر :

''تصرف کرے (یعنی سکھائے) ان تمام سازوں کو اس آواز کی طرح جو بغیر خطا کے موزون و مناسب ہو ۔''

ہم کہتے ہیں کہ دربار اور ممالک محروسہ کے ارباب طرب اس نادرات کے خزانے کو اپنی مصلحتیں جانیں ، اس کے امور کی عزت کو شرعی اور طبعی طور پر اپنے فرائض میں سے سمجھیں ۔ اپنے اصول و فروع کے حاصل سے اس کی مقرر کردہ اور رسمی باتوں کو بغیر کسی ترانہ اور کسی سختی کے اُس کے اور اُس کے کارکنوں کے سپرد کریں ۔ ہر ممکن طریق سے اس کے اقوال اور اعمال کی جانب لوٹیں ، اور اس کی فرماں پذیری میں گردن کو حلقہ بنائیں تا کہ وہ شاہی بخشش و نوازش کے مستحق بن جائیں شعر :

''جو چاہے وہ سماع کو امت احمد کے کانوں کے لیے ہمیشہ کے لیے حرام بنا دے ۔''

یہ بلند احکام (جو اس کے کمال نے زمانے کی خوشی سے لکھے) اس کے بلند فرمان پر ، کہ دنیا کی خوشی اس کی بخشش ہے ، بادشاہوں کے مدد گار نے ،—— جو سلطانوں کی زبان ہے ، جو دولت و دین کا اختیار ہے ، جو بلند رتبہ لوگوں کا پسندیدہ ، دشمنوں کی پیشانیوں کو پکڑنے والا ، دربانوں کا امیر ، بہت بڑا نائب اعظم ، بلندیوں کے

فخر کا سردار اور بادشاہوں کے شیروں کا بچہ ہے ۔ ہمیشہ اس کا ورود غنا کے ملک میں رہے ! جو محبت کا بادشاہ ، امیروں کا سردار ، بڑوں کا سر ، سلطنت کا تاج ، خاص مبارک آدمی اور محل کا دربان ہے کہ ہمیشہ اس کے گھر میں خوشی کے نغمے گونجیں !ـــــ شوال کی سات تاریخ (۷۱۶ھ) کو مطربوں کے سردار کے نام لکھے ۔ لحن سے پُر اس ورق ، کہ شادمانی کی راہوں کا میدان ہے ، کا عنوان کمال الزمان بدر الدین (کہ اس کا شہرہ آسمان کی زھرہ تک پہنچے !) کی آراستہ مجلس میں داخل ہو !

حمد : ہم حمد کرتے ہیں اس نیک راستے کی طرف راہ نمائی کرنے والے کی ۔ وہی بہت زیادہ سننے والا اور وہی لحن کی اصلاح کرنے والا ہے اور وہ دانا و بینا ہے ۔ **شعر:**

''اے حکیم تیرے عود کے ساز عاشقوں کو رگ دل کی مانند عزیز ہوں!''

جب تک مطرب شراب کی ویرانی میں راہ زنی[۳۲] کرتا رہے ، مضراب چلتی رہے اور بربط ربط[۳۳] کی طرف مائل رہے ، اس وقت تک شادمانی کے نغمے کامرانی کے طریق پر کامل زمانہ ، محفلوں کی زینت یعنی بدرالدولہ والدین[۳۴] ، ـــــ جو بادشاہوں کا ہم بزم ، سلطان کا انیس ، خوشی اور طرب کا سردار ، رنج و الم کا دور کرنے والا ، دلوں کو دوستی کی طرف بر انگیختہ کرنے والا اور آواز[۳۵] کے نکالنے کے موقع پر عاشقوں کو خوشی دینے والا ہےـــــ کے طنبور مسرت میں تمام لطیف اوصاف کے ساتھ رہیں ، بے اصولوں[۳۶] کا حلق اس کے ہاتھ کی ضرب سے ٹوٹا رہے ، اور بد سازوں[۳۷] کے چنگ[۳۸] اس کی دم ساز[۳۹] بانسری سے بندھے رہیں! **شعر :**

''جب تک آسمان پر ستارے رقص کرتے رہیں اس وقت تک تو عیش و نغمہ میں زھرہ کی مانند ہو!''

صاحب قول علما کی برکت اور اہل سماع (فقرا) کی حرمت کے ساتھ شعیب ایسے اصول رکھنے والا سازندہ ، جو ہمیشہ کمال الزمانی

کی نوازشوں کا مست ہے ، ایسی خدمت جو پیٹھ کو دف کے حلقے کی طرح ٹیڑھی کر دے ، اور ایسا سلام جو سر کو سارنگی کی مانند نگوں بنا دے ، ہزاروں نالہ ہائے شوق اور تشنگی کے ترانوں کے ساتھ ادا کرتا ہے اور اس بلبل کی آواز سننے کی تمنا میں خوشی کا باغ بنفشے کی مانند اپنے کان ہوا کی گزر پر رکھتے ہوئے مست صوفیوں کی طرح جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ بیت :

''صبا چون آید از سویت ببالد هر رگم بر تن
چون آن چنگی که ناگاه از کمین بادے زند بروی''

اس نعمت کا حصول خوش ترین حال میں میسر ہو !

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ باخرز اور فرغانہ کی جانب سے چند گویے ، کہ کمال الزمان کے بربط کی آوازیں وہاں ان کے کانوں تک پہنچیں اور ان کو کان پکڑ کر اس طرف کھینچ لائی ہیں ، پہنچے ہیں ۔ انہیں ہم بڑے ماہر فنکار کہہ سکتے ہیں ۔ ان کی ہم راہی میں دو ابوالفرخ گویے ہیں ؛ ایک تو نے نواز اور دوسرا بربط نواز ۔ شعر :

هستند بسکه ره زده و پاے کوفته
هر جاے مانده اند چون موونک رباب

چند روز تک ان فنکاروں کو کسی قسم کی زحمت نہ دی گئی جس سے کہ ہمیں ان کے ہاتھوں کوئی راحت حاصل ہوتی ۔ اب دو ایک روز ہوئے ہیں کہ وہ جو کچھ پردے میں تھا باہر نکال رہے ہیں ۔ ان میں کا ایک گویا ، داؤد جبلی[۵۰] ، تو ایسا ہے کہ اس کا ترنم پہاڑ کو بھی فریاد پر مجبور کر دیتا ہے ۔ شعر :

اگر زو بشنود نالیدن زار
کند ناله بآواز صدا کوه

اور دوسرا جسے شعبان قمری کے نام سے پکارتے ہیں ، ایک ایسا بلبل ہے کہ : شعر

بانگ بلبل چو در سرود آورد
مرغ را از هوا فرود آورد

یہ ماہر بربط نواز ایک ایسے ھاتھ کا مالک ہے جو بادل اور بارش کی مانند ہے ، جس سے کہ پانی برستا ہے اور پھر اس کی سمندر صفت موج سے رود۱۵ خشک میں دو بحر رواں ھو جاتے ھیں ۔ شعر:

هر آنچه ازان کف چون بحر می چکد گهریست
کـه از لـطافت خـود در نـظر نمـی آیـد

وہ اپنی خوش نفس زبان سے صرف مردے ھی کو زندہ نہیں کرتا بلکہ جمادات کو بھی زبان بخش دیتا ہے ؛ ورنہ بے جان لکڑی کا یہ ذرا سا ٹکڑا محض ھوا کے پھونکنے سے کیوں کر جان داروں کی مانند نغمے الاپ سکتا ہے ۔ شعر :

بنگر که آن فسون گر کامل چه می‌دمد
کان چوب همچو آدمیان می کند سخن

حاصل کلام یہ کہ کوئی بھی مشکل ایسی نہیں ہے کہ جو مشکل بھی ھو اور بھلی بھی لگے ، اور پھر موسیقی تو آغاز ھی سے کچھ ایسا دقیق فن ہے کہ شاذ ھی کوئی اس کو مکمل طور پر سیکھ پایا ہے ۔ لیکن ان کی (مذکورہ گویے) باریک بینی نے اس میں بال بھر بھی چوک نہیں کی ۔ البتہ اس سلسلے میں ان کا دعویٰ کچھ اتنا بڑا ہے کہ وہ اونچے مرصع آسمان کے پردے میں نہیں سماتا ۔ ان کا کہنا ہے کہ ھمارے علم کے مقابلے میں کہ جو ارباب عیش و نشاط کے لیے باعث حیرانی ہے ، کون ایسا فرد ہے جو جدت طبع سے دو 'عرصوں' کو ایک دوسرے سے جدا کر سکتا یا ریشم کے تار سے دو 'پردوں' کو اکٹھا سی سکتا ہے ۔ شعر :

ما توانیم که ز ابریشم باریک چو موی
ذیـل دو پـردهٔ بیگانه بهم بـر دوزیم

(ھم بال کی طرح باریک ریشم سے دو مختلف پردوں کے دامن کو اکٹھا سی سکتے ھیں ۔)

جو مغنّی ھمارے سامنے چنگ کے گندم و جو کی باریکیوں کو

تمام و کمال شعر بیز[۵۲] کر لے اس کی روٹی مجلس کی گرمی میں اس قدر پک جائے گی کہ اس کا ھاتھ پھر کبھی بھی مطربوں کے بچے کھچے ٹکڑوں سے آلودہ نہ ھوگا ۔ بیت:

چنگے کہ نخست گندم و جو گیرد
از بیزش ما دقیقۂ تو گیرد

(جو پنجہ کہ پہلے گندم و جو پکڑتا (لیتا) ھے ، وہ ھماری بیزش[۵۳] سے نئی باریکی حاصل کرتا ھے ۔)

ھم سازوں کی صحت اور بیماری سے بخوبی آگاہ ھیں کہ کس طرح چنگ جسم کی سفیدی کے سبب سر جھکا کر رہ جاتا ھے ، بانسری کا شکم کس طرح نفخ[۵۴] کے باعث آواز دینے لگ جاتا ھے ۔ کس طرح مسکک[۵۵] دم پھونکنے سے نالہ کشی میں مصروف اور نوالک[۵۶] سانس کی رکاوٹ سے گلو گیر ھو جاتا ھے ، اور کس طرح دف کی کوفتگی[۵۷] حرارت سے مدقوق[۵۸] ھو جاتی ھے اور ان میں سے ھر ایک کی اصلاح کس طریقے پر کرنی چاھیے ۔ ھم رباب کی نبض پکڑنے اور بربط کی فصد کھولنے کا طریقہ قانون[۵۹] حکمت کے مطابق کچھ اس طرح پا گئے ھیں کہ بیمار کا پورا پورا علاج کر سکتے ھیں ۔ شعر :

کدوی خالی ما را مبین کہ ھست درو
شراب شوق کہ باشد شفای بیماران

(ھمارے کدو کو خالی نہ سمجھو کہ اس میں وہ شراب شوق ھے جو بیماروں کے لیے شفا ھے ۔)

اگرچہ رباب کو کاسہ[۶۰] نے ڈھانپ رکھا ھے اور درمیان میں سوائے جھلی اور رگ کے اور کچھ بھی نہیں ھے ، لیکن جس وقت ھم بوسیدہ کاسے کی طرف ھاتھ بڑھاتے ھیں تو اس وقت دماغ کے پیالوں میں روح کی غذا ڈال دیتے ھیں ، جس کی لذت سے اھل ذوق کے دل پورے طور پر سیر ھو جاتے ھیں ۔ ھمیں ان ربابیوں میں سے نہ جاننا چاھیے جو ھر کسی کے سامنے اپنے ھاتھ کے کاسے کو پھیلا دیتے ھیں

اور جن کا هنسلی پر رکھا هوا هاتھ اپنے رباب کے کاسے کے سامنے کف گیر نہیں بنتا ۔ **شعر :**

آنکه پیش کاسهٔ خود دست داند کفچه کرد
دست پیش کاسهٔ دونان چرا کفچه کند

(جو شخص اپنے کاسے کے سامنے هاتھ کو کفچه کرنا جانتا هے ، وہ کمینے لوگوں کے سامنے هاتھ کیوں پھیلائے) ۔

همارى آواز ، جو بلندی میں زهرۂ فلک کی مضراب سے بهی آگے گزر جاتی هے ، اگرچه بیٹھی هو لیکن هوگی سر تال میں اور پھر نیچی هو جائے گی :

احسنت زهے بلندی گفت
کاواز افتاد فرو بشکست

اس دقیق ، علم کی ، کہ دانایان روم کا مسلک هے ، باریکیاں رباب کے سفید ورق اور ابریشم (تاروں) کے رود[٦١] کی جدول[٦٢] پر بغیر لکھے هی پڑهی جا سکتی هیں ۔ بھلا هندوستانی کنکره زنوں[٦٣] کو کیا معلوم کہ وهی 'عجب رود[٦٤]' ان کے سرود کی هنسی اڑاتا هے ۔ **شعر :**

چون هندو نوازد عجب رود خویش
بخندد عجب رود بر دست او

(جب کوئی اهل هند اپنا عجب رود بجاتا هے تو عجب رود اس کے هاتھوں پر هنستا هے ۔)

اور یه لوگ 'پرده' کی شناخت سے اسی قدر بیگانه هیں جس قدر ایک ترک خاتون پردے کے ڈهانپنے سے ۔ ان هندی گنواروں کو بھلا 'علم اصول' کا کیا علم کہ 'اصول' چار پر کیوں منحصر هے ، 'پرده' کا انحصار باره پر کس لیے اور ابریشم[٦٥] کا چھ پر کیوں هے ؟ اور باقی جو کچھ هے وہ شاخ هے کہ وہ بھی اسی جگه سے سر نکالتی هے ۔ 'اصول ثقیل'[٦٦] کو کون سی ترازو میں تولیں کہ وہ 'خفیف[٦٧]' هو جائے اور 'خفیف' کو کس وزن کے ساتھ بھاری کریں کہ وہ 'ثقیل' هو جائے ؟

'مخالف[۶۸]' کو کس طریقے پر بجائیں کہ 'راست' بیٹھے؟ 'زیر[۶۹] بزرگ' کو کس طرح توڑیں کہ وہ 'زیر خرد' بن جائے اور 'زیرخرد' کو کس جانب کھینچیں کہ وہ 'زیر بزرگ' کی شکل اختیار کرے؟ 'بوسلیک' اور 'نوا[۷۰]' کا، کہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، 'پردہ' کس طریق سے پکڑنا چاہیے کہ ان میں ایک دوسرے میں امتیاز ہو سکے؟ 'ہادی' اور 'حسینی[۷۱]' میں، کہ ایک دوسرے کے قریب ہیں، کیا پیدا کرنا چاہیے کہ وہ ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اور 'نہاوند' کو، کہ عشاق کی زیادہ تر لے اسی میں ہوتی ہے، کس طرح دل کی گہرائیوں سے نکالیں کہ وہ سیدھی روح میں اتر جائے؟ جب 'لحن' مغنی کی بدولت معرض وجود میں آتا ہے تو پھر چنگ و رباب پرگرفت کیوں نہیں ہوتی اور جب بربط سر بندگی[۷۲] کا حامل ہے تو پھر دف کی گردن پر پیچھے سے کس لیے گھونسا رسید کرتے ہیں؟ شعر:

در پردہ راز ما ہر کہ این قدرے؟ داند
شاید اگر او با ما در پردہ سخن راند

(ہمارے راز کے 'پردہ' میں جو کوئی اتنا سا بھی جانتا ہے اسے جچتا ہے اگر وہ ہم سے در پردہ باتیں کرے۔)

پہلے ہی دن جب عجیب قسم کے رود نوازوں نے اپنے 'خرک'[۷۳] کو مکون سے ملایا تھا تو طریق کشاد سے پہلے یہ بات کھول دی گئی تھی کہ "یہ جگہ آپ کا گدھا باندھنے کے لیے نہیں ہے، کیوں کہ اس شہر کے طنبورہ نوازوں کی مضراب ایک ایسا دو رود[۷۴] تیر ہے جو ایک ہی جست میں عرصۂ عراق[۷۵] سے ساحل بار[۷۶] حجاز[۷۷] تک پہنچ جاتا اور ایک ہی چھلانگ میں زاول[۷۸] سے اصفہان تک دوڑتا ہے۔" اس پر وہ کہنے لگے کہ "ہمارے 'خرک' کو خفتہ[۷۹] اور جاماندہ[۸۰] نہ جاننا چاہیے کیوں کہ اس کا آغاز ابریشم[۸۱] اور اس کی بساط حریر[۸۲] بھی تو آخر[۸۳] کسی کام کے لیے ہے۔ شعر:

ہمہ دانند کاں خرکش ہنر نبود ہنر مندان
کہ از ابریشمش بندند و بز کاسہ نشانندش

''ہمارے باجے میں ہر شخص وہ چیز دیکھ سکتا ہے جو نظر نہیں آتی ، لکڑیاں متعدد ہیں اور خمیر ساکن ہے ۔''

اور ہم نے درباری گویوں کا شہرہ بھی سنا ہے جو زیادہ تر سارنگی کے پہلے تار کی مانند گوشہ نشینوں کے سامنے بے کار و عاجز ہیں اور رباب نوازوں کے سر انگشتر کے تار کی مانند بے کار رہ کر انہیں چنگ پکڑنے کا معمولی سا بھی طریقہ نہیں آتا ۔ شعر :

ہر کرا اندر ہنر دستے ست گو بنمای دست
ورنہ ما دستش نمائیم آنچنان کافتد ز پای

(جس کسی کو فن میں دست گاہ حاصل ہے ، اسے کہو کہ وہ اس کا مظاہرہ کرے ورنہ ہم اسے ایسا ہاتھ دکھائیں گے کہ وہ 'پاؤں' سے گر پڑے گا ۔)

الغرض کمال الزمانی کی مجلس کے بارے میں اتنا جاننا چاہیے کہ یہ دعوے دار ، جنھوں نے رباب کے ورق کو اپنے دعوے کا قبالہ اور ساز کے تاروں کو سچے گواہ قرار دیا ہے ، سوائے زخمۂ خاص (خاص مضراب) کے اور کچھ نہیں بجا سکتے ۔ تو اب کچھ ایسی بات بنانی چاہیے کہ مخالف گروہ کو طنبور کے تختہ بند (پٹی) سے زنجیر ڈالی جائے ۔ شعر :

چناں بزخمہ زدن رود بستہ را بنواز
کہ ہم بسازگری خصم را کنی بے ساز

(مضراب چلانے سے رود بستہ کو اس طرح بجا کہ سازگری سے بھی دشمن کو بے اسلحہ کر دے ۔)

وہ چنگ نواز جنھوں نے ایک مدت تک مضراب چنگ کے 'قانون' میں باریک تاروں کو انگشت[۸۴] پیچ کیا اور دعوے کے 'مقام' پر کینہ و دشمنی کے سبب ناخن زنی[۸۵] کی ہے ، وہ طنبور نواز جو اس بات پر انگشت نما[۸۶] ہوئے تھے کہ ''ہم ہر انگلی کی پور پر ہزاروں ہنر رکھتے ہیں اور دو دستہ[۸۷] رباب تو ایک طرف ، یک دستہ[۸۸]

رباب بھی بجا سکتے ہیں''، وہ قوال جو کہتے تھے کہ ''جب ہم دونوں ھاتھوں کو باھم پیٹتے۸۹ ھیں تو بلبل ہزار داستان کو بھی ھاتھ پر سدھائی ھوئی چڑیا کی مانند اپنا دست آموز بنا لیتے ہیں۔''

شعر

وقت ست کنون کہ آن ھمہ ھمدستان
در مالش خصم آستین بر مالند

(اب وقت ہے کہ وہ سب کے سب دشمن کو مٹانے کے لیے آستینیں چڑھا لیں۔)

اور پرندوں کی وہ جماعت جس نے اپنے گلے کی آواز کا دم بھرا ہے اور جس نے اپنی پرواز پر فخر کیا اور کہا ہے کہ :

''حجاز کی راھوں میں جب ہم دیکھتے ہیں تو عراق کی کبوتریاں ہمیں نشے میں نظر آتی ہیں۹۰۔''

ان تمام کو چاہیے کہ وہ امیر کنجشک، محمد شاہ مرغک، محمود چوزہ۹۱ اور دیگر ہزاروں عندلیبوں (جو دھلی کے باغ میں اڑتی رھی ہیں) کی اولاد کی طرح برابری کا دعویٰ کرتے اور ساز بجاتے ھوئے اس طرف سے آئیں اور امیر الطیور۹۲ کی، کہ جس کی اکیلی ذات سیمرغ۹۳ کے مانند ہے، خدمت میں عنقا۹۴ کی سی شکل والے بربط کے ساتھ ان مٹھی بھر مینا۹۵ کا سا منہ رکھنے والوں پر 'خراسانی' باز۹۶ چھوڑیں اور جب تک انھیں اپنا شکار نہ کرلیں باز نہ آئیں۔

شعر

کہ تا درست شود تمریان بالا را
کہ مرغ چون بود اندر بہار ھندوستان

جب انھیں طیرہ۹۷ (شرمندہ) کر دیں اور ان کے پر نوچ لیں تو اس کے بعد فارغبال۹۸ (بے فکر) ھو کر اپنی عزت کو اونچا اڑائیں اور ھمیشہ شادمانی کے سماع (سننا) میں مشغول رھیں (آمین)

تسلیمات : اس طرف سے نوخیز مطرب بچوں نے خدمت کے قد کو ساز کے تاروں کے حلقے کی طرح ھیچ پیچ کے ساتھ بہت زیادہ جھکایا اور اُس طرف کے سازندوں کے سامنے سازندگی (موافقت) کے طور پر معروفک کی مانند 'رباب دو دست' زمین پر رکھی گئی -

(اعجاز خسروی ، صفحہ ۲۷۵ تا ۲۹۱)

امیر حسن سجزی

(ملفوظات حضرت نظام المشائخ)

[امیر حسن سجزی (۱۲۵۷ء–۱۳۳۶ء) نے اپنے مرشد حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات 'فوائدالفواد' کے نام سے مرتب کیے ہیں ۔ یہ کتاب نہ صرف صوفیہ کے ارشاد و ہدایت کا مخزن ہے ، بلکہ جیسا کہ ذیل کے اقتباسات (جن کا یہاں اردو ترجمہ دیا جا رہا ہے) سے ظاہر ہوگا ، ابتدائی عہد کی ادبی ، علمی اور ذہنی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے ۔]

(۱)

لاہور کی تباہی کے بارے میں

لاہور کی تباہی کا ایک اور منحوس سبب یہ تھا کہ انھی دنوں لاہور کے کچھ سوداگر گجرات گئے ۔ اس وقت یہ شہر ہندوؤں کے قبضے میں تھا ۔ مختصر یہ کہ جب ہندوؤں نے ان تاجروں سے کپڑا خریدنا چاہا تو ان لوگوں نے انہیں دگنے دام بتائے ۔ مثلاً جو کپڑا دس درہم کا تھا اس کے بیس اور بیس والے کے چالیس درہم کہے ۔ اسی طرح ہر کپڑے کا بھاؤ اصل سے زیادہ ہی بتایا ، لیکن بعد میں سودے کے وقت انھوں نے اصل بھاؤ پر ہی ، بلکہ بنائے ہوئے نرخوں سے بھی نصف پر کپڑا بیچا ۔ اس ملک کے ہندوؤں کا یہ دستور نہ تھا ؛ وہ جو کچھ بھی فروخت کرتے ، اس کی صحیح صحیح قیمت بتاتے ۔ وہ 'ایک بول' کے قائل تھے ۔ الغرض جب انھوں نے اس قسم کا معاملہ

دیکھا تو ان میں سے ایک نے تاجروں سے پوچھا کہ تم لوگ کہاں سے آئے ہو؟ تاجروں نے جواب دیا ۔ ہم لاہور کے رہنے والے ہیں ۔ اس ہندو نے پھر سوال کیا کہ کیا تمہارے شہر میں سودا اسی طرح ہوتا ہے؟ اس کا جواب انہوں نے اثبات میں دیا ۔ اس پر وہ ہندو بولا ، ''کیا وہ شہر اب تک آباد ہے؟''

''جی ہاں ۔''

ہندو کہنے لگا ''جس شہر میں تجارت اور دکان داری کا انداز اس قسم کا ہو وہ شہر تو آباد نہیں رہ سکتا ۔'' القصہ جب وہ سوداگر گجرات سے واپس لوٹے تو راستے ہی میں انہوں نے سن لیا کہ منگول کافروں نے حملہ کر کے لاہور کو برباد کر دیا ہے ۔

(فوائد الفواد ، صفحہ ۱۱۶ ، ۱۱۷)

(۲)

ایک کلمہ گو ہندو

حاضرین میں سے ایک نے آپ (خواجہ نظام الدین) سے دریافت کیا کہ ''ایک ہندو کلمہ بھی پڑھتا ہے ، خدائے واحد کی عبادت بھی کرتا ہے اور اس کے رسول صلعم کی رسالت کا بھی قایل ہے ، لیکن جوں ہی کہ مسلمان آتے ہیں وہ خاموش ہو جاتا ہے ، تو ایسے شخص کی عاقبت کیسی ہوگی؟'' خواجہ صاحب نے فرمایا ''وہاں اس کا معاملہ خدا سے ہے ؛ وہی جانے کہ اسے بخش دے یا عذاب میں ڈالے ۔'' پھر آپ نے فرمایا کہ ''بعض ہندو یہ جانتے ہیں کہ اسلام سچا مذہب ہے ، لیکن پھر بھی مسلمان نہیں ہوتے ۔''

(فوائد الفواد ، صفحہ ۱۳۵)

(۳)

اسی دوران میں ایک مرید غلام اپنے ساتھ ایک ہندو[۱] کو لیے آن پہنچا ، جسے وہ اپنا بھائی بتاتا تھا ۔ جب یہ دونوں بھائی بیٹھ گئے تو خواجہ صاحب نے اس غلام سے پوچھا کہ ''تیرے اس بھائی کو اسلام

سے بھی کچھ رغبت ہے ؟'' اس نے عرض کی ''میں اس کو اسی مقصد کے تحت یہاں لایا ہوں کہ میرے مخدوم کی برکت نظر سے وہ مسلمان ہو جائے ۔'' آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ؛ فرمایا کہ ''اس قوم کو کبھی کسی کے کہنے کا اثر نہیں ہوتا ، لیکن اگر کسی مرد صالح کی صحبت انہیں میسر آ جائے تو امید ہے کہ اس کی برکت سے مسلمان ہو جائیں ۔''

(فوائد الفواد ، صفحہ ۱۸۲)

(۴)

وعظ

قاضی منہاج الدین کے بارے میں کچھ بات چلی تو آپ نے فرمایا کہ میں ہر سوموار کے دن ان کے وعظ میں جایا کرتا تھا ؛ ایک روز وعظ کے دوران میں انہوں نے یہ رباعی پڑھی[۲] :

لب بر لب دلبران مہوش کردن
و آهنگ سر زلف مشوش کردن

امروز خوش است و لیک فردا خوش نیست
خود را چو خسے طعمۂ آتش کردن

(چاند ایسے چہرے والے حسینوں کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھنا اور زلف پریشان کو ہاتھ میں لینے کا ارادہ کرنا آج تو اچھا ہے ، لیکن کل کے دن خود کو خس کی مانند آگ کا لقمہ بنانا اچھا نہیں ۔)

خواجہ صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ ''جب میں نے یہ اشعار سنے تو مجھ پر بے خودی طاری ہوگئی اور کوئی ایک گھنٹے بعد مجھے ہوش آیا ۔'' بعد میں آپ نے قاضیؒ مذکور[۳] کے متعلق بتایا کہ ''وہ ایک صاحب ذوق انسان تھے ۔ ایک موقع پر انہیں سوموار کے دن شیخ بدر الدین[۳] غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کے گھر بلایا گیا ؛ انہوں نے وعظ سے فارغ ہو کر آنے کا وعدہ کیا ۔ قصہ مختصر وعظ سے فارغ ہو کر وہاں پہنچے ، سماع میں شریک ہوئے اور پگڑی اور لباس وغیرہ جو

اس وقت پہن رکھا تھا ، پارہ پارہ کر دیا ۔'' اس موقع پر آپ نے شیخ بدرالدین غزنوی کی 'آتش گرفت' والی غزل کا ذکر کیا ، اور اس کے دو ایک شعر بھی سنائے ، جن میں سے صرف یہ ایک یاد رہ گیا ہے :

نوحہٴ می‌کرد بر من نوحہ گر در مجمعے
آہ زین سوزم برآمد نوحہ گر آتش گرفت

پھر آپ نے فرمایا کہ قاضی منہاج الدین ، شیخ بدرالدین کو سرخ شیر کہا کرتے تھے ۔

(فوائد الفواد ، صفحہ ۱۹۱ - ۱۹۲)

(۵)

سماع

بروز بدھ ۱۸ - شوال ، سنہ مذکور آپ کی پابوسی کا شرف حاصل ہوا ۔ مولانا برہان الدین بلخی رحمۃ اللہ علیہ کی بزرگی کے متعلق بات چلی تو آپ نے فرمایا ''مولانا برہان الدین[۵] بلخی نے مجھ سے بیان کیا کہ میں[۶] کوئی پانچ سات برس کا ہوں گا ، ایک دن اپنے والد کے ساتھ کہیں سے گزر رہا تھا کہ راستے میں مولانا برہان الدین مرغینانی[۷] مصنف 'ہدایہ' نظر پڑے ۔ میرے والد کنی کترا کر دوسرے کوچے میں چلے گئے اور مجھے ایک جگہ پر کھڑا کر دیا ۔ جب مولانا برہان الدین مرغینانی کی سواری نزدیک پہنچی تو میں آگے بڑھا اور انہیں سلام کیا ۔ انہوں نے بڑی تیز نگاہوں سے مجھے دیکھ کر کہا ''میں اس بچے میں علم کا نور دیکھ رہا ہوں ۔'' میں نے یہ بات سنی تو ان کی سواری کے آگے آگے چل پڑا ۔ انہوں نے پھر اپنی زبان مبارک سے یہ فرمایا کہ ''خدا تعالیٰ مجھ سے یہی کہلواتا ہے کہ یہ بچہ اپنے زمانے میں بہت بڑا عالم ہوگا ۔'' میں یہ سن کر پھر اسی طرح آگے چلتا رہا ۔ تیسری مرتبہ مولانا برہان الدین مرغینانی نے فرمایا کہ ''خدا تعالیٰ مجھ سے یہ کہلواتا ہے کہ یہ بچہ اس قدر عظیم شخصیت کا مالک ہوگا کہ اس کے دروازے پر بادشاہ

آیا کریں گے۔'' خواجہ صاحب نے اس حکایت کو یہاں ختم کیا اور اپنی زبان مبارک سے یہ فرمایا کہ مولانا برہان الدین بلخی بہت زیادہ صاحب علم و کمال ہونے کے علاوہ صاحب صلاحیت بھی تھے۔ چناں چہ وہ[8] اکثر کہا کرتے کہ ''خدائے عزوجل مجھ سے کسی بھی گناہ کبیرہ کی پرسش نہیں کرے گا۔'' اتنا کہہ کر خواجہ سرکار مسکرائے اور فرمایا ''مولانا برہان الدین یہ بھی کہتے کہ البتہ ایک گناہ کبیرہ کی پکڑ ہوگی؛ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون سا گناہ کبیرہ ہے؟ جواب دیا ''سماع، اس لیے کہ سماع میں نے بہت سنا ہے، اور اب بھی اگر کہیں ہو تو میں سننے سے باز نہیں آؤں گا۔''

اس حکایت کے سبب بات سماع پر چل نکلی؛ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اس شہر میں سماع کی رسم قاضی حمید الدین ناگوری[9] نے جاری کی اور قاضی منہاج الدین اس سلسلے میں اول الذکر کے جانشین ثابت ہوئے۔ یہ بھی صاحب سماع تھے اور انھی لوگوں کی وجہ سے سماع کو یہاں استقامت حاصل ہوئی۔ لیکن قاضی حمید الدین کے ساتھ بہت سے مدعیان مذہب الجھتے رہے، اور ان کے ساتھ ان لوگوں کی بہت زیادہ دشمنی کا سبب بھی یہی امر تھا، کیوں کہ ایک موقع پر انھیں (حمید الدین) قلعۂ سفید کے نزدیک سلطان کے گھر میں مدعو کیا گیا؛ شیخ قطب الدین بختیار[10] قدس اللہ سرہ العزیز بھی وہاں موجود تھے۔ بعض بزرگوں نے مولانا رکن الدین سمرقندی کو خبر دی کہ یہاں سماع ہو رہا ہے۔ وہ بہت بڑا مدعی تھا، چناں چہ اپنے چند خدمت گاروں اور متعلقین کے ساتھ گھر سے نکل پڑا تاکہ وہاں جا کر سماع بند کروا دے۔ قاضی حمید الدین کو جب اس بات کا علم ہوا تو انھوں نے مالک خانہ سے کہا کہ تو کہیں جا کر چھپ رہ اور ہر چند تیری تلاش کی جائے تو سامنے نہ آنا؛ اس نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد قاضی حمید الدین نے دروازہ کھول دینے کے لیے کہا؛ دروازہ کھول اور سماع شروع کر دیا گیا۔ رکن الدین سمرقندی جب اپنے حواریوں سمیت گھر کے دروازے پر پہنچا تو مالک خانہ کے بارے میں پوچھ گچھ کی؛ جواب ملا کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ جب اس کی

ملاقات گھر کے مالک سے نہ ہوسکی تو وہ دروازے سے پلٹ گیا۔ خواجہ سرکار اتنی بات سنا کر مسکرا دیے اور فرمایا کہ قاضی حمیدالدین نے بڑی اچھی چال چلی جو مالک خانہ کو غائب کر دیا، کیوں کہ گھر کے مالک کی اجازت کے بغیر گھر میں داخل نہیں ہوا جا سکتا۔ اگر رکن الدین سمرقندی اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہو جاتا تو وہ قابل مواخذہ تھا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جب قاضی حمید الدین کے سماع کا چرچا بہت زیادہ پھیل گیا تو وقت کے مدعیوں نے بڑے فتوے لگائے اور ان کے جواب سنے۔ سب نے یہ لکھا کہ سماع حرام ہے۔ قاضی حمید الدین کے ایک فقیہ کے ساتھ مراسم تھے۔ اس نے بھی شاید اس فتوے کا کوئی جواب لکھا تھا؛ اس کی خبر قاضی صاحب کو ہوگئی۔ اسی دوران میں وہ فقیہ قاضی صاحب کی خدمت میں پہنچا؛ قاضی صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا ”تو نے بھی اس کا جواب لکھا ہے؟“ فقیہ نے شرمندہ ہو کر اثبات میں جواب دیا۔ یہاں پہنچ کر خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اس روز قاضی حمیدالدین نے بھی بڑی دور کی بات کی؛ اس فقیہ سے کہنے لگے ”وہ تمام مفتی جنھوں نے جواب لکھے ہیں میرے نزدیک ابھی ماں کے پیٹ ہی میں ہیں، لیکن تو ابھی ابھی پیدا ہوا اور دودھ پیتا بچہ ہے۔“

انھی باتوں کے درمیان قاضی حمید الدین مارنکلہ کی بات چل نکلی؛ آپ (خواجہ صاحب) نے فرمایا کہ اس (مارنکلہ) نے کہا ”میں شہر میں قاضی حمید الدین ناگوری کی تلاش میں آیا ہوں۔“ جب میں نے پوچھا تو وہ پہلے ہی نقل (مکانی) کر چکا تھا۔ ایک دن اس نے حمید الدین کی تصنیفات اپنے پاس منگائیں اور سلوک پر لکھی ہوئی ان کی کتب کا مطالعہ شروع کیا۔ مطالعہ کر چکنے کے بعد وہ متعلقین کی طرف، جو اس کے گرد جمع تھے، متوجہ ہوا اور کہنے لگا ”تم جو کچھ پڑھتے ہو وہ بھی ان کاغذوں میں ہے اور جو کچھ تم نے نہیں پڑھا وہ بھی انھی میں ہے۔ اور جو کچھ میں نے پڑھا ہے وہ بھی ان کتب میں ہے اور جو کچھ نہیں پڑھا وہ بھی ہے۔“ (فوائد الفواد، صفحہ ۲۳۸ تا ۲۴۱)

امیر خورد کرمانی

[سید محمد مبارک کرمانی المعروف به امیر خورد (وفات ۱۳۶۸ء) بچپن میں سلطان المشائخ (نظام الدین اولیا) کے مرید ہوئے، لیکن انھوں نے فیض شیخ نصیر الدین چراغ دھلی سے پایا۔ بڑھاپے میں چشتی صوفیا کا تذکرہ سیرالاولیا مرتب کیا جو قدیم کتب اور زبانی روایات پر مبنی ہے۔ ذیل کا اقتباس غیاث‌الدین تغلق کے عہد سے ہے، جب علمائے عصر اور حضرت نظام الدین اولیا کے درمیان سماع پر مباحثہ ہوا۔]

محضر سماع

سماع سے لگاؤ رکھنے والے عزیزوں کے شفقت قبول کرنے والے ضمیر پر یہ امر واضح ہو کہ قاضی حمید الدین ناگوری[1] قدس سرہ کے زمانے میں شہر کے علماء ان سے الجھ پڑے، اور انھوں نے سماع کو حرام اور سننے والے کو کافر قرار دے کر اس سلسلے میں بہت سے سوالات شائع کیے اور اس وقت کے بہت سے عالموں نے حرمت سماع پر جواب لکھے۔ راقم حروف نے ان تمام سوالات کو پڑھا ہے؛ بہر حال جیسا سوال کرتے ہیں اسی قسم کا جواب ہوتا ہے۔

حق تعالیٰ نے قاضی حمید الدین کو عشق کامل، بہت زیادہ علم اور ظاہر کرامتوں سے نوازا تھا۔ بدایں ہمہ اس وقت کے صدر جہاں قاضی منہاج الدین جرجانی[2]، جو علم وفضل اور لطافت طبع میں بے نظیر اور صاحب سماع بھی تھے، قاضی حمیدالدین اور دوسرے بزرگوں کے ساتھ کہ اہل عشق و محبت تھے، سماع کیا کرتے تھے۔ چناں چہ اس ضمن میں ہم

کچھ باتیں 'اھل سماع' کے ذیل میں تحریر کر آئے ھیں ۔ قاضی منہاج کے صاحب سماع ھونے کے سبب اس دور کے مدعیوں کو سماع کے بارے میں کسی قسم کی بات کرنے اور دخل اندازی کی جرأت نہ رھی ۔ لیکن جب حضرت سلطان المشائخ[۳] کی بزرگی اور دولت و کرامت کا خورشید اھل دنیا پر نور افگن ھوا ، اور ایسے تمام دور و نزدیک کے شریف و وضیع ، علما ، فضلا ، بڑے بڑے لوگ اور وزرا (جن کی فطرت میں قدرت نے عشق کی چاشنی سمودی تھی) کو سماع کا شوق ھوا اور ایک دلیا میں اس کا غلغلہ مچ گیا ؛ ان کے دلوں میں عشق کے ولولے جاگ جاگ اٹھے ، اور عاشقی و عشق بازی اور سماع کا معاملہ دنیا میں پھر سے تازہ ھوگیا ، اور اس سے گویا دنیا میں بہار آ گئی ، جیسا کہ خواجہ سنائی[۴] فرماتے ھیں :

(۱) زین جا نفیر ریزد و زان جا نوای نای
آنجا خروش عاشق و این جا نشاط یار

(۲) بر ھر طرف بہشتی و در ھر بہشت حور
در ھر چمن نگاری و در ھر نگار یار

(۳) روی زمین ز شاھد گل پر زر و نگار
شاخ شجر چو گوش عـروسان شاھوار

(۴) مرغی بھر درخت و نـوای بھـر طـرف
شاھد بھر طریق و عروسی بھر کنار[۵]

تو مدعیوں کے خار حسد نے ، جیسے کہ یہ موروثی ھو ، نئے سر سے اس معاملے کو چھیڑنا شروع کیا اور ایک مدت تک یہ تعصب ان کے دل میں اس طرح سمایا رھا کہ وہ گویا دیکھنے سے بھی قاصر ھوگئے ۔ یہ عاجز کہتا ھے :

مرا زین عشق فیروزی است مطلق

نیز چوں کہ بیشتر اکابر و علما ، وزرا ، اولیا ، امرا اور مقربین کو یہ علم تھا کہ بادشاہ حضرت سلطان المشائخ کا معتقد اور گرویدہ ھے ، اس لیے اور بھی دم نـہ مار سکتے تھے اور ڈھکی ھوئی دیگ

کے اندر ھی اندر غصے سے جوش مار رھے اور پند و نصائح کو کچھ اس طرح کام میں لا رھے تھے کہ شاید ان سے متاثر ہو کر بادشاہ اس سلسلے میں محضر تیار کرائے ، اور اس طرح وہ (مدعی) اپنے زخم حسد کو زبان کی نوک سے تراوش دے سکیں - ''بار خدایا مجھے حسد کیے جانے والوں میں سے کر اور حسد کرنے والوں میں سے نہ کر!'' اتنے علوم کے عالم ھوتے ھوئے بھی یہ دعا[6] گویا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکل کر ان کے کانوں تک پہنچی[7] ھے -

مختصر یہ کہ سلطان علاءالدین[8] اور قطب الدین[9] کے عہد میں ان حاسدوں کی سوچ بچار کسی کام نہ آئی اور کوئی محضر طلب نہ کیا گیا - جب سلطان غیاث الدین[10] تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا تو شیخ حسام الدین فرجام نے ، کہ جس نے مسافرت کے موزے سلطان المشائخ کے گھر میں کھولے تھے اور جسے سلطان المشائخ نے بڑی شفقت و تربیت سے پرورش کیا تھا ، محض اس لیے کہ اسے شہرت ہو ، بہت زیادہ مجاھدہ کیا اور تکالیف اٹھائیں - لیکن چوں کہ عشق کی سرمستی اور ذوق اسے ودیعت نہ ھوا تھا ، اس لیے اسے شہرت حاصل نہ ھوسکی تھی ؛ اب اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خود کو مشہور کرنا چاھا ؛ چناں چہ مدعیوں نے محضر کے ھنگامے کے لیے اسی کو منتخب کیا -

''اے بے عقل ! اگر تجھے نام ھی پیدا کرنا ھے تو نیک نام بن نہ کہ بدنام -''

قاضی جلال الدین لوانجی حاکم مملکت کا نائب اہل عشق کی دشمنی میں مشہور تھا ؛ دوسرے دانش مندوں نے شیخ زادہ حسام کو اکسا کر اسے اپنا پیشوا بنا لیا تاکہ وہ بادشاہ کے سامنے یہ بیان کرے کہ شیخ نظام الدین مقتدائے عہد ھے ، اور سماع سنتا ھے جو کہ امام اعظم کے مذھب میں حرام ھے - اور اس کام میں جو شرعی طور پر ممنوع ھے ، ھزاروں لوگ اس کی پیروی کر رھے ھیں - چوں کہ

شیخ زادۂ مذکورہ کو بادشاہ کا قرب بھی حاصل ہو چکا تھا ، اس نے یہ باتیں بادشاہ کے گوش گزار کر دیں ۔ سلطان غیاث الدین کو سماع کے جائز یا حرام ہونے کا علم نہ تھا ؛ وہ اس بات سے بہت متعجب ہوا کہ ایسا عظیم بزرگ جو مقتدائے عالم ہے ، کیوں کر ایک غیر شرعی فعل کا مرتکب ہو سکتا ہے ۔ (''ظالموں کے قول سے اللہ کی پناہ! '') بہر حال قاضی حمید الدین ناگوری کے فتوے ، سوال ، اور شرعی کتابوں کی روایتیں بادشاہ کے سامنے پیش کی گئیں ۔ سلطان نے کہا کہ ''چوں کہ علمائے دین نے سماع کو حرام قرار دیا ہے اور اس معاملے میں وہ مزاحم بھی ہوئے ہیں اس لیے سلطان المشائخ کو حاضر کیا جائے اور شہر کے تمام علماء ، اکابر اور صدور بھی طلب کیے جائیں جو محضر تیار کریں تاکہ اس سلسلے میں جو بھی حق بات ہے وہ ظاہر ہو جائے ۔'' ایک بزرگ کا کہنا ہے :

اخترانی کہ بہ شب در نظر ما آیند
پیش خورشید محال است کہ پیدا آیند

همچنین پیش وجودت همه خوبان عدم اند
گرچه در چشم خلائق همه زیبا آیند

(یہ ستارے جو رات کو ہمیں نظر آتے ہیں ، ان کی کیا مجال کہ سورج کے سامنے ظاہر ہو سکیں ؛ اسی طرح تیرے وجود کے سامنے تمام حسین مات ہیں ، اگرچہ لوگوں کی نظر میں وہ تمام حسین ہیں) ؛

الغرض یہ تمام ماجرا جو بادشاہ کے حضور میں پیش آیا تھا ، سلطان المشائخ کے معتقدوں نے ان تک پہنچا دیا ۔ سلطان المشائخ نے اس کی ذرہ بھر بھی پروا نہ کی :

جهان اگر همه دشمن شود بدولت عشق
خبر ندارم ازیشان کہ در جهان هستند

لیکن جو علما کہ صحیح طور پر اپنے وقت کے بہت بڑے صاحبان علم تھے ، وہ حضرت سلطان المشائخ کی خدمت گاری کو فخر سمجھتے تھے ۔ چناں چہ مولانا فخرالدین زرادی[11] اور مولانا وجیہ الدین[12] پائلی

وغیرھم سماع کو جائز قرار دینے کے لیے آیات پیش کرتے اور حضرت سلطان المشائخ کی محفل میں سماع کی اباحت میں دلیلیں لاتے، اس نیت سے کہ محضر سے پہلے پہلے ان پر استحضار[۱۳] حاصل ھو۔ حضرت سلطان المشائخ کہ جن کا باطن مبارک علم لدنی سے دریا کی طرح موج زن تھا، ان کی طرف کوئی توجہ یا التفات نہ فرماتے اور نہ اس سلسلے میں کوئی بات ھی کرتے۔ ان لوگوں کو اس بات پر بڑا تعجب ھوتا، لیکن چوں کہ انھیں سلطان المشائخ کے تبحر پر پورا پورا اعتقاد تھا، اس لیے وہ بے حد خوش تھے۔ بہرحال جب حضرت سلطان المشائخ کو بادشاہ کے حضور میں طلب کیا گیا تو آپ نے اپنے دوستوں میں سے کسی کو بھی نہ بلایا لیکن قاضی محی الدین کاشانی[۱۴] کہ زیور علم سے بہت آراستہ، استاد شہر اور علامۂ دوراں تھا، اور فخر الدین زرادی، جو تمام علوم میں مذکور قاضی سے بڑھ کر اور ایک شریف النفس بزرگ زادہ تھا، دونوں بغیر کسی بلاوے اور پیغام کے سلطان المشائخ کے مریدوں کے ساتھ ساتھ شاھی محل کی طرف ھو لیے۔

بادشاہ کے حضور میں پیشتر اس کے کہ محضر پیش ھو، قاضی جلال الدین نائب حاکم نے سلطان المشائخ کو نصیحت کے طور پر کچھ کہنا شروع کیا، اور ایسے ایسے تعصب بھرے کلمے جو حضرت کی مجلس کے شایاں نہ تھے، منہ سے نکالے اور انھیں برا بھلا کہا۔ سلطان المشائخ بڑی بردباری سے سنتے اور برداشت کرتے رھے، لیکن جب اس نے یہ کہا کہ ''اگر اس کے بعد تم نے کوئی دعوت کی اور سماع سنا تو میں بہ حیثیت حاکم شرع کے تم سے بری طرح پیش آؤں گا'' تو سلطان المشائخ غضب میں آ گئے اور فرمایا کہ ''خدا کرے تم اس عہدے ھی سے معزول ھوجاؤ جس کے بل بوتے پر تم اس قسم کی باتیں کرتے ھو۔'' چناں چہ اس واقعے کے بارہ دنوں کے بعد وہ اچانک معزول کر دیا گیا اور جلد ھی وھاں سے کوچ کر گیا۔

آمدم برسر مطلب؛ تو جب محضر ھوا ـــــ اور محضر بھی کیسا کہ جس میں تمام عالم، بڑے بڑے لوگ، امرا، صدور اور ملوک حاضر تھے، اور بادشاہ وغیرہ تمام کی توجہ اور مہربانی سلطان المشائخ کی جانب

تھی ـــ تو شیخ زادہ حسام الدین نے کہا ''ہماری مجلس میں سماع ہوتا ہے اور لوگ ناچتے اور نعرے بلند کرتے ہیں ۔'' غرض اس نے اس قسم کی بہت سی باتیں کیں ۔ سلطان المشائخ نے اپنا چہرۂ مبارک اس کی طرف کیا اور کہا ''زیادہ باتیں نہ بناؤ ؛ پہلے یہ تو بتاؤ کہ سماع کے معنی کیا ہیں ؟'' شیخ زادہ حسام بولا ''میں نہیں جانتا لیکن علما اسے حرام قرار دیتے ہیں ۔'' سلطان المشائخ نے فرمایا ''جب تم سماع کے معنی ہی نہیں جانتے تو مجھے پھر اس سلسلے میں تم سے کچھ نہیں کہنا ہے اور نہ کہنا ہی چاہیے ۔'' شیخ زادہ جو ابھی تک مدعی بنا بیٹھا تھا ، اب ملزم بن کر رہ گیا اور شکستہ خاطر ہوا :

تراست حجت قاطع بدست یعنی علم
چگونہ پیش رود دعوئ من نادان

بادشاہ حضرت سلطان المشائخ کی دل پذیر باتیں بڑے انہماک سے سن رہا تھا ؛ جب بحث کے دوران میں کوئی ذرا بھی اونچی آواز سے بولتا تو بادشاہ فوراً ٹوک دیتا ''شور نہ کرو ، سنو شیخ کیا کہتے ہیں ۔'' جو علماء موجود تھے ، ان میں سے حمید الدین اور مولانا شہاب الدین ملتانی نے خاموشی اختیار کی اور ان دونوں علمائے دھر نے کسی قسم کی بھی کوئی وحشت بھری بات نہ کہی ، بلکہ مولانا حمید الدین نے ایک موقع پر کہا کہ ''جس رنگ میں حضرت سلطان المشائخ کی مجلس کا تذکرہ یہ دعوے دار کر رہے ہیں ، معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے ۔ میں اس مجلس میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور اس میں میں نے صرف پیر ، مشائخ اور درویش ہی دیکھے ہیں ۔'' اسی دوران میں قاضی کمال الدین بولا ''میں نے ایک جگہ یہ روایت دیکھی ہے کہ ''قال ابو حنیفة السماع حرام والرقص فسق لدیہ...'' (یعنی ابو حنیفہ نے فرمایا کہ گانا سننا حرام اور اس کے ساتھ ناچنا کار بد ہے میرے نزدیک) ۔'' جب اس نے اتنا کہا تو حضرت شیخ نے فرمایا ''اس کے امتناع کا تو حکم نہیں آیا ہے ۔''

یہ بحث چل رہی تھی کہ شیخ بہاؤ الدین[۱۵] زکریا کے نواسے علم الدین داخل ہوئے ؛ بادشاہ نے انہیں خطاب کرتے ہوئے کہا

''تم دانش مند بھی ہو اور مسافر بھی؛ آج میرے سامنے مسئلۂ سماع پر بحث ہو رہی ہے؛ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ سماع حرام ہے یا حلال؟'' مولانا علم الدین بولے ''میں نے اس مسئلے پر 'مقصدہ' نام کا ایک رسالہ لکھا ہے جس میں میں نے وہ تمام دلیلیں جمع کر دی ہیں جو آج تک سماع کے حلال اور حرام ہونے کے بارے میں پیش کی جا چکی ہیں۔ وہ لوگ جو دل سے سنتے ہیں ان کے لیے تو حلال ہے، لیکن جو نفس سے سنتے ہیں ان کے لیے حرام ہے۔'' پھر بادشاہ نے مولانا علم الدین سے پوچھا کہ ''تم بغداد، شام اور روم میں گھومے ہو، کیا وہاں کے مشائخ بھی سماع سنتے ہیں یا نہیں؟ اور اس معاملے میں کوئی انھیں روک ٹوک بھی کرتا ہے یا نہیں؟'' مولانا نے جواب دیا ''تمام شہروں میں بزرگ اور مشائخ سماع سنتے ہیں، بعض تو دف کے ساتھ اور بعض الغوزے وغیرہ کے ساتھ؛ کوئی بھی تو انھیں نہیں ٹوکتا۔ اور مشائخ کو تو سماع شیخ جنید[16] و شبلی[17] سے وراثت میں ملا ہے۔'' بادشاہ نے جب مولانا سے یہ باتیں سنیں تو ساکت رہ گیا اور کچھ نہ بولا۔ مولانا جلال الدین نے کہا ''بادشاہ کو چاہیے کہ سماع کو حرام قرار دے، اور اس سلسلے میں امام اعظم[18] کے مذہب کی رعایت رکھے۔'' اس موقع پر حضرت سلطان المشائخ نے بادشاہ سے کہا ''میری خواہش ہے کہ آپ اس معاملے میں کوئی حکم صادر نہ کریں۔''

بادشاہ نے سلطان المشائخ کا کہنا مان لیا اور کوئی حکم صادر نہ کیا۔ اس معاملے میں دو روایتیں ہیں: ایک تو یہ کہ حضرت سلطان المشائخ کے خلیفہ مولانا فخرالدین زرادی[19] نے سماع کی اباحت سے متعلق اپنے ایک رسالے ''کشف المفتاح من وجوہ السماع'' میں یہ لکھا ہے کہ ''یہی زیادہ صحیح ہے'' اس لیے کہ یہ بزرگ خود اس محضر میں حاضر تھے، اور زیادہ تر انھی نے قاضی کمال الدین صدر جہاں سے بحث کی تھی—اور وہ یہ ہے...... ''یعنی مخالف نے حلت (حلال ہونا) کے قائلین کے دلائل کو جھٹلایا؛ چوں کہ بحث کو حلت اور حرمت (حرام ہونا) کی طرف لے جانا بہ ظاہر باطل نظر آتا تھا،

اس لیے اسے ترک کرنے یا بجا لانے کی اولیت کی بحث چھڑ گئی اور یہ بحث چاشت کے وقت سے سورج ڈھلنے تک جاری رہی۔ پھر اہل مجلس بادشاہ کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوئے''۔۔۔لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ بادشاہ نے حکم دیا تھا کہ ''حضرت سلطان المشائخ سماع سنا کریں اور کوئی بھی انھیں منع نہ کرے، لیکن جو قلندر یا حیدری ہیں یا جو لوگ کہ نفسانی طور پر سماع کرتے ہیں، انھیں اس سے باز رکھا جائے۔'' یہ روایت ضعیف ہے کیوں کہ اس کے راوی اس مجلس میں خود موجود نہ تھے، اور معتبر اور صحیح وہی ہے جو مولانا فخرالدین زرادی نے بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔

انھی دنوں کسی نے حضرت سلطان المشائخ سے دریافت کیا کہ ''کیا اس موقع پر یہ حکم بھی ہوا ہے کہ جو کوئی اپنے مخدوم کی خدمت میں حاضر ہو اور سماع سنے، اس کے لیے حلال ہے؟'' آپ نے فرمایا کہ ''اگر تو یہ حرام ہے تو کسی کے کہنے سے حلال نہ ہوگا، اور اگر حلال ہے تو کسی کے کہنے سے حرام نہ ہوگا۔''

اب ہم مختلف مسئلوں کی طرف رجوع کرتے ہیں؛ مثلاً اسی سماع کو امام شافعی[20] برخلاف ہمارے علماء کے، دف اور شہنائی وغیرہ کے ساتھ جائز قرار دیتے ہیں۔ لیکن اب تو وہی کچھ ہوتا ہے جو حاکم حکم دیتا ہے۔ بہر حال محضر سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے حضرت سلطان المشائخ کو بڑی تعظیم و تکریم کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ لیکن ضیاء الدین[21] برنی نے 'حیرت نامہ' میں لکھا ہے کہ جب حضرت سلطان المشائخ اس محضر کے بعد اپنے گھر آئے تو ظہر کی نماز کے وقت انھوں نے مجھے، مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو[22] شاعر کو اپنے پاس بلایا۔ جب ہم لوگ پابوسی کی سعادت حاصل کر چکے تو آپ نے فرمایا کہ ''دہلی کے دانش مند تو پہلے ہی میری دشمنی اور حسد سے بھرے پڑے تھے، اب انھیں اچھا موقع ہاتھ لگا اور انھوں نے خوب جی کھول کر عداوت کی باتیں کیں۔ اور آج ایک تعجب کی بات یہ دیکھنے میں آئی کہ بحث کے دوران میں انھوں نے حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیثوں کو بھی بالکل نہ سنا، اور یہی

کہتے رہے کہ ہمارے شہر میں حدیث کی نسبت روایت فقہ کو مقدم سمجھا جاتا ہے ۔ اس قسم کی باتیں وہی لوگ کرتے ہیں جنہیں حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں پر اعتقاد نہ ہو ۔ جس وقت بھی حضرت مصطفیٰ صلعم کی کوئی صحیح حدیث پیش کی جاتی تو وہ برافروختہ ہو جاتے اور منع کر دیتے اور کہتے کہ ''یہ حدیث تو شافعی رض دلیل کے طور پر لاتا ہے اور وہ ہمارے علما کا دشمن ہے ۔ نہ تو ہم یہ احادیث سننے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی یہ جانتے ہیں کہ یہ قابل اعتقاد ہیں یا نہیں ۔'' یہ لوگ حاکم کے حضور میں دوسروں پر اپنی فضیلت جتانے کے لیے آتے اور صحیح حدیثوں کے سننے سے اجتناب برتتے ہیں ۔ اور میں نے ایسا کوئی عالم نہ دیکھا نہ سنا کہ جس کے سامنے حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث بیان کی جائیں اور وہ کہے کہ میں نہیں سنتا ۔ میں حیران ہوں کہ یہ کیسا زمانہ آن لگا ہے ! بھلا جس شہر میں اس طرح زبردستی دوسروں پر اپنی فضیلت جتائی جاتی ہو وہ شہر کیوں کر آباد رہ سکتا ہے ۔ تعجب ہے اس کی اینٹ سے اینٹ کیوں نہیں بجتی ! اب جب بادشاہ ، امراء اور عوام شہر کے قاضی اور عالموں سے یہ سنیں گے کہ اس شہر میں حدیث پر عمل نہیں کیا جاتا تو پیغمبر علیہ السلام کی احادیث پر ان کا اعتقاد کس طرح مضبوط رہ سکے گا ۔ اور میں تو اس وقت سے ، جب سے کہ انہوں نے حدیث کے بیان سے روکا ہے ، ڈر رہا ہوں کہ جس بد اعتقادی کا مظاہرہ شہر کے علما نے کیا ہے ، کہیں اس کی نحوست سے آسمان سے بلاؤں ، مصیبتوں ، قحط اور وباؤں کا نزول نہ ہو ۔''

چناں چہ اس واقعے کے چوتھے سال ان تمام علماء کو جو اس محضر میں موجود تھے ، اور ان کی وجہ سے دیگر علماء کو بھی دیوگیر میں جلا وطن کر دیا گیا ۔ ان میں سے بیشتر علماء نے وہیں وفات پائی ، شہر مہلک وبا اور سخت قحط سالی کا شکار ہوا ، یہاں تک کہ یہ بلائیں ہنوز پورے طور پر دور نہیں ہوئیں ۔ سبحان اللہ ! جو بات بھی حضرت سلطان المشائخ کی مبارک زبان سے نکلی وہ اسی طرح پوری ہوتی دیکھی گئی ۔ واللہ اعلم ۔ (سیر الاولیاء ، صفحہ ۵۲۵ تا ۵۳۲)

ضیاء الدین نخشبی

[ضیاءالدین (وفات ۱۳۵۰ء) کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ 'گل ریز'، سلک السلوک' اور 'طوطی نامہ' ان میں سے زیادہ اہم ہیں۔ 'گل ریز' رنگین نثر نگاری کا عمدہ نمونہ ہے۔ 'طوطی نامہ' باون کہانیوں کا مجموعہ ہے اور 'سلک السلوک' مشائخ کبار کے حالات و افکار کا دل نشیں مجموعہ ہے۔]

(۱)

'گل ریز' سے اقتباس

عجب ملک اس تخت کے گوشے میں بیٹھا اس عورت کے حسین و جمیل چہرے کا نظارہ کر رہا اور حیرت کے دانتوں سے انگشت حسرت کاٹ رہا تھا اور دل میں کہتا تھا

''ایسا کون ہے جو رخساروں کے سیب کو اور قد کی ٹہنیوں پر پستانوں کے اناروں کو پسند نہ کرے۔'' **بیت :**

اندریں چاشنی کہ ایں لب راست
اللہ اللہ کرا ہوس نشود

پھر جی ہی جی میں کہتا ''شاید یہ ماہ و پرویں کی صورت ہے، یا پھر لبوں کا شہد خود یہی ہے، وگرنہ آج زمانے کے چمن میں اس سے زیادہ حسین پھول کس نے دیکھا ہے؟ اور زمانوں کے شرابہ میں اس سے زیادہ خوش نما شراب کس نے چکھی ہے؟ یہ کوئی بشر نہیں بلکہ کوئی شریف فرشتہ ہے۔''

جب کچھ وقت گزرا........تو باد نسیم نے اس کی آنکھوں کی

نرگس کو پلکوں کی ندی میں کھلایا اور وہ ماہ جبیں نیند سے بیدار ہوئی ۔ عجب ملک پر جو اس کی نظر پڑی تو اس نے دیکھا کہ وہ آرام اور شادمانی کا دامن پھیلائے تخت کے گوشے میں بڑے مزے سے بیٹھا ہے ؛ اُسے بلند آواز سے مخاطب کرتے ہوئے بولی ''اے غموں کے مارے اور اپنی جان کے دشمن! تو کون ہے ؟ کہاں سے آیا ہے اور یوں گستاخانہ طور پر تو نے تخت پر کیوں پاؤں جمایا ہے ؟ اس محل کے اوپر سے تو آفتاب و ماھتاب کو بھی گزرنے کی جرأت نہیں اور باد نکبا (چاروں طرف کی ھوا) کی کیا مجال کہ وہ اس آستانے کے قریب سے بھی گزرے ۔''

''اس میں تیز و تند آندھیاں اپنی سانس کو چھپاتی ھیں اور اگر وہ پردوں کو شدت سے ھلائیں تو انھیں اکھیڑ نہ سکیں گی ۔''

عجب ملک بولا ''میں ایک بد نصیب ہوں جسے حادثات زمانہ نے یہاں لا پھینکا اور لیل و نہار کی دشمنی نے یہ دن دکھایا ہے ۔ ایک ایسا انسان ہوں جسے ایک مہم درپیش ہے ؛ ابھی تھوڑی ھی دیر میں اٹھ کھڑا ہوں گا اور اس جگہ سے چل دوں گا ؛ لیکن تو اپنا حال کہہ کہ تو کون ہے ؟ چاند ہے ؟ مشتری ہے ؟ انسان ہے ؟ یا پری؟ یہاں تجھے بغیر کسی مونس و غم خوار کے کیوں کر چین نصیب ہے اور انیس و دلدار کے بغیر تو نے یہ کیسی مسکین صورت بنا رکھی ہے ۔ تیرا کھانے پینے اور رہنے سہنے کا کیا حال اور کیا ذریعہ ہے ؟'' اُس ماہ رو نے جواب دیا کہ ''اس آفرید گار کے کرم سے مجھے رزق کے لیے ادھر اُدھر بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑتی ۔ قضا و قدر کا باورچی میرے لیے صبح و شام کا کھانا یہیں اسی گھر میں پہنچا دیتا ہے ۔ میرا مت پوچھ کہ کہاں سے آئی اور کیا کھاتی ہوں ؛ قدرت کے باورچی خانے کی بات کر کہ وہ کہاں سے پہنچاتا ہے ۔ ایک شخص سے منقول ہے کہ اُس نے ایک راھب سے پوچھا ''تم کہاں سے کھاتے ہو ؟'' جواب ملا ''اس کا علم میرے پاس نہیں ہے بلکہ تم باری تعالیٰ سے پوچھو کہ وہ مجھے کہاں سے کھلاتا ہے ۔''

آن کس کہ بدین جائے رسانید مرا
او رزق مرا نیز رساند بر من؛

عجب ملک نے کہا ”اس محل کے گرداگرد ہزاروں کوس تک کوئی انسانی صورت نظر نہیں آتی اور نہ کوئی آبادی ہی کا نشان دیکھنے میں آتا ہے؛ تجھ پر تو پھر آسمانی دسترخوان ہی اترتا ہوگا یا تیرا رزق آسمان کے کارخانے سے برستا ہوگا۔“ وہ بولی ”یہ تیرے دل میں کیسی سست اعتقادی سمائی ہے! اگر تو یہ روے زمین اس ہستیٔ مطلق کے تصرف میں نہ ہو اور ارضی قطعات اس کی ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی بے زوال سلطنت سے خارج ہوں تو پھر وہ میرے لیے آسمان سے خوان بھیجے اور اوپر سے رزق اتارے۔ حاتم الاصم کے پاس ایک آدمی آیا اور کہا ”تم کہاں سے کھاتے ہو؟“ اس نے جواب دیا ”اس کے خزانے سے۔“ پھر اس شخص نے پوچھا ”کیا تجھ پر آسمان سے روٹی پھینکی جاتی ہے؟“ جواب ملا ”ہاں، جب زمین مجھ پر آسمان سے روٹی نہ پھینکے۔“ پھر وہ ماہ رو کہنے لگی ”اے جوان! تو نے کیا یہ سنا ہے کہ ایک دفعہ ایک شخص کہ راہ دیانت کا سالک اور سلطنت نگہداشت کا مالک تھا، بصرے سے کوفے کی جانب روانہ ہوا؛ جب دن ذرا ڈھل گیا اور دوپہر کے ملک کے بادشاہ (سورج) کا زوال شروع ہوا تو وہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا؛ اتفاق سے اس دن اس نے تل کھائے تھے اور ایک تل اس کے دانتوں کی تہہ میں کہیں رہ گیا تھا؛ اچانک اس نے منہ کھولا تو ایک پرندے نے اپنی دم کے زور سے وہ تل آڑا لیا۔ اس پر فرشتۂ غیب نے آواز دی کہ ”اے راہ طریقت کے سالک اور شریعت کے مالک! آٹھ اور اپنے گھر کو لوٹ جا کہ تو پرندے کا رزق اٹھانے والا اور اس کی روزی کا راہ نما تھا؛ میں تجھے اس پرندے کے رزق ہی کے لیے گھر سے باہر لایا اور محض اسی کی روزی کے لیے تجھے اس جگہ پہنچایا تھا۔“ تو جب اس رازق مطلق کے بے انتہا کرم اور اس منعم علی الاطلاق کی نوازش نے ایک پرندے کو خلا اور صحن صحرا میں رزق کے بغیر نہ رکھا تو

مجھے کہ 'ولقد کرمنا بنی آدم' (ہم نے اولاد آدم کو بزرگی دی) کی خلعت سے مشرف ہوں ، کیوں کر بغیر رزق کے رکھے گا۔ اور میں کہ 'اسجدوا' (اور سجدہ کرو) کی بزرگی کے طفیل مکرم ہوں ، مجھے کس طرح ضائع کرے گا'' ''وما من دابة فی الارض الا علی اللہ رزقھا'' (زمین پر چلنے والے ہر جانور کی روزی اللہ کے ذمے ہے۔)

عجب ملک نے جب یہ بات سنی تو بولا '' تو اس بے نور صحرا اور انسانوں سے خالی میدان میں بغیر کسی ہمدم و جلیس اور غم خوار و انیس کے کیوں کر رہ سکتی اور کس طور وقت کاٹ سکتی ہے ؟'' اس حسینہ نے جواب دیا ''جس انسان کے ساتھ لطف و عنایت خداوندی ہو اسے مسافر نہیں کہا جا سکتا اور جس دل کی رفیق ایزد بارک کی لا محدود مہربانی ہو اسے تنہا نہیں کہا جا سکتا ۔ حضرت موسیٰ سے منقول ہے کہ انھوں نے اللہ سے دعا کرتے ہوئے کہا کہ اے مولا ! میں مسافر ہوں ، مریض ہوں اور محتاج ہوں۔ اللہ نے موسیٰ کی طرف وحی بھیجی کہ مسافر وہ ہے جس کا مجھ ایسا کوئی دوست نہ ہو ، مریض وہ ہے جس کا مجھ ایسا طبیب نہ ہو اور محتاج وہ ہے کہ جسے مجھ ایسا دعا قبول کرنے والا میسر نہ ہو ۔ **مصرع**

آں را کہ تو ہستی چہ کم از ہستئی او

جب عجب ملک نے دم صافی اور قدم وافی دیکھا تو اس حسینہ سے کہنے لگا کہ ''چاہیے تھا کہ تمھارے احوال و افعال کا مجھے کچھ پتا چل جاتا کہ تو کون ہے اور یہاں کس لیے مقیم ہے؟'' 'وہ بولی ''اس بات کو چھوڑو ؛ یہ قصہ ہی کچھ ایسا ہے کہ جو زبان کی مدد سے ادا نہیں ہو سکتا اور نہ قلم ہی اسے حیطۂ تحریر میں لا سکتا ہے ، اس لیے کہ کینہ پرور فلک نے بغض و حسد کا گھوڑا دوڑایا اور منحوس طالع نے مجھے یہ دن دکھایا ہے ۔ زحل نے کہ ساتویں آسمان کا مزارعہ ہے ، نحوست سے بھری نگاہوں سے زمانے کو تاکا ہے ۔ **بیت**

بکار ہر کہ کیواں گشت ناظر
شود الکن کہ باشد بس مناظر

مشتری نے کہ چھٹے محکمے (آسمان) کا حاکم ہے، بغیر کسی دشمنی و خطا اور بلا کسی دلیل روشن و گواہ کے مجھے بلاؤں میں محبوس اور رنج و محن کے لیے وقف کر دیا ہے ۔ بیت

مشتری گرچہ هست قاضیِ چرخ
هیچ دل زو بدهر راضی نیست
با همه کس همون کند خصمی
خصمِ خشنود گشت قاضی نیست

مریخ نے کہ پانچویں آسمان کے قلعے کا تیغ زن ہے، مصیبتوں کا خنجر خصومت کے قرابہ (بڑا پیالہ) سے نکالا اور میری مرادوں کے زهرے (پتے) کو سیکڑوں جگہوں سے چیر ڈالا ہے ۔ بیت

چشم گردون ندید هیچ گهی   یک جگر خستهٔ نمونهٔ من
تیغ مریخ آتشی دارد   که نسوزد مگر درونهٔ من

(آسمان کی نگاهوں نے کبھی بھی مجھ ایسا کوئی جگرخستہ نہیں دیکھا ۔ مریخ کی تلوار میں ایک ایسی آگ ہے جو صرف میرے ہی دل کو جلاتی ہے ۔)

آفتاب کہ بام چهارم (چوتھا فلک) کا روشن دل ہے، صبح کے وقت ہمارے مقاصد کے کونوں میں روشنی نہیں ڈالتا اور کسی وقت بھی ہمارے کلبۂ احزان کی چھت کے جھرنوں سے نہیں جھانکتا ۔ بیت

هر خانه که تاریک کند تقدیرش
از پرتو آفتاب روشن لشود

اور زهره نے کہ تیسرے پردے (آسمان) کی مغنیہ ہے، خود کو مخمور شبانہ بنا رکھا اور ساز طرب کو ایک کونے میں پھینک رکھا ہے ۔ بیت

هم ساقیِ من عیش من در آمد از پای
هم مطرب وقت من دف از دست انداخت

اور عطارد نے کہ دوسری کچہری (آسمان) کا منشی ہے،

مصیبتوں کے حملہ آوروں اور دشمنی کے برت داروں کو مجھ پر مقرر کر رکھا ہے ، اور سال اور مہینے میرے مار ڈالنے کے احکام صادر کرتے اور وقت بے وقت میرے خون کا پروانہ لکھتے ہیں ۔ بیت

نزد من از نامہ کشش آسماں نامۂ تہدید رسد ہر زمان
(گل ریز ، ضیاء الدین نخشبی)

(۲)

'طوطی نامہ' سے اقتباس

داستان شیر اور بلی کی اور بلی کے بچے کے ہاتھوں چوہوں کے مارے جانے کی اور بلی کے پشیمان ہونے کی

پندرھویں رات جب آفتاب کا سنہری ہرن مغرب کے غار میں چلا گیا ، اور چاند کا سریع السیر غزال دشت مشرق سے نکل آیا تو خجستہ ، کہ ماہ تاباں کا تمام جمال اسی کی درگاہ کا مرہون منت تھا ، حصول اجازت کے لیے طوطے کے پاس گئی اور کہنے لگی ''اے طوطے ! ہجر کے جوش اور اشتیاق کی گرمی کے زور نے مجھے بری طرح پامال اور مضطرب و بے قرار کر رکھا ہے ؛ کیا کبھی کوئی ایسا بھی وقت آئے گا کہ میری اس تاریک رات کی صبح ہوگی . . . اور اس بند تالے کی چابی ہاتھ لگے گی ۔ بڑوں کا کہنا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہوتے ہیں : اول تو وہ جنھیں فکر معاش آخرت کے بارے میں سوچنے کی مہلت ہی نہیں دیتی ؛ ایسے لوگ 'ہلاک ہونے' والوں کے درجوں میں آتے ہیں ۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جنھیں فکر آخرت فکر نان کی طرف نہیں آنے دیتی اور یہ لوگ 'فائزین' کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں ۔ خدا معلوم یہ تیسری قسم کی فکر جس نے مجھے کسی اور کام کا نہیں رکھا ، کہاں سے مجھے آ چمٹی ہے کہ نہ تو مجھے فکر آخرت کا کچھ دھیان رہا ہے اور نہ فکر معاش ہی کا ۔ قطعہ

نخشبی شغل عشق خوش شغلی ست عـزل در کار او گـذر نکـند
ہر کہ مشغول شـد بشغل بتی پـیش مـشغولیِ ذکر نـکـند

طوطا پہلے ہی خود کو بیمار بنائے بیٹھا اور سوچ بچار میں غرق تھا ، اب جو اس نے یہ سنا تو خجالت کے سرہانے سے سر کو آگے بڑھایا اور نہایت عاجزی و انکساری کو کام میں لاتے ہوئے مریض اور بیمار لوگوں کی سی نرمی اور آہستگی اختیار کی اور پھر آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا۔ خجستہ بولی ''اے طوطے ! اس بیماری کا باعث اور اس سستی کا سبب کیا ہے ؟'' طوطے نے جواب دیا ''مجھے نہ تو کوئی جسمانی عارضہ ہے اور نہ کوئی بدنی تکلیف ؛ اصل میں تو مجھے تیرے غم نے غم زدہ اور تیرے اضطراب نے مضطرب بنا رکھا ہے اور تو ہے کہ میرے بارے میں سوچ بچار کر رہی اور میرے ہی افسانوں ترانوں میں کھوئی ہوئی ہے اور فرصت ہے کہ ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے ۔ آخر اس مسکین عاشق کو کب تک انتظار میں رکھے گی ۔ مجھے تو ڈر ہے کہیں تجھ پر کوئی نحوست نہ آ پڑے اور تجھے اس نہ جانے کے سبب اس بلی کی طرح پشیمان ہونا پڑے جو چوہوں کو مارنے کے بعد پشیمانی سے دو چار ہوئی تھی ۔'' خجستہ طوطے کی یہ بات سن کر بڑی حیران ہوئی اور کہنے لگی ''اے طوطے ! یہ عجیب بات تو کبریت احمر (سرخ گندھک) سے بھی زیادہ تعجب انگیز اور یہ داستان تریاق اکبر سے بھی زیادہ عجیب و غریب ہے ، اس لیے کہ چوہا تو بلی کا کھاجا ہے ، پھر وہ اس کے مارنے سے کیوں کر پشیمان اور اس کے قتل سے کس لیے نادم ہوگی ؟ اگرچہ اس تکلیف والی بات سننے سے میری تکلیف میں اور اضافہ ہوگا لیکن کیا تو اس حکایت کو بیان کرسکے گا ؟''

طوطے نے اس حکایت کا آغاز یوں کیا ''کہتے ہیں چین کی سرحد پر ایک نہایت ہی تازہ و پاکیزہ سبزہ زار تھا ۔ ایک بے حد خوف ناک شیر نے کہ درندوں کا بادشاہ ہے ، اس سبزہ زار کو اپنا پایۂ تخت اور ارد گرد کے تمام درندوں اور جنگلی جانورں کو اپنا مطیع و منقاد بنا رکھا تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس شیر کی شام جوانی ڈھل کر بڑھاپے کی صبح (سفیدی) میں تبدیل ہو گئی اور اس کے شباب کا موسم بہار پیری کے خزاں میں بدل گیا ، تو شیر نے بھوک کے

ھاتھوں تنگ آ کر گربگی۲ اختیار کر لی ۔ ھاں ! بڑھاپا اگرچہ قابل احترام ھے لیکن شباب ایک بہت بڑی نعمت ھے ۔ **قطعہ**

نخشبی پیر ہم چو طفلی دان طفل از ضعف خود بلرزہ بود
نتواند درید موشی ھم پیر با آں کہ شیر شرزہ بود

(نخشبی ! بوڑھے کو ایک بچے کی مانند سمجھو ؛ بچہ اپنی کمزوری کے سبب لرز اٹھتا ھے ؛ ایک بوڑھا اگرچہ وہ خوفناک شیر ھی کیوں نہ ھو ، چوھے کو بھی نہیں پھاڑ سکتا ۔)

بڑھاپے کے فتور نے شیر کے پنجوں کو نرم کر ڈالا تھا ، اور اس کے دانتوں میں سوراخ پڑ گئے تھے ۔ جس وقت بھی وہ گوشت کھاتا کئی ایک ٹکڑے اس کے دانتوں میں پھنس کر رہ جاتے ۔ اس سبزہ زار میں چوھے بہت تھے ؛ جب شیر سو جاتا تو وہ آ کر ان ٹکڑوں کو دانتوں سے کھینچ کر نکالتے جس سے اس کی نیند حرام ھو جاتی ۔ وہ باوجود اپنے اس رعب و دبدبہ کے چوھوں کے ھاتھوں تنگ ، اور اتنا دلیر ھوتے ھوئے بھی ان سے عاجز آ چکا تھا ـــــ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ھے ، کیوں کہ اکثر ایک بڑا انسان کسی معمولی انسان سے عاجز آ جاتا ھے اور اپنا وقت پشیمانی و پریشانی کے عالم میں گزارتا ھے ۔ اس سے اتنا نہیں ھو پاتا کہ ایسے شخص کے دست تعدی کو جھٹک دے ۔ ٹھیک ھے ، دریا باوجود اپنی اس گہرائی کے مینڈک ایسی حقیر جان کی جولاں گاہ ھے اور پہاڑ اپنی مضبوطی کے باوصف چیتے کی لکد کوب کا نشانہ بنتا ھے ۔ کہتے ھیں جب شیر کا بچہ اپنی ماں کے شکم سے باھر آتا ھے تو چیونٹیاں اس سے چمٹ جاتی ھیں ، اور اکثر شیر کا بچہ انھی چیونٹیوں کے ھاتھوں موت کا شکار ھوتا ھے ۔ شیر یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ھے لیکن اپنے بچے کو اس ظلم سے نجات نہیں دلا سکتا ۔ یہ سب کیا ھے ؟ یہ سب اس لیے ھے کہ طاقت ور لوگ اپنی بے بسی کو جانیں اور اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کریں ـــ ایک واقعہ سنو گی ! ۔ ایک مرتبہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک خلیفہ کے پہلو میں بیٹھے تھے ۔ ایک مکھی خلیفہ کو بے حد پریشان کر رھی تھی ؛

اس نے تنگ آ کر کہا ''نہ جانے اس مکھی کے پیدا کرنے میں خدائے بزرگ و برتر کی کیا حکمت تھی !'' امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ''اس میں حکمت یہ ہے کہ طاقتوروں کو ان کی طاقت کی بے بسی دکھائے۔'' **قطعہ**

تخشبی خلق عاجزند ہمہ
کیست کو را دریں سخن عجبیست

گر چہ شیراست با شہامت و زور
ہم در اندیشۂ صداع تبعیست

(تخشبی تمام مخلوق عاجز ہے۔ کون ہے جسے اس بات میں تعجب ہے۔ شیر اگرچہ بڑی طاقت اور زور والا ہے لیکن وہ بھی درد سر کے اندیشے میں مبتلا ہے۔)

مختصر یہ کہ درندوں کا سلطان چوہوں کے معاملے میں مجبور ہو کر رہ گیا۔ آخر ایک دن اس نے بھیڑیے سے مشورہ کیا۔ وہ بھیڑیا بھی ایک ہی کایاں اور اس قسم کے بیسیوں معاملے دیکھ چکا تھا ؛ کہنے لگا ''ہر درد کا درمان اور ہر زہر کا تریاق موجود ہے ؛ جو کام کسی حیلے سے ہو سکتا ہے وہ طاقت سے نہیں ہو سکتا ، اور جو معاملہ تدبیر کے ساتھ انجام پذیر ہونے والا ہو وہ دبدبے سے ختم ہو جاتا ہے۔ گھر میں کوڑے کرکٹ کی تکلیف کو جھاڑو سے دور کیا جاتا ہے ، لکڑی سے نہیں ، اور جھونپڑے میں گرے پڑے خس و خاشاک کو ٹوکری میں ڈال کر باہر پھینکا جا سکتا ہے نہ کہ تلوار سے۔ بلی اس بارگاہ عالی کی ایک ادنیٰ رعیت اور اس درگاہ کی ایک پرجا ہے ؛ حضور چوہوں کو مار بھگانے کا کام اس کے سپرد کریں۔''

شیر کو بھیڑیے کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔ اس نے بلی کو حاضر کیے جانے کا حکم صادر کیا۔ جب بلی اس کے حضور میں پہنچی اور اس نے زمیں بوسی کی تمام رسوم ادا کر لیں تو شیر نے چوہوں کے گھمنڈ اور خود پر ان کے تسلط کا سارا ماجرا اسے کہہ سنایا۔ بلی بولی ''اگرچہ عالم پناہ کو اس لونڈی سے ننگ و عار ہے اور اس ناچیز کو

اپنی لونڈیوں اور خادماؤں کی فہرست سے خارج رکھتے ہیں ، لیکن اس حقیر کی کھال کو سنجاب اسدی[3] کی دولت سے پورا پورا تعلق ہے ۔ اور جہاں پناہ کے مبارک کانوں نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں چوہوں نے بہت ہی گڑبڑ مچائی اور کشتی کے بند کاٹنے شروع کر دیے تو نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ شیر کے ماتھے پر ہاتھ رکھو ؛ حضرت نوح علیہ السلام نے ایسا ہی کیا ۔ اس سے شیر کو چھینک آ گئی اور فوراً ہی دو بلیاں اس کے دونوں نتھنوں سے زمین پر آ رہیں جنھوں نے جلد ہی چوہوں کا صفایا کردیا ۔ اگر ظل اللہ اس بارگاہ والا جاہ کی پہرے داری اور اس دربار عظمت آثار کی چوکیداری اس لونڈی کے ذمے لگا دیں ، تو جس طرح اس خادمہ کے اسلاف نے حضرت نوح علیہ السلام کے سامنے اس مہم کو بانجام پہنچایا تھا ، اسی طرح یہ لونڈی بھی جہاں پناہ کے حضور میں اس مہم کو سر انجام دے گی ۔"

چناں چہ شیر نے دربار کی پاسبانی بلی کو تفویض کر دی ۔ بلی نے اب اطمینان کے ساتھ اس فرض کو انجام دینا شروع کر دیا ۔ اب جب چوہوں نے بلی کو دیکھا تو وہ تمام تتر بتر ہو گئے اور شیر ان کی مزاحمت سے محفوظ ہو گیا ۔ وہ بلی کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آنے لگ گیا اور اسے اپنی حمایت کی پناہ اور حفاظت کے سائے میں رکھنے لگا ۔ **قطعہ**

نخشبی رنج کس مکن ضایع
ہاں مشو زین سبب تو آفت خویش

کہتران چوں کنند خدمت خود
مہتران ہم کنند رافت خویش

(نخشبی کسی کی خدمت کو ضائع نہ کر ؛ دیکھنا اسی سبب سے کہیں تم اپنی مصیبت آپ نہ بن جانا ۔ جب چھوٹے خدمت بجا لاتے ہیں تو بڑوں کو بھی مہربانی کا مظاہرہ کرنا چاہیے ۔)

اگرچہ بلی نے چوہوں پر خوف و ہراس کے دروازے کھول رکھے

تھے ، لیکن ساتھ ھی ساتھ وہ صلح و آشتی اور نرمی و مہربانی سے بھی کام لے رھی تھی ، اور ان کی مکمل بیخ کنی کرنے سے اجتناب برت رھی تھی ۔ دل میں کہتی کہ اگر انھیں پورے طور پر ختم کر دیا تو شیر کو اس سلسلے میں میری کوئی ضرورت نہ رہے گی اور اس کے اس احسان و اکرام کا سلسلہ بند ھو جائے گا ۔ ھر کوئی اپنے کام میں دانا ہے ۔ قطعہ

نخشبی خلق درپئی غرضند
نیست جز تو غریق حرمان کس

ھر کہ بینی گو از وضیع و شریف
نیست درکار خویش نادان کس

(نخشبی ھر کوئی اپنی غرض کا بھوکا ہے ۔ سوائے تیرے اور کوئی بھی غم و یاس میں غرق نہیں ہے ۔ تو جس کسی بھی کمینے یا شریف آدمی کو دیکھے گا ، وہ اپنے کام میں اناڑی نہ ھوگا ۔)

جب کچھ مدت اسی طرح گزر گئی تو ایک دن بلی اپنے ایک بچے کو شیر کے پاس لے کر آئی اور کہنے لگی "یہ میرا بچہ ہے ؛ اپنی پختہ ایمانی ، وسعت علم ، کثرت حلم اور اپنے صدق و یقین کے سبب یہ اپنے معاصرین اور بھائیوں میں مشہور و معروف اور مجلس شاھانہ کے ادب آداب سے بخوبی آگاہ ہے ؛ اگر حضور اجازت فرمائیں تو کبھی کبھار اسے اپنی جگہ پر کھڑا کر جایا اور خود دوسرے بچوں کو دیکھ آیا کروں ۔" شیر نے کہا "بہت اچھا ۔" چناں چہ اس رات بلی اسے اپنی جگہ پر کھڑا کر کے خود گھر چلی گئی ۔

بلی کا بچہ اپنی ماں کے اس 'علم معرفت' سے نا واقف تھا ۔ اسے کیا خبر کہ وہ چوھوں کے ساتھ صلح و آشتی سے پیش آتی ہے ۔ وہ ، جو بھی چوھا باھر نکلتا اسے پھاڑ کے رکھ دیتا ، تا آں کہ اس رات تمام چوہے مارے گئے اور ان کی قوم میں سے ایک بھی ان کا نوحہ کرنے والا نہ بچا ۔ صبح کے وقت ، جب کہ زمانے نے نئے رسم و آئین کی بنیاد ڈالی اور صبح نے باد صبا کی وساطت سے خوشبوئیں پھیلائیں تو

بلی اپنے گھر سے نکلی - اس نے چوھوں کا جو یہ حشر دیکھا تو پہلے تو بڑبڑائی ، پھر طیش میں آ کر اپنے بچے کو لعنت ملامت کرنے لگی اور بولی ''جس حادثے کا مجھے خوف تھا ، آخر وہ ہو کر ہی رہا - اب اگر اس کے بعد بادشاہ سلامت کی مہربانی ہم پر کم ہو جائے اور ان کی وہ نگاہ کرم ، جس سے وہ ہمیں دیکھتے رہے ہیں ، ہم پر کم اٹھے ، تو اس میں کوئی تعجب نہ ہوگا ، اس لیے کہ خلق کی مہربانی و عنایت کے پس پردہ ان کی کوئی غرض ہوتی ہے اور بیشتر لوگ کسی کی غم خواری و دل جوئی اپنے کسی مقصد کی خاطر کرتے ہیں ، تو جب ان کا وہ مقصد پورا ہو جاتا اور غرض ختم ہو جاتی ہے ، تو ان کی وہ تمام عنایت و غم خواری اور دل جوئی بھی کم ہوجاتی ہے - قطعه

نخشبی بی غـرض نیابی کس گرچه خود جوهر است یا عرضی
هر که بینی تونگر و درویش نیست بیرون ز کوچهٔ غرضی

(نخشبی تو دنیا میں کسی کو بھی بے غرض نہ پائے گا ، اگرچہ وہ خود جوہر یا عرض ہی کیوں نہ ہو - جس کسی بھی امیر یا غریب کو دیکھے گا ، ان میں سے کوئی بھی غرض کے کوچے سے باہر نہ ہوگا -)

جب کچھ مدت اسی طرح گزر گئی اور شیر چوھوں کے غم سے بے غم ہوگیا ، تو ایک دن وہی تفکرات کا لشکر جس نے کبھی بلی کے دل میں ہنگامہ پیدا کیا تھا ، اب شیر کے سینے کے میدان پر حملہ آور ہوا ؛ اس نے سوچا کہ بلی کو اس حریم میں محض چوھوں کو دور رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا ، اب کہ چوھوں کا معاملہ نپٹ چکا ہے تو بلی سے بھی معذرت کر لینی چاہیے - دوسرے یہ بھی تو ہے کہ بلی خود بھی درندہ ہے ، وہ خود اپنا شکار کر کے کھا سکتی ہے ، پھر میں اس کی خاطر دوسروں کا خون اپنی گردن پر کیوں لوں - اس بنا پر اس نے بلی کو پاسبانی سے چھٹی دے دی - بلی اپنے بچے پر برس پڑی کہ ''یہ سب فتنہ تیرا ہی پیدا کردہ ہے ، اور اس حادثے کا لباس تیرا ہی سیا ہوا ہے - اگر تو ان چوھوں کو ختم نہ کرتا اور شیر کو یہ فارغ خاطری حاصل نہ ہونے دیتا تو آج وہ مجھے اس منصب سے علیحدہ

نہ کرتا ۔'' بلی کا بچہ چوہوں کے اس قتل عام کے سبب بے حد پشیمان ہوا ۔''

طوطا جب ساری داستان سنا چکا تو خجستہ سے کہنے لگا ''اے کد بانو ! مجھے تو عشق کے معاملے میں تو بہت ہی سست اور دوست تک پہنچنے میں نہایت آہستہ رو نظر آتی ہے ؛ ایسا نہ ہو تیرا شوہر جلد پہنچ جائے اور تو اپنی اس تقصیر پر بلی کے اسی بچے کی طرح پشیماں ہو ۔'' خجستہ کے دل پر ان باتوں کا بہت اثر ہوا اور اس نے چاہا کہ جلد ہی اپنے عاشق کے کمرے کی طرف جائے کہ خورشید کا گرم چشمہ ابل پڑا اور دن کا شاہی جلوس نکل آیا ۔ صبح نے اپنے روشن چہرے سے پردہ اٹھایا اور خجستہ کو جانے میں تاخیر ہوگئی ۔ **قطعہ**

نخشبی خواست تا رود امشب
سوی خوبے کہ زد ز خوبی کوس

صبح از رفتنش بشد مانع
دشمن عاشقان ست صبح و خروس

(نخشبی ، اس نے چاہا کہ آج رات وہ اپنے اس محبوب کے پاس جائے جس کے حسن کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے ، لیکن صبح ہوگئی اور اس کے جانے میں رکاوٹ بنی ۔ صبح اور مرغا عاشقوں کے دشمن ہیں ۔)
(طوطی نامہ ، صفحہ ۱۶۳ تا ۱۷۲)

(۳)

دعا

سولھویں لڑی :

آدمیوں اور دنیا والوں پر یہ واضح ہو کہ انسان کے لیے ناز و غنا[۳] میں شکر سے بڑھ کر اور کوئی بہتر جائے قرار نہیں ، اور حاجت و ضرورت اور تکلیف میں دعا سے خوش تر کوئی جائے قرار نہیں ۔ دعا کو وہ درجہ حاصل ہے جو کسی عبادت کو بھی حاصل نہیں ۔

اس لیے کہ بعض عبادتیں دن کو ادا کی جاتی ہیں ، مثلاً نماز فرض[5] اور بعض رات کا وظیفہ ہیں ، جیسے عشاء کی نماز کہ فرض ہے ۔ بعض عبادات ہفتے میں ایک مرتبہ ادا ہوتی ہیں ، مثلاً نماز جمعہ ، اور بعض ماہانہ وظیفہ ہیں ، جیسے ماہ رمضان ، بعض سال میں ایک دفعہ ، جیسا کہ زکواۃ ہے ، اور کچھ عمر کا وظیفہ ہیں مثلاً حج ۔ لیکن دعا ایسی عبادت ہے کہ یہ گنہ گار اور پرہیز گار ، ڈرپوک اور نڈر ، صبح و شام کے وقت ، مالک اور غلام گویا ہر کسی سے اور ہر وقت جائز ہے ۔ کہتے ہیں کہ جو کوئی بھی خدائے بزرگ و برتر کو ، جس نام سے بھی وہ اسے جانتا ہو ، عجز کے ساتھ پکارے تو وہ اس کی دعا کو قبول کرتا ہے ۔

سنو ! ایک واقعہ سنو ! ایک مرتبہ کوئی شخص عارفوں کے شہنشاہ شیخ بایزید بسطامی قدس سرہ کے پاس گیا اور آپ سے پوچھا ”اے خواجہ ! خدا کا بڑا نام کون سا ہے؟“ آپ نے فرمایا ، ”اس بزرگ و برتر کا بھلا کوئی چھوٹا نام بھی ہے؟ اس کے تو تمام نام بڑے ہیں ؛ مگر دعا کی راہ گزر (دل) پاک ہونی چاہیے ، کیونکہ جو دعا دل سے نہ نکلی ہو اللہ اسے قبول نہیں کرتا ۔ بے عمل دعا کرنے والے کی دعا ایسی ہے جیسے بغیر رسی کے کمان ۔“

جو دعا کبھی رد نہیں ہوتی وہ ہے والدین کی دعا ، مسافر کی دعا اور مظلوم کی دعا ۔ شاید ہی کوئی آدھی رات ہوگی جب آسمان سے یہ آواز نہیں آتی : ”ہے کوئی دعا مانگنے والا کہ اس کی دعا قبول ہو ، اور ہے کوئی گنہ گار کہ ہم اس کی بخشش کریں ، اور ہے کوئی سائل کہ اس کا سوال پورا کیا جائے ، یہاں تک کہ سورج طلوع ہو جائے ۔“

دعا ہمیشہ آفتوں اور مصیبتوں کے نزول سے پہلے پہلے مانگنی چاہیے ، کیوں کہ جب کوئی مصیبت آ پڑتی ہے تو وہ دعاؤں سے دور نہیں کی جا سکتی ۔ کہتے ہیں کہ جب منگولوں کی آفت نیشا پور کے حدود تک پہنچ گئی تو بادشاہ[6] نے کسی درویش کے پاس اپنا آدمی بھیجا کہ آپ دعا فرمائیں ۔ درویش نے جواب دیا کہ آفت تو نازل

ہو چکی ؛ اب دعا کا وقت نہیں رہا؟ اب تو 'راضی برضاے دوست' ہونے کا وقت ہے ۔ اے اللہ ہم تیری پناہ مانگتے ہیں اس علم سے جو نفع بخش نہیں ہے ، ایسے دل سے جس میں عجز نہیں ہے ، ایسے پیٹ سے جو سیر نہیں ہوتا اور ایسی دعا سے جو قبول نہیں ہوتی !

قطعہ

نخشبی در دعا مکن امہال از دعا التماس دادہ شود
ہر دری را کہ آسمان بندد بکلید دعا کشادہ شود

(نخشبی دعا میں دیر نہ کر ۔ دعا مانگنے سے حاجت روا کی جاتی ہے ۔ جو دروازہ بھی آسمان بند کرتا ہے ، وہ دعا کی چابی سے کھل جاتا ہے)
(سلک السلوک ، صفحہ ۱۷ تا ۱۸)

(۴)

زکواۃ

چونسٹھویں لڑی :

جاننا چاہیے کہ زکواۃ تین قسم کی ہے : اول زکواۃ شریعت ہے ، اور وہ اس طرح کہ دو سو درم میں سے پانچ درم ادا کرنے ہوتے ہیں ۔ دوم زکواۃ طریقت ہے ، اس میں یہ ہوتا ہے کہ دو سو درم میں سے صرف پانچ درم اپنے پاس رکھ لیتے ہیں ۔ سوم زکواۃ حقیقت ہے ؛ وہ یہ کہ تمام کا تمام مال دے دیتے ہیں ، اور اپنے لیے افطار کی خاطر بھی کچھ بچا کر نہیں رکھتے ۔ چناں چہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ زکواۃ کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس نے جواب دیا ''دوسروں پر واجب ہے ۔'' پھر پوچھا ''تو کیا آپ پر واجب نہیں ؟'' بزرگ بولا ، ''اگر میرے ہاتھ کچھ مال لگے تو اسے اتنے عرصے تک اپنے پاس رکھوں گا ہی نہیں کہ اس پر زکواۃ واجب ہو جائے ۔''

ہر شخص کا کسی کو کچھ مال دینا تین قسموں سے باہر نہ ہوگا ؛ پہلی قسم کو زکواۃ ، دوسری کو وقایہ> اور تیسری کو صدقہ کہیں گے ۔ صدقہ قبول کرنے کے لیے پانچ شرطیں ہیں : دو شرائط اد

کرنے سے پہلے ، دو ادا کرنے کی حالت میں اور ایک اس کے بعد۔ ان دو شرائط میں سے ، جو کہ ادا کرنے سے پہلے آتی ہیں ، ایک یہ ہے کہ جو کچھ کوئی دے وہ لازمی طور پر اس کی حلال کی روزی سے ہو۔ دوسری یہ کہ نیت کرے اور وہ مال ایسے شخص کو دے جو اسے بہتری کے کاموں میں صرف کرے ، نہ کہ نقصان دہ امور میں۔ دوسری دو شرطیں جو ادا کرنے کی حالت میں عاید ہوتی ہیں ، یہ ہیں کہ جو کچھ بھی دیا جائے اسے زبان پر نہ لایا جائے۔

سنو اور غور سے سنو ! جس روز ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے سب کچھ دے دیا اور چالیس ہزار دینار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور پیش کیے تو اس دن وہ ایک کمبل پہنے ہوئے تھے ، جس میں ایک کیل گاڑ رکھی تھی۔ اسی دوران میں حضرت جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے ؛ انھوں نے بھی وہی لباس پہن رکھا تھا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ''یہ کیسا لباس پہن رکھا ہے؟'' جبرائیل بولے ''یا رسول اللہ ! آج تمام فرشتوں کو حکم ہوا ہے کہ وہ ابوبکر کی موافقت میں کمبل پہنیں اور اس میں اسی طرح کیل گاڑیں۔'' **قطعہ**

بخشش در سخا ست سود ہمہ　　کیست کو این سخن بیان نکند
تا توانی بدہ بکس چیزی　　ہیچ کس در سخا زیان نکند

(بخشش سخاوت میں فائدہ ہی فائدہ ہے ؛ کون ہے جو یہ بات بیان نہیں کرتا۔ جہاں تک تجھ سے ہوسکے کچھ نہ کچھ بانٹتا رہ ، کیوں کہ سخاوت کرنے سے کسی کو گھاٹا نہیں پڑتا)

(سلک السلوک ، صفحہ ۵۰ تا ۵۱)

(۵)

علم و عمل

اڑسٹھویں لڑی :

واضح ہو کہ علم سے عمل مطلوب ہے ، روایت نہیں ؛ جیسا کہ شمع سے مقصود حصول روشنی ہے نہ کہ بیان حکایت۔ لہٰذا اگر کسی

کے وقت کی تھیلی میں علم کی نقدی آ پڑی ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صرف 'علم' ہی پر اکتفا نہ کرے کیوں کہ حصول علم ایک اور چیز ہے اور اس سے کام کرنا دوسری بات ۔

سنو اور غور سے سنو ! ایک مرتبہ ابو علی سینا[۸] اور خواجہ ابو سعید ابوالخیر[۹] کے درمیان ملاقات ہوئی ؛ جب بو علی اس محفل سے اٹھ کر جانے لگا تو اپنے ایک صوفی دوست سے جو اس جگہ موجود اور شیخ ابو سعید کا مرید تھا ، کہنے لگا ''تم میرے جانے کے بعد اسی جگہ موجود رہنا اور جو کچھ بھی شیخ میرے متعلق کہے وہ لکھ لینا ۔'' بو علی کے جانے کے بعد شیخ نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کی ؛ صوفی نے پوچھا ''بو علی کیسا آدمی ہے ؟'' شیخ نے فرمایا ''بو علی مرد دانا اور طبیب ہے اور بہت سے علوم سے آگاہ ہے ، لیکن وہ مکارم اخلاق نہیں رکھتا ۔'' صوفی نے یہی باتیں بوعلی کو لکھ بھیجیں ۔ بو علی نے شیخ کو ایک خط میں لکھا کہ ''میں نے مکارم اخلاق پر بیسیوں کتابیں لکھی ہیں ، پھر شیخ نے یہ کیوں کر فرما دیا کہ بوعلی اخلاق نہیں رکھتا ۔'' شیخ نے جب یہ خط پڑھا تو مسکرا دیا اور کہنے لگا ''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ بوعلی مکارم اخلاق نہیں جانتا ، بلکہ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بوعلی میں مکارم اخلاق نہیں ہیں ۔'' **قطعہ :**

بر تو بادا کہ کار چند کنی　　مخشبی علم با عمل نیکو
هم بدانستن ار پسند کنی　　همچنین دان کہ تو نمیدانی

(سلک السلوک ، صفحہ ۵۴)

ضیاء الدین برنی

[ضیاء الدین برنی (۱۲۸۵ء-۱۳۵۷ء؟) نے فیروز تغلق کے نام پر 'تاریخ فیروز شاهی' لکھی ، جو 'طبقات ناصری' کا تکمله هے اور بلبن کے زمانے سے فیروز شاہ کے عہد کے چھٹے سال تک کے واقعات اس میں درج هیں ۔ تاریخ نگاری کے بارے میں برنی کا ایک خاص مسلک هے ۔ اس کا نظریۂ تاریخ محدود اور ناصحانه سہی لیکن اسے فن تاریخ نویسی کی ذمه داری کا احساس ضرور تھا ۔ اس نے تاریخ کو تخلیقی فن پارے کا درجه دے دیا هے ۔ اس کے علاوہ اس کی تصانیف میں سے 'فتاوائے جہاں داری' قابل ذکر هے ۔]

(۱)

علم تاریخ کے فوائد

دین و دولت کے بزرگوں نے علم تاریخ کے بارے میں بڑی بڑی عمدہ باتیں کہی اور لکھی هیں ۔

علم تاریخ کی پہلی نفیس بات یه هے که آسمانی کتب ، مثلاً قرآن مجید وغیرہ ، انبیاء علیہم السلام که بہترین اور برگزیدہ مخلوق هیں ، کے معاملات کے بیشتر آثار ، شہنشاهوں کے واقعات اور ان لوگوں کی جباری و قہاری کے تذکرے سے جو بنی نوع انسان کے حاکم و آمر رهے ، بھری پڑی هیں اور یہی ایک ایسا علم هے جو صاحبان بصیرت کے لیے سرمایۂ اعتبار بنتا هے ۔

علم تاریخ کی دوسری نفاست یه هے که علم حدیث میں که وہ

تمام تر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل ہے اور علم تفسیر کے بعد سب علوم سے زیادہ عمدہ اور نافع علم ہے ، روایت کرنے والوں کی جانچ پڑتال اور ان کی تعریف ، حدیثوں کے ورود کا ماجرا ، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد و غزوات کے معاملات ، اور احادیث کے ناسخ و منسوخ کے مواقع کی تقدیم و تاخیر کا ذکر ہوتا ہے ، اس لیے وہ تاریخ ہی سے متعلق ہے - یہی سبب ہے کہ علم حدیث اور علم تاریخ کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔

آئمۂ حدیث کا کہنا ہے کہ علم تاریخ اور علم حدیث جڑواں ہیں ۔ اگر ایک محدث مورخ نہیں ہے تو اسے حضرت مصطفیٰ صلعم اور صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے ، کہ درحقیقت وہی احادیث کے راوی ہیں ، معاملات سے کوئی آگاہی اور واقفیت نہ ہوگی اور اس پر غیرمخلصین کے مقابلے میں مخلصین صحابہ کی کیفیت اخلاص اور غیرملتزمین سے ملتزمین کا فرق واضح نہیں ہوگا ۔ اور جب محدث مورخ نہ ہوگا تو مذکورہ بالا امور یقینی طور پر واضح اور روشن نہ ہوں گے کیوں کہ نہ تو وہ حدیث کی روایت دے سکے گا اور نہ احادیث کے بیان کا پورا پورا حق ہی ادا کرے گا ۔ نیز وہ حالات و واقعات جو آں حضرت صلعم اور صحابۂ کرام کے زمانے میں وقوع پذیر ہوئے اور ان کی شرح و تفصیل ، کہ ملت بیضا کی گزشتہ و آئندہ نسلوں کے دلوں کے لیے باعث تسکین ہے ، تاریخ ہی سے روشن ہیں ۔

تیسری عمدہ بات علم تاریخ کی یہ ہے کہ علم تاریخ کے شعور سے عقل و دانش میں افزونی ہوتی ہے اور یہ رائے اور تدبیر کی درستی کا باعث بنتا ہے ۔ اس میں دوسروں کے تجربات کا مطالعہ کرکے قاری خود تجربہ کار بن جاتا ہے اور دوسروں پر گزرے ہوئے حادثات کے جاننے سے تاریخ دانوں میں دور بینی و عاقبت اندیشی پیدا ہوتی ہے - ارسطواور بزرجمہر کا قول ہے کہ علم تاریخ کا جاننا درست عقل و رائے کے لیے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے ، کیوں کہ سلف کے احوال کا علم خلف کی صحت رائے کے لیے ایک شاہد عدل ہے ۔

چوتھی نفاست یہ ہے کہ علم تاریخ سے واقف ہونے سے شہنشاہوں، بادشاہوں، وزیروں اور عظیم لوگوں کے دل قدیم اور جدید حادثات و واقعات میں بر قرار رہتے ہیں۔ اور اگر سلاطین کو آسانی حادثات کے سبب کوئی سخت مصیبت در پیش آ جائے تو اس کے دور ہونے کی امید ختم نہیں ہوتی۔ گزشتہ لوگوں نے بیماریوں کو دور کرنے کے لیے جو علاج اختیار کیا اُس (علم) سے موجودہ لوگوں کے لیے سماوی امراض کو دور کرنے کا علاج روشن ہو جاتا ہے اور دل ان خیالی اور وہمی حادثات و واقعات سے جو سینوں میں در آتے ہیں، بچا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ حادثات کے وقوع پزیر ہونے سے پہلے ہی ان کی علامتوں کا پتا چل جاتا ہے۔ اور یہ فائدہ ایک عظیم فائدہ اور یہ نفاست بہت بڑی نفاست ہے۔

پانچویں نفاست اس علم کی یہ ہے کہ اس کی وساطت سے انبیاء علیہم السلام کے حالات و حادثات اور اُن کے ان حادثات وغیرہ کو صبر و رضا سے برداشت کرنے کا پتا چلتا ہے، اور پھر یہی آگاہی تاریخ کے جاننے والوں کے لیے صبر و رضا کا باعث بنتی ہے اور انبیاء علیہم السلام کا مصیبتوں سے نجات پانا علم تاریخ کے عالموں کے لیے اُمید کا وسیلہ بنتا ہے؛ اس لیے کہ جب یہ معلوم ہو گیا کہ انبیاء علیہم السلام پر بھی، کہ افضل انسان تھے، کئی مصیبتیں نازل ہوئیں تو اس سے مومنوں کے دل مصیبتوں اور حادثات کے وقوع پزیر ہونے سے خائف نہیں ہوتے۔

چھٹی نفیس بات یہ ہے کہ اس کے جاننے سے نیک لوگوں، منصفوں اور نجات پانے والوں کے عادات و خصائل، ان کی نجات اور ان کے درجے وغیرہ دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ سر کشی کے سبب ظالموں اور جابروں کی بے نصیبی اور ان کی ہلاکت و تباہی مسلمان بادشاہوں، وزیروں اور سلاطین پر خلفاً و سلفاً واضح ہو جاتی ہے، جس کے سبب معاملات حکومت میں نیک کرداری و بد کرداری کے نتائج روشن ہو جاتے ہیں اور نیک بخت سلاطین، ملوک اور خلفاء نیکی و خیر کی طرف مائل ہوتے ہیں۔ مسلمان بادشاہ خدائے بزرگ و برتر کی جباری و قہاری سے

نہیں اُلجھتے اور آمور سلطنت میں ظلم و ستم اور تکبر و فرعونیت سے کام نہیں لیتے ۔ علاوہ ازیں صفات بندگی کے لوازم کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ۔ اس طرح خلفا ، سلاطین ، وزرا اور ملوک کے نیک کاموں کا فائدہ عوام کو ہوتا ہے اور دور و نزدیک تک پہنچتا ہے ۔

اور ساتویں نفاست علم تاریخ کی دین و سلطنت کے بزرگوں سے متعلق اس کی سچائی کا لازم ہونا ہے ۔ سلف و خلف کا قول ہے کہ علم تاریخ کی بنیاد سچائی پر رکھی گئی ہے ، جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی : ''پچھلے لوگوں میں میرا ذکر صحیح جاری کرنا'' اور خود اللہ تعالیٰ جھوٹ لکھنے والوں کی تنبیہ میں فرماتا ہے ''وہ الفاظ کو آن کی جگہ سے ادل بدل کر بیان کرتے ہیں ۔'' اس کے علاوہ باری تعالیٰ نے دروغ گوئی اور بہتان تراشی کو ہلاکت آفریں باتوں میں شمار کیا ہے ۔

تاریخ کی تالیف اور علم تاریخ دونوں ایسے بزرگوں ، بزرگ زادوں اور معروف و عظیم لوگوں سے مخصوص ہے جو انصاف ، سچائی اور درستی سے منسوب تھے ۔ اس لیے کہ علم تاریخ اسلاف کے خیر و شر ، انصاف و ظلم ، ان کی حق داری و غیر حق داری ، اچھائیوں ، برائیوں ، پرہیز گاری ، گنہ گاری ، فضیلتوں اور رذیلتوں وغیرہ کا نقل کرنا ہے ، تاکہ بعد میں آنے والے لوگ اس سے سبق اور عبرت حاصل کریں ۔ حکم رانی و نیکو کاری کے فوائد اور نقصانات کا خیال رکھیں اور بد کرداری سے پرہیز کریں ۔ خدا نہ کرے کہ کوئی دروغ گو اور افترا پرداز جھوٹ کو کام میں لائے اور اپنے فریب کار باطن اور خبیث نفس کے باعث بزرگوں کے خلاف نازیبا آمور تراشے ، من گھڑت قصے اپنی کتاب میں درج کرے ، اپنے بہتان و افترا کو رنگین تحریروں کے ذریعے پھیلائے ، جھوٹے واقعات کو اس رنگ میں پیش کرے کہ وہ صحیح معلوم ہوں ، دنیا و آخرت کی خطا و جزا سے نہ ڈرے اور قیامت کے دن جو حساب کتاب اسے دینا ہوگا اس سے خوف نہ کھائے ، کیوں کہ نیک لوگوں کو برا کہنا اور برا لکھنا زبان سے کی جانے

والی چغلی سے بھی کہیں زیادہ سخت گناہ ہے، اور بروں کو نیک کہنا یا لکھنا بدکرداری کی بہت بڑی مثال ہے۔

(تاریخ فیروز شاہی، صفحہ ۱۲ تا ۱۶)

(۲)

ہندو اور شریعت اسلام

جب دارالملک دہلی فتح ہو گیا اور ملعون چنگیز خاں کے خوف سے ہر شہر کے بڑے بڑے علما ہجرت کرکے دہلی آ گئے اور سلطنت دہلی سلطان شمس الدین التتمش[۲] کے قبضے میں آ گئی تو علما پر ہندوؤں کے کفر و شرک کی باتیں روشن ہو گئیں۔ انہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ان لوگوں کے پاس نہ تو کوئی کتاب ہے اور نہ یہ ذمیوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ اگر تلوار اور لشکر کو اپنے سروں پر دیکھتے ہیں تو خراج دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں ورنہ دوسری صورت میں سرکشی و بغاوت پر آتر آتے ہیں۔ چناں چہ بعض بڑے بڑے علما نے آپس میں اس مسئلے پر بہت زیادہ بحث کی کہ آیا ہندوؤں کے ساتھ 'اما القتل و اما الاسلام' (یا قتل یا اسلام) کا طریقہ اختیار کیا جائے یا اس بات پر راضی ہوا جائے کہ وہ خراج اسی طرح دیتے رہیں اور پہلے کی طرح امیرانہ اور ٹھاٹھ کی زندگی گزارتے، بت پرستی کرتے اور کفر و شرک کے تمام احکام کو بغیر کسی خوف و ہراس کے باقاعدگی سے بجا لاتے رہیں اور ان کی عزت و حرمت کو بر قرار رہنے دیا جائے؟ ان علما نے بڑی بحث کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ ''سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن ہندو ہیں، اس لیے ان کے بارے میں سرور کونین صلعم کا کیا حکم ہے؟ آیا انہیں قتل کیا جائے، غلام بنایا جائے اور ذلیل و خوار و رسوا کرکے ان سے مال چھینا جائے؟'' دین اسلام میں ایسا سخت حکم نہ تو یہودیوں کے بارے میں ہے، نہ نصاریٰ اور نہ دوسرے مذاہب کے متعلق؛ اور ہندوؤں کے مذہبی سربراہوں (برہمنوں) نے بھی کہ آن میں عام کفر و شرک پھیلانے کا سبب ہیں، ان کے دلوں میں یہ حکم شروع ہی سے بٹھا رکھا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہندو خواہ مطیع ہو خواہ باغی، ہر حالت میں سردار دو جہاں صلعم کا بہت بڑا دشمن ہے۔ صلاح یہ ٹھہری کہ پہلے بادشاہ سے ان دشمنوں کے بارے میں بحث کی جائے۔ چناں چہ اس سلسلے میں اپنے وقت کے چند معتبر ترین علما سلطان شمس الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کے سامنے انھوں نے مسئلۂ مذکور بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا اور اس سے درخواست کی کہ ہندوؤں کے ساتھ ''اما القتل و اما الاسلام'' کا طریقہ اختیار کیا جائے، کیوں کہ دین کی مصلحت اسی میں ہے کہ ان لوگوں سے نہ تو خراج لیا جائے اور نہ جزیہ ھی پر راضی ہوا جائے۔ بادشاہ نے ان کی بات آرام سے سنی اور وزیر سے کہا کہ وہ ان علما کو اس کا جواب دے اور جو کچھ بھی عقل کے مطابق بات بنتی ہو، وہ انھیں بتائے۔ نظام الملک جنیدی[۳] نے علما کی تجویز کو بخوبی سمجھ کر بادشاہ سے کہا کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہنود کے ساتھ 'اما القتل و اما الاسلام' والا طریقہ ھی استعمال کرنا چاہیے کیوں کہ یہ لوگ آں حضرت صلعم کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ نہ تو ان کا کوئی ذمہ ہے، نہ کوئی عہد اور نہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی کتاب اور نہ کوئی پیغمبر ھی ہندوستان میں مبعوث ہوا ہے؛ لیکن اس وقت جب کہ ہندوستان پر ہمارا تازہ ھی قبضہ ہوا ہے اور پھر ہندوؤں کی تعداد بھی اتنی ہے کہ ان کے مقابلے میں مسلمان آٹے میں نمک کے برابر ہیں، یہ بات مناسب نہیں؛ اس لیے کہ اگر ہم نے ان کے بارے میں مذکورہ طریقہ اختیار کیا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ متحد ہو کر سرکشی پر اتر آئیں اور ہم تھوڑی طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ نہ کر سکیں اور یہ بات ہر طرف فتنہ و فساد کے پھیلنے کا سبب بنے۔ ہاں! جب چند برس بیت جائیں، دارالخلافے اور تمام خطوں، قصبوں میں مسلمان آباد ہو جائیں اور بہت زیادہ لشکر بھی مہیا ہو جائے تو پھر البتہ ہم ہنود کے ساتھ 'یا قتل یا اسلام' والا طریقہ اختیار کر سکتے ہیں۔'' علما نے جب وزیر کا یہ مصلحت آمیز جواب سنا تو بادشاہ سے کہا کہ ''اگر آپ ہندوؤں کے قتل کا حکم صادر نہیں کرتے تو آپ کسی بھی صورت

میں انھیں اپنے دربار میں عزت نہ بخشیں ، اور نہ انھیں اس امر کی اجازت ہی دیں کہ وہ مسلمان محلوں میں سکونت پزیر ہوں ۔ اور اس بات کو ہرگز روا نہ رکھیں کہ دارالخلافے اور مسلمانوں کے علاقوں اور قصبوں میں کفر و بت پرستی کے احکام جاری ہوں ۔" بادشاہ اور وزیر نے اس وقت ان علما کی تینوں باتیں مان لیں ۔ چوں کہ اس نے شروع شروع میں قتل ہنود کا حکم نہ دیا تھا ، اس لیے نتیجے کے طور پر مسلمانوں اور دین داروں میں کفر و شرک اور بت پرستی جڑ پکڑ گئی ۔

(اقتباس از صحیفۂ نعت محمدی)

[ذیل کا اقتباس سلطان غیاث الدین بلبن کے اصول سلطنت کی وضاحت کرتا ہے ۔ سلطان کی سخت مزاجی ایک خاص مسلک کی پابند تھی ۔ پاک و ہند میں اپنا اثر قائم رکھنے کے لیے اس نے رعایا کے دل میں خوف و احترام پیدا کیا اور یہی اس کے اصول جہاں بانی کا بنیادی اصول بنا ۔ مؤلفین]

(۳)

سلطان غیاث الدین کے اصول سلطنت

جب غیاث الدین بلبن[۴] ، کہ آمور ملکی کے وسیع تجربے رکھتا اور ملکی سے خانی اور خانی سے بادشاہی تک پہنچا تھا ، تخت سلطنت پر متمکن ہوا تو دارالخلافہ دہلی نے ایسے مضبوط و طاقت ور اور تجربہ کار بادشاہ کے بیٹھنے سے زیب و زینت پائی ۔ جہاں بانی کی مصلحتوں اور آمور جہاں داری کو نئے سر سے رونق حاصل ہوئی ۔ اس کی سلطنت سے 'اولی الامری' نے استقامت پائی ، تمام منتشر و پراگندہ اور ابتر و غیر مستحکم آمور کو استحکام و انضباط حاصل ہوا اور حکم رانی کی عزت کو ایک 'کار اور کارستان[۵]' ملا ۔ بلبن نے محکم و مضبوط ضابطوں اور درست ارادوں سے مملکت کے خواص و عوام کو اپنے فرمان کے تحت لے آیا ۔ اس کا رعب و دبدبہ رعایا کے دل پر پوری طرح بیٹھ گیا اور اپنے عدل و انصاف اور مہربانی سے اس نے ہندوستان کے تمام علاقوں کے عوام کو اپنی طرف مائل کر لیا ۔

جو لوگ کہ سلطان شمس الدین ایلتتمش کی وفات کے بعد تیس سال کی مدت میں سلطان مذکور کے بیٹوں کی نا اہلی اور اس کے (شمس) اہل کاروں کی زیادتی کے باعث بیہودہ گو ، نا فرمان اور خود غرض ہوچکے تھے ، اور ہر شاخ پر بیٹھنے والے ، ہر کسی کی حمایت حاصل کرنے والے بن چکے اور اپنی ہی مرضی کے مطابق زندگی بسر کر رہے تھے ، اور ان کے دلوں سے اولی الامری کا خوف و دبدبہ ، کہ دنیا کے انتظام و انصرام کا سبب اور جہاں داری و جہاں بانی کی رونق کا وسیلہ ہے ، نکل چکا اور اس کے سبب ملک انتشار کا شکار ہو چکا تھا ، وہ لوگ بلبن کی تخت نشینی کے پہلے ہی سال مطیع و فرمان بردار ہوگئے ۔ انھوں نے ہر قسم کی خود غرضی ، خود نمائی و خود رائی ترک کر دی اور بے توجہی و بےباکی کو یک دم چھوڑ دیا ۔

سلطان بلبن نے اپنی وسعت عقل اور کثرت تجربات کے سبب تخت نشین ہوتے ہی اپنے خدمت گاروں کے ، کہ حکمرانی و ملک داری کا سرمایہ ہیں ، معاملات کی استقامت کو مقدم جانا ، اور قدیم و جدید سواروں اور پیادوں کو ایسے بڑے بڑے تجربہ کار اور نام ور امیروں ، سرداروں ، صاحب حشمت عالی ہمتوں اور نمک حلال وفاداروں کے سپرد کیا جو اتنی بڑی فوج میں سے صرف چند ہزار منتخب ، چنے ہوئے ، جانے پہچانے اور موروثی فروسیت (گھوڑے کی پہچان اور سواری) رکھتے تھے ؛ جو لوگ کبھی کسی بغاوت یا کفران نعمت کے مرتکب نہ ہوئے تھے ، ان پر گزشتہ عنایات سے کہیں زیادہ مہربانیاں کیں ، اور انھیں تنخواہوں کے بدلے زرخیز زمینوں والے گاؤں عطا کیے ۔ اس نے ایسے لوگوں کو ملک و دولت کا معاون و مدد گار بنایا ، جن کی سرداری و بزرگی اور شجاعت و سخاوت میں کسی قسم کے شبہے کی گنجائش نہ تھی ۔ اس نے اپنے دربار کو ایسے ہی معاونین ، اکابر ، مشاہیر ، احرار ، اشراف ، اصیل ، نیک نام ، ہنر مند اور خوش طبع لوگوں سے سجایا اور اپنے خلوص و دیرینہ بندگی کے حقوق پر نظر نہ کی ۔ کسی کم مایہ ، بے ہنر ، کنجوس ، لالچی اور کمینہ قسم کے شخص کو سرداری و بزرگی نہ دی ۔ اپنے عزیزوں اور غلاموں میں سے

اگر کسی کو آگے لایا بھی تو ان کو جو اس وقت اپنی نیک نامی، رعیت پروری اور بندہ نوازی میں شہرۂ آفاق تھے - بلبن نے اپنے تمام دور حکومت میں کسی کاہل، بد اصل، سفلے اور کم ہمت شخص کو کسی بھی عہدے پر فائز نہ کیا بلکہ ایسے لوگوں کو محل کے قریب پھٹکنے کی بھی اجازت نہ دی - اور جب تک کسی شخص اور اس کی اصل و نسل کی تحقیق نہ کر لیتا، کسی قسم کا عہدہ یا کام اس کے سپرد نہ کرتا - اسے کمینے اور گھٹیا لوگوں کی سروری و سرداری سے طبعی طور پر نفرت تھی -

سلطان بلبن نے بھی اپنی تخت نشینی کے پہلے دو سالوں میں سفلہ لوگوں کو عزت بخشی (؟) اور شاہی سواری کی عظمت اور دبدبے میں بڑا مبالغہ کیا، اور ان بے شمار سیستانی پہلوانوں کی تنخواہیں، جو ننگی تلواریں لیے اس کی رکاب میں چلتے، ساٹھ ساٹھ ستر ستر ہزار چیتل مقرر کیں - جس وقت اس کی سواری جا رہی ہوتی اس وقت ایک طرف تو اس کا منور چہرہ چمک رہا ہوتا اور دوسری طرف پہلوانوں کی تلواریں شعاعیں مار رہی ہوتیں - اور اگر اس گھڑی سورج درخشاں ہوتا تو اس کی چمک، ننگی تلواروں کی دمک اور خود اس (بلبن) کے چہرے کی جھلک سے ایک عجیب سماں بندھ جاتا، اور اس تابندگی و رخشندگی کے سبب اس کے چہرے کی درخشندگی سو گنا بڑھ جاتی - تماشائیوں کی آنکھیں چکا چوند اور نگاہیں خیرہ ہو ہوجاتیں - اس کے شاہی جلوس کے رعب و دبدبہ اور ہیبت سے تماشائی بے حد مرعوب ہوتے - وہ دربار کو ایک عجیب انداز سے درباری کارکنوں، دربانوں، مسلح سپاہیوں، جان داروں[6]، سہم الحشموں، نائب سہم الحشموں، نقیبوں، چاؤشوں[7] اور پہلوانوں سے آراستہ کرتا؛ ہاتھیوں اور مرصع گھوڑوں کو دائیں بائیں کھڑا کرتا اور اپنے آفتاب صفت چہرے اور کافور کی مانند ڈاڑھی کے ساتھ تخت کو زیبائش بخشتا، اور اس ہیبت و دبدبہ کے ساتھ بیٹھتا کہ اس کی شان و شوکت لوگوں کے دلوں پر ایک لرزہ طاری کر دیتی -

جب دربار ہوتا تو خواص اور مقرب اس کے پیچھے اور ہاتھیوں کے پاس بان ، جان دار اور مسلح لوگوں کے سردار ، ازبک اور امیر غلمان دائیں بائیں اور ان کے نائب اپنے اپنے عہدوں کے مطابق مختلف جگہوں پر کھڑے ہوتے ۔ چاؤشوں اور سہم الحشموں کی آواز اور نقیبوں کا شور و غوغا اس قدر بلند ہوتا کہ دو ایک کوس تک اس کی آواز بہ خوبی سنائی دیتی اور دیکھنے والوں پر ایک ہیبت طاری ہو جاتی ۔ اور اگر ایسے موقع پر دور دراز سے آئے ہوئے ایلچی ، راجے ، راؤ زادے اور پیش کار وغیرہ دربار میں زمیں بوسی کے لیے حاضر ہوتے تو اکثر ایسا ہوتا کہ وہ بے ہوش و بے خبر ہو ہو جاتے اور لڑکھڑا کر گر گر پڑتے ۔ ایسے موقع پر حاضرین کی 'بسم اللہ' کی آواز دور دور تک سنائی دیتی ۔

سلطان بلبن کے دربار اور شاہی جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے سو سو دو دو سو کوس سے مسلمان اور ہندو یہاں پہنچتے اور بے حد حیران و متعجب ہوتے ۔ اس کے دربار اور شاہی ٹھاٹھ باٹھ کا دبدبہ سن کر دور دراز کے سرکش بھی مطیع و منقاد ہو جاتے ۔ اگرچہ سلطان شمس الدین ، سلطان بلبن کا آقا تھا ، اور اس کے پاس امرا و رؤسا ، خزانے ، جمعیت ، ہاتھی اور گھوڑے وغیرہ بلبن کی نسبت بہتر اور زیادہ تھے ، لیکن جو ہیبت و دبدبہ بلبن کے دربار اور شاہی جلوس کو حاصل تھا وہ دھلی کے پایۂ تخت میں کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہوا ۔ وہ اس دبدبے کے ساتھ دربار کرتا کہ اس کی ہیبت ناظرین کے دلوں میں مہینوں جاگزیں رہتی ۔ سلطان بلبن اکثر کہا کرتا کہ ''میں نے ملک اعز الدین سالاری ، ملک قطب الدین حسن غوری اور دوسرے بزرگوں کو ، جو میرے آقا سلطان شمس الدین کے دربار میں بہت بلند مقام و مرتبہ رکھتے تھے ، سلطان کی خدمت میں بارہا یہ کہتے سنا ہے کہ جو بادشاہ دربار اور شاہی جلوس کی ترتیب اور بادشاہوں کی طرح اٹھنے بیٹھنے کے آداب و رسوم میں اپنے احترام و حشمت کا خیال نہیں کرتا ، اور جس کے ہر حال اور قول و فعل اور حرکات و سکنات میں بادشاہی شان و شوکت نظر نہ آتی ہو ، اس کا رعب و دبدبہ اس کے ملک کے دشمنوں

کے دلوں پر ہرگز نہ بیٹھے گا ، اور نہ اس کی اور اس کے امیروں ہی کی ہیبت رعایا کے دلوں میں جا گزین ہوگی ۔ بادشاہ جس قدر اپنی شان و شوکت کی محافظت اور دربار اور شاہی سواری کی ہیبت سے رعایا کی نگہداشت و غم خواری اور سرکشوں کو اطاعت قبول کرنے پر مائل کر سکتا ہے اس قدر اسے یہ بات مہر و محبت اور تنبیہ و سزا سے حاصل نہیں ہوسکتی ۔ جب تک شاہی رعب و حشمت اور ہول و ہیبت عوام و خواص کے دلوں پر اور سلطنت کے دور و نزدیک کے علاقوں میں اثر انداز نہیں ہوتی ، اس وقت تک امور جہانبانی اور مصالح حکمرانی کا حق ، جیسا کہ چاہیے ، پورا پورا ادا نہ ہو سکے گا ۔ اور جب بادشاہ حکمرانی کی عزت و حشمت کو برقرار رکھنے میں غفلت و بے پروائی برتتا ہے ، تو اس کا قہر و جبر دور و نزدیک کے لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کا خوف یا ڈر پیدا نہیں کرسکتا ۔ اس سے ملکی امور میں خلل پڑتا ہے ، رعایا سرکش ہو جاتی ہے ۔ اور رعایا کے سرکش و باغی ہونے کے سبب ملک کی حالت پتلی ہو جاتی ہے ۔

سلطان بلبن نے سلطان شمس الدین کے کئی ایک ہم نشین ملوک سے سلطان سنجر[۸] اور سلطان محمد خوارزم شاہ[۹] ، کہ سکندر ثانی تھا ، کی مجلسوں اور جشنوں کی بے حد تعریف سن اور دل میں بٹھا رکھی تھی ۔ وہ جشن کی محفلوں کو نقش و نگار والی مسندوں ، رنگا رنگ کے جام خانوں ، سونے چاندی کے برتنوں ، زربفت کے پردوں ، قسم قسم کی نخل بندی ، گونا گوں میووں ، کھانے پینے کی چیزوں اور پانوں سے بے حد سجاتا ۔ جشن کے دن مابین الصلاتین[۱۰] بیٹھا رہتا اور خدمت گار خوانین ، وزرا اور امرا سب اس کے سامنے سے گزرتے اور ہر اس شخص کے نام فصل مشبع[۱۱] پڑھی جاتی جس نے کوئی خدمت کی ہوتی اور جس کا اس کے ہاں کوئی مقام و مرتبہ ہوتا ۔ فصل کی دربانی اس نے اپنے عہد کے ایک معتبر فاضل کے سپرد کر رکھی تھی ۔ جشن کی محفلوں میں موسیقی ہوتی اور شعرا مدحیہ اشعار پڑھتے ۔ اس کے جشنوں کی اس شان و شوکت کی داستان ایک عرصے تک لوگوں کی زبان پر رہتی اور وہ بے حد حیرانی کا اظہار کرتے رہتے ۔

بندے نے کہ مؤلف 'تاریخ فیروز شاہی' ہے ، اپنے نانا کے متعلق ، جو بڑے صاحب فہم و فراست ، صاحب فکر و شعور اور بلبن کے دربار میں بلند مرتبہ و مقام رکھتے تھے ، سنا ہے کہ وہ اکثر اپنی محفلوں میں یہ کہا کرتے تھے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے زمانے نے بادشاہی قبا سلطان غیاث الدین بلبن ہی کے قد کے لیے سی ہے ؛ کیوں کہ جو کر و فر اور آرائش و زیبائش اس کے دربار میں مشاہدہ ہوتی تھی ، اور جس طرح وہ حکمرانی کی حرمت و حشمت کی محافظت کرتا تھا ، اس کے متعلق اس وقت کے تمام دانش مند یہی کہتے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے اور اس سے بہتر کسی اور سے نہیں ہوسکتا ۔ اور اگر کوئی اس کے ادب و آداب اور خصائل و عادات کے متعلق کتاب بھی لکھ ڈالے تو جب بھی ان کا بیان ادھورا ہی رہے گا ۔

غرض کہ سلطان بلبن نے اپنے بیس سالہ دور حکومت میں جس طرح شاہی وقار ، آداب و خصائل ، بادشاہی اور شاہی حرمت و حشمت کی محافظت کی ہے ، اس سے زیادہ کرنا یا ہونا ناممکن ہے ۔ اس نے آداب شاہی کو مبالغے کی حد تک برقرار رکھا یہاں تک کہ کسی بھی فراش ، طشت دار ، خواجہ سرا اور غلام نے جو اس کی مجلس خلوت کا واقف حال اور دیرینہ حق بندگی و چاکری رکھتا تھا ، اسے کبھی بغیر کلاہ ، جراب ، یکتا اور بارانی کے نہ دیکھا ۔ اپنی خانی اور بادشاہی کے دوران میں ، جس کی مدت چالیس برس سے زیادہ ہے ، وہ کبھی کسی رئیس ، کسی بازاری آدمی ، کسی کاسہ لیس ، کسی ناکس ، کسی سفلے ، کسی مطرب یا کسی مسخرے سے ہم کلام نہیں ہوا ۔ اور ناواقف یا واقف حال لوگوں کے معاملے میں اس سے کبھی کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہوئی جو اس کی شاہی حرمت میں کسی قسم کی کمی کا باعث ہو ۔ دوران حکومت میں اس نے نہ تو کسی سے ہنسی ٹھٹھا کیا ، اور نہ کسی اور ہی کو اس بات کی جرأت ہوئی کہ اس کے سامنے ہنسی مذاق کرے ۔ نہ تو وہ خود کبھی مجلس میں کھلکھلا کر ہنسا اور نہ دوسروں نے کبھی اس کے سامنے قہقہہ لگایا ۔ اس کے عہد میں ایک مشہور رئیس فخر باونی تھا ؛ اس نے اپنی سرداری کے دوران میں

بڑی کوشش کی کہ کسی طرح وہ بادشاہ سے ہم کلام ہو ، لیکن اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی ۔ اس لالچ میں کہ وہ بادشاہ سے ہم کلام ہو ، اس نے مقربین اور وزرا کو بہت عمدہ عمدہ تحفے تحائف بھیجے ۔ انھوں نے اس رئیس کی سال‌ہا سال کی خواہش اور درخواست بادشاہ تک پہنچا دی ، اور خواہش کی تکمیل کے لیے وہ جو کچھ خدمت گاروں کو پہنچایا کرتا تھا ، اس کا تذکرہ بھی کر دیا ، لیکن بادشاہ نے یہ درخواست قبول نہ کی ، اور اس رئیس کو اپنے ساتھ ہم کلام ہونے کا موقع نہ دیا ، اور فرمایا کہ بادشاہی تو سراسر عزت و عظمت اور حرمت و حشمت ہے ؛ جب خلوت و جلوت میں یہ حشمت و عظمت اور ہیبت بادشاہ سے جاتی رہے تو وہ اس کے حق کی حفاظت نہ کر سکے گا اور بادشاہ اور رعایا میں کوئی امر بھی مابہ الامتیاز نہ ہوگا ۔ وہ رئیس بازاری لوگوں کا سردار تھا ؛ ظاہر ہے بادشاہ ایسے شخص سے کیوں کر بات کرے یا کس طرح اس امر کو روا رکھے کہ وہ بازاری لوگوں کے سردار سے ہم کلام ہو ۔ اور اگر بادشاہ سفلوں ، کمینوں ، نوکروں ، سپاہیوں ، بدجنسوں ، نا اہلوں ، بازاری لوگوں ، ناکسوں ، گویوں ، مسخروں اور کم مایہ لوگوں سے بات چیت کرنے ، اور وزیروں اور مقربین کے علاوہ ہر کسی کو شاہی مسند پر خود سے ہم کلام ہونے کا موقع دینے لگ جائے تو وہ گویا خود اپنے ہاتھوں شاہی حشمت اور اولوالامری کے دبدبے کو خاک میں ملا دے گا ۔ ایسے بادشاہ سے اس کی رعیت گستاخ ہو جاتی ہے جس کے سبب بادشاہی کی عزت و آبرو مٹ جاتی ہے ۔ اور جب بادشاہ رعایا کی نظر میں سبک ہو جاتا ہے تو ایک تو وہ حکم نافذ کرنے سے عاجز رہتا ہے اور دوسرے ہر کوئی ایرا غیرا بادشاہت کے ، کہ نہایت ہی عمدہ اور بزرگ کام ہے ، خواب دیکھنے لگ جاتا اور بہت سے نقصانات کا باعث بنتا ہے ۔ شاہی قوانین کے نفاذ کا تعلق خود بادشاہ کے رعب و دبدبہ اور شان و شوکت سے ہے ، اور نفاذ امر کے سلسلے میں ، کہ بادشاہی فریضہ ہے ، جو کچھ لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کے خوف ، ڈر اور دبدبے سے پیدا ہوتا ہے وہ تنبیہ و سیاست سے نہیں ہوسکتا ۔

سبک ہونے اور خود کو اپنی رعایا کی نظروں سے گرانے سے سلطنت قائم نہیں رہتی اور بغیر رعب و دبدبہ کے کسی بھی امر کا نفاذ کماحقہ، نہیں ہونے پاتا۔

مجازی طور پر بادشاہت خدائی نیابت ہے اور خدا کی نیابت میں کسی قسم کی ذلت و خواری اور کم مایگی کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اگر بادشاہ کو باپ اور دادا سے بادشاہت ورثے میں ملی ہو اور وہ حسب و نسب کے لحاظ سے اس کا مستحق ہو تو پھر یقیناً اس کی حرمت و حشمت لوگوں کے دلوں میں بیٹھ جائے گی، اور اگرچہ اس کی طرف سے کسی قسم کی تنبیہ، درشتی یا کسی قسم کا رعب و دبدبہ دیکھنے میں آیا ہو یا نہ آیا ہو، تو بھی اس کے نفاذ امر کی کامیابی ممکن ہے۔ اور اگر وہ دو ایک پشتوں سے بادشاہ نہیں اور نہ خود میں بادشاہوں ایسی خوبیاں اور بزرگیاں ہی پیدا کرتا ہے؛ یا خواص و عوام، دور و نزدیک، اندر باہر اور خلوت و جلوت میں بادشاہی رعب و دبدبہ اور شان و شوکت کی واجب و مناسب نگہداشت نہیں کرتا تو کسی بھی دل میں اس کی عزت و بزرگی کا احساس نہ ہوگا۔

بادشاہ بغیر عزت و عظمت اور ہیبت و دہشت کے بادشاہ ہی نہیں۔ اس کا مرتبہ تو میر ہزارہ یا میر تومنی یا پھر کسی علاقے کے والی کا ہوگا؛ عزت و عظمت اور ہول و ہیبت سے عاری بادشاہ کے عہد حکومت میں رعایا الحاد و کفر کا شکار ہوگی اور سرکشی و بغاوت کا دور دورہ ہوگا۔ ہندو نافرمانی کریں گے اور مسلمان فسق و فجور کی زیادتی، زنا، اغلام اور شراب خوری کی کثرت اور دیگر برے کاموں کے سبب بد بختی کا شکار ہوں گے۔ اور ایسے بادشاہ سے، کہ جسے نہ تو ورثے میں بادشاہی ملی ہو، اور نہ جس کی ہیبت و دہشت اور قہر و سطوت ہی سے لوگوں کے دل کانپ کانپ اٹھیں، ہرگز ہرگز دین پناہی اور دین پروری نہ ہو سکے گی کہ جس کا تعلق 'امر معروف' اور 'نہی منکر' کے اجرا سے ہے۔ اگر رعب و دبدبہ اور جاہ و حشم سے عاری بادشاہ کو دین کی حمیت نہیں ہے، اور اس کا قہر و غلبہ لوگوں

کے دلوں پر نہیں بیٹھتا تو وہ آخر کب تک تخت پر جا رہے گا ؟ تھوڑی ہی مدت گزرے گی کہ دین حق کو خواری سے دو چار ہونا پڑے گا؛ جھوٹے مذاہب کو دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوگی ؛ اور مسلمانوں کے ساتھ وہ بے انصافیاں ہوں گی کہ خود کفرستان والے بھی انہیں روا نہ جانیں گے ۔ (تاریخ فیروز شاہی ، صفحہ ۳۳ تا ۳۴)

(۳)

سلطان معز الدین کیقباد کی داستان عشرت

سلطان معز الدین نے اودھ سے دھلی کی طرف مراجعت کی ؛ کچھ عرصہ اپنے باپ کی وصیت پر کار بند رہ کر اس نے کسی قسم کی مجلس عیش و طرب برپا نہ کی ، شراب کو ھاتھ نہ لگایا ، اور اسی طرح نہ تو وہ موسیقی کی طرف مائل ہوا ، اور نہ اس نے حسیناؤں ھی کو اپنے پاس بلایا ۔ لیکن چوں کہ اس کی بخشش ، اس کی لطافت مزاج ، اس کی موزونیٔ طبع اور اس کے بے پناہ عیش و نشاط کا شہرہ دور و نزدیک کے تمام علاقوں میں پہنچ اور اس کی حسن پرستی اور عشق بازی کا چرچا عام لوگوں میں پھیل چکا تھا ، اس لیے بڑے بڑے شہرۂ آفاق بھڑووں اور دلالوں نے سلطان کے لیے تحفے کے طور پر اور اس کی خدمت کے خیال سے بڑی بڑی حسین و جمیل ، تنگ جامے والی ، شوخ ، چنچل ، کان ملاحت اور ناز و ادا والی دوشیزاؤں کو موسیقی ، رباب بجانا ، غزل گانا ، نکتہ سنجی اور شطرنج اور چوپڑ کھیلنا سکھا دیا ۔ انھوں نے ہر اس ماہ پارہ کو جس کا حسن قیامت خیز اور شباب آشوب انگیز تھا ، مختلف طریقوں سے پرورش کیا اور اس سے پیشتر کہ ان کا نہال جوانی بار آور ھو ، انہیں بڑی چستی و چالاکی سے گھوڑا دوڑانے اور نیزہ بازی کھیلنے کی تربیت دی ۔ اور ان آفت کے پرکالوں کو قسم قسم کے دل نواز و دل فریب فنون سے جو زاھدوں کو اپنی زھد شکنی پر مجبور اور عبادت گزاروں کو خرابات کی طرف مائل کریں ، آراستہ کیا ۔ ھندوستان کے منفعت پسندوں نے شمشاد قد ، نوخیز امردوں اور ماہ جبین دوشیزاؤں کو فارسی زبان اور موسیقی کی مشق کرائی ،

زر و زیور اور زردوزی لباس سے آراستہ کیا اور ان روح نواز حسیناؤں کو دربار کے طور طریقوں اور ادب آداب کی تعلیم دی ۔ نوخیز و لاثانی امرد غلاموں کے کانوں میں موتیوں کے بندے پہنائے ، بے مثل کنیزوں کو جلوہ گاہ کی دلھنوں کی مثل آراستہ کیا ۔ بڑے بڑے موسیقاروں اور استاد فن کاروں نے ایرانی اور ہندی دھنوں کو ترتیب دے کر 'قول' ، 'غزل' ، 'حب' اور 'کیلانی' میں بادشاہ کی مدح کے راگ الاپے ۔ ایسے ایسے مسخرے اور بھانڈ بھی ، جن کی معمولی سی مسخرگی اور بھانڈ پن پر بے حد غم دیدہ انسان بھی قہقہے لگانے پر مجبور ہوجائیں ، اور خوش طبع لوگوں کے مارے ہنسی کے پیٹوں میں بل پڑ پڑ جائیں ، شاہی نوازشوں کے لالچ میں بڑی بڑی دور سے پایۂ تخت میں پہنچے ۔ کول اور میرٹھ کے شراب ساز بے خماری کا عرق مشکبو اور دو سالہ تین سالہ پرانی شراب مٹکوں میں بھر بھر کر پیش کش کے طور پر لائے ۔

جن دنوں سلطان معزالدین اودھ سے دھلی کی جانب لوٹ رہا تھا اور اس نے چار پانچ منزلیں طے کی تھیں ، تو ہر روز چند سرو قامت ماہ پارے اور شمشاد قد پری رخ ، کہ عابد فریب اور زھد شکن ہوتے ، راستے میں کھڑے ھو جاتے ؛ جس وقت سلطان کی سواری گزرتی ، وہ سامنے آ کر ترانے گاتے ۔ اگرچہ سلطان کا دل ان سیم تنوں کی طرف بری طرح کھنچ رہا تھا اور اس کی طبیعت ان نازک اندا‌موں کو دیکھ کر مچل مچل رھی تھی ، پھر بھی وہ اپنے باپ کی وصیتوں کی شرم سے ، کہ جن کا مضمون ہر ہر لشکری کو معلوم ھوچکا تھا ، اپنے آپ پر قابو پانے اور برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا ، مگر ساتھ ھی ساتھ وہ کنکھیوں سے ان زہرہ جبینوں کے حسن دل فریب کا نظارہ اٹھاتا جاتا اور ہر لحظہ ان مہ وشوں کے وصل کا شوق اس کے دل میں پیوست ھوا جا رہا تھا ۔ تا آں کہ ایک روز جب کہ اس کی سواری گزر رھی تھی ، ایک نٹ بچہ ، آفت کا پرکالہ ، شوخ ، چنچل ، مہ پارہ ، حشر بہ داماں ، حسن میں لاثانی ، زر نگار قبا پہنے ، زر اندود ترکش کمر سے باندھے ، شیر کی دم ترکش میں لٹکائے اور شاھی کلاہ کان کی لووں تک سر پر ٹکائے ، سبزی مائل اور دم اٹھائے ھوئے گھوڑے پر (کہ جس پر ملمع زین کسی

ہوئی تھی) ہزار میخی زرہ پہنے ہوئے، بڑے ماہر اور چست شکاریوں کی مانند سوار ہو کر اور سیاہ پرچم گھوڑے کے سینے کے آگے لٹکائے (میدان حسن و جمال کا یہ شہ سوار) خاص فوج میں سے نکل کر باہر آیا اور اپنے گھوڑے کو دوڑا کر اور چکر دے کر شاہی سواری کے قریب لے گیا ۔ سلطان کے مقربین اور فوج خاص کے آدمیوں کو یہ گمان گزرا کہ شاید کسی شاہ زادے نے شکار کے تعاقب میں گھوڑا دوڑایا ہے ، جو اس کی شوخی ، چستی و چالاکی ، تاخت و بافت اور اس کے چنچل پن سے تماشائیوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ گئی ہیں ۔ وہ آفت جان اور بلاے بے درماں ، حشر بداماں میدان سے تیر کی سی تیزی سے گزرا ، پھر گھوم کر واپس مڑا اور شاہی چتر کے سامنے آ گیا ۔ ہتھیار بند محافظ ، نقیب اور چاؤش جو ہاتھوں میں گرز اور چقماق اٹھائے شاہی سواری کے آگے آگے چل رہے تھے، اس پری پیکر ، گل عذار سیمیں، بر کے حسن جاں افروز پر کچھ اس طرح لٹو ہو ہوگئے کہ انہیں اسے شاہی چتر کے سامنے آنے سے روکنے کا ہوش تک نہ رہا ، اور جب تک وہ پلک جھپکیں وہ چشم و چراغ حسن و خوبی شاہی چتر کے نزدیک پہنچ چکا تھا ۔ وہ گھوڑے سے اتر کر شاہی گھوڑے کے قریب جا پہنچا ، اور نازک بدنوں کے الحان اور دلبروں کے آہنگ کے ساتھ یہ شعر پڑھا :

گر قدم بر چشم ما خواہی نہاد
دیدہ در رہ می نہم تا می روی۱۲

پھر بادشاہ سے کہنے لگا کہ ”عالم پناہ! اس غزل کا مطلع حضور کی بندگی میں عین مناسب ہے ، لیکن مجھے ڈر ہے کہ میں پڑھ نہ سکوں گا ۔“ سلطان نے جو اسے دیکھا تو اس پر ہزار جان سے فریفتہ اور اس کی شیریں سخنی سے مدہوش ہوگیا ؛ گھوڑے کو روکا اور اس زہرہ وش سے کہا ”پڑھو ، پڑھو ، ڈرو نہیں ۔“ اس پر اس زہد شکن عابد فریب نے یہ شعر پڑھا :

سرو سیمینا بصحرا می روی
نیک بد عہدی کہ بی ما می روی (سعدی)

(چاندی ایسے حسین محبوب! تُو باغ میں جا رہا ہے؛ تو بڑا ہی بد عہد ہے جو ہمارے بغیر جا رہا ہے۔)

مطلع پڑھنے کے بعد بہ صد ناز و ادا بادشاہ سے کہنے لگا ''ہم سیکڑوں غمزہ فروش حسین محض جہاں پناہ کے جمال کی آرزو میں کہاں کہاں سے آئے ہیں، لیکن حضور ہیں کہ ہم سے پہلو تہی کرتے ہوئے تشریف لے جارہے ہیں؛ کیا ہماری اتنی بھی قیمت نہیں کہ ہم حضور کا ایک نظارہ ہی کر سکیں؟'' سلطان اس آفت جاں کے حسن و جمال اور اس سکون قلب و جان کے کلام نزاکت نظام پر مر مر ہی تو گیا! اس کے حسن و خوبی، اس کی چستی و چالاکی، شوخی اور سخن گوئی پر حیران ہو ہوگیا اور فرط مدہوشی میں اس نے چاہا کہ گھوڑے سے اتر کر اسے بغل میں لے لے۔ اس توبہ شکن کے نظارۂ حسن کا ولولہ اس پر اس قدر غالب آیا اور اس غیرت ناہید کی ہر ہر تان نے سلطان کو اس قدر مسحور کیا کہ اس نے اسی مدہوشی کے عالم میں توبہ توڑ ڈالی؛ اسی وقت شراب طلب کی اور شاہی جام ہاتھ میں تھام اس سرو قامت، سمن بر کے سامنے چڑھا گیا۔ توبہ شکنی کے موقع پر اس نے یہ شعر پڑھا:

شب ز می توبہ کنم از بیم ناز شاهدان
بامدادان روی ساقی باز درکار آورد

(رات کے وقت حسینوں کے ناز کے ڈر سے شراب نوشی سے توبہ کرتا ہوں، لیکن صبح ساقی کا چہرہ پھر شراب کی طرف مائل کر دیتا ہے)۔

اس آفت دین مسلمانی نے جب سلطان کی زبان سے یہ شعر سنا تو فوراً بڑی ہی پر سوز اور جان افروز آواز میں دوسرا شعر پڑھا:

غمزۂ عابد فریبم زاهد صد ساله را
سوی پیشانی گرفته پیش خمار آورد

(میرا عابد فریب غمزہ صد سالہ زاہد کو بھی پیشانی کے بالوں سے پکڑ کر مے فروش کے پاس لے آتا ہے۔)

وہ شعر پڑھتا جاتا اور ساتھ ساتھ نازِ و ادا، غمزہ و کرشمہ اور

چستی ، چالاکی دکھاتا جاتا تھا ، اور تماشائی اس کے حسن جاں نواز کے مشاہدے ، اس کی آواز کے لوچ اور لطافت کلام سے انگشت بدنداں ہوئے جا رہے تھے ، اور دل و جان سے اس بات کے خواہاں تھے کہ خود کو اس پر قربان کر دیں اور اس کے ماں باپ کو اپنی غلامی کا پروانہ لکھ دیں ۔

وہ مہ وش کبھی گھوڑے کو کداتا ، کہاں ہاتھ میں تھام کر تیر اس میں جوڑتا اور کبھی دراج کے پنکھوں کے نیچے سے پھلانگتا ۔ اس کے حسن کے نظارے اور مہارت فن کے تماشے سے خاص فوج کے لشکریوں پر ایک مدھوشی و بے خودی چھائی ہوئی تھی ؛ لگامیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹی ہوئیں اور نگاہیں اس آفت جاں پر گڑی ہوئیں ، عجیب نشے کے عالم میں چل رہے تھے ۔ غرض کہ تمام تماشائی اس مایۂ حسن و خوبی پر سو سو جان سے قربان ہوئے جاتے تھے ۔

جس وقت سلطان نے بارگاہ دولت میں نزول اجلال فرمایا اور محفل عیش و نشاط برپا کی گئی تو اس (سلطان) نے اس فتنہ سامان اور حشر بداماں کو طلب کیا اور بڑی ہی دلی آرزو کے ساتھ اس سے کہا کہ ''ہماری خواہش ہے کہ آج ہم تمہارے ہاتھوں سے جام شراب نوش کریں اور تم ہی ہماری محفل کے ساقی بنو ۔'' اس مایۂ خوبی نے بڑے ناز و ادا کے ساتھ بادشاہ کو جواب دیا :

ما گرچہ کہ خوب تر ز ماہیم　　هم بندۂ بندگان شاہیم

(ہم اگرچہ چاند سے بھی زیادہ حسین ہیں لیکن بادشاہ کے غلاموں کے غلام ہیں ۔)

شعر پڑھنے کے بعد اس نے جام پُر کیا اور سلطان کے ہاتھ میں دیا ۔ سلطان نے جام اس کے ہاتھوں سے لیا اور ہاتھوں میں تھام کر اس کے حسن عالم افروز کے نظارے میں محو ہوگیا ؛ پھر یہ شعر پڑھا :

قدح ، چون دور من آید ، بہ ہشیاران مجلس دہ
مرا بگذار تا حیران بمانم چشم در ساقی

(جب میری باری آئے تو جام محفل میں بیٹھے ہوئے ہوش مندوں

کو دے اور مجھے رہنے دے تاکہ میں ساقی کے نظارے میں محو و حیران رہوں۔)

اس ساقی سرو قد، نازک اندام نے بہ کمال ناز سر زمین پر رکھ دیا اور شوخی و طنازی کے ساتھ ابروؤں پر شکن ڈالے، چستی اور پھرتی دکھاتے ہوئے عشوہ و غمزہ کو کام میں لایا۔ پھر بڑی ہی پیاری اور مدھم آواز میں گویا ہوا ''شاہ عالم نوش فرمائیے، نوش فرمائیے شاہ عالم۔'' سلطان نے فوراً یہ شعر پڑھا:

اگر ساقی تو خواهی بود مارا
که می گوید که می خوردن حرام است

(اگر تو ہمارا ساقی بنے تو پھر کون ہے جو یہ کہے کہ شراب نوشی حرام ہے۔)

اسی دوران میں جب کہ ساقیوں کا سلطان 'نوشانوش' کا نعرہ لگا رہا تھا، سلطان نے ضیا جھجی کی طرف دیکھا، پھر مسکرا کر بولا ''ساقیوں کا حکم کچھ برا نہیں ہے۔'' ضیاء الدین جھجی نے سر جھکاتے ہوئے کہا:

تحکم کردن ساقی جہاں نیست
جہاں این است این خود در جہاں نیست

سلطان نے حکم دیا کہ چاندی کے دو ہزار تنکے لائے اور اس چمن حسن و خوبی کے نہال پر نثار کیے جائیں۔ اس پر اس طناز نے طنزیہ انداز اختیار کرتے اور مسکراتے ہوئے سلطان سے عرض کیا ''یہ نثار کیا ہوا مال ان لوگوں کا حق ہے جنھوں نے مجھ ایسے ماہ پارے کو حضور ایسے سلطان کے لیے پالا پوسا اور جو اب دربار میں حاضر ہونے کے لیے چشم براہ ہیں۔'' سلطان نے پوچھا کہ ان میں تجھ ایسا بھی کوئی ہے؟ اس نے جواب دیا ''شاہ عالم! اگرچہ آج تک کسی ماں نے مجھ ایسا حسین نہیں جنا، تاہم باقی سب کے سب بھی پروین صفت اور رشک ماہ و مہر ہیں اور اس قدر عمدہ گانا گاتے ہیں کہ زہرۂ فلک بھی ان کی آواز پر رقص کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

اگر انھیں جہاں پناہ کے محل ھمایوئی میں لایا جائے تو ان کی موسیقی سے پرندے بھی فضا سے نیچے زمین پر آ رھیں ، اور در و دیوار ناچنے لگ جائیں گے ۔'' سلطان نے حکم دیا کہ اس گروہ کو دربار میں پیش کیا جائے ۔

جب وہ لوگ دربار میں لائے گئے اور درباریوں کی نگاھیں ان کے حسن و جمال پر پڑیں تو ایک سے ایک کو بڑھ کر حسین و جمیل اور زیبا و خوب رو پایا ، اور جس گھڑی وہ تانیں اڑانے اور ناچنے لگے تو حاضرین مجلس آن خور پیکر مہ وشوں کے نظارے ، ان حسینان سیم تن کے ناز و ادا ، ان مایۂ ناز شمشاد قدوں کی شوخی اور ان جاں نواز گل عذاروں کی طرح داری پر مر مر گئے ۔ سلطان آن شوخ چشموں کی شوخی ، ان عربدہ جو نرد بازوں کی لطیفہ بازی ، ان سیمیں ساق پری رخوں کے رقص اور ان نکیسا۱۳ ایسی آواز رکھنے والے جاں نوازوں کی رباب نوازی میں کچھ ایسا کھو گیا کہ اسے باپ کی نصیحت کا قطعاً خیال نہ رہا ۔ دوسرے لفظوں میں اس نے پند و موعظت کا تختہ ایک طرف کونے میں رکھ دیا اور دن رات ان توبہ شکن مہ رخوں کے ساتھ عیش و نشاط میں مشغول رہنے لگ گیا ۔ ع :

پند پدر مانع نشد در عیش و عشرت شاہ را

(عیش و عشرت میں بادشاہ کے لیے باپ کی نصیحت کوئی رکاوٹ نہ بنی ۔)

ان نازک اندام حسینوں کی ملاقات اور ان نازوں کے پلے سیمیں بدنوں کے نظارے سے اس نے زنار عیش اپنے گلے میں ڈال لیا ؛ نئے سرے سے حسن پرستی اختیار کی اور خود کو پورے طور پر عیش و نشاط کے سپرد کر دیا اور جی کھول کر داد نشاط دی ۔ وہ ان مہ پاروں کے حسن ھوش ربا میں تو پہلے ھی خود کو کھو بیٹھا تھا ، اب جو ان مہ وشوں کے شطرنج اور چوپڑ کھیلنے اور ان سیم تنوں کے پانسہ پھینکنے کے انداز دیکھے تو وہ اور بھی آشفتہ و مدھوش ھوتا چلا گیا ۔

ھر روز ، ھر منزل پر نئی نئی محفلیں جمائی جاتیں جہاں ان گل بدنوں

کو بلایا جاتا۔ ان مہ پاروں کے دستے باری باری پیش کیے جاتے۔ سلطان ان پر کچھ اس قدر والہ و شیدا ہو چکا تھا کہ انھیں بیس بیس تیس تیس ہزار تنکے انعام میں بخش دیتا اور ان مہ پیکروں میں سے جو کوئی بھی سلطان کے جلیس و ندیم بن جاتے اور سلطان اور اس کے ندیموں کے ساتھ شطرنج وغیرہ کھیلتے، شوخی، شرارتیں، شوخ چشمی و عربدہ جوئی کرتے، ان کے دلوں پر ڈاکے ڈالتے اور جانوں کو نوازتے، ان میں سے چند خاص الخاص اور چیدہ چیدہ سیم تن شاہی بخششوں، زر و زیور اور جواہرات و مروارید سے لاد لاد دیے جاتے۔

ہر پڑاؤ پر شاہی خیموں کے چاروں طرف سے خوش گلو حسینوں کی مدھم اور سریلی تانیں سنائی دیتیں اور رشک ناہید نازنینوں کے نغمے 'فردوس گوش' بنتے، جنھیں سن کر تیسرے آسمان پر زہرہ قلابازیاں کھاتی اور فلک ان پر قربان ہو ہو جاتا۔ ان سیم تنان غارت‌گر ہوش اور گل رخان عشوہ فروش کے نظارے اور تماشے سے تماشائی مست و بے خود ہو ہو جاتے۔ ان کے چنگ و رباب، طنبور و کمانچہ اور مسکک [۴۱] وغیرہ کے پر سوز و دل دوز سروں اور نغموں سے پرندے بھی فضا سے نیچے زمین پر اتر آتے اور جنگلی جانور بے خود و مست ہو کر خیموں میں داخل ہو ہو جاتے۔ ان 'چار ابرو سادہ پسروں' کے نغموں، ان تھرکتے ہوئے ستیزہ کاروں کے رقص، ان شیریں دہن حسینوں کے ناز و غمزہ اور ان جفا شعار بے وفاؤں کے انداز و کرشمہ سے لشکر کے زندہ دل اور دلیر سپاہی ان پر دل و جان سے لٹو اور فریفتہ ہو ہو جاتے اور ان شگفتہ رو سیم تنوں کے وصف میں عمدہ عمدہ غزلیں لکھتے۔ آشفتہ مزاج نوجوان، دیوانہ سر مجنوں اور بوڑھے تلواروں سے اپنے گیسو کاٹ کاٹ ڈالتے اور زنار باندھتے۔ عشاق کے دلوں سے صبر و قرار اٹھ جاتا اور 'دل گم کردہ' عاشقوں کی فریاد و فغاں آسمان تک پہنچتی۔ حسن پرست حسینوں کی چاہ میں ہاتھوں میں سنکھ لے کر انھیں بتوں کی مانند پوجتے۔ ان بے سر و سامان عشاق کی جیبوں میں جو تھوڑا بہت مال ہوتا اسے وہ ان جاں نواز ماہ وشوں کے سروں پر نثار کر دیتے۔ جو عشاق بالکل بے خانماں ہوتے وہ اپنے

گھوڑے ، مویشی ، اسلحہ ، غلام ، کنیزیں اور خیمے تک بیچ ڈالتے ؛ جو مال ان کی فروخت سے حاصل ہوتا وہ سب ان سیم بروں کے پاؤں میں نچھاور کر دیتے اور جب بالکل قلاش ہو جاتے تو سر پر ٹوپی ڈال اور کمر میں میزر[۱۵] باندھ لیتے اور جو کچھ بھی ہاتھ لگتا اسے ان گل رخوں کے کتوں پر لٹا دیتے ۔

ان انسان صورت بتوں کے عشق اور ان بد خو سادہ پسروں کے دیدار کے شوق میں بے چارے عاجز و بے کس عاشقوں کی نیند اور کھانا پینا حرام ہو چکا تھا ؛ سارا سارا دن بے خود و بے ہوش اور ساری ساری رات مست و مدھوش پڑے رہتے اور مسخروں کی مسخرگی ، بھانڈوں کے بھانڈ پن ، بازی گروں کے حیرت افزا کرتبوں اور اناڑیوں کی بے شرمی پر ، کہ جو مختلف علاقوں سے سلطان کے حضور میں پہنچے ہوئے اور شاہی خیموں کے اطراف میں اپنے بے ڈھنگے کرتب اور کھیل دکھاتے تھے ، جی کھول کر داد دیتے اور اناڑی پن اور بھانڈ پن کو آخر تک پہنچاتے تھے ۔ کبھی کسی طرف سے زور کے قہقہے سنائی دیتے تو تماشائی دریاے حیرت میں گم ہو جاتے ۔

الغرض ملک نظام الدین [۱۶] داد بک نے جو دولت ہندوستان کے مختلف علاقوں سے نذرانوں کی رقموں ، مال غنیمت ، راجاؤں کے تحائف ، شاہی چتر پر نثار کردہ رقموں اور پچھلے بقایاجات کی صورت میں اکٹھی کرکے لشکری خزانے کو اس سے معمور کر دیا تھا ، سلطان معزالدین نے اس دولت کو ان اہل طرب پر لٹا دیا جو اودھ تک گروہ در گروہ حضور میں پہنچتے رہے ۔ سلطان اودھ سے دھلی تک تمام راستے میں عیش و نشاط کرتا ، رقص و سرود سے محظوظ ہوتا ، شراب پیتا پلاتا ، انعام و اکرام بخشتا اور اپنی دلی خواہشات کو پورا کرتا ہوا کیلوگھری کے محل میں داخل ہوا ۔ اس کے ورود دھلی پر عوام نے جشن کے طور پر شہر کو کاسوں ، محرابوں اور پھولوں وغیرہ سے آراستہ و پیراستہ کیا ؛ حسین و جمیل مطرب اور رقاص گانا گانے اور ناچنے کے لیے ان کاسوں پر چڑھے ؛ ان کے حسن و جمال پر اہل شہر فریفتہ اور

لٹو ہو ہو گئے ۔ ان سرو قدوں اور آفت کے پرکالوں کے عشق میں شہریوں نے اپنی دولت لٹا دی ؛ جاگیریں گرو ڈال دی گئیں ، مکان و مسکن ہاتھوں سے جاتے رہے ، سر پر بڑے بڑے قرض چڑھ گئے ؛ ملک زادے اور رئیس زادے دیوانہ و آشفتہ ہو ہو گئے ۔ ملتانی بچے اپنی تجارت و سوداگری سے ہاتھ دھو بیٹھے ۔ امیر زادے مفلسی کا شکار ہو گئے ، اور گھر بار لٹا دینے والوں نے بے خانماں ہو کر لکھنوتی کی راہ لی ۔ داناؤں کی عقل پر آ بنی ، اہل علم گناہوں کے گڑھے میں لڑھک گئے ، متقی و پرہیزگار طاعت و بندگی سے ہاتھ اٹھا بیٹھے اور عبادت گزاروں نے مےخانوں میں ڈیرے جما لیے ۔ ننگ و نام یوں غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔ عزت و آبرو مٹ گئی اور چاروں اور رسوائی و بدنامی کا ڈنکا بجنے لگا ۔ کنسوں اور محرابوں میں شراب کی سبیلیں لگائی گئیں جہاں سے لوگوں نے مٹکوں کے مٹکے نوش جان کیے ۔ محرابوں کو سامان تعیش سے اس قدر آراستہ کیا گیا تھا کہ اس قسم کی زیبایش و آرایش نہ کبھی پہلے دیکھنے میں آئی اور نہ کبھی آئندہ دیکھے جانے کی توقع ہے ۔ اور وہ عیش و نشاط اور مسرت و شادمانی جو اس دور کے لوگوں نے عہد معزی میں دیکھی ، نہ تو اس سے پہلے انھوں نے دیکھی تھی اور نہ اس کے بعد ہی دیکھی گئی ۔ اور اس قسم کی بے فکری اور راحت و آسایش کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی ۔

(تاریخ فیروز شاہی، جلد اول ، صفحہ ۱۷۹ تا ۱۸۸)

---

(۵)

سلطان جلال الدین خلجی کی محفلیں

تاج الدین عراقی ، امیر خسرو[۱] ، موید جاجرمی ، قرابیگ دعا گو ، موید دیوانہ ، صدر عالی ، امیر ارسلان کلاہی ، اختیار باغ اور تاج خطیب سلطان کے ندیموں میں سے تھے ، اور انشاء سخن ، علم تاریخ اور آداب ملوک میں ان کا کوئی ہم پایہ نہ تھا ۔ امیر خاصہ اور حمید راجا

شاہی محفل کے غزل خواں تھے ۔ امیر خسرو ہر روز شاہی مجلس میں نئی سے نئی غزل لکھ کر لاتے ؛ سلطان امیر خسرو کی غزلوں کا بے حد مشتاق و دل دادہ اور انھیں بڑے انعام و اکرام سے نوازتا تھا ۔ شاہی محفل میں ساقی گری کے فرائض ہیبت خاں کے بیٹے سر انجام دیتے، جب کہ نظام خریطہ دار اور یلدز سر ساقی تھے ۔ یہ سب اتنے حسین و جمیل اور اس قدر ناز و ادا والے تھے کہ اگر کوئی عابد و زاہد بھی انھیں دیکھ پاتا تو ہزار جان سے ان پر فریفتہ ہوکر زنار کمر میں باندھ مصلے کو شراب خانے کا بوریا بنا لیتا اور مے خانے میں جام پر جام چڑھاتا ، اور ان توبہ شکن ماہ وشان بے بدل کے عشق میں ذلیل و رسوا ہو کر رہ جاتا ۔

سلطان کی مجلس کے مغنیوں میں محمد شاہ چنگی بہترین ستار نواز تھا ؛ وہ ستار بجاتا اور فتوحا دختر فقاعی اور نصرت خاتون کچھ اس جادو بھری آواز کے ساتھ گانا گاتیں کہ ان کی پر سوز آواز سن کر پرندے بھی فضا سے نیچے زمین پر اتر آتے ، سننے والوں کے ہوش اڑ اڑ جاتے ، دل تڑپ تڑپ اٹھتے اور جانوں میں ایک ہلچل سی مچ جاتی ۔ نصرت بی بی اور مہرافروز کہ اپنے بے پناہ حسن اور حیا کے سبب ایک قیامت تھیں اور جس طرف بھی دیکھتیں اور جو بھی ناز و ادا کرتیں اس سے محفل کان نمک بن جاتی ، شاہی محفل میں رقص کرتیں اور جو کوئی بھی ان کے رقص اور ناز و کرشمہ کو ایک مرتبہ دیکھ لیتا ، اس کی یہی خواہش ہوتی کہ وہ خود کو ان پر قربان کر دے اور جب تک زندہ رہے اپنی آنکھیں ان کے پاؤں میں بچھائے رکھے ۔ سلطان کی محفل بلاشبہ ایک ایسی محفل تھی جس کا تصور صرف خواب ہی میں ہو سکتا ہے ۔ امیر خسرو جو محفل شاہی کے ندیم بزرگ تھے ، ہر روز سیمیں بدن سادہ امردوں کے حسن و جمال ، چہار ابرو ، نوخیز طفلوں کے حسن اور ناز و ادا ، شکاری انداز نوخطوں کے دل اڑا لینے اور مایۂ ناز مہجبینوں کی جان نوازی کے وصف میں نت نئی اور تازہ غزلیں لکھ کر لاتے ؛ ساقیوں کے نعرہ ہائے نوشا نوش ، نوخیز لڑکوں کی

تندی وعربدہ جوئی ، مہ وشوں کے نغمہ و سرود اور عشوہ و کرشمہ ، اور سیم بروں کے رقص کے دوران میں امیر خسرو کی غزلیں بھی گائی جاتیں۔ اور ایسی محفل میں کہ جو ارضی محفلوں سے کہیں بالا ہوتی ، عشاق کو گویا روح تازہ مل جاتی اور آشفتہ مزاج دیوانے ایک نئی زندگی حاصل کرتے۔

(تاریخ فیروز شاہی ، جلد دوم ، صفحہ ۲٦ تا ۲۸)

---

(٦)

کوتوال علاء الملک اور علاؤالدین خلجی

مذکورہ مقدمے کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سلطان علاؤ الدین[۱۸] اپنی اس مدہوشی و بدمستی کے دنوں میں اپنی مجلس میں کہا کرتا کہ "مجھے دو مہمیں در پیش ہیں۔" ان دو مہموں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے وہ اپنے حلیفوں اور ندیموں سے مشورہ کرتا اور امرا و رؤسا سے کہتا کہ "کوئی طریقہ بتاؤ جس سے میں ان دو مہموں کو سر کرلوں۔" ان زیر بحث مہموں میں سے ایک تو یہ تھی کہ وہ کہتا "خداوند تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چار دوست دیے تھے جن کی طاقت اور دبدبے سے آپ صلعم نے دین و شریعت پیدا کی۔ اس دین و شریعت کو وجود میں لانے کے سبب آپ صلعم کا نام تا قیامت زندہ رہے گا۔ اور آں حضرت صلعم کے بعد جس کسی نے بھی خود کو مسلمان جانا اور مسلمان کہلایا اس نے خود کو آپ صلعم کی اُمت و ملت میں شمار کیا۔ سو مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے چار یار بخشے ہیں: ایک الغ خاں ، دوسرا ظفر خاں ، تیسرا نصرت خاں اور چوتھا الپ خاں۔ اور میری دولت و سلطنت کے سبب انھیں شاہانہ قوت و شوکت میسر ہے۔ اگر میں چاہوں کہ ان چار یاروں کی قوت و مدد سے ایک نئے دین و مذہب کی بنا ڈالوں اور اپنی اور اپنے دوستوں کی تلواروں سے تمام لوگوں کو اس مذہب نو کی طرف مائل کروں ، تو اس دین

کے سبب میرا اور میرے یاروں کا نام اسی طرح قیامت تک لوگوں میں زندۂ جاوید رہے جس طرح پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے یاروں کا باقی ہے۔'' وہ اسی طرح بد مستی، بدتمیزی، حماقت، جہالت اور جوانی کے نشے میں اور بڑی بے باکی سے ایسی باتیں کرتا اور سوچے سمجھے بغیر محفل ناؤ نوش میں بھی اس کا تذکرہ کرتا رھتا۔ اس نئے دین و مذھب کی بنا ڈالنے کے لیے امرائے محفل سے مشورہ کرتا اور حاضرین سے پوچھتا کہ ''کیا طریقہ اختیار کیا جائے جو قیامت تک میرا نام زندہ رہے، اور جس روش کی بنا میں ڈال جاؤں، لوگ میرے مرنے کے بعد بھی اس روش کو اختیار کیے رکھیں؟''

دوسری مہم کے بارے میں وہ یہ کہتا کہ ''میرے پاس مال و دولت، ھاتھی گھوڑے اور نوکر چاکر بے حد و بے شمار جمع ھوگئے ھیں؛ میری یہ خواھش ھے کہ میں دھلی کسی ایک کے حوالے کرکے خود سکندر کی مانند دنیا پر چڑھائی کروں، اور اس عالم کو اپنے زیر نگیں لے آؤں۔'' اس کے اس قسم کے احمقانہ خیالات کی وجہ دراصل یہ تھی کہ اس کی کچھ مہمات اس کے حسب خواھش پوری ھوگئی تھیں، جس کے سبب وہ خطبے میں خود کو سکندر ثانی کہلاتا اور لکھواتا تھا۔ اور عین شراب نوشی کے عالم میں یہ ڈینگیں مارتا کہ ''جو ملک بھی میرے قبضے میں آئے گا اسے میں اپنے کسی معتمد کے حوالے کر دوں گا، اور خود کسی دوسری سلطنت کو قبضے میں لانے کے لیے آگے بڑھوں گا؛ کون ھے جسے میرا مقابلہ کرنے کی جرأت ھوگی؟'' سامعین محفل یہ جانتے ھوئے بھی کہ زیادہ مال و دولت، ھاتھی گھوڑے اور نوکر چاکر ھونے اور مادر زاد جہالت کے سبب وہ بد مست و بے خود ھو چکا ھے، اور یہ دونوں باتیں وہ اپنی حماقت، مدھوشی اور نادانی کی وجہ سے کہہ رھا ھے، ضرورت کے تحت اور اس کی بدمزاجی و زشت خوئی کے ڈر سے اس کی ھاں میں ھاں ملاتے؛ اس کی بد مستی کے خوف سے اس کی اس قسم کی باتوں پر تحسین و آفرین کے ڈونگڑے برساتے؛ جھوٹے سچے واقعات اور مثالیں گھڑ گھڑ کر اس کی

درشت مزاجی کی موافقت میں بیان کرتے اور اسے یہ گمان گزرتا کہ شاید وہ تمام ناممکن محالات، جو اس احمق کے دل و زبان سے نکلتے ہیں، پورے ہو جانے والے ہیں۔ اس کی یہ تمام ہرزہ سرائی، جو وہ اکثر محفل شراب میں کیا کرتا، سارے شہر میں پھیل چکی تھی۔ بعض بزرگ اس کی ان بیہودہ باتوں پر ہنس دیتے اور انہیں اس کی جہالت و حماقت پر محمول کرتے؛ بعض دانا لوگ ڈرتے اور ایک دوسرے سے کہتے کہ یہ شخص فرعون مزاج اور علم و خبر سے عاری ہے، اور اس قدر بے پناہ دولت کہ جس سے غافل و جاہل تو ایک طرف بڑے بڑے داناؤں کی آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، اس غافل کے ہاتھ لگ گئی ہے کہ اگر شیطان اس کو دین کے خلاف اکسا کر کسی کج راہ کی طرف لے جائے اور یہ واقعی گمراہ ہو کر ساٹھ ستر ہزار آدمی مروا ڈالے تو مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔

میرے چچا علاء الملک جو شہر کے کوتوال تھے، اپنے موٹاپے کے باعث ہر ماہ کی صرف پہلی تاریخ کو سلطان علاؤالدین کے پاس سلام کے لیے حاضر اور اس کی مجلس شراب میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جب وہ حسب عادت پہلی تاریخ کو وہاں حاضر اور شراب نوشی میں شریک تھے، سلطان نے ان سے اپنی ان دو ناشدنی مہموں کے بارے میں مشورہ کیا۔ علاء الملک نے دیگر لوگوں سے بھی سن رکھا تھا کہ سلطان اس قسم کی باتیں کرتا ہے اور حاضرین مجلس اس کی ان باتوں پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں، اور اس کی بدمستی و بد مزاجی کے ڈر سے اس کے سامنے سچی بات کرنے سے عاجز ہیں؛ تو اس روز جب انہوں نے سلطان کی زبان سے بھی مذکورہ کلمات سنے اور سلطان نے ان سے مشورہ طلب کیا تو علاء الملک بولے کہ ''اگر جہاں پناہ محفل سے شراب اٹھا لے جانے کا حکم صادر فرمائیں اور سوائے چار امرائے سلطنت کے جو اس وقت یہاں موجود ہیں، کسی اور کو یہاں بیٹھنے کی اجازت نہ ہو تو یہ خاکسار عالم پناہ کی ان دو مہموں کو عمل میں لانے کے لئے کچھ تجویزیں واضح اور کھلے طور پر حضور کے سامنے پیش

کرے گا ۔'' سلطان نے شراب اٹھا لےجانے کا حکم دے دیا ، اور سوائے الغ خاں ، ظفر خاں ، نصرت خاں اور الپ خاں کے کسی اور کو محفل میں نہ بیٹھنے دیا گیا ۔ جب دوسرے امرا چلے گئے تو سلطان نے علاء الملک سے کہا کہ ''میری مذکورہ دو مہموں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جو تدبیر و تجویز تیرے دماغ میں آئی ہے ، وہ میرے ان چار یاروں کی موجودگی میں بیان کر تا کہ میں اسے سر انجام دینے میں مشغول ہوں ۔''

علاء الملک عذر خواہی کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ''جہاں پناہ کو دین و شریعت اور مذہب کی باتیں ہرگز زبان پر نہ لانی چاہئیں کہ یہ کام انبیاء کا ہے ، بادشاہوں کا نہیں ؛ اور دین و شریعت کا تعلق آسمانی وحی سے ہے ، کسی انسان کی تدبیر و رائے سے اس کی بنیاد نہیں ڈالی جا سکتی ۔ حضرت آدم سے لے کر اس وقت تک دین و شریعت کے بانی انبیاء اور پیغامبر ہی رہے اور بادشاہت و سلطنت بادشاہ کرتے آئے ہیں ۔ جب سے یہ دنیا وجود میں آئی ہے اور جب تک رہے گی ، بادشاہ نبوت کر سکے ہیں نہ کر ہی پائیں گے ؛ البتہ بعض پیغمبروں نے بادشاہی بھی کی ہے ؛ سو اس عاجز غلام کی یہ التماس ہے کہ حضور اس کے بعد کبھی بھی کسی دین و شریعت اور مذہب کی بنیاد ڈالنے اور جو کچھ کہ پیغمبر کا خاصہ ہے (کہ جو ہمارے پیغمبر صلعم پر آ کر ختم ہوگیا) اس کے بارے میں ، کیا محفل شراب میں اور کیا دیگر محافل میں ، کوئی بات اپنی زبان پر نہ لائیں ، کیوں کہ اگر اس قسم کی باتیں کہ کوئی بادشاہ ایک نئے دین و مذہب کی بنیاد ڈالنا چاہتا ہے ، خواص و عوام کے کانوں تک پہنچ جائیں تو تمام رعایا اس سے بدظن ہو جائے گی ؛ ایک مسلمان بھی اس کے نزدیک نہ پھٹکے گا ؛ ملک میں ہر جگہ فتنہ و فساد اٹھ کھڑا ہوگا اور سلطنت خلل پذیر ہوگی ۔ عالم پناہ نے یہ تو سنا ہے کہ ملعون چنگیز خاں[۱۹] نے اسلامی ممالک میں کس قدر مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی تھی[۲۰] ، لیکن پھر بھی وہ اپنے منگولی دین و احکام کو عوام میں رائج نہ کر سکا ؛ نہ ان پر

تهوپ سکا ، بلکه بیشتر منگول مشرف به اسلام هوگئے اور انهوں نے دین محمدی کو قبول کر لیا۲۱ ۔ اس کے برعکس کوئی بھی مسلمان منگول نه هوا اور نه کسی نے منگولی مذهب هی کو اپنایا ۔ میں حضور کا ایک نمک خوار غلام هوں ؛ میری روح و رواں ، میری هستی و زیست اور میری زاد و بود حضور هی کے دم سے وابسته هے ؛ اگر حضور کی سلطنت میں خدا نه کرده کوئی فساد کھڑا هوا تو فسادی نه مجھے زنده چھوڑیں گے نه میرے اهل و عیال کو ، بلکه میرے پیروکاروں میں سے بھی وه کسی کو زنده نه رهنے دیں گے ۔ اور اگر میں حضور کی سلطنت میں کسی قسم کا خلل دیکھوں ، اور اسے واضح و روشن طور پر حضور کے گوش گزار نه کروں تو میں اپنے اهل و عیال اور پیروکاروں کی جانوں پر گویا ظلم کروں گا ۔ یه جو کلمات حضور کی زبان مبارک پر جاری هیں ، یه باعث فتنه و فساد هیں ، اور فساد بھی ایسا که سیکڑوں بزرجمهر ایسے داناؤں کی تدبیر بھی اسے ٹھنڈا نه کرسکے ۔ اور وه درباری جو عالم پناه کی غلامی اور اخلاص کا دم بھرتے هیں اور بهت سی محفلوں میں انهوں نے حضور کی غلامی میں یه باتیں سنی هیں ، ان پر صاد کیا هے اور تحسین و آفرین کے ڈونگڑے برسائے هیں ، تو انهوں نے منافقت و خوشامد سے کام لیا اور حضور کا حق نمک ادا نهیں کیا هے ۔''

سلطان علاؤالدین نے جب علاء الملک کی یه باتیں سنیں تو سر جھکا کر سوچ میں ڈوب گیا ۔ اس کے ان چاروں یاروں کو علاء الملک کی یه باتیں بے حد پسند آئیں ۔ وه اب اس بات کے منتظر تھے که دیکھیں سلطان ، علاء الملک کی باتوں کا کیا جواب دیتا هے ۔ تھوڑی دیر کے بعد سلطان نے علاء الملک سے کہا ''هم نے تجھے اپنا رازداں بنا رکھا هے اور اکثر مجھ پر مهربانی فرماتے رهتے هیں ؛ یهی وجه هے که هم تجھے نمک حلال سمجھتے هیں ۔ هم نے بارها یه دیکھا اور آزمایا هے که همارے سامنے تو نے همیشه درست بات هی کہی هے اور کبھی حق بات کو نهیں چھپایا ۔ میں نے اس لمحے اس بات پر

غور و فکر کیا ہے اور معاملے کو ویسا ہی پایا ہے جیسا کہ تو نے کہا ہے ۔ واقعی مجھے ایسی باتیں زبان پر نہ لانی چاہئیں ۔ اب اس کے بعد کسی بھی محفل میں کوئی بھی مجھ سے ایسے کلمات نہیں سنے گا ۔ تجھ پر اور تیرے والدین پر خدا کی ہزاروں رحمتیں نازل ہوں کہ تو نے میرے سامنے حق گوئی سے کام لیا اور صحیح طور پر خود کو نمک حلال ثابت کیا ۔ اب یہ بتا کہ دوسری مہم کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے ؛ کیا وہ بھی غلط ہے یا صحیح ؟'' علاء الملک نے دوسری مہم کے بارے میں ، کہ دنیا پر قبضہ کرنا ہے ، سلطان سے کہا ''جہاں تک دوسری مہم کا تعلق ہے تو یہ ارادہ تو بڑے بلند ہمت سلطانوں کا ہے ، اور جہاں گیری کے طور طریقے یہ ہیں کہ سلاطین اس بات کے خواہاں ہوں کہ وہ تمام دنیا کو فتح کر کے اسے اپنے تصرف میں لے آئیں ۔ جہاں پناہ اپنے اتنے خزانوں ، دفینوں ، فوجوں اور ہاتھیوں کو لے کر پایۂ تخت سے تیار و مستعد ہو کر نکل سکتے اور داد جہاں گیری دے سکتے ہیں ۔ میں اس دوسری مہم پر عمل پیرا ہونے کا منکر نہیں ہوں ۔ اور مجھے علم ہے کہ فیل خانے اور تھان میں بے شمار ہاتھی اور گھوڑے جمع اور خزانے بے انتہا مال و دولت سے معمور ہو چکے ہیں کہ جن سے عالم پناہ دو تین لاکھ سوار نوکر رکھ سکتے ہیں ، اور تمام دنیا کو فتح اور جہاں گیری کر سکتے ہیں ۔ لیکن حضور کو یہ بات ذہن میں رکھنی اور اس پر غور کرنا چاہیے کہ دہلی اور مملکت ہند کو ، کہ بہت بڑی دولت ضائع کرنے اور بہت خوں ریزی کے بعد قبضے میں آئی ہے ، کس کے سپرد کریں گے ؟ جس کے سپرد کریں گے اس کے پاس کتنی فوج رہنے دیں گے اور خود کتنی رکھیں گے ۔ اگر حضور جہاں گیری کے لیے نکل پڑیں اور سکندر کی طرح دنیا کو قبضے میں لے آئیں اور پھر جس کسی کو حضور دہلی میں یا کسی دوسری مملکت میں مقرر کر جائیں گے ، جب وہ اپنے دارالملک کی طرف لوٹنا چاہے گا تو ان لوگوں اور علاقوں کو ، جو ایسے موقعوں پر بغاوت اختیار کر لیتے ہیں ، ظلم و ستم سے کیوں کر باز رکھ سکے گا ؟ سکندر کے طور طریقے اور تھے اور اس کا

زمانہ کچھ اور زمانہ تھا۔ پھر اُس زمانے کے لوگوں کی گھٹی میں
یہ بات پڑی تھی کہ جو قول ایک مرتبہ کرتے ، سال ہا سال گزرنے
پر بھی اس پر قائم رہتے ۔ اُس دور میں لوگوں کا رجحان دغا ،
فریب ، مکر ، جھوٹ ، وعدہ خلافی اور بہانہ جوئی کی طرف کم تھا ۔
اور اگر کوئی حاکم یا کسی ملک کے لوگ سکندر یا کسی دیگر
بادشاہ سے کسی قسم کا وعدہ وعید کرتے ، تو بہر صورت اس کی
موجودگی یا غیر موجودگی میں اپنے اس قول پر ڈٹے رہتے اور کسی
طرح بھی وعدہ خلافی کی طرف مائل نہ ہوتے ۔ بھلا ارسطو ایسا
وزیر کہاں ملے گا کہ روم کے خواص و عوام باوجود کثرت افراد ،
وسعت سلطنت اور فراخی نعمت کے اس کا اس طرح حکم مانتے اور
اس پر اعتماد کرتے رہیں ؛ اس کے قول و قلم اور دیانت و ایمان داری پر
اس قدر بھروسا کریں اور کسی نوکر چاکر یا غلام کی مدد کے بغیر
اس کی وزارت و نیابت پر اس طرح راضی و مستعد ہوں کہ سکندر کی
غیر موجودگی میں اس کے (ارسطو) حکم سے سر مو بھی انحراف نہ برتیں
اور شورش و بغاوت کا خیال تک بھی ذہن میں نہ لائیں اور جب
سکندر بتیس سال کے بعد فاتح عالم بن کر اپنے پرانے پایۂ تخت میں داخل
ہو تو مملکت روم کو مانند سابق پر امن ، مستحکم اور مطیع و منقاد
پائے اور چوتھائی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ کی مدت میں اس کی قدیم
سلطنت میں کسی قسم کا فتنہ ، ہنگامہ اور انتشار پیدا نہ ہو ۔ بد قسمتی
سے ہمارے زمانے کے لوگ اس کے بالکل برعکس ہیں ؛ خاص طور پر
ہندو کہ ان کا قطعاً کوئی عہد و پیمان نہیں ہے ، اس لیے کہ اگر یہ
اپنے سر پر کسی زبردست اور جابر بادشاہ کو نہ پائیں اور اپنے ملک و
مال اور جان پر سواروں اور پیادوں کا عظیم لشکر اور سونتی ہوئی
تلواریں نہ دیکھیں تو ہرگز اطاعت و فرماں برداری اختیار نہ کریں ؛
خراج دینے سے منکر ہوں اور شورش و بغاوت برپا کر دیں ۔ عالم پناہ
کی سلطنت و حکومت ، کہ اقلیم ہند میں ہے ، ایسے لوگوں کے ہوتے
ہوئے کہ جن کا کوئی قول و عہد نہیں ہے اور نہ جن میں کسی قسم

کی وفا ہے ، حضور کی غیر موجودگی (اور غیر موجودگی بھی ایسی کہ سال ھا سال تک کی ہوگی) کی تاب کیوں کر لا سکے گی ؟''

سلطان نے علاء الملک کے جواب میں کہا کہ ''جس قدر مال و دولت اور ھاتھی گھوڑے میرے پاس ھیں ، اگر میں دنیا کو فتح نہ کروں ، دوسری اقلیموں کو قبضے میں نہ لاؤں اور صرف مملکت دھلی پر قانع ھو جاؤں تو اس مال و دولت کا کیا فائدہ اور میں فاتح عالم کا نام کیوں کر پاؤں گا ؟'' علاء الملک بولا ''میں حضور کا قدیم غلام ھوں ، مجھے تو اسی بات میں مصلحت نظر آتی ہے کہ حضور دو مہموں کو دوسری تمام مہمات پر ترجیح دیں ؛ اس کے بعد دیگر مہموں کی طرف توجہ کریں۔'' سلطان نے پوچھا ''وہ دو مہمیں کون سی ھیں جنھیں دوسری مہمات پر مقدم جاننا چاھیے؟'' اس نے جواب دیا کہ ''ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ھندوستان کی تمام اقلیموں کو ــــ مثلاً رنتھنبور ، چتوڑ ، چندیری ، مالوہ ، دھار ، اجین ، مشرق کی طرف سے دریائے سرجو کے کنارے تک ، سوالک سے جالور تک ، ملتان سے دمریلہ تک اور پالم پور سے لاھور اور دیپال پور ــــ مطیع و منقاد بنایا جائے اور مطیع بھی ایسا کہ پھر کسی باغی یا مفسد کا نام کسی کی زبان پر نہ آئے۔ دوسری مہم اس سے بھی زیادہ اھم ہے اور وہ ہے ملتان کے راستے کو منگولوں کے خطرے سے بچنے کے لیے بند کرنا ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس طرف کے قلعوں میں قابل اعتماد کوتوالوں کو مقرر کیا جائے ، قلعوں کی مرمت کی جائے ، خندقیں کھودی جائیں ، اسلحہ ، راشن اور چارہ وغیرہ ذخیرہ کیا جائے ، بڑی بڑی توپیں اور منجنیقیں نصب کی جائیں اور ماھر ، مضبوط اور دلیر افسر مقرر کیے جائیں ۔ جب سامانہ ، دیپال پور اور ملتان میں سردار وغیرہ لشکر ، سوار ، اور پیادے ساز و سامان کے ساتھ متعین کیے جائیں گے تو اس سے منگولوں کا داخلہ بند ھوجائے گا ۔ لیکن جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ منگول ھندوستان کی طرف بالکل رخ نہ کریں ، تو یہ کام تجربہ کار ، اور وفادار فوجی سرداروں ، منتخب اور برگزیدہ خدام ، ھاتھیوں اور

چاق و چوبند لشکرهی کا ہے - اور جب یہ دونوں مہمات ، یعنی ہندوستان کے مختلف علاقوں سے ہندوؤں کی شورش و بغاوت کو ختم اور پایۂ تخت میں منگولوں کے داخلے کو روکنے کے لیے بڑے بڑے اور نامور امرا کو ساز و سامان اور لشکر سے آراستہ کرنا ، حسب منشا انجام پذیر ہو جائیں تو پھر حضور کو فارغ خاطر ہو کر اپنے دارالخلافہ دہلی میں مقیم رہنا اور سلطنت کے کاموں کو دل جمعی کے ساتھ سر انجام دینا چاہیے ، کیوں کہ بادشاہ کی استقامت مرکز میں جبھی ممکن ہے کہ اس کے خاص علاقوں میں بھی استقامت و استحکام ہو ؛ بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھا جہاں گیری کرے اور ہر طرف اپنے مخلص و صاحب اعتبار غلاموں کو چاق و چوبند لشکر کے ساتھ اور پر خلوص امرائے سلطنت کو نام زد کرے ، تاکہ وہ دور دور کے ممالک پرحملہ آور ہوں اور ہندوستان کی دیگر سلطنتوں کو اپنی تاخت و تاراج کا نشانہ بنائیں ؛ راجوں اور مہاراجوں کے ہاتھی گھوڑے اور مال و اسباب قبضے میں کریں اور انہیں بادشاہ کے حضور میں پیش کریں - اسی طرح ان علاقوں کے راجاؤں اور حکمرانوں کو انھی کے علاقوں پر مقرر و متعین کریں اور یہ شرط رکھیں کہ وہ لوگ ہر سال بادشاہ کو ہاتھی ، گھوڑے اور مال و اسباب بھیجا کریں گے -''

علاءالملک یہ مشورہ دینے کے بعد آداب بجا لایا اور کہنے لگا کہ ''بندے نے جو کچھ حضور کی خدمت میں عرض کیا ہے اس کا حصول اس وقت تک ممکن نہیں جب تک حضور بے حد شراب نوشی ، ہمیشہ مجالس عیش و نشاط برپا کرنے اور دن رات شکار کے پیچھے لگے رہنے سے ہاتھ نہیں اٹھاتے ؛ جب تک اپنے دارالخلافے میں مسلسل اقامت و استقامت اختیار اور سلطنت و حکمرانی کے مسائل و مصالح میں اپنے مخلص غلاموں کا مشورہ قبول نہیں کرتے ؛ اس لیے کہ بادشاہ کی کثرت شراب نوشی کے سبب سلطنت کے تمام کام معطل اور دگرگوں ہو جاتے ہیں ؛ جہاں بانی کے امور کماحقہ اور صحیح طور پر انجام پزیر نہیں ہو پاتے - پھر شکار میں ہر وقت مصروف رہنے کے باعث شورش اور مکاروں غداروں کی فریب‌کاری کا ڈر اور نفس بادشاہ متزلزل رہتا ہے ، اور جب

مملکت کے خواص و عوام کو اس امر کا یقین ہوجاتا ہے کہ بادشاہ تو ہر گھڑی اور ہر لمحہ شراب خوری و شکار میں مصروف و محو رہتا ہے تو ان کے دلوں سے اس کا رعب اٹھ جاتا اور باغیوں کو شورش و بغاوت کا موقع مل جاتا ہے ۔ اور اگر شراب و شکار لازم ہی ٹھہرے تو پھر حضور کو چاہیے کہ بغیر کسی محفل یا شریک محفل کے نماز دیگر کے بعد شراب پئیں اور وہ بھی اتنی کہ مدھوشی و مستی سے بچے رہیں۔ جہاں تک شکار کا تعلق ہے ، اس کے لیے کسی سیر گاہ میں ایک محل تعمیر کرا لیا جائے جس کے چاروں طرف بڑے وسیع و عریض میدان ہوں اور ان میدانوں میں شکرے پالے اور چھوڑے جائیں ، اور اس طور سے اپنی خواہش شکار کو پورا کیا جائے ، تاکہ حکومت کے حریصوں اور باغیوں کو کسی خام طمع میں پڑنے کا موقع ہی نہ ملے ۔ اور ہمیں تو حضور کی زندگی اور سلطنت کی پائندگی ہی مطلوب ہے کہ انہی دو چیزوں سے ہماری اور ہمارے اہل و عیال کی زندگی وابستہ ہے ؛ کیونکہ اگر خدا نہ کرے خدا نہ کرے ! یہ ملک کسی اور کے تصرف میں آجائے تو وہ نہ ہمیں زندہ و سلامت چھوڑے گا ، نہ ہمارے بیوی بچوں اور عزیز و اقارب کو۔''

جب سلطان نے علاء الملک کی یہ باتیں سنیں تو بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ ''تو نے واقعی صحیح باتیں کہی ہیں ؛ ہم ان شاءاللہ ان باتوں پر جو خدائے بزرگ و برتر نے تیرے منہ سے نکلوائی ہیں ، عمل کریں گے'' اس کے بعد سلطان نے علاء الملک کو جامۂ زردوزی جس پر شیر کی تصویر تھی ، زریں کمر بافت نیم سیری ، دس ہزار تنکہ ، دو زین دار گھوڑے اور دو گاؤں انعام میں دیے ۔ اور ان چاروں یاروں نے ، جن کے سامنے علاء الملک نے سلطان کے حضور میں صبح سے لے کر دوپہر تک اپنے خیالات بیان کیے تھے ، تین تین چار چار ہزار تنکے اور دو دو تین تین زین سے آراستہ گھوڑے اس کے گھر بھجوائے ۔

علاء الملک کے یہ خیالات و تجاویز وزیروں ، امیروں اور شہر کے دانش مندوں تک پہنچ گئیں ۔ انہوں نے اس کی ذہانت و دانائی اور

خیالات و تجاویز کی تحسین و آفرین کی ۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب ظفر خاں ہنوز زندہ اور سیوستان کی مہم سے واپس دربار میں پہنچا ہوا تھا اور ابھی قتلغ خواجہ ملعون کی لڑائی نہ ہوئی تھی ۔

(تاریخ فیروز شاہی، صفحہ ۹۲ تا ۱۰۲)

---

(۷)

سلطان علاءالدین اور قاضی مغیث الدین کے درمیان گفتگو

سلطان علاءالدین ایک علم سے بے بہرہ بادشاہ تھا جس نے کبھی صاحبان علم و فضل کے ساتھ نشست و برخاست نہ رکھی ۔ اس کے دل میں یہ بات بری طرح سما چکی تھی کہ حکمرانی و فرماں روائی دین و مذہب اور شرع و شریعت سے بالکل الگ ایک جداگانہ معاملہ ہے ۔ اور یہ کہ شاہی احکام بادشاہ سے اور احکام شریعت قاضیوں اور مفتیوں سے متعلق ہیں ۔ اپنے اسی عقیدے کے تحت وہ اپنی حکمرانی کے لیے جو کام بھی مناسب سمجھتا اور جس امر میں بھی اسے ملک کی مصلحت نظر آتی اسے وہ ضرور کرتا ، خواہ وہ شرعی ہوتا خواہ غیر شرعی ۔ اس نے اپنی حکومت و فرماں روائی کے امور میں کبھی کوئی مسئلہ یا روایت معلوم کرنے کی سعی نہ کی ۔ یہی سبب تھا کہ ارباب عقل و دانش اس کے یہاں کم ہی آتے جاتے تھے ؛ صرف قاضی ضیاءالدین بیانہ ، مولانا ظہیر لنگ اور مشید کہرامی دسترخوان پر بیٹھنے کے مجاز تھے، اور یہ تینوں امرا کے ساتھ باہر دسترخوان پر بیٹھا کرتے تھے ۔

قاضی مغیث الدین بیانہ کا سلطان کے یہاں آنا جانا تھا اور اکثر امیروں کے ساتھ خلوت میں اس کی نشست رہتی ۔ جن دنوں خراج ، تاوان اور مطالبات وغیرہ کی کارروائی سے متعلق جد و جہد ہو رہی تھی تو ایک روز سلطان نے قاضی مغیث سے کہا ”آج میں تم سے چند ایک مسئلے پوچھنا چاہتا ہوں ، اس سلسلے میں مجھ سے وہی کچھ بیان کرنا جو واقعی صحیح ہو ۔“ قاضی نے جواب میں کہا ”معلوم ہوتا ہے میری

موت قریب آپہنچی ہے ۔'' سلطان نے پوچھا ''تمہیں کیوں کر معلوم ہوا؟'' قاضی بولا ''اس لیے کہ جہاں پناہ مجھ سے دینی مسائل پوچھیں گے، اور میں اس سلسلے میں حق بات کہوں گا؛ ظاہر ہے اس سے عالم پناہ کو طیش آئے گا اور مجھے مروا ڈالیں گے ۔'' سلطان نے کہا ''میں تمہیں مرواؤں گا نہیں، بس جو کچھ تم سے پوچھتا ہوں وہ مجھے صحیح صحیح بتاؤ ۔'' اس پر قاضی کہنے لگا کہ ''حضور جو کچھ مجھ سے پوچھیں گے اس کے متعلق میں نے جو کچھ بھی کتابوں میں پڑھا ہوگا وہ بیان کردوں گا ۔''

سلطان علاؤ الدین نے قاضی مغیث سے پہلا مسئلہ یہ پوچھا کہ شرع کے مطابق کون سے ہندو کو جزیہ گزار اور خراج دہ کہا جاتا ہے ؟'' قاضی نے جواب دیا ''شرع کے مطابق خراج گزار اس ہندو کو کہتے ہیں کہ جب محصل[۲۲] اس سے چاندی طلب کرے تو وہ بغیر کسی خدشے کے کمال عاجزی و انکساری اور تعظیم کے ساتھ اسے سونا پیش کرے، اور اگر محصل اس کے منہ میں تھوکنا چاہے تو وہ بغیر کسی حیل و حجت اور اظہار نفرت کے اپنا منہ آگے کر دے تاکہ محصل اس میں تھوک لے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ اس کی خدمت بھی بجا لائے ۔ اس (ہندو) کی اس نرمی و عاجزی سے مراد اس کا متواضع و فروتن ہونا ہے اور محصل کا اس کے منہ میں تھوک ڈالنا اس (ہندو) ذمی کی کمال اطاعت کی نشان دہی کرتا ہے ۔ اس کے علاوہ اس سے سچے مذہب اسلام کی عزت اور جھوٹے دین کی ذلت مقصود ہے ۔ خود خدائے بزرگ و برتر ان باطل مذہب والوں کی ذلت و خواری کے متعلق فرماتا ہے ''یہاں تک کہ وہ ذلت کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے (جزیہ ادا کریں ۔) اور خصوصاً ہندوؤں کی تذلیل و تحقیر تو گویا اپنے مذہب کے لوازمات میں سے ہے، اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے دشمن یہی لوگ ہیں ۔ اور حضور صلعم نے ان کے مار ڈالنے، انہیں لوٹ لینے اور غلام بنا لینے کے متعلق حکم فرمایا ہے ۔ یا تو یہ لوگ اسلام قبول کریں، نہیں تو ان کی گردن ماری جائے، انہیں غلام بنایا جائے اور ان کا ملک و مال و اسباب چھین لیا جائے ۔

سوائے امام اعظم ابو حنیفہ کے ، جن کے ہم مقلد ہیں ، کسی سے بھی ہندوؤں اور دیگر مذاہب والوں سے جزیہ قبول کرنے کے بارے میں کوئی روایت نہیں ہے ۔ دوسرے عالموں نے تو ہندوؤں کے بارے میں 'اما القتل و اما الاسلام' کا فتویٰ صادر کیا ہے ۔''

سلطان قاضی کا یہ جواب سن کر ہنس دیا اور کہنے لگا ''یہ جو باتیں تم نے مجھے بتائی ہیں میں ان سے بالکل بے خبر تھا ، لیکن مجھ تک ایسی خبریں بہت پہنچی تھیں کہ خوط اور مقدم[۲۳] تنومند اور خوب صورت گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں ، بڑا ستھرا لباس پہنتے ہیں ، ایرانی کمانوں سے تیراندازی کرتے ہیں ، ایک دوسرے سے لڑتے اور شکار وغیرہ کو جاتے ہیں ، لیکن وہ اپنے جزیے ، خراج ، کری اور چرائی[۲۴] سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں بھیجتے ۔ دیہاتوں سے خوطی کا حصہ علیحدہ لیتے ہیں ، عیش و نشاط کی محفلیں برپا کرتے اور شراب پیتے پلاتے ہیں ۔ ان میں سے بعض تو کسی صورت بھی دیوان میں نہیں آتے اور نہ کبھی محصلوں ہی کی پروا کرتے ہیں ۔ ایسی خبریں سن کر مجھے بڑا طیش آیا ؛ میں نے جی میں سوچا کہ میری تو یہ خواہش ہے کہ میں دوسری سلطنتوں کو فتح کروں اور دیگر ممالک کو اپنے تصرف میں لاؤں ، لیکن جب میری اس سو کوس کی سلطنت میں لوگ میری کما حقہ اطاعت و فرماں برداری نہیں کر رہے تو بھلا دوسرے ممالک کو اپنا مطیع و منقاد کیوں کر بنا سکوں گا ۔ اسی لیے میں نے میزان بندی کی اور رعایا کو اطاعت گزار و فرماں بردار بنایا اور اس طرح انہیں (رعایا) اتنا سیدھا کر دیا کہ میرے حکم پر وہ چوہے کے بل میں بھی گھسنے سے دریغ نہ کریں ۔ اور اب تم یہ بتا رہے ہو کہ شرع میں بھی یہی ہے کہ ہندوؤں کو مکمل طور پر مطیع و فرماں بردار بنانا چاہیے ۔''

اس کے بعد سلطان نے قاضی سے کہا ، ''مولانا مغیث ! تم ہو تو صاحب عقل و دانش لیکن تجربے سے بالکل عاری ہو ۔ اس کے برعکس میں ایک بے علم مگر بہت زیادہ تجربہ کار ہوں ۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہندو اس وقت تک مسلمانوں کا مطیع نہیں ہوتا جب تک وہ بالکل مفلس اور کنگال نہ ہو جائے ۔ اسی لیے میں نے یہ فرمان جاری

کیا ہے کہ لوگ اپنے پاس صرف اتنا ہی غلہ اور پیسہ وغیرہ رکھیں جس سے وہ اپنا سال بھر کا خرچ چلا اور کھیتی باڑی وغیرہ کا سلسلہ کر سکیں اور نہ اتنا کہ جو کسی قسم کی ذخیرہ اندوزی یا زیادتی کا سبب بنے۔"

سلطان نے قاضی مغیث سے دوسرا مسئلہ یہ پوچھا کہ "آیا حکومت کے کارندوں کی چوری چکاری، رشوت ستانی اور ان لوگوں کے متعلق جو حساب لکھنے میں گڑ بڑ کرتے ہیں، شرع میں کہیں ذکر آیا ہے؟" قاضی نے جواب دیا "کسی جگہ بھی ایسا مذکور نہیں اور نہ میں نے کسی کتاب ہی میں یہ پڑھا ہے کہ اگر حکام اور کارندوں کو اپنی ضروریات کے مطابق مشاہرہ وغیرہ نہ ملے اور وہ لوگ بیت المال، کہ جس میں رعایا کا خراج جمع کیا ہوتا ہے، کے مال میں گڑبڑ کریں یا رشوت لیں اور مالیہ یا خراج کو کم کریں تو اولی‌الامر مصلحت وقت کے مطابق انہیں جرمانے یا قید وغیرہ کی سزا دے سکتا ہے۔ مگر اس قسم کے چور کے بارے میں کہ جو خزانے سے مال چرائے کہیں بھی یہ نہیں آیا کہ اس کے ہاتھ کاٹ دیے جائیں۔" سلطان کہنے لگا "میں نے ارباب خزانہ و محاسبہ کو حکم دیا ہے کہ کارکنوں، متصرفوں اور حاکموں کے ذمے جو بھی رقمیں نکلتی ہیں وہ ان سے ہر صورت میں وصول کی جائیں؛ خواہ انہیں مارپیٹ سے زخمی کرنا اور شکنجوں اور زنجیروں میں جکڑنا ہی کیوں نہ پڑے۔ جو حکام بہت زیادہ مشاہرے کا مطالبہ کرتے تھے ان کے یہاں، مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس وقت چوری اور رشوت ستانی بہت کم ہوگئی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ میں نے یہ فرمان بھی جاری کیا ہے کہ متصرفوں[۲۵] اور عہدہ داروں کو اس قدر مشاہرہ دیا جائے کہ وہ عزت و آبرو کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔ اور اگر اس پر بھی وہ چوری چکاری اور اصل مال میں گڑبڑ کریں تو انہیں لاٹھیوں سے پیٹ پیٹ کر ان سے مذکورہ رقوم حاصل کی جائیں۔ سو اب تم جان گئے ہوگے کہ حاکموں اور متصرفوں پر یہ سختی کیوں کی جا رہی ہے۔"

تیسرا مسئلہ سلطان نے یہ پوچھا کہ "آیا اس مال و دولت کا جو

میں نے اتنے خون خرابے کے بعد دیوگیر سے حاصل کی ہے ، حق دار میں ہوں یا اسے مسلمانوں کے بیت المال کا مال سمجھا جائے گا؟" قاضی نے جواب دیا "میرے لیے حضور کے سامنے سچ کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ؛ وہ مال و دولت جو عالم پناہ دیوگیر سے لائے ہیں ، اس کے حصول میں لشکر اسلام کی قوت کو دخل ہے ، اور ہر وہ مال جو اسلامی لشکر کی قوت و مدد سے حاصل کیا جائے وہ مسلمانوں کے بیت المال کا حصہ قرار پائے گا ۔ اگر تنہا جہاں پناہ نے کسی جگہ سے کوئی مال حاصل کیا ہوتا اور حضور کے لیے اس کے شرعی طور پر جائز ہونے کا کوئی جواز ہوتا تو وہ مال حضور کی ملکیت ہوتا ۔"

سلطان کو قاضی کی اس بات پر غصہ آ گیا؛ اس سے کہنے لگا "کیسی باتیں کرتے ہو ! کچھ خبر بھی ہے کیا کہہ رہے ہو ! وہ مال جس کے لیے میں نے اپنی اور اپنے نوکروں کی جان کی بازی لگا دی اور جو میں ان ہندوؤں سے جن کا دہلی میں کوئی نام و نشان بھی نہ جانتا تھا ، فتح کے وقت لایا ہوں اور جسے میں نے شاہی خزانے میں جمع نہ کرایا بلکہ اپنے ہی قبضے میں رکھا ، تو ایسا مال کیوں کر بیت المال کا حصہ ٹھہرا؟" قاضی مغیث نے جواب دیا کہ "خداوند عالم مجھ سے شریعت کا مسئلہ پوچھ رہے ہیں تو اس سلسلے میں میں نے جو کچھ کتاب میں پڑھا اور دیکھا ہے اگر وہی کچھ عرض نہ کروں اور حضور کی موافقت طبع کی خاطر جھوٹ تراشوں اور حضور جو کچھ مجھ سے پوچھ رہے ہیں وہی امتحان کے طور پر کسی اور صاحب دانش سے پوچھ لیں ، اور وہ میرے اس قول کے بالکل برعکس بتائے تو اس سے خداوند عالم کا اعتماد مجھ پر کیا رہے گا ، اور اس کے بعد حضور مجھ سے حکم شرع کیوں کر پوچھیں گے ؟"

چوتھا مسئلہ سلطان نے قاضی مغیث سے یہ دریافت کیا کہ "بیت المال پر میرا اور میری اولاد کا حق کس حد تک ہے ؟" قاضی جواب میں بولا کہ "اب میری موت کا وقت آ پہنچا ۔" سلطان نے پوچھا "وہ کیوں کر ؟" اس نے جواب دیا کہ "یہ جو مسئلہ جہاں پناہ نے خاکسار سے دریافت کیا ہے ، اگر اس کا صحیح جواب دیتا ہوں تو

حضور ناراض ہو جائیں گے اور مجھے مروا ڈالیں گے اور اگر جھوٹ کہتا ہوں تو روز قیامت دوزخ کا ایندھن بنوں گا۔'' سلطان نے کہا ''میں تمھیں ہرگز قتل نہیں کروں گا؛ تم جو کچھ شرع کا حکم ہے وھی بیان کرو۔'' قاضی جواب میں کہنے لگا ''اگر جہاں پناہ خلفائے راشدین (رضوان اللہ علیہم) کی پیروی کریں اور آخرت کے طلب گار ہوں تو پھر جس طرح اھل جہاد کے لیے حضور نے دو سو چونتیس تنکے مقرر کیے ھیں، اسی قدر حضور کو اپنے نفقہ خاصہ اور حرم کے لیے رکھنے چاھئیں، اور اگر جہاں پناہ اعتدال کو بروے کار لائیں اور یہ سمجھیں کہ اتنی مقدار سے جو کہ تمام خدم و حشم کو دی جاتی ہے، کام نہیں چلتا اور عزت اولی الامری قائم نہیں رھتی تو پھر جس قدر حضور اپنے دربار کے بڑے بڑے امرا مثلاً ملک تیران، ملک قیریک، ملک نائب، وکیل در اور ملک خاص حاجب۲۶ کو دیتے ھیں، اسی قدر اپنے نفقہ خاصہ اور حرم کے لیے بیت المال سے لے سکتے ھیں۔ اگر عالم پناہ دنیوی علماء کی روایت کی بنا پر بیت المال سے اپنے نان و نفقہ اور حرم کے لیے مال لینا چاھیں تو اس قدر لیں کہ وہ دربار کے دوسرے امرا سے صرف اتنا ھی زیادہ اور بہتر ہو کہ جس سے خداوند عالم کی انفرادیت بھی قائم رہے اور حکمرانی کی عزت بھی مٹنے نہ پائے۔ اور اگر حضور بیت المال سے ان تین طریقوں سے بھی، جو کہ خاکسار نے ابھی عرض کیے، زیادہ مال نکالیں، اور اپنے حرم کو لاکھوں، کروڑوں روپے، زرین اور مرصع اشیاء تحفے میں پیش کریں تو اس کے لیے حضور کو روز قیامت جواب دہ ہونا پڑے گا۔''

سلطان طیش میں آ گیا؛ قاضی سے کہنے لگا ''کیا تم میری تلوار سے نہیں ڈرتے؟ تمھارے خیال میں جتنی بھی دولت میرے حرم میں خرچ ہوتی ہے وہ سب غیر شرعی ہے؟'' قاضی نے جواب دیا ''میں حضور کی تلوار سے ڈرتا ہوں اور اپنے کفن کو، کہ یہ میری دستار ہے، سامنے لاتا ہوں؛ گیتی پناہ چوں کہ شرعی مسئلہ پوچھ رہے ھیں اس لیے اس کے بارے میں جو کچھ اس بندے کو معلوم ہے وھی عرض کر رھا ہوں۔ اور اگر خداوند عالم مجھ سے ملکی مصلحت کے متعلق

ذریافت فرماتے ہیں تو میں عرض کروں گا کہ جو کچھ حرم میں صرف کیا جاتا ہے اس سے کہیں بڑھ کر خرچ کرنا چاہیے کہ اسی سے ظل اللہ کی عزت لوگوں میں بڑھے گی اور حضور کی عزت میں افزائش ہی ملکی مصلحت کا تقاضا ہے ۔" ان تمام مسئلوں سے متعلق سوال جواب کے بعد سلطان نے قاضی سے کہا "جس طریق پر تم میرے تمام کاموں کو غیر شرعی بتا رہے ہو اس طرح تو میرا یہ حکم بھی کہ جو سوار عرض[۲۷] میں پہنچے اس سے تین سال کا مواجب استدراک[۲۸] لیں ، اور یہ جو شراب پینے اور بیچنے والوں کو قید و بند میں ڈالتا ہوں ، زانی کا عضو مخصوص کٹوا ڈالتا اور زانیہ کو مروا دیتا ہوں ، بغاوتوں میں نیک و بد اور اعلیٰ و ادنیٰ کو مارنے کے بعد ان کے بال بچوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیتا ہوں ، لوگوں سے مال مطالبہ (مالیہ) مار پیٹ سے اور چمٹوں اور شکنجوں کی تکلیفیں دے دے کر طلب کرتا ہوں ، یہاں تک کہ اگر ایک کوڑی بھی 'مطالبہ' میں سے باقی رہ جائے تو انہیں زنجیروں میں جکڑ کر قید میں ڈال دیتا ہوں ، اور ملکی قیدیوں کو سخت سزائیں دیتا ہوں ، یہ سب کچھ تمہارے نزدیک غیر شرعی ہوگا؟" قاضی مغیث محفل سے اٹھ کر ذرا پرے چلا گیا اور پیشانی زمین پر رکھ کر بہ آواز بلند کہنے لگا "سلطان عالم ! اس فقیر کو خواہ زندہ چھوڑ دیں خواہ اسی لمحے قتل کا فرمان صادر کر دیں ، سچی بات تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ بھی غیر شرعی ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور علماء کی روایتوں میں کہیں بھی یہ نہیں آیا کہ اولی الامر اپنا حکم منوانے کی خاطر جو چاہے کر سکتا ہے ۔"

سلطان نے قاضی کی یہ باتیں سن کر خاموشی اختیار کر لی اور جوتے پہن کر حرم میں چلا گیا؛ قاضی بھی گھر لوٹ گیا؛ دوسرے روز اس (قاضی) نے اپنے اہل و عیال کو وداع آخرت کہی ، صدقہ دیا ، غسل کیا اور تلوار سے موافقت کرتے ہوئے شاہی محل میں سلطان کے پاس پہنچا؛ سلطان نے اسے پاس بلایا ، اس پر نوازش کی اور جو لباس اس وقت

پہن رکھا تھا وہ اور ایک ہزار تنکے اسے عنایت کیے؛ پھر کہنے لگا
''قاضی مغیث ! میں اگرچہ بالکل ناخواندہ ہوں لیکن پشتہا پشت سے
مسلمان اور مسلمان زادہ ہوں ، اور محض اس لیے کہ کوئی بغاوت
نہ ہو، کہ اس میں ہزاروں انسان مارے جاتے ہیں ، جس چیز میں بھی
ملک اور رعایا کی بہتری دیکھتا ہوں ، اسی کے متعلق حکم صادر کرتا
ہوں ، مگر لوگ ہٹ دھرمی اور بے توجہی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور
میرے فرمان پر عمل پیرا نہیں ہوتے جس کے سبب میں مجبور ہو جاتا
ہوں کہ ان سے سختی برتوں تاکہ وہ اطاعت و فرمان برداری اختیار
کریں ۔ مجھے اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ میرے یہ احکام شرعاً
جائز ہیں یا ناجائز ، مجھے تو جس بات میں ملک کی بہبود اور جو
مصلحت وقت نظر آتی ہے اسی کے مطابق فرمان جاری کر دیتا ہوں ۔
اس کی مجھے خبر نہیں ہوتی کہ قیامت کے روز اللہ جل شانہ مجھ سے
کیا سلوک کرے گا ۔ لیکن مولانا مغیث ! عبادت کے وقت میں
اللہ تعالیٰ سے یہ بات ضرور کہتا ہوں کہ بار الٰہا ! تو جانتا ہے کہ
اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی عورت سے حرام کاری کرے تو
میری سلطنت میں اس سے کچھ نقصان نہیں ہوتا ؛ اگر کوئی شراب
پیتا ہے تو جب بھی اس سے مجھے کوئی نقصان نہیں ؛ اگر کوئی چوری
کرتا ہے تو میرے باپ دادا کی جائداد سے کچھ نہیں لے جاتا جو مجھے
اس کا درد ہو ؛ اگر کوئی تنخواہ وغیرہ وصول کر لیتا ہے اور اپنے
متعلقہ فوجی دستے میں نہیں جاتا تو دس بیس آدمیوں کے جانے نہ جانے
سے اس دستے کا کام تو نہیں رک جاتا ۔ یوں تو میں ان چار قسم کے
لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کروں جو پیغمبروں نے فرمایا ہے ، لیکن
اس دور میں ایسے انسان وجود میں آئے ہیں کہ جو ایک سے لے کر
ایک لاکھ تک ، بلکہ لاکھوں سے کروڑوں تک ، گویا سبھی ، سوائے
باتیں بنانے ، لاف زنی کرنے اور دنیا و آخرت کی پروا نہ کرنے کے اور
کوئی کام جانتے ہی نہیں ۔ اور میں نے کہ جاہل اور ان پڑھ
ہوں اور سوائے قل ھو اللہ ، دعائے قنوت اور التحیات کے اور کچھ

نہیں جانتا ، اپنی اس جہالت میں یہ حکم صادر کیا ہے کہ اگر کوئی شادی شدہ آدمی کسی دوسرے کی بیوی سے حرام کاری کرے تو اسے خصی کر دیا جائے۔ (میرے اس شدید اور عبرت آموز حکم کے باوجود میرے دربار میں ایسے بہت سے لوگ پیش کیے جاتے ہیں جو اس فعل کے مرتکب ہوتے ہیں) ۔ اور وہ جو تنخواہ تو وصول کرلیتا ہے لیکن اپنے متعلقہ لشکر میں نہیں جاتا ، اس سے تین سال کی تنخواہ وصول کی جائے ۔ (اور شاید ہی کوئی لشکر ایسا ہوگا جس میں سو دو سو آدمی ایسے نہ ہوتے ہوں ۔ کم بخت پیسہ تو حاصل کر لیتے ہیں لیکن لشکر میں نہیں جاتے اور نتیجے کے طور پر قید و بند میں پڑے زندگی گزارتے ہیں) ۔ جہاں تک عاملوں (مالیہ وصول کرنے والے) اور محرروں کی چوری کا تعلق ہے ، اس سلسلے میں کوئی دس ہزار محرروں سے شہر میں گداگری کروا اور ان کے جسموں میں کیڑے تک ڈلوا چکا ہوں ، لیکن پھر بھی یہ لوگ عبرت نہیں پکڑتے اور باز نہیں آتے ۔ گویا محرری اور چوری کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ پھر شراب پینے اور بیچنے پر سیکڑوں آدمیوں کو قید کے کنوئیں میں ڈال کر مار چکا اور مار رہا ہوں ، لیکن یہ لوگ ہیں کہ قید میں بھی شراب پینے اور بیچنے سے نہیں ٹلتے ؛ تو جب یہ خدا کے بندے اپنی ان حرکات سے باز نہیں آتے تو پھر میں کیوں اپنی ان سختیوں سے ہاتھ اٹھاؤں ؟"

(تاریخ فیروز شاہی ، صفحہ ۱۱۹ تا ۱۲۷)

---

(۸)

حضرت سلطان المشائخ کے فیض اور برکتیں

شیخ[۲۹] کے مبارک وجود ، ان کے بابرکت انفاس اور ان کی شرف قبولیت حاصل کرنے والی دعاؤں کے طفیل اس دیار کے بیشتر مسلمان عبادت و بندگی ، تصوف ، ترک دنیا اور گوشہ نشینی کی طرف راغب اور شیخ کے عقیدت مند ہوگئے تھے ۔ سلطان علاؤالدین بھی اپنے

خاندان سمیت ان کا معتقد و مخلص بن گیا تھا ، گویا خواص و عوام نیکی اور نیک کرداری کے نشے میں چور ہو رہے تھے ، اور خدا شاہد ہے جو عہد علائی کے آخری چند سالوں میں کسی کی زبان پر شراب و شاہد بد کاری و قمار بازی ، فحاشی و اغلام اور دیگر برائیوں ، بدکاریوں کا ھد نام بھی آیا ہو ۔ لوگ اب ہر قسم کے گناہ اور بدی کو کفر سمجھنے لگ گئے تھے ۔ مسلمان ایک دوسرے کی شرم سے کھلم کھلا سود خواری اور ذخیرہ اندوزی کا کاروبار نہیں کرسکتے تھے۔ عام لوگوں میں خوف و ہراس کے سبب جھوٹ ، کم تولنا ، دھوکے بازی ، حیلہ بازی ، کھوٹ ، منافقت ، جلانا اور جہلا کو انگیخت کرنا وغیرہ بالکل ختم ہوچکا تھا ۔ اغلب طالبان علم ، شرفا اور اکابر کو جو شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ، تصوف کی کتب اور احکام طریقت کے صحیفوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہوگیا تھا اور قوۃ القلوب[۳۰] ، احیاء العلوم[۳۱] ، ترجمہ احیاء العلوم[۳۲] ، عوارف[۳۳] ، کشف المحجوب[۳۴] ، شرح تعرف[۳۵] ، رسالہ قشیری[۳۶] ، مرصاد العباد[۳۷] ، مکتوبات عین القضاۃ[۳۸] ، لوائح جامی[۳۹] لوامع قاضی حمید الدین ناگوری[۴۰] ، اور امیر حسن کی فواید الفواد[۴۱] ایسی کتابوں کے بے حد خریدار پیدا ہو گئے تھے جن کا تذکرہ ملفوظات شیخ میں ہوا تھا ۔ اور بیشتر لوگ کا تبوں سے سلوک و حقائق ھی کی کتب کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ۔ کوئی بگڑی ایسی نظر نہ آتی جس میں مسواک اور کنگھی لٹکی نہ دکھائی دیتی اور صوفی قسم کے گاھکوں کی کثرت کے سبب چمڑے کے طشت اور لوٹے بے حد گراں ہوگئے تھے ۔

(تاریخ فیروز شاهی ، جلد دوم ، صفحہ ۱۷۶ تا ۱۷۷)

فیروز تغلق

[سلطان فیروز تغلق (۱۳۵۱ع - ۱۳۸۸ع) مورخین کا قدردان ھی نہیں ، خود بھی صاحب علم شخص تھا - اس نے اپنے کارھائے نمایاں کی تفصیل فتوحات فیروز شاھی فیروز آباد کی مسجد کے مثّمن گنبد پر کندہ کرائی - کتاب کئی دفعہ شائع ھوچکی ھے (طبع اول ۱۸۸۵ع)- جن سطور کا ترجمہ یہاں کیا جا رھا ھے ، اسی کتاب سے لی گئی ھیں]

عہد فیروز تغلق کے واقعات

شیعہ لوگ کہ جنھیں رافضی کہا جاتا ھے ، لوگوں میں مذھب شیعہ و رفض کی تبلیغ کرتے تھے - ان لوگوں نے اپنے اس مذھب کے بارے میں کئی رسالے اور بیسیوں کتب لکھ رکھی تھیں ، درس و تدریس کو پیشہ بنا رکھا تھا ، اور جناب خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم ، اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رض اور تمام بڑے بڑے صوفیا رح پر کھلم کھلا تبرا بھیجتے ، ان کی شان میں گستاخی کرتے اور گالی گلوچ سے کام لیتے تھے - اس کے علاوہ قرآن مجید کو 'ملحقات عثمانی' کہہ کر پکارتے - ھم نے ان سب کو پکڑ لیا ، اور ان کا خود گمراہ ھونا اور دوسروں کو گمراہ کرنا ثابت ھوگیا - اس سلسلے میں جو لوگ زیادہ کٹر قسم کے تھے ، ان کو ھم نے سزا دے کر تنبیہ فرمائی ؛ دوسروں کو سزا ، تنبیہ اور تشہیر کی دھمکی دے کر ڈانٹا ؛ ان کی کتب کو سر عام جلا دیا ؛ تا آں کہ ان لوگوں کا فتنہ عنایت ربانی سے پورے طور پر مٹ گیا -

پھر کچھ ملحد اور 'اباحتی' (ھر چیز کو حلال قرار دینے والے)

اکٹھے ہوگئے۔ یہ لوگ خلق خدا کو الحاد و اباحت کی طرف بلاتے تھے۔ یہ شرپسند لوگ کسی خاص رات کو کسی مقررہ مقام پر جمع ہوجاتے، جہاں محرم و غیر محرم لوگ ایک دوسرے کو شراب و طعام پیش کرتے اور کہتے کہ یہ عبادت ہے؛ نیز ایک بت سا بنا کر لوگوں کو اس طرف مائل کرتے کہ وہ اس بت کو سجدہ کریں۔ علاوہ ازیں ایک دوسرے کی بیوی، ماں اور بہن میں سے، جنھیں اس رات یہ لوگ ساتھ لائے ہوتے، جس کسی کا بھی دامن کسی کے ہاتھ لگ جاتا، وہ اس سے حرام کاری کرتا۔ ہم نے ان کے سر براہوں کی گردنیں آڑا دیں، دوسروں کو قید یا جلا وطن کیا یا سزا دی اور اس طرح ان کا یہ فتنہ و شر مرکز اسلام سے کاملاً ختم ہوگیا۔

ان کے علاوہ کچھ لوگ ایسے تھے جو تارک الدنیا، گوشہ نشینوں اور دھریوں کے روپ میں عوام کو دھوکا دے رہے اور گم راہ کر رہے تھے۔ وہ لوگوں کو مرید بناتے اور کفر کے کلمات بکتے۔ ایک شخص احمد بہاری ان گمراہوں کا سرغنہ اور شہر میں مقیم تھا؛ بہار کے کچھ لوگ اسے خدا مانتے تھے۔ اس گروہ کو مقید اور پا بہ زنجیر ہمارے سامنے پیش کیا گیا اور ہمیں بتایا گیا کہ یہ شخص گالی گلوچ بکتا اور کہتا ہے کہ ''جس کی نو بیویاں ہوں، اس کی نبوت کا کیا رعب و دبدبہ ہوگا'' نیز اس کا ایک پیروکار یہ کہتا تھا کہ ''دہلی میں خدا کا ظہور ہوا ہے اور وہ ہے احمد بہاری۔'' جب یہ تمام الزامات ان پر ثابت ہوگئے تو ہم نے ان دونوں کو قید میں ڈال کر اور بیڑیاں پہنا کر سزا دی، اور باقی ماندہ کو توبہ و استغفار کرنے کی ہدایت کی۔ پھر ہر ایک کو کسی نہ کسی شہر میں جلا وطن کر دیا اور یوں ان کا شر رفع ہوگیا۔

دہلی میں ایک شخص رکن ملقب بہ مہدی نے یہ دعویٰ کیا کہ ''مہدی آخرالزمان میں ہوں اور مجھے علم لدنی حاصل ہے۔ میں نے کسی بھی استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا، اور نہ کسی سے کوئی استفادہ ہی کیا ہے۔ مجھے تمام مخلوقات کے اسماء، کہ جن کے بارے میں سوائے آدم نبی علیہ السلام کے کسی بھی پیغمبر کو علم نہ تھا،

معلوم ھیں ، اور علم حروف کے راز جو کسی پر بھی نہیں کھلے ، مجھ پر منکشف ھوگئے ھیں ۔'' اپنے اس دعوے کی حمایت میں اس نے کتابیں لکھیں اور لوگوں کو گم راھی و ضلالت کی دعوت دی ۔ پھر اس نے یہ دعویٰ کیا کہ ''رکن الدین اللہ کا رسول میں ھوں ۔'' اس سلسلے میں مشائخ نے ھمارے سامنے یہ گواھی دی کہ انھوں نے اس سے اس قسم کی باتیں سنی ھیں ۔ جب اسے ھمارے روبرو لایا گیا تو ھم نے خود اس کی گم راھی اور اس کے لوگوں کو گم راہ کرنے کے متعلق استفسار کیا ؛ اس نے اپنی اس بدعت و گم راھی کا اقرار کیا ؛ اس پر علما نے یہ فتویٰ صادر کیا کہ ''وہ کافر ھوگیا ھے اور اس کا خون بہانا جائز ھے ۔ اور چوں کہ یہ فتنہ و شر اس کی خباثت نفس کے سبب اسلام اور اھل سنت و جماعت میں پیدا ھوا ھے ، اس لیے اگر اس فتنے کو دور کرنے میں ذرا سی بھی سستی و بے پروائی کا مظاھرہ کیا گیا تو خدا نہ کرے ، خدا نہ کرے ، یہ شر و فتنہ اس قدر پھیل جائے گ کہ سیکڑوں مسلمان گم راھی کے گڑھے میں گرجائیں گے اور اسلام سے منحرف ھوں گے ، اور اس سے ایک ایسا فتنہ کھڑا ھوگا جو ھزاروں انسانوں کی ھلاکت کا باعث ھوگا ۔'' ھم نے حکم دیا کہ تمام عالموں کے مجمع میں اس خبیث کے فتنہ و فساد اور گم راھی کا اعلان کیا جائے اور اسے خاص و عام کے کانوں تک پہنچا دیا جائے ۔ اور علمائے دین اور شریعت کے آئمہ کے فتوے کے مطابق وہ جس سزا کا بھی مستحق ھو ، اسے دی جائے ۔ چناں چہ اسے اس کے پیروکاروں اور شرکائے کار کے ساتھ قتل کر دیا گیا ۔ اس موقع پر تمام مخلوق خدا آن پہنچی اور انھوں نے اس کا گوشت پوست اور اعضاء پارہ پارہ کر دیے ۔ اس کا یہ فتنہ کچھ اس طرح دور ھوا کہ دنیا والوں کو ایک مرتبہ تو کان ھوگئے ۔ اس قسم کے فتنوں کا قلع قمع کرنے اور ان بدعتوں کو مٹانے کے لیے خدائے بزرگ و برتر نے مجھ عاجز گنہ‌گار کو اپنی نصرت و عنایت سے نوازا اور سنتوں کے احیا کی توفیق ارزانی فرمائی ۔ ان واقعات کے تذکرے سے فقط رب جل جلالہ کی شکر گزاری مقصود ھے ۔ ان تحریروں کے پڑھنے یا سننے سے جس کسی کو اپنے دین کی اصلاح درکار ھو ، وہ یہی طریقہ

اختیار کرے تاکہ اسے ثواب حاصل ہو اور ہم بھی اس نیکی کی بدولت ثواب کے امید وار ہوں ۔ 'اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے ۔'

گجرات کے علاقے میں ایک ملاّ زادے 'عین ماہرو' نے خود کو پیر و مرشد اور کچھ لوگوں کو اپنا مرید بنا رکھا تھا ۔ وہ 'اناالحق' (میں خدا ہوں) کہتا اور اپنے مریدوں کو حکم دیتا کہ ''جب میں اناالحق کہا کروں تو تم 'تو ہی ہے، تو ہی ہے' کہا کرو''۔ نیز یہ کہتا کہ 'انا الملک الذی لا یموت' (میں ایک امر بادشاہ ہوں) ۔ اس نے ایک کتابچہ بھی لکھا جس میں کفر کے کلمات درج تھے ۔ اس شخص کو پا بہ زنجیر ہمارے روبرو لایا گیا ۔ اس کی یہ گمراہی و فساد ثابت ہوگیا ؛ چناں چہ اسے بھی ہم نے سزا دی اور جو کتاب اس نے لکھی تھی اسے جلا دیا ۔ شکر ایزد کہ توحید پرست مسلمانوں سے یہ فتنہ بھی اٹھ گیا ۔

شہر کے مسلمانوں میں ایک ایسی رسم و عادت پیدا ہوگئی تھی جو اسلام میں جائز نہیں ، اور وہ یہ تھی کہ مذہبی تہواروں کے موقع پر عورتیں دستوں اور جتھوں کی صورت میں پالکیوں ، گردوں اور ڈولیوں میں بیٹھ کر یا خچروں پر سوار ہو کر (او اسی طرح پیادہ عورتیں) جوق در جوق شہر سے باہر مزاروں پر نکل جاتیں ۔ ادھر لچے لفنگے اور اوباش ، کہ خواہشات نفسانی کا شکار اور راستئی کردار سے عاری ہوتے ہیں ، وہاں پہنچ کر فتنہ و فساد برپا کرتے (اور ایسے موقعوں پر ان کی حرکات کے سبب ایسا اکثر ہو جاتا ہے) ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عورتوں کا گھر سے باہر نکلنا ہی شرعی طور پر ممنوع ہے ۔ ہم نے فرمان صادر کیا کہ 'کوئی عورت مزاروں پر نہ جائے اور اگر کوئی جائے تو اسے سزا دی جائے'۔ اب اللہ جل شانہ کی مہربانی سے کسی بھی مسلمان عورت کی یہ مجال نہیں کہ وہ باہر نکلے یا مزاروں پر جائے ۔ سو یہ بدعت بھی ختم ہوگئی ۔ (فتوحات فیروز شاہی)

سراج عفیف

[سراج عفیف (وفات ۱۳۵۰ع ؟) فیروز تغلق کے زمانے میں اس نے ہندوستان کی عمومی تاریخ ، تاریخ فیروز شاہی (۱۲۹۸ع) مرتب کی - ادبی اور تاریخی لحاظ سے یہ کتاب برنی کی تاریخ فیروز شاہی کو نہیں پہنچتی ، تاہم کئی اعتبار سے اس کے بیانات کو تقویت دیتی ہے] -

سلطان فیروز[1] کا بے روزگار لوگوں کو یاد کرنا

(ہر بار بادشاہ کی شکار سے واپسی ملک کے لیے باعث خیر و برکت ثابت ہوتی -) کہتے ہیں کہ جب کبھی وہ بادشاہ عالم و عالمیاں شکار سے لوٹ کر دھلی شہر میں داخل ہوتا تو کوتوال ممالک کو ، کہ بہت ہی رعب و دبدبہ والا اور صاحب ہیبت کوتوال تھا ، جو شہر کے لوگوں کے ساتھ بڑے عدل و انصاف سے کام لیتا اور ہر وقت اور ہر لمحے کوتوالی کے فرائض بڑی ہوشیاری اور بیداری سے سر انجام دیتا تھا ، فرمان بھیجتا کہ شہر میں جہاں کہیں بھی کوئی بے روزگار آدمی ہو ، اسے لے کر میرے دربار میں پہنچو - چناں چہ یہ کوتوال شہر کے ہر مشہور محلہ دار کو اپنے پاس بلاتا اور اس سے ہر ایک شخص کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا - ادھر شہر میں بہت سے شرفا ایسے ہوتے جو اپنی بے حد مفلسی اور پریشان خاطری کے سبب لوگوں کے سامنے آنے سے ھچکچاتے - اس قسم کے شرفا اور بزرگ زادوں کو محلہ دار کوتوال کے پاس لے کر آتے - ملک نیک نام کوتوال ان لوگوں کے نام اور دیگر کوائف وغیرہ لکھوا لیتا اور انھیں مناسب موقع پر بادشاہ کے حضور میں پیش کر دیا کرتا - سلطان فیروز شاہ ، کہ اللہ تعالی

کی طرف سے اسے گویا الہام ہوتا تھا، ہر ایک شخص کو اس کے بزرگوں کے نام سے شناخت کر لیتا اور پھر اسے کسی نہ کسی کام پر لگا دیتا۔

سبحان اللہ! سلطان کتنا مصفا ذہن رکھتا تھا کہ جس کسی کو بھی اس کے پاس لے جایا جاتا، اگرچہ اسے اس نے کبھی بھی نہ دیکھا ہوتا، جب بھی وہ اسے اس کے بزرگوں کی نشانی سے پہچان لیتا۔ مختصر یہ کہ جب بھی بے روزگار لوگ سلطان کے روبرو لے جائے جاتے تو وہ ان میں سے ہر ایک کے لیے کوئی نہ کوئی کام یا شغل ضرور مہیا کر دیتا۔ اگر کوئی اہل قلم ہوتا تو اسے کارخانے[۲] میں ملازم رکھ لیتا، اور اگر کوئی مقبول کارکن ہوتا تو اسے خان جہاں[۳] کے سپرد کر دیا جاتا۔ اگر کوئی شخص درخواست کرتا کہ بندے کو فلاں امیر کے سپرد کیا جائے تو سلطان اسے خود اپنی موجودگی میں اس امیر کے حوالے کر دیتا، اور اگر کسی نے یہ عرض کی کہ مجھے فلاں صاحب جاگیر امیر کے سپرد کیا جائے، تو اس جاگیردار کے نام فرمان جاری کر دیا جاتا اور درخواست کنندہ اس جاگیر میں چلا جاتا۔ اس طرح کم ہی لوگ بے کار و بے روزگار رہتے۔ یہ بے کار لوگ جہاں جہاں اور جس جس کے سپرد کیے جاتے، وہاں ان کی زندگی بڑی خاطر جمعی سے بسر ہوتی۔

سبحان اللہ! اسی طرح اس نے سیکڑوں بے کاروں کو روزگار مہیا کیا اور وہ لوگ کسی ٹھکانے لگے۔ اس معاملے میں سلطان اکثر فرمایا کرتا کہ صحیح طور پر کام کرنے والے لوگ جب بے کار ہوجاتے ہیں تو وہ غم و اندوہ کے سبب سرد آہیں بھرتے ہیں اور انتہائی افلاس کے باعث سر نہیں اٹھا سکتے۔ یہ لوگ ہر روز 'نو روز[۴]' کی مانند دربار کے سامنے آ بیٹھتے ہیں اور کمریں کس کر بیشتر اس تلاش و جستجو میں رہتے ہیں کہ کون ملازمت سے معزول اور کس کس پر شاہی عتاب نازل ہوا۔ آج کسے محبوس اور کسے رہا کیا گیا۔ سو اس طرح یہ بے چارے اپنی بے روزگاری و بے چارگی کے

سبب ، اسی انتظار میں صبح عین وقت معین پر گھر سے نکل آتے ھیں تاکہ اگر کسی کو کسی جرم کی پاداش میں معزول کر دیا گیا ھو تو شاید اس کی جگہ کسی اور کا تقرر ھوجائے ، اور ممکن ھے کہ 'ھم بے روزگاروں ھی میں سے کسی کو وہ جگہ مل جائے ۔' چوں کہ ان بے سر و سامان مفلسوں ، مسکینوں اور بے نواؤں کو اپنی بے روزگاری اور بے سر و سامانی کا بے حد قلق ھوتا ھے ، اس لیے اسی تمنا میں بے چارے سرد آھیں بھرتے رھتے ھیں ۔ اس موقع پر سلطان فیروز شاہ فرماتا ''ھم نے اس بیھودہ رنج کو ان کے دلوں سے دور کردیا ھے ۔'' چناں چہ جہاں کہیں بھی کوئی بے کار ، بے روزگار ھوتا ، اسے محل میں بھیج دیا جاتا ۔ (تاریخ فیروز شاھی ، صفحہ ۳۳۴ تا ۳۳۶)

(۲)

سید جلال الدین مخدوم جہانیاں[۳] کی سلطان فیروز سے آخری ملاقات

کہتے ھیں کہ سید جلال الدین بخاری رحمۃ اللہ علیہ سال سال دو دو سال بعد بادشاہ ھفت اقلیم سے ملاقات کے لیے اوچ سے تشریف لایا کرتے ۔ دونوں بزرگ ھستیوں کو ایک دوسرے سے یاران غار کی مانند بے حد محبت و اُلفت تھی ، اور دونوں اپنی اس دوستی و یگانگت کو زیادہ بڑھانے کے لیے دل و جان سے کوشش کرتے ۔ جب حضرت سید جلال الدین اوچ سے تشریف لاتے اور فیروز آباد کے قریب پہنچتے تو سلطان ذی جاہ ان کا استقبال کرنے کی خاطر مسند تک پہنچ جاتے اور وھاں دونوں نیک بخت آپس میں ملتے ۔ پھر بادشاہ سلامت حضرت سید کو بڑے اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے ۔ کبھی تو انھیں فیروز آباد کے مقام پر منارہ سے متصل شاھی محل میں ٹھہرایا جاتا اور کبھی شفا خانے میں یا شاہ زادہ فتح خاں مرحوم کے احاطے میں ان کے قیام کا بندوبست کیا جاتا ۔ الغرض جب حضرت سید السادات حسب عادت اپنی عبادت گاہ سے نکل کر سلطان فیروز کو ملنے جاتے اور دربانوں کی جگہ پر پہنچ کر جوں ھی سلام کرتے تو حضور بادشاہ سلامت اپنے اس جاہ و مرتبہ کے باوجود اپنے تخت سے اٹھ کھڑے ھوتے اور بڑی

انکساری کے ساتھ ان کی خدمت کرتے۔ دونوں بزرگ اس جگہ 'جام خانہ' پر بیٹھ جاتے اور جب حضرت سید واپس لوٹنے لگتے تو اس وقت سلطان جام خانہ سے اٹھ کر کھڑے ہوجاتے؛ حتیٰ کہ حضرت سید دربانوں کی جگہ تک بھی پہنچ جاتے لیکن حضرت سلطان اسی طرح جام خانہ ہی پر کھڑے رہتے۔ اور جس وقت حضرت سید دربانوں کی جگہ پر پہنچ کر سلام کرتے تو حضور بھی سلام کرتے۔ اور جب حضرت سید شاھنشاہ کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے تو اس وقت بادشاہ سلامت تخت شاہی پر بیٹھتے۔ سبحان اللہ! حضرت عالم پناہ کس حسن ادب سے حضرت سید سے پیش آیا کرتے تھے۔

بڑے بڑے سلاطین اور نام ور شہر یاروں کی طرح شاھنشاہ عالی‌وقا بھی دوسرے تیسرے روز سید ابوالبرکات سے ملنے کے لیے ان کی قیام‌گاہ پر حاضری دیا کرتے۔ دونوں بزرگوار، کہ خدائے بزرگ و برتر کے برگزیدہ و چنیدہ تھے، یک جا بیٹھتے اور محبت و الفت کے سبب بڑی بڑی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اوچ اور دھلی کے اکثر و بیشتر غرض مند اور صاحبان حاجت اپنی اپنی حاجتیں لے کر حضرت سید کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضرت سید اپنے خادموں کو ہر حاجت مند کی ضرورت لکھنے کو فرماتے۔ چناں چہ خادم ہر کسی کی حاجت لکھ لیتے اور جب بادشاہ سلامت شاہی تمکنت کے ساتھ حضرت سید کے دیدار کے لیے آتے تو حضرت سید اس موقع پر اپنے خادموں سے فرماتے کہ وہ حاجت مندوں اور غرض مندوں کے وہ کاغذات جہاں پناہ کے حضور میں پیش کریں۔ جب حضرت بادشاہ سلامت مذکورہ کاغذات پڑھتے تو ہر کسی کی غرض و حاجت اس کی خواہش کے مطابق پوری کر دیتے۔

جب حضرت سید جلال کچھ عرصہ شہر میں ٹھہر کر واپس اوچ کی جانب روانہ ہوتے تو شاہ مکرم اپنے اس جاہ و جلال کے باوصف انھیں ایک پڑاؤ تک چھوڑنے آتے۔ مختصر یہ کہ اس خدائے ذوالجلال و الاکرام کی حکمت و عنایت سے حضرت سید جلال الدین

اور طالب دین سلطان فیروز شاہ میں کچھ مدت تک اسی طرح گاڑھی چھنتی رہی ۔ آخری مرتبہ جب حضرت سید جلال الدین خاص طور سے سلطان سے ملنے کے لیے شہر میں تشریف لائے تو خلاف معمول کچھ عرصہ زیادہ ہی مقیم رہے ۔ اور جب خدائے جل جلالہ و کریم کی رضا کے طالب حضرت مخدوم سید اوچ جانے کے لیے سلطان سے رخصت ہونے لگے اور محبت آمیز گفتگو میں اپنے وطن جانے کا تذکرہ کیا تو اس موقع پر سلطان سے مخاطب ہو کر یہ فرمانے لگے کہ ''اس دعا گو کا گمان یہ ہے کہ دعا گو اور بادشاہ سلامت کے درمیان اب جدائی ہے ۔'' پھر فرمایا : ''دعا گو کے دن آ لگے ہیں اور آپ بھی اب چوں کہ کبر سنی میں ہیں ، لہٰذا آپ کے لیے ، آئین جہانداری کے مطابق ، سوار ہو کر دہلی شہر سے زیادہ دور جانا خلاف مصلحت ہے ۔''

(تاریخ فیروز شاہی ، صفحہ ۵۱۴ تا ۵۱۶)

عین الملک ماهرو

[عین الملک ماهرو ملتانی محمد تغلق اور فیروز تغلق کے زمانے کا امیر ہے۔ کئی کتابوں کا مصنف ہے لیکن اب صرف منشآت ماہرو (یا انشاے ماہرو) ملتی ہے۔ منشآت اس دور کے نثری کارناموں میں ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے، اگرچہ بہ قول مرتب فہرست ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، مکتوبات کی افادی حیثیت اس وجہ سے کم ہوجاتی ہے کہ افراد اور جگہوں کے نام اور واقعات و سنین اس میں موجود نہیں ہیں۔ پہلا اقتباس آن شاہ پرستی کے احساسات کو پیش کرتا ہے جو اس زمانے کا عام وطیرہ تھا؛ دوسرے میں صوفیاے ملتان کے اوقاف وغیرہ کی تفصیلات ہیں]۔

عہد نامہ جو رؤساے پیش گاہ، امراے نامدار، مخلصان درگاہ اور خوانین بارگاہ کے لیے لکھا گیا

چوں کہ عہد و پیماں کرنا اس ایزد پاک مالک کون و مکان اور اس کے رسول اکرم صلعم کا طریقہ رہا ہے، اور پرانے زمانوں میں غلام و کم ترین لوگوں نے بھی اپنے خلوص و شرف کا اظہار کرنے کے لیے دیندار بادشاہوں کی بیعت کی ہے، اسی باعث مجھ عاجز نے بہ کمال رضا و رغبت یہ بات قبول کی، اور میں نیک نیتی و راست اعتقادی سے یہ کہتا ہوں کہ قسم ہے اس مالک الملک کی، زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے کی، عرش و کرسی کے خدا کی، جن و انسان کے پروردگار کی، اس خدا کی جس کے جلال کے سرا پردے پر تغیر کی گرد نہیں بیٹھ سکتی، اس خدا کی جس کے کمال لازوال تک دیدۂ فکر و خیال

کی رسائی ممکن نہیں ، جس کی عقیدت و ارادات کی تلچھٹ بھی اغراض کی آلودگی سے پاک اور جس کی ذات پاک شرک و شریک سے بالکل مصفا اور بری ہے ؛ اس وحدہ لا شریک کی قسم کہ جس نے ''اے ایمان والو اپنے عہد پورے کرو'' کی آواز ایمان والوں کے گوش ہوش تک پہنچائی ، اس واجب الوجود کی قسم کہ جس نے اس آیۂ کریمہ[۲] (اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو پورا کرو اور قسموں کے پختہ ہو جانے کے بعد انہیں نہ توڑو) کے تحت ہر کسی پر ایفاے وعدہ لازم ٹھہرایا۔اور بے شک اللہ سب پر غالب ہے ، وہ مالک الملک ہے اور اسے موت نہیں ہے۔

(ان قسموں کے کھانے کے بعد) مجھ خاکسار نے اس گھڑی اور اس لمحے عہد کیا ہے اور ایسی قسمیں کھائیں ہیں کہ جن کی خلاف ورزی سراسر کفر ہے کہ میں حضرت شہنشاہ عالم ، امیر المؤمنین کے نائب ، ظل الہ ، سلطانوں کے سلطان ، خداے رحیم و رحمان کی تائید سے مضبوط کیے گئے سلطان ابو ظفر فیروز شاہ۔۔۔خدا اس کے ملک و سلطنت کو تا ابد قائم رکھے اور اس کے حکم و شان کو بلند کرے ! کہ شرع شریعت کی رو سے وہ امر مطلق کی ولایت کا امام ہے اور اس کی اطاعت و فرماں پزیری ہر کس و ناکس پر لازم و واجب ہے۔۔۔کی اطاعت ، فرماں برداری ، اخلاص اور نیک خواہی میں راسخ ، صاف دل ، پاکیزہ اعتقاد ، بے شروفساد ، نیک خواہ ، مخلص اور بے ریا رہوں گا۔ اس کے علاوہ حضور عالم پناہ کے دوستوں کے ساتھ دوستی اور دشمنوں کے ساتھ دشمنی رکھوں گا ؛ مرتے دم تک ان شرطوں پر قائم و ثابت رہوں گا۔ کسی بھی صورت میں یا کسی بھی سبب سے جہاں پناہ کے خدم و حشم ، وابستگان اور مخلصین کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوں گا۔ ظل الہ کے فرمان سے ہرگز روگردانی نہ کروں گا ؛ گیتی پناہ کے مخالفین سے کوئی تعلق اور بد اندیشوں سے ہرگز دوستی نہ رکھوں گا۔ اپنے قول و فعل اور قلم کو حضور کے بارے میں کھلم کھلا یا اشارۃً کنایۃً آلودہ نہ کروں گا۔ کسی قسم کی برائی کو اپنے دل میں جگہ نہ دوں گا اور جہاں تک مجھ عاجز کم ترین کا مقدور ہے ، اطاعت ،

نیک خواہی اور حسن خدمت پر قائم و دائم رہوں گا ۔ اپنے دل و زبان ، ظاہر اور باطن کو اس درگاہ سے اخلاص کے سبب ہمیشہ حکم پزیر اور اطاعت گزار رکھوں گا ، اور ہرگز اس بارگاہ کی مخالفت پر آمادہ نہ ہوں گا ۔ اور اگر خدا نہ کرے ،خدا نہ کرے ، میرا بیٹا یا بھائی بھی کسی ایسی حرکت کا مرتکب ہوگا تو اس سے اظہار بیزاری اور اس کے قلع قمع کی کوشش کروں گا ۔

آیہ ''اطاعت کرو خدا کی ، اس کے رسول صلعم کی اور جو تم میں حاکم ہے'' کے مطابق خدائے تبارک و تعالیٰ کی اطاعت فرض جانوں گا اور اس بارگاہ کی نعمتوں کا شکر حتی‌المقدور بجا لاتا رہوں گا ۔ اس درگاہ کی بندگی میں ہر خلاف و نفاق سے ، کہ ہمیشہ ہمیشہ کی محرومی کا باعث ہے ، بچوں گا ۔ اور اگر خدا نہ کردہ اپنے اس عہد و پیمان سے تجاوز اور ان تمام قسموں اور شرطوں سے یا ان میں سے کسی ایک سے بھی روگردانی کروں تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے عہد کو توڑنے والا ہوں گا ؛ روز قیامت ان لوگوں کے گروہ سے آٹھایا جاؤں گا جن کے متعلق 'الذین ینقضون عہد اللہ' (وہ لوگ جو اللہ کا عہد توڑتے ہیں) کی آیت نازل ہوئی ہے ۔ اور خدا کی وحدت اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ، تمام پیغمبروں ، فرشتوں ، قیامت ، چاروں مذہبوں اور آسمانی کتب کی حقیقت سے بیزار ہوں گا ، اور میری ہر بیوی یا جسے بیوی بنانا چاہوں ، بغیر کسی حیل و حجت اور شرعی تاویل کے میرے لیے بہ منزلہ مطلقہ کے ہوگی اور جب بھی شافعی رض مذہب کے قاضی کے حکم کے مطابق زیادہ نکاح کرنے کا حیلہ کروں تو پھر وہی قسم عاید ہو جائے گی ۔ اور جو بھی میرا غلام ہے یا کوئی نیا غلام خریدوں تو وہ خود بہ خود آزاد سمجھا جائے گا ۔ میں نے ان تمام باتوں کا اعتراف کرنے کے بعد اپنے ان تمام عہد و پیمان پر اللہ تبارک و تعالیٰ کو ''اور اللہ گواہ ہونے کے لیے کافی ہے''، فرشتوں کو اور حاضرین کو گواہ ٹھہرایا تاکہ اس معاملے کی حجت قائم رہے ۔

(۲)

عرضداشت جو ملتان کے علاقے میں اوقاف مقرر کرنے کے متعلق شاہی دربار میں بھیجی گئی اور حسب التماس قبول ہوئی

عاجز کم ترین عین ماھرو کی عرض داشت جو ملتان کے حساب کتاب کی دیکھ بھال کے موقع پر جاگیر وقف کی زمین، قریوں سے خراج لانے اور تصحیح وغیرہ کے سلسلے میں وزارت کے دیوان عالی کے دیے گئے حکم کے مطابق ارسال کی گئی۔ اوقاف کی تفصیل و کیفیت اس طرح ھے :

دفعہ ۱۔ شہنشاھوں (خدا ان کی قبروں کو منور کرے!) کا اوقاف۔ سلطان معزالدین محمد سام غوری کا وقف دو گاؤں پر مشتمل ھے، جو جامع مسجد ملتان کے لیے، پانچ درسوں مثلاً مدرسوں، مکرروں (؟) اور طالب علموں کے لیے، ارباب مسجد مثلاً مؤذنوں اور تکبیر کہنے والوں کے لیے اور اس کے علاوہ دیگر اخراجات مثلاً جانمازوں، ٹاٹوں، روشنی اور مسجد کی عمارت وغیرہ کے واسطے وقف کیے گئے، اور یہ تمام خیرات اس قاعدے کے مطابق ھے۔ مسجد مذکور کے متعلق حضور شہنشاہ کا یہ حسن اھتمام تھا جو انھوں نے یہ خدمت شیخ الاسلام کی التماس پر، کہ اس اوقاف کے متولی ھیں، انھیں سپرد کی۔ فرمان صادر ہوا تھا کہ چوں کہ اس عمارت پر خرچ بہت ھوگیا ھے، اس لیے ایک مرتبہ اس کا خرچ دیوانی محصول سے دیا جائے۔ اس کے بعد بھی ان دو گاؤں کے، کہ مسجد کی عمارت کے لیے مقرر ھیں، حصوں سے خرچ مرتب ھو۔

خان شہید[۳] کا وقف دو گاؤں پر محیط ھے، جو اپنے درس اور مدرسوں، مکرروں اور طلبا کی خوراک وغیرہ کے لیے وقف کیے گئے۔ اگرچہ شرع کی رو سے وقف میں سختی ھونی چاھیے لیکن خرچ دو وجہ سے ھے جس کے سبب یہ لوگ بیت المال کے مال کے حقدار ھیں۔

جامع مسجد طلبینہ کا وقف، کہ یہ بھی سلطان معزالدین محمد سام

کے وقف سے یاد کیا جاتا ہے ، ایک گاؤں پر مشتمل ہے اور اس کے اخراجات بھی اسی طرح ہیں ۔

سلطان شہید کا وقف ، کہ خطۂ ملتان کے اطراف میں ایک جاگیر پر مشتمل ہے ، ملتان کی نمازگاہ اور مسجد کے لیے ہے ۔ مسجد کے امام اور مؤذن کی خوراک اور نمازگاہ کی مرمت کا خرچ وغیرہ اسی سے چلتا ہے ۔ مجھ عاجز کم ترین کے لیے واجب تو یہ تھا کہ سلطان شہید ، جو اس کم ترین خاکسار اور تمام اہل عالم کے مخدوموں کے مخدوم ہیں ، کے وقف کا ذکر سب سے اوپر کرتا ، لیکن ولی اوقاف کی ترتیب کے سبب گزشتہ شہنشاہوں کے اوقاف پہلے لکھنے پڑے ۔

دفعہ ۲ ۔ دانش مندوں ، مشائخ اور امرا کے اوقاف :۔ ان میں زمینیں اور دیہات مقرر کیے گئے اور مقررہ جاگیر کے حصے دیے گئے ۔ اس کے علاوہ ، جیسا کہ رسم چلی آ رہی ہے ، بہ تدریج حصۂ دیوانی بھی وقف کیا گیا ۔ جہاں تک جاگیر کے حصے کا تعلق ہے اس میں تو کوئی کلام نہیں ، ہاں اگر کچھ کلام ہے تو حصۂ دیوانی میں ہے ، اور وہ یہ کہ مذکورہ صاحبان دانش اور مشائخ عالم پناہ کے خاص دعا گوؤں میں سے ہیں اور مفلس ہیں ۔ جن دنوں حضور کے بلند جھنڈوں نے مشرق علاقوں میں جاج نگر کی جانب اپنا سایہ پھیلا رکھا تھا ، ان دنوں یہ لوگ قرآن کریم کے ختم میں مصروف رہے ۔ اگر دیوانی حصہ صدقے کے طور پر عنایت ہو تو یہ سب اس کے مستحق ہیں ۔ ان اوقاف کا پورا حصول آسان امر ہے ۔ سات صدیوں سے ملتان میں اسلام ہے ۔ یہاں کے لوگ مختلف حادثات و انقلابات کا شکار ہو کر گرد و نواح میں آباد ہو چکے تھے ، جس کے سبب ملتان کا شہر بے آباد و بے رونق ہو کر رہ گیا تھا ۔ حضور کے مبارک و بابرکت عہد سلطنت میں ، کہ تا ابد قائم رہے ! یہ قدیم اور ویران و غیر آباد شہر پھر سے آباد ہوگیا ہے ، اور اب یہاں کے عوام پھر اسی پرانے وقف کی جاگیر کی حرص و آرزو رکھتے ہیں ۔ اس بندۂ کمینہ کی کیا مجال تھی جو ایسی باتیں حضور کے گوش مبارک تک لاتا لیکن چونکہ ملتان خداوندعالم

کا کارنامہ ہے ، اس لیے اس گستاخی کی جرأت ہوئی ، مگر ساتھ ہی خداوند گیتی کے عفو کی بھی آمید ہے ۔

اس ضمن میں جو بھی فرمان کرم ہو ، صادر فرمایا جائے تاکہ شاہان مشرق اور وزرا کے سلطان کا غلام عین الملک مذکورہ وقف کی جاگیر کے گاؤں اور زمین حسب سابق مقرر کر دے ۔ اور فرمان اعلیٰ کے مطابق عمل کرکے حضور کے پسندیدہ غلاموں میں شمار ہو ، خدائے بزرگ کی مرضی اور حکم اعلیٰ سے — حضور کو اللہ ہمیشہ بلند رکھے اور مشرق و مغرب پر حضور کا تسلط ہو! — (اللہ کی مہربانی و کرم نوازی سے ماہ صفر کی گیارھویں تاریخ کو ۷۶۳ھ میں اختتام پذیر ہوئی ۔ محمدہ و مصلی) (انشائے ماہرو ، صفحہ ۳۲ تا ۳۴)

شیخ شرف الدین یحیٰی منیری

[شرف الدین یحییٰ[1] منیر صوبۂ بہار کے رہنے والے صوفی بزرگ تھے - صاحب تصانیف کثیرہ تھے - مکتوبات صدی اور مکتوبات دو صدی بھی ان سے یاد گار ہیں - ان خطوط میں نجی یا تاریخی اندراجات نہ ہونے کے برابر ہیں - فی الحقیقت یہ مکتوبات تصوف ، اخلاق اور فلسفے کے مختلف مسائل پر مستقل رسالے ہیں] -

میرے بھائی شمس الدین کو ، کہ اللہ اسے اخلاق ستودہ سے آراستہ کرے! معلوم ہو کہ اخلاق حمیدہ سب سے پہلے فطرت حضرت آدم علیہ السلام کو عطا کیے گئے - حضرت آدم سے یہ ورثہ نبیوں اور پیغمبروں علیہم السلام کو ملا اور آخر میں خاتم النبیین ، سردار انبیا ، سلطان اولیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک پہنچا ؛ حضور سرور کائنات سے ان کی امت کو ملا - ادھر روز ازل تقسیم کے موقع پر تمام اخلاق زشت ابلیس کے حصے میں آئے اور اس سے ہوتے ہواتے متکبروں اور سرکشوں تک ، کہ امت ابلیسیہ سے متعلق ہیں ، پہنچے - سو جو شخص شرع کی پیروی میں جتنا استوار ہے ، اتنا ہی زیادہ نیکو کار ہے ، اور جتنا کوئی نیکو کار و نیک خو ہے اتنا ہی وہ بارگاہ خداوندی میں زیادہ مقرب ہے - چونکہ اچھا خلق حضرت آدم کی میراث اور خدائے لم یزل کی طرف سے دیا گیا ، ایک تحفہ ہے لہٰذا مومن کے لیے خلق نیک سے اچھی اور بڑھ کر دیگر کوئی زینت و آرائش نہیں ہے - اور خلق نیک کی اصل فرمان ایزدی کی بجا آوری اور حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شرع کی پیروی ہے ، اس لیے

کہ سرکار دوعالم کے ، ان پر افضل درود و سلام ہو! تمام قول و فعل پسندیدہ تھے۔ جو کوئی بھی حضور صلعم کی پیروی کرتا ہے ، اس پر واجب ہے کہ وہ بھی ویسی زندگی بسر کرے جیسی حضور صلعم نے بسر کی۔ اسے چاہیے کہ وہ اپنوں ، بیگانوں اور دور و نزدیک والوں کے ساتھ نیک خوئی و خوش خلقی سے پیش آئے؛ ہنسی ٹھٹھا نہ کرے تاکہ مروت میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ بد خوئی سے پرہیز کرے کہ اس سے عیش مکدر ہو جاتا ہے۔ ہمیشہ شگفتہ رو لیکن کم سخن رہے۔ جو کوئی بھی آئے اسے پہلے سلام کرے، اس لیے کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگر صحابۂ کرام رض سے دن میں سو بار بھی ملتے تو اپنے بہت زیادہ اچھے خلق کے سبب ایک دوسرے کو سلام کرتے۔

اپنے مال میں سے سخاوت کرے کیوں کہ حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے چند لمحوں کے لیے بھی معمولی سی دولت بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ اگر حضور صلعم کے پاس کوئی چیز فالتو بچ جاتی اور کوئی بھی مستحق نہ ملتا جسے حضور وہ چیز عنایت فرما دیں تو حضور صلعم اس وقت تک حجرۂ مبارک میں تشریف نہ لے جاتے جب تک وہ چیز کسی کو دے نہ دیتے۔ زبان پر گالی گلوچ اور جھوٹ کو نہ آنے دے اور کاموں میں تکلف کرنے سے بچے ، کہ نیک خوئی بے تکلفی سکھاتی ہے۔ تمام حالات اور اقوال و افعال میں اللہ کی طرف دھیان رکھے۔ کھانے پینے ، سونے جاگنے ، ہنسنے اور کہنے بولنے میں شریعت کی پیروی کے مطابق کمی کرے۔ ہر حال میں بلند ہمتی کا مظاہرہ کرے اور اپنے آپ کو کمینگی ، حقارت اور حرص سے آلودہ نہ کرے۔ شبہے والی اور مہلک باتوں سے دوری اختیار کرے اور کوشش کرے کہ تابہ مقدور حضرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اخلاق کی متابعت کرے تاکہ شیطان سے اس کی وابستگی قرار نہ پائے؛ کیوں کہ ایسی صورت میں وہ شیطان کی مانند خبث باطن اور دوسرے برے افعال سے آلودہ ہوگا۔ روایت ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا "جو

شخص تجھ سے دور ہٹے تو اس سے رابطہ رکھ ، جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کر دے ، اور ایسے شخص کو دے جس نے تجھے کبھی کچھ نہ دیا ہو ۔''

اس کے لیے ۲ یہ فرمان ہے کہ وہ حکمت و دانائی اور اچھی نصیحتوں سے لوگوں کو خدا کی راہ پر لگائے اور انہیں اچھی اچھی باتیں بتائے ۔ جب حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون (علیہما السلام) کے ساتھ فرعون کو دعوت حق دینے کے لیے بھیجا گیا تو کہا 'فقولا له قولاً ليناً' (اس سے نرمی کے ساتھ بات کرو) ۔ انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''میں اٹھارہ سال سرور کونین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا خادم رہا ہوں اور اس عرصے میں حضور صلعم نے کبھی بھی مجھے نہیں ڈانٹا کہ تو نے یہ کام برا کیا یا ایسا کیوں کیا ۔ جب میں اچھا کام کرتا تو دعا فرماتے اور جب کوئی چیز مجھ سے خراب ہوجاتی تو فرماتے 'و كان امر الله قدراً مقدورا' (یعنی اللہ کو ایسا ہی منظور تھا) ۔ نیز یہ کہ حضور صلعم ڈھور ڈنگر کا چارا خود تیار کرتے ، اپنے دست مبارک سے لباس سیتے اور اس میں جوڑ لگاتے ، گھر میں خادموں کے ساتھ اکٹھے رہتے ۔ جب کفش مبارک کے تسمے ٹوٹ جاتے تو خود ہی انہیں ٹھیک کرتے ؛ گھر تشریف لے جاتے تو خود ہی چراغ ٹھیک کر کے جلاتے ۔ جو کوئی شخص لاعلمی میں حضور کو کوئی کام کہہ دیتا تو حضور اس کا کہنا نہ ٹالتے ۔ اگر کسی غیر شخص نے کبھی حضور صلعم کو تکلیف پہنچائی تو جواب میں حضور صلعم نے کبھی اسے دکھ نہ پہنچایا ۔ حضور صلعم کی زبان مبارک پر کبھی بھی برے کلمات ، لعن طعن یا دشنام وغیرہ نہیں آئے ۔ حضور ہمیشہ مسکراتے رہتے ...اور جب کوئی مسلمان حضور صلعم کے پاس پہنچتا تو حضور صلعم اسے پہلے سلام کرتے اور صحابہ کرام رض کے ساتھ یوں گھل مل کر بیٹھتے جیسے انھی میں سے ایک ہوں ۔ ہر ایک کو اس کی کنیت سے خطاب فرماتے . . . . اگر کسی کی کنیت نہ ہوتی تو اس کی کنیت مقرر کرتے ۔ اگر صحابۂ کرام رض میں سے یا کوئی دوسرا شخص حضور ص کو مخاطب کرتا تو حضور صلعم فرماتے 'لبیک' ۔ اگر بچوں کے پاس سے

گزرتے تو انہیں سلام کرتے اور ہمیشہ مسلمانوں کے عیبوں پر پردہ پوشی فرماتے ۔ جیسا کہ ایک چور سے فرمایا 'اسرقت' قل لا' (کیا تونے چوری کی ؟ کہہ دے نہیں) ۔ شرع کے مطابق بال بچوں اور غلاموں کا حق برابر رکھتے ۔ دین کی سربلندی کے لیے سیکڑوں ظلم و ستم اور طعنے برداشت کرتے ، کبھی کسی سوالی کو نہ موڑتے ؛ اگر کچھ موجود ہوتا تو عنایت فرما دیتے ورنہ فرماتے 'ان شاء اللہ دوں گا۔'' اپنے لیے کسی پر غصے کا اظہار نہ فرماتے ۔ دین حق میں کسی قسم کی سستی ، رعایت ، فتور اور خاموشی کو روا نہ رکھتے ، برے وقتوں میں صحابہ رض کی دست گیری فرماتے ۔ اگر ایک گھڑی بھی وہ حضور صلعم کی نظروں سے اوجھل رہتے تو حضور خود انہیں ڈھونڈنے نکل جاتے ۔ گھر میں جب کوئی خادم موجود نہ ہوتا تو حضور صلعم اس کی جگہ کام کرتے اور بازار سے کھانا وغیرہ لاتے ۔ ہر کسی کی دعوت کو ، خواہ وہ غلام ہو یا آقا ، شرف قبولیت بخشتے اور تحفے تحائف قبول فرماتے ، اگرچہ وہ پانی ملے دودھ کا ایک گھونٹ ہی ہوتا ۔ خرگوش اور دیگر جو حلال چیزیں سامنے آتیں ، ان کے کھانے میں پس و پیش نہ کرتے ۔ اشیائے خوردنی میں کبھی نقص نہ نکالتے ۔ جو حلال چیز پہننے والی ہوتی وہ پہنتے ۔ مثلاً کبھی گدڑی پہن لی تو کبھی بردیمانی[۳] ، کبھی صوف زیب تن فرما لیا تو کبھی سفید لباس ۔ جو سواری بھی میسر آتی اس پر سوار ہوتے ۔ کبھی گھوڑے پر تو کبھی اونٹ پر ، آج خچر پر سوار ہیں تو کل پیدل ہی چل رہے ہیں ، کسی وقت پاؤں سے ننگے ہیں تو کسی وقت بغیر چادر ہی کے ہیں ؛ کبھی ایسا اتفاق بھی ہوتا کہ نہ تو سر مبارک پر پگڑی ہے اور نہ ٹوپی ۔ ایک بے بستر کے بوریے پر نیند فرماتے ۔ جو کوئی بھی آزاد ، غلام یا لونڈی اپنی کوئی ضرورت حضور صلعم سے بیان کرتی ، حضور صلعم اس کی حاجت روائی فرماتے ۔ اور اگر کوئی اپنی حاجت لے کر اس وقت حاضر ہوتا جب حضور صلعم نماز پڑھ رہے ہوتے تو جلدی سے نماز ختم کرتے اور حاجت مند کی جانب رخ کرکے اس کی ضرورت پوری فرماتے اور پھر نماز شروع کر دیتے ۔ جو کوئی بھی حضور صلعم کے پاس آتا حضور صلعم

اسے پوری طرح نوازتے ، یہاں تک کہ اپنی چادر مبارک تک بچھا دیتے اور آسے اس پر بیٹھ جانے کے لیے فرماتے ۔ اور ایسا بھی ہوتا کہ حضور صلعم کے نیچے تکیہ ہوتا اور حضور صلعم اس شخص کو دے کر آسے اس پر بیٹھنے کو فرماتے ۔ اگر وہ شخص صاحب حشمت ہوتا تو اسے قسم دے کر اس پر بٹھاتے ۔ حضرت امام حسن و حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کے لیے مرکب[۳] بن جاتے اور وہ حضور صلعم کی پشت مبارک پر سوار ہو کر کہتے ’اے گھوڑے ! اس طرف چل ، اسی طرح چل ۔‘‘ اور حضورعلیہ الصلوۃ و السلام بھی اسی طرح کرتے ۔ یہ تمام باتیں ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے بیان کی ھیں اور تمام مستند کتب میں منقول ھیں ۔

یہ تھا حضورصلعم کا اخلاق جو ھم نے اوپر بیان کیا اور ابھی تو حضور صلعم کے اخلاق کے بارے میں ھزاروں باتیں بن کہی رہ گئی ھیں ۔ اگر حضورصلعم کے پاس کوئی معجزہ نہ بھی ھوتا تو بھی حضور صلعم کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ ھی حضورصلعم کی نبوت کے شاھد کافی ھوتے ۔ چناں چہ بہت سے مدعیوں اور متکبروں نے حضورصلعم کو دیکھتے ھی کہا تھا ’لیس ھذا وجہ الکذابین‘ (یہ چہرہ جھوٹ بولنے والوں کا نہیں ھے) اور بغیر کسی معجزہ و دلیل کے فوراً ایمان لے آئے اور مشرف بہ اسلام ھوگئے تھے ۔

اور یہ اخلاق ھی ھے جو طریقت و تصوف میں صاحبان علم کا شعار رھا ھے ، کیوں کہ یہ لوگ ھر حال میں شریعت کے پیروکار ، اور اپنے اخلاق کو سنت نبوی صلعم کی کسوٹی پر پرکھتے ھیں ۔ اور جو شخص کہ شریعت سے بے خبر ھے ، اس کے لیے طریقت بے سود ھے ۔ اس اخلاق کی بنیاد بصیرت و معرفت پر ھے ، اس لیے کہ جو کوئی بھی غرور و تکبر میں گرفتار ھوگا وہ خلوص کی پاکیزگی کو نہ پاسکے گا ، لہٰذا سالک کو چاھیے کہ اس درجے کی بصیرت حاصل کرے اور ان اخلاق نبوی صلعم سے آراستہ ھو ۔ جو اخلاق خداوند تعالی کے فیض سے حاصل ھوں ، ان پر قائم و دائم رھے اور جو اخلاق اس میں نہیں ،

انہیں سعی و کوشش سے ، ریاضت سے اور صاحبان شریعت و طریقت کی خدمت و صحبت سے حاصل کرے ۔ کیوں کہ بیشتر اخلاق اکتسابی[۵] ہیں اور انسان کو انہیں محنت سے حاصل کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔

اے بھائی ! انسانی نفس آئینے کی طرح ہے ؛ جب تربیت پاتا اور اپنے کمال کو پہنچتا ہے تو انسانیت کے زنگ سے پاک ہو جاتا ہے اور پھر خدائے جل جلالہ کے جلال و کمال کی تمام صفات کو خود میں منعکس پاتا ہے ۔ اس وقت خود کو پہچانتا ہے کہ وہ کون ہے اور اسے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے ۔ جیسا کہ ایک عارف نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے : **رباعی**

ای نسخۂ نامۂ الٰہی که توئی
وی آئینۂ جمال شاهی که توئی

بیرون ز تو نیست هرچه در عالم هست
در خود بطلب هر آنچه خواهی که توئی

(اے کہ تو خدائی مکتوب کا نسخہ اور جمال خداوندی کا آئینہ ہے ؛ جو کچھ دنیا میں ہے وہ تیری ذات سے باہر نہیں ، جو کچھ تجھے مطلوب ہے اسے 'خود' میں ڈھونڈ کہ سب کچھ تو ہے ۔)

اور یہ شریعت و طریقت اور حقیقت کی راہ پر چلے بغیر حاصل نہیں ہوتا ۔ اس سلسلے میں پوری پوری سعی و کوشش کو کام میں لانا چاہیے کہ نہ معلوم اس دولت کا تالا کون سی چابی سے کھلے گا ، یا کس خوش بخت کو یہ دولت عطا کی گئی ہے ، کیوں کہ نہ تو سلطنت جاوید ہر بادشاہ کو عطا ہوتی ہے اور نہ عزت کی کلاہ ہی سر پر رکھی جاتی ہے ۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے : **بیت**

ملک طلبش بهر سلیمان نه دهند
منشور غمش بهر دل و جان نه دهند

(اس کی طلب کی سلطنت ہر سلیمان کو نہیں ملتی اور اس کے غم کا منشور ہر کسی کے دل و جان کو میسر نہیں ۔)

خداوند عز و جل کے اسی (۸۰) ہزار عالم ہیں ؛ یہ تمام اس بات سے خالی اور ادراک و نصیبہ سے محروم ہیں ، سوائے انسان کے کہ یہ بزرگی و شرافت موجودات عالم میں سے کسی اور کو نہیں دی گئی ۔ اسی لیے کسی نے کہا ہے :—

پناہ بلندی و پستی توئی
همه نیستند آنچه هستی توئی

(تو بلندی و پستی کی پناہ ہے ۔ تمام 'نیست' ہیں اور تو 'ہست' ہے)

(مکتوبات شیخ شرف الدین یحییٰ منیری ، صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۷)

حضرت نور قطب عالم

[نورالحق المعروف به نور قطب عالم (متوفی ۱۴۱۰ ع) بنگال کے صوفیاے کرام میں سے تھے - ان کے مکتوبات اور شرح احادیث نبوی (انیس الغربا) مشہور ھیں]

(۱)

تصوف کے بعض مسائل

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''جو شخص اللہ کی ملاقات پسند کرتا ھے ، اللہ اس کی ملاقات پسند کرتا ھے'' یہاں 'اللہ کی ملاقات' سے مراد 'موت' ھے - حضور علیہ السلام نے فرمایا ''موت ایک ایسا پل ھے جو دوست کو دوست سے ملاتا ھے -'' پردیسی اور مسافر آدمی اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی محنت میں زیادہ تیزی و سرعت سے کام لیتا ھے تاکہ واپسی پر اپنوں میں خالی ھاتھ اور بے سروسامانی کی حالت میں نہ جائے - تو بھی اس وحدہ لاشریک کی معرفت اور نیک اعمال میں سرعت و تیزی دکھا تاکہ کل قیامت کے دن اس بارگاہ لم یزلی میں تو خالی ھاتھ زیاں کار اور خیانت کرنے والے کی حیثیت سے پیش نہ ھو -

مسافر پردیس کے دکھوں اور اپنے وطن والوں سے دوری کی جلن کے سبب ھمیشہ ملول و غمگین ، ماتم سرا ، بے چین اور بے کل رھتا ھے ، تو بھی مسافرت کی تکالیف اور اپنے محبوب وطن سے دوری کی سوزش کے سبب ماتم اور غم و اندوہ میں رہ اور اشعار پڑھ پڑھ کر دل کو جلا :

رباعی

گر دولت و بخت یار بودی مارا | در مسکن خود قرار بودی مارا
گر چشم بد زمانہ بر ما نہ زدی | در شہر کسان چہ کار بودی مارا

(اگر دولت اور بخت ہمارے دوست ہوتے تو ہمیں اپنی جگہ پر قرار ہوتا ۔ اگر زمانے کی نظر بد ہمیں نہ لگتی تو غیروں کے شہر میں جانے کی ہمیں کیا ضرورت رہتی)

میں کسی بہتری کے لیے اس دنیا کے قید خانے میں محبوس ہوں ، ورنہ کہاں میں اور کہاں قید خانہ ۔ میں نے کسی کا مال تھوڑی چرایا ہے ۔ غریب الوطن ہمیشہ شکستہ دل ، غمگین ، مسکین اور بے تسکین ہوتا ہے ؛ تو بھی دنیا میں ، کہ تیرے لیے پردیس ہے ، شکستہ خاطر ، پر انکسار و بے قرار رہ اور اس دنیائے فانی کے نشہ و غرور میں بد مست و سرگراں نہ ہو : فرد

در عشق دلی شکستہ باید کز طاعت خشک ہیچ ناید

(عشق میں آئینۂ دل شکستہ ہونا چاہیے (تاکہ نگاہ آئینہ ساز میں عزیز تر ہو) خشک عبادت بے سود و بے کار ہے)

وطن سے دوری کی آگ کی لپٹ اور پردیس کی مصیبتوں کی جلن غریب الوطن کو صبح و شام ہزاروں بار جلاتی ہے اور اس کا دل وطن والوں سے ملنے کے شوق میں جلتا رہتا ہے ؛ زہر مسافرت کے گھونٹ اس کی جان کے حلق میں ٹپکتے اور اس کے دل کے شہر میں ہزاروں جاں گداز درد اٹھتے رہتے ہیں : رباعی

زہر است بجای بادہ در جام غریب زان روی کہ تلخ باشد ایام غریب
ہنگام وغا و ساعات درد دل (کذا) یا صبح قیامت است یا شام غریب

(غریب الوطن کے پیالے میں شراب کی بجائے زہر ہے ؛ اسی وجہ سے اس کے اوقات تلخ ہیں ۔ شور و غوغا کی گھڑی اور درد دل کے لمحات قیامت کی صبح ہے یا غریب الوطن کی شام)

تو بھی اس رب العزت کی بارگاہ سے دوری میں جلتا رہ کہ قرآن کریم میں آیا ہے ''روح کئی ہزار سال تک اس خدائے غفار کی درگاہ کے قرب و جوار میں رہی اور حق تعالیٰ کے فضل سے مستفیض ہوتی رہی ۔'' کسی بزرگ نے اسی طرف اشارہ کیا ہے :

تو آن نوری که پیش‌ازصحبت خاک ولایت داشتی بر بام افلاک

(تو وہ نور ہے کہ زمین پر اترنے سے پہلے آسمانوں پر تیری حکومت تھی)

اسی حقیقت کے بارے میں مولانا روم[1] رحہ فرماتے ہیں :

ما ربفلک بوده ایم یار ملک بوده ایم
باز همان جا رویم منزل ما کبریا ست

(ہم آسمان پر رہے ہیں اور فرشتوں سے ہماری دوستی رہی ہے ؛ پھر اسی جگہ چلیں کہ بارگاہ کبریا ہی ہماری منزل ہے)

تمام اوقات میں خصوصاً صبح و شام (اس دوری کا) ماتم کرتا رہ اور یہ شعر پڑھ کر سر پیٹتا رہ :

یاد آر از غریبی و رنجور بی طبیبی
از هجر دل فگاری ، از وصل بی نصیبی

(ایک غریب الوطن اور ایسے مریض کو، جس کا کوئی معالج نہ ہو ، جس کا دل ہجر کے سبب زخمی ہو اور جو وصل سے بے نصیب ہو ، یاد رکھ)

درد جدائی ، غم مسافرت اور راتوں کی تنہائی کے سبب آہ و زاری کر، آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہا ، تپش دل کے باعث نالہ ہائے آتشیں سر کر اور چشم پرنم اور سوختہ دل کے ساتھ یہ اشعار بار بار پڑھ :

رباعی

مدتی شد که من غم زده سودائی می‌کشم بار فراق و ستم تنهائی
جرعهٔ زهر غریبی چو شکر می نوشم از کف ساقی و دور فلک مینائی

(ایک مدت سے میں غم کا مارا دیوانہ ہجر کا بوجھ اور تنہائی کے ستم اٹھا رہا ہوں ۔ ساقی کے ہاتھوں اور آسمان کی گردش سے غریب الوطنی کے زہر کے گھونٹ شہد کی طرح نوش کر رہا ہوں)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے 'اوکانک عابر سبیل ۔' (گویا کہ تو راہ چلتا مسافر ہے) ۔ جب کوئی غریب الوطن کسی شہر میں وارد ہوتا ہے تو اسے ہر صورت و ہر حال میں اس شہر اور اہل شہر سے

رغبت و آلفت ھو جاتی ھے ، اور جب وہ پھر اپنی راہ پر چل نکلتا ھے تو اپنے وطن اور ابنائے وطن کی چاھت میں اُس کا دل اس شہر اور اھل شہر سے اُٹھ جاتا ھے اور وہ کسی کی طرف رغبت نہیں کرتا۔ تو بھی اس دنیا سے کہ تیرے لیے بیگانہ شہر ھے ، آخرت کی طرف سفر کر اور کسی سے دل نہ لگا : نظم

بهیچ یار مده خاطر و بهیچ دیار
که بر و بحر فراخ است ، آدمی بسیار
ازین درخت چو بلبل بر آن درخت نشین
بدام گل چه فرومانده ای چو بو تیار
چو ماکیان بدر خانه چند چینی جو
چرا سفر نه کنی چون کبوتر طیار

(کسی یار اور کسی دیار سے دل نہ لگا کہ یہ دنیا بہت وسیع ھے اور انسان بے شمار ھیں۔ بلبل کی طرح کبھی اس شاخ پر بیٹھ کبھی اُس شاخ پر۔ بگلے کی طرح کیچڑ کے جال میں کیوں پھنس کے رہ گیا ھے ، کب تک مرغیوں کی طرح گھر کے دروازے پر جو چگتا رھے گا ، اُڑنے والے کبوتر کی طرح سفر کیوں نہیں کرتا ؟)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ھے " سفر کرو ؛ کیوں کہ جب پانی ٹھہرا رھتا ھے تو وہ بدبودار ھو جاتا ھے۔" کوئی مسافر راستے کو اپنا مسکن اور جائے پناہ نہیں بناتا اور نہ چلنے پھرنے سے باز ھی رھتا ھے۔ وہ اس تمام مال و اسباب سے جو چلنے میں رکاوٹ کا سبب بنے ، خود کو فارغ اور خالی ھاتھ رکھتا ھے۔ تُو بھی دنیا میں دنیا کی گزر گاہ کو اپنی سکونت و جائے پناہ مت بنا :

دنیا پلیست بر گذر از راه آخرت — اهل تمیز خانه نه کردند بر پلی
بر پل مساز خانه که این خانه بی تمیز — روزی بود که سیل برد خانه با پلی

(دنیا ، آخرت کے راستے میں ایک پل ھے ؛ صاحبان عقل و ھوش پل پر گھر نہیں بناتے۔ پل پر گھر نہ بنا کہ ایک نہ ایک دن سیلاب اس بے ڈھنگے گھر اور پل کو بہا لے جائے گا)

اور اللہ کے سوا جو دیگر بوجھ اور اسباب ہیں ان سے خالی ہاتھ اور فارغ ہو جا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'سیرو اسبق المفردون۔'

ترجمہ : چلنے میں جلدی کرو کہ دوسرے لوگ جو ما سوی اللہ سے فارغ و خالی تھے ، چلنے میں سبقت لے گئے ہیں : **مصرع**

سبک برخیز چہ جاے انتظار است

(جلدی اٹھ ، انتظار کا اب کون سا وقت ہے)

اور راہ گیر جو اپنے وطن اور اہل وطن کی چاہت میں سفر و حضر کی تکلیفیں اور مشقتیں اٹھاتا ہے تو اس لیے کہ وہ جلد سے جلد وطن اور اہل وطن سے جا ملے اور راستے کی صعوبتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ رہے ۔ تو بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول مبارک ۔ ''اپنے نفسوں سے مجاہدات اور مخالفات کے ذریعے جنگ کرو'' ۔ کے مطابق ریاضت میں شدت اور نفس امارہ کی مخالفت میں مشقت اختیار کر ، دن رات جلتا رہ اور ہرگز سکون و آرام کی طرف مائل نہ ہو اور کمال عجز و انکساری سے یہ شعر پڑھتا رہ :

یا رب تو مدہ قرار مارا گر بی رخ تو قرار داریم

(اگر ہم تیرے چہرے کے بغیر سکون میں ہوں تو اے خدا ہمیں قرار نصیب نہ ہو!)

مسافر راہ زنوں اور چوروں کے ڈر سے ہمیشہ بہت محتاط اور ہوشیار رہتا ہے اور اپنے سامان کی پوری پوری رکھوالی کرتا ہے - دن رات اس پر خوف و ہراس طاری رہتا ہے جس کے سبب وہ ایک لمحہ بھی غفلت کا شکار نہیں ہوتا ۔ تو بھی محتاط اور ہوشیار ہو جا اور اپنے دل کی رکھوالی کر ۔ عبادت میں انفاس پر پہرہ رکھنے کی کوشش کر تاکہ شیطان نہ گھسنے پائے اور تیرے ایمان اور معرفت حق کی پونجی نہ اڑا لے جائے ۔ عبادت کے وقت انفاس پر پہرہ دینے سے اس میں خلل نہیں پڑتا ۔

راہ گیر راہ زنوں کے خوف سے اور راستے کی آفتوں سے بچنے کے لیے

آخر شب سفر شروع کرتا ہے تاکہ راستے کی صعوبتوں سے نجات پائے اور جلد منزل پر پہنچ جائے۔ تو بھی شب روی اختیار کر اور رات کے پچھلے پہر نکل پڑ تا کہ راستے کے ڈر سے محفوظ رہے اور اپنے مقصد کو پہنچے۔ (انیس الغربا، صفحہ ۵ تا ۸)

(۲)

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے ''ابن آدم کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ بگڑ جائے تو تمام جسم بگڑ جاتا ہے اور جب وہ سنور جائے تو تمام جسم سنور جاتا ہے، اور سن لو کہ وہ دل ہے''۔

وہ دل جو اس فانی دنیا کی طمع اور محبت میں اور بیہودہ کاموں کے سبب مردہ و فاسد ہو چکا ہو، تم اس کے سامنے لاکھ قرآن مجید کے وعظ و نصیحت بیان کرو، احادیث رسول اکرم اور اقوال مشائخ پڑھ پڑھ کر سناؤ، اس پر اس کا کچھ بھی اثر نہ ہوگا، یعنی وہ بیدار نہ ہو گا، بلکہ وحشت کا شکار ہو جائے گا اور کچھ بھی نہ سن سکے گا۔ اس لیے کہ اس بے ثبات دنیا سے بے حد لگاؤ اور حرص اور دیگر بری خاصیتوں کے سبب وہ دل مر چکا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' انک لاتسمع الموتی۔' 'یعنی اے محمد صلعم! آپ مُردوں کو سنا نہیں سکتے، کیونکہ وہ سننے سے عاجز ہیں۔' اگر انہیں اس دنیا اور اہل دنیا کے متعلق یا کوئی فضول و بیہودہ بات سنائی جائے تو اسے وہ بڑے غور و خوض سے سنیں گے اور لطف اٹھائیں گے۔ ہاں گبریلا کے لیے گلاب کی خوشبو باعث ہلاکت ہے اور غلاظت و گندگی کی بدبو اس کی زندگانی و شادمانی کا سبب۔ شیخ فریدالدین عطار[۲] 'اسرار نامہ' میں لکھتے ہیں: ''ایک حلال خور عطرفروشوں کے محلے سے گزر رہا تھا؛ جب عطر کی خوشبو اس کے دماغ تک پہنچی تو وہ بے ہوش ہو گیا اور اس کی جان پر بن گئی۔ عطاروں نے ہر چند عرق گلاب اور دیگر عطر اس کے منہ پر چھڑکے، اسے ہوش نہ آیا بلکہ اور بھی بے ہوش و بے قابو ہو گیا۔ اسی دوران میں کسی دانا کا ادھر سے

گزر ہوا؛ اس نے یہ ماجرا دیکھا تو تھوڑا سا گوبر اٹھا کر اس کی ناک کے قریب رکھا ۔ گوبر کا رکھنا تھا کہ وہ ہوش میں آگیا اور چنگا بھلا اٹھ کھڑا ہوا ۔''

شیخ عطار ہی نے اپنی 'مثنوی منطق الطیر' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ ''کوئی دیوانہ کسی ویرانے میں رہتا تھا؛ جب کبھی اتفاق سے اس کا گزر آبادی سے ہوتا تو وہ اپنی ناک کو انگلیوں سے دبا کر بند کر لیتا؛ لوگ اس کا سبب پوچھتے تو وہ جواب میں کہتا ''دنیا کی بدبو سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہوں ۔'' اے میرے عزیز! دنیا کی اس بدبو کا پتا صرف اس شہباز کے دماغ کو چلتا ہے، جس کی روح کے پرندے نے محبوب حقیقی کے گل زار وصل سے خوشبو پائی ہو، محبوب لم یزلی کے چمن عشق و محبت کی نسیم اس کے دماغ تک پہنچی ہو، مدھ مکھی کی طرح اس نے شہد عرفان و معرفت کی لذت اٹھائی ہو، اور دل کے صحن کو دنیاوی خواہشات و لذات کے کوڑے کرکٹ سے پاک صاف رکھا ہو: شعر

دل عرش اعظم است بکن خالی از بتان
بیت المقدس است مکن جاے بت گری

(دل عرش اعظم ہے، اسے بتوں سے خالی رکھ ۔ یہ مقدس گھر ہے اسے بت گری کی جگہ نہ بنا ۔)

بھلا اس شخص کے دماغ میں اس دنیا کی بدبو کیوں کر پہنچے گی جس نے گبریلے کی طرح خود کو جیفۂ[۳] دنیا سے چمٹائے رکھا اور جس کے دماغ میں محبوب حقیقی کے گلستان عشق و محبت سے کبھی خوشبو نہ پہنچی ہو، جس کا دماغ دنیا کی بدبو سے بھرا پڑا ہو، جس نے خود دنیا سے موافقت کی ہو، جس کی ہمت و کوشش حصول دنیا پر ہی صرف ہو، جس نے دل میں غم دین کو قطعاً جگہ نہ دی ہو اور موت و قیامت کو بھلا دیا ہو، جس نے تمام زندگی غفلت و سستی میں گنوا دی، جس نے نفسانی خواہشات کی آگ کو بھڑکائے رکھا، اور جس نے محض اس جہان بے ثبات کی طلب میں عزت و آبرو کو کھو یا اور ذلت و رسوائی

کی خاک اپنے سر میں ڈالی ہو ۔ اس سلسلے میں میدان طریقت کے شہ سوار ، گنبد حقیقت کے شہباز اور حضرت قدوس کی شراب عشق کے سرمست و سرشار فریدالدین عطار نے کیا خوب کہا ہے : **مثنوی**

در غم دنیا گرفتار آمدی — خاک بر فرقت که مردار آمدی
تشنۂ مردار دنیا آمدی — لا جرم مهجور معنیٰ آمدی
هر که مشغولت کند از کردگار — بت بود در خاک افگن زینهار
هست دنیا آتشی افروخته — هر زمان خلقی دگر را سوخته
کار دنیا چیست ؟ بی کاری همه — چیست بی کاری ؟ گرفتاری همه

(تو دنیا کے غم میں گرفتار ہے ؛ تیرے سر پر خاک که تو مردار ہے ۔

تو جیفۂ دنیا کا طالب گار ہے ، اس لیے حقیقت سے دور ہو گیا ہے ۔

جو چیز بھی تجھے اپنے پروردگار سے دور رکھے ، وہ بت ہے اسے فوراً خاک میں ملا دے ۔

دنیا ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے ، جو ہر لمحہ خلق کو جلاتی رہتی ہے ۔

کار دنیا؟ تمام بے کاری ہے ۔ اور بیکاری؟ سب گرفتاری ہے ۔)

اے عزیز بے شک تو تمام دنیا کو اپنی دلی مراد کے مطابق ڑپ کر جا ، عیش و نشاط کے جام میں اس کی شراب پی ، نفس امارہ کی تمام خواهشات اور شہوات پوری کر ، دنیا کے تمام عیش و مسرت ، قسم قسم کی نعمتوں اور دولت کی لذتوں سے شاد کام ہو ، تمام دنیا کو اپنے قبضے میں لے آ اور اپنے محلات کہکشاں تک اونچے لے جا ، لیکن یاد رکھ که آخر تجھے خاک میں ملنا اور کیڑوں مکوڑوں کا لقمه بننا ہے ۔ قبر کی تنگی کے باعث تو چیخ چیخ اٹھے گا ، اور جب منکر نکیر تجھ سے سوال کریں گے تو اس وقت تجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا ۔

اور اس گھڑی سوائے اللہ جل جلالہ کی رحمت و بخشش کے کوئی بھی تیرا پرسان حال اور مددگار نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے امام، کونین کے قطب ابوحنیفہؒ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے:

اشعار

همب ان النفس قد بلغت مناها	الم تكن المنية منتهاها
و فیک سارق فاعتبروا اعتبارا	و عمرک طار تنبسه انتهاها
صرفنا العمر فی لعب و لهو	فاها لثمراها لثمراها
احب الصالحین و لست منهم	لعل الله یرزقنی صلاحا

(تو سمجھ لے کہ دل نے اپنی آرزو پالی، لیکن کیا اس کی انتہا موت نہیں؟

تم ھی میں چور موجود ہے اس لیے ھوشیار رھو۔ اور تمہاری عمر اڑنے والی اور انتہا کو پہنچنے والی ہے۔

ہم نے اپنی عمر کھیل کود میں بسر کر دی؛ پس افسوس اس کے حاصل پر اور مزید افسوس۔

میں صالحین سے محبت کرتا ھوں، اگر چہ ان میں سے نہیں ھوں۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان کی معیت عطا کرے گا)

ھیہات! ھیہات!! ذرا اس خواب غفلت سے بیدار ھو کہ زندگانی کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیا خبر موت کا فرشتہ کس گھڑی اچانک آ دھمکے اور چھوٹے بڑوں اچھے بروں سب کو اچک کر لے جائے؛ پھر وقت ھاتھ نہیں آئے گا۔ زندگی پر بھروسا نہ کر، فرصت کی تلاش میں نہ رہ کہ یہ بادل کی مانند بہت جلد اور تیز تر گزر جانے والی شے ہے۔

"الفرصة غنيمة والغفلة غرامة۔" (فرصت غنیمت ہے اور غفلت جرمانہ):

غافل مباش از عاقلی، دریاب کر صاحب دلی
باشد کہ نتوان یافتن دیگر چنیں ایام را

اگر تو عاقل ہے تو غافل نہ رہ ۔ اگر تو صاحب دل ہے تو موقع کو پا لے ۔ ہو سکتا ہے ایسا موقع پھر ہاتھ نہ لگے)

حدیث میں آیا ہے ''ہر صبح دن یہ کہتے ہوئے طلوع ہوتا ہے کہ اے انسان مجھے غنیمت جان اور اپنا نصیب یعنی نیکیاں اور اچھائیاں مجھ سے حاصل کر ، اس لیے کہ جس وقت میں تجھ سے جدا ہو گیا تو پھر تیرے ہاتھ نہیں لگوں گا ۔'' کسی نے کیا خوب کہا ہے :

رباعی

امروز که روز عمر بر جا است　　می باید کرد کار خود راست
فردا چو اجل عنان بگیرد　　عذر من و تو کجا پذیرد

(آج جب کہ زندگی کا دن ابھی باقی ہے ، اپنا کام درست کر لینا چاہیے ؛ کل جب موت آ دبوچے گی تو پھر ہمارے کوئی عذر نہ سنے جائیں گے)

آج اللہ کے سوا جس چیز سے تو نے دل لگا رکھا ہے ، کل قیامت کے روز وہی تیرے پاؤں کی زنجیر بنے گی ۔ نہ تو وہ تیری مدد کرنے کے قابل ہو گی اور نہ تیری نجات ہی کا وسیلہ و سبب بن سکے گی ۔ آج محبوب حقیقی کے سوا جو چیز بھی تیری محبوب ہے ، کل وہی تیری جان کی ہلاکت کا باعث ہو گی اور جو تیری مونس ہے وہی تیری وحشت کا سبب بنے گی ۔ لہذا موت سے پہلے پہلے ان تمام چیزوں سے دل اٹھا لینا چاہیے ، اور ''موتوا قبل ان تموتوا'' (مرنے سے پہلے مر جاؤ) کا شربت چکھ لینا ، غفلت کا پردہ دور کر دینا اور محبوب حقیقی کی طرف ہمت کے پروں سے اڑ جانا چاہیے :

ای دل ببر از هر چه ترا پیوند است
زیرا چه همه بر جان تو فردا بند است
سودی طلب از عمر که سرمایه عمر است
روزی چند است و کس نداند چند است

(جس چیز سے بھی تیرا لگاؤ ہے اس سے دل اٹھا لے کہ قیامت کے دن یہی تیری روح کی زنجیر ہو گی ۔ عمر سے سود (فائدہ) طلب کر کہ

یہ زندگی کا سرمایہ ہے ۔ زندگانی کے دن چند ہی ہیں اور کسی کو معلوم نہیں کہ کتنے ہیں)

آہ بے چارہ ، درد کا مارا ، غریب‌الوطن ، شدت غم میں گرفتار و بے قرار ہے ادھر دیار محبوب تک پہنچنا دشوار ؛ راستہ خطرات سے پر اور اس کی صعوبتیں بے شمار ؛ منزل دور ، گھوڑا چلنے سے عاجز و مجبور ، محبوب بے حد بے نیاز و غیور ؛ نہ تو اس کے ساتھ رهنا ممکن نہ اس تک پہنچنے کا مقدور :

راه نا ایمن است و منزل دور   مرکب لنگ و یار سخت غیور

(راستہ خطروں سے پر ہے اور منزل دور ہے ؛ گھوڑا چلنے سے مجبور ہے اور محبوب بے حد غیور ۔)

(انیس‌الغربا ، صفحہ ۳۷ تا ۴۰)

(۳)

بے چارے مسکین و غمگین نور کی تمام عمر برباد ہو گئی مگر گوہر مقصود تک اس کی رسائی نہ ہو سکی ، اور وہ حیرت کے بیابان اور حسرت کے میدان میں گیند کی طرح سرگرداں ہو کر رہ گیا :

همه شب بزاریم شد کـه صبا نداد بوی
نـه دمید صبح بختم چه گنه نهم صبا را

(میری تمام رات روتے ہی کٹ گئی مگر باد صبا بوے یار نہ لائی ۔ میرے تو بخت کی صبح ہی طلوع نہ ہوئی ، پھر میں صبا کو کیوں قصور وار ٹھہراؤں)

ہا ! عمر ساٹھ سے بھی اوپر ہو گئی اور وقت ہاتھ سے نکل گیا ۔ اور بے چارا نور ایک لمحہ بھی تو نفس امارہ کے شر سے نہ بچ سکا ۔ خالی ہاتھوں ، نمناک آنکھوں ، دل میں آگ اور سر پہ خاک کے سوا اسے اور کیا ملا ۔ اب اس کے پاس بجز خجالت اور ندامت کے دوسری دستاویز ہی کون سی رہ گئی ہے ، اور سوائے آہ و فغاں اور سوز و درد کے دیگر پاے فرار بھی تو نہیں :

دِرد را باش ، ای برادر ! درد را

(اے بھائی درد و گداز اختیار کر درد و گداز) شعر :

دل مردان دین پُر درد باید　　ز محنت فرق شان پُر گرد باید

(مردان دین کے دل درد سے معمور اور ان کی پیشانی رنج و غم کی گرد سے اٹی ہوئی ہونی چاہیے)

گو لاکھ جتن کیے مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ لگا :

گفتم مگر کہ کار بہ سامان شود ، نشد
یار از جفای خویش پشیمان شود ، نشد

گفتم مگر زمانہ عنایت کند ، نکرد
بخت ستیزہ کار بہ فرمان شود ، نشد

(میرا یہ خیال تھا کہ شاید معاملہ درست ہو جائے اور دوست اپنی جفا سے پشیمان ہو ، لیکن ایسا نہ ہوا۔

میں نے سوچا کہ شاید دنیا مہربانی کرے اور جھگڑنے والا نصیب رام ہو جائے مگر افسوس کہ یوں نہ ہوا)

دنیا غرور کی جگہ اور کمینہ نفس دور بینی سے عاری ، محبوب حقیقی ٹھہرا غیور تو اس حالت میں بھلا مقصود کیوں کر دل میں سرور پا سکے گا - اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ اے داؤد گنہ گاروں کو خوش خبری سنا دو کہ میں بخشنے والا ہوں اور صدیقین کو خبردار کردو کہ میں غیور ہوں) :

راہ نا ایمن است و منزل دور　　مرکبت لنگ و یار سخت غیور

(راستہ خطروں سے بھرپور اور منزل دور ؛ تیرا گھوڑا چلنے سے مجبور اور محبوب بڑا غیور ۔)

اس محبوب کی غیرت نے یہ تقاضا کیا کہ 'ماسو اللہ' کو درمیان میں نہ رہنے دیا اور جس کسی نے ماسو اللہ سے لو لگائی اسے گداز کر دیا ۔

با هرکه آنس گیری ازو سوخته شوی
بنگر که 'اُنس' چیست ، مصحف ز 'آتش' است

(جس کسی سے 'اُنس' کرے گا اسی سے جل جائے گا ۔ ذرا دیکھ کہ 'آنس' کیا ہے ؛ 'آتش' سے مشابہ ہے ، یعنی ان دونوں میں صرف نقطوں کا فرق ہے)

اے جان برادر! برسوں ہم نے اس نفس امارہ کو مختلف ریاضتوں سے مرتاض کیا ، لیکن ایک لمحہ بھی اس کے شر سے نہ بچ سکے اور ایک لحظہ بھی ہمیں اپنے آپ سے آسودگی نہ حاصل ہوئی :

کردیم بسی سپید سیمی — از ما نشد این سیہ گلیمی
شستیم بسی بہ چارہ سازی — پیراہن ما نشد نمازی

(ہم نے اسے چاندی کی طرح سفید کرنے کی بہت کوشش کی ، لیکن یہ سیہ[5] گلیم ہم سے سفید نہ ہوئی ؛ ہم نے اسے بڑے ہی طریقوں سے دھویا لیکن ہمارا یہ لباس پھر بھی پاک نہ ہوا)

(۴)

درویش کا چین بے چینی میں اور درویش کی عبادت 'ما سو اللہ' سے بیزاری میں ہے ۔ ما سو اللہ سے لگاؤ گرفتاری ہے ، اور عبادت جو من میں ڈوب کر نہ کی جائے وہ محض بے کاری ہے ۔ ظاہر کی عبادت نشانی ہے بدکاری کی ۔ خون جگر پینا بزرگواری اور 'غیر حق' سے چشم پوشی برخورداری ہے ۔ عوام ظاہری پاکیزگی میں جد و جہد کرتے ہیں اور خواص باطن کی پاکیزگی میں ۔ اللہ تعالی کی جانب سے ندا آتی ہے اور عتاب ہوتا ہے کہ ''اے میرے بندے تو نے مخلوق کے لیے برسوں اپنے ظاہر کو پاکیزہ بنایا ، کیا میرے لیے ایک لمحے کو بھی تو نے خود کو پاکیزہ بنایا ؟ تو نے عمر کس میں صرف کی؟'' ظاہری طہارت خروج[6] حدث سے اور باطن کی طہارت ذکر محدث[7] سے ٹوٹ جاتی ہے ۔ مشائخ کا کہنا ہے کہ ''جس کسی سالک کے دل میں دنیا کا خیال آ جاتا ہے ، اس پر جنابت طریقت[8] کا غسل واجب ہو جاتا ہے ۔'' کسی شے سے دل نہ لگا اور نہ کسی کی محبت میں گرفتار ہو کہ مخلوق کی پیشانی پر بے وفائی کی تحریر ثبت ہے ۔ (اخبارالاخیار ، صفحہ ۱۵۳ ، ۱۵۴)

خواجه بنده نواز گیسو دراز

[سید محمد الحسینی الملقب به بنده نواز گیسو دراز (۱۳۲۰ع - ۱۴۲۲ع) حضرت چراغ دهلی کے مرید تھے - حملۂ تیموری میں دکن چلے گئے - 'جوامع الکلم' ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ، جو ان کے صاحب زادے سید حسین نے جمع کیا - ذیل کا اقتباس اسی سے ہے اور اشاعت اسلام کی دشواریوں کو ظاہر کرتا ہے]

هندوؤں کے عقاید کے بارے میں خواجه بنده نواز کے ارشادات اور شراب کے متعلق احکام اسلام

اٹھائیس شعبان ہفتے کے روز پہر دن چڑھے ایک برہمن پابوسی کے لیے حاضر ہوا اور کہنے لگا ''مجھے اڑتالیس سال ہو چلے ہیں کسی ایسی ہستی کی تلاش میں ہوں جس نے اپنے نفس کو پہچان اور اس حقیقت کو جان لیا ہو کہ اس سے باہر کوئی اور وجود نہیں ہے - آپ (خواجہ بندہ نواز) نے فرمایا ''ایسا شخص صرف وہی ہو سکتا ہے جس نے دل کو کسب کیا ہو اور کسب دل کے لیے ایک خاص عمل ہے - جس نے کسب دل کر لیا وہی اپنے نفس کو پہچان اور یہ جان گیا کہ اس سے باہر کوئی دوسری چیز نہیں ہے -'' برہمن بولا '' ہمارے یہاں ایک بزرگ تھے جنھوں نے چالیس دن تک کچھ بھی نہ کھایا ، اور نہ کسی کی شکل ہی دیکھی - انھوں نے بھی یہ سب کچھ کسب دل ہی کے لیے کیا تھا -''

آپ نے فرمایا ''چالیس دن تو کیا چالیس سال تک کچھ نہ کھائے یا قطعاً کھانا ترک کر دے اور آنکھ مکمل طور پر بند کر لے

(تو بھی کیا بنتا ہے) یہ سب کچھ جسمانی اعضا سے متعلق ہے۔ اسے ہم 'ابواب بر' (نیکی کے دروازے) کا نام دیتے ہیں۔ یہ کسب دل نہیں ہے، اس سے دل ہاتھ نہیں لگتا۔ کسب دل کے لیے تو اس قسم کے تمام عملوں سے علیحدہ ایک عمل ہے۔'' پھر آپ نے ایک لمحے کے لیے اس عاجز (مؤلف ملفوظات) کی طرف دیکھا اور فرمانے لگے ''ان کی طریقت کی انتہا بس یہیں تک ہے کہ گناہ اور عبادت برابر ہو۔'' پھر آپ نے فرمایا ''ان کے علما مسئلۂ تناسخ کے قائل ہیں، یعنی جو کوئی مرتا ہے وہ دوبارہ اس دنیا میں لوٹ کر آئے گا؛ لیکن کس کے شکم سے اور کون سی شکل میں پیدا ہو گا؟ یہ معلوم نہیں۔ ممکن ہے کتے کا روپ دھار لے یا بندر ہو، پھر سانپ کی شکل یا دوبارہ آدمی کے وجود میں آ سکتا ہے۔ بادشاہ کی جون اور فقیر کی آتما میں آنا بھی ممکن ہے۔ اگر تو اس نے نیک عمل کیے ہوں گے تو پھر کسی بزرگ کے یہاں جنم لے گا، ورنہ (پاپی ہونے کی صورت میں) کسی برے پران میں ظاہر ہو گا یا پھر حیوان بنے گا۔''

''ایک ہندو سے میں نے پوچھا کہ تم لوگ گوشت کیوں نہیں کھاتے؟ کہنے لگا کہ 'جس وقت یہ (حیوان) انسان کے شکم سے پیدا ہو گا اور میں نے اس کا گوشت کھایا ہو گا تو یہ میرا دشمن بن جائے گا۔' لیکن ان کے سالک اس بات کے قائل ہیں کہ جب تک کوئی 'ہست' ہے، ہست رہے گا اور جب چلا جاتا ہے تو سب کچھ خالی کر جاتا ہے اور کچھ بھی پیچھے نہیں رہتا؛ دوبارہ لوٹنا یا آنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اور یہ جو ہم روز محشر، روز قیامت اور روز حساب وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں تو یہ تمام لوگ اس سے قطعاً نا واقف و بے خبر ہیں۔ ان کے علماء اور سالک بیسیوں مرتبہ مجھ سے بحث و مناظرہ کے لیے آئے اور ہر مرتبہ یہی طے پایا کہ اگر ایک فریق کی باتیں صحیح قرار پائیں تو دوسرے فریق پر واجب ہو گا کہ وہ اس کی پیروی کرے۔ چنانچہ اسی کے مطابق شرائط نامہ بھی تیار کیا گیا۔ جب میں نے ان سے بحث کے لیے کہا تو کہنے لگے پہلے تم کہو۔ میں نے چونکہ ان کی سنسکرت کی کتابیں اور مذہبی داستانیں پڑھی ہیں اس لیے میں نے

انھی کے مذھب کی باتیں چھیڑیں - انھوں نے میری ھر بات کو دل و جان سے قبول کرتے ھوئے اس بات کا اقرار کیا کہ ان کے مذھب میں واقعی ایسا ھی ھے جیسا کہ میں کہہ رھا ھوں - پھر میں نے اپنے مذھب کے مسائل بیان کرنے شروع کیے اور ساتھ ساتھ دونوں کا موازنہ و مقابلہ کر کے ان کے مذھب پر دین اسلام کی برتری ثابت کی ؛ حیران ھو کر رہ گئے اور رو پڑے - پھر خوار ھو کر ایک دم رو بہ زمین ھو گئے اور جس طرح بتوں کو سجدہ کرتے ھیں اسی طرح میرے سامنے سر بہ سجود ھوگئے - میں نے انھیں اس سے روکا کہ یہ امر فضول ھے ؛ ھم نے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر ایک فریق کی بات صحیح قرار پائے تو دوسرا فریق اس کی پیروی اور اس کا مذھب اختیار کرے گا - اس پر کوئی تو یہ کہنے لگا کہ کیا کروں مقدر ھی میں یہ مذھب لکھا تھا ؛ ھمارے بزرگ اسی مذھب پر چلے، لہٰذا جو مذھب ان کا تھا وھی اپنا مذھب ٹھہرا ، اور کسی نے یہ جواب دیا کہ 'میں بال بچوں اور گھربار والا ھوں ، کیوں کر انھیں چھوڑ دوں -''

ان (ھندوؤں) کا ایک مناظرہ کرنے والا سامانہ سے خاص طور پر مناظرہ کرنے کے لیے میرے پاس آیا - اس کے ساتھ بھی میں نے یہی شرط رکھی جو اس نے قبول کر لی - چنانچہ میں نے بڑے سکون سے باتیں کرتے ھوئے باقاعدہ دلائل و براھین سے کام لیا ، جس کے سبب اسے اعتراف کرتے ھی بنی ؛ کہنے لگا ''جو کچھ تو کہتا ھے وہ بجا طور پر دلیل و حجت کے ساتھ ھے لیکن جس چیز میں کہ میں دیکھتا ھوں ، اگر وہ ٹھیک بیٹھے تو پھر میں تیری طرف متوجہ ھوں گا -''
میں اس بات پر ھکا بکا رہ گیا - ھم مسلمان تو خاص افعال و اعمال کے حامل ھیں اور یہ ٹھہرے کافر اور جب تک ایمان نہ ھو ، عمل کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا - بہر حال میں کچھ دیر یوں ھی متحیر رھا - پھر مجھے خیال آیا کہ ایک بات اس سے کہتا ھوں ، ممکن ھے وہ اس کے دل میں اتر جائے - دل اس کا ریاضت کا عادی اور صاف و پاکیزہ ھے ، شاید اسے کوئی ایسی چیز نظر آ جائے جس سے اس پر دین اسلام کی بزرگی و عظمت روشن ھو جائے - چنانچہ میں نے اسے ورد کرنے

کے لیے کچھ سکھایا ۔ دوسرے دن تڑکے ہی باہر کے دروازے پر سر گھستا رگڑتا آ پہنچا اور کہنے لگا "جو کچھ تم نے مجھے بتایا تھا وہی میں نے پڑھا اور اسی طریق پر دل لگایا ؛ کیا دیکھتا ہوں کہ میں ایک چھپر میں جو نہایت ہی تنگ و تاریک اور وحشت آور ہے ، پڑا ہوں اور ہاتھ پاؤں ہلانے سے عاجز ہوں ۔ میرے ارد گرد بے شمار سانپ ، بچھو ، چھپکلیاں اور کنکھجورے ہیں ۔ پھر میں نے ایک وسیع مقام دیکھا جو بڑا پاکیزہ ، ستھرا اور روشن تھا ۔ اس میں ہر قسم کی بیش بہا دریاں بچھی تھیں ۔ اس مقام پر میں نے تمھیں بیٹھے ہوئے پایا ۔ تمھاری بزرگی و عزت اور اس مقام کی پاکیزگی و عمدگی کی کوئی انتہا ہی نہ تھی ۔ میں نے تمھیں اس حال میں دیکھ کر تم سے کہا کہ مجھے اس تنگ جگہ سے نکال کر اپنے پاس لے جاؤ ۔ تم نے کہا ، اس چھپر کو توڑ ڈال اور میرے پاس آجا ۔"

اس پر میں نے اس ہندو سے کہا کہ "اب تمھارا کیا خیال ہے؟ مسلمان ہوجاؤ اور میری پیروی کرو ۔" کہنے لگا "میں سامانہ واپس جا رہا ہوں ، وہاں میری نو بیاہتا بیوی ہے ، اسے ساتھ لے کر آؤں گا ۔" میں نے اس سے کہا کہ "تم اسی بہانے پیچھا چھڑا رہے ہو اور ہرگز ایمان نہیں لاؤ گے ۔" اور واقعی وہ ایسا گیا کہ پھر واپس نہ آیا ۔

پھر خواجہ بندہ نواز نے فرمایا کہ "قدیم زمانے میں ان لوگوں میں بیاہ شادی کی رسم نہ تھی ؛ جب لڑکی جوان ہو جاتی تو وہ اپنی خواہش پوری کرنے کے لیےجہاں جی چاہتا چلی جاتی ۔ پانچ برہمن دیو، (۱) خجشتل ، (۲) نکل ، (۳) بیہون ، (۴) ارجون اور (۵) سہدیو، یا (۱) جودھشتر، (۲) نکل، (۳) بھیم، (۴) ارجن، (۵) سہدیو اور پنتھلی و شیو راج ، جو ان کے مذہب کی جڑ ہیں ، ایک باپ سے نہ تھے ، اور ان میں سے کسی کے بھی باپ کا پتا نہ تھا کہ کون اور کہاں ہے ۔ ان کی ماں کا نام کونتا تھا ۔ جب اس نے چھٹے بیٹے کو جنم دیا تو اس خیال سے کہ کہیں دوسرے بیٹوں کے سامنے ، جنھیں یہ خیال ہوگا کہ ہماری ماں

ابھی تک اس کام سے باز نہیں آ رہی ، شرمندگی نہ اٹھانا پڑے ، اس بچے کو جس کا نام اس نے کرن رکھا تھا ، کپڑے میں لپیٹ کر دریا میں پھینک آئی ۔ پانی اسے بہا کر کنارے پر واقع ایک شاہی محل کے قریب لے گیا ۔ وہاں کے بادشاہ کی جو اچانک اس پر نظر پڑی تو اس نے حیران ہو کر اس گٹھڑی کے متعلق استفسار کیا ؛ غلام اس بہتی ہوئی گٹھڑی کو فوراً پکڑ لائے ؛ بادشاہ نے اسے کھول کر جو دیکھا تو ایک بچہ نظر آیا ۔ بادشاہ نے اس بچے کو اپنے پاس رکھ لیا اور شہزادوں کی طرح اس کی پرورش کی ۔ بڑا ہو کر وہ بہت طاقتور اور کڑیل جوان نکلا ، یہاں تک کہ کوئی بھی اسے زیر نہ کر سکتا تھا ۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ ''اس طاقت و توانائی کے ساتھ تو اس بادشاہ کے نطفے سے نہیں ہوسکتا ، اور جس قوت و طاقت کا تو مالک ہے وہ اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ تو اس بادشاہ کی اولاد سے نہیں ہے ۔'' ـــــ اس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ وہ پتھر کا ٹکڑا دو انگلیوں کے درمیان پکڑتا اور پانی سے بھرے ہوئے تانبے کے گھڑے پر مار کر اسے چکنا چور کر دیتا ـــــ لوگوں کے کہنے پر اس نے ہر کسی سے اپنے ماں باپ کے بارے میں دریافت کیا ۔ اسے بتایا گیا کہ وہ کونتا کے پیٹ سے ہے اور فلاں فلاں اس کے بھائی ہیں ۔ یہ سن کر وہ ان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور آخر اس شہر میں جا پہنچا جہاں اُس کے بھائی رہتے تھے ۔ یہاں سب سے پہلے وہ مہریتی نام کے ایک چھوٹے سے بت خانے میں داخل ہوا ، اور تاریکی میں چھپ کر بیٹھ رہا تاکہ جو کوئی بھی آئے اس سے ان لوگوں کے بارے میں دریافت کرے ۔ اتفاق سے اس کی ماں کونتا ہی پوجا کرنے وہاں چلی آئی ؛ اس نے بڑھ کر اُس کے تہ بند پر ہاتھ ڈالا جیسے اسے کھولنا چاہتا ہو ۔ کونتا اپنا دامن چھڑا کر جلدی سے باہر نکل آئی اور بیھون سے اس امر کی شکایت کی ۔ بیھون نے آ کر اس سے اپنی ماں کے تہ بند کا مطالبہ کیا ۔ کرن نے اب کے پھر تہ بند پر ہاتھ ڈالا ؛ جس پر بیھون اس سے اُلجھ پڑا ؛ اس نے اُسے زمین پر دے پٹخا ۔ بیھون کہنے لگا ''تو نے مجھے بے خبری میں آ لیا اور زمین پر پٹخ دیا ہے ؛ اگر اب تو مجھے زمین پر گرا دے تو تجھے مرد جانوں ۔'' چنانچہ

دونوں پھر ایک دوسرے سے الجھ پڑے - اس مرتبہ بیھون نے اسے نیچے گرا لیا ، اور گراتے ہی اس کے سینے پر کٹارے سے وار کر دیا ؛ وہ چیخ اٹھا اور کہنے لگا ''تو نے اچھا نہ کیا - خیر ! میرے بھائی بھی اسی جگہ رہتے ہیں ، جب انھیں اس کا پتا چلے گا تو وہ تجھے زندہ نہ چھوڑیں گے -'' بیھون نے پوچھا ''تیرے بھائی کون ہیں ؟'' اس نے ان کے نام بتا دیے - جس پر بیھون جلدی سے ماں کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا ''سچ سچ بتاؤ ہم پانچ بھائیوں کے علاوہ تم نے کسی اور بیٹے کو بھی جنم دیا ہے ؟'' جس کے جواب میں اس کی ماں کے منہ سے بہ‌صد مشکل 'ہاں' نکلی - بیھون بولا ''ایسی بلا کو تم نے جنم دیا ؟'' پھر اُن لوگوں نے اُس کا سر گردن سے جوڑنے کی کوشش کی کہ شاید وہ بچ جائے لیکن وہ جہنم رسید ہو کے رہا ـــ یہ بلا ان لوگوں میں بہت بڑا گناہ سمجھی جاتی ہے - اسے وہ کوھیج کے نام سے پکارتے ہیں - جس کے ہاں یہ (کرن[1]) جنم لیتا ہے ، اُس کے پاس نہیں بیٹھتا اور نہ کسی محفل ہی میں جاتا ہے - ہاں اس صورت میں یہ بات[2] ممکن ہے کہ بارہ روز تک صبح و شام بارش ہوتی رہے اور وہ[3] اس میں برہنہ کھڑا ہو کر مینہ کا پانی پیے، یا پھر بارہ برس تک سفر میں رہے ـــ اب ان بھائیوں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ ''اب کیا کریں ؟'' وہ بولی کہ ''اگر بارش والا سلسلہ اختیار کرو گے تو مرجاؤ گے ، بہتر یہی ہے کہ سفر اختیار کرو -'' چنانچہ پانچوں بھائی سفر پر نکل کھڑے ہوئے - گھومتے پھرتے اور مختلف ملکوں کی خاک چھانتے وہ ایک شہر میں پہنچے - اس شہر کے بادشاہ پرکھت نے ایک مہمان خانہ بنا رکھا تھا جس میں لوہے کی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اور اس پر لوہے کا تیر کمان رکھا ہوا تھا - پھر ایک گٹھلی بالوں کے ساتھ باندھ کر اوپر لٹکا رکھی تھی - جب ارجن اس مہمان خانے میں داخل ہوا اور اس نے یہ سب کچھ دیکھا تو کہنے لگا ''یہ سب کچھ مجھ ایسوں کے لیے کیا گیا ہے -'' وہ سیدھا بیٹھ گیا، کمان کو ہاتھ میں تھاما ، چلہ چڑھایا اور تڑ سے گٹھلی پر نشانہ جما دیا - جب اس واقعے کی اطلاع بادشاہ کو پہنچی تو اُس نے اپنی لڑکی

ارجن سے بیاہ دی - بیہوں نے ماں کے پاس پہنچ کر سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ ''ارجن کی شادی بڑے ٹھاٹھ سے ہوئی ہے''- ماں نے حکم دیا کہ ارجن سے کہو کہ ''پانچوں بھائی اس عورت کو باری باری اپنے پاس رکھیں -'' چنانچہ وہ شہزادی ان پانچوں بھائیوں کی بیوی بنی رہی اور یہ سب اپنی اپنی باری پر اس کے پاس جاتے رہے -''

ایک مرتبہ عشا کی نماز کے بعد اس کم ترین خادم[۴] نے آپ (خواجہ بندہ نواز) سے کہا کہ ''صحابہ میں سے کسی ایک کو بزدلی سے منسوب نہیں کیا گیا -'' آپ فرمانے لگے ''تاریخ میں ہے کہ جب احزاب نے مدینے کا محاصرہ کیا تو اُن میں سے ایک گھوڑ سوار مدینے کے اندر داخل ہوا ؛ اس وقت آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی صفیہ وہاں موجود تھیں ، انھوں نے حسان[۵] سے کہا کہ اس شخص کو مار ڈالو - حسان نے بزدلی کا مظاہرہ کیا اور آپ قتل نہ کر سکے- صفیہ رض نے چھت پر سے نیزہ پھینک کر اس شخص کو مار ڈالا ـــــ ایک طرف تو رسول اللہ صلعم جنگ احد میں سعد وقاص سے فرماتے ہیں ''اے سعد وقاص تیر چلا ، تجھ پر میرے ماں باپ فدا ہوں!'' اور دوسری جانب آپ حسان سے فرماتے ہیں ''قریش کی ہجو کہو، جبرائیل تمھارے ساتھ ہیں -'' تو گویا جو شخص جس کام کا اہل تھا حضور صلعم نے وہی کام اس کے سپرد کیا ــــ بھلا شاعر بے چارہ اس سے زیادہ اور کر بھی کیا سکتا ہے -''

ایک موقع پر جناب خواجہ نے حدیث ''کل مسکر حرام[۶]'' کے بیان میں فرمایا ''شراب کی حرمت کی وجہ سوائے ضبط و ہوش کے جانے اور عقل کے معدوم ہو جانے کے اور کوئی نہیں ہے - پس ایک صفت کے بغیر دوسری صفت کی پیروی کرنے کے کیا معنی - (یعنی بے ضابطگی کو پکڑنا اور انعدام عقل کو نہ پکڑنا کہاں درست ہے -) جو چیز عقل کو معدوم کرنے والی ہوگی ، وہ بھی حرام ہو گی'' ــــ اس کم ترین نے شراب حرام ہونے کے سبب اور واقعے کے متعلق پوچھا تو آپ نے فرمایا ''ایک روز حمزہ[۷] نے شراب کے نشے میں حضرت فاطمہ رض[۸] کی اونٹنی کا ایک پاؤں کاٹ دیا ؛ حضرت علی رض نے حضور اکرم صلعم کے

پاس اس امر کی شکایت کی ۔ حضور صلعم اٹھ کر حمزہؓ کی طرف گئے
تو انہیں فضول اور آلٹی سیدھی باتیں کرتے پایا ۔ ایسی حالت میں
حضور صلعم نے ان کے سامنے جانا مناسب نہ سمجھا اور حضرت علیؓ
سے فرمانے لگے ”علی ! تم دیکھو گے کہ فاطمہؓ کی اونٹنی کا زخم
کسی دن حمزہؓ کو لے ڈوبے گا ۔“ چنانچہ جب جنگ احد میں حمزہؓ
کو مذکورہ واقعہ پیش آیا تو حضور نے فرمایا ”علی! دیکھا تو نے!!
فاطمہ کی اونٹنی کے زخم نے حمزہ کے ساتھ کیا کیا؟“ اس کے علاوہ ایک
موقع پر کچھ مہاجر اور انصار باہم شراب نوشی کر رہے تھے، جب
ان پر نشہ طاری ہوگیا تو انہوں نے ایک دوسرے پر تلواریں سونت
لیں ، جس کے سبب ایک بہت بڑی لڑائی کے چھڑ جانے کا امکان تھا ۔
بہرحال جب یہ دو حادثے رونما ہوئے تو پھر مستی کی حالت میں نماز کے
قریب جانے کی ممانعت پر آیت نازل ہوئی کہ ”نشے کی حالت میں نماز
کے قریب مت جاؤ ۔“ صاحبان عقل و خرد اور صحابۂ کرام غور کرنے
کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ جو حکم آیا ہے تو یہ محض شراب
کو پورے طور پر حرام قرار دیے جانے کی طرف اشارہ ہے ، اس لیے کہ
نماز دن میں پانچ مرتبہ پڑھی جاتی ہے اور شراب کا اثر بڑی دیر تک
رہتا ہے ۔ مثلاً جب نماز ظہر کے بعد شراب پی جائے تو ظاہر ہے عصر کی
نماز نہ پڑھی جا سکے گی ۔ اور جب پہر دن چڑھے کوئی شراب پیے گا
تو اس کی نماز ظہر کیوں کر ہو سکے گی ۔ لہذا اسی بنا پر بعض
نے شراب نوشی یکسر ترک کر دی ۔ اس کے بعد وہ آیت نازل ہوئی
جس میں شراب کو مطلقاً حرام اور نجس قرار دیا گیا ہے ۔“

(جوامع الکلم (ملفوظات خواجہ گیسو دراز) صفحہ ۱۱۸ تا ۱۲۱)

سید اشرف جہانگیری

[اشرف جہانگیری سمنانی (متوفی ۱۴۳۶ع) بنگال میں علاء الحق لاہوری کے مرید ہوئے۔ بہ قول ریو ان کے کل ۷۵ مکتوب تھے۔ ان میں سے ۱۲ موجود ہیں۔]

چھیالیسواں مکتوب (سلطان ابراہیم[1] شرقی کے نام)

اس واجب الاحکام، بادشاہوں کے بادشاہ سلطان ابراہیم (خدا اس کے ملک و سلطنت کو تا ابد قائم رکھے!) کا فرمان بہترین اوقات میں صادر اور نہایت ہی عمدہ و اقبال مند لمحات میں وصول ہوا۔ وہ التفات و توجۂ خاص جو حضور نے زاویۂ گم نامی کے گوشہ نشینوں اور خلوت گزینوں کی طرف فرمائی، آمید ہے اس توجہ و التفات کا بدلہ اور اجر اس 'سخاوت و احسان' اور 'وجود و نقصان' کے خزانے (یعنی سلطان) کو اللہ جل جلالہ کی جانب سے بے شمار فتوحات اور نت نئی نصرتوں کی شکل میں ملے گا۔ حضور کا وہ مکتوب ملا جس میں تحریر تھا کہ حضرت قطب عالم[2] مد ظلہ کی طرف سے مکتوب ارادت موصول ہوا ــ جس میں گنیش[3] رائے کے غلبے کے خلاف دادخواہی اور اس زیاں کار کے تعصب کی شکایت مندرج تھی، نیز یہ مرقوم تھا کہ دیار اسلام، بنگالہ اور ہفت اقلیم کی 'قربت الٰہی کا اثر رکھنے والی' مخلوق کے مرکز پر تین صدیوں کے بعد کفار کی ظلمت اور 'مسلم کش' بے دینوں کے گھمنڈ کے سبب، تاریکی و سرکشی کی گھٹائیں چھا گئی ہیں:

۱- چـراغ دیـن اسـلام و هـدایت
کـه می افـروخته هـر گوشه از نـور

-۲ نخست از باد کفر گنیش رای
....منصور

-۳ چراغ نور و شمع نور حسنی
نخست از باد تیغ و آب منظور

-۴ چراغ شمع مردم را چه گوئی
که طبع هر که بوده خورده کافور

-۵ چو دار دین اسلام این چنین شد
چرا بنشسته ای بر تخت مسرور

-۶ بیا برخیز و دین را کن جماعت
که بر تو لازم است ای شاه مقدور

-۷ چرا صاحبقران از فتوی دین
فروزد تخت دهلی میر تیمور[۳]

-۸ دو سه میری که دیده نامناسب
بهم برزد چو دهلی شهر معمور

-۹ تو خود صاحبقران صاحب هند
پسندی این جفا و جور موفور

-۱۰ که این بنگاله سوزد ز آتش کفر
تو آب تیغ داری از میان دور

-۱۱ عجب دارم ز دین آن موالی
که می دارند ترا زین کار مقصور

-۱۲ چو این بنگاله را فردوس گویند
ز دوزخیان شود چون دود معذور

-۱۳ خلیل آن جا ز آتش دان نترسد
تو ترسی از چنین بستان معمور

-۱۴ بنوعی می زود بر هر کسی جور
که نارد کرد شرحش خامه مذکور

۱۵- چراغ دین فرستادم کـه دی هم
بـر افـروزد ز نـور دیده مغـرور

۱۶- بآن دارای دین هـر مسلمان
کـه کـرد از چـار ارکان خانـهٔ سـور

۱۷- بـه ارکان دیـار دیـن نبـوی
کـه ارکان خانـه دارد نـور از هـور

۱۸- بنور هـر چـراغ دوازده بـرج
کـه سیّارنـد ازان انـوار معـمور

۱۹- بـه شاهـان ولایت خانـهٔ دهـر
کـه در کار وغـا هستنـد مشهـور

۲۰- بیک ساعت نشین بـر تخت شاهی
بـیـا از تیغ کـن این کـفر مقهور

ترجمہ : ۱- دین اسلام اور ھدایت کا چراغ جو ہر گوشے کو اپنے نور سے منور کرتا تھا

۲- گنیش رائے کے کفر کی ھوا سے نہ بجھا ....منصور -

۳- اس حسن کے نور کی شمع اور چراغ ، تلوار کی ھوا اور ''آب منظور'' سے نہ بجھے -

۴- لوگوں کے چراغ شمع کی کیا بات کرتے ھو کہ ہر کسی میں اس کی استعداد کے مطابق کانور پڑا -

۵- جب دین اسلام کے مرکز کی حالت ایسی ھوگئی ھے تو تُو تخت پر کیوں شادماں بیٹھا ھے ؟

۶- اٹھ کھڑا ھو اور دین کے شیرازے کو مجتمع کر ، اس لیے کہ تجھ ایسے صاحب قدرت بادشاہ پر یہ لازم ھے -

۷- صاحب قران امیر تیمور کس لیے دین کے فتوے سے دھلی کے تخت کو رونق بخشتا ھے ؟

۸- دو تین سرداروں نے جب نا ملائم حالات دیکھے تو انھوں نے دھلی جیسے آباد شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی -

۹- آپ خود والئی ہند اور صاحب قران ہوتے ہوئے یہ سب جور و ستم پسند کر رہے ہیں ؟

۱۰- بنگالہ کفر کی آگ سے جل رہا ہے اور آپ اپنی تلوار کے پانی کو کمر سے دور رکھ رہے ہیں -

(یعنی آپ اس کفر کا خاتمہ کرنے کے لیے اپنی تلوار کو استعمال میں نہیں لا رہے -)

۱۱- مجھے تو آپ کے ان غلاموں کے دین پر تعجب ہوتا ہے جو آپ کو اس کام سے روک رہے ہیں -

۱۲- جب اس بنگالہ کو فردوس کہتے ہیں تو پھر یہ دوزخیوں سے پاک رہنا چاہیے -

۱۳- حضرت ابراہیم خلیل‌اللہ تو آتش نمرود سے نہیں ڈرے تھے مگر آپ (یعنی سلطان ابراہیم) اس بھرے چمن سے ہراساں ہیں -

۱۴- ہر کسی پر اس قدر ظلم ہو رہا ہے کہ قلم کو اس کے بیان کرنے کا یارا نہیں ہے -

۱۵- میں نے دین کا چراغ بھیجا تاکہ وہ بھی آنکھوں کے نور سے اسے روشن کرے -

۱۶- قسم ہے آپ کو مسلمانوں کے دین کے اس بادشاہ کی کہ جس نے چار ارکان[۵] سے شہر مذہب کی فصیل بنائی -

۱۷- قسم ہے آپ کو دین نبوی صلعم کے دیار کے ستونوں کی کہ ارکانِ خانہ سورج کی روشنی رکھتے ہیں -

۱۸- قسم ہے آپ کو بارہ برجوں[۶] کے چراغوں کے نور کی کہ جن کے نور سے سیارے معمور ہیں -

۱۹- قسم ہے آپ کو زمانے کی ولایت کے سلطانوں[7] کی کہ جو جنگ[8] کرنے میں مشہور ہیں -

۲۰- کہ ایک ساعت کے لیے آپ تخت پر بیٹھ جائیں اور اپنی تلوار سے اس کفر کا قلع قمع کریں -)

اس قسم کے مضمون پر مشتمل اور تاریکیوں کو مٹا دینے والے نور سے پُر نامۂ ولایت فرما پہنچا جو اس دربار عالی میں بھجوا دیا گیا - یہ حضور نے کیا تحریر فرمایا ہے کہ ''فاتح لشکر اور کثیر افواج سے ہم نے بنگالہ پر چڑھائی کی ہے ، اگر آپ (سید اشرف) فتح و نصرت اور کام یابی و کامرانی کے لیے فاتحہ و درود پڑھیں اور دعا کریں تو نہایت مہربانی ہوگی -'' اس میں بھلا مہربانی کی کون سی بات ہے ، اس لیے کہ حضور کو معلوم ہونا چاہیے کہ دبن دار بادشاہوں ، (کہ جن کی شان میں آیت 'نصر من اللہ و فتح قریب[9]' اتری -) اور سلاطین ہدایت و ارشاد کے لیے (کہ جن کے بارے میں 'انا فتحنالک فتحاً مبیناً[10]' کی آیت نازل ہوئی) اس سے بڑھ کر اور کوئی عمدہ و بہتر شغل نہیں ہے کہ وہ امور اسلامی کی وسعت و سربلندی کے لیے لشکر کشی کریں - اور اس سے بری کوئی بات نہیں ہے کہ وہ اس سلسلے میں لشکر کی مدد و استعانت میں کسی قسم کی کاہلی یا سستی برتیں :

زهی شاهان اقلیم حمایت   که لشکر می‌کشند از بهر امداد

دیار مومنان از دست کافر   کشیده می دهند بر مومن از داد

(آفرین ہے سلطنت کے بادشاہوں کی حمایت پر کہ جو امداد کے لیے لشکر کشی کرتے ہیں اور از روے انصاف مسلمانوں کو ان کا ملک کافروں سے چھڑا کر واپس دلاتے ہیں -)

سبحان اللہ ! بنگالہ ملک بھی کیسا ملک ہے کہ گرد و نواح کے اکثر اولیا یہاں آ کر آباد ہو گئے ہیں - زہے ''دیار ہفت کالہ'' کہ جہاں بہت سی برگزیدہ ہستیاں اطراف سے آ کر بس گئی ہیں - چنانچہ صرف دیو گاؤں میں شیخ اعظم حضرت شہاب الدین سہروردی[11] کے

اسی (۸۰) معتبر خلفا مدفون ہیں اور اکثر خلفاے سہروردیہ مہسون میں ، جلالیہ۱۲ فرقے کے بہت سے اصحاب دیوتلہ میں ، صاحب رسوخ شیخ احمد دمشقی اور حضرت شیخ شرف الدین تواماں کے کئی ایک بہترین برگزیدہ یار احباب نارکرنی میں اور ازلی اثنا عشری قدرخانیے سونارگاؤں میں آسودۂ خاک ہیں ۔ حضرت شرف الدین یحییٰ منیری اور خاص طور پر ان کے شاگرد یہیں ہوئے ۔ ان کے علاوہ حضرت بدر عالم اور راے بدر عالم زاھدی کے نام بھی قابل ذکر ہیں ۔ مختصر یہ کہ بنگالہ میں ، کسی ملک یا شہر کا تو ذکر ہی کیا ، کوئی قصبہ اور گاؤں ایسا نہیں کہ جس میں کوئی نہ کوئی منتخب روزگار مدفون نہ ہو ۔ اکثر مشہور خاندانوں کے مشائخ اسی جگہ موجود ہیں جو آسودۂ خاک ہیں ، ان کی تعداد بھی کافی ہے ، اور جو ھنوز زندہ ہیں وہ بھی ان گنت ہیں ۔ اگر . . . . تو ان تمام بزرگوں اور برگزیدہ لوگوں کی اولاد ، خصوصاً سجادہ نشین مخدوم زادے اور ان کے سلسلے کے پیروکار قبیلے آپ کے جری لشکر اور عظیم فوج کی مدد سے اور کافروں کو مٹا دینے اور زیاں کاروں کو تباہ کرنے والے دلیروں کی ھمت سے ان کفار سے خلاصی پالیں :

زہی دولت شہی زنہار زنہار   سمن در راہ قدم از کہ گویند (؟
و بردارند اگر از دست شاہان   برآید کاری از فیروزی و رای
زہی دولت کہ برزین برنشستند   نہد بر راہ دشمن سا ے خود پای

وہ عزت و وقعت جو آپ کے ظفر آثار اور نصرت مآب دل میں جاگزیں ہے ، باعث برکت و مبارک ہے ۔ علائی۱۳ سلسلے کے درویشوں اور بلند مرتبہ گروہ کے دل ریشوں (زخمی دل) نے کفار کے پنجے سے بنگالہ کی آزادی اور رہائی کے لیے فاتحہ و دعا بڑے خلوص سے پڑھی اور دم درود کیا ہے ۔ چوں کہ حضور کے ارکانِ دولت پناھی کا مقصد ملک کو کافروں کے پنجے سے چھڑانا اور ظفر آثار بشارت دینے والوں کی غایت اسلام کی حمایت خاص ہے ، اس لیے اس کا اثر ان شاء اللہ العزیز بڑی اچھی صورت میں ظاہر ہوگا :

به تقدیر دارای نصرت فروز | بر آید مراد ولایت کشای
چو مقصود تخلیص اندو ستانست | بر آید بزودی ز لطف خدای

(فتح و نصرت رکھنے والے بخت سے فاتح ولایت کی مراد پوری ہوگی۔ چوں کہ اس کا مقصد اپنے دوستوں کو رہائی دلانا ہے، اس لیے خدا کی مہربانی سے یہ مقصد جلد پورا ہوگا۔)

چوں کہ حضور سلطان کا عزم و ارادہ حضرت مخدوم زادہ کے معطر ضمیر کی میانہ روی اور ان کے دل کی کمک کی بنا پر ہے، اس لیے فتح مندی کے آثار رکھنے والی افواج کے پہنچنے پر اس باعث عزت و احترام ہستی کے پاسِ خاطر کا دھیان رکھیں۔ گرد و نواح کے مقدم اور حکام ان عزیزوں کے مقابل اور ان صاحب اثر بزرگوں کے سامنے آنے سے بالکل احتراز کریں:

بہم در اکابر چو خورشید ماہ | ز بیش و کمی نور از ماے(؟)
بنا بر بہم بر درخشندگی | سخن کرد تا در نیفتد ز پاے

(مکتوبات حضرت سید اشرف جہانگیری)

محمود گاوان

[محمود گاوان (۱۴۱۰ - ۱۴۸۱ع) بهمنی فرماں روا فیروز کا وزیر تھا ۔ ادبا کا قدردان تھا اور انہیں مختلف ممالک سے بلاتا رھتا تھا ۔ چناں چہ ابوبکر تہرانی کے نام خط سے معلوم ہوتا ھے کہ ایرانی ادبا بڑی کثرت سے دکن میں آتے رھے ۔ ریاض الانشا (مکتوبات) اور مناظر الانشا (فن انشا) اس کی تخلیقات ھیں ۔ ریاض الانشا تاریخی اعتبار سے بہت اہم ھے]

(۱)

مکتوب بنام جناب گرامی مولانا عبدالرحمان جامی[۱] (اللہ تعالیٰ ان کے رشد و ھدایت کے سایوں کو تا ابد قائم رکھے!)

''لوگوں نے بھی اپنے حسب خواھش تمنا کی لیکن میری تمنا یہی تھی کہ میں تیرے وصال سے شاد کام ھوں ۔ اگرچہ میری اور تیری ملاقات کے درمیان صرف ایک دن حائل ھے ، لیکن یہ بھی بہت دور نظر آ رھا ھے ۔''

نظم

گوئی کہ بازدہ خبر از سرگذشت خویش
اینک عیان ببین کہ عیان از خبر گذشت

از دست ھجر یار بجانم رسید کار
سر جملۂ حدیث ھمین است و سرگذشت

(تم کہتے ھو کہ اپنی سرگزشت بیان کرو ؛ تو لو ، تم اپنی آنکھوں سے ھماری حالت دیکھ لو کہ بیان کرنے سے 'عیاں' زیادہ بہتر

ہے ۔ دوست کے فراق میں جان لبوں تک آ گئی ہے۔بس یہی ہمارے بیان کا عنوان اور یہی ہماری سرگزشت ہے ۔)

محبت و اخلاص کی عمارتوں کے صحن کو حسن عبارت کے نقش و نگار سے سجانا ، دلی محبت کے آسمانی طبقوں والے چھجے کے شامیانے کو استعاروں کنایوں کے اسالیب کی فریب کاریوں سے آراستہ کرنا ، خیال کی مشاطہ کے ہاتھوں رشک آفتاب اور آتشیں چہرے کو سیاھی کے وسمے ، تل ، نقطوں اور سطروں سے سنوارنا ، الفت و یگانگت کے مصر کے یوسف کے چہرے کو قسم قسم کے الفاظ کے ابٹنے سے مزین و مزیب کرنا اور دل تاریک کے زیرے اور کھجور کو الفاظ اور حروف کے رنگا رنگ برتنوں میں رکھنا ، اور انہیں تکلف کے منقش ڈھکنے سے ڈھک کر عقل و دانش کے کرمان[۲] کے سخیوں اور دانائی و بصیرت کے بصرے[۳] کے باسیوں کے پاس لے جانا عین کم ظرفی اور فراست و کیاست کی راھوں سے بعید ہے : شعر

”زیور کیا ھیں ؟ فقط زینت مستعار ھیں ، جو حسن کی تکمیل کرتے ھیں ، جب اس میں کوئی کمی ہوتی ہے ۔لیکن جب حسن کمال پر ہوتا ہے تو اسے سورج کی مانند زیور کی حاجت نہیں ھوتی ۔“

مصرع :

بخال و خط و رنگ و بو چه حاجت روی زیبا را ؟

(نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی)

اسی بنا پر ارادے کے گھوڑے کی لگام کو اس طرف سے ہٹا کر بڑے مقاصد کے حصول کی جانب موڑ دیا ہے اور تکلف و تصنع کے راستوں اور وصف و ثنا میں محویت کے طریقوں سے ہٹ کر نیازمندی اور دعا کے کوچے میں ، کہ بھید کے خزانوں کے طالبوں کی اقامت گاہ ہے ، مقیم ہوگیا ہوں ۔ خدائے مطلق اور 'اذا اراد شیئاً ان یقول له کن فیکون[۴]' کا حکم نافذ کرنے والا سلطان ، جو عروس عالم کی شکل بنانے اور سجانے والا ، اور آسمان کی سات منزلوں والی عمارت کا بانی ہے ، ہمیں اس[۵] مشتری صفت عالی شان ولی۔ شہود و ایقان کے چمن کی خوش الحان

بلبل ، جہان فانی کے زرافشاں آفتاب اور موتی بکھیرنے والے دریا ، سلوک و معرفت کے مرتبوں کے بند دروازوں کی چابی ، اوہام و شکوک کے شیطانی وسوسوں کی تاریکیوں کے چراغ ، جو مصحف وجود کے لیے سجدے کی آیت ہے ، اور جس نے کہ اپنی انگلیوں کے درخت کی ٹہنیوں سے عالم شہود کی آگ روشن کی ، اس کے دیدار سے مشرف کرے! اے خدا ! جس طرح تو نے اس کی انگلیوں سے زندگی کا فرات جاری کیا ، اور اس کے قلم کو دوات کی ظلمات میں ذوالقرنین بنایا ہے ، ہمارے اشتیاق کی گردنوں کو بھی اس کی ملاقات کے ہاروں سے زینت بخش ، اور اس کے رخسار کے وصال کے آب شیرین و مصفا سے لوگوں کی تشنگی مٹا! خدائے تعالیٰ بہ طریق احسن اور عذروں کے زنگ سے پاک آئینۂ وجود میں اس کا دیدار میسر کرے[6] ! اور چشم باطن ، کہ حصول دین کی راہ میں مجھ سے دو چار ہوئی ہے ، فیض نچھاور کرنے والے قدوم میمنت لزوم کی خوش خبری کے سرمے سے روشن و بینا رہے ! : رباعی

مرا ز ہر دو جہان حضرتِ تو مقصود است
کہ حضرتت بحقیقت مقامِ محمود است

دریچۂ نظر و رہ گزار خاطر من
بجز خیال تو بر ہرچہ ہست مسدود است

(دونوں جہانوں میں مجھے صرف تیرا قرب درکار ہے ، کیوں کہ تیرا قرب ہی حقیقت میں مقام محمود ہے ۔ میری نظر کے دریچے اور میرے دل کی راہ گزر میں سوائے تیرے خیال کے اور کسی چیز کا گزر نہیں ہے ۔)

یہ نا چیز صبح کے زرین بیضہ والے پرندے (سورج) کے بازوؤں اور شام کے سیاہ کوے کے پروں کے ذریعے ہزاروں ہزار دعائیں بھیجتا ہے کہ جن کے خلوص و پاکیزگی کی خوش بو دار نسیم سے جسموں کے گلستانوں میں روحوں کے پھول کھلتے ہیں ، اور جن کی ثنا کے رنگ و بو سے بیان کے چمنستان میں زبان کی بلبل کے دل کو

شگفتگی و کشادگی حاصل ہوتی ہے ؛ عشق و شیفتگی کی تعریف اور دل سرگشتہ کے خرام کی دلیل و تعلیل نہ تو قیاسات کی تہیلی اور رسوم کے احاطے اور مواد میں سما سکتی ہے اور نہ ناقص و تمام کی حدود ہی میں کھپ سکتی ہے ۔ اس لیے کہ عقلی دلالت کے ضابطوں اور وضع بیان سے اس کی انفرادی اور اجتماعی صورت کی حقیقت جاننا کار دشوار ہے ۔ اور گویائی کا شاہین اپنے سچے افکار کے بازوؤں اور تیز آڑنے والے شہ پروں کے ساتھ بھی اس کی گفتار کی فضا میں اڑنے سے قاصر ہے ، تو پھر بھلا خود انسانی فکر و نظر کی جرأت و دلیری کا کیا مقام ، بلکہ یہاں تو گردش کرنے والے ستارے ، کہ گھومنے والے آسمان کے میدان کے گھوڑے ہیں روشنیوں کی سنانوں ، نظروں کی کمندوں ، ٹوٹنے والے تاروں کے تیروں ، افلاک کے گھوڑوں اور قطب کی رکاب کے ہوتے ہوئے بھی ، ہجر و فراق کے الم کے بیان کے میدان میں دلی آہوں کے ہجوم کے ہیجان کے سبب ، بپھرے ہوئے شیر کی مانند ، راکھ کر دینے والی آگ سے لرزاں و گریزاں ہیں :

"حد سے بڑھنے والا ثناخوان بھی اس کی خوبیوں کو نہیں پاسکتا ، اگرچہ وہ وصف یا مدح بیان کرنے میں مبالغے سے کام لیتا ہے ۔"

بیت

آنی کہ دارد آن مہ و این غم کزو مراست
آن غایتی ندارد و این ہم نہایتی

اس فرشتہ خصلت کی ملاقات کی دعا کی کشتی کو رقت دل کے بادبان اور آہ سحر گاہی کی ہواؤں کے ساتھ اس ایزد متعال کے کرم کے بے کراں سمندر میں چھوڑ کر آیے واثق امید کے مال و اسباب سے لاد دیا ہے ، کہ شاید ملاقات کا حیات بخش آفتاب جلد ہی آفق حسی سے طلوع اور 'سعادت آثار' دیدار کی توفیق کا ستارہ عمر جاوید کی جاے طلوع سے روشن ہو ۔ **بیت**

غالباً خواہد کشود از دولتم کاری کہ دوش
من ہمین کردم دعا و صبح صادق می دمید

محبت کی سطروں اور خلوص کے الفاظ سے بھرا ہوا یہ خط کفرستان سنگیسر سے لکھا گیا ۔ آں جناب اپنی 'تقدیر کا اثر رکھنے والی خورشید نظر' دعا کو اس سفر کا رفیق بنائیں تا کہ یہ سرزمین جو زمانۂ ماضی سے لے کر اب تک اہل اسلام کے ہدایت کے اوصاف حمیدہ رکھنے والے ستاروں سے روشن نہیں ہوئی ، اور جس کے 'فلک شکوہ' قلعوں کی بلندی اور جنگلوں اور پہاڑوں کی زمینیں بڑے بڑے سلاطین کی ہمتوں کے قدموں کی سیرگاہ اور دین کے بادشاہوں کے ستاروں ایسے لشکروں کی گزرگاہ نہیں بنیں ، بڑے بڑے مردان حر کی ہمت و شجاعت سے مسخر ہوجائے ، اور بر و بحر کے مسافر نابکار کفار کے خوف و خطر اور ان کے ہرقسم کے شر و فساد سے نجات پائیں اور آں (مسافر) کے مقصود کا چہرہ ملعونوں کی ہیبت کے کانٹے کی خراش سے محفوظ رہے اور فائدے کے دسترخوان سے ان کی جان کا مذاق[۷] لذت اندوز ہو ۔ اے خدا! جس طرح تو نے میری بصیرت کی آنکھ میں اہتمام کا سرمہ ڈالا ہے ، اسی طرح اسے مقصد کے حصول کے اتمام اور شعار اسلام کے اظہار سے منور کر!

اما بعد ! آں جناب کی خاطر عاطر سے ، کہ جس کے آفتاب صفت درخشاں آئینے میں اس دل مشتاق کی آتش درونی آپ کے اپنے چہرے میں نور کی مانند روشن ہے ، اور جس کی عظمت والی نظر میں فراق زدہ جان کے اندیشے کی صفائی و پاکیزگی ان سطور کی سیاہی سے (تاریک رات میں ماہتاب کی روشنی کی مانند) زیادہ منور ہے ، یہ مخفی نہیں ہے کہ صورت و مادہ سے مجرد عالموں کی سیر کا فائدہ جمال وحدت کا مشاہدہ ہے ، اس طرح کہ کثرت کے پردے دیدۂ بصیرت کے لیے یوں پردہ نہ بن جائیں اور کمال ایقان کے دامنوں کے گرد وہم و گمان کی گرہ نہ پڑ جائے ۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ راہ ہدایت کا چراغ 'ولایت' کے علم برداروں کے سینے کے شیشے میں رکھا گیا اور 'عن' کے ذریعے روایت کی جانے والی حدیث ''من تقرب الیّ ذراعاً تقربت الیه باعاً[۸]'' کا اثر اس قربت خداوندی کے حامل گروہ کی بشارت رساں[۹] زبان سے سنا گیا ہے ۔

بیت

از در اهل صفا روی مگردان ای دل
هر که دور است ازین در بخدا نزدیک است

اور اس دور میں اس نار کا علم اور ان آثار کا منظر صرف آن جناب ہی کی 'آفتاب صفت درخشاں' ذات گرامی ہے : بیت

چون توئی نیست در زمانۂ ما هر که گوید که هست ، گو بنما

(ہمارے زمانے میں تجھ ایسا کوئی نہیں ہے ۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ ہے ، اسے کہو کہ وہ دکھائے)

ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ آں جناب نے اپنی خاطر شریف میں زیارت حرمین شریفین ، کہ عین فرض اور ادائے قرض ہے، کا عزم بالجزم کر رکھا ہے ۔ سو اگر آں جناب اس جانب سے ہو کر بیت الحرام تشریف لے جائیں ، اور درد جگر کی آگ میں جلے اور درد دل کے مارے ہوؤں کو وصال کے آب شیرین و شفاف سے سیراب کرجائیں تو آپ ایسے صاحب کمال کے جمال میں قطعاً کوئی کمی واقع نہ ہوگی ۔

بیت

اندر شب سیاهم گم گشت راه مقصود
از گوشۂ برون آ ، ای کوکب هدایت

(سیاہ رات میں میں اپنی راہ مقصود سے بھٹک گیا ہوں ؛ اے ہدایت کے ستارے کسی گوشے سے باہر آ)

کیوں کہ یہ یقینی امر ہے کہ آفتاب و ماہتاب کے خراسان روز سے ظلمتستان ہندوستان منتقل ہونے سے ان کے دامن کمال پر ذرا سی بھی کمی کا غبار نہیں بیٹھتا ۔ تاریکیوں کی مملکت ان کے جمال کی روشن شعاعوں سے نورانی ہو جاتی ہے ۔ اور یہ تو رسم محمود اور عادت معہود ہے کہ کمال کی بزرگیوں اور شب ہائے 'حال' کی بلندیوں والے اپنی آمد کے ستاروں کے زیور سے مخلصوں کو آراستہ اور بیمار دلوں کے آئینے کو عیادت کے آلۂ صیقل سے امراض کے زنگ سے پاک کرتے ہیں ۔

بیت

بزدای زنگ حیرت از آئینۂ دلی
کز پرتو جمال تو یابد رخش جلی

نیز التفات کے ستاروں نے حیات کی طلوع ہونے والی جگہوں سے طلوع فرمایا ہے ۔ فصوص ۱۰ کی شرح کے نسخے سے ، جو آپ نے ارسال فرمایا تھا ، بے حجاب مقاصد کی مستورات بیان کے منصہ پر کچھ اس طرح ظاہر ہوئیں کہ روح کے ناطقہ نے اس کے کمال حسن سے حد درجہ متاثر ہو کر انگشت شہادت بلند کی اور کلمۂ طیبۂ توحید کا ورد شروع کر دیا : **شعر......**

''کیا خوب موتیوں جیسے الفاظ جھڑتے ہیں ۔ اگر وہ نازنینوں کے پاس ہوتے ، تو وہ بغیر زیور ہونا پسند کرتیں ۔ اور معانی کے ایسے سر چشمے ہیں کہ اگر آنکھوں کی پلکوں میں ان کا سرمہ لگایا جائے تو وہ انہیں سرمے سے بے نیاز کر دیں ۔ پرانی شراب کا ایسا سمندر ہیں کہ اگر اس کی تلچھٹ بھی زمانے کو پلا دی جائے تو وہ چیونٹی کی رفتار چلنے لگے ۔''

اور اس کے کلمات کے حروف کے میوے ، قلوب عشاق کی چشم بصیرت کی بصارت کو روشن اور دل مشتاق کے رنج و محن کے آثار کو زائل کرنے والی حسینان عالم کی کنپٹیوں اور حوران جنت کے گیسوے تابدار کی مانند ہیں ۔ **شعر......**

''الفاظ یوں ہیں جیسے ناز و ادا کرنے والی حسینہ کے آنسو او معانی یوں ہیں جیسے استدلال کرنے والے کی حجت و دلیل ۔''

بیت

ای حرفی از کتاب تو از رحمت آیتی
حق را بروزگار تو با ما عنایتی

(اے کہ تیری کتاب کا ایک ایک حرف رحمت کی نشانی ہے ۔ تیرے زمانے میں ہم پر حق کی عنایت ہے ۔)

پیش تر اس کے کہ بزرگی کو مٹا دینے والا باز کوئی دست درازی کرے ، اس جان ناتواں نے ، جو ارتحال کی حالت اور قبالۂ انتقال میں تھی ، آپ کی تحقیق کی اس خالص شراب سے ، جو آپ نے توفیق کے ھاتھوں سے وضاحت و صراحت کے جام میں حسن ترتیب سے انڈیلی تھی ، حیات بخش مشروب حاصل کیا : شعر......

''اگر وہ کسی مردے کی قبر کی گیلی مٹی اس سے کھودتے تو روح اس میں لوٹ آتی اور اس کا جسم حرکت کرنے لگ جاتا ۔''

لیکن آں جناب ایسی فرشتہ صفات ہستی ، کہ جن کا بلند مرتبہ قلب عالم صغیر کے آسمان پر آفتاب درخشاں اور جن کا بے نظیر ضمیر عالم کبیر کے صور کی جلوہ گاہ ھے اور بغیر کسی شک و شبہ کے تمام کیفیت حال آپ کی ذات والا صفات پر واضح و روشن ھے ؛ اگر از روے کرم اور بے تاخیر فضل و عنایت سے اپنے آفتاب جمال کی درخشندگی اس سرزمین پر ڈالیں اور اھل مطلب کی پریشان خاطری کو تربیت کے ھاتھوں سے مرتب و مجتمع فرمائیں تو قوی امید ھے کہ ارواح کے مسافر جو جسموں کے گھوڑوں پر سوار صبح و شام کے مرحلوں اور منزلوں میں گردش کر رھے ھیں ، موت کے ھاتھوں کے حائل ھونے سے پیش تر امید و نا امیدی کے اتار چڑھاؤ سے نجات پا کر مقاصد کے ملک میں پڑاؤ کے بازو کھولیں گے اور رضا کے چمن میں اس صفت سے موصوف ھوں گے کہ ''نہ اس میں ھمیں کوئی تکلیف پہنچتی ھے اور نہ تھکان ھی محسوس ھوتی ھے۱۱ ۔'' اے رب ! میری امید ناکام نہ کر اور مجھے میری مراد تک پہنچا ۔ بے شک تو اس پر قادر ھے ، اور اجابت دعا کر سکتا ھے :

بیت

پس از چندین شکیبائی شبی یارب توان دیدن
کہ شمع دیدہ افروزیم در محراب ابرویت

(اتنے صبر کے بعد اے خدا کیا یہ دیکھا جا سکتا ھے کہ ھم اپنی نکھوں کی شمع تیرے (معشوق) ابرو کی محراب میں جلائیں) ۔

وہ قدسی مسلکوں کا سالک اور انسانی کمال کے ملکوں کا مالک (یعنی مولانا جامی) وجود کے تخت پر بقاے دوام اور پائندگی کے تاج

سے مزین رہے اور عقل و حواس کی قید کے گرفتاروں کی التماس کی پونجی بس آنس و شفقت کے قافلے کے سالار کی نظر کیمیا اثر میں مقبول و مروج ہو!

(ریاض الانشا ، صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۷)

(۲)

فاضل اجل ابوبکر تہرانی کے خط کا جواب اور انھیں ہندوستان آنے کی دعوت

اگرچہ زبان کا کلیم ، کہ انسان کے جامع وجود کے شہر میں تخت جناں کے سریرآرا سلطان کا قاصد ہے ، اور حروف کے کفش اور قلم کے عصا سے 'حدوث و قدم' کے طور کا سالک اور وجود و عدم کے سمندروں کا پیراک ہے، لیکن اس کی ہمت کا قدم تیرے اعجاز شوق کی مقدس وادی میں 'فاخلع نعلیک۱۲' کے حکم کے پتھر سے ضائع اور لنگ ہے - اور درج و اقتباس کی ترکیبوں کا طشت اور پیالہ اور تعریف و قیاس کے اسالیب کا برتن اور طاس ، شوق و تشنگی کے طعاموں کی کثرت کے سامنے چیونٹی کی آنکھ اور بخیلوں کے حوصلے کی طرح تنگ ہے - اور چوں کہ کلک کے تیر طبیعتوں کے بازوؤں کی قوت سے سوز دل کے اوصاف کے نشانوں پر نہیں بیٹھتے ، اس لیے شہباز بلند پرواز طلب کی فضا سے بیان و وضاحت کے 'نشیب افراز' میں نہ اڑا - خدا کرے کہ آں جناب فضیلت مآب کی ـــ کہ زیرک سرشت ، فضیلتوں کی خلعت میں ملبوس، حسن خصائل کے زیور سے آراستہ، جنگ نثر و نظم کی صفیں چیرنے والے ، کمال فہم کے بھیدوں کے انوار کے مظہر ، تحصیل مطالب میں لازوال ، عالم بایقین اور انسانوں کے لباس میں شیاطین انس کے دخل سے پاک ، لعل و عسلی (ثال مثول) این اور متی (اب اور کب) سے بے داغ ہیں ـــ ملاقات مسرت آیات میسر و مہیا ہو! ہمارا سلام ، کہ جس کے مسودے کی سطور کی کثرت سے محبت و یگانگت کا نور آفتاب کے چہرے کی پاکیزگی و صفائی کی مانند فلک کی نیل گوں بیداری کے کنارے سے زیادہ واضح اور روشن ہے، قبول فرمائیں - یہ صحیفۂ صفا ، جس میں محبت و الفت کے احساسات مندرج ہیں ، سنگیسر کے

مقام سے لکھا گیا ، اور عرض پرداز ہے کہ اللہ جل شانہ کی عنایت و مہربانی سے یہ کفرستان ، جس کے اطراف و جوانب میں اسلام کے آغاز سے لے کر اس عہد تک ہدایت ایمان کی روشنیاں نہیں پڑی تھیں اور جس کا حاکم اپنی سنانوں کی کثرت ، قلعوں کی مضبوطی و استحکام کہ جن کی بلندی و کشادگی انسانی قیاس سے باہر ہے، مال و دولت کی زیادتی اور جنگجو دلیروں کی بہتات کے باعث حشمت و بزرگی میں چرخ گردوں کی عظمت کی برابری کرتا تھا، اس وقت ہمارے زیر فرمان ہے ۔ اور اس کی سرزمین ، اس کے قلعے اور محلات وغیرہ تمام کے تمام اس نصرت آثار لشکر کے قبضے میں آگئے ہیں ۔ ''اس خدا کا شکر ہے کہ جس نے ہمیں راستی کا عَلم بلند کرنے کی توفیق دی اور ہماری کوشش کی تلوار کے پرتلے کو اجتہاد کے خالص سونے اور غزوے اور جہاد کے جواہر کی زینت سے مشرف کیا ۔''

اما بعد! پوشیدہ نہ رہے کہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بلاغت شعار بلبل (یعنی ابوبکر) کسی قسم کے بہانوں اور عذروں کے سراب کی نمود کے بغیر اس سرزمین کی جانب عازم و متوجہ ہو ، اور امید کا ہاتھ مقصودات کی دلہن کی گردن میں حائل سمجھے۔ اور آرزوؤں کی نقدیاں جو آپ (ابوبکر) خزانۂ عظمت کے صندوقچے میں رکھتے ہیں، اور زیادہ حاصل کریں ۔ نفسانی اندیشوں کی صورت جو بُعد مکانی کی جرأت مشاہدہ میں آشکارا نظر آتی ہے ، یقین رکھیں کہ وہ محض نفسانی وسوسوں کے سبب ہے ، نہ کہ خدائی خزانوں کے نفیس تحفوں میں سے ۔ اس لیے کہ ہمت کے تیز پروں والے پرندے کے لیے دور و نزدیک اور اوپر نیچے سب برابر ہے ۔ اور یہ سرزمین تو تمام اقصائے عالم میں کرم و بخشش کی روشنیوں اور بلند ہمتی کے آثار کے سبب تاریک رات میں چودھویں کے چاند کی روشنی کی مانند مشہور و معروف ہے ۔ اور ہمیشہ دنیا کے بڑے بڑے فاضلوں کے ارادے کی باگ اسی ہندوستان کی سرزمین بے نظیر کی جانب مڑی ہے ۔ اور اگر لوٹنے کا ارادہ مصمم اور مراد کا خیمہ واپسی کے ستون سے محکم ہو ، تو پھر ایک برس بعد کا عرصہ گزرنے کے بعد آپ کو آپ کی خواہش و تمنا کے مطابق آپ کے وطن مالوف

میں اس طرح بھیجا جائے گا کہ آپ کے حال کے آفق سے حصول مطالب کے ستارے چشم عام و خاص اور ارباب عناد و خلوص کی آنکھوں میں دکھائی دیں گے۔ چوں کہ آں جناب کی عقل و دانش کی روشنیاں اهل زمان کے روزن سے کانوں کے محل میں پیہم پہنچتی رهی هیں ، اس لیے امید واثق ہے کہ جو کچھ مکتوب میں عرض هوا ، اس کے مطابق اقدام کریں گے اور ارباب محبت و مؤدت کی خاطر فاصلے کی دوری کو اپنے همت کے قدموں سے طے کریں گے۔ اس سے زیادہ وعدوں اور تاکیدوں کی پونجیاں محبت کی مہر والے کلمات کے سفینوں میں قلم کے ستون اور نامے کے بادبان سے کیوں کر رواں هوں اور محبت و یگانگت کے اظہار کا بیج قلموں کی نوکوں کے هاتھوں کلام کی کھیتی میں کیوں کر بویا جائے۔

اس صاحب فضیلت و عظمت (ابوبکر) کی آرزوؤں کے قافلے همیشه حصول کی منزلوں پر اترتے اور نیک نصیبے کی مطلوبه رقمیں عیش کے خزانۂ معموره میں پہنچتی رهیں ! (ریاض الانشا، صفحه ۱۷۵ تا ۱۷۶)

(۳)

اپنے بڑے بیٹے المخاطب به ملک التجار کے نام

(خدا اس پر رهتی دنیا تک اپنا سایه قائم رکھے!)

(اے الله جس طرح تو نے اسے شرفا کا جانشین بنایا اسی طرح اسے اپنی نسلوں کا سردار بھی بنا اور اسے اس کے والدین و اسلاف سے زیاده خوبیوں سے متصف کر!) جب شوق کی جاں سوز آگ دل کے آتش دان میں شعله زن هوئی اور اس کی لپٹ نے منه کے روزن سے زبان کی مخروطی سطح پر سر نکالا تو اس کے دھوئیں کی کثرت سے مکتوب کی تحریر کا جنون گویائی کے دماغ اور قلب قلم کے سویدا میں پیدا هوا۔ لیکن حقیقت میں معامله کچھ ایسا هے :

بیت

زبان ناطقه در وصف شوق ما لالست
چه جای کلک بریده زبان بیهده گوست

(یاوہ گو زبان اور کٹا ہوا قلم تو ایک طرف، یہاں تو گویائی کی زبان بھی ہمارے عشق کے وصف میں گنگ ہے)۔

بہر حال اس جنون خام کے سبب، کہ جو روح کی سرشت میں گوندھا گیا ہے، یہ خواہش تھی کہ مصرع ذیل:

کما یتداوی شارب الخمر بالخمر[۱۳]

کے مصداق غم ہجر کے جان سوز درد کو نظم و نثر کے شوق آمیز کلمات کی تحریر سے کچھ سکون و شفا میسر ہو۔ لیکن افسوس کہ سوزش جان کی شراب کی تیزی و تلخی گفتگو کے مصفا، شفاف اور شیریں پانی کے امتزاج سے ہلکی اور پھیکی پڑ جائے گی: شعر

گفتم کہ سوز آتش دل کم شود بہ اشک
آن سوز کم نگشت وزان نم بتر بسوخت[۱۴]

(میرا خیال تھا کہ آتش دل کی جلن آنسوؤں سے کم ہو جائے گی، لیکن وہ کم نہ ہوئی اور اس نمی سے اور بھی تیز ہو گئی)
بلکہ خوف اس بات کا ہے کہ زندگی کی آرزوؤں کی عمارتیں بقا کے سیلاب کی کثرت اور آہ و درد کی شدت کے سبب کہیں "دکاً دکاً[۱۵]" کی صفت سے موصوف نہ ہو جائیں۔ قادر کریم لا شریک لہ، کہ ماہتاب کی مشعل اور مہر درخشاں کے عالم افروز نور سے آسمان کے شش پہلو طاق کو روشن کرنے والا ہے، دل فراق زدہ کی طویل و تاریک شب کو وصل و حضور کے دن میں تبدیل کرے، اور قلب حزیں کی آنکھوں کی تاریکی کو میل ملاپ کے نور سے روشن کرے!

بیت

دارم امید بدین اشک چو باران کہ دگر
برق شادی کہ برفت از نظرم باز آید

(ان بارش کی مانند برسنے والے آنسوؤں سے امید ہے کہ خوشی کی برق جو میری نظروں سے غائب ہو گئی تھی، ایک بار پھر آئے گی)

فرزند ارجمند کو معلوم ہو کہ جان مشتاق کئی روز سے شفقت

و محبت کی انگلیوں سے دل کے دروازے پر دستک دے رہی تھی، تاکہ اس جانب کے احوال کی تفصیلوں کی صورتیں گفتگو کے صحیفے کے صفحے پر کھینچے ، لیکن پیر عقل نے ، کہ جدت پسندی کے کارخانے کا استاد ہے ، جان متاع کے سینے پر منع اور رکاوٹ کا ہاتھ رکھا ، کہ قلم کی باگ تفصیل کی جانب سے اختصار محض کی طرف موڑنا تقاضاے حال کے عین مطابق ہے۔ فرزند دل بند کو چاہیے کہ وہ اپنے عیش کے رخساروں سے ملال کی گرد کو دور کر دے ،کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی عنایت سےہر مراد کی صورت جو خیال کا نقش بند قلم عیش کے ورق پر کھینچتا ہے ، آئینۂ حصول میں بہ احسن وجوہ منظور ہے۔

پوشیدہ نہ رہے کہ چونکہ فرزند عزیز کی محبت و شفقت کا ہاتھ اس اندوہ گیں دل کے گریبان پر مضبوط و محکم تھا ، اس لیے مناسب جانا کہ اس کی بزم دل کو چند نصیحتوں کی شمع سے روشن کیا جائے۔

نور چشمی کو چاہیے کہ وہ امارت کے لوازم کی رعایت اور وزارت کے ارکان اور شرائط کے احاطے ھی میں سرداری و سروری کے ستونوں کی بلندی اور بزرگی و مہتری کے پایوں کی رفعت جانے تا کہ ارباب فضل و دانش کی نظر میں وہ صحیح طور پر تلوار اور قلم چلانے کا مستحق ٹھہرے۔ اس سلسلے میں تیز زبان قلم کے ترجمان کی وساطت سے اس کے بعض لوازمات ، خوبیاں ، اہم جزو اور شرائط ، ضمیر کی ڈبیا سے بیان کی لڑی میں پروئی جاتی ھیں اور باقی معاملات کو جگرگوشہ کی عقل و دانش پر چھوڑا جاتا ہے۔ آسے یہ ذہن نشین کر لینا چاھیے کہ اگر معاملہ اس کے برعکس ھو تو وہ امیدوں کے شجر کی پژمردگی کا باعث اور جلال کی عمارتوں کے یقینی خلل پزیر ھونے کا سبب ھوتا ہے۔ ''اور خدا! نہ کرے کہ ایسا معاملہ وقوع پذیر ھو!''

اول یہ کہ خصلتوں کے اوصاف جمع کرنے اور عادات کی خوبیوں کا علم بلند کرنے میں ایسی سعی و کوشش اختیار کرے کہ جو انسان کے ، کہ جس کے سر پر جہانوں کی جامعیت کا سایہ پھیلا ھوا ہے ، شایان شان ھو۔ خدا کرے اوصاف حمیدہ اور خصائل پسندیدہ کو

احاطه کرنے والا پٹکا اس لخت جگر کی روح کی کمر پر مضبوطی و استواری سے بندھا رہے :

''اگر تو اس کی زیارت کرے تو تو لوگوں کو اس ایک آدمی میں اور زمانے کو (سمٹ کر) ایک 'گھڑی' میں اور 'زمین' کو (سمٹ کر) ایک 'گھر' میں دیکھے۔''

تاکہ تمام قوموں کے افراد اس قرۃ العین کے اوصاف پسندیدہ کی اشاعت میں یک زبان و یک ہمت ہوں : شعر......

''تمام دنیا والے ایک زبان کی مانند ہیں جو تیری مدح سرائی کرتی ہے ، اور دنیا منہ کی مانند ہے۔''

دوسرے یہ کہ بنیادی طور پر مقاصد کی طلب کی وادی میں انجاموں کے معاملات کی کیفیتوں کو بہ غور دیکھنے سے غافل و بے پروا نہ ہو ۔ اور تمام مرادوں اور آرزوؤں کے مواد کے حصول میں اپنے والد اور اسلاف کی طرح مستقبل کے واقعات کے اجمال و تفصیل کو حال کے جریدے کے صفحے سے مشاہدہ کرے تاکہ ہر غائب و حاضر کی زبان عقلوں اور مجلسوں میں اس جگر گوشہ کی مدح و ثنا میں مصروف و مشغول رہے :

''وہ رائے کے انجام کو پا لیتا ہے ، اور اس کی رائے ہمیشہ مقبل (جس کا انجام بہ خیر ہو) ہوتی ہے ، گویا کہ آج وہ کل پر نظر رکھتا ہے۔''

''وہ اپنے باپ کا تابع اور اس کا پیروکار ہے جس طرح کہ اس کا باپ اپنے باپ کا تابع تھا ، جو سردار ابن سردار تھا۔

نیز یہ کہ ''انزلو الناس منازلہم۱۶'' کے مطابق ہر چھوٹے بڑے ، امیر اور جنگ جو دلیر کو اس کے حسب حال عزت و توقیر بخشے اور ان کے عیش کے آئینے سے رنج و ملال کا زنگ اعزاز و اکرام کے صیقل سے دور کرے :

''جب تو کوئی عزت کا مقام پالے تو بلند بھی سہل معلوم ہونے لگے۔ اور جو مٹی کے اوپر ہے ، وہ مٹی ہے۔''

دیگر یہ کہ عفو و تنبیہ کی صورت (تصویر) کو دانائی و زیرکی

کے مو قلم سے اپنے اپنے موقع و محل پر ، بہ‌طریق احسن ، بغیر کسی کمی بیشی کے ظاہر و نمایاں کرے : شعر......

''جب تو کسی شریف النفس کی عزت کرے تو تو اس کا مالک بن جائے گا اور اگر کسی کمینے کی عزت کرے گا تو وہ اور سر کش ہوجائے گا ۔

تلوار کی جگہ سخاوت کرنا اتنا ہی مضر ہے، جتنا سخاوت کی جگہ تلوار کا استعمال ۔''

جو لوگ کہ عجیب و غریب معلومات اور کافی ہنر مندی سے آراستہ ہوں اور جن کی دانش و بینش کی کثرت سے بزرگ منش لوگوں کی نگاہیں بھری پڑی ہوں ، اور جن کے جواب و خطاب کے چہرے سے درستگی و راست گفتاری کا نور دیکھا جا سکتا اور فتنہ و شر کا دست و سر جن کے ذہن کی تازگی اور دقت نظر سے کچلا جاسکتا ہو ۔ شعر......

''دل قسم قسم کے فضائل کا جامع ہے اور اس کی عقل معاملات کے انجام پر بصیرت رکھتی ہے ۔ '' : بیت

دلش برندۂ نقش فتن بدست حکم
کفش زنندۂ حد ستم بنوک قلم

(اس کا دل فتنوں کے نقش کو داناثیوں کے ہاتھوں سے کاٹنے والا اور اس کا ہاتھ حد ستم کو قلم کی نوک سے مٹانے والا ہے)۔۔۔

آن کی حفاظت طرح طرح کی بخشش و عطا اور مرتبوں میں قسم قسم کی ترقیوں سے کی جائے ، اور ان کے مقاصد و مطالب کے اسباب کو قبول کی نظروں سے دیکھا جائے ۔ اور اگر اس لخت جگر کی عنایتوں کے مینہ کا بادل اس قسم کے لوگوں کے وجود کے شجر کو تربیت کے چھینٹوں سے سرسبز و شاداب نہیں کرے گا تو اس کے طور طریقے کے کمال کا رخسار حسن اوصاف کے میدان کارزار میں عیب اور عار کی نال سے زخمی ہوجائے گا۔ ''ہم اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ایسے نقش اس کے نام کے چہرے پر بنیں!''

نیز ایسے لوگوں کے بارے میں ، کہ جن کے کندھے فضیلتوں کے حصول کی خلعت اور پسندیدہ خصلتوں کی چادر سے خالی اور خوبیوں کے ستارے ان کے وجود کے افق سے پوشیدہ ہوں ، یقین رکھے کہ انہیں معاملات کی دشواریوں کے بند دروازوں کو کھولنے کی ذرا بھی سمجھ نہیں ہے ، اور نہ انہیں بزرگوں کی ہم بزمی اور ہم مجلسی ہی سے کوئی نسبت ہے - اور اگر کبھی خدا نہ کردہ بعض اصحاب کی کوشش اور معاونت سے اس فرزند ارجمند کی بساط بزم پر ایسے لوگوں کی قربت کے نقش کی چھاپ لگ جائے تو اس کے جاہ حال کے گال پر بزرگان دوران کی زبان کے طعن نقش ہو جائیں گے: شعر......

''اهل کرم کی صحبت اختیار کر کہ اس سے تجھے کچھ نہ کچھ حاصل ہوگا ، اس لیے کہ عادات هر ساتھی سے متاثر هوتی هیں -

کیوں کہ هوا جہاں سے گزرتی ہے وهاں سے وهی کچھ لے جاتی ہے جو اس جگہ هوتا ہے - مثلاً بد بو گندی جگہ سے اور خوش بو ، خوش بو والی جگہ سے -''

دیگر یہ کہ سلطنت و سرداری کی برکت سے ناصر ملک و قوم کے باغ کو اهل فساد کے ظلم کی آندھی اور شرپسندوں کی دست درازی سے محفوظ رکھے - اور اس حقیقت کے ذریعے نیک بختی کی پائندگی کے ستون کو گنبد فلک کے کلس کے اوپر سمجھے ، کیوں کہ حاکموں کی همتوں پر یہ واجب و لازم ہے کہ وہ تمام قوموں کے دل کے پاؤں سے ظلم و ستم کا کانٹا نکالیں ، اور خرد و کلاں کی عزت و آبرو اور مال و دولت کی جیب کو لشکروں کے ظلم و تعدی کے ھاتھ سے محفوظ رکھنا ان کے لیے قیامت کے روز نجات کا باعث هوگا : شعر......

''عدل کر تا کہ تو زمانے کی گردشوں سے محفوظ رہے ، کیوں کہ عدل هی کی وجہ سے عمر کا نام غیر منصرف هوگیا -''

حشمت و شوکت والے رئیسوں کے وظیفہ جات اور تنخواهیں ، اور ماتحت نوکروں چاکروں اور لشکر کا روزینہ وغیرہ بغیر کسی تاخیر ، سستی اور بے پروائی کے پورے طور پر انہیں پہنچائے اور اس امر

کو حد سے زیادہ اہم سمجھے ۔ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کے سرداروں کو مشقتوں کی کثرت اور نا قابل برداشت تکلیفوں سے متنفر و بیزار نہ کرے: مصرع

شکستہ شود کمان چو از حد بکشی
(جب کمان کو حد سے زیادہ کھینچو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی)

اور سخاوت و بخشش کے نور سے خاص و عام کے دلوں کو روشن رکھے ۔ بذل و سخاوت کرنے کی شرط اور انعام و اکرام بخشنے کا رکن یہ ہے کہ اس فرزند دل بند کی بخشش کا فیضان ابر کی مانند فرماں بردار اور نا فرمان ، اور دور و نزدیک پر عام ہو ۔ اور فضیلتوں اور انعام کا چہرہ تبسم و شگفتگی کی علامتوں سے منقش، اور خلق اللہ کے اصرار و ابرام کی تاریکیوں کے باوجود بخشش و تواضع کے آفتاب کی روشنی دوپہر کے سورج کی طرح تیز ہو ۔ اور اس کی ہمت و تواضع کا دامن ایذا دہنے اور احسان جتانے[۱۷] کے زنگ سے کلی طور پر پاک رہے : شعر......

”جب ابو حامد کا ہاتھ ہم پر سخاوت کرتا ہے تو دو سخیوں ، سمندر اور بارش کی تعریف نہیں کی جا سکتی ۔

اور اگر ہمارے لیے اس کی پیشانی کی بشاشت روشن ہو تو گویا شمس و قمر روشن ہو جاتے ہیں ۔“

نیز یہ کہ تدبیرکار کی تقدیم اور سوچ بچار والے معاملات کی ترتیب کو اپنی ہمت کے عہدے پر واجب و لازم گردانے ۔ اور جب تدبیر کی کمان میں فکر کا تیر چڑھائے تو اس وقت عجز و نیاز کا سر عاجزی و انکساری کی خاک پر رکھے ، تاکہ اس جگر گوشہ کی تدبیر کے آئینے میں تقدیر کی صورت نظر آئے ، کیوں کہ دولت و اقتدار تقدیر با تدبیر کی توفیقوں سے عبارت ہے ۔ اور تدبیر کی توفیق کے بعد روشن ضمیر بزرگوں اور جوانوں کے صلاح مشورے سے ’ہمت بال[۱۸]‘ کا پاؤں قتال و جدال کے ارادے کی رکاب میں ڈالے: شعر......

”بہادروں کی بہادری سے پہلے عقل مندی ہے ۔ عقل مندی کا درجہ

پہلا ہے اور شجاعت دوسرے درجے پر ہے - جب یہ دونوں (بہادری اور عقل مندی) کسی شریف النفس میں جمع ہو جاتی ہیں ، تو وہ ہر بلندی تک پہنچ جاتا ہے۔"

اور جب عقل و دانش کے ساتھ میدان کارزار میں قدم رکھے تو اس خدائے حامی و ناصر پر بھروسا کرتے ہوئے خیال کے خزانے کو تعلق حیات کے وسوسے اور خواہشات و لذات کے تصور و تخیل سے خالی کر دے ، دل کے طاق کی پیش‌گاہ میں سوائے ننگ و ناموس کی تصویر کے اور کچھ نہ بنائے اور اپنی ہمت کے سر پر جرأت و دلیری کی دستار کو عین سعادت و کرامت سمجھے : **بیت**

بزم مردان عرصۂ رزم است و عشرت داروگیر
بادۂ خوش دشمن و جام دمادم تیغ و تیر

(دلیروں کے لیے میدان کارزار بزم اور داروگیر عشرت ہے - اُن کے لیے دشمن بادۂ خوش ہے اور تلوار اور تیر جام دمادم)

اُستواری و ثبات کے مقام پر کمزور ارادوں اور بد دلی و نامردی کی علامتوں والے لوگوں کی باتوں پر ہرگز ہرگز توجہ نہ دے : **شعر.....**

"بزدلوں کا خیال ہے کہ بزدلی انتہائی احتیاط ہے ، حالانکہ یہ کمینہ فطرت کا دھوکا ہے -"

اور اس میں شک نہیں کہ چہرۂ حیات پر بے دلی کے غازے کی نسبت ذات کی پیشانی پسر نقش ممات کا ہونا بہتر ہے ، اور تلوار اور نیزے کے زخموں کے ساتھ قبر میں اُترنا زندگی کے اُس عروج و کمال سے ، جس میں ہم عصروں کی زبان کے طعنے شامل ہوں ، بڑھ کر ہے : **شعر.....**

"ہم وہ لوگ ہیں جن کے ہاں کوئی درمیانی جگہ نہیں ؛ ہم یا تو عالموں کے سردار ہوتے ہیں یا ہمارے لیے قبر ہے - عز و جاہ کے حصول میں ہماری جانیں ہماری نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتیں اور جو کوئی کسی حسینہ کو شادی کا پیغام دیتا ہے ، تو اُس کے لیے مہر گراں نہیں ہوتا -"

مرکب حروف کی موجوں نے بحر معانی میں اس سے زیادہ جوش نہیں مارا اور نہ شفقت و محبت کی انجمن میں پند و نصیحت کی 'آفتاب صفت' شمع ھی الفاظ کی لگن میں اس سے بڑھ کر جلی ھے - خدا کرے اُس قرۃ العین کے ضمیر کی کمان سے اُس کے غور و فکر کا تیر ھمیشہ مطلوب و مقصود کے نشانے پر بیٹھے اور اس کا 'ظفر اثر' لشکر بیجانگر کے وسط میں اُترتا رھے ! ''بمن یحقق الحق ویذھق الباطل'' (اُس کی قسم جو حق کو حق کر کے دکھاتا ھے اور باطل کو شکست دیتا ھے)

(ریاض الانشاء، صفحہ ۱۳۶ تا ۱۴۱)

جزو دوم

دورهٔ تیموریان هند

ظہیرالدین بابر

[ظہیرالدین بابر (پیدائش ۸۸۸ھ وفات ۹۳۷ھ) جو انتقال کے بعد سرکاری تحریروں میں فردوس مکانی کہلایا ، ترکی ، فارسی اور ہندوی سے دلچسپی رکھتا تھا ۔ ترکی میں وہ صاحب دیوان بھی ہوا ۔ توزک بابری ترکی زبان میں اس کی خودنوشت سوانح حیات ہے ۔ یہ کتاب واقعات بابری یا بابر نامہ بھی کہلاتی ہے ۔ اکبر کے حکم سے عبدالرحیم خان خاناں نے فارسی میں ترجمہ کیا ۔ یہ اقتباسات اسی ترجمے سے لیے گئے ہیں ۔ پہلا اقتباس اُس واقعے سے تعلق رکھتا ہے جب بابر کو ہندوستان میں رانا سانگا سے مقابلہ کرنا پڑا ۔ یہ اُس کی زندگی کا بڑا نازک دور تھا اور بظاہر کامیابی مشکل نظر آتی تھی ۔ اس موقع پر بابر نے ترک شراب کی ۔ دوسرا اقتباس ہندوستان کے بارے میں بابر کے گہرے مشاہدے کو ظاہر کرتا ہے]

ظہیرالدین محمد بابر کا فرمان

''تحقیق اللہ تعالٰی توبہ کرنے والوں اور پاکیزہ لوگوں کو پسند کرتا ہے اور استغفار کرنے والوں کو بخشتا ہے ۔ اور ہم درود پڑھتے ہیں اس کی بہترین مخلوق محمد صلعم اور ان کی نیک و پاک اولاد پر!''

اہل خرد کی عقلوں کے تحفے[1] ، کہ اسباب کی صورتوں کی بلندیوں کی خوبیاں اور نقوش صدق و راستی کے موتیوں کے خزانے ہیں ، اس حقیقت کے چمک دار موتیوں کا نقش قبول کرنے والے ہوں گے کہ انسانی طبیعت اپنی فطرت کے مطابق نفسانی لذات کی جانب

مائل ہے۔ اگرچہ بری باتوں کے ترک کرنے میں کامیابی صرف تائید ایزدی اور توفیق خداوندی ہی سے ممکن ہے۔ انسانی نفس انسان کی خواہش و رغبت سے دور نہیں ہے جیسا کہ قران کریم میں ہے ''وماأبرئ نفسی....الخ ۲'' (میں اپنے نفس سے بری نہیں ہو سکتا۔ بلا شبہ نفس برائی کا حکم کرنے والا ہے) اور اس نفس سے چھٹکارا اس غفورالرحیم کی عنایت کے بغیر مشکل ہے، کیوں کہ ''وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم۳۔''

اس مقولے کے بیان کرنے اور اس ساری تمہید کے لکھنے سے ہماری غرض یہ ہے کہ کچھ تو تقاضاے بشری سے، کچھ بادشاہوں کے رسم و رواج اور شاہی لوازم کے تحت اور کچھ صاحبان جاہ و مرتبہ (کیا بادشاہ کیا سپاہی) کے حسب عادت ہم سے جوانی کے آغاز میں کئی ایک غیر شرعی افعال اور لہو و لعب کی باتیں سرزد ہوئیں۔ کچھ عرصے کے بعد ان افعال کے سبب بڑی شرمندگی و پشیمانی حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں ان برے افعال کو ایک ایک کر کے ترک کیا، اور سچی توبہ کے دروازے پر پہنچ کر پچھلے افعال کو بند کر دیا۔ لیکن جہاں تک شراب سے توبہ (کہ ہماری مذکورہ غرض کا سب سے اہم پہلو یہی ہے) کا تعلق ہے، وہ اکثر اوقات 'کل امر مرھون باوقاتہ۴' کے پردے میں چھپ کر اپنا چہرہ نہیں دکھاتی تھی۔ تا آں کہ ان مبارک گھڑیوں میں، جب کہ ہم بہ کمال جد و جہد جہاد کا احرام باندھ کر اسلامی فوجوں کے ساتھ کافروں کو ملیامیٹ کرنے میں مصروف تھے، ملہم غیبی اور فرشتۂ لاریبی سے ''الم یان للذین......الخ۵'' کا مبارک مضمون سن کر گناہوں کے اسباب کو مٹانے کے لیے ہم نے پوری طاقت سے توبہ کے دروازوں کو کھٹکھٹایا۔ چنانچہ ہادی توفیق نے ''من قرع بابا ولج ولج۶'' کے مضمون کے مطابق سعادت و نیک بختی کا دروازہ کھول دیا۔ اس جہاد بالسیف کے آغاز نے ہمیں جہاد اکبر، کہ نفس کے خلاف ہے، کی طرف راغب کیا۔ الغرض 'ربنا ظلمنا انفسنا' (اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا) کے الفاظ اپنی زبان اخلاص

پر لا کر ''تبت الیک وانا اول المسلمین۷'' کو لوح دل پر منقش کیا اور توبۂ شراب کی خواہش کو، کہ اب تک سینے کے خزینے میں چھپی بیٹھی تھی، عملی جامہ پہنایا۔ فتح و نصرت رکھنے والے ہمارے خادموں نے ہمارے سعادت انجام حکم کے مطابق صراحی، جام اور تمام منشی اشیاء اور چاندی کے ظروف و آلات کو، کہ جو اپنی کثرت اور سجاوٹ کے باعث فلک عالی کے ستاروں کی مانند ہماری نادر و اعلیٰ محفلوں کو سجانے والے تھے، ذلت و پستی کی زمین پر دے پٹکا، اور بتوں کی طرح، کہ جنھیں ہم ان شاء اللہ العزیز جلد ہی برابر خاک کرنے میں کامیاب ہوں گے، ان کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا اور ہر ٹکڑا کسی نہ کسی مفلس اور نادار کو دے دیا۔ ہماری اس قریب الاجابت دعا کے سبب ہمارے بہت سے مقربوں نے ''الناس علی دین ملوکھم'' کے مضمون کے مطابق اسی مجلس میں توبہ کرنے کا شرف حاصل کیا، اور خود کو تکلیف میں ڈال کر شراب نوشی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اب بھی بے شمار لوگ امر و نہی کی پیروی کرتے ہوئے ہر لمحے اس سعادت سے مشرف ہو رہے ہیں اور امید ہے کہ ''الدال علی الخیر کفاعلہ۸'' کے مطابق ان اعمال کے دروازے ہمارے عہد میں سلطنت کے سعادت انجام نائبوں۹ پر کھل جائیں گے، اور اس سعادت کی برکت سے ہر روز ہماری فتح و نصرت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اس اہم کام کے اختتام اور اس خواہش کی تکمیل کے بعد ہم نے اپنا دنیا کو مطیع کرنے والا فرمان جاری کیا کہ تمام سلطنت میں (اللہ اسے تمام آفات و بلیات سے محفوظ و مامون رکھے!) کوئی بھی شخص ہرگز ہرگز شراب خوری اور بادہ نوشی کا ارتکاب نہ کرے؛ نہ اس کے حصول کی کوشش کرے، نہ بیچے، نہ خریدے اور نہ پاس ہی رکھے۔ پھر ''فاخشوا لعلکم تفلحون......الخ۱۰'' کے زر و دینار سے بادشاہی جود و کرم کے سمندر نے جوش میں آ کر سخاوت و بخشش کی لہروں کو، کہ عالم کی آبادی اور بنی آدم کی آبرو کا باعث ہیں، باہر اچھالا، اور تمام ممالک میں مسلمانوں سے لیے جانے والے ٹیکس (تمغہ) کے بارے میں، کہ جس کا حاصل

بے حد و شمار ہے اور جو گزشتہ سلاطین کے عہد میں مسلسل لیا جاتا رہا ، حالانکہ اس کا حصول سیدالمرسلین صلعم کی شریعت مطہرہ کے ضابطوں کے خلاف تھا ، ہم نے یہ فرمان جاری کیا کہ کسی بھی شہر اور کسی قصبے وغیرہ میں وصول نہ کیا جائے اور نہ اس حکم ہی میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کریں ۔ ''فمن بدلہ بعد ما سمعہ......۱۱'' بادشاہی مہربانیوں کے سائے میں پناہ لینے والے سپاہیوں ، خواہ وہ ترک ہوں ، تاجیک ہوں ، عرب ہوں ، ایرانی ہوں ، خواہ ہندوستانی ہوں ، اور شہری اور فوجی رعایا ، ہر مذہب کے لوگوں اور ہر قبیلے کے افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ اس تائید یافتہ بخشش سے طالب مدد اور امید وار ہو کر پائندہ و جاوید سلطنت کے لیے دعا کریں اور ان 'سعادت انجام' احکام کے لوازم سے سر مو انحراف نہ کریں ۔ فرمان اعلیٰ کے مطابق عمل کر کے اسے پورا کریں اور جب فرمان شاہی۱۲ پہنچے تو اس پر اعتماد کریں ۔

یہ فرمان خدائے بزرگ و برتر کے حکم سے ۲۴ ۔ جمادی الاول ۹۳۳ھ کو لکھا گیا ۔ اللہ تعالیٰ اسے بہت بلند کرے اور اس کے نفاذ کو ہمیشگی بخشے ! (توزک بابری ، صفحہ ۲۱۹ تا ۲۲۰)

ہندوستان کے بارے میں

ہندوستان میں لطافت و پاکیزگی کا عنصر کم ہے ۔ یہاں کے لوگ نہ خوب صورت ہیں ، نہ میل جول رکھنے کے شائق ۔ ان میں زندہ دلی نام کو نہیں ۔ فہم و ادراک سے یہ عاری ہیں ۔ ادب ، مروت اور لطف و عنایت ان کے نزدیک نہیں پھٹکے ؛ کام اور پیشے ان کے بے سلیقہ و بے ترتیب ، جسم ان کے بےڈول اور بے ڈھنگے ۔ یہاں کے گھوڑے اچھے نہیں ہیں ، اور گوشت بھی ناقص ہی ہوتا ہے ۔ اور نہ صرف یہ کہ اعلیٰ قسم کا خربوزہ اور انگور یہاں دستیاب نہیں ہوتا بلکہ دوسرے اچھے پھل بھی غائب ہیں ۔ برف نہیں ، ٹھنڈا پانی ناپید ۔ بازاروں میں کھانے پینے کی جو چیزیں ملتی ہیں وہ ردی ۔ حمام کا کہیں پتا نہیں ، مکتب نظر نہیں آتے ۔ شمع و مشعل کا نام و نشان نہیں ۔ موم بتی کی

لگن بھی نہیں ملتی ۔ شمع اور مشعل کی بجائے آپ کو بہت سے گندے لوگ ملیں گے جو دیوٹی[13] کہلاتے ہیں ، اور جو اپنے بائیں ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سہ پایہ پکڑے ہوتے ہیں جس کی ایک ٹانگ کے ساتھ ، جو لکڑی کی ہوتی ہے ، شمع دان کے سرے کی مانند ، لوہے کا ایک ٹکڑا مضبوطی سے باندھ دیتے ہیں ۔ پھر ایک نرم سی بتی جو لمبائی میں انگوٹھے کے برابر ہوتی ہے ، دوسرے پاؤں کی لوہے والی لکڑی سے باندھ دی جاتی ہے ۔ ان لوگوں کے دائیں ہاتھ میں ایک کدو ہوتا ہے جس میں بڑا تنگ سوراخ رکھتے ہیں ۔ اس سوراخ سے تیل بہت تھوڑی مقدار میں نیچے آتا ہے ۔ چنانچہ جس وقت بھی بتی پر تیل ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسی کدو سے تیل ڈالتے ہیں ۔ ان کے بڑے بڑے آدمی ایک سو یا دو سو ایسے دیوٹی رکھتے ہیں ۔ شمع اور مشعل کی بجائے اسے استعمال میں لاتے ہیں ۔ اگر ان کے بادشاہوں اور امیروں کو رات کے وقت کوئی کام روشنی میں کرنے کی ضرورت در پیش آئے تو ان کے خادم یہی گندے دیوٹ ہاتھ میں تھامے ان کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں ۔ دریاؤں اور تالابوں کے علاوہ گڑھوں اور غاروں میں بھی کچھ پانی رواں رہتا ہے ۔ یہاں کے باغوں اور عمارتوں میں نہریں نہیں ہیں ۔ عمارتیں کچھ اس ڈھب کی ہیں کہ ان میں ہوا داخل نہیں ہوتی ، اور نہ کوئی ان میں صفائی ہی ہے ۔ علاوہ ازیں وضع قطع میں بھی بے ڈھنگی سی ہیں ۔ یہاں کے کسان اور نچلے طبقے کے لوگ ننگے پاؤں[14] پھرتے ہیں ۔ ناف سے دو بالشت نیچے اریب کٹا ہوا ایک چھوٹا سا کپڑا باندھتے ہیں جسے لنگوٹا کہتے ہیں ۔ اس کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا کپڑا نیچے کی طرف لٹکا ہوتا ہے ۔ جس وقت انہیں لنگوٹا باندھنا ہوتا ہے تو اس کپڑے کو دونوں رانوں کے نیچے سے گزار کر پیچھے لاتے اور لنگوٹے کے بند میں اڑا کر مضبوط کردیتے ہیں ۔ ان کی عورتیں لنگی باندھتی ہیں ، جو آدھی تو ان کی کمر تک بندھی ہوتی ہے اور آدھی کو وہ سر پر اوڑھ لیتی ہیں ۔

ہندوستان میں اگر کوئی خوبی ہے تو یہ کہ یہ ایک بہت وسیع ملک ہے ۔ اس میں سونے چاندی کی بہتات ہے ۔ پھر برسات کے موسم

میں یہاں کی آب و ہوا بڑی خوش گوار ہو جاتی ہے اور اس موسم میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دن میں پندرہ بیس مرتبہ مینہ برس جاتا ہے ۔ ان بارشوں کے سبب ایک دم سیلاب آ جاتے ہیں اور جہاں پانی کی بوند بھی نہیں ہوتی وہاں دریا بہنے لگ جاتے ہیں ۔ مینہ برسنے اور تھم جانے کے موقعوں پر ہوا میں ایک عجیب خوش گواری آ جاتی ہے ، یہاں تک کہ اس وقت کوئی شے بھی اس کے معتدل اور لطیف موسم سے سبقت نہیں لے جا سکتی ۔ اور اس میں عیب یہ ہے کہ ہوا میں بے حد رطوبت اور نمی آ جاتی ہے ۔ یہاں کی برسات میں اپنے یہاں کی بنی ہوئی کمانوں سے تیر نہیں پھینکا جا سکتا اور وہ بیکار ہو جاتی ہیں ۔ یہاں کی برسات نہ صرف کمان پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ زرہ ، کتاب ، لباس اور دیگر ساز و سامان پر بھی اپنا اثر چھوڑے بغیر نہیں رہتی ۔ عمارتیں بھی اس کے سبب دیرپا نہیں رہتیں ۔ برسات کے علاوہ موسم سرما اور موسم گرما میں بھی بڑی عمدہ ہوائیں چلتی ہیں ، لیکن شمالی ہوا ہمیشہ چلتی رہتی ہے ۔ اور یہ ہوا اس قدر گرد و غبار اڑاتی ہے کہ اس میں کچھ بھی سجھائی نہیں دیتا ۔ اسے یہاں کے لوگ آندھی کہتے ہیں ۔ گرمیوں میں ثور اور جوزا کے دوران میں گرمی زیادہ پڑتی ہے ؛ لیکن اتنی بھی زیادہ نہیں کہ نا قابل برداشت ہو ۔ بلخ اور قندھار کی نسبت یہاں گرمی کم پڑتی ہے ۔ علاوہ ازیں اس (گرمی) کی مدت بھی مذکورہ شہروں کے مقابلے میں نصف ہوتی ہے ۔

اس ملک کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہاں ہر قسم کی صنعت و حرفت بے حد و شمار ہے ۔ اور ہر کام اور ہر پیشے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں کارندے موجود ہیں جو پشت در پشت سے ایک ہی کام اور پیشے سے متعلق رہے ہیں ۔ ملا شرف الدین علی یزدی صاحب ظفر نامہ نے امیر تیمور کے 'مسجد سنگ' بنانے کے ذکر میں اس مبالغے سے کام لیا ہے کہ اس مسجد میں آذربائیجان ، فارس ، ہندوستان اور دیگر ملکوں کے سنگ تراش روزانہ دو سو کی تعداد میں کام کرتے تھے ۔ لیکن ان صرف آگرہ میں میری ایک عمارت میں آگرہ ہی کے چھ سو اسی

سنگ تراش ہر روز کام کرتے تھے - اس کے علاوہ آگرہ ، فتح پور سیکری ، بیانہ ، دولت پور ، گوالیار اور کول میں روزانہ ایک ہزار چار سو اکانوے سنگ تراش میری مختلف عمارتوں میں کام کرتے تھے - ان اعداد و شمار سے بہ خوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس ملک میں ہرپیشے اور ہر صنعت کے لوگ کس قدر بے شمار ہیں -

(توزک بابری ، صفحہ ۲۰۴ تا ۲۰۵)

ابوالفضل علامی

[ابوالفضل (۹۵۸ - ۱۰۱۱ھ) اکبر کا وزیر، فارسی زبان کا صاحب طرز انشا پرداز تھا - اُمور ملکی سے گہری واقفیت اور سرکاری کاغذات تک دسترس کی وجہ سے اس نے آئین اکبری اور اکبر نامہ جیسی یادگار کتابیں لکھیں - اس کی انشا رقعات کی ایک ایسی دستاویز ہے جس سے مؤرخین نے بہت کم کام لیا ہے - ذیل میں ہم انشاے ابوالفضل سے بعض ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں جو اُمور ملکی کے بارے میں اکبر کے خیالات کی وضاحت کرتے ہیں - اس کے بعد آئین اکبری کے بعض ایسے اقتباس درج کیے گئے ہیں جن سے نظام حکومت کی بعض تفصیلات اور اکبری دور کے معاشرتی آداب پر روشنی پڑتی ہے -]

حضرت شہنشاہ (جلال الدین اکبر) کا دستورالعمل مقبوضہ ممالک کے حاکموں اور اُمور متعلقہ کے پیش‌کاروں کے نام

ظل الہ کا یہ فرمان اور قانون و کار آگاہی کا یہ دستورالعمل شہنشاہی لطف و عنایت کے مخرج اور نوازشوں کی کان سے جاری ہوا، کہ سلطنت کے ماہر منتظم اور بارگاہ خلافت کے کارکن، یعنی ہمارے بلند اقبال شہزادے، خلوص کیش سردار، عالی مرتبہ اُمرا اور دیگر تمام منصب دار، حکام اور کوتوال اس طریقے پر عمل پیرا ہو کر شہروں، دیہاتوں اور تمام کٹڑوں کے انتظام میں شاہی فرمان کو مد نظر رکھیں -

اول مختصراً یہ کہ تمام کاموں میں، خواہ وہ دنیاوی ہوں یا دینی، اللہ تعالٰی کی رضا کے طالب ہوں، اور ہر کارکن اس بارگاہ لم یزل کا

نیازمند بن کر ہر کام خود اپنی ذات اور دوسروں کا لحاظ کیے بغیر شروع کرے ۔ دوسرے یہ کہ تنہائی پسند نہ ہو کہ یہ صحرا نشین درویشوں کا طور طریقہ ہے ۔ ہمیشہ عام لوگوں میں بیٹھنے اور بھیڑبھاڑ میں رہنے کی عادت نہ ڈالے کہ یہ پوچ اور بازاری قسم کے لوگوں کا ڈھنگ ہے ۔ الغرض اپنی بود و باش میں میانہ روی اختیار کرے اور اعتدال کی روش کو ھاتھ سے نہ جانے دے ، یعنی نہ تو حد سے زیادہ مجمع میں بیٹھے اور نہ بالکل ھی گوشہ نشینی و تنہائی اختیار کرے ۔ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کو عزیز رکھے ۔ صبح و شام ، آدھی رات اور دوپہر کو جاگتے رہنے کی عادت ڈالے ، اور جس وقت عوام کے کاموں سے فرصت میسر ھو اس لمحے بزرگان دین کی تصنیفات — جیسے علم اخلاق ، کہ طب روحانی اور تمام علوم کا نچوڑ ھے ، کی کتابیں مثلاً اخلاق ناصری ، احیاء العلوم کے دو باب منجیات و مہلکات ، کیمیاے سعادت اور مثنوی مولانا روم — کا مطالعہ کرے تاکہ دین داری کے انتہائی درجوں سے آگاہ ھوکر وہ اھل مکر و فن کے حیلہ و فریب سے محفوظ و مامون رہے ، کہ اس دنیا میں خداے بزرگ و برتر کی بہترین عبادت لوگوں کے معاملات کو کسی دوست ، دشمن یا اپنے پرائے کی رو رعایت کیے بغیر خندہ پیشانی سے سرانجام دینا ھے ۔

ان فقیروں ، مسکینوں اور خصوصاً خلوت نشینوں اور آزاد منشوں (مجرد) کے ساتھ ، کہ جو نہ تو خود کسی کے پاس جاتے ھیں ، نہ کسی کو آنے دیتے اور نہ کسی کے سامنے دست سوال ھی دراز کرتے ھیں ، تا بہ مقدور نیکی اور بھلائی کرے ۔ گوشہ گیر طالبان خدا کی خدمت میں حاضر ھو کر ان سے دعا کا طالب ھو ۔ لوگوں کے جرم و خطا کو انصاف کی کسوٹی پر پرکھ کر ہر مجرم کو اس کے رتبے کے مطابق سزا دے ۔ اس 'دانش اساس' ترازو سے ہر ایک کو بدلہ دے ۔ اور اپنے نکتہ شناس دل سے معلوم کرے کہ اس گروہ میں کون سی خطا قابل درگزر اور کون سی تقصیر پردہ پوشی کے لائق ھے اور کون سا جرم پوچھنے ، زبان پر لانے اور سزا دینے کے قابل ھے ۔ اس لیے

که اکثر چھوٹی چھوٹی خطائیں بہت بڑی سزا دینے اور بعض بڑی بڑی تقصیریں چشم پوشی کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔

سرکشوں کو نصیحت، نرمی، سختی اور ملائمت سے ان کے مراتب کے مطابق ہدایت کرے، اور جب نصیحت سے کام بنتا نظر نہ آئے تو فرق مراتب کو ملحوظ رکھ کر باندھنے، مارنے، عضو کاٹنے اور قتل کرنے پر عمل کرے۔ قتل کرنے میں عجلت سے کام نہ لے اور اس سلسلے میں پہلے پوری طرح غور و خوض کرے، کیونکہ

''کٹے ہوئے سر کو دوبارہ جوڑا نہیں جا سکتا''

بلکہ جہاں تک ممکن ہو اس گردن زدنی کو دربار میں بھیج دے اور اس کی حقیقت سے آگاہ کرے، اور اگر اس سرکش کی نگہداشت یا اس کا دربار میں بھیجنا باعث خرابی ہو تو اسے قتل کر ڈالے۔ کھال کھینچنے، ہاتھی کے پاؤں میں ڈالنے اور اس قسم کی دیگر سزائیں دینے سے، کہ جو صرف بڑے بڑے بادشاہ ہی اختیار کرتے ہیں، پرہیز کرے۔ لوگوں کے طبقوں میں ہر شخص کی سزا اس کی حالت کے مطابق ہو، اس لیے کہ کسی عالی طبع شریف آدمی کے واسطے ایک غصے کی نظر ہی مار ڈالنے کے مترادف ہے، جب کہ کسی کمینے شخص کے لیے گھونسا لات بھی کم ہے۔ ایسے شخص کو، کہ جس کی عقل و ایمان داری پر اسے بھروسا ہو، اس امر کی اجازت دے کہ اپنے خیال کے مطابق جو کچھ وہ نازیبا سمجھے تنہائی میں اس سے بیان کرے۔ اور اگر کبھی کہنے والے سے اتفاقاً کوئی بات غلط سرزد ہو گئی ہو تو اسے ملامت نہ کرے، کہ ملامت بات کہنے میں حارج ہوتی ہے۔ اور ایسے آدمی کو کہ جسے خدائے وحدہ لا شریک نے سچ بولنے کی توفیق ارزانی فرمائی ہو، عزیز رکھے، اس لیے کہ لوگوں میں سچ بولنے کی جرأت کم ہی ہوتی ہے۔ جو لوگ تو ذلیل اور فسادی ہیں، انھیں تو گویا راست گوئی سے چڑ ہے، اور وہ یہی چاہتے ہیں کہ اسی طرح مصائب میں گرفتار رہیں۔ اور جو شخص کہ اصیل اور نیک ذات ہے، اسے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو

کہ میرے سچ کہنے سے سننے والا ناراض ہو جائے اور میں خواہ مخواہ گرفتار آلام ہو جاؤں ۔ اور ایسا نیک اندیش جو دوسروں کے فائدے کی خاطر خود نقصان اٹھائے گویا اکسیر اعظم کا حکم رکھتا ہے ۔

خوشامد پسندی کو اپنا شعار نہ بنائے، کہ خوشامدیوں سے اکثر کام ادھورے ہی رہ جاتے ہیں۔ ان سے ایک دم بدگمان بھی نہ ہوجائے، کہ ملازم کو اپنے آقا کی خوشامد کرنا بھی ضروری ہے ۔ فریادیوں کا حال بذات خود معلوم کرنے میں حتی المقدور سعی و کوشش کرے :

اشعار

بدیوان مینداز فریاد او　　که شاید ز دیوان بود داد او

بخود پرس فریاد مظلوم را　　برون ساز از انگبیں موم را

(حاکم عدالت پر اس کی فریاد کو نہ چھوڑ کہ ممکن ہے وہ اسی حاکم کے خلاف شکایت لایا ہو ۔ مظلوم کی دادرسی خود کر اور اس طرح شہد سے موم کو باہر نکال دے ۔)

دادخواہوں کے نام ان کی آگے پیچھے آنے کی ترتیب سے لکھ کر پرسش کرے، تا کہ پہلے آنے والے کو رنج انتظار نہ اٹھانا پڑے، اور پیش کاروں کو معاملات آگے پیچھے کرنے کی جرأت نہ ہو ۔ اگر کوئی شخص کسی کی برائی آ کر بیان کرے تو اس شخص کو (جس کی برائی بیان ہوئی) سزا دینے میں جلدی نہ کرے اور چھان بین کرے، کہ تہمت لگانے والے افترا پرداز تو بہت ہوتے ہیں لیکن راست گو، نیک اندیش نہایت کم یاب۔ غصے کی حالت میں عقل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے اور بڑے ٹھنڈے دل اور تحمل سے کام کو سرانجام دے ۔ اپنے چند عقل مند اور پر خلوص دوستوں اور خدمت گاروں کو اس امر کا اختیار دے دے کہ جب رنج و غم کی کثرت و زیادتی ہو تو اس موقع پر، کہ ایسے عالم میں دانا لوگ خاموشی برتتے ہیں، وہ حق گوئی سے باز نہ رہیں ۔

قسمیں کھانے کی عادت نہ ڈالے، کہ قسم کھانا گویا اپنی

ذات پر جھوٹ کی تہمت لگانا اور مخاطب کو بد گمانی سے منسوب کرنا ہے ۔ گالی دینے سے بھی اجتناب برتے کیوں کہ یہ رذیل اور بازاری لوگوں کا شیوہ ہے ۔

زراعت کی افزائش : رعایا کی دل جوئی اور زر تقاوی[1] تقسیم کرنے کا انتظام کرے تاکہ ہر سال شہروں ، دیہاتوں اور قصبوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ کاشتکاروں کے ساتھ اس حسن سلوک سے پیش آئے کہ وہ زراعت میں زیادہ دل چسپی لیں اور اس طرح قابل زراعت تمام زمین کاشت ہونے لگے ۔ اس کے بعد جنس کامل[2] کی پیداوار بڑھانے میں سعی و کوشش بروئے کار لائے ۔ اور عامل کے دستور العمل کو بھی کہ علیحدہ مقرر کیا گیا ہے اپنے حق اندیش دل کے پیش نظر رکھے۔ مختصر یہ کہ تمام ادنی رعایا میں سے ہر کسی کا پرسان حال رہے اور کسی بھی موقع پر وعدہ خلافی نہ کرے ۔

اس امر کی سعی کرے کہ کوئی سپاہی وغیرہ ، صاحب خانہ کی مرضی کے بغیر اس (صاحب خانہ) کے گھر میں داخل نہ ہونے پائے ۔ مختلف امور میں محض اپنی ہی عقل و دانش پر اعتماد نہ کرے ، بلکہ اپنے سے زیادہ دانا سے صلاح مشورہ کر لے ۔ اور اگر ایسا آدمی میسر نہ ہو تو بھی مشورہ لینے سے گریز نہ کرے ، کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی نادان ہی سے راہ حقیقت کا سراغ مل جاتا ہے ، جیسا کہ کسی نے کہا ہے : **قطعه**

گاه باشد ز پیر دانش مند   بر نیاید درست تدبیری
گاه باشد که کودکی نادان   به غلط بر هدف زند تیری

(کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بوڑھے دانا مرد سے کوئی اچھی تدبیر بن نہیں پڑتی اور کبھی ایک نادان بچہ غلطی سے صحیح نشانے پر تیر پھینکتا ہے ۔)

یہ بھی نہ ہو کہ بہت سے لوگوں سے مشورہ کرے ، کہ معاملہ فہمی اور عقل درست تو خدا کی دین ہے ، جو نہ تو مطالعے سے حاصل ہوتی ہے اور نہ عمر گزارنے ہی پر ہاتھ لگتی ہے ؛ کہیں ایسا نہ ہو

کہ کچھ نا سمجھ لوگ کسی معاملے میں مخالفت کریں اور اس معاملے میں وہ مخالفت تیرے لیے پریشانی کا باعث ہو ، اور یہ لوگ تجھے تیری اپنی اور دوسرے درست کار لوگوں ، کہ ہمیشہ کم ہوتے ہیں ، کی دانائی کے مطابق کام کرنے سے روک دیں ۔

جو کام ملازموں خادموں سے ہو سکتا ہو آسے اپنے بیٹوں سے نہ کرائے اور جس کام کو بیٹے سرانجام دے سکیں ، آسے خود ہاتھ نہ لگائے ، اس لیے کہ اگر کوئی کام دوسروں سے خراب ہو جائے تو تو خود آسے سنبھال سکے گا ، اور جو کام تجھ سے بگڑ جائے گا اس کا کسی دوسرے سے سنبھلنا معلوم ۔

خطاؤں سے چشم پوشی اور عذر قبول کرنے کو اپنی عادت بنا لے ، کیوں کہ انسان غلطی کا پتلا ہے ۔ کبھی تو وہ ڈانٹ ڈپٹ سے اور بھی ڈھیٹ اور نڈر ہو جاتا ہے اور کبھی زیادہ ہی شرم سار ہو کر اپنے متعلقہ کاموں سے ہاتھ آٹھا لیتا ہے ۔ بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں جنھیں ان کی پہلی ہی خطا پر سزا دینی چاہیے اور کچھ ایسے ہیں کہ جن کی ہزاروں تقصیروں سے بھی درگزر کرنی پڑتی ہے۔ الغرض معاملات عوام کے بندوبست کا کام سلطنت کے نہایت نازک آمور میں سے ہے ، لہٰذا اس کام کو نہایت بردباری سے اور سوچ سمجھ کر انجام دے ۔

گزرگاہوں کی حفاظت دلیر اور خدا ترس لوگوں کے سپرد کرے اور ان گزرگاہوں کے تمام احوال و کوائف ان سے معلوم کرتا رہے اور ہمیشہ با خبر رہے کہ بادشاہی اور سرداری ، پاسبانی سے عبارت ہے ۔ خلق خدا کے مذہب سے تعرض نہ کرے ، اس لیے کہ دانا آدمی اس فانی و آنی دنیا کے کام میں اپنا نقصان گوارا نہیں کرتا تو دین کے معاملے میں ، کہ پایندہ و باقی ہے ، کیوں کر جان بوجھ کر اپنا خسارہ چاہے گا ۔ سو اگر وہ حق پر ہے تو گویا تو اس سے متعرض ہو کر خود حق سے جھگڑنے اور مخالفت کرنے پر تیار ہے ، اور اگر تو حق پر ہے اور وہ اپنی نادانی کے سبب اس کے خلاف ہے تو پھر وہ

بے چارہ خود نادانی کا مریض ہے ؛ ایسی حالت میں تو اس پر مہر بانی کرنی چاہیے نہ کہ اس سے الجھا جائے یا انکار کیا جائے ۔ ہر فرقے کے نیک اور خیر اندیش لوگوں کو دوست رکھے۔ کھانے اور سونے جاگنے میں کثرت و زیادتی سے اجتناب برتے اور جو ضروری مقدار ہے اس سے تجاوز کو جائز نہ سمجھے تاکہ حیوانات کے درجے سے بلند تر ہو کر انسانیت کے رتبے پر پہنچے ۔

جہاں تک ممکن ہو رات کا کام دن پر نہ چھوڑے ۔ لوگوں کا جانی دشمن نہ ہو ۔ اپنے سینے کو کینے کی آماج گہ نہ بنائے اور اگر کبھی تقاضاے بشری کے تحت کسی سے کچھ رنجش ہو بھی جائے تو اسے جلد دور کر دے ، اس لیے کہ در اصل فاعل حقیقی اس خداے بزرگ و برتر ہی کی ذات ہے اور کارکنان قضا و قدر نے ان خرخشوں[3] کو اس دنیا کے انتظام و انصرام کے لیے تجویز کیا ہے ۔

ہنسی اور مسخرگی سے اجتناب کرے اور ہمیشہ جاسوسوں سے خبردار رہے ۔ ایک جاسوس کی بات پر اعتبار نہ کرے ، کہ سچ بولنے اور حرص و آز سے بچنے والے لوگ کم ہی دستیاب ہوتے ہیں ۔ بنا بریں بہت سے مخبر اور جاسوس مقرر کرے اور اس طرح کہ ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہو ۔ ہر ایک کی اطلاع کو جدا جدا تحریر کرائے اور اس سے پھر سراغ نکالے ۔ جن مخبروں سے لوگ واقف ہو گئے ہوں ، انھیں برطرف کر کے نظروں سے گرا دے ۔ بدذاتوں اور فسادیوں کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دے ۔ اگرچہ ایسے لوگ دوسرے بدکاروں کی خبر لینے کے لیے بڑے کام کے ہوتے ہیں ، لیکن اصول کو ہاتھ سے نہ جانے دے اور ان لوگوں کو ہمیشہ اپنے دل میں خطا کار سمجھے ، اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ دوستی کے لباس میں نیک لوگوں کے قتل اور اخراج کا ارادہ کریں ۔

اپنے عزیزوں ، رشتہ داروں اور خدمت گاروں سے محتاط رہے تاکہ یہ لوگ اس قربت سے فائدہ اٹھا کر ظلم و ستم پر نہ اتریں ۔ چکنی چپڑی باتیں کرنے والے نااہل لوگوں سے ، جو دوست نما دشمن ہیں ، خبردار

رہے کہ فتنہ و فساد اکثر انھی لوگوں کے سبب پیدا ہوتا ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کو تو کام کی زیادتی کے سبب فرصت نہیں ہوتی اور یہ بدکار لوگ بے شمار ہیں۔

اپنے گرد و پیش سے خبردار رہے۔ کلام کو مختصر کر کے جو باتیں قابل بیان ہوں وہی گذارش کرے۔ عوام میں عقل پھیلانے اور کمال حاصل کرنے میں کوشاں رہے تاکہ خلائق میں سے جوہر قابل ضائع نہ ہوں۔ قدیم گھرانوں کی پرورش کرنے میں جد و جہد کرے۔ سپاہیوں کے اسلحے اور سامان جنگ سے غافل نہ رہے۔ خرچ، آمدنی سے کم کرے کہ درستی آمور اسی پر موقوف ہے۔ داناؤں کا قول ہے کہ جس نے آمدنی سے زیادہ خرچ کیا وہ احمق ہے، اور جس نے خرچ اور آمدنی کو برابر رکھا، اسے نہ تو عقل مند کہا جائے گا اور نہ بے وقوف۔ اپنے مستقر پر مستقل قیام نہ رکھے بلکہ بلائے جانے کے لیے آمادہ اور خدمت میں حاضر ہونے کے لیے منتظر رہے۔ وعدہ خلافی کو نزدیک نہ آنے دے اور ہر کسی سے راست‌گوئی سے پیش آئے، خصوصاً سلطنت کے پیش کاروں اور نائبوں وغیرہ سے۔

ہمیشہ بندوق چلانے اور تیر اندازی کی مشق کرتا اور سپاہیوں کو پریڈ کراتا رہے۔ شکار کا بے پناہ شوقین نہ ہو؛ ہاں! سپاہ گری کی مشق اور تفریح طبع کی غرض سے، کہ اس دنیا کا لازمہ ہے، کبھی کبھار کھیل لیا کرے۔ گراں فروخت کرنے کے ارادے سے ایک دم سارا غلہ رعیت سے لے کر ذخیرہ نہ کرے۔ سورج، کہ دنیا کو نور بخشنے والا ہے، طلوع ہونے کے وقت اور آدھی رات کو، کہ حقیقت میں طلوع ہونے کا وقت وہی ہے، نقارچی نقارہ بجایا کریں، اور جب سورج ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہو تو بندوقچی اور توپچی توپیں وغیرہ سر کریں، تاکہ خدا کی تمام مخلوق اس سے آگاہ ہو کر اللہ تعالیٰ کا شکر بجا لائیں۔

اپنی جانب سے ایک شخص کو ہماری بارگاہ میں مقرر کر دے تاکہ وہ اس کی عرضیوں وغیرہ کو ما بدولت کے ملاحظے میں لاتا رہے۔ اور

اگر شہر میں کوتوال نہ ہو تو اس کے قانون کی دفعات کو پوری طرح ملحوظ رکھ کر ان کے رواج دینے میں کوشاں ہو۔ اور گنواروں کی طرح اپنے دل میں یہ خیال نہ آنے دے کہ کوتوال کے کام کو میں کیوں کر نبھاؤں ، کہ میرے لیے کسر شان ہے ، بلکہ اسے ایک بہت بڑی عبادت جانتے ہوئے سرانجام دے۔ اس تفصیل کے مطابق پہلے تو یہ چاہیے کہ ہر شہر ، ہر قصبے اور ہر گاؤں کا کوتوال محرروں کی مدد سے وہاں کے گھروں اور عمارتوں کی فہرست تیار کرے۔ پھر ہر محلے کے ہر گھر کے افراد کے بارے میں معلومات مہیا کرے کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔ اور پھر ایک گھر والے کو دوسرے گھر والے کا ضامن بنا کر انہیں آپس میں وابستہ کر دے۔ پھر محلے بنائے اور ہر محلے میں ایک چودھری مقرر کرے تاکہ وہاں کا ہر اچھا برا کام اس کے صلاح مشورے سے انجام پذیر ہو۔ اور یہ مقرر کر دے کہ جب کبھی کسی کے گھر کوئی چور در آئے یا آگ لگ جائے یا اسی طرح کا کوئی اور ناخوش‌گوار واقعہ رونما ہو تو اس کا پڑوسی فوراً اس کی مدد کو دوڑے۔ اسی طرح محلے کے سربراہ اور چوکیدار مدد کریں۔ اور اگر کسی معقول عذر کے بغیر مدد کو نہ پہنچیں تو وہ مجرم ٹھہریں۔ کوئی شخص بھی اپنے ہمسائے ، میر محلہ اور چوکیدار کو اطلاع دیے بغیر سفر اختیار نہ کرے ، اور نہ کسی کو محلے میں اترنے کی اجازت دے۔ جن لوگوں کے ضامن نہ ہوں انہیں علیحدہ سرائے میں آباد کرے۔ سرائے میں بھی چودھری اور چوکیدار متعین کرے۔

ہمیشہ اپنی فراست سے ہر کسی کی آمدنی اور خرچ کی حالت کا جائزہ لے کر جانچ پڑتال کرے ، اس لیے کہ جس کسی کی آمدنی کم اور خرچ زیادہ ہے ، وہاں ضرور دال میں کالا ہے۔ اس سلسلے میں اچھی طرح چھان بین کرے اور نیک ذاتی و خیراندیشی کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ اور اس چھان بین کو انتظام کا وسیلہ سمجھے نہ کہ لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ۔ اور چاہیے کہ ہر قسم کے دلالوں کو ضامن لے کر انہیں بازاروں منڈیوں میں متعین کرے تاکہ جو کچھ بھی خرید و فروخت ہو وہ اس سے آگاہ کرتے اور گاہک اور بیچنے والے

دونوں کا نام روزنامچے میں لکھتے رہیں ۔ اور جس قسم کی بھی خرید و فروخت بازار میں کی جائے وہ محلے کے چودھری اور 'خبردار محلہ ، کے صلاح مشورے سے ہو ۔

ہر محلے ، ہر کوچے اور شہر کے اطراف میں تھوڑے تھوڑے آدمی مقرر کرے جو رات کو ان جگہوں میں پہرہ دیں ۔ اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ محلے ، کوچے اور بازار میں کوئی غیر شخص نہ رہنے پائے ۔ چوروں ، جیب کتروں اور اچکوں وغیرہ کے بارے میں پوری پوری تحقیق و تفتیش کرے اور ان کا نام و نشان باقی نہ چھوڑے ۔ اگر کوئی سامان گم ہو جائے یا لٹ جائے تو اس مال کو مع چور کے برآمد کرے ورنہ پھر جس طرح بھی ممکن ہو اس سے عہدہ برآ ہو ۔ جہاں تک کسی گم شدہ یا کسی مردے کے مال کا تعلق ہے اس کے بارے میں تحقیق کرے کہ اگر کوئی وارث ہو تو اس کو دے دے ورنہ امانت دار کے سپرد کر دے اور اس کی تفصیل ہماری بارگاہ کو لکھ دے ، تاکہ جس وقت اس کا کوئی حق دار پیدا ہو وہ مال اسے دے دیا جائے ۔ اس معاملے میں بھی خیر اندیشی اور نیک ذاتی کو بروئے کار لائے ، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی صورت حال یہاں بھی پیش ہو ، جیسی کہ ملک روم میں ہے[۳] ۔ اس بات کی بھی پوری کوشش کرے کہ شراب کا نام و نشان باقی نہ رہے ۔ اور جو لوگ شراب پیتے ، بیچتے اور تیار کرتے ہیں انھیں وہاں کے حاکم کے صلاح مشورے سے ایسی سزا دے کہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں ۔ اور اگر کوئی شخص از روئے حکمت و دانشمندی دوا کے طور پر استعمال کرے تو اس سے تعرض نہ کرے ۔

اس امر کی کوشش کرے کہ چیزوں کے بھاؤ سستے ہوں اور مال داروں کو اس بات کا موقع نہ دے کہ وہ ذخیرہ اندوزی کریں اور وقت آنے پر اسے مہنگے داموں بیچیں ۔

جشن نوروز اور عیدین منانے کا بندوبست کرے ۔ اسی طرح مندرجہ ذیل تاریخوں پر آنے والی عیدوں اور عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کو دستور و قاعدہ کے مطابق منایا جائے :

(۱) بڑی عید ، عید نو روز ہے ۔ اس کی ابتدا خورشید عالم تاب کے برج حمل میں داخل ہونے کے وقت ہے ۔ یہی ماہ فروردین (مارچ - اپریل) کا آغاز ہے ۔

(۲) ایک عید اسی مذکورہ مہینے کی انیسویں تاریخ کو ، کہ شرف آفتاب[۵] کا دن ہے ۔

(۳) ایک عید اردی بہشت (اپریل - مئی) کی تیسری تاریخ کو۔

(۴) ایک عید خرداد (مئی - جون) کی چھٹی تاریخ کو ۔

(۵) ایک عید تیر (جون - جولائی) کی تیرہ تاریخ کو ۔

(۶) ایک عید مرداد (جولائی - اگست) کی ساتویں کو ۔

(۷) ایک عید شہریور (اگست - ستمبر) کی چوتھی تاریخ کو ۔

(۸) ایک عید مہر (ستمبر - اکتوبر) کی سولہ کو ۔

(۹) ایک عید آبان (اکتوبر - نومبر) کی دسویں کو ۔

(۱۰) ایک عید آذر (نومبر - دسمبر) کی نویں کو ۔

(۱۱) دے (دسمبر - جنوری) کے مہینے میں تین عیدیں ہیں : آٹھویں ، پندرھویں اور تیئیسویں کو ؛

(۱۲) ایک عید بہمن (جنوری - فروری) کی دوسری تاریخ کو ۔

(۱۳) ایک عید اسفندیار[۶] (فروری ، مارچ) کی پانچویں کو ۔

شب نوروز اور شب شرف کے موقعوں پر شب برات کی طرح چراغاں کیا جائے ۔ اس رات کے پہلے حصے میں کہ جس کی صبح کو عید ہو ، نقارے بجائے جائیں ۔ اسی طرح عید کے دن ہر شہر کے دروازے پر نقارے بجنے چاہئیں ۔

عورتیں کسی ضرورت کے بغیر گھوڑے کی سواری نہ کریں ۔ مردوں کے نہانے اور پانی لینے کے لیے دریا پر جدا گھاٹ بنائے اور عورتوں کے لیے جدا راستہ مقرر کرے ۔

(انشائے ابوالفضل از صفحہ ۶۷ تا ۷۵)

(۲)

طور طریقوں کی خوبیوں اور اطوار کی بزرگیوں کا نفیس تحفہ ، کہ جس سے اس عظیم حکومت کی تعمیر ، احتیاط اور حصول وابستہ ہے ، پانچ چیزوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی چیز ہوشیاری ہے ، یعنی چھوٹے اور بڑے ، شریف اور کمینے ہر قسم کے لوگوں سے پوری طرح آگاہ ہونا اور ہمیشہ قابل اعتماد ثقہ لوگوں کی وساطت سے ، یا چند ایسے لوگوں کے ذریعے جو ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے نہ ہوں مملکت ، شہر ، قریہ اور درون خانہ وغیرہ سے پوری طرح مطلع ہونا ۔ خبروں کی صحت اور نا درستی کو اپنی دور اندیش عقل سے پرکھنا ۔ دوسری چیز تحمل و بردباری اور اپنے سے نچلے درجے کے لوگوں کی خطاؤں اور لغزشوں سے چشم پوشی کرنا ہے ۔ اور اگر چشم پوشی نہ ہو سکے تو اس لغزش کو خطا کار کی عقل کی کمی پر محمول کرتے ہوئے سزا دینے میں حد سے آگے نہ نکل جائے اور عفو و درگذر کو اپنی دیگر ضروریات میں سے جانے ۔

تیسری چیز مظلوموں کی فریاد کو پہنچنا اور ظالم کو سزا دینے میں اس کے صاحب حیثیت ہونے یا اس کی قرابت و رشتہ داری کو مدنظر نہ رکھنا ہے ۔ چوتھی چیز جواں مردی ہے ، کہ دنیا کو دشمنی کی نظروں سے دیکھ کر اس کی ذلت و خواری کو دنیا والوں کے ذہن نشین کرانا ، لوگوں کے سوال اور التماس کیے بغیر ان کی حاجتوں اور ضرورتوں کو سمجھ کر ان کے مقاصد کو پورا کرنا ، کسی بھی حال میں خلق اللہ کے معاملات میں طمع اور لالچ نہ رکھنا ، اور شان و شوکت اور مال و دولت کی کثرت کو کسی طرح بھی کمال نہ جاننا ۔ پانچویں چیز انصاف کی راہ پر چلنا ، تعصب سے دوری اختیار کرنا ؛ یعنی جو لوگ اس کے دین و مذہب کے پیروکار نہ ہوں انھیں دشمنی و حقارت سے نہ دیکھے ، اور اگر ہو سکے تو نرمی و آشتی سے ان کے دلوں میں گھر کرے ، یا استدعا و التماس سے ان کے مقاصد کے بارے میں آگاہی حاصل کرے اور کسی بھی حال میں مذہبی و قومی اختلاف کو بغض و کینہ کا سبب نہ بنائے ، اور ان کی دولت و جاگیر کو بے سبب 'دخل اندازی' اور ظلم و ستم کے ہاتھوں سے محفوظ رکھے ۔ (انشاے ابوالفضل صفحہ ۱۱۷ - ۱۱۸)

(۳)

روش کار یہ ہوگی کہ آپ سخاوت اور داد و دہش میں کوشش کریں ، اس لیے کہ تدبیر و سیاست اور حرمت و نیک نامی انھی چیزوں سے مربوط و وابستہ ہے ۔ ہر وقت اور ہر موقع پر بردباری اور ہوشیاری سے کام لیں ۔ آپ کی محفل کا موضوع گفتگو زیادہ تر ظفر نامہ[۷] ، شاہنامہ[۸] اور چنگیز نامہ ایسی کتب ہونی چاہئیں ۔ جہاں تک اخلاق ناصری[۹] مکتوبات شیخ شرف الدین یحیٰی منیری[۱۰] ، خاقانی[۱۱] اور حدیقۂ سنائی[۱۲] ایسی کتابوں کا تعلق ہے ، تو یہ تجرد پیشہ لوگوں کا موضوع ہیں ۔ اور یہ جو ہم ، اس دنیاوی جھنجٹوں اور الجھنوں میں گرفتار لوگ ، ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بھی گویا ہمارے نفس امارہ کی مکاری و فریب کاری ہے ، کہ وہ ہمارے راستے میں تاریکیوں کا گڑھا تو نہ کھود سکا لیکن نورانی کنواں بنا ڈالا کہ ہم خود بخود اس میں گر جائیں ۔

تنہائی میں خدائے لم یزل کے حضور میں زاری کرنے اور گڑگڑانے کو اپنا ہر روز کا فرض واجبی جانیں ۔ حد سے زیادہ عیش و نشاط کو ہمیشہ کے لیے حرام سمجھتے ہوئے خلق خدا کے دلوں کو اپنے قبضے میں لیں اور تا بہ مقدور دل جوئی اور دل دہی کریں ۔ ترکوں کی ہنگامہ آرائی اور تاجیکوں کے دل کی نگہداشت کو اپنا وطیرہ بنائیں ۔ ہمیشہ یہ طریقہ اختیار کریں کہ دعوت عام فراوانی سے ہو اور اس میں کھانوں کی خصوصیت کو مقدار پر ترجیح دی جائے ۔ اور زیادہ خلوت نشینی سے احتراز کیا جائے تاکہ اس طرح کی زندگی اورنشست و برخاست سے بڑے بڑے کام بخوبی انجام پذیر اور باعث خیر و برکت ہوں ۔

(انشاے ابوالفضل از صفحہ ۱۵۳ تا ۱۵۴)

شیخ علاء الدولہ سمنانی کی داستان

حضرت شیخ علاء الدولہ سمنانی کہ بہت بڑے ولی اللہ ہیں ، اپنی جوانی کے ایام میں وزیر رہ چکے ہیں ۔ جب آن پر جذبۂ الٰہی طاری ہوا تو انھوں نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی اور چالیس سال تک خدا کی عبادت و ریاضت میں ، کہ شاید ہی کسی انسان کی طاقت

ایسی ریاضت کی متحمل ہو سکتی ہو ، مشغول رہے ۔ آخری رات خواب میں دیکھا کہ میدان حشر گرم ہے اور خلق خدا کے اعمال کی جانچ پڑتال ہو رہی ہے ۔ اسی دوران میں ایک دم یہ حکم سنائی دیا کہ ''علاء الدولہ کے تمام نیک اور صالح اعمال اور اس کی چالیس سالہ ریاضت و عبادت کو ایک پلڑے میں اور وہ جو اس نے اپنی وزارت کے دوران میں ایک بڑھیا کی دل جوئی و دل دہی کی تھی ، اسے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے'' نتیجے کے طور پر مؤخر الذکر پلڑا جھک گیا ۔ جب شیخ اس عبرت آموز خواب سے بیدار ہوئے تو انہیں بے حد افسوس اور ملال ہوا کہ ''اگر میں اس کی قدر پہلے جانتا ہوتا تو کبھی درویشی کی طرف مائل نہ ہوتا اور نہ کبھی ملازمت ہی ترک کرتا ۔''

(انشاے ابوالفضل ، صفحہ ۳۲۰ تا ۳۲۱)

بادشاهی کے متعلق ابوالفضل کا نظریہ

اس خداے یکتا و بے ہمتا کے نزدیک بادشاہی سے بڑھ کر کوئی اور شے بلند درجہ و عالی مرتبہ نہیں ہے اور تمام دانا و کار آگہ اس کے دبدبہ و اقبال کے گھاٹ سے سیراب ہوتے ہیں ۔ جو لوگ ہمارے اس قول کی تصدیق کے لیے دلیل کے طالب ہیں ، انہیں خاموش کرنے کے لیے صرف یہ دو دلیلیں ہی کافی ہیں کہ (۱) بادشاہ بے حد و شمار انسانوں کی سرکشی کو دباتا اور (۲) اہل جہان کو اپنا مطیع و منقاد بناتا ہے ۔ اس کے علاوہ خود لفظ 'پادشاہ' اس کی بہت بڑی دلیل ہے؛ کیوں کہ 'پاد' کے معنی 'پایندگی' (ہمیشگی) اور 'دارندگی' (Possession) کے ہیں، اور 'شاہ' بہ معنی 'اصل' اور 'آقا' (Origin & Lord) کے ۔ اس لیے بادشاہ 'اصل' اور 'پایندگی و دارندگی' کا مالک و آقا ہے ۔ اگر فرماں روائی کا خوف اور ڈر نہ ہو تو طرح طرح کی شورشیں کیوں کر دب جائیں اور خود آرائی و خود غرضی کس طرح مٹے ۔ لوگ باگ غصے اور حرص کے بوجھ تلے دب کر عدم آباد کی راہ لیں ، دین کے بازار کی رونق اٹھ جائے اور تھوڑی ہی مدت میں یہ اچھی بھلی آباد دنیا ویرانے میں تبدیل ہو جائے ۔ یہ بادشاہ ہی کے انصاف کے فروغ کے سبب ہے کہ کچھ لوگ تو خندہ پیشانی اور شگفتہ روئی سے راہ اطاعت اختیار کرتے ہیں اور کچھ لوگ سزا کے ڈر سے

ظلم و ستم سے ہاتھ اٹھا کر مجبوراً صحیح طرز و روش کو اپناتے ہیں[۱۴] ۔ نیز ''شاہ'' اسے کہتے ہیں جو اپنے ہم عصروں یا ہم جولیوں سے بہتر ہو ، جیسے شاہ سوار ، شاہراہ وغیرہ ۔ اور لفظ 'دولہا' پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے ، کہ دنیا کو سجانے والی دلہن اس (شاہ) سے بیاہ رچاتی اور یہ حسین بانو اس کی باندی ہے[۱۵] ۔

نادان کوتاہ نظر لوگ ایک حقیقی حاکم اور ایک خود غرض و حریص حاکم میں امتیاز نہیں کر سکتے ۔ ہاں ! انہیں پہچانیں بھی تو کیوں کر کہ دونوں کو خزانۂ معمور ، لشکر بے شمار ، شائستہ و تہذیب یافتہ خدمت گزار، لوگوں کی اطاعت و فرماں برداری اس پر مستزاد، دانش مندوں کی فراوانی ، ہنرمندوں کی کثرت اور عیش و نشاط کے بے پناہ سامان میسر و مہیا ہیں ۔ لیکن گہری نگاہ رکھنے والے راست بینوں پر یہ بات بہ خوبی روشن ہے کہ مذکورہ حکام میں سے اول الذکر کو تو دیر تک دوام ہے ، جب کہ مؤخرالذکر حاکم جلد زوال پذیر ہوتا ہے ۔ اول الذکر کو اس (سلطنت) سے کوئی دلی وابستگی نہیں ہوتی ، اور اس کی تمام خواہش و آرزو محض ظلم و ستم کو مٹانا اور اپنی تمام قابلیتوں کو بروئے کار لانا ہے ، جس کے نتیجے میں اس کی سلطنت میں امن و عافیت ، عدل و انصاف ، لطف و وفا اور حد سے زیادہ خلوص وغیرہ کا دور دورہ ہوتا ہے ۔ اور جو دوسرا حاکم ہے ، وہ ظاہری خود غرضی و خود پسندی اور خود آرائی ، لوگوں کو غلام بنانے کی خواہش اور تن آسانی کا شکار ہوتا ہے، جس کے سبب اس کی حکومت میں خوف ، ڈر، بے اطمینانی ، لڑائی جھگڑوں ، جور و ستم ، قانون کی خلاف ورزی اور چوری چکاری کی گرم بازاری ہوتی ہے ۔

بادشاہی اس رب یکتا و بے مثل کا ایک پرتو، آفتاب عالم تاب کی ایک کرن ، کمالات کے صحیفوں کی فہرست اور لیاقتوں کا مجموعہ ہے ۔ اسے موجودہ زبان میں 'فر ایزدی' اور زبان قدیم میں 'کیان خورہ' (خدائی شکوہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ۔ یہ بغیر کسی درمیانی وسیلے کے خدا کی طرف سے مقدس جسم میں پہنچائی جاتی ہے ، اور اس کے دیدار سے تمام لوگ اپنی جبین ستائش غلامی کی چوکھٹ پر رکھ دیتے ہیں اور اس سے ہزاروں عمدہ اوصاف ظاہر ہوتے ہیں ۔

بادشاہ کی لوگوں سے شفقت

ہر فرقے اور ہر مذہب کے لوگ اس کی عنایت و مہربانی سے سکون و اطمینان کی سانس لیتے ہیں ، اور مذاہب کی رنگا رنگی کے با وصف دوئی کی خاک اڑنے نہیں پاتی ۔ اور چوں کہ وہ زمانے کے مزاج سے پورے طور پر شناسا ہے ، اس لیے اس کے مطابق معاملات کو انجام دیتا ہے ۔

وسعت حوصلہ

نا ملایم امور کو دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی وہ کسی قسم کے طیش یا بے حوصلگی کا مظاہرہ نہیں کرتا اور نہ بیہودہ قسم کے ہنگامہ و شورش ہی سے دل گرفتہ ہوتا ہے ۔ وہ دلیری سے کام لیتا ہے اور اس کی خداداد جواں مردی سے کیفر و پاداش کا سررشتہ مضبوطی پکڑتا ہے ۔ نیز مجرم کی بلند مرتبگی اس کے راستے میں حائل نہیں ہوتی ۔ اس کی بخشش و سخاوت سے ہر کس و ناکس مستفیض ہوتا ہے ، اور خواہش و آرزو انتظار کے کوچۂ تنگ میں نہیں بیٹھتی ۔

روز افزوں توکل

وہ حقیقی کارساز اس خدائے بے ہمتا کو سمجھتا ہے[۱۶] اور اسباب کا تغیر و تبدل اس کی پریشان خاطری کا سبب نہیں بنتا ۔

حمد خداوندی

مقاصد کے حصول میں کامیابی اسے بے پروا و غفلت شعار نہیں بنا دیتی اور نہ ناکامی و سرگشتگی ہی اسے خدا کی یاد سے غافل کرتی ہے ۔ وہ خواہش و آرزو کی باگ عقل کے ہاتھ میں دیتا ہے ۔ خواہشات کے وسیع کوچے میں وہ خود کو بے آرامی و بے اطمینانی کا شکار نہیں ہونے دیتا ۔ نا شائستہ معاملات کی تلاش میں قیمتی وقت ضائع نہیں کرتا ۔ غصے کے حاکم کو عقل و دانائی کا فرمان پذیر بناتا ہے تا کہ اندھا غضب ، مہارت و دانائی پر غالب نہ آ جائے اور معاملے کا ہلکا پن[۱۷] مناسب حدود سے نہ بڑھ جائے ۔ وہ صلح و آشتی کے مقام

بند پر قیام کرتا ہے تاکہ گمراہ اور کج روش لوگ پھر سے راہ راست پر آ جائیں اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی برائیاں کسی پر بھی نہ کھلنے پائیں - وہ انصاف کرتے وقت یوں ظاہر کرتا ہے کہ جیسے خود تو وہ فرمان پذیر[18] ہو اور طالب انصاف حکم دینے والا ہو - وہ آرزو مندوں کو انتظار کی راہیں نہیں دکھاتا اور پروردگار عالم کی فرمان پذیری میں خالق اللہ کی خوشی اور خوشنودی سمجھتا ہے - لوگوں کی بھلائی عقل کی مخالفت میں تلاش نہیں کرتا - وہ راست‌گو لوگوں کا متلاشی ہوتا ہے اور شیرین اثر رکھنے والی بہ ظاہر کڑوی باتوں سے طیش میں نہیں آتا - مراتب سخن اور گفتگو کرنے والے کے رتبے کا پاس کرتا ہے - اور محض اس بات پر ھی اکتفا نہیں کرتا کہ وہ خود کسی پر ظلم روا نہیں رکھتا ، بلکہ اس بات کا بھی دھیان رکھتا ہے کہ تمام مملکت میں کسی ایک فرد بشر کے ساتھ بھی معمولی سا ظلم یا نا انصافی نہ ہو -

وہ ھمیشہ زمانے کے جسم[19] کی صحت اور بیماری کے گوناگوں علاجوں کو نگاہ میں رکھتا ہے - جس طرح مزاج میں اعتدال عناصر[20] میں یکسانیت و برابری سے پیدا ہوتا ہے ، اسی طرح اھل زمانہ کی طبیعت مرتبوں میں برابری ہونے سے اعتدال کی طرف مائل ہوتی ہے[21] ، اور اس یک دلی و یک جہتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی کثرت گویا ایک جسم کی صورت اختیار کر جاتی ہے -

(آئین اکبری ، صفحہ ۲ تا ۳)

قاضی اور میر عدل کا آئین

انصاف دھی اور فریاد رسی اگرچہ فرماں روایان والا شان کا کام ہے، لیکن صرف ایک شخص کی ہمت و طاقت تمام نظم و نسق کو چلانے سے قاصر رہتی ہے ، اس لیے یہ لازم ہے کہ وہ (بادشاہ) کسی ایک 'سیر چشم آگاہ دل' کو اس کام[22] پر مامور کرے - یہ نمائندہ صرف گواہ اور قسم پر ھی اکتفا نہ کرے بلکہ چھان بین سے بھی کام لے ، اس لیے کہ پرسش کرنے والا واقعات سے نابلد ہوتا ہے اور وہ دونوں (مدعی

اور مدعا علیه) بہ‌خوبی آگاہ ہوتے ہیں ، لہٰذا پوری پوری تفتیش اور صحیح دانش و بصیرت کے بغیر کسی معاملے کی تہہ تک پہنچنا نہایت دشوار ہوجاتا ہے ۔ انسان کی بد ذاتی اور اس کے بے حد طامع و حریص ہونے کے سبب گواہوں اور ان کی قسموں پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ۔ سیرچشمی ، مزاج شناسی اور غیرجانب داری سے مظلوم اور ظالم میں تمیز کرے ۔ اور اپنی تفتیش اور اخذ کردہ نتائج کو دلیری اور حقیقت پسندی کے ساتھ عملی جامہ پہنائے ۔ سب سے پہلے وہ پوری پوری جرح کرے اور معاملے کی کیفیت و نوعیت سے آگاہ ہو ۔ پھر ہر قضیے میں جو کچھ مناسب ہو اسے سامنے لائے ، اور گواہوں سے بھی جدا جدا پوچھ کچھ کر کے ان کے بیانات قلم بند کرے ۔ جب عقل و دانش ، آہستگی اور ژرف نگاہی سے معاملے کو انجام تک پہنچا دے تو کچھ عرصے تک کسی دوسرے کام میں مصروف ہو جائے اور دوسروں سے اسے پوشیدہ رکھے ۔ پھر دوسری مرتبہ اسی کام کو ہاتھ میں لے اور نئے سر سے تفتیش اور پوچھ کچھ کرے اور اس طرح بیانات میں تبدیلی اور یکسانیت سے معاملے کی تہہ تک پہنچے ۔ اور اگر وہ استعداد اور دلیری سے عاری ہو تو دو آدمیوں کو مقرر کرے ، جن میں سے ایک یعنی قاضی تو تحقیق و تفتیش کا کام کرے اور دوسرا ، جسے میر عدل کہتے ہیں ، اُس کے فیصلوں پر عمل در آمد کرائے ۔

آئین کوتوال

اس مرتبے کے لائق وہ شخص ہے جو دلیر، تجربہ کار ، چابک دست زیرک ، متحمل مزاج ، دشوار فہم اور نیک خیال ہو ۔ اس کی بیداری اور راتوں کی روند (شب گردی) سے دوسرے لوگوں کو سکون و اطمینان کی نیند میسر ہو ، اور جرائم پیشہ لوگ پوشیدگی کے گڑھے میں گم ہوجائیں ۔ تمام آباد گھروں اور گزرگاہوں کا ایک رجسٹر تیار کرے[۲۳] ۔ ہر ایک شخص سے ایک دوسرے کی مدد کرنے کا (امداد باہمی) پیمان لے اور ایسا سلسلہ کرے کہ لوگ ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں برابر کے شریک ہوں ۔

ہر جگہ چند گھروں پر مشتمل ایک محلہ بنائے اور کسی ایک فرشتہ خو کسو اس محلے کا چودھری بنا دے ، جس سے وہ آنے جانے والوں اور جو کچھ ہر روز وقوع پذیر ہو اُس کا روزنامچہ ، جس پر اُس (چودھری) کی اپنی مہر ثبت ہو، لیا کرے ۔ کسی گم نام اور غیر معروف شخص کو جس سے دوسرے لوگ شناسا نہ ہوں ، جاسوسی پر مقرر کرے اور ہمیشہ ایسے لوگوں کی کارگزاریوں کو تحریر میں لا کر پوری پوری چھان بین سے کام لے ۔

ایک سرائے سب سے الگ بنائے جس میں اجنبی مسافروں کے قیام کا انتظام ہو اور چند دیکھنے والوں[۳۴] کی سند و گواہی سے ان کی جانچ پڑتال کرا لیا کرے ۔ لوگوں کی طرح طرح کی آمدنی اور خرچ کے بارے میں دقت نظر سے کام لے اور نیک نیتی و خیر خواہی سے کام لیتے ہوئے کاوش[۳۵] کو نظم و نسق کا زیور بنائے ۔ ہر پیشے کے لوگوں میں سے کسی ایک کو اُن کا سرگروہ اور ایک کو دلال بنائے تاکہ جو بھی خرید و فروخت ہو وہ ان دونوں کی آگاہی کے ساتھ وقوع پذیر ہو ۔ اور ان دو آدمیوں (سر گروہ اور دلال) سے بھی روزنامچہ تیار کروائے ۔

کوچوں کو کھلا اور کشادہ رکھنے کی کوشش کرے اور ان کے شروع میں جنگلے نصب کروائے ۔ آلودگی سے محترز رہے ۔ جب رات بھیگ جائے تو لوگوں کو گھومنے پھرنے سے منع کرے ۔ بے کاروں کو کسی نہ کسی ہنر کی تربیت دلائے ۔ سابقہ ظلم و ستم کے دھبوں کو دور کرے ۔ کسی بھی شخص کو اس بات کی جرأت نہ ہونے دے کہ وہ دوسروں کے مکان میں زبردستی داخل ہو ۔ چوروں اور مسروقہ مال کو پیدا کرے ورنہ اس نقصان کا ذمہ دار بنے ۔ اس امر کی ہدایت کرے کہ سوائے اسلحہ ، ھاتھی، گھوڑا ، گائے ، اونٹ ، بھیڑ ، بکری اور گھر کے اسباب کے کسی اور چیز کا محصول یا ٹیکس وغیرہ نہ لیا جائے ۔ ہر صوبے میں کسی درآمد پر معمولی سا کسٹم (Custom) ، وہ بھی صرف ایک ھی جگہ پر وصول کیا جائے

پرانے سکوں کو ٹکسال میں پہنچائے یا پھر ان کی غیر سکہ شدہ

قیمت پر انہیں خزانے کے حوالے کر دے ۔ شاہی زر و سیم کے نرخوں میں کسی قسم کا فرق روا نہ رکھے ۔ اور جو سکہ بھی گھسنے کے سبب وزن میں کم ہوگیا ہو اسے اس کمی کے اندازے کے مطابق خریدے ۔ نرخوں میں کمی کرتے وقت پوری پوری آگہی سے کام لے اور اس بات کی ہرگز اجازت نہ دے کہ لوگ بیرون شہر جا کر اشیا خریدیں۔ مال دار لوگ ضرورت سے زیادہ نہ خریدیں ۔ ترازو کے باٹوں کا معائنہ کرے اور سیر کا وزن تیس دام سے زیادہ یا کم نہ کرے ۔ گز کے مجوزہ ناپ[۲۶] میں کمی بیشی نہ آنے دے ۔

لوگوں کو شراب بنانے ، ناپنے ، خریدنے اور بیچنے سے باز رکھے۔ اُن کی گھریلو زندگی کی چھان بین سے احتراز کرے ۔ اگر کسی گم شدہ یا مرنے والے کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کے مال اسباب کی باقاعدہ فہرست بنا کر اس کی حفاظت کرے ۔ گھاٹوں اور کنوؤں کے راستے مردوں اور عورتوں کے لیے علیحدہ علیحدہ بنائے اور کنوؤں سے پانی کے ڈول نکالنے کے لیے کسی پرہیزگار شخص کو مقرر کرے ۔

عورتوں کو گھوڑے کی سواری سے روکے ۔ اس بات کی ہدایت کرے کہ گائے ، بھینس ، گھوڑا ، اور اونٹ نہ ذبح کیا جائے ۔ شخصی آزادی میں رکاوٹ[۲۷] اور بردہ فروشی کو جائز نہ رکھے ۔ اس امر کی اجازت نہ دے کہ کسی عورت کو زبردستی ستی ہونے پر مجبور کریں ۔ موت کی سزا کے قابل مجرم کو پھانسی پر نہ لٹکایا جائے ۔ بارہ سال سے کم عمر کے بچے کے ختنوں کی اجازت نہ دے ؛ ہاں اس سے زیادہ عمر والوں کو اس کی اجازت دے دے ۔

ملنگوں ، قلندروں اور اسی قسم کے دوسرے ریا کار مذہبی دکان داروں کو شہر بدر کرے یا انہیں اس طرز و روش سے باز رہنے کی تنبیہ کرے ۔ اس کے ساتھ ہی اسے (کوتوال) یہ بھی دھیان رکھنا چاہیے کہ اس سلسلے میں کسی گوشہ نشین خدا پرست کی دل آزاری نہ ہو اور طلب حق کے جنگل میں ننگے پاؤں پھرنے والوں کو کوئی گزند نہ پہنچے ۔ قصابوں ، شکاریوں و مردوں کو غسل دینے والوں اور

بھنگیوں کو عام لوگوں سے علیحدہ رہنے وغیرہ کی جگہ دے اور لوگوں کو ان سیہ باطن سنگ دلوں کے ساتھ میل جول بڑھانے سے دور رکھے ۔ اور جو کوئی جلاد سے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہو اس کے ہاتھوں کو تکلیف پہنچائے[۲۸] ۔

قبرستان شہر سے باہر مغرب کی جانب مقرر کرے ۔ مرنے والے کے عقیدت مندوں وغیرہ کو سوگ واری میں ماتمی لباس پہننے سے روکے بلکہ کوشش کرے کہ وہ سرخ لباس پہنیں ۔

فروردین کے مہینے سے لے کر آبان کے تقریباً سارے مہینے تک ، ان دنوں جب کہ سورج ایک برج سے دوسرے برج کا سفر کرتا ہے ، یعنی ہر شمسی مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو ، الٰہی تقریبات اور چاند اور سورج گرہن کے موقعوں پر اور ہفتے کے پہلے دن لوگوں کو جانور ذبح کرنے سے باز رکھے ، لیکن شکاری جانوروں کی خوراک اور بیماروں کی ضرورت کے لیے مذکورہ مواقع پر ذبیحے کو جائز قرار دے ۔ پھانسی دینے کی جگہ بیرون شہر مقرر کرے ۔ دین الٰہی[۲۹] کے جشن منانے کا اہتمام کرے ۔ نوروز کی رات کو منڈیروں پر چراغ جلائے ۔ عید سے پہلی رات کے آغاز میں اور عید کے دن ہر گھڑی کے بعد بڑے زور سے نقارہ بجانے کا بندوبست کرے ۔ فارسی اور ہندی کی جنتریوں میں 'تاریخ الٰہی' کو رواج دے ۔ نیز ہندی ناموں او اصطلاحات کی فہرست کے مطابق مہینے کا آغاز 'شکل پچھ' میں رکھے ۔

آئین تعلیم

ہر ملک ، خاص طور پر اس معمورہ سرزمین میں طالب علم کو کئی سال تک مدرسے میں رکھا جاتا ہے جہاں اسے نقطہ دار حروف کے مفردات کی تعلیم کئی طرح کے اعراب (زیر زبر وغیرہ) کے ساتھ دی جاتی ہے اور طلبا کی زندگی کا بیش قیمت وقت انھیں بہت سی کتابیں پڑھنے پر مجبور کرنے سے ضائع ہو جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں عالم پناہ کا یہ فرمان ہے کہ ہر طالب علم سب سے پہلے حروف ابجد لکھنا اور حروف کی مختلف شکلوں کو شناخت کرنا سیکھے ۔ اسے م

حرف کی شکل اور نام یاد کرنا چاہیے ۔ اس کے لیے اسے صرف دو دن دیے جائیں ۔ اس کے بعد وہ ملے ہوئے حروف لکھنا شروع کرے۔ ایک ہفتے تک جب اسے اس میں مہارت حاصل ہو جائے تو قدرے نظم و نثر سے واقفیت کرائی جائے اور کچھ اشعار خدا کی حمد میں اور کچھ پند و نصیحت کے فقرے جدا جدا لکھ کر یاد کرائے جائیں ۔ کوشش یہ کی جائے کہ طالب علم ہر ایک چیز کی پہچان خود کرے اور استاد اس سلسلے میں اسے بہت کم بتائے ۔ پھر اسے کچھ عرصے تک روزانہ ایک مصرع یا شعر لکھنے کی مشق کرائی جائے۔ اس طرح طالب علم تھوڑی ہی مدت میں بہت کچھ سیکھ لے گا ۔ استاد ہر روز ان پانچ چیزوں کا خاص طور پر دھیان رکھے (۱) حروف کی شناخت (۲) الفاظ کے معنی (۳) مصرع (۴) شعر اور (۵) پچھلا سبق[۳۰] ۔ اس طرح جو کچھ اس نے برسوں میں سیکھنا تھا اسے وہ مہینوں بلکہ دنوں میں سیکھ لے گا اور یہ امر لوگوں کے لیے باعث حیرت ہو گا ۔

مختلف علوم مثلاً اخلاق ، حساب ، سیاق (یہ بھی علم حساب ہی ہے) زراعت ، مساحت (پیمائش ، Mensuration) ، جیومیٹری ، نجوم ، رمل ، تدبیرمنزل ، سیاست مدن (پولیٹیکل سائنس) ، طب ، منطق ، طبیعیات ، ریاضی ، الٰہیات ، اور تاریخ وغیرہ بہ تدریج حاصل کرے ۔ ہندی علوم میں سے بیاکرن ، نیائے ، بیدانت اور پاتنجل پڑھے ۔ کسی کو بھی اس بات کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ ان چیزوں سے لاپروائی اختیار کرے جن کی اس دور میں ضرورت ہے ۔

اس فرمان کے سبب مکتبوں کو اور ہی رونق حاصل ہوئی اور مدرسوں نے خوب فروغ پایا ۔ (آئین اکبری ، صفحہ ۲۰۱ تا ۲۰۲)

شیخ مبارک

محضر علماء (۱۵۷۹ء)

[سلطان عادل کو مجتہدین سے زیادہ مرتبہ دینے کے متعلق یہ اہم دستاویز شیخ ابوالفضل کے والد شیخ مبارک[1] نے مرتب کی اور اکبر و ابوالفضل کے نظریۂ ملوکیت کی آئینہ دار ہے۔]

ان بنیادوں کو مضبوط کرنے اور ان حقائق کی تمہید سے مقصود یہ ہے کہ ہندوستان کی 'صفت ایجادات رکھنے والی' سرزمین عالم پناہ کے عدل و انصاف اور تدبیر و انتظام کے سبب امن و آشتی کا مرکز اور عدل و احسان کا دائرہ بن چکی ہے، جس کے سبب خواص و عوام، بالخصوص علمائے معرفت و سلوک اور باریک بین فضلا، کہ صحرائے نجات کے رہنما اور 'اوتوالعلم درجات[2]' کی طریقت کے مالک ہیں، عرب و عجم سے آ کر یہاں متوطن ہو گئے ہیں۔ چنانچہ فقہ، کتاب و سنت اور قرآن و حدیث کے جامع اور علوم معقول و منقول کو احاطہ کرنے والے بڑے بڑے علما نے، جو دین و دیانت اور بلند کرداری کے اوصاف سے متصف ہیں، بڑے غور و خوض اور سوچ بچار کے بعد اس آیۂ کریمہ ''اطیعواللہ واطیعوالرسول و اولی الامر منکم[3]'' کے پیش نظر اور حدیث صحیح ''ان احب الناس الی اللہ یوم القیامۃ...... الخ[4]'' کی روشنی میں اور دیگر عقلی و نقلی شہادتوں اور دلیلوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ حکم لگایا ہے کہ عادل و منصف سلطان کا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک مجتہد کے مرتبے سے بڑھ کر ہے۔ اور حضرت شہنشاہ اسلام، رعایا کے لیے پناہ گاہ، امیرالمومنین، جہانوں پر خدا کا سایہ،

ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر شاہ[۵] بادشاہ غازی (خدا ان کے ملک وسلطنت کو رہتی دنیا تک قائم رکھے !) بہت زیادہ عادل ، عالم اور اللہ کو سمجھنے والے ہیں - للہذا اگر دین کے ان مسئلوں میں ، جو مجتہدین کے درمیان متنازعہ فیہ ہیں ، وہ اپنے ذہن صائب اور فکر روشن سے اختلاف کے ایک پہلو کو ، بنی نوع انسان کے آرام و آسایش اور ملکی نظم و نسق کی بہتری کی خاطر ، اختیار کر کے اس کے حق میں فیصلہ دے دیں تو وہ مسائل متفق علیہ ہو جائیں گے ، اور ان کی پیروی رعایا کے ہر فرد بشر پر واجب و لازم ہو گی - اسی طرح اگر وہ اپنی درست رائے سے کوئی ایسا حکم جاری کریں جو کسی آیت کریمہ کے خلاف نہ جاتا اور رعایا کی آسودگی کا باعث ہو ، تو اس پر عمل کرنا ہر کس و ناکس پر لازم ٹھہرے گا ، اور اس کی مخالفت دینی اور دنیوی گھاٹے اور آخروی رنج و ناخوشی کا موجب ہو گی -

صدق و خلوص سے بھرپور یہ سطور حسبۃً للہ[۶] اور حقوق اسلام کے اجرا کے اظہار کے لیے علمائے دین اور ہدایت دینے والے فقیہوں کے محضر میں لکھی گئیں - یہ محضر ماہ رجب ۹۸۷ھ میں وقوع پذیر ہوا - (منتخب التواریخ)

ملا عبدالقادر بدایونی

[ملا عبدالقادر بدایونی (۱۵۴۰–۱۵۹۷ع) اپنے وقت کے بڑے فاضل آدمی تھے ۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ منتخب التواریخ ھے جس میں اکبر سے قبل کے سلاطین ھند سے لے کر خود اکبر کے کوائف درج ھیں ۔ ملا صاحب علما کے گروہ سے تھے اور اکبر کے مذھبی رجحانات کو پسند نہیں کرتے تھے ، اس لیے ان کی کتاب ایک چالاک وکیل استغاثہ کا بیان ھے ، غیر جانب دار منصف کا فیصلہ نہیں ھے ۔ واقعات کی قطع و برید سے قطع نظر بدایونی کی کتاب کی تیسری جلد شعرا و ادبا و علما کے حالات کا نہایت عمدہ ذخیرہ ھے]

شیخ عبدالنبی صدر الصدور

شیخ احمد بن شیخ عبدالقدوس[1] گنگوھی کے بیٹے ھیں ۔ چند ایک مرتبہ مکۂ معظمہ اور مدینہ طیبہ گئے اور وھاں علم حدیث حاصل کیا ۔ جب وھاں سے واپس لوٹے تو اپنے آبا و اجداد کی طرح سماع و موسیقی کے منکر تھے اور محدثین کی سی طرز و روش اختیار کر رکھی تھی ۔ طہارت و پاک بازی اور تقویٰ کے علاوہ عبادت ظاھری میں مصروف رھتے تھے ۔ جب عہدۂ صدارت پر فائز ھوئے تو لوگوں کو بے حساب اراضی مدد معاش کے لیے دی اور بہت سے وظیفے اور اوقاف بھی قائم کیے ۔ ان کی سی داد و دھش والا اور مقتدر صدر کسی بادشاہ کے زمانے میں نہیں ھوا اور جو وظائف و اوقاف انھوں نے قائم کیے اس کا عشر عشیر بھی کسی صدر نے نہ کیا ھو گا ۔ کچھ عرصہ تو بادشاہ (اکبر) ان کا اتنا معتقد رھا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کیا کرتا تھا ،

لیکن بعد میں مخدوم الملک[۲] اور دیگر بد باطن حیلہ گر علما کی مخالفت کے سبب ، کہ جن کے بارے میں کسی نے کہا ہے :

جاھلانند ہمہ جاہ طلب   خویش را علما کردہ لقب[۳]

یہ اعتقاد عتاب میں بدل گیا ۔ ان کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جن دنوں اکبر بانس والا کے سفر سے واپسی پر فتح پور میں قیام پزیر تھا ، تو متھرا کے قاضی ، قاضی عبدالرحیم نے ان (عبدالنبی) کے پاس شکایت کی کہ ''اپنا ارادہ ایک مسجد بنوانے کا تھا ، لیکن یہاں کے ایک سرکش مال دار برھمن نے اس زیر تعمیر مسجد کا سامان تعمیر اٹھوا کر بت خانے کی عمارت پر صرف کر دیا ہے ۔ جب ہم نے اس پر اعتراض کیا اور رکاوٹ ڈالنا چاہی تو اس کم بخت نے (اس کے منہ میں خاک!) حاضرین کے سامنے (جو اس واقعے کے گواہ ہیں) حضور نبی اکرم صلعم کی شان مبارک میں گستاخی کی اور مسلمانوں کی بری طرح تذلیل و توہین کی ۔'' جب شیخ نے اس برھمن کو طلب کیا تو وہ حاضر نہ ہوا ۔ اس پر بیربل اور شیخ ابوالفضل کو بھیجا گیا ؛ وہ اس برھمن کو دربار میں لائے ۔ شیخ ابوالفضل نے جو کچھ لوگوں کی زبانی سنا تھا وہ بے کم و کاست کہہ سنایا اور کہا کہ اس امر کی تحقیق ہو چکی ہے کہ اس نے گستاخی کی تھی ۔ چناں چہ علما میں سے بعض نے تو اسے گردن زدنی ٹھہرایا اور بعض اس کی تشہیر اور جرمانے کے قائل تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علما دو گروہوں میں بٹ گئے اور اس سلسلے میں ان میں بہت بحث مباحثہ ہوا ۔ شیخ عبدالنبی نے بڑی کوشش کی کہ بادشاہ سے اس کے قتل کا حکم حاصل کریں لیکن بادشاہ نے کھلم کھلا یہ حکم دینے سے گریز کیا ۔ اور اشارتاً کنایتاً یہ کہا کہ ''شرعی سزاؤں کا تعلق تم سے ہے ، ہم سے کیا پوچھتے ہو ۔''

اس بحث مباحثے کے سبب وہ برھمن ایک مدت تک قید میں پڑا رہا ۔ اسی دوران میں شاہی حرم کی بیگمات نے اس کی رہائی کے لیے سفارش کر دی ؛ لیکن بادشاہ کو شیخ کا بے حد لحاظ تھا ۔ آخر جب

قتل برہمن کے احکام حاصل کرنے کے لیے شیخ کا اصرار زیادہ ہی بڑھ گیا تو بادشاہ نے کہہ دیا کہ ''ہمیں جو کچھ کہنا تھا وہ پہلے ہی کہہ دیا گیا ہے، اب تم جو مناسب سمجھو کرو۔'' شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب بادشاہ کو اس صورت حال کا پتا چلا تو اُسے بہت طیش آیا۔ پھر ادھر تو اندرون حرم سے بیگمات نے اور اُدھر باہر سے تمام ہندو مقربین نے یہ آواز اُٹھائی کہ یہ ملا لوگ محض آپ کی مہربانی و عنایت کے سبب اتنے دلیر ہوگئے ہیں کہ اب انہیں آپ کی مرضی کا بھی لحاظ نہیں؛ اور آپ کے فرمان کے بغیر ہی فقط اپنا رعب و دبدبہ اور اختیار جتانے کی خاطر، لوگوں کو قتل کروا رہے ہیں۔ غرض ان لوگوں نے بادشاہ کے کان کچھ اس طرح بھرے کہ اب اس میں مزید قوت برداشت نہ رہی اور جو لاوا کچھ عرصے سے اندر ہی اندر پک رہا تھا وہ اب پھوٹ کر باہر بہہ نکلا۔ چناں چہ ایک شب انوپ تلاؤ کے حوض پر ایک محفل میں اکبر نے یہ معاملہ فتنہ پرداز مفتیوں کے سامنے رکھا اور اس سلسلے میں اُن کی رائے پوچھی۔ کسی نے کہا کہ جو گواہ بھگتائے گئے ہیں اُن پر اچھی طرح جرح کی جائے۔ کوئی کہنے لگا ''تعجب ہے کہ شیخ خود کو امام اعظم[٣] رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد کہتا ہے، حالانکہ امام اعظم کے مذہب کے مطابق جو کافر کسی اسلامی حکومت کے مطیع ہوں وہ اگر حضور اکرم صلعم کی شان میں کوئی گستاخی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد یا ذمہ سے انحراف کا موجب نہیں بن سکتی اور یہ مسئلہ حنفی فقہ کی کتب میں بہ تصریح مندرج ہے۔ حیرت ہے شیخ نے اپنے دادا سے کیوں کر اختلاف کیا۔'' اس پر بادشاہ نے یک بارگی دور سے راقم حروف (بدایونی) پر نظر ڈالی اور میری طرف متوجہ ہو کر مجھے نام سے پکارا اور اپنے قریب بلایا؛ میں آگے بڑھا تو بادشاہ نے پوچھا ''کیا تم نے بھی یہ سنا ہے کہ اگر ننانوے روایتیں کسی ملزم کے قتل پر متفق ہوں اور صرف ایک روایت اس کی رہائی کا سبب ٹھہرتی ہو تو مؤخرالذکر روایت کو ترجیح دی جاتی ہے؟''۔ میں نے عرض کیا کہ ''واقعی مسئلہ اسی طرح ہے جس طرح کہ حضور نے فرمایا، اور وہ یوں ہے

کہ 'ان الحدود و العقوبات تندری بالشبہات۵ -'' پھر میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا ۔ افسوس کے ساتھ پوچھنے لگے ''کیا شیخ عبدالنبی اس مسئلے سے آگاہ نہ تھا جو اس بے چارے برھمن کو مروا ڈالا ؛ آخر ایسا کیوں ھوا ؟'' عرض کی کہ ''شیخ خود عالم ھیں اور اس مسئلے سے بخوبی آگاہ ؛ اس روایت کو جانتے بوجھتے اگر انھوں نے حکم دیا ھے تو یہ ضرور کسی مصلحت کے تحت ھو گا ۔'' بادشاہ نے پوچھا ''ایسی کون سی مصلحت ھو سکتی ھے ؟'' میں نے جواب میں عرض کیا کہ ''فتنہ و فساد اور عوام کی دلیری و جرأت کی روک تھام ۔'' اس ضمن میں قاضی عیاض کی کتاب 'شفا' کی ایک روایت میری نظر سے گزری ھوئی تھی ، وہ بھی میں نے بیان کر دی ۔ اس پر حاضرین میں سے بعض بد باطنوں نے کہا کہ عیاض تو امام مالک٦ کے پیرو ھیں ، حنفی مملکت میں ان کی روایت سند نہیں مانی جا سکتی ۔ بادشاہ نے اس کے متعلق مجھ سے جواب پوچھا : میں نے کہا کہ ''اگرچہ وہ مالکی ھیں ، لیکن اگر کوئی محقق مفتی کسی سیاسی مصلحت کے تحت ان کے فتوے پر عمل پیرا ھو تو یہ شرعی طور پر جائز ھے ۔''

اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ھوئی ۔ اس دوران میں لوگوں نے دیکھا کہ بادشاہ کی مونچھوں کے بال شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ھو گئے ؛ ادھر لوگ مجھے پیچھے سے ٹھوکے دے رہے تھے کہ میں مزید بحث کو ختم کروں ؛ اچانک بادشاہ جھلا کر بولے ''یہ جو کچھ تم کہہ رہے ھو سب بیہودہ ھے ۔'' میں اسی وقت آداب بجا لا کر واپس جرگے میں چلا آیا ۔ اس دن سے میں نے ایسی جرأت کرنا اور بحث مباحثے میں حصہ لینا ترک کردیا اور گوشۂ تنہائی میں جا بیٹھا ۔ کبھی کبھار دور ھی سے تسلیم بجا لاتا تھا اور بس ۔ اس واقعے کے بعد شیخ عبدالنبی کو روز بہ روز زوال ھوتا گیا ؛ بادشاہ اور اس کے درمیان گویا ایک پردہ حائل اور ایک کھچاؤ پیدا ھو گیا ۔ دونوں ایک دوسرے سے دور دور رھنے لگے اور شیخ نے دربار میں جانا بالکل بند کر دیا ۔

انھی دنوں شیخ مبارک آگرہ سے کسی معاملے کی مبارک باد دینے

فتح پور آیا - بادشاہ نے اس کے سامنے بھی یہ سارا واقعہ دھرایا ؛ اس نے جواب میں یہ کہا کہ ''آپ تو خود اپنے دور کے امام اور مجتہد ہیں ؛ آپ کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ آپ شرعی یا ملکی احکام کے بارے میں ان لوگوں سے رجوع کریں جنہیں علم سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور جو فقط جھوٹی شہرت کے مالک ہیں -'' بادشاہ نے کہا ''اب تم ہمارے استاد ہو اور ہم تم سے درس لیا کریں گے - تم ہمیں کسی طرح ان ملاؤں سے چھٹکارا دلا دو -'' اس نے بھی اپنی پرانی رقابتوں اور دشمنیوں کا بدلہ لینے کے لیے موقع غنیمت جانا اور اپنے خبث باطن کے سبب کہنے لگا ''آپ اپنے مجتہد ہونے کا دعویٰ کر دیں اور اس ضمن میں ان لوگوں سے محضر لکھوا لیں -'' چناں چہ یہی وہ واقعہ ہے جس کی بنا پر اس نے یہ محضر تیار کیا کہ بادشاہ نہ صرف یہ کہ مجتہد ہے بلکہ دیگر مجتہدین سے بھی افضل ہے - پھر شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو عام لوگوں کی طرح زبردستی پکڑ کر ان ہاجیوں کی محفل میں لایا گیا اور کسی نے ان کی تعظیم تک نہ کی - وہ جوتیوں کے قریب ہی بیٹھ گئے اور ان سے زبردستی اور بہ جبر و اکراہ اس محضر پر دستخط کروا لیے گئے ، جیسا کہ ہم سنین متعلقہ کی ذیل میں بیان کر آئے ہیں - آخر دونوں علما کو سفر حجاز پر روانہ کر دیا گیا - شیخ نے ۹۹۱ھ میں داعی اجل کو لبیک کہی - (منتخب التواریخ)

مولانا عبداللہ سلطان پوری

ان کا تعلق انصاری قوم سے ہے - ان کے آباؤ اجداد سلطان پور میں آ کر آباد ہو گئے تھے - اپنے زمانے کے منفرد و یکتا عالم تھے ؛ خاص طور سے عربی زبان ، اصول فقہ ، علم تاریخ اور دیگر علوم نقلی میں مہارت ہونے کے سبب کئی ایک عمدہ تصانیف کے مالک ہیں - ان کی تصانیف میں سے یہ کتب 'عصمة الانبیا' اور 'شرح شمایل النبی' صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ شہرت کی حامل ہیں - جنت آشیانی' ہمایوں بادشاہ سے انہیں خطاب مخدوم الملک اور شیخ الاسلام کا عہدہ ملا تھا - شرع متین کے پھیلانے میں ہمیشہ سرگرمی سے

کوشاں رہے - کٹر سنی تھے ؛ ان کی سعی و کوشش سے بہت سے ملحد اور رافضی اپنے مقام مخصوص کو پہنچے[8] - کتاب 'روضۃ الاحباب' کے متعلق وہ بڑے اصرار سے کہا کرتے تھے کہ اس کا تیسرا باب امیر جمال الدین محمد کا نہیں ہے -

جس سال گجرات فتح ہوا ہے ، ان دنوں وہ فتح پور میں شاہی دیوان خانے کے وکیل تھے اور بڑے جاہ و جلال کی زندگی بسر کر رہے تھے - یہ عاجز (بدایونی) جب پنجاب کے سفر سے واپس لوٹا تو ایک روز شیخ ابوالفضل[9] ، کہ ہنوز دربار تک اس کی رسائی نہ ہوئی تھی ، اور حاجی سلطان تھانیسری[10] کی معیت میں ان سے ملاقات کرنے کے لیے گیا - مخدوم الملک اس وقت مذکورہ کتاب کا تیسرا باب کھولے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ ''دیکھو ولایت ایران کے عالمان دین نے مذہب میں کیا کیا خرابیاں پیدا کی ہیں -'' پھر وہ شعر دکھایا جو منقبت میں تھا :

همین بس بود حق نمائی او   که کردند شک در خدائی او

پھر بولے ''اس نے (تیسرے باب کا مصنف) تو رفض سے بھی کئی درجے آگے بڑھ کر یہ معاملہ حلول خداوندی تک پہنچا دیا ہے - میں نے بھی اب یہ طے کیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے آگ دکھاؤں -'' اگرچہ یہ عاجز ان دنوں گوشۂ گمنامی میں پڑا تھا اور ان سے میری یہ پہلی ملاقات تھی ، پھر بھی میں نے جرأت سے کام لیا اور کہا کہ ''یہ شعر تو اس بیت کا ترجمہ ہے جو امام شافعی[11] رحمۃ اللہ علیہ سے منسوب کیا جاتا ہے اور اس طرح ہے'' :

لو ان المرتضی ابدی محله   لصار الناس طرا سجدا له
کفی فی الفضل مولانا علی   وقوع الشک فیه انه الله[12]

اس پر انھوں نے مجھے گھور کر دیکھا اور پوچھا کہ یہ کہاں لکھا ہے ؟ میں نے جواب میں کہا ''دیوان امیر کی شرح میں -'' کہنے لگے ''دیوان کا شارح قاضی میر حسین تو مبتدع ہے ، اس کے

علاوہ آپ بھی لوگوں نے رافضی کہا ہے ۔'' میں نے کہا کہ ''یہ بات دوسری ہے ۔'' ادھر شیخ ابوالفضل اور حاجی سلطان ہر لمحے اپنے ہونٹوں پر ھاتھ رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے تھے ؛ میں نے پھر کہا کہ ''میں نے بعض مستند راویوں سے یہ سنا ہے کہ یہ تیسرا باب میر جمال الدین کا نہیں بلکہ ان کے بیٹے میرک شاہ یا کسی اور شخص کا نوشتہ ہے ۔ یہی سبب ہے کہ یہ تحریر پہلے دو ابواب کی تحریر سے مختلف ہے اور اس میں محدثانہ روش کی بجائے شاعرانہ طرز اختیار کیا گیا ہے ۔'' جواب میں بولے'' اے بابا! میں نے تو دوسرے باب میں بھی ایسی چیزیں دیکھی ھیں جو بہ‌صراحت بدعت اور عقیدۂ فاسد پر دلالت کرتی ھیں ، میں نے ایسے مقامات پر حواشی بھی لکھے ھیں ۔ چناں چہ ایک جگہ مصنف لکھتا ہے کہ جب طلحہ‌رض[۱۳] نے سب سے پہلے حضرت علی‌رض کی بیعت کی تو آپ نے فرمایا ''ید شلاء و بیعۃ شلاء[۱۴]'' ۔ ذرا غور تو کرو کہ جو ھاتھ غزوۂ احد[۱۵] کے موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پناہ بنا اور جسے گیارہ زخم آئے تھے ، آپ حضرت علی برا شگون سمجھیں ، کہ جو شرعاً ممنوع ھے ۔ میرے نزدیک ایسا ھرگز نہیں ھو سکتا ؛ یہ ناممکنات میں سے ہے ۔'' میں نے کہا کہ ''شگون اور فال میں تو بہت فرق ہے ۔'' اب پھر ابوالفضل چپکے سے میرا ھاتھ بہ زور دبا کر مجھے بولنے سے روک رہا تھا ؛ اتنے میں مخدوم الملک نے ان دونوں سے پوچھا کہ ''ان صاحب کی تعریف کیا ہے ؟'' دونوں نے میرے بارے میں کچھ بتایا اور اس طرح ھماری یہ ملاقات بہ خیروخوبی گزر گئی ۔ جب ھم باھر آئے تو دوستوں نے کہا کہ آج سمجھو خیر ھوئی جو انھوں نے تمھاری باتوں پر اعتراض نہ کیا ورنہ ان سے چھٹکارا دلانے والا کوئی نہ تھا ۔

مخدوم الملک نے جب شروع شروع میں ابوالفضل کو دیکھا تو وہ اپنے شاگردوں سے کہا کرتے تھے کہ ''یہ شخص دین میں بہت زیادہ خلل کا باعث ھو گا'' ؛

چو به طفلیش بدیدم بنمودم اهل دین را
که شود بلائے جاں‌ها به شما سپردم این را

(جب میں نے اسے اس کے بچپن ہی میں دیکھا تھا تو اسے اهل دین کو دکھا کر کہا تھا کہ یہ بلائے جان ہوگا ، اسے میں تمھارے سپرد کرتا ہوں۔)

مخدوم الملک ۹۹۰ھ میں مکہ معظمہ سے واپسی کے بعد بہ مقام گجرات عالم بقا کو سدھارے ؛ قطعۂ ذیل سے آن کی تاریخ وفات نکلتی ہے :

رفت مخدوم ملک و با خود برد رحمة اللہ نشان پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش گفت بشمار مصرع ثانی

چند ناخلف لڑکے ان کی یادگار ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ۔ اس سلسلے میں تمام بزرگ اپنی اولاد سے نالاں ہیں ، کیوں کہ اس زمانے کی آب و ہوا اور ماحول ہی کچھ ایسا ہو گیا ہے کہ وہ ان کی اس سے اچھی تربیت و پرورش نہیں کر سکتا ، بلکہ یوں کہیے کہ انھیں اچھے طور پر جنم نہیں دیتا :

خوبی اندر جہاں نمی بینم گوئیا روزگار عنین شد

(مجھے جہاں میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی ؛ گویا زمانہ نامرد ہوگیا ہے) ۔

اس کی مثال تو وہی ہوئی کہ کسی کٹڑ سنی بادشاہ نے رافضیوں کے گڑھ سبزوار پر لشکر کشی کی ؛ وہاں کے سردار اور رئیس اس کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ''ہم تو مسلمان ہیں ، ہم سے کون سی ایسی خطا سرزد ہوئی جو آپ نے ہم پر چڑھائی کی ؟'' وہ بولا ''تمھارے حد سے زیادہ رافضی ہونے کے سبب ۔'' کہنے لگے ''یہ تو ہم پر محض تہمت ہے ۔'' بادشاہ نے جواب میں کہا ''اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر اپنے قول کی سچائی میں اپنے شہر سے کوئی شخص ابوبکر نامی تو پیدا کر دکھاؤ ، تاکہ میں تمھارے قتل اور لوٹ مار سے

دست بردار ہو جاؤں ۔'' بہت ہی کوشش و جستجو کے بعد ایک مفلوک الحال اور گم‌نام سے شخص کو بادشاہ کے سامنے لائے کہ یہ شخص اسی نام سے موسوم ہے جس کا آپ نے ذکر کیا تھا ۔'' بادشاہ نے جب اس شخص کو پھٹے پرانے کپڑوں اور اس ہیئت کذائی میں دیکھا تو ان لوگوں سے پوچھا ''کیا تم اس سے بہتر کسی دوسرے آدمی کو لا کر نہیں دکھا سکتے تھے؟'' جواب دیا ''بادشاہ سلامت! تکلف برطرف، سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابوبکر پیدا نہیں کر سکتی ۔''مولانائے[۱۶] روم قدس اللہ نے بھی اپنی مثنوی میں اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے :

سبزوارست این جهان بی مدار
چون ابوبکریم در وی خوار و زار

(منتخب التواریخ)

ملک الشعرا فیضی

مختلف علوم و فنون مثلاً شعر، معمّا گوئی، عروض، قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشا میں اپنا ثانی نہ رکھتا تھا ۔ شروع شروع میں اس نے 'مشہور' تخلص کیا لیکن آخر میں جب اس کے چھوٹے بھائی ابوالفضل کو علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے فیاضی تخلص رکھ لیا ۔ شومیِ قسمت کہ یہ تخلص اسے راس نہ آیا اور اس کے کوئی دو ایک ماہ بعد ہی عالم فنا سے ہزاروں حسرتوں کے ساتھ عالم بقا کو سدھارا ۔

جدت پسند تھا اور کینہ، کبر و نخوت، ہزل گوئی، نفاق، خباثت، ریا کاری، حب جاہ اور رعونت کا مادہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا ۔ مسلمانوں سے تو اسے خدا واسطے کا بیر تھا ۔ اصول دین کی تذلیل کرتا اور صحابۂ کرام، تابعین[۱۷]، متقدمین، متاخرین، بزرگان دین اور زندہ یا مرحوم مشائخ کی توہین و تحقیر میں پیش پیش تھا ۔

اس کے علاوہ تمام علما، صلحا اور فضلا کے بارے میں دن رات، کیا کھلم کھلا اور کیا پوشیدہ، اہانت آمیز کلمات استعمال کرتا ۔

نزاری[18] اور صباحی[19] تو ایک طرف ، اس سے تو کم بخت یہودی ، عیسائی ، ہندو اور مجوسی ہی ہزار درجہ بہتر تھے ۔

اس قدر بد باطن تھا کہ تمام حرام باتوں کو دین محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے برعکس حلال اور فرائض کو حرام جانتا تھا ۔ اور وہ جو اس نے بے نقط تفسیر[20] لکھی تو وہ بھی محض اپنی بدنامی کا دھبا ، کہ جسے اگر روز حشر تک سیکڑوں دریاؤں کے پانی سے بھی دھوتا رہے تو جب بھی نہ دھل سکے گا دھونے کے لیے تھی اور ستم تو یہ ہے کہ کم بخت نے یہ تفسیر بھی ناپاکی و مستی کی حالت میں لکھی اور اس طرح کہ اس کے کتے اس کتاب کو بری طرح لتاڑتے اور ناپاک کرتے رہتے تھے - آخر اپنی اس ہٹ دھرمی ، بے دینی ، کبر و نخوت اور ادبار کے ساتھ اور اس حالت میں اس دنیا سے گیا کہ خدا کسی دشمن کو بھی وہ حالت دکھائے نہ سنائے ۔

جب اس کا آخری وقت قریب تھا تو اکبر اس کی عیادت کے لیے گیا ۔ اس نے بادشاہ کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنا شروع کردیا ۔ اس واقعے کو بادشاہ نے خود کئی مرتبہ سر دربار بیان کیا ہے[21] ۔ مرتے وقت اس کے ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے اور چہرہ سوج گیا تھا ۔ چنانچہ بادشاہ نے ابوالفضل سے پوچھا کہ "اس کے ہونٹ اس قدر سیاہ کیوں پڑ گئے ہیں ، کہیں شیخ نے مسی تو نہیں ملی؟" اس نے جواب دیا کہ "ایسا نہیں ہے ؛ یہ در اصل خون کی قے کے سبب کچھ خون جم گیا تھا۔" بہرحال جو کچھ اس نے دین کی بے حرمتی اور حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی تھی ، اس کی آسے جتنی بھی سزا ملتی کم تھی - بہت سے شعرا نے اس کی وفات پر مذمت آمیز تاریخیں کہیں ، جن میں کی چند ایک یہ ہیں :

فیضئ بی دین چو مرد سال وفاتش فصیح
گفت "سگی از جہان رفتہ بحال قبیح"[22]

دیگر

سال تاریخ فیضئ مردار   شد مقرر "بچار مذہب نار"[23]

ایک شاعر نے ان الفاظ سے تاریخ نکلی :

فیضئی نحس دشمن نبوی رفت و باخویش داغ لعنت برد

سگکی بود و دوزخی زان شد سال فوتش چه 'سگ پرستی مرد'[٢٤]

اسی طرح کسی نے 'قاعدۂ الحاد شکست' کبھی تو کسی نے 'بود فیضی ملحدے۔'' اور ذرا یہ تاریخ بھی ملاحظہ ہو :

چون بنا چار رفت شد نا چار سال تاریخ ''خالد فی النار''[٢٥]

پورے چالیس سال تک اس نے شعر کہے لیکن سب پھسپھسے اور بے ربط۔ ہڈیوں کو ترتیب تو اس نے خوب دی لیکن سب گودے سے خالی۔ تمام اشعار پھیکے اور بے مزہ [٢٦]۔ ہاں جہاں تک مہملات بکنے، فخریہ شعر کہنے اور کفر بولنے کا تعلق ہے، اس میں اس نے خاصی شہرت حاصل کی۔اس کا کلام عشق حقیقی کے ذوق و معرفت اور سوز و گداز کی لذت سے خالی ہے اور قبول خاطر نصیب اعداء۔

اس بات کے باوجود کہ اس کے دیوان اور مثنوی کے اشعار کی تعداد بیس ہزار سے اوپر ہے، اس کا ایک شعر بھی آس کی اپنی افسردہ دلی کی مانند جوش و مستی کا حامل نہیں ہے [٢٧]۔ اور چوں کہ وہ کچھ زیادہ ھی مردود و مطرود (راندہ) رھا، اس لیے کسی نے بھی اس کا کوئی شعر خواھش سے یاد نہ کیا، جب کہ دوسرے ادنیٰ درجے کے شعرا کو یہ فخر حاصل رھا۔

شعری کہ بود ز نکتہ سادہ ماند ھمہ عمر بیک سوادہ

اور سب سے زیادہ لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس نے اپنی بے شمار دولت اپنے ان جھوٹے افکار و خیالات کی نشر و اشاعت پر خرچ کر ڈالی اور اشعار وغیرہ لکھوا لکھوا کر دور و نزدیک کے دوستوں یاروں کو بھیجتا رھا، لیکن پھر بھی کسی نے انھیں دوبارہ ھاتھ تک لگانا گوارا نہ کیا۔ (منتخب التواریخ)

فیضی

[اکبری وکیل ابوالفضل کا بڑا بھائی ملک الشعراء فیضی (۱۵۴۷ع ۱۵۹۵ع) شاعری کے علاوہ سلیس اور با محاورہ فارسی نثر بھی لکھتا تھا ۔ اس کے مکتوبات ''لطیفۂ فیاضی'' کے نام سے ملتے ھیں ۔ اکبری دور کی ادبی اور سیاسی زندگی پر ان مکتوبات سے بہت روشنی پڑتی ھے ۔ کتاب ھنوز غیر مطبوعہ ھے] ۔

فیضی کے خطوط مولانا عبدالحق محدث[1] کے نام

آپ ایسے دوست ربانی اور محبوب روحانی (اللہ آپ کی عمر دراز کرے!) کی ملاقات گرامی کا شوق کوئی رسمی و ظاھری بات نہیں ھے کہ اسے حیطۂ تحریر میں لایا جا سکے ۔ چوں کہ آغاز میں بندہ آپ کے فیض رساں دل کی خواھش سے مطلع نہ تھا ، اس لیے مجھے اس بات کا احتمال رھا کہ شاید آپ بھی ملنے کے خواھش مند ھوں گے ۔ لیکن بعد میں جب پتا چلا کہ آپ نے دوستی کی راہ ھی سرے سے بند کر رکھی ھے ، تو اس عاجز نے بھی آپ کی خواھش و مرضی کو اپنی خواھش پر ترجیح دی ۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ھو جائے!

بس التماس یہ ھے کہ اپنے خلوت کدے پر بیگانگی اور غیریت کو روا نہ رکھیں ۔ آج سے کوئی دو تین روز پہلے زبدۃالاصفیا میاں شیخ موسی[2] خاکسار کے غریب خانے پر تشریف لائے تھے ؛ ان کی زبانی معلوم ھوا کہ ممکن ھے آپ انھی دنوں یہاں تشریف لائیں ۔ اگرچہ ان سے آپ کی اس تشریف آوری کا سبب بہت پوچھا لیکن انھوں نے کچھ ابہام و اجمال ھی سے کام لیا اور پورے طور پر نہ بتایا ۔ آں وحدہ‌لاشریک

کی قسم کہ فقیر کی جانب سے اس سلسلے میں نہ تو کبھی کوئی اشارہ ہوا ہے اور نہ کبھی ان شاء اللہ ہوگا - اگر آپ تشریف لے آئیں تو سبحان‌اللہ ، یہ گویا ''نور علیٰ نور'' ہوگا ۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے اور اپنی یاد کے متعلق کوئی اظہار یا اشارہ کیا ہے نہ کروں گا ۔ اس لیے اس سلسلے میں آپ تکلیف نہ اٹھائیں ۔ لیکن اگر میرے بال و پر ہوتے تو میں ہر روز اڑ کر اس حجرے کی منڈیر پر جا بیٹھتا ، نکات محبت کا دانہ چگتا اور ترانۂ عشق کے شیریں نغمے الاپتا ۔ مزید کیا لکھوں ؛ آپ ہی کی جانب سے ساری تاخیر اور رکاوٹ ہے ۔ خدا کے لیے مجھ پر اپنے اسرار کے اس قافلے کی راہ نہ بند کریں ۔ اور اگر آپ کی طرف سے یہ سلسلہ بند بھی کیا گیا تو ان شاء اللہ اس جانب سے بند نہ ہو گا ۔ والسلام[۳]

دو دن ہوئے ایک موقع پر یہ رباعی کہی تھی :

فیضی دم پیری ست قدم دیده بنه
گام مژه می نهی پسندیده بنه

از عینک شیشه هیچ نگشاید هیچ
لختی بتراش از دل و بر دیده بنه

(فیضی دم پیری ہے ، قدم دیکھ کے رکھ ۔ مژہ کے قدم رکھ رہا ہے تو پسندیدہ رکھ ۔ شیشے کی عینک سے کچھ بھی نہ کھلے گا (نظر آئے گا) اپنے دل سے ٹکڑا تراش اور اسے آنکھوں پہ رکھ)

مسند فقر کے سکندر میاں بہلول[۴] کو میرا سلام پہنچے ۔

(۲)

ایک مدت کے بعد آپ کا گرامی نامہ چشم انتظار کی بصارت میں افزونی کا باعث ہوا ۔ امید ہے آپ محبت و اخوت کے یہ چشمے ہمیشہ جاری رکھیں گے ۔ اگر چہ ہم نے اپنی خواہش کو آپ کی 'خواہش' کے تابع رکھ کر ظاہری جدائی سے موافقت اور نباہ کیا ہے ، اور اس سے ہمیں اطمینان و سکون بھی میسر آیا ، لیکن یہ بات کہ ہم خط و کتابت

منقطع اور اس سلسلے میں آپ کی پیروی کر سکتے ہیں ، کچھ زیادہ ہی محنت طلب ہے ۔ اور یہ جو آپ بڑی بڑی مدت کے بعد ہمیں یاد فرماتے ہیں تو اس سے غالباً آپ کا مقصد ہمیں اس محنت و ریاضت کی تربیت دینا ہے :

مکن مکن کہ نکو محضران چنین نکنند

امید ہے آپ ظاہری طور پر تو اپنے وطن مالوف میں بال بچوں اور عزیزوں سمیت بخیر و خوبی ہوں گے اور روحانی طور پر اس وطن کو صحرائے عجیب سمجھ کر اس سے علیحدگی اور دوری کے طالب ہوں گے ۔ اس لیے کہ فرزند دل بند کی جگہ جب کوئی بلند مقصد سامنے ہو تو یہ تمام چیزیں سنگ راہ ہوتی ہیں ۔

مزید کیا لکھوں ، کیا تحریر کروں ؟ مثنوی 'نل و دمن'[۵] مکمل ہو گئی تھی ، آپ کی خدمت میں ارسال کر دی گئی ہے ۔ اب مثنوی 'مرکز ادوار[۶]' لکھنے میں مصروف ہوں :

آنکہ چنین جنبش پرکار کرد — نام ترا مرکز ادوار کرد
نقش ازل بین کہ بسطح بسیط — مرکز من دائرہ را شد محیط
جامے و صد میکدہ در جوش او — موجے و صد بحر در آغوش او

نل دمن... خالی نہیں ہے[۶(ا)]؟ ۔ آپ نے اس 'دولت مند' کے انتقال و ارتحال کا لکھا تھا ، پڑھ کر تقاضائے بشری کے طور پر اس فقیر کی عجیب حالت ہوئی ۔ آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ آپ کا عشق ہمیں اس دنیا میں لے گیا اور آپ کی باز نشینی کے متعلق کہ مروت سے دور تھی ، کہتا اور اظہار حیرت کرتا جاتا تھا ، جب کہ یہ بندہ عاجز عذر خواہی کرتا تھا ۔ افسوس ، صد افسوس! عاقبت بخیر ہو !

(۳)

محبت نامہ دل سرگشتہ کے لیے باعث مسرت و شادمانی ہوا ، اور دوستی و الفت کے دماغ میں محبت و یگانگت کی خوشبو پہنچی ، کیونکہ متقی لوگوں کی (کہ فضائل کسبی اور کمالات وہبی سے آراستہ ہیں) 'اخوت پناہ' خدمت کے ساتھ ظاہری اور باطنی ربط و تعلق کی نسبت بہت

بلند مقام پر واقع ہے ۔ آپ کے اس گرامی نامے سے آپ کے جوہر ذاتی اور طبعی پاکیزگی کے کمال کا راز کھلا ، اور اشعار کے اوراق سے بے حد لذت حاصل ہوئی ؛ واقعی پوری پوری مناسبت کے حامل تھے :

مسافران طریقت ز من جدا مشوید
کہ دور بینم و چشمم بمنزل افتاد است
چو ریگ بادیہ گم باد آنکہ قافلہ را
نشان منزل مقصود دور دور دہد

(طریقت کے مسافرو! مجھ سے جدا نہ ہو کہ میں دور بیں ہوں اور میری نظریں منزل پر پڑی ہیں ۔ وہ صحرا کی ریت کی مانند گم ہو جائے جو قافلے کو منزل مقصود کا نشان دور دور بتائے)

چمنِ حقیقت کے پرندوں سے ہم کلام و ہم صفیر ہونا لازم ہے ؛ خدا کرے کہ اس راہ کی گرد طالبوں کے چہرے کا قل بنی رہے!

آپ نے برادر گرامی کے احوال کے بارے میں پوچھا تھا ۔ و بہ خیر و خوبی ، خوش و خرم اور نواب مستطاب ، سپہ سالار ، امیرالامرا خان خاناں> کے حاشیہ نشینوں میں ہیں ؛ تعجب ہے کہ آپ کی محبت کا جذبہ انھیں اپنی طرف نہیں کھینچتا ۔ ہاں اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ خود وہاں پہنچیں اور ظاہری و باطنی نعمتوں سے مالا مال ہوں ۔ فقط اب اور کیا درد سر دوں ۔ (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

(۴)

فریاد کہ دوریم ز مطلوب دل خویش
چندان کہ دراز است زبان طلب ما

(فریاد کہ ہم اپنے دل کے مطلوب سے اتنے ہی دور ہیں جتنی کہ ہماری زبان طلب دراز ہے!)

شاید ہی کوئی موقع ایسا ہوگا کہ باد نسیم آپ کی جانب چلی ہو اور اس خاکسار نے اس کے ہم راہ اپنے جگر کے تراشے نہ بھیجے ہوں ۔ ذیل کا شعر جو حسب حال ہے ، اس ''سلطان احباب'' کی خدمت میں

بھی تحریر کرتا ہوں ۔ یہ شعر اُس غزل کا ہے جو میں نے جہاں پناہ کو ارسال کی تھی :

بہ بند تـازہ دو گلـدستہ از دل و جگرم
بـارمغانی بـہ بستانِ بـزم گاہ بـبـر

(میرے دل اور جگر سے دو گل دستے بنا اور انھیں بزم گاہ کے باغ میں تحفے کے طور پر لے جا) ۔

کیا لکھوں ، ایک مدت ہو گئی ہے ، آپ نے اپنے قلم کی سیاہی سے چشم دل کو نور نہیں بخشا ۔ دوستوں کے ساتھ تو آپ ایسا نہ کیا کریں ۔

اُمید ہے آپ مع الخیر ہوں گے ۔

(نوٹ : ہمارے خیال میں یہ خط مولانا عبدالحق کے نام نہیں ہے)

عرضداشت

[جن دنوں وہ (فیضی) مہم دکن پر گیا ہوا تھا ، تو اس عاجز (ملا عبدالقادر بدایونی) نے وادیٔ کشمیر سے اُسے دو خط لکھے تھے جن سے اُسے بادشاہ کے مجھ سے بے التفات ہونے اور مجھے کورنش سے محروم کرنے کا علم ہوا ۔ وہاں سے اُس نے جو عریضہ بادشاہ کو لکھا اس میں میری[۸] سفارش بھی کی ۔ بادشاہ نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ یہ خط اکبر نامہ[۹] میں بہ طور نمونہ شامل کیا جائے[۱۰]۔

یہ اس عریضے کی نقل ہے جو اس نے دسویں جمادی الاول ۱۰۰۰ھ کو احمد نگر سے لاہور بھیجا تھا ۔ (بدایونی)]

عالم پناہا ! انھی ایام میں بدایوں سے ملا عبدالقادر[۱۱] کے دو عزیز نہایت پریشان حالی میں اور روتے پیٹتے میرے پاس آئے اور انھوں نے بتایا کہ ”ملا عبدالقادر کچھ دن بیمار رہا تھا جس کے سبب وہ اپنے دربار میں حاضر ہونے کے وعدے کو پورا نہ کر سکا ۔ نتیجتاً شاہی آدمی اُسے زبردستی پکڑ کر لے گئے ہیں ؛ خدا معلوم اس کا کیا حشر ہو ۔

نیز یہ کہ اس کی بیماری کی طوالت کی خبر جہاں پناہ تک نہیں پہنچ سکی ۔''

شکستہ نوازا ! ملا عبدالقادر بڑا قابل شخص اور ان تمام علوم سے آراستہ ہے جو ہندوستان کے علما حاصل کرتے رہے ہیں ۔ اس نے میرے باپ سے کسب فضیلت کیا ہے اور میں تقریباً سینتیس سال سے اسے جانتا ہوں ۔ علمی فضیلت کے علاوہ شعر گوئی ، عربی و فارسی انشا کا سلیقہ رکھتا اور کچھ ہندی نجوم اور حساب سے بھی بخوبی آگاہ ہے ۔ ولایتی اور ہندی موسیقی اور چھوٹی بڑی شطرنج بھی جانتا ہے ۔ علاوہ ازیں بین کی بھی اس نے قدرے مشق کی ہے ۔ ان فضائل سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ بڑا قناعت پسند ، بے طمع ، راست پسند اور با ادب آدمی ہے ۔ بامرادی ، شکستگی ، شکستہ دلی اور پریشان حالی کا شکار ہے ؛ بیش‌تر رسوم تقلید کو ترک کر چکا ہے ؛ آزاد منش ، مخلص اور درگاہ والا کا عقیدت مند ہے ۔ جن دنوں کونپلمیر پر لشکر کشی کی گئی تھی ، اس نے محض جان نثاری کی خاطر خود درخواست کر کے محاذ پر جانا قبول کیا تھا ۔ وہاں وہ زخمی بھی ہو گیا تھا اور حضور کو اس کی اطلاع دے کر اس نے انعام حاصل کیا تھا ۔ اول اول جلال خاں قورچی اسے درگاہ والا میں لایا تھا اور اس نے عرض کیا تھا کہ ''حضور کے لیے ایک امام لایا ہوں ، جسے حضور بے حد پسند فرمائیں گے ۔'' اور میر فتح اللہ[۱۲] نے بھی اس کا کچھ احوال حضور سے بیان کیا تھا ۔ میرا بھائی بھی اس کے احوال سے آگاہ ہے ۔ لیکن جیسا کہ مشہور ہے :

جوی طالع ز خروار ہنر بہ

(نصیبے اور مقدر کا ایک جو ہنر کے کھلیان سے بہتر ہے)

چونکہ درگاہ والا راست پسندوں کی درگاہ ہے ، اس لیے اس وقت جب کہ بندے پر ضعف و بے طاقتی غلبہ کیے ہوئے ہے ، میں نے خود کو عالم پناہ کی بارگاہ میں موجود سمجھتے ہوئے اس کے احوال سے حضور کو آگاہ کیا[۱۳] ۔ اگر اس وقت میں اس کے بارے میں عرض نہ کرتا

تو یہ ایک قسم کی ناراستی اور نا مناسب بات ہوتی ۔ حق سبحانہ بندگانِ دربار کو حضور بادشاہ سلامت کے زیر 'سایۂ فلک پایہ' راستی ، حق گزاری اور حقیقت شناسی کی راہ پر ثابت قدم رکھے ! اور جہاں پناہ کو اپنی بارگاہ کے پاک بندوں اور صبح سویرے اٹھنے والے روشن دل عبادت گزاروں کی عزت کے طفیل ہزارہا دولت و اقبال اور عظمت و جلال کے ساتھ تمام دنیا اور اہل دنیا پر سایہ گستر ، غریب درور ، خطا پوش اور تا دیر سلامت رکھے ! آمین آمین !

(منتخب التواریخ)

اسد بیگ قزوینی

[اسد بیگ قزوینی (وفات ۱۰۴۱ھ) سترہ برس ابوالفضل کا ملازم رہا ۔ اس نے جہانگیر اور شاہ جہاں کا زمانہ بھی دیکھا ، اور اس مؤخرالذکر فرماں روا کے زمانے میں انتقال کیا ۔ یہ اقتباس اکبری دور میں ہندوستان میں تمباکو کے رواج کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس سے قبل اس کا ترجمہ ایلیٹ اور ڈاسن نے اپنی تاریخ میں کیا ہے اور یہیں سے سمتھ اور دوسرے مؤرخوں نے اسے نقل کیا ہے]

تمباکو کے بیان میں

چوں کہ خاک‌سار کو ہندوستان میں تمباکو دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا اور بیجاپور میں تمباکونوشی کا رواج شروع ہوچکا تھا ، اس لیے اس عاجز نے مکبرہ (منگلبیڑہ ؟) میں قیمتی جواہرات سے مرصع سونے کی ایک چلم بنوائی ، اس کے ساتھ اجین[1] کا بنا ہوا حقے کا نیچہ تھا جو تین گز لمبا ، نہایت ھی خوش رنگ اور مضبوط تھا ، اور اس کے دونوں سروں پر عمدہ میناکاری کی گئی تھی ۔ ادھر اتفاق سے یمن کا ایک بہت ھی خوش نما عقیق ھاتھ لگ گیا تھا ، اسے نیچے کے اس سرے پر جو منہ میں لیا جاتا ہے ، جڑ دیا گیا ۔ یہ بہت ھی بھلا اور بلبل کے سر کی مانند معلوم ھوتا تھا ۔ ان دنوں شمع کے لیے فتیلہ سوز کا بڑا رواج تھا ، للہذا سونے کا ایک فتیلہ سوز اور ایک نہایت ھی عمدہ ساخت کی طلائی ڈبیا ، کہ عادل خاں نے پانوں سے بھر کر اس عاجز کو دی تھی ، ایسے اعلیٰ قسم کے تمباکو سے بھری کہ جس کے ایک پتے کو آگ دکھاؤ تو دوسرے سب جل اٹھتے تھے ؛ ان تمام

اشیا کو چاندی کے ایک طشت میں بڑے سلیقے سے رکھا ۔ 'نیچے' کے لیے چاندی کا غلاف بنوایا تاکہ نڑی اس میں لپٹی رہے ، پھر اس کے اوپر نہایت عمدہ مخمل کا غلاف چڑھایا ۔

مختصر یہ کہ جب بادشاہ سلامت نے فقیر کے ان تحائف کو دیکھا تو بے حد خوش ہوئے ، بڑی تحسین و آفرین کی اور بار بار فرمایا ''تم نے اس تھوڑے سے وقت میں اتنی انوکھی اور لاثانی چیزیں کیوں کر اکٹھی کر لیں؟'' جب انھوں نے تمباکو کے خوان کو دیکھا تو بڑے متعجب ہوئے اور چلم کو ، کہ بڑی محنت اور خوب صورتی سے بنائی گئی تھی ، بار بار اٹھا کر دیکھا ۔ پھر تمباکو کی طرف اشارہ کر کے پوچھنے لگے کہ یہ کیا چیز ہے اور کس کام آتی ہے ؟ نواب خان اعظم نے عرض کیا کہ ''اسے تمباکو کہتے ہیں اور مکہ مدینہ میں اس کا بہت رواج ہے ۔ حکیم دوائے[۲] حضور کے لیے لایا تھا ۔'' بادشاہ سلامت نے کوئی توجہ نہ کی ؛ اس حقیر سے کہنے لگے کہ ذرا چلم تیار کر کے لاؤ ۔ جوں ہی حضور نے کش لگانا چاہا حکیم نے آگے بڑھ کر روک دیا اور کش نہ لگانے دیا ۔ لیکن جہاں پناہ نے ازراہ بندہ پروری فرمایا کہ ''ہم تو محض اسد کی خاطر ذرا سا کش لگائیں گے ۔'' یہ کہہ کر نڑی منہ میں لی اور دو تین کش لگائے ۔ اب حکیم نے مضطرب ہو کر حضور کو کش لگانے سے قطعاً روک دیا ۔ بادشاہ حضور نے نڑی منہ سے نکال کر خان اعظم کو پیش کی ؛ انھوں نے بھی حسب حکم چند کش لگائے ۔ اس کے بعد حکیم دوائے کو طلب کیا اور اس سے اس کی خاصیت پوچھی ؛ اس نے بتایا کہ ''حکمت کی کتابوں میں اس کا کہیں بھی ذکر نہیں ملتا ؛ یہ انھی دنوں کی دریافت ہے ۔ نڑی اجین سے درآمد کی گئی ہے اور فرنگی حکیموں نے اس کے بہت سے خواص کا ذکر کیا ہے ۔'' حکیم علی[۳] نے کہا ''درحقیقت یہ ایک غیر مجرب دوا ہے اور قدیم حکما نے اس کے متعلق کچھ بھی نہیں لکھا ؛ لہٰذا ہم جہاں پناہ کے لیے ایسی دوا کیوں کر تجویز کر سکتے ہیں کہ جس کی حقیقت سے ہم بالکل بے خبر ہیں ۔ بہتر تو یہی ہے کہ حضور اس سے اجتناب ہی برتیں ۔'' فقیر[۳] نے حکیم علی سے کہا کہ ''انگریز لوگ

ایسے نہیں ہیں کہ اس کے متعلق تحقیق اور غور نہ کریں ۔ ان میں ایسے ایسے دانا موجود ہیں جن سے کبھی کسی قسم کی غلطی اور نافہمی سرزد نہیں ہوتی ۔ سو جب تک ان فرنگیوں نے اسے آزمایا نہ ہوگا اور اس کی حقیقت و اصل سے پوری طرح آگاہی نہ حاصل کی ہوگی، کیوں کر یہ تجویز کیا ہوگا کہ ان کے بادشاہ، حکام، اصیل اور کمینے یعنی ہر قسم کے لوگ اس کا ارتکاب کریں ۔'' حکیم علی بولا ''ہمارے لیے کیا ضرور ہے کہ ہم فرنگیوں کی پیروی کریں اور جس چیز کا دانا لوگوں میں رواج نہیں اسے آزمائے بغیر کیوں کر دوسروں کی تقلید و پیروی میں اختیار کرلیں ؟'' اس عاجز نے جواب دیا ''یہ عجیب بات ہے کہ احوال دنیا تو ہر لمحے بدلتے رہتے ہیں اور حضرت آدم کے زمانے سے لے کر اس وقت تک تمام چیزیں اسی طرح آہستہ آہستہ دریافت ہوئی ہیں؛ تو جب کوئی نئی چیز کسی قوم میں رواج پائے اور پھر دنیا میں رفتہ رفتہ رائج ہو جائے اور تمام لوگ اس کی پیروی کرنے لگیں تو عاقلوں اور داناؤں پر واجب ہے کہ اس کے فوائد کو جانچیں اور تجربہ کریں، کیوں کہ ہوسکتا ہے وہ ان فوائد سے بہ‌خوبی آگاہ نہ ہوں ۔ اس سلسلے میں چوب چینی[5] کا نام مثال کے طور پر لیا جا سکتا ہے، جو زمانۂ قدیم میں موجود نہ تھی اور حال ہی میں دریافت ہوئی اور کئی ایک امراض کے لیے سودمند ہے ۔'' بادشاہ سلامت نے میرے اور حکیم کے درمیان جو یہ بحث مباحثہ سنا تو بڑے متعجب ہوئے اور بے حد مسرت و شادمانی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''تجھ پر خدا کی رحمت ہو!'' پھر خان اعظم سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے ''دیکھا تم نے ! اسد نے کس قدر معقول باتیں کی ہیں ۔ حقیقت میں کسی ایسی چیز کو جو دنیا میں رواج پذیر ہو، محض اس بات پر رد کردینا کہ ہماری کتب میں اس کا ذکر نہیں ہے، مناسب نہیں ہے ۔'' اس پر حکیم نے پھر مبالغے سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ''آں حضرت صلعم نے اس سے منع فرمایا ہے ۔'' آخر بادشاہ سلامت نے پادری کو طلب کیا ۔ اس نے بھی تمباکو کے بہت سے فوائد گنوا دیے، لیکن اس کے باوجود کوئی بھی حکیم کا سد مقابل نہ ہوسکا، اور سچ تو یہ ہے کہ وہ حکیم

بھی تو بڑے پایے کا حکیم تھا ۔

چوں کہ یہ عاجز اپنے ساتھ نڑیاں اور تمباکو بہت زیادہ لے گیا ہوا تھا، اس لیے اس میں سے کچھ تو چند ایک بزرگوں کو بھجوا دیا اور کچھ بعض احباب نے خود مانگ، کر لے لیا، حتیٰ کہ شاید ہی کوئی خدا کا بندہ ایسا رہ گیا ہو جس نے اس خاک سار سے تمباکو وغیرہ کی خواہش نہ کی ہو ۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ سوداگر تمباکو لاتے اور منہ مانگے دام پاتے اور یوں بہت سے علاقوں میں تمباکو نوشی کا رواج ہوگیا ، لیکن بادشاہ سلامت پھر کبھی اس کے نزدیک بھی نہ پھٹکے۔
(اکبر نامہ ، اسد بیگ)

خواجه محمد هاشم کشمی

[خواجه محمد هاشم کشمی کا حضرات نقشبندیہ مجددیہ کی تاریخ میں وہی مرتبہ ہے جو حسن[1] سجزی دہلوی کا 'فوائد الفواد' کی تالیف کے سلسلے میں ہے۔ ان کی 'زبدۃ المقامات' برصغیر میں نقشبندیہ سلسلے کے اکابر اولین (حضرت مجدد الف ثانی اور ان کے پیر حضرت خواجہ باقی باللہ) کی نہایت کام یاب سوانح عمری ہے۔ حضرت مجدد صاحب کے بعض مکتوب الیہ بھی یہی تھے۔ ذیل میں 'زبدۃ المقامات' میں سے حضرت باقی باللہ کا حال درج کیا جاتا ہے۔ آخری اقتباس حضرت مجدد الف ثانی کی کتاب 'مبدأ و معاد' کے بارے میں ہے۔ (اس کے اقتباسات ویسے تو بعد میں درج ہونے چاہئیں لیکن موضوع کی مناسبت سے یہاں درج کیے گئے ہیں۔)]

حضرت خواجہ باقی باللہ

(۱)

ہمارے حضرت خواجہ باقی باللہ کی یہ بڑی پسندیدہ روش تھی کہ آپ خلوت و گوشۂ گم نامی اختیار کیے رہتے اور احوال کو اخفا میں رکھتے۔ آپ میں حد سے زیادہ عجز و انکسار تھا، جس کے سبب آپ ہمیشہ اپنی ہی خطاؤں کو دیکھتے اور دوسروں کے بارے میں اچھی نیت رکھتے۔ آپ بہت کم باتیں کرتے، وہ بھی بہ قدر ضرورت، کسی زائر کا دل رکھنے یا کسی سائل کا جواب دینے کے لیے۔

البتہ جب کوئی بڑا دقیق مسئلہ آپ کے سامنے رکھا جاتا تو اس وقت آپ مجبوراً اس مسئلے کو پوری وضاحت سے بیان کرنے کے لیے، کہ جس سے مسئلہ پوچھنے والے کی پوری تشفی ہو جائے، کچھ باتیں فرماتے، اور وہ بھی بڑی شفقت و ہمدردی کے ساتھ تاکہ سننے والا کہیں غلط سمجھ کر غلط راہ نہ اختیار کر لے۔

حزن و غم میں مبتلا رہنے کے باوجود آپ ملاقاتیوں سے ہمیشہ خندہ پیشانی اور تازہ روئی سے پیش آتے۔ مسلمانوں کی جائز ضروریات کو پورا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ سادات اور علما کی بے حد تعظیم فرماتے۔ تمام جزوی و کلی معاملات میں پرہیزگار فقہا سے رجوع کرتے۔ جب کوئی رشد و ہدایت کا طالب آپ کے آستانے پر حاضر ہوتا تو آپ نہایت ہی انکسار اور عذر و معذرت کے ساتھ خود کو اس کار بزرگ کے قابل نہ سمجھتے۔ اگر وہ طالب، طالب صادق ہوتا اور آپ کے خوان بخشش سے بہرہ مند ہو جاتا تو آپ کے اس انکسار پر اور بھی آپ کے علو مرتبہ و عظمت کا قائل ہو جاتا، اور خود کو اس آستانے کے سپرد کر کے زبان حال سے پکار اٹھتا:

شعر مؤلف

ازین در نداریم روی گذر — اگر از دو عالم گذر کردہ ایم
بیان نمک ھای این می‌گسار — حوالہ بریش جگر کردہ ایم

(اگر ہم نے دونوں عالم سے گزر کیا ہے تو اب اس دروازے سے آگے نہ بڑھیں گے۔ اس مےخوار کے بیان کے نمک کو ہم نے اپنے زخم جگر پر چھڑکا ہے)

جب آپ اس طالب کا شوق طلب پوری طرح آزما لیتے تو اس وقت اسے اپنی آغوش شفقت و عنایت میں لیتے اور اس کی پوری پوری تربیت فرماتے۔

کہتے ہیں کوئی خراسانی نوجوان مدتوں خواجہ قطب الدین[۲] بختیار اوشی قدس سرہ کے مزار پرانوار پر مجاور اور آپ کی روح مبارک سے کسی زندہ پیر کامل کا طالب رہا؛ چناں چہ جب ہمارے حضرت

خواجہ باقی باللہ دھلی میں وارد ہوئے تو اس نوجوان کو خواب میں یہ خبر دی گئی کہ اس وقت طریقۂ نقشبندیہ[۳] کا ایک بزرگ شہر میں آیا ہوا ہے ، لازم ہے کہ اس کی خدمت و صحبت اختیار کرو ۔ وہ نوجوان حسب بشارت آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا بیان کر کے آپ سے یہ التماس کی کہ ''مجھے اپنا مرید بنا لیجیے۔'' آپ نے فرمایا ''یہ عاجز خود کو اس لائق نہیں سمجھتا ؛ وہ شخص کوئی اور ہوگا ۔'' چوں کہ آپ نے زیادہ انکسار کے ساتھ بے حد معذرت چاھی تھی ، اس لیے وہ نوجوان واپس اپنے مقام پر چلا آیا ۔ دوسری رات اسے پھر خواب میں بتایا گیا کہ ''یہی وہ مطلوبہ بزرگ ھیں ، جن کی خدمت میں تم کل پہنچے تھے اور جنھوں نے تمھارے سامنے عجز و انکسار سے کام لیا تھا ۔'' اس کے دوسرے روز جو وہ نوجوان دوبارہ حضرت کے پاس آیا تو پھر واپس نہیں گیا ، اور شرف قبولیت کی عزت سے نوازا گیا ، اور یہیں اس نے وہ کچھ دیکھا جو کچھ کہ اس نے دیکھا ۔

اکثر ایسا ہوتا کہ آپ غایت عجز کے سبب اپنے بعض صادق العقیدہ ، صاحب حال اور ہر وقت کے صحبت و خدمت میں بیٹھنے والے طالبوں سے بھی فرما دیتے کہ ''جو کچھ تم لوگ خیال کرتے ھو یہ نا چیز اس کا قطعاً اھل نہیں ھے ؛ کسی اور جگہ کوشش کر دیکھو ؛ اگر کوئی مرشد مل جائے تو اس حقیر کو بھی آگاہ کرنا تاکہ میں بھی اس کی خدمت میں جلد تر حاضر ھوؤں اور اس طرح ممکن ھے اپنے درد کی دوا کر سکوں ۔''

راقم عاجز نے خواجہ حسام الدین[۳] احمد (اللہ محبوں کے سر پر ان کا سایہ قائم رکھے !) کو یہ فرماتے سنا ھے کہ ''مجھے بھی حضور نے اسی طرح بڑے اصرار سے فرمایا تھا اور چوں کہ آپ نے حد سے زیادہ عاجزی کی تھی ، اس لیے میں نے ذرا سے بھی توقف کو سوء ادب جانا اور جلد ھی آگرہ کی طرف روانہ ھوگیا ۔ پہنچنے کو تو میں اس شہر میں پہنچ گیا لیکن اس حالت میں کہ حیرانی و سراسیمگی

مجھ پر پوری طرح طاری تھی ۔ یہی سوچتا کہ آخر کیا چارہ کروں ؛ کبھی دل میں کہتا کہ حضرت ھی کے آستانے پر واپس چلا جاؤں اور اُن سے عرض کروں کہ میں نے حضور کے حکم کی تعمیل تو کی ، لیکن جیسا مرشد کہ آپ نے فرمایا ھے ویسا مرشد نہیں مل سکا ۔ اسی ادھیڑ بن میں میں چلا جا رھا تھا کہ راستے میں ایک سرائے سے بڑے دل نشین و پر سوز گانے کی آواز سنائی دی ۔ جب میں نے ذرا کان لگا کر سنا تو قوال شیخ بزرگ سعدی شیرازی کا یہ شعر گا رھے تھے :

تو خواھی آستین افشان و خواھی دامن اندر کش
مگس ھرگز نخواھد رفت از دکانِ حلوائی[5]

اس شعر نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا ؛ میں سر پر پاؤں رکھ کر فوراً آپ کی خدمت میں پہنچا اور الف سے یا تک سب ماجرا کہہ سنایا ۔''

اسی طرح ایک مرتبہ لاھور میں کسی درویش نے آپ کو خواب میں دیکھا کہ آپ ایک چتکبرے گھوڑے پر سوار گزر رھے ھیں اور لوگوں کا ایک بہت بڑا ھجوم آپ کے پیچھے پیچھے چلا جا رھا ھے ، اور لوگ کہہ رھے ھیں کہ یہ قطب وقت ھے ۔ اس خواب کے بعد وہ درویش آپ کے آستانے پر حاضر اور ھدایت کا طالب ھوا ۔ آپ نے اس سے بھی اسی عاجزی کے ساتھ معذرت کی ۔ وہ بے چارہ مسجد میں آ کر زار و قطار رونے لگا اور پریشان خاطری کے ساتھ درویشوں کے مجمع میں اپنا دکھڑا بیان کرنے لگ گیا کہ ''یارو یہ کیسا ناز و انداز ھے کہ خود ھی تو دیدار کرایا اور میرا دل اُڑایا اور اب جو میں ناشاد و خانہ برباد یہاں آیا تو یہ کچھ فرمایا اور اپنے سے مجھے بھگایا ۔ آخر میں بے چارہ کیا کروں ، کہاں جاؤں ؟'' اس نے یہ سارا ماجرا کچھ اس درد کے ساتھ سنایا کہ بہت سے حاضرین رو رو کر نڈھال ھوگئے اور ایک عجیب شور و ھنگامہ برپا ھوا جو آپ کے کانوں تک پہنچا ؛ آپ نے پوچھا ''یہ شور کیسا ھے؟'' عرض کیا گیا :

کز لب شیرین تو شوریست در ھر خانۂ

(ہر ہر گھر میں آپ کے شیریں لبوں کے سبب ایک شور برپا ہے۔ شور کے معنی نمک کے بھی ہیں) آپ مسکرا دیے۔ پھر اس درویش کو بلا کر ذکر و جذبۂ الٰہی کی تلقین سے نوازا۔

تا نگرید طفل کی جوشد لبن   تا نگرید ابر کی خندد چمن[6]

(جب تک بچہ نہ روئے ماں کا دودھ جوش نہیں مارتا ؛ جب تک بادل نہ روئے چمن نہیں مسکراتا ۔)   (زبدۃ المقامات)

(۲)

ہمارے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ میں جذبۂ شفقت و رحم بہت زیادہ تھا ۔ چناں چہ جن دنوں لاہور میں قحط پڑا ہے ، ان دنوں آپ وہیں قیام پذیر تھے ۔ آپ نے چند روز تک کھانا نہ کھایا ۔ جس وقت بھی کھانا آپ کے سامنے لے جایا جاتا آپ فرماتے ''یہ بعید از انصاف ہے کہ ہمسائے تو فاقوں مریں اور ہم بیٹھے کھانا کھائیں ۔'' پھر جو کچھ بھی موجود ہوتا ، وہ تمام و کمال قحط زدہ لوگوں کو بھجوا دیتے اور خود روحانی غذا پر کہ 'ابیت عند ربی' کی میراث ہے ، گذران کرتے ۔

جب آپ نے لاہور سے دہلی کی طرف کوچ فرمایا تو راستے میں اکثر ایسا ہوا کہ ابھی ایک فرسخ بلکہ ایک میل بھی طے نہیں کرنے پائے کہ کسی پیدل چلتے معذور پر آپ کی نظر پڑ گئی ؛ آپ اسی وقت گھوڑے سے اترے ، اس معذور شخص کو سوار کیا اور خود اگلے پڑاؤ تک پا پیادہ چلے ۔ پھر اس خیال سے کہ کوئی دوست آشنا آپ کے اس نیک عمل سے آگاہ نہ ہو جائے ، اس وقت سر پر چادر اوڑھ لی اور جب پڑاؤ کے قریب پہنچے تو اس معاملے کو پوشیدہ رکھنے کی خاطر پھر سے اپنے گھوڑے پر سوار ہوگئے ۔

آپ صرف انسانوں ہی سے نہیں بلکہ حیوانوں سے بھی اسی شفقت و مہربانی کے ساتھ پیش آتے تھے ۔ چناں چہ کہتے ہیں کہ ایک رات آپ تہجد کے لیے اٹھے ہوئے تھے کہ ایک بلی آ کر آپ کے لحاف پر سوگئی ،

آپ صبح تک اسی حالت میں سردی کی تکلیف برداشت کرتے رہے ، لیکن بلی کی نیند میں خلل ڈالنا مناسب نہ سمجھا ۔ (زبدة المقامات)

(۳)

آپ کے همسایے میں ایک نوجوان رهتا تھا کہ تمام شرعی عیوب کا مرتکب ہونے کے علاوہ قسم قسم کے شر و فساد کا مظاہرہ کرتا رهتا ۔ آپ اس کی تعریف فرماتے اور اس کی تمام حرکات کو برداشت کرتے ۔ ایک روز کوتوال نے خواجہ حسام الدین سلمہ اللہ کے اشارے پر اس شریر کو قید میں ڈال دیا ۔ جب یہ خبر آپ تک پہنچی تو آپ نے خواجہ حسام الدین کو بلا کر ناراضی کا اظہار کیا ۔ خواجہ نے عرض کی کہ ''وہ شخص بے حد فاسق و فسادی ہے اور اس کی شرارتیں اب روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہیں ۔'' آپ نے اپنے دل پر درد سے ایک آہ سرد کھینچی اور فرمایا ''ہاں ! آپ تو چوں کہ خود کو صالح ، با صفا ، پرهیزگار اور صاحب خیر سمجھتے هیں ، اس لیے وہ آپ کی نظروں میں شریر ، فسادی اور بدکار هی ٹھہرے گا ، لیکن هم کہ کسی طور بھی خود کو دوسروں سے ممتاز نہیں سمجھتے ، کیوں کر اس کے نقصان کی خواهش کریں گے ۔'' اس کے بعد آپ نے اس نوجوان کو قید سے رهائی دلا دی اور وہ آپ کی شفقت کی برکت سے صالح و پرهیزگار بن گیا ۔

آپ کا یہ عجز و انکسار اور یہ خود کو خطا کار و گنہ گار سمجھنا آپ پر اس قدر غالب تھا کہ اگر کسی طالب صادق سے اچانک کوئی گناہ سرزد هو جاتا اور وہ آپ کے پاس آتا تو آپ فرماتے ''یہ سب هماری بدصفتی کا نتیجہ ہے ؛ جب بھی هم سے کوئی برائی سرزد هوگی تو یقیناً اس کا عکس ان پر بھی پڑے گا ۔ اس سلسلے میں یہ بے چارے مجبور هیں ۔'' اگر کسی میں کوئی غیر شرعی بات دیکھتے تو آپ کھلم کھلا یا سختی سے نہ ٹوکتے ، بلکہ بڑی نرمی سے ، اشاروں کنایوں میں اور تمثیلات کے ذریعے کچھ اس طرح آپ امر معروف کی طرف راغب کرتے کہ وہ شخص هر صورت میں قائل هو جاتا اور وہ باتیں اس کے دل نشیں

هو کر رہتیں ۔ دوسروں کو کھلم کھلا امر معروف کی تلقین نہ کرنے کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ آپ خود کو دوسرے لوگوں سے ممتاز نہ سمجھتے تھے ۔

آپ نے کبھی کسی کی چغلی نہیں کھائی ۔ اسی طرح آپ کی زبان سے یا آپ کی محفل میں کبھی کسی کے متعلق برے الفاظ نہیں نکلے ۔ جس کا ذکر ہوتا ، اس کی تعریف شروع کر دیتے ۔ (زبدۃ المقامات)

(۴)

آپ کی عظمت صحبت بلکہ فکر و تأمل کا یہ عالم تھا کہ بیگانے تو ایک طرف ، اپنے بھی دل کی بات زبان پر لاتے لاتے رہ جاتے ، اور آپ کے اس عجز و انکسار کے با وصف لوگوں کے دلوں پر آپ کا احترام آمیز رعب اس قدر چھایا ہوا تھا کہ بڑے بڑے دانا بھی بات کرتے لڑکھڑا جاتے تھے۔

ایک سن رسیدہ عزیز نے کہ فاضل باخبر تھا ، یہ واقعہ سنایا کہ ''ایک دن میں نماز کے لیے ایسے وقت میں پہنچا جب جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور اگلی صف میں اب کوئی جگہ نہ رہی تھی ؛ البتہ جہاں حضرت خواجہ کھڑے تھے وہاں لوگوں نے ان کے ادب و احترام کے سبب کچھ جگہ چھوڑ رکھی تھی ؛ چوں کہ مجھے خواجہ سے کوئی خاص عقیدت نہ تھی اور میں نے انہیں اس وقت سے دیکھا تھا جب کہ وہ ہنوز بچے تھے ، اور اب بھی وہ میرے نزدیک مجھ سے چھوٹے تھے ، اس لیے کسی ادب و احترام کا لحاظ کیے بغیر میں اس خالی جگہ پر جا کھڑا ہوا ؛ لیکن ابھی ایک لمحہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے آپ کی شکوہ و عظمت نے میرے دل پر ہلہ بول دیا ہے ۔ ہر چند میں نے خود کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نظر نہ آیا ۔ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ میں بے اختیار نماز ہی میں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ آیا اور اتنا ہٹا کہ اگر مجھے پتا نہ چلتا اور ایک قدم اور پیچھے رکھتا تو میں دالان

سے نیچے گر جاتا۔ اس واقعے کے بعد میں، اس عارف بزرگ کا ایک حقیقی مخلص بن گیا۔''

آپ اس بزرگی کے باوجود کبھی کبھی جوش قلق کے باعث یا معتقدین کی ملاقات سے بچنے کے لیے اکیلے ھی کوچہ و بازار میں نکل اور کسی دیوار کے سائے میں زمین پر بیٹھ جاتے۔ گو ایسے اوقات میں آپ پر ایک سرمستی، از خود رفتگی اور حیرت کا عالم طاری ہوتا، لیکن پھر بھی شرعی امور اور فریضہ ھائے واجبی میں ذرہ بھر کوتاھی نہ کرتے۔ سماع اور رقص کی آپ کے یہاں قطعاً اجازت نہ تھی اور نہ آپ کے سامنے کوئی وجد ھی میں آ سکتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز کسی درویش نے آپ کے سامنے بلند آواز سے 'اللہ' کہہ دیا؛ آپ نے فرمایا ''اس سے کہہ دو کہ ھماری مجلس میں آنا ھو تو آداب مجلس کا پورا پورا خیال رکھا کرو۔''

اگر کبھی کسی مرید سے ترک ادب کا ارتکاب ھو جاتا تو اس کے ساتھ ظاھری طور پر درشتی سے پیش نہ آتے اور نہ ھی اسے دھتکارتے۔ اور اگرچہ ظاھری قربت تو ویسے ھی رھتی، لیکن باطنی طور پر خود کو اس سے دور کر لیتے، یا پھر وہ شخص اپنے احوال میں رکاوٹ اور الجھن پاتا۔ اور کبھی یہ بھی ھوتا کہ آپ اسے خواب میں کچھ حکم فرما دیتے جس سے وہ شخص متنبہ ھو جاتا:

ای تو مجموعۂ خوبی ز کدامت گویم

(تو حسن و خوبی کا مجموعہ ھے، تیری کس کس خوبی کا ذکر کروں)

آپ کی بلند مرتبگی کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ھوگا کہ آپ دو تین سال مسند مشیخت پر رھے؛ اس تھوڑی سی مدت میں بے شمار لوگ آپ کے خوان دولت سے بہرہ مند ھوئے اور آپ ھی کی بہ دولت ھندوستان کی وسیع سلطنت میں ھزاروں برکتیں اور نیک بختیاں پھیلیں اور نقشبندی سلسلہ، کہ اس ملک میں باھر سے آیا تھا، پوری طرح رواج پا گیا۔ اگرچہ اس سے پہلے اس سلسلے کے

بہت سے مشائخ یہاں آ کر سال ہا سال رہے تھے ، پھر بھی جو برکتیں ان دو تین سالوں میں دیکھنے میں آئیں ، اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئیں ۔ (زبدۃ المقامات)

(۵)

آپ؄ نے بھی اپنے کتابچے 'مبدأ و معاد' میں یہ تحریر فرمایا ہے کہ ''ہم چار آدمی آپ کی (خواجہ باقی باللہ) خدمت و ملازمت میں ایسے تھے جو لوگوں کے نزدیک ، دیگر دوستوں کی نسبت ممتاز تھے ۔ ہم میں سے ہر ایک کو حضرت خواجہ قدس سرہ سے جو عقیدت تھی وہ ایک دوسرے سے بالکل الگ تھی ، اور اسی طرح ہمارا معاملہ بھی ایک دوسرے سے جدا تھا ۔ مجھ حقیر کو یقین کامل تھا کہ اس قسم کی 'صحبت اجتماع' اور ایسی رشد و ہدایت آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے کے بعد سے ہرگز وجود میں نہیں آئی ؛ اور ہمیں اس نعمت کا شکر بجا لانا چاہیے کہ گو ہم خیرالبشر علیہ و علیٰ آلہ الصلوت والسلام کے شرف صحبت سے مشرف نہیں ہوئے ، کم از کم اس صحبت کی سعادت سے تو محروم نہیں رہے ، اور یہاں ہر کسی کو بہ اندازۂ اعتقاد حصہ ملا ۔'' (زبدۃ المقامات)

حضرت خواجہ باقی باللہ

[اکبر کے مذہبی معتقدات کے خلاف ردعمل نے کئی صورتیں اختیار کی تھیں ۔ وحدت الوجودی خیالات کے بزرگ اکبر کے ہم نوا ہوئے ۔ اختراعوں سے متنفر لوگ (شیخ عبدالحق محدث وغیرہ) دربار سے کنارہ کش ہو گئے ۔ تیسرے گروہ نے حضرت خواجہ باقی باللہ بیرنگ کی سیادت میں ایک مستحکم محاذ قائم کیا ۔ یہ اکبر کی زندگی کے آخری ایام میں ہندوستان وارد ہوئے ، لیکن اس قلیل مدت میں بھی نقش بندی سلسلے کی بنیادوں کو استوار کر دیا ۔ آپ کے مرید حضرت مجدد الف ثانی نے اسے اور بھی فروغ دیا ۔ خواجہ صاحب کے مکتوبات موجود ہیں ، جن سے ان کی صوفیانہ سرگرمیوں کا مفصل پتا چلتا ہے]

مکتوب ۵۸

استاذی میاں شیخ احمد اور محمد صادق [۱] کی خدمت میں لکھا گیا ۔

برادران عزیز میاں شیخ احمد اور محمد صادق کو ہماری مخلصانہ دعائیں پہنچیں ۔ آپ کا مکتوب ملا ۔ آپ نے میرا حال احوال پوچھا ہے ، خدا کا شکر ہے کہ یار احباب سب پاس ہیں ۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ ہر بات کا جواب بالتفصیل علیحدہ لکھوں لیکن چوں کہ جب تک بالمشافہ بیان نہ کیا جائے ، پوری تشفی نہیں ہوتی ، اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا ۔

مختصر یہ کہ محمد صادق کا حال بڑا اصیل (مضبوط) ہے اور یہ جو شیخ احمد کا حال بیان ہوا ہے کہ کبھی......'توحید' ہے اور بہت زیادہ

عبادت اس کی شاہد ہے کہ 'خبر[۲]' سے 'نظر[۳]' میں آ گیا ہے۔ اور اس مقام میں 'گوش' سے 'آغوش' تک معاملہ پہنچ گیا ہے، تو یہ کچھ تحقیق طلب ہے کہ آیا اس سے آپ کی مراد 'کثرت میں وحدت' کا مطالعہ ہے یا توحید صوری (ظاہر) کا۔ اگر تو اول الذکر ہے تو مبارک ہے اور حامل کمال ہے؛ اگر مؤخرالذکر ہے تو ایک حیثیت سے اصیل ہے اور ایک حیثیت سے معلول۔ (اس وقت ان دونوں کے سلسلے میں تفصیلی بحث کا موقع نہیں ہے) اور اگر اس کے علاوہ کوئی تیسرا معاملہ ہے تو وہ البتہ خود معلول ہے۔ لیکن آپ کی عبارت سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مشار الیہ کی دوسرے درجے پر نظر ہے۔ سو خدا نے چاہا تو وہ از قسم اصیل ہوگا اور وہ جو آپ نے ملحدانہ رباعی لکھ کر بھیجی ہے، اس میں بہت زیادہ فرو مایگی کا اظہار ہے۔ ایسی رباعی کہنے والا قطعاً مقبول ایزدی نہیں ہے۔ آپ ہرگز ہرگز ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں کہ بارگاہ لم یزلی استغنا و غیرت کی جگہ ہے۔

والسلام

مکتوب نمبر ۹۱

ایک دوست کے نام:

شیخ احمد[۴] سرہند کے رہنے والے اور بڑے صاحب علم اور قوی عمل والے آدمی ہیں۔ اس حقیر کو ان کے ساتھ کچھ عرصہ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے، اور اس دوران میں میں نے ان سے متعلق بہت سے عجیب و غریب معاملات و واقعات مشاہدہ کیے ہیں۔ میرے نزدیک ان کی مثال ایک ایسے چراغ کی ہے جس سے بہت سے عالم روشن کیے گئے ہوں۔ بحمد اللہ تعالیٰ ان کے احوال کاملہ کا مجھے پورا پورا یقین ہو گیا ہے۔ شیخ مذکور کے عزیز و اقارب اور بھائی بھی سب کے سب صالحین اور علما میں سے ہیں۔ خاکسار نے ان میں سے چند ایک سے ملاقات کی ہے اور انہیں واقعی جوہر قابل پایا ہے۔ خدا نے انہیں عجیب و غریب استعداد و لیاقت سے نوازا ہے۔ شیخ کے فرزند یوں تو ہنوز لڑکپن میں ہیں، لیکن سب اسرار خداوندی سے

بہ خوبی آگاہ ہیں ۔ بالجملہ شجر طیبہ ہیں کہ جس سے شاخیں بھی پاک ہی نکلتی ہیں ۔ 'انبتہ اللہ . . .' (اللہ تعالیٰ نے پھر اس کو اچھی شکل میں اگایا)

الغرض کثرت عیال ، بہت زیادہ فقر اور بے روزگاری کے سبب یہ خاندان تفرقہ و پریشانی کا شکار ہے ۔ اگر ہر سال ایک مقررہ رقم اس خاندان کو ملتی رہے ، جسے راقم حروف ان لوگوں میں بانٹ دیا کرے تو یہ نہایت ہی مستحسن اقدام اور باعث خیر کثیر ہوگا ۔ ہر چند رقم تھوڑی ہی سی ہو لیکن خیرات کا ایک رکن عظیم ہوگی ۔ درویش لوگ 'باب اللہ' اور عجیب دل کے مالک ہوتے ہیں ۔ فقط مزید لکھنا گستاخی ہے ۔ (مکتوب حضرت خواجہ محمد باقی باللہ)

مکتوب ۹۷

جب میرے مخدوم و استاد میاں شیخ احمد سرہندی درجۂ تکمیل کو پہنچ گئے تو اس کے بعد بھی ، اگرچہ انہیں بہت زیادہ عظمت و بزرگی حاصل اور ان کی بے حد قدر و منزلت تھی ، اپنی طلب و جستجو کی بے پناہ خواہش کے سبب جو حضرت ارشاد پناہ کو آخر عمر تک رہی ، آپ خود کو مبتدی ہی سمجھتے رہے اور حاصل شدہ کمالات کو نظر میں نہ لاتے ۔ چناں چہ خاکسار نے مذکورہ روش کے مطابق اپنے متذکرہ بالا مخدومی کو خطوط لکھے ۔ راقم سطور کو اس سے زیادہ کیا سلیقہ و شعور جو خلوت و جلوت میں مذکورہ حضرت کے کمالات اور اس مضمون ناطق کے موافق و مطابق کچھ لکھ سکے ۔ حضرت خواجہ نے حضرت مخدوم و استاد کا سن کر ایسے اوقات میں یہ عنایت نامہ نوازش فرمایا ۔ خدائے بزرگ و برتر آپ کو بہت زیادہ کمال پر پہنچائے ! ۔

'وللہ رضی من کاس الکرام نصیب'

(اور اللہ سخیوں کے ساغر میں سے ایک حصے پر راضی ہے)

اس میں کسی قسم کا تکلف یا بناوٹ نہیں بلکہ جو کچھ حقیقت حال ہے وہی بیان کی جائے گی ۔ پیر انصارہ قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میں

خرقانی۶ کا مرید ہوں ، لیکن آج اگر خرقانی ہوتے تو پیر ہونے کے باوجود مریدی اختیار کرتے ۔ جب ان بے صفتوں کی صفت ایسی ہے تو آثار صفات کے گرفتار کیوں کر نہ طلب گاری کے لوازم پر جان فدا کریں گے ۔ اور جہاں کہیں سے بھی ان کے دماغ تک کوئی خوشبو پہنچے گی ، کیوں کر نہ اس کا پیچھا کریں گے ۔ اب جو توقف و تاخیر ہے تو یہ کسی بے نیازی واستغنا کے سبب نہیں بلکہ کسی اشارے کے تحت ہے :

چون طمعی خـواهد ز من سلطان دین
خاک بـر فرق قناعت بعد ازین

(جب دین کا سلطان مجھے طمع کرنے کو کہتا ہے تو پھر اس کے بعد قناعت کے سر پر خاک !)

بارے ہمارے حال پریشان کا نسخہ یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو اس سے بچو اور کبر و نخوت سے چھٹکارا حاصل کرو ۔

دیگر امر یہ ہے کہ سیادت مآب امیر صالح۷ سلمہ اللہ نے اظہار طلب کیا تھا ۔ چوں کہ فقیر کا وقت اس بات کا مقتضی نہ تھا ، اس لیے ان کے اوقات کو ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور آپ کی صحبت میں انہیں بھیجا گیا ۔ ان شاء اللہ العزیز اپنی استعداد کے مطابق بہرہ مند ہوں گے اور کمال مہربانی کی توجہ حاصل کریں گے ۔ والدعا

(مکتوب حضرت خواجہ محمد باقی باللہ)

مکتوب ۸۰

[مشیخت ترک کرنے کے بعد جب آپ نے زیادہ تر خلوت میں رہنا شروع کیا تو آغاز میں سوائے چند خاص حاضرین کے سب کو آپ نے فرمایا تھا کہ اب میرے استاد میاں شیخ احمد سلمہ اللہ کی خدمت میں پہنچو ۔ چوں کہ ایسے مخلصوں کا اس درگاہ سے ایک دم منقطع ہونا امر محال تھا ، اس لیے ملول ہو گئے ۔ آخر کچھ لوگوں کو لطف و کرم سے اور ترغیب دلا دلا کر وہاں جانے پر راضی کر لیا ، اور وہ لوگ جو راضی تو نہ تھے لیکن محض حکم عالی پر جا رہے تھے انہیں جانے سے روک لیا ۔ یہ عنایت نامہ اسی موقع پر لکھا گیا تھا]

خدائے بزرگ و برتر آپ کو بہت زیادہ پاکیزگی و صفا عنایت فرمائے !

چند احباب جو ہمارے بار وجود کے گرفتار تھے ، چوں کہ وہ 'ہم میں سے سب کا ایک معلوم مقام ہے' کی تنگنائے میں مقید تھے اس لیے ہمارے فکر و عمل کی مصلحت نے اس امر کا تقاضا کیا کہ اس موسم برسات میں یہ احباب مجھ ہیچمدان سے دور رہ کر آفتاب شہود کی روشنی میں زندگی بسر کریں ۔ جہاں وہ ان شاء اللہ العزیز آخرت کی نیکی و پاکیزگی حاصل کریں گے ۔ دیگر 'جماعت اور صحبت' کا تعلق پوری طرح واضح اور روشن ہے ، بیان کی حاجت نہیں ۔

ما گرفتاریم بر ما ناوک بیداد ریز
سنبل و گل بر کنار مردم آزاد ریز

(ہم تو تیرے گرفتار ہیں ، ہم پر فقط بیداد کے تیر چلا ؛ اور سنبل و گلاب غیر لوگوں کو عطا کر)

'استغفراللہ......' (اللہ کی بخشش مانگتا ہوں ان تمام چیزوں سے جو اللہ کو ناپسند ہیں ۔)

دیگر عرض ہے کہ ایک مدت سے آپ نے اپنے احوال مبارک سے آگہ نہیں کیا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے ضرور کوئی نیکی مانع آئی ہو گی ۔ موسم برسات کے بعد اگر استخارے کا موقع ملا تو حاضر ہوں گا ورنہ نہیں ۔ لیکن جو کچھ استخارے میں ظاہر ہو ہمیں لکھیں ۔ اگر اپنی تعبیر بھی لکھ بھیجیں تو یہ گویا نورٌ علی نور ہوگا ۔ والدعا

(مکتوبات حضرت خواجہ محمد باقی باللہ)

مکتوب ۸۲

[جن دنوں آپ نے ترک مشیخت کی اور زیادہ تر گوشہ نشینی و تنہائی اختیار کر لی تھی اور یار احباب حسب سابق آپ کی تعظیم و تکریم کرتے تھے تو اس موقع پر آپ نے گھر سے اہل مسجد کو 'مرید کے ترک تعظیم کرنے' کے بارے میں رقعہ لکھ کر مسجد میں بھجوایا ۔]

اپنے مخدوموں کی خدمت میں یہ التماس ہے کہ خاکسار کو اپنی مصلحت اس بات میں نظر آتی ہے کہ میں چند روز کے لیے حضرت خواجہ عبدالخالق[۸] غنجدوانی کے اس قول مبارک 'مشیخت کا دروازہ بند کر اور دوستی کا دروازہ کھول' پر عمل کروں ، لہٰذا گزارش ہے کہ جس طرح احباب نے مجھ پرمہربانی فرما کر دوستی و تقلید ترک کی ہے ، اسی طرح مسجد میں بھی میری تعظیم و تواضع سے اجتناب برتیں اور مسجد میں اٹھنے بیٹھنے اور آنے جانے کے سلسلے میں جیسا معاملہ مرزا حسام الدین[۹]، مولانا یوسف[۱۰] اور اسی قسم کے دوسرے حضرات کی خدمت میں اختیار کرتا ہے ، ویسا ہی معاملہ اس حقیر سے کیا جائے۔ دلہ سے لے کر میاں شیخ الہداد[۱۱] تک سب چھوٹے بڑے اس پر عمل پیرا ہوں۔ ان شاء اللہ العزیز انھیں ثواب دارین حاصل ہو گا۔ ''سلامتی ہو ان پر جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی!''

(مکتوبات حضرت خواجہ محمد باقی باللہ)

امام ربانی مجدد الف ثانی

[شیخ احمد المعروف بہ مجدد الف ثانی (۱۵۶۳-۶۴ع) نے اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کے مسلک کی پیروی میں نقشبندی سلسلے کو طبقۂ امرا میں بھی متعارف کرایا اور مذہب سے وہ آنس پیدا کیا جس کے سامنے اکبر کے مذہبی خیالات کا فروغ ناممکن ہو گیا ۔ اس دور کے اہم امیر نواب مرتضیٰ خان شیخ فرید سے ان کے تعلقات بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں ۔ اکبر کے انتقال کے بعد بھی امام ربانی کی دینی سرگرمیاں جاری رہیں ۔ جہانگیر نے اپنی سلطنت کے دسویں سال میں انھیں کچھ مدت کے لیے قید کردیا ۔ جہانگیری عہد میں شیعہ خیالات کے فروغ کے خلاف بھی انھوں نے آواز اٹھائی ۔ علاوہ ازیں غیر مسلموں کے بارے میں بھی ان کا مسلک بڑا سخت تھا ۔ ان ہر دو رجحانات کی وضاحت ذیل کے مکتوبات سے بہ خوبی ہوتی ہے]

شیخ فرید ۱ کے نام ایک خط کا اقتباس

ایک درویش نے کہ لاہور سے آیا تھا ، یہ بتایا کہ شیخ جیو (یعنی شیخ فرید) پرانی کھڑ منڈی کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے اور میاں رفیع الدین نے اظہار التفات فرمانے کے بعد بتایا کہ ''نواب شیخ جیو نے اپنی حویلی میں جامع مسجد بنوائی ہے ۔'' سبحان اللہ ! سبحان اللہ ! الحمدللہ ! خدائے بزرگ و برتر اس سے بھی زیادہ توفیق و ہمت عطا فرمائے ! اس قسم کی خبریں

جب ہم ایسے مخلصوں تک، پہنچتی ہیں تو ہماری مسرت و شادمانی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہتا۔

سیادت پناہا ! مکرما ! اس دور میں اسلام بڑی کس مپرسی کی حالت میں ہے۔ آج ایک چیتل [۲] جو اس کی تقویت و استحکام پر صرف کیا جاتا ہے، کل (روز قیامت) اسے کروڑوں میں خریدا جائے گا۔ سو دیکھیں کون سے شاہباز کو اس دولت عظمیٰ سے مشرف کیا جاتا ہے۔ ہر وقت اور ہر زمانے میں جس کسی سے بھی دین حق کی ترویج اور ملت بیضا کے استحکام کے لیے کچھ عمل میں آئے وہ احسن اور قابل ستائش ہے۔ لیکن اس دور میں کہ اسلام کس مپرسی کا شکار ہے، آپ ایسے جواں مرد اور بلند ہمت اہل بیت سے ایسا فعل اور بھی زیادہ احسن و زیبا ہے کہ یہ دولت تو آپ کے خاندان بزرگ کی لونڈی ہے۔ یہ دولت (اسلام) آپ کے لیے 'جوہر[۳]' ہے اور دوسروں کے لیے 'عرض[۴]'۔ وراثت نبوی (آپ اور آپ کی اولاد پر اکمل و افضل درود و سلام ہو!) کی حقیقت اس امر کے حصول میں عظیم القدر ہے۔ ایک موقع پر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابۂ کرام رض سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ''آپ لوگ ایسے زمانے میں پیدا ہوئے ہیں کہ اگر آپ اوامر و نواھی[۵] کا دسواں حصہ بھی ترک کر دیں تو یہ آپ کے لیے باعث ہلاکت ہوگا۔ اس کے برعکس جو لوگ آپ کے بعد آئیں گے اگر وہ اوامر و نواھی کے دسویں حصے پر بھی عمل کریں گے تو وہ نجات پا جائیں گے۔'' اور اب یہ وقت وہی وقت ہے اور یہ گروہ وہی گروہ :

گوی توفیق و سعادت درمیان افگندہ اند
کس بہ‌میدان درنمی آید ، سواران را چہ شد

(توفیق و سعادت کی گیند میدان میں پڑی ہے، کوئی بھی میدان میں نہیں آتا ، سواروں کو کیا ہوا!)

کافر لعین رائے گوبند وال[۶] کو اس موقع پر ہلاک کر دینا بہت ہی مناسب ٹھہرا ، اور یہ بات مردود ہندوؤں کے لیے شکست عظیم کا

سبب بنی ہے - جس نیت سے بھی یا جس بھی مقصد کے تحت اسے مارا گیا ہے ، بہر صورت احسن ہے ؛ اس لیے کہ کفار کی رسوائی اہل اسلام کے واسطے گویا سکۂ جاری ہے - ابھی اس کافر کو جہنم رسید بھی نہیں کیا گیا تھا جب اس حقیر نے خواب میں دیکھا تھا کہ بادشاہ وقت نے لفظ شرک کا سر (پہلا حرف) توڑ ڈالا ہے - اور حقیقت یہ ہے کہ وہ کافر اہل شرک کا سب سے بڑا سردار اور کافروں کا امام تھا (خدائے بزرگ و برتر ان پر گرفت کرے!) خود دین و دنیا کے سردار آں حضرت علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی بعض دعاؤں میں کفار پر ان الفاظ میں نفرین بھیجی ہے ''اللھم شتت ......''

(اے اللہ ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کر دے ، ان کے گروہ میں تفرقہ ڈال دے ، اور ان کی بنیاد کو مسمار کر دے اور ان پر غالب قدرت رکھنے والے کی سی گرفت کر!)

جو امر اسلام اور اہل اسلام کے لیے باعث عزت ہوگا وہی امر کفر اور کافروں کے لیے ذلت و رسوائی کا سبب ہو گا - یہ جو کفار سے جزیہ وغیرہ لیا جاتا ہے تو اس سے ان کی محض رسوائی و تذلیل مقصود ہوتی ہے - جس قدر کفار صاحب عزت ہوتے جائیں گے اسی قدر اسلام کی ذلت ہوگی ، لہٰذا اس امر کو شدت سے مدنظر رکھنا چاہیے - لیکن افسوس کہ ہمارے اکثر مسلمانوں نے اس کی ذرا پروا نہیں کی ، جس کے سبب انھوں نے دین کو بگاڑ کے رکھ دیا ہے - اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''اے نبی کافروں اور منافقوں کے ساتھ جہاد کرو اور ان پر شدت کرو -'' کفار کے ساتھ جہاد کرنا اور ان پر غلبہ پانا دین کی ضروریات میں سے ہے - لہٰذا مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اس دور میں جب کہ بادشاہ اسلام کو اہل کفر سے پہلی سی رغبت نہیں رہی ، اسے (بادشاہ) ان بدکیش کافروں کی بقیہ رسوم (جو گذشتہ صدی میں وجود میں آئیں اور مسلمانوں کے دلوں پر گراں گزرتی ہیں) کی برائیوں سے آگاہ اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں ، کیوں کہ ممکن ہے ان رسوم کی برائیوں سے بادشاہ کی عدم واقفیت کے

سبب ان کی بقیہ (بچی ہوئی) رسوم متبنیٰ (لے پالک) ہوں ۔ اگر آپ کو فی الواقعہ وقت میسر ہو تو بعض عالمان اسلام کو اس سے باخبر کریں ، تاکہ رسوم کفار کی جو برائیاں ہیں انہیں وہ طشت از بام کریں ؛ کیوں کہ شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے کسی قسم کی کرامات یا خوارق کے اظہار کی ضرورت نہیں ہے ۔ جس کسی نے احکام شرعی کی تبلیغ بے کم و کاست نہ کی ہو گی ، قیامت کے دن اس کا کوئی عذر قبول نہ ہو گا ۔ انبیا علیہم الصلوات و التسلیمات ، کہ افضل مخلوقات ہیں ، شرعی احکام کی تبلیغ فرمایا کرتے تھے ۔ اگر ان کی امتوں نے کبھی ان سے معجزوں کا تقاضا کیا تو انہوں نے ہمیشہ یہی فرمایا کہ ''معجزے تو خدائے بزرگ و برتر کی طرف سے ہیں ؛ ہم پر فقط احکام کی تبلیغ واجب ہے ۔'' اور ممکن ہے اس دوران میں خدائے عز و جل کچھ ایسی بات پیدا کر دے جو اس جماعت کے حقیقت پر مبنی اعتماد کا باعث ہو ۔ بہر حال شرعی مسائل کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا ازبس لازم ہے ۔ اگر اس آگاہی کا بیڑا نہ اٹھایا گیا تو اس کی ذمہ داری بادشاہ کے مقربین اور علماء پر عاید ہو گی ۔ اس معاملے میں سعادت تو ایک طرف ، کئی ایک کو تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ انبیا علیہم الصلوات والتحیات نے شرعی احکام کی تبلیغ میں کون کون سے دکھ نہیں جھیلے اور کیا کیا رنج نہیں اٹھائے ۔ افضل انبیا (آپ پر افضل و اکمل درود و سلام ہو !) فرماتے ہیں ''کسی نبی کو اتنی ایذا نہیں دی گئی جتنی کہ مجھے دی گئی ۔''

عمر بگذشت و حدیث درد ما آخر نشد
شب بآخر شد کنون کوتہ کنم افسانہ را

(عمر گزر گئی مگر ہماری داستان درد ختم نہ ہوئی ؛ اب کہ رات ختم ہونے کو آئی ہے تو میں افسانے کو مختصر کرتا ہوں)

والسلام والاکرام

(مکتوبات امام ربانی ، جلد اول)

مکتوب ۴۷

[گزشتہ صدی میں کفار کو جو غلبہ حاصل ہو گیا تھا اور مسلمان ذلیل و خوار ہو کر رہ گئے تھے ، یہ خط اس کی شکایت میں ، نیز اس امر کی ترغیب دلانے میں سیادت پناہ شیخ فرید کو لکھا گیا ، کہ اگر بادشاہت کے آغاز ہی میں تبلیغ اسلام کی ترویج میسر آ جائے تو بہتر ہے تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی گمراہ درمیان میں کود پڑے اور مسلمانوں میں خلل و انتشار ڈالے اور قرن گذشتہ کے سے حالات و کیفیات پیدا کر دے]

''ثبتکم اللہ.......'' (اللہ تعالیٰ تمھیں تمھارے نجیب آبا کی راہ پر ثابت قدم رکھے ! ان میں سب سے زیادہ فضیلت والے سرور کونین ص ، اور حضرت علی رض کی باقی رہنے والی اولاد پر درود و سلام ہو!)

دنیا میں بادشاہ کی حیثیت وہی ہے جو جسم میں دل کی ہے۔ یعنی اگر دل صالح ہے تو جسم بھی صالح ہو گا ؛ اگر دل میں کوئی خرابی و فساد ہے تو اس کا اثر جسم پر بھی پڑے گا ۔ اسی طرح بادشاہ نیک ہے تو اس کی نیکی رعایا پر بھی اثر انداز ہو گی اور اگر اس میں کوئی خرابی اور برائی ہے تو رعایا میں بھی وہی خرابی اور وہی برائی جڑ پکڑ لے گی ۔

آپ تو یہ خوبی جانتے ہیں کہ پچھلی صدی میں مسلمانوں پر کیا کیا کچھ گزر چکی ہے ۔ گزشتہ صدیوں میں بہت زیادہ بے چارگی و بے کسی کے باوجود مسلمانوں کی بے چارگی اس سے آگے نہ بڑھی تھی کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہیں اور کفار اپنے مذہب پر ۔ آیت کریمہ 'لکم دینکم ولی دین' (تمھارا دین تمھارے لیے، میرا دین میرے لیے) گویا اسی حقیقت کے بارے میں ہے ۔ اور گزشتہ صدی میں تو کفار کھلم کھلا مرکز اسلام میں غلبے کے طور پر احکام کفر کا اجراء کرتے رہے ، جب کہ مسلمان احکام اسلام کے بجا لانے میں بالکل عاجز تھے ۔ اور اگر کبھی کوئی مسلمان شرعی امور بجا بھی لاتا تو اسے قتل کر دیا جاتا ۔ واویلا ! وامصیبتا ! کس قدر

دکھ، رنج و غم اور حسرت کا مقام ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ واله وسلم، کہ محبوب العالمین ہیں، پر قربان ہونے والے تو ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرتے تھے اور آپ صلعم کے منکر صاحبان عزت و توقیر تھے۔ مسلمان اپنے زخمی دلوں سے اسلام کی تعزیت میں مصروف تھے اور دشمن تمسخر اور ٹھٹھا مخول سے ان کے زخموں پر نمک چھڑکتے تھے۔ هدایت کا آفتاب گم راھی کی چادر میں جا چھپا تھا، اور نور حق باطل کے پردوں میں مستور و معطل ھو کے رہ گیا تھا۔ آج جب کہ دولت اسلام میں رکاوٹیں ڈالنے والوں کے زوال کی بشارت اور بادشاہ اسلام کی تخت نشینی کی خوش خبری خاص و عام تک پہنچ چکی ہے، مسلمانوں پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ھر معاملے میں بادشاہ کے ممد و معاون بنیں اور شریعت کی اشاعت اور ملت بیضا کی تقویت میں اپنی تمام کوششیں بروے کار لائیں۔ یہ امداد اور تقویت وغیرہ زبان سے یا ھاتھوں سے، یعنی کسی بھی صورت میں کی جا سکتی ہے۔ سب سے بہترین امداد شرعی مسئلوں کا بیان کرنا اور کتاب و سنت، اور جن آراء پر امت کا اتفاق ھو، ان کے مطابق کلامیہ عقاید کا اظہار کرنا ہے تا کہ کوئی بدعتی اور گمراہ درمیان میں آ کر راستے سے نہ بھٹکا دے اور معاملہ خرابی و فساد پر نہ منتج ھو۔ اس قسم کی امداد فقط ان علماے حق سے مخصوص ہے جو محض آخرت کے طلب گار ھیں، نہ کہ دنیاوی علما کہ ان کی ھمت زیادہ تر اس حقیر دنیا پر مرکوز ھوتی ہے، ان کی صحبت زھر قاتل اور ان کا فساد ایسا فساد ہے جس کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے:

عالم کہ کامرانی و تن پروری کند
او خویشتن گم ست کرا رهبری کند

(جو عالم خود نفسانی خواھشات کو پورا کرنے اور تن پروری میں مشغول ہے، وہ کسی کی کیا راھنمائی کرے گا کہ وہ تو خود گم کردہ راہ ہے)

گزشته دور میں جو بھی مصیبت ملت بیضا پر وارد ہوئی اس کا سبب اسی قسم کے علما تھے ۔ انھی علما نے بادشاہوں کو گمراہ کیا اور یہ جو بہتر (۷۲) فرقے گمراہی کے گڑھے میں گرے ہیں تو محض اس وجہ سے کہ وہ ان علمائے سوء کے ہتھے چڑھے ہوئے تھے ۔ علما کے علاوہ اگر کوئی عام شخص گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا اثر دوسروں تک کم ہی پہنچا ہے ۔ اور اس دور میں تو بہت سے صوفی نما جاہل ، علمائے سوء ہی کی مانند ہیں ۔ ان کا فساد بھی دوسروں تک پھیلانے والا ہے ۔ اور ظاہراً طور پر اگر کوئی شخص امداد کی استطاعت رکھنے کے باوصف کسی قسم کی بھی اعانت سے اجتناب برتے اور دین اسلام میں کسی قسم کا فتور واقع ہو جائے تو ایسا شخص بہت بڑا قصوروار ہوگا ۔ اسی بنا پر یہ حقیر و بے بضاعت بھی اس امر کا خواہاں ہے کہ خود اسلام کی حمایت و نگہبانی کرنے والوں کے گروہ میں شامل ہو اور اس سلسلے میں جد و جہد کرے ۔

'من کثر . . . الخ' (جس نے کسی قوم کو زیادہ کیا وہ اس قوم میں سے ہے) کے مطابق احتمال ہے کہ اس بے استطاعت کو اس مکرم گروہ میں شامل کرلیں گے ۔ یہ نا چیز خود کو اس بڑھیا کی طرح سمجھتا ہے جو سوت کی ایک انٹی لے کر حضرت یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل ہوئی تھی ۔

امید ہے بندہ جلد ہی ، ان شاء اللہ العزیز ، حضور کے نیاز سے مشرف ہوگا ۔ چوں کہ حضور کو خدا تعالیٰ نے بادشاہ کی قربت اور یہ استطاعت بہ درجۂ اتم ارزانی فرمائی ہے ، اس لیے یہ توقع ہے کہ حضور کیا خلوت اور کیا جلوت ، ہر جگہ شریعت مصطفوی (آپ صلعم اور آپ ص کی آل اولاد پر سب سے اعلیٰ و افضل درود و سلام ہو) کی اشاعت میں کوشاں ہوں گے اور مسلمانوں کو اس ادبار سے نجات دلائیں گے ۔

عریضہ بردار مولانا حامد کو آپ کی سرکار 'اقبال آثار' سے ایک

مقررہ وظیفہ ملتا ہے ؛ پچھلے سال اسے حضور سے وہ وظیفہ مل گیا تھا ، اور اب اس سال بھی وہ اسی امید سے آ رہا ہے !

خدا آپ کو دنیا و آخرت کی دولت سے مالا مال کرے !

(مکتوبات امام ربانی جلد اول)

مکتوب ۵۴

[یہ خط بھی جناب سیادت پناہ شیخ فرید کو اس موضوع کے بارے میں لکھا گیا کہ بدعتی کی صحبت سے جو نقصان پہنچتا ہے وہ کافر کی صحبت کے نقصان سے کہیں زیادہ ہوتا ہے ، اور بدعتیوں میں سب سے بدتر شیعہ لوگ ہیں]

'ومایناسب . . . . الخ' (اور اس سلسلے میں جو بات مناسب ہے ،ـــ اللہ تبارک و تعالی آپ کے اجر کو بڑھائے ، قدر کو اونچا کرے ، معاملے کو آسان فرمائے اور سید البشر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے طفیل کہ جو آنکھوں کی ہر قسم کی بیماری سے پاک ہیں ، آپ کا سینہ کھول دے !) وہ یہ ہے کہ من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ ، (یعنی جو شخص کسی انسان کا احسان نہیں مانتا ، وہ خدا کا بھی شکر نہیں بجا لاتا) اس لیے ہم فقیروں پر آپ کے احسانات کا شکریہ واجب و لازم ہے ۔ سب سے پہلے تو یہ کہ آپ ہی ہمارے حضرت خواجہ (باقی باللہ) کی جمعیت کا سبب بنے ، آپ ہی کے طفیل ہم نے اس جمعیت میں خدائے عزوجل سے لو لگائی اور اس کے طالب ہوئے اور بے حد حظ اٹھایا ۔ دوسرے ، جب 'کبرت بموت الکبراء' (بزرگوں کے مرنے کے سبب میں بزرگ سمجھا گیا) کے مصداق اس طبقے تک نوبت پہنچی تو اس وقت بھی آپ ہی فقرا کے اجتماع اور طالبان حق کے انتظام کا وسیلہ و باعث تھے ۔ اللہ جل جلالہ آپ کو اس کی جزائے خیر دے ! :

گر برتن من زبان شود هر موی
یک شکر تو از هزار نتوانم کرد

(اگر میرے جسم کا ہر ہر رواں زبان بن جائے تو پھر بھی میں تیرے شکر کا ہزارواں حصہ ادا نہیں کرسکتا)

خدائے عز شانہ سے دعا ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں آپ کو بہ حرمت سید المرسلین (آپ صلعم اور آپ صلعم کی اولاد پر سب سے اعلیٰ و افضل درود و سلام ہو!) ہر ناپسندیدہ و ناشائستہ امر سے محفوظ و مصئون رکھے!

آپ کی صحبت گرامی سے دور ہونے کے سبب اس فقیر کو یہ معلوم نہیں کہ اس محفل مبارک میں کس کس قسم کے لوگوں کی گنجائش ہے اور تنہائی و بزم کا انیس کون ہے:

خوابم بشد از دیدہ درین فکر جگر سوز
کاغوش کہ شد منزل و آسائش خوابت

(میری نیند اس جگر سوز فکر میں اڑ گئی کہ کس کی آغوش تیری نیند کی منزل و آسائش بنی)

آپ یقین مانیں کہ جس قدر فساد و خرابی کا باعث ایک بدعتی کی صحبت ہوتی ہے اتنی کافر کی صحبت ضرر رساں نہیں ہوتی۔ اور بدعتیوں میں جو سب سے زیادہ برے بدعتی ہیں، وہ وہ لوگ ہیں جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم سے کینہ و بغض رکھتے ہیں۔ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان لوگوں کو کافر کہا ہے۔ 'یغیظ بہم الکفار' (. . . . تاکہ ان کے ذریعے کفار کو غیظ سے بھر دے)۔ قرآن و شریعت کی تبلیغ صحابۂ کرام رض نے کی ہے۔

اگر وہ مطعون ہوتے ہیں تو قرآن و شریعت پر طعن لازم آتا ہے۔ قرآن کو جمع کیا ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے۔ سو اگر عثمان رض مطعون ہیں تو قرآن بھی مطعون ٹھہرتا ہے (توبہ نعوذ باللہ) (اللہ تعالیٰ کی پناہ ہے ان بے دینوں کے اعتقاد سے!)

صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے درمیان جو اختلاف و نزاع پیدا ہوا وہ کسی نفسانی خواہش کے تحت نہ تھا، اس لیے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت خیر میں انہیں تزکیۂ نفس

حاصل ہونے کے سبب وہ بدی کی آلائشوں سے پاک ہو چکے تھے۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ حضرت امیرؓ (علیؓ) اس معاملے میں حق پر تھے اور ان کے مخالف غلطی پر۔ لیکن یہ غلطی اجتہادی ہے اور فسق کی حدوں تک نہیں پہنچاتی۔ بلکہ اس قسم کی غلطی میں تو ملامت کو بھی گنجایش نہیں ہے، اس لیے کہ خطا وار کے واسطے بھی یہاں کچھ ثواب کا درجہ ہے۔ رہا یزید لعین تو وہ تو صحابۂ کرامؓ میں سے نہیں ہے۔ اس کی بد بختی میں کسے شک ہے؟ جو کام اس بدبخت نے کیا ہے وہ کسی فرنگی کافر نے بھی نہ کیا ہوگا۔ یہ جو اہل سنت کے بعض علما نے اس لعین پر لعنت بھیجنے سے اغماض برتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ اس کے حامی یا اس سے خوش ہیں، بلکہ انہوں نے 'رجوع اور توبہ' کے احتمال کو ملحوظ رکھا ہے۔

آپ کی محفل شریف میں ہر روز قطب زماں بندگی مخدوم[۸] جہانیاں کی مستند کتب میں سے کچھ نہ کچھ پڑھا جانا چاہیے تاکہ پتا چلے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ کرامؓ نے کس طرح مدح و ستایش کی ہے اور کون سے ادب سے وہ مالا مال تھے، تاکہ بد اندیش مخالفین شرمندہ و ذلیل ہوں۔ اس دور میں بد اندیش لوگوں نے حد سے زیادہ مبالغے سے کام لیا ہے اور وہ ملک کے اطراف میں پھیل گئے ہیں۔ اسی سبب سے اس ضمن میں یہ چند حروف لکھنے پڑے تاکہ آپ کی صحبت شریفہ میں اس قسم کے بد اندیشوں کو بار حاصل نہ ہو۔
خدا تعالیٰ آپ کو پسندیدہ روش پر قائم و ثابت رکھے!

(مکتوبات امام ربانی، جلد اول)

مکتوب ۶۵

[خان اعظم[۹] (عزیز کوکلتاش) کو لکھا گیا۔ اس میں اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی و ضعف پر اظہار تاسف کیا گیا اور اہل اسلام کی تقویت اور احکام الٰہی کے اجرا کے لیے اکسایا گیا تھا اور یہ کہ خدا تمھاری تائید فرمائے اور تمھیں احکام الٰہی کے بلند کرنے میں دشمنان اسلام پر فتح و نصرت عطا فرمائے]

مخبر صادق آں حضرت صلعم (آپ پر افضل و اکمل سلام ہو!) نے فرمایا ہے ''اسلام کی ابتدا غربت میں ہوئی اور یہ (جلد ہی) عروج کو پہنچے گا جیسا کہ یہ شروع ہوا تھا ۔ پس مژدہ ہے غریبوں کے لیے۔''

اسلام کی کس مپرسی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ کفار کھلم کھلا اسلام کو برا بھلا کہتے اور مسلمانوں کی مذمت کرتے ہیں ۔ اور بے تحاشا کوچہ و بازار میں احکام کفر کو جاری کرنے اور اہل کفر کی مدح و ستایش میں مصروف ہیں ، جب کہ مسلمانوں کو احکام الٰہی کی اشاعت کی اجازت نہیں ہے اور دین و شریعت کی پیروی میں انہیں مطعون و قابل مذمت گردانا جاتا ہے :

بیت

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز
بسوخت عقل ز حیرت کہ این چہ بوالعجبی ست[۱۰]

(پری نے چہرہ چھپایا ہوا ہے اور بھوت ناز و ادا دکھا رہا ہے ۔ عقل حیرانی سے جل اٹھی کہ یہ کیا بوالعجبی ہے ۔)

سبحان اللہ وبحمدہ ۔ کسی کا قول ہے کہ 'غلبۂ دین شمشیر کے تحت ہے' اور یہ کہ شرع متین کی اشاعت و رونق بادشاہوں سے وابستہ ہے لیکن اب معاملہ بالکل برعکس ہو گیا ہے ۔ ہا ! کس قدر حسرت و ندامت کا مقام ہے ۔

آج اس دور میں آپ کا مبارک وجود غنیمت ہے اور اس وقت اس معرکۂ کفر و اسلام میں ، جس میں اسلام کا پلہ ہلکا جا رہا ہے ، ہمیں آپ کے سوا کوئی دلیر سپاہی نظر نہیں آ رہا ۔ خدائے عز شانہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حرمت کے صدقے میں آپ کا حامی و ناصر ہو !

حدیث میں آیا ہے 'لن یومن احدکم......الخ' (تم میں سے ایک بھی ایسا ایمان نہیں لایا جسے یہ کہا جائے کہ تحقیق یہ دیوانہ ہے) آج وہ دیوانگی کہ جس کی بنیاد اسلام کی بے پناہ غیرت ہے ، آپ ہی میں دیکھنے میں آ رہی ہے ۔ الحمدللہ سبحانہ علیٰ ذالک ۔ آج کا

دور وہ دور ہے کہ دین اسلام سے متعلق معمولی سے کار خیر کو بھی بہت بڑے اجر کے ساتھ اور پوری توجہ سے شرف قبولیت حاصل ہوتا ہے ۔ اصحاب کہف[۱۱] نے سوائے ہجرت کے اور تو کوئی معرکے کا کام نہیں کیا تھا ، لیکن ان کے اسی معمولی عمل نے انہیں کس قدر ساکھ بخشی ہے ۔ اگر سپاہی دشمنوں کے پر امن اور خاموش رہنے کے وقت کی نسبت ان کے غلبے کے موقع پر ذرا سی بھی کوشش کر لیں تو ان (سپاہیوں) کی خاصی ساکھ بن جاتی ہے ۔ اور یہ جو ''جہاد گفتار'' آج آپ کو میسر ہے وہ جہاد اکبر سے کچھ کم نہیں ہے ۔ اسے غنیمت جانیں اور 'هل من مزید' کا نعرہ بلند کریں اور اس جہاد زبان کو جہاد سیف سے افضل سمجھیں ۔ ہم ایسے بے دست و پا فقیر لوگ تو اس دولت و نعمت سے محروم ہیں ۔

''صاحبان نعمت کے لیے نعمتیں مبارک ہوں ؛ عاشق کے لیے ہجر دوست کا غم زیادہ خوش گوار ہے جس کے وہ گھونٹ پیتا ہے ۔''

دادیم ترا ز گنج مقصود نشان گر ما نرسیدیم تو شاید برسی

(ہم نے تجھے خزانۂ مقصود کا پتا بتا دیا ہے ؛ اگر ہم نہیں پہنچے تو شاید تو ہی پہنچ جائے ۔)

حضرت خواجہ[۱۲] احرار قدس اللہ فرمایا کرتے تھے کہ ''اگر میں مشیخت اختیار کر لوں تو دنیا میں کسی شیخ کو بھی مرید نہ ملیں ، لیکن میں کسی اور کام پر مامور ہوں ، اور وہ ہے شریعت کی اشاعت اور ملت بیضا کی حمایت ۔'' چنانچہ اسی سبب سے آپ سلاطین کے پاس جاتے اور انہیں اپنے تصرف سے اپنا مطیع و فرمان پزیر بنا کر انھی کے ذریعے دین کی تبلیغ فرماتے ۔ چوں کہ اللہ تعالی نے آپ (مکتوب الیہ) کی اس بزرگ خاندان سے محبت کے طفیل (اللہ ان کے اسرار کو پاک کرے !) آپ کی زبان کو بڑی تاثیر بخشی ہے ، اور بہ حیثیت مسلمان کے آپ کی بزرگی و عظمت اپنے ہم عصروں میں واضح و روشن ہے ، اس لیے آپ سے یہ استدعا ہے کہ آپ اس امر کی کوشش فرمائیں کہ کم از کم کافروں کی وہ بڑی بڑی بدعتیں اور رسوم کبیرہ جو مسلمانوں میں

رواج پکڑتی جا رہی ہیں، پوری طرح مٹا ڈالی اور ختم کی جائیں تاکہ مسلمان ان برائیوں سے محفوظ رہیں۔ اللہ جل جلالہ' آپ کو ہماری اور تمام مسلمانوں کی طرف سے اس کی جزائے خیر دے!

پچھلی حکومت میں تو دین مصطفٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے جو بغض و عناد تھا وہ واضح تھا، لیکن اس حکومت میں بہ ظاہر وہ دشمنی و عناد نہیں ہے، اور اگر کچھ ہے تو وہ محض عدم واقفیت کے سبب ہے۔ ڈر اس بات کا ہے کہ کہیں یہاں بھی وہی بغض و عناد کار فرما نہ ہو جائے اور مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے: **مصرع**

چو بید بر سر ایمان خویش می لرزم

(بید کی طرح میں اپنے ایمان کے متعلق لرز رہا ہوں)

اللہ تعالٰی ہمیں اور آپ سب کو سیدالمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں ثابت قدم رکھے!

یہ عاجز یہاں بغیر کسی مقصد و تقریب کے آیا تھا؛ دل نے نہ چاہا کہ آپ کو اپنی آمد سے بے خبر رکھوں، بعض سود مند باتوں کے لکھنے سے اجتناب برتوں اور اس طبعی محبت سے کہ فطری مناسبت کے واسطے سے ہے، آگاہ نہ کروں۔ آں حضرت صلعم کا فرمان ہے 'من احب......الخ' یعنی جو شخص اپنے مسلمان بھائی سے محبت کرتا ہے اُسے کہو کہ وہ اپنی اس محبت سے اس دوست کو آگاہ کرے۔

آپ پر اور ان تمام لوگوں پر سلامتی ہو جنھوں نے ہدایت کی پیروی کی! (مکتوبات امام ربانی، جلد اول)

مکتوب ۸۱

[لالا بیگ کو لکھا گیا۔ اس میں بھی اسلام کی اشاعت کے لیے کہا اور اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی و ضعف اور ملعون کافروں کے غلبے کا ذکر کیا گیا تھا]

اللہ تعالٰی ہم میں اور آپ میں اسلام کی غیرت زیادہ کرے!

کوئی ایک قرن سے اسلام کی بے چارگی و پستی کچھ اس

ذکر پر آ ٹھہری ہے کہ کفار نہ صرف یہ کہ سلطنت اسلامی میں کھلم کھلا احکام کفر کی تبلیغ و اشاعت کر رہے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ وہ اس بات کے خواہاں ہیں کہ اسلامی شرائع سرے ہی سے مٹا ڈالے جائیں اور مسلمانوں کا نام و نشان بھی نہ رہنے پائے۔ نوبت یہاں تک آ پہنچی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنے مذہبی فرائض ادا کرتا ہے تو یہ لوگ اسے قتل کر دیتے ہیں ۔ ہندوستان میں گائے کی قربانی ایک اسلامی فریضہ ہے ، لیکن ہندو لوگ جزیہ دینا قبول کر لیں گے مگر گائے کی قربانی پر کسی طرح راضی نہ ہوں گے ۔ سو اگر بادشاہت کے آغاز ہی میں اسلام کی ترویج و اشاعت کی گئی اور مسلمانوں کی ساکھ بن گئی تو فبہا ، ورنہ خدا نہ کرے خدا نہ کرے اگر ذرا سی بھی تاخیر کی گئی تو مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو جائے گا ۔ الغیاث! الغیاث! ثم الغیاث! الغیاث! بہر حال اب دیکھنا یہ ہے کہ کس صاحب اقبال کو یہ سعادت نصیب ہوتی ہے اور کون سا صاحب ہمت اس دولت پر قابض ہوتا ہے ؟ 'ذالک فضل اللہ......الخ' (یہ اللہ کی دین ہے جسے دے ، اور اللہ صاحب فضل عظیم ہے)

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سید المرسلین (آپ اور آپ کی اولاد پر افضل و اکمل درود و سلام ہو !) کی اطاعت میں ثابت قدم رکھے ! والسلام (مکتوبات امام ربانی ، جلد اول)

مکتوب ۱۶۷

[ایک ہندو ہردے رام کے نام لکھا گیا جس نے اس بلند رتبہ جماعت سے اپنے خلوص کا اظہار کیا تھا ۔ اس خط میں آسے خدائے برحق ، کہ جس کا کوئی شریک و ثانی نہیں ہے ، کی عبادت کی ترغیب دلائی گئی اور جھوٹے خداؤں کی پرستش سے پرہیز کرنے کے لیے کہا گیا]

آپ کے دو خطوط[۱۳] وصول پائے ۔ ان دونوں سے آپ کی فقیروں سے محبت اور اس بلند رتبہ جماعت سے التجا کا پتا چلا ۔ سبحان اللہ کیسی نعمت ہے کہ حق تعالیٰ ہر ایک کو اس سے نوازے ! ثانیاً ع

من آنچہ شرط بلاغ ست با تو می‌گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر و خواہ ملال

(پیغام پہنچانے کی جو شرط ہے وہ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں؛ باقی تم میری باتوں سے خواہ نصیحت پکڑو خواہ ملول ہو، یہ تمھارا اپنا معاملہ ہے)

واضح ہو کہ ہمارا اور تمھارا پروردگار، بلکہ آسمانوں میں، زمینوں میں، بلندیوں میں اور پستیوں میں جو بھی مخلوق ہے، ان سب کا پروردگار ایک ہی ہے، جس کا کوئی شریک و ثانی نہیں - جو ہم شکل اور ہم مثل سے پاک اور شکل و مثال سے مبرا ہے - اس معبود حقیقی سے پدری یا فرزندی کی نسبت ٹھہرانا محال، اس کے حضور میں مشابہت و مماثلت کی کیا مجال - اس عز و جل کی شان میں اتحاد و حلول کی آلایش، مکروہ و زشت ہے، اور اس ہستی مقدس کے بارے میں پوشیدہ اور ظاہر گمان رکھنا قبیح - وہ 'زمانی' نہیں ہے کہ زمانہ تو اس کا پیدا کردہ ہے؛ 'مکانی' نہیں ہے کہ 'مکان' تو اس کا بنایا ہوا ہے[۱۳] - نہ تو اس کے وجود کا کوئی آغاز ہے اور نہ ہی اس کی بقا کی انتہا - جو کچھ بھی خیر و کمال ہے وہ اسی پاک ہستی سے قائم ہے، اور جو کچھ بھی نقص و زوال ہے وہ اس بزرگ و برتر سے دور ہے - اس لیے صرف اسی کی ذات اقدس عبادت و پرستش کے لائق و مستحق ہے -

رام اور کرشن اور اسی قسم کی دوسری شخصیتیں، جن کی ہندو پرستش کرتے ہیں، اس ہستی مطلق کی ادنٰی مخلوقات میں سے ہیں - انھیں ماں باپ نے جنم دیا ہے - رام، جسرتھ کے بیٹے، لچھمن کے بھائی اور سیتا کے شوہر تھے - جب رام اپنی بیوی ہی کی حفاظت نہیں کر سکتے تو وہ بے چارے کسی دوسرے کی کیا مدد کریں گے - کچھ عقل دور بیں سے کام لینا چاہیے - ان کی پیروی سے پرہیز لازم ہے - کس قدر بری بات ہے کہ کوئی شخص تمام جہانوں کی مخلوقات کے پروردگار کو رام اور کرشن کے نام سے یاد کرے - یہ تو ایسے

ہی ہے جیسے ایک عظیم الشان بادشاہ کو رذیل خاکروب کے نام سے یاد کیا جائے۔ رام اور رحمان کو ایک سمجھنا بہت بڑی جہالت ہے۔ بھلا خالق اور مخلوق کیوں کر ایک ہو سکتے ہیں، اور 'بے مانند' 'مانند' کے ساتھ کیسے متحد ہو سکتا ہے۔ رام اور کرشن کی پیدائش سے پہلے پروردگار عالم کو رام اور کرشن تو نہیں کہا جاتا تھا ؛ پھر یہ کیا بات ہے کہ ان کے وجود میں آنے کے بعد اس ہستی اقدس کو ان کے ناموں سے پکارا اور ان کی یاد کو یاد الٰہی سے تعبیر کیا جائے حاشا و کلا ! ثم حاشا و کلا[۱۵]۔

ہمارے پیغمبروں نے (علیہم الصلوات و التسلیمات) کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے قریب ہو گزرے ہیں، ہمیشہ مخلوق کو اس خالق واحد کی عبادت کی تلقین و ترغیب فرمائی اور عبادت غیر سے منع فرمایا ہے۔ خود کو وہ ہمیشہ بندہ و عاجز سمجھتے اور اس وحدہ' لا شریک کی عظمت و ہیبت سے ڈرتے اور کانپتے رہے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوؤں کے اوتار لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف مائل کرتے اور خود کو خدا سمجھتے رہے۔ اگرچہ وہ اس ذات باری کے قائل تو ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا خود ان میں حلول کر آیا ہے۔ گویا اس طرح وہ بھی خدا بن گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلاتے اور خود کو خدا (دیوتا) کہلاتے ہیں، اور یوں ناجائز باتوں میں بری طرح الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ اس زعم میں ہیں کہ خدا (دیوتا) کو کسی چیز سے روکا نہیں جا سکتا۔ وہ اپنی مخلوق میں جو دخل دینا چاہے دیتا ہے۔ اور اسی قسم کے دیگر بے شمار فاسد خیالات کا شکار ہیں۔ ضلوا فاضلو[۱۶]۔ اس کے برعکس پیغمبروں نے (علیہم الصلوات والتسلیمات) جن چیزوں سے لوگوں کو منع فرمایا آن سے خود بھی پورے طور پر بچتے رہے۔ انہوں نے خود کو ہمیشہ دوسرے انسانوں کی طرح انسان کہا۔

ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا[۱۷]

(مکتوبات امام ربانی، جلد اول)

مکتوب ۱۹۲

[شیخ بدیع الدین سہارن پوری[۱۸] کے اس استفسار کے جواب میں لکھا گیا کہ 'مقام رنگین' سے ، جو حضرت صدیق اکبر رض کے مقام سے بلند تر ہے ، کون (آگے) گیا تھا]

برادر عزیز شیخ بدیع الدین نے یہ استفسار کیا تھا کہ ''یہ جو گیارھویں عرض داشت میں ، کہ حضرت خواجہ (باقی باللہ) قدس سرہ' کو لکھی گئی تھی ، مذکور ہے کہ ایک 'مقام رنگین' پر (جو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام سے بلند تر ہے) وصل میسر ہوا تو اس کے کیا معنی ہیں ؟'' اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو رشد و ہدایت فرمائے ! واضح ہو کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ اِس عبارت میں ، ہر چند کہ لفظ 'ہم' بھی اس میں آیا ہے ، تفضیل لازمی طور پر وارد ہوئی ہے ۔ بالفرض ہم مان بھی لیں تو ہم یہ کہیں گے کہ یہ بات اور دیگر باتیں ، جن کا مذکور اس عرض داشت میں ہوا ہے ، آن واقعات میں سے ہیں جو ہم نے اپنے پیر و مرشد کو لکھے ۔ اور یہ اس جماعت (نقش بندی) کی ایک مقررہ بات ہے کہ ان کے ساتھ جو بھی واقعات رونما ہوتے ہیں ، خواہ وہ صحیح ہوں خواہ ناقص ، ان کا اظہار فوراً اپنے مرشد سے کرتے ہیں ؛ کیوں کہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں بھی تاویل و تعبیر کا احتمال ہے ، لہذا اس کے اظہار کے سوا چارہ نہ تھا ۔ اور زیر بحث مسئلے میں اس حقیقت کو جان لینے سے کسی قسم کا اندیشہ لازم نہیں آتا ۔

اور دیگر حل یہ ہے کہ اس بات کو جائز سمجھا گیا ہے کہ اگر ایک 'غیر نبی' کی کسی ایک 'جزئی' میں نبی پر فضیلت متحقق ہو جائے تو اس میں کوئی باک نہیں ہے بلکہ یہ امر واقعہ ہے ؛ جیسا کہ شہدا کے معاملے میں یہ بات بہت زیادہ واقع ہوئی ہے اور انبیاء علیہم السلام میں نہیں ہے ۔ حالانکہ نبی علیہ الصلوات والتسلیمات کو فضیلت کلی حاصل ہے ۔ تو اس لحاظ سے اگر غیر نبی کی سیر اس 'جزئی' کے کمالات میں واقع ہو اور وہ خود کو اس مقام میں بلند تر پائے تو

یہ بھی جائز ٹھہرے گا ۔ اگرچہ اس کے لیے اس مقام کا حصول نبی ھی کی اطاعت کے وسیلے سے ہے اور نبی بھی حدیث 'من سن حسنته....الخ[۱۹]' کے مطابق اس مقام سے پورا پورا بہرہ مند ھوتا ہے ۔ لہٰذا جب غیر نبی کی جزئی فضیلت کے لیے نبی مجوز ٹھہرا تو وہ فضیلت غیر نبی پر بہ طریق احسن جائز ھوگی ۔ فلا اشکال اصلاً (اور یہ قطعاً مشکل نہیں ہے) ۔

والسلام

(مکتوبات امام ربانی ، جلد اول)

مکتوب ۱۵

[سامانہ شہر کے خطیب کی سرزنش میں ، کہ جس نے عید قرباں کے موقع پر خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم ، کا ذکر خطبے میں نہ کیا تھا ، وھاں کے سادات عظام ، قاضیوں ، باشندوں اور حکام کو لکھا گیا]

'ومایناسب........الخ' (جو چیز مناسب ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے لیے تعریف ہے اور اس کے برگزیدہ بندوں پر سلامتی)

سامانہ شہر کے قابل احترام خدام ، سادات عظام ، قاضیوں ، باشندوں اور حکام کے لیے یہ امر نہایت ھی تکلیف دہ ہے کہ وھاں کے خطیب نے عید قرباں کے خطبے میں خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر ترک کر دیا اور ان کے مبارک نام پڑھنے سے اجتناب کیا ، اور یہ کہ جب کچھ لوگوں نے اس کی اس حرکت پر اعتراض کیا تو بجائے اس کے کہ وہ اسے اپنی بھول پر محمول کرتے ھوئے معذرت کرتا ، الٹا سرکشی کے ساتھ پیش آیا اور کہنے لگا کہ "اگر خلفاء راشدینرض کا ذکر نہیں کیا گیا تو کون سی آفت آ گئی ۔" ھم نے یہ بھی سنا ہے کہ وھاں کے عام اور سرکردہ لوگوں نے اس سلسلے میں سہل انگاری سے کام لیا ہے اور اس دریدہ دھن خطیب کے ساتھ درشتی و تلخی سے پیش نہیں آئے : ع

وائے نہ یکبار ، کہ صد بار وائے

اگرچہ خلفاء راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ذکر خطبے میں

ضروری نہیں ہے ، لیکن یہ اہل سنت کے شعائر میں سے ہے ۔ شکر اللہ تعالیٰ سعیہم [۲۰] ۔ صرف وہی شخص اسے دیدہ و دانستہ اور سرکشی سے ترک کرتا ہے جس کا دل مریض اور باطن خبیث ہو ۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ اس نے کسی تعصب یا دشمنی کی بنا پر ایسا نہیں کیا ہوگا تو بھی 'وعید من تشبہ......... الخ [۲۱]' کا کیا جواب دے گا اور تہمت کی جگہوں سے کہ 'اتقو مواضع التہم [۲۲]' کیوں کر رہائی پائے گا ؟ اگر خلفاء راشدین کی تقدیم و تفضیل میں توقف کرتا ہے تو پھر اہل سنت کے طریقے کو ترک کرنے والا ہے ، اور اگر ان کی محبت میں پس و پیش کرتا ہے تو جب بھی اہل حق کے زمرے سے خارج ہو جاتا ہے اور عجب نہیں کہ اس بے حقیقت نے ، کہ کشمیری ہے ، یہ خباثت کشمیر کے بدعتیوں سے اخذ کی ہو ۔

اس پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ خلفاء راشدین رض کی افضلیت تمام صحابۂ کرام رض اور تابعین رض کے نزدیک طے شدہ امر ہے ۔ چناں چہ بڑے بڑے اماموں کی جماعت نے ، کہ امام شافعی رح ان میں سے ایک ہیں ، اس مسئلے کو بیان کیا ہے ۔ شیخ الامام ابوالحسن اشعری [۲۳] فرماتے ہیں ''حضرت ابوبکر رض پھر ان کے بعد حضرت عمر رض کو باقی ساری امت پر قطعی فضیلت ہے ۔'' امام ذہبی [۲۴] فرماتے ہیں کہ ''حضرت علی رض کی یہ روایت ان کی خلافت و حکومت کے زمانے سے اور ان کے بے شمار احباب کی موجودگی میں متواتر چلی آتی ہے کہ پہلے حضرت ابوبکر رض پھر حضرت عمر رض امت میں سب سے زیادہ افضل ہیں ۔'' ذہبی ہی فرماتے ہیں ''کہ اسی (۸۰) سے زیادہ لوگوں نے ، جن میں سے بعض کے نام بھی لیے گئے ہیں ، حضرت علی رض سے اس کو روایت کیا ہے ۔'' پھر ذہبی فرماتے ہیں ''اللہ تعالیٰ رافضیوں کا برا کرے کہ وہ کتنے بڑے جاہل ہیں !'' بخاری [۵] ، کہ جن کی کتاب خدا کی کتاب کے بعد سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے ، حضرت علی رض سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا تھا ''حضور سرور کائنات علیہ الصلواۃ والسلام کے بعد تمام لوگوں میں سے بہتر ابوبکر رض ہیں ، پھر عمر رض اور پھر ایک اور شخص ۔'' اس پر آپ کے صاحب زادے محمد بن حنیفہ رض نے کہا کہ ''پھر

آپ ؟ '' تو حضرت علی رض نے فرمایا ''میں مسلمانوں کی جماعت کا ایک عام آدمی ہوں ۔'' اور اس قسم کی روایات آپ رض اور دیگر بڑے بڑے صحابہ اور تابعین سے بہت مشہور ہیں ، جن کا انکار سوائے جاہل یا دشمن کے اور کوئی نہیں کر سکتا ۔ اس بے انصاف سے یہ کہنا چاہیے کہ ہمیں تو پیغمبر (صلعم) کے تمام صحابۂ کرام رض سے محبت کرنے کا حکم دیا اور ان سے بغض و عناد رکھنے سے منع کیا گیا ہے ۔ خلفاء راشدین ، اکابر صحابہ کرام رض اور سرور دو عالم (صلعم) کے اقربا میں سے ہیں ، اس لیے وہ اس محبت و عقیدت کے زیادہ لائق و سزاوار ہیں ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ''کہہ دیجیے اے پیغمبر صلعم کہ میں سوائے رشتہ داروں کے ساتھ دوستی و محبت کے تم سے اس تبلیغ کا کوئی اجر نہیں چاہتا ۔'' اور آپ صلعم نے فرمایا ''لوگ میرے دوستوں کے معاملے میں احکام خداوندی کو مد نظر رکھیں اور میرے بعد ان کو نشانہ نہ بنائیں ۔ جو ان سے محبت کرے گا وہ میری محبت کی وجہ سے محبت کرے گا ؛ جو ان سے دشمنی رکھے گا وہ مجھے دشمن سمجھنے کی وجہ سے دشمنی رکھے گا ؛ جو ان کو تکلیف دے گا اس نے مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ تعالیٰ کو تکلیف پہنچائی ، اور جس نے خدا کو تکلیف پہنچائی تو قریب ہے کہ خدا اس سے مواخذہ فرمائے ۔'' ہندوستان میں آغاز اسلام سے لے کر اس وقت تک شاید ہی کوئی اس قسم کا بدبو دار پھول۲۶ کھلا ہو ۔ کوئی بعید نہیں ہے کہ اس معاملے سے سارے شہر پر تہمت آئے بلکہ ہندوستان ہی سے اعتماد اٹھ جائے ۔ بادشاہ وقت (خدا اسے دشمنان اسلام پر فتح و نصرت عطا فرمائے) اہل سنت اور حنفی مذہب ہے ؛ اس کے عہد میں اس قسم کی بدعت کرنا بہت بڑی جرأت ہے ؛ بلکہ حقیقت میں بادشاہ سے جھگڑا اور اس کی اطاعت سے سرکشی کرنا ہے ۔ تعجب ہے کہ وہاں کے مخدومین عظام اس معاملے میں خود کو قابل معافی سمجھ رہے اور سہل انگاری سے کام لے رہے ہیں ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اہل کتاب کی مذمت میں فرماتا ہے ''اگر اللہ تعالیٰ سے خصوصی نسبتیں رکھنے والے اور بڑے بڑے علما ان کو بری باتیں کہنے اور حرام مال کھانے سے نہ روکتے تو ان کے کارنامے بہت برے ہوتے ۔''

اور اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے ''اگر وہ اس بڑے کام سے جو وہ کر رہے تھے ، نہ رک جاتے تو وہ بہت بڑا کام کر پاتے ۔''

اس قسم کے واقعات میں ذرا سی بھی غفلت برتنا گویا بدعتیوں کو دلیر کرنا اور دین میں رخنہ ڈالنا ہے ۔ یہ اسی سستی و تغافل کا نتیجہ ہے کہ مہدوی[۲۷] فرقے کے پیروکار اہل حق کو کھلم کھلا باطل کی دعوت دے رہے ہیں اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد دو ایک اہل حق کو اس طرح اپنی طرف لے جاتے ہیں جیسے بھیڑیے ریوڑ سے بکریاں اٹھا لے جاتے ہیں ۔

آپ احباب کو مزید کیا درد سر دوں ؛ اس وحشت انگیز خبر کے سننے سے چوں کہ طبیعت میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور میری 'رگ فاروقی' بھڑک اٹھی تھی ، اس لیے یہ چند حروف لکھنے پڑے ؛ امید ہے آپ معاف فرمائیں گے ۔

سلامتی ہو آپ پر اور ان سب پر جو راستی و حقیقت کی پیروی کرتے اور آں حضرت صلعم (علیہ و علیٰ آلہ الصلوات والتسلیمات والبرکات) کی اطاعت کو لازمی گردانتے ہیں! (مکتوبات امام ربانی ، جلد دوم)

مکتوب ۲۹

[فضیلت پناہ شیخ عبدالحق[۲۸] دہلوی کے نام ۔ اس بیان میں کہ اس جہان کی سب سے عمدہ پونجی حزن و اندوہ اور اس دسترخوان کی سب سے زیادہ خوش مزہ نعمت مصیبت و الم ہے]

الحمد للہ ! سلام ہو خدا کے برگزیدہ بندوں پر !

میرے مخدوم و مکرم ! اگرچہ مصیبتوں کے دوران میں رنج و اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے تاہم اس ذات باری سے بخشش کی امید ضرور ہے ۔ واضح ہو کہ اس جہان کی سب سے عمدہ متاع اندوہ و غم اور اس دسترخوان کی لذیذ ترین نعمت رنج و الم ہیں ۔ ان شکر پاروں کو گویا کڑوی دوائی میں لپیٹ کر رکھا گیا اور اس بہانے سے آزمائش کی راہ کھول دی گئی ہے ۔ صاحبان اقبال کی نظریں ان کی مٹھاس پر جمی رہتی ہیں ، اور وہ اس تلخی کو شکر کی مانند چباتے اور کڑواہٹ کو

صفرا کے برعکس میٹھا پاتے ہیں۔ بھلا انہیں یہ رنج و الم اور اندوہ و غم شیریں کیوں نہ معلوم ہوں کہ عشاق کے لیے محبوب کی ہر ہر ادا میں شیرینی و حلاوت ہے۔ البتہ جو کوئی علتی (مریض) ہے اس کے لیے ان میں کڑوا پن ہے، اس لیے کہ وہ 'ماسو اللہ' (علائق دنیوی) کی محبت میں گرفتار ہے۔

سعادت مندوں کو محبوب کی ایذا رسانی سے اس قدر لذت و حلاوت حاصل ہوتی ہے کہ وہ اس کے انعام میں بھی اس لذت کا تصور نہیں کر سکتے۔ اگرچہ یہ دونوں چیزیں (انعام و ایذا) محبوب ہی کی طرف سے ہیں، لیکن 'ایذا رسانی' میں عاشق کے نفس کو کسی قسم کا دخل حاصل نہیں ہے، اور انعام میں نفس کی خواہش کے مطابق قیام ہے۔

''صاحبان نعمت کے لیے اسباب نعمت مبارک ہوں!''

''اے اللہ ہمیں ان کے اجر سے محروم نہ رکھ اور ان کے بعد ہمیں آزمائش میں نہ ڈال!'' اسلام کے اس دور بے کسی میں آپ کا وجود مبارک مسلمانوں کے لیے غنیمت ہے۔ اللہ تعالٰی آپ کو سلامت رکھے! والسلام (مکتوبات امام ربانی، جلد دوم)

مکتوب ۹۲

[میر محمد نعمان[۲۹] کے نام؛ اس امر کے بیان میں کہ 'ولایت[۳۰]' قرب الٰہی سے حاصل ہوتی ہے اور اس کے لیے کرامات و خوارق کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ نیز اس ذکر میں کہ دنیاوی بادشاہوں کو سجدہ و سلام کرنا جائز ہے یا نہیں]

''اور جو مناسب بات ہے وہ یہ ہے کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے۔ اور سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر!''

سیادت مآب برادر عزیز میر محمد نعمان کو خدا ہمیشہ خوش رکھے! واضح ہو کہ ضروری نہیں کہ ایک صاحب ولایت صاحب کرامت بھی ہو۔ اور جس طرح علما حصول کرامات میں مکلف (تکلیف دیا گیا، باندازۂ طاقت کام بتایا ہوا) نہیں ہیں، اسی طرح اولیا بھی ظہور کرامات

میں مکلف نہیں ہیں ، کیوں کہ ولایت عبارت ہے خدائے جل جلالہ کے قرب سے۔ اور یہ قرب اللہ تعالیٰ اپنے اولیا کو اس وقت بخشتا ہے ، جب وہ ماسوا کو بھول جاتے ہیں۔ ایک شخص ایسا ہوتا ہے کہ اسے یہ قرب تو عطا ہو جاتا ہے ، لیکن مخلوقات کے حالات غیب سے اسے بے خبر رکھا جاتا ہے۔ پھر ایک شخص وہ ہے کہ جسے قرب بھی میسر آتا ہے اور مخلوقات کے احوال غیب سے بھی آگاہی عطا ہوتی ہے۔ تیسرے ایک شخص وہ ہے جو اس قرب سے تو محروم رہتا ہے لیکن اسے احوال غیب سے اطلاع ہوتی ہے۔ مؤخرالذکر اہل استدراج[۳۱] میں سے ہے اور پاکیزگی نفس اسے احوال غیب کے کشف میں مبتلا کرتی اور گم راہی میں ڈالتی ہے۔ آیۂ کریمہ 'ویحسبون...الخ' (اور ان کا گمان ہے کہ وہ ایک صحیح روش پر ہیں ، حالانکہ وہ جھوٹے ہیں۔ درحقیقت شیطان ان پر غالب آ چکا اور اس نے اللہ کا ذکر ان سے فراموش کرا دیا ہے۔ یہ شیطان کا گروہ ہے اور شیطان کا گروہ ہی زیاں کار ہے) گویا ایسے ہی لوگوں کے حال پر وارد ہوئی ہے۔ پہلے دو شخص جو قرب کی دولت سے مشرف ہیں ، وہ اولیٰ اللہ ہیں۔ احوال غیب کے کشف سے نہ تو ان کی ولایت میں کچھ اضافہ ہوتا ہے اور نہ احوال غیب کے عدم کشف سے کوئی نقصان۔ ان میں جو فرق ہے وہ قرب کے درجوں کے اعتبار سے ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس سے احوال غیب کا کشف نہیں ہوتا وہ صاحب کشف سے افضل اور اپنے قرب کی فضیلت کے سبب کہ جو اسے حاصل ہوتی ہے ، مؤخرالذکر سے آگے ہوتا ہے۔ صاحب 'عوارف[۳۲]' نے کہ شیخ الشیوخ اور صوفیوں کے تمام فرقوں میں مقبول ہیں ، اپنی مذکورہ کتاب میں اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔ سو اگر کسی کو میری اس بات پر یقین نہ ہو تو وہ متذکرہ کتاب دیکھ سکتا ہے۔ اس کتاب میں کرامتوں اور خوارق کے ذکر کے بعد یہ مندرج ہے کہ "کرامتیں اور خوارق خدائے عز وجل کا عطیہ ہیں۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ کسی کو اس مکاشفے سے مشرف کیا اور اس دولت سے نوازا جاتا ہے ، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ اس طبقے کے

اس شخص کو ، کہ جسے کوئی کرامتیں وغیرہ عطا نہیں ہوئی ہوتیں ، اس مقام سے بھی بلند تر درجہ مل جاتا ہے ؛ اس لیے کہ یہ تمام کرامات و خوارق تو یقین کی تقویت کے لیے قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہیں ، اور جس کو یقین محض ارزانی ہوگیا اُسے بھلا ان کرامتوں کی کیا ضرورت ہے ۔ اور یہ جو کرامات ہیں تو یہ سب ذکر ذات باری سے اور دل کے مذکورہ بالا ذکر سے خالص ہونے سے کم تر ہیں ۔''

اس طبقے کے امام خواجہ عبداللہ انصاری[۳۳] ، جن کا لقب شیخ الاسلام ہے ، اپنی کتاب 'منازل السائرین[۳۴]' میں فرماتے ہیں کہ ''فراست دو قسم کی ہے : ایک فراست تو اہل معرفت کی فراست ہے ، اور ایک فراست اہل 'جوع و ریاضت' کی ۔ جو فراست تو اہل معرفت کی ہے اس کا تعلق طالبان حق کی استعداد کے پہچاننے اور واصل بہ حق اولیا کی شناخت سے ہے اور جو اہل ریاضت اور ارباب جوع کی فراست ہے وہ احوال غائب کے کشف و انکشاف سے ، کہ ان کا تعلق مخلوقات سے ہے ، مخصوص ہے ۔ اور چوں کہ یہ لوگ خلایق سے اکثر دور رہتے ہیں ، اس لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ گویا ان کی دنیاوی مشغولی ہوتی ہے ۔ ان کے دل کشف صور (جمع صورت ، ظاہری چیزیں) کی طرف اور مخلوقات کے احوال غیب سے اطلاع دینے کی جانب مائل ہوتے ہیں ۔ ان (اہل کشف ، یعنی وہ لوگ جو حق سے منقطع ہیں) کے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے ، اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ (خود) اللہ والے اور اس کے خاص بندوں میں سے ہیں ۔ وہ اہل حقیقت کے کشف سے رو گردانی کرتے اور جو کچھ وہ (اہل حقیقت) اللہ کے بارے میں آگاہی دیتے ہیں اس پر تہمت دھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''اگر یہ لوگ اہل اللہ ہوتے تو یقیناً ہمارے اور دیگر مخلوقات کے احوال غیب سے اطلاع دیتے ۔ تو جب یہ ہمارے احوال غیب بتانے سے قاصر ہیں تو پھر انہیں ایسے امور کے کشف پر ، کہ جو احوال مخلوقات سے بالا و برتر ہیں ، کیوں کر قدرت ہوگی ؟'' علاوہ ازیں یہ لوگ اہل معرفت کی فراست کو بھی ، جو خدائے بزرگ و برتر کے افعال واجبی اور اس کی ذات و صفات سے

تعلق رکھتی ہے ، جھٹلاتے ہیں ۔ چناں چہ اپنے انھی فاسد خیالات و قیاسات کے سبب یہ لوگ صحیح علم و معرفت سے محروم رہے ہیں ۔ یہ بزرگ اتنا نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان بزرگوں (اھل حقیقت و معرفت) کو لوگوں کے تنقیدی حملوں سے بچاؤ کے سلسلے میں اپنی حمایت سے نوازا اور اپنی بارگاہ قدس کے خاص بندوں میں سے کیا ہے ۔ جب کہ غیر اھل حقیقت کو 'غیر حق' میں ، اپنی حمایت و غیرت کے سبب جو وہ اھل حقیقت کے لیے رکھتا ہے ، مشغول رکھا ہے ۔ اور اگر یہ لوگ (اھل حقیقت) احوال خلق کے درپے ہوتے تو ان میں دربار قدسی میں حضوری کی صلاحیت نہ رھتی ۔" یہاں خواجہ عبداللہ انصاری کی بات ختم ہوتی ہے ۔ آپ نے اس قسم کی اور بھی کئی باتیں فرمائی ہیں ۔

میں نے اپنے پیر و مرشد (حضرت محمد باقی باللہ قدس سرہ) کو یہ فرماتے سنا ہے کہ شیخ محی الدین ابن عربی نے لکھا ہے "بعض اولیا کرام ، جن سے بہت سی کرامات ظہور میں آئی تھیں ، آخر آخر میں اپنی ان کرامات کے سبب بے حد نادم اور اس بات کے متمنی تھے کہ کاش یہ تمام کرامات ہم سے سر زد نہ ہوتیں ۔" ظاھر ہے کہ اگر بہت زیادہ کرامتوں کے اظہار ھی سے کسی کو فضیلت حاصل ہوتی تو ان اولیا کی یہ ندامت بالکل بے معنی تھی ۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کشف و کرامات ولایت کے لیے لازم نہیں ہے تو پھر ولی اور غیر ولی میں کیوں کر تمیز ہو سکتی ہے ، اور حقیقت اور باطل ایک دوسرے سے کس طور جدا ہوں گے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان میں امتیاز ممکن نہیں اور یہ کہ حق و باطل ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں ۔ کیوں کہ اس جہان رنگ و بو میں حق اور باطل کا امتزاج گویا ایک لازمی امر ہے ۔ اسی طرح لوگوں کے لیے ولی کی ولایت سے آگاھی ضروری نہیں ہے ، اس لیے کہ بہت سے اولیا اللہ ایسے ہیں کہ خود جنھیں اپنی ولایت کی خبر نہیں ، پھر بھلا دوسروں کو ان کی ولایت سے آگاھی کیوں کر لازم ہوگی ؟ البتہ نبی کے لیے معجزے کے بغیر چارہ نہیں تاکہ نبی اور غیر نبی میں امتیاز ہوسکے ،

اس لیے کہ نبوت نبی سے علم و آگاھی لازمی ھے ۔ اور ولی چوں کہ اپنے نبی کی شریعت کی تبلیغ و اشاعت کرتا ھے ، اس لیے اسے نبی کا معجزہ ھی کافی ھے ۔ اور اگر ولی اپنے نبی کی شریعت کے ماسوا کسی دوسری بات کی اشاعت و تبلیغ کرتا تو اس وقت کرامات کے بغیر چارہ نہ تھا اور چوں کہ اس کی تبلیغ و دعوت محض شریعت نبوی ھی سے متعلق ھے ، اس لیے اسے کرامات کی ضرورت نہیں ھے ۔

علما لوگوں کو شریعت کے ظاھر کی طرف بلاتے ھیں ، جب کہ اولیا ظاھر شریعت کے علاوہ اس کے باطن کی بھی تبلیغ فرماتے ھیں ۔ سب سے پہلے وہ طالبان حق اور مریدوں کو توبہ استغفار کی طرف توجہ اور شرعی احکام پر عمل پیرا ھونے کی ترغیب دلاتے ھیں ۔ اس کے بعد اللہ تبارک و تعالیٰ کے ذکر اذکار میں ان کی رہ نمائی فرماتے اور اس بات کی تاکید کرتے ھیں کہ اپنے تمام اوقات میں وہ (طالبان حق اور مرید) خود کو ذکر اللہی میں اس قدر مصروف و مشغول رکھیں کہ ذکر ھر چیز پر غالب آجائے اور دوسری کسی چیز کا دل میں گزر نہ ھو ، حتیٰ کہ تمام ماسوا طالب کی یاد سے اس طرح اتر جائیں کہ اگر وہ دماغ پر زور دے کر بھی ان کو یاد کرنا چاھے تو اسے ھرگز یاد نہ آئیں ۔ ظاھر ھے کہ ولی کو شریعت کے ظاھر و باطن سے متعلق اس دعوت و تبلیغ کے لیے کرامتوں کی کیا ضرورت ھے ۔ پیری و مریدی تو عبارت ھے اس دعوت سے کہ جسے کسی قسم کی کرامت سے سروکار نہ ھو ، اس کے باوجود ھم یہ کہیں گے کہ ایک صاحب ھدایت مرید اور صاحب استعداد طالب حق کو سلوک و طریقت میں ھر لمحے اپنے مرشد کے خوارق و کرامات کا احساس ھوتا رھتا ھے اور معاملۂ غیب میں وہ ھر ساعت اس سے مدد کا خواھاں ھوتا اور مدد حاصل کرتا رھتا ھے ۔ جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ھے ان کے سامنے کسی کرامت وغیرہ کے اظہار کی ضرورت نہیں ؛ البتہ مریدوں کے لیے تو ان کا مرشد گویا کرامات در کرامات اور خوارق در خوارق کا حامل ھوتا ھے ۔ آپ خود ھی سوچیے کہ ایک مرید کو اپنے مرشد کی کرامتوں کا احساس کیوں کر نہ ھوگا

جب کہ اس (مرشد) نے اس (مرید) کے مردہ دل میں ایک نئی روح پھونک دی اور اسے مشاہدہ و مکاشفہ تک پہنچا دیا ہو۔ عام لوگوں کے لیے تو مردہ جسم کو زندگی بخشنا حیرت انگیز امر ہے لیکن جو خواص ہیں ان کے نزدیک قلب و روح کا احیا ایک عظیم الشان دلیل ہے۔

خواجہ محمد پارسا[۳۵] قدس سرہ اپنے رسالہ 'قدسیہ' میں فرماتے ہیں کہ چوں کہ اکثر لوگوں کے نزدیک جسم و بدن کا احیا زیادہ معتبر تھا اس لیے اللہ والوں نے اس احیا کی بجائے روح کے احیا کو اپنایا ہے اور طالب حق کے مردہ دل کو زندگی بخشنے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ قلب و روح کے احیا کی نسبت احیاے جسدی ایسا ہی ہے جیسے کوئی چیز راستے میں گری ہوئی ہو۔ اس لحاظ سے یہ ایک بے سود 'آمدنی' ہے، کیوں کہ یہ احیا تو صرف چند روزہ زندگی کا وسیلہ ہے اور احیاے قلب و روح حیات جاوید کا باعث۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ حقیقت میں اللہ والوں کا وجود ہی خود ایک کرامت ہے، اور ان کا لوگوں کو اللہ جل شانہ کی طرف بلانا پروردگار لم یزل کی ایک رحمت، اور ان کا مردہ دلوں میں روح پھونکنا ایک بہت بڑی نشانی ہے۔ وہ اہل زمین کے لیے امان اور زمانے کے لیے غنیمت ہیں۔ 'بہم یمطرون و بہم یرزقون[۳۶]' انھی کی شان میں ہے۔ آن کی گفتار دوا اور ان کی نظر شفا ہے۔ 'ہم جلساء اللہ......الخ[۳۷]۔' وہ علامت کہ جس سے اس جماعت کا 'حق' ان کے 'باطل' سے جدا ہو، یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ وہ شریعت پر مضبوطی سے قائم ہے، اس کی محفل میں دل کو اللہ تبارک و تعالیٰ سے لگاؤ اور توجہ پیدا ہوتی اور ماسوا سے قطعی بے توجہی کا پتا چلتا ہے تو وہ شخص واقعاً حق پر ہے اور اس کا شمار اولیا میں، درجوں کے تفاوت کے مطابق ہوگا۔ یہ (علامت امتیاز) بھی 'ارباب مناسبت[۳۸]' کے بارے میں ہے اور جو 'بے مناسب' ہے وہ فقط محروم مطلق ہے:

ہر کہ او روی بہ بہبود نداشت
دیدنِ روی نبی سود نداشت

(جو کوئی بھی بہبود کی طرف مائل نہ ہوا ، اس کے لیے روے نبی کا دیدار سود مند نہ ہوا)

آپ کے گرامی نامے میں بادشاہ وقت کے 'خدا طلبی' سے لگاؤ کے بارے میں کچھ مندرج اور عدل و انصاف اور احکام شرعی کے التزام کے متعلق کچھ اشارہ تھا ، جسے پڑھ کر بے حد مسرت و فرحت حاصل ہوئی۔ خداے بزرگ و برتر نے جس طرح دنیا کو بادشاہ وقت کے عدل و انصاف سے منور کیا ہے ، اسی طرح شریعت و ملت محمدیہ کو بھی ان کے حسن اہتمام سے نصرت و عزت عطا فرمائے ! محب مکرم ! 'الشرع تحت السیف' کے مطابق شرع بیضا کی اشاعت بڑے بڑے سلاطین کے حسن اہتمام سے مربوط ہے ، لیکن ایک مدت سے یہ حقیقت ضعف پزیر ہو چکی ہے جس کے نتیجے میں اسلام رو بہ ضعف ہو رہا ہے۔ ہندو لوگ دھڑا دھڑ مسجدیں منہدم کر کے ان کی جگہ اپنے مندر تعمیر کر رہے ہیں۔ تھانیسر کے حوض کر کھیت میں ایک مسجد تھی جس سے ملحق کسی بزرگ کا مقبرہ تھا ، ان دونوں کو ان کافروں نے گرا دیا اور ان کی جگہ گوردوارہ تعمیر کر لیا ہے۔ علاوہ ازیں کفار ببانگ دھل اپنی مذہبی رسوم ادا کر رہے ہیں ، جب کہ مسلمان بیشتر مذہبی احکام بجا لانے سے عاجز ہیں۔

ایکادشی کے دن ، یعنی جس روز کہ ہندو کچھ نہیں کھاتے پیتے ، یہ لوگ اس بات کا خاص طور پر بندوبست کرتے ہیں کہ اس دن بلاد اسلام میں کوئی بھی مسلمان نہ تو بر سر بازار روٹی پکائے اور نہ بیچے ، اسی طرح نہ کھانا پکائیں نہ بیچیں[۳۹]۔ اس کے برعکس ماہ رمضان میں یہ کافر لوگ بڑے دھڑلے سے کھانا پکاتے اور بیچتے ہیں ، اور مسلمان اپنی بے چارگی کے سبب انھیں اس فعل سے نہیں روک سکتے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ بادشاہ وقت تو ہم میں سے ہو اور ہم فقیر اس زبوں حالی اور تباہی کا شکار ہوں۔ اسلام ان صاحبان دولت و سلطنت کے اعزاز و اکرام کے سبب رونق پزیر تھا۔ علما اور صوفیوں کی عزت و تکریم ہوتی تھی ، اور وہ ان (بادشاہوں)

کی تقویت کے باعث اسلام کی اشاعت و ترقی میں جد و جہد کیا کرتے تھے۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دن صاحبقران امیر تیمور[۳۰] علیہ الرحمۃ بخارا کے کسی کوچے میں گزر رہا تھا؛ اتفاق سے حضرت خواجہ نقشبند[۳۱] قدس سرہ کی خانقاہ کے درویش اس کوچے میں خانقاہ کی گدڑیوں کو پھیلا کر ان کی گرد جھاڑ رہے تھے۔ امیر اپنے جذبۂ مسلمانی کے تحت جو اس کے دل میں تھا، اس کوچے میں ذرا رک گیا تاکہ خانقاہ کے اس گرد و غبار کو اپنے لیے عبیر و صندل بنا کر درویشوں کے فیوض کی برکتوں سے مالا مال ہو۔ یہ جو اللہ والوں کے سامنے اس نے عاجزی و انکساری روا رکھی تو شاید اسی کے نتیجے میں اس کا انجام بہ خیر ہوا۔

نقل ہے کہ حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ امیر تیمور کی وفات کے بعد فرمایا کرتے تھے: ''تیمور مرد و ایمان برد[۳۲]۔'' آپ کو علم ہے کہ جمعے کے دن خطبے میں یہ جو بادشاہوں کا نام منبر کے نچلے پائے پر اتر کر پڑھتے ہیں تو اس کا سبب کیا ہے؟ یہ دراصل وہ انکساری و فروتنی ہے جو بڑے بڑے سلاطین نے حضور سرور کائنات اور ان کے خلفاے راشدین رض کے بارے میں روا رکھی ہے اور اس بات کو انھوں نے جائز نہیں سمجھا کہ ان کے نام اکابر دین کے ناموں کے ساتھ ایک ہی درجے میں اور ایک ہی پائے پر بیان کیے جائیں۔ 'اللہ ان کی کوشش کو بار آور کرے!'

برادر عزیز! سجدے سے کہ زمین پر پیشانی رکھنے کا نام ہے، مراد نہایت ہی انکساری و خاکساری اور عاجزی و فروتنی ہے، اس لیے اس قسم کی عاجزی و فروتنی صرف اس حاکم مطلق جل شانہ ہی کی عبادت کے لیے مخصوص ہے، اور اس ذات باری کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے جائز نہیں سمجھی گئی۔ روایت ہے کہ ایک روز سرکار کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہیں سے گزر رہے تھے؛ ایک بدو نے آ کر آپ صلعم سے کہا کہ کوئی معجزہ دکھائیں تاکہ میں ایمان لے آؤں۔

حضور سرورکائنات صلعم نے فرمایا ''اس درخت سے کہو پیغمبر (صلعم) نے تجھے بلایا ہے۔'' اس نے ایسا ہی کیا ، جس پر وہ درخت اپنی جگہ سے ہلا اور حضور صلعم کی جانب متوجہ ہوا۔ جب بدو نے یہ ماجرا دیکھا تو وہ اسلام لے آیا ۔ اس کے بعد کہنے لگا ''یا رسول اللہ ! آپ اجازت مرحمت فرمائیں تو میں آپ کو سجدہ کروں ؟'' حضور صلعم نے فرمایا ''اللہ تبارک و تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کو سجدہ جائز نہیں ہے ؛ اگر میں اس ذات باری کے علاوہ کسی اور کو سجدہ جائز قرار دیتا تو پھر یہ کہتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے ۔''

اگرچہ بعض فقیہوں نے سلاطین کو سجدۂ تحیت کرنے کو جائز قرار دیا ہے ، لیکن عظیم بادشاہوں کے شایان شان یہی ہے کہ وہ خدائے ذوالجلال کے حضور میں فروتنی و انکساری اختیار کریں ۔ اور یہ بے حد انکساری و خاکساری اس ذات باری کے علاوہ کسی اور کے لیے جائز نہ رکھیں ۔ خدائے تعالیٰ نے ایک عالم کو ان کا مفتوح و محتاج بنایا ہے ، تو انہیں چاہیے کہ اس بہت بڑی نعمت کا شکر بجا لاتے ہوئے اس ہستی مطلق کے حضور میں کمال عجز و انکسار کا مظاہرہ کریں اور اس سلسلے میں اس کا شریک بننے کی سعی نہ کریں ۔ ہر چند کہ بعض (فقہا) اسے (بادشاہ کو سجدہ) جائز قرار دیتے ہیں لیکن انہیں (بادشاہ) اپنے حسن تواضع کے تحت اس امر کو جائز نہ سمجھنا چاہیے ۔ 'احسان کا بدلہ احسان ہی ہے ۔'

چوں کہ بادشاہ وقت اپنی مملکت کے دور ترین علاقوں کے دورے سے واپس پایۂ تخت پہنچ گئے ہیں ، خیال ہے کہ عاجز ، اگر خدا نے چاہا تو ، عنقریب پایۂ تخت میں حاضر ہوگا ؛ باقی بات چیت ملاقات پر ہوگی ۔

حضور سرکار دو عالم کی اطاعت کو لازمی گردانے اور ہدایت و راستی کی پیروی کرنے والوں پر سلام ہو !

(مکتوبات امام ربانی ، جلد دوم)

مکتوب ۶

[معارف گاہ شیخ بدیع الدین[۴۳] کے نام ، اس بیان میں کہ محبوب کی ایذا رسانی اُس کا انعام ہے ، اور اُس کا جلال اُس کے جمال سے زیادہ محبوب ہے]

الحمدللہ ، سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر!

شیخ فتح اللہ کے ہاتھ ارسال کردہ آپ کا گرامی نامہ وصول پایا۔ آپ نے لوگوں کے ظلم و ستم اور ملامت کی شکایت کی ہے؛ عرض ہے کہ یہی چیز تو اس گروہ (صوفیا) کا جمال اور ان کے زنگ (روح کی آلودگی) کے لیے صیقل ہے۔ تو پھر یہ بات (لوگوں کی جفا) کدورت و انقباض کا باعث کیوں ہو۔ شروع شروع میں جب یہ فقیر اس قلعے میں پہنچا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ شہروں اور قریوں کے لوگوں کی ملامتوں کے انوار نورانی بادلوں کے روپ میں پیہم اور مسلسل پہنچ اور (میرے) معاملے کو پستی سے بلندی کی جانب لے جا رہے ہیں۔ آپ نے ایک مدت تک 'تربیت جمالی' کی مسافت طے کی ہے ، اب 'تربیت جلالی' کی راہ طے کریں اور 'مقام صبر' [۴۴] بلکہ مقام رضا'[۴۵] میں رہیں اور 'جمال' و 'جلال[۴۶]' کو برابر سمجھیں۔

آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب سے یہ فتنہ کھڑا ہوا ہے نہ دل میں 'ذوق[۴۷]' ہی رہا ہے اور نہ 'حال[۴۸]'؛ ایسی حالت میں تو بلکہ ذوق و حال دگنا ہو جانا چاہیے ، اس لیے کہ محبوب کی جفا میں جو لطف ہے وہ اس کی وفا میں نہیں۔ آخر ایسی کون سی افتاد آن پڑی ہے جو آپ عام لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے اور 'محبت ذاتیہ' سے دور ہٹ گئے ہیں۔ آپ ماضی کے برعکس اب جلال کو جمال سے زیادہ اور (محبوب) کی ایذا رسانی کو اس کے انعام سے بیشتر سمجھیں ، اس لیے کہ جمال اور انعام میں محبوب حقیقی کی مراد انسان کی اپنی مراد سے مخلوط ہے ، جب کہ جلال اور ایذا رسانی میں اپنی مراد کے برعکس خالصۃً محبوب کی مراد ہے۔

اپنا وقت اور حال پہلی ہی ڈگر پر ہے۔ 'کس قدر بعد ہے ان

دونوں میں ۔' آپ نے حرمین شریفین کی زیارت کا لکھا ہے ، ضرور جانا چاہیے ۔ کون سا امر اس میں مانع ہے ؟ 'حسبنا اللہ و نعم الوکیل' (اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے) ۔

(مکتوبات امام ربانی ، جلد سوم)

مکتوب ۴۳

[خواجہ محمد سعید اور خواجہ محمد معصوم (خدا انھیں سلامت رکھے !) کے نام ۔ بادشاہ وقت کی مجلس میں جو گفتگو ہوئی اس کے ذکر میں]

الحمد للہ ، سلام ہو اس کے برگزیدہ بندوں پر !

شکر ایزد کہ اس جگہ کے حال احوال خوب اور مناسب ہیں ۔ آج کل بڑی عجیب و غریب صحبتوں میں وقت گزر رہا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی سے اس عاجز نے دینی آمور اور اصول اسلامی سے متعلق ان مباحثوں میں کسی قسم کی سہل انگاری ، سستی یا چاپلوسی سے کام نہیں لیا ، اور جس طرح خلوت میں اور خاص خاص محفلوں میں مسائل مذکورہ بیان کرتا ہوں ، اللہ کی توفیق و عنایت سے ان معرکوں (شاہی محفل) میں بھی اسی ڈھنگ سے بیان کر رہا ہوں ۔ اگر ایک مجلس شاہی کا ذکر لکھنے بیٹھوں تو اس کے لیے بھی دفتر درکار ہے ؛ خاص طور پر آج کی رات تو، کہ ماہ رمضان کی سترھویں تاریخ ہے ، شاید ہی کوئی مسئلہ رہ گیا ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو ۔ مثلاً انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات کی بعثت ، عقل کا عدم استقلال ، آخرت پر ایمان اور اس (آخرت) میں عذاب و ثواب ، رؤیت[۴۹] کا اثبات ، آں حضرت صلعم خاتم الرسل کے بعد نبوت کا خاتمہ اور ہر سو سال کے بعد ایک مجدد کا پیدا ہونا ، خلفاے راشدین (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کی پیروی کرنا ، سنت تراویح، تناسخ کا بطلان ، جنوں وغیرہ کے احوال اور ان کا عذاب و ثواب اور اسی قسم کے دیگر بہت سے مسائل بیان کیے گئے جنھیں بادشاہ سلامت نے کامل توجہ کے ساتھ سنا ۔ اسی طرح ان مسئلوں کے دوران میں موقع بہ موقع قطبوں ، ولیوں اور ابدال

وغیرہم کے احوال اور ان کی خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا گیا۔ الحمدللہ سبحانہ، کہ وہ[۵۰] اپنی جگہ پر قائم ہیں اور کسی قسم کا تغیر ظاہر نہیں ہو رہا اور شاید اس ملاقات و واقعات میں اللہ جل شانہ، کی کچھ مصلحتیں اور بھید چھپے ہوں۔ 'الحمدللہ الذی......الخ[۵۱]'

قرآن کریم سورۂ عنکبوت تک ختم کر چکا ہوں؛ رات کے وقت جب شاہی محفل سے لوٹ کر آتا ہوں تو تراویح میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ حفظ قرآن کی یہ عظیم دولت عین فترت[۵۲] کے دوران میں کہ حقیقت میں جمعیت تھی، حاصل ہوئی۔ الحمدللہ اولاً و آخراً۔

(مکتوبات امام ربانیؒ، جلد سوم)

مکتوب ۸۲

[حضرات مخدوم زادوں خواجہ محمد سعید[۵۳] اور خواجہ محمد معصوم[۵۴] مد ظلہما کے نام۔ بعض بشارتوں کے ساتھ آلام فراق کے اظہار میں]

الحمد للہ۔ اور سلام ہو اللہ کے برگزیدہ بندوں پر!

خدائے تعالیٰ فرزندان عزیز کو ظاہر و باطن کی جمعیت سے نوازے! میرے لیے ان سفروں اور تکلیفوں میں کوئی بھی رنج و غم آپ دو فرزندوں کی جدائی کے غم کے برابر نہیں ہے، اور شاید ہی کوئی وقت ہو گا جب آپ لوگوں کی یاد نہیں ستاتی۔ اس منعم حقیقی جل شانہ، کی طرف سے جس قدر زیادہ نعمتوں کا نزول ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ دور رہنے والے احباب کا ذکر زبان پر رہتا ہے۔ ہر روز کے نئے نئے سوانح حیطۂ تحریر میں لائے اور بیاض کی صورت میں اکٹھے کیے جا رہے ہیں، لیکن ایسی صورتیں کہاں میسر کہ جو ان سے آگاہی پائیں اور لطف اٹھائیں۔ بہر حال خواجہ محمد ہاشم کا دم غنیمت ہے کہ سخن فہمی کے ذوق سے بہرہ ور ہیں اور واقعی لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن اب کے سفر اجمیر میں تکالیف کی شدت کے سبب وہ بھی 'صحیح العذر' مخالفوں میں سے ہو گئے ہیں۔ شاید کچھ عرصہ موافقت کریں۔ 'حسبنااللہ ونعم الوکیل' (اللہ ہمیں کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے)۔ ساتھی بھی چند ہی ہیں

اور زاد و خوراک بھی تھوڑی 'الیس اللہ بکاف عبدہ'، بلیٰ (کیا اللہ اپنے بندے کی حفاظت کے لیے کافی نہیں ہے ؟ ہاں (کافی ہے) ۔

دیگر کیا عرض کروں ، آپ احباب کی جدائی میں وقت کتنا دشوار ہو رہا ہے ۔ ایک رات تہجد کی نماز کے بعد (خواب میں) میں نے دیکھا کہ آپ دونوں بھائی ان دوستوں میں سے ایک کے ساتھ شاہی وکیل کے پاس گئے اور شاہی ملازم ہو گئے ہیں ۔ نیز یہ کہ شاہی ملازم رکھنے رکھانے کا تمام سلسلہ اسی وکیل کے سپرد ہے اور وہ اس بات کا مجاز ہے کہ جس کسی کو ملازمت کے اہل سمجھے اسے ملازم رکھ لے ۔ چناں چہ وہ جس کسی کو ملازمت کے لیے مناسب سمجھتا ہے اس کی عرضی کے ایک کونے میں لکھ دیتا ہے اور اس شخص کو ملازم رکھ لیا جاتا ہے ۔ میں نے دیکھا کہ آپ تینوں میں سے صرف آپ دو بھائیوں کی شناخت اس نے لکھ لی اور ملازمت بھی تجویز کر دی ہے ، لیکن آپ کے دوست کی نہ تو اس نے شناخت لکھی اور نہ اسے نوکر ہی رکھا گیا ہے ۔ اس وقت میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ بھلا وکیل نے اس تیسرے آدمی کی شناخت کیوں نہیں لکھی ؟ تو آپ جواب میں کہتے ہیں کہ شناخت لکھتے وقت وہ (وکیل) اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لایا اور بڑے غور سے دیکھنے کے بعد بولا 'اس میں سیاہی ہے'، یا کچھ اسی قسم کی بات کہی اور اس کی شناخت نہ لکھی ۔

شکر ایزد کہ آپ دونوں کی جانب سے دل جمعی حاصل ہوئی کہ آپ قبول کر لیے گئے، لیکن آپ کے اس دوست کے قبول نہ ہونے کے باعث دل کو بڑا دکھ ہوا ۔ کاش اسے شاہی ملازموں ہی کی ملازمت میں قبول کر لیا جائے ۔ عاقبت بالخیر ۔

(مکتوبات امام ربانی ، جلد سوم)

مکتوب ۸۳

[بزرگ مخدوم زادوں کے نام (خدا انھیں سلامت رکھے !) اس ذکر میں کہ باطن میں ہونا کسی کے اختیار میں نہیں ، مگر اس کی بڑی برکات ہیں ۔]

فرزندان عزیز کو جمعیت خاطر حاصل ہو!

لوگ ہر وقت ہماری تکالیف کو مدنظر رکھتے اور ان دکھوں تکلیفوں سے ہماری نجات کے طالب ہوتے ہیں، لیکن انہیں یہ علم نہیں کہ اس نامرادی و ناکامی اور مجبوری میں کس بلا کا حسن و جمال ہے۔ اور کون سی نعمت بھلا اس کے برابر ہو سکتی ہے کہ خالق حقیقی انسان کو بے اختیار اس کے اختیار سے باہر لائے اور اپنے اختیار سے اسے زندگی عطا کرے۔ اس کے اختیاری ۵۵ معاملات کو بھی اس کی 'مجبوری' کے تابع کرکے اس کے دائرۂ اختیار سے باہر کر دے اور اس کی حالت ایسی ہی کر دے جیسے میت غسال کے ہاتھ میں ہو۔

ایام اسیری میں جب کبھی میں اپنی اس مجبوری و ناکامی کا جائزہ لیتا تو مجھے ایک عجیب لذت اور ایک خاص لطف و سکون حاصل ہوتا تھا۔ ہاں! اہل فراغت بھلا ارباب بلا ۵٦ کو کیا جانیں اور اس (محبوب لم یزل) کی طرف سے آئی ہوئی آفتوں اور مصیبتوں کے جمال کی انہیں کیا خبر۔ بچوں کو مٹھائی زیادہ مزہ دیتی ہے، لیکن جسے کڑواہٹ سے لذت حاصل ہوتی ہو وہ تو شیرینی کو ایک کوڑی میں نہ خریدے گا:

مرغ آتشخوارہ کی لذت شناسد دانہ را ۵۷

ہدایت کی پیروی کرنے والوں پر سلام ہو!

(مکتوبات امام ربانی، جلد سوم)

مولانا عبدالحق محدث دهلوی

[شیخ عبدالحق محدث (۱۶۴۲ء) کم و بیش ساٹھ کتابوں کے مصنف تھے - یہ بھی حضرت خواجہ باقی باللہ کے خرمن کمال کے خوشہ چین تھے - شیخ صاحب نے اپنے زمانے کے فتنوں کا سدباب تریاق علم حدیث کی ترویج میں دیکھا - شیخ کے زمانے میں مہدویت ، مجددیت اور عقلیت کے دعویداروں نے عقاید و خیالات میں الجھنیں ڈال دی تھیں : شیخ نے ان سب کا علاج نبوت کی عظمت و حقیقت کو نمایاں کرنے میں سوچا اور علوم حدیث کی اشاعت کی - ان کی کتاب ''اخبار الاخیار'' صوفیاء کرام کے حالات پر مشتمل ہے - مکتوبات اور ''اخبار الاخیار'' سے بعض اقتباسات کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے]

عبدالحق محدث (رحمۃ اللہ علیہ) کے ابتدائی حالات و تحصیلات

زندگی کے آخری ایام میں جب کہ ضعف و پیری کا غلبہ ہوتا ہے ، میرے والد بزرگ وار کی زیادہ تر توجہ اس عاجز ہی کی طرف رہی - میں ہنوز تین چار سال کا تھا کہ انہیں دلی دوستوں ، غم‌گسار یاروں اور جوانی کے گزر جانے کے باعث ایک سخت عارضہ لاحق ہو گیا - اس بیماری میں ان کی پریشان خاطری اور پیری و ضعف کی کلفتوں کے دور کرنے کا باعث یہی عاجز تھا جو رات دن آن کی آغوش لطف و عنایت میں تربیت پا رہا تھا - والد بزرگ وار میرے انہی ایام طفلی میں مجھے حضرات صوفیہ کی باتیں سناتے رہتے اور اس طرح شفقت ظاہری کے ساتھ ساتھ گویا میری باطنی تربیت بھی فرماتے جاتے اور میں بھی اپنے فطری و جبلی تقاضے کے تحت ان باتوں کو کمال

شیفتگی و دیوانگی سے سنتا اور جب کبھی وہ ذرا خاموش ہو جایا کرتے تو میں خود کو بھول جاتا اور عارفوں کی مانند ان سے انھی سود مند باتوں کی تکرار کا اصرار کیا کرتا۔ ان کے بعض فرمودات ابھی تک اپنے موقع و محل کے ساتھ، میرے مخزن خیال میں موجود ہیں، اور یہ بات غرابت سے خالی نہیں ہے۔ اس سے بھی عجیب تر امر یہ ہے کہ فقیر کو اپنی دودھ چھڑانے جانے کی حالت، کہ اس وقت میری عمر دو ڈھائی برس کے قریب ہو گی، اس طرح یاد ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔

ان ایام ہی میں جب کہ والد بزرگ‌وار کی عنایت و تربیت کے آثار ظاہر ہوئے، میں تحصیل علوم میں مصروف ہو گیا تھا۔ میرے شب و روز ان کی خدمت میں بحث و تمحیص اور ذکر اذکار میں گزرتے۔ راتیں گزر جاتیں اور وہ اس عاجز کو اپنی ہم زبانی میں قبول فرما کر محظوظ ہوتے۔ بالخصوص علم توحید کی تلقین اور مسئلۂ وحدت الوجود کی تحقیق علم و شہود کے موافق فرماتے۔ اور اگر کبھی علم کسبی[۱] کے مقدمات کی پابندی کے تقاضے اور ان وہبی علوم کی تحقیق کے مقصد کے تحت میں کسی قسم کے اندیشے یا شک و شبہ کا اظہار کرتا تو فرماتے ''ہمیں بھی اس مسئلے میں اس قسم کے بہت سے شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے، ایسی کوئی بات نہیں؛ ان شاء اللہ آہستہ آہستہ سب کچھ روشن و آشکار ہو جائے گا اور حسن یقین حاصل ہوگا۔ لیکن تمھیں چاہیے کہ ہمیشہ اس خیال میں رہو اور جس قدر بھی ممکن ہو کوشش و سعی کرتے رہو''۔ پھر یہ شعر پڑھتے:

لنگ و لوک و خفتہ شکل و بی ادب
سوی او می خیز و او را می طلب[۲]

شروع شروع میں انھوں نے بغیر کسی سابقہ تعلیم اور قواعد تہجی کے، جس طرح کہ بچے پڑھتے ہیں، قرآن کریم کے دو تین جزو، اور شاید اس سے بھی کم (واللہ اعلم) پڑھائے۔ وہ سبق پر سبق لکھتے جایا کرتے اور میں پڑھتا جایا کرتا۔ میں نے قرآن کریم ان سے بس اتنا ہی پڑھا ہے۔ اس کے بعد ان کی تربیت و شفقت کے سبب مجھے کچھ

اس قدر استعداد حاصل ہو گئی کہ میں ہر روز خود ھی تھوڑا سا قرآن پڑھ لیتا اور پھر ان کے سامنے جا کر وھی سبق دھرا دیتا ۔ اس طرح میں نے دو تین ماہ میں قرآن کریم ختم کر لیا ۔

انھوں نے لکھنے لکھانے اور املا کی مشق کی پابندی ، جس طرح کہ مکتبوں میں آستاد بچوں کو کراتے ھیں ،نہیں کی ۔ بہ مشکل 'ف' اور 'ق' تک شاید انھوں نے اس پابندی کے ساتھ مجھے لکھایا ھو ، لیکن اس کے بعد تو بالکل اجمالی طور پر اور بہت تھوڑی مدت کے لیے ایسا کیا ۔ چنانچہ اگر میں یہ کہوں کہ صرف ایک ماہ میں مجھ میں لکھنے کی استعداد اور انشاء کا سلیقہ پیدا ھو گیا تھا ، تو یہ مبالغہ نہ ھو گا ۔ اللہ جل شانہ' نے ان کی عنایت و توجہ میں کچھ ایسی تاثیر و خصوصیت رکھی تھی کہ کوئی شخص استعداد و لیاقت میں کتنا ھی پھسڈی کیوں نہ ھو ، ان کی توجہ و تربیت سے اس کی مخفی صلاحیتیں فوراً بیدار ھو جاتیں ۔

اس عاجز کو جو کچھ حاصل ھے ، وہ سب انھی کی توجہ و عنایت کا اثر ھے اور آن کے کل پدری حقوق اور حقوق تعلیم و تربیت و ھدایت اس نامراد کے ذمے ثابت ھیں ۔ نظم و اشعار کی ان کتب میں سے کہ جن کی تعلیم اس سر زمین میں عام ھے ، شاید گلستان[3] و بوستان[4] اور دیوان خواجہ حافظ[5] کے چند جزو پڑھائے ھوں اور خرد سالگی کے آغاز سے ختم قرآن مجید کے بعد انھوں نے 'میزان صرف' سے 'مصباح' و 'کافیہ' تک خود ھی میری تعلیم فرمائی ۔ انھی ایام میں اکثر فرمایا کرتے ''تو ان شاء اللہ العزیز جلد ھی عالم بن جائے گا ۔ مجھے اس وقت ایک عجیب لطف حاصل ھوتا ھے جب میں تصور کرتا ھوں کہ خدائے تعالیٰ تجھے اس کمال تک پہنچا دے جو میرے ذھن میں ھے ، اور میں پھر تیرے حلقۂ درس و افادہ میں ضعف و پیری کے سجادے پر تکیہ کر کے بیٹھا ھوؤں ۔'' اور کبھی کتابوں کو گنتے اور فرماتے ''انھی چند کتابوں کے مطالعے سے تم عالم بن گئے ھو ۔''

مجھ سے فرمایا کرتے ''تو ھر علم مختصر طور پر حاصل کر لے ،

تیرے لیے یہی بہت کچھ ہو گا ۔ اس کے بعد ان شاء اللہ تجھ پر برکت و سعادت کے دروازے اس طرح کھلیں گے کہ تمام علوم بغیر کسی زحمت کے تجھے حاصل ہو جائیں گے ۔'' ان کی اس مبارک بات نے واقعی اپنا اثر دکھایا ۔ یعنی میں نے مختلف علوم کچھ اس سرعت و تیزی سے حاصل کیے کہ یوں سمجھیے جیسے زمان و مکان کو طے کر گیا ہوں ۔ نحو کی مختصرات میں سے ، مثال کے طور پر کافیہ ، لب و ارشاد کا بعض اوقات ایک ایک جزو بلکہ اس سے بھی زیادہ پڑھ جاتا تھا ۔ بلکہ اپنی تکمیل علم اور فروغ کے بے پناہ شوق کے سبب میں اکثر ایسا کرتا کہ اگر ان مختصرات کا کوئی ایک صحیح شدہ اور حواشی والا جزو ہاتھ لگ جاتا تو اسے استاد کے سامنے پڑھنے کے لیے نہ لے جاتا تھا ، اور اس جزو کے حواشی پر سرسری نظر ڈالنے کے دوران میں جو تھوڑا بہت مطالعہ ہو جاتا اسی پر اکتفا کر کے دوسرے جزو کا مطالعہ شروع کر دیتا ۔ اور اگر کوئی آسان سا مبحث در پیش آ جاتا یا اس سے پہلے کسی کتاب میں وہ حکایت اور مضمون میری نظر سے گزرا ہوتا تو اس کے لیے طبیعت کسی قسم کے غور و خوض کی زحمت گوارا نہ کرتی ۔ خدا معلوم اس وقت میں کیا دیکھتا اور کیا سمجھتا تھا ، لیکن اتنا ضرور تھا کہ جس متن اور جس حاشیے پر بھی نگاہ ڈالتا اس کے ہر ہر حرف سے پورے طور پر مستفید ہوتا تھا ۔ اور جب کبھی کوئی کتاب نظر پڑتی اور اس کا کوئی ایک جزو کسی وقت ہاتھ لگتا تو ہر چند اس سے پہلے اور بعد کی جلد کے آغاز اور اختتام پر عبور ہونا اس وقت لازم ہی ہوتا ، پھر بھی میں اس بات کا پابند نہ ہوتا کہ شرح ، کتاب کے آغاز ہی سے کرنی اور اسے آخر تک ختم کرنا چاہیے ، اس لیے کہ اپنا مقصود و مطلوب تو حصول علم تھا ، خواہ کسی طور سہی ۔

میری عمر کوئی بارہ تیرہ برس کی ہوگی جب میں شرح شمسیہ[6] اور شرح عقاید کا مطالعہ کرلیا کرتا تھا ۔ اور سولہ سال کی عمر میں مجھے مختصر معانی اور مطول سے فراغت ہو چکی تھی ۔ کوئی بیس برس کا ہوں گا جب میں نے ایسے علوم عقلی و نقلی تمام کر لیے تھے

جو صورت و مادہ کے لحاظ سے افادہ و استفادہ میں کافی و وافی ہو سکتے ہیں ۔ الحمد للہ کہ اس کے بعد حفظ قرآن مجید کی بھی توفیق نصیب ہوئی اور یہ عاجز کلام اللہ کی حفاظت میں آ گیا ، اور یہ نعمت کہ جس کے ایک حرف کا شکر سو برس میں بھی ادا نہیں ہوسکتا ، کچھ اوپر ایک سال کے عرصے میں حاصل کرلی ۔ الغرض اسی ڈھنگ سے مجھے تمام کتب پر عبور حاصل اور میں ان پر حاوی ہوگیا ۔ سات آٹھ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت تک ، کتب عربی اور کتب منطق و کلام کے مطالعے اور کچھ قوت اکمال و اتمام کے حصول کے بعد ، ماوراء النہر کے بعض دانش مندوں کے درس کی اس طرح ملازمت کی کہ تمام شب و روز میں شاید ہی دو تین ساعت کے لیے مطالعے اور تفکر و مشغولیت سے فرصت ملی ہو ۔ اور جب استادوں کی توجہ باطنی کی مدد سے اثنائے درس میں اس حقیر کی طبع فاتر سے بحث اور کلام مفید کا اظہار ہوتا تو ان بزرگوں میں سے اکثر یہ کہا کرتے کہ ''ہم تو مجھ سے استفادہ کرتے ہیں ، ہمارا تم پر کوئی احسان نہیں ہے ۔'' خدا جانے وہ کیسا شوق تھا اور کیا طلب تھی ۔ اگر اس قدر ذوق و شوق طلب مولی اور ریاضت باطن میں ہوتا تو کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ۔

ایک مرتبہ کچھ طالب علم آپس میں بیٹھے ایک دوسرے کے حصول علم کا مقصد معلوم کر رہے تھے ۔ بعض نے تکلف اور بناوٹ کے طور پر یہ جواب دیا کہ ہمارا مقصد تو طلب معرفت الٰہی ہے اور بعض نے ذرا سادگی اور سچائی سے کام لیتے ہوئے صاف کہہ دیا کہ حصول علم سے ہماری غرض دنیوی مال و جاہ کا حصول ہے ۔ جب مجھ سے (ان دنوں کافیہ بلکہ اس سے بھی آخری درجے کی کتاب میرے زیر مطالعہ تھی) ایک نے پوچھا کہ ''بھئی تم بتاؤ ، تم کس مقصد کے لیے علم حاصل کر رہے ہو ، اور کس امر پر تم نے اپنی ہمت و قصد کی نظر لگا رکھی ہے ؟'' تو میں نے جواب دیا کہ اس وقت تو مجھے ہرگز اس کا علم نہیں کہ حصول علم کا نتیجہ معرفت حق کی صورت میں ظاہر ہوگا یا اسباب لہو و لعب کی شکل میں ، لیکن

فی الحال مجھے یہ شوق ہے کم از کم یہ جان لوں کہ گزرے ہوئے علما و عقلا کیا کچھ کہہ گئے اور مسائل کی معلومات کی حقیقت کے انکشاف میں کیا کیا موتی پرو گئے ہیں۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا کہ حالات کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔ آیا یہ حصول علم نفسی خواہشات کی طرف لے جاتا ہے یا محبت مولی کی جانب ؛ دنیوی اغراض کی جانب کھینچتا ہے یا طلب عقبی کی طرف۔

میں بچپن ہی سے ان باتوں سے نا آشنا ہوں کہ کھیل کود کسے کہتے ہیں ، نیند کیا ہوتی ہے ، مصاحبت کیا ہے ، آرام کیا بلا ہے اور آسایش و سیر کہاں ہوتی ہے :

شب خواب چہ و سکون کدام ست
خود خواب بعاشقان حرام ست

اس حصول علم کے شوق میں میں نے نہ تو کبھی وقت پر کھانا کھایا اور نہ کبھی بر وقت ہی سویا۔ جاڑے کی سن کردینے والی ہواؤں اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں ہر روز دھلی کے مدرسے میں جو ہمارے گھر سے کوئی دو میل ہو گا ، دو مرتبہ جایا کرتا تھا۔ دوپہر کو گھر میں جو تھوڑا سا وقت ملتا اس میں چند لقمے کھا لیتا تاکہ چلنے پھرنے کی سکت قائم رہے۔ مدرسے میں صبح وقت سے بہت پہلے پہنچ جایا کرتا اور سایۂ چراغ میں ایک جزو نکال لیا کرتا۔ اور سب سے عجیب بات یہ کہ باوجود اس امر کے کہ بیشتر وقت مطالعے ، ذکر اور بحث و تمحیص میں گزرتا تھا ، جو کچھ بھی میں نے کتابوں میں پڑھا ہوتا ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر جو کچھ شرحوں اور حواشی میں نظر سے گزرا ہوتا ، اسے قید تحریر میں لانا بہت اہم اور ضرورت وقت میں سے جانتا تھا۔ چناں چہ رات کا بیشتر اور دن کا کچھ حصہ تو مطالعے میں صرف ہوتا ، اور اس کے برعکس رات کا کچھ اور دن کا زیادہ تر حصہ لکھنے لکھانے میں گزرتا۔

میرے والدین ہمیشہ اس بات پر مصر ہوا کرتے کہ میں کسی وقت محلے کے لڑکوں کے ساتھ کھیل بھی لیا کروں یا رات کو وقت پر

سو جایا کروں ۔ لیکن میں ہمیشہ یہی جواب دیتا کہ کھیلنے سے مقصد آخر دل ہی خوش رکھنا ہے نا ؟ تو پھر میرا جی اسی میں خوش رہتا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ پڑھتا لکھتا رہوں ۔ عام طور پر والدین بچوں کو پڑھنے اور مدرسے جانے کی تاکید کرتے بلکہ ڈانٹ ڈپٹ پلاتے ہیں ، لیکن یہاں معاملہ اس کے برعکس تھا ۔ یعنی میرے ماں باپ مجھے کھیل کود کی رغبت دلاتے ۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مطالعہ کرتے کرتے جب آدھی رات گزر جاتی تو والد قدس سرہ' پکار اٹھتے کہ ''بابا کیا کر رہے ہو؟'' میں جھوٹ سے بچنے کی خاطر اسی وقت لیٹ جاتا اور کہتا کہ ''میں سو رہا ہوں ، آپ کیا فرماتے ہیں ؟'' اس کے بعد پھر اٹھ بیٹھتا اور مصروف مطالعہ ہو جاتا ۔ کئی بار عمامے اور سر کے بالوں میں چراغ کی لو سے آگ لگ گئی ، لیکن مجھے اس وقت تک اس کی خبر نہ ہوتی جب تک اس کی حرارت دماغ تک نہ پہنچ جاتی :

چه دود های چراغی که در دماغ نرفت
چه خار خار که در بستر فراغ نرفت
کدام خواب و چه آسایش و کجا آرام
کدام بادۂ محنت کـه در ایاغ نرفت
بحیرتم ز دل خود که عمر رفت ولی
ز کنج غمکده هرگز بصحن باغ نرفت

(چراغ کا کون سا دھواں تھا جو دماغ میں نہ گیا ۔ کون کون سے کانٹے تھے جو ہمارے بستر فراغ میں نہ الجھے ۔ کون سی نیند ، کیسی آسائش اور کیسا آرام ، یہ کہو کہ کون سی رنج و محنت کی شراب پیالے میں نہ انڈیلی گئی ۔ میں اپنے دل کے ہاتھوں حیرت میں ہوں کہ تمام عمر گزر گئی لیکن اس نے کنج غم کدہ سے نکل کر صحن باغ کی طرف جانے کی کبھی خواہش نہ کی ۔)

(۲)

اپنے مرشد (شاہ ابوالمعالی قدس سرہ) کے نام مکتوب

اکثر سینہ جوش مارتا اور دل خروشِ کرتا ہے تاکہ کچھ احوالِ

باطن باہر نکالے ، اور ان احوال کی کیفیت بیان کرے جن کا اظہار نہیں ہوسکتا ۔ ایک لمحہ نہیں گزر پاتا کہ نیا شغل در پیش آ جاتا اور حالات بدل جاتی ہے اور وہ تمام جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے ۔ اور بیشتر جو احوال واقع ہوئے ہوتے اور جو معانی دل میں آئے ہوتے ہیں وہ یکسر فراموش ہو جاتے ہیں ، اور اگر وہ معانی فراموش نہیں ہوتے تو پھر وہ لذت و ذوق جو اس وقت اور اس حال میں موجود ہوتا ہے ، وہ ختم ہو جاتا ہے ۔ بے ذوق کیا لکھوں کہ ذوق کے بغیر تو کلام کو رونق حاصل نہیں ہوتی ۔ اگرچہ ذوق کلام میں تو نہیں در آتا لیکن اس کا عکس کلام پر ضرور پڑتا ہے ، جس سے کلام میں چاشنی ، رنگینی ، لذت اور دل نشینی پیدا ہو جاتی ہے ۔ بعض اوقات عمداً قلم ہاتھ میں لے کر کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن بات نہیں بنتی ، اور کتنی بھی کوشش کروں اسے کسی صورت اختتام کو نہیں پہنچا سکتا ۔ آخر مجبور ہو کر قلم ہاتھ سے رکھ دیتا اور خاموش بیٹھ جاتا ہوں ۔ کاش اس وقت بھی ، جب ذوق حاصل ہوتا اور جوش مارتا ہے ، کچھ لکھ لیا کروں ۔ تعجب کی بات ہے کہ جب ذہن میں خیالات کا طوفان ہوتا ہے تو کچھ لکھا نہیں جاتا ، اور جب لکھنے کو جی چاہتا ہے تو خیالات غائب ہو جاتے ہیں ۔

خط لکھنے میں جو چیز سب سے زیادہ مانع ہوئی ، وہ یہ ہے کہ ایک موقع پر راقم نے اپنی کیفیت حال کے متعلق چند حروف بڑی جلدی میں لکھ کر آپ کی خدمت گرامی میں بھیجے تھے ، جس کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ ”ہمیں تمہارے خیالات پسند آئے اور بہت ہی قبول خاطر ٹھہرے ہیں ، نیز یہ خیالات وقت کے عین مناسب^۸ تھے ۔“ چناں چہ اس وقت سے اسی خواہش کا شکار ہوں کہ 'بحرتہ......(؟)' کے مصداق پہلے سے بھی زیادہ عمدہ خیالات کا اظہار کروں ، تاکہ وہ زیور قبولیت کے سزاوار ہوں ۔ لیکن جو حکایت کہ بیان کر چکا ہوں اس کی بنا پر کوئی ایسی صورت نہ بن سکی^۹ تا آں کہ آج پھر رگ کشش میں تحریک ہوئی ہے ؛ اگرچہ یہ حرکت سست ہے اور اضطراب سے خالی نہیں ، لیکن اتنا ہے کہ آج نوک قلم

پر لانے کے لیے کچھ باتیں ضرور ہیں - تحریک کا رجحان طبیعت میں گویا الہام پا رہا ہے اور اس کی زبان میں رطوبت محسوس ہو رہی ہے ، شاید کہ آج اس سے کچھ ٹپکے - اگرچہ وہ رطوبت اس قدر تو نہیں کہ باہر ٹپکے ، لیکن اگر معانی کے کچھ قطرات اسی طرح متواتر ٹپکیں تو پھر اس کے باہر آنے کا احتمال ضرور ہے -

ایک اور بات جو حال احوال لکھنے میں مانع آتی ہے ، یہ ہے کہ کچھ اس قدر آزردۂ محبت ہوں کہ جو کچھ بھی لکھوں گا وہ شکوہ و شکایت کی آلودگی سے پاک نہ ہوگا - اگرچہ سراپا غرق نعمت ہوں لیکن چشم تمنا ایک ہی حال اور صفت پر گاڑے ہوئے ہوں ، اور محبوب سے ایک خاص عنایت کا امید وار ہوں ، کہ جس کے بغیر میرے نزدیک سب کچھ ایک پراگندہ غبار اور ہیچ ہے - انصاف کا غیبی فرشتہ ہر وقت 'خذما آتیتک......۱۰' کی آواز لگاتا ہے ، لیکن نفس اپنی اس انہونی حاجت سے باز نہیں آتا - یہ حاجت و ضرورت اگرچہ واضح طور پر عالم ازلی سے متعلق تو نہیں ہے ، لیکن کچھ اسی قسم کے عالم سے مشابہت و مماثلت رکھتی ہے - نہیں! نہیں! یہاں تو کلمۂ 'کلمنی۱۱' ، 'ارنی۱۲' کی جگہ 'بیٹھا' ہے - بندہ تو فقط ایک کلمہ 'سننے' اور 'التفات کرنے' کا مارا ہوا ہے ، دیکھنے دکھانے کی نوبت ہی کب پہنچے گی :

من از سر زندہ گردم گر تو با من یک سخن گوئی
تو ، می دانم ، نگوئی لیک من گفتار می گویم

(اگر تو میرے ساتھ ایک بات بھی کر لے تو میں نئے سر سے زندہ ہو جاؤں - میں جانتا ہوں کہ تو بات نہیں کرے گا لیکن میں بات کیے جاتا ہوں)

کئی مرتبہ طبیعت اس بات پر فریاد و فغاں کرتی ہے کہ آخر کب تک ہمیں 'یومنون بالغیب' کے پردے میں محجوب اور دل تنگ رکھا جائے گا - کیا ہو اگر کسی وقت ہمیں 'کذالک نری......۱۳' کی فضا میں چھوڑا جائے تاکہ اس میں پرواز کریں اور انبساط دلی

حاصل ہو ۔ لیکن پھر ڈرتا ہوں کہ میری یہ بات کہیں 'لولا یکلمنا اللہ ......۱۴' میں نہ شمار کی جائے ۔ خدا کی پناہ ! خدا کی پناہ ! ہرگز معاملہ ایسا نہیں ہے ، بلکہ یہ تو 'ولکن لیطمئن قلبی......۱۵' سے متعلق ہے ۔ تعجب کی بات ہے کہ ایک عجز و عاجزی کرنے والا محتاج سائل اس بے حد بخشش کرنے والے رحیم و کریم کے حضور میں ایک حاجت پیش کرتا ہے ، لیکن اس دعا کو شرف قبولیت بخشنے میں توقف کیا جاتا ہے ، اور اس کا وہ مدعا پورا نہیں ہوتا ۔ تو آخر اس توقف کا سبب کیا ہے ؟ (غیب) سے ندا آئی کہ ''ہاں وہ یہ حق رکھتا ہے ۔ وہ رحیم و کریم ہونے کے باوجود علیم و حکیم[16] بھی ہے ۔ وہ تمام امور کے انجام و عاقبت سے بہ خوبی آگاہ ہے ، اور اس کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی حکمت پوشیدہ ہے ۔ ممکن ہے قبولیت دعا میں توقف کرنے اور مدعا پورا نہ کرنے میں اس کی کوئی حکمت ہی ہو ۔ اگر تم یہ کہو کہ کاش صرف اسی قدر معلوم ہو جائے کہ اس میں کیا حکمت ہے ؟ تو یہ بے چینی اور اضطراب دور ہو جائے ، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ قادر مطلق ہے ، جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے دیتا ہے ۔ 'یفعل اللہ مایشاء ویحکم ما یرید[17]' اس کی صفت ہے ، اور 'یعطی من یشاء ویمنع مایشاء[18]' اس کی شان ۔ یہاں تو سوائے صبر اور تسلیم و رضا کے کوئی چارہ نہیں ۔ یہ جباری و قہاری ہے ، یہاں دم مارنے کی جا نہیں ۔'' دامن کرم و رحمت پر پنجہ مارا تھا لیکن جب نوبت جباری و قہاری تک پہنچی تو کیا کہیے کہ پھر اس کا گناہ زبان کی گردن پر ہوگا ۔

'ربنا ظلمنا انفسنا......الخ[19]' ۔ بہر حال جب قلم ہاتھ میں تھام ہی لیا ہے تو ضروری ٹھہرا کہ کچھ نہ کچھ لکھوں ۔ سو بہتر یہی ہے کہ قلم اب 'قہر' کے علاوہ کسی دیگر موضوع پر چلے ۔

سب سے پہلے تو آپ کی ذات با برکات کے اس عارضۂ ضعف سے صحت یاب ہونے پر خدا کا شکر بجا لاتا ہوں ، جو انھی دنوں آپ کے جسم مبارک کو لاحق ہوگیا تھا ۔ الحمد للہ کہ معاملہ بہ خیر گزر گیا ۔ خدائے جل جلالہ' آپ کی عنایت و شفقت کا سایہ اس سلسلے[20] کے

درویشوں پر قائم و دائم رکھے! کہ آپ ہی ہم لوگوں کی مشکلات کے حل کا وسیلہ اور ہماری دشواریوں کو آسان بنانے والے ہیں۔ آپ سے اس لگاؤ اور محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کی اس ناسازی طبع کا سن کر بیتابانہ حاضرخدمت ہوتا، اس لیے کہ آج اگر اپنا کوئی ایسا دوست ہے جو خیر دنیا و آخرت کا طالب ہے تو وہ میرے نزدیک محض آپ ہی کی ذات گرامی ہے، ـــــ دل و جان اس محبت پر بلکہ جہاں کہیں بھی محبت کا ذرا سا نشان ہے، فدا ہو! ـــــ لیکن چوں کہ آپ کی خواہش اس کے برعکس رہی ہے، اس لیے بندہ جرأت نہ کر سکا۔ یہ جو کہتے ہیں کہ 'الاطاعة فوق الادب' (فرماں برداری ادب سے بڑھ کر ہے) تو وہ یہی ہے: مصرع

قرب جانی چو بود بعد مکانی سہل است

اس کے بعد اپنے بعض احوال کے کشف کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں؛ امید ہے آپ ضرور معذور فرمائیں گے۔ حال کے متعلق کیا لکھوں کہ خراب ہے اور بے حد خراب ہے۔ بہ ظاہر تو ایسا خوب و درست معلوم ہوتا ہے کہ دیکھنے والے کو اس پر رشک آتا ہے کہ اس سے اچھا حال اور کسی کا نہ ہو گا، لیکن اگر ذرا باطن میں دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کس قدر خراب و شکستہ ہے۔

شکستہ دل تر ازاں شیشۂ بلوریم　　　که درمیانۂ خارا کنی ز دست رہا

(میں اس شیشۂ بلور سے بھی زیادہ شکستہ دل ہوں جسے تم پتھر پر گرا دو)

گوشہ نشینی کی جو مشق مرشد طریقت نے سکھائی تھی وہ برابر جاری ہے، لیکن ابھی تک دوست[۲۱] کی ایک بات بھی تو میسر نہیں آئی۔ خدا معلوم یہ تاریکی کب چھٹے گی؟ عمر بیت چکی ہے، امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے، اب اور کس چیز سے دل لگاؤں؟

عمرم بغم تو سر بسر شد　　　چوں سایہ کہ بر شود بدیوار

''الٰہی تیرے بندے کے لیے اسباب تنگ ہو گئے ہیں اور اس

کے سامنے دروازے بند کر دے گئے ہیں ؛ اس کی عمر ختم ہو چکی ہے مگر اس کے لیے دروازہ نہیں کھلتا ۔'' اپنے سے نا امید نہیں ہوں اور خود سے ہو بھی کیوں کر سکتا ہوں ، لیکن ایک ایسی خوش خبری کا طالب ہوں جو امید کو تازہ رکھے اور عشق و شوق کو بلند آوازہ عطا کرے :

وصلت کہ مرا دین و دنیا بخشد   صد روح بقا ، لب تمنا بخشد
نومید نیم لیک دلم می خواهد   یک مژدۂ وصلے کہ تسلا بخشد

(تیرا وصل مجھے دین و دنیا بخشتا ہے ، سینکڑوں روح بقا اور لب تمنا بخشتا ہے ۔ نا امید نہیں ہوں لیکن میرا دل ایک ایسے وصل کی خوش خبری چاہتا ہے جو تسلی بخش ہو)

یہ تمام سہل ہے ؛ دنیاے عشق و محبت میں ہجر و وصل ، دوری و نزدیکی ، ظلم و جفا اور لطف و وفا سب برابر ہیں ۔ اگرچہ خدا کی نعمتوں کو کہ بے حد و حساب ہیں ، ملحوظ رکھتے ہوئے سراپا شکر و رضا ہوں ، لیکن نفس کے وسوسوں اور شیطان سے کیوں کر نپٹوں کہ وہ تو دلیل مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ''تو تو ٹھنڈا لوہا کوٹ رہا ہے ۔ تجھے نہ تو اس 'سلوک' ہی سے کوئی بہرہ حاصل ہے اور نہ اس کام ہی کے مناسب ہے ۔ لوٹ جا کہ تیرے لیے منزل مقصود تک پہنچنا دشوار ہے ۔ چلا جا کہ بزم وصال میں تیرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ۔ تو راستہ گم کر بیٹھا اور ایک عام اور معمولی راستے سے باہر نکلا ہے ۔ تو جمہور کی طرز و روش کے برعکس چلا ہے ۔'' ہر چند دلیلوں پر قائم ہوں اور سندیں پیش کرتا اور نشانیاں دکھاتا ہوں ، نہیں مانتے اور ان وسوسوں اور اندیشوں سے باز نہیں آتے ۔ اب اس حالت میں کیا کروں اور کس طرح ان دو بد فطرت ستیزہ جو دشمنوں کو خاموش کروں 'خذ لہما اللہ......۲۲'

اس حال کے آغاز میں آں جناب نے یہ پیغام بھیجا اور دل خفتہ کو بیدار کیا تھا کہ عالی حضرت۲۳ کا اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ ''اپنی جگہ سے نہ ہلو ، گوشۂ خلوت سے باہر پاؤں نہ رکھو ؛

کسی بھی غریب امیر ، اپنے بیگانے اور مردہ و زندہ سے ملاقات نہ کرو اور ایک جگہ سے دوسری جگہ نہ جاؤ ۔'' چوں کہ اس سلسلے میں حد سے زیادہ مبالغہ و شدت سے کام لیا گیا تھا ، اس لیے میں نے عرض داشت گزاری کہ اگر خاک سار کو اس بھید سے آگاہ فرمائیں کہ کیا ہے ؟ (یعنی اس کی توجیہ فرمائیں) تو نفس کو لا جواب کرنے کا بہترین سبب ہوگا ۔ اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ ''ہم چاہتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ (تمھیں) اس وقت تک حقیقت حال سے آگاہی نہ ہو جب تک کہ وہ (تم) پاک و صاف نہ ہوجائے (جاؤ) ۔'' اس بارے میں جب تاکید و مبالغہ زیادہ ہوا تو طبیعت نے اضطراب کیا اور اس حال کی شان کشف کی تحقیق کے لیے حاضر خدمت ہوا ، تو آپ نے بالمشافہ بھی فرمایا کہ ''بات یہی ہے ، اور یہ بات قبول شدہ ، مانی ہوئی اور آراستہ ہے ، اور تم سے اس کے سوا کوئی اور صفت مطلوب نہیں ۔'' اس مرتبہ بھی نفس اپنی عادت کے مطابق جنبش میں آیا اور دلیل و حجت کا طالب ہوا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو تین روز اسی اضطراب اور بے چینی میں کٹ گئے۔ پھر اچانک تصدیق و تسلیم کا نور دل پر ایسا چمکا کہ اس سے شک و شبہ کی تمام تاریکیاں چھٹ گئیں اور دلیل طلبی کو کفر کے برابر جانتے ہوئے تسلیم و رضا کے مقام پر ساکن و ساکت ہو گیا ۔ دل وعدۂ کرم اور خیر صدق کی امید پر لگا کر بیٹھ گیا ۔ جب دوسری مرتبہ اس 'مقصد' کی صعوبت کے تصور سے خوف پیدا ہوا تو پھر عرض داشت بھیجی کہ اس امر کا نتیجہ اور اس کام کی غایت کیا ہے ، آگاہ فرمائیں ، تاکہ کام میں کچھ جد و جہد پیدا ہو اور عشق و شوق میں اضافہ ہو ؛ تو آپ نے جواب میں لکھا کہ سب 'خیر' ہے اور معاملہ ٹھیک ٹھاک رہے گا اور یہ کہ حضرت غوث الاعظم[۲۴] کی عنایات بے شمار ہیں ، کسی قسم کا غم اندیشہ نہ کرنا چاہیے ۔ 'و بذہ الاشارۃ......الخ' (اور یہ اشارہ میرے نزدیک ساری دنیا بلکہ دین و دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے ، سے زیادہ بڑا ہے) ۔ الحمد للہ کہ یہ بات بڑی مفید ثابت ہوئی اور کسی قسم کا اندیشہ یا تذبذب باقی نہ رہا اور اہالیان شہر وغیرہ جو ملامت

کو اٹھے تھے اب خاموش اور معترف ہو گئے اور اگر کبھی کبھار کوئی دانستہ یا نادانستہ طور پر چغلی کھائے اور کوئی ایسی ویسی بات کرے تو اس میں کوئی نقصان نہیں ہے کہ لوگوں کی زبان بند بھی تو نہیں کی جا سکتی۔

ان باتوں کے باوجود نفس 'حجت طلب' ہے ، بلکہ قلب و روح بھی معاملے کے وقوع پذیر ہونے کے وقت بے قرار اور مضطرب ہو جاتے ہیں۔ جب تک استقامت اور یقین کی ایک ایسی مخصوص حالت اور ایک ایسا خاص نور ، جو غیب کے پردے سے 'فضاے عیاں' میں چمکے اور 'مطلوب' کی نشانیوں سے آگاہ کرے ، ارزانی نہیں ہوتا ، یہ شکوک اور الجھنیں ہرگز دور نہ ہوں گی۔ ہر چند یہ جانتا ہوں کہ یہ راستہ تاخیر و تدریج سے طے ہوتا ہے اور معاملے کا سلجھاؤ وقت پر موقوف ہے ، اور اس جگہ دن ، ہفتے اور ماہ و سال نہیں گنے جاتے ؛ عقد و بندگی ابدی ہے ، اور جو کچھ ناصح مشفق فرمائے اور مخبر صادق آگاہی دے وہ حق ہے ، اور صبر و رضا اور تسلیم تو دین مسلمانی کے لوازمات اور معاملات کی اہم شرطوں میں سے ہیں ، اور خواہش و آرزو اور عجلت پسندی مقصود تک پہنچنے میں رکاوٹ اور بندگی کے طریقے کے منافی ہیں۔ اس حقیقت کے بیان اور اس وصیت کی استواری میں بھلا فتوح الغیب[۲۵] ایسی پاکیزہ کتاب سے بڑھ کر اور کون سی کتاب اور کون سا انسان زیادہ واعظ اور زیادہ سچے لہجے والا ناصح ہوگا۔ لیکن اس کے با وصف نفس کو اس اندیشے سے فراغت نہیں ہے ، دل کو قرار نہیں اور وحشت پیچھا نہیں چھوڑ رہی اور (نفس) کہتا ہے کہ اگر اتنا ہی کہہ دیں کہ صبر کر ، بے قرار نہ ہو ، یا یہ کہیں کہ تیرے نصیب میں اتنا ہی کچھ ہے ، اس سے زیادہ کا طالب مت ہو ، بلکہ اگر یہ کہہ دیں کہ تیرے لیے نہ تو 'بارگاہ قبولیت' میں کوئی جگہ ہے اور نہ 'منزل وصول' تک کوئی راستہ ، تو العیاذ باللہ من ذالک[۲۶] اس پر بھی راضی ہوں۔

اکثر اس بد کیش نفس سے کہتا ہوں کہ اے صلاح کار کو

نہ سمجھنے والے عجلت پسند ، معاملہ ناشناس ، اور اے نا عاقبت اندیش نادان! اس قدر تو اس بے جا حرص و آز پر قائم نہ رہ ، سوال میں اس قدر جلدی نہ کر ، معاملے کو پردے میں اور مبہم رہنے دے ، تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ایسی بات کہہ دیں ، جس کے باعث تجھے پشیمان ہونا پڑے اور اس وقت پھر تو کف افسوس ملتا پھرے کہ میں نے ایسا کیوں چاہا ؛ کاش معاملہ پوشیدہ اور ڈھکا چھپا ہی رہتا اور حقیقت حال کے چہرے پر سے پردہ نہ اٹھتا ۔ 'یا ایھا الذین......الخ[۲۷] ۔'

لیکن یہ بھک منگوں کی سی فطرت والا ندیدہ نفس ہر گز اپنی اس آرزو سے ہاتھ نہیں اٹھا رہا اور اپنی حرص و آز سے ذرا نہیں ٹل رہا ۔ کہتا ہے کہ جب تک پردہ نہ اٹھےاور جمال مقصود اپنا چہرہ نہ دکھائے مجھے اطمینان اور سکون و قرار حاصل نہ ہو گا ، یہاں تک کہ اس بات پر آ پہنچتا ہے کہ 'لولا یکلمنا اللہ......الخ' (جب تک کہ خدا تعالیٰ ہم سے کلام نہ کرے یا ہمارے پاس نشانی نہ آئے) اس سے خدا کی پناہ ہے! 'امنا...' (ہم اللہ پر ایمان لائے ہیں اور اس کے فیصلے پر راضی ہیں) اور حقیقت میں اس قبیل سے نہیں ہے ، بلکہ ایک بہت بڑا فرق درمیان میں ہے ۔ وہی فرق جو 'ارنی[۲۸]' اور 'حتی نری اللہ[۲۹]' میں ہے ۔

الغرض رنج و اندوہ اور دل کا انقباض حد سے بڑھ گیا ہے ۔ اب تو امداد و اعانت کا وقت ہے ۔ فریاد رسی کرنی چاہیے اور اغاثۂ کبریٰ[۳۰] کی چادر ، کہ حضرت غوث الاعظم کی جناب پر ختم ہوتی ہے ، اوڑھ اور داؤدی[۳۱] زرہ پہن لینی چاہیے ۔ غوثیہ حقیقت عظمیٰ کے قالب میں در آنا اور تصرف کر لینا چاہیے ، اس سلسلے کے مشائخ کی مقدس ارواح کی طرف متوجہ ہونا چاہیے اور کشف حال کی خواہش کرنا ، کوئی آگاہی پانا اور آگاہی دینا چاہیے تاکہ دل مرکز قرار بر ٹھہرے ۔

دل میرود ز دستم صاحبدلان خدارا
دردا کہ راز پنہاں خواھد شد آشکارا[۳۲]

(اے صاحب دلو! خدا کے لیے کوئی چارہ کرو کہ دل میرے ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے ۔ ڈر ہے کہ راز پنہاں ظاہر ہو جائے گا)

اگرچہ اس امر کا اظہار بے ادبی ہے لیکن کیا کروں کہ طاقت جواب دے چکی ہے ۔ کہاں جاؤں اور کس سے کہوں :

فریاد دل غم زدہ را گر نہ کنی گوش
پس پیش کہ از دست تو فریاد توان کرد

(اگر تو غم زدہ دل کی فریاد نہیں سنے گا تو پھر کس کے سامنے تیرے ہاتھوں فریاد کی جا سکتی ہے)

بس اب ختم کرتا ہوں ۔

(المکاتیب والرسائل اخبار الاخیار فی اسرار الابرار)

فرشتہ

[محمد قاسم ہندو شاہ فرشتہ نے بیجا پوری فرماں رواؤں کی راج دھانی میں بیٹھ کر اپنی کتاب ''گلشن ابراہیمی'' تالیف کی ۔ اکبر کا معاصر تھا ؛ جنوبی ہندوستان ہی میں رہا ۔ اس کی کتاب مسلمانوں کے ورود ہند کے بعد کی عمومی تاریخ ہے اور بیشتر حصہ دوسری تاریخوں پر مبنی ہے ۔ لیکن ابتدائی حالات کے لیے اس کے سامنے بعض ایسی تاریخیں بھی تھیں جو اب ناپید ہیں ۔ اس کے علاوہ تاریخ فرشتہ صوبائی حالات کے لیے بھی بہت کار آمد ہے]

محضر سماع

سیرالاولیا کے مصنف سید وحید الدین[1] کرمانی سے ، جو شیخ نظام الدین اولیارحہ کے مرید اور 'سید خرد' کے نام سے مشہور ہیں ، روایت ہے کہ جب بادشاہ قطب الدین مبارک شاہ[2] کے قتل کے بعد خسرو خاں تخت نشین ہوا تو اس نے مشائخ میں سے ہر ایک کو دو دو تین تین لاکھ 'تنکہ' بھیجے ۔ یہ رقوم سید علاء الدین جنیوری ، شیخ وحید الدین خلیفہ شیخ فرید الدین[3] مسعود گنج شکر اور شیخ عثمان[4] سیاح خلیفہ شیخ رکن الدین[5] ابو الفتح کے سوا سب نے قبول کر لیں ۔ اکثر نے یہ رقوم امانت کے طور پر رکھ چھوڑیں اور خرچ نہ کیں ۔ البتہ شیخ نظام الدین اولیارحہ نے کہ جنھیں پانچ لاکھ تنکہ ملے تھے ، تمام کے تمام فقرا پر خرچ کر ڈالے ۔ چار ماہ کے بعد جب غازی ملک یعنی سلطان غیاث الدین[6] تغلق ، خسرو خاں کو قتل کرکے دھلی کے تخت پر متمکن ہوا اور اسے مکمل طور پر استقلال

حاصل ہو گیا تو اس نے وہ تمام روپیہ جو خسرو خاں نے بانٹا تھا ، متعلقہ لوگوں سے واپس لینے کی ٹھانی ۔ اکثر مشائخ نے کسی حیل و حجت اور لیت و لعل کے بغیر مذکورہ رقمیں لوٹا دیں ؛ شیخ نظام الدین^ چوں کہ خرچ کر چکے تھے ، اس لیے وہ جواب میں خاموش رہے جس کے نتیجے میں سلطان غیاث الدین نے شیخ نظام الدین سے بدظن ہو کر عنایت و مہربانی سے ہاتھ اٹھا لیا ۔ ان لوگوں نے جو پہلے ہی شیخ رح سے دشمنی و حسد رکھتے اور سماع کے منکر تھے ، موقع کو غنیمت جان کر بادشاہ کے کان بھرنے شروع کیے کہ اس شیخ اور اس کے مریدوں کو تو سماع کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ یہ سرود بھی سنتا ہے جو کہ مذہب حنفی میں حرام ہے ۔ لہذا سلطان کے لیے واجب ہے کہ وہ علما کو بلوا کر محضر تیار کروائے اور اسے اس غیر شرعی فعل سے روکے ۔

چناں چہ سلطان نے اپنی تعمیر کردہ عمارت قلعہ تغلق آباد میں شیخ رح اور تمام علما کو طلب کیا ۔ کوئی ترپن (۵۳) عالم کہ ان میں سے ہر ایک خود کو سر آمد زماں سمجھتا اور سرود و سماع کے مسئلے میں شیخ نظام الدین اولیارح سے برسر نزاع تھا ، بحث میں شرکت کے لیے حاضر ہوئے ۔ مولانا فخر الدین[۹] رازی نے کہ شیخ رح کے مریدوں میں سے تھے اور اجتہاد کا دم بھرتے تھے ، بادشاہ سے کہا کہ ان علما میں سے دو ایسے عالم منتخب کر لیں جو سب سے زیادہ صاحب علم و فضل ہوں تاکہ وہ ہم سے بحث کریں ۔

الغرض بادشاہ نے قاضی رکن الدین ابوالحئی کو ، جو قاضی شہر اور شیخ رح کی دشمنی میں پیش پیش تھا ، بحث کا آغاز کرنے کے لیے اشارہ کیا ۔ اس نے شیخ رح سے مخاطب ہو کر کہا ''اے درویش! سرود و سماع کو جائز قرار دینے میں تمھارے پاس کیا دلیل ہے ؟'' شیخ رح نے حدیث نبوی صلعم 'السماع مباح لاھله' (سماع اس کے لیے حلال ہے جو اس کا اہل ہے) کا حوالہ دیا ۔ قاضی بولا ''تو تو ایک مقلد[۱۰] ہے ، تجھے حدیث سے کیا سروکار ؛ ابو حنیفہ رض[۱۱] کی کوئی روایت بیان کر کہ قابل قبول بھی ہے ۔'' شیخ رح نے جواب دیا ''سبحان اللہ!

میں تو صحیح حدیث نبوی صلعم پیش کر رہا ہوں اور تم کہتے ہو کہ ابو حنیفہ رضؓ کی کوئی روایت بیان کر - معلوم ہوتا ہے حکومت کا گھمنڈ تم سے یہ کچھ کہلوا رہا ہے - تم یہ جو اللہ کے دوستوں کے ساتھ اس قدر بے ادبی سے پیش آ رہے ہو، خدا نے چاہا تو جلد ہی اس عہدے سے معزول ہو جاؤ گے -''

جب بادشاہ نے حدیث نبوی (صلعم) سنی تو وہ کچھ سوچ کر خاموش اور ہمہ تن گوش ہو گیا - ابھی یہ لوگ اسی بحث میں مصروف تھے کہ مولانا علم الدین ، جو شیخ بہاءالدین[۱۲] زکریا کے پوتے تھے ، ملتان سے سیدھے دیوان میں پہنچے - بادشاہ تمام حاضرین کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے کھڑا ہو گیا - مولانا علم الدین سب سے پہلے شیخ نظام الدین اولیارحؒ کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کا حال احوال پوچھا اور ان کی بہت عزت و تکریم کی - اس کے بعد بادشاہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کہ شیخ کو کس لیے یہاں آنے کی زحمت دی گئی ہے ؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ ''سماع کی حلت و حرمت پر بحث کے لیے علما یہاں اکٹھے ہوئے ہیں ، الحمدللہ کہ آپ بھی تشریف لے آئے -'' مولانا علم الدین ، کہ علامۂ زماں تھے ، کہنے لگے ''میں نے مکہ ، مدینہ شام اور مصر کا سفر کیا ہے اور ہر جگہ یہ دیکھا ہے کہ متبحر اور پرہیزگار علما کے ہوتے ہوئے وہاں کے مشائخ سماع سنتے ہیں اور کوئی بھی انہیں اس سے منع نہیں کرتا - اور وجد تو بغیر کسی شک و شبہ کے جائز ہے - حضرت شیخ رحؒ اور ان کے مرید تو تمام اہل حال ہیں ، اور اخلاق و زہد و تقویٰ کے زیور سے ان کا ظاہر و باطن مکمل طور پر آراستہ ہے - پھر خود حضرت رسالت پناہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے سماع کیا اور وجد فرمایا ہے -'' جب مولانا نے یہ الفاظ کہے تو سلطان اٹھا اور اس نے شیخ رحؒ کو نہایت ہی اعزاز و اکرام کے ساتھ واپس بھیج دیا - اسے (سلطان) اس بات کی بے حد ندامت ہوئی - چناں چہ اسی روز اس نے قاضی رکن الدین ابوالحئی کو عہدۂ قضاءت سے معزول کر دیا -

(تاریخ فرشتہ ، جلد دوم)

معزالدین محمد بن سام

جن دنوں سلطان شہاب الدین لاہور میں قیام پزیر تھا، گکھڑ لوگ، کہ جن کا علاقہ دریاے سندھ کے کنارے سے کوہ سوالک تک پھیلا ہوا ہے، مسلمانوں کو بے حد تنگ اور ان کی تذلیل و تحقیر کر رہے تھے۔ جو کوئی بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتا اسے بہت بری طرح اور قسم قسم کے شکنجوں سے تکلیفیں پہنچاتے۔ خاص طور پر وہ مسلمان جو سلطان کی طرف سے پشاور شہر اور اس کے نواح میں متعین تھے وہ تو بے چارے ہر وقت ان ظالموں کے ہاتھوں رنج و تشویش میں مبتلا رہتے اور سکون و اطمینان کے ساتھ پنجاب کی طرف آ جا نہ سکتے تھے۔

یہ گکھڑ لوگ لا مذہب تھے۔ جس وقت ان میں سے کسی کے ہاں لڑکی ہوتی تو وہ اسے اٹھا کر اپنے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور آواز لگاتا ''کوئی ہے جو اس لڑکی کو اپنی زوجیت میں قبول کر لے؟'' اگر تو اسے کوئی قبول کر لیتا تو وہ لڑکی اسے دے دی جاتی ورنہ اسی گھڑی اس لڑکی کو قتل کر دیا جاتا۔ ان کے یہاں ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے تھے۔ جس گھڑی اس عورت کا ایک خاوند اس کے پاس آتا، تو وہ گھر کے باہر اپنی کوئی نہ کوئی نشانی رکھ چھوڑتا تاکہ اس وقت اگر دوسرا خاوند آ جائے تو وہ مذکورہ نشانی دیکھ کر باہر ہی سے لوٹ جائے۔ چناں چہ یہ لوگ اسی غیر متمدن ڈگر پر زندگی بسر کر رہے تھے، اور مسلمان آزاری کو اچھا سمجھتے تھے۔

تا آں کہ سلطان شہاب الدین کی سلطنت کے آخری ایام میں ایک مسلمان ان کا اسیر ہو گیا۔ اس نے موقع پا کر ان لوگوں کے سامنے اہل اسلام کے طور طریقے بیان کیے۔ چوں کہ ان لوگوں کی ہدایت کا وقت آ پہنچا تھا، اس لیے ان کے سردار کو مسلمانوں کی طرح و وضع بہت پسند آئی۔ اس نے اس مسلمان سے کہا کہ اگر میں سلطان شہاب الدین کے پاس جا کر حلقہ بہ گوش اسلام ہو جاؤں تو میرے ساتھ وہ کیا سلوک کرے گا؟ مسلمان نے جواب دیا کہ میں تجھے یقین

دلاتا ہوں کہ وہ اپنی شاہانہ عظمت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کوہستان کی حکومت مجھے سونپ دے گا ۔ اس کے بعد اس مسلمان نے اس واقعے پر مشتمل ایک خط گکھڑوں کے سردار کی عرض داشت کے ساتھ سلطان کے پاس بھجوا دیا ۔ سلطان نے بغیر کسی تاخیر کے ایک خلعت فاخرہ اور مرصع کمربند اس سردار کو بھیج دیا ۔ بعد ازیں وہ سردار سلطان کی خدمت میں پہنچا اور شاہی عنایات سے سرفراز ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا ۔ سلطان نے اسے اس کوہستان کی حکومت کا پروانہ دے دیا ۔ واپس آ کر اس نے بہت سے گھکڑوں کو مسلمان کیا ، اور صرف وہ چند ایک گکھڑ جو اس کے علاقے سے ذرا دور تھے، حلقہ بہ گوش اسلام نہ ہوئے ۔

اسی سال سلطان نے غزنیں اور پنجاب کے راستے میں واقع کوہستان میں رہنے والے کفار تراہھ میں سے ، کہ جن کے نزدیک مسلمانوں کو قتل کرنا گویا جنت کا پروانہ حاصل کرنا تھا ، چند ایک کو تو مہر سے اور کچھ کو قہر سے دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راغب کیا ۔ اس یورش میں تقریباً چار لاکھ کافروں نے اسلام قبول کیا اور آج تک ، کہ سنہ ہجری ۱۰۱۸ ھ ، یہ دونوں قومیں دین اسلام پر ثابت قدم ہیں اور ان کے اعتقاد میں کسی قسم کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی ۔

(تاریخ فرشتہ ، جلد اول)

ملا ظہوری

[ملا نورالدین ظہوری قائینی (۳۸–۱۵۳۷–۱۶۱۶ع) ۱۵۸۰ع میں وارد ہند ہوا؛ احمد نگر آیا اور پھر ۹۶–۱۵۹۵ع میں بیجا پور میں قیام پزیر ہوا۔ ابراھیم عادل شاہ ثانی جو علوم و فنون کا ماہر تھا، اس نے علم موسیقی پر دکنی اردو نظم میں ایک رسالہ (کتاب نورس) لکھا جو اب شائع بھی ہو چکا ہے۔ اس رسالے کا دیباچہ نثر مرصع میں ظہوری نے (۹۸–۱۵۹۷ء) کے لگ بھگ تحریر کیا۔ ذیل میں اس دیباچے کا اردو ترجمہ درج کیا جاتا ہے]

دیباچۂ کتاب نورس

عشرت خانۂ قال[1] کے نغمہ سرا کہ جنھوں نے حال کے بستان سرا کا نورس (تازہ پکا ہوا پھل) کھلا کر کام و دھن کے لیے لذت مہیا کی ہے، اس صانع مطلق کی حمد کے شہد سے شیریں بیان ھیں، جبھی تو انھوں نے، نے کے رگ و پے میں شیریں نغموں کی چاشنی دوڑا دی ہے۔ اور چمن عیش و نشاط کے خوش نفس (شعرا و امرا) کہ جنھوں نے مسرت و شادمانی کی بساط پھیلائی ہے، پروردگار کی ثنا کے شیریں و مصفا پانی سے رطب اللسان ھیں؛ جبھی تو انھوں نے تازہ نغموں کے پھول آواز و صوت کی شاخوں سے کھلائے ھیں۔ اس کے حجازیوں[2] کے محمل عشق ھندیوں کے تال (ایک ساز) کی صدا سے زنگلہ بند[3]، اور اس کے عراقیوں[4] کا زخم جگر ترکوں کے تار طنبور کے نمک سے متبسم ہے۔ درختوں کے پتوں کے مبنجیرے اس کی آرزو میں ترانہ ریز اور بلبلوں کی چونچوں کے الغوزے اس کی نوا سے نغمہ خیز ھیں

مثنوی

درین بستان سرا افگنده غلغل
سخن گردید گلبن ، نغمه بلبل
زبان را مطرب بزم دهن کرد
نفس را دم کش ساز سخن کرد
به ضبط نغمهٔ اسرار پرداخت
ز صندوق تن خلق ارغنون ساخت
رباب از مغز راز آمد بگفتن
شدش خشک از غم او پوست برتن
گل داغش کسی را رسته از شاخ
که چون نی استخوانش گشته سوراخ
چو نی آنکس نفس در نغمه افگند
که از کاهش سراپای خود آگند
چو از دردش شود پشت دو تا چنگ
دود دل ، تار های ناله در چنگ
پر و خالی پر اند از نغمهٔ دوست
ببین دف را که چون بر می درد پوست

''اس باغ میں اس نے چہچہوں کا شور ڈال دیا ؛ گلاب کی جھاڑی سخن اور بلبل نغمہ بن گئی ۔''

''زبان کو اس نے محفل دہن کا مطرب اور نفس کو ساز سخن کا دم کش[5] بنا دیا ۔''

'' وہ بھیدوں کے نغمے کو ضبط (ریکارڈ) کرنے میں مشغول ہوا ۔ اس نے خلق کے جسم کے صندوق سے باجا بنایا ۔''

''رباب ، راز کے مغز سے گفتار میں آیا اور اس (باری تعالیٰ) کے غم سے اس (رباب) کی کھال اس کے جسم پر خشک ہو گئی ۔''

''اُس (خدا) کے داغ کا پھول صرف اسی کی شاخ سے اگا کہ جس کی ہڈیاں بانسری کی طرح چھد گئیں ۔''

''بانسری کی مانند صرف وہی شخص نغمے میں روح پھونک سکا کہ جس نے کاہش (گھٹنا) سے اپنا تمام جسم بھر دیا ۔''

''جب اس کے درد سے چنگ، پشت دوتا ہو جاتا ہے تو دل ہاتھ میں نالۂ تار لیے دوڑتا ہے۔''

''تمام ابھری ہوئی اور خالی چیزیں اس (محبوب حقیقی) کے نغمۂ محبت سے پر ہیں۔ دف کو دیکھو وہ کس طرح اپنی کھال کو پھاڑتی[6] ہے۔'')

امتوں کے نوازندہ[7] (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ساز و برگ کے ساتھ درود ہو کہ جس کی ہدایت کے مضراب سے دین کا قانون[8] پر صدا ہے۔ اور آپ صلعم کی آل و اصحاب پر نغمہ و ترانہ سے پر صلواۃ ہو کہ جن کی زاری و عاجزی کی 'دم کشی' سے آپ صلعم کی شفاعت کا ساز نغمہ ریز ہے۔رباعی.........

''آپ صلعم تمام رسولوں کے سلطان اور سب سروں کے تاج ہیں۔ آپ صلعم ہی کے طفیل زندگی کا باجا نغمہ ریز ہے۔''

''اس دنیا کے چار کونوں (چار خلفا رض) میں صرف وہی شخص آپ صلعم کی اولاد ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے جو آپ صلعم کے بارہ مقاموں (بارہ امام) سے بہ خوبی آگاہ ہے۔''

اما بعد! 'سامعہ' کو شہنشاہ کے بولوں کی خوش خبری ہو؛ شہنشاہ بھی کون؟ ابراهیم عادل شاہ کہ جو سخن ور، نکتہ پرور، نغمہ سرا اور ترانہ ریز ہے، جو عرش مکانی ہے، جس کے خیمے آسمان پر گڑے ہیں، جو زحل[11] کے ارادوں والا، مریخ جیسے نوکر رکھنے والا، خورشید ایسے جھنڈوں والا، مشتری ایسی خصلتوں والا، زہرہ کی طرح نغمے الاپنے والا، منشی فلک[12] کی سی تحریر والا، چاند جس کا نوکر، جو حضرت ابراهیم خلیل اللہ کی مانند سخی، یوسف علیہ السلام ایسا صاحب جمال، داؤد علیہ السلام جیسا خوش گلو، سلیمان علیہ السلام جیسا صاحب منزلت، انصاف پھیلانے والا اور ظلم کو مٹانے والا ہے۔ خدا اس کے ملک و سلطنت کو تا ابد قائم رکھے اور دنیا اور اہل دنیا کو اس کے کرم اور نیکیوں سے فیض حاصل ہو!

مثنوی

جهانگیر و جهان دار و جهان بخش　　فلک قدر و فلک تخت و فلک رخش
کف همت دم شمشیر جرأت　　دماغ هوش مندی مغز فطرت
خلیل کعبهٔ دل زو مباهی　　برو صادق ثنای قبله گاهی
چنین تارک پیٔ افسر که دارد　　شهنشاهی جز او دیگر که دارد
اگر بزمست عیشستان ز جامش　　وگر رزمست رنگین از حسامش
ز عدلش گوی عدل دیگران چیست　　باو نازد لقب نوشیروان کیست
تفاوت کفر و دین آمد بمعنی　　میان عدل او تا عدل کسری
ز بیداریش خواب ایمن ز نالش　　بچشم پاسبانش کرد بالش
ز تیغش پیکر خصمان دو پیکر　　ز گرزش فرقها را سینه مغفر
سمندش را سپند از خال محبوب　　کمندش را نخ از رگهای مجذوب
مه نو حلقه در گوش رکابش　　یکی از نیزه داران آفتابش
سنانش چون علم سازد سر انگشت　　شود تسبیح ساز از مهرهٔ پشت
بر انگیزد بهر جانب که لشکر　　بگیرد گرد روی راه صرصر
بکین چرخ گر رخ بر فروزد　　نگه در چشم مهر و مه بسوزد
ز جودش قطرهٔ در لجه گنجید　　ز خلقش نفحهٔ در غنچه پیچید
سخنهای که نشنیده شنیدست　　فراست را تو گوی آفریدست
خبر از راز پنهانیش دادند　　سواد خط پیشانیش دادند
دعایش گر نگردد با اثر رام　　اثر از دم رود چون وحشی از دام
بجانها تخم مهری کشت ازان دست　　که در هر سو صد انبار دلش هست
بمهر از مهرور زان بر سر آمد　　عرض عشق و دل او جوهر آمد
نه تنها عشق را پشت و پناه ست　　برای حسن هم امید گاه است
دماغ از تار موی او تتار است　　نگه را باغ روی او بهار است
نهد خور هر طرف دامی ز تارش　　گزان رو پرتوی گردد شکارش
ادب در پیشگاهش پیشکاری　　جبینش را حیا آئینه داری
بزیر قصر قدرش در تماشا　　سر بر پشت عقل دست بالا
خلایق جمله مفتون هوایش　　وکیلم من همه جانها فدایش
بخلقش حق نداده احتیاجی　　دهد ما را برای ما رواجی

دهد صد بحر و کان را حاصل از دست   نیارد داد امایک دل از دست
کسی را زیبد انداز نثارش   کــه باشد عالم جان در کنارش

(''وہ دنیا کو پکڑنے والا ، جہان کو رکھنے والا اور عالم کو بخشنے، اور آسمان جیسی قدر و منزلت والا ہے۔ آسمان اس کا تخت اور فلک اس کا گھوڑا ہے۔''

''اس کی کف ہمت جرأت کی تلوار کی باڑھ ہے۔ اس کا ہوش مند دماغ فطرت کا مغز ہے۔''

''کعبۂ دل کا خلیل اس سے نازاں ہے۔ 'قبلہ گاہی' کی مدح و ثنا اس پر صحیح اترتی ہے۔''

''تاج پہننے کے لیے جو سر اسے عطا ہوا ہے وہ کسی دوسرے شہنشاہ کو نصیب نہیں ہوا۔''

''اگر بزم ہے تو اس کے جام سے وہ عیش و طرب کی جگہ ہے۔ اگر رزم ہے تو اس کی تلوار سے وہ رنگین ہے۔''

''اس کے برابر انصاف کرنے والا کوئی اور نہیں۔ نوشیرواں[۱۳] کون ہے ؟ یہ لقب تو (میرے ممدوح پر) ناز کرتا ہے۔''

''اس کے اور نوشیرواں کے عدل میں تو درحقیقت کفر و دین والا فرق ہے۔''

''اس کی بیداری کے سبب نیند نے فریاد و فغاں سے امن میں ہو کر اس کے پاس بان کی آنکھوں کو اپنا سرھانہ بنا لیا ہے۔''

''اس کی تلوار سے دشمنوں کے جسم ایک ایک کے دو دو ہو گئے اور اس کے گرز سے ان کے سروں کے لیے ان کے سینے خود بن گئے ہیں۔''

''معشوق کا تل اس کے گھوڑے کے لیے حرمل کا کام دیتا ہے ، مجذوب کی رگیں گویا اس کی کمان کی رسی ہیں۔''
''ہلال اس کی رکاب کا حلقہ بہ گوش اور آفتاب اس کا ایک نیزہ بردار ہے۔''

''اس کی سنان جب انگلی اٹھاتی ھے تو دشمن کی ریڑھ کی ھڈی سے تسبیح بناتی ھے ۔''

''جس طرف بھی وہ لشکر کشی کرتا ھے ، اس کے لشکر کی گرد باد صرصر بن جاتی ھے ۔''

''اگر کبھی آسمان کی دشمنی پر اس کا چہرا چمک اٹھے، تو اس چمک ھی سے وہ آفتاب و ماہ تاب کی آنکھوں میں 'نگاہ' کو جلا کر رکھ دیتا ھے ۔''

''اس کی سخاوت کا صرف ایک قطرہ بھنور میں سمایا اور اس کے خلق سے ذرا سی خوش بو کلی میں داخل ھوئی ھے ۔''

''اس نے ان سنی باتوں کو سن لیا ھے ؛ گویا وہ فراست کے لیے پیدا ھوا ھے ۔''

''اسے قدرت کی طرف سے چھپے ھوئے بھیدوں اور ماتھے کی لکیروں کا علم ملا ھے ۔''

''اگر اس کی دعا 'اثر' کے ساتھ مطیع نہ ھو تو دم سے اثر اس طرح دور ھو جائے جس طرح وحشی جال سے ۔''

''محبت کرنے کی وجہ سے وہ عشاق کا سردار بن گیا ھے ؛ گویا عشق عرض ھے اور اس کا دل جوھر ۔''

''وہ صرف عشق ھی کے لیے پشت و پناہ نہیں ھے بلکہ حسن کے لیے بھی امید کا مرکز ھے ۔''

''دماغ اس کے بالوں کے تار سے 'تتار'[۱۲] ھے اور نگاہ اس کے چہرے کے باغ سے بہار ھے ۔''

''سورج ھر طرف اپنی کرنوں کا جال بچھاتا ھے تاکہ ممدوح کے چہرے کی شاعوں کو شکار کرے ۔''

''اس کے حضور میں 'ادب' ایک ادنٹی ملازم اور 'حیا' اس کے ماتھے کی آئینہ دار ھے ۔''

''اس کی قدر و منزلت کے محل کے نیچے عقل بالا دست بھی تماشے کے وقت سر کو پیچھے جھکائے ہوئے ہے۔''

''تمام لوگ اس کے اشتیاق میں شیدائی ہو رہے ہیں ؛ میں اس بات کا ضامن ہوں کہ تمام جانیں اس پر فدا ہیں۔''

''اس کو خدا نے خلق کی حاجت نہیں رکھی بلکہ وہ تو ہمیں ہمارے فائدے کے لیے شہرت دیتا ہے[۱۵]۔''

''وہ سیکڑوں سمندروں اور کانوں کا حاصل تقسیم کر دیتا ہے لیکن ایک دل بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا[۱۶]۔''

''اس کے قدموں میں جان نثار کرنے کا ڈھنگ اسی شخص کو زیب دے سکتا ہے جس کے پہلو میں ہزاروں جانیں ہوں۔''

واہ ! کیسا افلاطون[۱۷] کی ذہانت والا اسکندر[۱۸] ہے کہ جس کے تحت دانائی اور حکمت ایک دوسرے کی پناہ میں نشو و نما پاتی ہیں۔ واہ! واہ! کیسا بار بد[۱۹] صفت ماہر نغمہ سرا پرویز[۲۰] ہے کہ جس کے مسرت افزا نغموں کی انگلی[۲۱] کے سرے سے رنج و غم کے کان ملے جاتے ہیں۔ اس کے خلق کی شمیم سے چنبیلی کا دامن بے انتہا خوش بو سے بھر گیا ہے۔ اس کے لطف و کرم کی نسیم سے کلی کے زیر لب 'چمن چمن[۲۲]' مسکراہٹیں ہیں۔ اس کی مدح کے نغموں کی توفیق سے ناطقہ کو گویائی حاصل اور اس کی دعا کے اجارے کی کثرت سے صدف کی قبولیت کی ہتھیلی تاثیر کے موتیوں سے بھرپور ہے۔ قضا کے فرمان کے لیے اس کے حکم نافذ کا اجرا درکار ہے، اور تقدیر کے نسخے (کتاب) کی درستی اس کی راست کار تدبیر سے ہے۔ موافقت کے باغ کی باد شمال کو اس کی طرف سے یہ تاکید ہے کہ وہ دل کے غنچے کھلانے اور نفاق کے کوچے کی باد صرصر کو یہ تنبیہ کہ وہ دلوں پر غموں کی خاک نہ بیٹھنے دے۔ بد عہدوں کے قتل کرنے میں موت کا جلاد اس کے غضب کے تھانے دار سے 'ہم پیمان' ہے۔ اور اس کی محبت کے کارخانے میں زندگی کا سررشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے عیش سے 'ہم پیوند' ہے۔

اس کی عدالت کے قانون کا نغمہ ملک نواز اور اس کی سیاست کی بھٹی کا شعلہ ظلم گداز ہے ۔ اس کا دبدبہ شیر کے پنجے کے زور کو ختم کرنے والا اور اس کی رزم خون میں ڈبو دینے والی اجل ہے ۔ اس کی الفت ہرن کا رم چھیننے والی ، اس کی بزم جمشید کے سامنے جام چڑھانے والی اور اس کی تلوار کی آب (دھار) زندگی کے کھلیان کے لیے آگ ہے ۔ اس کے تیر کی ہوا ناگہانی موت کی آواز ہے ۔ اس کا جھنڈا فتح و نصرت کا سرو ہے اور اس کا خنجر فتح کے دریا کی مچھلی ہے ۔ کوشش کی کمر اس کی مہربانی و عنایت کی مدد سے چست اور ہنر کی شکستگی اس کی تربیت کی مومیائی سے درست ہے ۔ موتی اس کی نظر میں صحرا کی ریت سے کم وقعت ؛ اس کا وعدہ موج کے دریا سے قریب ہونے سے بھی زیادہ وفا کے نزدیک ہے ۔ اس کی ہتھیلی کے سمندر (بہت زیادہ سخاوت) کے استعارے سے بادل کو یہ درفشانی حاصل ، اور اس کے دل افروز گالوں کی تشبیہ سے سورج کو یہ درخشانی ملی ہے ۔ اس کی بردباری کی سنگینی کے سامنے پہاڑ کی گرانی (سنگینی) گویا بھوس کی مانند ہلکی ہے اور اس کی قدر و منزلت کی بلندی کے مقابلے میں سدرہ کی بلندی گویا گھاس کی پستی ہے ۔

سخن نے کہ جس کی بلندی کے سامنے آسمان بھی اتنا نیچے ہے کہ اسے (سخن) پرواز کے وقت کئی جگہوں پر جھکنا پڑا ، جب اس (ممدوح) کی مدح و ستائش کے محل کی دہلیز کو چومنے کا ارادہ کیا تو وہ (سخن) شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا ۔ اس (ممدوح) کی فضیلتوں کا شمار اور اس کے کمالات کا احاطہ کرنا گویا سمندر کے پانی کو مٹھی کے پیمانے سے ناپنا اور صحرا کی ریت کے ذروں کو انگلی سے گننا ہے ۔

دنیا والوں پر اس عظیم عطیے کا شکر واجب و لازم ہے کہ وہ اس کے ہمیشہ قائم رہنے والے عہد حکومت کو پا کر مفتخر اور صاحبان سعادت و خوش بختی ہوئے ہیں ۔ خاص طور پر اہل دکن کے لیے (یہ شکر اور بھی لازم ہے) کہ وہ ہر طرف اور گوشہ میں محفلیں اور مجلسیں آراستہ کیے ہوئے ہمیشہ ہمیشہ کی دعوت میں عیش و نشاط کے دسترخوان اور 'ذوق حضوری[۲۳]' کے مائدے پر بیٹھے ہوئے ہیں ۔

دائرے[۲۴] پر کہ جس پر تمام نغموں اور قانون کا دار و مدار ہے ، زمانے نے اس قدر نوازش[۲۵] کی ہے کہ وہ بے حد مسرت کے سبب جامے میں نہیں سما رہا ۔ اور قانون کے تاروں سے ، کہ کتاب نغمات کا مسطر ہیں ، احوال کے صفحات پر 'عیش' کی تحریر رقم ہے ۔ طنبور[۲۶] ہوش کا شکار کرنے کے لیے تاروں کی کمان کندھوں پر لیے ہوئے ہے ، اور بانسری مسرت و شادمانی کو نئے سر سے جلانے کے لیے صور پھونکنے میں مصروف ہے ۔ کمانچہ[۲۷] کے پیالے کے پیمانے سے 'سامعہ' کے کان نغموں کے انبار سے پر ہیں ۔ ہندوستان کے ترانہ ساز (گویے) بیش بہا ترانوں کو تولنے کے لیے جنتروبین[۲۸] کے ترازو ہاتھ میں لیے ہوئے ، اور بیدار مغز پرہیز گار لوگ منڈل[۲۹] کے مٹکے کی شراب سے سرمست ہو رہے ہیں ۔ گت کی پا کوبی (رقص) اور تال کی دستک زنی سے رنج و ملال کا سر پامال ہے ۔ اور نورس (یعنی نئے نئے) راگوں اور نغموں سے اس دنیا کی پرانی فضا نشاط و شادمانی کی دولت سے مالا مال ہے ۔

ابیات

ز بس در نغمہ انگیزیست ایام — سزد رقصد اگر در گور بہرام
تذرو نغمہ بر لب آشیان ساخت — ترنم خانہ در کام و دہان ساخت
بشہری مرغ دلہا راست آہنگ — کہ از بام و درش میروید آہنگ
ہوا را ز امتزاج نغمہ آن حال — کہ موسیقار سازد مرغ را بال
زبانہا از شراب نغمہ سر مست — نفسہا پای کوبان دست بر دست
خموشی را در آوردہ بہ آواز — بہ نورس شہر یار نغمہ پرداز
گر اکسیر سرور و سور سازند — زخاک پاک بیجاپور سازند

(''زمانہ اس قدر نغمہ انگیزی میں مبتلا ہے کہ اگر بہرام[۳۰] اپنی قبر میں ناچنا شروع کر دے تو عین مناسب ہے ۔''

''نغمے کے تذرو (ایک خوش رفتار پرندہ) نے ہونٹوں پر آشیان اور ترنم نے کام و دہان میں گھر بنا لیا ہے ۔''

''دلوں کا پرندہ اس شہر کا آہنگ کر رہا ہے کہ جس کے بام و در سے نغمے پھوٹ رہے ہیں ۔''

''نغموں کی آمیزش کا یہ حال ہے کہ اگر کوئی پرندہ پھڑپھڑائے تو اس ہوا میں بھی موسیقی ہوتی ہے۔''

''زبانیں نغموں کی شراب سے نشے میں دھت ہیں اور روحیں ہاتھ پر ہاتھ رکھے رقص کر رہی ہیں۔''

''نغمہ پرداز بادشاہ نے نورس لکھ کر گویا 'خموشی' کو بھی آواز عطا کر دی ہے۔''

''اگر لوگ مسرت و شادمانی اور عیش و نشاط کی اکسیر بنانا چاہیں تو وہ بیجا پور ہی کی خاک پاک سے بنائیں گے۔'')

اگر وہ جہاں بانی کی رسموں، جہانگیری کے قاعدوں، رزم و بزم کی تنظیم اور عزم و جزم کے پاس میں، کہ یہ اس کی شان میں ایک آیت اور اس کے جسم پر ایک خلعت ہے، کما حقہ قیام و اقدام کرتا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں؛ تعجب تو اس بات میں ہے کہ اس نے ہر فن میں ــــ مثلاً ساز، کتابت اور مصوری کہ جن میں صاحبان فن مدتوں مشق میں قرینہ نہ ہونے کے سبب بے حد جد و جہد کرتے اور جب کہیں جا کر فن کے منشور کو درست کر کے کمال فخر کا اظہار کرتے ہیں ــــ معمولی سی توجہ سے اور تھوڑی سی مدت میں اس قدر امتیاز پیدا کر لیا کہ لوگوں کے پاس اس کی تعریف کرنے کے لیے الفاظ کا ذخیرہ نہیں رہا۔ اسے 'ہنر آفریں' شہنشاہ کہنا عین مناسب اور مختلف فنون میں اس کی مہارت و قدرت پروردگار کی دلیل ہے۔ نکتہ چیں عقل اس کی نقاشی کا موقلم بنانے والی اور رنگ آمیز[۳۲] خرد اس کی مصوری کے رنگوں کا پیالہ اٹھانے والی ہے۔

وہ (ممدوح) کور سواد[۳۳] لوگوں کی آنکھیں روشن کرنے کے لیے قلم کی سلائی سے سرمہ لگانے میں مصروف اور طنبور کے تار کی نبض گیری سے 'بیمار طینتوں' کے علاج میں مسیحائی دکھا رہا ہے۔ اس کے خط کی غلامی کا پروانہ حسینوں کے چہرے کی بغل میں[۳۴]، اور اس کے ساز کا 'تار دان' مرغولہ مو[۳۵] حسینوں کے دوش پر ہے۔ اس کے عنبر ایسی خوش بو رکھنے والے قلم کی توقیع[۳۶] کے سامنے

'منشی فلک'[37] کے لیے بھی سوائے خط فرمان پر سر رکھ دینے کے اور کوئی چارہ نہیں۔ زہرہ[38] میں بھی اس کے پردہ ساز[39] کے شاہد (معشوق) کا مشاہدہ کرنے کا زہرہ[40] نہیں، سوائے اس کے کہ وہ 'پردے' سے باہر گر پڑے۔ اس کا قلم زمانے کے صفحے کو سجانے والا اور اس کی تحریر مہر کے چہرے کا مسودہ نقل کرنے والی ہے[41]۔ (یعنی محبت و الفت کی کتاب ہوتی ہے) مثنوی

زخطش سرمه پرور چشم دیدن — زسازش حلقه در گوش شنیدن
بفرّ تاج او سوگند خورشید — به تار ساز او پیوند ناهید
چکد چون خامه بردارد به انشاء — عطارد در دواتش قطره آسا
عروس صفحه را خطش نگاریست — حروفش گرچه هریک خود نگاریست
نقط بر حرفهایش دانه چیدست — چنین دام نگه گیری که دیدست
کمر چون در فن صورتگری بست — قلم از طرهٔ حور و پری بست
ز نقاشی برنگی چهره آراست — که نقش ساده اش چین رونما خواست
اگر بلبل کشد، آواز بشنو — دهد آواز را پرواز بشنو
نگیرد طائرش بر صفحه آرام — نسازد گر بپایش مهر خود دام
زگلچینان باغش فصل خورداد — شگفته غنچها از جنبش باد
چو او کس صورت معنی نه پرداخت — بدعوی لیک چون مانی نه پرداخت
هنر گو خندها برلب به انبار — ز اشک غم بن مژگان بیفشار
هنر پرور بزی گو در عزیزی — که آخر شد زمان بی تمیزی

(''اس کے خط سے 'دیکھنے' کی آنکھ سرمہ پرور اور اس کے ساز سے 'سامعہ' کے کانوں میں حلقہ[42] ہے۔''

''خورشید اس کے تاج کی شان و شوکت کی قسم کھاتا[43] ہے۔ اس کے ساز کے تار سے ناہید (مطربۂ فلک) کا پیوند ہے۔''

''جب وہ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہے تو اس کی دوات میں عطارد قطروں کی طرح ٹپکتا ہے۔''

''صفحے کی دلھن کے لیے اس کی تحریر آراستگی کا باعث ہے، اگرچہ اس کی تحریر کا ایک ایک لفظ خود ایک معشوق ہے۔''

''اس کے حرفوں پر نقطے گویا دانے بکھیرے ہوئے ہیں۔ بھلا اس قسم کا نگاہوں کو پکڑنے والا جال کس نے دیکھا ہے۔''

''جب اس نے فن مصوری پر کمر باندھ لی تو حور اور پری کی زلفوں سے اپنا مو قلم تیار کیا۔''

''نقاشی سے اس نے چہرے کو اس طرح سجایا کہ اس کے سادہ سے سادہ نقش کے لیے بھی چین[۳۴] کا رونما[۳۵] در کار ہے۔''

''اگر بلبل کی تصویر بنائے تو تم اس (بلبل) کی آواز سن سکتے ہو۔ وہ آواز کو پرواز بخشتا ہے۔''

''اگر وہ اس کے پاؤں میں اپنی محبت کا جال نہ لگائے تو اس کا پرندہ (یعنی تصویر) صفحے پر آرام سے نہ رہے۔''

''موسم بہار اس کے باغ (تصویر) کے گل چینوں میں سے ہے، اور (اس کے کاغذ پر بنائے ہوئے) غنچے ہوا کے چلنے سے کھل جاتے ہیں۔''

''کسی نے بھی اس کی مانند 'معنی' کی تصویر نہیں کھینچی، لیکن پھر بھی اس نے[۳۶] مانی کی طرح کبھی بلند بانگ دعوے نہیں کیے۔''

''ہنر سے کہہ دو کہ وہ اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کے انبار لگا لے اور پلکوں سے غم کے آنسو پونچھ لے۔''

''ہنر مند سے کہو کہ وہ اب ارجمندی کی زندگی بسر کرے کہ بے تمیزی کا زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔'')

اب تک زمانے نے ہنر کو کم کرنے میں جس 'تنگی' کا مظاہرہ کیا تھا، اس (ممدوح) کے زیادہ بخشش والے کرم نے اس کی تلافی میں ہاتھ کھول دیے ہیں۔ ارباب فن کی آرزو اس کی توجہ و مہربانی کے لباس میں حصول کی معشوقہ ہے اور اہل استعداد کا ایک ایک نکتہ ایک ایک کتاب کی صورت، اور ایک ایک گلاب ایک ایک گلزار کی شکل

میں قبول کیا گیا ہے۔ کون ہے جس کے پاؤں میں راہ ہنر کا کانٹا چبھا ہو اور اس نے اس (ممدوح) کی عنایت کی شگفتگی سے جھولیاں بھر بھر کر گل مراد نہ چنے ہوں۔ کون ہے جس نے ذرا بھی کسب کمال کی مشقت کی تلخی چکھی ہو اور پھر اس کی مہربانی کی چاشنی سے اپنے حلق میں مصر مصر (بہت زیادہ) شکر نہ ڈالی ہو، اور کون سی چیز ہے کہ جس میں ہنر کا حسن پنہاں نہ ہوا ہو اور اس کی عقل و ہوش نے آشکارا اس سے عشق نہ کیا ہو؟ اگر کسی وقت ہوا کی جنبش سے پانی کی لہریں ایک تحریر کی سی صورت اختیار کریں تو وہ ان کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے۔ یا اگر ممدوح کبھی آگ کو دھوئیں کے مرغولے بناتے دیکھے تو اس کی توصیف میں نرم نفسی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اگرچہ اس نے اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے ہر قسم کے فنون کی داد دی اور اب بھی دیتا ہے، لیکن (سبحان اللہ) فن سخن کو اس نے بہت کچھ دیا اور دے رہا ہے۔ جو کلام اس کے نقاد ذہن کے سامنے پیش نہیں کیا گیا وہ قبولیت کے زیور سے محروم رہا اور جس کلام کو اس کی طبع روشن نے نہیں جانچا پر نہا وہ اپنے ہلکے پن کی وجہ سے دلوں پر گراں گزرا۔

مکتب سخن کے بڑے بڑے بالغ کلام (شعرا) اس کی زبان دانی کے مدرسے کے طفل، اور بیان کے میدان کے بڑے بڑے شہسوار (شعرا) اس کی نکتہ سنجی کے میدان کے پیادے ہیں۔ جب وہ تفصیل سے بات کرتا ہے تو قطرہ ایک دریائے بے کراں کا منبع بن جاتا ہے۔ اس کے اختصار کا یہ عالم ہے کہ آفتاب درخشاں کی 'جائے غروب' ذرہ بن جاتی ہے۔ اس کی بلاغت کے طومار کا شہرہ فصاحت کے کانوں کا بندا اور اس کی شیرینی گفتار کا شور[۴۸] ملاحت کے دسترخوان کا نمک ہے۔ اس کے ابہام[۴۸] کے قلم کا نقطہ بھیدوں کے خزانے کی مہر[۴۹] ہے۔ اس کی وضاحت کے شعلے کی روشنی آئینۂ اظہار کا صیقل ہے۔ اس کے طریقۂ اظہار کی شیرینی سخن کے حلق کو شیریں بنا دیتی ہے۔ 'معنی' کے شکار کی گردن اس کے 'انداز رسا' کی کمند میں ہے۔ جانوں کی امید کی نگاہیں اس کے خوش‌خبری دینے والے ہونٹوں کی جنبش پر لگی ہیں

اور دلوں کی ملکیت کی سند اس کے اشارے کی بھووں کی ھتھیلی میں ھے ۔ اس کی نثر نثرہ[۵۰] کی مانند رفیع الشان اور اس کے شعر شعری[۵۱] کی طرح بلند مرتبہ ؛ اس کا ہر حرف ایک فصل (باب) اور ہر فرع (شاخ) اصل (جڑ) ھے : مثنوی

سخن را بار خاطر بود کوهی	نبودی صاحب صاحب شکوهی
عروسی بود از پیرایه عاری	ز بخت پست خود در شرمساری
کنونش آسمان درپای بوس است	سراپا گردن و گوش عروس است
لآلی حقهٔ پروین سپند است	خیال شاه والا بس بلند است
ز شاگردیش استادان سخن ساز	نزاکت را ز طبعش ناز بر ناز
حلاوت چاشنی گیر از بیانش	بشیرینی سوطف از زبانش
چناں شیرین کند هرحرف حنظل	که شیرینی کند در گوشها تل
به آن سنگینی از کاه آورد یاد	که کوه از بار رشک آمد بفریاد
نسازد لفظ گل در گفتگو درج	نسازد تا درو صد رنگ و بو خرج
بجام شوق گردد باده پیما	دهد در قطره سر طوفان دریا
بحرف آورد ترکیبش ثنا را	متانت گشته آله این بنا را
سخن از فکر حفظ مرتبت رست	ز ترتیبش بجای خویش به نشست
برو گر عیب بین چشمی کشاید	دگر زو جز هنر بینی نیاید

(''سخن کا دل اس غم کے بوجھ سے پہاڑ کی طرح بوجھل ہو چکا تھا کہ کوئی بھی حشمت و شکوہ والا صاحب سخن نہ تھا[۵۲] ۔''

''وہ (شعر) ایک آرائش کے بغیر دلھن تھی اور اپنی بد بختی و کم نصیبی کے سبب خود ھی شرم سار ۔''

''لیکن اب تو اس کا مرتبہ اتنا بلند ہو چکا ھے کہ آسمان اس کے پاؤں چومتا ھے اور وہ سراسر دلھن کا کان اور گردن بن گیا ھے ۔''

(یعنی اب شعر کو بہت زیادہ آرائش حاصل ہو گئی ھے)

''شہنشاہ والا قدر کا تخیل اتنا بلند ھے کہ اس کے نزدیک ستاروں کے موتی گویا حرمل کے دانے ھیں ۔''

''اس کی شاگردی اختیار کرنے سے شاعر استاد بن جاتے ھیں ، اور اس کی لطافت طبع پر نزاکت بھی ناز کرتی ھے ۔''

''حلاوت اس کے بیان سے چاشنی حاصل کرتی ھے اور اس کی زبان سے اسے (حلاوت) شیرینی کا وظیفہ ملا ھے ۔''

''وہ ھر کڑوے لفظ کو اس طرح شیرین بناتا ھے کہ کانوں میں شیرینی کا ڈھیر لگ جاتا ھے ۔''

''وہ گھاس کا ذکر اس سنگینی (بوجھ) سے کرتا ھے کہ پہاڑ بھی رشک کے بوجھ سے چیخ اٹھتا ھے ۔''

''وہ گفتگو میں پھول کا لفظ اس وقت تک استعمال نہیں کرتا جب تک اس میں بے شمار رنگ و بو صرف نہ کرے ۔''

''اگر وہ عشق [۵۳] کے جام سے شراب پیے تو طوفانی دریا کو ایک قطرہ بنا کر چھوڑے ۔''

''اس کی ترکیب (ساخت) نے ثنا کو گویائی عطا کی اور متانت و سنجیدگی اس عمارت کا اوزار بنی ۔''

''(اب) سخن حفظ مراتب کی فکر سے چھوٹ اور اس (ممدوح) کی ترتیب سے اپنی جگہ پر بیٹھ گیا ۔''

''اگر کوئی عیب نکالنے والا اس کو دیکھے تو اسے اس میں 'ھنر بینی' کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا ۔'')

ان تمام حقوق میں سے ، جو اس نے ارباب عقل و دانش اور صاحبان نغمہ و آواز پر ثابت و واجب کیے ، ایک یہ بھی ھے کہ اس نے کتاب 'نورس' لکھ کر 'سامعہ' اور 'ناطقہ' کو اس کے پڑھنے اور سننے سے نوازا ھے ، اور اس بات کا التزام کیا ھے کہ جس طرح معنی کی تازگی نے الفاظ کو طراوت بخشی ھے ، اسی طرح ان راگوں کے الاپ کی ، جو موتی بکھیرنے والے شعروں میں باندھے گئے ھیں[۵۴] ، تازگی دلوں پر بے حد اثر کرے اور گانے والوں کے سر اور آواز سے سننے

والوں کے دلوں کے گوشوں سے تمام نئے پرانے غموں کی گرد صاف کر دے :

رباعی

از شاہ دکن جہان نشاط آباد ست
خاک غم از آب نغمہ اش برباد است
ارباب ترانہ کہنہ شاگردانند
آنکس کہ ازو نو شدہ طرز استاد است[۵۵]

اس کتاب کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ہندوستان والے اس مجموعے کو 'نورس' کہتے ہیں جس میں نو قسم کے رس اکٹھے ملائے گئے ہوں ، اور اگر فارسی زبان والے (ایرانی) اسے (کتاب نورس) اس کے فضل و کمال کے نہال کا نورس[۵۶] سمجھیں تو یہ بھی عین درست ہے اور اس لحاظ سے کہ یہ بے عیب معشوق غیب کے پردے سے ظہور کی جلوہ گاہ میں نو رسیدہ[۵۷] ہے ، اسے نورس کہہ لیں تو بھی روا ہے : ع

قیاس مسمیٰ ازین اسم گیر

بصارت کو اس کے دیکھنے سے باغ و بہار حاصل اور ذہن اس کے پڑھنے سے روشن ہے ۔ اس کا ہر صفحہ ایک چمن اور ہر سطر درخت ہے کہ جس کے پتے اس کے دلکش الفاظ اور جس کا پھل اس کے پاکیزہ معنی ہیں ۔ فصاحت کا بلبل اس کی نزاکت تحریر کے گلاب پر نغمہ پرداز اور نظارہ کرنے والوں کی نظر اس کی رواں عبارتوں کی رطوبت کی موج سے گویا زنجیر میں جکڑی ہوئی ہے ۔ اس کے حرفوں کی سنبل[۵۸] ناشکیبوں (عشاق) کی آہ سے بنی اور اس کے نقطوں کا بنفشہ حسینوں کے تل سے بنا ہے ۔ طراوت الفاظ کے ٹپکنے سے سطر کی نہر آب حیات سے بھری پڑی ہے ۔ پیاسا خضر اس کے طرز ادا سے سیراب اور اس کی ہوا[۵۹] مردہ مسیحا کو جان بخشنے والی ہے ۔ اس کے برجستہ نکتے گویا سربستہ غنچے ہیں ۔ اس کی رنگینی لالہ کے پھولوں کے کام آتی اور اس کی شگفتگی شیرینی سے پر ہے :

مثنوی

ز رنگینیش گل در غازہ جوئی　　ز سیرابیش مل در تازہ روئی

مگو نورس که فردوس برین است — نه تنها خلق، رضوان هم برین است
کسی زینسان تواند ساخت گلزار — که چیند چون خلیل از نار گلنار
رسید از داد رس شاه سخن رس — بفریاد نفسها نقش نورس
بفرمان حق و طبع بفرمان — سخن را کرد پیکر نغمه را جان
ره پژمردگی بر تازگی بست — چه نقشی در بلند آوازگی بست
بخورشید درخشان پرتوی داد — نوی را طرفه تشریف نوی داد
سخن پاس شکوه و شان خود داشت — که در دیوان شه ایوان خود داشت
کشد صد داستان هر صفحه در لب — ورق را گر زنند انگشت بر لب
سطور از رشتهٔ آواز دارد — ورق از پرد های ساز دارد
حروفش در ورقها جمله هم پشت — که ننهد هیچکس برحرفش انگشت
نوی میبال گو خوش فارغ البال — که نورس کهنگی را کرد پامال
خدا پیرایه بخشد از قبولش — و مضئون دارد از دهر فضولش

(''اس کی رنگینی سے پھول کو یہ سرخی ملی ، اور اس کی سیرابی و تازگی سے شراب کو تازہ روئی حاصل ہوئی ۔''

''اسے نورس مت کہو کہ یہ تو فردوس بریں ہے ۔ صرف خلقت ہی نہیں بلکہ رضوان بھی اس قول سے اتفاق کرتا ہے ۔''

''(کیا) کوئی اس قسم کا گلزار بنا سکتا ہے کہ جس میں (حضرت ابراهیم) خلیل اللہ[60] کی طرح کوئی نار[61] میں سے گلنار[62] چنے ۔''

''بادشاہ دادرس[63] کہ سخن رس بھی ہے ، کی طرف سے 'نفسوں'[64] کی فریاد پر نورس کا نقش[65] پہنچا ۔''

''خدا کے حکم اور فرماں پزیر طبع سے اس نے سخن کو جسم عطا کیا اور نغمے کو جان بخشی ۔''

''پژمردگی کی رہ[66] کو اس نے تازگی بخشی اور بلند آواز میں کیسا راگ باندھا ۔''

''اس نے چمکتے ہوئے سورج کو روشنی دی اور 'نئے پن' کو ایک عجیب نئی خلعت عطا کی ۔''

''سخن نے اب اپنی شان و شوکت کی حفاظت کر لی ہے کیوں کہ بادشاہ کے دیوان٦٦ میں اب اس کا ایوان ہے۔''

''اگر اس کے ورق کے ہونٹ پر انگلی لگائیں تو اس کا ہر صفحہ ہونٹوں پر سیکڑوں داستانیں لے آئے۔''

''اس کی سطریں آواز کے دھاگے کی اور اس کے اوراق ساز کے پردوں سے بنے ہیں۔''

''اس کے اوراق میں جملہ حروف٦٨ ہم پشت٦٩ ہیں تاکہ کوئی اس کے حرف پر انگلی٧٠ نہ رکھ سکے۔''

''اے 'نئے پن' تو اب فخر کر اور مطمئن و فارغ ہو جا کہ کتاب نورس نے کہنگی (پرانا پن) کو پامال کر دیا ہے۔''

''خدا اسے اپنی قبولیت کا زیور عطا کرے اور ہر بیہودہ شخص کی تنقیص سے بچائے۔'')

چوں کہ شاہانہ لطف و عنایت اور خسروانہ کرم و مرحمت ہمیشہ دور و نزدیک کی رعایا کے شامل حال رہتی ہے ، اس لیے (اس موقع پر بھی) بادشاہ سلامت نے عراق اور خراسان کے لوگوں کو اس ذوق سے محروم نہ رکھنا چاہا اور خواہش کی کہ یہ کتاب سارے عجم میں پھیل جائے تاکہ لوگ اس کے معنی سے آگاہی پا کر اپنا ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات بنالیں ۔ چناں چہ شاہی فرمان جاری ہوا کہ اس 'عرش نظیر' تخت خلافت کے پائے پر کھڑے ہونے والے (صاحبان استعداد) اپنی اپنی قابلیت و لیاقت کو مکمل طور پر کام میں لاتے ہوئے اس کتاب کی شرح بڑے فصیح و بلیغ انداز میں کریں اور کتاب کے بعض فوائد کو اصطلاحات کے مطابق لکھیں ۔ اس بات کے باوجود کہ ہر صاحب استعداد نے دوسروں سے ممتاز ہونے کی خاطر موشگافیوں میں بہت زیادہ محنت و جستجو سے کام لیا ، لیکن جب ان لوگوں نے اپنی اپنی تحریریں بادشاہ کے حضور میں پیش کیں تو (بادشاہ کی جانب سے) ان کی تحریروں میں الفاظ کی تبدیلی ، عبارتوں کے تغیر ،

بجا قسم کے تصرفات اور 'حق ادا'[۱] بجا لانے کے سبب بڑے بڑے عدیم السہو[۲] ادبانے ، کہ جن کی انشا کے صفحے پر کبھی حک و اصلاح کا چاقو اور قلم نہ چلا تھا ، اپنی شرحوں کی ایک ایک سطر اور ایک ایک صفحے کو شرمندگی کے پسینے سے دھو ڈالا اور پھر جو کچھ جہاں پناہ کی زبان معجز بیان سے سنا اسے لکھ کر اپنے آپ کو اس شرح نویسی میں اپنے قلم کی طرح ، لکھنے کا اوزار سمجھا ۔ مختصر یہ کہ متن کی متانت میں بھی اسی کی ہمہ دانی اور شرح کی انشراح[۳] میں بھی اسی کی شگفتہ بیانی کو دخل ہے :

ادب آموز و نکتہ اندوز اند گـر عـراق وگـر خراسانی
کو فلاطون کہ با ہمہ فطنت تـہ کند زانوی سبق خوانی

اور یہ جو حضور عالم پناہ نے بہ نفس نفیس دیباچہ لکھنے کی طرف توجہ نہیں فرمائی تو اس میں کچھ فائدے اور اغراض مقصود و ملحوظ ہیں ۔ ہاں ! بیش بہا موتیوں کو نظر بد سے بچانے کے لیے ان کی لڑی میں ٹھیکری باندھنا ضروری اور باغ و بوستان کی فضائے جاں فزا کے لیے خار و خس کا ہونا لازمی ہے ۔ سیاہ روغن[۴] کے قریب کافور[۵] رکھنا اور حنظل[۶] کے بعد شکر چکھنا حکمت ہے ۔ اور اس دیباچے کا لکھنا بھی درحقیقت گیتی پناہ ہی کی ان تعلیمات کے فیض سے ہے جو آپ نے مختلف موقعوں پر فرمائیں ، کہ سخن ور کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے الفاظ کی چستی و بندش کو ملاحظے میں رکھے ، کیوں کہ اکثر عبارتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں ایک لفظ بھی زیادہ یا کم نہیں کیا جاتا اور معمولی سی تقدیم و تاخیر سے معنی میں زمین آسمان کا فرق آ جاتا ہے ۔ نیز حضور نے ہمیشہ 'کلام' کی راہ سے ثقیل اور بے ڈھنگے الفاظ کے سنگ ریزے اٹھانے کو کہا ہے تاکہ بیان کے گھوڑے کے پاؤں کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے ۔ آپ نے الفاظ کی تاریکی اور باریکی سے بھی ، کہ جس کے معنی تک عقل کے ہاتھ پاؤں نہ پہنچ سکیں ، منع فرمایا ہے ۔ خاک سار نے حضور سے اس قسم کی باتیں کئی مرتبہ سنی ہیں ۔ آپ کی صفائی ذہن کے وسیلے سے آپ سے استفادہ کرنے والوں

کی طبیعت میں صفائی آگئی ہے اور آپ کی شاگردی کا بندا اهل انصاف کے کانوں کا آویزہ ہے ۔ مختصر یہ کہ اگر کوئی پھول بہار کا تحفہ بنے تو بھی اس کا وجود بہار ہی کے دم سے ہے اور اگر کوئی موتی نثار دریا ہو تو بھی اس کا وجود دریا ہی کے طفیل ہے : بیت

در کمالات ای خرد پہنا ببین　　　کم ز رشحے پیش آن دریا ببین

جس طرح بے نیازی اس پروردگار کی صفت خاص ہے ، اسی طرح اس کے سایہ[۷۷] کو بھی اگر کوئی احتیاج ہے تو صرف ان ندیموں کی کہ جن کی موجودگی میں وہ اپنی کیفیت و چاشنی کے مطابق شراب سخن کے جام چڑھائے اور نغموں کا نقل[۷۸] اڑائے اور عقول[۷۹] کے اندازے کے مطابق 'انداز[۸۰]' کے بارے میں هم زبانی کے ہونٹ کھولے ۔

واہ واہ ! اس چمن ایسی شگفتہ طبیعت رکھنے والے کے ذوق کا کیا کہنا کہ جس کے رنگین نکتوں کی آگاهی سے چہرے پر 'ادراک[۸۱]' کا رنگ ملا جا سکتا ہے ۔ سبحان اللہ کیسا سبک روح[۸۲] ہے کہ اس کے دل کا پرندہ اهتزاز[۸۳] کے پروں سے نازک نغموں کی شاخوں پر بیٹھ سکتا ہے[۸۴] ۔ سخن بلند[۸۵] کہنے والے کے لیے ایک کوتاہ فہم سننے والے سے بنا کر رکھنا کس قدر دشوار ہے ۔ اور بلند مرتبہ کلام کو کسی ضرورت کے تحت اپنے رتبے سے گرانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی جوہری کسی بیش بہا موتی کو توڑنے پر دل کڑا کر لے تاکہ ایک کم مایہ گاہک اسے خرید سکے ۔ یا جیسے کوئی نقاش اپنے 'نزاکت رقم' قلم کو بڑی تیزی سے چلائے تاکہ ایک موٹی نظر والا مبصر اسے چشم تماشہ سے دیکھ سکے ۔

چوں کہ خاص و عام کے دلوں کے صفحات پر اوہام کا قلم مشق کرتا رہتا ہے[۸۶] ، اس لیے وہ لوگ جنھوں نے 'بہشت صفت' محفل کے نظارے سے چشم و گوش کو آراستہ نہیں کیا ، جو نگاہ و سماع کی عید نوروز[۸۷] سے قطعاً ناواقف ہیں ، جنھوں نے عقل کی تصویر اور روح کی تجسیم نہیں دیکھی اور جنھوں نے معجزہ صفت کلام کے موتیوں کو ہوش کے کانوں کی ڈبیا میں نہیں سنبھالا ہے ، یہ سمجھتے

ہوں گے کہ میرا اپنے (ممدوح کی) یہ تعریف و ستائش کرنا بالکل انھی مداحوں کی طرح ہے جو اپنے ممدوح کی مدح میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے اور اس (ممدوح) کے قطرے کو دریا کا منبع اور ذرے کو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کہہ کر پکارتے ہیں ۔ لیکن اگرچہ ظہوری کے قول کی سچائی اظہرمن الشمس ہے ، پھر بھی وہ اس گمان و شبہ کو دور کرنے کے لیے قسم کھاتا ہے ۔ ''قسم ہے اس نگارندہ۸۸ کی جس نے حسینوں کے خط۸۹ کے ریحان۹۰ سے مشک۹۱ کو نسرین۹۲ کے اوپر حصہ دیا اور قسم ہے اس نوازندے۹۳ کی جس نے نغمے کی چابی سے سننےوالوں کے لیےنوازش۹۴ کا دروازہ کھولا کہ کسی بھی 'نادر قلم' کا قلم اس کے دفتر مدح کی 'مد' ٹھیک طرح نہیں لکھ سکتا۹۵ ، اور اس کی تعریف کے قانون۹۶ کی 'شد' کسی مبارک نفس کےحد لفس میں نہیں ہے۔''
خدا کرے سب کو نصیبے کی یاوری سے اس کی آستاں بوسی کی سعادت نصیب ہو! تاکہ ہر کوئی اپنی اپنی ذہانت و فطرت کے مطابق بہرہ مند اور محظوظ ہو کر حقیقت حال اور میرے قول کی راستی سے آگہ ہو ۔ اس دعا کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ کلام کو طول دینا ادب سے دور ہونے کے مترادف ہے ، لہٰذا دعاے اختتام کے زمزمے سے 'نوازش' کا اثر رکھنے والا دم کرنے کو واجب و لازم جانا ۔

دعائیہ کلمات

جب تک سورج کے طنبورے کے پیالے سے شعاعوں کے تار نکلتے بجتے ہیں ، اس وقت تک ظل اللہ کے مہب (ہوا چلنے کی جگہ) سے نغموں کی نسیم چلتی رہے ، اور جب تک سخن کے ساز پر زبان کی مضراب سے نفس کے تار بجتے رہیں ، اس وقت تک عالم پناہ کی مدح و توصیف کا ترانہ اہل جہاں کے گلے اور زبان کا ذخیرہ بنا رہے!

قطعہ

تا دو معنی بہر لفظ چنگ و قانون آورند
لفظ پردازان معنی ساز در بزم بیان
باز اقبالش بصید سلک رنگین چنگ باد
تارِ چنگ عشرتش بادِ از گسستن در امان

همم بر آهنگ ثنایش نغمهٔ قانون دهر
هم بوفق مدعایش رسم و قانون جهان

(جب تک معنی ساز ادیب 'بیان' کی محفل میں 'چنگ' اور 'قانون' کے لیے دو علیحدہ علیحدہ معنی لاتے رہیں ، اس وقت تک اس (ممدوح) کے نصیبے کا باز 'ملک رنگین' کے شکار میں 'چنگ' (پنجہ) بنا رہے اور اس کے عشرت کے چنگ (باجہ) کے تار ٹوٹنے سے محفوظ رہیں ! اسی طرح زمانے کے 'قانون' کا نغمہ اس کی مدح کے آہنگ (لے ، ارادہ) پر رہے اور دنیا کے رسم و قانون اس کے مدعا کے موافق رہیں!)

زین دعا ها بر اجابت منت بسیار باد

(مغلیہ دربار میں فارسی ادب ، جلد سوم ، ضمیمہ الف)

———

حکیم ابو الفتح گیلانی

[۱۵۷۴-۷۵ء میں وارد ہند ہوا ؛ ابو الفضل اور فیضی کی طرح اکبر کے مزاج میں دخل رکھتا تھا اور بہ قول بدایونی اس کے مذہبی عقائد کا طرف دار تھا ۔ ادب کے لیے حکیم کی اہمیت اس لیے ہے کہ شعر کا اچھا نقاد تھا اور عرفی جیسے شاعروں کی تربیت کرتا رہا ، ۱۵۸۹ء میں انتقال کیا ۔ چار باغ یا رقعات سے ذیل کا اقتباس لیا گیا ہے]

منیر شریف آملی[1] کے نام

عمدہ و اعالی نظم و نثر کا مجموعہ جو میرے برادر عزیز بخشی الملک شریف سرمد نے دلی مسرت کے ساتھ دوستوں کو ارسال کیا تھا ، حسن عقیدت میں افزائش کا باعث بنا : مصرع

طبع لطیف تو ہمہ فکر نکو کند

ان دنوں عزیزم ملا حیاتی[2] میں ترقی کے خاصے آثار نظر آ رہے ہیں ۔ پچھلے دنوں اس نے ایک غزل کہی جس کا ہر شعر اعلیٰ درجے کا ہے ، سوائے ایک کے جو زیادہ معیاری نہیں ؛ البتہ ملا عرفی[3] کی توقع کے مطابق ترقی نہیں کر رہا ۔ اگرچہ اس کی ذہانت ، نکتہ سنجی اور معنی آفرینی میں کسی کو کلام نہیں ، لیکن ہر انسان پر فیضان الٰہی کا ایک خاص وقت ہوتا ہے ۔

کسی اہل اللہ کی مجلس ہو یا اصحاب زمانہ کی محفل ، آپ کو ہر موقع پر یاد کیا جاتا ہے ۔

ان لوگوں پر زیادہ سختی نہیں کرنی چاہیے جنھیں بڑی دقت و پریشانی

کے بعد جمع اور سربراہ کر کے روانہ کیا گیا ہے ۔ درخواست کی ابتدا اس دن سے کرنی چاہیے جس دن آپ پہلی مرتبہ حیدر بیگ سے ملیں ۔

فالونیا[۴] دو ایک روز میں تیار ہونے پر روانہ کر دی جائے گی ؛ مفرح[۵] موجود تھی لہٰذا ارسال کر دی گئی ہے : فرد

به تنهائی بسی خون جگر خوردیم بر یادت
تو هم چون با حریفان باده نوشی یاد کن مارا[۶]

روپیہ سب سے پہلے احدیوں میں تقسیم کرنا چاہیے ، اس کے بعد کسی ایسے شخص کو مالی امداد دینی چاہیے کہ جس کی بہت زیادہ بے سر و سامانی سے آپ خود آگاہ ہوں ؛ جو کہیں سے تنخواہ نہ پاتا ہو اور کوئی بھی اس کی مدد کرنے والا نہ ہو ۔ یا اسے مدد دی جائے جس نے اس سفر میں کوئی پیشگی رقم نہ لی ہو ۔

جب آپ ہلہ کار (جگہ کا نام) پہنچیں تو وہاں کے محنت و مشقت میں مشغول زمیں داروں اور گکھڑوں کے سوا دوسرے باشندوں سے آپ کا برتاؤ اور سپاہیوں کی پیشگی تنخواہیں وغیرہ ، یہ ساری باتیں نواب کے مشورے اور صواب دید کے مطابق ہونی چاہئیں اور جس شخص کو بھی روپیہ پیسہ دیں اس سے باقاعدہ رسید لیں ۔

برخوردار فتح اللہ جو بڑا وفا شعار ہے ، ہمیشہ آپ کو یاد کرتا اور سلام کہتا ہے ۔

(رقعات ابو الفتح گیلانی)

نورالدین جہانگیر

[نورالدین جہانگیر (۱۵۶۹-۱۶۲۷ع) اکبر کا فرزند ، تیموری فرماں روا ، علم و فن میں گہری نظر رکھتا تھا ۔ خصوصاً مصوری سے اسے بڑا لگاؤ تھا ۔ اس کے زمانے میں اس فن کو بڑا فروغ حاصل ھوا ۔ اس کے دور حکومت (۱۶۰۵ع-۱۶۲۷ع) میں مذہبی تحریکات خصوصاً مجدد الف ثانی اور شیخ عبدالحق محدث کی سرگرمیاں اپنے عروج پر رھیں ۔ اکبری دور کا یہ رد عمل شاہجہان کے زمانے تک بہت نمایاں ہو گیا]

نقاشی کے متعلق جہانگیر کے خیالات

آج (تیرھویں جشن نوروز کے موقع پر) ابوالحسن مصور کو نادرالزمانی کے خطاب سے نوازا ۔ اس نے میری تخت نشینی کی جو تصویر جہانگیر نامہ کے دیباچے میں شامل کرنے کے لیے بنائی تھی ، وہ مجھے دکھائی ۔ چوں کہ یہ تصویر بہت عمدہ اور واقعی تحسین و آفرین کے لائق تھی ، اس لیے وہ میری بے پناہ عنایت و مہربانی کا سزاوار ٹھہرا ۔ اس کا فن کمال کو پہنچ چکا ہے اور اس کی تصاویر زمانے کے شاھکار کا درجہ رکھتی ھیں ۔ وہ اس دور کا ایک بے مثل فنکار ہے ۔ آج اگر استاد عبدالحئی اور استاد بہزاد[۱] ایسے عظیم فنکار اس دنیا میں موجود ہوتے تو وہ بھی اس کے فن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکتے ۔ اس کا والد آقا رضا ہروی میری شاھزادگی کے دوران میں ملازم ھوا تھا ، جس کے سبب اسے (ابوالحسن) اس آستانے کے خانہ زاد غلام ہونے کی نسبت حاصل ہے ۔ اس کے باپ کے فن کو اس کے فن سے کوئی نسبت نہیں ہے بلکہ دونوں کا طرز ھی مختلف ہے ۔ اور اس پر میری تربیت کے

بہت سے حقوق ہیں - میں نے اسے اس کے بچپن سے لے کر اس وقت تک ہمیشہ بہ طریق احسن پرورش کیا ہے جب کہیں جا کر وہ اس مقام پر پہنچا ہے - سچ تو یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کا نادر روزگار مصور ہے -

اسی طرح استاد منصور نقاش بھی ، کہ نادرالعصر کے خطاب سے ممتاز ہے ، فن مصوری میں یکتائے دہر ہے - میرے والد کے اور خود میرے عہد حکومت میں ان دونوں کا ہم پلہ کوئی نقاش نہ تھا ، اور اب بھی ان کا کوئی جواب نہیں ہے -

مجھے تصویروں سے اتنی دل چسپی اور ان کو پرکھنے سمجھنے کی اس قدر مہارت ہو گئی ہے کہ اگر ماضی و حال کے ماہر نقاشوں میں سے کسی کی بھی کوئی تصویر یا نقاشی مصور کا نام بتائے بغیر میرے سامنے رکھ دی جائے تو میں فوراً جان جاؤں گا کہ یہ فلاں استاد کا کام ہے ، بلکہ یہاں تک کہ اگر کسی مجلس کی تصویر بنائی گئی ہو جس میں مختلف اشخاص کے چہرے ہوں اور ہر چہرہ الگ الگ نقاش کے مو قلم کا نتیجہ ہو تو پھر بھی میں پہچان جاؤں گا کہ فلاں چہرہ کس استاد کا بنایا ہوا ہے ، اور فلاں چہرہ کس فنکار کی کوشش کا نتیجہ ہے - اور اگر کسی ایک ہی تصویر میں چہرہ ایک فن کار نے بنایا ہو اور بھویں کسی دوسرے استاد کے مو قلم سے ہوں ، تو اس تصویر کے متعلق بھی مجھے پتا چل جاتا ہے کہ چہرہ کس نے بنایا ہے اور آنکھیں اور بھویں کس نے - (توزک جہانگیری)

(۲)

شیخ احمد سرہندی کا تذکرہ

انھی دنوں مجھے بتایا گیا کہ شیخ احمد نامی[۲] ایک جعل ساز و فریبی نے سادہ لوح اور بھولے بھالے لوگوں کو اپنے مکر و فریب کے جال میں پھانس رکھا ہے - اس کے علاوہ اس نے تقریباً ہر شہر اور ہر قریے میں اپنا ایک ایک مرید ، جسے وہ خلیفہ کے نام سے پکارتا ہے ، مقرر کر رکھا ہے - اس کے یہ مرید معرفت کی دکان داری چلانے اور لوگوں کو جل دینے کے معاملے میں گویا گرگ باراں دیدہ ہیں -

اس نے اپنے مریدین اور معتقدین کے نام وقتاً فوقتاً جو مزخرفات لکھے ہیں ، انھیں مکتوبات کے نام سے ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا ہے ۔ اس مجموعۂ لغویات میں اس نے بہت سی ایسی بیہودہ باتیں تحریر کی ہیں ، جو کفر و زندقہ[3] کی حدوں سے جا ملتی ہیں ۔ ایک مکتوب میں وہ لکھتا ہے کہ ''مقامات سلوک طے کرتے ہوئے میں مقام ذی النورین رض[4] میں پہنچا ، جو ایک نہایت عالی شان اور پاکیزہ مقام تھا ۔ وہاں سے گزر کر مقام فاروق رض[5] میں پہنچا اور مقام فاروق رض سے گزر کر میں نے مقام صدیق رض[6] کو عبور کیا ۔'' اس کے ساتھ ساتھ وہ ہر مقام کے مطابق اس کی تعریف لکھتا گیا ہے ۔ پھر لکھتا ہے : ''وہاں سے میں مقام محبوبیت[7] میں پہنچا جو نہایت ہی منور اور رنگین و دل کش تھا ۔ اس مقام میں مجھ پر قسم قسم کی روشنیوں اور رنگوں کے عکس پڑتے رہے ۔'' گویا استغفراللہ ! بزعم خویش وہ خلفا رض کے مرتبہ و مقام سے بھی آگے بڑھ گیا ، اور ان سے عالی تر مقام پر فائز ہوا ۔ اس نے اس قسم کی دیگر بہت سی گستاخانہ باتیں ان عظیم ہستیوں کی شان میں لکھی ہیں ، جن کا یہاں بیان کرنا مضمون کو طول دینا اور خلفا رض کی شان میں گستاخی کرنا ہوگا ۔

ان وجوہات کی بنا پر میں نے اسے دربار میں طلب کیے جانے کا حکم صادر کیا ۔ میرے حسب فرمان جب وہ دربار میں حاضر ہوا تو میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش اور معقول جواب نہ دے سکا ۔ کم عقل و کم فہم ہونے کے علاوہ نہایت مغرور و خود پسند نکلا ۔ چنانچہ میں نے اس کی اصلاح کے لیے یہی مناسب جانا کہ اسے کچھ عرصے کے لیے قید و بند میں ڈالا جائے ، تا کہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور دماغ کی آشفتگی ذرا تھم جائے ، اور لوگوں میں جو ہنگامہ بپا ہے وہ بھی رک جائے ، لہٰذا اسے انی رائے سنگدلن کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اسے گوالیار کے قلعے میں محبوس رکھے ۔

(توزک جہانگیری ، جشن چاردھمین نوروز)

آج کے دن (پندرھویں جشن نوروز کے موقع پر) میں نے شیخ احمد سرهندی کو ، جو کچھ عرصے سے اپنی زهد فروشی اور یاوہ گوئی کے سبب مقید تھا ، دربار میں طلب کر کے رھا کر دیا ۔ اس کے ساتھ ھی اسے ایک خلعت اور خرچ کے لیے ھزار روپے عنایت کر کے اس امر کی اجازت دے دی کہ اگر وہ چاھے تو (سرھند) واپس چلا جائے ، یا یہیں قیام پذیر ھو۔ اس نے از روے انصاف اس بات کا اعتراف کیا کہ یہ سزا اور سرزنش در حقیقت اس کے لیے ھدایت و کفایت کا باعث بنی ھے ، اور اب اسے حاضر خدمت رھنے ھی میں اپنی بھلائی نظر آتی ھے ۔

(توزک جہانگیری ، جشن پانزدھمیں نوروز)

شیخ عبدالحق محدث دھلوی کی توصیف میں

اس مرتبہ میرے ورود دھلی پر شیخ عبدالحق نے جو ارباب علم و فضل میں سے ھے ، شرف حضوری حاصل کر کے اپنی ایک کتاب[۹] ، جو بر صغیر پاک و ھندوستان کے علما و مشائخ کے حالات پر مشتمل ھے ، میری نظر سے گزاری ۔ اس نے اس کتاب پر بڑی محنت صرف کی ھے ۔ اب وہ ایک مدت سے گوشۂ تنہائی میں توکل و قناعت کی زندگی بسر کر رھا ھے ۔ بڑی قابل قدر شخصیت ھے اور اس کی ملاقات خالی از لطف نہیں ۔ میں نے اسے طرح طرح کی مہربانیوں اور عنایت سے نواز کر رخصت کیا ۔

(توزک جہانگیری ، جشن چاردھمین نوروز)

———

محسن فانی؟

[دبستان مذاهب ایک نا معلوم مصنف کی تالیف ھے؛ بعض لوگ اسے محسن فانی کی تالیف بتاتے ھیں لیکن یہ انتساب مشکوک ھے۔ اس میں ایشیا کے تمام مشہور مذاھب کے عقاید درج ھیں۔ ذیل میں سکھوں اور روشنیہ تحریک کے بارے میں معاصر بیانات پیش کیے جاتے ھیں۔]

سکھوں کے عقاید کے متعلق

(سکھوں کا ایک فرقہ) نانک پنتھیوں کا ھے۔ یہ لوگ گرو سکھوں کے نام سے مشہور ھیں اور بتوں وغیرہ پر کسی قسم کا اعتقاد نہیں رکھتے۔ نانک کا تعلق بیدی فرقے سے ھے جو کھتریوں کی ایک جماعت ھے۔ اس (نانک) نے فردوس مکانی ظہیرالدین بابر[1] کے زمانے میں شہرت پائی۔ بابر کے افغانوں پر تسلط سے پہلے یہ دولت خاں[2] لودھی کا جو ھندوستان کے شہنشاہ ابراھیم خاں[3] کے بہت بڑے امرا میں سے تھا، مودی تھا۔ مودی اسے کہتے ھیں جس کے ھاتھ میں اناج غلے وغیرہ کا بند و بست ھو۔ کسی موقع پر ایک درویش نے اس کے دل پر تصرف کر لیا جس کے نتیجے میں اس نے اپنی دکان اور خان لودھی کا تمام اناج وغیرہ، جو اس کی دکان میں تھا، لٹا دیا اور اھل و عیال سے قطع تعلق کر لیا۔ دولت خاں یہ خبر سن کر بڑا حیران ھوا، لیکن جب اس نے اس میں درویشی کے آثار پائے تو اسے تکلیف دینے سے احتراز کیا۔

الغرض نانک نے بہت زیادہ ریاضت کی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی غذا میں کمی کی۔ کچھ عرصے بعد صرف گائے کے ذرا سے دودھ پر

اکتفا کرتا رہا ۔ بعد ازیں تیل پینے ، پھر پانی پینے اور آخر میں ہوا کھانے پر گزارا کیا ۔ ہندی زبان میں ایسے شخص کو (جو ہوا پر گزارہ کرے) 'پون اھاری' کہتے ہیں ۔ آہستہ آہستہ کچھ لوگ اس کے پیرو ہو گئے ۔

نانک ، باری تعالیٰ کی وحدت کا قائل تھا اور جو امور شرع محمدی میں رائج ہیں ان پر بھی اور مسئلۂ تناسخ پر بھی ایمان رکھتا تھا ۔ شراب ، گوشت[۴] اور سور کو حرام سمجھتا تھا ۔ اس نے جانوروں کا شکار ترک کیا اور اپنے پیروکاروں کو بھی جانور آزاری سے روکا ۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے چیلے گوشت خوری کی طرف مائل ہو گئے تھے ، لیکن جب ارجن مل نے ، کہ اس کے بے واسطہ چیلوں میں سے ہے ، اس (گوشت) کی برائی دیکھی تو اس نے لوگوں کو گوشت کھانے سے منع کیا اور کہا کہ "یہ فعل نانک کی مرضی کے خلاف ہے ۔" آخر ارجن مل کے بیٹے ہرگوبند نے گوشت کھایا اور شکار کیا ۔ اس سلسلے میں ان کے بہت سے چیلوں نے ہرگوبند کی پیروی کی ۔

نانک نے جس طرح مسلمانوں کی تعریف و ستائش کی ، اسی طرح ہندوؤں کے دیوتاؤں ، اوتاروں اور دیویوں کی بھی تعریف و توصیف کی ہے ۔ لیکن سب کو خالق نہیں ، مخلوق جانتا تھا ۔ حلول ، اور اتحاد ، کا منکر تھا...... کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں میں تسبیح اور گردن میں زنار ہوتی تھی ۔ اس کے چیلے اس کی اتنی کرامات بتاتے ہیں کہ اس مختصر سی جگہ میں ان کا سمانا ذرا مشکل ہے ۔ مثلاً ایک یہ کہ ایک مرتبہ نانک افغانوں سے ناراض ہوگیا تو اس نے مغلوں کو ان پر مقرر کر دیا ۔ چناں چہ ۹۳۲ھ میں حضرت فردوس مکانی ظہیر الدین محمد بابر نے ابراھیم افغان پر فتح[۵] پائی ۔

نانک کی بانیاں (اشعار) سراسر مناجات اور پند و نصائح سے مملو ہیں ، اور زیادہ تر کلام ، اللہ جل شانہٗ کی بزرگی کے متعلق ہے ۔ یہ تمام بانیاں پنجاب کے جاٹوں کی زبان میں کہی گئی ہیں ۔ جٹ پنجابی زبان میں دیہاتی آدمی کو کہتے ہیں ۔ اس کے پیروکاروں کو

سنسکرت زبان سے معمولی سا بھی لگاؤ نہیں ہے ۔ نانک نے جو قاعدے اور قانون وضع کیے ان کا ذکر ہم بعد میں کریں گے ۔

نانک نے اپنی بانیوں میں یہ کہا ہے کہ آسمان اور زمینیں تعداد میں بہت ہیں ۔ انبیاء ، اولیاء اور اوتاروں وغیرہم نے جو کمال حاصل کیا ہے ، وہ انہیں حق تعالیٰ کی عبادت سے حاصل ہوا ہے ۔ جو کوئی بھی حق تعالیٰ کی عبادت میں سرگرم ہے ، وہ جس طریق سے بھی چاہے اس کا مقرب بن جاتا ہے اور اللہ جل جلالہ' کے تقرب کا وسیلہ ، جانوروں کو نہ ستانا ہے : بیت

راستی آور که شوی رستگار
راستی از تو ، ظفر از کردگار[۶]

نانک کی اولاد پنجاب میں آباد ہے ۔ انہیں 'کرتاری' کے نام سے پکارا جاتا ہے لیکن بعض لوگوں کے خیال کے مطابق اس کی خلافت اس کی اولاد تک نہیں پہنچی ۔ کہتے ہیں کہ نانک کے بعد گرو انگد ، جو ھرین کھتری فرقے سے تھا ، اس کے حکم سے اس کا گدی نشین ہوا ۔ اس کے بعد گرو امرداس ، جو بھلائی کھتری تھا ، اس کا جانشین ہوا ۔ بعد ازیں گرو رام داس ، سوڈھی کھتری ، بیٹھا ۔ اسے سری گرو کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے ۔ رام داس کے سرگباش ہونے پر اس کا بیٹا ارجن مل باپ کی گدی پر بیٹھا ۔ اس کے زمانے میں بہت سے لوگ سکھ ہو گئے اور انہوں نے اپنے عقیدہ و اعتقاد میں بے حد مبالغے سے کام لیا ، یہاں تک کہ انہوں نے بابا نانک کو خدا اور اس دنیا کا پیدا کرنے والا کہا ۔ لیکن خود بابا نانک اپنی بانیوں میں اپنے آپ کو بندہ اور اللہ تعالیٰ کو نرانجن ، پار برہم اور پرمیشور کہتا ہے کہ جو مادی اور جسمانی نہیں اور جس کا جسم سے کسی قسم کا بھی تعلق نہیں ۔

الغرض نانک کے پیروکار بتوں کو اچھا نہیں سمجھتے ، اور جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ، ان کا عقیدہ ہے کہ جتنے بھی گرو ہیں ، وہ سب نانک ہیں ۔ وہ ہندوؤں کے منتر نہیں پڑھتے ، ان کے بت خانوں کی تعظیم نہیں کرتے اور ان کے اوتاروں کو کوئی وقعت نہیں دیتے ۔

انہیں سنسکرت زبان سے ، جو ہندوؤں کے نزدیک فرشتوں کی زبان ہے ، قطعاً لگاؤ نہیں ہے ۔

مختصر یہ کہ (آہستہ آہستہ) ہر محلے میں سکھوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا ، اور ارجن مل کے عہد میں تو یہ قوم بہت ہی بڑھ گئی اور کوئی بھی شہر ایسا نہ رہا جس میں تھوڑے بہت سکھ نہ ہوں۔ ان لوگوں میں اس قسم کی پابندی ، جو ہندوؤں میں ہے کہ ایک برھمن کسی کھتری کا مرید نہیں ہو سکتا ، نہیں ہے ۔ اس لیے کہ نانک خود کھتری تھا اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، ان کا کوئی گرو بھی برھمن نہیں ہے ۔ اسی طرح انھوں نے کھتری کو جاٹ کا تابع بنایا ہے حالانکہ جاٹ ، فرقۂ ویش میں سب سے نیچ ذات ہے ۔ مزید برآں گرو کے اکثر بڑے بڑے 'مسند' (مہنت) اسی جاٹ قوم سے ہیں ۔ برھمن ، کھتری ، میلی اور مشہلنک یعنی گرو کے شاگرد اور مرید انھی مسندوں (مہنتوں) کی وساطت سے گرو کی شاگردی و مریدی کی منظوری پاتے ہیں ۔

واضح ہو کہ افغان سلاطین کے زمانے میں امراء کو 'مسند عالی' لکھا جاتا تھا ؛ بعد میں اس لفظ کو کچھ تو کثرت استعمال اور کچھ ہندوستانیوں نے 'مسند' بنا دیا ۔ اور چوں کہ سکھ لوگ اپنے گروؤں کو 'سچا بادشاہ' یعنی حقیقی بادشاہ جانتے ہیں ، اس لیے ان کے گماشتوں کو 'مسند' (مہنت) کہتے اور 'رام داس' کے نام سے بھی پکارتے ہیں ۔

پانچویں گرو سے پہلے گرو سکھوں سے بھینٹ[۷] نہیں لیا کرتے تھے ، اور جو کچھ وہ (سکھ) اپنے آپ پرشاد[۸] دے دیتے تھے وہی کافی ہوتا تھا ۔ ارجن مل نے اپنے عہد میں ہر شہر کے سکھوں سے پرشاد وصول کرنے کے لیے باقاعدہ ایک آدمی مقرر کیا ۔ لوگ اس شخص (مہنت) کے توسط سے گرو کا سکھ (مرید) بننا شروع ہو گئے اور بڑے بڑے مہنتوں نے ، کہ جن کی وساطت سے بہت سے لوگ گرو کے سکھ بنے تھے ؛ اپنی طرف سے نائب مقرر کیے ، جس کے سبب ہر محلے اور ہر کوچے میں مہنتوں کے ان گماشتوں کے وسیلے سے لوگ متعلقہ مہنت کے 'میلی' (شاگرد) ہو کر گرو کے سکھ بنے ۔

اُن کے مذہب میں اوداسی[۹] ہونا کوئی قابل تعریف امر نہیں سمجھا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ گرو کے بعض سکھ کھیتی باڑی کرتے ہیں، بعض تجارت اور چند ایک ملازمت سے اپنی روزی کماتے ہیں اور ہر کوئی سال میں حتی المقدور پیسے جمع کر کے مہنت کے پرشاد کے طور پر خود ہی پہنچا دیتا ہے۔ مہنت اس پیسے کو ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس کے علاوہ سال میں دیگر جو کچھ بھی گرو کی سرکار میں نذر پہنچانے کے لیے مہنت کے پاس لایا جاتا ہے، اسے وہ خود اپنے پاس رکھ لیتا ہے، بہ شرطیکہ اس کا سلسلۂ روزگار اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ ورنہ اگر وہ خود کوئی کام کاج کرتا ہو تو قطعاً اس پرشاد کو ہاتھ نہیں لگاتا اور تمام نذر نیاز جمع کر کے گرو تک پہنچا دیتا ہے۔

بیساکھ کے مہینے میں کہ سورج برج ثور میں ہوتا ہے، تمام مہنت گرو کے آستانے پر جمع ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کے 'میلیوں میں سے بھی جو کوئی جانے کا خواہش مند اور چلنے پر قادر ہوتا ہے، وہاں پہنچتا ہے اور جب یہ لوگ واپس[۳] ہونے لگتے ہیں تو گرو ہر ایک مہنت کو ایک ایک پگڑی عنایت کرتا ہے۔

سکھوں کے کچھ عقائد کا ذکر اپنے قلم تحقیق رقم سے کرنے کے بعد ہم اب ان کے چند ایک بزرگوں کا تذکرہ کرتے ہیں جنہیں کہ ہم نے خود دیکھا ہے۔ **چھٹا محل**: گرو ارجن مل کا بیٹا سری گرو ہرگوبند ہے؛ حضرت جنت مکانی نورالدین محمد جہانگیر[۱۰] بادشاہ نے جن دنوں شاہزادہ خسرو[۱۱] کو دیس نکالا دیا ہوا تھا، ان دنوں ارجن مل نے اس کے لیے دعاے خیر کی تھی[۱۲]۔ چناں چہ اس بنا پر بادشاہ سلامت نے خسرو کی گرفتاری کے بعد اس کا خاصا مواخذہ کیا اور اس سے بہت بڑی رقم کا تقاضا کیا تھا۔ گرو وہ رقم نہ دے سکا، جس کے نتیجے میں اسے باندھ کر لاہور کے ریگستان میں ڈال دیا گیا۔ وہاں کچھ تو گرمی کی شدت اور دھوپ کی تیزی سے اور کچھ محصلین کی آزار دہی سے اس نے جان دے دی۔ یہ واقعہ ۱۰۱۵ع میں وقوع پزیر ہوا۔ بادشاہ سلامت نے اسی طرح شیخ نظام تھانیسری

کو بھی خسرو کے حق میں دعاے خیر کرنے اور اس سے ملنے کے جرم میں ہندوستان سے نکال دیا تھا۔

الغرض ارجن مل کے بعد اس کا بھائی برتھا، جسے اس کے چیلے گرو مہربان کہتے ہیں، گدی نشین ہوا۔ اور آج کہ ۱۰۵۵ ہجری ہے، گرو ہرجی اس کا جانشین ہے اور وہ خود کو 'بھگت' یعنی خدا کا پرستار سمجھتا ہے۔ گرو ہرگوبند کے چیلے اس کے بجائے ارجن مل کے بیٹوں کا نام لیتے ہیں اور یہ نام ان کے نزدیک قابل ملامت ہے[۱۴]۔ ارجن مل کے بعد ہرگوبند نے بھی خلافت کا دعویٰ کیا اور باپ کا جانشین بنا۔ یہ ہرگوبند کبھی بھی 'ظفر نشان' شاہی رکاب[۱۵] سے جدا نہ ہوتا تھا۔ اسے بڑی بڑی دشواریاں درپیش آئیں۔ ایک تو یہ کہ اس نے سپاہیوں کی سی وضع قطع اختیار کر لی اور اپنے باپ کے برعکس تلوار باندھنا، نوکر چاکر رکھنا اور شکار کھیلنا شروع کر دیا۔ حضرت جنت مکانی نے اس بقایا رقم کے حصول کے سلسلے میں، جو اس کے باپ ارجن مل کے ذمے جرمانے کی شکل میں واجب الادا تھی، اسے گوالیار کے قلعے میں بھجوا دیا، جہاں وہ بارہ سال مقید رہا۔ اس دوران میں اسے نمکین غذا قطعاً نہ دی گئی۔ جب تک مقید رہا مہنت اور سکھ (مرید) وہاں جاتے اور قلعے کی دیوار کو سجدہ کرتے رہے۔ آخر بادشاہ سلامت نے از راہ شفقت اسے رہا کر دیا۔ حضرت جنت مکانی (جہانگیر) کی وفات کے بعد وہ حضرت امیرالمؤمنین ابو المظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی شاہ جہان بادشاہ غازی کی غلامی میں رہا۔ جب وہ پنجاب کے نواح میں اپنے وطن کو لوٹا تو یار خان خواجہ سرا نے، کہ پنجاب کے گرد و نواح میں فوج دار تھا، اس کی بڑی خدمت اور مدد کی، پھر اس نے رام داس پورہ کی جانب مراجعت کی جہاں گرو رام داس اور ارجن مل نے بلند عمارات اور عمدہ تالاب بنوائے تھے؛ اس جگہ شاہی گماشتوں کی فوج اور شاہجہانی کارندوں کے ساتھ جو شاہی فرمان کے تحت اس کا پیچھا کر رہے تھے، اس کی جھڑپ ہو گئی؛ جس میں اس کا (ہرگوبند) بہت سا مال اسباب تباہ ہوا۔ وہاں سے پھر یہ کرتار پور کی طرف بھاگ گیا؛ یہاں بھی اس کی جھڑپ ہوئی؛ اس لڑائی میں میر بدھرہ اور

فتح خاں کا لڑکا پایندہ خاں قتل ہوئے۔ اس سے پہلے بہت بڑا لشکر اس پر حملہ آور ہوا تھا لیکن تائید ایزدی اس کے آڑے آئی اور یہ بچ نکلا، گو کہ اسے اپنے تمام مال و اسباب سے ہاتھ دھونے پڑے ۔ مادہ نامی ایک شخص نے بتایا کہ اس جنگ میں ایک لشکری نے گرو پر تلوار سے وار کیا۔ گرو نے وہ وار لوٹاتے ہوئے حملہ آور سے کہا ''شمشیر اس طرح نہیں، یوں مارا کرتے ہیں۔'' اور اسی ایک ضرب سے حملہ آور کا کام تمام کر دیا۔ گرو کے ایک مقرب نے راقم حروف (مؤلف کتاب) سے پوچھا کہ یہ جو گرو نے وار کرتے وقت کہا کہ دیکھو زخم اس طرح لگاتے ہیں، تو اس میں کیا حکمت تھی؟ میں نے جواب دیا کہ یوں معلوم پڑتا ہے کہ گرو کا تلوار چلانا بھی سکھانے ہی کے لیے تھا (کیوں کہ گرو کے معنی ہی سکھلانے والے کے ہیں) اور یہ کسی غصے کے سبب نہ تھا کہ غصہ قابل ملامت ہے۔

مختصر یہ کہ کرتارپور کی جنگ کے بعد ہرگوبند پھگواڑہ چلا گیا؛ اور چوں کہ اس کا لاہور کے گرد و نواح میں رہنا دشوار تھا، اس لیے وہ وہاں سے کریت پور، جو کوہستان پنجاب میں ہے، کی طرف بھاگ گیا۔ اس علاقے کا تعلق راجا تارا چند سے تھا جو شاہجہاں بادشاہ کا مطیع و منقاد نہ تھا۔ کریت پور کے لوگ بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ انھوں نے پہاڑ کی چوٹی پر نیتا دیوی نام کی ایک دیوی کا بت بنا رکھا تھا، جہاں ارد گرد کے راجے مہاراجے اور دوسرے لوگ آ کر درشن کی رسمیں بجا لاتے۔ جب گورو وہاں پہنچا تو اس کے ایک سکھ بھیرو نامی نے اس بت خانے میں پہنچ کر دیوی کی ناک توڑ ڈالی۔ راجوں کو جب اس کی خبر پہنچی تو انھوں نے گرو سے اس کی شکایت کی؛ گرو نے بھیرو کو بلا کر اس سے باز پرس کی لیکن وہ اس جرم کے ارتکاب سے منکر ہوگیا۔ راجاؤں کے خادموں نے کہا کہ ہم اسے بخوبی پہچانتے ہیں۔ اس پر وہ ان لوگوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا کہ تم لوگ دیوی سے پوچھ لو، اگر وہ نام لے دے تو مجھے مار ڈالنا۔ راجاؤں نے کہا ''ارے احمق بھلا دیوی بھی بات کر سکتی ہے؟'' بھیرو ہنس دیا

اور بولا ''معلوم ہے احمق کون ہے ؟ جب وہ اپنا سر توڑنے سے باز نہیں رکھ سکتی اور جو اسے دکھ دیتا ہے اس کا پتا نہیں بتا سکتی تو پھر اس سے کسی خیر کی کیا توقع ہو سکتی ہے ؟ تم لوگ اسے معبود بنا کر پوجتے ہو!'' راجے لاجواب اور چپ چاپ ہو گئے ۔

ان دنوں اس سرزمین (کریت پور) کے بیشتر لوگ گرو کے چیلے ہیں اور اس کوهستان میں تبت اور خطا کی سرحد تک ایک بھی مسلمان نظر نہیں آتا ۔ راقم حروف نے خود گرو ہرگوبند سے یہ سنا کہ شمالی کوهستان میں ایک عظیم الشان راجا ہے ؛ ایک مرتبہ اس نے اپنا ایک ایلچی بھیج کر مجھ (گرو ہرگوبند) سے استفسار کیا کہ ہم نے سنا ہے دہلی کسی شہر کا نام ہے ؛ وهاں کے راجے کا کیا نام ہے اور وہ کس راجے کا بیٹا ہے ؟ مجھے (مؤلف) اس امر پر بے حد تعجب ہوا کہ اسے امیرالمؤمنین صاحب قران ثانی کے نام سے آگاهی نہیں تھی ۔

گرو کے پاس سات سو گھوڑے تھے، اس کے علاوہ تین سو سوار اور ساٹھ توپچی همیشہ اس کی بندگی میں رہتے تھے ۔ ان میں سے کچھ لوگ سوداگری، مختلف خدمات اور کارگزاری وغیرہ سے بسر اوقات کرتے اور جو کوئی بھی کسی جگہ سے روگردانی کرتا ، وہ اسی (ہرگوبند) کے پاس پناہ لیتا ۔

سکھ گرو ہرگوبند کی پرستش الوهیت کی حد تک کرتے تھے اور ان کا یہ اعتقاد تھا کہ وہ خدا ہے اور اس دور میں چھ مرتبہ ظاہر ہوا ہے ۔ 'پرۂ کیوان یزدانی<۱' گرو کے اوصاف سن کر اسے دیکھنے کے لیے آئی ؛ گرو نے اسے پہچان لیا اور اس کی کماحقہ تعظیم میں مصروف ہوا ۔ آخر پرہ کیوان باہر نکل گئی ؛ ابھی پرہ کیوان کو گئے ایک هفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ اتوار کے روز محرم الحرام کی تیسری تاریخ ۱۰۵۵ھ کو گرو نے سفر آخرت اختیار کیا ۔ جب اس کی نعش کو ایندھن کے اوپر رکھ کر آگ دکھائی گئی اور آگ کے شعلے بلند ہوئے تو ایک راجپوت مسمی راجا رام نے جو اس کا ملازم تھا ، اپنے آپ کو اس آگ میں پھینک دیا ؛ پھر چند قدم آگ پر چل کر

گرو کے پاؤں تک جا پہنچا اور اپنا چہرہ اس کے پاؤں کے تلووں پر رکھ کر بے حس و حرکت پڑ رہا ، تا آں کہ اس کی جان نکل گئی ۔ اس کے بعد ایک جاٹ کا بیٹا کہ گرو کے داماد کا خدمت گار تھا ، آگ میں کود پڑا ؛ پھر بہت سے لوگوں نے آگ میں کودنا چاہا لیکن گرو ہر رائے ان کے مانع آیا ۔ دولت خاں قاقشال کہتا ہے :

از صد سخن پیرم یک حرف مرا یاد است
عالم نشود ویران تا مے کدہ آباد ست
تا جان کہ تواند داد تا دل کہ تواند برد
جان دادن و دل بردن این ہر دو خدا داد است

(دبستان مذاہب ۔ ...)

(۲)

فرقۂ روشنیہ کے ذکر میں

پہلا باب : میاں بایزید کے ظہور اور اس کی بعض باتوں کے بارے میں ۔

دوسرا باب : اس کی حالت کا کچھ تذکرہ ۔

تیسرا باب : اس کی اولاد کے بارے میں ۔

پہلی نظر (پہلا باب) میاں بایزید کے ظہور سے متعلق

اس کی اپنی تصنیف 'حال نامہ' میں مرقوم ہے کہ میاں بایزید انصاری ، شیخ عبداللہ کا بیٹا ہے کہ جن کا سلسلۂ نسب سات پشتوں سے شیخ سراج الدین انصاری تک پہنچتا ہے ۔ وہ افغان حکومت کے دور آخر میں بہ مقام جالندھر (پنجاب) پیدا ہوا ۔ اس واقعے کے کوئی ایک سال بعد فردوس مکانی ظہیرالدین محمد بابر نے افغانوں پر فتح پائی ، اور ہندوستان پر قابض ہو گئے ۔ تاریخ مغول میں ہے کہ ۹۳۲ھ میں حضرت فردوس مکانی نے ابراہیم خاں افغان پر تسلط پایا ۔ حال نامہ کے مطابق اس (میاں بایزید) کی والدہ کا نام بنین تھا ۔ بنین کے والد اور

عبداللہ کے دادا آپس میں بھائی بھائی اور جالندھر میں سکونت پزیر تھے۔ میاں بایزید اسی جگہ پیدا ہوا۔

عبداللہ کے والد نے اپنے بیٹے کی شادی محمد امین نامی کی لڑکی بنین سے کر دی۔ بایزید کے والد عبداللہ کوھستان افغانان میں واقع کانی کرم میں رھتے تھے۔ جب منگولوں کا تسلط زیادہ ھی بڑھ گیا تو بنین بھی بایزید کے ساتھ کانی کرم میں آ گئیں۔ عبداللہ کو بنین سے کوئی رغبت اور تعلق خاطر نہ تھا جس کا نتیجہ یہ ھوا کہ انھوں نے بیوی کو طلاق دے دی۔ میاں بایزید کو عبداللہ کی دوسری بیوی اور زوجۂ یعقوب کے بیٹوں کی دشمنی اور عبداللہ کی لاپروائی کے سبب بے حد تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔

میاں بایزید کا یہ قاعدہ تھا کہ جب بھی وہ اپنے کھیتوں کی دیکھ بھال کے لیے جاتا تو دوسروں کے کھیتوں کی بھی حفاظت کرتا اور دوسرے لوگوں کی خبر گیری بھی کرتا۔ اسے بچپن ھی سے اللہ کی طرف رغبت تھی۔ چناں چہ اکثر پوچھا کرتا کہ آسمان اور زمین تو موجود ھیں، لیکن خدا کہاں ھے؟ جب خواجہ اسماعیل کہ اس کے قرابت داروں میں سے تھے، کسی واقعے سے بشارت پا کر عبادت و ریاضت میں مشغول ھوگئے، اور کچھ لوگوں نے ان کی ارادت میں منفعت دیکھی تو بایزید نے بھی ان کا مرید ھونا چاھا، لیکن عبداللہ نے اسے اس امر سے باز رکھا اور کہا کہ ''میرے لیے یہ باعث ننگ ھے کہ تم اپنے سے کمتر درجے کے شخص کے مرید بنو۔ (جانا ھے تو) شیخ بہاء الدین زکریا کے فرزندوں[۱۹] کے پاس جاؤ۔'' بایزید نے جواب میں کہا ''مشیخت وراثت میں نہیں ملتی۔''

الغرض بایزید کو غیب کی طرف سے ریاضت کی جانب بلایا گیا اور وہ شریعت و حقیقت، معرفت، قربت اور وصل و سکون سے آگے گزر گیا اور لوگ اس کے حلقے میں شریک ھونے لگے۔

دوسری نظر: حضرت میاں روشن بایزید کے بعض حالات کے بارے میں

بایزید خود کو نبی سمجھتا اور لوگوں کو عبادت و ریاضت کی

تلقین کرتا اور نماز ادا کرتا ، لیکن اس سلسلے میں اس نے 'جہت' وغیرہ کی تعیین بالکل اڑا دی - 'فاینما......[۲۰] الخ' وہ کہا کرتا کہ پانی کے ساتھ غسل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ، کیوں کہ جیسے ھی ھوا چلے جسم پاک ھو جاتا ھے ، اور یہ اس لیے کہ چاروں عناصر[۲۱] ، مطہرات میں سے ھیں - نیز یہ کہتا کہ جو شخص خدا اور خود کو نہیں پہچانتا وہ آدمی نہیں ہے - وہ اگر موذی ھے تو پھر بھیڑیے ، چیتے ، سانپ اور بچھو کی مانند ھے - آں حضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کا فرمان ھے : 'اقتل الموذی......[۲۲]' - اگر وہ شخص پرھیز گار ، متقی اور نماز گزار ھے تو وہ گائے اور بکری کی مانند ھے ، اور ایسے شخص کا مارنا جائز ھے - چناں چہ اسی بنا پر اس نے مخالفان 'خود شناس[۲۳]' کو قتل کرنے کا حکم دیا ، کیوں کہ ایسے لوگ حیوان ھیں جیسا کہ قرآن میں آیا ھے ''اولئک کالانعام......[۲۴]'' اس نے یہ بھی کہا کہ جو کوئی خود کو نہیں پہچانتا اور جسے ابدی زندگی و حیات جاوید کی کوئی خبر نہیں ، وہ مردہ ھے ، اور اس مردے کا مال کہ جس کے وارث اسی قسم کے مردے ھوں ، زندہ لوگوں کو پہنچتا ھے - چناں چہ اسی بنا پر اس نے جاھل کے قتل کا بھی حکم دیا - اگر وہ کسی ھندو کو 'خود شناس' پاتا تو اسے مسلمان پر ترجیح دیتا -

وہ اپنے بیٹوں کے ساتھ مل کر ایک مدت تک راہ زنی کرتا رھا - مسلمانوں وغیرہ سے مال لیتا اور اس مال کا پانچواں حصہ بیت المال میں رکھتا ، جب ضرورت پڑتی تو حاجت مندوں میں تقسیم کر دیتا - اور اس کے بیٹے ھر قسم کے فسق و فجور ، زنا اور دیگر برے کاموں سے ھمیشہ دور رھے - اس کے علاوہ انھوں نے توحید پرستوں کے مال لوٹنے اور موحد کیشوں پر ستم کرنے سے ھمیشہ احتراز کیا - اس نے عربی ، فارسی ، ھندی اور پشتو میں کئی ایک تصانیف چھوڑی ھیں ، جن میں 'مقصود المؤمنین' عربی میں ھے -

کہتے ھیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ حضرت جبرائیل کی وساطت کے بغیر (یعنی براہ راست) بات کرتا - اس نے ایک کتاب 'خیرالبیان'

چار زبانوں عربی ، فارسی ، ہندی اور پشتو میں لکھی ، یعنی چاروں زبانوں میں ایک ہی موضوع کو بیان کیا ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کا خطاب حضرت بایزید سے ۔ اس کتاب کو لوگ صحیفۂ آسمانی سمجھتے ہیں ۔ ایک کتاب 'حالنامہ' میں اپنے حالات لکھے ہیں ۔ سب سے تعجب خیز امر تو یہ ہے کہ تعلیم سے بالکل بے بہرہ ہونے کے باوجود وہ قرآن کے معانی اور حقیقت آموز نکتے بیان کرتا ؛ دانش مند لوگ اس بات سے بڑے حیران ہوتے ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ آسے قدرت کی جانب سے 'خدا ناشناس' لوگوں کے قتل پر مامور کیا گیا تھا ۔ اس سلسلے میں خدا نے آسے مسلسل تین مرتبہ حکم فرمایا ، لیکن اس نے تلوار نہ اٹھائی ؛ جب بار بار فرمان الٰہی پہنچا تو مجبور ہو کر اس نے جہاد پر کمر باندھ لی ۔

وہ حضرت ہمایوں[۲۵] بادشاہ کے بیٹے حضرت میرزا محمد حکیم[۲۶] کا ہم عصر تھا ۔ راقم حروف کو میرزا شاہ محمد عزتی خاں نے بتایا کہ میاں روشن نے ۹۳۹ہجری میں زور پکڑا اور اس کا مذہب رواج پزیر ہوا ۔ میرے والد شاہ بیگ خان رغون نے جن کا خطاب خان دوران تھا ، میاں بایزید کو دیکھا تھا ۔ وہ بتاتے تھے کہ میرزا محمد حکیم کی بغاوت سے پہلے اس (میرزا) کی مجلس میں لایا گیا ، لیکن علما مناظرے میں اس سے مات کھا گئے ۔ چناں چہ اسے لوٹ جانے کی اجازت دے دی گئی ۔ (۹۹۳ھ میں کابل سے حضرت میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر عرش آشیانی (اکبر) کو پہنچی)

میاں بایزید کی قبر کوہستان افغاناں میں واقع موضع بہتہ پور میں ہے ۔

تیسری نظر : حضرت میاں بایزید کی اولاد کے احوال میں

چار بیٹے[۲۷] عمر شیخ ، کمال الدین ، نورالدین اور جلال الدین ، اور ایک لڑکی کمال خاتون ۔ بایزید کے بعد جلال الدین نے خلافت اور برتری حاصل کی ۔ آسے خاصا استقلال حاصل ہوا ، اور اس نے کبھی حضرت میاں کے فرمان سے تجاوز نہ کیا ۔ وہ منصف اور ضبط والا تھا ۔

اس نے بڑی جد و جہد کی ۔ ۹۸۹ھ میں جب حضرت عرش آشیانی[۲۸] اکبر بادشاہ کابل سے دارالخلافہ کی طرف آ رہے تھے تو یہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں سے بھاگ گیا ۔ ۱۰۰۰ھ میں جعفر بیگ قزوینی[۲۹] بخشی المخاطب بہ آصف خانی ، جلال الدین[۳۰] روشنی (جسے حضرت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ 'جلالہ' کہا کرتے تھے) کے استیصال پر متعین ہوا ۔ اسی سال شاہی بہادر میاں جلال‌الدین کے اہل و عیال کو ایک شخص وحدت علی کے ساتھ گرفتار کر کے پایۂ تخت میں لے آئے ۔ ۱۰۰۷ھ میں حضرت عرش آشیانی ہی کے عہد میں ، میاں جلال الدین ہزارے کے شادمان کے ہاتھوں زخمی ہو کر کوہ رباط کی جانب بھاگ گیا ، جہاں شریف خاں کے چند ایک ملازموں اور مراد بیگ نے پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیا ۔ اس کے بعد میاں احداد[۳۱] ولد عمر شیخ ولد بایزید[۳۲] ، جو بزرگوں میں احداد کے نام سے مشہور ہے ، مسند رشد و ہدایت پر متمکن ہوا ۔ یہ بھی منصف و ضابط تھا ۔ اپنے آبائی آئین پر حتی المقدور قائم رہا ۔ وہ دولت کی طرف بالکل متوجہ نہ ہوا اور لوگوں کا حق لوگوں ہی کو پہنچاتا ۔ جو مال اسے جہاد سے ہاتھ لگتا اس کا پانچواں حصہ بیت‌المال میں رکھتا ، بلکہ اسے بھی غازیوں ہی میں تقسیم کر دیتا ۔ ۱۰۳۵ھ میں بہ عہد جہاں گیر خواجہ ابوالحسن[۳۳] تبریزی کے بیٹے احسن ظفر خاں[۳۴] اور شاہی سپاہیوں نے اسے گھیر لیا اور اس حملے کے روز ہی نواغر نامی قلعے میں اس کا خاتمہ کر دیا گیا ۔ کہتے ہیں کہ مرنے سے (جسے وہ لوگ روز وصال کہتے ہیں) ایک روز پہلے میاں احداد نے خیر البیان کھولی اور اس کا مطالعہ کیا ؛ پھر اپنے ارادت مندوں سے کہنے لگا کہ کل ہمارا روز وصال ہے ۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس نے کہا تھا ۔ ایک موقع پر راقم (مؤلف کتاب) کی ملاقات ایک کابلی مرتاض (ریاضت کرنے والا ، جوگی) سے ہوئی ؛ اس نے بتایا کہ "میں احداد کی رحلت کے روز بے حد خوش ہوا اور اسے برے الفاظ سے یاد کیا ؛ اسی رات میں نے اپنے مرشد کو خواب میں دیکھا جنہوں نے مجھے اس فعل سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ 'قل ھو اللہ احد' احداد ہی کے بارے میں ہے ۔ احداد کو اس کے مرید 'احد' کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔

کہتے ہیں کہ احداد کے وصال کے بعد افغان اس کے بیٹے عبدالقادر کو اٹھا کر پہاڑ پر چڑھ گئے اور شاہی لشکری کہ جنھیں قلعے کے تسخیر ہونے کا گمان تک نہ تھا ، قلعے میں داخل ہو گئے ۔ احداد کی لڑکی جسے بھاگنے کی کوئی راہ نہ ملی تھی ، قلعے میں ادھر آدھر بھٹک رہی تھی ؛ ایک لشکری نے اسے پکڑنا چاھا لیکن اس نے آنکھوں پر چادر ڈال کر قلعے کی دیوار سے چھلانگ لگا دی اور ھلاک ہو گئی ۔ تمام لوگ اس واقعے سے بڑے متحیر ہوئے ۔

میاں احداد کے بعد اس کا بیٹا عبدالقادر مسند خلافت پر بیٹھا ۔ اس نے موقع پا کر ظفر خان پر حملہ کر دیا جو پوری کوشش کے ساتھ بھاگ نکلا ، لیکن اس کا تمام ساز و سامان شبستانیوں سمیت افغانیوں کے ھاتھ لگا ۔ البتہ اس (ظفر خان) کی بیوی بزرگ خانم ، احمد بیگ خان کے بیٹے نواب سعید خان ایسے بہادروں کی کوشش سے عصمت و عفت بچا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ۔

راقم نے ذوالقدر نژاد پری سلطان ذوالقدر کو کہ اب ذوالفقار خان کے خطاب سے سرفراز ھے ، یہ کہتے سنا ھے کہ ''جب میں سعید خان کے فرمان پر عبدالقادر کے خاندان میں گیا تو میں اس کے لیے قسم قسم کی اشیائے خور و نوش لے کر آتا تاکہ وہ ان اشیا پر لٹو ہو جائے ۔ ایک دن جب دسترخوان پر حلوا لا کر رکھا گیا تو ایک افغان اٹھ کر کہنے لگا ''اے عبدالقادر ! تیرے جد بزرگ وار کے وقت سے لے کر اب تک کسی مغل کا پاؤں اس جگہ تک نہیں پہنچا ؛ یہ شخص جو یہاں آیا ھے تو یہ تجھے رنگ برنگے عمدہ کپڑوں اور چرب و شیریں کھانوں سے ، کہ جن سے صاحبان شکم کو رغبت اور درویشوں کو نفرت ہوتی ھے ، اپنے دام فریب میں لانا چاھتا ھے ۔ بہتر یہی ھے کہ میں اسے ختم کر ڈالوں تاکہ پھر کوئی دوسرا ڈر کے مارے ادھر آنے کی جرأت نہ کرے ۔'' لیکن عبدالقادر اور اس کی ماں بی بی علائی (میاں جلال الدین کی بیٹی) اس بات پر راضی نہ ہوئے ۔ ایک دن جب عبدالقادر سعید خان کے لشکر میں داخل ہو رہا تھا تو ڈھول اور کرنا کی آواز سے اس کا

گھوڑا بدک کر لوگوں کے درمیان سے ایک طرف کو نکل گیا ۔ ایک افغان نے اس (عبدالقادر) سے کہا ، ''جو کچھ حضرت میاں روشن نے فرمایا تھا گھوڑا اسے بجا لا رہا ہے ۔ تم اس مستی کا خمار نہ اٹھا سکو گے ۔'' عبدالقادر نے پوچھا ''میاں نے کیا فرمایا ہے؟'' افغان بولا ''مغلوں سے دوری اور پرہیز ۔''

جب عبدالقادر حضرت ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی امیرالمؤمنین بادشاہ غازی کے دربار میں حاضر ہوا تو بہت بڑے منصب سے سر فراز کیا گیا ۔ ۱۰۴۳ ہجری میں اس کی زندگی کے دن پورے ہوگئے۔ پشاور میں مدفون ہے ۔

نورالدین کا بیٹا میرزا ، حضرت امیر المؤمنین شاہ جہان کے دور میں تھا ؛ یہ دولت آباد کی لڑائی میں مارا گیا ۔ جلال‌الدین کے بیٹے کریم داد کو جلالیوں کی قوم نے محمد یعقوب کشمیری کے سپرد کر دیا جو ترخان نسل کے سعید خاں کا وکیل تھا ۔ کریم داد کو ۱۰۴۸ھ میں قتل کر دیا گیا ۔ جلال‌الدین کے بیٹے اللہ داد[۳۵] خاں کو رشید خانی کے خطاب سے نوازا گیا اور دکن میں اسے 'چہارہزاری' کا منصب عطا ہوا ۔ اس نے ۱۰۵۸ھ میں وصال پایا ۔

(دبستان مذاہب......)

محمد صالح کنبوہ

[آگرہ، دہلی اور لاہور کی عمارات شاہجہان کا بہت اہم کارنامہ ہے۔ شاہجہانی دور کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ قادری سلسلۂ تصوف زیادہ پھیلا اور اسلام اور ہندو مذہب کے عقائد کی تطبیق کا وہ عمل جو اکبر کے دور سے شروع ہوا تھا، اپنی منطقی انتہا کو پہنچا۔ محمد صالح کنبوہ کی تاریخ عمل صالح (۱۶۵۹-۶۰ع) ان رجحانات کو پیش کرتی ہے۔]

دہلی کی عمارتوں اور قلعے کے بارے میں

صفت کے قلم کی زبان اس کی تعریف سے کیوں کر عہدہ برآ اور انشاء کی کتاب کا صفحہ اپنی 'تنگ روئی' کے ساتھ کس طرح اس کی ستایش کی تضمین کا کفیل ہو کہ اس کے ناقابل پیمایش آنگن کی وسعت عالم امکان کی فراخی کی برابری کرتی ہے، اور اس کے عرش ایسا سایہ رکھنے والے 'قوی مایے' پایہ کی بلندی سات آسمانوں کی مضبوطی کی ہم سری میں خود کو کسی طرح کم نہیں جانتی۔ زمین اس کی بنیادوں کی مضبوطی کے سبب عرش بریں کی ساق[1] کے ہم دوش ہو گئی ہے اور اس کی رفعت و بلندی کا درجہ اس محکم عمارت کے طفیل آٹھویں آسمان کی کرسی سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اس کے 'البرز آثار[2]' آسمان سے باتیں کرنے والے برج اور کنگرے اس نویں (۹) آسمان کے کنگرے کی بلندی سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ اس کے خاک ریز[3] کی بنیادوں نے جو کرۂ خاک کی مانند تین طرف سے پانی میں گھری ہوئی ہیں، عمارت کی اساس سمندر کی گہرائی تک پہنچا دی ہے۔ اس کی دیواروں کی

پاکیزہ وصفا روشنی خورشید تاباں کے ظہور سے زیادہ نمایاں اور اس کی بلندی کی شہرت کے درجے، مہینوں اور سالوں کے شب و روز سے زیادہ شہرت یافتہ ہیں۔

نظم

اساس متینش درین خاک دان — بود[۴] لنگر کشتئی آسمان[۵]
قوی دل بود عالم خاک ازو — نشان می دهد غور ادراک ازو[۶]
جہان کہن راست بر وی نظر — چو پیری کہ او را بود یک پسر[۷]
شد از رفعت شان سپہر دگر — بود آفتابش شہ بحر و بر[۸]
محیط کرم پادشاہ جہان — جہان بخش، ثانی صاحب قران[۹]
شہ عدل کیش ملائک خصال — سلیماں جلال و فلاطون کمال[۱۰]

تکلف بر طرف! اس طلسم آباد (یعنی دنیا) کی ابتدا سے اس قسم کے بلند بنیاد قلعے کی تعمیر تک، کہ جس کی بلندی کے کنارے کا سرا کیوان[۱۱] کے طاق ایوان کے عین برابر ہے اور 'غور' میں تیرنے والے کی سوچ کا حوض اس کی خندق کی گہرائی کو پا نہیں سکا، کسی بھی فلک جاہ بادشاہ کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں آئی۔ بلکہ اس دو رنگے[۱۲] فرش کے پورے طور پر لپیٹے اور سفید و سیاہ مہروں[۱۳] کے اٹھا لیے جانے کے وقت[۱۴] تک کسی بھی صاحب اقتدار کو اس قسم کی عمارتیں، کہ خدا کرے رہتی دنیا تک ان کی بنیادوں میں کہنگی نہ پیدا ہو، بنانے کی ہمت نہ ہوگی۔ بہ فرض محال اگر دوسرے صاحب تدبیر فرماں روا وقت کی یاوری اور نصیبے کی مساعدت سے جاہ و اقتدار اور دولت و اعتبار کے مرتبے حاصل کر کے زمین سے لے کر آسمان تک بڑی بڑی ارفع و اعلیٰ عمارتیں تیار بھی کر لیں اور نقش و نگار سے مزین اور رنگا رنگ کے سینکڑوں محل زحل کے ایوان تک بنا بھی لیں، جب بھی دنیا میں کسی اور کو بلند و اعلیٰ عمارات، منازل اور عجیب و غریب نشیمن بنانے، دل کش اور نظر فریب باغ و بستان لگانے، نہروں کے جاری کرنے، درختوں کے لگانے اور فرماں روائی و شہنشاہی کے رسم و آئین کے تمام آمور میں زیادہ سے زیادہ تکلف و تصرف برتنے میں، — کہ اس کا خاصہ

قدرت خداوندی کے کمال کا مظہر ہے اور روے زمین پر کسی بھی بادشاہ نے اس امر کو صحیح طور پر نہیں جانا۔۔۔یہ فطرت بلند، دانش ارجمند، کمال عقل، فہم کی جدت، ذھانت کی کثرت، درست اندازہ، پوری پوری تمیز اور صحیح سلیقہ میسر نہیں آیا، اور میسر آنے بھی کیوں کر کہ روز اول کی تفریح گاہ کی تقسیم کے مطابق یہ انوکھے نقش بنانا، کہ جو مرہون وقت تھے، اس شہنشاہ زماں کے غلاموں کے مقدر میں ہو چکا تھا۔

شاید ھی کوئی ایسی چیز پردۂ غیب میں رہ گئی ہو اور منصۂ شہود پر نہ آئی ہو کہ جو دنیا کے انتظام اور اھل دنیا کے عیش و مسرت اور روزی کے لیے لازم ہے۔ چناں چہ اس قسم کی مہموں میں محض عالم پناہ ھی کے اہتمام سے تصرف و تکلف کا کام اس قدر بلندی تک پہنچ گیا ہے کہ اس سے ذرا بھی نیچے پہنچنے کا تصور ھی نہیں ہو سکتا۔ دیگر امور میں بھی ترقی کا یہ عالم ہے کہ وہ ممکنات کی آخری حدوں تک جا پہنچی ہے۔ ھندوستان کی سرزمین دل نشین جہاں پناہ ھی کے عہد میں رفتہ رفتہ گلستاں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ اور حضور کا امن سے بھرپور دور زمانے کا موسم بہار بلکہ لیل و نہار کا عالم شباب بن گیا ہے۔ اس دنیا میں اس طرح کے بلند اقبال اور صاحب فطرت اور اس قسم کے عقل و دانش کے طالب مجدد بہت ھی کم پیدا ہوتے اور اس ظاھری دنیا کی رونق افزائی کا سبب بنتے ہیں؛ بلکہ صاحبان عقل و بینش کا تو یہ اعتقاد ہے کہ اس قسم کی بلند فطرت ہستی آج تک دنیا میں پیدا ہوئی ہے نہ ہوگی۔

فرہاد کی مانند گہری سوچ رکھنے والے سنگ تراشوں نے اس کی (قلعہ) تختیوں کی 'تنگ درزی' میں کچھ اس قدر گہرے غور و فکر سے کام لیا ہے کہ فکر تیز کے ناخن میں اس کی صفت نہیں سما سکتی۔ چناں چہ طور معنی کا کلیم[١٦] یعنی طالب بھی اس مقام پر، کہ جہاں بڑے بڑے ارباب غور و فکر کی بھی قوت فکر لغزش کھا جاتی ہے، اس کے شایان شان ایستادگی نہ کر سکا۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے؛

نہ بینی بدیوارش از سنگ درز
کہ چسپان بود صحبت 'تنگ درز'
در آئینۂ سنگ خارا تراش
چو خورشید (گردون) ہنر کردہ فاش
ز بنیاد تا کنگرا از خارا سنگ
تراشیدہ گوئی ز یک پارہ سنگ
ستانت سترشت و صفا گستراست
ہم آئینہ ہم سدّ اسکندر است
بدینسان بنای فلک احتشام
شد از سنگ یک رنگ گل گون تمام[۱۷]

اسی طرح برج شمالی سے لے کر حیات بخش اور شاہ محل کے جنت نظیر باغ تک اور مقبرۂ مقدس ، برج طلا امتیاز محل[۱۸] اور اس کے قریب کی دوسری عمارتیں ، مثلاً زمانے کی سب سے زیادہ پرہیزگار اور مقدس ہستی ، قدسیہ القاب نواب بیگم صاحبہ اور دوسری بیگمات کی خواب گاہیں ، گویا سرکار عالی مدار کی سب کی سب عمارتیں ایک رستے میں بہ ترتیب واقع ہوئی ہیں ۔ (عمل صالح)

احوال حضرت میاں میر رح

آپ اللہ والوں کے پیشوا اور درگاہ ایزدی میں مقبول لوگوں کے مقتدا تھے ۔ آپ مسلک تجرید طے کرنے کے بعد فنا فی اللہ اور نفی ما سو اللہ کے مقام پر ثابت قدمی سے گامزن ہوئے اور تصوف و عرفان کی پر آفت وادیوں سے گزرنے کے بعد دنیا و مافیہا اور ہوا و ہوس کے تمام علایق کو ترک کرتے ہوئے محبوب حقیقی کی منزل وصال کی طرف روانہ ہوئے اور یوں 'کعبۂ وصل' کی مجاورت سے شاد کام ہوئے ۔

مختلف فنون اور علوم عقلی و نقلی میں بڑی دسترس بہم پہنچائی تھی ۔ علاوہ ازیں اس ظاہری و رسمی عقل و دانش میں بھی کمال حاصل کیا تھا ۔ چناں چہ اس دور کے بڑے بڑے صاحبان عقل و بصیرت بعض مشکل مسائل کا حل معلوم کرنے کے لیے آپ کی طرف رجوع کیا کرتے ۔

جہاں تک صوفیوں کے حقایق و معارف اور ان کی اصطلاحات کا تعلق ہے، ان کے آپ بحر بے کراں تھے۔ آپ کو جناب ابن عربی رحہ کی 'فتوحات مکی' کی بیشتر عبارتیں یاد تھیں اور مولانا جامی[۱۹] کی شرح 'فصوص الحکم' کا تو گویا ایک ایک صفحہ حفظ تھا۔

آپ کا سلسلۂ نسب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کا اسم مبارک میر محمد ہے، لیکن عوام و خواص میں میاں میر کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی ولادت با سعادت مضافات ٹھٹھہ کے ایک قصبہ سیوستان میں ہوئی۔ آپ کے والدین اور آپ کی ہمشیرہ حال و مستقبل کے خداوندوں کے سرگروہ اور اہل حال و قال میں سے تھے اور صفائی باطن میں کمال حاصل ہونے کے سبب صاحبان کشف و کرامات بھی تھے۔

آپ نے عین عالم شباب میں اپنے مولد کو خیرباد کہہ کر دارالسلطنت لاہور کو اپنا وطن بنایا اور پنجاب کی خاک پاک میں پروان چڑھے۔ یہیں آپ نے سلسلۂ قادریہ کے مسلک طریقت کو اختیار کیا۔ اور چوں کہ صاحبان کمال اور اہل اللہ کی یہ پسندیدہ عادت ہے کہ انھیں شہرت سے چڑ اور گمنامی سے دوستی ہوتی ہے، — اور ہو بھی کیوں نہ، بھلا ایک عارف کو شہرت سے کیا سروکار، او خدا کے شناسا کو لوگوں کی شناسائی سے کیا حاصل — اس لیے آپ نے بھی زندگی کا بیشتر حصہ گمنامی اور گوشۂ تنہائی میں بسر کیا۔ یہاں تک کہ چالیس برس تک مخلوق خدا میں سے کوئی بھی اس برگزیدہ ہستی کے حال احوال سے آگاہ نہ ہوا، یعنی آپ اسم مبارک 'الخفی[۲۰]' کے مظہر اور صوفیا کے سچے مقولے ''تحت قبابی لایعرفہم غیری[۲۱]'' کے مصداق تھے۔ آخر اس مثل کے مصداق کہ 'عشق اور مشک چھپے نہیں رہتے' کچھ لوگوں نے، کہ علم و عرفان کی نسیم ان کے مشام جاں تک پہنچی ہوئی تھی، اس گلشن عرفان کے گلدستے اور وجدان کے گل سرسبد کی مہک پا کر صفوت کدۂ قدس یعنی اس عرش مکان کی خلوت مقدس سے فیض کی خوشبوؤں کو سونگھا اور اس آباد ویرانے

میں کہ جو در حقیقت حقائق و معارف کی دنیا کا بیت المعمور (آباد گھر) تھا ، اس چھپے ہوئے خزانے اور خزانچی ، بلکہ توحید کی نقدی کے مخزن کا کھوج نکال کر اس مخفی گنجینے کو باھر لے آئے ۔

مختصر یہ کہ اس بارگاہ ایزدی کے مقرب خاص کی دیگر خصوصیات کے علاوہ یہ خصوصیت بھی تھی کہ آپ نے تمام عمر پارسا رہ کر شادی نہ کی۔ آپ میں حد سے زیادہ فقر و فنا[۲۲] و استغنا کا مادہ تھا۔ اسی سبب سے آپ کبھی کسی سے کوئی چیز نہ لیتے ۔ ھاں ! قوت لایموت اور تن ڈھانکنے کے لیے البتہ کبھی کبھار بہت ھی تھوڑی مقدار میں کوئی چیز قبول کرتے اور وہ بھی حد سے زیادہ احتیاج کے موقع پر اور ذریعۂ حلال سے ۔ آپ اھل دنیا کو 'ترک تعلق[۲۳]' کے بغیر ھرگز تلقین نہ کرتے ۔ آپ مکمل طور پر صاحب 'تصرف[۲۴]' تھے ۔ آپ کو طالبان حق کو منزل مطلوب تک پہنچانے میں پوری قدرت حاصل تھی ، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ھر وہ صاحب سعادت جو آپ کی طرح مسلک طریقت اختیار کر لیتا ، جلد ھی مقامات عالیہ تک پہنچ جاتا۔ عمر کے آخری حصے میں محبوب حقیقی کی غیرت معشوق نے آپ کی آنکھوں کو 'مشاھدۂ غیر' سے (یعنی غیر اللہ کے دیکھنے سے) بند کر کے ایک دم ظاھری اور باطنی طور پر اپنے 'شہود مطلق' میں محو کر دیا ۔ اور چوں کہ علائق سے دل تنگ اور عوام کے تعلق صحبت سے آزاد یہ ھستی ، کہ تنہائی کی فریفتہ اور اپنوں بیگانوں سے جدائی کی شیدائی تھی ، اس محبوب ازلی کی محبت میں گرفتار و سرشار اور اپنی شادمانی لوگوں پر در خلوت بند رکھنے میں جانتی تھی ، ـــــ چناں چہ یہ مضمون :

چون تنہایم ھم‌نفسم یاد کسی است　　چون ھم‌نفس کسی شوم تنہایم

بالکل آپ کے حسب حال تھا ـــــ اس لیے اس گوشہ نشینی اور ماسواللہ سے منہ پھیر لینے کے ایام میں آپ نے گوشۂ تنہائی کو قطعاً نہ چھوڑا اور پا شکستہ ھو کر کنج عزلت میں بیٹھ رھے اور دنیا والوں سے ملاقات کرنا اور ان کے گھروں میں جانا تو ایک طرف ، آپ درویشوں کی زیارت کی بھی رغبت نہ کرتے ۔

شہنشاہ دین پناہ (شاہجہان) نے کہ ہمیشہ اللہ والوں کی صحبت اور بارگاہ ایزدی کے مقربوں کے تقرب کی تلاش میں رہتے اور اس بہانے ذات باری سے مزید قرب کے جویا ہوتے ہیں، کشمیر سے واپسی کے بعد دو ایک مرتبہ سلسلۂ اہل اللہ کے اس سرگروہ کی خانقاہ متبرکہ کو اپنی پرنور حاضری کے فیض سے گویا نئے سر سے انوار برکت کے اترنے کا مقام بنا دیا۔ اور حضرت (میاں میرؒ) نے بھی باوجود اس بے حد وحشت و نفرت کے جو آپ کو لوگوں کے ملنے سے تھی اور جس کے سبب آپ ہر ایک سے پہلوتہی کرتے، ان (بادشاہ) سے بڑی خندہ پیشانی اور کشادہ روئی سے پیش آ کر بڑے انس کا مظاہرہ کیا۔ خلفائے راشدین کے اس بڑے جانشین کی ہم نشینی کی طرف رغبت کر کے آپ نے انہیں ٹھہرنے کی ترغیب دلائی اور بہت دیر تک بیٹھے رہنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس روز ایک عجیب رنگین صحبت رہی۔ اس پر انوار انجمن میں شرکت کرنے کی سعادت پانے والوں نے بے حد و حساب انوار و فیوض حاصل کیے، اور حقیقتوں کے شناسا، عالم پناہ، صاحبان عرفان کے اس مقتدا کی صحبت کے اس قدر شیفتہ و شیدا ہوئے کہ اس سے زیادہ کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ چناں چہ انہوں نے اکثر آپ کے قابل صد تعریف اطوار و احوال کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا کہ ''میں نے اس سلطنت کے صوفیا میں میاں میرؒ کو کامل تر پایا، اور آپ کے بعد شیخ المشائخ شیخ فضل اللہؒ [۲] کو، کہ جن سے میری ملاقات دوران شاہزادگی میں ان کے وطن برہان پور میں ہوئی، سب سے زیادہ ذات حقیقی کے ساتھ وابستہ و منسلک دیکھا۔''

الغرض میاں میرؒ کچھ اوپر ساٹھ برس تک پایۂ تخت لاہور میں مقیم اور ایک مدت تک طالبان حق اور سالکان راہ معرفت کا مرجع و ماوا رہے۔ آپ نے ۱۰۴۴ھ میں 'خلعت عنصری' اتار کر اس جہان فانی کو خیر باد کہی اور عالم باقی کے قدسی پیکروں کی ہم نشینی اختیار کر لی۔ آپ کا مزار مبارک موضع غیاث پور میں ہے جو عالم گنج (لاہور)، یعنی غلہ کی خرید و فروخت کرنے والوں کی سرائے کے نزدیک واقع ہے۔ (شاہجہان نامہ)

مولانا عبد الحکیم

آپ کی جائے ولادت دارالسلطنت لاهور کے مضافات میں قصبه سیالکوٹ هے ۔ آپ کے علم و فضل کی شهرت کے درجے شب و روز اور سال و ماه سے بھی زیاده مشهور هیں ۔ اگر آپ کو 'ثالث معلمین[۲۸]' کہا جائے تو عین مناسب هے ؛ اگر 'عقل حاوی عشر[۲۹]' کہیں تو بالکل روا ۔

آن جناب نے آغاز حال میں خدائی تعلیم کے مدرسے سے ادب سیکھا اور 'اختتام ناپزیر' فضل کے دانش کدے سے حکمت اندوزی کی ، اور آخر میں جهانِ کتاب و قلم کے بھیدوں کے پرده کشا بن گئے ۔ آپ نے اپنے خدا داد کمالات کے زور سے اور مبداء و معاد[۳۰] کی بے پناه معرفت حاصل هونے کے سبب بڑی بڑی معتبر کتابوں پر که سب کی سب استادان قدیم کی تصنیفات هیں ، اور ان کی تفصیل اس کتاب کے ذیل میں لکھ دی گئی هے ، بڑے خود پسند ، معنی طراز حواشی لکھے اور هر ایک کے دیباچے کو حضرت ثانی صاحب قران شاهجهان بادشاه کے نام نامی سے آراسته کیا ۔

آپ ساٹھ برس تک سنن و فرائض شرع نبوی (الصلوات الله و سلامه علیه وعلی آله و اصحابه) کی تلقین کرنے والے مدرسے کے صدر نشین رهے ۔ آپ نے اپنی ذات عالی درجات کی برکتوں اور اپنی صفات حمیده کی بزرگیوں کی سعادتوں سے نه صرف پنجاب بلکه سرزمین هندوستان کو فیض جاوید سے لبریز رکھا ۔ رفته رفته آپ نے میدان تفرد (انفرادیت) میں علم و فضل کا علم کچھ اس انداز سے بلند کیا که زمانے کے جمله استاد آپ کے سامنے فنون دانش کے استفاده کے 'دبستان گزیں' (مبتدی) نظر آنے لگے، اور تمام سخن پرداز ادیب آپ کے کمالات کے آگے 'حرف شمار' طفل شمار هونے لگے ۔ بلکه اصحاب دانش اور ارباب فطرت کامل نے تو ادیب یونان (افلاطون) تک کو آپ کے ادب آموز دبستان کے تہجی خوانوں میں سے سمجھا اور 'دانش افروز' عقل کو آپ کے مدرسۂ تعلیم کا جزو کش (طالب علم) تصور کیا ، اور اس طرح اپنی اس درست[۳۱] رائے کی بنا پر خود کو صاحب تمیز کامل جانا ۔

الغرض ظاهری و باطنی فضیلتوں کی حامل یہ ہستی تمام صاحبان علم و فضل پر اپنا عظیم حق ثابت کر کے ۱۰۶۷ ہجری میں دارالبقا کو سدھاری ۔ اب کمالات انسانی کے مجموعے ، حقیقتوں اور معرفتوں کے شناسا مولانا عبداللہ ، خلف الصدق آں جناب کہ تمام علوم کے جامع اور اخلاق ستودہ ، اوصاف حمیدہ اور فضائل پسندیدہ کے مالک ہیں ، تمام معاملات میں اور ہر لحاظ سے آں جناب عرفان مآب کے صحیح اور حقیقی جانشین ہیں ۔ دعا ہے کہ 'اللہ جل جلالہ' اس فیض ربانی کے مظہر اور عنایت ازلی کے مورد کو مدت مدید تک فضیلتوں کی انجمن کا مسند آرا رکھے !

(شاہجہان نامہ)

مولانا ابوالبرکات المتخلص بہ منیر

آپ ملک شعر کے حاکم ہیں اور آپ کے اشعار کتاب روزگار کے لیے باعث زینت ۔ آپ کی عقل و دانش کی روشنی آفتاب سے بھی زیادہ روشن اور آپ کی طبع چودھویں کے چاند کی مانند بالکل درست اور روشن ہے ؛ معنی آفرینی اور نکتہ پردازی میں لاثانی اور عبارات بدیعہ لکھنے اور مضامین عالیہ کے اختراع میں تمام نکتہ وروں سے ممتاز ۔ آپ کی زبان دانی میں کسی بھی سخن ور کو کلام نہیں ، اور زبان دانی کے ڈھنگ میں کوئی بھی نکتہ سنج آپ کی طرح نادرۂ فن نہیں ۔ آپ کی بلندی فطرت اس مقام تک پہنچی ہوئی ہے کہ اس سے بلند تر کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا ۔ آپ کا تخیل اس حد تک بلند ہے کہ اس سے زیادہ خیال ہی میں نہیں آ سکتا ۔ 'نفس کل' (عرش) کی مانند آپ سراپا استعداد اور 'عقل اول' (یعنی حضرت جبرئیل) کی طرح تمام عقل ہیں ۔

جب بھی آپ کی طبع بلند گلستان سخن کی آرائش و پیرائش کی جانب متوجہ ہوتی ہے تو آپ کی شاخ قلم رنگین اشعار کا پھل دینے لگ جاتی ہے ۔ اور جب آپ بدائع صنائع کے نئے نئے محاسن پیدا کرتے اور حسین و دل کش قافیوں کو اختراع کرتے ہیں تو زمین شعر باغ فردوس کے لیے بھی باعث رشک بن جاتی ہے ۔ جس طرح آپ شاعری میں انفرادیت کے حامل ہیں ، اسی طرح فن نثر میں بھی آپ منفرد و یکتا ہیں ۔

اوج سخن وری کا یہ آفتاب درخشاں کہ جس کا کلام اپنی جدت و تازگی کے سبب مشہور اور جس کی عبارتوں کی لطافت و نزاکت زبان زد خاص و عام ہے، اگرچہ بہ حسب سرشت لاہور کے افق سے طلوع ہوا لیکن اس کے بخت کا ستارہ معانی آفرینی و دقیقہ سنجی کے اوج پر اہل ایران سے بھی ہزاروں درجے زیادہ بلندی پر ہے۔ چناں چہ شعر کی لڑی میں اگر آپ نے پروین کو پرویا ہے تو نثر میں نثرہ۳۲ کو سمویا ہے۔ اپنی تصنیفات وغیرہ میں آپ نے زمین سخن کے خسرو۳۳ اور آفرید گار۳۴ معانی کے طرز پر قلم رانی کی ہے اور عربی کے فصیح الفاظ کو فارسی الفاظ سے ملا کر اپنی عبارتوں میں بڑے بڑے روشن معانی کھپائے ہیں۔ القصہ آپ نے کچھ اس انداز سے سخن سرائی کی ہے کہ ایسا طرز بلند سخن صرف اسی 'والا دستگاہ' سے ممکن ہے اور کسی دوسرے صاحب سخن سے اس مہارت و دست گاہ کا مظاہرہ کار دشوار ہے۔

مختصر یہ کہ فضیلتوں کی سلطنت کے اس ملک الملوک نے انداز سخن پر فیض کا سکہ جمایا اور معنی کو صاحب خطبہ بنایا۔ افسوس صد افسوس کہ یہ 'جوان طبع' اپنی پوری عمر طبیعی کو بھی نہ پہنچا اور زندگی کے تمام مرحلے طے نہ کر سکا۔ عین عالم شباب میں کہ زندگی کا موسم بہار ہوتا ہے، عالم بقا کو سدھارا اور زمین شعر میں معنی نو کی مانند خاک میں جا ملا۔ بے چارے کو اتنی بھی فرصت نہ ملی کہ اپنے کلام ہی کو جمع کر لیتا۔

اس خاک سار (محمد صالح) کو آغاز طفولیت ہی سے اس بدایع معانی کے جامع (منیر) کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا رہا۔ ہم دونوں آپس میں یوں شیر و شکر ہو گئے تھے کہ جیسے ایک شعر میں دو معنی یا ایک آئینے میں دو جسم ہوں۔ ہم ایک ہی گھر اور ایک ہی خلوت میں بسر کرتے تھے۔ اگر پاس ظاہر درکار نہ ہوتا اور اہل استعداد کی نزدیک دیکھنے والی پیش بیں نظر میں یہ بات دور از کار نہ دکھائی دیتی تو یقیناً آپ کی مدح و ستائش میں مبالغے کے

طور پر نہیں بلکہ حقیقت کے ساتھ ، ایک باب لکھ کر جان سخن پر احسان کرتا ۔

آپ نے پیر کے دن ۷ - رجب ۱۰۵۴ھ کو بہ مقام آگرہ وفات پائی ، جہاں سے آپ کی نعش لاہور لائی گئی - یہ چند اشعار کہ ان میں سے ہر ایک آفتاب عالم گیر کی مانند ہے اور جو اس قابل ہیں کہ انہیں 'بیاض صبح' (سفید بیاض) میں لکھا جائے ، یہاں درج کیے جاتے ہیں :

نظم

هر کـه کج باشد زبانش پایهٔ او کـمتر است
شانـه چـون دارد زبان راست جایش بر سر است
راز دار حـق نـدارد قـدر گـر سامانش نیست
هدیهٔ مصحف ، چو خطش خوب نبود ، کمتر است۳۵
هـر چـه گوید مرد 'صاحب دم' دلیل معنی است
هـر چـه آید بـر زبان تیغ بحث جـوهـر است
عزت ار خـواهی مشـو پابند یکجا ای عزیز
تا زمین گیرست زر ، پیوسته خاکش بر سراست۳۶

اشعار

در چمن آن سـرو رعنا بـر کنار جـو گزشت
آب از رفتار ماند و گل ز رنگ و بـو گـزشت
داشتم زان شـوخ آهـو چشـم امیـد نگاه
گـوشـهٔ چشمم نمود از دور و گفت آهـو گـزشت
پای چـوبین را ره باریک رفتن مشکل است
شانه حیرانم چه سان از تار آن گیسو گـزشت۳۷
بگاه جـلـوه بـر افشـان ز ناز گـیسـورا
ز تـار گـیسـوه زه کـن کـمان ابـرو را
بجـز منیر کـه طـاق اسـت در سخنـدانی
کـسی نـه فهمـد مضمون بیت ابـرو را۳۸

سرگزشت گریه از مژگان ما باید شنید
از زبان موج حرف آشنا باید شنید
از سیه مستی زدم در دامن زلف تو دست
از زبان شانه ام اکنون چها باید شنید۳۹

---

(۱) منم آن که کوس دانش ز شکوه نکته دانی
زده خسرو ضمیرم به قلم رو معانی
(۲) رخ صفحه ز آب گوهر همه شست و شوی یابد
رگ ابر خامهٔ من چو کند گهر فشانی
(۳) چو نسیم نو بهاری چو هوای صبح گاهی
سخنم بتازه روئی نفسم به گل فشانی
(۴) زمتانت و جزالت همه لفظ و معنی من
چو خرد بکهنه سالی ، چو هوس به نوجوانی
(۵) چو روم سوی گلستان غزل مرا سرایند
همه بلبلان گلشن ، ز ره مزاج دانی
(۶) من و آتش محبت ، تو و آتش جوانی
من و عشق جاودانه ، تو و حسن جاودانی
(۷) ز غبار سینه بادا همه عمر تیره چشمی
که زخط عارض تو نکند سواد خوانی
(۸) سبق کرشمه کم ده ، مژهای 'سحر فن' را
که با بروت ز شوخی نکنند هم زبانی
(۹) بتو داده شرح سوزم ، بتو گفته حال اشکم
مژه ام ز گرم خوئی نگه ام ز تر زبانی
(۱۰) همه گوش چشم گردد همه چشم گوش آن دم
که پیام ناز گوید بمن ابروت زبانی
(۱۱) نه مرا زبان شکوه ، نه ترا دهان خنده
من و رنج بی زبانی ، تو و قید بی دهانی۴۰

(شاهجهان نامه)

چندر بھان برھمن

لاھور کی خاک سے اس کا خمیر اٹھا اور صلح کل کے 'دارالامن' کا باسی ھے۔ بڑا ھی پسندیدہ ، خوش‌خلق اور ملنسار واقع ھوا ھے۔ صنم خانۂ شعر کا بت پرست اور اس بلند مرتبہ فن کی چوکھٹ کا جاروب کش ھے۔ قدرت نے اسے طبع رسا اور فکر بلند سے نوازا ھے۔ خط شکستہ بہت ھی عمدہ لکھتا اور قلم نستعلیق کی زبان سے باتیں کرتا ھے۔ نثر اور انشا پردازی میں ابوالفضل کی پیروی کا شائق ھے۔ جب رواں اشعار پڑھتا ھے تو اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ھو جاتے ھیں۔ سخن کی کھیتی میں چشم تر سے آبیاری کرتا ھے۔ اس کی پلکیں ھمیشہ تر رھتی ھیں۔ 'درد طلب' کا دم بھرتا ھے۔ بہ ظاھر تو وہ زنار پرست ھے لیکن کفر سے کوسوں دور بھاگتا ھے۔ اور اگرچہ دیکھنے میں ھندو ھے لیکن در حقیقت اسلام کا شیدائی ھے۔ اپنے اشعار کی طرح بہت ھی سادگی اور بے تکلفی سے بسر کرتا ھے۔ اس کے قلم کی زبان نہایت ھی خوش سخن اور اس کی طبع اس فن میں بے حد ماھر ھے۔ شروع شروع میں امیر عبدالکریم ، میں عمارات لاھور کے پاس تھا ، پھر افضل خاں ، وزیر نیک سرشت کے پاس رھا ، اب فلک مرتبہ درگاہ کے غلاموں میں داخل ھے۔ (شاھجہان نامہ)

منیر لاہوری

[منیر (۱۶۱۰—۱۶۴۵ع)شاہجہانی دور کا شاعر اور پاک و ہند کا باشندہ تھا ۔ نثر میں صاحب طرز ہوا ہے]

نواب[1] موت کے کاری زخم سے پلک جھپکنے میں ہمیشہ کی نیند سو گیا اور مجھ سیاہ بخت نے آنکھ کی پتلی کی طرح سیاہ لباس پہن لیا اور روتے دھوتے آنسوؤں کی مانند نکل پڑا ۔ جب اکبر نگر پہنچا تو عالی مرتبت ، والا گہر اور جوہر شناس جناب شہ زادہ کامگار نے اپنی جوہر شناسی کے سبب اس بات کی آرزو کی کہ مجھ خاک سار کی گردن میں موتی کی طرح اپنی غلامی کا دھاگا ڈال کر مجھے اپنے حلقہ بہ گوشوں کی صف میں لے آئیں ۔ لیکن اس وقت چوں کہ میرے سر میں کچھ اور ھی سمائی تھی ، اس لیے میں نے معذرت کی ۔ ہر چند یار احباب نے بہت سمجھایا بجھایا اور خوش نصیبی کا مژدہ سنایا ، لیکن اپنی طبیعت نہ مانی ۔

الغرض اس بزم بلند مرتبہ کے حاشیہ نشینوں نے مجھ مہر و محبت کے پتلے کو پورے ایک ماہ تک سفر سے روکے رکھا ؛ آخر میں نے سعی و کوشش کر کے پروانۂ راہ داری حاصل کر ھی لیا اور پامردی شوق کے ساتھ رہ نوردی اختیار کر کے گام فرسائی شروع کر دی ۔ تھوڑی ھی مدت میں بلبل کی مانند اڑتے اڑاتے خطۂ بہار میں جا پہنچا ، اور اس گلستان کی طرح شگفتہ و تر و تازہ سرزمین میں قیام اختیار کیا ۔ بعض مہربان دوستوں نے کہ اس خطۂ جنت نظیر کے خوش بخت ساکن تھے ، مجھ سے کہا کہ ”اے گلشن معانی کی عندلیب اور چمنستان سخن دانی کے بلبل ! اگر شائستہ خاں[2] ایسے فیض رساں امیر کی ، کہ

سخن پروری کے باغ کی بہار اور دانش وری کے بہارستان کی نسیم ہے ، نشاط افزا محفل اور بہار آرا مجلس میں شریک اور نکتہ طرازی میں لب کشا ہو تو تیری مرادوں کی کلی کھل جائے گی ، اور آرزوؤں کی بہار کو تازگی حاصل ہوگی ۔'' لیکن چوں کہ اپنی طبیعت میں کچھ اور ہی سمایا تھا ، اس لیے ان بہی خواہوں کی باتوں کو ایک کان سے سنا اور دوسرے کان سے نکال دیا اور اس شاداب سر زمین سے چل کھڑا ہوا ۔ دل میں یہ خواہش تھی کہ اگر نصیبے نے یاوری کی اور بخت نے ساتھ دیا تو لاہور کی سر زمین نزہت آباد میں پہنچوں گا اور شاہنشاہ فلک بارگاہ ، یعنی

شاہ فلک رفعت و والا مکان   شاہ جہان ثانی صاحبقران

کے مدح سراؤں اور ثنا گویوں کے زمرے میں شامل ہو کر امید کی جلوہ گاہ میں سکون و آسایش سے بسر کروں گا ۔

قصہ مختصر ، جب میں نے دریاے سون سے گزر کر اس سرزمین کو طے کر لیا ، تو میرا سامنا 'سیہ کار' بادل سے ہو گیا ، جس نے میرے ساتھ 'تر صحبتی' کا آغاز کیا اور بارش سے میری گردن میں رسی اور پانی کی موجوں سے میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دی ۔ میرا کتابوں والا صندوق کشتی کی صورت اختیار کر گیا ۔ میری بیاض کے اوراق 'آبی رنگ' میں رنگے گئے ۔ میری غزلوں کے سفینے (بیاض) کو پانی بہا کر لے گیا اور میرے اشعار تر دھو ڈالے گئے ۔

قطعہ

شعر من تر گشت و من هم تر شدم چون شعر خویش
ابر تا انصاف حرف خویش را چون داد آب
دست خواهم از سخن شستن که اشعار مرا
قطره های آب گشته نقطه های انتخاب[۳]

آخر 'هر چه بادا باد[۴]' کہہ کر پانی کے سواروں کی طرح ابرش (گھوڑا) کو پانی پر چھوڑا اور موجوں کے چابک سے اسے پانی کی رفتار پر چلایا ۔ جب سہسرام پہنچا ، تو وہاں سواے آفتاب کے کسی میں

'گرم آشنائی' نظر نہ آئی ۔ لہٰذا اپنی بھیگی ہوئی کتابوں کو اس (آفتاب) کے سامنے ڈال دیا ۔ وہ دل سوز مہربان از روے مہر و محبت ایک ایک ورق کو صبح سے لے کر شام تک پوری 'دل گرمی' کے ساتھ خشک کرتا رہا اور اس نے بادل سے میرا انتقام لینا چاہا ۔ چناں چہ اس نے 'کوہ گراں سنگ' کو حکم دیا کہ وہ اس باد پیا کو تیغ (پہاڑ کی چوٹی کو بھی تیغ کہتے ہیں) مارے اور اسے بے آب کر دے ۔

جب میں بنارس پہنچا تو وہاں بخت ہمایوں (مبارک نصیبہ ، خوش بختی) مجھ سے دو چار ہوا اور کہنے لگا ''مرحبا !! اے بیابان حیرانی کے سرگرداں اور صحراے سرگردانی کے حیران ! کہاں جا رہا ہے اور کس طرف کا ارادہ ہے ؟ ایک مدت سے میں تیری تلاش میں ہوں اور ایک زمانہ ہو چلا ہے میں تیرے پیچھے پیچھے بھاگ رہا ہوں ۔ اب خوشیاں منا کہ نصیبہ تیرا یاور اور اقبال تیرا مددگار ہو گیا ہے ۔ قسمت نے تیرے ساتھ موافقت اور دولت نے پامردی کی ہے ۔ قدم بڑھا اور جون پور کی راہ لے ۔ اس فیض رساں خطے میں پہنچ کہ وہاں بازار معانی بڑے زوروں پر اور رونق سخن دانی کا ہنگامہ برپا ہے ۔ شعر کو وہاں کچھ اور ہی عزت و مقام حاصل ہے اور معنی گوہر کا ہم پلہ ہے ۔ یعنی سخن کا رتبہ شناس ، فن کے معجزے کی نطق کا مسیح ، چراغ بینائی کا نور ، دماغ دانائی کا مغز ، تیغ آزماؤں کا سربراہ ، کشور کشاؤں کا سرگروہ ، سخن دانی کے موتی پرونے والا ، معانی کا جوہر نما ، بزرگی کا آراستہ کرنے والا ، قدر بزرگی کا بڑھانے والا ، نیک خصال ، زر بخشنے والا ، دشمن مال[5] ، صاحبان دانش و بینش کا دیدہ افروز ، خرد پروروں کا دانش آموز ، نصیبے کے معشوق کا چہرہ سجانے والا ، امیدوں کی زلفوں میں خوش بو لگانے والا ، رزم خواہی کے میدان کے لیے باعث زینت اور فرخندہ فالی کے ستارے کا نور نواب قدر داں اعتقاد خاں[6] اس فرخندہ آثار دیار میں فرماں روا ہے ۔

نظم

که لطفش چهره افروز امید است | ز مهرش صبح دولت رو سپید است

سعادت را ز بخشش فال نیکوست — ہما مشت پرے از سایۂ اوست
غبار لشکرش از گردناکی — کند تیر فلک را تیر خاکی
چو پوشد چارآئینہ دم کیں — شود آئینہ خانہ ، خانۂ زین
زبان خنجر او برق تاب است — دم شمشیر او حاضر جواب است۷

تو توفیق کی راہ نمائی کے ساتھ خود کو اس خداوند کے مجلسیوں میں شریک کر کہ وہ 'سحر آئین عیش' کا بانی ہے ۔''

جب مبارک فال والے بخت کا یہ ترانہ میرے کانوں تک پہنچا ، تو اقبال نے مبارک باد پر لب کشائی کی اور دولت تہنیت و تبریک کہنے آئی ؛ سعادت نے خوشی کا مژدہ سنایا ، طالع نے فیروز بختی کی خوش خبری دی ۔ میں فرط نشاط سے پھولے نہ سمایا اور مسرت و شادمانی سے سرشار ہو ہو گیا ۔

مثنوی

رویم از جام عیش گلگون شد — اخترم نور چشم گردون شد
بخت زد فال کامرانیٔ من — کرد توفیق همعنانی من۸

اس کے باوجود کہ راستے میں پانی ھی پانی تھا اور کسی قسم کی بھی رفتار کام نہیں آ سکتی تھی ، میں چشم رہ نورد میں حباب بن گیا اور روانی میں پانی سے گزر گیا ۔ اب میں اس شہر فیض میں پہنچ چکا ھوں اور امید کرتا ھوں کہ اس خداوند کی مہربانی سے اپنا کام بن جائے گا ۔

مثنوی

اگر گوئی کہ بکشا بر درم رخت — زھی طالع زھی دولت زھی بخت
وگر رانی مرا از در بہ بیداد — ز بخت نارسا فریاد فریاد۹

چناں چہ میں نے اپنے بعض طبعی فرزندوں (اشعار) کو ، کہ جنھوں نے فیض کے بیت المقدس کا دروازہ کھٹکھٹایا ھے ، ضمیر کی 'یونان زمین' میں پرورش پا کر انگلیوں کے پنجاب کو عبور کیا ھے ، اور جو قلم کے قلعے میں آ کر وھاں سے دوات کے ھندوستان کی سیر کرتے ھوئے کاغذ کے چین پر آرام کر رھے ھیں ، حکم دیا کہ وہ

رواں ہو جائیں اور اس معنی شناس آقا کی فیض آرا محفل میں خوانده ناخوانده (بلائے بن بلائے) داخل ہو کر زبان خاموشی سے کچھ گفتگو کریں ، اور مجھ خاکسار کی ، کہ ان معنی نژادوں کا معنوی باپ ہوں ، حالت کا تذکرہ چھیڑیں ، اور اس طرح اپنے فرائض فرزندی کو بہ وجوہ احسن بجا لائیں - توقع ہے کہ جب وہ اس آقا کی دست بوسی کا شرف حاصل کریں گے تو اس کے لطف و عنایت کے دست پرورده بن جائیں گے ۔ الحمدللہ کہ 'بے جوہر' نہیں ہیں اور ان شاء اللہ خود ان پاک گوہروں[10] کے جوہر اس محفل گرامی کے جوہر شناسوں پر روشن ہو جائیں گے ۔

بیت

اهل معنی به درت روی نهادند همه
چو در فیض مدامست بروی همه باز[11]

اصحاب دانش و بینش پر یہ بات واضح ہے کہ عالی نژاد ارباب کا نام نامی اہل سخن ہی کے طفیل اوج و بلندی حاصل کرتا ہے اور صاحبان عقل و خرد اس سے بہ خوبی آگاہ ہیں کہ سعادت مندوں کو اصحاب فن سخن ہی کی بدولت زندگی جاوید اور بقاے دوام حاصل ہوتی ہے ۔ چناں چہ اگر رودکی[12] ساز سخن کے تار نہ چھیڑتا تو امیر نصر[13] کو آج کوئی نہ جانتا ۔ اگر فردوسی[14] شاہ نامہ[15] کی بہار کو نہ سجاتا تو محمود[16] کے نام سے تازگی کب کی ختم ہو چکی ہوتی ۔ اگر فرخی[17] نے 'فرخ فال' (مبارک فال والے) قصیدے نہ کہے ہوتے تو امیر ابو المظفر[18] کو بھی فرخندہ نامی حاصل نہ ہوتی ۔ اگر منوچہری[19] نظم کا چہرہ نہ سنوارتا تو پسر سبکتگین[20] (محمود غزنوی) روشنی' جاوید سے محروم رہتا ۔ اگر انوری[21] معانی روشن پیدا نہ کرتا تو سنجر[22] کا نام روشن نہ ہوتا ۔ اگر خاقانی[23] نکتہ سنجی کی نوبت نہ بجاتا تو خاقان کبیر[24] کو بلند شہرہ نہ حاصل ہوتا ۔ اگر معزی[25] معانی کا شکوہ نہ دکھاتا تو ملک شاہ[26] کی شان و شوکت بھی ڈھکی چھپی رہتی ۔ اگر ظہیر[27] سخن کے مرتبہ و مقام کو ظاہر نہ کرتا تو قزل ارسلان[28] کا مرتبہ و پایہ ظاہر نہ ہو پاتا ۔ اگر سیف[29] اپنی تیغ زبان

کو گوهر سخن سے آراسته نه کرتا تو الپ ارسلان[۳۰] کے جوهر هرگز بروے کار نه آتے ۔ اگر کمال[۳۱] سخن کے مرتبوں کو پایۂ کمال تک نه پہنچاتا تو رکن سعد[۳۲] کا درجه 'چار رکن مسعودی' میں شرف قبولیت نه پاتا ۔ اگر سعدی[۳۳] شعری درجوں کو بلندی تک نه پہنچاتا تو سعد زنگی[۳۴] کی شاهانه عظمت آسمان تک نه پہنچتی ۔ اگر خسرو[۳۵] قلم کے جوئبار سے آب حیات نه ٹپکاتا تو خضر خاں[۳۶] کا نام سبز (زنده) نه رهتا ۔ اگر سلطان[۳۷] فارسی زبان اختیار نه کرتا تو کوئی بھی زبان دان داستان اولیں[۳۸] کو به کمال رغبت نه پڑھتا ۔

بیت

بدهر هر آنچه بدو زنده میتوان بودن
بود همین سخن و جز سخن دگر سخنست[۳۹]

وہ آب حیات ، که زندگی کے متلاشی جس کے مرده هیں ، صرف بحر سخن هی سے مل سکتا هے اور بقاے دوام کا حصول فقط سخن هی کے دم سے ممکن هے ۔ شعر و سخن روح کی جان هے اور جو کوئی اس کے بغیر زندگی بسر کرتا هے تو سمجھو که وه بے جان زندگانی گزارتا هے ۔ سو جو بھی 'بے جان' زنده هے اس کا وجود اور عدم یکساں هے ۔

روشن خردان را بسخن زلدگی است
خامش شدن شمع بود مردن شمع[۴۰]

'جان' اور 'سخن' میں کوئی فرق نہیں هے ۔ قسم هے مجھے جان معنی کی که میں یه سخن (بات) جان[۴۱] سے کہه رها هوں ۔ اگر کسی کو یقین نہیں تو لو میں جان درمیان[۴۲] رکھتا هوں ۔ نہیں نہیں ، میں نے غلط کہا ، بھلا 'جان' کو 'سخن' سے کیا نسبت ۔ 'جان' دنیاوی زندگی کو بقا بخشتی هے اور 'سخن' حیات ابدی سے نوازتا هے ۔ وه جان جو مرنے کے بعد زندگانی کا سامان آماده رکھتی هے ، وه 'سخن' هے ۔ اس قسم کی جان (سخن) کو هزار جانوں سے خریدا جا سکتا هے ۔

بیت

بجز جنس سخن را از من ارزان درین سودا زیانی نیست چندان[۳۳]

هر وہ چیز جو جان سے زیادہ قیمتی ہو اور لوگوں کا اس سے تعلق جانی ہو ، زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد مٹ جاتی ہے ۔ لیکن اس کے بر عکس 'سخن' تا ابد قائم و دائم رهتا ہے : **مصرع**

هست سخن باقی و باقی سخن[۳۴]

پہلے زمانے میں دانش مند و عاقل بادشاہ ارباب سخن (شعرا) هی کو اپنا ندیم اور وزیر مقرر کیا کرتے تھے اور ہر وقت ان کے ساتھ ان کی مصاحبت رهتی ۔ وہ شعرا سے اس ملاپ کے فیض سے بے حد بہرہ اندوز ہوتے ۔ لیکن اس دور میں کہ عقل و دانش کی کتاب پارہ پارہ ہو چکی اور انسانیت کا شیرازہ بکھر چکا ہے ، کوئی بھی سخن گویوں کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں ہے اور نہ کوئی اس گروہ کے مقام و مرتبہ هی کا شناسا ہے ۔ اهل زمانہ اپنی دوں فطرتی اور پست همتی کے سبب شعر کو خواہ وہ نفس مسیحا هی کا حامل کیوں نہ ہو باد[۳۵] سمجھتے ہیں ، اور سخن کو ، اگرچہ وہ زلال[۳۶] خضر ہو ، آب[۳۷] گردانتے ہیں ؛

زمانه ایست که از سردی فسرده دلان
سخن نیرزد یکمشت باد ، وای سخن[۳۸]

تمام کے تمام دولت کمانے میں مصروف اور گنج معانی کو جو روح کی قوت کا سرمایہ ہے ، هاتھ سے دے بیٹھے ہیں ۔ اگر انصاف پسند خردمند شعر کو قوت فکر کی ترازو میں تولیں تو وہ دیکھیں گے کہ شعر اگرچہ 'ہوا' اور دولت 'پتھر' ہے ، پھر بھی شعر کا پلڑا بھاری ہے ، کیوں کہ دولت اور پیسہ جسمانی لذتوں کا زیور ہے اور شعر ذوق روحانی کا سرمایہ ۔ دولت گھٹتی ہے ، لیکن سخن گھٹنے کی بجائے افزایش پذیر ہوتا ہے ۔ زر (سونا مراد دولت) پتھر سے نکلتا ہے ، اور سخن زبان سے جاری ہوتا ہے ۔ زر نیستی کی جانب مائل ہے جب کہ سخن کو بقا حاصل ہے ۔ احباب زر حرص کے گاهک ہیں ، اور ارباب سخن حرص و آز سے کلی طور پر بے نیاز ۔ اب جب کہ اس

تقابل و تجزیہ سے یہ واضح ہو گیا کہ سخن کو 'زر' پر کئی طریقوں سے فوقیت و برتری حاصل ہے تو پھر جنس سخن کو، جو ہر حال میں زر سے عمدہ ہے، زر کے مقابلے میں لانا غیر مناسب اور پتھر کے ٹکڑے کو جان کے ٹکڑے کے برابر رکھنا غلطی ہے۔

سخن گفتم که از زر هست خوشتر   بزر باید نوشتن این سخن را[۴۹]

اس خداوند (ممدوح) کی رائے فیض آرا پر یہ بات مخفی نہیں ہے کہ نکتہ وروں کا سرگروہ عبدالرحیم[۵۰] خان خانان ارباب سخن کے ساتھ کس طرح پیش آتا تھا اور فیض و کرم بکھیرنے والی بساط کس انداز سے بچھاتا تھا۔ بڑے بڑے نغز گو شعرا، مثلاً عرفی[۵۱]، ثنائی[۵۲]، نظیری[۵۳]، شکیبی[۵۴]، انیسی[۵۵]، حیاتی، نوعی[۵۶] اور کفری[۵۷] سب اسی کی محفل کے چراغ اور اسی کے لطف و عنایت کے طفیل معانی کی دست گاہ میں بڑے بڑے معجزے دکھاتے تھے اور اپنے اشعار میں نئے نئے معانی و خیال لاتے۔ جب وہ اہل سخن کا رتبہ شناس ملک بقا کو سدھارا تو نہ تو لعل و یاقوت نے اس سے وفا کی اور نہ محلوں، عمارتوں اور ہاتھیوں گھوڑوں ہی نے اس کا ساتھ دیا۔ اسی طرح لونڈیاں اور غلام بھی اس کا ساتھ دینے سے عاجز رہے۔ جو چیز اس کی بقا کا سبب بنی وہ صرف معنی کے ان گوہر شناسوں (شعرا) کے منظوم موتی تھے، جنھوں نے سخن کے جواہرات کو اس کی مدح کے دھاگے میں پرویا تھا۔ ایک نیک سرشت نے اس کی ہنر شناسی اور قدر دانی کے بارے میں ایک کتاب لکھی جس میں اس محفل کے حاشیہ نشین شاعروں اور مدح سراؤں کا ذکر کیا، اور اس کا نام 'مآثر رحیمی' رکھا۔

بمعنی پروران و نکته سنجان   چسان میکرد احسان خان خانان
بگیتی در سخا و در سخن هم   تو نیز از خان خانان نیستی کم[۵۸]

مجھ بے خانماں نے ـــــ کہ شعر کی قلمرو میں متوطن ہوا اور خطۂ معانی کے تمام اطراف میں پورے طور پر گھوما پھرا ہوں ـــــ ہزاروں ایسے بلند بیتوں[۵۹] کی بنیاد نظم کی زمین میں بڑے بڑے انوکھے اور دل نشیں پیرایوں میں رکھی ہے، کہ جن کا ہر ایک شعر گویا معنی

کا بیت المعمور ہے ، اور گویا ہر بیت کے دو مصرعوں سے آب دار معانی کے سامنے دو پٹ والے دروازے کھولے ہیں ۔ ابیات کے 'معنی کدے' کو بڑا 'قوی بنیاد' بنا دیا ہے ، اور اس کی بنا کو بحر[۶۰] شعر سے آب[۶۱] تک لے گیا ہوں ۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ تعمیر سخن پر صرف اور گونیا[۶۲] کا اندازہ مسطر کے دھاگے کے سپرد کیا ہے ۔ قافیہ سنجی سے 'خانۂ بیت' کی نشست کو کرسی[۶۳] کی طرح بنایا ہے ، اور نظم کے سمندر سے شعر کی زمین میں آب و گل کا خمیر اٹھانے میں مصروف ہوا ہوں ۔ میں نے تعمیر سخن کے لیے بے شمار کتابوں کی اینٹوں کو ایک دوسرے کے اوپر چنا اور معنی کی بنیاد کو بڑا مضبوط بنایا ہے ؛ اپنے بلند ابیات سے بیاض کے دشت میں حسین خطہ آباد کیا اور اس خطےمیں اپنے رنگین اشعار سے ہزاروں ہی تا ابد قائم رہنے والے سدا بہار گلستانوں کی بنیاد رکھی ہے : **شعر**

نگر بمعنی من صورتم چه می بینی   منم خراب و لیکن دلم بود آباد[۶۴]

میں معانی کی بلندیوں کا درخشاں ماہتاب ہوں ، اگر اس فلک مآب بارگاہ کے بزم نشیں میرے اشعار کے ستاروں اور میری نثر کے کواکب کے کوکبہ[۶۵] کے مشتری[۶۶] بنیں اور میری قدر و منزلت بڑھائیں تو اس سے جہاں میرا نام تمام دنیا میں روشن ہوگا وہاں اس آفتاب ایسی روشن رائے رکھنے والے کی رتبہ شناسی کا شہرہ بھی بلندیوں تک پہنچے گا ۔ اور جب تک آسمان کا مجموعہ پروین کی نظم (لڑی) اور ستاروں کی نثر (ترتیب) سے آراستہ ہے یہ داستان زمانے کے صفحات میں باقی رہے گی ۔

بیت

فیضِ منشور معانی چو بنام تو نوشت
نسزد جز رقم مدح تو طغرای سخن[۶۷]

قصہ مختصر ، اس طول داستاں سے مقصود یہ ہے کہ اس بلند مرتبہ محفل کے رتبہ شناسوں کو مجھ خاکسار کی حالت سے ، کہ جس نے گوشۂ گم نامی کی تنہائی اختیار کر رکھی ہے اور حجاب کے دامن میں

پاؤں پھیلا رکھے ہیں ، پورے طور پر آگاہی ہو جائے ۔ نہیں ! نہیں !! جب اس آفتاب ایسا روشن ضمیر رکھنے اور آئینہ ایسی شفاف طبع والے ممدوح کی ، جو اپنے علم و فضل کے زور سے ان کہی بات کو سن اور اپنی بصیرت کی طاقت سے ان لکھے صفحات کو پڑھ سکتا ہے ، پاکیزگی باطن اور روشنی قلب جلوہ نما ہو گی تو ظاہر ہے کہ راز پنہاں ظاہر ہو کر رہے گا :

ترا چون رای نورا نیست روشن   سواد خط پیشانی ست روشن۶۸

چوں کہ میں اپنے آقا کی غلامی میں آنے کا خواہش مند تھا ، اس لیے میں نے سخن (شعر) کا وسیلہ ڈھونڈا ، اور چوں کہ 'سخن' کی مجھ پر بڑی عنایت تھی ، اور بے اندازہ معنی نے بھی میری زبان سے ایک داستان کو آراستہ کیا اور جو کچھ میرے لیے کہنا دشوار تھا اسے بیان کا جامہ پہنایا تھا ، اس لیے اس (سخن) نے معانی کے رسیا لوگوں کو میری طبیعت کے اچھوتے پن سے شناسا کیا ، اور مجھ بے زبان پر داستان طرازی کی تہمت باندھی ۔

نظم

هرچند به پشت پاست چشمم ز حجاب   بی نشاء فیض نیست طبعم ، دریاب
پیمانۀ سرنگون ما هم چو حباب   دریاب که آشناست با عالم آب۶۹

'تحفہ' کا خطاب پانے والے اس خط کا مسودہ اله آباد کے 'حسن بنیاد' خطے میں یکم جمادی الاول ۱۰۵۰ھ کو سپرد قلم ہوا ۔

ایک<۰ سخن شناس 'معنی آمدہ' کی مانند بن بلائے میرے 'بیت' (گھر) کے دروازے سے ، کہ جس پر دربان کی ضرورت نہیں ہوتی ، داخل ہوا اور کہنے لگا ''اے روشن رائے رکھنے والے منیر! سخن سنجی کے آسمان کے شمس<۱ اور معانی کی بلندیوں کے بدر<۲، تو نے انوری و سنائی<۳ کا مقام حاصل کر لیا اور معانی کے شمس کی روشنی سے معانی کا قاسم انوار<۴ بن گیا ہے ۔ طالع مسعود سے تجھے سعدی کا رتبہ حاصل ہوا ، اور چرخ ازرق<۵ سے تو نے نشاء عنصری<۶ پایا ہے ۔ تیری نظم کی زمین فردوسی<۷ بن گئی اور تیرا موزوں کلام حسینی<۸ کا ہم پلہ ہوگیا

ہے ۔ منوچہری کی طرح تو نے سخن کے چہرے کو بہ کہال[۷۹] جمال آراستہ کیا اور شاھدان معنی کو حسینان فرخار[۸۰] کی مانند بڑے حسن کے ساتھ سجایا ہے ، اب تو سخن کے مرتبے کو فلک تک پہنچا اور شہاب کی طرح قلم کو فلکی[۸۱] بنا ، ظہیر[۸۲] خرد بن اور معنی کا ادیب[۸۳] ہو جا ۔ مغربی[۸۴] پیشہ بن اور خسروی[۸۵] اختیار کر ۔ معانی کی قلمرو میں کوس خاقانی[۸۶] بجا اور سخن کے کوکبہ کو 'چار رکن رفیع[۸۷]' میں بھرا ۔ اُس حقیقی مددگار کی تائید سے فتح یاب ہو اور سرزمیں سخن کے بادشاھوں کو عبید[۸۸] خادم میں سے سمجھ ۔ طوطی و قمری کو وطواط[۸۹] جان ، اپنے آپ کو سخن وری میں حجت[۹۰] سمجھ ، سیف[۹۱] کی مانند اپنے آپ کو ایک جوھر بنا ، اور دو زبانیں رکھنے والے قلم کی ذوالفقار[۹۲] سے معنی کی مملکت کو فتح کر ۔ اور اگر تو عالم روحانی[۹۳] میں متکلم ہو جائے تو پھر تجھے کیا ڈر ہے ۔ اور اگر تو ابوالمفاخر[۹۴] کی طرح مسعود کے بخت سعد[۹۵] پر فخر کرے تو تو مختار[۹۶] ہے ۔ صابر[۹۷] ہو جا اور سخن کے مسودہ کی کاتبی[۹۸] کر ، اور فربہ تن (موٹے ، بلند) افکار سوچ سوچ کر خود کو دبلا پتلا کر ۔

(انشائے منیر)

چندر بھان برہمن

[اسی دور کے زبردست عالم ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے شاگردوں میں چندر بھان برہمن (متوفی ۱۶۶۲ع) بھی تھا۔ شاہ جہاں کے دفتر انشا میں ملازم رہا۔ اس کے رقعات اور چار چمن (۱۶۴۷ع) اس دور کی فارسی نثر کا اعلیٰ نمونہ ہیں اور ان سے اس دور کی ادبی زندگی، مشاعروں اور محفلوں کا مفصل حال معلوم ہوتا ہے۔]

اقوال افضل خاں

افضل خاں[1] مرحوم کا یہ قول تھا کہ ''وزیر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ کہ جو کچھ بادشاہ فرمائے اسے وہ پورے طور پر سمجھ جائے اور اس کے مطابق عمل کرے۔ اور دوسرا وہ کہ جو کچھ وہ کہے بادشاہ اسے بہ خوبی سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہو۔ جب اس دور کے وزرا، جیسے کہ ہم ہیں، اس خوبی سے عاری ہیں کہ بادشاہ سلامت کے فرمان کو صحیح طور پر سمجھ اور اس کے مقدس مزاج اور مرضی کے مطابق کام کر سکیں تو پھر بھلا دوسروں کا کیا ذکر۔''

افضل خاں مرحوم کہا کرتے تھے کہ ''بادشاہوں کے صلاح مشوروں میں جب تک کہ کسی سے کچھ پوچھا نہ جائے، ہرگز ہرگز نہ بولنا چاہیے۔ اور جب کسی سے بادشاہ مشورہ کرے تو اس وقت لازم ہے کہ وہ سچائی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے، اور بادشاہوں کی نسبت خدا سے زیادہ ڈرے۔''

''جو بات خلوت میں کہنے والی ہو وہ جلوت میں ہرگز نہ کہنی

چاہیے ، اس لیے کہ بادشاہ بڑے غیور طبع ہوتے ہیں ؛ ممکن ہے وہ بات وہ محفل میں سننا قبول نہ کریں ۔ اور اگر وہ خلوت قبول فرمائیں تو ان کے دولت خواہ (خیر خواہ) وہ بات دوبارہ بھی ان کے گوش گزار کر سکتے ہیں ۔''

''چوں کہ علم خلافت اور علم وزارت دو الگ الگ علم ہیں ، اس لیے بادشاہوں کے علم خلافت میں کبھی بھی خود کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنی چاہیے ۔ اس لیے کہ جو کچھ بھی اس بلند مرتبہ گروہ (بادشاہ) کے الہام قبول کرنے والے ضمیر پر عکس انداز ہو گا اصل وہی ہو گا ۔ لیکن جہاں تک علم وزارت کا تعلق ہے اس میں یہ ہے کہ اگر کوئی بات خیرخواہی کے طور پر ذہن میں آئے تو اس میں ہرگز ملاحظہ داری نہ کرنی چاہیے اور بادشاہ کی خوبی مصلحت کو اپنی مصلحت پر ترجیح دینی چاہیے ۔''

''چوں کہ اس (بادشاہ) کے بہت زیادہ دبدبہ و ہیبت اور جاہ و جلال کے سبب روداد بیان کرنے کی مجال نہیں ہوتی اس لیے طلب ہدایات ایسے مناسب و موزوں موقع پر کرنی چاہیے جو بادشاہوں کی طبع نازک پر گراں نہ گزرے ، تا کہ وہ اپنے مافی‌الضمیر سے پوری طرح آگاہ کر دیں ۔ اور ایسے موقع پر اگر کوئی بات خیرخواہی کے طور پر ذہن میں آ جائے تو وہ ان کے گوش‌گزار کر دینی چاہیے ۔ اگر تو وہ قبول فرمالیں تو فبہا ، ورنہ گوش‌گزار کرنے والا خیر خواہی کے تمام لوازم ادا کر کے بری‌الذمہ ہو گیا ۔''

''باہم صلاح مشورے کے موقع پر تمام اچھے اور برے ، قوی اور ضعیف پہلوؤں کو ذہن میں لاتے ہوئے مصلحت و بہتری کے مقام کو صحیح غور و فکر کی جھاڑو سے صاف کرنا اور کسی بھی بات کو فراموش نہ کرنا چاہیے ۔ اس کے بعد جو کچھ بھی زیادہ ضروری و اہم ہو اس کو پہلے شروع کرنا چاہیے، اور جو معاملہ غیر اہم سا ہو اسے کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھنا چاہیے ۔''

یہ بھی خان مغفور کے اقوال میں سے ہے کہ ''دور بین اور

حق شناس بادشاہ کو سلطنت کی بنیادیں مضبوط و محکم کرنے کے لیے چار ستونوں یعنی داناؤں کی ضرورت ہے، تا کہ وہ جس طرف بھی توجہ کرے اور جس کسی سے بھی کچھ پوچھے، ان میں سے ہر ایک معاملے کی تہ تک پہنچ کر جو بھی واضح مصلحت دیکھے وہ اس کے گوش گزار کر دے۔ بادشاہ پھر ہر ایک کے قول کو اپنے ذہن میں رکھ کر اسے عقل درست کی ترازو میں صحیح طور پر جانچے اور جس مصلحت پر وہ متفق اورہم قول ہوں اس کے مطابق عمل کرے۔ اس لیے کہ عظیم‌الشان بادشاہ کے لیے بے شمار خزانے کی ضرورت ہے۔ اگر خزانہ نہ ہو تو لشکر کی فراہمی نا ممکن، اگر لشکر نہ ہو تو ملک کا نظم و ضبط قائم نہیں رہتا اور نہ مال ہی فراہم ہوتا ہے۔ خزانہ اس وقت جمع ہوتا ہے جب ملک پورے طور پر آباد ہو، اور ملک اس وقت آباد ہوتا ہے جب صاحب معاملہ (بادشاہ) ہر معاملے کی تہ تک خود پہنچے۔''

''اگرچہ لشکر کی فراہمی مال ہی سے ممکن ہوتی ہے لیکن دلوں کی تسخیر خوش اخلاق، سیر چشم، وسیع مشرب، بردبار، سخی، مخلص اور ہنس مکھ سپہ سالار کے بغیر محال ہے۔ اور وہ شخص (سپہ سالار) اس قدر اعتماد رکھتا ہو کہ (فوج میں) اضافہ اور کمی کرنے، انعام دینے دلانے اور کسی کو برطرف کرنے پر اسے پورا پورا اختیار ہو۔ اس کے نائبوں کی تعداد اتنی ہو کہ سلطنت کے بڑے بڑے ارکان اس سے خوف کھائیں۔''

(نیز بادشاہ حق شناس کے لیے) ''ایک شخص ایسا چاہیے جو خلوت و جلوت میں بات کرنے کی جرأت رکھتا ہو، اور جو عتاب و خطاب کو دھیان میں نہ لائے۔ اور ایسا شخص محرم راز اور راست گو ہونا چاہیے، تا کہ جو کچھ بھی کہے یا سنے اس کا اظہار کسی دوسری جگہ نہ کرے۔ ایسا شخص اگرچہ کم ہی دستیاب ہوتا ہے، لیکن حق شناس بادشاہ کی خواہش سے البتہ مل جاتا ہے۔ (منشات چندر بھان برھمن)''

عبد الحمید لاہوری

[عبدالحمید (متوفی ۱۶۵۴ ع) ابوالفضل کا مقلد تھا؛ شاہ جہان کے ابتدائی بیس برس کی تاریخ لکھی۔]

تاج محل کی عمارتوں کی تفصیل

۱۷ (ذی القعدہ ۱۰۵۲ھ) کی شب کو مغفرت و خوشنودی کی ڈولی سوار حضرت مہد علیا ممتاز الزمانی[۱] کی برسی ان کے منور مقبرے میں منائی گئی جو انھی دنوں مکمل ہوا اور جس کی شرح و کیفیت ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ اس موقع پر بڑے بڑے پرہیزگاروں، فضلا، صالحین، حافظان قرآن اور دوسرے ارباب احتیاج نے تلاوت قرآن اور فاتحہ خوانی کی۔ کریم و سخی سلطان نے اس فیض نشان مقام پر تشریف لا کر مقررہ پچاس ہزار روپے میں سے نصف رقم مذکورہ محفل میں تقسیم کر دی، اور اگلی صبح واپس تشریف لے جا کر بقیہ رقم عورتوں میں بانٹ دی۔

روضۂ مطہرہ کی عمارات کی تفصیل یہ ہے: عالم پناہ کے پانچویں سال جلوس کے شروع میں اس بلند بنیادوں والی عمارت کی نیو رکھنے کے لیے کھدائی کا کام شروع ہوا، کہ جو[۲] دریاے جمنا کے کنارے واقع ہے اور دریاے مذکور شمال کی طرف اس کے متصل بہتا ہے۔ جب بڑے بڑے قوی بازو اور مضبوط ہاتھوں والے بیلچہ داروں نے پوری پوری کوشش و سعی سے اس کی بنیاد پانی میں پہنچا دی تو بلند درجہ نادرہ کار اور جدت پسند معماروں نے ایسے پتھروں اور چونے سے بڑی استواری و محکمی کے ساتھ اوپر اٹھا کر زمین کے ہموار کر دیا۔ اور اس بنیاد کے اوپر روضۂ معلیٰ کی کرسی کو، کہ ریاض رضوان کی برابری اور قدسی احاطوں کی نشان دہی

کرتی ہے ، اینٹوں اور چونے کے ساتھ ۳۷۴ گز طول اور ۱۴۰ گز عرض میں چبوترے کی مانند ہموار کرکے سولہ گز اوپر کو اٹھایا۔ ہزاروں کی تعداد میں بڑے بڑے سادہ و پرکار سنگ تراش اور نقاش ، جو مقبوضہ ممالک کے ہر ہر گوشے سے بلائے گئے تھے ، اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے فن میں ماہر و مشاق تھا ، دوسرے عملے کے ساتھ مصروف کار ہو گئے۔ انہوں نے اس کے روکار (ماتھا) کو سنگ سرخ سے تراش کر آراستہ کیا ، کہ جس میں عجیب عجیب قسم کی منبت کاری (ابھرے ہوئے نقوش) اور پچی کاری سے کام لیا گیا اور پتھروں کو آپس میں اس طرح ملایا گیا تھا کہ بڑی گہری نظر رکھنے والے بھی ان کی درز معلوم نہ کر سکیں۔ اس کے فرش کو پتھر سے گرہ بندی (باہم ملانا) کرکے ترتیب دیا گیا۔

اس عرش صفت کرسی کے وسط میں ایک اور مربع سطح کی کرسی جس کی روکار سنگ مرمر کی اور طول و عرض ۱۲۰ گز اور اونچائی ۷ گز ہے ، پھیلائی گئی۔ اس دوسری کرسی کے درمیان میں فلک شکوہ اور خلد آثار روضے کی عمارت ستر گز قطر میں مثمن بغدادی[۲] کے نمونے پر ایک گز کی کرسی سے تعمیر کی گئی۔ اس فیض نشان مرقد کا گنبد جو اس عمارت کے وسط میں اور اندر اور باہر سے تمام کا تمام سنگ مرمر کا ہے ، سطح سے کنارے تک آٹھ پہلو اور اس کا قطر ۲۲ گز ہے۔ اس کے کنارے کو مخروطی بنایا گیا ہے۔ کنارے سے گنبد کی برجی تک کہ عمارت کی سطح سے ۳۲ گز اونچی ہے ، سنگ مرمر کو قالب کاری کے طرز پر کاٹ کر لگایا گیا ہے۔ اس گنبد کے اوپر ، کہ قدسیوں کے باطن کی مانند روشن ہے ، ایک اور فلک شکوہ اور امرودی شکل کا گنبد بنایا گیا ہے جس کی باریکیوں کے درجوں کی دریافت میں مہندس فلک بھی سرگرداں ہے۔ اور اس فلک پایہ گنبد کے اوپر کہ جس کا گھیرا ۱۱۰ گز ہے ، خالص سونے کا گیارہ گز اونچا کلس نصب کیا گیا ہے جو آفتاب درخشاں کی مانند چمکتا ہے۔ زمین سے کلس کی چوٹی تک کی بلندی ۱۰۷ گز ہے۔

گنبد کے اندر اس کے آٹھوں گوشوں میں آٹھ دو منزلہ آرام گاہیں

ہیں اور ہر آرام گاہ[۳] (یا خلوت خانہ) ساڑھے پانچ گز لمبی اور تین گز چوڑی ہے اور چاروں اطراف میں چار مربع خانے (کمرے ، نشیمن وغیرہ) ہیں جو دو منزلہ ہیں ، جن میں سے ہر ایک چھ گز لمبا ، چھ گز چوڑا اور چار نشیمنوں پر مشتمل ہے ۔ اور ہر نشیمن ساڑھے چار گز لمبا اور تین گز چوڑا ہے ۔ ہر مربع خانہ کے سامنے ایک سولہ گز لمبا ، نو گز چوڑا اور ۲۵ گز اونچا پیش طاق ہے ۔ اور چاروں زاویوں (گوشوں) میں چار ہشت پہلو خانے ہیں ۔ ہر خانے (کمرہ) کے تین درجے دس گز کے قطر میں اور آٹھ نشیمنوں پر مشتمل ہیں ۔ ان خانوں کا تیسرا درجہ ایک گنبد نما چھت اور آٹھ گوشوں والا ایوان ہے ۔ ان آٹھ گوشوں والے گھروں کے تین اضلاع میں باہر کی جانب تین پیش طاق ہیں جن میں سے ہر ایک سات گز لمبا ، چار گز چوڑا اور دس گز اونچا ہے ۔ گنبد کے وسط میں اس قدوۂ مطہرات ، اسوۂ مقدسات ، فردوس بریں کی مسند گزیں ، منازل علیین کی صدر نشیں ، رحمت و بخشش کی محفوفہ[۳] اور مغفرت و خوشنودی کی ملفوفہ کی آرام گاہ فیض نشان ہے ۔

اس فردوس آثار تربت کے اوپر سنگ مرمر کا چبوترہ ہے ، جس کے اوپر قبر کا تعویذ نمایاں شکل میں بنایا گیا ہے ۔ اس کے ارد گرد اسی پتھر کا بنا ہوا جالی دار محجر (چار دیواری) ہے جو آٹھ گوشہ ، بڑا چمک دار اور مصفا ہے ۔ اس کی پچی کاری کی نادرہ کاری کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے ۔ محجر کا دروازہ سنگ یشب (سبزی مائل قیمتی پتھر کی قسم) کا ہے اور بند رومی کے نمونے پر ہے ، جس کے جوڑوں کو لوہے کی پتریوں سے جکڑ کر ان پر سونے کا پانی چڑھایا گیا ہے ۔ اس پر دس ہزار روپیہ خرچ ہوا ۔ اس 'عرش شکوہ' عمارت کے اندر سونے کے مینا کار چراغ اور قندیلیں روشن ہیں ۔ اور اس 'فردوس مثال' گنبد کی ہر راوٹی میں حلب کے بنے ہوئے شیشے لگائے گئے ہیں ۔ ایک میں آنے جانے کے لیے راستہ رکھا گیا ہے ۔

سنگ مرمر کی کرسی کے ہر کونے میں ، کہ سطح زمین سے ۲۳ گز بلند ہے ، ایک سیڑھیوں والا مینار ہے ۔ یہ بھی اسی پتھر کا بنا ہوا اور

اس کا قطر سات گز اور بلندی باون گز ہے ۔ مذکورہ کرسی کی سطح سے کلس تک ، کہ گویا پایۂ افلاک کا زینہ ہے ، اور اس کے اوپر اسی پتھر کی ایک راوٹی ہے ۔ اس بہشت صفت روضے کی کرسی کا فرش بھی سنگ مرمر کا ہے ۔ روضے کے فرش کو سنگ مرمر اور سنگ سیاہ سے ، کہ دن اور راتیں اس سے رنگ حاصل کرتے ہیں ، گرہ بندی (باہم ملانا) کر کے بڑی ہی خوب صورتی اور خوش نمائی سے ترتیب دیا گیا ہے ۔

اس روضے کی تمام اندرونی اور بیرونی عمارتوں میں سحر طراز نادرہ کار کاریگروں نے عقیق اور دوسری قسم کے رنگین اور گراں بہا پتھروں کو ، کہ جن کے اوصاف کے گوہروں کا ظرف بیان میں سمانا مشکل اور جن کی تعریف کے موتیوں کا زبان کے ترازو میں تلنا دشوار ہے ، جن کی تابش سے آفتاب عالم تاب نور حاصل کرتا اور جن کی شعاعوں سے 'صبح جہاں افروز' کی پیشانی روشن ہے ، کچھ اس محکمی و استواری سے آپس میں جوڑا ہے کہ بڑی سے بڑی باریک بیں نظر بھی اس کی باریکیوں تک پہنچنے سے قاصر اور دور رس 'غور' اس کی نادرات کے ادراک سے عاجز ہے ۔ اس صنعت گری اور ہنرمندی کی ، جو مرقد کے چبوترے اور اس کے گردا گرد محجر کی (کہ جس کے نادر نقوش کے انعکاس سے چشم آفتاب نگاریں ، اور آسمان کا دامن بہاروں سے آراستہ ہے) پچی کاری میں دکھائی گئی اور جس کی پرداخت میں مانی ایسے قلم کاروں اور سحر طراز نقاشوں نے ید بیضا دکھایا ہے ، کیفیت و کمیت کے بارے میں اگر درختوں کے قلم اور سمندروں کی سیاہی سے بھی لکھا جائے تو بھی وہ اختتام پذیر نہ ہو پائے گی ۔ سابق میں اس جگہ چالیس ہزار تولے وزنی سونے کا ایک منقش محجر تھا جس کی قیمت چھ لاکھ روپے تھی ۔ لیکن جیسا کہ دور اول کے چھٹے سال کے واقعات میں ہم بیان کر آئے ہیں بادشاہ عاقبت اندیش نے اپنی دور بینی اور عاقبت اندیشی کے سبب عمارت روضہ کی مہمات کے پیش‌کاروں کو یہ حکم فرمایا تھا کہ محجر ، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ، سنگ مرمر کا بنائیں ۔ یہ محجر دس سال کے عرصے میں پچاس ہزار روپے کی لاگت سے تکمیل کو پہنچا ۔ چناں چہ

عالم پناہ کے مبارک حکم کے مطابق اسے سونے کے محجر کی جگہ نصب کیا گیا۔

روضۂ مقدس کے اندرونی اور بیرونی کتبے، جو قرآنی سورتوں، رحمانی آیتوں، اسماے حسنیٰ اور دعاؤں کے حامل ہیں، کچھ اس طرح پچی کاری کیے گئے ہیں کہ نہ صرف خاک نشینوں بلکہ افلاک کے معتکفین کے لیے بھی باعث حیرت و استعجاب ہے۔ اس 'محکم بنیاد' اور مضبوط ستونوں والی عمارت اور اس کی کرسی کی کندہ کاری کا وصف بیان کرنے کے لیے ایک علیحدہ کتاب درکار ہے۔

روضۂ منورہ کے مغرب میں سنگ سرخ کی کرسی پر ایک مسجد بنائی گئی ہے، جس میں مذکورہ پتھر کے تین چشمے ہیں، جو ستر ستر گز لمبے، تیس تیس گز چوڑے اور تین گنبدوں پر مشتمل ہیں۔ یہ تینوں گنبد اندر سے سنگ سرخ اور باہر سے سنگ مرمر کے ہیں۔ ایک اور گنبد ہے جس کا قطر گیارہ گز ہے۔ درمیانی گنبد میں ایک چودہ گز لمبا دس گز چوڑا اور اکیس گز اونچا پیش طاق ہے۔ طرفین کے دو گنبدوں میں سے ہر ایک کے سامنے ایک گیارہ گز طویل اور نو گز چوڑا خانہ ہے۔ مسجد کی بائیں دیوار کے حاشیے کو اندر اور باہر سے سنگ مرمر، سنگ زرد اور سنگ سیاہ سے لہروں کی مانند پچی کاری کیا گیا ہے۔ مسجد کا فرش سنگ سرخ سے بنایا گیا ہے۔ اس سنگ زرد اور سنگ سیاہ کو پچی کاری کر کے مصلی کی شکل نمایاں کی گئی ہے۔ اس کے سامنے ایک ستر گز لمبا اور بیس گز چوڑا چبوترہ ہے۔ چبوترے کے سامنے ایک چودہ گز لمبا اور دس گز عریض حوض ہے۔ اس کا روح افزا صحن بڑے بڑے ولیوں کی عبادت گاہ اور اس کی دل کشا فضا بڑے بڑے عبادت گزاروں کی سجدہ گاہ ہے۔

روضۂ مطہرہ کے مشرق میں مسجد سے ملحق مہمان خانہ ہے جو تمام جزئیات اور خصوصیات میں اس (مسجد) کی مانند ہے؛ سوائے اس کے کہ اس کی دیوار میں محراب نہیں ہے اور فرش بھی جانماز کی مانند نہیں۔ سنگ سرخ کی کرسی کے چار کونوں میں چار تین منزلہ اور

هشت پہلو برج ہیں ۔ ان کی تیسری منزل کی چھت گنبد نما ہے ۔ گنبد کا تاج اندر سے سنگ سرخ اور باہر سے سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے ۔ ہر برج کے پہلو میں ایک بارہ گز لمبا چھ گز چوڑا ایوان ہے جس کے دو طرف حجرے ہیں ۔ سنگ سرخ کی کرسی کے آخر میں ایک رشک فردوس مربع باغ ہے ۳۶۸ گز طول و عرض میں ، جس میں قسم قسم کے پودے اور مختلف انواع کے درخت ہیں ۔ باغ کی درمیانی چہار روش میں کہ چالیس گز چوڑی ہے ، ایک چھ گز عریض نہر ہے ۔ جس میں فوارے چھوٹ رہے ہیں ۔ ان فواروں میں پانی دریاے جمنا سے آتا ہے ۔ نہروں کے سنگم پر ایک مربع چبوترہ ہے اٹھائیس گز طویل وعریض ۔ مذکورہ نہر اس چبوترے کے اطراف میں پھیلی ہوئی ہے ۔ چبوترے کے وسط میں سولہ گز لمبا سولہ گز چوڑا حوض ہے ، جس میں پانچ فوارے نصب کیے گئے ہیں ۔ اس جنت مثال (چبوترہ) کی روشوں کا فرش سنگ سرخ کا ہے ۔ جس کی گرہ بندی بڑی مہارت سے کی گئی ہے ۔ باغ کے مشرق اور مغربی دونوں اضلاع (حصے) میں گیارہ گز طول اور سات گز عرض کا ایک ایوان ہے ، جس کے ساتھ دو دو حجرے بنائے گئے ہیں ۔ ایوان کے عقب میں طنبی خانہ (طناب خانہ ؟) ہے نو گز لمبا پانچ گز چوڑا ۔ ایوان کے سامنے چھیالیس گز طویل اور دس گز عریض چبوترہ ہے ۔ باغ کا جنوبی حصہ ، شمال کی جانب بارہ گز کی چوڑائی میں ، تمام کا تمام ایوان در ایوان ہے ۔ اس ضلع (حصہ) کے دو کونوں میں دو برج ہیں جو سنگ سرخ کی کرسی کے برجوں کے نزدیک ہیں ۔ مذکورہ ضلع کے وسط میں روضے کا دروازہ آسمان سے باتیں کر رہا ہے ۔ دروازے کے گنبد کی سطح کا ، کہ مثمن بغدادی ہے ، قطر سولہ گز ہے ۔ گنبد کے مشرق و مغرب میں نیم مثمن شکل کے دو نشیمن ہیں ۔ ہر نشیمن کا طول سات گز اور عرض چار گز اور ان کی چھت آدھے پیالے کی مانند ہے ۔

دروازے کی عمارت کے چاروں گوشوں میں چار خانے (کمرے) واقع ہیں جو مربع اور دو منزلہ ہیں ۔ ہر ایک خانہ طول و عرض میں چھ گز اور چار نیم مثمن نشیمنوں پر مشتمل ہے ۔ اس عمارت کے شمال اور جنوب میں دو پیش طاق ہیں ۔ ہر پیش طاق کی لمبائی سولہ گز

چوڑائی نو گز اور اونچائی پچیس گز ہے ۔ اسی طرح اس (عمارت) کے مشرق و مغرب میں بھی دو پیش طاق ہیں جو بارہ بارہ گز طویل ، سات سات گزعریض اور انیس انیس گز بلند ہیں ۔ دروازے کی روکار (ماتھا) کے اوپر ، اندر اور باہر کی جانب ، سات چوکھنڈیاں ہیں جن کے تاج سنگ مرمر کے ہیں ۔ اس عمارت کے چاروں کونوں میں چار بہت ہی نفیس و زیبا مینار ہیں ۔ باغ ، عمارتوں اور ان کے گردا گرد کی دیواریں اندر اور باہر سے ، عمارتوں کے فرش اور باغ کی دیواروں کے کنگرے (جو آسمان تک پہنچے ہوئے ہیں اور جن میں سنگ سفید اور سنگ سیاہ کی پچی‌کاری کی گئی ہے) تمام کے تمام سنگ سرخ سے بنائے گئے ہیں ۔ دروازے کے سامنے اسی گز لمبا اور چونتیس گز چوڑا چبوترہ ہے ۔ جلوخانہ (آنگن ، میدان) کی لمبائی دو سو چار اور چوڑائی ایک سو پچاس گز ہے ۔ جلو خانے کے چاروں اطراف میں ایک سو اٹھائیس حجرے اور باغ کی دیوار سے متصل دو خواص پورہ (خاص لوگوں کا علاقہ ۔ خواص خدمت گاروں کو بھی کہتے ہیں) ہیں ، ایک تو جلو خانے کے مشرق میں اور دوسرا جانب مغرب۔ ہر ایک کا طول چھہتر اور عرض چونسٹھ گز ہے ، اور یہ مشتمل ہیں بتیس حجروں پر ۔ حجرے سے پہلے ایک ایوان ہے جو اس مرحومہ و مغفورہ کے خادموں کے لیے بنایا گیا ہے ۔

جلو خانے کے شرق و غرب میں بازار بنائے گئے ہیں ، جن کے ایوان سنگ سرخ اور حجرے چونے کی اینٹوں کے ہیں ۔ ان بازاروں کی چوڑائی بیس گز ہے ۔ جلو خانے کے جنوبی حصے میں ایک چوک بازار ہے جس میں سے چار بازار نکلتے ہیں ۔ مغربی اور مشرقی بازار کی چوڑائی نوے گز اور شمالی و جنوبی کی تیس گز ہے ۔ اس چوک کے اطراف میں چار سرائیں ہیں ۔ ان میں سے دو سرائیں سرکار شاہی نے پختہ اینٹوں اور چونے سے بنوائی ہیں ۔ ہر سرائے ایک سو ساٹھ گز ہے ۔ ان کا صحن مثمن بغدادی اور ہر سرائے ایک سو چھتیس حجروں پر مشتمل ہے ۔ ہر حجرے کے سامنے ایک ایوان ہے تین کونوں میں ۔ ان دونوں سراؤں (پختہ اینٹوں وغیرہ والی) میں تین تین چوک ہیں اور ہر چوک کا صحن ۱۴ × ۱۴ گز ہے ۔ دونو سراؤں کے چوتھے گوشے میں

ایک دروازہ ہے جس میں سے لوگ آتے جاتے ہیں اور جو 'ہشت پہلو' چوکی کی طرف کھلتا ہے۔ یہ چوکی ایک سو پچاس گز لمبی اور سو گز چوڑی اور چوک بازار کے وسط میں بنائی گئی ہے۔ باقی دو سرائیں اس سے ملحق ہیں۔

ان سراؤں میں ہر قصبہ و شہر اور ہر ملک و ولایت کے قسم قسم کے مال و اسباب، ساز و سامان، زمانے کی رنگا رنگ نفیس چیزوں اور طرح طرح کی اشیاے آرایش و تعیش کی کہ دنیا کے ہر کونے سے یہاں لائی جاتی ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔ شاہی سراؤں کے پیچھے بہت سے تاجروں نے پختہ ڈیرے اور سرائیں بنا رکھی ہیں۔ یہ آباد و شاداب 'ابد بنیاد' علاقہ جو ایک عظیم شہر کی صورت اختیار کر گیا ہے، ممتاز آباد کے نام سے موسوم ہے۔

ان تمام عمارتوں پر، جن کی تفصیل ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، اور جو مکرمت خان اور امیر عبدالکریم کی نگرانی میں تقریباً بارہ برس میں تکمیل پذیر ہوئیں، پچاس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ دارالخلافہ اکبر آباد اور نگر چند کے پرگنۂ حویلی کے تیس قصبوں کو، جن کا مالیہ چالیس لاکھ دام (روپے کا چالیسواں حصہ) ہے، مذکورہ سراؤں اور بازاروں کی دکانوں کے محصول کے ساتھ کہ دو لاکھ روپیہ بنتا ہے، اس روضۂ منورہ کے لیے وقف کیا گیا ہے، تاکہ اگر کبھی مرمت کی ضرورت آ پڑے تو مذکورہ آمدنی میں سے بہ قدر ضرورت اس مرمت پر اور باقی رقم دوسری مقررہ مدوں پر مثلاً سالانہ و ماہانہ تنخواہ پانے والوں کی خوراک اور نان و نفقہ جو اس بلند رتبہ عمارت کے نوکروں چاکروں اور دربانوں وغیرہ نیز محتاجوں اور بے نوا لوگوں کے لیے مقرر ہے، خرچ کی جائے۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہے اس کے بارے میں خلیفۂ وقت، کہ اس بقعۂ فیض کی سرپرستی کا تعلق اس سے ہے، جو مناسب سمجھے اسے عمل میں لائے۔

(بادشاہ نامہ)

مغلیہ دور کے ارباب موسیقی

یکم رجب (۱۰۴۷ھ) کو عالم پناہ نے لعل خاں کلاونت کو، کہ اس 'سعادت نشان' دور میں ہندوستانی زبان کے نغمہ سراؤں کا سرگروہ ہے، 'گن سمندر' کے خطاب اور خلعت سے نوازا۔ یہ لعل خاں تان سین (جس کا ذکر آگے چل کر ہوگا) کے بیٹے بلاس کا داماد ہے اور اس (بلاس) کی گائیکی کو اس نے اس کے شاگردوں سے بہت عمدگی سے سیکھا ہے۔ اس (بلاس) کے طرز (گائیکی) میں دھرپد گانے میں اس(لعل خاں) کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اس کے چار بیٹے ہیں جو راگ گاتے وقت اس کے ہم آواز ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے اچھے خوشحال اور بسرام ہیں۔ یہ دونوں گانا گانے میں ایک دوسرے کے مماثل ہیں۔ اول الذکر چوں کہ بڑا صاحب فہم اور درست سلیقہ ہے، اس لیے سلطان بلند اقبال کے نام نامی پر بول (راگ) ایجاد کرتا رہتا ہے۔ لیکن اس پر مسرت اور عشرت افزا دور میں تصنیفیں (راگ۔ بول) گانے والوں کا سردار جگن ناتھ مہاکب رائے ہے۔

اگرچہ ہندوستان کی سرزمین جنت نظیر کے قدیم گویوں کا دار و مدار تصنیفوں پر تھا، جنھیں گیت، چھند، دھرد اور استت کہتے ہیں، لیکن چوں کہ یہ عجیب و نادر ترانے کرناٹکی زبان میں رائج تھے، اور اس سرزمین کے لوگ ان کے مطلب و معنی سے نا آشنا ہونے کے سبب سوائے ان کی سروں اور لے کے اور کچھ بھی نہیں سمجھ پاتے تھے، اس لیے امیر خسرو نے، جو ہزارہ نسل سے تعلق رکھتے اور شیخ نظام الدین بدایونی ثم دہلوی کے مریدوں میں سے تھے، انھیں چار قسموں میں گایا۔ پہلی قسم قول ہے جو گیت کی شکل میں عربی فارسی نظم یا نثر پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد ایک تال، دو تال، یا تین تال اور چار تال پر ہے۔ دوسری قسم فارسی ہے جس میں فارسی اشعار ایک تال پر مبنی ترانے کے ساتھ فراہم کیے ہیں۔ تیسری قسم کا نام ترانہ ہے جو بغیر اشعار کے ہے اور اس کی بنیاد ایک تال پر رکھی ہے۔ چوتھی قسم میں تصنیف آتی ہے جو ہندی زبان میں وضع کی اور اسے خیال وغیرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔

امیر خسرو سے کچھ عرصہ پہلے بھی چند ایک گویوں نے خیال گایا ہے ۔ ان کے بعد راجا مان تونور نے ، کہ قلعۂ گوالیار کا حاکم اور ہندوستانی نغمات و تصنیفات کی باریکیوں سے بہ خوبی آگاہ تھا اور جس نے گوالیاری زبان میں نئے نئے معانی پیدا کیے تھے ، طرز جدید نکالا تاکہ ہر ایک کے لیے اس تک رسائی آسان ہو جائے ۔ اس نے اس تصنیف کو جس میں ہندوؤں کے مذہبی پیشوا کشن کا ذکر تھا ، بشن پد کا نام دیا اور جو کچھ دوسرے بزرگوں کی تعریف اور ارباب ثروت کی مدح میں یا مراتب عشق کی تفصیل میں فراہم کیا اسے استت اور دھرپد کے ناموں سے یاد کیا ۔

نایک بخشو کلاونت نے ، جو راجا مان کے پروردہ لوگوں میں سے تھا ، دھرپد کو مضامین رنگین کی استواری ، آراستہ و پیراستہ عبارت کی سلاست ، دل نشیں نغمے کے حسن اور پسندیدہ تصرفات کے لطف سے پایۂ کمال تک پہنچایا ۔ یہاں تک کہ اس کی بے مثل لے نے ایک دنیا کو مسحور کر دیا ۔ اس کی آواز کی رسائی اس درجہ تھی کہ دوسرے تمام نغمہ سراؤں کے برعکس ، کہ جب تک وہ کم از کم دو مل کر نہ گائیں اچھا نہیں گا سکتے ، وہ اکیلا بڑی عمدگی اور بلند آواز سے گاتا تھا اور بہت ہی اونچی شدّ کو جسے ہندی میں ٹیپ کہتے ہیں ، کچھ اس طرح ادا کرتا تھا کہ اس فن کے بڑے بڑے دشوار پسند ماہر بھی اس پر تحسین و آفرین کے پھول نچاور کرتے اور متاثر ہوتے تھے ۔ وہ گاتے وقت پکھاوج (طبلہ) بھی بجایا کرتا ، اور الاپ میں ، کہ جو محض نغمے کا ادا کرنا ہے اور گاتے وقت اس سے آغاز کرتے ہیں ، طرز لاثانی کا مالک تھا ۔

نایک مذکور راجا مان کے مرنے کے بعد کچھ عرصے تک اس کے بیٹے راجا بکرماجیت سے وابستہ رہا اور جب گوالیار کا قلعہ اور علاقہ راجا بکرماجیت کے قبضے سے نکل گیا تو وہ قلعۂ کالنجر کے حاکم راجا کیرت کے پاس چلا گیا ۔ وہاں بھی اس نے بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کی ۔ آخر سلطان بہادر[۵] گجراتی نے اس (نایک) کے عجیب و غریب

احوال سننے کے سبب فریفتہ ہو کر اسے راجا گیرت سے مانگا ۔ راجا کو چار و ناچار اسے سلطان کے پاس بھیجنا پڑا ۔ اس یگانۂ روزگار کے وھاں پہنچنے پر سلطان بہادر نے بے پناہ مسرت و شادمانی کا مظاھرہ کیا ۔ نایک مذکور نے بقیہ زندگی اسی جگہ بسر کی ۔

اس کے بعد گوالیاری کلاونت تان سین کے ، جو شیخ محمد غوث[6] کا منظور نظر تھا ، نغمۂ دل کشا کی آواز نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ۔ تان سین اس سے پہلے قلعۂ باندھو اور علاقۂ تپہ کے راجا رام چند بگھیلہ کے پاس کام یابی و کامرانی کی زندگی بسر کر رھا تھا ۔ جب اس فن دقیق میں اس کی یکتائی کا شہرہ بادشاہ فلک بارگاہ حضرت عرش آشیانی (اکبر بادشاہ) کی 'فردوس مثال' محفل میں ، کہ دنیا کے دانش‌وروں کے جمع ھونے کی جگہ اور ھر ملک و دیار کے ھنرمندوں کا مرجع تھی ، بار بار پہنچا تو انھوں نے راجا مذکور کے پاس اپنا ایک معتمد اس (تان سین) کی طلبی کا منشور دے کر بھیجا ۔ راجا نے کمال خواھش کے ساتھ شاھی فرمان قبول کرتے ھوئے اسے بادشاہ کے پاس بھیج دیا ۔ جب وھاں اسے آستان بوسی کا شرف حاصل ھوا اور اس کی نغمہ پردازی اور لطف آواز نے خاطر اقدس کو نشاط آگیں کیا تو بادشاہ سلامت نے اسے اپنے بے پناہ لطف و کرم سے نواز کر ھم سروں کی نسبت اس کا مرتبہ اور بلند کر دیا ۔

آج کل ھندوستان کی سرزمین 'بہشت نشان' کے گویوں اور موسیقاروں کا دار و مدار بخشو اور تان سین کی تصنیفوں (راگوں) پر ھے ۔

(بادشاہ نامہ)

طغرا مشہدی

[جلالہ طباطبائی اور طغرا دونوں اپنے عہد کے صاحب طرز انشا پرداز تھے - طغرا کے رسائل شائع ہو چکے ہیں - ذیل کا اقتباس رسالہ جلوسیہ سے لیا گیا ہے جہاں تخت طاؤس کے بارے میں شاعر نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے -]

واہ وا ! سبحان اللہ ! کیسا عمدہ تخت ہے کہ جب قضا و قدر کے زرگر نے اس کی مرصع کاری کے لیے ہاتھ بڑھایا تو جوہریوں کے پسندیدہ نو آسمانوں کے فیروزہ کو اس کے ایک پائے کا مصالحہ سمجھا - اگر اس کے موتیوں کی موج (چمک تابندگی) طوفان نوح میں ذرا سا بھی تیری ہوتی تو آب (چمک ، پانی) کے آثار سے بیگانہ ہونے کے سبب اسے (طوفان نوح) زمین کے برابر ہموار نہ ہونے دیتی[1] -

اس موتیوں کے چمن کے پرندے جب اپنے مرصع و زرکار بال و پر کھولتے ہیں تو فضا میں 'ذات العماد ارم' (ذات العماد : ستونوں والا اور ارم بہ معنی باغ - غالباً شداد کی بہشت کی طرف اشارہ ہے) کا سا منظر پیش کرتے ہیں - آفتاب کی ، جو اپنی کیمیا گری کے لیے ہر جگہ اور خاص و عام میں مشہور و معروف ہے - تمام عمر اس فلک شکوہ تخت کا سونا بنانے میں گزری ہے - اگر جہاں بیں چاند کو اس تخت معالی کی پابوسی کا موقع ہاتھ لگتا تو وہ مزید روشنی کے حصول کی خاطر اس کے نیلم کو پتلی کی طرح آنکھوں پر رکھتا - لعل پیکانی (نیزے کی انی کی مانند لعل) نے جب آب (تابندگی) کی باریک کمان کو کھینچا ہے تو ہر روز اس کی لہروں کے سیکڑوں تیر سرزمین ہند سے بدخشاں تک پہنچے ہیں - اس کے یا قوت رمانی (لعل کی ایک قسم) کی نسیم

اگر خشک انار پر چلتی تو اس کے ہر ہر دانے سے شبنم گلنار کی تری کے صدھا کھلیان ٹپک پڑتے ۔ عین الہر (قیمتی پتھر بلی کی آنکھ کی طرح) نے اس سونے کے باغ کی زمین میں تعلق کی جڑیں جمائیں تاکہ اسے قیمتی پتھروں کی آب سے سرسبز کہا جا سکے ۔ شبہ (سیاہ رنگ کا چمک دار پتھر ۔ پیتل) کو اتنی مجال ہی نہیں کہ اس کے الماس کے پہلو میں بیٹھ سکے تو پھر بھلا اس کی خوب صورتی کے سامنے اپنے چہرے کو کیوں کر سفید دیکھے ۔ اگر اس کے موتیوں کا آب یاقوت کی آگ کے منبع میں مشغول نہ ہوتا تو حضرت سلیمان کا تخت اڑا کر لے جانے والی ہوا کو پیوند خاک کر دیتا ۔ جس جواہر تراش نے اس کی بلندی کے فیروزے کو تراشا ہے، اس نے ہنر کی سرزمین میں آسمان کے زبرجد (سبز رنگ زردی مائل جوہر) کو ادنٰی پایا ہے ۔ اس کے یاقوت کے آب سے نسبت کے سبب پیگو (ایک ملک اور جوہری کا نام) کی خاک کان پاکیزگی کا گرداب اور اس کے سنگ زمرد کے ملاپ سے ولد پہاڑ کا ایک کان نما طوفان ہے ۔

جب تک اس کے لعل کا چراغ 'کانِ خراشی' (کھودنا) کی بزم میں روشن نہیں ہوا اس وقت تک تیشے کے فولادی پروانے نے اپنے پر و بال نہیں جلائے ۔ باغ ارم کا مور چوں کہ داغ کی مشابہت کے سوا دیگر خوبیوں سے محروم ہے اس لیے اس باغ کا مرصع مور اسے کس طرح اپنی لڑی میں شامل کر لے : **رباعی**

این تخت کہ آسمان کند پابوسش
ز اختر شدہ گوہر شرف مانوسش
گر تاج خروس عرش گرد خورشید
مشکل کہ رسد بزینت طاؤسش[۲]

اس شگفتگی کے چمن میں جب سے موروں نے شاخوں پر پاؤں رکھا ہے ایک شاہباز (بادشاہ) کے سر پر انھوں نے اپنی دم سے کئی ایک چتر پھیلا رکھے ہیں ۔ گہر فروش کے علی الرغم جیسی کہ آب و تاب اس تخت کے موتیوں میں ہے (اس کے ہوتے ہوئے) جس روز

تخت کا سرپوش اٹھایا جائے اس دن سورج کے روشن ستارے کی کیا ضرورت ہے[۳] ؟

جو زرگر آب دار جواھرات سے اس کی جڑاؤ نقاشی میں مشغول ہوا اس نے اپنے کام کی نزاکت سے نقاشوں کو تصویر کی طرح حیران کر دیا ۔ مہرۂ سلیمانی بدقماری (جوہر کا نام) کی طرح کفر کا زنار کس طرح پرے پھینکے کہ وہ اپنے چومنے کے تختے کے درمیان خطائی (مہرے کا نام) کی مانند بیٹھنے کا نقش نہیں رکھتا ۔

عقیق یمن اگرچہ انگوٹھی کی سواری سے شہرت پا گیا ھے لیکن اس (تخت) کی ھم نشینی نے سیلانی یاقوت کے دل میں اس (عقیق یمن) کو پیادہ بھی نہیں رھنے دیا[۴] ۔ جس نجومی نے اس عرش شکوہ تخت کے قبے کو نہیں دیکھا اسے کیا معلوم کہ تدویر (دائرے کے اندر چھوٹا دائرہ) آسمان کی کرسی کے اوپر بھی ھو سکتا ھے ۔ اس کے سایے کی رنگ آمیزی نے زمین کو اس درجہ رنگا رنگ بنا دیا ھے کہ (اس کے مقابلے میں) نگارستان چین کی خاک کے خاکہ کو شرم کے پانی میں ڈبویا جا سکتا ھے ۔

اس جواھرات سے مرصع تخت کے سونے میں اس قدر عظمت و بزرگی کی بانگی (سونے کی چاشنی) ھے کہ کتاب دار (لائبریرین) اس کے نسخۂ اکسیر کو کیمیاے سعادت کے اوپر رکھتا ھے[۵] ۔ جس ماھر زرگر نے اس کی مرصع کاری میں اپنی سعی و کوشش کے جوھر دکھائے ھیں اس نے اس کثرت سے اس میں جواھرات جڑے ھیں کہ کسی دوسری چیز کے لگانے کے لیے اس میں جگہ ھی نہیں رھی ۔

اگر اس کے عالم افروز موتیوں کی روشنی گنبد فلک تک نہ پہنچتی تو آسمان کے شبستان میں ستاروں کے چراغ روشنی نہ حاصل کر پاتے ۔ اس تخت کے غیر معروف موتی اگر 'نام' قبول کرتے تو ان کا نام رکھنے والا اس سلسلے میں لغت کی مانند ایک کتاب تیار کر سکتا تھا ۔ دریتیم (بڑا موتی جو سیپی میں صرف ایک ھوتا ھے) نے جب نور کی لہر کے ھونٹ تخت کی پابوسی کے لیے کھولے تو سیپی اماں نے اس کے اس فعل پر تحسین و آفریں کے پھول نچھاور کیے ۔ اگر نقاش اس کے زمرد کی سبزی

سے ذرا سا بھی رنگ پیالی میں رکھ لیتا تو جہان کے آٹھوں باغوں کی سبزی کو ایک ہی قلم (یعنی ایک ہی ڈوبے) سے کاغذ پر لکھ دیتا ۔ جواہر التفسیر[6] کا عالم جب اس کے تماشائیوں میں شامل ہوا تو اس نے اس تخت کی نور بخشی سے آنکھ کی بیاض (سفیدی) میں سورۂ نور[7] پائی ۔

اگر شاہی فرمان کے مطابق تخت کا سرپوش سفید کپڑے کا ہوتا تو رنگارنگ جواہر کی آب داری سے گل بندی شال کی طرح رنگ برنگا دکھائی دیتا ۔ جو ہاتھ بھی اس 'گوہر شب چراغ' کے پائے تک پہنچا اس کی روشنی کی شہرت نے ید بیضا[8] کو بھی بے دست و پا کر دیا ۔ یوں تو بہ ظاہر یہ ایک تخت ہے جس کی زمین سونے کی بنائی گئی ہے ، لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا باغ ہے جس کے صحن میں زعفران بویا گیا ہے ۔ زرد سونا جو سرخ لعل کے سامنے موتیوں سے ملا ہوا ہے ، گویا ایک عاشق ہے جو اپنے معشوق کے سامنے آنسو بہا رہا ہے ۔

رباعی

شاہا تخت تو داشت چون بآب گہر گردید ز لطف حق صفا باب گہر
گر تخت سلیمان شدہ از باد روان تخت توروان می شود از آب گہر

اگر باغ کی شبنم اس کے موتیوں سے مشابہت نہ رکھتی تو روشن آفتاب اسے بلندی کے خزانے میں جگہ نہ دیتا ۔ اس کے سونے کے حساب کو جب منشی نے تحریر کی ترازو میں تولا تو اپنے قلم کے زور کو تحریر کے پلڑے میں مستی کے مقابل پایا (تحریر نہ کر سکا) ۔ اگر چرخ گردوں اپنے تمام ستاروں کے نور کو جمع کرتا تو جب بھی اس زرنگار تخت کے ایک کلس کی زیبائی کے برابر روشنی ڈالنے سے قاصر رہتا ۔ جس ورق میں اس کے آب دار عکس کی رنگینی کی تفصیل آ جائے اس کے مسطر کا حوض (ورق) ابری بنانے کے سانچے کی رنگینی میں ظاہر ہو ۔ اس کے یاقوت کی تعریف لکھنے والے نے جب تحریر کے گرد چکر لگایا (لکھنا شروع کیا) تو قلم کا ریشہ آب و تاب میں کان لعل کی رگ سے بھی بڑھ گیا ۔ جس نے اس کے زینے کے پائے کی سیر کے لیے آنکھیں کھولیں اس نے یہ جانا کہ ستاروں کے فلک کا راستہ سیڑھیوں والا تھا ۔

بلندی اور پستی اس کے جواھرت کی روشنی سے ایسی منور ھو گئیں کہ آسمان اور زمین ایک دوسرے سے اپنے راز نہیں چھپا سکتے۔

اس گہرزار کے موتی اپنے بے پناہ حسن سے کچھ اس قدر شاداب ھیں کہ دیدار کا تشنہ جوھری اس کے خیال ھی سے آنکھوں میں آنسو بھر لاتا ھے۔ اس کے یاقوت سیلانی نے نور کی موج خیزی سے کون سی ایسی پھوار نہیں برسائی جو ثریا کے موتیوں کی طرح وہ نیلے آسمان پر نہ گرا سکے۔ صرف وھی اھل قلم اس کے لعل پیکانی کی شرح و تفصیل لکھنے پر قادر ھو گا جو آفتاب کے چاقو سے روشن ستاروں کا قلم بنائے گا۔

اگر طوطی اس کے شکر سے ھم رنگ سونے پر سے گزرتا تو سونے کے اثر کی برکت سے وہ سنہری پرندے کی سی شان و شوکت والا ھو جاتا۔ کالی مینا نے اس کے یاقوت کی آب میں پر نہ کھولے ورنہ رنگینی کے سبب سرخاب کی مانند قرمزی پروں والی ھوجاتی۔ ھندوستان کی سرزمین میں جو پرندہ نوری کے لقب سے مشہور ھے وہ ایک ایسا کوا ھے جو اس کے جڑاؤ مور کے عکس سے نور میں ڈوب گیا ھے۔

جو مفسر بھی اس بلند رتبہ تخت کے مرتبے کی حقیقت کو پا گیا اس نے جان لیا کہ آیۃ الکرسی اسی کی شان میں نازل ھوئی ھے۔ نور افشانی کے سلسلے میں یہ تخت بھلا شجر طور کا ھم مثل کیوں نہ ھو کہ ظل سبحانی عالم پناہ کی پیشانی سے اس کے ھر جانب تجلی ھوتی ھے۔

قطعہ

ز روی شہ نگیرد چون ھوا نور — بود آن ظل حق سر تا بپا نور
جلوس او بدین تخت ضیائی — دلیل معنی 'نور علیٰ نور'۹

قضا و قدر کے جوھری نے اگرچہ بہت سے مقدس موتی چنے ھیں لیکن اس تخت کے موتی جڑنے والے نے ایک موتی بھی چھانٹے بغیر نہیں خریدا۔ سورج کا لعل اگر کرنوں کے تاروں سے آب دار نہ ھوتا تو اس (تخت) کی موتی تراشنے والی سان سے مشابہت رکھنے کے لائق نہ ھوتا۔ جس صاحب دل نے بھی اپنے وجود کے تانبے کو کیمیا بنانا چاھا اسے

اس کے سونے کے 'تصور' (کی اکسیر) سے بڑھ کر کوئی اور اکسیر نظر نہ آئی ۔

اس کے لعل کو دیکھنے کے باعث پپوٹوں کے پردوں میں اس قدر رنگ رچ گیا ہے کہ پتلی کا سیاہ لباس ارغوانی نظر آنے لگا ہے ۔ (اس کے) گوہر شب چراغ کی چمک شمع طور کی روشنی کی قائم مقام ہے اور اس کے آتشی مونگے کی کرن مشعل نور کی روشنی کی نائب مناب ۔ اس کے ہیرے کی توصیف کا قلم چاقو کے احسان کے بغیر ہی تیز و تند اور یاقوت کی صنعت کی تحریر شنگرف کی زحمت کے بغیر ہی سرخی دار ہے ۔ زمرد کی آب دیکھنے سے بہار کے بادل کی سی تازگی و شگفتگی آنکھوں میں چھا گئی اور زبرجد کا رنگ سننے سے بہار کی خرمی کانوں پر حاوی ہوگئی ۔ عین الہر نے جب سے اس مرصع باغ میں آنکھیں کھولی ہیں اس کی آنکھ کا گھیرا قوس و قزح کی مانند رنگین نظر آتا ہے ۔

اس کے سونے کے سوا ، کہ جس نے فیروزے کو زیبائی و زینت بخشی ہے ، کبھی بھی کوئی خزاں بہار کی آراستگی میں مصروف نہیں ہوئی ۔ اس کے مونگے کی سرخی اگر سیاہی کی دوات میں پڑ جائے تو سیاہی دوات میں سے شفق کے ترشح کی مانند ٹپکے ۔ سیلانی یاقوت کی آب ، جو جزیرۂ 'سیلان' کی 'خشکِ ہند' (خشک کی ہوئی) ہے ، اس جواہرات کے پہاڑ کے دامن میں رو کی طرح بہہ رہی ہے ۔ حسن کا کھرا سونا اگرچہ دنیا میں بہت کم دستیاب ہے لیکن اس (تخت) کے جڑاؤ عشق باز کو اس کمی کے باوجود بہت سا سونا حاصل ہو گیا ہے ۔ حوروں کے ہونٹوں کا یاقوت چوں کہ تراشے جانے کے قابل نہ تھا اس لیے نیلے آسمان کی گردش نے اسے اس تخت کے مسالے میں شامل نہ ہونے دیا ۔ غلمان کے کانوں کا موتی اگر اپنے آپ کو پابند نہ پاتا تو اس (تخت) کی مرصع کاری کے کارخانے میں سر کے بل دوڑا آتا ۔

قطعہ

(۱) تخت شہی چو از در و یاقوت شد نگار
اقبال گفت کای ز تو گوہر نگار تخت

(۲) بنشین به تخت تا شود استاده خاص و عام
وز یمن این جلوس کند افتخار تخت

(۳) دیہیم و تخت تہنیت تخت گه گفت
آمد به حکم شه چو بدارالقرار تخت

(۴) زان پیشتر که تخت شود تکیه گه او
از بالش جلال گرفت اعتبار تخت

(۵) با تخت تا انیس نگردید مسندش
دیہیم سان نچید گل اشتہار تخت

(۶) در باغ تخت گه که از پایهٔ شکوه
بر چتر ریخت شوکت شاخ چنار تخت

(۷) تمکین ز شاه تخت نشین یافت زان نشد
رقصان بساز کوکبه طاؤس وار تخت

(۸) چترش ز اوج تخت چو گردید نور پاش
چون تاج او نبود دگر شد دو چار تخت

(۹) باد و هو ای تخت که شاه ضامن اند
کز گرد حادثات نه بیند غبار تخت ۱۰

(رسائل طغرا)

جلالاے طباطبائی

[ذیل کی سطور دور شاہجہاں کے ایک ادبی مناقشے سے متعلق ہیں۔ قدسی ۱۰۴۱ھ میں وارد ہند ہوا؛ یہاں اس کے ایک قصیدے پر ملا شیدا نے اعتراضات کیے۔ اسی سلسلے میں یہ مکتوب جلالاے طباطبائی نے شیدا کو لکھا ہے۔ یہ خط اس مناقشے کی قدیم ترین اور مفصل دستاویز ہے۔]

عہد شاہ جہاں کا ایک ادبی مناقشہ

آن کیست که پا کرده سر از روی توجه
این نامه بدان بی سر و بی پا برساند
این شعلهٔ پیچیده که سرزد ز نیِ کلک
تا خرمن آن سوخته کالا برساند
زین سوخته صفرا که بسر ریخت قلم را
یک قطره بہ آن مایهٔ سودا برساند
از تیر شہاب قلم شعله کش ما
سدی بہ مہا دیو مقوی برساند
در پرده سخن چند کنم باد صبا گو
کین نامهٔ بربسته به شیدا[1] برساند[2]

اے محترم جو کوئی اس نکتہ چیں اور دقیقہ رس عقل سے ذرا سا بھی بہرہ مند ہے اس کے تصور کا آئینہ اس حقیقت کی صورت کا عکس پذیر ہے کہ اس دنیا کے وجود میں لانے اور خمیر آدم گوندھنے کا اصلی مقصد اس واحد مطلق اور اس اول اول کی پہچان ہے اور عرض و جوہر کی ایجاد اور جسم و روح کے پیدا کرنے کی غرض و غایت

جز و کل کے مبدع کا ادراک اور گل و خار کے صانع کی شناخت اور پہچان ہے ۔ اور جو کوئی اس شناخت و معرفت میں غور و فکر سے کام نہیں لیتا وہ حیوانیت کی پست زمین سے انسانیت کے بلند مقامات کی اونچائی تک نہیں پہنچ سکتا ۔ ظاہر ہے کہ جو کوئی اپنے نفس کی پہچان سے غافل ہے وہ راہ عرفان و معرفت کیوں کر طے کرے گا اور ادراک کی شاہ راہ پر کس طرح چل سکے گا اور یہ روشن مسلک تو محبوب حقیقی کی طرف لے جانے والے راستوں میں سب سے زیادہ نزدیک ہے ۔ ہمارے اس واضح دعوے پر عقل گواہ اور 'من عرف نفسہ فقد عرف ربہ' کا مضمون شاہد ہے ۔

اس تمہید کے نتیجے کے مطابق یہ طے پایا کہ جس نے خدا کو پہچانا اس نے یقیناً پہلے خود کو پہچانا ہوگا اور جس نے خود کو پہچانا اس نے لازمی طور پر عقل سے بہرۂ وافی حاصل کیا ، اپنے پلڑے کو تولا اور اپنے معاملے کو پوری طرح جانچا ہوگا ۔ اس نے اپنے حساب کی خبر اور اپنے نفس کی خاصیتوں اور خوبیوں سے کما حقہ اطلاع پائی ہوگی ، اپنی قدر و قیمت کو جیسا کہ چاہیے ، مقرر کیا ہوگا ۔ لہٰذا انصاف پسند عقل کے نزدیک اپنی چھوٹی گدڑی کی حدود سے باہر پاؤں پھیلانا ، بے حیائی کی بے پردہ گدڑی سے باہر نکل کر غرور و سرکشی کا ڈھول پیٹنا ، عدم بصارت کے باوصف خود کو دوسرے کی آنکھ سے دیکھنا ، چمگادڑ کی آنکھوں سے آفتاب کی شعاعوں کو گھورنا ، یعنی پلۂ پست کو بزرگوں کی پلہ سازی سے اونچا رکھنا ، اپنے چھوٹے رتبے کو ارباب عالی قدر کے اعلیٰ رتبے کے مقابلے میں برتر سمجھنا ، کٹے ہوئے اور بے انگشت ہاتھ سے سخن آفرینوں کے کلام پر انگلی رکھنا (عیب نکالنا) اور خود کو سخن فہم ، نکتہ چیں اور نکتہ شناس سمجھنا یہ سب کچھ خود نا شناسی کا لازمی نتیجہ ہے جس سے ، خدا نخواستہ ، انسان لازمی طور پر خدا کی معرفت سے دور ہو جاتا ہے ۔

الغرض قلم کی زبان کو اس قدر دکھ دینے ، مکتوب کے چہرے کو اس طرح خراشنے ، دوات کے دل نازک کو یوں کریدنے ،

غور و فکر کی اس تشویش اور تضیع اوقات سے مقصود یہ ہے کہ انھی دنوں جب ایک بے سرا اور بے ڈھنگا ، نغمہ و اسلوب اور لے سے خارج ترانہ خرد کے کانوں تک پہنچا کہ اس بے شرم ننگ ، حمیت (شیدا) نے صورت آدمیت کے پردۂ حفظ کو چہرے سے اٹھاتے ہوئے چند بھونڈے اور بے معنی اعتراضات نظم کی صورت میں لکھ کر انھیں قصیدے کا نام دیا ہے ، یا یوں کہیے کہ کاغذ اور سیاھی پر ظلم کرکے اپنے ناقص زعم میں کہال سخن وری کی داد دی ہے ۔ اور جب میں نے زمانے کے ایک ھرزہ کار عزیز کے عجز و اصرار پر اس بے سروپا مجموعۂ مزخرفات کے دیکھنے اور سننے کو چشم و گوش کے گناھوں کے کفارے کا نام دے کر اس کے سراپا کا بہ غور مطالعہ کیا تو معنی کے سر عزیز اور جان نازنین کی قسم ، اور 'و انہ لقسم لو تعلمون عظیم[۳]' (اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے) کہ اس پا در ھوا مالیخولیا کے ثمرے کو پاؤں سے سر تک تہی مغز احمقوں کے غور و فکر کی مانند بالکل سپاٹ اور اس تمام بے مایہ نمود کو 'بے مقصود' قلم کی تختی کی مانند ھیچ بلکہ ھیچ سے بھی کم تر پایا ۔ ناچار مروت کی شرع کے فتوے اور طریقت انصاف کے حکم کے مطابق میں نے اپنی ھمت کے ذمے یہ واجب و لازم جانا کہ نصیحت کے طور پر ذیل کا پند نامہ اس خود ستا اور خود غرض کو لکھ کر اسے اس کی لغزشوں سے آگاہ کروں ۔

اس کے تمام بے ادبانہ سوالوں کے بارے میں فقط یہی ایک بات کافی ہے کہ ارباب (منطق ؟) کے مطابق تصدیق بلا تصور (منطق کی ایک اصطلاح ، یعنی تصور کے بغیر تصدیق) بے معنی صورت کی حامل ھوتی ہے ۔ الغرض جو سوال درخور جواب ہے وہ یہ ہے کہ 'زھر آلاے' کو ، جو بہ ظاھر 'آلائندۂ زھر' کے معنی دیتا ہے ، 'زھر آلود گشتہ' کے معنوں میں استعمال کیا ہے ۔ سبحان اللہ ! ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ محاورات میں ایسے بہت سے الفاظ ھیں جو اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں کے لیے استعمال ھوتے ھیں ، اور ان سے موقع و محل کے مطابق معنیٰ مقصود لیے جاتے ھیں ۔ اور یہ حقیقت اگرچہ بہت زیادہ واضح ھونے کے سبب کسی مثال کی حاجت مند نہیں ہے ، پھر بھی ہم

ضرورت کے تحت اس جگہ ایک آدھ مثال پیش کرتے ہیں ۔ مثلاً کارساز عالم گیر ، جہان آفرین ، دانش آموز اور عالم سوز ۔ یہ الفاظ جب اسم فاعل کے طور پر استعمال ہوں تو ان کے یہ معنی ہوں گے : سازندۂ کار (کام بنانے والا) ، گیرندۂ عالم (دنیا کو پکڑنے والا) آفرینندۂ جہان (جہان کو پیدا کرنے والا) آموزانندۂ دانش (عقل و دانش سکھانے والا) اور سوزانندۂ عالم (دنیا کو جلانے والا) ۔ اور کبھی اسی طرح بعض موقعوں پر یہی الفاظ دوسری ترکیب کے ساتھ اسم مفعول کے معنی دیتے ہیں ، جیسا کہ کہا جاتا ہے 'فلاں کار خدا ساز شد' یعنی 'ساختۂ خدا شد' (خدا کا بنایا ہوا) اور اسی طرح 'خدا گیر شد' (خدا کا پکڑا ہوا) 'این گلشن خدا آفرین است' (یہ گلشن خدا کا پیدا کیا ہوا ہے) ، 'فلاں پیر آموز است' (فلاں مرشد کا سکھایا ہوا ہے) اور 'فلاں چیز خام سوز شد' وغیرہ تمام اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوئے ہیں ۔ اور 'عبیر آلا' بہ معنی 'عبیر آمودہ شد' (عبیر سے بھرا ہوا ۔ عبیر ایک خوش بو ہے) اس شعر میں استعمال ہوا ہے :

چون آن غنچہ دہن آمد بہ گل‌گشت　عبیر آلای شد بام و در و دشت

(جب وہ غنچہ دہن پھولوں کی سیر کو نکلا تو تمام بام و در اور دشت خوش بو سے بھر گئے ۔)

خاص طور پر لفظ 'زہر آلای' ایک بڑے شاعر کے کلام میں وارد ہوا ہے جہاں اس نے حضرت پیغمبر صلعم کے معجزوں کے سلسلے میں ایک زہر دیے گئے بکری کے بچے کے بولنے کا ذکر کیا ہے :

آن پیمبر کہ برۂ بریان　گفت از من مخور کہ زہر آلاست

(آپ صلعم وہ پیغمبر ہیں کہ جنھیں بھنے ہوئے بکری کے بچے نے کہا کہ آپ (صلعم) میرا گوشت نہ کھائیے کہ یہ زہر آلودہ ہے ۔)

اے مدعی !! کم از کم اتنا تو جاننا چاہیے کہ داناؤں کے قول پر دلیری سے حرف گیری کرنا بے عقلی کی دلیل ، اور بزرگوں کی باتوں میں بلا سوچے سمجھے عیب نکالنا طفلی و نادانی ہے ۔ الہام صفت کلام کہنے والے کلیموں کا ، کہ دوات کی جیب اور قلم کی آستین سے 'ید بیضا'

نکالتے ہیں ، سامری بننا (برابری، کرنا) گوسالگی (پھوھڑ ن ۶) کی دلیل ہے ۔ قدسی انفاس رکھنے والے مسیحا نفس کا ، کہ ایک ہی پھونک سے ہزاروں سالہ مردے کے جسم میں روح پھونک دیتا ہے ، دجال بننا ، گدھے (اشارہ ہے سعدی کے اس شعر کی طرف : شعر

خر عیسیٰ اگر بمکہ رود چون بیاید هنوز خر باشد)

کی یاد دلاتا ہے ۔ اپنی تک بندی پر مغرور ہونا اور اسے قصیدۂ غرہ کا نام دینا ، متشاعری بلکہ بےشعوری ہے ۔

ای خواجه فلاں شاعری آسان نبود هنگامۂ نان مائدۂ جان نبود
چون بر کف آبی که کند باد گزار موجی دارد و لیک عمان نبود

(اے فلاں صاحب شاعری کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ روٹی کا ہنگامہ روح کا دستر خوان نہیں ہوتا ۔ جب ذرا سے پانی پر سے ہوا گزرتی ہے تو اس میں لہر تو پیدا ہوتی ہے لیکن وہ ذرا سا پانی دریا نہیں ہوتا ۔)

پیارے یہ کوئی دھرہ یا دھرپت نہیں ہے کہ اس میں تو موقع و بےموقع تصرف کر سکے اور نہ یہ کوئی سنسکرت یا گوالیاری زبان میں لکھا ہوا نثر کا ٹکڑا ہے کہ جس میں تو پنڈت کی غیر موجودگی کے با وصف کوئی تبدیلی کر سکے ۔ یہ تو فارسی زبان کا دری لہجہ (فارسی کا ایک لہجہ ، عرف عام میں فارسی زبان) ہے جو فارسی زبان دانوں کے مونہوں سے سیکھنا اور سخن دانی کا چراغ ان کے افکار کے فانوس سے روشن کرنا چاہیے ۔ محض لغات کے مطالعے سے فارسی کا زبان داں نہیں بنا جا سکتا اور نہ قدیم اساتذہ کے مجموعہ ہائے کلام کا تتبع کرنے ہی سے اس وادی کے پیش رووں میں شامل ہوا جا سکتا ہے ۔ معلوم ہوتا ہے اس سلسلے میں اس تیرہ نہاد دنیا کے اس سیاہ باطن احمق [۳] کی تقلید کی گئی ہے جس نے اپنی گنواروں والی زبان سے اور اپنے دنیاوی جاہ و مرتبے کے ساتھ استاد سخن اور فن شاعری کے اماموں کے امام مولانا عرفی شیرازی سے یہ کہا تھا کہ ’’ملا! ہم نے تو فارسی زبان انوری و خاقانی سے سیکھی ہے لیکن تم نے مسکین بوڑھی عورتوں سے ۔‘‘

اس احمق نے یہ نہ جانا کہ انوری و خاقانی نے بھی تو انھی بوڑھیوں سے بات کرنا سیکھا۔

قصہ کوتاہ ، ارے بھائی ! میری بات سن اور پھر دوبارہ بحث و گفتگو کی موگری پر نہ چڑھ ، کیوں کہ محض الفاظ اور آواز سے سخن وری کے شہرے کو بلند نہیں کیا جا سکتا ، اور نہ ھی کلاونت کے راگ سے رغبت رکھنے سے مملکت سخن کی سرداری میں سر اٹھایا جا سکتا ھے ۔ آواز کی بلندی سے آوازہ (شہرت) بلند نہیں ھوتا اور نہ نام نامی اور تخلص گرامی ھی سے 'لحن الملکی' کا ڈھول آواز دیتا ھے ۔ عوام کی تحسین سے خود کو خواص میں شمار نہیں کیا جا سکتا اور نہ بے تمیزوں کی آفرین ھی سے عزیزوں سے امتیاز حاصل ھو سکتا ھے ۔ قبول شامہ کا محضر تو 'شہد بمافیہ' سے سند حاصل کرتا ھے اور قابلیت خاص کا نسخہ چوٹی کے صاحبان بلاغت کے صاد سے ، پوری ساکھ کے ساتھ ، خصوصیت پاتا ھے ۔ عوام کی رضا پر اپنے آپ ھی راضی نہ ھونا چاھیے اور اپنا وقت گونگوں کی سی زبان رکھنے والوں کے شکار میں صرف نہ کرنا چاھیے :

چون شکار خوک باشد صید عام رنج بے حد لقمہ زو خوردن حرام

(اگرچہ سور کا شکار عام مل جاتا ھے لیکن اس میں بڑی زحمت اٹھانی پڑتی ھے ، پھر یہ کہ اس کا ایک لقمہ بھی حرام ھوتا ھے ۔)

پوست خانے کے پوستیوں کی ، کہ جو گودے اور چھلکے میں تمیز نہیں کر سکتے ، 'واہ واہ' اور 'سبحان اللہ' پر اپنے آپ کو کسی طرح بھی صاحبان بصیرت میں شمار نہ کرنا چاھیے اور قہوہ خانے کے سیاہ باطنوں کی ، کہ سیاہ اور سفید میں فرق کرنے کی اھلیت نہیں رکھتے ، تحسین و آفریں پر کسی بھی صورت میں وجدان کے شہر بزرگ کا روشناس اور انجمن عرفان کا شناسا نہیں کہلایا جا سکتا ۔

(معاصر حصہ پنجم ، بحوالہ منشورات تمنا)

دارا شکوه

سرّ اکبر کا دیباچہ

درین دریای گوهر خیز نومیدی نمی باشد
غنی شد چون صدف هر کس دهان خود کشود این جا
درین عالم سبک دستی رباید گوی از میدان
که خود را از میان مردم عالم ربود این جا

(اس گوھر خیز دریا میں ناامیدی نہیں ھوتی۔ جس نے بھی یہاں منہ کھولا وہ سیپی کی طرح غنی ھو گیا۔ اس دنیا میں وھی چابک دست سبقت لے جاتا ھے جس نے خود کو دنیا کے لوگوں سے دور رکھا)۔

تعریف ھے اس ذات باری کی کہ تمام آسمانی کتب میں 'بسم اللہ' کی 'ب' کا نقطہ جس کے قدیم بھیدوں میں سے ، اور 'الحمد' کہ قران مجید میں ام الکتاب ھے ، جس کے اسم اعظم کی طرف اشارہ ھے ، اور تمام رشتے ، آسمانی کتب ، انبیا اور اولیا اس 'اسم' میں مندرج ھیں۔

اما بعد! ۱۰۵۰ ھ میں جب کہ یہ فقیر بے اندوہ یعنی محمد دارا شکوہ کشمیر جنت نظیر گیا ھوا تھا ، ذات باری کی کشش اور اس کے بے پناہ فضل و کرم سے کاملوں کے کامل ، عارفوں کے خلاصے ، استادوں کے استاد ، پیروں کے پیر ، پیشواؤں کے پیشوا ، حقیقتوں سے آگاہ اور توحید پرست حضرت ملا شاہ[۱] سلمہ اللہ کی عقیدت و ارادت کی سعادت حاصل ھوئی۔ چوں کہ خاکسار کو ھر قوم و فرقے کے عارفوں سے ملنے اور توحید کی عظیم باتیں سننے کا ذوق و شوق کچھ قدرت کی طرف سے ودیعت ھوا تھا ، اس لیے میں نے تصوف کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کیا اور کئی ایک کتابچے بھی لکھے تھے۔ مگر توحید کی ،

که ایک بے کراں سمندر ہے ، طلب کی پیاس ہر لحظے بڑھتی ہی رہتی تھی اور بڑے بڑے گمھیرے مسئلے جن کا حل سوائے کلام الٰہی اور اس استاد ذات لامتناہی کے کسی اور سے ممکن نہ تھا ، ذہن میں آتے رہتے تھے۔ چوں کہ اس کتاب بزرگ یعنی قران مجید و فرقان حمید میں اکثر باتیں رموز و اشارات میں ہیں ، اور آج ان اشاروں اور رمزوں کو سمجھنے والا کوئی نظر نہیں آتا ، اس لیے جی میں آئی کہ جتنی بھی آسمانی کتب ہیں ان کا مطالعہ کرکے کلام الٰہی سے کہ اپنی تفسیر آپ ہے ، ان مسائل کا حل ، کہ اگر ایک کتاب میں اختصار اور دوسری کتب میں تفصیل سے ہو تو اس تفصیل و اجمال سے ڈھونڈا جائے۔ للہذا توریت ، انجیل ، زبور اور دیگر صحیفوں کا جائزہ لیا ۔

لیکن ان میں توحید کا بیان مجمل اور اشاروں کنایوں سے تھا اور ان کی آسان تفسیروں سے ، جو ارباب غرض نے کی تھیں ، گوہر مقصود هاتھ نہ لگا۔ چناں چہ بندے نے اس بات کا کھوج لگانا شروع کیا کہ آخر ہندوستان کی سرزمین میں کس لیے توحید کی بات بہت زیادہ ہے اور کس وجہ سے ہندوستان کے قدیم لوگوں کے ظاهری اور باطنی علوم توحید کے منکر نہیں اور نہ توحید پرستوں پر ہی معترض ہیں ، بلکہ توحید پرست ان کے نزدیک صاحب اعتبار ہیں ، جب کہ اس کے برعکس اس دور کے جاهل علما کہ جنھوں نے خود کئی علم تراشے ہیں ، خدا شناسوں اور توحید پرستوں کے قتل و آزار اور انکار و تکفیر کے درپے ہو کر توحید کی ان تمام باتوں کو جو قرآن مجید اور صحیح احادیث نبوی (صلعم) سے پورے طور پر واضح و روشن ہیں ، رد کرتے اور راہ خدا کے رہزن بنتے ہیں ۔

ان باتوں کی تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ اس قدیم قوم (ہندو) کے قدیم باشندوں پر ، جن کا سب سے بڑا نبی برها یعنی حضرت آدم صفی اللہ ہے ، تمام آسمانی کتب سے پہلے چار کتب سماوی ـــ رگ وید ، یجر وید ، سام وید اور اتھربن وید تمام احکام کے ساتھ نازل ہوئی تھیں

اور یہ حقیقت انھی کتابوں سے ظاہر ہے ۔ ان چاروں کتابوں کے خلاصے میں جسے اپنشد کہتے ہیں ، سلوک و معرفت کے اسرار اور توحید محض کے اشغال مرقوم ہیں ۔ اس زمانے کے لوگوں نے اس اپنشد کو علیحدہ علیحدہ کر کے اس پر بڑی شرح و تفصیل کے ساتھ تفسیریں لکھی ہیں اور ہمیشہ اسے سب سے اچھی عبادت سمجھتے ہوئے پڑھتے ہیں ۔

اس خودبین جویائے حق (دارا شکوہ) کے دل میں ، کہ جس کی نظر صرف وحدت ذات کی اصل پر تھی نہ کہ عربی ، سریانی ، عراق اور سنسکرت زبان پر ، یہ خواہش پیدا ہوئی کہ ان اپنشدوں کو ، جو توحید کا خزانہ ہیں اور جن کے جاننے سمجھنے والے اس قوم میں بھی کم رہ گئے ہیں ، لفظ بہ لفظ سیدھی سادی عبارت میں کسی کمی بیشی اور نفسانی غرض کے بغیر فارسی زبان میں ڈھال کر سمجھوں اور یہ دیکھوں کہ اس قوم میں ، جسے اہل اسلام اس قدر پوشیدہ و پنہاں رکھتے ہیں ، کیا بھید ہے۔ (بزم تیموریہ میں 'سمجھوں' سے بعد کا ترجمہ اس طرح ہے' کہ یہ جماعت اس کو اہل اسلام سے پوشیدہ اور پنہاں رکھتی ہے ، اس کا کیا بھید ، ہے (صفحہ ۴۰۴) یہ غالباً متن میں اختلاف کے سبب ہے) ۔

ان دنوں جب کہ بنارس کا علاقہ ، جو اس قوم کا دارالعلم ہے ، اس حق جو کے تحت تھا ، بندے نے پنڈتوں اور سنیاسیوں کو جو زمانے کے برگزیدہ اور وید اور اپنشدوں کے عالم تھے ، ۱۰۶۷ھ میں اکٹھا کر کے خود توحید کے وید کے اس خلاصے کا جو اپنشد یعنی اسرار پوشیدہ اور تمام اولیاء اللہ کے مطالب کی انتہا ہے ، بے غرض ہو کر ترجمہ کیا ۔

چناں چہ بندہ جس جس مشکل اور اعلیٰ بات کے حل کا طالب تھا اور جو تلاش کے باوجود نہ ملتا تھا وہ اس قدیم کتاب سے مل گیا ، جو بے شک و شبہ سب سے پہلی آسمانی کتاب اور بحر تحقیق کا سرچشمہ اور قرآن مجید کے مطابق ہے بلکہ اس کی تفسیر ہے ۔ اس خلاصے سے واضح و روشن ہوتا ہے کہ یہ آیت بعینہ اس قدیم کتاب کے حق میں ہے : ''انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون لایمسہ الا المطہرون؟ تنزیل من رب العالمین ۔'' یعنی '' قرآن کریم کتاب میں ہے اور وہ کتاب پوشیدہ

ہے اور اس کا ادراک سوائے پاکیزہ دل کے اور کسی کو نہیں ہو سکتا ، (یہ کتاب) دنیا اور اہل دنیا کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوئی ۔''

اس سے پتا چلتا ہے کہ یہ آیت زبور ، توریت اور انجیل کے بارے میں نہیں ہے ، بلکہ لفظ 'تنزیل' سے ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہ آیت 'لوح محفوظ' کے متعلق بھی نہیں ہے ۔ چوں کہ آپنشد ، کہ پوشیدہ اسرار ہیں ، اس کتاب کی اصل ہیں اور قرآن مجید کی آیات بعینہ ان میں ملتی ہیں ، لہذا یہ ثابت ہوا کہ 'کتاب مکنون' سے مراد یہی کتاب قدیم ہے ——— اور اس سے اس فقیر نے ناقابل فہم اور ناقابل ادراک باتیں سمجھیں اور جانیں ۔ اس (ترجمہ) سے سوائے اس کے کہ اپنی ذات ، اپنی اولاد ، اپنے دوست اور طالبان حق مستفید ہوں ، اور کوئی مقصد و مطلب نہ تھا ۔ جس سعادت مند نے بھی نفسانی خواہشات کو ایک طرف رکھ کر محض خدا کی رضا کے لیے ، تعصب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ، اس ترجمے کو جس کا نام 'سر اکبر' رکھا گیا ہے ، کلام الہٰی کا ترجمہ سمجھ کر پڑھا اور سمجھا ، وہ تمام رنج و الم سے فارغ اور منصور و نجات یافتہ ہوگا ۔

(سر اکبر بہرۂ چہارم از کلیات دارا شکوہ)

———

اورنگ زیب عالمگیر

[اورنگ زیب عالمگیر (متوفی ۱۷۰۷ع) مغلیہ خاندان کا آخری بڑا فرماں روا ، دور اکبری کے مذہبی رجحانات اور آزاد خیالی کا سخت مخالف تھا ۔ دارا شکوہ کی پیدا کردہ غیر اسلامی فضا کو ناپسند کرتا تھا ۔ رقعات اور احکام عالمگیری کا مصنف ہے جس میں آزاد کے قول کے مطابق ''تمام انتظامی ہدایتیں اور اخلاق نصیحتیں ہیں کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں ۔ اس کی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دوں تو مضائقہ نہیں ۔ اتنا فرق ہوگا کہ گلستان کے خیالی مضامین ہیں اور اس کے حالی ۔ عبارت اس کی جتنی پڑھنے میں سہل ہے اتنی ہی لکھنے میں دشوار ۔'' (سخن دان فارس)]

رقعہ ۹

فرزند ارجمند محمد معظم[۱] !

خدا تمہیں محفوظ و سلامت رکھے ! ایک عزیز کے خط سے معلوم ہوا کہ فرزند دل بند بسنتی پگڑی اور زرد رنگ کا لباس پہن کر دربار میں بیٹھتا ہے ۔ سن شریف چھیالیس کا ہو چکا ہے ، اس پر بھی یہ چاؤ چونچلے تو بوڑھی گھوڑی لال لگام والی بات ہے ۔

رقعہ ۱۲

فرزند سعادت مند !

میرے عالی جاہ اعلیٰ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ شکار بیکاروں کا کام ہے ۔ انسان اگر آخرت کے معاملات میں مشغول نہیں ہو سکتا تو دنیوی امور کے سر انجام دینے میں کیا قباحت ہے کہ ''الدنیا مزرعۃ الاخرۃ'' (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) واقع ہوئی ہے ۔

آں حضرت (شاہ جہاں) رات کے پچھلے پہر بہ نفس نفیس اپنی خواب گاہ سے نکلتے اور آبشار توفیق سے وضو کر کے تسبیح و وظیفہ میں مشغول ہوجاتے۔ پھر صبح صادق سے پہلے نماز کی اذان کے بعد فاضلوں کی جماعت کے ساتھ نماز ادا کرکے جھروکۂ درشن میں تشریف لے آتے اور درشنیوں (دیدار کرنے والے) کو اپنے 'فیض آثار' دیدار کی سعادت سے نوازتے۔ جب چار پہر دن نکل آتا تو دیوان عام فرماتے۔ اس مجلس میں تمام چھوٹے اور بڑے منصب دار بار پاتے۔ دیوان اعلیٰ اور میر منشی آپ کے حضور میں اہل خدمات کی تجویز اور صوبوں کے ناظموں، فوج داروں، امانت داروں اور کروڑیوں کی قابل ستایش کوششوں اور جاں فشانی کے متعلق عرض کرتے۔ آں جناب ہر کسی کا دامن امید گوہرمقصود سے بھر کر دوسروں کی محبت و دل جوئی فرماتے اور شاہی ہاتھیوں اور گھوڑوں کی تعداد کے ملاحظے کے بعد ایک پہر دو گھڑی دن گزرنے پر دیوان عام سے دیوان خاص میں رونق افروز ہوتے جہاں بڑے بڑے بخشی[۲] خدمت اقدس میں منصبوں پر نئے نئے سرفراز ہونے والوں کے احوال عرض کر کے 'عرض مکرر' اور 'نظرثانی' کا حکم حاصل کرتے اور ہر صوبے کے واقعات و سانحات کا انتخاب گوش گزار کر کے ہر معاملے کے حسب حال صادر کیے گئے احکام و فرامین کو حکم ناطق کے طور پر قبول کرتے۔

تقریباً دوپہر تک یہ معاملات درپیش رہتے؛ اس کے بعد کھانا کھانے کی طرف متوجہ ہوتے جو کہ بڑی تاکید کے ساتھ حلال کی روزی سے تیار کیا جاتا تھا۔ کھانا صرف اس قدر نوش فرماتے جس سے بدن میں چلنے پھرنے، عبادت کرنے اور عدالت لگانے کی قوت و طاقت برقرار رہے۔ پھر وظیفہ خواروں اور راتب داروں کے متعلق، کہ جو اکثر علما، فضلا، مسکین، یتیم، بےکس اور بیمار ہوتے، اور ان میں سے بیشتر آپ کی 'کیمیا اثر' نظر میں جانے پہچانے ہوتے تھے، استفسار کرکے اپنی خاص خواب گاہ میں تشریف لے جاتے۔ ایک آدھ گھنٹہ دل بیدار کے ساتھ آرام فرماتے۔ جب چار پہر دوگھڑی دن گزر جاتا تو آپ خواب گاہ سے باہر آ کر وضو فرماتے اور پھر 'نماز خانے' میں قرآن کریم کی تلاوت میں مصروف ہو جاتے۔

نماز ظہر پڑھنے کے بعد ہاتھ میں تسبیح لیے ورد اوراد کرتے برج اسد میں آ کر بیٹھ جاتے۔ دیوان اعلی[۳] اس جگہ حاضر ہو کر مالی و ملکی معاملات عرض کر کے بہت سے کاغذات پر آپ کے روشن دستخط کراتا۔ چار گھڑی دن رہنے پر آپ پھر دیوان عام فرماتے۔ اس وقت دیوان تن[۳] کا بخشی تازہ منصب پانے والوں اور طالبان جاگیر کو حضرت کی نظر انور کے سامنے پیش کرتا۔ آں حضرت ہر کسی کے حسب نسب، ذاتی کمالات اور ہنرمندی کے بارے میں پوچھ گچھ کر کے تشخیص منصب اور تنخواہ جاگیر کے لیے حکم فرماتے۔

شام کے بعد دیوان عام سے اٹھتے اور نماز مغرب ادا کر کے خلوت کدۂ خاص میں تشریف لے جاتے، جہاں بڑے بڑے شیریں زبان مؤرخ، فصیح بیان قصہ خواں، خوش الحان قوال اور جہاں گرد سیاح حاضر ہوتے۔ پردہ کے اندر عورتیں اور باہر مرد ہوتے۔ ہر کوئی حضرت کی طبع بلند و مبارک کی رغبت کے مطابق پرانے بزرگوں اور بادشاہوں کے حالات اور مختلف ملکوں اور شہروں کے عجیب و غریب واقعات و حادثات بیان کرتا۔ مختصر یہ کہ آں حضرت نصف شب تک اپنے دن رات کے اوقات کو اس طرح تقسیم فرما کر زندگانی و حکمرانی کا صحیح استعمال فرماتے۔

چونکہ اس قرۃالعین کے حق میں ہماری شفقت پدری خلوص پر مبنی ہے نہ کہ کھوٹ پر، اس لیے ہم اس چیز کے بارے میں جو اچھی اور اس فرزند ارجمند کے لیے زیبا ہو، لکھنے اور آگاہ کرنے میں بے اختیار ہیں۔ اس وقت ہمیں جو کچھ یاد آیا اسے سپرد قلم کر دیا ہے۔ معاف فرمائیں۔

رقعہ ۱۵

فرزند عالی جاہ!

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس لخت جگر کا دیوان خاص مصطفی قلی بیگ معاملات کو بڑی فہم و فراست سے سرانجام دے رہا ہے۔ یہ غنیمت ہے۔ اگر آپ لکھیں تو اس کے منصب میں اضافے کے ساتھ اسے خانی کا خطاب بھی دے دیا جائے گا۔ وہ کھرے سونے کی مانند بہت اچھا انسان ہے۔

بیت

آنچه برجستیم و کم دیدیم بسیار است و نیست
نیست جز انسان درین عالم که بسیار است و نیست

(جو کچھ ہم نے تلاش کیا اور کم دیکھا وہ بہت زیادہ ہے اور نہیں ہے ۔ اس دنیا میں سوائے انسان کے کوئی چیز نہیں ہے کہ بہت زیادہ ہے اور نہیں ہے ۔)

ایک روز سعد اللہ خاں مرحوم نے ورد اوراد کرنے کے بعد کافی دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رکھے ؛ کسی گستاخ ندیم نے پوچھا کہ ''اب کون سی آرزو باقی رہ گئی ہے ؟'' جواب دیا ''ایک اچھے انسان کی ۔'' اس نے واقعی بڑے پتے کی بات کہی ہے ۔ اگرچہ دیانت اور امانت کا جوہر انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے ، البتہ جسے وہ (حق تعالیٰ) اس سے فیض یاب کرے ، لیکن اس میں آقا کی ہمت و انصاف کو بھی دخل ہے کہ وہ اپنے نوکر کو خوش حال اور اسے اس کے حال کے مطابق فکر معاش سے فارغ البال رکھے ، تاکہ دنیاوی ضرورتیں اس کے ایمان کو ڈانواں ڈول نہ کر دیں : ع

که مزدور خوش دل کند کار بیش

رقعہ ۲۹

فرزند عالی جاہ! اگرچہ ہمارا جوان فرزند اپنے بوڑھے باپ کا مشتاق نہیں ہے لیکن یہ بوڑھا باپ اپنے جوان لخت جگر کا بے حد مشتاق ہے : ع

بیا و از دل ما کوه های غم بردار

(آ اور ہمارے دل سے غم کے پہاڑوں کو اٹھا ۔)

رقعہ ۳۶

امان اللہ بیگ اور بہادر بیگ شروانی اگر اس نور چشم سے دوری اختیار کرتے ہیں تو وہ بہ ظاہر اس کام کو سر انجام دے سکتے ہیں ۔ دیانت داری اور حالات سے آگاہیِ ملکی و مالی معاملات کی تنظیم و ترتیب

کا جزو اعظم ہے ۔ مطلب پرست بگاڑنے والے تو بہت ہیں لیکن اعلیٰ کردار کے مالک اور راست گو مفقود ہیں ۔ حضرت عرش آشیانی کے خدام چوں کہ بہت اچھے تھے اسی لیے وہ مسلسل فتوحات حاصل کرتے اور کثرت سے مہات سرانجام دیتے تھے ۔ ادھر اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) کے زمانے میں بڑے بڑے نام ور جاں نثاروں ، تجربہ کار حکام اور صاحب ہوش دفتر داروں کی کثرت تھی ، لیکن پھر بھی آپ کی ذات قدسی صفات تمام معاملات کے بست و کشاد میں ذاتی دل چسپی اور ظاہری و باطنی توجہ فرماتی ۔ ہمیں یاد ہے کہ جب اعلیٰ حضرت نے مراد بخش کو ولایت قدیم کی تسخیر کے لیے بلخ روانہ کیا تو اس وقت دیوان فوج درکار تھا ۔ چناں چہ جب یہ تجویز پیش ہوئی تو اسی وقت بیس آدمی جن میں سے کچھ تو پہلے ہی کام کر رہے تھے اور کچھ بے کار تھے ، مہیا ہو گئے ۔ لیکن آج جب کہ ہمیں دیوانیٔ بنگالہ کے لیے ایک ایسا آدمی درکار ہے جو راست گفتاری اور کارشناسی کے زیور سے آراستہ ہو ، تو وہ ڈھونڈھے سے نہیں مل رہا ۔ کارشناس مرد کی کم یابی قابل صد افسوس ہے ۔

رقعہ ۴۵

فرزند عالی جاہ !

ذیل کا واقعہ ہم نے ایک معتبر شخص کی زبانی سنا تھا ؛ اب ہم اسے تحریر کا جامہ پہنا کر آپ کی طرف روانہ کر رہے ہیں تا کہ آپ کے کان بھی اس سے آشنا ہو جائیں ۔

ایک دن اعلیٰ حضرت نے علی مردان خاں[۵] اور سعداللہ خاں کو اپنی خلوت خاص میں شرف ملاقات بخشا ۔ گفتگو کے دوران میں آپ نے اپنی گوہر فشاں زبان سے فرمایا کہ ”ملک و مال کا بست و کشاد عقل و انصاف پر منحصر ہے ۔ نعوذ باللہ اگر بے عقل بادشاہ مرتبۂ خلافت پر فائز ہو جائے اور سلطنت کا کام بے تدبیر امرا و وزرا کے سپرد کر دے تو یقیناً مملکت کے نظم و نسق میں بہت بڑی خرابی واقع ہوگی ۔ رعایا کی پریشانی اور عوام کی بے سامانی کے سبب ملک تباہی و ویرانی اور کم حاصلی کا شکار ہوگا ۔

آپ (یعنی علی مردان وغیرہ) کی ملاقات (خدا آپ کے لیے کافی ہو!) چوں کہ درویشوں اور صالحین سے رہتی ہے ، اس لیے پانچوں وقت نماز کے بعد ہمارے لیے دعا مانگتے رہا کریں کہ ہماری سلطنت کی رونق و عظمت میں کمی واقع نہ ہو اور کوئی بھی ہمارے بارے میں برے الفاظ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بھی فرماں روا بنے وہ توفیقات خیر سے کام یاب و کامران ہو ۔

بعض اوقات ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ بڑے ولی عہد (شہزادہ دارا شکوہ[6]) کے پاس اگرچہ شان و شوکت ، تجمل اور دبدبے کے تمام سامان موجود ہیں لیکن وہ نیک لوگوں کا تو دشمن اور بروں کا دوست واقع ہوا ہے : ع

با بداں نیک و بد بہ نیکاں است

شہزادہ شجاع[7] میں سوائے سیر چشمی و قناعت کے اور کوئی خوبی نہیں ۔ مراد بخش[8] ہے تو وہ مجہول الکیفیت ، شراب و کباب کا رسیا اور ہر وقت نشے میں دھت رہتا ہے ، مگر فلانی (یعنی یہ عاجز فانی ، اورنگ زیب) بڑا صاحب عزم اور دور اندیش معلوم ہوتا ہے ۔ یقین غالب ہے کہ وہ حکومت کے بہت بڑے فریضے سے بہ خوبی عہدہ برآ ہو سکے گا ۔'' اس پر سعداللہ خان نے مولانا روم کا یہ مصرع پڑھا : ع

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست[9]

(پھر اعلیٰ حضرت نے فرمایا) ''دیکھیں وہ کسے عزیز رکھتا اور کس کی جانب مائل ہوتا ہے ۔'' (رقعات عالم گیری)

عالم گیر کا وصیت نامہ

الحمدللہ والصلواۃ علی عبادہ الذین اصطفیٰ! (تعریف ہے اس پاک ذات کی اور درود اس کے برگزیدہ بندوں پر!) ۔ چند وصیتیں کرتا ہوں :

اول : یہ کہ اس عاصی گناہ گار کی تکفین و تدفین پاک و مقدس حسینیہ (امام باڑہ) کی قربت میں کی جائے ، کیوں کہ بحر عصیاں میں ڈوبے ہوؤں کے لیے اس رحم و بخشش کی بارگاہ میں التجا کرنے کے سوا

اور کوئی پناہ نہیں ہے ۔ اس عظیم سعادت کا ساز و سامان فرزند ارجمند شہزادہ عالی جاہ کے پاس ہے ، ان سے لیا جائے ۔

دوسری : ٹوپیاں سینے کی اجرت ، چار روپے دو آنے ، آیہ بیگہ محل دار کے پاس ہے ؛ اس سے وصول کرکے اس عاجز کے کفن پر خرچ کریں ۔ اور کتابت قرآن کی اجرت ، ۳۰۵ روپے ، 'صرف خاص' میں ہے ، وہ میری وفات کے دن فقیروں اور درویشوں میں بانٹ دی جائے ۔ چوں کہ قرآن کی کتابت سے کمایا ہوا پیسہ شیعوں کے نزدیک حرام ہے (اس کا خرچ کرنا) اس لیے اسے میرے کفن پر خرچ نہ کیا جائے ۔

تیسری : باقی ضرورتیں شاہزادۂ عالی جاہ کے وکیل سے پوری کی جائیں ، کہ اولاد میں قریبی وارث وہ ہیں اور حلال و حرام کی ذمہ داری ان پر عاید ہوتی ہے ۔ یہ عاجز ہر قسم کی باز پرس سے بری ہوگا کیوں کہ مردہ زندہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے ۔

چوتھی : اس وادیٔ گمراہی کے آوارہ کو ننگے سر دفن کریں کیوں کہ ہر تباہ حال گنہ گار کو اس سلطان سلاطین کے پاس ننگے سر لے جاتے ہیں ، اور اس حالت میں لے جانا یقیناً بخشش کا موجب ہوگا ۔

پانچویں : میرے تابوت کے صندوق کے اوپر موٹا سفید کپڑا جسے گزی کہتے ہیں ، ڈالا جائے ۔ شامیانے اور گویوں اور میلاد کی بدعت سے پرہیز کیا جائے ۔

چھٹی : فرماں روائے ملک پر یہ لازم ہے کہ ان بے یار و مددگار خانہ زادوں (غلاموں) کے ساتھ ، کہ جنھوں نے اس بے ننگ و عار گنہ گار کے ہمراہ دشت و صحرا کی خاک چھانی ہے ، رعایت کرے اور صلح و آشتی سے پیش آئے ۔ اور اگر ان سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو عفو جمیل اور عظیم در گزر سے کام لے ۔

ساتویں : پیش کار کے عہدے پر بلکہ جنگ میں بھی کام کرنے کے لیے ایرانیوں سے بہتر اور کوئی نہیں ہے ۔ حضرت جنت آشیانی کے عہد سے لے کر اس وقت تک ان لوگوں میں سے کسی نے بھی لڑائی میں

پیٹھ نہیں دکھائی اور نہ ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش ھی آئی ھے۔ اس کے علاوہ کبھی بھی انھوں نے خود سری یا نمک حرامی کا مظاھرہ نہیں کیا۔ لیکن چوں کہ یہ لوگ عزت کے بہت بھوکے ھوتے ھیں اس لیے ان کے ساتھ نبھانا ذرا مشکل کام ھے۔ بہر حال نباہ کرنا چاھیے اور مشکل امور انھیں سونپنے چاھئیں۔

آٹھویں: تورانی لوگ جانے ھوئے سپاھی ھیں؛ شب خون مارنے، لوٹ مار اور گرفتاریاں کرنے میں ماھر ھیں؛ عین جنگ میں واپس مڑنے سے، کہ جسے 'تیز بازکشی' کہتے ھیں، کسی قسم کا خوف و ھراس اور شرم محسوس نہیں کرتے، اور اھل ھند کے اس جہل مرکب سے کہ 'سر جائے تو جائے جگہ نہ جائے' کوسوں دور ھیں۔ اس گروہ کے ساتھ ھر حال میں رعایت کرنی چاھیے کہ یہ لوگ اکثر ایسی جگہوں پر کام آتے ھیں جہاں کوئی دوسرا کام نہیں آسکتا۔

نویں: بارھہ کے سادات لازم السادات کے ساتھ آیت ''وات ذالقربی حقہ'' کے مطابق سلوک کرنا اور ان کے احترام اور رعایت میں کسی قسم کی فروگزاشت نہ کرنی چاھیے۔ چوں کہ آیت کریمہ ''قل لااسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربی'' کے بہ موجب اس جماعت کی محبت نبوت سے محبت کے مصداق ھے، اس لیے اس میں ھرگز کوتاھی نہ کرنی چاھیے کہ یہ دنیا و آخرت میں باعث خیر و برکت ھے۔ لیکن سادات بارھہ[۱۰] کے سلسلے میں پوری پوری احتیاط روا رکھنی چاھیے۔ ان کی محبت باطنی میں تو کوئی کمی نہ واقع ھونی چاھیے، مگر اس کے ساتھ ھی بہ حسب ظاھر ان کا مرتبہ و درجہ نہ بڑھانا چاھیے، کیوں کہ یہ لوگ نہ صرف شریک غالب ھیں بلکہ طالب ملک بھی ھیں۔ اگر لگام کو ذرا سی بھی ڈھیل دی گئی تو خفت و ندامت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دسویں: جہاں تک ممکن ھو والیٔ مملکت سلطنت کے مختلف حصوں کا دورہ کرتے رھنے سے نہ ھچکچائے اور ایک جگہ بیٹھ رھنے سے پرھیز کرے کہ بہ ظاھر تو یہ باعث آرام ھے لیکن در حقیقت ھزاروں مصیبت و آلام کا سبب ھے۔

گیارھویں : اپنے بیٹوں پر ھرگز اعتماد نہ کرے اور زندگی بھر ان کے ساتھ ھم مجلسی کا طریقہ اختیار نہ کرے ، کیوں کہ اگر اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) دارا شکوہ کے ساتھ اچھا برتاؤ نہ کرتے تو معاملہ یہاں تک نہ پہنچتا ۔ اور 'الملک عقیمہ' (سلطنت بانجھ عورت کی مانند ھے) کے الفاظ ھمیشہ مد نظر رکھنے چاھئیں ۔

بارھویں : سلطنت کا سب سے اھم رکن ملکی خبروں سے آگاھی رکھنا ھے ۔ اس سلسلے میں ایک لحظے کی غفلت بیسیوں سالوں کی پشیمانی کا باعث بنتی ھے ۔ چناں چہ معتوب سیوا جی[۱۱] کا فرار اسی غفلت کے سبب وقوع پزیر ھوا ، اور آخری عمر تک اسی سرگردانی کا سامنا کرنا پڑا ۔

مبارک اثناء عشر (بارہ امام) کے مطابق بارہ وصیتوں پر اختتام کیا گیا : **شعر**

اگر دریافتی بـــر دانشت بـــوس　　　وگر غافل شدی افسوس افسوس

(اگر تو سمجھ گیا تو تیری عقل پر بوسہ ، اور اگر غافل ھو گیا تو افسوس ۔) (احکام عالم گیری)

(۲)

زین آبادی کے متعلق

زین کا معاملہ اس طرح وقوع پزیر ھوا کہ جن دنوں حضرت (عالم گیر) دکن کے صوبہ دار مقرر ھو کر اس مبارک بنیاد سرزمین کی طرف روانہ ھوئے ، اور اثنائے راہ میں برھان پور پہنچے تو سیف خاں[۱۲] کی دعوت پر ، جو وھاں کا گورنر تھا ، اور حضرت کی خالہ یعنی آصف خاں[۱۳] کی لڑکی صالحہ بانو اس کے عقد میں تھی ، اس سے ملنے کے لیے گئے ۔ اس خیال سے کہ یہ آپ کی خالہ کا گھر ھے ، محل کی عورتوں کو ایک طرف رکھنے میں چنداں احتیاط نہ برتی گئی ۔ حضرت بے خبر محل میں داخل ھو گئے ۔ زین آبادی جس کا نام ھیرا بائی تھا ، ایک درخت کے نیچے کھڑی دائیں ھاتھ میں اس کی شاخ پکڑے کچھ

گنگنا رہی تھی ۔ آپ اسے دیکھتے ہی بے اختیار ہو کر وہیں بیٹھ گئے ؛ اس کے بعد زمین پر لیٹ کر غش کھا گئے ۔ خالہ کو پتا چلا تو وہ ننگے پاؤں سینہ پیٹتی اور نالہ و زاری کرتی ہوئی بھاگی آئیں ۔ کوئی تین چار گھڑی کے بعد آپ کو افاقہ ہوا ۔

ہرچند خالہ نے اس کے بارے میں پوچھا کہ کیا تکلیف تھی اور آیا اس سے پہلے بھی کبھی اس مرض کا دورہ پڑا تھا ، لیکن آپ نے کوئی جواب نہ دیا اور مکمل سکوت اختیار کیے رکھا ۔ ضیافت و دعوت کی خوشی ماتم و سوگواری میں تبدیل ہو گئی ۔ کوئی آدھی رات کے قریب آپ نے زبان کھولی اور فرمایا ''اگر میں اپنی تکلیف بیان کروں تو کیا آپ اس کا علاج کر سکتے ہیں ؟'' خالہ نے جب یہ الفاظ سنے تو خوشی سے اچھل پڑیں اور صدقے قربان ہو کر کہنے لگیں ''علاج کیا چیز ہے ، میں جان قربان کروں گی ۔'' اس پر آپ نے ساری حقیقت تفصیل سے کہہ سنائی ۔

خالہ نے جب یہ داستان سنی تو ان کے ہوش اڑ گئے اور زبان بند ہو گئی کہ اس کا کیا جواب دیں ۔ آخر حضرت نے فرمایا کہ ''آپ یونہی احوال پرسی میں اتنی منت ساجت کر رہی تھیں ؛ جب آپ میری بات کا جواب نہیں دیتیں تو پھر علاج کیا کریں گی ؟'' خالہ بولیں ''میں واری ! تم اس بدبخت یعنی سیف خاں کو جانتے ہو کہ وہ بڑا ظالم ہے ۔ اسے تمھاری اور شاہ جہاں کی قطعاً پروا نہیں ہے ۔ وہ یہ بات سنتے ہی پہلے تو مجھے اور پھر اسے (زین) مار ڈالے گا ۔ بات کرنے کا فائدہ اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ میں اپنی جان قربان کر دوں ، لیکن اس بے چاری ، بے قصور کو کیوں جان سے مارا جائے ۔'' آپ بولے '' بات تو بالکل ٹھیک ہے ، اب کچھ اور ہی طریقہ سوچتا ہوں ۔''

سورج طلوع ہونے کے بعد گھر آ گئے اور کھانے کو بالکل ہاتھ نہ لگایا ۔ مرشد قلی خاں۱۴ کو جو دیوان دکن میں تعینات تھا ، طلب کیا ، اور اس کے ساتھ خاص رازداری ہونے کے سبب اسے تمام واقعہ بہ تفصیل کہہ سنایا ۔ اس نے عرض کی کہ ''پہلے میں اس (سیف خاں) کا

جھگڑا چکاتا ہوں ؛ اس کے بعد اگر کوئی ہمیں مار دے تو کوئی مضایقہ نہیں کہ ہمارے خون کے عوض پیر و مرشد کا کام تو بن جائے گا۔'' فرمایا ''درحقیقت مجھے تمھاری جاں نثاری سے یہی توقع ہے ، لیکن جی نہیں چاہتا کہ خالہ رانڈ ہو جائے۔ پھر یہ بھی تو ہے کہ شریعت کی رو سے فقیہ شرع قتل عمد کا اقدام کرنے پر قادر نہیں ہے۔ البتہ اللہ پر بھروسا کرکے (سیف خان سے) بات کر دیکھنی چاہیے۔''

مرشد قلی خان بلا حیل و حجت روانہ ہوگیا اور خان مذکور کو تمام واقعے سے آگاہ کیا۔ سیف خان نے عرض کی کہ ''انھیں میرا مؤدبانہ سلام کہنا اور یہ کہ اس کا جواب میں ان کے گھر پر دوں گا۔'' بعد میں اندر جا کر کہنے لگا ''کیا مضائقہ ہے ! مجھے شاہ نواز خاں کی دختر ، بیگم سے کوئی واسطہ نہیں ہے ، آپ اپنی حرم خاص چتر بائی کو بھیج دیں تاکہ عوض و بدل ہو جائے۔'' پھر اسی وقت خالہ کو سوار کرکے بھیجا۔ ہر چند وہ لیت و لعل کرتی رہیں کہ میں نہیں جاؤں گی ، وہ نہ مانا اور کہنے لگا ''اگر اپنی جان کی امان چاہتی ہو تو فوراً جاؤ۔'' وہ مجبور ہو کر آئیں اور ساری تفصیل بیان کی۔ آپ بے حد محظوظ ہوئے اور فرمایا ''ایک کی کیا بات ہے ، آپ دونوں کو اپنے ہم راہ اسی وقت اور اسی پالکی میں جس میں آپ آئی ہیں لے جائیں ؛ مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔'' خالہ نے خواجہ سرا کے ہاتھ تمام حقیقت کہلا بھیجی۔ سیف خان نے یہ کہتے ہوئے کہ اب حجت نہیں رہی ، بائی کو سوار کر کے بلا توقف آپ کے پاس بھیج دیا۔ (احکام عالم گیری)

عبد القادر بیدل

[دور شاہ جہان میں پیدا ہوا ؛ اورنگ زیب کا زمانہ دیکھا اور محمد شاہ کے دور (۱۷۲۰ع) میں انتقال کیا ۔ نظام الملک اور میر شکراللہ کا پروردہ تھا ۔ شاعر کے علاوہ نثرنگار بھی تھا]

عہد عالم گیر کے واقعات

جن دنوں عالم گیر بادشاہ تسخیر دکن میں مصروف تھا اور بے کسی کی برق اطراف ہند پر گر رہی تھی ، دہلی اور آگرے کے گرد و نواح کے لوگ ، حکام کی نا اہلی اور سستی کے سبب ، اطاعت و فرمان پزیری سے منہ موڑ چکے تھے اور جگہ جگہ اپنا قبضہ و تسلط اور حکومت جتانے کے لیے ایک طوفان بے تمیزی برپا کر رکھا تھا ۔ متھرا کے گرد و نواح کے اکثر پرگنے انھوں نے ظلم و ستم سے ہتھیا لیے اور راستوں اور گزرگاہوں پر لوٹ مار کرکے خود سری اور بے باکی کا علم بلند کر رہے تھے ۔ شرفا کی عزت و ناموس ، اسیری اور بے حرمتی کی رسوائیوں کا شکار ہورہی تھی ۔ بڑے بڑوں کی آبرو ذلت و خواری کی خاک میں مل رہی تھی ۔ کفار کے ظلم و بیداد کے سوا کسی دوسرے داد گر کا تصور بھی ممکن نہ تھا ۔ اور فریاد کی 'صورت' صرف بہرے کانوں کے آئینوں کو مجلا کرتی (یعنی کوئی فریاد سننے والا نہ تھا) ۔

ادھر دکن سے ہر روز ایک نیا حاکم متعین ہو کر آتا اور پیشتر اس کے کہ وہ ہندوستان پہنچے وہ کہنگی (پرانا پن) کی شرمندگی اٹھا چکا ہوتا ۔ جب تک وہ فتح مند جھنڈوں کے ماہچہ[1] کے ساتھ اس سر زمین علم میں در آئے وہ سرنگونی ہلال کی سی کاہش کا شکار ہوچکا

اور جب تک لشکر ظفر کے علم اس جگہ گردن بلند کریں وہ غبار کی مانند اعتبار کے سر سے اٹھ چکا ہوتا (یعنی اس کی ساکھ نہ رہتی تھی)۔ تدبیر کی کھیتی کی آبیاری میں مکر و حیلہ کے مور و ملخ کے حملے کے سبب نشو و نما پیدا کرنے کی قوت زائل ہو چکی تھی - اور شرائط رفتار کی پاس داری (حفاظت) 'بےحفاظتی' کے خارستان میں سوائے 'خراش' کے اور کسی چیز سے دامن احتیاط نہیں بھرتی تھی -

نظم

الحذر زان فتنۂ کز طبع مردم گل کند
اتفاق این غبار از برق هم سوزان ترست
از هجوم عاجزان غافل نباید زیستن
مور مسکین هر کجا جوشید باهم ، اژدرست
امتیاز نیک و بد محوست در جوش عوام
چون بلند افتاد آتش خشک و تر خاکسترست

(بچو اس فتنے سے جو لوگوں کی طبیعت سے پیدا ہو رہا ہے۔اس غبار کا اتفاق بجلی سے بھی زیادہ جلا دینے والا ہے) -

(عاجز لوگوں کے حلے سے غافل نہ رہنا چاہیے ، کیوں کہ چیونٹیاں بھی جب اکھٹی ہو کر جوش میں آتی ہیں تو وہ اژدھا بن جاتی ہیں) -

(عوام کے طوفان میں نیک و بد کی تمیز جاتی رہتی ہے - جب آگ بلند ہوتی ہے تو خشک و تر سب کو خاکستر بنا دیتی ہے') -

مکانات پورے طور پر خانۂ شطرنج کی مانند اقامت کے محلوں کا سر کوٹنے والے اور بازار یکساں طور پر میدان قیامت کی طرح اجناس ندامت کا غبار اٹھانے والے بنے ہوئے تھے - نیزے اور تیر کی راستی (سیدھا ہونا) کو راستوں کی آفات کی ہمواری میں جان کاہی کی قسم کھانی پڑتی اور توپ و تفنگ کی ضربات کو کوچوں کے شور نا ایمنی میں سکھ کی سانس سمجھا جاتا - عالم معاش کے فکر مند جس وقت راہ چلتے راستہ سانپ کی مانند ان کے پاؤں سے لپٹ لپٹ جاتا - اگر وہ گھر میں پناہ لیتے تو گھر کی ہوا اژدھے کے سانس کی مانند اندر کو کھینچتی تھی -

درخت کا سایہ روز سیاہ کی مانند تھا جو راستے میں پڑا ہو۔ کنویں کا کنارہ یوں نظر آتا جیسے مگرمچھ منہ کھولے کسی کو نگلنے پر آمادہ ہو۔ تاجروں کا قافلہ مال و اسباب کی گرانباری کے ساتھ بہ مشکل ایک قدم ارادے کی محمل کو سجاتا کہ لوٹ مار اور غارت‌گری کا شکار ہو کر نالۂ جرس کی سی تیز رفتاری سے واپس لوٹ آتا۔ لشکر اور سپاہی وردیوں میں ملبوس اور اسلحے کے ساتھ ایک میدان پر بھی حملہ آور نہ ہو پاتے کہ انہیں عریانی اور بے ہتھیار ہونے کے سبب بغیر پھریرے کے جھنڈوں کو کندھوں پر ڈالنا پڑتا۔

نظم

راہ رو چو صبح گر نقد نفس در بار داشت
تا قدم در رہ گزارد بادش از کف بردہ بود
ور ہمہ تمثال رہ در خانۂ آئینہ بود
تا بخود جنبد ہجوم رنگ خونش خوردہ بود
بس کہ در ہر سو غبار نالہ می زد موج یاس
شش جہت آئینہ دار یک دل آزردہ بود

(اگر راہ رو کے پاس صبح کی مانند سانس کی نقدی ہوتی تو ابھی وہ ایک قدم بھی نہ چلتا کہ ہوا اس نقدی کو اڑا لے جاتی۔ اور اگر راستے کی صورت خانۂ آئینہ میں تھی تو جب تک وہ خود ہلے رنگ کا ہجوم اس کا خون پی چکا ہوتا۔ ہر طرف غبار نالہ اس قدر یاس کی لہریں پھینک رہا تھا کہ شش جہت ایک آزردہ دل کی تصویر بنی ہوئی تھیں۔)

ادھر کسی سر نے گردن اٹھائی ادھر اسے آفتاب کی مانند نوک سنان پر چڑھا دیا گیا۔ شاید ہی کوئی جسم ایسا ہوگا جو خود میں پھولے نہ سمایا ہو اور اس کے پہلو میں کباب کی طرح سیخ نہ گزاری گئی ہو۔ اگر کسی مسافر کا سامان خاک پرگر پڑتا تو زمین اسے ٹپکے ہوئے آنسو کی مانند واپس نہ دیتی۔ اگر سوار گھوڑے کی باگ ذرا ڈھیلی چھوڑ دیتا تو اسے اڑے ہوئے رنگ کی طرح اس کے واپس آنے کا احتمال نہ رہتا۔ وضع جمعیت کے قدر دان اپنی پگڑیوں سے ہاتھ نہ اٹھاتے کہ کہیں ہوا

آن کو سروں سے نہ اڑا لے جائے ۔ اور عریانی کو عافیت کی زرہ سمجھتے تھے کہ کہیں لباس (یعنی عریانی) ان کی کھال سے عریاں نہ نظر آئے۔ سروں کو کچھوے کی مانند دیوار میں چھپا لیتے تاکہ گریبان کی ڈھال کوئی زک نہ پہنچائے، اور پاؤں کو خم کی طرح پورے طور پر خاک میں چھپاتے تاکہ سفر خاک زحمت میں دامن نہ پھیلائے۔

اس ھنگامے میں اگر واعظ اپنی دستار گم کر بیٹھتا تو اس کا سراغ گنبد افلاک سے باھر پاتا ۔ اور اگر زاھد ھاتھ سے عصا گرا دیتا تو طوبلی (بہشت کا درخت) اور سدرہ کی شاخ (حضرت جبریل کا ٹھکانا ، بیری) کے سوا اور کہیں نہ اسے پہچان پاتا ۔ مجبور و بے کس عوام ھر چند یہ دیکھتے تھے کہ کشتی کا راستہ مگرمچھ کے حلق میں ھے پھر بھی وہ بادبانی کی کوشش سے ھاتھ نہیں اٹھاتے تھے ۔ اور اگرچہ وہ جانتے تھے کہ وہ سراپا روئی سے بھرے ھیں پھر بھی قدم آگ ھی میں رکھتے تھے۔ اغراض کی کاوش پیہم ایک لمحے کی بھی مہلت نہ دیتی تھی ۔ اگر منزل (مقصود) بھی ھوتی تو وہ بھی راستے ھی میں رہ جاتی (یعنی منزل مقصود پر پہنچ کر بھی یہی معلوم ھوتا جیسے ابھی راستے ھی میں ھوں)۔

نظم

همه حیران کار خویشتنیم   جمله بی اختیار خویشتنیم
درد سر نیز ساغری دارد   نشاء فهم خمار خویشتنیم
جست‌وجو هیچ کم نشد هیهات   قــلزم تنگ بــار خویشتنیم
چشم پوشیده ایم و می گزرد   نــا گزیر غبار خویشتنیم
غیر آئینه دار عبرت نیست   کس چه سازد دو چار خویشتنیم

(ھم سب اپنے کام کے 'حیران' ھیں اور تمام اپنے آپ کے 'بے اختیار' ھیں ۔ درد سر بھی ایک ساغر ھے ، ھم اپنے خمار کے فہم کا نشہ ھیں ۔ جستجو اور تلاش ذرا کم نہ ھوئی ، افسوس ، ھم اپنے آپ کے اتھاہ سمندر ھیں ۔ ھم نے آنکھیں ڈھانپ لی ھیں ، اور گزر رھا ھے ۔ ھم اپنے غبار کے ناگزیر ھیں ۔ عبرت کے سوا کوئی آئینہ دار نہیں ھے ، کوئی کیا بنائے ھم اپنے آپ سے مقابل ھیں)۔

ایک عرصے تک متھرا کے اغنیا نے تیر و تفنگ کی استعداد کے بھروسے پر محلات کے راستوں کو روکے رکھا ، اور فقرا اپنی 'بے دری' (بے در ہونا - بے گھر ہونا) پر توکل کرتے ہوئے آئینہ خانہ کے سامان کی طرح بیرون در بیٹھے رہے - ازاں جملہ فقیر بیدل کی بنیاد حال سے چند بے دست و پا احباب کی ، کہ حسن اتفاق سے جن کے تعلق کا بوجھ خیال کے کندھے پر پڑا ہوا تھا ، طبیعتوں کی پریشانی ہر لحظہ ایک نیا غبار اٹھا رہی تھی ، اور ان کے احوال کے تردد کی کشاکش ہر لمحے دل جمعی کے ساز کے تار توڑ رہی تھی - بے چینی کا اندوہ اوضاع و اطوار کے چہرے پر بھی صحرا کے دامن کا غبار چھڑکتا تھا - ریت کی گردشیں ایک دوسرے کے ہا کے صفحات پر مور کے پروں کی پرکار گھماتی تھیں - صبروں کا پتا مصیبت کی گھن گرج سے آب رشک کی سی نرمی کے ساتھ پگھلا جا رہا تھا اور طاقتوں کی آبرو ٹپکے ہوئے اشک کی سی ہزار 'بے دست و پائی' سے اپنے سر پر خاک ڈال رہی تھی :

قطعه

راحت خواهی درین شبستان خراب دل جمع کن از ربط وفاق احباب
تا مژگان ها ستم کش تفرقه اند چشم است و همان حیرت محرومی خواب

(تو اس ویران شبستان میں راحت کا طلب گار ہے احباب کی موافقت و محبت کے ربط سے دل جمعی حاصل کر - جب تک پلکیں انتشار کے ستم کا شکار ہیں ، اس وقت تک آنکھ ہوگی اور وہی اس کی محرومئ خواب کی حیرت -)

دو سال تک عذاب اٹھانے کے بعد ، کہ جس کا ایک ایک دن قیامت کی ہزار صبحوں سے رنج و تعب کا محاسبہ کرتا تھا اور جس کی ہر ہر شام قبر کی بے شمار راتوں کی تاریکی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچ دیتی تھی ، ۱۰۹۶ھ میں نا امیدی کے جنون نے خیال کی بھٹی سے سوچ بچار کے دفتروں کے دفتر اٹھائے (تحریر کیے) اور ناکامی کی غیرت نے اس مسودے کی شراب کو دماغ کے ساغر میں انڈیلا کہ مزاج کی ہر طرح کی بے تدبیری کے باوجود عافیت احتیاج کو سواد دھلی کا راستہ طے کرنا اور زندگی سے سیر شدہ طبیعت کو آفات کے مخمصے سے

آزاد نہ کرنا ہے ۔ پل پل کے جلنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ پروانے کی مانند خود کو ایک دم آگ کے سپرد کر دیا جائے ۔ اور ہر روز اپنا ایک ایک عضو کاٹنے سے یہ کہیں مفید ہے کہ 'یکا یک' کی تلوار کے نیچے اپنی گردن رکھ دی جائے ۔ اس سانس کی آمد و رفت میں بھی کچھ اس قدر قابل اعتماد درازی نہیں ہے ۔ اگر اس رشتے (سانس) کے ٹوٹ جانے کا زمانہ قریب ہے تو پھر سوچ بچار بے کار ہے ۔

نظم

فرصتی داری ز گرد اضطراب دل بر آ
همچو خون پیش از فشردن از رگ بسمل برآ
خلقی آفت خرمن ست این جا بقدر احتیاط
عافیت می‌خواهی ازخود اندک ای غافل برآ
از تکلف در فشار قبر نتوان زیستن
چون نفس دل هم اگر تنگی کند از دل بر آ

(تیرے لیے موقع ہے دل کے اضطراب کی گرد سے باہر نکل آ ۔ خون کی طرح نچوڑنے سے پہلے ہی رگ بسمل سے نکل آ ۔ خلقت آفتوں کا شکار ہے ، تو یہاں احتیاط کے مطابق عافیت چاہتا ہے تو اے غافل ذرا اپنے آپ سے نکل آ ۔ قبر کے فشار (دباؤ) میں تکلف (تکلیف اٹھانا) سے نہیں جیا جا سکتا ، سانس کی طرح اگر دل بھی تنگی کرے تو دل سے نکل آ ۔)

ان خطروں کی پیش آمد کے ضمن میں جہان توکل کا فرشتہ بھی جانی ہوئی آفات کے راستے سے خبردار کر رہا تھا کہ جب تم یہ جان چکے ہو کہ مختلف طبیعتوں میں خیر و شر کا جو طوفان ہے وہ اللہ کی خواہش و مرضی سے ہے تو پھر تم نے اچھائی برائی کے اوضاع میں تبدیلی کو قدرت کے آثار میں سے کیوں نہ سمجھا ۔ بحر فضل کے قطرات کی سیرگاہ میں ، خطرے کی موج کے سبب ، سلامتی کے کوچے پر آنکھیں نہ کھولنا بے یقینی کی غفلت کی دلیل ، اور باغ بخشش کے بہارستان کی گل گشت (پھولوں کی سیر) میں جگنوؤں کے شعلے سے (ڈر کر) گل و ریحان نہ چننا دوستی نما بیگانگی ہے ۔

نظم

در طبائع آنکه تخم دستگاہ ظلم کاشت
می تواند عدل و رافت نیز بر دلہا گماشت
ای بسا سیلی که گرد انگیخت ازبنیاد دھر
خاروخس را دسته کرده همچوگل برسرگذاشت
بی پر و بالی رسد ھر جا بغرض امتحان
حلقۂ دامت ھمان خط امان خواھد نگاشت

(جس (خدا) نے طبیعتوں میں ظلم کی قدرت و طاقت کا بیج بویا ہے، وہ دلوں پر عدل و مہربانی کو بھی مقرر کر سکتا ہے - بہت سے ایسے سیلابوں نے خار و خس کا دستہ بنا کر سر پر گلاب کی طرح رکھا ہے کہ جنھوں نے دنیا کی بنیاد کو جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا - بے پر و بالی ہر جگہ امتحان کی غرض سے پہنچتی ہے، تیرا حلقۂ دام وهی خط امان لکھے گا -)

وہ صاحبان قوت و جمعیت، جو ہزار قسم کی مدد و استعانت کرنے کی قدرت و طاقت رکھتے تھے، اس مصلحت میں سوائے مدد روکنے کے اور کچھ نہیں فرما رہے تھے۔ اور وہ 'آشنا روش' احباب جو بیسیوں طریقوں سے آغوش شفقت کھولا کرتے تھے، اب اس حالت میں صرف 'غیریت' کا دروازہ وا کیے ہوئے تھے۔ آخرکار ان کی نصیحتوں کے نصیبے کی بے اثری نے آزردگی کے مواد میں ابال پیدا کیا، اور وعظ و پند کے سحر کی بے توجہی (کم اثری) نے ان کی مہربانی و التفات کے مزاج کو منحرف کر دیا۔ 'گفتگوؤں' کے ساز کی نوا کا مبالغہ (بم ؟) ٹھٹھا مخول کی لے میں بدل گیا، اور زبانوں کے معاملے کی مباحثہ آرائی تمسخر کے مناقشے پر منتج ہوئی کہ "اس ارادے کی پختگی اگر کرامتوں پر اعتماد کے سبب ہے تو امتحان سلامتی کے بعد ایمان لائے جانے کے قابل ہے۔ اور اگر اس کا تعلق تدبیر شجاعت سے ہے تو فتح کے وقوع پزیر ہونے کے بعد مبارک باد کے لائق ہے۔" ظاہر ہے اس قسم کی طوفان گاہ سے چیونٹی کی کشتی کس مدد و استعانت کے بھروسے پر نجات کی راہ

ہا سکے گی اور بے پر و بال سپند (ھرمل) کس جادو کے ذریعے اس شعلہ زار سے باھر نکل سکتا ھے۔

قصہ کوتاہ ھر قسم کی بے کسی اور بے طاقتی کے ساتھ آمور بے اختیاری کی خو کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ھوئے چند بہلیاں کرایہ پر لیں اور تشویش و پریشانی کے بے شمار مال و اسباب کے ساتھ ھوائے دھلی (خواھش دھلی) کے پر کھولے۔

قطعہ

محمل کشی آثار خیال است گذشتن
رنج و غم این مرحلہ پیوستہ نماند
مفت است ز صاحب اثری جوھر قدرت
چندانکہ دل خون شدۂ خستہ نماند
بر ناخن امداد شکستن بکمارید
ای بی خبران کار کسی بستہ نمانـد

(چہار عنصر بیدل)

نعمت خان عالی

[عالم گیر کے زمانے میں دربار میں تورانی (سنی) پارٹی کا زور ہو چکا تھا اور ایرانی پارٹی (شیعہ) اپنے آپ کو بے دست و پا محسوس کر رہی تھی ۔ نعمت خاں عالی (متوفی ۱۷۱۹ع) (مقرب خاں) کو اورنگ زیب کا تسنن کھٹکتا تھا ، اس نے اس کے متعلق طنز و تعریض کا انداز اختیار کیا ۔ دکنی محاربات (۱۶۸۶ع) میں وہ عالم گیر کا ہم رکاب تھا ، چناں چہ وقائع نعمت خاں ، دکنی محاصرے کی یادگار ہے ۔ فنی اعتبار سے یہ کتاب فارسی مزاح نگاری میں بڑا بلند مقام رکھتی ہے]

انیسویں شعبان سنہ ۳۱ جلوس کے واقعات

فنا کے کنارے پر بیٹھے ہوئے زخمی (لشکریوں) کے گروہ میں سے ، جن کی ہلاکت کی سرنوشت پتھر پر لکیر کی مانند لا زوال تھی ، اور جن کی روحوں کے قیدیوں کی آزادی کا پروانہ رگ سنگ کی طرح ان مٹ تھا (یعنی وہ یقیناً مرنے کے قریب تھے) ، ایک شخص سنگ ساری سے زخمی ہونے کے سبب بڑی سختی سے جان دے رہا اور کہہ رہا تھا ''کبھی تو میں سر پر پتھر مارتا ہوں اور کبھی سر پتھر پر ، لیکن پتھر دل ابو الحسن[1] قلعہ نہیں سپرد کر رہا ۔ دونوں طرف کے سردار صاحبان دست و دل (قوت و ہمت) ہیں ، لیکن نہ تو اس کے دل میں رحم کو ایک بار (کبھی) بار حاصل ہوا ہے اور نہ اس کے ہاتھ سے کوئی عقدہ کشائی ہوئی ہے ۔''

کوئی پیٹ پر چوٹ کھایا ہوا آنتوں کی مانند اپنے آپ پر پیچ وتاب

کھاتا اور زبان سے کہتا کہ ''جان سے بے زار بھوکے لشکر کے لیے یہ سنگ ھائے جراحت ھیں (کہ پیٹ پر باندھنے کے لیے مفید ہوتے ھیں) جو (قلعے سے نہیں) بلکہ آسمان سے برس رہے ھیں۔'' اور کوئی دانتوں پر پتھر کھایا ھوا یوں لب کشائی کر رھا تھا کہ ''عالم بالا (قضا و قدر) کی سخن فہمی کا بھی پول کھل گیا ہے ؛ میں تو یہ سوچتا تھا کہ حیدر آباد میں بڑے بڑے (قیمتی) پتھر حاصل کروں گا اور اسی وجہ سے میں الماس و یاقوت پر طمع کے دانت جمائے ھوئے تھا (لیکن معاملہ اس کے برعکس ھوا)۔ میری خواهش ہرگز یہ نہ تھی کہ یہ پتھر (جو دشمن برسا رہے تھے) ھوں اور میرے دانت۔ معلوم ھوتا ہے جواھر مجردہ (فرشتے) جوھریوں کی اصطلاح سے بالکل نا آشنا ھیں۔ اس کی تو وھی مثال ھوئی کہ ایک زاھد پیدل سفر کر رھا تھا ؛ چلتے چلتے جب اس کے پاؤں درد کرنے لگے تو اس نے ھاتھ اٹھا کر دعا کی کہ بار الٰہا مجھے سواری عطا کر! ابھی وہ چند قدم ھی آگے گیا تھا کہ ایک مردم آزار اور مغرور گھوڑی سوار ترک سے اس کا سامنا ھوا ؛ اس کی گھوڑی نے کہیں اسی وقت بچھیرے کو جنم دیا تھا ، جو چلنے سے عاجز ھونے کے سبب زمین پر پڑا ھوا تھا ؛ اس ترک نے جب اس عزیز مستجاب الدعوات[۲] کو دیکھا تو پہلے تو چابکوں سے اس کی مرمت کی اور پھر حکم دیا کہ فوراً اس بچھیرے کو اٹھاؤ اور گھوڑی کے آگے آگے چلو۔ بے چارہ بچھیرے کو اٹھا کر چلا ، اور گرم آنسوؤں اور سرد آھوں کے ساتھ نالہ و زاری کرتا اور کہتا کہ قصور میرا ہے جو میں نے اس کی وضاحت نہ کی کہ وہ سواری کا جانور عطا ھو جو مجھے اٹھائے۔ پس اللہ نے مجھے وہ سواری دی جسے میں نے اٹھایا۔''

بہر حال (ابو الحسن کے آدمیوں میں صرف) ایک دیدبان[۳] کی ، جسے بدچشم اھل قلعہ برج کے قریب ھی متعین کرکے دور چلے گئے تھے اور ان لوگوں (عالم گیر کے لشکری) کے چشم زخم[۴] کا سبب یہی شخص تھا ، پیشانی پر ایک سنگریزہ آ کر لگا جس سے وہ مثل ابرو شگفتہ (زخمی) ھو گئی۔ گویا تقدیر کے قلم نے اس کے 'ابرو' کے اوپر ایک

مد لگا کر اسے 'آبرو' بنا دیا اور اس سنگ ریزے سے ایک نقطہ اس کی قوت 'بصر[۵]' کی جگہ پر لگا دیا یعنی ''ما النصر الا من عند اللہ[۶] ۔''

جب اس دیدبان نے دیکھا کہ پتھروں کی بارش ختم ہو گئی ہے اور مورچے کے تمام لوگ حباب کی مانند دریائے عدم میں جا ملے ہیں تو وہ سیلاب کی سی تیزی سے اس خس و خاشاک کو (یعنی ان اہل قلعہ کو جو اسے وہاں مقرر کرکے دور چلے گئے تھے) واپس لے آیا ، جسے 'مغفرت نشان' دلاوروں نے مرکب رفتہ کی ہوا سے جھاڑا تھا ۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ مورچے والوں نے بہادروں کے بیٹھنے کی مخصوص جگہ (قبر) میں اقامت ابدی اختیار کر لی ہے ، اور (غازی الدین) فیروز جنگ[۷] کے وہاں پہنچنے میں دوری' راہ مانع ہے تو وہ مردود فوراً گھوڑوں کو دوڑاتے ہوئے اس جائے مخصوص[۸] میں داخل ہو گئے ۔ بہادر[۹] کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس نشست گاہ پر غاصب باغیوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا ہے تو وہ انہیں وہاں سے بھگانے کے لیے ایک لشکر جرار لے کر چلا ۔ ان دوزخیوں نے مار دھاڑ شروع کر دی ۔ کبھی تو وہ ہلہ بولتے اور کبھی آتش بازی استعمال کرتے ۔ اس گیر و دار کے سبب بچاؤ کی طاقت نہ رہی اور لوگوں (لشکری) نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا[۱۰] ۔ اس ہنگامے میں مقتولین کی تعداد لفظ 'حشرگاہ' (۵۳۴) کے اعداد کے برابر تھی ۔

اس خبر کے سنتے ہی سلطانی غضب کی آگ بھڑک اٹھی ۔ آپ (عالم گیر) کے حکم والا کے مطابق خاصے کی سواری تیار کی گئی ۔ نقیبوں نے فتح مندی کے آثار رکھنے والے لشکروں کو جنگ پر اکسایا کہ 'فاقتلوا ھم' (قتل کرو انہیں) ، اور سردار تاکید مزید کے لیے کہتے 'حیث وجدتموا ھم' (جس جگہ تم انہیں پاؤ) ۔ قریب تھا کہ قہر بادشاہی کی باد صرصر ، تند آندھی کی مانند ، ان ادب سے عاری سرکشوں کے ملک ہستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے (اور اس بات میں کوئی کسر باقی نہ رہ گئی تھی) ، اور نزدیک تھا کہ دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتے ہوئے لشکر کی تلواروں کی آب ان 'گوہر آبرو گم کردہ[۱۱]' مفسدوں

کے وجود کی بنیاد کو نیستی کے سیلاب کی مانند جڑ سے اکھاڑ دے ، کہ کج رفتار فلک کی مخالفت اور الٹے کام کرنے والے آسمان کی ناموافقت کے سبب آندھی چلنا شروع ہو گئی اور گرد اڑنے کی وجہ سے آنکھیں کام سے رہ گئیں ، کام ہاتھ سے گیا[۱۲] اور ہاتھ آنکھوں کو کھجلانے میں مصروف ہو گئے ۔ لشکری بے حد کم حوصلہ ہو کر لب کشائی کرنے لگے کہ یہ تو ذلت و خواری کی آندھی ہے ۔ اور کم ظرفوں کی ہمت اس قدر کوتاہ ہو گئی تھی کہ وہ زبان دراز کرکے کہتے کہ یہ تو نحوست اور بد نصیبی کی صرصر ہے ۔ آخرکار سیاہ بادلوں کے آنے سے یہ بات روشن ہوئی کہ تند و تیز آندھی تو برسات کے لشکر کا ہراول دستہ ہے ۔ پھر اچانک بارش کا سلطان سر پر بادلوں کا چھتر لیے ، بگولے کا جھنڈا پھیلائے ، کڑک کا نقارہ بجاتے اور حسینۂ برق[۱۳] کا تاج الماس سر پر رکھے ہوئے قطرہ زناں (یعنی بڑی سرعت سے) آ پہنچا ۔ غالباً وہ بے مزہ خنک اور باد سبک سے پر (مغرور ، بارش کا سلطان) قلعے والوں کی کمک کے لیے آیا تھا ، کیوں کہ ان 'بے معنی' لوگوں کے معاملے کی 'صورت' کے مرقع[۱۴] میں کسی قسم کے خلل کی نمی نہ آئی ، جب کہ اس طرف کی امیدوں کے صفحات پر سے اعمال کے تمام نقوش پوری طرح دھل گئے ۔ یہ تو 'تر' ہو رہے تھے اور وہ 'خیرہ سر[۱۵]' ؛ گویا ابر و باراں قلعہ داروں کی توپ و تفنگ کے دھوئیں سے معرض وجود میں آئے تھے ، جو وہ سب (باراں وغیرہ) ان کے کام آئے ۔

وہ ندی جو شاہی لشکر گاہ اور قلعے کے درمیان بہہ رہی تھی ، اب ایک گہری اور وسیع نہر کی شکل اختیار کر گئی ، اور فیروز جنگ کے بہادروں کے لیے راستہ طے کرنے میں رکاوٹ بنی ۔ یار لوگ اس بارش میں ایک مرتبہ پھر 'ماوراء النہری[۱۶]' بن گئے ، اور وہ نقارہ جو قلعے کے نزدیک اونچے مقام پر باندھا ہوا تھا ، شدت باراں سے نیچے بیٹھ گیا (یعنی بھیگنے کے سبب اس کی آواز بند ہوگئی) اور وہ توپیں جو قلعے کو اڑانے کے لیے بڑی جدوجہد سے وہاں لائی گئی تھیں محصورین کے قبضے میں آ گئیں ۔ جو کچھ وہ لے جا سکتے تھے وہ تو قلعے میں لے گئے اور جس چیز کو اٹھا نہ سکتے تھے اسے وہیں پھینک اور اس میں

کیلیں گاڑ کر ناکارہ بنا گئے ۔ بدکار ظالم ان میخ زدہ چیزوں کو بھی نہ چھوڑتے اور اکثر کو کام میں لاتے تھے ۔ انھوں نے (اهل قلعه) اسی سنگ دلی پر اکتفا نہ کی بلکہ وہ عین بارش اور طوفان میں بڑی بڑی لکڑیوں اور بوجھل شہتیروں کو مٹی کی بوریوں اور تھیلیوں سمیت، جو بڑی محنت و مشقت کے ساتھ خندق میں رکھی گئی تھیں، اٹھا کر لے گئے اور ان سے دیوار کے اس رخنے کو بھر دیا جو برجوں کے اڑ جانے سے پیدا ہو گیا تھا ۔ وہ زبان حال سے کہتے تھے : ع

چه خوش بود که برآید بیک کرشمهٔ دو کار

خندق خالی ہونے سے دل پر ہو گئے[17] اور دیوار کا رخنہ بھر جانے سے معاملہ رخنے سے خالی ہو گیا ۔ اگرچہ میدان کارزار کے جواں مرد موقع ہاتھ سے نکل جانے پر سمجھ گئے کہ امید کے ہاتھ پاؤں کی مہندی میں رنگ نہیں رہا، اور اگرچہ مدعا سے قطع نظر، انھوں نے دیکھا کہ انتظار کا سرمہ نفع بخش نہیں، اور زخم کے پھٹ، خاطر پریشان کی زلفوں کی کنگھی[18] اور اڑے ہوئے رنگ صورت حیرانی کے آئینے ہیں، لیکن حکم عالی فرماں برداری کے کانوں کا گوشوارہ بنا کہ پوری پوری آراستگی سے دھاوا بولنے کی جلوہ گاہ[19] میں در آؤ ۔ کارسازی میں ماہر نقیب پیچھے پڑ گئے کہ دشمنوں سے الجھ پڑو، اور نڈر محصلین بڑی سختی سے سامنے کھڑے ہو گئے کہ جلدی اس معاملے کی گتھی سلجھاؤ[20] ۔ بادل بھی ہواداری (طرف داری) کر رہا تھا اور بارش 'معاملے' کے چہرے پر 'آب[21]' لا رہی تھی ۔ ایک دم باد مسرت چلی اور عیش و نشاط کی محفل برپا ہوئی ۔

ایک طرف تو بارش بادلوں کے رباب پر تار باندھ کر تر (سریلے) نغمے الاپ رہی تھی اور دوسری جانب فلک کا دائرہ[22] بجانے والا بلند قلعے کے پردے[23] میں ایک لے نکال رہا تھا ۔ ایک طرف سے تو بارش ہو رہی تھی اور دوسری طرف سے قلعے والے گولے پھینک رہے تھے ۔ توپوں کے باجے اور چھوٹی بڑی بندوقوں کی نفیریاں آپس میں مل رہے تھے ۔ توپ کا طنبورہ بجلی کی کڑک کی مدد سے زیر و بم درست کر رہا تھا ۔ سازندۂ فرنگی[24] جو چھوٹے قلعے پر بیٹھا تھا، 'ضرب و نطق'[25] میں

ایک عجیب مہارت و استادی کا مظاہرہ کر رہا تھا ۔ کسی وقت وہ زخم کا زخمہ سینے کے قانون[۲۶] پر اور ضرب کا مضراب شاہ رگ کے دو تارے پر چلاتا ؛ کسی دم موسیقار پہلو[۲۷] کو توپ دم کرتا تو کسی نفس[۲۸] گلے کی بانسری کو بجاتا تھا ۔ بلبان (سہ تار ۔ ستار) جب اس کی ہم گاہی[۲۹] میں 'آھنگ راست'[۳۰] چھیڑتا تو سرے[۳۱] کو دست و پا کی دوگاہ[۳۲] میں کھینچتا تھا ۔ حقہ (ایک ساز) کا زنگ نواز (گھنٹی بجانے والا) بھی کچھ برا نہ تھا ۔ زنبورک[۳۳] کے گھنگرو بھی زمزمہ پیرائی میں مصروف تھے۔ اور انبان نفط[۳۴] کا نیے انبان[۳۵] باوجود شعلۂ آواز نہ رکھنے کے سب پر غالب و حاوی ہوا ۔ ادھر برق تند کا دم کش (آس دینے والا ، کسی کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر گانے والا) بلند آواز نکال کر ہر لحظہ بلندی سے گرتا اور اتنا بے سرا ہو جاتا کہ ھاتھی بھی اس کی تاب نہ لا سکتے ،کیوں کہ شاھی سواری کا فیل خاصہ جس کی قیمت چالیس ہزار روپے تھی ، اس کی آواز کی ہیبت سے مر گیا۔ اور جس کسی نے بہادری کے مرگ[۳۶] پیچ کو نہ دیکھتے ہوئے ھاتھی کی طرح کان نہ پھیلائے تھے[۳۷] ، اس نے اس کے صدمے سے بان (آتش بازی) جلا کر جان کے دھاگے میں رکھ دیے اور بازی نہ جیتی (یعنی جس کسی نے نامردی اختیار کی اور بھاگ گیا ، تو اگرچہ اس کا جسم جگہ جگہ سے جل گیا لیکن زندہ بچ رہا)

قضا کا عطار مصیبتوں کے کیف دان (معجونیں رکھنے والا ڈبا) کو گردش میں لا کر ہر کسی کو سر بازی کے بہت زیادہ نشے کی تکلیف دے رہا تھا ۔ ادھر کسی نے بندوق کی گولی کا اخروٹ کھایا ادھر وہ اپنے آپ سے گیا ۔ کسی نے چھروں کی خشخاش تناول کر لی تو اگرچہ اس کا نشہ کم تھا لیکن اس (نشے) نے بھی اپنا رنگ دکھایا۔ راجپوتوں ، افغانوں اور شیخ زادوں نے جو ان چیزوں سے ناواقف تھے ، توپ کی گولی کو بہ طور افیون کی گولی کے استعمال کیا ۔ بعضوں نے مزاج میں گرمی کے سبب اس (گولی) سے پرہیز کرتے ہوئے تیر کی انی کے بادام کو ترجیح دی ۔ سب کی سرمستی حد سے گزر گئی اور نشاء دلیری کے بد مست نشہ آور چیزوں کی بے ہوشی کے مدھوش ہو گئے ۔ کچھ

ایسی حالت طاری ہوئی کہ در و دیوار بھی محو تماشا ہو گئے ۔

قلعہ کنگروں پر سے 'دنداں نما' ہنسی ہنس رہا اور برج توپ سے بلند آواز قہقہے لگا رہا تھا ۔ یوں سمجھو کہ دیوار قلعہ 'دیوار قہقہہ' تھی ؛ برج ٹوٹا ہوا انار اور کنگرے پستے کے درخت کی شاخ تھے ۔ بزم کے اس جوش و خروش کے درمیان اس فوج میں جو اس ارادے (جنگ) سے نفیر[۳۸] تھی ، بے آزرم نقیب[۳۹] کا شور و غوغا اور رزم[۴۰] کے سنکھ کا نعرہ بلند ہوا ۔ چناں چہ جو کوئی بھی مے کدۂ نبرد[۴۱] کی شراب کا سرمست یا جرعۂ درد کا درد کش[۴۲] تھا وہ ، اس صوفی کی مانند جو سماع کے لیے اٹھے ، یورش کا نام سنتے ہی بارانی صوف (پشم) کا لباس پہن کر اٹھ کھڑا ہوا ۔

جب (عالم گیری سپاھی) قلعے کے کچھ اور نزدیک ہوئے تو اس قدر گھمسان کا رن پڑا کہ ہنگامۂ رستخیز (قیامت) بھی اس کے آگے ماند پڑ گیا ۔ (اسی دوران میں) ایک قیامت نما شور اور محشر خیز غوغا بلند ہوا ۔ ہوا یوں کہ کسی (عالم گیری) سپاھی نے دوسرے سے پوچھ لیا ''بھئی وہ گرا ہوا برج کون سا ہے ؟'' اس نے جواب دیا ''وہ جو دور سے نظر آ رہا ہے ۔'' وہ بولا ''یہ اتنی جلدی کیوں کر درست ہو گیا ؟'' اس پر دوسرا بگڑ کر بولا ''اندھے تو نہیں ہو گیا؟ دیکھتے نہیں کہ انھوں (اھل قلعہ) نے خندق کی لکڑیاں اور بوریاں لے جا کر باھم چن دی ھیں ۔'' اسی بات پر تو تو میں میں شروع ہو گئی ۔ پھر یہی درشت کلمے گھونسہ بازی کی شکل اختیار کر گئے ۔ غیور سپاھی اور پر زور دلاور ایک دوسرے کے رکیک جملوں کی تاب نہ لا کر باھم الجھ پڑے ۔ بس پھر کیا تھا جانبین کے حواری و مددگار بھی آن پہنچے اور 'ھم چشم' (حریف و مقابل) نگاہ کی مانند ہر گوشے سے دوڑے آئے ، تا آں کہ نوبت باقاعدہ لڑائی تک پہنچ گئی ، اور مقابلہ ، مقاتلہ[۴۳] کی سورت اختیار کر گیا ، جس میں مردانگی و جواں مردی کے خوب خوب جوھر دکھائے گئے ۔ آخر کار سردار کے گنور (کیمپ) سے دور بین لائی گئی (تا کہ حقیقت حال کو دیکھا جائے)

لیکن چوں کہ شام ہو چکی تھی ، اس لیے سرگروہ (سردار) کو پتا نہ چل سکا کہ کون سا گروہ اپنے دعوے میں سچا ہے ۔ ناچار اس حادثے کے صدق و کذب کی تحقیق صبح پر رکھ دی گئی ۔ سردار نے کسی بھی فریق کو قصوروار نہ ٹھہراتے ہوئے دونوں کو تسلی دی اور خود واپس چلا گیا ۔

الحق ، سرداری کا قاعدہ بھی یہی تھا کہ اس نے کسی طرف کی بھی طرف داری نہ کی ۔ لوگ بہ خیر و خوبی اپنے اپنے کیمپوں کو لوٹ گئے، اور جن لوگوں کو ذرا نمایاں گھاؤ لگے تھے ، ان کے زخموں کے ہونٹ انعام و اکرام کی بخشش کے مرہموں کے سبب ، اظہار شکایت کرنے سے بند ہو گئے ۔ شکر ایزد کہ یہ عظیم فتنہ خود بہ خود بیٹھ گیا ۔ باقی رہا قلعے اور مورچے (پر قبضہ) تو یہ کہاں جائیں گے ، ان پر بھی قبضہ ہو ہی جائے گا ۔ جب تک غنیم ناکس زندہ ہے (اہل قلعہ) ان کی حفاظت کر لیں گے (لیکن اس کے مرنے کے بعد تو یہ ہمارے ہی ہاتھ میں ہیں) ۔ یا پھر دوسری صورت ان کے ہاتھ میں آنے کی یہ ہے کہ تیسری[۳۴] نقب سے (جو اس وقت لگا رکھی ہے) کوئی راہ مل جائے (جس کا ہنوز کوئی پتا نہیں) ۔

اس ظفر آثار لشکر کے دیگر حقائق اس وقت ویسے ہی ہیں جیسے کہ پہلے تھے ، فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت میکائیل علیہ السلام کی توجہ پہلے کی نسبت کم ہو گئی ہے ، جب کہ حضرت عزرائیل علیہ‌السلام پہلے سے زیادہ دل جوئی کرنے لگے ہیں ۔

رباعی

پیداست کہ شد غلہ ازین لشکر کم گشتند ز جان سیر تمامی مردم
افتادہ زن و مرد چون خرمن باہم ......ست جو و ...... نخود گندم[۵۵]

جوان تلاش معاش میں بے دل ہو رہے ہیں ، تو بوڑھے فکر آخرت سے غافل ، کھلنڈرے بچے خوشی کے نشے میں مدھوش اور درس پڑھنے میں جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہے ہیں ۔ ایک قطعہ جو ہمارے کانوں تک پہنچا ، درج ذیل کیا جاتا ہے ۔

قطعه

(۱) مخزن گوهر دل اهل قبول
مفتعلن مفتعلن مفتعل

(۲) قسمت اثنا عشری در فلک
ساخت بروج از پی ضبط شهور[۳۶]

(۳) حوت، حمل، عقرب و میزان و ثور
دلو پس آنگه سرطان شد ضرور

(۴) جدی و اسد سنبله جوزا و قوس
هر سه بیک عنصری افگنده شور

(۵) آتشی از خلق بر آورده دود
کشته بباروت ز نزدیک و دور

(۶) آبی شان بسته ز باران و سیل
راه بسر آذوقهٔ اهل عبور

(۷) خاکی و بادی بهم از اتفاق
وقت یورش چشم سپه ساخت کور

(۸) بد اثر کوکب ازین برجها
شادی و غم گاه عزا گاه سور

(۹) رفته کنون از همه سیارگان
خاصیت فرحت و عیش و سرور

(۱۰) ماه ز عقرب ننهد پا برون
مهر اسد را نگذارد بزور

(۱۱) بست و طریقه شد و تحت الشعاع
لازم ایام و سنین و شهور

(۱۲) بدر طرب منخسف از رنج و غم
شمس فرح منکسف از شر و شور

(۱۳) راس و ذنب گشته دو سردار فوج
این ز شرف و آن ز سعادت نفوز

(۱۴) پیشهٔ مریخ که خونریزی است
کرده ز هر برج به قلعه ظهور[۳۷]

(وقائع نعمت خان عالی)

سجان رائے بٹالوی

["خلاصة التواریخ (۹۶-۱۶۹۵ع) کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ہندو مصنف کی پہلی قابل قدر ، پر از معلومات اور مفید کتاب ہے ۔ تاریخی واقعات سے کہیں زیادہ اس میں غیر متعلق مفید معلومات درج ہیں ۔" (سید عبداللہ)
امتناع تمباکو اور ابوالفضل کی زندگی کے بارے میں انھوں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اور کسی کتاب میں نہیں ملتا ۔ سجان رائے[۱] کی دوسری کتاب 'خلاصة المکاتیب' کا مندرجہ اقتباس مغلیہ دور کے نصاب تعلیم کا مجمل خاکہ ہے]

(۱)

صوبہ لاہور

لاہور دریائے راوی کے کنارے پر واقع ایک قدیم شہر ہے ۔ کہتے ہیں کہ راجا رام چند کے لڑکے 'لو' نے اسے آباد کیا تھا ۔ بعض تاریخوں میں اس کا نام 'لہور' اور 'لہاور' بھی لکھا ملتا ہے ۔ جب ایک عرصہ گزرنے کے بعد گردش فلک سے اس شہر میں ویرانی کے آثار نمایاں ہوئے اور بالکل معمولی سی آبادی رہ گئی تو اس کا پایہ تخت شہر سیالکوٹ قرار پایا ، اور جب سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان کو فتح کیا ، تو ملک ایاز[۲] نے ، جو سلطان کا منظور نظر اور حسن و فراست میں بے مثل تھا ، اس شہر کو آباد کرنے کی ٹھانی ۔ اس سلسلے میں اس نے ایک محکم قلعے کی بنیاد رکھی ، اور یوں یہ شہر نئے سر سے آباد ہوا ۔ اس کے بعد سلطان محمود کی اولاد میں سے خسرو شاہ[۳] اور اس کے بیٹے سلطان خسرو ملک[۴] نے پھر سے اس مملکت کو فتح کرکے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا ۔

اڑتیس (۳۸) سال تک یہ شہر سلطان محمود غزنوی کی اولاد کا مرکز خلافت رہا ؛ بعد ازیں ہندوستان کے کسی بھی سلطان نے اس شہر میں اقامت اختیار نہ کی ، جس کے سبب اس کی رونق میں کمی واقع ہو گئی ۔ مدت مدید کے بعد سلطان بہلول لودھی[۵] کے ایک امیر تاتار خاں[۶] نے اسے اپنا پایۂ تخت بنایا ۔ پھر بابر بادشاہ کے بیٹے کامران میرزا[۷] نے اس شہر میں اقامت اختیار کر کے اس کی رونق و آبادی کو دوبالا کیا ۔ اس کے بعد حضرت جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے اپنے عہد حکومت میں اس کی آبادی کی طرف توجہ کی اور شہر پناہ کے طور پر مضبوط قلعہ اور دولت خانہ تعمیر کروا کر اسے نئے سر سے رونق بخشی ۔ پھر حضرت نورالدین محمد جہاں گیر بادشاہ نے یہاں بڑی بڑی عالی شان عمارتیں بنوائیں جو اب تک موجود ہیں اور ایک عرصے تک یہاں قیام فرما کر اس کی آبادی و رونق کا سبب بنے ۔ شاہ زادوں اور بلند مرتبہ امیروں کے محلات خصوصاً آصف خاں عرف ابو الحسن بن اعتمادالدولہ[۸] کی عمارت سے کہ نہایت وسیع و عریض ہے اس کی آبادی میں بے حد اضافہ ہوا ۔ اور حضرت شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے عہد حکومت میں تو اس کی آبادی میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوئی ۔

بادشاہ غازی محی الدین محمد اورنگ زیب رح[۹] کے زمانے میں جب دریاے راوی نے اپنا رخ شہر کی جانب بدل لیا اور اس کے باعث بہت سی عمارتوں اور باغات کو نقصان پہنچا ، تو چوتھے سال جلوس میں آپ نے ایک مضبوط بند کی تعمیر ک حکم صادر فرمایا جو عمارتوں کو انہدام سے بچا سکے ۔ اطاعت گزاروں نے کوئی دو کوس لمبا بند بڑی مضبوطی و استواری سے باندھا ، اور 'سد سکندری'[۱۰] کی مانند 'سد عالم‌گیری' کو شہر کی حفاظت کے کام میں لائے ۔ اکثر جگہ انھوں نے تالاب کی طرح زینے بنا کر لب دریا کو حسینوں کے لبوں کی مانند دل فریب بنا دیا ۔ اور عالی رتبہ امرا نے دریا کے نزدیک بڑی بڑی دل کشا اور فرحت افزا عمارتیں بنوا کر شہر کی زینت و خوبی میں چار چاند لگا دیے ۔

چوتھے سال جلوس کے آغاز سے اس وقت تک ، کہ چالیس سال سے زیادہ کا عرصہ بنتا ہے ، ہر سال سرکار شاہی کی طرف سے مزید تعمیر و ترمیم کی جاتی ہے اور اس پر بے شمار روپیہ صرف ہوتا ہے ۔ بغیر کسی تکلف و مبالغے کے ، یہ ایک بہت عظیم اور وسیع شہر ہے ۔ آبادی ، وسعت اور بھیڑ بھاڑ کے لحاظ سے شاید ہی کوئی شہر اس جیسا ہو ۔ اس میں ہر ملک کے قسم قسم کے ہنر مند اور زمانے کے صنعت گر سکونت پذیر ہیں ، اور ہفت اقلیم کی اجناس اور بحر و بر کی اشیا کی خرید و فروخت ہوتی ہے ۔

یوں تو اس کے ہر کوچہ و بازار میں مسجدوں کی فراوانی ہے ، لیکن دریا کے کنارے پر حضرت عالم گیر بادشاہ کے عالی شان محل کے روبرو جو پتھر کی مسجد[۱۱] بنائی گئی ہے ، وہ بڑی عظیم الشان ہے ۔ اس پر پانچ لاکھ سے زیادہ روپیہ صرف ہوا ۔ اس کے علاوہ شہر کے وسط میں وزیر خاں[۱۲] ، یعنی شاہ جہانی حکیم علیم الدین کی تعمیر کردہ جامع مسجد[۱۳] گویا شہر کے رخ زیبا پر ایک خوش نما تل ہے ۔ اس شہر میں اولیاے عظام کے سرگروہ میر علی ہجویری رح[۱۴] کی آرام گاہ ہے ، کہ جنھوں نے فضیلت کو ولایت کے ہم آغوش کیا ۔ آپ نے غزنین سے محمود غزنوی کے ہمراہ آ کر لاہور ہی میں سفر آخرت اختیار کیا ۔ سلطان محمود فتح لاہور کو آپ ہی کے قدوم میمنت لزوم کے طفیل جانتا تھا ۔ آپ (ہجویری رح) کے علاوہ اور بھی بہت سے مقربین بارگاہ الٰہی اس شہر میں لیٹے ہوئے ہیں ۔

حضرت جہانگیر بادشاہ کا مقبرۂ معظمہ راوی کے اس پار شاہدرے کے نزدیک واقع ہے ۔ اس کے نزدیک ہی آصف خاں ابوالحسن جہاں گیر کا مقبرہ ہے ۔ اگرچہ شہر کے ارد گرد بے شمار دل کشا باغ اور فرح افزا چمن موجود ہیں ، لیکن شالا مار باغ[۱۵] ، جسے حضرت شاہ جہاں بادشاہ نے باغ کشمیر کی تقلید میں بنوایا ، کچھ اور ہی دل فریب منظر پیش کرتا ہے ۔

(خلاصۃ التواریخ)

(۲)

تمباکو پر پابندی

تمباکو کی پیداوار کا آغاز جزائر فرنگ (انگلستان) سے ہوا ۔ حکیم اور طبیب لوگ اسے بعض دواؤں میں استعمال اور بعض امراض کے علاج کے لیے اس کا پینا تجویز کیا کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ کئی تندرست آدمیوں کو بھی اس سے رغبت تھی ۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود یہ زیادہ رواج پذیر نہ تھا ، اور انگلستان سے اسے بہت کم مقدار میں درآمد کیا جاتا ۔ آخر سرزمین ہند کے کسانوں نے اسے بہت بڑی مقدار میں کاشت کرنا اور اس سے دولت کمانا شروع کر دیا ۔ دوسری اجناس کی نسبت اس کی پیداوار میں بڑھ چڑھ کر کوشش کرتے ۔ خاص طور پر آں حضرت کے دور حکومت میں تو اس کی کاشت نے بے حد رواج پایا اور ہر کوئی تمباکو نوشی کا متوالا و شیدا ہو گیا ۔ امیر ، وزیر شریف ، نجیب ، صالح ، زاہد ، فاضل ، شاعر ، بلیغ ، فصیح ، حکیم ، منجم ، فقیر ، غریب ، غرض کہ ہر قسم کے لوگ اس کی طرف راغب ہوئے ۔ اور چھوٹے بڑے ، شریف اور کمینے سبھی اس کے اس قدر دل دادہ ہوئے کہ اسے تمام کیف آور چیزوں اور ہر قسم کے ماکولات و مشروبات پر ترجیح دینے لگے ۔

ہوتے ہوتے یہ مہمانوں کے لیے عمدہ ترین ماحضر اور پر خلوص لوگوں کا بہترین تحفہ قرار پایا ۔ اس کی تاثیر لوگوں میں اس حد تک سرایت کر گئی کہ اس کا طالب ضروری کھانے پینے والی چیزوں کو تو ترک کر سکتا تھا ، لیکن اس سے پرہیز کرنا اس کے لیے بے حد دشوار تھا ۔ یوں تو ہر کسی کو دوسروں کے لعاب دہن سے نفرت ہے لیکن تمباکو نوشی کے معاملے میں کبھی کسی نے کسی ایرے غیرے کے لعاب دہن کی بھی پروا نہیں کی ۔ جتنا یہ زیادہ کڑوا ہوگا ، اتنا ہی دلوں پر اس کا اثر بے حد شیریں اور نرخ گراں ہوتا جائے گا ۔ اس کے عاشقوں کی نظر میں اس کا دھواں کحل جواہر اور اس کے آرزومندوں کے اعتقاد کے مطابق اس کی آگ حرارت غریزی معلوم ہوتی ہے ۔

بیت

بسیار کسی که خواهدش از دل و جان
کمیاب کسی بود که او را کم خواست

(ایسے بہت سے لوگ ہیں جو اسے دل و جان سے چاہتے ہیں ، لیکن ایسے بہت کم ہیں جو اس کے کم طلب گار ہوں ۔)

سچ پوچھو تو یہ (حقہ) سفر و حضر میں ایک مصاحب ، خلوت و جلوت کا ہمدم و ہم راز ، حجرہ نشین خلوت گزینوں کی بزم کو آراستہ کرنے والا ہم نفس و دم ساز ، بیدار بخت بزم نشینوں کا مسرت پیرا ، اور ایک ایسا دل فریب معشوق ہے جس نے اپنے دھوئیں کے مرغولوں سے عنبریں مو حسینوں کے حلقۂ زلف کی مانند اہل جہاں کی گردن جاں پرعشق کی کمند پھینکی ، اور آتش محبت سے دلیا والوں کے نہاں خانۂ دل میں آرزو کی شمع روشن کی ہے ۔ یہ ایک ایسا بوالہوس عاشق ہے جس نے پری رو حسینوں کے ساتھ بوسہ بازی اور مہ وشوں کے ہونٹوں سے چاشنی حاصل کی ہے ۔ یہ ایک ہزار داستان بلبل ہے جو نغمہ سرائی سے مشتاقوں کا دل موہنے اور نواسنجی سے حکم‌رانی کے طالبوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے والا ہے ۔ یہ کشور کشائی کا تاج دار اور ایسا تخت نشین ہے جس نے نیچہ سے دنیا کو فتح کرنے والا جھنڈا دلوں کے میدان میں بلند کیا اور 'گڑ گڑ' کی آواز سے روحوں کی مملکت میں فرماں روائی و جہاں گیری کا نقارہ بجایا ہے ۔ اس کے طالبوں کے لیے 'ہر نفسی که فرو رود[۱۶]' (ہر سانس جو نیچے جاتا ہے زندگی کا معاون اور جب باہر آتا ہے تو کشادگی طبع کا باعث ہوتا ہے ۔ یعنی اس کے ہر ہر گھونٹ میں ایک زندگی اور ایک نئی فرحت ہے ۔) گویا ہر نفس میں دو نعمتیں موجود ہیں :

بیت

آن حریفانی که تنباکو کشند　　　اولش الله و آخر 'هو' کشند

(جو احباب، تمباکو نوشی کرتے ہیں ، وہ اس کے اول میں 'اللہ' اور آخر میں 'ہو' کرتے ہیں ۔)

توبہ! توبہ! میں کیا بک رہا اور کیا لکھ رہا ہوں ۔ سنو! تمباکو

تمام نشوں میں سب سے برا نشہ اور ایک وقت ضایع کرنے والا شغل ہے ۔ یہ منہ پر ایک ایسا تالا اور زبان پر ایک ایسا بند ہے جو سبحانہٗ تعالیٰ کی یاد اور ایزد پاک کے ذکر میں رکاوٹ ڈالتا ہے ۔ یہ بوالہوس بادہ خواروں کا پسندیدۂ طبع ، مے کدہ نشیں مے پرستوں کا مقبول مزاج ، فرخندہ طبع اهل دل اصحاب کے نزدیک لائق نفرت اور عالی مرتبہ عقل رکھنے والے ارباب دانش کے نزدیک قابل مذمت ہے ۔ اور ایک فعل ہے بیہودہ ، یعنی جلنا ، آگ کھانا اور دھواں پینا ۔ ایک عمل ہے بے جا ، یعنی دھوئیں کو غذا بنانا یا دوسرے لفظوں میں ہوا کو منہ میں کوٹنا ہے ۔ اس کے علاوہ اس کے پینے سے بہت سے جسمانی اور بدنی نقصانات ظاهر ہوتے ہیں ، یعنی یہ نورانی چہرے کو سیاہ اور روے ارغوانی کو تیرہ ، دماغ کو مختل اور مادۂ تولید کو زائل کرتا ہے ۔ بلغم اور کھانسی اس کی خاص پیداوار ہیں ۔ دق اور دمہ جیسے امراض اسی سے رونما ہوتے ہیں ۔ اس کے پینے سے منہ میں حد سے زیادہ گندگی اور بدبو رہتی ہے اور ضمیر کا آئینہ زنگ آلود اور صفحۂ دل سیاہ ہو جاتا ہے ۔

بیت

تمباکو نوش را سینہ سیاہ است　　اگر باور نداری نی گواہ است

(تنباکو نوش کا سینہ سیاہ ہوتا ہے ۔ اگر تمھیں یقین نہ ہو تو حقے کا نیچا دیکھ لو ۔)

القصہ جب اس کا رواج حد سے زیادہ بڑھ گیا ، اور امیر غریب ، چھوٹے بڑے سب اس کے دیوانے ہو گئے تو حضرت خاقان زماں نے اس بیہودہ فعل یعنی تمباکو نوشی کو ممنوع قرار دے دیا ، اور تمام حاکموں اور گورنروں وغیرہ کے نام اس بدعت کو دور اور اس کی خرید و فروخت کو مکمل طور پر ختم کرنے کے فرمان صادر کیے ۔ عالم پناہ نے مزید احتیاط ، حکم عالی کے پاس اور طالبان تمباکو کے لیے عبرت کے طور پر شہر لاہور میں بہت سے ایسے لوگوں کی تشہیر کی ، جنھوں نے حکم ممانعت کے نفوذ کے باوجود تمباکو نوشی کی جرأت کی تھی ۔ یہی نہیں ، بلکہ بعض کے تو ہونٹ تک کاٹ دیے گئے ۔ لیکن اس 'دود سیہ' (سیاہ دھواں) نے لوگوں کو اپنا اس قدر گرویدہ بنا لیا تھا

کہ ممانعت اور سزا کے باوجود انھوں نے کوئی عبرت نہ پکڑی اور نہ اس سے اجتناب ھی برتا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ بدعت گھٹنے کی بجائے ھر روز زیادہ ھی پھیلتی چلی گئی : قطعہ

با سیہ دل چہ سود گفتن وعظ   نرود میخ آھنی در سنگ
آھنی را کہ مورچانہ بخورد   نتوان برد ازو بصیقل زنگ

(سیہ دل کو نصیحت کرنے کا کیا فائدہ ۔ لوھے کی کیل پتھر میں نہیں جاتی ۔ جس لوھے کو زنگ نے اندر سے کھا لیا ھو ، اس کا زنگ صیقل سے نہیں اتارا جا سکتا ۔)

(خلاصۃ التواریخ)

(۳)

شیخ مبارک اور ابو الفضل کے بارے میں

شیخ مبارک اپنے زمانے کا بہت بڑا فاضل اور جید عالم اور آگرہ میں درس دیا کرتا تھا ۔ بہت سے طالبان علم اس کے فیض رساں مدرسے سے فیض یاب ھوئے ۔ چوں کہ وہ ایک درویش منش ، فقیر طبع اور خدا پرستی کی راہ پر قائم تھا ، اور صلح کل کی زندگی بسر کر رھا تھا ، اس لیے بعض ملاؤں نے اس سے بے حد دشمنی و عداوت کے سبب علمی تنازعوں میں الجھ کر حضرت سلطان عالم (اکبر) کے عہد خلافت کے اوائل میں اس پر دین اسلام سے برگشتگی کی تہمت لگا دی ۔ پھر ایک محضر تیار کرکے اس خدا شناس کے قتل کے بارے میں مفتیوں سے فتویٰ لکھوایا اور اس پر مشاھیر وقت کی مہریں ثبت کروا کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیا ۔ جب شیخ کو اس بات کا پتا چلا تو وہ اپنے بیٹوں سمیت روپوش ھو گیا اور کچھ عرصہ اسی طرح کسی گوشے میں چھپا رھا ۔ اس حادثے سے شیخ اور اس کے فرزندوں پر ایک عجیب حالت و کیفیت طاری رھی ۔ انجام کار بعض امرا کی وساطت سے ، جو کبھی شیخ کے شاگرد رھے تھے ، اس کی دین داری و خدا پرستی اور دشمنوں کی دشمنی و تہمت تراشی کی حقیقت بادشاہ کے گوش گزار کی گئی ۔ بہتان تراشوں اور ارباب دروغ کو نہایت خجالت و شرم ساری کا سامنا

کرنا پڑا اور شیخ بادشاہ عادل کی انصاف پرستی اور عدل کے طفیل شرارت پسندوں کے فساد سے بچ کر حسب سابق فضل و کمال کی راہ پر گامزن اور طالبان علم کو درس دینے کی طرف متوجہ ہوا۔ سرکار شاہی کی طرف سے اس کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

جب اس خدا مست کے بیٹوں کی فضیلت و کمالات کا شہرہ سمع اقدس (بادشاہ) تک بار بار پہنچا اور انہیں دربار میں حاضر کیے جانے کے لیے شاہی فرمان صادر ہوا، تو بارھویں سال جلوس میں شیخ ابو الفیض نے، جو اشعار میں فیضی تخلص کرتا اور شیخ مبارک کا سب سے بڑا فرزند تھا، ملازمت اقدس میں آ کر سعادت حاصل کی۔ انیسویں سال جلوس میں شیخ ابو الفضل، جو شیخ ابوالفیض سے چھوٹا تھا اور جس نے آیۃ الکرسی کی تفسیر آں حضرت (اکبر) کے نام معنون کی تھی، بساط بوسی اقدس کی عزت سے مشرف ہوا، اور دریا صفت دل کے نزدیک پسندیدہ ٹھہرا۔ چوں کہ وہ علامۂ زماں، یکتائے دوراں جامع کمالات اور صاحب صفات تھا، اس لیے روز بروز بے پناہ مہربانیوں اور بےکراں لطف و کرم کا مورد بنتا گیا۔ رفتہ رفتہ اس کا مرتبہ امرائے عظام اور وزرائے کرام سے بھی بڑھ گیا اور یوں وہ مقرب درگاہ اور مشیر حکومت کے مرتبے کو پہنچا؛ حتیٰ کہ دوسرے مقربین درگاہ کے لیے باعث رشک و حسد ٹھہرا۔ نہ صرف مقربین بلکہ والا شان شاہ زادے بھی اس کے اس تقرب سے حسد کھانے لگے اور موقع کی تلاش میں رہتے کہ اسے ہر ممکن ڈھب سے اکھاڑا اور حضور بادشاہ سے دور کیا جائے۔

اس کے والد بزرگوار شیخ مبارک نے اپنے حین حیات میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی تھی، لیکن اس میں حضرت خاقان زماں کا اسم گرامی درج نہ کیا تھا؛ شیخ نے باپ کی وفات کے بعد، بجائے اس کے کہ اس تفسیر کو بادشاہ دوراں کے نام سے منسوب کرتا، اس کے بہت سے نسخے لکھوا کر ایران، توران، روم، شام اور دوسرے اسلامی ملکوں میں بھجوا دیے۔ جب اس کی خبر سمع مقدس تک پہنچی

تو حضور (اکبر) بہت برہم ہوئے، اور نتیجے کے طور پر ابو الفضل پر حد سے زیادہ شاہی عتاب نازل ہونا شروع ہو گیا۔ شاہ زادہ سلطان سلیم، جو شیخ کی گستاخی سے آزردہ دل رہتا تھا، اور ان امرا نے، جو اس کی بے اعتنائی اور خود رائی کے سبب دل پر زخم حسد کھائے ہوئے تھے، موقع غنیمت جان کر اس کے متعلق بڑی عجیب عجیب اور دور از کار باتیں بادشاہ کے گوش اقدس تک پہنچائیں۔ اس طرح شیخ معتوب ہو کر کورنش؂۱ بجا لانے سے روک دیا گیا۔ چوں کہ شیخ نے کئی مواقع پر حضور بادشاہ یہ عرض کی تھی کہ ''میں سوائے حضرت بادشاہ کے اور کسی کو نہیں جانتا، شاہ زادے سے بھی میرا کوئی سروکار نہیں، اور چوں کہ میں امرا کی خاطر تواضع نہیں کرتا، اس لیے سب مجھ سے آزردہ رہتے ہیں۔'' بادشاہ سلامت کو اس حقیقت کا پورا پورا علم تھا۔ وہ شیخ کو بے حد چاہتے تھے۔ اس کی قربت سے بہت محظوظ ہوتے اور ایک لحظے کے لیے بھی خود سے جدا نہ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ کچھ دنوں کے بعد اس کی خطا معاف کر دی گئی اور پھر سے اس پر لطف و عنایت کی بارش ہونے لگی۔ لیکن اس مرتبہ خاطر مقدس میں یہ بات بھی جا گزین تھی کہ شیخ کو کچھ عرصے کے لیے حضور پر نور سے دور رکھا جائے تاکہ اسے شاہی لطف و عنایت کی قدر معلوم ہو۔ چناں چہ اسی وجہ سے اسے دکن کی مہمات پر روانہ کیا گیا تھا......آخر کار اس نے شہادت کا رتبہ پایا۔

کسی تکلف، بناوٹ اور مبالغے کے بغیر، شیخ سراپا دانش و فضیلت، سراسر علم و کمال اور صاحب جوہر تھا۔ اس کی عقل و دانش اس حد تک تھی کہ پندرہ برس ہی کی عمر میں اس نے تمام علوم متعارف کی تحصیل اور دانش مندی معروف کی تکمیل سے فراغت پا لی تھی۔ اس کے فضائل و کمالات اس درجے کے تھے کہ اس نے تمام مذاہب کی کتب مثلاً توریت، انجیل اور ہندوؤں کے ویدوں وغیرہ کا مطالعہ کیا اور اس طرح دوسرے مذہبوں کے تمام علما سے بازی لے گیا۔ اس کی فراست و فرزانگی اس ڈھب کی کہ گم نامی کے گوشے سے نکل کر سلطان بر و بحر کا مقرب و مصاحب بنا اور اسی کے مشورے سے ملکوں

کی مہموں کا انتظام کیا جانے لگا۔ اس کی دلیری و دلاوری اور اقبال مندی و بلند بختی اس مرتبے کی کہ ولایت دکن کو بہ زور شمشیر فتح کرکے پنج ہزاری کے منصب اور سپہ سالاری کے رتبے کو پہنچا۔ ایسے صاحب جوہر کے عدم سے وجود میں آنے کے لیے ہزاروں سال کی مدت درکار ہے ، اور بے شمار صدیوں اور زمانوں کی ضرورت ہے تاکہ ایسا اہل فطرت پردۂ خفا سے ظہور کے روشن مقام میں آئے۔ جس قدر وہ صاحب کمالات تھا ، کاشکے اسی قدر اسے عمر طبعی بھی عطا ہوتی ، یا پھر کسی کار نمایاں اور خدمت شایاں میں اپنی جان عزیز قربان کرتا تاکہ اس کی طرف سے بادشاہ دوراں کی ان عنایات کا حق ادا ہو جاتا جو انھوں نے اس پر کی تھیں۔

نظم

(۱) درین باغ سروی نیامد بلند
که باد اجل بیخش از بن نکند

(۲) نہالی بسی سال گردد درخت
ز بیخش بر آرد یکی باد سخت

(۳) گر افراسیاب[۱۸] ست ور پیر زال[۱۹]
بباید ز باد اجل گوشمال

(۴) بہر کار از نیک و بد چارہ ہست
ولی چارۂ مرگ نباید بدست

(۱) اس باغ میں جو بھی سرو اونچا ہوا ، باد اجل نے اسے جڑ سے اکھاڑ ڈالا۔

(۲) پودے کو درخت بنتے کئی سال لگ جاتے ہیں مگر ایک تند ہوا اسے پل میں اکھاڑ پھینکتی ہے۔

(۳) خواہ افراسیاب ہو خواہ بوڑھا زال موت کی ہوا ہر ایک کی گوش مالی کرتی ہے۔

(۴) ہر اچھے برے کام کا علاج ہے لیکن موت کا کوئی چارہ نہیں۔
(خلاصة التواریخ)

(۴)
مکاتیب نگاری کے ارتقا کے بیان میں

زمانے کے دانش مندوں اور مبارک آثار خرد مندوں کے نزدیک یہ بات طے شدہ ہے کہ جب بچوں کی زبان بول چال کے قابل ہو جائے تو انہیں تحصیل علوم کی خاطر مدرسوں اور مکتبوں میں بھیجنا چاہیے، تاکہ اگر بہار زندگی کے آغاز اور نشو و نما پانے والی عقل کے شروع میں ان کے خمیر کا آئینہ مقصود کی صورتوں کا عکس پذیر ہو اور علمی نقوش کے نقش ہونے کا مقام بنے تو زوال پذیر اور خلل قبول کرنے والا نہ ہو، بلکہ روز بہ روز ان کا ذہن زیادہ روشن اور ان کی عقل و فراست پختہ تر ہوتی جائے۔

حرف نوشتہ بدل طفل خرد کز لک نسیان نتواند سترد

(جو حرف ایک مرتبہ چھوٹے بچے کے دل پر لکھا گیا، اسے فراموشی کا چاقو نہیں کھرچ سکتا۔)

اس سلسلے میں زمانے کا دستور اس طرح ہے کہ طالب علم سب سے پہلے اللہ تبارک و تعالیٰ کے نام سے، کہ وہی ظاہری اور باطنی علوم کا پیدا کرنے والا ہے، آغاز کرے۔ اس کے بعد 'ابجد' کہ علم کے ابتدائی امور اور آئینی مطالبات کی بنیاد اس پر ہے، شروع کرکے مفرد حروف کو پڑھنے، مرکب الفاظ کو جاننے اور ہر ایک کے نقطوں کو پہچاننے کی مشق کرے۔ اور جب اسے حروف اور نقطوں کو پڑھنے، سمجھنے اور الفاظ کی ترکیب و انفرادیت میں مہارت حاصل ہو جائے، اور وہ مختلف سوالات کا جواب کسی غلطی و فراموشی کے بغیر صحیح صحیح دینے لگے، تو اس وقت متبرک اشعار کا، جو نیک فال اور مبارک باتوں پر مشتمل ہوں، مطالعہ شروع کرے۔ اس کے بعد سبزۂ راز کے گلستان کے بلبل اور حقیقت و مجاز کے بوستان کے عندلیب حضرت شیخ مصلح الدین (انار اللہ برہانہ') کی، جو سعدی شیرازی کے نام سے مشہور ہیں، متبرک کتابوں (گلستاں اور بوستاں) کے مطالعے سے عقل کے چراغ میں تیل ڈالے۔ بعد ازیں دیگر کتب

کو درجہ بہ درجہ بڑھے اور جو کچھ پڑھا ہو اسے فرصت کے موقع پر خصوصاً چھٹیوں کے دوران میں ، بہ غور دیکھے تاکہ وہ مشکل عبارتیں جن کا سمجھنا بار بار پڑھنے پر موقوف ہے ، ذہن سے نہ اترنے پائیں ، اور جب وہ طبیعت کے آئینے پر مرتسم ہو جائیں تو رنگین مضامین اور اچھوتی عبارتوں کی روشنیاں بنیں اور اس طرح فہم و فراست میں پختگی اور روشنی پیدا ہو ۔

جہاں تک انشا نگاری کا سلیقہ سیکھنے کا تعلق ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ بدیع الانشاء ، جو انشاء یوسفی کے نام سے مشہور اور حضرت نصیر الدین محمد ہمایوں بادشاہ کے عہد میں منشیوں کا دستورالعمل رہی ہے ، رقعات مولانا جامی ، رقعات ملا منیر ، ارباب علم و عمل کے پیشوا شیخ ابو الفضل علیہ الرحمۃ کے مکتوبات کہ جن سے بہتر کوئی تحریر نہ ہوگی ، شاہ جہانی دور کے قلیچ خاں[۲۰] کے منشی شیخ عنایت اللہ کنبوہ[۲۱] کا گلدستہ اور اس کے بھائی محمد صالح[۲۲] کی تصنیف بہار سخن ، جو بادشاہ عالم گیر کی سرکار اقدس کے جرگۂ منشیاں سے منسلک تھا اور جس نے شیخ ابو الفضل کے مکتوبات کی پیروی میں ایک کتاب ترتیب دی تھی ، عالم گیر بادشاہ کے وہ مراسلے جو انھوں نے ایران و توران کے فرماں رواؤں کے نام لکھے ، وہ خطوط جو امرا کی طرف سے خوانین کو لکھے گئے ، وہ مکتوبات جو اخلاص کی نشانی رکھنے والے مخلصوں اور بلند مرتبہ امیروں کی جانب سے حیطۂ تحریر میں لائے گئے ، شاہ جہانی عہد کے سیف خاں کے منشی شیخ ابوالبرکات منیر[۲۳] کی ، جس نے استعارات کو نئے طرز سے استعمال کیا ، تالیفات کارستان اور نوباوہ ، شیدا اور ملا طغرا[۲۴] کے منشآت ، کہ ان دونوں عزیزوں نے نئی نئی عبارتیں بڑے اچھوتے اور نرالے ڈھب سے سپرد قلم کی ہیں ، لعل چند ملتانی کی نگار نامہ[۲۵] جس کی انشا بڑی دل پسند ہے ، اور اسی قسم کی دوسری مشہور کتب انشاء کا مطالعہ کرے تاکہ اس سے اس کی طبیعت جلا پائے ۔

جب انشاء کے پڑھنے میں پوری مہارت حاصل ہو جائے تو

پھر ہر ایک کا نچوڑ اور انتخاب یاد کرے اور ہر روز کوئی نہ کوئی مطلب و معنی اپنے ذہن سے نکال کر یا کسی دوسرے سے سن کر املا لکھے ۔ پھر ان مناسب عبارتوں کو جو اس نے یاد کر رکھی ہوں ، اس میں کھپا کر اس فن کے ماہرین سے اصلاح لے ۔ فن انشاء کی تحصیل اور تکمیل میں سعی بلیغ کو کام میں لائے ۔ صرف و نحو کے قواعد ، عبارتوں کے اوزان اور استعارات وغیرہ سیکھے ، کہ ان کے بغیر صحیح انشاء کا لکھنا نا ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے ۔ اس کے علاوہ کتاب لیلاوتی[۲۶] ، جسے فیضی نے ہندی سے فارسی میں ڈھالا ، اور اس کے دوسرے لکھے ہوئے حساب و ضوابط کا مطالعہ کرے کہ منشیوں کے لیے ان کا جاننا لازم ہے ۔

ہمیشہ تجربہ کار منشیوں اور سعادت آثار دانشوروں کے ساتھ میل ملاقات رکھ کر خطوط نویسی کے طریقے کی اصلاح کرتا رہے ۔ اسی طرح خوش خطی میں ، جو فن انشا کا زیور ہے ، مہارت حاصل کرنے کی پوری کوشش کرے ۔ سب سے پہلے حروف ابجد یعنی مفرد ''الف'' (ا) ''با'' (ب) وغیرہ کو جلی قلم سے لکھے ۔ پھر ''بابت'' اور ''جاجت'' جیسے مرکب الفاظ لکھنے کی مشق کرے ۔ اس میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اشعار اور قطعات لکھنا شروع کرے ۔ جب خط جلی (موٹا) میں پختگی اور اس کے صحیح استعمال کا طریقہ آ جائے تو پھر خط خفی (باریک) اور نستعلیق کی مشق میں مشغول ہو جائے ۔ بعد ازیں 'خط آمیز' کہ اسے 'شکستہ' بھی کہتے ہیں اور آج کل پورے طور پر رواج پذیر ہے ، لکھنے کی مشق کرے ۔ مذکورہ بالا تمام رسم‌الخط خوش نویسوں کی اصلاح اور قواعد کے مطابق درست کرے ، اور اس قدر مشق اور استعمال کرے کہ سطور کی ترتیب ، الفاظ کی ترتیب اور حروف کی آرائش کا حسن و خط قاعدے کے مطابق ہو جائے اور پختگی حاصل ہو ۔ امید قوی ہے کہ اس طریقے پر عمل پیرا ہونے سے وہ ایک شہرت یافتہ منشی بن جائے گا ۔

جب خطوط نگاری کا ڈھنگ آ گیا تو طبیعت کو جلا دینے کی خاطر مندرجہ ذیل معروف کتابوں کا مطالعہ کرے : مولانا عبد الرحمان جامی

کی تصنیفات : یوسف و زلیخا[۲۷] ، تحفة الاسرار[۲۸] ، اور سبحة الابرار[۲۹] ۔ مولانا نظام الدین گنجوی[۳۰] کی مثنویات : سکندر نامہ[۳۱] ، مخزن اسرار[۳۲] ، هفت پیکر[۳۳] ، شیرین خسرو[۳۴] اور لیلی مجنون[۳۵] ۔ امیر خسرو رحمہ دهلوی کی تصانیف : قران السعدین[۳۶] ، مطلع الانوار[۳۷] هشت بہشت[۳۸] اور اعجاز خسروی[۳۹] ۔

جہاں تک شعرا کے دواوین کا تعلق ہے تو وہ بے شمار ہیں ، تاہم ان دواوین کا ضرور مطالعہ کرے : دیوان مجیر الدین بیلقانی[۴۰] ، دیوان شمس تبریزی ، دیوان ظہیر فاریابی ، دیوان سعدی ، دیوان خواجہ حافظ شیرازی ، دیوان انوری ، دیوان خاقانی ، دیوان عرفی ، دیوان فیضی ، دیوان بدر چاچ ، کہ اس کا کلام بڑے دقیق معموں پر مشتمل ہے ، اور خاص کر صائب[۴۱] کا دیوان ، کہ یہ بلند فطرت ، سرآمد شعرا حضرت شاہ جہاں بادشاہ کے دور خلافت میں عالی مرتبہ امیر ظفر خاں بن خواجہ ابوالحسن کا بزم افروز تھا ۔ اس نے نئے نئے مضامین اور بڑے بڑے انوکھے نکات پر مشتمل ایک لاکھ بیس ہزار اشعار کہے اور اس میں شک نہیں کہ جیسے تازہ اشعار سخن پروری کے اس 'بہار آرا' نے کہے ویسے بہت کم شعرا نے کہے ہوں گے ۔

خوش دلی و خوش بسری کے لیے طوطی نامہ[۴۲] از نخشبی[۴۳] ، مولانا حسین واعظ کاشفی[۴۴] کی انوار سہیلی[۴۵] ، عیار دانش[۴۶] مصنفہ ابوالفضل ، اور شیخ عنایت اللہ کنبوہ کی بہاردانش[۴۷] کو زیر مطالعہ رکھے کہ ان کتب کی عبارتیں بھی بڑی پیاری اور ان کی حکایتیں بھی عجیب و غریب اور دل خوش کن ہیں ۔

گزشتہ سلاطین کی حقیقت ، ملکوں کے احوال اور سلطنت کے قواعد و ضوابط سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے زیادہ تر کتب تاریخ اور خصوصاً مندرجہ ذیل کتابوں کی طرف رجوع کرے ۔ شاہ نامۂ فردوسی ، جس میں کیومرث[۴۸] بن سام بن نوح سے لے کر نوشیروان عادل تک ایران کے چالیس بادشاہوں کے احوال درج ہیں جنھوں نے تقریباً چار ہزار سال حکومت کی ۔ اس کے علاوہ اس مین رستم[۴۹] ، اسفندیار[۵۰]

افراسیاب اور دوسرے نامور پہلوانوں کے جنگی کارناموں کا بھی تذکرہ ہے ۔ شرف الدین علی یزدی[۵۱] کی تالیف ظفر نامہ جو صاحب‌قران امیر تیمور گورگان کی فتوحات کے ذکر پر مشتمل ہے ، اکبر نامہ[۵۲] ، جس میں اکبر کے احوال مرقوم ہیں ، طبقات اکبری[۵۳] ، اقبال نامۂ جہانگیری[۵۴] اور تاریخ فیروز شاہی کہ ہندوستان کی معتبر تاریخوں میں سے ہے ۔ ان کتب کے علاوہ مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ[۵۵] اور دوسری ہندی تاریخوں کو باری باری اور ہمیشہ پڑھتا رہے ۔

تزکیۂ نفس اور پاکیزگیٔ باطن کے لیے اخلاق ناصری ، شرف الدین یحیٰی منیری[۵۶] کے مکتوبات ، نزھت الارواح[۵۷] ، مولانائے معنوی جلال الدین رومی کی مثنوی اور حکیم سنائی کی مثنوی حدیقہ کا مطالعہ کرے ۔ توقع ہے کہ اس طرح وہ طبع روشن ، عقل سلیم ، اخلاق پسندیدہ اور اوصاف حمیدہ کا مالک بن کر عالی رتبہ دولت مندوں کی محفلوں میں جگہ پائے اور شرف و اعزاز حاصل کرے گا ۔

(خلاصة المکاتیب نسخۂ خطی متعلق به کتاب خانۂ ملی لاهور)

جزو سوم

دورهٔ متأخّرین

شاہ ولی اللہ رحمہ

[امام الہند شاہ ولی اللہ (پیدائش ۱۷۰۱ع) ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جس نے اُس اخلاق اور روحانی انحطاط کا سدباب کیا جو اورنگ زیب کے بعد اسلامیان پاک و ہند پر مسلط تھا ۔ اس بزرگ نے ''قرآن فہمی کی نعمت عظمیٰ عطا کی ۔'' ان کی تصانیف میں سب سے اہم کتاب حجۃ اللہ البالغہ ہے ۔ اس کے علاوہ بھی وہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ذیل میں ان کے وصیت نامے کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے ۔]

وصیت نامہ

الحمدللہ ملہم الحکم ، ومفیض النعم ، والصلوات والسلام علیٰ سیدالعرب والعجم و علیٰ آلہ و صحبتہ اہل الفضل والکرم ۔ (تعریف ہے اس خدا کی جو دل میں حکمتیں ڈالنے والا اور نعمتوں کا پہنچانے والا ہے ۔ اور صلوات ہو عرب و عجم کے سردار آں حضرت صلعم پر ، آپ کی آل پر اور اصحاب فضل و کرم پر !)

امابعد! بندۂ حقیر ولی اللہ عفی عنہ اپنے احباب اور اپنی اولاد کو یہ چند کلمے بہ طور وصیت کے کہتا ہے :

''میں نے اس (وصیت نامہ) کا نام 'المقالۃالوصیۃ فی النصیحۃ والوصیۃ' رکھا ہے ۔ ہمیں اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے اور وہی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے ۔''

پہلی وصیت : یہ کہ اعتقاد اور عمل قرآن پاک اور حدیث رسول اللہ صلعم کے موافق ہو۔ اور ہمیشہ ان میں غور کرتے رہنا چاہیے ۔

هر روز دونوں کا تھوڑا تھوڑا مطالعہ کرنا چاہیے ۔ اور اگر پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو دونوں کے ایک ایک ورق کا ترجمہ سن لیا جائے۔ عقائد کے لحاظ سے قدما کا مذہب ، اہل سنت اختیار کرنا چاہیے ۔ جس امر میں بزرگوں نے تفتیش سے کام نہیں لیا اس کی تفصیل و تفتیش سے اجتناب بہتر ہے ۔ منطقیوں کی بیہودہ شک و شبہ میں ڈالنے والی خام باتوں کی طرف توجہ نہ دی جائے ۔ مسائل فروعی میں ان علمائے محدثین کی پیروی کی جائے جو فقہ اور حدیث دونوں کو خوب جانتے ہوں ۔ فقہ کے مسئلے قرآن کریم اور حدیث کی کسوٹی پر پرکھے جانے چاہئیں ؛ اگر موافق ہو تو اسے قبول کر لیا جائے ورنہ برا مال مالک کے منہ پر ، (خلاف، کو چھوڑ دیا جائے) کہ امت کو قیاسیہ مسئلوں کے سلسلے میں ہر لمحے کتاب و سنت (کلام اللہ و حدیث) کی ضرورت ہے اور وہ ان سے کسی پل بھی بے اعتنائی نہیں برت سکتی ۔ اور ان فقیہوں کی فرسودہ بات نہ سننی چاہیے جنھوں نے ایک عالم کی تقلید کو مند بنا کر سنت کی پیروی کو ترک کیا ہوا ہو ۔ ایسے فقہا کی طرف توجہ نہ کرنی اور ان سے دور رہنے میں خدا کا تقرب جاننا چاہیے ۔

دوسری وصیت : امر معروف کی حد ، جیسا کہ اس فقیر کو القا ہوا ہے ، یہ ہے کہ مذہبی فریضوں ، کبیرہ گناہوں اور دیگر اسلامی شعائر کے سلسلے میں پوری سختی سے نیک کاموں کا حکم دینا اور برے کاموں سے روکنا چاہیے ۔ اور ایسے لوگوں کے ساتھ جو اس معاملے میں غفلت سے کام لیتے ہیں ، میل جول نہ رکھنا چاہیے بلکہ ان کا دشمن ہونا چاہیے ۔ باقی امور میں ، خصوصاً جن میں پہلوں یا پچھلوں نے اختلاف کیا ہو ، کسی قسم کی سختی مناسب نہیں ؛ فقط امر معروف و نہی منکر سے آگاہ کر دینا ہی کافی ہے ۔

تیسری وصیت : اس دور کے مشائخ کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے اور نہ ان کی بیعت کرے کہ یہ لوگ قسم قسم کی بدعتوں میں مبتلا ہیں ۔ آن کے بے شمار مرید یا بہت سی کرامات دیکھ کر دھوکے میں نہ آئے ۔ اس لیے کہ مریدوں کی کثرت رسم کے سبب ہے ، اور رسمیہ امور کی

وقعت حقیقت میں کچھ بھی نہیں ۔ رہیں کرامات ، تو الا ماشاء اللہ ، طلسم و جادوگری کو کرامات سمجھا جاتا ہے ۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سب سے بڑی کرامت دلوں کی باتیں جاننا اور آنے والے واقعات کا انکشاف کرنا ہے ۔ سو اس کے بہت سے طریقے ہیں جن میں سے ایک تو علم نجوم و رمل کا 'باب ضمیر' ہے ۔ یہ نہ سمجھو کہ علم نجوم میں جب تک ستاروں کے شمار نہ لکھیں ، یا رمل میں جب تک زائچہ نہ ہو تو کچھ معلوم نہیں کر سکتے ، اس لیے کہ ہم نے یہ تجربہ کیا ہے کہ نجومی نے جب یہ جان لیا کہ اس وقت کون سی ساعت ہے ، تو اس کے ذہن میں سب ستاروں کا شمار آ گیا اور نقشہ تصور میں بندھ گیا ، اور گویا 'تسویۃ البیوت' (مراد ستاروں کا شمار) کا صفحہ اس کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے ۔ اسی طرح رمال نے جب کسی انگلی کو لحیانِ دل (رمل کی شکل / / /.) میں قرار دے لیا ، اور فلاں انگلی کو فلاں شکل دے دی اور ذہن میں صورت قائم کر لی کہ ان شکلوں میں سے کون سی شکل پیدا ہوگی ، تو زائچہ اس کے سامنے حاضر ہو جاتا ہے ۔ دوسرا طریقہ 'کہانت' ہے ، جس کی کئی قسمیں ہیں اور یہ فن بہت وسیع ہے ۔ یعنی کبھی تو حاضرات جن سے اور کبھی اس کے علاوہ دوسرے طریقے سے معلوم کر لیتے ہیں ۔ تیسرا طریقہ 'طلسم' ہے کہ قوائے کواکب کسی صورت میں بند کرنے سے دریافت کرتے ہیں ۔ اور بعض اعمال جوگیہ سے بھی کشف ہو جاتا ہے ، اس لیے کہ وہ اشراف و کشف میں پورا پورا اثر رکھتے ہیں ـــ سو جو کوئی اس کی تحقیق کرنا چاہے وہ ان فنون کی کتابوں کی طرف رجوع کرے ـــ کسی کام پر کمر ہمت باندھنا ، ڈراؤنی شکل بن جانا ، کسی کے دل پر دل رکھنا اور طالب کو مسخر کر لینا یہ سب کچھ فن نیرنگ سے متعلق ہے ۔ چند اعمال ہیں جن کے وسیلے سے انسان یہ سب کچھ حاصل کرتا ہے ؛ ورنہ نیکی و بدی ، خوش بختی و بد بختی اور مقبول و مردود میں یہاں کوئی فرق نہیں ہے ۔

اسی طرح اہل مجلس میں وجد و شوق پیدا کر دینے کا تعلق حدت

اور قوت بہیمیہ (حیوانی) سے ہے ۔ لہٰذا جس کسی میں جتنی قوت حیوانی زیادہ ہوگی ، اتنا ہی اس کا وجد زیادہ ہوگا ۔

ہاں! اس قسم کے عمل بعض صالحین بھی کرتے ہیں ، مگر ان کی نیت نیک ہوتی ہے اور یہ بات کچھ کرامت میں شمار نہیں ہوتی ۔ ہم نے بہت سے ایسے سادہ لوح دیکھے کہ جب وہ اس قسم کے شغل کسی مرشد سے حاصل کرتے ہیں تو انہیں عین کرامات سمجھتے ہیں ۔ سو لازم یہ ہے کہ حدیث کی کتب مثلاً صحیح بخاری ، صحیح مسلم ، سنن ابوداؤد اور ترمذی ، اور حنفی و شافعی فقہ[1] کی کتب کا مطالعہ کرے اور ظاہر سنت پر عمل پیرا ہو ۔ اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں عشق صادق عطا فرمائے اور اس میں اس راہ کی طلب زیادہ ہو تو کتاب عوارف کو نماز ، روزہ ، ورد اوراد اور دیگر مصروفیات سے پہلے دیکھے ۔ رسائل نقشبندیہ کو یاد داشت پیدا کرنے کے طور پر پڑھے ، کہ ان دونوں بزرگوں نے ان دونوں ابواب کو اس طرح واضح اور روشن لکھا ہے کہ ان کے پڑھنے سے کسی مرشد کی تلقین کی ضرورت نہیں رہتی ۔ جب نور عبادت کی کیفیت اور یاد داشت کی نسبت حاصل ہو جائے تو اس پر قائم و پابند رہے ۔ اگر اس دوران میں کوئی ایسی ہستی نظر آ جائے کہ جس کی صحبت و ہمدمی جذب کی چابی اور جس کی صحبت کی تاثیر لوگوں میں پوری طرح سرایت کر چکی ہو تو اس کے ساتھ صحبت رکھے ، یہاں تک کہ مطلوبہ حالت ملکہ کی شکل اختیار کر لے ۔ اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار کرے اور اس کمال میں مشغول ہو جائے ۔

اس زمانے میں کوئی بھی ، الا ماشاء اللہ ، بہ حیثیت مجموعی صاحب کمال نہیں ہے ۔ یعنی اگر کسی کو ایک بات میں کمال حاصل ہے تو دوسری میں وہ بے کار ہے ۔ تو ایسی صورت میں اس سے وہی کمال حاصل کر لینا اور اس کی دوسری باتوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے ۔ دوسرے لفظوں میں 'خذ ما صفا و دع ما کدر' پر عمل کرے ۔ صوفیوں کی نسبتیں تو بہت بڑی غنیمت ہیں ، لیکن ان کی رسوم بالکل بے وقعت ہیں ۔ میری یہ بات بہت سوں کو ناگوار

گزرے گی ، لیکن مجھے تو ، جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے اس کے مطابق بات کرنا ہے اور زید یا عمرو کے قول کو اختیار نہیں کرنا ہے ۔

چوتھی وصیت : جاننا چاہیے کہ ہم میں اور اہل زمانہ میں اختلاف ہے ۔ اس لیے کہ صوفی منش تو یہ کہتے ہیں کہ حاصل مطلوب ، فنا و بقا اور استہلاک ہے اور شرع میں جو رعایت معاش و عبارت بدنیہ کی آئی ہے ، وہ اس لیے ہے کہ وہ فنا و بقا ہر ایک سے ادا نہیں ہو سکتی ۔ ''و مالا یدرک کله لا یترک کله ۔'' (اور جو چیز پوری سمجھ نہ آئے اسے پوری کو نہیں چھوڑ دیا جاتا) ۔ متکلمین[۲] یہ کہتے ہیں کہ جو شریعت میں آیا ہے بس وہی مطلوب ہے ۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کی صورت نوعیہ کے اعتبار سے شریعت ہی مطلوب ہے اور شارع نے خاص و عام کے لیے اس کی اصل کا بیان فرمایا ہے ۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان اس طرح پیدا کیا گیا ہے کہ اس میں فرشتوں اور حیوانوں دونوں کے اوصاف جمع ہو گئے ہیں ۔ اگر یہ صفات ملکی میں تقویت حاصل کر لے تو اس کے لیے باعث سعادت اور اگر حیوانی قوتوں کو اپنا لے تو یہ اس کی بد بختی کا سبب ہوگا ۔ اس کی خلقت اس ڈھنگ پر ہوئی ہے کہ اس کا نفس اعمال اور اخلاق کے رنگ قبول کر لیتا ہے ، پھر انہیں اپنی اصل میں لے آتا اور موت کے بعد اپنے ساتھ لے جاتا ہے ۔ جیسے اس کا بدن غذا کی کیفیت کو قبول کر لیتا اور اپنے ساتھ ملا لیتا ہے ۔ اور اسی لیے بد ہضمی اور بخار وغیرہ میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ اور یہ نفس انسان ایسا مخلوق ہوا ہے کہ یہ احاطۂ قدس میں داخل ہو سکتا اور وہاں سے الہام اور جو کچھ الہام کے حکم میں ہے ، قبول کر سکتا ہے ۔ پھر اگر تو مکان پاک ملائکہ سے مناسبت ہے تو وہ خوشی و مسرت حاصل کرے گا اور اگر ان ملائکہ کی نسبت منافرت ہے تو وحشت و تنگی سے دوچار ہوگا ۔ الغرض چوں کہ نوع انسان اس طرح واقع ہوئی ہے کہ اگر اسے یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو نفسانی امراض اسے بہت دکھ پہنچاتے ، لہٰذا خدائے بزرگ و برتر نے محض اپنے فضل و کرم سے اس (نوع انسان) کی کارسازی کی ؛ نجات کا راستہ دکھایا اور انہی (انسانوں) میں سے زبان غیب کے ترجمان یعنی حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ

وسلم کو ان میں بھیجا تا کہ بخشش و عطا کی تکمیل ہو جائے ، اور شان ربوبیت ، جو پہلے ان کی خلقت و ایجاد کی خواہش مند تھی ، پھر ان کی دست گیری کرے ۔ چناں چہ انسان کی صورت نوعیہ نے بہ زبان حال مبداء فیاض سے شرع کی بھیک مانگی ۔ پس حکم شرع ، صورت نوعیہ کے ان میں مل جانے کے باعث، تمام بنی نوع انسان پر لازم ہے ، اور کسی فرد کی خصوصیت کو اس جگہ دخل نہیں ہے ۔ اور وہ افراد جو فنا و بقا اور نیستی وغیرہ کو مطلوب بنائے ہوئے ہیں تو یہ ان کی ذاتی خصوصیات کی بنا پر ہے ، کیوں کہ بعض افراد نہایت ہی علو و تجرد میں مخلوق ہوتے ہیں اور خدا تعالیٰ انہیں ان کی راہ دکھا دیتا ہے ۔ اور وہ حکم شرع نہیں ہے بلکہ ان کی زبان حال نے خصوصیتِ فردیت کے سبب اس کا تقاضا کیا ہے ۔ شارع کا کلام ہرگز اس معانی پر محمول نہیں ہے ، نہ اشارۃً ہی اور نہ صراحۃً ہی ۔ ہاں مگر کچھ لوگوں نے شارع کے کلام سے یہ مطالب سمجھ لیے ہیں ۔ یہ تو اس طرح ہے جیسے کوئی لیلیٰ و مجنوں کا قصہ سنے اور اس کو اپنی ہی سرگزشت خیال کرے ۔ اس بات کو ان کی اصطلاح میں 'اعتبار'[۳] کہتے ہیں ۔ غرض فنا و بقا و نیستی کے معاملات میں افراط کرنا اور ہر ایرے غیرے کا ان میں مشغول ہونا امت مصطفویہ (صلعم) میں بہت بڑی بیماری ہے ۔ خدا اس شخص پر اپنا رحم فرمائے جو ان کو گم نامی کے گڑھے میں پھینکنے کی کوشش کرتا ہے ، گو بعض استعدادات کے مطابق وہ صاحب اصل ہی ہو ۔ اگرچہ میری یہ باتیں اس دور کے بہت سے صوفیوں کو ناگوار گزریں گی ، لیکن مجھے تو ، جو کام میرے سپرد کیا گیا ہے ، اسی کے مطابق بات کرنا ہے ؛ زید یا بکر سے میرا کوئی سروکار نہیں ہے ۔

پانچویں وصیت : آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے صحابۂ کرام رض کے بارے میں نیک اعتقاد رکھے ۔ ان کی مدح و منقبت کے سوا زبان سے کچھ نہ نکالے ۔ اس سلسلے میں دو قسم کے لوگوں نے خطا کی ہے ۔ بعض لوگ تو اس خیال کے حامی ہیں کہ ''وہ سب (صحابہ کرام رض) آپس میں صاف دل تھے ، اور ان میں کبھی کوئی جھگڑا یا تنازعہ

نہیں ہوا ۔'' یہ ان کا محض وہم ہے ، اس لیے کہ مستفیض کی روایت ان کی چپقلش پر گواہ ہے ، اور مستفیض کی نقل سے انکار نہیں کیا جا سکتا ۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ نے جب ایسی باتوں کو ان سے منسوب پایا تو ان (صحابۂ کرام رض) کی شان میں گستاخی کی اور اس طرح ہلاکت میں پڑے ۔ اس فقیر کے دل میں یہ بات ڈالی گئی ہے کہ اگرچہ صحابۂ کرام رض معصوم نہ تھے ، اور ان میں سے بعض عوام سے ممکن ہے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوئی ہوں کہ اگر وہی باتیں کسی دوسرے سے سرزد ہوتیں تو وہ طعن و جرح کا مورد بنتا ، مگر ہم کو یہ حکم ہے کہ ہم انہیں زبان کے پلڑے میں برابر برابر رکھیں ، اور ہمارے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ ہم ان کے حق میں دشنام طرازی یا زبان طعن کو روا رکھیں ، کہ اس میں ایک مصلحت ہے اور وہ یہ کہ اگر ان کے متعلق کسی قسم کی بحث یا جرح چھیڑی جائے تو حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بارے میں روایت منقطع ہوتی ہے اور جب روایت منقطع ہوئی تو دین میں بگاڑ پیدا ہوگیا ۔ ہر صحابی رض سے جب روایت لی جائے تو اکثر حدیثیں مستفیض ہوں گی اور امت کے لیے حجت قائم ہوگی ۔ اس میں بعض کی جرح سے نقل میں خلل نہیں پڑے گا ۔

اس فقیر نے آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی روح پر فتوح سے سوال کیا کہ شیعہ لوگ اہل بیت کی تو محبت کا دعویٰ کرتے ہیں ، لیکن صحابہ رض کو برا کہتے ہیں ، ان کے بارے میں آں حضرت صلعم کا کیا ارشاد ہے ؟ آں حضرت صلعم نے کلام روحانی سے القا کیا کہ ''ان کا مذہب باطل ہے ، اور ان کے مذہب کا باطل ہونا لفظ امام سے ظاہر ہے ۔'' جب فقیر کو اس حالت سے افاقہ ہوا تو میں نے لفظ امام پر غور کیا ؛ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی اصطلاح میں امام اسے کہتے ہیں جو ''معصوم مفروض الطاعت منصوب للخلق'' ہو ۔ وہ امام کے حق میں وحی باطنی کو جائز گردانتے ہیں ۔ لہٰذا حقیقت میں وہ ختم نبوت کے منکر ہیں ، گو زبان سے آں حضرت صلعم کو خاتم الانبیا کہیں ۔ بہر حال جس طرح صحابۂ کرام رض کے حق میں

نیک اعتقادی سے کام لے، اسی طرح اہل بیت کے بارے میں نیک اعتقاد رکھے۔ ان میں جو صالحین ہوں ان کی زیادہ تعظیم کرے کہ "وقد جعل اللہ لکل شیئی قدرا" (اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے)۔

اس فقیر کو معلوم ہوا ہے کہ بارہ امام رضی اللہ عنہم ایک نسبت کے قطب ہوئے ہیں، اور ان کی رحلت کی قربت سے تصوف کا رواج ہوا ہے، لیکن عقیدہ اور شرع فقط حدیث پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے لیے جائیں گے۔ ان کی قطبیت ایک باطنی امر ہے، آسے تکلیف شرعی سے کوئی تعلق نہیں۔ اور نص و اشارہ ہر ایک کا اپنے متاخر پر اسی قطبیت سے ہے۔ اور جنہیں آمور امامت کہتے ہیں وہ بھی اسی طرف راجع ہیں، کیوں کہ انہوں نے اپنے بعض خالص یاروں کو اس پر مطلع کیا ہے۔ ایک زمانے کے بعد کچھ لوگوں نے غور کیا اور ان کے کلام کو دوسرے ڈھب سے بیان کیا۔ واللہ مستعان (اور مدد اللہ سے مانگی جاتی ہے۔)

چھٹی وصیت : طریقِ تعلیم علم : تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ (تعلیم دینے کے لیے) پہلے صرف و نحو کے تین تین چار چار مختصر رسالے، جیسا کہ طالب عام کا ذہن ہو، پڑھائے جائیں۔ اس کے بعد عربی زبان میں لکھی ہوئی تاریخ کی یا حکمت عملی کی کوئی کتاب پڑھائیں اور بہ طریق تتبع ساتھ ساتھ لغت اور مشکل سے طالب علم کو آگاہ کیا جائے۔ جب اسے عربی زبان میں مہارت حاصل ہوجائے تو موطا بہ روایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائیں۔ اور اس کتاب کو مطالعے سے ہرگز خارج نہ رکھیں کہ یہ علم حدیث کی بنیاد ہے اور اس کے پڑھنے میں بے شمار فائدے ہیں، اور ہمیں اس کا سماع مسلسل ہے۔ اس کے بعد قرآن عظیم کا درس دیا جائے اور وہ اس طرح کہ پہلے بغیر تفسیر کے صرف قرآن پڑھے اور ترجمہ کرے، اور جہاں نحو یا شان نزول میں کوئی مشکل پیش آئے وہاں ٹھہر جائے اور بحث کرے۔ اس درس سے فراغت پا لینے کے بعد اسے تفسیر جلالین بہ قدر درس پڑھائی جائے۔ اس طریقے میں بڑے فائدے ہیں۔ بعد ازیں ایک وقت میں تو

کتب حدیث مثلاً بخاری اور مسلم وغیرہ اور فقہ[3] و عقاید و سلوک کی کتابیں پڑھے اور ایک وقت میں کتب دانش مندی کا مطالعہ کرے، جیسے شرح ملا جامی اور قطبی وغیرہ، الا ماشاء اللہ۔ اور اگر ممکن ہو تو ایک دن مشکواۃ پڑھے، اور دوسرے دن جتنا کہ پہلے دن پڑھا تھا اسی کے برابر، شرح طیبی کو دیکھے۔ یہ بے حد فائدہ مند ہے۔

ساتویں وصیت: ہم لوگ اجنبی ہیں، کیوں کہ ہمارے آبا و اجداد سرزمین ہند میں بہ طور اجنبی کے آئے تھے۔ اور ہمارے لیے عربی نسب اور عربی زبان دونوں باعث فخر ہیں کہ یہ ہمیں سید اولین و آخرین، افضل انبیاء و مرسلین اور فخر موجودات آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قریب لے جاتے ہیں۔ اس بہت بڑی نعمت کا شکر اس طرح ادا کیا جا سکتا ہے کہ ہم تا بہ مقدور عرب کے، جو آں حضرت صلعم کا مولد ہے، عادات و رسوم کو ہاتھ سے نہ جانے دیں، اور عجم کی رسموں اور ہندووں کی عادات کے نزدیک نہ پھٹکیں۔ ''اخرج البغوی عن ابی عثمان النہدی قال اتانا کتاب عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالٰی عنہ و نحن باذربائیجان مع عتبۃ بن فرقد اما بعد ما فاترزوا ور تدو انتعلوا والقوالخفاف والقوا السراویلات علیکم بلباس ابیکم اسماعیل وایاکم والتنعم و ذی العجم و علیکم بالشمس فانہا حمام العرب و تمعددو واخشو شنوا وا اخلو القعاید و اعطو الرکب و انزوا انزواً و ادمو الاغراض و فی دوایہ وانزوا علٰی ظہور الخیل نزواً۔ (عثمان النہدی نے بیان کیا کہ ''ہمیں حضرت عمر بن خطاب رض کا خط ملا جب کہ ہم آذربائیجان میں عتبہ بن فرقد کے ساتھ تھے۔ اس خط میں تھا کہ تہمد باندھو، چادر اوڑھو، ......الخ)۔ یعنی جب عرب جہاد کے لیے ایران کے اطراف میں پھیل گئے تو حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ' ڈرے کہ مبادا یہ لوگ عجمیوں کی رسمیں اختیار کرلیں اور رسوم عرب کو خیرباد کہہ دیں۔ چنانچہ آپ رض نے ان کی طرف خط لکھا کہ ''تہمد باندھو چادر اوڑھو، جوتے پہنو، موزے پھینک دو، شلواریں چھوڑ دو۔ تمہیں اپنے باپ اسماعیل علیہ کا لباس پہننا چاہیے۔ اپنے آپ کو عجمی تنعم و ہیئت سے دور رکھو، دھوپ میں بیٹھو، کہ یہ عربوں کا

حام ھے ، قوم معد[۵] کی رسم پر رھو ، موٹا لباس پہنو ، جفا کش بنو ، کہنہ پوشی کی عادت ڈالو ، اونٹوں کو تناول کرو یعنی پکڑو اور رام (مطیع) کرو ، گھوڑوں پر جست لگا کر سوار ھو اور تیر نشانوں پر پھینکو''۔

ھندوؤں کی ایک بری رسم یہ ھے کہ جب کسی عورت کا خاوند مر جاتا ھے تو اسے دوسری شادی نہیں کرنے دیتے ۔ یہ رسم عربوں میں قطعاً نہ تھی ؛ نہ تو آں حضرت صلعم سے پہلے نہ آں حضرت صلعم کے زمانے میں اور نہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ھی ۔ خدائے بزرگ و برتر اس شخص پر اپنی رحمت فرمائے جو اس بری رسم و عادت کو مٹائے ۔ اور اگر ممکن نہ ھو کہ یہ عادت عوام الناس سے دور ھو تو اپنی قوم میں ، اس کی بجائے ، عربوں کی عادت و رسم ڈالنی چاھیے ۔ اور اگر یہ بھی ناممکن ھو تو اس رسم کو برا جاننا اور اس کا دل سے دشمن ھونا چاھیے ، کہ نہی منکر کے ادنیٰ مراتب یہی ھیں ۔

آٹھویں وصیت : ھم لوگوں کی ایک بری عادت یہ ھے کہ ھم حق مہر بہت زیادہ مقرر کرتے ھیں ۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ دین و دنیا میں ھمارا شرف آپ صلعم ھی پر ختم ھوتا ھے ، اپنے اھل بیت کا ، کہ برگزیدہ ھستیاں ھیں ، مہر بارہ اوقیہ ونش (اوقیہ = ۴۰ درم ونش = ۱/۲ اوقیہ = ۲۰ درم) یعنی پانچ سو درم مقرر فرمایا ھے ۔

نویں وصیت : ھم لوگوں کی ایک بری عادت یہ بھی ھے کہ ھم خوشیاں منانے کے موقعوں اور بہت سی رسموں پر بڑی فضول خرچی سے کام لیتے ھیں ۔ اس سلسلے میں کچھ حد مقرر ھونی چاھیے ۔ جیسی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشیوں میں مقرر فرمائی ھے ۔ یعنی خوشیاں دو ھیں ، ولیمہ اور عقیقہ ۔ بس ان دو خوشیوں کو اپنانا چاھیے اور ان کے علاوہ جتنی خوشیاں ھیں انھیں ترک کر دیں ، یا (کم از کم) انھیں اپنے اوپر لازم نہ سمجھیں اور ان کا اھتمام نہ کریں ۔

دسویں وصیت : پھر ھم میں یہ بری عادت بھی ھے کہ ھم سوگ کے موقعوں پر اسراف کرتے اور سوم ، چہلم ، ششماھی اور برسی وغیرہ

مناتے ھیں - پہلے عرب میں ان باتوں کا رواج نہ تھا - بہتر یہی ہے کہ تین دن تک مرنے والے کے عزیزوں سے ماتم پرسی کی جائے اور ایک رات دن انہیں کھانا کھلایا جائے - اس کے بعد کوئی اور رسم نہ منائیں - تین دن کے بعد خاندان کی عورتیں جمع ہوں اور مرنے والے کی عورتوں کے کپڑوں میں خوشبو لگائیں - اور اگر (اس کی) بیوی ہے تو وہ عدت کے بعد سوگ ترک کرے -

گیارھویں وصیت : ہم میں خوش بخت شخص وہ ہے جو عربی زبان، صرف و نحو اور کتب ادب سے مناسبت پیدا کرے اور حدیث و قرآن کو سمجھے - فارسی اور ہندی کتب ، علم شعر و معقول اور اسی قسم کے دیگر علوم میں مشغول ہونا اور بادشاہوں کے واقعات اور صحابہ رض کے تنازعات کی تاریخوں کا مطالعہ کرنا سراسر گمراھی ہے - اور اگر زمانے کی رسم کے تقاضے کے طور پر ان علوم میں مشغول ہونا ھی پڑے تو اتنا ضرور جان لے کہ یہ دنیاوی علوم ھیں اور ان سے متنفر ہو اور توبہ و استغفار اور اظہار ندامت کرے - ہم لوگوں کے لیے لازمی ہے کہ ہم حرمین شریفین جائیں اور ان آستانوں پر جبہہ سائی کریں - یہ بات ہمارے لیے باعث سعادت اور اس سے بچنا ہمارے لیے باعث بد بختی ہے -

بارھویں وصیت : حدیث شریف میں آیا ہے ''ومن ادرك منكم عیسیٰ بن مریم فلیقرا منی السلام'' (اور جو کوئی تم میں سے عیسیٰ ابن مریم کو پائے وہ انہیں میرا سلام کہے -) اس فقیر کی بڑی آرزو ہے کہ اگر میں حضرت عیسیٰ روح اللہ کا زمانہ پاؤں تو سب سے پہلے جو انہیں سلام پہنچائے وہ میں ھی ہوں - اور اگر مجھے وہ زمانہ نصیب نہ ھوا تو میری اولاد یا میرے پیروکاروں میں سے جس کسی کو بھی وہ مسرت آثار زمانہ نصیب ھو ، وہ بہ کمال آرزو سلام پہنچائے ، تاکہ محمدیہ لشکروں میں آخری لشکر ہم ھوں - (وصیت نامہ)

خافی خان

[خافی خان نے اپنی تاریخ ۱۷۱۷ء میں لکھنی شروع کی اور ۱۷۳۲ء میں مکمل کر لی - کتاب کا سب سے زیادہ مستند حصہ معاصر واقعات کا بیان ہے ــــ جب عالمگیر کے بیٹے نے سنی عقائد کی بجائے شیعہ خیالات کو اپنایا اور جمعے کے خطبے میں حضرت علیؓ کا ذکر لقب وصی کے ساتھ کروانا چاہا تو اس پر جو کچھ ہوا اس کی تفصیل خافی خان کی زبانی سنیے -]

عہد عالمگیری کے واقعات (۱۱۱۸ھ)

اولاد تیمور بلکہ دھلی کے قدیم بادشاھوں میں سکندر لودھی کے بعد ، ظاھری طور پر ایسا بادشاہ جو عبادت ، ریاضت اور عدل و انصاف میں صاحب امتیاز ھو ، ھندوستان کے تخت پر متمکن نہیں ھوا - وہ (عالمگیر) دلاوری ، متحمل مزاجی اور درست رائے میں بے مثل تھے ، لیکن چوں کہ وہ رعایت شرع کو ملحوظ رکھتے تھے اس لیے سیاست[1] سے کام نہ لیتے تھے - اور ملک کا بندوبست سیاست کے بغیر ناممکن ھے - اُمرا رقابت کے سبب نفاق کا شکار ھو چکے تھے - بادشاہ سلامت جو بھی تدبیر یا منصوبہ بروے کار لاتے وہ کم ھی پروان چڑھتا ، اور جس مہم پر بھی جاتے وہ طول پکڑ جاتی اور انجام کو نہ پہنچتی -

نوے سال کی عمر گزرنے پر بھی ان کے حواس خمسہ میں کسی قسم کا فرق نہ آیا تھا ، سواے سامعہ میں معمولی سے فرق کے اور وہ بھی ایسا کہ کسی دوسرے کو معلوم نہ ھو پاتا - رات کا اکثر

خصہ بیداری اور عبادت میں بسر کرتے اور ایسی اکثر لذات کو ترک کر رکھا تھا جو بشریت کے لیے لازم و ملزوم ہیں ۔

ایک روز ایک بڑھیا کسی ظالم فوجی افسر کی دست درازی کے خلاف شکایت لے کر حضور میں پہنچی ۔ بادشاہ نے اسی وقت مظلومہ کا روپیہ واپس کرنے کا تاکیدی حکم اس کے ہاتھ میں دیا ۔ وہ بڑھیا جا کر پھر لوٹ آئی کہ اس فوجدار نے روپیہ تو واپس نہیں کیا بلکہ اُلٹا مجھ پر پہلے سے بھی زیادہ ظلم کیا ہے ۔ حکم دیا کہ اس فوجدار کو تبدیل کر دیا جائے ۔ بعد میں وہ ستم رسیدہ پھر شکایت لے کر آئی کہ موجودہ فوجدار نے اس روپے کی وصولی کو سابق حاکم کا دستورالعمل قرار دے کر مجھ سے زبردستی اور ظلم سے وہ روپیہ لے لیا ہے ۔ اس کی اس شکایت کے جواب میں فرمایا کہ ''دعا کرو خدا کوئی دوسرا بادشاہ بھیجے ۔'' لیکن ان دو ظالم فوجداروں کی تنبیہ و سزا کا حکم ہر گز صادر نہ فرمایا ۔ سزا دینے میں یہی نرم رویہ تھا جس کے باعث پرگنوں کے حاکم اور فوجدار قانون شکنی پر دلیر ہوگئے تھے۔ گرز بردار جاتے بھی تھے تو رشوت لے کر بس دکھانے کو ، مچلکہ وغیرہ لے کر آ جاتے ۔ (منتخب اللباب)

(۲)

خطبۂ لاہور (۱۱۲۱ھ)

دارالخلافہ لاہور سے یہ خبر موصول ہوئی کہ جب خطبے میں حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہ کے مناقب میں لفظ وصی کے شامل کرنے کا حکم پہنچا تو جان محمد اور حاجی یار محمد ، کہ دونوں لاہور کے جید فاضل تھے ، دیگر علما و فضلا کے ہمراہ عام ہلہ بولتے ہوئے قاضی اور صدر کی رہائش گاہ پر پہنچے اور لفظ وصی کے ساتھ خطبہ پڑھنے میں رکاوٹ ڈالی ۔ اسی طرح پایۂ تخت و مرکز خلافت کے فضلا اور مشائخ نے بہت سے مسلمانوں کی ہمراہی میں مذکورہ حکم کے مطابق خطبہ پڑھنے میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے شورش برپا کی ۔ دوسرے شہروں سے بھی خبر رسانوں نے اسی قسم کی خبریں بادشاہ

تک پہنچائیں ۔ اسی دوران میں احمد آباد کے واقعات سے پتا چلا کہ اہل سنت و جماعت کے ایک گروہ نے جامع مسجد کے خطیب کو لفظ وصی پڑھنے پر قتل کر دیا ہے ۔ اگرچہ جمعے کے روز خطیب کے قتل اور مہر علی خان بخشی اور واقعہ نگار احمد آباد کے محبوس ہونے کے بارے میں (جنھیں خطیب کے قتل کے بعد اتوار کے دن فیروز جنگ کے ایما پر رسوا کر کے کوتوالی کے چبوترے میں قید کر دیا گیا تھا ۔) احمد آباد میں مختلف روایتیں مشہور ہو گئیں ، لیکن چوں کہ راقم حروف (خافی خان) انھی دنوں احمد آباد میں تازہ وارد ہوا تھا ، اس لیے اس سلسلے میں میں نے تا بہ مقدور چھان پھٹک کی ، جس کا مختصر ذکر کرتا ہوں ؛ بعد کا علم خدا کو ہے ۔

جب خطبے میں لفظ وصی پڑھنے کا حکم پہنچا تو احمد آباد کے صدر نے اجازت حاصل کرنے کے لیے وہاں کے صوبہ دار فیروز جنگ کی خدمت میں درخواست لکھی جس کے جواب میں اس نے لکھا کہ خلیفہ کے حکم کے مطابق پڑھو ۔ اس کے بعد جب اس نے جمعے کے روز جامع مسجد میں لفظ وصی کے ساتھ خطبہ پڑھا تو پنجاب کے کچھ لوگوں اور چند ایک تورانیوں نے شورش برپا کر دی ، اور خطیب کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اس جمعے تو ہم نے تجھے ایسا خطبہ پڑھنے پر معاف کر دیا لیکن آئندہ جمعے کو نہیں پڑھو گے ۔ اس نے جواب دیا کہ "میں تو بادشاہ ، صوبہ دار اور صدر کے حکم کے مطابق پڑھتا ہوں ۔" بعد ازیں دوسرے جمعے کے روز جب خطیب منبر پر چڑھا تو ایک مغل نے کہا کہ لفظ وصی ہرگز نہ پڑھنا ، مگر وہ اجل رسیدہ خطیب اس سے باز نہ آیا ۔ چناں چہ جوں ہی خطبہ کے دوران میں لفظ وصی اس کی زبان پر آیا ، ایک پنجابی نے اٹھ کر اس کا دامن پکڑ منبر سے نیچے کھینچا اور خوب ڈانٹ ڈپٹ اور لعنت ملامت کی ۔ ساتھ ہی ایک تورانی مغل نے اچھل کر آزبکی چھری اس کے پیٹ میں گھونپ دی اور اسے منبر سے نیچے گرا دیا ۔ اس پر مسجد میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ خطیب کو نیم جانی کی حالت میں کھینچ کر مسجد کے صحن تک لایا گیا ؛ پھر اسے اس قدر خنجر اور جوتے مارے گئے

که بڑی ہی بے حرمتی کے ساتھ اس نے جان دے دی ۔ اس کے وارث ایک دن اور ایک رات تک اس کی لاش اٹھانے اور کفن دفن کرنے کی جرأت نہ کر سکے ۔ دوسرے روز مقتول کے والدین ماتم کرتے ہوئے فیروز جنگ کے پاس آئے اور اس کی تجہیز و تکفین کی اجازت کے لیے استغاثہ اور درخواست پیش کی ۔ فیروز جنگ نے ان لوگوں کو اس کی تکفین و تدفین کے لیے کچھ روپیہ سرکار کی طرف سے دے کر رخصت کیا۔ اور اس کے تیسرے دن مہر علی خاں بخشی اور واقعہ نگار کو ایک جرم کی بنا پر ، کہ بعض واقعات میں مؤخرالذکر کی جھوٹی خبر رسانی ظاہر ہو چکی تھی ، گھر سے بلوایا اور ذلیل کر کے قید میں بھجوا دیا ۔ پھر تین چار روز کے بعد رہا کر دیا ۔

انھی دنوں فیروز جنگ کے بیٹے خان دوران[۲] کو ، جو اودھ گورکھ پور کی صوبے داری پر مامور تھا ، باوجود اس کے کہ اس نے اپنے تعلقے میں پہنچنے کے بعد بڑا اچھا بندوبست کیا ، بلکہ سہ بندی کے خرچ سے وہ زیر بار بھی ہو گیا تھا ، بغیر کسی قصور کے معزول کر دیا گیا ۔ چناں چہ وہ واپس دربار میں آگیا ۔ لیکن چوں کہ بادشاہ امور سلطنت سے بالکل بے خبر رہتا اور خانہ زاد کارگزاروں کے معاملے میں پورے غور و خوض سے کام نہ لیتا تھا ، اس لیے اس (خان جہاں) نے تنگ آ کر اپنے منصب سے استعفیٰ دے دیا اور گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔ میرزا محمد ہاشم جو سورت کی بندرگاہ سے احمد آباد پہنچا تھا ، فیروز جنگ سے ملنے کے لیے آیا ۔ اس نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لیے بھیجا ۔ جب وہ (ہاشم) گھر کے قریب پہنچا تو فیروز جنگ اسے لینے کے لیے خود چند قدم آگے بڑھا اور مناسب اعزاز کے ساتھ چار پانچ روز تک مہمان رکھ کر اسے پندرہ ہزار روپیہ نقد ، ایک ہاتھی اور چار گھوڑوں سے نوازا اور راقم حروف (خافی خان) کو اپنی طرف سے دیوان اور مہمان دار بنا کر بہ کمال عزت روانہ کیا ۔

(منتخب اللباب)

(۳)

چون کہ خطبے کا معاملہ لاہور کے فضلا کے لفظ وصی پر (جو خطبے میں داخل کیا گیا تھا) اڑنے کے سبب کھٹائی میں پڑا ہوا تھا ، اس لیے بادشاہ نے ان فضلا کے طلب کیے جانے کا حکم صادر کیا۔ ان میں سے حاجی یار محمد اور محمد مراد تین چار مشہور فاضلوں کے ہم راہ آ کر خدمت بجا لائے۔ بادشاہ نے انھیں تسبیح خانے میں بلوا کر بیٹھنے کا حکم دیا اور عبدالقادر خاں کو جو قاضی میر کا بھتیجا ہے ، دو تین فاضلوں کے ساتھ ہم کلام کرایا اور خود بادشاہ نے ان کے سامنے معتبر کتب ، احادیث موافق اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر ائمۂ دین کے اقوال کی رو سے لفظ وصی کے اثبات کے بارے میں روایتیں بیان کیں۔ خاصی بحث و تمحیص ہوئی۔ حاجی یار محمد بادشاہ کے قول کے رد میں بڑی گستاخی اور بڑی بے احتیاطی سے پیش آ کر ان کے ساتھ سوال جواب کرتا رہا۔ آخر بادشاہ نے طیش میں آ کر فرمایا کہ ''کیا تو بادشاہوں کے غضب سے نہیں ڈرتا ، جو اس طرح شاہی آداب محفل کے خلاف قیل و قال کی جرأت کر رہا ہے؟'' حاجی یار محمد نے جواب دیا ''میں اپنے خداوند کریم سے چار چیزوں کی خواہش کیا کرتا تھا : اول تحصیل علم ، دوسری حفظ قرآن پاک ، تیسری حج اور چوتھی شہادت ؛ الحمدللہ! کہ پہلی تین نعمتوں کے حصول میں تو مجھے کام یابی حاصل ہو گئی ہے ، اب صرف شہادت کی آرزو باقی ہے ، سو امید ہے کہ بادشاہ عادل کی عنایت و توجہ سے میری یہ آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔''

بہ ہرحال تحقیق و تنقیح کے لیے اس بحث نے چند روز تک طول کھینچا۔ شہر کے بے شمار عوام بہت سے افغان ثمن داروں (دسہزاری) کی ہم راہی اور ایک لاکھ سے زائد کی تعداد میں حاجی یار محمد کے ساتھ خفیہ طور پر مل گئے۔ شاہ زادہ عظیم الشان[۳] بھی پوشیدہ طور پر اس جماعت کا طرف دار تھا۔ آخر شوال کے آخر میں صدر نے خطبہ پڑھنے کے لیے درخواست گزرانی۔ بادشاہ نے اس درخواست پر لکھا کہ ''خطبہ حضرت

خلد مکانی (عالم‌گیر) کے عہد کے دستور کے مطابق پڑھا جائے۔ حضرت امیرالمؤمنین علی رضی اللہ کے مناقب میں بہت سے الفاظ موجود ھیں، گو لفظ وصی نہیں ہے۔ لیکن چوں کہ عام لوگ اور بدنام قسم کے غنڈے بدمعاش غلط قیاسات کی بنا پر شورش و ھنگامہ کی فکر میں ھیں اس لیے اس بات کی احتیاط کی جائے کہ خطبہ پڑھے جانے کے دوران میں بے سروپا قسم کے شوپسند لوگ مسجد میں داخل نہ ھوں۔" چوں کہ بادشاہ کی اس تحریر کی اطلاع کم ھی لوگوں کو تھی، یہاں تک کہ مقربین بھی اس سے آگاہ نہ تھے، اس لیے ھر قوم اور فرقے کے ھزاروں افراد اپنی اپنی عقل و رائے کے مطابق فاسد خیالات میں پڑ کر مسجد کو چاروں طرف سے گھیرے میں لیے ھنگامۂ فساد کی آواز پر کان لگائے بیٹھے تھے۔ لیکن جب قدیم دستور کے مطابق خطبہ پڑھا گیا تو یہ معاملہ رفع دفع ھو گیا۔ بعد میں یہ معلوم ھوا کہ حاجی یار محمد کو دو دیگر فضلا کے ساتھ معتوب کر کے کسی قلعے میں بھیج دیا گیا۔
(منتخب اللباب)

صمصام الدولہ شاہ نواز خان

[شاہنواز خاں[1] اورنگ آبادی نے مغل امرا کے حالات میں یہ تذکرہ ۱۷۴۲—۱۷۴۷ع میں لکھا۔ اس کی ترتیب و تکمیل شاہ نواز کے بیٹے عبدالخان نے کی ۔ کتاب کی بنیاد معاصر مواد پر رکھی گئی ہے ، اس لیے امرا کے حالات کے لیے بڑی اہم کتاب ہے ۔]

شیخ فرید مرتضیٰ بخاری

صاحب 'اقبال نامہ' لکھتا ہے ''شیخ کا تعلق سادات موسوی سے ہے۔'' اس کی یہ بات غرابت سے خالی نہیں ہے ، اس لیے کہ سادات بخاریہ کی نسبت تو سید جلال بخاری[2] قدس سرہ پر ختم ہو جاتی ہے اور آپ کا سلسلۂ نسب سات پشتوں سے امام بزرگ علی نقی الہادی[3] علیہ السلام تک پہنچتا ہے ۔ کہتے ہیں کہ شیخ کے جد چہارم سید عبدالغفار دہلوی نے بیٹوں کو وصیت کی تھی کہ ''مدد معاش (جاگیر وغیرہ) ترک اور فوج کی ملازمت اختیار کرو ۔'' الغرض شیخ چھوٹی عمر ہی میں عرش آشیانی (اکبر) کی ملازمت میں آ گیا ، اپنے حسن اخلاص اور شائستہ خدمات کے سبب لطف و عنایت کا مورد بن کر قرب و اعتبار سے مختص ہوا ، اور اپنی تجربہ کاری ، خردمندی ، دلیری اور دلاوری سے ناموری حاصل کی ۔

اٹھائیسویں سال جلوس میں ، جب خان اعظم بنگالہ کی آب و ہوا کی ناسازی کے سبب بہار لوٹ آیا اور وزیر خاں[4] پھر سردار سپاہ مقرر ہوا ، تو اڑیسہ کے سرکش قتلو لوہانی نے سرکشی و زیادہ طلبی اختیار کی ۔ بادشاہ نے مجبوراً بنگال کے بھی کچھ علاقے اسے دے دیے

اور یہ طے پایا کہ شیخ فرید مقررہ جگہ پر ملاقات کر کے صلح کی شرطیں اور عہد وغیرہ مضبوط کرے ۔ وہ غدار (قتلو) ملاقات کے مقررہ وقت پر حاضر نہ ہوا شیخ اپنی سادہ دلی اور خیراندیشی کے سبب سخن ساز چرب زبانوں کے کہنے پر اس کی منزل کی طرف روانہ ہوا ۔ قتلو بڑی عاجزی اور چاپلوسی سے پیش آیا ۔ اس نے یہ ترکیب سوچ رکھی تھی کہ جس وقت لوگ اپنی اپنی جگہوں پر آرام کر رہے ہوں گے ، وہ شیخ کو پکڑ کر ایک گوشے میں بٹھا دے گا اور اس طرح اسے اپنے قبضے میں رکھ کر اپنی خواہش میں کامیاب ہو گا ۔ لیکن شیخ نے بھانپ لیا اور رات کے آغاز ھی میں جانے کا ارادہ کیا ۔ مگر قتلو کے آدمیوں نے اصطبل میں ایک گھوڑا بھی نہ چھوڑا تھا ، اور چند ایک جگہوں پر راستہ بھی گھیر رکھا تھا جس کے سبب خاصا معرکہ ہوا ۔ اس دوران میں شیخ اپنے ہاتھی پر سوار ہو گیا ، لیکن شومئی قسمت کہ ہاتھی بے قابو ہو کر غلط راہ پر سرپٹ دوڑا ۔ شیخ ایک ندی میں پہنچ کر اسے پار کرنے کی راہ ھی تلاش کر رہا تھا کہ اچانک ایک گروہ وھاں آن پہنچا ، جس نے تیروں سے شیخ کو ایک آدھ جگہ سے زخمی کر دیا مگر شیخ اپنے آپ کو ایک طرف گرا کر وھاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا ، دشمن نے یہ سمجھا کہ شیخ عماری میں موجود ہے ۔ اسی دوران میں شیخ کے ایک ملازم نے پہنچ کر اسے اپنے گھوڑے پر بٹھا لیا اور لشکر گاہ میں لے آیا ۔ مقررہ صلح پر پانی پھر گیا اور قتلو کو اس غداری کی نحوست کے باعث لڑائی میں پے در پے فرار اور ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔

شیخ تیسویں سال جلوس میں ھفت صدی کے منصب پر سرفراز ہو کر چالیسویں سال جلوس تک ہزار و پانصدی تک پہنچ چکا تھا ۔ پھر بخت کی یاوری سے میر بخشی کا عہدہ پا کر عز و افتخار حاصل کیا ۔ اگرچہ وہ بخشی تھا ، لیکن اس کی حیثیت وزیروں کی سی تھی ۔ دیوان تن کی نا اھلی کے سبب وہ چند سال دفتر تن پر بھی (جو خدمت دیوان کا لازمہ ہے) قابض رہا اور ارباب طلب (تنخواہ دار ملازم) کو تنخواہ کے طور پر جاگیریں دیتا رہا ۔

عرش آشیانی کی وفات کے بعد شیخ نے دو ایسی شائستہ خدمات سرانجام دیں جن کے سبب اس کی ساکھ اور منزلت اپنے معاصرین و ہم مرتبہ لوگوں بلکہ سلطنت کے تمام اعیان و ارکان سے بڑھ گئی ۔

پہلی خدمت تو یہ تھی کہ جنت مکانی (جہانگیر) نے عہد شاہزادگی میں اپنی خودسری کے سبب الہ آباد میں اپنے ملازموں کو خطاب اور منصب[۵] عطا کر کے جاگیریں تقسیم کی تھیں ؛ اس پر عرش آشیانی نے ان کے بڑے بیٹے سلطان خسرو کی عزت و آبرو میں اضافہ کردیا تھا جس سے لوگوں کو یہ گمان گزرا کہ شاہ زادہ خسرو ولی عہد بنایا جائے گا ۔ بعد میں جب شاہ زادہ (سلیم) دربار میں پہنچا تو ہنوز اس کے دماغ میں شورش تھی ؛ بادشاہ (اکبر) اس سلسلے میں سستی اور سہل انگاری سے کام لے رہے تھے ؛ جب شاہ زادے کے آدمی گجرات گئے ہوئے تھے ، جو انھی دنوں ان (سلیم) کی جاگیر مقرر ہوا تھا ، تو عرش آشیانی نے مرض الموت کے دنوں میں اشارتاً کہا تھا کہ شاہ زادہ قلعے سے باہر خانہ‌نشین ہو جائے تاکہ مخالفین کسی عذر سے کام نہ لے سکیں ۔ میرزا عزیز کوکلتاش[۶] اور راجا مان سنگھ[۷] چوں کہ سلطان خسرو سے خاص قرابت رکھتے تھے ، انھوں نے اس (خسرو) کی بادشاہت کے خیال سے قلعے کے دروازے اپنے آدمیوں کے حوالے کر دیے اور خضری دروازہ اپنے آدمیوں کی شراکت میں شیخ فرید کے سپرد کر دیا ۔ شیخ کو ، کہ اس کے اختیار میں فوج تھی ، یہ بات نہایت ناگوار گزری ؛ وہ قلعے سے باہر نکلا اور شاہ زادے کے پاس پہنچ کر اسے رسمی طور پر سلطنت کی مبارک باد دی ۔ امرا نے جب یہ سنا تو وہ ہر طرف سے اُمنڈ آئے اور ابھی عرش آشیانی نزع ہی کے عالم میں تھے کہ راجا مان سنگھ کو صوبۂ بنگالہ کی بحالی پر مامور کر دیا گیا ۔ جنت مکانی قلعے میں داخل ہو کر تخت پر جلوہ افروز ہو گئے اور شیخ فرید کو 'صاحب سیف و قلم' کے الفاظ سے مخاطب کرکے پنج ہزاری کے منصب اور میر بخشی گری کی اعلیٰ خدمت پر سرفراز فرمایا ۔

دوسری خدمت یہ تھی کہ جن دنوں خوشامدیوں کی بیہودہ گوئی

کے سبب سلطان خسرو کے سر میں حکومت کی ہوا سمائی اور وہ اپنے بلند اقبال باپ کے پہلے سال جلوس (۱۰۱۴ھ) میں آٹھویں ذالحجہ کو رات کےوقت فرار اختیار کرکے لوٹ مار کرتا ہوا آگرہ سے لاہور پہنچ گیا تو بادشاہ نے شیخ فرید کو کئی ایک امرا کے ساتھ اس کے تعاقب پر متعین کیا اور جنت مکانی خود بھی اس کے تعاقب میں فوراً روانہ ہو گئے - امیر الامرا شریف خاں[8] اور مہابت خاں[9] (جن کی شیخ سے بنتی نہ تھی) نے چغلی کھائی کہ شیخ جان بوجھ کسر سستی کر رہا ہے اور خسرو کو پکڑنے کا ارادہ نہیں رکھتا - چناں چہ مہابت خاں نے جا کر بادشاہ کی طرف سے آسے (شیخ) کچھ تہدید آمیز باتیں کہیں- شیخ نے بڑی متحمل مزاجی سے اپنے اخلاص کے شایاں جواب کہلا بھیجا - ادھر سلطان خسرو کو جب پتا چلا کہ شیخ سلطان پور کے قریب آ پہنچا ہے تو اس نے لاہور سے محاصرہ اٹھا لیا اور ان بارہ ہزار سواروں کو ساتھ لے کر مقابلے کی ٹھانی جو اس نے ان چند دنوں میں اکٹھے کر لیے تھے - شیخ کے پاس تھوڑی سی فوج تھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جنگ کے لیے تیار ہو گیا اور دریاے بیاس سے گزر کر غنیم کے مقابلے میں آ گیا - بڑے گھمسان کا رن پڑا - بہت سے سادات بارھہ و بخاری بہادری کے جوہر دکھاتے ہوئے کام آئے - سلطان خسرو نے بہت سوں کو قتل کرکے راہ فرار اختیار کی اور شیخ میدان جنگ سے کچھ ادھر خیمہ زن ہوا -

اسی شب دو تین پہر گزرنے کے بعد جنت مکانی نے بڑی سرعت سے وہاں پہنچ کر شیخ کو آغوش میں لے لیا اور رات اس کے خیمے میں بسر کی - پھر شیخ کی التماس پر اس جگہ کو ، کہ پرگنۂ بھیروں وال میں تھی ، پرگنہ بنا کر فتح آباد کے نام سے موسوم اور شیخ کو عنایت کیا - ساتھ ہی شیخ کو مرتضی خاں کے خطاب اور گجرات کی صوبہ داری سے نوازا - دوسرے سال شیخ نے گجرات سے بدخشانی لعل کی ایک انگوٹھی نذر کے طور پر بھیجی ، جس کا نگین ، نگین رکھنے والی جگہ اور حلقہ سب ایک ہی پتھر سے تراشے گئے تھے ، اور وزن

ایک مثقال اور پندرہ سرخ اور رنگ نہایت ہی عمدہ تھا ۔ اس انگوٹھی کی قیمت پچیس ہزار روپے آٹھی ۔

چونکہ گجرات کے لوگوں نے شیخ کے بھائیوں کے سلوک و رویہ سے تنگ آ کر داد و فریاد کی تھی ، اس لیے آسے دربار میں طلب ، اور پانچویں سال جلوس میں پنجاب کی صوبہ داری پر مامور کیا گیا - ۱۰۲۱ھ میں اسی صوبے کے ایک شہر کانگڑہ کی مہم پر مامور ہوا - ۱۰۲۵ھ جہانگیر کے گیارھویں سال جلوس میں اس نے پٹھانکوٹ کے مقام پر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ۔

اس کی قبر دھلی میں اپنے آبا و اجداد کے مقبرے میں ھے ۔ اس کی وصیت کے مطابق وھاں ایک عمارت بنائی گئی جس کی تاریخ تعمیر ''داد ، خورد ، برد'' ۱۰۲۵ھ (اس نے دیا ، اس نے کھایا ، وہ لے گیا) کے الفاظ سے نکلتی ھے ۔ اس عمارت پر ایک ہزار اشرفی صرف ھوئی ۔

شیخ آراستہ ظاہر و باطن کا مالک اور شجاعت اور سخاوت دونوں کا مجموعہ تھا ۔ اس کی بخشش عام نے لوگوں پر فیض کا دروازہ کھول دیا ۔ جو کوئی بھی اس کے پاس جاتا خالی ھاتھ واپس نہ آتا ۔ دربار تک پہنچتے پہنچتے قبا ، کمبل ، چادر اور جوتی راستے میں بیٹھے ھوئے فقیروں درویشوں میں بٹ جاتی ۔ اشرفی اور روپے کی ریزگاری اپنے ھاتھوں سے بانٹتا ۔ ایک دن ایک درویش نے کوئی سات مرتبہ اس سے خیرات حاصل کی ۔ آٹھویں دفعہ جب وہ آیا تو شیخ نے اسے آھستہ سے کہا کہ جو کچھ تو نے سات مرتبہ حاصل کیا ھے آسے چھپا کر رکھ تاکہ دوسرے درویش تجھ سے چھین نہ لیں ۔ خانقاہ نشینوں ، اھل توکل' ضرورت مندوں اور بیوہ عورتوں کے روزانہ و سالانہ وظیفے مقرر کر رکھے تھے ، جو آنھیں اس کی موجودگی و غیر موجودگی میں بغیر کسی سند یا پروانے کے برابر ملتے رھتے ۔ اس کی جاگیر میں زیادہ تر 'مدد معاش' تھی ۔ جو لوگ اس کی نوکری کے دوران میں فوت ھوئے ، ان کے بچوں کی ، ھر کسی کے حسب حال ، تنخواہ مقرر کر دی ۔ ایسے بچے اس کے اپنے بچوں کی مانند اس کی گود اور پہلو میں کھیلتے اور استاد نگہ داری کے ساتھ ان کی تربیت کرتا ۔

گجرات میں جتنے سید گھرانے تھے ، ان سب کے چھوٹے بڑوں کی فہرست بنوا رکھی تھی اور ان کی اولاد کے شادی بیاہ کا ساز و سامان اپنی سرکار سے مہیا کرتا ۔ حتیٰ کہ حاملہ عورتوں کو کچھ روپیہ پیسہ امانت کے طور پر دے دیتا ، پھر ان کے ہاں جو بچہ پیدا ہوتا اس کی شادی اسی روپے سے سر انجام پاتی ۔ اس کے برعکس اس نے ڈوم ڈھاریوں وغیرہ کو کبھی کچھ نہ دیا ۔

شیخ نے کئی ایک سرائیں اور مسافرخانے بنوائے ۔ احمد آباد میں بخارا نام کا ایک محلہ آباد کیا ؛ شاہ وجیہ الدین[10] کی مسجد اور روضہ اسی کے بنا کردہ ہیں ۔ دہلی میں عمارتوں اور تالابوں پر مشتمل فرید آباد کا علاقہ بطور یادگار کے چھوڑا ۔ لاہور میں بھی ایک محلہ اور اس کے چوک کا بڑا حمام تعمیر کروایا ۔

شیخ شاہی کارندوں کو جو اس سے متعلق ہوتے تھے ، سال میں تین مرتبہ فاخرہ خلعتیں اور کچھ روپیہ بھی عطا کرتا ۔ اور اپنے نوکروں کو سال میں ایک خلعت ، پیادوں کو کمبل اور حلال خوروں (خاکروب) کو جوتی دیتا ۔ اس طریقے کو اس نے اپنا معمول بنا لیا تھا اور مرتے دم تک اس میں کوئی فرق نہ آنے دیا ۔ اپنے بعض احباب کو جو صاحبان جاگیر بھی تھے ، ایک لاکھ روپیہ سالانہ بھیجا کرتا تھا ۔ تین ہزار عمدہ و چیدہ گھڑ سوار ہر وقت اپنی نگہ داشت میں رکھتا ۔ عرش آشیانی (اکبر) کے زمانے سے لے کر جنت مکانی کے عہد تک کبھی حویلی میں نہ گیا ؛ ہمیشہ پیش خانے میں حاضر رہتا تھا ۔ تین چوکیاں مقرر کر کے ہر روز ایک ہزار یا پانچ سو آدمیوں کو کھانا کھلاتا اور دیگر پانچ سو کا حصہ بھجوا دیتا ۔ لشکریوں کو اپنی موجودگی میں تنخواہ دلاتا اور ان کے ہنگامہ و شور و غوغا سے ہرگز ناخوش نہ ہوتا تھا ۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ترین قبیلے کا ایک پٹھان شیر خاں ، جو ایک جانا پہچانا ملازم تھا ، گجرات سے رخصت لے کر اپنے وطن کو گیا اور وہاں پانچ چھ برس تک مقیم رہا ؛ جب شیخ فرید کانگڑہ کی

مہم پر مامور ہوا تو مذکورہ پٹھان قصبۂ کلانور میں پہنچ کر حاضر خدمت ہوا ۔ شیخ نے اپنے بخشی دوارکا داس سے کہا کہ ''اس شخص کو خرچ دے دو تاکہ یہ اپنے قبیلے والوں کو دے کر لوٹ آئے ۔'' بخشی نے اس کے خرچ کی فرد تیار کر کے تاریخ کے لیے شیخ کے ہاتھ میں دی ؛ شیخ برہم ہو کر بولا ''یہ پرانا نوکر ہے ، اگر کسی سبب سے اسے تاخیر ہوگئی تو کون سی قیامت آ گئی ، ہمارا کوئی کام تو نہیں رکا ؟'' چناں چہ جب سے اس کی تنخواہ سرکار میں تھی ، اسی تاریخ سے حساب کر کے اس پٹھان کو سات ہزار روپیہ دیا گیا ۔

سبحان اللہ ! اگرچہ شب و روز کا چکر اور ستاروں اور آسمانوں کی گردش اسی طرح ہے ، لیکن اس زمانے میں یہ ملک ایسی ہستیوں سے خالی ہے ۔ ممکن ہے یہ لوگ اب کسی دوسرے ملک کے حصے میں آ گئے ہوں ۔

شیخ کا کوئی بیٹا نہ تھا ، ایک لڑکی رہ گئی تھی سو وہ بے چاری بھی بے اولاد ہی فوت ہوئی ۔ محمد سعید اور میر خاں شیخ کے لے پالک تھے ۔ دونوں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے اور بے حد اسراف سے کام لیتے ؛ تکبر اور بد دماغی کے سبب شاہی عظمت کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے؛ پھر بھلا مجھ ایسے کا کیا ذکر ۔ شاہی محل کے جھروکے کے سامنے دریاے جمنا میں بے شمار فانوسوں اور مشعلوں کے ساتھ سیر کیا کرتے تھے ؛ کئی مرتبہ انہیں اس سے منع کیا گیا ، لیکن وہ باز نہ آئے تا آں کہ جنت مکانی نے مہابت خاں کو اشارہ کیا ؛ اس نے راجی سید مبارک مانکپوری سے جو اس کا معتبر ملازم تھا ، کہا کہ انہیں اس طرح ختم کر کہ کسی کو پتا نہ چلنے پائے ۔ چناں چہ ایک رات جب میر خاں دربار سے اٹھ کر آرہا تھا تو سید نے اسے راستے ہی میں ختم کر دیا ، لیکن خود بھی اس کے ہاتھوں زخمی ہوا ۔ شیخ فرید نے قصاص کے لیے مہابت خاں پر دعویٰ کیا ؛ اس (مہابت) نے بادشاہ کے سامنے معتبر اشخاص کی گواہی سے یہ ثابت کیا کہ میرخاں کا قاتل محمد سعید ہے جس پر محمد سعید کو بہ طور قصاص موت کے گھاٹ اتار دیا گیا ۔ شیخ نے مجلس کی کیفیت سے اصل مدعا کو بھانپ کر خاموشی اختیار کی اور قصاص سے ہاتھ اٹھا لیا ۔
(مآثرالامرا ، جلد دوم)

دانش مند خاں

نام ملا شفیع ، یزد کا رہنے والا تھا ۔ مدتوں سرزمین ایران میں فضائل و کمالات کے اکتساب میں مصروف رہا ۔ مروجہ علوم عقلی و نقلی حاصل کرنے کے بعد جائز روزی کمانے کے لیے اس نے ایران کے تاجروں سے کچھ رقم مضاربت کے طور پر لی اور ہندوستان کی وسیع مملکت میں ، کہ ارباب آرزو اور اصحاب امید کے لیے حصول نفع کا گھر ہے ، وارد ہو کر کچھ عرصہ شاہی لشکر گاہ میں گزارا ۔ پھر دارالخلافہ آگرہ سے دارالسلطنت لاہور تک اور لاہور سے کابل تک اسی لشکر کے ہم راہ رہا ۔ جب شاہی اشکر کابل سے واپس لوٹا تو وطن جانے کے ارادے سے بندرگاہ سورت پہنچا ۔ لیکن چوں کہ اس کا نصیبہ رو بہ بیداری اور بخت اس کا یاور تھا ، اس کے فضل و کمال کا شہرہ فردوس آشیانی (شاہجہاں) کے کانوں تک پہنچا ؛ بادشاہ نے بندرگاہ مذکور کی مہمات کے پیش کاروں کے نام فرمان بھیجا کہ ملاّ کو دربار معلیٰ میں روانہ کریں ۔ چناں چہ وہ بخت کی راہ نمائی اور نصیبے کی رہبری میں بندرگاہ سورت سے پایۂ تخت کو روانہ ہوا اور نویں ذی الحجہ (چوبیسویں سال جلوس) کو اس عالی مرتبہ دربار کی آستاں بوسی سے مشرف ہو کر کامرانی و خوش حالی سے ہم کنار ہوا ۔

جب اس اہل عنایات بادشاہی کی استعداد و قابلیت کے مدارج بار بار اعلیٰ حضرت کے ذہن نشیں ہوئے تو اس فضیلت پرور اور دانا نواز بادشاہ نے اسے اپنی نظر تربیت کا منظور نظر بنا کر ہزاری صد سوار کے منصب سے سرفراز کیا اور حکم ہوا کہ روز یک شنبہ (اتوار) کی پیشکش ایک سال تک اس (ملا) کے انعام کی رقم میں واگزار کریں ۔ بعدازیں ملا کے منصب میں اضافہ کر کے انتیسویں سال جلوس میں لشکر خاں[11] کی تبدیلی پر اسے بخشی دوم بنا دیا اور دانش مند خاں کے خطاب سے نواز کر اور پانصدی دو صد سوار کے اضافے سے دو ہزار و پانصدی ، شش صد سوار کے منصب پر مامور کر کے اس کا سر بلند کر دیا ۔ اکتیسویں سال جلوس میں سہ ہزاری ہشت صد سوار کے منصب پر فائز ہوا ۔ جب اعتقاد خاں[12] کی تبدیلی ہوئی تو ملا اس کی

جگہ میر بخشی بنا دیا گیا ، لیکن اسی سال اس نے اس خدمت سے استعفیٰ دے کر دھلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی ۔

عالمگیر کے دوسرے سال جلوس میں پھر سے الطاف خسروی کا مورد بنا اور چہار ہزاری دو ہزار سوار کے منصب پر فائز ھوا ۔ ساتویں سال کے آغاز میں پنج ہزاری کا بلند منصب پا کر بلند رتبہ ٹھہرا ۔ آٹھویں سال میں دھلی کی صوبہ داری اور قلعۂ دھلی کی نگہ بانی پر مامور ھوا ۔ دسویں سال جلوس میں محمد امین خاں[۱۳] کی تبدیلی پر میر بخشی کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا اور ساتھ ھی قلم دان مرصع عطا ھوا ۔ بارھویں سال جلوس میں جب ظفر آثار عالمگیری جھنڈے مستقر خلافت کی طرف لہرائے تو میر بخشی کے عہدے کے علاوہ دارالخلافے کا نظم و نسق بھی اس کے سپرد ھوا ۔ تیرھویں سال جلوس ، دسویں ربیع الاول سنہ ۱۰۸۰ ھ کو اس نے وفات پائی ۔

یہ ستودہ خصائل امیر بہت بڑا فاضل اور اپنی نیک نفسی و نیک اندیشی کے لیے مشہور تھا ۔ اس کے بعد سے اب تک بلند مرتبہ امرا میں سے کوئی بھی ایسا نہیں اٹھا جو فضیلت و امارت دونوں کا مجموعہ ھو ۔ کہتے ھیں کہ جب یہ شاھی ملازمت میں آیا تو بادشاہ کی طرف سے اسے ملا عبدالحکیم سیالکوٹی کے ساتھ علمی مباحثہ و مناظرہ کرنے کا اشارہ ھوا ۔ ملا عبدالحکیم اپنے علم و دانش کے سبب اساتذۂ قدیم سے بھی سبقت لے گئے تھے ۔ ھندوستان میں ان سے بہتر عالم نہیں ملتا اور بہت سی معتبر کتب پر ان کے بے حد فاضلانہ حواشی اس بات کی بین دلیل ھیں ۔ چناں چہ دونوں فاضلوں میں واو عطف (ایاک نعبد و ایاک نستعین) پر بڑی طویل بحث ھوئی ۔ جب خاصا وقت گزر گیا تو علامی سعد اللہ خاں کو ، جو علم میں عَلَم تھا ، ثالث بنایا گیا ۔ آخر دونوں برابر ٹھہرے ۔ اس روز سے یہ بادشاہ کا منظور نظر بنا اور امارت کے رتبے تک پہنچا ۔ اور یہ جو کہتے ھیں کہ خان مذکور آخری عمر میں فرنگیوں کے علم کی طرف مائل ھو گیا اور ان کے اکثر احکام تحریفات کی تکرار کیا کرتا تھا تو اس کے فضل و کمال کو مد نظر رکھتے ھوئے یہ بات کچھ بعید معلوم ھوتی ہے ۔ (مآثر الامرا)

علامی سعد اللہ خاں

صوبۂ لاہور کے قصبۂ جھنوٹ (چنیوٹ) کے شیخ زادوں میں سے تھا؛ اصل اس کی قریش کے قبیلے بنی تمیم[۱۴] سے تھی۔ ذہن رسا اور فکر درست کا مالک اور کثرت معلومات اور وسعت مطالب میں بے مثل تھا۔ اوائل عمر میں عقلی و نقلی علوم کی تحصیل میں مشغول ہوا اور قرآن مجید حفظ کرنے کے علاوہ تقریر و تحریر میں مہارت بہم پہنچائی۔ جب اس کا شہرہ فردوس آشیانی (شاہجہاں) تک پہنچا تو چوں کہ وہ جوہر قابل کے پرستار اور لائق لوگوں کے جویا تھے، انھوں نے چودھویں سال جلوس میں موسوی خاں[۱۵] صدر کو اسے شاہی ملازمت میں لانے کے لیے فرمایا۔ دربار میں حاضر ہونے کے بعد جب اس کی کاردانی و کارگزاری کے جوہر نمایاں ہوئے تو اسے ملازمین شاہی کے زمرے میں منسلک کر لیا اور خلعت اور گھوڑا عطا فرمایا؛ ساتھ ہی 'عرض مکرر' کا تعلقہ (جو صرف معتمدوں کے لائق ہوتا ہے) تفویض کر کے اسے سربلندی بخشی۔ پندرھویں سال جلوس میں اصل و اضافے سے ہزاری دو صد سوار کے منصب اور سعداللہ خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں دولت خانۂ خاص کی داروغگی پر فائز ہوا، کہ جس کے لائق صرف سچی عقیدت رکھنے والے خیر خواہ ہوتے ہیں۔

واضح ہو کہ دولت خانۂ[۱۶] خاص اس عمارت کو کہتے ہیں جو شاہی حرم سرا اور دیوان خاص و عام کے درمیان تعمیر کی جاتی ہے، اور بادشاہ دربار عام سے اٹھ کر چند خاص مقدمات کے فیصلوں کے لیے وہاں آ کر بیٹھتا ہے۔ ایسے مقدمات سے صرف مقربین ہی آگاہ ہوتے ہیں۔ اور چوں کہ یہ عمارت حمام سے متصل واقع ہوتی ہے اس لیے عہد عرش آشیانی سے بعد تک اسے غسل خانہ کہا جاتا رہا۔ جب اعلیٰ حضرت (شاہجہاں) تخت نشین ہوئے تو انھوں[۱۷] نے اسے دولت خانۂ خاص کے نام سے موسوم کیا۔

سولھویں سال جلوس میں علامی کے منصب میں پانصدی صد سوار کا اضافہ اور ایک ہاتھی مرحمت ہوا۔ سترھویں سال دولت خانۂ خاص کی داروغگی سے معزول ہو کر اصل و اضافے سے دو ہزاری پانصد سوار

کے منصب تک پہنچا ؛ ساتھ ھی خانسامانی^{۱۷} کی خلعت سے نوازا گیا ۔ خانسامانی کے بعد وزارت کا عہدہ آتا ھے ۔ اٹھارویں سال جب بیگم صاحب کا جشن صحت منایا گیا ، جو بدن پر شمع کی لو لگنے سے کچھ عرصہ صاحب فراش رھی تھیں ، تو اسے خلعت عنایت ھوئی اور اصل و اضافہ سے دوھزار و پانصدی شش صد سوار کا منصب اور علم عطا ھوا ، پھر منصب میں پانصدی کا اضافہ ھوا ۔ بعد ازاں پانصدی دو صد سوار کے مزید اضافے سے سرفراز کیا گیا ۔ کچھ عرصہ بعد خان دوران کے انتقال پر جب اسلام خان کو صوبجات دکن کی حکومت تفویض ھوئی تو اس کی جگہ اسے دیوانئی خالصہ کی خدمت سپرد اور خلعت عنایت کی گئی ، ساتھ ھی فرمانوں کے مضامین کے مسودے تیار کرنے ، ان کو دبیروں تک پہنچانے اور شاہزادہ دارا شکوہ کے ، جو فرامین کی پشت پر اپنے دست خاص سے لکھا کرتے تھے ، فرامین و خطوط وغیرہ کے نیچے اپنی تصدیق لکھنے کی خدمت پر مامور ھوا ۔ پھر منصب میں اضافہ ھونے کے سبب چھار ھزاری ھزار سوار کے مرتبے تک پہنچا اور مرصع قلم دان پا کر اپنے بخت کی پیشانی کو منور کیا ۔ تھوڑی ھی مدت میں وزارت کل کے اعلیٰ رتبے سے سرفراز ھوا اور بادشاہ کی طرف سے خلعت اور پھول کٹارہ کے ساتھ مرصع جمدھر عطا ھونے کے علاوہ منصب میں اضافہ ھوا اور پنج ھزاری ھزار و پانصد سوار کے مرتبے پر پہنچ کر ترقی کی حدوں سے آگے نکل گیا ۔ انیسویں سال منصب میں پانصد سوار کا اضافہ اور نقارہ عطا ھوا ۔ بعد ازاں اس کے منصب میں ھزاری کا مزید اضافہ کیا گیا اور چاندی کے سامان سے مزین ھاتھی اور ایک ھتھنی (سادہ) انعام میں پا کر ھم عصروں میں سربلندی حاصل کی ۔

جن دنوں شاہ زادہ مراد بخش ، کہ بلخ و بدخشاں کی تسخیر پر متعین ھوا تھا ، کابل پہنچ کر فوج کے مقررہ طویل راستے پر پڑی ھوئی برف کے ھٹنے کے انتظار میں خیمہ زن تھا ، تو اس وجہ سے کہ اس سرزمین کی دوری اور مہم کی طوالت کے پیش نظر شاھی حکم صادر ھوا تھا کہ منصب داران نقدی[۱۶] ، احدیوں ، تیر اندازوں ، گھوڑ سوار برق اندازوں ، پیادہ تفنگ داروں اور دیگر نوکروں چاکروں کو تین ماہ

کا خرج ، اور جاگیرداروں کو، کہ جن کا داغ[۲۰] حاصل جاگیر کے مطابق مقرر ہے ، ان کی جاگیروں کا چوتھا حصہ ، کہ وہ بھی تین ماہ ہی بنے، بطور مدد کے خزانے سے دیا جائے تا کہ ان لوگوں کو خرچ کے معاملے میں کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے (اور بعض کو یہ رقم لاہور میں نہ مل سکی تھی)۔۔اور کچھ شاہزادے کی طفل مزاجی اور اس کے خوشامدیوں کی باتوں سے اثر پذیری کے باعث (جو فتح بلخ کے بعد پورے طور پر ظاہر ہوئی) اعلیٰ حضرت نے اسی سال ، جب کہ وہ خود لاہور سے کابل کی طرف متوجہ ہو کر باغ صفا میں ٹھہرے ہوئے تھے ، سعد اللہ کو شاہزادے تک بعض معاملات پہنچانے ، جن لوگوں کو مذکورہ رقم نہ مل سکی تھی انھیں وہ رقم دینے اور شاہی لشکر کے کابل پہنچنے سے پہلے پہلے شاہ زادے کی افواج کو منزل مقصود کی طرف روانہ کرنے کے لیے بھیجا ۔ اس نے دو روز میں کابل پہنچ کر بڑی تگ و دو سے کام لیا ؛ پانچ روز کے اندر اندر ، کہ اس کے پہنچنے سے شاہی لشکر کے وہاں وارد ہونے تک کا فاصلہ تھا ، تمام معاملات سر انجام دے لیے اور شاہ زادے کو افواج کے ساتھ منزل مقصود کی طرف روانہ کرکے خرد نواح کابل میں خدمت شاہی میں پہنچ گیا ۔

(واضح ہو کہ شاہجہاں بادشاہ کے عہد میں قرار پایا تھا کہ اگر کوئی اس صوبے میں جاگیر رکھتا ہو جہاں وہ تعینات ہو تو وہ اپنے ماتحتوں کا تقریباً تیسرا حصہ داغ میں پہنچائے ۔ مثلاً جس کا منصب سہ ہزاری ذات سہ ہزار سوار ہو ، وہ ہزار سوار داغ کرے ۔ اگر ہندوستان کے کسی دوسرے حصے میں کسی کام پر متعین ہو تو چوتھا حصہ ؛ اور بلخ و بدخشاں کی مہم کے دوران میں مسافت کی دوری کے باعث ، پانچواں حصہ داغ کرنا طے پایا تھا ۔)

بیسویں سال جلوس میں علامی منصب میں اضافہ ہونے کے سبب شش ہزاری چہار ہزار سوار کے مرتبے پر پہنچا اور سر بلندی حاصل کی ۔ فتح بلخ کے بعد جب شاہ زادہ مراد کا دل اس جگہ نہ لگا اور اس نے باپ کو لکھا کہ کسی اور کو وہاں متعین کیا جائے تو

اعلی حضرت نے سعد اللہ کو اس طرف روانہ کر دیا (اگرچہ رازدانی اور کثرت کار کے سبب اس کی دوری دشوار تھی) تاکہ شاہ زادے تک پیغام پہنچائے ۔ اور ساتھ ہی آسے (سعد) یہ کہہ دیا کہ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ (مراد) اس علاقے کی صوبہ داری کے استعفیٰ سے نادم نہیں ہے تو اس سے ملاقات نہ کرے ، اور دوسروں کو بھی اس سے روکے ۔ چناں چہ سعد اللہ قرب مسافت کی بنا پر خنجان کی بے حد دشوار گزار راہ سے پندرہ روز میں بلخ پہنچا ۔ اور جب وہاں پہنچ کر اس نے شاہ زادے کو مستعفی ہونے پر مصر ہی پایا تو بادشاہ کے ارشاد کے مطابق خود ہی وہاں کے تمام امور کو سرانجام دے کر چار روز میں سب پست و بلند طے کرتا ہوا بلخ سے کابل پہنچا ۔ چوں کہ اس نے وہاں کے تمام آمور مزاج سلطانی کے مطابق نپٹائے تھے ، اور صوبے کا بند و بست بھی نہایت عمدہ طریقے سے کیا تھا ، اس لیے اس کے منصب میں اضافہ کرکے اسے شش ہزاری پنج ہزار سوار کے اعلیٰ رتبے سے سرفراز کیا گیا ۔ بعد ازاں مزید ہزار سوار کے اضافے سے اس کی 'ذات' و 'تابیناں'[۲۱] مساوی ہو گئے ۔ تھوڑی ہی مدت بعد وزن قمری کے جشن[۲۲] کے موقع پر اس کا منصب بڑھا کر ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کر دیا گیا اور ساتھ ہی سونے کی زین سے مزین عربی گھوڑا عطا ہوا ۔ اکیسویں جشن تخت نشینی پر ، جو دارالخلافۂ دہلی کے نو تعمیر محلات میں منایا گیا ، اسے بانادری کی خلعت عطا ہوئی اور اس کے تابینوں سے ایک ہزار سوار کو دواسپہ سہ اسپہ مقرر کرکے اس کی عزت افزائی کی گئی ۔ بائیسویں سال جلوس میں جب بادشاہ جھجر کے مقام سے تین کوس دور سفیدوں کے علاقے میں شکار کے لیے گیا اور وہاں سے واپسی پر آسے قندھار کے قلعہ دار خواص خاں اور بست کے قلعہ دار پر دل خاں[۲۳] کے خطوط ملے ، جن میں شاہ صفی[۲۴] کے بیٹے شاہ عباس[۲۵] کے قندھار کی طرف بڑھنے کی خبریں تھیں ، تو سعد اللہ کو جو کارہائے دیوانی تی انجام دہی کے لیے دارالخلافہ میں ٹھہر گیا تھا حضور میں طلب کیا گیا اور اس کے تابینوں میں سے مزید دو ہزار سواروں کو دو اسپہ سہ اسپہ قرار دے کر اسے شاہ زادے محمد اورنگ زیب بہادر

کے ساتھ قندھار کی جانب بھیجا گیا ۔ وہاں پہنچ کر اس نے محاصرے کے لوازم کی تیاری مثلاً مورچوں کی تعیین ، کوچۂ سلامت (بہت ٹیڑھی اور پر پیچ خندق جو اہل محاصرہ اپنے مورچے کے درمیان بناتے اور اس کے ان پیچوں کی آڑ میں غنیم کے قلعے تک پہنچتے ہیں ۔) کی تیاری اور نقب لگانے وغیرہ میں ایک لمحہ بھی آرام اور کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا ۔

چوں کہ اس قلعے کی فتح مقدر میں نہ تھی اور کچھ موسم سرما بھی آن پہنچا تھا ، اس لیے وہ بادشاہ کے حسب حکم شاہزادۂ مذکور کے ساتھ واپس لوٹ آیا ۔ تیئیسویں سال اس کے تابینوں میں سے دیگر دو ہزار سواروں کو دو اسپہ سہ اسپہ مقرر کیا گیا اور منصب میں اصل و اضافہ سے ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار تک پہنچا ۔ ان سات ہزار سواروں میں سے پانچ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ تھے ۔ بعد ازاں ایک کروڑ دام (چالیس دام کا ایک روپیہ) کہ مجموعۂ تنخواہ بارہ کروڑ دام بنتے ہیں، انعام میں پاکر سر عزت بلند کیا ۔ پچیسویں سال جلوس میں جب بادشاہ لاہور سے کشمیر کی طرف گیا تو اسے وزیر آباد کے مقام پر صوبۂ پنجاب کے حالات کی تحقیق کے لیے چھوڑ گیا ، جہاں پہلے بارش کی کمی اور پھر اس کی کثرت کے سبب فصلوں کو بہت نقصان پہنچا تھا ۔ چناں چہ وہ کچھ عرصہ وہاں رہ کر پھر بادشاہ سے جا ملا ۔ اسی سال بے شمار فوج اور ساز و سامان کے ساتھ دوبارہ شاہزادہ اورنگ زیب کی ہمراہی میں تسخیر قندھار کی مہم پر مامور ہوا ۔ شاہزادہ ملتان سے براہ راست (یعنی دریائے سندھ کے کنارے سے ججہ ، چتالی اور فوشنج سے ہوتے ہوئے سیدھا قندھار ، یہ راستہ جریب کے حساب سے ایک سو ساٹھ کوس بنتا ہے)، اس طرف متوجہ ہوا اور سعد اللہ کابل و غزنین کے راستے سے روانہ ہوا ــــ اس راستے سے لاہور تا قندھار کا فاصلہ دو سو چھہتر کوس ہے ــــ وہاں پہنچ کر اس نے قلعے کے گرد اندازہ لینے اور نقبیں لگانے میں بڑی جد و جہد کا مظاہرہ کیا ۔ جب وہ قلعہ مسخر ہو گیا تو چھبیسویں سال جلوس میں حسب حکم بادشاہ واپس لوٹ آیا اور انعام و اکرام سے مالا مال ہوا ۔

اٹھائیسویں سال بادشاہ کو خبر ملی کہ رانا جگت کا بیٹا رانا راج سنگھ (والی چتوڑ) بعض دروازوں اور برجوں وغیرہ کی تعمیر میں مصروف ہے ، حالانکہ جس وقت اس کے دادا رانا کرن نے ، اعلیٰ حضرت (شاھجہان) کی تصویب سے ، جنت مکانی (جہانگیر) کی ملازمت حاصل کی تھی تو اس وقت یہ طے پایا تھا کہ اس کی اولاد میں سے بھی کوئی شخص قلعۂ چتوڑ میں کوئی ترمیم نہ کرے گا ۔ اس بنا پر بادشاہ خود تو درگاہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے ارادے سے اجمیر کی طرف روانہ ھوا ، اور اسے (سعد اللہ) کثیر افواج کے ساتھ قلعۂ چتوڑ کی تخریب پر بھیجا ۔ وھاں پہنچ کر اس نے رانا کے تعلقے کی زراعت کو برباد کیا اور چتوڑ کی نئی اور پرانی دیوار اور برج کو زمین کے ساتھ ھموار کرکے واپس لوٹ آیا ۔

تیسویں سال درد قولنج کی دوائی کھانے سے بیمار ھو گیا ، اور جب تک اس بیماری نے شدت نہ اختیار کی باقاعدگی سے دربار میں حاضر ھوتا اور متعلقہ امور میں مصروف رھتا رھا ۔ جب کمزوری زیادہ ھی بڑھ گئی تو خانہ نشین ھو گیا - بادشاہ اس کی قدردانی میں اضافہ کرنے کے لیے خود اس کی عیادت کو گیا ۔ آخر بائیسویں جمادی الثانی سنہ ۱۰۶۶ ھ کو گلشن بقا کو سدھارا ۔ بادشاہ کو جب اس کی وفات کی خبر ملی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ اس کے بڑے لڑکے لطف اللہ کو گیارہ سال کی عمر میں خلعت اور ھفت صدی دو صد سوار کے منصب سے نوازا گیا ۔ اس کے باقی بیٹوں اور وابستگان کو یومیہ ، اس کے بھانجے یار محمد کو منصب سہ صدی شصت سوار اور اس کے بہت سے نوکروں کو مناسب مناصب سے سرفراز کیا گیا ۔ ان میں سے ایک عبدالنبی کو ھزاری چہار صد سوار کا منصب عطا ھوا ، جو سعداللہ کی جاگیر کے مہتمم کا نوکر اور خلد مکانی (عالمگیر) کے عہد میں متھرا کا فوج دار ھو گیا تھا ۔ اس عبدالنبی نے اپنے عہدے کو بہ کمال احسن نبھایا ، اور ایک جنگ میں بندوق سے زخمی ھو کر فوت ھوا ۔ متھرا کی مسجد اسی کی تعمیر کردہ ہے ۔

سعد اللہ خان زیور علم اور حسن اخلاق و تواضع سے آراستہ تھا ۔

متعلقہ معاملات کے نپٹانے میں راستی و دیانت داری سے کام لیتا ۔ سرکار شاہی کی رقوم کے حصول میں عمال یا رعایا پر کسی قسم کے ظلم و ستم کو روا نہ جانتا تھا ۔ اس کی وزارت کے زمانے میں ہندوستان کو بڑی رونق حاصل ہوئی ۔ دارا شکوہ جیسا حریف بھی اس کی شکایت کرکے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا ۔ ملازمت کے آغاز سے وہ برابر ترقی کے زینے طے کرتا رہا ۔ اس کا لقب ''علامیٔ فہامی جملۃ الملک'' قرار پایا ۔ وہ بلند مرتبوں پر فائز ہو کر رحمت حق سے جا ملا ، اور نیک نام بہ طور یادگار چھوڑ گیا ۔ اس کی اولاد میں سے جو کوئی بھی نام آور ہوا ہے اس کا ذکر (اس کتاب میں) علیحدہ کیا گیا ہے ۔

نکتہ : دیانت ایک قابل ستائش فعل اور پاس نمک ایک مستحسن شیوہ ہے ، مگر آقا کے معاملات میں ، جو غربا سے پڑتے ہیں ، ان باتوں (دیانت وغیرہ) کا دھیان رکھنا خیرخواہی کے لیے نہایت ضروری ہے ۔ کیوں کہ اگر اس صورت میں کل کو نقصان پہنچے تو اس سے نسبت جزئی ہوگی ؛ اور جز کو نقصان پہنچے تو کلی ۔ جز کا نقصان کل کے نقصان پر منتج ہوتا ہے...... ۔ (ماثر الامرا)

مغلوں کے دور میں مالیات کا انتظام

کتب تاریخ کے پڑھنےوالوں پر یہ واضح ہے کہ عرش آشیانی (اکبر) کے عہد میں ، کہ خلافت و جہاں بانی کے بانی مبانی اور جہاں ستانی کی بنیادوں کے مؤسس ہیں ، ادوار گذشتہ و آئندہ کی نسبت معمول اخراجات اس قدر نہ تھا ۔ جب ہر روز ایک نیا علاقہ اور ایک نیا ملک فتح ہو کر مملکت اکبری میں شامل ہوتا رہا اور سلطنت وسیع تر ہوتی چلی گئی تو ہر چند اس وسعت کے مطابق قدرے خرچ بھی بڑھ گیا لیکن اس کے ساتھ ہی آمدنی بھی ایک سے سو تک جا پہنچی اور بہت سا مال ہاتھ لگا ۔ جب جنت مکانی کا عہد آیا تو چوں کہ اس لا ابالی بادشاہ نے ملکی و مالی مہمات کی طرف کوئی توجہ نہ دی ، اور اس کے مزاج میں ایک طبعی بے پروائی و عالی جاہی تھی ، اس کے حریص و خائن پیش کاروں نے اپنی زر اندوزی و رشوت ستانی کے باعث کارسازی اور

معاملہ پردازی میں کسی چھوٹے ، بڑے یا ادنلی و اعلٰی شخص اور ضروری و غیرضروری معاملات کا لحاظ نہ رکھا ، اور ملک کی ویرانی اور آمدنی میں کمی کو اس حد تک پہنچا دیا کہ خالصہ جاگیروں کی آمدنی پچاس لاکھ روپے رہ گئی جس کے سبب خزانۂ عامرہ پر بوجھ پڑا اور گراں بہا رقمیں صرف ہوگئیں ۔ اعلٰی حضرت (شاھجہاں) کے آغاز عہد میں جب شاھی ارکان نے ملکی کیفیت کے ساتھ ساتھ اخراجات اور آمدنی کی تفاصیل عرض کیں تو اس دقیقہ رس ھوشیار بادشاہ نے ڈیڑھ کروڑ روپے کی جاگیریں ، کہ بارہ مہینوں (سالانہ) کے حساب سے ممالک محروسہ کا پندرھواں حصہ بنتا ہے ، خالصہ میں شامل کر دیں ۔ کروڑ روپیہ اخراجات مقررہ کے لیے بحال رکھا ، اور باقی رقم کو متفرق اخراجات کے لیے رھنے دیا ۔ رفتہ رفتہ اس بادشاہ کے حسن نیت اور بخت بلند کے سبب آمدنی میں روز بروز اضافہ ھوتا چلا گیا اور اس کے مطابق اخراجات بھی بڑھ گئے ۔ چناں چہ بیسویں سال جلوس کے آخر میں ممالک کی آمدنی کے آٹھ سو اسی کروڑ دام میں سے خالصہ کے ایک سو بیس کروڑ دام مقرر کیے ، جو سالانہ حساب کے مطابق تین کروڑ روپے بنتے ھیں ۔ اور آخری ایام میں تو یہ رقم چار کروڑ روپے تک جا پہنچی تھی ۔

سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بخشش ، انعامات ، مہموں اور تعمیر عمارات وغیرہ پر بھی مبلغ خطیر خرچ ھوا ۔ چناں چہ پہلے سال جلوس میں ایک کروڑ اسی لاکھ روپیہ نقد جنس کی صورت میں ، چار لاکھ بیگھہ زمین اور ایک سو بیس دربست گاؤں (دربست یا درویست موضع ، جس میں کسی دوسرے کا تصرف نہ ھو) بیگموں ، شاہزادوں ، نوئینوں[۲۶]، امرا ، سادات ، فضلاء اور مشائخ وغیرہ میں بانٹے گئے اور بیسویں سال کے آخر تک نو کروڑ روپیہ انعامات کی رقوم میں صرف ھوا ۔ بلخ و بدخشاں کی مہم پر تنخواھوں اور راتب وغیرہ پر صرف کیے گئے دو کروڑ روپے کے علاوہ بعض دیگر ضروریات پر دو کروڑ روپیہ نقد خرچ ھوا اور اڑھائی کروڑ روپیہ عظیم الشان عمارتوں کی تعمیر پر اٹھا ۔ ان میں سے پچاس لاکھ روپیہ روضۂ ممتاز (تاج محل آگرہ) پر ، باون لاکھ

روپیہ آگرہ کی دوسری عمارات پر ، پچاس لاکھ روپیہ دہلی کے قلعہ اور دس لاکھ وہاں کی جامع مسجد پر ، پچاس لاکھ روپیہ لاہور کے باغات و عمارات پر ، بارہ لاکھ کابل پر ، آٹھ لاکھ کشمیر کی آرایش و زیبایش پر ، آٹھ لاکھ قندھار میں اور دس لاکھ روپیہ احمدآباد اور اجمیر وغیرہ کی عمارات پر صرف ہوا ۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ خزانے جو اکبر کے اکاون سالہ دور حکومت میں پوری طرح معمور رہے اور پھر ان کی کیفیت 'لاخلا و لاملا' (نہ خالی نہ بھرے ہوئے) کی سی ہو گئی تھی ، اب پھر 'ھل من مزید' (کچھ اور بھی ہے تو لاؤ) کا نعرہ لگا رہے تھے ۔

خلد مکانی (عالمگیر رح) نے جو بڑے حزم و احتیاط کے مالک تھے ، خرچ اور آمدنی کو برابر برابر رکھنے کی کوشش کی ، لیکن دکن کی طویل مہم پر بے شمار روپیہ ضائع ہوا ؛ حتیٰ کہ داراشکوہ وغیرہ کے آدمیوں کا مال بھی ہندوستان سے لے جا کر دکن میں تنخواہوں میں بانٹ دیا گیا جس کے باعث ملک کی ویرانی اور کم حاصلی نے سر اٹھایا ، تاہم اس بادشاہ کے آخری ایام حیات تک آگرہ کے قلعے میں تقریباً دس بارہ کروڑ روپیہ موجود تھا ۔ کچھ روپیہ خلد منزل[۲۷] کے زمانے میں اڑ گیا ، جب کہ آمدنی کچھ نہ تھی اور خرچ ہی خرچ تھا ۔ اس کے بعد کچھ روپیہ محمد معزالدین[۲۸] نے برباد کیا ؛ جو باقی بچا وہ نیکوسیر کے زمانے میں سادات بارھہ نے اڑا لیا ۔ اس وقت جب کہ سلطنت کی آمدنی کا انحصار صوبۂ بنگالہ پر ہے ، مرہٹوں نے دو تین سال سے اس علاقے میں خرابی مچا رکھی ہے ، لیکن اخراجات بھی کچھ اتنے نہیں رہے ــــ قلم کیسا جوش میں آ گیا ؛ بات کہاں کی تھی اور کہاں آ پہنچی ۔ (مآثر الامرا)

شیخ علی حزیں

[شیخ محمد علی حزیں (وفات ۱۷۹۴ع) ایرانی نژاد تھے ؛ افغانی حملوں کی وجہ سے ہندوستان چلے آئے۔ ایرانی ہندی نزاع میں انھوں نے حصہ لیا اور خان آرزو سے ان کا جھگڑا چلتا رہا ۔ ہندوستان کے فارسی ادبا کو تسلیم نہیں کرتے تھے ۔ ذیل کے اقتباس سے اس نفرت کا بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے ۔]

احوال ہندوستان کے متعلق چند باتیں

اب ہندوستان کے متعلق چند باتیں لکھی جاتی ہیں ۔ حالات کی حقیقتوں کے جاننے اور کتب تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ عمر شیخ میرزا[1] کے بیٹے بابر میرزا کا حیرت و پریشانی اور گم نامی و سرگردانی سے چھٹکارا اور اس کا حکم رانی کے رتبے تک عروج ہرگز وقوع پذیر نہ ہوتا اگر اس نے سلیمان علیہ السلام ایسی شان رکھنے والے بادشاہ ابوالبقا شاہ اسماعیل صفوی[2] کی زبردست سلطنت کے دامن کو نہ تھاما ہوتا ۔ اس لیے کہ جو لوگ صاحب قران امیر تیمور گورگان کی اولاد کے احوال سے آگاہ ہیں وہ بہ خوبی جانتے ہیں کہ وہ لوگ (اولاد تیمور) خود اپنے آپ سے کیا سلوک کرتے رہے اور خلق خدا کا ان کے ساتھ کیا رویہ رہا ہے ۔ وہ ہر لمحے ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار و عناد رہے اور اس طرح اپنے آپ کے قتل و غارت سے بھی باز نہ رہ سکے ۔ رعایا اُن کے ان آپس کے لڑائی جھگڑوں اور ظلم کے ہاتھوں نت نئی مصیبتوں ، بلاؤں اور دکھوں کا شکار رہی ۔ ان لوگوں کا وجود عوام کے لیے بار خاطر تھا

اور عوام کی تمام ہمت و کوشش ان کا تختہ الٹنے میں صرف ہوتی ۔ چناں چہ اپنی قوت و طاقت اور موقع و فرصت کے مطابق رعایا نے بھی ان کے قتل کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ۔

اس خاندان کے جس بادشاہ نے سب سے زیادہ اچھی زندگی بسر کی وہ مغفرت پناہ سلطان حسین میرزا[۳۱] ہے ۔ وہ تخت سلطنت پر متمکن ہونے کے بعد دوسروں کی نسبت زیادہ ہی تمکنت اور آرام سے رہا ۔ تا آں کہ اس مغفور کی رحلت کے بعد جب شیبک خاں اوزبک[۳] نے اس کے جانشینوں پر غلبہ پا لیا ، اور اپنے قہر و غدر سے اس کی اولاد کو کمزور کر کے اپنی شان و شوکت کے جھنڈے بلند کئے تو خاندان تیموریہ کے بقیہ افراد کی زبوں حالی اس درجے تک پہنچ گئی کہ جس کا خلاصہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

الغرض اس بے مثال مصطفوی نسب بادشاہ (اسماعیل صفوی) کی ، کہ جس کے دبدبہ و سطوت کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا ، ہمت و توجہ کے پرتو نے بابر میرزا کو عرصۂ ظہور میں لا کر اسے پر و بال دیے اور گوناگوں عنایت و امداد کا مورد بنایا ۔ اور اس نے بھی مرتے دم تک ، کیا سلطنت ہندوستان کے دوران میں اور کیا اس سے پیشتر اس عظیم الشان اور زبردست سلطنت کے ساتھ شیوۂ دوستی اور اظہار خلوص وغیرہ کو اپنا شعار بنا کر کبھی تو (اس کے نام کا) خطبہ و سکہ جاری کر کے ، جیسا کہ سمرقند میں کیا ، اور کبھی نیاز و التماس سے پر عرضیاں بھیج کر اس سلیمان کی سی شان رکھنے والے بادشاہ کو خوش رکھا ۔ اس کی اولاد و احفاد ہمیشہ عجز و اضطرار کے اور اغراض پوری کرنے کے مواقع پر اس عالی خاندان (صفویہ) کی مدد و یاری کا وسیلہ ڈھونڈتی رہی ۔ لیکن بعد میں جب ایران میں ہولناک واقعات رونما ہوئے اور مملکت ہند کے کسی گوشے میں کوئی بڑی گڑبڑ نہ ہونے اور آسودگی کے سبب ان کی اغراض میں کمی آ گئی تو ان کا وہ شیوۂ خلوص و دوستی بہت زیادہ نخوت و غرور میں بدل گیا اور اس طرح انہوں نے دوستی و آشنائی کی راہیں مسدود کر دیں ۔

چناں چہ بابر کی اولاد کی طبیعتوں میں یہ عادت پختہ ہوگئی ۔ دراصل ان میں یہ جو تبدیلی آئی تو یہ سب ہندوستان کی آب و ہوا کی تاثیر کے باعث تھا ۔ کیوں کہ یہ بات واضح ہے کہ یہاں کے لوگ غرض کے بغیر کسی کے دوست نہیں بنتے ۔ اور قدیم کتب تاریخ سے اس امر کا پتا چلتا ہے کہ اسلام سے قبل بھی یہاں کے راجاؤں اور حکم رانوں کی طبیعت ایسی ہی تھی ۔ چناں چہ جب کبھی کوئی عجمی بادشاہ خود یا اس کا کوئی سپہ سالار اس طرف آیا تو ہندو حکم رانوں نے اپنی قوت و طاقت اور فتح مندی کا اندازہ کئے بغیر ہی اس کے سامنے نہایت عجز و انکسار اور بے چارگی کا مظاہرہ کیا اور بغیر کسی حیل و حجت کے اس کے مطیع و باج‌گزار بن گئے ۔ لیکن ادھر وہ ایران کی طرف لوٹا ادھر وہ بد باطن راجے اپنے بے وقعت زاغ صفت (کوّوں کے مانند) لشکر کو دیکھ کر اور ذرا سی دولت کے نشے میں غرور و تکبر پر اتر آئے ۔ اور اپنا ملک اور میدان خالی پا کر بے ہودہ ڈینگیں مارتے ہوئے تمام عہد و پیمان فراموش کر دیے اور یکسر آنکھیں بدل لیں ۔

اور بیسیوں مرتبہ ہندوؤں نے اپنی انھی حرکات اور ایرانیوں نے اس شیوہ (درگزر) کا مظاہرہ کیا ۔ ازاں جملہ ایک عہد منوچہر[۵] بھی ہے جس میں ایسے ہی واقعات درپیش آئے ۔ اور وہ اس طرح کہ اس (منوچہر) کے حکم پر سام[۶] بن نریمان[۷] ہندوستان آیا اور اس نے کیشو راج کو تخت سلطنت پر بٹھایا ۔ بعد میں جب کیشو راے کا بیٹا فیروز راے تخت نشین ہوا تو اس نے خود سری و مخالفت اختیار کی جس پر کیقباد[۸] نے رستم دستاں کو ہندوستان بھیجا ۔ فیروز شکست کھا کر بھاگ نکلا اور ہندوستان کے جنگلوں ہی میں کہیں مر گیا ۔ اور رستم سورج کو سلطنت پر متمکن کر کے واپس لوٹ گیا ۔ اسی طرح سکندر ، ارد شیر مامک[۹] اور کسرئ نوشیرواں وغیرہم کے زمانوں میں بھی کہ جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے ، یہی کچھ وقوع پذیر ہوا ۔

سلاطین عجم کے ہندوستان پر قبضہ نہ رکھنے کا سبب ارباب بصیرت پر بہ خوبی واضح ہے ۔ اس لیے کہ جس کسی کا مقام اقامت و قرار

ایران جیسا ملک ہو جو بالذات تو دنیا کا اعدل و اشرف اور بالعرض حسین ترین و کامل ترین ملک ہے ، وہ ہندوستان میں اپنی مرضی سے ہرگز مقیم نہیں رہ سکتا ۔ یہ اس کا فطری امر ہے کہ وہ بجز ہنگامی حالات میں وہاں رہنے کے کسی دوسرے موقع پر وہاں ٹھہرنے پر راضی نہیں ہوتا ۔ اور یہ بات بادشاہ ، رعایا اور لشکر سب میں مشترک ہے ۔ اور ہر اس شخص کا ایسا ہی حال ہے کہ جس میں حس صحیح ہے اور جس نے کسی دوسری آب و ہوا میں خصوصاً ممالک ایران و روم میں تربیت پائی ہو ۔ مگر جو کوئی اس ملک (ہند) میں غافل و بے خبر وارد ہوتا ہے اور پھر واپس لوٹ جانے پر قادر نہیں ہوتا تو اگرچہ آسے رکاوٹوں اور بیماریوں وغیرہ کے سبب کسی جگہ قیام پذیر ہونے کی مجال نہ رہی ہو ، اور اس نے اپنے ماضی کے ایام صعوبت و زبوں حالی میں گزارے ہوں ، وہ اس ملک میں مال و جاہ سے ، کہ ڈھلتی چھاؤں ہے ، بہرہ اندوز ہوتا اور پھر نہایت ضعیف الاحساس اور کمینہ فطرت بن کر اس (مال) سے دل بستگی پیدا کر لیتا ہے ۔ اور آہستہ آہستہ یہ بات اس کی گھٹی میں پڑ جاتی ہے جس کے باعث وہ اطمینان و سکون سے رہنے لگتا ہے ۔

مجوسیوں (آتش پرست) کی تاریخ میں میں نے پڑھا ہے کہ جب ضحاک[۱۰] نے گرشاسپ[۱۱] کو سردار سپہ بنا کر ہندوستان کی طرف بھیجا تو اس سے یہ خاص طور پر کہا کہ ''اس ملک کو فتح کرتے ہی مہاراج کے سپرد کرو اور واپس لوٹ آؤ ، کیوں کہ اگر لشکر نے وہاں کچھ عرصہ قیام کیا اور وہاں کے لوگوں سے میل جول رکھا تو وہ لشکر میرے کام کا نہیں رہے گا ؛ یا پھر مجبوراً اسے (لشکر) اس ملک (ہند) میں چھوڑنا پڑے گا یا قتل کرنا پڑے گا ؛ اور میں ان دونوں باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا ، کیوں کہ لشکر تو میرا ہاتھ ہے ، اسے کاٹا نہیں جا سکتا ۔''

استاد اسدی طوسی[۱۲] نے بھی اس حکایت کو گرشاسپ نامہ[۱۳] میں منظوم کیا ہے ۔

مثنوی

(۱) وصیت چنین کرد گرشاسپ را
که در هند بدرود کن خسپ را

(۲) نداری ز خون سپاهان دریغ
همی کارفرما درخشنده تیغ

(۳) بچستی ده انجام کار سترگ
بر ایشان چنان زن که بر گله گرگ

(۴) نمانی دران بوم سالی تمام
که لشکر کران گیرد از ننگ ونام

(۵) گرت بگزرد چار موسم دران
ز فرهنگ و مردی نیابی نشان

(۱) اس نے گرشاسپ کو یہ وصیت کی کہ ہندوستان میں سستی سے کام نہ لینا ۔

(۲) سپاہیوں کا خون (گرانے) سے دریغ نہ کرنا ، اپنی چمکتی ہوئی تلوار کو کام میں لانا ۔

(۳) بڑا کام چستی سے سر انجام دینا اور ان پر (اہل ہند) اس طرح حملہ کرنا جس طرح بھیڑیا بھیڑوں کے گلے پر ٹوٹ پڑتا ہے ۔

(۴) اس سر زمین میں پورا سال نہ گزارنا ، ورنہ تمہارا لشکر ننگ و نام سے کنارہ کشی اختیار کر لے گا ۔

(۵) اگر تم نے وہاں چاروں موسم (پورا سال) گزار دیے تو پھر دانش و تہذیب اور جواں مردی سے عاری ہو جاؤ گے ۔

(کلیات حزیں)

شیر خان لودھی

[شیر خاں (متوفی ۱۶۹۳ع) نے بہ عہد عالمگیری مراۃ الخیال (۱۶۹۱ع) تالیف کی ۔ اس میں مشہور شعرا کے علاوہ علوم و فنون کا تذکرہ بھی ہے ، خصوصاً علم السرویہ ، علم السحر اور موسیقی وغیرہ ۔ ذیل میں موسیقی کے بارے میں اس کا مقالہ درج کیا جاتا ہے ۔ شیر خاں خود بھی اس علم سے ربط رکھتا تھا ، اس لیے اس کے بارے میں اس کی معلومات بڑی مفید ہیں ۔]

اہل ہند کی موسیقی کے بارے میں

اس کی ایجاد اور ابتدا کے متعلق لوگوں میں بڑا اختلاف ہے ۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس کے قدم و حدوث[1] میں بھی اختلاف کیا ہے ۔ بعض لوگ اس کی اصل کو ناھد[2] کی شاخ قرار دے کر اسے ازلی و ابدی بتاتے ہیں ۔ اور یہ روایت حضرت سلطان المشائخ (نظام الدین اولیا رح) کے اس اشارے کے نزدیک ہے کہ ''میں نے روز ازل میں کلام حق کو پوربی لے میں سنا ۔'' یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے بہت سے نغمہ پرداز نہایت غلو اور افراط سے کام لیتے ہوئے اسے (موسیقی) اسرار (بھید) کا نام دیتے ہیں ۔ ان اوراق میں اس کی تفصیل بیان کرنا حفظ مراتب سے دور ہے ، تاہم صاحب بصیرت اس شعر کے مضمون سے اس کی کچھ حقیقت جان سکتا ہے ۔

پُر و خالی بُراند از نغمۂ دوست　　ببین دف را کہ چوں برمی درد پوست

دوسرا گروہ اس کے حدوث کا قائل ہے اور اسے ان چیزوں میں سے شمار کرتا ہے جو ممکنات کے توسط سے ظہور پذیر ہوتی ہیں ۔ پھر اس

گروہ میں بھی اختلاف ہے ۔ یعنی اس میں ایک فرقہ تو اسے متھرا کے فرماں روا راجا کنس کے بھانجے کشن سے منسوب کرتا ہے ۔ اور یہاں اس قول کو باطل قرار دینا ضروری ہے ، کیوں کہ جیسا کہ مشہور ہے ، کشن کو گنتی کے چند راگ یاد تھے جن سے وہ اپنے ایام جوانی میں شیر فروش عورتوں کو فریفتہ کیا کرتا تھا ۔ اور وہ راگ ہندوستان میں کافی مشہور ہیں ۔ لیکن جس بات پر دکن کے بیشتر نایک متفق ہیں ، وہ یہ ہے کہ مہا دیو دنیا کے تمام دیوؤں کا سرگروہ تھا اور تمام دیو اس کی طاعت کو لازمی جانتے تھے ۔ ان (دیوؤں میں سے) چھ دیو اور تیس پریاں ، کہ ہر دیو کے ساتھ پانچ پریاں مقرر تھیں ، اس کے مقربوں اور خاصوں میں سے تھے ۔ اور ان میں سے ہر ایک دن اور رات کے ایک خاص وقت میں ایک مقررہ لے کے ساتھ اس کی عبادت کرتا ۔ چناں چہ راگ اور راگنیوں کے نام انھی مقربوں کے ناموں پر اور ان کے گانے کے اوقات بھی اسی دستور کے مطابق قرار پائے ۔ پھر دو تین راگوں اور راگنیوں کی آمیزش سے چھ راگ اور تیس راگنیاں بن گئیں جنھیں 'بھارجا' کہتے ہیں ۔ بھارجا کا کوئی حد و شمار نہیں ہے ۔ ان کی کیفیت بالکل حروف مفردہ کی سی ہے کہ جنھیں کئی قسم کے الفاظ سے مرکب کرکے بولا جا سکتا ہے ۔ (راگوں میں) یہ آمیزش و ترکیب حضرت انسان کا تصرف ہے ۔

اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ دکن کے استادوں کی اطلاع کے مطابق بھارجا کی تعداد انچاس ہزار ہے ۔ مجھے (اس کتاب کا مؤلف ، شیر خاں) بہت سے مشہور اور غیر مشہور بھارجا یاد تھے ، لیکن یہاں ان کے نام لکھنے میں کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آیا ، کیوں کہ ظاہر ہے کہ فقط نام سے کوئی بھی صاحب شوق لطف اندوز نہ ہوگا اور نہ اہل درد کے کان ہی اس کی سماعت سے متمتع ہوں گے ۔ لہذا فقط اصلی راگ راگنیوں کے نام لکھنے پر اکتفا کی گئی ہے کہ اس جگہ ان کا تحریر ہونا ناگزیر تھا ۔ چھ راگوں کے نام یہ ہیں :

۱ ۔ بھیروں ۲ ۔ مالکوس ۳ ۔ ہنڈول ۴ ۔ دیپک ۵ ۔ سری راگ ۶ ۔ میگھ راگ ۔

راگنیوں کے ناموں کے بارے میں چوں کہ قسم قسم کی روایتیں ملتی ہیں ، اس لیے یہاں صرف وہ نام درج کیے جاتے ہیں جو ایک گروہ کے پسندیدہ تھے :

بھیروں کی راگنیوں کے نام : ۱ - بھیروی (بھیرویں) ۲ - مالسری ۳ - نت نرائن ۴ - پٹ منجری ۵ - للت -

مالکوس کی راگنیوں کے نام : ۱ - مالی کورا ۲ - کھناوتی ۳ - مارو ۴ - رام کلی ۵ - گن کلی -

هنڈول کی راگنیوں کے نام : ۱ - بلاول ۲ - ٹوڈی ۳ - دیک کھلہ ۴ - کندھار ۵ - مد مادہ -

دیپک کی راگنیوں کے نام : دھناسری ۲ - کہیان ۳ - پوریا ۴ - کدارا ۵ - دیسی -

سری راگ کی راگنیوں کے نام : ۱ - گوری ۲ - ککب ۳ - بھیم ۴ - گوجری ۵ - اساوری -

میگھ راگ کی راگنیوں کے نام : ۱ - شدہ ملار ۲ - کامودی ۳ - بنگال ۴ - گونڈ ۵ - مکود -

علاوہ ازیں بہت سے بیٹے بھی ان سے منسوب کیے جاتے ہیں - مادھونل کے مطابق ، جو اس فن میں سند مانا جاتا تھا ، ہر راگ کی پانچ راگنیاں اور ساٹھ بیٹے ہیں - چناں چہ شیخ عالم نے اپنے رسالے (دربارۂ موسیقی) میں ، کہ جس کا نام اس نے مادھونل کے نام پر رکھا ، ان کا ذکر تفصیل سے کیا ہے -

اس جماعت (؟) کے سات اوزان ہیں جنھیں سات سروں میں گایا جاتا ہے - کہتے ہیں کہ متقدمین و متاخرین میں سے کسی بھی انسان نے تین سروں سے زیادہ میں نہیں گایا اور باقی چار سریں دیوں سے مخصوص ہیں - پھر ان سات سروں میں 'مقامات' ہیں جنھیں 'گرام' کہا جاتا ہے -

راگ کے دیوں سے انسانوں کو منتقل ہونے کے بارے میں دو

روایتیں ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ قدیم ایام میں دیووں کا انسانوں کے ساتھ میل جول رہا ہے اور دکن کے نایکوں نے یہ علم (موسیقی) ان سے اسی زمانے میں حاصل کیا ہے۔ ان کا یہ قول مؤرخوں کی اس روایت کے مطابق ہے کہ ''روے زمین کے سب سے پہلے بادشاہ کیومرث نے اپنے بیٹے کا انتقام لینے کے لیے دیووں سے بڑی زبردست جنگیں لڑی تھیں؛ جن میں بہت سے دیو مارے گئے۔ اسی زمانے میں دیو ڈر کے مارے دور دراز کے پہاڑوں پر چلے گئے اور انسان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔'' دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ دیو شروع ہی سے انسان سے مستور رہے ہیں اور کبھی کبھار ایک آدھ انسان کو نظر آ جایا کرتے تھے۔ ملک دکن دوسرے ملکوں کی نسبت زیادہ دیووں کا مسکن رہا ہے، وہاں کے نایک سحر و جادو کے زور سے انھیں حاضر کر کے ان سے موسیقی کی تعلیم لیا کرتے تھے۔ ایک زمانے تک وہ لوگ مہا دیو، اس کے بیٹے کنس اور دیگر دیووں کی مدح میں دیووں ہی کی زبان میں، کہ جسے 'اسہنس کرت' کہتے ہیں، تالیفات (راگ راگنیاں وغیرہ) بنا بنا کر عبادت کے گیت (شبد، بھجن) گاتے رہے اور صرف عبادت گاہوں ہی میں نہیں، بلکہ شاہی مجالس میں بھی یہ رسم موجود تھی، جسے وہ گیت اور سنگیت کا نام دیتے۔ تا آں کہ اوجین کے فرماں روا راجا مان نے نایک و نایکا (مرد و عورت) کے واقعے پر مشتمل ایک دھرپت گوالیاری زبان میں تصنیف کی اور بھیروں راگ میں باندھ کر نایک چرجو کے سامنے گئی جو اس دور کا برگزیدہ شخص تھا۔ نایک نے اسے پسند نہ کیا اور اندیشۂ دور و دراز میں پڑ گیا۔ جب کچھ دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا تو راجا نے پوچھا ''کیا وجہ ہے کہ آپ میرے اس نئی چیز ایجاد کرنے پر تحسین و آفرین کہنے کی بجائے لمبی سوچ میں پڑ گئے؟'' نایک بولا ''یہ کون سی تحسین والی بات ہے؟ تو نے ہمارے علم کو جو صدیوں سے رواج پذیر تھا، آج بگاڑ کے رکھ دیا ہے اس لیے کہ جب اس میں مرد و زن کی سرگزشت داخل ہو گئی اور یہ آسان فہم عبارات میں ادا ہونے لگی تو اس تمام تصرف و قبضہ کے باوجود جو موسیقی کو دلوں پر حاصل ہے، کون ہے جو اس دشوار طریق کی

طرف رغبت کرے گا - اور یہ یاد رکھ کہ تو نے عبادت کو لذت میں بدل کر اور اس میں عاشقی و معشوقی کی حکایات داخل کر کے ایک بہت بڑے گناہ کا ارتکاب کیا ہے ، کیوں کہ بہت سے تن پرست لوگ اسے مجاز میں لے کر حقیقت سے غافل ہو جائیں گے اور یہ بات عظیم فساد و تباہی کا باعث ہوگی اور اہل دنیا سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہونے لگیں گے -'' راجا بڑا شرمندہ ہوا ، لیکن چوں کہ وہ دھرپت زبانوں پر چڑھ چکی تھی اس لیے شہرت پا گئی - بعد میں بہت سے لوگوں نے راجا کے تتبع میں اس قسم کے گیت بنا کر عیش و نشاط کی مجلسیں گرم کیں - آخر جب نایکوں نے دیکھا کہ اس کے سوا چارہ نہیں تو وہ بھی دھرپت کی تصنیف میں مصروف ہو گئے - چناں چہ آج یہ (دھرپت) مشہور و معروف ہے -

کچھ مدت کے بعد جون پور کے فرماں روا سلطان حسین شرقی[3] نے دھرپت میں جو چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی تھی ، تخفیف کر کے اس کے دو مصرعے مقرر کر دیے اور اس کی لے میں بھی کچھ تبدیلی کر کے اسے اور بھی رنگین بنا دیا ، اور 'خیال' اور 'چنکلہ' کے نام سے موسوم کیا - لیکن ساتھ ہی اس میں گفتگوے مجاز کو اتنا واضح کر دیا کہ جب تک کوئی تاویل کرنے والا ثقہ شخص نہ ہو وہ اس کے خلاصۂ مضمون کو حقیقت کی طرف نہیں لے جا سکتا - بعد ازیں جب گردش زمانہ نئی صنعت کی متقاضی ہوئی تو دکن کا نائک گوپال جسے علم سنگیت میں بڑی مہارت تھی ، بڑے طمطراق سے ہندوستان کی طرف متوجہ ہوا - کہتے ہیں کہ ایک ہزار سات سو پالکی سوار اس کی معیت میں تھے - جس شہر میں بھی پہنچتا وہاں کا حاکم گھر میں رکھا ہوا تمام نقد و جنس اسے پیش کر دیتا - تا آں کہ دھلی میں سلطان محمد تغلق کی خدمت میں پہنچا اور علم کے زور سے پایۂ تخت کے تمام ارباب موسیقی پر غالب آ گیا - سلطان کو اس بات کا بڑا دکھ ہوا - اس نے اس سلسلے میں خواجہ خسرو دھلوی علیہ الرحمۃ و الغفران سے کچھ مشورہ کیا - چناں چہ مشہور ہے کہ سلطان نے ایک رات خواجہ (امیر خسرو) کو اپنے تخت کے نیچے چھپا لیا ؛ جب نایک گوپال نے

سنگیت گایا تو خواجہ نے کمال فراست سے اس کا 'قانون' ذہن نشین کر لیا اور پھر الفاظ تبدیل کر کے بڑے رنگین قول تیار کیے ۔ (موسیقی کی اس صنف کو) قول اس لیے کہتے ہیں کہ اس کی ابتدا میں اس نے مشائخ وغیرہ کے اقوال ، مثلاً ''الا کل شی ما خلا اللہ باطل ......'' درج کیے ہیں —— دوسرے روز حضرت خواجہ نے سلطان کی مجلس میں نایک کے سامنے قول گایا ۔ نایک بڑا متحیر ہوا ، کہنے لگا ''اگرچہ میں یقینی طور پر جانتا ہوں کہ یہ میرا ہی چرایا ہوا ہے ، لیکن تم نے اس ڈھب سے چرایا ہے کہ مجھے اس پر قدرت نہیں ہے ۔'' اس وقت سے قول نے شہرت پائی اور نایک اللہ کی قدرت کاملہ کا اعتراف کرتے ہوئے وطن کو لوٹ گیا ۔ سلطان نے اسے انعام میں بے اندازہ مال و دولت عطا کی ۔

یہ ہے موسیقی (کے ارتقا) کا مختصر سا حال جو راقم حروف نے اس فن کے ثقہ ماہروں کی صحبتوں میں بیٹھ کر اور کتابوں کا مطالعہ کر کے معلوم کیا ۔ لیکن جہاں تک صوت و آہنگ کی صورت کا تعلق ہے ، اسے قلم اور سیاہی کی مدد سے صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر کرنا ناممکن ہے ۔ گویا کہ اس علم کی دشواریاں اسی سبب سے ہیں اور جبھی بوعلی سینا نے کہا ہے کہ میں نے تمام علوم میں خود کو غالب پایا اور اس علم میں مغلوب ۔ والعلم عند مقلب القلوب ۔ (مراۃ الخیال)

مظہر جان جاں

[نقش بندی سلسلے کے بزرگ مرزا مظہر جان جاں[1] (۱۶۹۹ع–۱۷۸۰ع) اٹھارویں صدی کی ایک اہم شخصیت ہیں - فارسی اور اردو دونوں زبانوں کے شاعر تھے - ان کے رقعات بہت اہم ہیں - ہندوؤں کے آئین و مذہب کے بارے میں تاثرات ان کے نقطۂ نظر کی بہ خوبی وضاحت کرتے ہیں -]

کفار ہند کے آئین کے بیان میں

(مجھ) سے پوچھا گیا تھا کہ ''ہندوستان کے کفار عرب کے مشرکوں کی طرح بے اصل دین رکھتے ہیں یا اس کی کوئی اصل ہے اور وہ منسوخ ہو چکی ہے ؟ اور ان کے اسلاف کے بارے میں کیسا اعتقاد رکھنا چاہیے؟'' تحقیق اور انصاف کی رو سے اس کا مختصر سا جواب تحریر کرتا ہوں -

واضح ہو کہ ہندوؤں کی قدیم کتابوں سے ہمیں جو کچھ پتا چلتا ہے ، وہ یہ ہے کہ نوع انسان کی پیدائش کے آغاز میں رحمت خداوندی نے دنیا و آخرت کی اصلاح کے لیے چار ابواب پر مشتمل بید نام کی ایک کتاب ایک فرشتہ برھنیا کی ، جو ایجاد عالم کا آلہ اور عضو ہے ، وساطت سے بھیجی - اس کتاب میں امر و نہی کے احکام اور گذشتہ و آئندہ زمانوں کے احوال مندرج تھے - ان کے مجتہدوں نے اس کتاب سے چھ مذہب استخراج کیے، اور ان پر اصول عقاید کی بنیاد رکھتے ہوئے اس فن کو دھرم شاستر کا نام دیا ہے - دوسرے لفظوں میں آپ اسے 'فن ایمانیات' کہہ لیجیے کہ جو علم کلام ہے -

انھوں نے نوع انسانی کو چار فرقوں میں تقسیم کیا اور اس کتاب

سے چار مسلک نکال کر ہر فرقے کے لیے ایک الگ مسلک یا راستہ مقرر کیا اور اس پر اعمال کے فروغ کی بنیاد رکھی ۔ اس فن کو وہ 'کرم شاستر' کے نام سے موسوم کرتے ہیں ۔ ہماری زبان میں اسے فن عملیات ، یعنی علم فقہ کہہ سکتے ہیں ۔ چوں کہ یہ لوگ نسخ احکام کے منکرہیں (اگرچہ عقل کہتی ہے کہ ہر دور اور ہر زمانے کے لوگوں کی طبیعتوں کے مناسب اعمال میں تبدیلی کی تجویز ضروری ہے) اور انھوں نے دنیا کی تمام مدت کو چار حصوں میں منقسم کر کے ہر حصے کو جگ کا نام دے رکھا ہے ، اس لیے ہر 'جگ' کے لوگوں کے واسطے انھی چار ابواب سے عمل کے طور طریق اخذ کیے ہیں اور جو تصرفات ان کے متاخرین نے کیے ہیں ، وہ قابل اعتبار نہیں ہیں ۔ ان کے تمام فرقے اللہ تعالیٰ کی توحید پر متفق ہیں ۔ دنیا کو مخلوق (پیدا کی گئی) جانتے اور دنیا کی فنا ، نیک اور برے عملوں کی جزا و سزا ، قیامت اور حساب پر یقین رکھتے ہیں ۔ علوم عقلی و نقلی ، ریاضتوں ، مجاہدات ، معرفتوں کی تحقیق اور مکاشفات میں انھیں بے حد مہارت حاصل ہے ۔ ان کے دانش مندوں نے انسان کی مدت عمر کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے ۔ پہلا حصہ مختلف علوم کے حصول کا ، دوسرا روزی اور اولاد کی تحصیل کا ، تیسرا اعمال کی درستی اور نفس کو مطیع کرنے کا ، اور چوتھا حصہ گوشہ نشینی اور تجرد کی مشق کا کہ یہ انسانی کمال کی انتہا ہے ۔ نجات کبریٰ جسے وہ مہاتکت کہتے ہیں ، اس پر موقوف ہے ۔ ان کے مذہب کے قواعد و ضوابط مکمل تنظیم و ترتیب کے نمونے ہیں ۔ ان امور سے یہ واضح ہوا کہ ہر نبی کا دین جاری ہوا اور بعد میں اس کی منسوخی ہوئی ، لیکن شرع میں سوائے دین یہود و نصاریٰ کی منسوخی کے اور کسی مذہب کی تنسیخ کا ذکر نہیں ہے ۔ حالانکہ کئی ایک نسخ مٹے بھی اور ثابت بھی ہوئے ۔

نیز واضح رہے کہ ان آیات کریمہ 'وان من امة الاخلا فيها نذير' (ہر ایک گروہ کا ڈرانے والا یعنی نبی گزرا ہے) ''ولکل امة رسول'' (ہر امت کا رسول ہوتا ہے) اور دوسری آیات کے مطابق سرزمین

هندوستان میں بھی انبیاء علیہم السلام بھیجے گئے ، اور ان کے حالات ان (ہندوؤں) کی کتب میں مرقوم ہیں - ان کے آثار سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہ صاحب تکمیل و کمال تھے - اللہ تعالیٰ کی رحمت عامہ نے بھی اس سرزمین میں انسانی مصلحتوں کا پورا پورا لحاظ رکھا -

نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر قوم میں ایک پیغمبر مبعوث ہوتا رہا ہے اور اس قوم پر صرف اسی پیغمبر کی اطاعت و فرماں برداری واجب ہوتی تھی نہ کہ کسی دوسری قوم کے پیغمبر کی - لیکن جب سے ہمارے پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مبارک ہوا ہے اور آپ مخلوق خدا میں مبعوث ہوئے ہیں ، اس وقت سے لے کر رہتی دنیا تک کوئی دیگر پیغمبر معرض وجود میں نہ آئے گا - مشرق سے مغرب تک، دنیا کے تمام انسانوں پر آں حضرت صلعم ہی کی اطاعت و فرماں برداری واجب و لازم ہے - اور سرورکائنات صلعم کے دین کے مقابلے میں باقی تمام دین منسوخ ہیں - لہٰذا آپ کی بعثت مبارک کے آغاز سے لے کر آج تک ، کہ ۱۱۸۰ سال کا عرصہ بنتا ہے ، جو کوئی بھی آپ صلعم کے دین کی جانب مائل نہیں ہوا وہ کافر ہے ، نہ کہ وہ لوگ جو آپ صلعم سے پہلے گزر چکے ہیں - نیز آیۂ کریمہ ''منہم من قصصنا علیک و منہم من لم نقصص علیک'' (ان میں سے بعض کا حال تمہارے روبرو بیان کیا اور بعض کا نہیں) کے مطابق چوں کہ شرع اکثر انبیاء کے احوال کے بیان میں خاموش ہے ، اس لیے ہمارے واسطے ہندوستان کے انبیاء کے بارے میں خاموش رہنا ہی بہتر ہے - ہم پر نہ تو ان کی اطاعت واجب ہے اور نہ ان کی نجات کا یقین لازم - ہاں ان کے حق میں نیک گمان رکھنا ضروری ہے اور وہ بھی اس شرط پر کہ اس میں تعصب کا دخل نہ ہو -

اسی طرح اہل فارس بلکہ ہر ملک کے لوگوں کے بارے میں ، کہ نبی آخر زماں صلعم کے ظہور سے پہلے ہو گزرے ہیں اور زبان شرع ان کے احوال کے سلسلے میں خاموش ہے اور ان کے احکام و آثار راہ اعتدال کے مناسب و موافق ہیں ، اسی قسم کا عقیدہ رکھنا بہتر ہے - کسی کو کسی ٹھوس دلیل کے بغیر کافر کہہ دینے کو آسان نہ جاننا چاہیے -

ان (ہندوؤں) کی بت پرستی کی حقیقت یہ ہے کہ یہ ان بعض فرشتوں کی جنھیں حکم خداوندی سے اس دنیاے کون و فساد میں کچھ دخل حاصل ہے ، یا کاملوں کی ان بعض روحوں کی ، جو تعلق جسم سے آزاد ہو کر اس جہاں میں، کچھ تصرف رکھتی ہیں ، یا پھر ان بعض زندہ افراد کی ، جو ان کے زعم میں حضرت خضر علیہ‌السلام کی مانند ہمیشہ کے لیے زندہ ہیں ، مورتیاں بنا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ایک مدت کے بعد اس توجہ کے باعث اس مورت والے سے مناسبت پیدا کر لیتے ہیں ۔ پھر اس مناسبت کی بنا پر اپنی دنیوی و آخروی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں ۔ ان کا یہ عمل ہمارے اسلامی صوفیا کے 'ذکر رابطہ' سے ملتا جلتا ہے جس میں وہ اپنے مرشد کی صورت کا تصور باندھتے ، اور پھر اس سے اکتساب فیض کرتے ہیں ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ (صوفیا) ظاہر میں اپنے مرشد کی مورتی نہیں تراشتے ۔ لیکن یہ بات عرب کے کفار کے عقیدے سے مناسبت نہیں رکھتی ، کیوں کہ وہ بتوں کو متصرف اور مؤثر بالذات جانتے تھے نہ کہ خدا کی پہچان کا ایک وسیلہ ۔ ان بتوں کو وہ زمین کا خدا سمجھتے اور رب جلیل کو آسمانوں کا خدا کہتے تھے، اور ایسا کرنا یا سمجھنا شرک ہے ۔ ان (ہندوؤں) کا سجدہ سجدۂ تحیت (سلام) ہے ۔ کیونکہ ان کے طریقے میں ماں باپ ، پیر اور استاد کے سلام کے لیے بھی سجدہ رائج ہے ، جسے وہ ڈنڈوت کے نام سے یاد کرتے ہیں ۔ ان کے اس سجدے کو سجدۂ عبودیت نہیں کہا جا سکتا ۔ جہاں تک مسئلہ تناسخ کا تعلق ہے ، اس پر اعتقاد رکھنے سے کفر لازم نہیں آتا ۔

(مقامات مظہریہ)

محمد صادق اختر

[محمد صادق[1] (۱۷۸۶ع — ؟) مرزا محمد حسن قتیل کے شاگرد، ھگلی کے رھنے والے؛ زندگی کا کچھ حصہ لکھنؤ میں بسر کیا، آخر میں کان پور اور اٹاوہ میں تحصیل دار رھے۔ ۱۸۵۷ع کے بعد لکھنؤ ھی میں وفات پائی۔ فارسی میں ۱۷ کتابوں کے مصنف ھیں۔ 'صبح صادق' (۱۸۵۲ع) ان کی انشاء پردازی کا نمونہ ھے۔]

(۱)

امجد علی شاہ فرماں روائے اودھ کے دور کے حالات و اطوار

اس زمانے کے دوست و رفیق (کہ سب کے سب ریاکار، بے توفیق، وقت پڑنے پر دھوکا دینے والے، بہانہ جو اور دروغ گو بلکہ مصیبتوں اور بلاؤں کا سبب ھیں) سب دشمن جاں اور معاملات کے بگاڑنے والے ھیں۔ اگر ان کی التجا کے بغیر کوئی کام بن یا کوئی معاملہ سنور جائے تو حلوائی کی دکان کی مکھیوں کے مانند جمع ھو جاتے ھیں۔ پھر دوستی و یاری کے اظہار میں بے حد مبالغے سے کام لیتے، بڑی اپنایت کا مظاھرہ اور دوستانہ گلہ شکوہ کرتے اور اپنی بے ھودہ گوئی سے احسان جتاتے ھیں کہ "کاش ھمیں اس معاملے کی خبر ھوتی تاکہ ھم مال و جان نثار کرتے۔ افسوس کہ ھمیں اطلاع نہ ھوئی۔ تاھم خدا کا شکر ھے کہ یہ مہم ھماری آرزو کے مطابق اور یہ خواھش ھمارے مقصود کے موافق سرانجام پائی۔" اس قسم کی باتوں سے اگرچہ وہ ظاھری طور پر تکلف کے ساتھ خود کو مسرور ظاھر کرتے اور کھسیانی ھنسی ھنستے ھیں، لیکن باطن میں حسد و غم کی وجہ سے زخم کی طرح خون کے

آنسو روتے ہیں اور اگر کسی کو بہ تقاضاے بشریت کسی کام میں کوئی الجھن پڑ جائے اور اس کے دل میں سراسیمگی پیدا ہو ، نہایت حیرانی کے باعث وہ معاملے کو سلجھانے سے عاجز آ جائے اور آیۂ کریمہ 'وشاورھم فی الامر' کے مطابق ان مکار و فریب‌کار دوستوں سے اس سلسلے میں مشورہ مانگ لے تو یہ سیاہ باطن بے حیا اور 'تاریک فطرت' بد اعتقاد اس طرح اس پر احسان جتلاتے ہیں کہ گویا اسے انھوں نے ہزاروں درہم و دینار بخش دیے ہوں اور دوستی و محبت کے جملہ حقوق بجا لائے ہوں — 'بے یار' وہ جو ان کی یاری کا خواہاں ہو اور نا امید وہ جو ان سے کوئی امید وابستہ رکھے — ان کی یاری ، بے کسی اور ان کی ہم راہی واپسی (پیچھے رہ جانا) ہے - ع

دیدم ہمہ را و آزمودم ہمہ را

(میں نے سب کو دیکھ لیا اور سب کو آزما لیا) (صبح صادق)

(۲)

اس قوم کی محبت بغیر طمع کے نہیں ہوتی اور اس جماعت کا اخلاق بے غرض نہیں ہوتا - اس پر ایک کہانی یاد آئی ہے - محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ یمن سے مدینے کی جانب سفر کر رہے تھے ، راستے میں ایک جگہ ایک شخص سے ان کا سامنا ہوا ؛ اس شخص نے انھیں دیکھ کر سلام کیا ، بڑی خندہ پیشانی اور خوش زبانی سے ان کا حال احوال پوچھا اور پھر بڑے اصرار کے ساتھ اپنے گھر لے گیا ؛ گھر میں ان کے سامنے طشت و آفتابہ لایا ، نئی دری بچھائی ، لذیذ کھانے دسترخوان پر چنے اور ان کے چوپایوں کو چارہ وغیرہ مہیا کیا - دوسرے دن صبح کے وقت جب مہمان روانہ ہونے لگا تو اس نے میزبان سے کہا کہ "میرا گھر مدینے میں ہے ، اگر کبھی تجھے کوئی ضرورت در پیش آئے تو میرے گھر آنا ، میں ان شاء اللہ العزیز تیری جو بھی غرض ہو گی اسے پورا کروں گا -" اس شخص نے جواب میں پوچھا "کیا میرے پاس تیرا یا تیرے باپ کا کوئی مال تھا ؟" مہمان بولا "نہیں" پھر اس نے پوچھا "کیا میں تیرا یا تیرے باپ کا غلام تھا ؟" مہمان نے کہا "نہیں"

اس پر وہ کہنے لگا ''پس یہ جو میں نے تیری اتنی خدمت کی اور تیری ضیافت پر اتنا کچھ خرچ کیا ہے، تو اس کا عوض دیے بغیر یہاں سے کیوں کر جا سکتا ہے؟'' محمد بن ادریس بولے ''تو نے جو بات کہی اسے میں تسلیم کرتا ہوں؛ جو کچھ تو نے مجھ پر خرچ کیا ہے وہ بتا دے تاکہ میں ادا کر دوں؟'' اس نے کہا۔'' میرے سلام کا، جس میں میں نے پہل کی، عوض اتنا؛ خندہ پیشانی کے ساتھ جو حال احوال پوچھا، اس کا عوض اتنا، طشت و آفتابہ کا، کہ جس سے تو نے وضو کیا، عوض اتنا؛ گھر کا کرایہ اتنا، اصطبل کی اجرت اتنی، لذیذ کھانے کے پیسے اتنے اور چارپایوں کے چارے کے دام اتنے۔'' ابن ادریس یہ بات سن کر بڑے حیران ہوئے؛ غلام سے کہنے لگے کہ ''اس کا تمام حساب بے باق کر دے۔'' اس کے بعد انھوں نے قسم کھا لی کہ کبھی کسی کے گھر ضیافت میں نہ جائیں گے۔

حکما کا کہنا ہے کہ جو شخص بغیر کسی جان پہچان کے اور بے سبب و بے جہت تیرے ساتھ بڑی خوش خلقی سے پیش آئے اور چاپلوسی سے کام لے، تو اس پر فریفتہ مت ہو، کہ در پردہ اسے تجھ سے کوئی غرض ہے، اور اگر تو اس کی وہ غرض پوری نہ کر سکے تو تجھے ہر جگہ ذلیل و رسوا کرے گا۔ لہٰذا ایسے بے وقعت ناکسوں کی صحبت سے دور رہ اور ان فضل و ہنر سے عاری خود غرضوں کے قرب سے بچ۔

اشعار

کنارہ گیر ازین مردمان اہل نفاق
کہ ہر یکی بفریب و دغل بود مشاق
ترا ز صحبت این‌ها خدا نگہدارد
ز مکر و فتنۂ ہر بد بلا نگہدارد[۲]

سلاطین ہیں تو وہ تمام عدل و انصاف کے راستے سے بھٹکے ہوئے اور نخوت و غرور کی شراب سے بہکے ہوئے۔ ان کے محلات و عمارات قیصری ہیں تو کاخ و ایوان ان کے کسرائی[۳]۔ ان کے گھوڑے اور سواری کے جانور قارونی ہیں تو قاب و قاچاق[۴] (ٹھاٹھ باٹھ؟) ان کے فرعونی۔

ان کے اخلاق و طبائع نمرودی ہیں تو سفرہ و دسترخوان ان کے خاقانی اور مذہب ان کا شیطانی ۔ نہ ان کے اخلاق محمدی ہیں اور نہ ان کے اطوار مصطفوی (صلعم) ۔ جہاں تک امرا اور حکام کا تعلق ہے تو وہ سب زبوں کیش اور مطیع کُش ۔ ہر گھڑی اسی ادھیڑبن میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح سر کشی و نا فرمانی وقوع پذیر ہو تاکہ خراج گزاروں کے مال و ناموس پر دست تعدی دراز کیا جائے ۔ معصوموں کے اموال پر قبضہ کرنا اور مظلوموں کو ستانا ان کا مشغلہ اور غربا کو اسیر کرنا اور بے جا سزا و تادیب ان کا شعار ہے ۔

اشعار

(۱) گر شاہ ری ست و خسرو روم
بینی بدرش ھزار مظلوم

(۲) از باد جفا همیشه چون بوق
رفته سر هریکی بعیوق

(۳) ایوان بلند و قصر معمور
از مال یتیم و حق مزدور

(۴) شمعی که میان بزم سوزند
از روغن ظلم بر فروزند[۱]

عمال (گورنر) سب کے سب بد سرشت و زشت خو ، کہ اپنی مقصد بر آری کو آقا کے مقاصد پر ترجیح دیتے اور مقدم جانتے ہوئے ملک کی بربادی اور رعایا کی پامالی میں کوشاں رہتے ہیں اور معاملے کو اس حد تک لے جاتے ہیں کہ جس سے خون خرابا اور خانماں بربادی ہو ۔ سرکاری خزانہ خالی کرنے اور اپنا گھر بھرنے کی فکر میں ہر لمحے کمر بستہ اور چوکس رہتے ہیں ۔ اور اگر فتنے کی آگ بھڑک اٹھے تو اسے دبانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ دنیا کو دین پر ترجیح دیتے اور شیطان کے حکم کو سلطان کے حکم سے مقدم جانتے ہیں ۔

پیش کار اور دفتر کے دیوان ہیں تو وہ سراپا شر ؛ شب و روز رشوت ستانی کی فکر میں مصروف اور دروغ گوئی و حق پوشی میں

مسرور رہتے ہیں ، سعادت و خوش بختی کو اپنے سے کوسوں دور بھگا دیتے اور بد بختی کو ہزار کمندوں سے اپنی طرف کھینچتے ہیں ۔

اشعار

(۱) این نویسندهای دفتر ریو
در نظر آدم و بسیرت دیو

(۲) می ستانند هر چه می یابند
از کم و بیش رو نمی تابند

(۳) کین کس چون بدل رقم کردند
کار شمشیر با قلم کردند

(۴) هریکی زین گروه پر تزویر
اخذ و جر را نمی کند تقصیر

(۵) بستم نقد خواهش دل ها
زبهر سد طمع کند منها

(۶) جمع و خرجش اگر تو وا بینی
رقم محنت و جفا بینی

(۷) گر کنی در اوارجه نظری
یابی از ظلم و جور او خبری

(۸) غرض این ها همه دغل باز اند
همه حیله گر اند و غماز اند

(۹) همه بدکیش و بد معامله اند
چون زنان از نفاق حامله اند

(۱۰) رسم مهر و وفا نمی دانند
غیر جور و جفا نمی دانند

(۱۱) خامه تیغ ست در کف آن ها
پی قطع علوفهٔ غربا

(۱۲) مهر آغاز شان مبین زنهار
پر حذر باش هان ز آخر کار؎

ارباب منصب تمام کے تمام بے توفیق ، بے انصاف اور ستم شعار۔ ان کے نوکر سب کفران نعمت کرنے والے (نمک حرام) اور ناشایستہ امور کے ارتکاب میں بڑے بد اطوار ـــ آقا کا نمک کھاتے اور اسی کے سر پر پیالہ توڑتے ہیں۔

اشعار

(۱) از بدی سر بسر سرشته همه
تخم زشتی بسینه کشته همه

(۲) بد زبان ، بد قیافه ، بد طینت
نیست در گفتگوی شان لینت

(۳) روز و شب جمله در کمین باشند
درپئی مال و جان و دین باشند[۸]

واقعه نویسانِ سراپا تلبیس ، که بادشاهوں اور وزیروں کے حضور سے حقائق و کیفیاتِ معلوم کرنے والے جاسوس مقرر هیں ، حق کو باطل کا لباس پہناتے اور جھوٹ کو سچ کی شکل میں جلوہ‌گر کرتے هیں۔ اپنی کمینه فطرت کے سبب صوبه داروں اور عمال سے ساز باز اور آقا کے حقوق کو فراموش کر کے صحیح حالات کے بیان سے چشم پوشی کرتے هیں اور عیب و هنر اور شر و فساد کے متعلق هرگز دربار میں نہیں لکھتے۔ ان کی یه ناشائسته حرکت معاملات کے بگڑنے ، ملک کی ویرانی ، فتنه و فساد کی آگ کے بھڑکنے اور گزرگاهوں اور راستوں کے مسدود هونے کا باعث ، اور تاجروں کے لٹنے ، مسافروں وغیره کے قتل اور خاص و عام کی عزت و ناموس کی بربادی کا موجب بنتی هے۔ جس کا نتیجه یه هوتا هے که هر باغی و سرکش ، سردار بن بیٹھتا اور هر گھر دربار بن جاتا هے اور راهرووں کو منازل و مراحل طے کرتے وقت هر هر قدم پر فتنه و آشوب اور بے حد خوف و خطر کا سامنا کرنا پڑتا هے ۔ یه انصاف کے دشمن ، جو ایک دانے کی طمع میں خرمن کو جلانے والی برق اور ایک پتے کے لالچ میں خزاں کی هوا کے مانند چمن کے لیے آفت هیں ، ایسے گم راه و بد باطن هیں که اگر کوئی هر لحظه ان کو خوش رکھنے اور ان کی رضا چاهنے کی کوشش نه کرے

اور ان حریصوں کے وسیع حوصلے کے مطابق خاصی رقم بہ طور رشوت کے پیش نہ کرے تو یہ اپنے خبث باطن اور فطرتی شر کے سبب اس پر ناکردہ جرم کی تہمت لگا دیتے ہیں اور اس فعل کو اس بے چارے سے منسوب کرکے، کہ جس سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا ، حکام کی نظروں میں لے آتے ہیں ، جس کے سبب وہ منصب و خدمت سے معزول کر دیا جاتا اور مصیبتوں اور دکھوں میں مبتلا ہو جاتا ہے ؛ پھر یہ اپنی محفل میں ڈینگیں مارتے اور ضرب المثل ''تازیانہ بیابو عبرت بتازی است'' (ٹٹو کو کوڑا گھوڑے کے لیے عبرت ہے) سناتے ہیں ۔ قصہ مختصر موالی (حاکم) سب کے سب نا قدر دان ہیں اور اہالی (رعایا) تمام کے تمام بد اندیش ـــــ مقاصد فوت اور نامرادیاں درپیش ہیں ۔

شعر

کجا راحت ، چہ آسودن کہ از ناکامئ مطلب
بپای جستجو چون آبلـه خون گشت مطلبها

(راحت کہاں ، کیسا آرام کہ مقصد کی ناکامی کے سبب مقاصد جستجو و تلاش کے پاؤں میں چھالے کی طرح خون ہوگئے ہیں ۔)

(صبح صادق)

مرزا محمد حسن قتیل

[مرزا محمد حسن قتیل[1] (دیوالی سنگھ ، ۵۹-۱۷۵۸ع-۱۸۱۸ع) فیض آباد و لکھنؤ کے فارسی دان فضلا میں سے تھے ، اور ترکی و عربی میں بھی صاحب تصنیف ہوئے ۔ ان کی فارسی دانی مسلم ہے (اگرچہ غالب اسے تسلیم نہیں کرتے ۔) شجرۃ الامانی ، چار شربت اور نہرالفصاحت کے علاوہ ہفت تماشہ ، مظہر العجایب ، معدن الفوائد اور ثمرات البدائع ان کی تصانیف ہیں ۔ ایرانی اور تورانی فارسی کے ممیزات کو خوب سمجھتے تھے ۔ اس کے علاوہ ہفت تماشا البیرونی کی کتاب الہند کی طرز پر اپنے عہد کے رسم و رواج کے بارے میں لکھی ہے ۔ مظہر العجائب مناسبات شعری اور متعلقات شعری کا ایک مجموعہ ہے ۔]

شاہ مدار ، سخی سرور اور مسعود سالار غازی کے حالات

احوال شاہ مدار : اس کے بارے میں مختلف روایات سننے میں آتی ہیں ۔ بعض مرید اسے سید قرار دیتے ہیں لیکن یہ سرا سر کذب اور غلطِ محض ہے ۔ بعض منکرین یہ کہتے ہیں کہ یہ حلب کا ایک یہودی تھا ؛ کچھ عرصہ بعد مشرف بہ اسلام ہو کر درویشوں کے حلقے میں شامل ہو گیا ۔ چوں کہ اس کے سر میں 'فنافی اللہی' کا سودا سما چکا تھا اور اہل دنیا اور پیروی شرع سے اسے سروکار نہ تھا ، اس لیے اس نے جوگیوں اور ہندوستان کے دیگر فقرا سے 'اکتساب باطنیہ' اخذ کیا ۔ بیشتر وہ راکھ کے بستر پر سویا کرتا تھا ۔

اور بعض لوگ کچھ اور طرح سے بھی روایت کرتے ہیں لیکن اکثر

اشخاص کے نزدیک زیادہ صحیح یہی ہے کہ وہ یہودی تھا ۔ مکہ کے سفر میں سید اشرف جہانگیر[۲] ، جن کا مزار کچھوچھہ (فیض آباد اور بنارس کے درمیان) میں ہے ، خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی اور شاہ مدار باہم رفیق[۳] تھے۔ ان (لوگوں) کا زمانہ امیر تیمور صاحب قران کی سلطنت کا زمانہ تھا ۔

کچھوچھہ (کا تلفظ اس طرح ہے) : کاف عربی ، ہاے ہوز کے ساتھ ملی ہوئی جیم فارسی ، دونو حرفوں پر زبر ، واو ساکن ، ہاے ہوز کے ساتھ ملی ہوئی جیم فارسی پر زبر اور ہاے ہوز ساکن ۔ (ک چھ و چھ ہ) یہ ایک جگہ کا نام ہے ۔

الغرض شاہ مدار کی اس خاک نشینی اور تجردی کے سبب شرع کی قید سے آزاد جاہل شرفا اور امت مسلمہ کے پاک دامن فرومایہ پیشہ وروں مثلاً جولاھوں ، کنجڑوں ، دھنیوں ، باورچیوں ، بڑھئیوں اور رنگریزوں وغیرہ کا ایک جم غفیر اس کا معتقد تھا ۔ مرنے کے بعد اسے مکن پور میں دفن کیا گیا ۔ لیکن بعض یہ کہتے ہیں کہ اس کی قبر حلب میں ہے اور مکن پور میں صرف حجرۂ عبادت ہے مگر اس روایت میں صحت نہیں ہے ۔

خود وہ ساری زندگی قید شرع اور متانت سے کوسوں دور رہا ۔ اور دوسرے فقراے صوفیہ کے برعکس اس کا کسی سلسلۂ تصوف (مثلاً نقش بندی ، چشتی وغیرہ) سے بھی تعلق نہ تھا ، اگرچہ اہل شریعت اسے بھی جائز نہیں سمجھتے ۔ اس کا اپنا کوئی سلسلہ جاری نہ ہوا ۔ لیکن ارباب عز و جاہ کو چھوڑ کر جتنے بھی نیچ ذات اور چھوٹے مسلمان تھے ، انھوں نے جوق در جوق اس کے مرقد کی پرستش شروع کر دی اور اپنی کم مائگی و بے علمی کے سبب آسے (نعوذ باللہ) آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مرتبے کا اور خدا کے مساوی الرتبہ سمجھا ۔ چناں چہ آج تک ان کا یہ دستور ہے کہ ہر سال ہزاروں کی تعداد میں زن و مرد ، کیا بوڑھے کیا جوان سبھی اپنے اپنے علاقوں سے گروھوں کی صورت میں ، کالے جھنڈے لیے اور ناچتے گاتے

مکن پور آتے ھیں۔ اس جگہ ھر طرف تا حد نگاہ یہی زائرین ، کہ سب گھٹیا اور فرومایہ لوگ ھوتے ھیں ، اور سیکڑوں ھزاروں کی تعداد میں اس کے سلسلے کے فقرا نظر آتے ھیں۔ یا پھر رذیل پیشہ مسلمان اور بازاری ھندو بھی اس مجمع میں سر کے بل آتے ھیں۔ اس کے مریدوں کی تعداد ، بلا مبالغہ سکھوں کے رھنما نانک شاہ پنجابی کے معتقدوں سے زیادہ ھے اور وہ اس طرح کہ ھر شہر میں امرا کے نوکروں اور بازار نشینوں میں نانک شاہ کے مرید نظر آ جاتے ھیں ، اسی طرح مداریہ بھی ھر جگہ مل جاتے ھیں۔ بلکہ مؤخرالذکر کے بارے میں تو یہ ھے کہ جہاں کہیں راستے میں کسی فقیر کا تکیہ ، یا کسی گاؤں یا قصبے کے دروازے پر اس قسم کا آدمی ھوگا ، تو عقل فوراً بول اٹھے گی کہ وہ تکیہ مداری (مدار شاہ کے مرید) کا اور وہ بندۂ خدا مدار کا مرید ھے ؛ اور اس گاؤں اور قصبےمیں سوائے چند اھل علم و تمکین مسلمانوں کے باقی جو بھی بازاری اور غیر بازاری لوگ ھوں گے وہ سب کے سب مدار شاہ کے مرید و غلام ھوں گے۔

مدار شاہ کا نام بدیع‌الدین تھا۔ عربی میں مدار کے معنی قرارگاہ کے ھیں ، اور نجومیوں کی اصطلاح میں ستارے کے مرکز کو مدار کہا جاتا ھے ، اور صوفیہ کے مطابق مدار قطب کا ایک مرتبہ ھوتا ھے۔ الغرض اس کی قبر کے مجاور ھر روز صبح کے وقت کمربستہ ھو کر چاروں طرف قافلے کے راستے میں بیٹھ جاتے ھیں ؛ جب قافلے کو دور سے دیکھتے ھیں تو بھاگ کر ھر کسی کے پاس پہنچتے ھیں ؛ اگر تو طرف ثانی مسلمان ھو تو اسے اس طریقے سے شاہ مدار کی زیارت پر اکسائیں گے کہ ''مرتضیٰ علیؓ، حسنؓ، حسینؓ اور محمد رسول‌اللہ صلی‌اللہ علیہ وسلم یہ سب القاب مدار صاحب ھی کے ھیں۔'' اور اگر فریق ثانی ھندو ھے تو اس سے یہ اس طرح کہیں گے کہ ''رام اوتار ، کنہیاجی اور بھوانی یہ سب نام شاہ مدار ھی کے ھیں۔'' آئیے زیارت کیجیے اور ھر قسم کی مراد اور غرض جو آپ کے دل میں ھے طلب کریں تاکہ آپ کی وہ مراد وغیرہ جلد تر پوری ھو۔''

مکن پور (کا تلفظ اس طرح ہے) : مَ کَ نْ پُ و رْ۔ یہ اس قصبے کا نام ہے جہاں مدار کا مقبرہ ہے ۔ اتنا واضح ہو کہ مدار پرستی میں پختہ اعتقادی پورب کے ہندوؤں ، بالخصوص فرقۂ کایتھ سے مخصوص ہے ۔

سلطان سخی سرور کے حالات

پنجاب کے ہندو سرور سلطان کے بارے میں بڑا مضبوط عقیدہ رکھتے ہیں ۔ اس کا مزار ملتان کے قریب ایک گاؤں نگاھہ (لفظ نگاہ کے آخر میں ایک ہاے ہوز زیادہ) میں ہے ۔ یہ بھی شاہ مدار کی طرح نیچ ذات کے مسلمانوں اور ہندو شرفا کا حاجت روا اور پیر ہے ۔ بعض چھوٹے لوگ اسے بھی سید کہتے ہیں لیکن اس میں کوئی حقیقت نہیں ۔ اور کچھ شرفا کہ پیشۂ کتابت سے تعلق رکھتے ہیں ، اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان سرور خواجہ مولود چشتی[7] کے زمانے میں چوروں کا شریک تھا ــــ خواجۂ مذکور خاندان چشتیہ کے ایک بزرگ تھے ۔ حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح[8] کا سلسلہ چند واسطوں سے ان پر آ کر ختم ہوتا ہے ۔ خواجہ مولود قطب الاقطاب تھے ، یعنی جہاں کہیں کوئی قطب فوت ہوتا وہاں اس کی جگہ دوسرا قطب انھی کے حکم سے منصوب ہوتا تھا ــــ کہتے ہیں کہ ایک روز اس نے سر شام آ کر خواجہ کی خانقاہ کی پچھلی دیوار کو نقب لگانا شروع کی ۔ اگرچہ اس نے بڑی کوشش کی ، لیکن صبح تک کوئی راہ نہ پیدا کر سکا اور اس کا نقب لگانے والا اوزار بھی ٹوٹ گیا ۔ اسی دوران میں خواجہ مولود کے ایک مراقبہ کرنے والے مرید نے ان سے کہا کہ ''ملتان کا قطب اس وقت دارالبقا کو سدھار گیا ہے ، اس کی جگہ دوسرا قطب بھیجنا ضروری ہے ۔'' خواجہ چوں کہ اس چور (سلطان سرور) کی تمام رات کی محنت سے بہ خوبی آگاہ تھے ، اس صوفی سے کہنے لگے کہ ''یہ چور تمام رات پتھر سے سر ٹکراتا رہا ہے ؛ بے چارہ کسی فائدے کی توقع میں یہاں آیا تھا ، اس کی اس محنت اور ناکامی کو دیکھ کر جی نہیں چاہتا کہ وہ اس دروازے سے محروم لوٹے ۔ لہٰذا بہ تقاضاے رحم دل یہی کہتا ہے

کہ اسے ملتان کا قطب بنا دوں ۔'' مرید نے کہا ''جیسا آپ مناسب سمجھیں ۔'' قصہ کوتاہ اسے ملتان کا قطب بنا دیا گیا ۔

ملتان کے بعض شرفا خصوصاً روضۂ بہاء الدین زکریا رح جو شیخ شہاب الدین سہروردی رح کے مرید تھے ، کے مجاوروں کا یہ کہنا ہے کہ ''نگاھہ میں قطعاً کوئی قطب مدفون نہیں ؛ البتہ اس گاؤں کے لوگوں نے ایک چار کا سر یہاں دفن کیا ہوا ہے ۔'' واللہ اعلم ، معلوم نہیں ان دونو میں سے کون سی روایت قرین صحت ہے ؛ البتہ دوسری روایت میں عداوت کے سبب جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے ۔ کیوں کہ جو مال و دولت سلطان سرور کے مجاوروں کو اس کے معتقدوں سے حاصل ہوتی ہے وہ بہاء الدین زکریا رح کے مجاوروں کو کبھی خواب میں بھی نصیب نہیں ہوئی ۔ اور یہ پیشہ‌ورانہ ہم چشمی و رقابت تو کوئی نئی چیز نہیں ، قدیم سے اسی طرح چلی آ رہی ہے ۔ پھر بھلا اول الذکر صوفی (ذکریا) کے مقبرے کے مجاور بھی کیوں کر جھوٹے اور افترا پرداز نہ ہوں گے ۔ قصہ مختصر اس عقدے کی گرہ کشائی اس کے پیرو کاروں کو مبارک ہو، ہمیں ان معاملات کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں ۔ بہ ہرحال شہرت کی بنا پر ہم نے جو دیکھا سنا ہے وہ یہ ہے کہ جاہل اور نیچ قوم کے مسلمان اور پنجاب کے ہندو شرفا سب اس کے آستانے پر ارادت و خلوص سے جبہہ سائی کرتے ہیں ۔

شاہان مغلیہ کے تسلط سے پہلے ہندوستان کے ایک بادشاہ نے دو عدد بدخشانی لعل اس کی قبر پر بطور نذر کے چڑھائے تھے ، اس روز سے 'پیرصاحب لعل' کے لقب سے ملقب ہوا ۔ چناں چہ آج بھی مسلمانوں کے ایک رذیل پیشہ فرقے کے لوگ جو براھی (ب ر ا ہ ی) کے نام سے موسوم ہے ، بڑی عقیدت کے ساتھ بڑے بڑے ڈھول پیٹتے اور اس کا اسم مبارک اسی لقب کے ساتھ گاتے ہوئے خود بھی رقص کرتے ہیں اور سامعین کو بھی نچاتے ہیں ۔ پنجاب میں اس ناچ کو 'لڈی' کہتے ہیں ۔ (لڈی کا تلفظ اس طرح ہے) : لام پر پیش ، بے نقطہ ثقیل دال (ڈ) پر شد اور یاے معروف ـــ اور اس نغمہ و سماع

میں بے پناہ تاثیر ہے ۔ اس سے اکثر اہل درد رذیلوں اور احمق شرفا پر گریہ طاری ہو جاتا ہے ۔

روایت ہے کہ پنجاب میں جب کسی ہندو لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو براہی اس کے گھر کے صحن میں آ کر دولہا اور دلہن کے مقابل کھڑے ہوجاتے اور نغمے الاپنا اور ڈھول پیٹنا شروع کر دیتے ہیں ، پھر جیسے ہی سرور مذکور کا نام زبان پر آیا پاؤں اٹھا کر ناچنے لگ جاتے ہیں ۔ اور جب ہنگامۂ رقص گرم ہو جاتا ہے تو وہ ہندو لڑکا اور اس کی بیوی دونوں اس لڈی میں شریک ہو کر براہی کی آواز پر رقص کرتے ہیں ۔ ان کے اعتقاد میں یہ رقص باعث خیر و برکت ہے ۔

براہیوں کے نغمۂ و سماع میں تین باتیں ہوتی ہیں ۔ یا تو وہ سرور کی مدح اس رنگ میں کرتے ہیں کہ وہ 'پیر صاحب لعل' تھا ، یا اس (نغمہ) میں بھیرو نام کے ایک برہمن کا قصہ ہوتا ہے ، جو ابتدا میں تو نان شبینہ تک کا محتاج تھا لیکن بعد میں سرور کے ساتھ اپنی عقیدت راسخ کے سبب ترقی کر گیا ۔ یا پھر لاہور و ملتان کے ناظم اور نواب عبدالصمد خاں[9] بہادر دلیر جنگ کے بیٹے نواب زکریا خاں[10] مشہور بہ خان بہادر کے عدل کا ذکر ہوتا ہے ۔

بھیرو ہندو نام ہے اور (اس کا تلفظ اس طرح ہے) بائے فارسی زیر کے ساتھ دو چشمی ہ سے ملی ہوئی ، یائے مجہول ، بے نقطہ را ، اور واو معروف ۔ بھ ے رو ۔)

باوثوق لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ جب معزالدین جہاندار شاہ اپنے والد بزرگوار شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگ زیب عالمگیر رحہ کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس نے سرور کے نوبت خانے میں چاندی کے نقارے بھجوائے ، چناں چہ یہ بات بھی عوام کے مزید اعتقاد کا باعث بنی ۔

القصہ ، سرور کے ہندو مرید اپنے مذہب کے پیشواؤں کو بھی عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں ۔ لیکن درگاہ خداوندی سے اپنی

مراد سرور کے وسیلے سے مانگتے ، اور ہر قسم کی دنیاوی ترقی کو اسی کی عنایت و توجہ سے جانتے ہیں ۔ ہر جمعرات کو اس کی نیاز کا حلوہ لوگوں میں بانٹتے اور اسی روز گھر کے حجرے میں چراغ روشن کرتے ہیں ۔ اس قسم کے چراغ اور حجرے دھلی تک کے بعض ہندوؤں کے گھروں میں موجود ہیں ۔ اس کے مریدوں کے اعتقاد کے مطابق اگر اس کا کوئی معتقد ہندو دانستہ طور پر جھٹکے وغیرہ کا گوشت کھائے تو وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے ، اور اگر سور کھائے تو کوڑھی ۔ یا پھر اس کے جسم پر موٹا سا دانہ نکل آتا ہے جس کی بدبو سے کیڑے پیدا ہوجاتے ہیں اور وہ جلد مر جاتا ہے ۔

جس طرح نیچ ذات کے مسلمان ہاتھوں میں جھنڈے اٹھائے دور و نزدیک سے آ کر شاہ مدار کے مزار پر جمع ہوتے ہیں ، اسی طرح ہر سال ہر شہر کے باہر سرور کے جھنڈے نصب کرتے ہیں ۔ اور براھی ہر جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر ڈھول پیٹتے اور اپنے پیر کی مدح کے الفاظ گاتے ہوئے ناچتے ہیں اور دوسروں کو بھی نچاتے ہیں ۔ اس تماشے کو دیکھنے کے لیے کیا ہندو کیا مسلمان سب جوق در جوق پہنچتے ہیں ۔ دکان دار قسم کے لوگ بھی حصول نفع کی امید میں اس جگہ حلوہ اور دیگر قسم کی مٹھائیوں وغیرہ کی چھوٹی موٹی دکانیں سفید یا رنگین ٹاٹوں سے بنا لیتے ہیں ۔ بعض نے تو ان کے اوپر چھتر بھی سجا رکھے ہوتے ہیں ۔ مختصر یہ کہ تمام رات اسی شور شرابے میں گزر جاتی ہے ۔ دوسرے دن صبح کے وقت یہ لوگ نگاھہ کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں ، لیکن تمام اهل مجمع نہیں ، کیوں کہ تمام معتقد اور غیرمعتقد تماشائی شہر کو واپس لوٹ جاتے ہیں اور کچھ دکان دار بھی اپنی چیزیں فروخت کر کے ان کے ہمراہ ہولیتے ہیں ۔ مگر براھی اور بعض طالبان مراد (نگاھہ کی طرف) چل پڑتے ہیں ۔ اس کے علاوہ کچھ بازاری لوگ بھی حصول منفعت کے خیال سے ان کے رفیق سفر بن جاتے ہیں ۔ نگاھہ میں زائرین کی کثرت کو اسی ایک شہر (کی کثرت) پر قیاس کر لینا چاہیے ۔ یعنی ایک شہر کی کثرت کے عدد کو، براھیوں ، دیگر مریدوں اور بازاری آدمیوں سمیت ، ہزار سے ضرب

دینی چاہیے - کوئی بھی بڑا شہر اس جتنا آباد نہیں - اور کوئی بھی لشکر اس ہنگامہ و رونق کا لگا نہیں کھاتا -

ہندوستان میں یہ بات مشہور ہے کہ کمینے اور چھوٹے لوگوں کا مال اگر پیر لوگ نہ کھاتے تو ان میں کا ہر شخص شرفا کو حقارت سے دیکھتا ، اس لیے کہ اس جماعت کا ہر فرد سارے سال میں جو کچھ کماتا ہے وہ آس کا مکن پور، نگاھہ اور بھڑاچ (بَ ہْ ڑ ا ءِ چْ) ہندوستان میں ایک قصبہ ہے جہاں مجہول النسب سالار مسعود غازی کا مزار ہے—کی نظر ہو جاتا ہے- بعض چھوٹے لوگوں کو تو دوری مسافت کے سبب وہاں آنے جانے میں پورا سال لگ جاتا ہے - البتہ نگاھہ جانے والےسرور پرست ہندو بہل سواروں کی تعداد ہر سال ہزاروں تک جا پہنچتی ہے - بہل (ب ہ ل یعنی بر وزن سہل) رتھ کی مانند ایک چیز ہوتی ہے جس میں لکڑی کے دو گول پائے (پہیے ؟) ہوتے ہیں -

مسعود سالار غازی

سالار مسعود بھی شخصیت کے لحاظ سے شاہ مدار اور سرور سلطان دونوں کے برابر ہے ، کسی بات میں بھی ان سے کم نہیں - جس طرح پنجاب کے نیچ ذات مسلمان اور ہندو ، جو سرور کے معتقد ہوتے ہیں ، سرور کی قسم جھوٹی نہیں کھاتے اسی طرح میواتی لوگ اور پورب کے رہنے والے شاہ مدار اور سالار کی قسم جھوٹی نہیں کھاتے -

اس کے مرید اسے سید سالار کے نام سے موسوم کرتے اور جناب محمد ابن حنفیہ رض کی نسل سے بتاتے ہیں - علاوہ ازیں اس بات کے بھی مدعی ہیں کہ وہ سلطان محمود غزنوی کا بھانجا اور اس کے لشکر کا سپہ سالار تھا ، اور سلطان مذکور ہی کے فرمان پر اس نے ہندوستان کے ممالک کو فتح کیا - اس کے ہمراہی جگہ جگہ شہید ہوئے - چناں چہ (ان مریدوں کے مطابق) دھلی میں ترکمان دروازے کے قریب اعظم خاں مرحوم کی حویلی سے متصل جو منقش قبر چتلی قبر کے نام سے مشہور ہے ، وہ اسی (سالار) کے ایک ہمراہی سید روشن علی کی قبر ہے—چتلی کا تلفظ اس طرح ہے : چِ تْ ل ی - دھلی میں ہر اس

منقش چیز کو جو سماعت میں مؤنث معلوم ہو ، چتلی کہتے ہیں ـــــ الغرض کافروں کے ساتھ جنگ و جدل کرتے ہوئے وہ (سالار) بہرائچ کے مقام پر شہید ہوا ۔

کہتے ہیں کہ اس نے قصبۂ ردولی میں ، جو اودھ سے ایک منزل کے فاصلے پر ہے ، اپنی شادی کا سلسلہ رچایا ہوا تھا ، اور ریشمی ڈوری بھی ، جو ہندوستان کی رسم کے مطابق داماد کے ہاتھوں میں نکاح کی رات سے ایک ہفتہ پہلے باندھتے ہیں ، اس کے ہاتھوں میں باندھی جا چکی تھی ، کہ اتفاق سے اسی دن جب کہ اس کا عقد ہونے والا تھا یا اس سے دو تین روز پیشتر اسے کافروں کے غلبے کی خبر ملی ؛ سب کچھ چھوڑ چھاڑ وہاں سے لڑائی کے لیے نکل آیا اور اسی جنگ میں مارا گیا ۔ چناں چہ اسی سبب سے ہر سال مذکورہ شب کے موقع پر اس کا پلنگ اور بستر اس قصبے کے ایک مقفل حجرے سے باہر لایا جاتا ہے اور بے شمار لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں ۔ لیکن لوگوں کا جو ہجوم بہرائچ میں نظر آتا ہے ، ردولی میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا ۔

سالار مسعود کے باپ سلطان محمود شاہ سالار کی قبر سترک نامی گاؤں میں ہے جو لکھنؤ سے دس کوس کے فاصلے پر ہے ۔ جن دنوں سالار مسعود کے زائرین روانہ ہونے والے ہوتے ہیں اُن دنوں اس گؤں میں بھی بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا ہے ۔ اور تین روز تک یہ لوگ اُس (شاہ سالار) کے آستانے پر خوب خوب عبادت کرتے ہیں - اس علاقے کے امیرلوگ اپنی مرادوں کے حصول پر اس کی قبر پر نیا غلاف چڑھاتے ہیں ۔ اگر یہ غلاف اُس پر پورا آ جائے تو اسے سعادت اُخروی کا سرمایہ اور نمایاں دنیاوی ترقیات کا باعث گردانتے ہیں ۔

قصہ مختصر مسلمان اس (سالار) کے فقیر کو شہید کے نام سے اور دوسروں کو ولی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں ۔ نیچ ذات کے مسلمانوں کی طرح ہندو بھی جب اس کی زیارت کا قصد کرتے ہیں تو اپنے بچوں کے سر منڈوانا چھوڑ دیتے اور مقررہ مدت گزر جانے کے بعد بہرائچ جا کر منڈواتے ہیں ۔ پورب کے بعض شرفا کا سلسلۂ نسب سالار کے

رفقا پر ختم ہوتا ہے ، یعنی یہاں کے سادات اور شیوخ کے آبا ؤ اجداد اس کے ہمراہ ہندوستان آئے تھے ۔

خدا کرے کہ اس کے یہ حالات قرین راستی و صحت ہوں ، ورنہ ان کے جھوٹ ثابت ہونے کی صورت میں اہل عزت خرابی سے دوچار ہوں گے ۔ (ہفت تماشا)

ایران و توران میں فارسی زبان

فارسی زبان کے ذکر میں : میرا کہنا ہے کہ شعر فارسی کے مقلد کے لیے ایران اور توران دونوں (کے دبستان ہائے شعر) سند ہیں ۔ اور تورانیوں کی نسبت اہل آذربائیجان کی زبان بہتر ہے ۔ خراسان کے لوگ آذربائیجانیوں سے اور شیراز والے اہل خراسان سے زیادہ فصیح ہیں ۔ لیکن اہل اصفہان سب سے بڑھ کر ہیں ۔ ایران کے کیا شہری اور پہاڑی لوگ اور کیا شرفا اور رذیل سبھی اہل زبان ہیں ۔ گفتگو کے وقت ایک عام خدمت گار اور مرزا صائب (مشہور شاعر) دونوں برابر ہیں اور دونوں کی زبان مستند ہوگی ۔ مگر بعض اہل زبان ہندوستان کے لوگوں کی مانند بعض حروف ادا نہیں کر سکتے ۔ اور یہ بات ہر فرقے اور ہر قسم کے لوگوں میں پائی جاتی ہے ۔ چناں چہ بعض کے یہاں 'قاف' کا مخرج نہیں ہے ۔ اور اسی طرح جب اہل زبان اس قسم کے لفظ بولیں گے تو وہ غلط ہوں گے : 'خرطوم فیل' کی بجائے 'خلطوم فیل' ، 'دیوار' کی بجائے 'دیفار' ، 'کاروھار' کی جگہ 'کاے وھاے' ، 'آتشین' کی جگہ 'اواتشین' ، 'شب' کے بجائے 'شو' اور 'قلم' کی جگہ 'کلم' ۔ نیز اگر ایران کے کسی شاعر نے غلط بحر یا قافیہ استعمال کیا ہو تو وہ بھی سند نہ ہوگا ۔ ایرانیوں کا اپنی وضع کے مطابق عربی الفاظ میں رد و بدل کرنا اور اسی طرح عربوں کا عجمی الفاظ میں تصرف درست اور جائز ہے ۔ جیسے عربی الفاظ میں یہ تصرف : طلبیدن (طلب کرنا) فہمیدن (فہم سے بنایا گیا ہے بہ معنی سمجھنا) اور بلعیدن (بلع سے ۔ مطلب نگلنا) اور فارسی کے الفاظ میں اس قسم کا تصرف : 'ششدر' ، 'مزلف' ، 'مزیب' اور نزاکت وغیرہ ۔ جو لفظ اعلیٰ درجے کے

چار شاعروں نے استعمال کیا ہو وہ بھی سند ہوگا ، اگرچہ اصل میں وہ غلط ہو ۔ یا پھر ایران کے دس موزوں طبع شاعر (اس کے استعمال پر) متفق ہوں ، یا اس کا تلفظ علی العموم روا سمجھیں (تو وہ سند ہوگا) ۔

متقدمین اور متاخرین کے اشعار اور اہل ہند و اہل زبان کی نثر میں فرق کے بیان میں

صاحب دانش و عقل پر پوشیدہ نہ رہے کہ ایران کا روزمرہ ہر ساٹھ سال کے بعد تغیر پذیر ہوتا ہے ۔ ہر ساٹھ سالہ دور میں فصحا اکٹھے مل بیٹھتے اور اس میں نئے نئے تصرفات بروئے کار لاتے ہیں ۔ لہذا جس شعر میں حال کا روزمرہ ہو وہ قدیم شعرا کا نہ ہوگا ۔ روزمرہ سے مراد وہ الفاظ ہیں جو اہل ایران گفتگو کے وقت استعمال کرتے ہیں ۔ ان میں سے کچھ کا ذکر ہم نے اپنی کتاب شجرۃ الامانی میں کر دیا ہے ۔ باقی مغل (؟) سے سننے چاہئیں کہ اس سلسلے میں کتاب کی طرف رجوع کرنا بے سود ہے ۔

جہاں تک توران کی فارسی کا تعلق ہے اس میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی ، اس لیے کہ تورانی اس زبان کے مالک نہیں ہیں اور ان میں اگر فارسی کے فصحا ہیں تو وہ صرف شعرگوئی میں ہیں ، اس صنف (روزمرہ) میں کم ہی نظر آتے ہیں ، چند الفاظ اہل زبان سے مخصوص ہیں کہ جو ان ہندوستانیوں کی نثر میں نہیں ملتے جو صحیح مقلد نہیں ہیں ۔ اور اسی طرح اس قسم کے روابط ، 'کشکچی' (پاسبان) 'قشون' (لشکر) ۔ 'پیلکات' (تحفے ، سوغاتیں) ۔ 'بلوکات' (دہ وقریہ) ۔ 'بگلر بیگی' (امیرالامرا وغیرہ) ۔ 'درخانہ' (دربار) ۔ 'سیورغال' (انعام ، مدد ، معاش) ۔ 'تیول' (جاگیر)۔ اور 'کلانتر' (چودھری ، تھانیدار) وغیرہ ۔ 'ماضی' کی بجائے صیغۂ 'مضارع' کا اور 'مستقبل' کی جگہ 'ماضی' کا استعمال ، 'می گفتہ است' (بجائے 'می گفت') اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ اور کسی واقف مرے ہوئے کے نام سے پہلے 'مرحوم ، خدا بیامرز' کا استعمال ۔ بزرگ بجائے کلاں ۔ کوچک بجائے خُرد ۔ قلعچی ۔ تَنک و شلاق ۔ روضہ خواں ۔ بابا ۔ مردکہ ۔ پسرہ ۔ دختر ۔ بچہ ۔ طغرل شدن ۔ شنقارشدن ۔

علی قابو - زن حلب - چرخچی - منقلا - تخم - کوکو - ریشخند - ریش - سبل - تکتو - توشمال - قرشمال - جل - زغ - بیلدرچی - خرکس - خیر (به معنی نه) اور 'آن' کی تقدیم کے بغیر لفظ 'جناب' به معنی صاحب - اسی طرح 'قبله' بجائے 'آن قبله' - ملازمان و خدام ایک هی معنی میں ، چک و چانه - چه می شود - اینها (بجائے ایشاں) - آوها - متکلم کے لیے لفظ 'بنده' اور 'مخلص' وغیره لانا اور اسی معنی میں 'داعی' و 'راقم' کا استعمال وغیره (هندوستانیوں کی نثر میں کم هی نظر آتے هیں -)
(نهرالفصاحت)

پاک و هند میں فارسی

املا کی درستی : اکثر صاحبوں سے ، ان کے شاعری ، انشا پردازی اور زبان پر عبور هونے کے باوجود ، املا میں غلطی هو جاتی هے - اور زیاده تعجب کی بات تو یه هے که بعض علما' بھی مشهور عربی الفاظ سے پوری آگاهی کے با وصف اس قسم کی کیفیت سے دوچار هو جاتے هیں - اس کی تصحیح کا انحصار تامل اور لغت کو مسلسل دیکھتے رهنے پر هے -

نثر یا تو تکلف سے خالی (ساده) هو گی یا پھر 'به تکلف' (مرصع) - تکلف سے خالی نثر دو قسم کی هے - یا تو وه اهل زبان کی وضع کے مطابق هوگی ، اور وه سب سے عمده و اعلیٰ هے - لیکن کیا کیا جائے که هندوستان میں اس کا رواج نہیں هے - بلکه یہاں کے منشی تو ان محاورات کو عدم واقفیت کے سبب پوچ جانتے هیں اور ان کے سمجھنے سے بھی عاری هیں —— یا پھر اهل هند کی طرز پر هو گی - یہاں اهل هند کے طرز سے همارا مقصد غلط اور بے محاوره عبارات نہیں هیں بلکه ایران و توران کی فارسی میں عدم امتیاز هے - کیوں که اهل هند نے جو کچھ کتابوں میں پڑھا ، اسی کے مطابق لکھا - ان کے یہاں تو یہی کتابی فارسی رائج هے - اور اهل تصانیف نے نظم میں وزن و قافیه کے لیے یا سجع یا کسی صنعت کی خاطر ، یا کسی قدیم استاد کی تقلید میں ، یا کسی لفظ اور عبارت سے اجتناب و احتراز اور اس کی جگه کوئی دوسرا لفظ استعمال کرنے کے بارے میں اس وقت کے فصحا کے عدم اتفاق کے باعث ، یا کوهستان یا شهر کے بیرونی اطراف میں رهائش پذیر هونے کے سبب

یا ترکوں سے میل جول رکھنے یا ایسے شہروں میں رہنے کی وجہ سے کہ جہاں ایرانیوں اور تورانیوں کا اجتماع ہو ، یا سلاطین ترکستان کی ملازمت اختیار کرنے اور ان کے روزمرہ کی تقلید کے باعث ، یا طول عبارت سے 'مبتدا' اور 'خبر' کو پرتکلف بنانے اور ایجاز و اختصار کے بعض الفاظ اور بعض روابط کو حذف کرنے کی خاطر ایران اور توران اور بے تکلف و با تکلف میں کوئی امتیاز نہیں کیا ۔ **مثال :**

بیت

شب از مطرب که دل خوش باد وی را
شنیدم نالۂ جانسوز نی را

(کل رات میں نے مطرب سے ، کہ خدا اس کے دل کو خوش رکھے ! بانسری کا جان سوز نغمہ سنا ۔)

یہاں (وی کی جگہ) لفظ 'او' مانع قافیہ تھا ۔

دوسری مثال :

زهی طالع مادر روزگار   که پور چنین پرورد در کنار

(واہ واہ ! زمانے کی ماں کا نصیبہ (کتنا اچھا ہے) کہ وہ اس جیسا بیٹا اپنی گود میں پالتی ہے ۔)

یہاں پور کی جگہ پسر کی گنجائش نہ تھی ۔ اور یہ سوائے نثر اور بے مضاعف الیہ کے فارسی میں مستعمل نہیں ، اور ایران کے اساتذۂ متاخرین کی وضع کردہ اصطلاحات میں سے ہے ۔

سجع نثر کے قافیے کو کہتے ہیں ، مثلاً :

''از بسکه دلیران چار طرف بشتافتند و تیرهای خارا دوز بجانب مخالفان برتافتند ۔ قیامتی دران صحرا قیام نمود ۔''

دوسری مثال :

''یک تنگه به ینگه نمی دهد ، و پگاه نگاه بمن کرد ، و بیگاه از بنگاه بیرون آمدم ۔''

طوالت سے عبارت میں تکلف پیدا کرنے کی مثال :

”فراز برج قلعه که نه فلک زینه های راه رفتن بآن نمی تواند شد برآمدند ۔“

اس قسم کی عبارات چوں کہ خواص تصنیف کے وقت حیطۂ تحریر میں لاتے ہیں اور عوام میں ان کا رواج نہیں ہے ، لہٰذا عدم سماعت کے سبب یہ روزمرہ میں جچ نہیں سکتیں ، خواہ رتبے میں کتنی ہی بلند کیوں نہ ہوں ۔

اور یہی کیفیت چھوٹی اور مختصر عبارتوں کی ہے ۔ مثال :

”آن مرد که اگر این حرکت عمداً کرده بود مرگ ملازمان که بسزا رسیده بود و نتیجۂ نیک ندیده بود ۔“

لفظ بود اس عبارت میں تین مرتبہ آیا ہے اور یہ اس طرح ہونی چاہیے :

”فلانی اگر عمداً این حرکت کرده بود یا می کرد بسزا رسیدے یا می رساندمش و نتیجۂ نیک نمی دید یا ندیدے ۔“

دوسری مثال :

”روزی حضرت ظل سبحانی بر تخت خلافت جلوه فرما و ارکان دولت همه در رکاب سعادت حاضر ، و جمعی از مغنیان خوش آواز و رقص آشنایان پری پیکر پیش پیش جلوه ریز متوجه باغ شهر آرا شدند ۔“

روزمرہ کے مطابق یہ عبارت اس طرح لکھی جانی چاہیے :

”یک روزی بندگان اقدس سوار تخت می شود ، امراے دولت هم همه حاضرمی شدند و چند تا مطرب خوان و لولیان رقصان پیش پیش راه می روند جلوه ریز ، متوجه می شود بباغ شهر آرا ۔“

دوسری مثال :

”دیروز حضرت خدیو گیهان بر تخت مع ارکان دولت و

مغنیان خوش آواز پری پیکران رقاص چہ زود لمر متوجہ باغ شہر آرا شدند۔''

جب بادشاہ توران ظہیرالدین محمد بابر ہندوستان پر قابض ہوا اور سلطنت گورکانیہ (مغلیہ) نے طول پکڑا تو اس وقت سے لے کر اس دور تک [کہ اب اس درگاہ کے نوکروں کی بدنہادی اور سیہ‌باطنی کے سبب اس سلطنت عالیہ کا چاند ایک مدت سے گہنایا ہوا ہے؛ اگرچہ ظاہر میں سکہ بادشاہ زمان یا حضرت شاہ عالم بہادر کے نام نامی کا چلتا ہے۔ شاہ موصوف کا سلسلۂ نسب آٹھ پشتوں سے آں حضرت (بابر) تک پہنچتا ہے اور آں حضرت کا چار واسطوں سے حضرت صاحب قران (تیمور) تک] کچھ اس کثرت سے تورانی اور ایرانی ہندوستان میں وارد ہوئے کہ یہاں کے رہنے والوں کے لیے دونوں فارسیوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ مگر جو لوگ طبیعت خوب کے مالک تھے اور ہیں انھوں نے صاف کو تلچھٹ سے علیحدہ کیا۔

پس روزمرہ نویس پر واجب ہے کہ عبارت میں روانی پیدا کرے اور اہل زبان یا کسی کسبی زبان داں سے ایران کا روزمرہ حاصل کرنے کے بعد ''ہندوستان میں رواج یافتہ'' روزمرہ کو خطوط میں جاری رکھے۔ ''تکلموالناس علی قدر عقولہم۔'' (لوگوں کے ساتھ ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو۔) اور اگر مخاطب کوئی کسبی زبان داں یا اہل زبان ہو تو پھر ایران کا روزمرہ استعمال کرے۔

(نہرالفصاحت)

غلام حسین

[غلام حسین (۲۸-۱۷۲۷ع — ۱۸۱۵ع؟) سیرالمتاخرین کی تکمیل ۱۷۸۱ع میں ہوئی - آخری مغلیہ عہد کی تاریخوں میں اسے بڑی اہمیت حاصل ہے - مہابت جنگ (علی ویردی خان) کے حالات اور پلاسی کی لڑائی (۱۷۵۷ع) کے سلسلے میں مصنف نے بعض بالکل نئی معلومات درج کی ہیں -]

(۱)

خطبۂ لاہور کے بارے میں

بادشاہ مذکور (بہادر شاہ اول) خود فاضل و محدث ہونے کے علاوہ اہل فضل و کمال کی صحبت کا شائق اور فنون علم ، خاص طور پر فقہ و حدیث میں بے حد مہارت رکھنے کے باعث تمام تیموری سلاطین سے فائق تھا - ارباب علم کے ساتھ اس کی صحبت اور علمی بحث رہتی - چوں کہ اس کی تحقیق کے مطابق شیعۂ امامیہ کا مذہب سچا تھا ، اس لیے اس نے اسی مسلک کو اختیار کر رکھا تھا - جن دنوں وہ دارالسلطنت لاہور میں وارد ہوا ، اس نے وہاں کے تمام علما کو ، کہ ان میں سے اکثر ناصبی مذہب[۱] تھے ، جمع کیا اور ان پر حضرت امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی حقیقت و وصایت کے بارے میں حجت تمام[۲] کی - جب انھوں نے اس کلمے کا اقرار و اعتراف کر لیا تو بادشاہ نے چاہا کہ کلمۂ ''علی ولی اللہ و وصی رسول اللہ'' کو خطبے میں جاری کرائے ، لیکن چوں کہ ایسے کام کے لیے اوامر و نواہی میں بڑے نفاذ کی ضرورت ہوتی ہے اور سلاطین ہند ، خاص طور پر آخری مغلیہ بادشاہوں کو یہ بات کم ہی میسر تھی ـــــ اس کے دو بیٹے ، عظیم الشان اور

خجستہ اختر جہاں شاہ[۲] ، کہ دونوں بڑے دلیر اور مقتدر اور بڑے کٹر سنی و اشعری تھے اور اس علاقے کا بلوائے عام (کہ وہاں کے بیشتر لوگ ناصبی مذہب ہیں) اس معاملے میں رکاوٹ بنے اور اس کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

ایک مرتبہ اس نے ایک خطیب کو شاہ زادہ عظیم الشان کے ہمراہ جامع مسجد میں بھیجا تاکہ وہ خطبے میں یہ کلمہ پڑھے ، لیکن چوں کہ خود شاہ زادہ اس تحریک کا مخالف تھا ، اس لیے پیشتر اس کے کہ بے چارہ (خطیب) اس کلمے کا آغاز کرے وہ بے گناہ شاہ زادے کے اشارۂ باطنی و تحریک سے لوگوں کی شمشیر کا نوالہ بن گیا۔ حنفی مذہب کے بڑے بڑے بزرگوں نے بہادر شاہ کے دفعیہ کے لیے دعائیں اور ختم کرائے ، ہر فاسق و فاجر اور مسلم و کافر سے مدد چاہی۔ مگر بہادر شاہ بدستور اپنی اس بات پر مصر اور مذہب شیعہ کی ترویج و تقویت میں کوشاں رہا۔ ایک عرصے تک علما سے بحث مباحثہ ہوتا رہا ، لیکن کوئی فائدہ و نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ہاں! اگر مذہب کی ترویج کا انحصار دلیل و برہان کی اقامت پر ہوتا تو خالق حقیقی سید انبیا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ، کہ عرب و عجم کے سب سے بڑے خوش بیان اور دنیا کے سب سے بڑے عالم تھے ، جہاد پر مامور نہ فرماتا۔ (سیرالمتاخرین)

(۲)

[مہابت جنگ[۳] کے اس جہان فانی سے کوچ کرنے اور اس فخر دودمان کے بعض اخلاق و انتظام اوقات کا تذکرہ اور سراج الدولہ[۴] کے مسند ایالت پر متمکن ہونے اور اس 'سراپا حماقت' بے وقوف کی نادانی کے سبب فتنہ و فساد کے ظہور کے آغاز اور مغرور امرا کی بے شعوری کے باعث تمام علاقوں میں فتنہ و شر کے پھیلنے اور آباد مملکت کے برباد ہونے کا ذکر۔]

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں ، مہابت جنگ کو اسی برس کی عمر میں نویں جمادی الاول ۱۱۶۹ھ کو استسقا کی بیماری شروع ہوئی۔ چند روز تو اس نے علاج اور پرہیز کیا ، لیکن بعد میں

یہ کہہ کر کہ اس عمر میں یہ عارضہ جس کسی کو لاحق ہو جائے اسے شفا حاصل نہیں ہوتی اور نہ یہ زائل ہونے ہی کا نام لیتا ہے ، پرہیز ترک کر دیا اور غذا اور پانی کے بارے میں ذرا احتیاط نہ کی۔ ادھر شہامت جنگ[5] کی بیوی اور مہابت جنگ کی بڑی لڑکی بی بی گھسیٹی[6] اپنے تمام ساز و سامان کے ساتھ موتی جھیل میں جا کر سکونت پذیر ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند کے ملازمین کو انعام و اکرام اور ہاتھی وغیرہ عطا کر کے انہیں اپنی ہمراہی اور سراج الدولہ کی مدافعت کے لیے تیار کیا اور اس سلسلے میں ان سے عہد و پیمان لیے --- جب انسان کے مقدر برگشتہ ہونے والے ہوتے ہیں تو وہ اسی قسم کی بے ہودہ تدبیریں سوچنے لگتا ہے۔

قصہ مختصر ، جب مہابت جنگ کی زندگی ختم ہونے کو آئی تو ، کہتے ہیں کہ اس کی بعض بیگمات نے اس سے درخواست کی کہ ان کا ہاتھ سراج الدولہ کے ہاتھ میں دے دے۔ چوں کہ وہ اس کے احوال سے بہ خوبی آگاہ تھا ، یہ بات سن کر مسکرا دیا اور کہنے لگا ''وہ اپنی جدہ کو اگر تین روز اپنی طرف سے خوش رکھ لے تو اس کے بعد تمہیں یا کسی دوسرے کو اس سے توقع رکھنا ہو گی۔''

آخر بروز ہفتہ نویں رجب سنہ مذکور کو جب کہ دن غروب ہونے میں ابھی دو گھڑیاں باقی تھیں ، مہابت جنگ خدا کو پیارا ہو گیا۔ اس کے اصحاب خاص نے اس کی تجہیز و تکفین کی اور دسویں رجب کو نصف شب اسے حسب وصیت خوش باغ میں اس کی والدہ کے مرقد کے پائنتی دفن کیا گیا۔ (خدایا اگر تو انہیں عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تو بہت ہی رحم کرنے والا ہے)۔

مہابت جنگ کو آغاز جوانی ہی سے نہ تو نشہ آور اشیا ، فواحش اور ساز و سرور سے کچھ دل چسپی تھی اور نہ عورتوں کی قربت ہی سے کوئی رغبت۔ اس کا بیشتر وقت نماز پنج گانہ ادا کرنے ، تلاوت کلام اللہ میں مشغول رہنے اور ورد اوراد میں گزرتا۔ تمام زندگی وہ زنا اور شراب کے نزدیک نہیں پھٹکا۔ اس قسم کی خباثتوں سے اس نے ہمیشہ

اپنا دامن بچائے رکھا ۔ ہمیشہ رات کے پچھلے پہر اٹھتا اور طہارت و پاکیزگی کے بعد صبح کاذب کے نفل ادا کرتا ، ان سے فارغ ہو کر صبح کی نماز پڑھتا ، پھر اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ قہوہ نوش کرتا ۔ جب صبح ہوتی اور دن پوری طرح روشن ہو جاتا تو دو گھنٹے تک بہ خوبی دربار عام کرتا ۔ لشکر کے تمام سردار ، عام ملازموں کے اہالی موالی اور حاجت‌مند وغیرہ حاضر ہو کر اپنے اپنے احوال و مقاصد عرض کرتے اور اس کے احسان و انعام سے بہرہ یاب ہوتے ۔ یہاں سے اٹھ کر خلوت میں بیٹھتا ۔ وہاں صرف وہ لوگ جن کو وقت دیا ہوتا ، یا مثلاً شہامت جنگ ، صولت جنگ؟ اور سراج الدولہ اور بعض مصاحب وغیرہم حاضر ہوتے ، خوب محفل جمتی اور شعرخوانی و داستان‌گوئی ہوتی ۔

اس کا ذائقہ نہایت درست اور عمدہ کھانے اسے بے حد مرغوب تھے ۔ چناں چہ حاضرین و مقربین یا تازہ واردوں میں سے جس کسی کو کھانا پکانے میں مہارت حاصل ہوتی وہ اس کے سامنے کچھ نہ کچھ پکاتا ۔ اس کے لیے جن جن چیزوں مثلاً گوشت اور مکھن وغیرہ کی ضرورت ہوتی ، وہ پہلے ہی سے مہیا ہوتیں ۔ کبھی کبھی کسی کھانے میں اختراع کر کے باورچیوں کو خود اس کے پکانے کا طریقہ بتاتا اور وہ کھانا تیار ہونا شروع ہو جاتا ۔ اس گھڑی دربار دیوان خانہ کا عملہ اور ارکان وہاں حاضر ہوتے اور جس کسی کو جو کوئی حاجت پیش کرنی یا کوئی التماس کرنی ہوتی ، وہ رو بہ رو آ کر عرض کرتا ۔ اتنے میں اس کے کھانے کا وقت ہو جاتا ، اس وقت بکاول (باورچی) کھانے کے خوان لے کر حاضر ہوتا اور دسترخوان بچھائے اور کھانے چنے جاتے ۔ ہر شخص کے سامنے اس کی فرمائش کے کھانے رکھے جاتے ۔ اس کا جو خاص کھانا پکا ہوتا اس میں سے بھی ہر ایک کو کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ۔ دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے پکی ہوئی اشیاء کے حسن و قبح اور اپنے اپنے شوق کی باریکیوں کا تذکرہ ہوتا اور اس طرح ہر کسی کے ذائقے کو پرکھ لیا جاتا ۔ جب کھانا کھانے سے فراغت ہو جاتی تو مہمان ہاتھ دھو دھا کر رخصت ہو جاتے ۔ مہابت جنگ کی یہ میزبانی ہمیشہ برقرار رہی ۔ اس قسم کی مجلس زیادہ تر مردانہ ہوتی تھی اور کبھی کبھی

قریبی خواتین مثلاً اپنی اور اپنے بھائیوں کی اولاد اور دیگر دور کے رشتے کی عورتوں کی بھی ضیافت کرتا اور خود ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ، لیکن کھانا کھاتے ہی ہاتھ دھو کر سونے کے لیے بستر استراحت پر دراز ہو جاتا ۔ پلنگ کے محافظین آموجود ہوتے ، اور قصہ خواں حاضر خدمت ہو کر قصہ سرائی کے لیے اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ جاتے ۔ دوپہر کے ایک گھنٹے بعد بیدار ہو کر فراغت کے لیے جاتا ۔ وہاں سے واپس آ کر وضو کرتا اور نماز ظہر پڑھنے کے بعد قدرے تلاوت قرآن مجید کرتا ، بعد ازیں نماز عصر پڑھتا ، پھر ایک قسم کا آب یخ یا آب شورہ یعنی جو کچھ بھی اس وقت موجود و میسر ہوتا ، پیتا اور اسی ایک پانی پر سارا دن اور رات گزارتا ۔

عصر کے بعد بڑے بڑے فاضل و برگزیدہ لوگ ، مثلاً سید الافاضل میر محمد علی فاضل (اللہ ان کی عزت کو ہمیشہ برقرار رکھے!) ، تقی خاں ، حکیم ہادی خاں ، میرزا محمد حسین صفوی اور ایک اور ملتانی فاضل ، جن کا نام اس حقیر کو معلوم نہیں ہے ، تشریف لا کر اس کی مجلس کو آبرو بخشتے ۔ دیوان خانے کے ایک دروازے میں مہابت جنگ کی مسند کے عین مقابل ایک مسند سید عالی قدر (میر محمد علی) کے لیے بچھائی جاتی اور اس مسند کے جانب پشت ایک گاؤ تکیہ لگا دیا جاتا ۔ جب میر صاحب دریا والے دروازے کی طرف سے ، کہ سب سے نزدیک راستہ تھا ، داخل ہو کر صحن کے چبوترے پر پہنچ جاتے (اور یہاں سے لے کر ایوان عمارت تک خاصا فاصلہ تھا) تو مہابت جنگ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسند پر ان کے انتظار میں کھڑا رہتا اور جب وہ جوتے اتار کر ایوان عمارت میں داخل ہوتے تو ہنوز بہت زیادہ فاصلہ ہونے کے باوجود مہابت جنگ مسند سے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے ادب سے انہیں سلام کرتا ، میر صاحب بھی حسب دستور اسے بڑے تپاک سے سلام کا جواب دیتے اور آ کر اپنی مقررہ مسند پر جلوہ افروز ہو جاتے اور مہابت جنگ ان کے سامنے اپنی مسند پر متمکن ہو جاتا ۔ اس وقت وہ اپنی مسند کے ایک جانب سے ایک چھوٹا تکیہ اٹھا کر سید صاحب کو پیش کرتا ۔ پھر میر صاحب ، تقی قلی خاں ، حکیم ہادی خاں اور

میرزا حسین صفوی کے حقے آجاتے اور ساتھ ھی قہوہ لایا جاتا۔ مہابت جنگ خود تو حقے کا شوقین نہ تھا ، لیکن قہوہ میں شریک ھو جاتا ۔ قہوہ نوشی سے فارغ ھوکر ملتانی فاضل کے سامنے تکیہ رکھ دیا جاتا اور اس تکیے پر شیخ محمد بن یعقوب کلینی[۸] کی کتاب 'کافی'[۹] رکھی جاتی ۔ یہ کتاب حضرت صاحب الامر[۱۰] کی غیبت صغرا کے بارے میں لکھی گئی اور امامیہ فرقے کے اعتقادات کے مطابق ھے ۔ آں حضرت (امام مہدی) نے اس کتاب کو دیکھا ھے اور اسے (کتاب) کافی کا لقب بھی آپ ھی کا عطا کردہ ھے ۔ فاضل مذکور اس کتاب سے ہر روز دو حدیثیں پڑھتا اور ان کا ترجمہ کرتا ۔ اور ان میں جو حقائق و دقائق ھوتے انھیں میر صاحب حل فرماتے ۔ اس کے بعد اگر مہابت جنگ کو کچھ پوچھنا ھوتا تو وہ سوال کرتا اور میر صاحب اس کا جواب دے کر باھم خوش گپیوں کا آغاز کرتے ۔ یہ مجلس دو گھنٹے تک رھتی ۔ جب مذاکرات سے فراغت ھو جاتی تو میر صاحب اٹھ کھڑے ھوتے اور مہابت جنگ حسب دستور چند قدم ان کے ساتھ چلتا ، پھر سلام کرکے اس وقت تک وھیں کھڑا رھتا جب تک میر صاحب جوتے پہن کر روانہ نہ ھو جاتے ۔ ان کے چلے جانے کے بعد وہ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ۔ پھر آھستہ آھستہ باقی اصحاب بھی حصول اجازت کے بعد گھر کی راہ لیتے ۔

اس کے بعد عملۂ دیوانی اور جگت سیٹھ[۱۱] آ کر تمام علاقوں کی خبریں گوش گزار اور دن کے شروع میں جو معاملات ملتوی ھوئے ھوتے ، ان کے بارے میں استفسار کرتا ۔ دو گھنٹے اس بات چیت میں گزر جاتے ۔ اس عرصے میں کبھی تو شہامت جنگ اور کبھی سراج الدولہ اور صولت جنگ بھی حاضر ھوتے ۔ جب یہ لوگ اٹھ کر چلے جاتے تو خوش طبعی و مزاح کا دور شروع ھوتا ۔ اور شمس الدین ، زین العابدین بکاول ، فراش خانہ و شمع و چراغ خانہ کا داروغہ میرزا کاظم ، میر جواد قوش بیگی اور محمود زنانہ جیسے بذلہ سنج اور خوش طبع ارباب مزاح حاضر خدمت ھوکر اپنی خوش طبعی سے محفل کو گرماتے ۔ مہابت جنگ کوئی دو ایک گھنٹے ان کی لطیفہ گوئی و مزاح سے محظوظ

ہوتا ۔ اتنے میں شام ہو جاتی اور مشعلچی اور شامعی (شمع جلانے یا بنانے والے) حاضر ہو جاتے ۔ ان کا مجرا ہندوستان کے عام دستور کے مطابق ہوتا ۔ اس کے بعد عشاً کی نماز ادا کرکے دیوان خانہ میں عورتوں کے پاس بیٹھتا ۔ اس کی بیوی ، زوجۂ سراج الدولہ اور دیگر قریبی خواتین جو اس کی ملاقات کے لیے آئی ہوتیں ، اکٹھی ہو کر اس کے پاس آبیٹھتیں ۔ چوں کہ وہ (مہابت) رات کے وقت کچھ نہ کھایا کرتا تھا ، اس لیے کچھ خشک اور تازہ پھل ، شیرینی اور حلوہ جات وغیرہ ، جو ہر وقت وہاں دستیاب ہوتے تھے ، لا کر ان میں بانٹ دیے جاتے ۔ جب رات کا تیسرا حصہ گزر جاتا تو خواتین رخصت ہو جاتیں ، اور مہابت جنگ پھر مردانے میں آ کر اپنے پلنگ پر سو جاتا ۔ اور قصہ خواں اور محافظین پلنگ حسب دستور اپنی اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتے ۔ رات کو وہ ہر دو تین گھنٹے کے بعد بیدار ہو کر پوچھتا کہ ''رات کتنی باقی اور کون کون حاضر ہے ؟'' اس طرح کوئی تین چار مرتبہ جاگتا ، اور پھر آخر شب صبح کاذب کے قریب اٹھ کھڑا ہوتا اور رفع حاجت و طہارت کے بعد نوافل وغیرہ ادا کرتا ۔ بعد ازاں فجر کی نماز پڑھ کر اسی دستور کے مطابق ، کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں ، اپنا ہر لمحہ مشغولیت و مصروفیت میں گزارتا ۔

اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب پر اس کا احسان و انعام اس درجے کا تھا کہ اس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا ۔ دہلی میں جس کسی نے بھی اس (مہابت) کی مفلسی کے دوران میں اس سے کوئی رعایت یا اچھا سلوک کیا تھا ، اپنے اقتدار کے زمانے میں اس نے اس شخص کو یا بہ صورت دیگر اس کی اولاد کو بلا کر اس پر وہ نوازشیں کیں کہ جو اس کے گمان میں بھی نہ تھیں ۔ اور اقربا کے بچوں اور ان کی خواتین کے ساتھ اس تپاک سے پیش آتا کہ اس زمانے میں بلکہ دوسرے زمانوں میں بھی کوئی شخص اس طرح اپنے بال بچوں کے ساتھ پیش نہ آیا ہوگا ۔ اس کی تمام قلم رو میں ، اس کے مرتے دم تک سب رعایا اس قدر آرام سے رہی کہ شاید ایسا آرام ان لوگوں کو اپنے ماں باپ کی گود میں بھی میسر نہ آیا ہو ۔ اس کے نوکروں حتیٰ کہ معتمد خدمت گاروں

میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو لاکھوں کا مالک نہ ہو ۔ صرف اسے رقص و سرود اور عورتوں کی صحبت و قربت سے کوئی ایسی دل چسپی نہ تھی ، ورنہ دیگر تمام امور سے آشنا ، ہر فن کے صاحبان کمال کا عاشق اور تمام کمالات کا قدردان تھا ۔ صحبت داری و اختلاط کے سلیقے میں بے مثل و بے نظیر اور ایک بہادر ، دلیر اور صاحب تدبیر امیر تھا ۔ صفات حمیدہ میں سے شاید ہی کوئی صفت ہوگی جو اس مجموعۂ حسنات کی ذات میں موجود نہ ہو ۔

آصف جاہ[12] کے فوت ہونے پر اس کا بیٹا ناصر جنگ[13] اس کا جانشین بنا جو پھول چری کے مقام پر اپنے ہمراہی افغانوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔ اس کے بعد اس (ناصر) کا بھانجا مظفر جنگ[14] پہلے تو انھی افغانوں کی مدد سے مسند ایالت پر متمکن ہوا ، پھر اس نے فرانسیسیوں کی اعانت سے مذکورہ افغانوں کے ساتھ ، کہ اس کے ماموں کے قاتل تھے ، جنگ کی ۔ تقدیر کی بات کہ اس جنگ میں مظفرجنگ اور افغانوں کا سردار دونوں مارے گئے جس کے نتیجے میں سید محمد خان صلابت جنگ[15] دکھن کی مسند امارت پر مسلط ہو گیا (اس کی تفصیل ہم آگے چل کر تیسری جلد میں 'سوانح دکھن' کے باب میں دیں گے) اور موشیر بھوسی[16] کا تسلط بڑھ گیا ۔ اور اس کا خط جس میں فراسڈانگہ[17] کی سفارش تھی ، بڑے طمطراق سے مہابت جنگ کو پہنچا ۔ مہابت جنگ ، سراج الدولہ کے ناصر جنگ سے دلی لگاؤ اور اس (سراج) کے انگریزوں سے اُلجھنے کے ارادے سے آگاہ تھا ۔ اور اُس کی دانائی و شجاعت اور اُس کا اپنے دوستوں اور خلق خدا کے ساتھ حسن سلوک بھی اس (مہابت) سے مخفی نہ تھا۔۔۔چناں چہ جن دنوں مذکورہ بالا واقعات پیش آئے تو بندہ (غلام حسین) نے ، کہ اتفاق سے ان دنوں چند ماہ سے سراج الدولہ کے پاس تھا ، خود اپنے کانوں اور با وثوق آدمیوں سے بھی سنا کہ مہابت خاں کہتا تھا ''واقعات بتا رہے ہیں کہ ہمارے بعد ممالک ہند کے ساحل کلاہ پوشوں (انگریزوں) کے قبضے میں آ جائیں گے ۔'' اور ایسا ہی ہوا جیسا کہ اس نے اپنی دوربیں آنکھوں سے دیکھا تھا ۔

اس (مہابت) کے اقتدار کے زمانے میں ایک روز مصطفیٰ خان نے اسے انگریزوں سے لڑنے اور کلکتہ پر حملہ کرنے کی ترغیب دلائی، لیکن اس نے اغماض برتا اور جواب نہ دیا۔ دوسری مرتبہ اس (مصطفیٰ) نے شہامت جنگ اور صولت جنگ کو بھی اپنے ساتھ شریک کرکے یہ معاملہ پیش کیا۔ مگر اس دفعہ بھی مہابت جنگ نے کوئی جواب نہ دیا۔ بعد ازاں خلوت میں شہامت جنگ اور صولت جنگ سے کہنے لگا کہ بابا وہ (مصطفیٰ خان) تو خود سپاہی اور نوکری پیشہ ہے، وہ تو چاہتا ہے کہ میری توجہ ہر وقت اسی پر رہے، لیکن تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ ایسے معاملات میں تم اس کے ہم زبان ہو رہے ہو؟ انگریز لوگوں نے میرے ساتھ کون سی برائی کی ہے جو میں ان کا برا چاہوں؟ ابھی تک تو جو آگ صحرا میں لگی ہوئی ہے وہ ہی بجھنے نہیں پا رہی تو جب دریا کو آگ لگ گئی تو کون ہے جو اسے بجھا سکے گا؟ خبردار! آئندہ ایسی باتوں پر کان نہ دھرنا کہ یہ سراسر فساد و خرابی کا باعث ہیں۔"
(سیرالمتاخرین جلد دوم)

(۳)

جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء

اس (موشیر لاس)[۱۸] کے مرشد آباد سے جانے کے بعد سراج الدولہ کے میر محمد جعفر خاں[۱۹] اور راجا دولبھ رام کے ساتھ تنازعات شدت اختیار کر گئے۔ ان دونوں نے جگت سیٹھ اور دیگر آدمیوں کو، جو سراج الدولہ سے تنگ آئے ہوئے اور شب و روز ترسان و لرزاں رہتے تھے، اپنے ساتھ ملا کر اس (سراج) کی بیخ کنی کی تدبیر کی۔ ادھر بی بی گھسیٹی، جو پہلے ھی سراج الدولہ سے کینہ رکھتی اور پھر حال ھی میں اپنے گھر کا مال و اسباب ضبط ہونے کے باعث رنجیدہ تھی، خفیہ طور پر میر محمد جعفر خاں کی مدد کرنے لگی۔ چناں چہ جس کسی کو وہ ذرا بھی اپنی طرف مائل اور سراج الدولہ سے منحرف پاتی، اس کے سامنے اپنے معتمد آدمیوں کی زبانی شکایات کے دفتر کھول دیتی، اور اسے اپنے باپ اور شوہر کے حقوق یاد دلا کر

فریاد کرتی اور انصاف چاہتی - پھر اسے میر محمد جعفر خاں اور راجا دولبھ رام کا ساتھ دینے کے لیے اکساتی - علاوہ ازیں خود بھی ان اشرفیوں سے میر جعفر کی مالی امداد کرتی رہی ، جو اس نے اموال کی ضبطی کے موقع پر اپنی معتمد خادماؤں اور خواجہ سراؤں کے پاس چھپا رکھی تھیں - اور میر جعفر خاں اپنے دیرینہ دوستوں کی معرفت دھڑا دھڑ روپیہ خرچ کرکے ہر مفلس و بے کار سپاہی کو اپنی طرف مائل کر رہا تھا - جس کے نتیجے میں اس کے محل میں خفیہ طور پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا -

......جب معاملہ اس حد تک پہنچ گیا (کہ جس کا ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں) تو ہر کسی کی یہی رائے ٹھہری کہ سراج الدولہ کو ہٹانے کے لیے انگریزوں کو اکسانا موزوں و مناسب ہوگا - چناں چہ ہر ایک نے اپنی بساط اور عقل کے مطابق انگریزوں کو سراج الدولہ سے لڑنے کی ترغیب دلانا شروع کر دی - جگت سیٹھ نے کھلے طور پر اپنے گماشتوں کے ذریعے کلکتہ کے بہت بڑے مہاجن امین چند روڑہ۲۰ کو اس بات پر مائل کیا کہ وہ انگریزوں کو سراج الدولہ کے ساتھ لڑنے کے لیے پکا کرے - راجا دولبھ رام نے بھی کسی کو ، کہ راقم اس کے نام سے آگاہ نہیں ، اس کام پر متعین کیا - اور میر محمد جعفرخاں نے آسی میرزا امیر بیگ کو (جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کر آئے ہیں) انگریزوں کے پاس بھیج کر سراج الدولہ کی خود اس (جعفر) کے اور دوسروں کے ساتھ بدسلوکیوں کا تذکرہ اور اس کا اظہار کیا کہ ''تمام لوگ سراج الدولہ کو ہٹانے کے درپے ہیں -'' بلکہ وہ محضر بھی ، جو اس (جعفرخاں) نے سراج الدولہ کے ہاتھوں تنگ آئے ہوئے سرداروں کے دستخطوں سے تیار کروا رکھا تھا ، میرزائے مذکور کے ہاتھ بھجوا دیا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ اب انگریز سردار حرکت میں آ جائیں - ساتھ ہی یہ کہلا بھیجا کہ اگر ''آپ لوگ (انگریز) اپنی جگہ سے ذرا آگے بڑھیں اور سراج الدولہ سے معمولی سی جنگ لڑیں تو اس (سراج) کا تدارک ، ہر ممکن طریق سے ، ہم کریں گے - اور آپ کی اس ذرا سی توجہ سے خدا کی مخلوق اس ظالم کے ظلم و ستم سے نجات

پا لے گی ۔" علاوہ ازیں مذکورہ مہاجنوں کو ضامن بنا کر اور بڑے پکے عہد و پیماں کے ساتھ تین کروڑ روپے کی خطیر رقم دینے اور دیگر رعایات کہ جن کا راقم کو علم نہیں ہے ، کا وعدہ کیا اور سراج کے ھاتھوں بی بی گھسیٹی اور دوسرے لوگوں نے جو سختیاں جھیلی تھیں ، انھیں خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا ۔

انگریزوں نے ، جو دلیری و بہادری میں بے نظیر ھیں ، اور کون ہے جو شجاعت و مردمی کا نشہ رکھتے ہوئے نام و نشان کا جویا اور اسباب کی سہولتیں میسر ہوتے ہوئے 'مملکت ستاں' نہ ہوگا ـــ جب اس قسم کے حالات سنے تو انھوں نے باہم مشورہ کرکے میر محمد جعفر اور راجا دولبھ رام کی التماس قبول کر لی اور سراج الدولہ کے ساتھ جنگ کے لیے تیار ھو گئے ۔ لیکن چوں کہ ان انگریزوں بلکہ تمام عقل مندوں کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ بغیر کسی معقول وجہ کے کسی سے الجھ پڑیں ، اس لیے انھوں نے یقیناً سراج الدولہ سے کچھ سوال و جواب کرکے اس کا تختہ الٹنے کی کوئی معقول وجہ پیدا کر لی ھوگی ، کہ جس کا راقم کو علم نہیں ہے ۔ خیال ہے کہ کلکتہ میں لوٹے گئے مال کے بدلے جو تاوان مقرر ھوا تھا اس کی ادائیگی میں سستی اور تغافل اس لڑائی کے آغاز اور صلح کے اختتام کا باعث ھوا ھوگا ، کیوں کہ سنا گیا ہے کہ سراج الدولہ نے ضرورت کے تحت ایک کروڑ روپیہ دینا قبول کر لیا تھا لیکن بعد میں اسے یہ رقم دینی دشوار ھو گئی ۔ بہر حال جب سراج الدولہ کے ساتھ جنگ کرنے کا ارادہ پختہ ھو گیا تو کرنل کلیف نے ، جو ثابت جنگ کے لقب سے مشہور تھا ، پورے لاؤ لشکر اور ساز و سامان کے ساتھ لڑائی کی تیاری کر لی ۔ سراج الدولہ کو جب اس کی خبر ھوئی تو اس نے بے بس ھو کر منافقوں کو راضی کرنے کی کوشش اور نرمی و مہربانی اختیار کی ۔ لیکن کوئی فائدہ نظر نہ آیا ۔

بیت

بسالی ز جورت جگر خون کنم　　　بیک ساعت از دل بدر چون کنم

(ایک سال تیرے جس ظلم سے جگر کو خون کرتا ھوں ، اسے ایک پل میں دل سے کیسے نکال دوں ۔)

آخر اس (سراج) نے راجا دولبھ رام کو بہت سی فوج دے کر آگے پلاسی تک بھیجا ، تا کہ وہ مورچوں وغیرہ اور سامان جنگ کی تیاری کرے ۔ وہ وہاں بیٹھ کر بہ ظاہر تو سرکار کا کام کرتا رہا ، لیکن اپنی کارستانیوں کو پورے طور پر بروےکار لاتے ہوئے اندر ہی اندر ان عہد و پیمان کو اور بھی مضبوط کرتا رہا جو خود اس نے اور میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ کیے تھے ۔ ساتھ ہی وہ سراج الدولہ کے لشکر کے سرداروں کو اپنے ساتھ ملانے میں مصروف اور ہر ایک کو اس کے حسب حال سبز باغ دکھا کر اپنا شریک حال بناتا رہا ۔ ادھر میر جعفر نے بھی اپنے رفقا کے ساتھ دربار میں آمد و رفت شروع کر کے اسی قسم کی کارستانیاں جاری رکھیں ۔ تا آں کہ مشہور ہے کہ تمام لوگ اس سے مل گئے اور دلی طور پر سراج الدولہ کے ساتھ کوئی بھی نہ رہا ۔

جب سراج الدولہ کو خبر ملی کہ کرنل کایف[۲۱] کلکتہ سے روانہ ہو گیا ہے تو وہ چار و ناچار بڑی بے دلی اور بیم و ہراس کے ساتھ منصور گنج سے کوچ کر کے اپنی قابل اعتبار فوج ، جو میر مدن بخشی ، راجا موهن لال دیوان اور اس کے ہم راہیوں پر مشتمل تھی ، اور چند دیگر مخلصین کے ہمراہ پلاسی تک پہنچ گیا ۔ دوسری طرف سے کرنل کایف ثابت جنگ بھی اپنی انگریز فوج اور کچھ تلنگہ فوج کے ساتھ ، کہ جن کی ساری تعداد بہ مشکل دو تین ہزار ہوگی ، باغ پلاسی میں پہنچ کر صف آرا ہو گیا ۔

جمعرات کے روز پانچویں شوال سنہ ایک ہزار ایک سو ستر کو لڑائی کا آغاز ہوا ۔ کلاہ پوشوں (فرنگی) نے ، کہ جنگ کے قانون و آداب ، توپ اندازی اور بندوق بازی وغیرہ میں ان کا کوئی ثانی نہیں ہے ، اور خاص طور پر انگریز تو اس معاملے میں اپنے مختلف فرقوں میں بھی ممتاز ہیں اور وہ کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے ـــــ ، وہ مسلسل و متواتر گولہ باری کی کہ تماشائیوں کی عقل حیران و پریشان اور (ان کی) قوت سامعہ و باصرہ اس (گولہ باری) کی سرعت کو پانے سے عاجز رہ گئی ۔ میر جعفر اور دوسرے لوگ جو اس فساد کا باعث اور سراج الدولہ

کی شکست کے خواہاں تھے، اپنی اپنی جگہ پر کھڑے تماشا دیکھتے رہے۔ اس کے برعکس میر مدن وغیرہ جو فتح و نصرت کے طالب تھے ، بڑی سرگرمی و جاں فشانی کا مظاہرہ کرتے رہے اور اگرچہ شدت گولہ باری کے سبب وہ حملہ کرنے سے عاجز تھے ، لیکن پھر بھی بڑی بہادری سے قدم آہستہ آہستہ آگے بڑھاتے رہے اور اپنی طرف سے انہوں نے کوئی کوتاہی نہ ہونے دی۔

یہاں تک کہ دن کا دو تہائی حصہ گزر گیا اور میر مدن اور موہن لال باغ پلاسی کے قریب پہنچ گئے ۔ کہتے ہیں کہ یہ صورت حال دیکھ کر ثابت جنگ امین چند سے بدگمان ہو گیا اور اسے مورد عتاب ٹھہراتے ہوئے کہنے لگا ''تمہارا وعدہ تو یہ تھا کہ بہت ہی معمولی لڑائی کے بعد ہمارا مقصد و مطلب پورا ہو جائے گا ، نیز یہ کہ تمام فوج سراج الدولہ سے منحرف ہے ، لیکن جو کچھ یہاں نظر آ رہا ہے وہ سب اس کے برعکس ہے ؟'' امین چند نے اس کے جواب میں عرض کیا کہ صرف یہی لوگ سراج الدولہ کے ساتھ ہیں جو اس وقت لڑ رہے ہیں ، جب یہ مغلوب ہو گئے تو جو کچھ میں نے کہا ہے اس کا اثر ظاہر ہو جائے گا۔'' سراج الدولہ کی زشتئی افعال و کردار جو ضرب المثل بن چکی تھی ، اب انتقام کے رنگ میں سامنے آ رہی تھی۔ چناں چہ (اسی دوران میں) میر مدن کو جو دلیری و شجاعت کا پتلا اور خلوص دل سے سراج الدولہ کا ساتھ دے رہا تھا ، توپ کا ایک جان لیوا گولہ آ کر لگا جس سے اس کی ران کا اگلا حصہ اُڑ گیا اور اس کی حالت نازک ہو گئی۔ اسے اسی حالت میں ، کہ چند سانس ابھی باقی تھے ، سراج الدولہ کے پاس لے آئے ۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے حسن ارادت کے بارے میں کچھ کہا اور جان جان آفریں کے سپرد کر دی ۔ سراج الدولہ نے جب یہ معاملہ دیکھا تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس نے بے قراری و اضطراب کی حالت میں میر جعفر کو طلب کیا ؛ اس (جعفر) نے آنے میں سہل انگاری سے کام لیا اور وہیں ٹھہرا رہا ۔ سراج الدولہ نے بار بار آدمی بھیجے : آخر اسے بڑی منت سماجت کے بعد لایا گیا۔

جب میر جعفر اپنے حواریوں، اور متعلقین ، مثلاً خادم حسین خاں

اور اس کے بیٹے محمد صادق خاں۲۲ المعروف میرن خاں وغیرہ کے ساتھ نزدیک آیا تو سراج الدولہ نے نہایت ھی عاجزی و انکساری دکھائی۔ چناں چہ یہاں تک کہتے ھیں کہ اس نے اپنی پگڑی آتار کر اس (جعفر) کے سامنے رکھ دی اور کہا ''میں اپنے کیے پر پشیماں ھوں اور حق قرابت اور اپنے دادا مہابت خاں۲۳ کا واسطہ دے کر تمھیں اس مرحوم کی جگہ سمجھتا ھوں ؛ امید ھے کہ تم مجھ ناچیز کی تمام خطاؤں سے درگزر کر کے جو کچھ بھی نجابت و سیادت کا لازمہ اور حقوق دیرینہ و قرابت کا تقاضا ھے ، اس کے مطابق عمل اور میری جان و آبرو کی حفاظت کرو گے۔''

میر جعفر نے موقع غنیمت جانتے ھوئے نامناسب بات اختیار کرنے سے بھی گریز نہ کیا اور اس سے دھوکے کی چال چلتے ھوئے کہنے لگا کہ ''آج تو دن ختم ھونے کو ھے اور یورش و جنگ کا وقت نہیں رھا ، آپ پیش قدمی کرنے والے سپاھیوں کو حکم دیں کہ وہ واپس اپنی جگہ پر لوٹ آئیں اور اس وقت جنگ کو ملتوی کر دیں ، کل ان شاء اللہ تمام فوج کے ساتھ اس لڑائی کا تدارک کروں گا۔''

سراج الدولہ نے کہا کہ ''شب خون کا ڈر ھے ؟'' اس پر میر جعفر نے بڑے وثوق سے جواب دیا ''یہ میرا ذمہ رھا ، وہ لوگ شب خون نہیں مار سکتے۔'' چناں چہ سراج الدولہ نے اپنے دیوان راجا موھن لال کو جو میر مدن کے ھم راہ پیش قدمی کر کے مار دھاڑ میں مصروف تھا اور اس کے پیادے اطراف و جوانب سے آگے بڑھ رھے تھے اور موقع غنیمت جان کر گولیاں بھی برسا رھے تھے ، حکم بھیجا کہ واپس اپنی چھاؤنی اور مورچے میں آ جاؤ۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ ''یہ موقع اب واپس لوٹنے کا نہیں ھے ؛ جو کچھ بھی ھونا ھے وہ اسی جگہ ھو کر رھے گا۔ اور اگر میں لوٹ بھی آؤں تو لشکر میں انتشار پیدا ھوگا اور سپاھیوں کو فرار ھونے کا موقع مل جائے گا۔'' سراج الدولہ نے میر جعفر کی طرف دیکھا اور اس سے مشورہ چاھا ۔ میر جعفر نے اپنی پہلی بات دھرائی اور کہا ''ھم سے تو بس اسی قسم کا کام ھو سکتا ھے

جو ہم نے پہلے عرض کر دیا ؛ باقی آپ کو اختیار ہے جو چاہیں سو کریں ۔'' سراج الدولہ نے ، کہ خوف و ہراس کے مارے بے ہوش و حواس ہوا جا رہا تھا ، میر جعفر کی تجویز کو موقع کے مطابق زیادہ مناسب و بہتر جانا اور اس کے کہنے میں آ کر موہن لال کو ، جس جگہ وہ پہنچا ہوا تھا ، وہاں سے بڑی تاکید و مبالغہ کے ساتھ واپس بلوا لیا ۔

بیت

چو تیرہ شود مرد را روزگار	همہ آن کند کش نیاید بکار

ادھر جوں ہی موہن لال اپنی جگہ سے ہٹا ، لشکری پریشان خاطری کا شکار ہو گئے اور بہت سے منافق اور بے دلے ہم راہیوں نے راہ فرار کھلی دیکھ کر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا شروع کر دیا ۔ جب یہ راہ اور کشادہ ہو گئی تو سپاہی ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی بھاگنا شروع ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں تمام سپاہی وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے ۔

سراج الدولہ کو جب یہ ساری کیفیت معلوم ہوئی تو اس پر مقابل کے دشمنوں ، بلکہ ان سے بھی زیادہ بغلی دشمنوں کا خوف و رعب چھا گیا ۔ اس نے کسی کو بھی اپنا دوست نہ سمجھتے ہوئے شدت اضطراب میں تمام تدبیریں ترک کر دیں اور اسی دن (جمعرات) جب کہ دن غروب ہونے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا ، خود بھی راہ فرار اختیار کی اور ماہ شوال (سنہ مذکور) کی چھٹی تاریخ ، جمعے کی صبح کو منصور گنج پہنچ گیا ۔ ہرچند اس نے وہاں پہنچ کر اپنے ملازموں کو بڑی تاکید کی کہ وہ اس کی نگہبانی کریں ، تاکہ وہ کچھ سوچ بچار کر لے اور پھر اپنے لیے جو راستہ مناسب سمجھے وہ اختیار کرے ، لیکن کسی نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور ہر کسی نے جواب میں کوئی نہ کوئی عذر پیش کیا ۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے سسر محمد ایرج خاں کے پاؤں پر اپنی دستار رکھی کہ ''خدارا اس وقت میرا ساتھ نہ چھوڑیں ، یہیں رہیں اور لوگوں کو اکٹھا کریں تاکہ اگر بھاگنا ہی ٹھہرے تو کم از کم مناسب طریقے سے بھاگا جائے ۔'' خان مذکور نے اس کی اس التجا پر کوئی کان نہ دھرا اور عذر معذرت کر کے اپنے گھر چلا آیا ۔

اب سراج الدولہ نے لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے حکم دے دیا کہ ''خزانے کا منہ کھول دیا جائے اور جو کوئی جتنی رقم بہ طور تنخواہ یا بہ طور اعانت کے مانگے، اسے دے دی جائے۔'' چناں چہ رات بھر خزانہ کھلا رہا اور لوگ دھڑا دھڑ رقمیں وصول کرتے رہے۔ اس رات ہر کسی نے مختلف حیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ وصول کر کے اپنے گھر میں اچھی خاصی دولت جمع کر لی، لیکن پھر بھی اس کا ساتھ کسی نے نہ دیا ـــــ جس وقت تو دولت خرچ کرنے کا موقع تھا، اس وقت وہ خوب مال سمیٹتا رہا اور دست و زبان سے بھی لوگوں کو تنگ کرتا رہا۔ آخر ان سب باتوں کا اجر اسے زندگی ہی میں مل گیا اور تمام مصائب و آلام اس نے اپنے ہی جسم و جان پر برداشت کیے ـــــ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

(۱) مها زورمندی مکن بسر کهان
که بر یک نمط می نماند جهان

(۲) مبر گفتمت پای مردم ز جای
که عاجز شوی گر در آئی ز پای

(۳) دل دوستان جمع بهتر نه گنج
خزینه تهی به نه مردم برنج

(۴) میـنداز در پای کاری کسی
که افتد که در پایش افتی بسی

(۵) عـدو را بکوچک نباید شمرد
که کوه گران دیدم از سنگ خرد

(۶) نه بینی که چون باهم آیند مور
ز شیران جنگی برآرند شور

(۷) نه موی ز ابریشمی کمتر است
چو پر شد ز زنجیر محکم تر است[۲۳]

قصہ کوتاہ، سراج الدولہ نے خود کو بے یار و مددگار پا کر سارا دن منصور گنج میں گزارا، اور ہفتے کی رات ساتویں شوال کو،

جس قدر بھی اشرفیاں اور جواہرات ساتھ لے جا سکتا تھا ، وہ اٹھائے اور لطف النساء اور چند دیگر عزیز بیگمات کو رتھوں وغیرہ میں بٹھانے کے لیے ساتھ لیا اور ساز و سامان سے لدے ہوئے ہاتھی ساتھ لے کر رات کے پچھلے پہر اپنے محل سے نکل کھڑا ہوا - لیکن اپنی نادانی اور بد نصیبی کے سبب خشکی کا راستہ چھوڑ کر بھگوان گولہ کے راستے چلا ؛ وہاں پہلے ہی سے تیار کردہ کشتیوں پر سوار ہو کر عظیم آباد کی راہ لی - اگر وہ ذرا بھی دل کو مضبوط رکھتا اور اس علاقے کے ان لوگوں کو ، کہ جن سے رفاقت کی توقع ہو سکتی تھی ، پیغام بھیج کر خشکی کی راہ اختیار کرتا تو بہت سے لوگ زیادہ طمع میں اور پرانے حقوق کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ آ کر مل جاتے - اس طرح وہ چند ہزار آدمیوں کے ساتھ نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا اور کوئی بھی اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتا تھا - بلکہ ہر منزل پر لوگ آ آ کر اس کے ساتھ مل جاتے اور اس طرح اس کے ہم راہیوں کی تعداد بڑھ جاتی - لیکن وہی بات کہ تقدیر کے لکھے کو مٹانا کسی کے بس میں نہیں -

سراج الدولہ نے اس سے پیشتر ، جب ابھی انگریزوں کے جنگ کے ارادے سے کوچ کرنے کا سنا ہی تھا اور خود پلاسی کی طرف بڑھا تھا تو اس وقت اس نے بڑے اضطراب میں فرانسیسی سربراہ موشیرلاس کو ایک خط ارسال کیا تھا جس میں اسے بڑی سرعت کے ساتھ پہنچنے کی بے حد تاکید کی تھی - لیکن جس وقت آسے وہ خط ملا اس وقت سراج الدولہ مات کھا کر کشتیوں کے بجرے پر عظیم آباد کا سفر کر رہا تھا - (شاید موشیرلاس جلد پہنچ جاتا) لیکن ہندوستان کے موجودہ ضابطے کے مطابق ، جب تک وہ روپیہ پہنچے جو سراج نے اس (موشیر) کے اخراجات کے لیے راجا رام نرائن[۲۵] کو دے رکھا تھا ، خاصی تاخیر ہو گئی - روپے کی وصولی کے بعد موشیرلاس روانہ ہوا ، لیکن اس کے پہنچنے سے پہلے ہی سراج الدولہ کا کام تمام ہو چکا تھا ــــ اسے میر محمد جعفر خاں کے آدمیوں نے راج محل کے نواح سے پکڑ کر انتقام کی بھینٹ چڑھا دیا تھا ــــ موشیرلاس نے جب راج محل کے قریب پہنچ کر

سراج الدولہ کے قتل کی خبر سنی تو اس نے اپنی کشتیوں کو عظیم آباد کی طرف لوٹا دیا ۔ ادھر میجر کوٹ[۲۶] (جو اب جنرل ہو گیا ہے) لاس کے تعاقب میں نکلا ــــ میجر مذکور ان ایام میں ولایت سے آیا اور میجر کے عہدے پر فائز اور کرنل کلیف کے ہم راہ تھا ــــ اس تعاقب کے سلسلے میں آسے یہ حکم تھا کہ اگر لاس سے سامنا ہو اور وہ اطاعت قبول نہ کرے تو اس سے جنگ کی جائے ۔ چناں چہ کوٹ نے کرم ناسہ اور بکسر تک اس کا پیچھا کیا ۔ موشیرلاس اس سے ایک منزل آگے چلتا رہا ۔ آخر اس (کوٹ) نے اس کا تعاقب کرتے کرتے آسے سراج الدولہ سے متعلقہ تینوں صوبوں کی سرحد سے باہر نکال دیا اور خود واپس لوٹ آیا ۔ (سیرالمتاخرین جلد دوم)

میر تقی میر

میر[1] (۲۳ - ۱۷۲۲ء — ۱۸۱۰ء) کی خود نوشت سوانح عمری 'ذکر میر' کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ اس میں بیان کردہ اکثر واقعات میر کے چشم دیدہ ہیں - آگرہ ان کا وطن تھا اور اس عہد میں وہاں جو معاشی ابتری پھیلی ہوئی تھی میر نے بیان کر دی ہے - دوسرے اقتباس میں اس شاعر عظیم نے اپنی پریشان خاطری کا حال لکھا ہے -]

میر کا آگرہ میں دوسری مرتبہ آنا اور اس شہر کا احوال

(حکایت) میں صبح و شام دریا کے کنارے سیر و تماشا کی خاطر جایا کرتا - یہ دریا بڑی اچھی جگہ واقع ہے ، کہ اس کے اس طرف تو باغ ہیں اور اس جانب قلعہ اور امرائے عظام کی حویلیاں - یوں کہہ لیجیے کہ یہ بہشت کی نہر ہے - میری معنی آفرینی کا چرچا کو بہ کو اور شہر بہ شہر تھا - چناں چہ شوخ چشم ، سیاہ پلکوں والے ، اچھی سج دھج والے ، خوش لباس ، پاک طینت اور موزوں طبع (شعرا) لوگ مجھے نہ چھوڑتے اور میری بڑی عزت کرتے - دو تین مرتبہ میں سارے شہر میں گھوما - وہاں کے شاعروں ، عالموں اور فقرا سے ملا - لیکن کوئی ایسا مخاطب نہ ملا کہ جس سے بات کر کے دل مضطر کو تسلی ہوتی - دل میں خیال آیا کہ خدا کی شان یہ وہی شہر ہے کہ کل تک جس کی ہر گلی اور ہر کوچے میں عارف ، کامل ، فاضل ، شاعر ، منشی ، دانش مند ، فقیہ ، متکلم ، حکیم ، صوفی ، محدث ، مدرس ، درویش ، متوکل ، شیخ ، ملا ، حافظ ، قاری ، امام ، اور مؤذن تھے - اور جس میں مدرسوں ، مسجدوں ، خانقاہوں ، تکیوں ، مہمان سراؤں ،

مکانوں اور باغوں کی کثرت تھی ، مگر آج مجھے کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آ رہی جہاں بیٹھ کر ذرا طبیعت کو بہلا لوں ، اور ایسا آدمی نہیں مل رہا جس سے کچھ دل ہلکا کر لوں ۔ شہر کو ایک وحشتناک ویرانہ پایا اور بڑے دکھ اٹھا کر واپس لوٹ آیا ۔ اس طرح چار ماہ کا عرصہ وطن مالوف میں گزارا ۔ وقت رخصت آنکھوں میں اشک حسرت امڈ آئے ۔ اور میں سورج مل[۲] کے قلعوں میں پہنچا ۔ (ذکر میر)

میر کی افسردہ خاطری

دنیا عجب حادثہ گاہ ہے ۔ کیسے کیسے مکان ویران ہو گئے اور کیسے کیسے جوان یہاں سے اٹھ گئے ۔ کیسے باغ تھے کہ اجڑ گئے اور کیا محفلیں تھیں جو افسانہ ہوگئیں ۔ کیسے کیسے پھول مرجھا کے رہ گئے ۔ کیا کیا انسان گزر گئے ، کیسی مجلسیں اکھڑ گئیں ، کیسے کیسے قافلے کوچ کر گئے ؛ عزیزوں نے کیا کیا خواریاں دیکھیں اور کیسے کیسے لوگ جان کی بازی ہار گئے ۔ ان عبرت بیں نگاہوں نے کیا کیا دیکھا اور ان سننے والے کانوں نے کیا کیا سنا :

هر کاسهٔ سر ز افسری میگوید هر کهنه خرابه از دری میگوید
دنیا ست فسانه پاره‌ی ما گفتیم و آن پاره که ماند دیگری میگوید

(ہر کاسۂ سر کسی تاج کی اور ہر ویرانۂ قدیم کسی دروازے کی حکایت بیان کر رہا ہے ۔ (یا ہر کاسۂ سر کسی تاج سے اور ہر قدیم ویرانہ کسی دروازے سے کہہ رہا ہے) کہ دنیا ایک افسانہ ہے جس کا کچھ حصہ ہم نے بیان کر دیا اور بقیہ کوئی دوسرا بیان کرے گا ۔)

اس تھوڑے سے عرصے میں اس ایک قطرہ خون نے ، کہ جسے دل کہا جاتا ہے ، طرح طرح کے ستم جھیلے اور سراپا خون ہو گیا ۔ اپنا مزاج ناساز تھا ، اس لیے ہر کسی سے ملنا جلنا بند کر دیا ۔ اب کہ بڑھاپے نے آ لیا ہے ، یعنی عمر عزیز ساٹھ برس کی ہو چکی ہے ، تو اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں ۔ چند روز آنکھوں کی تکلیف اٹھائی ، بینائی کمزور ہو گئی اور عینک کی ضرورت پڑ گئی ۔ میں نے کف افسوس ملا اور اس شعر کو مدنظر رکھ کر نظر بازی ترک کر دی :

دیده چون محتاج عینک گشت فکر خویش کن
بــر نفس دارنــد روز واپسیں آئینه را

(آنکھیں جب عینک کی محتاج ہو جائیں تو اپنی عاقبت کی فکر کر لے ، اس لیے کہ نزع کے عالم ہی میں سانس کے قریب آئینہ رکھا جاتا ہے ۔)

دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں ، حیران تھا کہ کب تک علاج کرتا رہوں ۔ آخر مجبور ہو کر ایک ایک دانت جڑ سے اکھڑوا دیا :

روزیٔ خود را برنج از درد دندان می خورم
نان بخون تر می شود تا پارهٔ نان می خورم

(دانتوں کے درد کی وجہ سے میں اپنی روزی بڑی تکلیف کے ساتھ کھاتا ہوں ۔ جب تک روٹی کا ٹکڑا حلق سے نیچے اترے وہ خون سے لتھڑ جاتا ہے ۔)

غرض کہ ضعف قویٰ ، بے دماغی ، ناتوانی ، دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میں اب بہت دن جینے کا نہیں ؛ زمانہ بھی زندہ رہنے کے لائق نہیں رہا ، بہتر ہے کہ اب اس سے دامن کھینچ ہی لیا جائے ۔ اگر خاتمہ بہ خیر ہو جائے تو سبحان اللہ ورنہ اختیار تو اسی ذات باری کے ہاتھ ہے ۔ (ذکر میر)

درگاہ قلی خان

[ذوالقدر درگاہ قلی خان درگاہ[1] (۱۷۱۰ع-۱۷۶۶ع) کا 'مرقع دھلی' اٹھارویں صدی کی معاشرتی زندگی کی ایک اہم دستاویز ہے - جس میں صوفیاء ، مغنیان اور ادبا و شعراء کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کی گئی ہیں -]

محمد شاہ کے عہد کے مغنی

نعمت خاں بین نواز : ہندوستان میں اس کا وجود ایک نعمت عظمیٰ ہے - نغموں کی اختراع اور راگوں کی ایجاد میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے - قدیم نایکوں کا ہم پلہ اور 'خیال ہائے' رنگین کا موجد ہے - اس نے کئی ایک زبانوں میں 'تصانیف' کہی ہیں - اس وقت دھلی کے مغنیوں کا سرگروہ ہے - اپنی ذاتی خواہش کے مطابق بادشاہ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے سر نہیں جھکاتا - محمد معزالدین کے زمانے میں بڑے ساز و سامان کا مالک تھا - بزرگوں کے عرسوں میں حاضر ہوتا اور خود بھی گیارھویں کا ختم کراتا ہے - شہر کے رؤسا اور بڑے بڑے لوگ ہر ماہ کی گیارھویں تاریخ کو اس کے گھر پہنچتے ہیں - اس روز اس کے یہاں اتنا ہجوم ہو جاتا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں رہتی - لہٰذا لوگ جگہ حاصل کرنے کے لیے صبح ہی سے آنا شروع ہو جاتے ہیں - یہ مجلس نور کے تڑکے تک جاری رہتی ہے - بین بجانے میں اتنا ماہر ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی اس جیسا پیدا ہوا ہوگا :

مطرب این بزم از بس راہ دل ہا می زند
دست بر طنبور و ناخن بر دل ما می زند

سبحان اللہ ! جب وہ 'بین نازنین' کندھے پر رکھتا ہے تو ہوش دماغ

سے اس طرح بھاگ لکلتے ہیں جیسے تار سے آواز - اس کی بین کے کدو باریک بیں نظروں میں مستی خیز شراب کے جام ہیں اور اس کے تار شہ رگ کی مانند جاں ستاں ، شور انگیز ۔ اس کے ناخن کا مضراب ساز سے ابھی چھونے ھی نہیں پاتا کہ سامعین کے دلوں سے (تار سے آواز کی مانند) نالے بلند ہونے لگ جاتے ہیں ۔ ابھی اس کے گلے سے شعلۂ آواز بلند ھی ہوتا ہے کہ قالب کدو کی طرح خالی ہو جاتے ہیں اور تحسین و آفریں کا شور ہوا میں پھیل جاتا اور ایک نیا نغمہ شروع ہو جاتا ہے ۔ 'واہ واہ' کا نغمہ آسمان تک پہنچتا اور ناہید (زھرۂ فلک) کی محفل میں ایک غلغلہ مچ جاتا ہے ۔ جہان والوں نے اس ممکنات کی دنیا میں اس سے بہتر کدو نہیں دیکھا اور نغمے کے مشتاقوں نے نعمت خاں کے نغمے سے بڑھ کر کوئی اور نغمہ نہیں سنا :

عالم آبست می گویم باواز بلند
آشنای بادہ را باید کدو برداشتن

اس کے بھائی کو آلات موسیقی بجانے میں طرفہ مہارت حاصل ہے ۔ وہ چار چار گھنٹے تک مختلف انداز میں قسم قسم کے نغمے اور کئی کئی آھنگ پیش کرتا ہے اور اس میں اسے اس قدر قدرت حاصل ہے کہ پھر اصل لے کی طرف لوٹ آتا ہے ۔ اس موقع پر بڑے بڑے مغنی بھی مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ اس قسم کا فن اور قدرت ہر کسی کے مقدر میں نہیں ہے ۔

اس کا بھتیجا ستار بجانے میں بڑا ماہر ہے ۔ اس نے ایک نیا طرز ایجاد کیا ہے اور وہ یہ کہ جو نغمات و آھنگ لوگ عمدہ سازوں سے نکالتے ہیں ، وہ انہیں ستار سے نکالتا ہے ۔ یوں کہیے کہ وہ ایک اعجوبۂ عالم ہے ۔ راقم کو بارہا اس سے ملنے کا اتفاق ہوا اور بیسیوں مرتبہ اس کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا ہے ۔ موصوف میرے ساتھ بڑے احسن طریق سے پیش آتا اور میری بڑی خاطر داری کرتا ۔ اور بہت زیادہ گانے بجانے کے بعد بھی صبح تک ایک ھی ڈھنگ سے سرگرم ترنم رھتا ، فرمائشیں قبول کیا کرتا اور کھلے دل اور خندہ پیشانی سے ترنم ریزی میں مشغول رھتا ۔

(مرقع دھلی)

سید احمد شہید بریلوی

[سید احمد بریلوی[1] (۱۷۸۶ع — ۱۸۳۰ع) کی زندگی کا دور مسلمانان پاک و ہند کے لیے اہم کشمکش کا زمانہ ہے جب سنت نبوی کی پیروی ختم ہو چکی تھی اور اسلام میں بہت سے غیر اسلامی عناصر شامل ہو گئے تھے۔ علاوہ ازیں پنجاب و سرحد میں سکھوں کے زیر حکومت اسلامی شعائر کی تکمیل بھی ناممکن تھی۔ سید احمد کی تحریک جہاد نے اس کی روک تھام کی سعی کی۔ اس کوشش میں آپ نے بالا کوٹ کے مقام پر جام شہادت نوش کیا۔ آپ طریقۂ محمدیہ کے بانی تھے۔]

(۱)

سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلام نامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ فقیر سید احمد کی طرف سے سادات کرام، مشہور علمائے بزرگ، قابل احترام مشائخ، امرائے عالی مقام اور تمام اہل ایمان و اسلام پر واضح ہو کہ:

بندہ زمانۂ سابق میں، خدا کے فضل سے، لوگوں میں امر حق یعنی سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے اتباع کی تبلیغ کرنے میں دن رات پوری سعی و کوشش بروئے کار لاتا رہا ہے اور یہ بات اس خاکسار کے اکثر دوستوں پر واضح و روشن ہے۔ اس کے بعد خدائے بزرگ و برتر نے اپنے بے پناہ فضل و کرم سے اس ناچیز کو چند مخلص مومنوں کے ساتھ مہاجرین صادق کے زمرے میں شامل کر دیا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً۔

چوں کہ دعوت لسان (زبان سے تبلیغ) جہاد سیف و سنان کے انضمام کے بغیر نا مکمل و نا تمام رہتی ہے ، اس لیے ہادیوں کے امام اور بڑے بڑوں کے سردار یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں کفار کے ساتھ جہاد کرنے پر مامور ہوئے۔ چناں چہ دین متین کی عبادتوں کا ظہور اور شرع مبین کے پرچموں کی بلندی اسی رکن عظیم (جہاد) کی اقامت کے سبب تکمیل پذیر ہوئی۔ بنا براین (قدرت کی جانب سے) اس عبادت عظمیٰ کا عزم اور اس سعادت بزرگ کا ادراک فقیر کے دل میں کچھ اس طرح ڈال دیا گیا ہے کہ میں اس امر عظیم اور اس بڑی مہم کو سر انجام دینے کے لیے صَرف جان و مال ، ترک اہل و عیال اور بہن بھائیوں سے دوری اختیار کر رہا ہوں۔ میرا یہ فعل ناپاک مکھی کو اڑانے اور خس و خاشاک کو اٹھا پھینکنے کے مترادف ہے۔ اور یہ سب محض خدا کے لیے اور خدا کی راہ میں ہے اور اس خواہش رحمانی میں کسی قسم کے شیطانی وسوسے یا ہوائے نفسانی کو دخل نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بات فقیر کے بہت سے واقفان حال پر واضح ہے، پھر بھی مزید تاکید کے لیے نئے سرے سے کہتا ہوں کہ :

میں اللہ تعالیٰ کو ، جو آشکارا و پنہاں کا جاننے والا اور تمام پوشیدہ اشیا اور اسرار سے پورے طور پر آگاہ ہے ، اس بات پر گواہ ٹھہراتا ہوں کہ اہل کفر و عناد کے ساتھ جہاد کرنے کی جو خواہش میرے دل میں موج زن ہے اس میں کسی صورت بھی مال و عزت ، جاہ و حشمت ، امارت و سلطنت اور نام و نشان کے حصول ، اور اخوان و معاصرین پر برتری چاہنے کی آلودگی یا مالک حقیقی کی رضا اور اعلائے کلمۂ حق کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طلب کا میل نہیں ہے ، حاشاللہ ، ثم حاشاللہ۔ واللہ علیٰ ما نقول وکیل (اور اللہ اس چیز پر جو ہم کہتے ہیں ، کارساز ہے۔) لہٰذا ہر وہ شخص ، جو خود کو مسلمان کہلاتا اور 'زمرۂ مہدیاں' میں شمار کرتا ہے ، اس پر نہایت واجب و لازم ہے کہ وہ اپنے آپ اس فقیر کے پاس پہنچ کر اس سلسلے (جہاد) میں خاکسار کے ساتھ تعاون و اشتراک کرے ، تاکہ معرکۂ حشر میں ، کہ جہاں اولین و آخرین کا اجتماع ہوگا ، نیز خالق

ارض و سماوات کی بارگاہ اقدس میں اور جناب سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے رو بہ رو سرخروئی حاصل کرے اور حضرت رسول مقبول صلواۃ اللہ وسلامہ علیہ کی شفاعت کے سبب مزید عز و اکرام سے ، جو حضرت سرور کونین علیہ الصلواۃ والسلام کی امت سے مخصوص ہے ، بہرہ ور ہو ۔

ہر چند دین محمدی صلعم کا غلبہ کسی کی شمولیت پر موقوف نہیں ہے ، کیوں کہ اگر کوئی قوم اس معاملے میں سستی اور سہل انگاری سے کام لے گی تو اس کی جگہ اللہ کے بندوں کی کوئی اور جماعت اس کے لیے جد و جہد کرے گی ، لیکن (ذرا اس کا بھی تصور کریں کہ) سہل انگار اور سست لوگوں کو اپنے مالک حقیقی کے حضور میں اور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے رو بہ رو کیسی کیسی خفتیں اٹھانا پڑیں گی اور وہ اس منتقم حقیقی کے انتقام میں گرفتار ہو کر کس قدر دست ندامت و افسوس ملیں گے ۔ اللہ تعالٰی فرماتا ہے : الا تنفرو یعذبکم عذاباً الیماً و یستبدل قوماً غیرکم ولا تضروہ' شیئاً واللہ علٰی کل شیئی قدیر ــــ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تعالٰی تم کو سخت عذاب دے گا (یعنی ہلاک کر دے گا) اور تمھارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دے گا (اور اُن سے اپنا کام لے گا) اور تم اللہ (کے دین) کو کچھ ضرر نہ پہنچا سکو گے اور اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے ۔

القصہ مومن اور کافر میں امتیاز کرنے کا وقت سر پر آ پہنچا ، اور اہل کفر و شرک کے مقابلے کی گھڑی درپیش ہے ۔ سو اب یہ کسی کی مرضی ہے کہ خواہ وہ خود کو مشرکین کی جماعت میں شامل کرے کہ جو واضح انکار کے ساتھ شرع مبین کا مقابلہ کرتے ہیں یا منافقوں کے زمرے میں داخل ہو کہ جو جھوٹے حیلوں بہانوں سے حکم خداوندی کو ٹالتے ہیں ـــ جیسے جسمانی معذوری یعنی ضعف و ناتوانی کے باعث سفر کی مشقتیں اور جہاد کی تکالیف برداشت نہ کرسکنے کا بہانہ ۔ چناں چہ اللہ جل شانہ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرماتا ہے : ''فرح المخلفون بمقعدھم..... یفقھون۲'' ـ یا مثلاً والدین کی محبت اور آقا کی پاس داری اور اہل و عیال ، بہن بھائیوں ، وطن اور اسی قسم کے

دوسرے معاشی امور سے وابستگی کا عذر ، حالانکہ خدائے بزرگ و برتر فرماتا ہے : قل ان کان آباؤ کم و ابناؤ کم.......... فاسقین[۳] ـــ اور خواہ عناد و نفاق کی آلودگی سے پاک رہ کر اس رب جلیل کی اطاعت و فرماں برداری پر کمرہمت باندھے اور قلت قلبیہ (قوت قلب کی کمی) کو درست کر کے اپنا نام بلند مرتبہ مخلصین کی فہرست میں شامل کرے ۔

پس یہ ہے اس کا طریق جو کچھ کہ ہم نے بیان کیا ۔ وما علینا إلا البلاغ المبین[۴] ۔

(سوانح احمدی حصہ پنجم در مجموعۂ مکاتیب احمدی)

(۲)

علماے پشاور کی خدمت میں ایک خط

بسم‌الله الرحمن الرحیم ۔ امیرالمؤمنین سید احمد کی جانب سے ھدایتوں کے سرچشمے ، افادیت کے منبع ، راہ دین کے ھادی ، شرع متین کے خادم ، رب‌العالمین کے احکام کے ناشر اور رسول امین کے نائب مولانا حافظ دراز ، مولانا حافظ محمد عظیم ، مولانا عبدالملک آخوند زادہ مولانا حافظ مراد آخوند زادہ ، مولانا غلام حبیب آخوند زادہ ، مولانا قاضی سعدالدین ، مولانا قاضی مسعود ، مولانا عبداللہ آخوند زادہ ، مولانا محمد حسن آخوند زادہ ، مولانا حافظ احمد آخوند زادہ ، اور پشاور شہر کے تمام علما سلمہم اللہ تعالیٰ کی خدمت عالیہ میں سلام اور مدارج ھدایت کی ترقی کی دعا کے بعد واضح ہو کہ :

ھمیں پتا چلا ہے کہ بعض بے انصاف مفسدوں اور برخود غلط قسم کے کم راہ لوگوں نے ھم فقیر مہاجروں اور ضعیف مجاھدوں کے بارے میں کچھ فتنہ انگیز وسوسے اور عناد آمیز شبہات پیدا کر کے خواص و عوام میں ان کی تشہیر کی ہے اور (اس طرح) محض جنبش زبان سے مسلمانوں کے درمیان آتش عداوت بھڑکانے کا سبب ، اور اپنے لیے شقاوت پنہانی کا سرمایہ سمیٹنے ، اپنے کندھوں پر کذب و افترا کا وبال اٹھانے اور روز محشر اپنے لیے 'دروغ بے فروغ' کی رسوائی حاصل

کرنے کا باعث بنے ھیں ۔ معاذاللہ من ذالک ۔ علاوہ ازیں (معلوم ھوتا ھے کہ) جن لوگوں نے بہتان و افترا کے ذریعے بعض اھل ایمان کو گم راہ کیا ، انھیں (اھل ایمان) رب العالمین کے راستے سے جو مجاھد مہاجروں کی شرکت سے عبارت ھے ، دور کر دیا ، انھیں شرع مبین کے خادموں سے بدظن کیا اور جہاد کی راہ مستقیم کو ان کی نظروں میں ٹیڑھا راستہ کرکے دکھایا ، انھوں نے کبھی یہ آیات کریمہ نہیں پڑھیں :

''الا لعنة اللہ علی الکاذبین۵'' اور ''الا لعنة اللہ علی الظالمین الذین یصدون عن سبیل اللہ و یبغونھا عوجا۶۔'' اور نہ کبھی انصاف کے میدان میں غور و فکر کے گھوڑے ھی دوڑائے ھیں ۔

اگرچہ ھم ناتوان و عاجز صرف رب جلیل کی استعانت و مدد پر یقین رکھتے ، فقط عنایت ازلی کو قابل اعتماد جانتے ، ایسے لوگوں کی مذمت کو ان کی مدح کی مانند بےوقعت سمجھتے اور ھمیشہ قادر مطلق کی رحمت کے نزول کے منتظر رھتے ھیں ، لیکن حدیث ''اتقوا من مواضع التھم۷'' کے مطابق ھم نے ان کے اتہام کا رد کرنا لازم و واجب جانا اور اس توقع پر بیان واقع کو ضروری سمجھا کہ شاید کسی مخلص صادق نے مجاھدوں کے ساتھ شمولیت کا ارادہ کیا ھو اور پھر ان لوگوں کی اس تہمت زنی و افتراپردازی کے سبب اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا ھو تو ممکن ھے وہ حقیقت حال سے آگاہ ھو کر پھر راہ راست کی طرف لوٹ آئے اور صدق و خلوص کو اپنائے ۔

ھاں ! تو ایسا سننے میں آیا ھے کہ یہ افترا پرداز دیگر بہتان طرازیوں کے علاوہ اس فقیر بلکہ مجاھدوں کے گروہ کو الحاد و زندقہ سے بھی نسبت دے رھے ھیں ۔ یعنی یہ کہتے ھیں کہ ''مسافروں کی اس جماعت کا کوئی مذھب نہیں اور نہ ان کا کسی مسلک ھی سے کوئی تعلق ھے ۔ بلکہ یہ تو محض خواھشات نفسانی کے طالب اور ھر طرح سے جسمانی لذات کے جویا ھیں خواہ وہ کتاب (قرآن) کے موافق ھوں یا مخالف ۔'' معاذ اللہ من ذالک ۔ جاننا چاھیے کہ اس برے فعل کو ھم لوگوں سے منسوب کرنا ایک بہت بڑا بہتان اور ایک بری تہمت ھے ۔

یہ فقیر اور اس فقیر کا خاندان ہندوستان میں گمنام نہیں ہے؛ ہزاروں لوگ، کیا خواص اور کیا عوام، اس فقیر اور اس فقیر کے اسلاف کو جانتے ہیں کہ میرا مذہب اباً عن جد مذہب حنفی ہے، اور آج بھی مجھ ناچیز کے تمام اقوال و افعال اسی مذہب کے قوانین و اصول اور آئین و قواعد کے مطابق ہیں۔ اور ایک بھی (قول و فعل) ان اصول مذکورہ سے ہٹ کر نہیں ہے۔ اور اگر کبھی ہمارے خاندان کے کسی فرد سے کسی غفلت کی بنا پر کوئی غلطی سرزد ہوتی ہے تو وہ اپنی غلطی کا معترف ہوتا اور مطلع ہونے کے بعد راہ راست پر لوٹ آتا ہے۔ ہاں! ہر مذہب میں محققین کا طریق دوسرا ہوتا ہے، اور غیر محققین کا دوسرا۔ بعض روایتوں پر بعض دوسری روایات کو ترجیح دینا، قوت و دلیل پر نظر، سلف سے منقول بعض عبارتوں کی توجیہ، کتابوں میں مندرج مختلف مسائل کی تطبیق اور اس قسم کے دوسرے امور ہمیشہ سے اہل تحقیق و تدقیق کا کاروبار ہیں۔ اس وجہ سے وہ مذہب سے خارج نہیں ہو سکتے، بلکہ انہیں تو اہل مذہب کا لب لباب جاننا چاہیے۔ جس کسی کو اس میں کچھ شبہ ہو وہ اس عاجز کے پاس آ کر بالمشافہ حل مشکلات کرے؛ یا تو وہ خود سمجھے یا پھر اس فقیر کو سمجھائے۔

مذکورہ افترا پرداز اس فقیر کو ظالم و جابر بھی کہہ رہے ہیں۔ ان کے مطابق "یہ عاجز مسلمانوں کے جان و مال پر بغیر کسی شرعی وجہ کے دست درازی کر رہا ہے اور اس سلسلے میں چرب زبانی اور حیلہ سازی سے کام لے رہا ہے۔" سبحان اللہ! یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اس فقیر نے تو بلا وجہ شرعی کبھی کسی کو ایک چابک بھی نہیں مارا، بلکہ بلا وجہ مارنا بھی میری عادت نہیں ہے۔ جو کوئی بھی اس فقیر کے ساتھ کچھ عرصہ رہا ہے وہ یقیناً اس بات سے آگاہ ہوگیا ہوگا۔ البتہ اس حقیر و ناچیز نے حکم خداوندی سے جو بعض شریر مرتدوں اور بد فطرت منافقوں کی گوشمالی و سرزنش کی ہے اسے میں اپنے لیے سب سے بڑی سعادت و خوش بختی اور (درگاہ خداوندی میں) اپنی مقبولیت کی قوی علامت جانتا ہوں۔ بلکہ (یوں کہنا چاہیے کہ) دین کی اعانت و

مدد میں غیرت اور دشمنوں کی تذلیل و تحقیر سے رغبت رکھنا ایمان کے لوازم میں سے ہے ۔ جس شخص میں غیرت ایمانی اور حمیت اسلامی نہیں ہے وہ حقیقت میں ایمان سے عاری ہے ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے ''یا ایھاالذین آمنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی‌اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ' اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم[8] ۔'' اسی طرح دوسری جگہ فرماتا ہے : ''یا ایھاالنبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم وماواھم جھنم[9] ۔'' اور بہ فرض محال اگر یہ عاجز اس قسم کی باتوں کا مرتکب بھی ہوا ہو تو پھر وعظ و نصیحت کے انداز میں مجھے اس سے آگاہ کرنا چاہیے نہ کہ پیٹھ پیچھے محفلوں اور مجلسوں میں میری تشہیر کی جائے ، اور اس بھول چوک کے سبب یہ لوگ مجھے مطعون کریں ، اور پھر اسی خیال سے جہاد کے معاملے میں اس فقیر کا ساتھ دینے اور مجاھدین کے گروہ میں شامل ہونے سے باز رہیں کہ حدیث ''الجھاد باق الیٰ یوم القیامۃ لا یبطلہ جور جابر و لا عدل عادل'' تمام اھل حدیث میں مشہور ہے ۔

الغرض تمام علما سے اس فقیر کی یہ درخواست ہے کہ وہ (علما) سب مسلمانوں کو عموماً اور اس فقیر کو خصوصاً ، امر بالمعروف اور نہی عن‌المنکر (نیک کاموں کا حکم اور برے کاموں سے منع) کریں ، اور ھدایت کی سیدھی راہ پر چلنے کا حکم فرمائیں اور جو کچھ اعتراضات وغیرہ وہ میری غیر موجودگی میں مجھ پر کرتے ہیں انھیں بالمشافہ شرعی دلائل کے ساتھ ثابت کریں ، اور اس فقیر کو وعظ و نصیحت سے 'خود پرستی' کی بہ جائے 'خدا پرستی' کی راہ پر لگائیں ، کہ میں تو ہر وقت اس بات پر تیار رہتا ہوں کہ اگر مجھے اپنے ایسے اقوال و افعال سے آگاہی ہو جائے جو خدا اور اس کے رسول صلی‌اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے منافی ہوں تو میں فی الفور ان سے توبہ کرکے راہ راست کی طرف لوٹ آؤں ۔ لہٰذا آئندہ اگر مذکورہ مجادلین (جھگڑا کرنے والے) کو میرے اقوال و افعال پر کوئی اعتراض ہو اور انھیں وہ خلاف شرع جانتے ہوں اور پھر اس سے مجھے آگاہ نہ کریں اور سفر کی ذرا

سی تکلیف برداشت کرکے آسے (اعتراض) بالمشافہ ثابت نہ کریں تو اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔

اور یہ جو بعض دروغ گو نادانوں اور فتنہ پرور احمقوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ ''جو کوئی بھی واجب تعظیم عالم اور قابل احترام فاضل اس فقیر کو امر بالمعروف اور نہی عن‌المنکر کرتا ہے یہ فقیر اس کے ساتھ بڑے قہر اور درشتی سے پیش آتا ہے اور اس کے جان و مال کو نقصان اور کسی نہ کسی طریق سے اسے دکھ پہنچاتا ہے۔'' یہ سب بہتان محض اور امر باطل ہے ، اس لیے کہ بارہا کافروں اور منافقوں کے جاسوسوں کو اس جگہ لایا گیا مگر ہم نے ان کے ساتھ کبھی درشت کلامی نہ کی ، بلکہ انہیں بالکل معاف کر دیا ۔ تو جب ان لوگوں (جاسوس) کے ساتھ فقیر نے ایسا رویہ اختیار کیا ، تو کیا کوئی عقل مند اس بات کو صحیح سمجھے گا کہ یہ فقیر ان واجب تعظیم علما و فقرا کے ساتھ بد زبانی و درشت کلامی سے پیش آتا ہے جو محض امر بالمعروف اور نہی عن‌المنکر کی خاطر اس فقیر کے پاس آتے ہیں ؟ یہ بات تو سراسر خلق ایمانی سے دور اور مروت انسانی سے بعید ہے ۔ معاذاللہ من ذالک ۔

مذکورہ افتراپردازوں کا ایک بہتان یہ ہے کہ یہ جو قادر مطلق نے اس فقیر کے ذریعے خادی خاں اور یار محمد[11] کا استیصال کیا ہے ، تو اس (سلسلے) میں مجاہدین و مہاجرین نے ظلم و جور سے کام لیا ہے ۔ وہ (افترا پرداز) ان سرکشوں اور باغیوں کو حق بہ جانب جانتے ہیں ، بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ مجاہدین کا یہ فعل باغیانہ ہے اور مذکورہ معاندین (دشمن) نے شہادت پائی ہے ۔ سبحان اللہ ! ایک شخص رسوم جاہلیت کو ترک کرنے کا حکم اور شرع محمدی (صلی‌اللہ علیہ وسلم) کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے اور جاہل لوگ اسی بات پر اس کی مخالفت اور کفار سے موافقت کریں ، شرع مبین اور احکام خداوندی کی مخالف راہ پر چلیں ، راہ دین کے اس ہادی کی تحقیر و تذلیل کے لیے کفار و مشرکین سے مدد چاہیں ، اور ان میں سے بعض (دشمن) دین کے ہادیوں اور غازی مجاہدین کے ہاتھوں جہنم رسید ہوں ، پھر دوسرے مشرکین

مذکورہ مشرکین کی حمایت میں کافر لعین کے حکم سے برگزیدہ مجاہدوں اور نیک مہاجروں پر ٹوٹ پڑیں ، اور جب یہ مجاہد و مہاجر ان بدکردار منافقوں کو شریر کفار ھی کے لشکری سمجھ کر بچاؤ کے طور پر ان سے مقابلہ کریں اور اسی مقابلے میں یہ بد فطرت منافق خدائے جبار کے غضب میں گرفتار ہوں اور اس حقیقی منتقم (انتقام لینے والا) کے انتقام کے سبب اپنی دنیا و آخرت کو برباد کر لیں ، اور اس آیۃ کریمہ ''ذالک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم'' کا مصداق بنیں اور پھر ان مرتدین و منافقین کو شہید کہا جائے اور مجاہدین صادق کے (اس مقابلے کو) بغاوت کا نام دیا جائے ، بھلا یہ مسئلہ[۱۳] کون سی قوم اور کس مذہب کا ھے ؟ کم از کم یہ ملت محمدیہ (صلعم) کا مسئلہ نہیں ھے ، البتہ یا تو سکھ قوم کا مسئلہ ہوگا یا پھر مجوسیوں اور ھندوؤں کا - بلا شک افتراپردازوں کے یہ مفتی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اور سرور کونین شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں خوار و تباہ اور ذلیل و روسیاہ ہوں گے۔ ''وتری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ الیس فی جھنم مثوی للمتکبرین[۱۳] ۔''

آخر یہ دروغ گو مدعی بالمشافہ مناظرہ کے لیے مردانہ وار سامنے کیوں نہیں آتے اور کیوں اپنے دعوے کو شرعی دلائل سے ثابت نہیں کرتے ؟ کیا یہاں کوئی اتنا ھی فرعون مزاج اور نمرود سرشت ھے جو امر بالمعروف کرنے والوں کو قتل کر دے گا ؟ اور بالفرض یہ لوگ اپنی بزدلی و نامردی کے سبب رو بہ رو بات نہیں کر سکتے تو پھر مجھ ناچیز کا وہ اعلامیہ ھی ملاحظہ کر لیں ، جو اس سے پہلے میں علمائے پشاور کو ارسال کر چکا ہوں ، اور اس کا ٹھیک سے جواب تحریر کریں - لیکن (یہ بات یاد رھے) کہ جس طرح مذکورہ اعلامیہ دلائل اربعہ سے واضح ھے ، اسی طرح اس کا جواب بھی اصول مذکورہ کے ساتھ مدلل و روشن ہو - مذکورہ جواب اس انداز سے قیل و قال اور بحث و جدال کے معرکے میں پیش کریں کہ وہ ارباب عقل اور اصحاب ہوش کے شایاں ہو - اسے امتحان کی کسوٹی پر پرکھ لیں اور پوری طرح جانچ لیں اور بحث مباحثے کی طوالت اور سوال و جواب کی کثرت سے ہرگز نہ گھبرائیں -

ھاں اتنا ضرور ہے کہ اللہ جل شانہ' کو حاضر و ناظر اور دلوں کے بھید جاننے والا سمجھ کر ، جو کچھ نوک قلم پر لائیں اس میں حق کے پہلو کو ذرا بھی ھاتھ سے نہ جانے دیں۔ اور اگر ان کے پاس کوئی معقول دلیل نہیں ہے جواللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مقبول ھو ، اور وہ محض سینہ زوری سے زبان طعن دراز کر رہے ھیں تو پھر انھیں یہ جان لینا چاھیے کہ کلمۂ حق ان کی اس قیل و قال سے باطل نہ ھوگا ، اور ھم بندگان الٰہی ، جنھوں نے دین کی خدمت کی خاطر اپنے عزیز و اقارب اور وطنوں کو خیرباد کہہ دیا اور سر دھڑ کی بازی لگا دی ہے ، ان کی ملامت کے خوف سے اپنے اس شغل سے ھاتھ نہ اٹھائیں گے۔ ''یریدون ان یطفؤ نور اللہ بافواھھم و یابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون۱۵ ۔''

الغرض ان کی یہ لعن طعن دین اور دین کے خادموں کو کوئی بھی نقصان نہ پہنچا سکے گی ؛ البتہ اُلٹا ان نا انصاف برخود غلط لوگوں پر دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی قسم قسم کے وبال و عذاب نازل ھوں گے۔ لٰہذا پشاور شہر کے علما و فضلا پر ، جو سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبوں کی حیثیت سے خواص و عوام کو ھدایت کرتے اور اسے اپنے لیے سب سے بڑی سعادت سمجھتے ھیں ، واجب و لازم ہے کہ وہ حکم خدا وندی کو واشگاف الفاظ میں بیان کریں اور بلا تکلف انصاف کی راہ پر چلیں تاکہ جس طرح مذکورہ مشرکین گمراھوں کے سربراہ بن کر 'نصوص الدین' کا مصداق بنے ھیں ، اسی طرح علمائے موصوف ھدایت کرنے والوں کے سردار بن کر 'العلماء ورثۃالانبیاء' کا مصداق بنیں۔

اگر سچ پوچھیں تو یہ لوگ (منافقین و مشرکین) ھم مجاھدوں کے حق بجانب ھونے کو باطنی طور پر تو تسلیم کرتے ھیں ، لیکن دنیوی اغراض کے سبب اس کا اظہار نہیں کرتے۔ وہ علمائے یہود کی مانند راہ مستقیم سے بہ خوبی آگاہ ھیں ، لیکن ھوس کا شکار ھونے کے باعث کج روی اختیار کر رہے ھیں۔ ''الذین آتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم و ان فریقاً منھم لیکتمون الحق و ھم یعلمون۱۶ ۔'' سو جس طرح علمائے یہود و نصاریٰ حقیقت اسلام

سے پورے طور پر آشنا تھے ، لیکن محض اپنے جاہ و جلال اور عزت کی حفاظت اور اپنے سلاطین و ملوک کی پاسداری کی خاطر وہ تمام دین و دانش کو بالائے طاق رکھ دیتے اور بیہودہ قسم کی تاویلوں سے تمام رؤسا اور ضعیف الاعتقاد لوگوں کو گمراہ کیا کرتے تھے ـــ یہاں تک کہ آج کے یہود و نصاریٰ بھی اسی گمراھی میں پڑے ہوئے اور فارقلیط (احمد ص) کے ظہور کے منتظر بیٹھے ہیں ۔ لہٰذا ایام سابقہ کے گم راہ موجودہ دور کے ان گم راہوں کے وبال میں برابر کے شریک ہیں اور قیامت تک شریک رہیں گے ۔ اسی طرح بہ نا انصاف کفار و منافقین ہم مجاہد مہاجروں کی راست بازی سے تو بہ خوبی آگاہ ہیں لیکن اس کے برملا اقرار کو اپنی عزت و توقیر کے زوال کا باعث اور سلاطین و خوانین کی ناراضی کا سبب جانتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دیکھی 'ان دیکھی' اور سنی 'ان سنی' کر دیتے ہیں اور اپنی چرب زبانی سے اس باطل کو فضول قسم کی تاویلات سے آراستہ کرتے اور رؤسا اور ضعیف الاعتقاد قسم کے لوگوں کو حیلہ و فریب سے گم راھی کی جانب لے جاتے ہیں ۔ لہٰذا ان لوگوں (رؤسا وغیرہ) کی گم راھی کا وبال قیامت تک ان گم راہ کرنے والوں کی گردن پر رہے گا ۔ اسی طرح علمائے حق اور فضلائے ربانی میں سے جو کوئی بھی اس وقت اظہار حق کرے گا ، تو جس قدر بھی مسلمان مجاہد اس کی کوشش سے حق کی جانب مائل ہوں گے ، وہ ان کے جہاد میں شریک ہونے کے ثواب میں برابر کا حصہ دار ہو گا ۔

سو لازم ہے کہ ہر بڑا عالم اس صحیفے کو خود بھی دیکھے اور دوسروں کو بھی اس سے آگاہ کرے ، تاکہ ہر چھوٹے بڑے پر حجت اللہیہ تمام ہو ۔ ''لیہلک من هلک عن بینة و یحییٰ من حی عن بینة ۱۷ ۔'' والسلام (نوشتہ ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ) ۔
(سوانح احمدی ، حصہ پنجم ۔ مکاتیب احمدی ، مکتوب نمبر ۴۴)

اسداللہ خاں غالب

[غالب[1] (۱۷۹۷–۱۸۶۹ ع) اردو اور فارسی کے با کمال شاعر ، فارسی اور اردو نثر میں بھی صاحب طرز ادیب تھے ۔ کئی کتابیں تصنیف کیں ۔ مثلاً فارسی نثر میں 'مہر نیم روز' ، 'پنج آھنگ'، 'قاطع برھان' ، 'دستنبو' ، 'درفش کاویانی'۔ بعض کو یک جا کر کے کلیات نثر غالب (۱۸۷۱ع) کے نام سے بھی شائع کیا گیا ۔]

(۱)

محبوبہ کے بارے میں مکتوب تعزیت

قطعہ

ای کہ گفتی کہ در سخن باشد حاصل جنبش زبان 'گفتن'
تاندانی کہ راز دل با دوست جز 'بگفتن' نمی توان گفتن
خامہ را نیز در گزارش شوق ھست دستی بداستان گفتن
گر قلم ور زبان ترا نہ یکی است این 'نوشتن' شمار و آن 'گفتن'
بقلم ساز می دھم گفتار تا نگنجد درین میان 'گفتن'
زانکہ دانم گزین خروش لبم ریش گردد ز 'الامان' گفتن
مشکل افتادہ است درد فراق با مظفر حسین خان گفتن

(اے کہ تو نے کہا کہ 'سخن' میں جنبش زبان کا حاصل 'گفتن' (کہنا ، بولنا) ھوتا ھے ، یہ نہ سمجھ لینا کہ دوست کے سامنے راز دل 'زبان سے کہنے' کے علاوہ کسی اور طریقے سے بیان نہیں کیا جا سکتا ، (اس لیے کہ) قلم کو بھی عشق کے بیان میں داستان کہنے کی مہارت حاصل ھے ۔ اگر قلم اور زبان تیرے لیے ایک نہیں ھیں (؟) تو اسے 'نوشتن' (لکھنا) سمجھ اور اسے 'گفتن' ۔

میں قلم (کی زبان) سے گفتگو کرتا ہوں تاکہ 'گفتن' درمیان میں نہ سما جائے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس خروش سے 'الاماں' کہتے کہتے میرے ہونٹ زخمی ہو جائیں گے۔ مظفر حسین خاں کے ساتھ درد فراق کا اظہار کار دشوار بن گیا ہے۔)

اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ اختلاط و محبت کے اندازہ داں عشق و آشنائی میں افراط کو اچھا نہیں جانتے اور بیگانگی کے ادا شناس مہر و الفت کی دل کشائی سے دل نہیں لگاتے لیکن کیا کروں کہ وفا میں نئے دستور لانا اور کم حوصلہ و بد معاملہ لوگوں کی مانند دو جگہ دل لگانا اپنا شیوہ نہیں۔

ہا! ان باتوں کے سبب جو بے خودی میں میری زبان سے نکل گئی ہیں مجھ پر اور میرے کاروبار شوق پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ ایک 'غم زدہ دل' اپنے پاس تھا سو وہ اعتقادالدولہ نوروزعلی خاں لے گیا اور مجھ سے چوری اُسے اپنے ایک دیرینہ دوست کے سپرد کر دیا۔ محبت کی 'نادرہ کاری' پر نازاں ہوں کہ انجمن وصال کی شمع روشن کئے بغیر ہی داغ 'فراق آور' سے بجھا رہا ہوں۔ اور اعتقادالدولہ کے سحر و افسوں کی گیرائی کے قربان جاؤں کہ بزم قرب میں پہنچے بغیر ہی ماتم میں تمھارا ہم زبان ہوں۔ کاش !! میں اس فریفتہ کرنے والے کی باتیں نہ سنتا اور میں نے وہ مکتوب غم نہ پڑھا ہوتا جو اس کے نام تھا۔ اب یہ عالم ہے کہ نشتر غم پیہم رگ جاں پر چل رہا اور خون دل مسلسل آنکھوں کی راہ بہہ رہا ہے۔ بھلا کیوں کر خود کو گریہ و زاری سے باز رکھوں اور کس حیلے بہانے سے دل کو گرداب خوں سے نکالوں!

ایام جوانی میں میرا چہرہ پرکشش تھا اور میرے سر میں پری چہرہ حسینوں کا سودا سمایا رہتا تھا۔ چناں چہ اس قسم کے رنج و محن (وفات محبوبہ) کا زہرآب مجھے بھی پینا پڑا ہے۔ میں نے دوست (محبوبہ) کے جنازے کی رہ گزر میں اپنے دامن صبر کو تار تار کیا ہے، دن کے وقت اس دلدار کے ماتم میں بوریا نشین اور سیاہ پوش رہا ہوں تو تاریک راتوں کو خلوت میں 'شمع خموش' کا پروانہ۔ کیسا ظلم ہے کہ اس

ہم خوابہ کے تن نازک کو خاک کے سپرد کیا جائے کہ جسے وقت وداع (رشک کے سبب) خدا کے سپرد بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ اور کیسا ستم ہے کہ اُس محبوبہ کی نعش کو قبرستان لے جایا جائے کہ جسے نرگس کی نظر لگ جانے کے خوف سے چمن کی گلگشت کے لیے نہیں لے جایا جا سکتا۔

شعر

خاک خون باد کہ در معرض آثار وجود
زلف و رخ درکشد و سنبل و گل بار دھد

جس صیاد کا دام ٹوٹ اور صید ھاتھ سے چھوٹ چکا ہو اُسے آسودگی کہاں نصیب ، اور جس گلچیں کا گل ھاتھ سے جاتا رہا اور گلبن جڑ سے اکھڑ چکی ھو اسے مسرت و شادمانی سے کیا سروکار ! معشوق کا اپنے عاشق کی ھمدمی پر راضی ھونا گو ایک عمر کی جاں فشانی کے بعد ھی سہی ، لیکن عشاق کے نزدیک ، پھر بھی یہ اس کی نہایت مہربانی اور دوست نوازی ہے۔ اس وفا شعار معشوقہ کے کیا کہنے کہ جس نے گذشتہ جفاؤں کی تلافی کو ھر چیز سے برتر جانا ھو ، اور جس کسی کا دل اپنے ناز و غمزہ سے اڑایا اسی کی محبت میں جان کی بازی بھی لگا دی ھو ۔

اگرچہ مرگ دوست کا غم جاں گزا اور ھمیشہ ھمیشہ کی جدائی کا دکھ جگر خراش ہے لیکن جب انصاف یہی ہے کہ صحیح لوگ صحیح بات سے رنجیدہ نہ ھوں تو پھر میری یہ خواھش ہے کہ اس غم و اندوہ کے عالم میں بھی آپ ذرا اپنے دل میں غور کریں کہ اس زخم کا علاج کس کے پاس ہے اور موت کو کون نیچا دکھا سکتا ہے ؟ خدا را اس سموم خیز وادی (رنج و محن) میں دور نہ جائیے گا اور اس جان گداز غم میں صبر و شکیب سے کام لیجیے گا ۔ ھاں اے دیدہ ور ! عشق بازوں کا سرمایہ اور ارباب محبت کی دولت یہی ایک دل ہے کہ جسے کبھی تو محبوب کی پتلی کمر پر فدا کیا اور کبھی اس کی زلفوں کا اسیر بنایا جاتا ہے ۔ مردہ جسم میں کمر کی سی لچک کہاں جو کسی دل کو اپنا متوالا بنا لے اور ایسی زلفیں کہاں کہ جن میں کسی کا دل اٹکے ۔ ڈرتا ھوں کہ کہیں یہ ناقابل برداشت غم آپ کی جان پر اثر انداز نہ ھو اور رفتہ رفتہ مرگ[۲] دل کا باعث بنے ۔ بلبل جو

اپنی عشق بازی کے سبب رسوا ہے ، ہر کھلے پھول پر مرتی ہے ، اور پروانہ جو اپنی فدا کاری کے لیے انگشت نما ہے ، ہر روشن شمع پر جان نچھاور کرتا ہے ۔ ہاں ! انجمن میں ہزاروں روشن شمعیں اور چمن میں بے شمار شگفتہ پھول ہیں ؛ پھر بھلا پروانے کو ایک شمع کے بجھنے کا کیا افسوس اور بلبل کو ایک پھول کے گرنے کا کیا غم ؟ آپ بھی (بلبل و پروانہ کی مانند) ایک ہی محبوب کے پابند نہ رہیں بلکہ تماشائے رنگ و بو سے دل لگائیں[3] ۔ بہتر تو یہ ہے کہ بزم شوق میں نغمۂ نشاط کو نئے سر سے شروع کریں اور ایک ایسی حسینہ سے اپنا پہلو گرم کریں جو گذشتہ محبت کو پھر سے تازہ کر سکے۔ تا کہ دشمن کے علی‌الرغم آپ مسرت و شادمانی سے ہم کنار اور راقم کے اس شعر سے نغمہ سرائی میں مصروف ہوں :

بر ما غم تیمار دل زار سرآمد   دیوانۂ مارا صنم سلسلہ مو برد

صاحب من ! میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ، بہ خدا فقط از راہ دل سوزی ہے، بد آموزی نہیں ۔ یہ تو اعتقاد الدولہ کے اصرار نے مجھے اس امر کی ترغیب دلائی کہ میں آپ کے نام اپنی طرف سے خط لکھوں اور اس طرح اپنی بے دانشی کا مظاہرہ کروں ۔ چناں چہ اپنا یہ سادہ دل جو ہمیشہ محبت کے گیت گاتا اور اپنوں اور بیگانوں کے غم سے خون ہو جاتا ہے ، اس غم سے جوش میں آ گیا جس کے سبب میرا لاآبالی قلم بے راہ ہو کر چلنے لگا ۔ سو اگر آپ کو میرے خط میں مندرجہ نصیحتیں بھلی معلوم نہ ہوں تو مکتوب کو ناخواندہ سمجھیں اور مجھ عاجز کے معاملے میں درگزر سے کام لیں ۔ آپ کے دل نازک کو جو دکھ پہنچا ہے اسے اس کارفرما (خدا) کی مہربانی کا نتیجہ جانیں اور مجھ نا چیز کو اپنا ایک فرمان پذیر خیال کریں ۔ خدا آپ کو دل توانا اور فکر روشن عطا فرمائے !

راقم
اسد اللہ نامہ سیاہ

(مکتوب بنام مظفر حسین ۔ کلیات نثر غالب)

(۲)

اپنی شاعری کے بارے میں نواب سعدالدین شفق کے نام خط

اب خالص دل نشیں باتیں ختم کرتا اور جگر میں جو خون جوش مار رہا ہے اسے رگ کلک سے کاغذ پر ٹپکاتا ہوں ۔ تاکہ دیدہ ور لوگ دور ھی سے دیکھ لیں کہ مکتوب نگار کی پلکیں خوں فشاں ھیں اور دل درد سے پر ہے ۔

ایک مدت سے اپنی طبیعت اردو شعرگوئی کی طرف نہیں آ رھی ، ھاں کبھی کبھار بادشاہ[۴] عالی جاہ کی رضا جوئی کی خاطر ریختہ کہنا پڑتا ہے ۔ اور خصوصاً ملکۂ عالیہ[۵] کے فرمان پر اردو غزل (ریختہ) میں اس قسم کی نا روا[۶] ردیف کو ھاتھ لگاتا ھوں ۔ ممکن ہے غزل کے مقطع میں ، بہ عالم مستی کوئی ایسی بات کہہ گیا ھوں جس پر اس 'بر خود غلط[۷]' شخص نے یہ جانا کہ میرا روے سخن اس کی طرف ہے ۔ چناں چہ اپنی ایک غزل کے مقطع میں اس نے لڑائی کا سا ڈھنگ اختیار کیا اور یہ سمجھا کہ وہ میری بات کا جواب دے رھا ہے ۔ اور میں نے اپنے اس مصرع تر:

هرچه در گفتار فخر تست آن ننگ من است

کی 'سیہ مستی' میں خاموشی ھی کو مناسب جانا اور قطع نظر کو اس امتیاز کی قطعی دلیل سمجھا جو ھم دونوں میں ہے ۔

وائے ہے مجھ پر کہ مجھے 'سوختہ خرمن' اور 'زیاں زدہ' پیدا کیا گیا ۔ نہ تو مجھے اپنے اسلاف کی طرح سلطان سنجر ایسی شان و شوکت ھی میسر آئی اور نہ میں قدیم دانش مندوں کی مانند علم و ھنر ھی میں بو علی (سینا) بن سکا ۔ (اس حرماں نصیبی کے سبب) جب میں نے درویشی و آزاد منشی اختیار کرنا چاھی تو ذوق شعر نے ، کہ ازل سے مجھے ودیعت ھوا تھا ، رھزنی کی اور مجھے یہ کہہ کر الو بنایا کہ 'خون جگر کھانا اور نئے نئے مضامین پیدا کرنا بھی ایک عظیم کام ہے ۔ یہ سپہ سالاری اور یہ دانش‌وری سب فضول ھیں ؛ صوفی گری چھوڑ اور

سخن سرائی میں مشغول ہو۔ مجبوراً ایسا ہی کیا اور بحر شعر میں کہ سراسر سراب ہے ، سفینہ رواں کر دیا۔

یا تو زمانے میں کوئی دیدہ ور نہ تھا یا اگر تھا تو اس نے میری طرف توجہ نہیں کی ۔ کیوں کہ بد قسمتی سے (فن شعر میں) میری ندرت اور اپج کو کوئی نہ پا سکا ۔ اور اب کہ دانت گر چکے اور کان بہرے اور بال سفید ہو چکے ہیں اور چہرہ جھریوں سے پر ہے ، ہاتھوں پر رعشہ طاری ہے اور پاؤں رکاب میں ہیں ، اس جنون و سودا میں سے جو کبھی سر میں تھا میرے پاس صرف ایک ختم ہونے والی جان اور کھائی جانے والی روٹی باقی رہ گئی ہے ۔ سو دیکھیں آج تک جو کچھ کیا ہے کل قیامت کے روز اس کی کیا سزا بھگتتا ہوں :

دوش برمن عرض کردند آنچہ در کونین بود
زاں ہمہ کالاے رنگا رنگ دل بــرداشتم

(کل (روز ازل) میرے سامنے دونوں جہان کی چیزیں رکھی گئیں ؛ ان رنگا رنگ چیزوں میں سے میں نے صرف ایک دل اٹھا لیا ۔)
اس جنوں زدہ دل نے غم و اندوہ سے پریشان ہو کر ذیل کی رباعی کا سہارا ڈھونڈا ۔ یہ (رباعی) ایک ایسا آہنگ ہے جس کی تیزی تار رگ جاں پر مضراب کا کام کرتی اور روح کو تڑپاتی ہے : رباعی

ای کردہ بہ آرایش گفتار بسیچ — در زلف سخن کشودہ راہ خم و پیچ
عالم کہ تو چیز دیگرش می‌دانی — ذاتیست بسیط منبسط دیگر ہیچ؟
(کلیات نثر غالب)

(۳)

مکتوب نگاری کے آداب و القاب کے بارے میں

زبان اس خدائے لم یزل کی تعریف کرنے سے قاصر ہے جو انسان کے تصور سے کہیں بلند و بالا ہے ۔ اور 'گفتار' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ، جو بنی نوع انسان کے لیے شرف کا باعث ہیں ، نعت کے بیان میں عاجز ۔ ناچار 'فکر بلند' اپنے مقام سے ذرا نیچے اتر کر چند ٹوٹی پھوٹی

باتوں کو فراهم کرتی ھے تاکہ انھیں دانا اور نادان کے سامنے پیش کر سکے ۔

یہ ۱۲۴۱ھ ھے اور یہ وہ موقع ھے جب کہ انگریز فاتحین نے بھرت پور[10] پر لشکر کشی کر کے اس مضبوط قلعے کو مسخر کر لیا ھے ۔ اس حملے میں میں اپنے گرامی قدر چچا جناب فخرالدولہ دلاورالملک نواب احمد بخش خاں[11] بہادر رستم جنگ دام اقبالہ کے ساتھ ھوں ، اور میرے پسندیدہ خصلت بڑے بھائی مرزا علی بخش[12] خان بہادر ھمارے ھم سفر ھیں ۔ ھم دن کے وقت اکٹھے ھی چلتے اور رات کو ایک ھی خیمے میں فروکش ھوتے ھیں ۔ (اس دوران سفر میں ایک روز) میرے والا قدر بھائی نے ، جن کی پیشانی سے سعادت مندی اور دانش جوئی کے آثار نمایاں ھیں ، مجھ سے یہ خواھش کی کہ میں عام رسمی القاب و آداب اور شکریہ ، گلہ شکوہ ، خوشی اور غم کے الفاظ کو ایک جگہ جمع کرکے مکتوب نگاروں کے لیے ایک مختصر سا دستورالعمل تیار کروں ۔ ھر چند یہ بات غالب دردمند کے شیوہ سے ھٹ کر ھے ۔ اداشناس جانتا ھے کہ مکتوب نگاری میں میرا طریقہ یہ ھے کہ جب میں کاغذ قلم ھاتھ میں لیتا ھوں تو مکتوب الیہ کو آغاز مکتوب میں اس لفظ سے خطاب کرتا ھوں جو اس کی ذات کے شایاں ھوتا ھے ، اور پھر ایک دم سے مدعا بیان کرنے لگ جاتا ھوں ۔ یہ القاب و آداب اور یہ خیر و عافیت گوئی سب 'حشو زاید' (فالتو) ھیں ۔ اور سنجیدہ لوگ حشو سے دور رھتے ھیں ۔ نیز دانا جانتے ھیں کہ اس باب میں کیا ساحری کی جا سکتی اور اس طرز میں سخن گستری کی کہاں تک گنجائش ھے ۔

چونکہ بھائی کا دل رکھنا منظور تھا ، اور ان کی اس فرمائش نے کانوں کے راستے دل میں اتر کر اپنا اثر دکھایا تھا اس لیے دماغ فوراً غور و تامل کی طرف مائل ھوا اور انگلیاں حرکت میں آ گئیں ، اور جلد ھی یہ اوراق تحریر کے نقش و نگار سے آراستہ ھو گئے ۔ چونکہ خودنمائی اور بیہودہ گوئی کوئی خوبی نہیں ھے اور با وجود اس بات کے کہ میں نعمت گفتار کا سیر چشم ھوں اور میرے ھاتھ اس گرانمایہ

سامان سے خالی نہیں ہیں ، میں اس جگہ سخن آرائی سے کام نہیں لوں گا اور سائل کی خواہش کو پورا کروں گا ۔

یہ اوراق تین روز میں تکمیل پذیر ہوئے ۔ اس سے پیشتر کہ موضوع کی طرف رجوع کیا جائے ، واضح ہونا چاہیے کہ مکتوب نگار کو لازم ہے کہ خط لکھتے وقت اپنے مقصد سے دور نہ ہٹے اور تحریر کو گفتگو کا رنگ دے ۔ اپنا مطلب اس طرح ادا کرے کہ پڑھنے والے کے لیے اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو۔ اگر اسے ایک سے زیادہ باتیں لکھنا درکار ہوں تو پھر ان کی تقدیم و تاخیر میں غور و فکر سے کام لے اور بات کو پیچ در پیچ لکھنے اور مدعا کے اجزا کو ایک دوسرے میں گڈ مڈ کرنے سے اجتناب برتے ۔ عبارت میں مشکل الفاظ اور نامانوس استعارات وغیرہ ہر گز استعمال نہ کرے ۔ ہر موقع پر مکتوب الیہ کے رتبے کو ملحوظ رکھے ۔ جہاں تک ممکن ہو سکے بات کو طول دینے اور الفاظ کی تکرار سے بچے ۔ زیادہ تر اہل زمانہ کے مذاق کے مطابق بات کرے ۔ ان قواعد و قوانین سے جو ان لوگوں نے وضع کر رکھے ہیں ، باہر نہ نکلے ۔ مگر خوبیٔ زبان کے اندازہ کو دھیان میں رکھے ۔ اور اردو زبان بولنے والے 'فارسی نویسوں' کے تصرفات کے چکر میں پڑ کر اس عربی کی آمیزش والی فارسی (اصل فارسی) کو ضائع نہ کرے ۔ عربی الفاظ صرف ضرورت پڑنے پر استعمال کرے ۔ ہمیشہ سادگی و ندرت کو اپنا شعار بنائے ۔ مختلف قسم کے مکاتیب میں، خاص طور پر ان خطوط اور عرضیوں میں جو وہ حکام کو لکھے اور جو معاملات پر مشتمل ہوں ، مبالغہ و مشکل گوئی سے ہر صورت بچے اور مطلب کو اشاروں کنایوں میں گم نہ کرے ۔ جو کچھ کہنا مقصود ہو اسے نرمی و سنجیدگی سے اور آسان طریق پر بیان کرے ۔

واضح ہو کہ اہل زمانہ کے مراتب کے تین درجے ہیں : اعلیٰ ، اوسط[۲] اور ادنیٰ[۳] ۔ اعلیٰ مرتبہ وہ ہیں جو ہم سے بلند تر ہیں جیسے باپ آقا ، استاد اور مرشد وغیرہ ۔ اوسط[۲] درجے میں بھائی اور دوست آتے ہیں اور ادنیٰ[۳] میں بیٹے اور نوکر ۔ اگر ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ آگے چل کر ان تینوں درجوں کے بہت سے درجے ہیں ۔ (جنھیں یہاں

بیان کرنا مشکل ہے کیونکہ) شرط یہ ہے کہ جو کچھ بھی کہوں مختصر کہوں اور جلدی کہوں۔ (کلیات نثر غالب)

(۴)

واضح ہو کہ احباب کے درمیان مراسلت کئی قسم کی ہوتی ہے، یہاں ہم صرف چند ایک القاب لکھنے پر اکتفا کریں گے۔ القاب لکھتے وقت حفظ مراتب ملحوظ رہے اور وہی القاب لکھا جائے جو مکتوب الیہ کے مرتبے کے مناسب ہو۔ اور وہ یوں ہے کہ منشیوں کے نزدیک لفظ 'شفیق' 'مشفق' سے اور 'مشفق' 'مہربان' سے بڑھ کر اور 'کرم فرمائے مخلصاں' 'کرم فرمائے دوستاں' سے بہتر ہے۔ اس سلسلے میں راقم نے ایک داستان سنی تھی، اسے بعینہ یہاں قلم کی زبان سے دھراتا ہوں۔

کہتے ہیں قدیم زمانے میں راجا بھرت پور کی سرکار میں ایک بڑا صاحب ہوش و تمیز منشی تھا جو راجا صاحب کی طرف سے اطراف میں خط لکھتا اور فن انشا میں بڑے بلند بانگ دعوے کیا کرتا تھا۔ قضارا راجا اس سے ناراض ہو گیا، اور اس ناراضگی کے عالم میں اس نے مراسلت نگاری کی خدمت کسی اور کو سونپ دی۔ جس کے باعث معزول منشی مغموم و رنجیدہ رہنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ یہ سوچتا کہ کوئی موقع ہاتھ لگے تو اس نئے منشی کی کسی تحریر پر حرف گیری کرکے اسے راجا کی نظروں سے گرا دے۔ اتفاق سے ایک روز نیا منشی راجا کی طرف سے اس کے ایک نہایت عزیز دوست کو خط لکھ رہا تھا؛ جب اس نے آغاز میں القاب وغیرہ لکھے تو معزول منشی نے عجیب انداز میں ان القابات پر نگاہ ڈالی، سر کو جنبش دی اور مسکرا دیا۔ راجا نے سمجھ لیا کہ دال میں کچھ کالا ہے، لیکن اس وقت اس نے اس کا سبب پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ بعد میں جب محفل برخاست ہوگئی تو معزول منشی کو خلوت میں طلب کیا اور اس سے سر ہلانے کا سبب پوچھا۔ منشی نے تکریم و تعظیم بجا لانے کے بعد عرض کیا کہ ''ہم حضور کے پرانے پروردۂ نعمت اور بہی خواہ دولت ہیں؛ نئے آنے والوں کو بھلا کیونکر ہماری طرح پاس نمک یا رونق سلطنت سے لگاؤ ہوگا؟ خاص طور پر

یہ اہل قلم جو دہلی سے آئے ہوئے ہیں یہ تو بالکل حضور کی خیر خواہی کے طالب نہیں ہیں اور نہ یہ حق نمک ہی ادا کر پائیں گے۔ اس نئے منشی نے فلاں سردار کو ، جس کی تعظیم و دل جوئی میں حضور ہمیشہ پیش پیش رہتے اور اس کی دوستی کو مفید اور صلاح حال کا باعث جانتے ہیں ، 'مہربان' (چھوٹی 'ہ' سے) لکھا ہے ، حالانکہ یہ ناچیز ہمیشہ تعظیم کے طور پر 'محربان' (بڑی 'ح' سے) لکھتا رہا ہے۔ ظاہر ہے بڑی 'ح' کو چھوٹی 'ہ' میں بدل دینے سے اس کی تعظیم میں بڑا فرق آ جائے گا ، جس کے باعث وہ دل ہی دل میں آزردہ ہو گا ، اور اس کی یہ رنجش و آزردگی حضور کے لیے اچھی نہ ہوگی ۔'' راجا کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا ۔ فوراً نئے منشی کو طلب کیا اور اسے ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا ''تم کون ہو کہ ہمارے اس دوست کو 'مہربان' (چھوٹی 'ہ' کے ساتھ) لکھو جسے ہماری طرف سے ہمیشہ 'محربان' (بڑی 'ح' کے ساتھ) لکھا جاتا رہا ہے ۔ کیا تم ہمارے دوستوں کو ہمارا دشمن بنانا چاہتے ہو؟'' قصہ مختصر اس منشی کو چھٹی دے دی اور پہلے منشی کو بحال کر دیا ۔ فاعتبروا یا اولی‌الابصار ۔ (کلیات نثر غالب)

(۵)

سید احمد خاں[۱۳] کی کتاب آثارالصنادید[۱۴] پر تقریظ

جوادالدولہ سید احمد خاں بہادر عارف جنگ بڑے دانا دل ، صاحب ہنر، اعلیٰ کردار، کار آگاہ، مہر ورز ، کیں فراموش ، دشمن شیطان ، دوست یزداں اور فرزانۂ دوراں ہیں ۔ آپ نے اپنے قلم کو تحریر میں نام زندہ کرنے کا ایسا جادو عطا کیا ہے کہ اس نے گزشتہ ادوار کے فراموش شدہ ناموروں کو بھی زندگیٔ جاوید بخش دی ہے ۔ خویشی و خجستگی (سعادت) کو آپ کی خو سے بے حد نسبت ہے ۔ اور سعادت و خوش بختی کو آپ کے 'گوہر' (ذات) سے جو تعلق و یگانگت ہے وہ روشنی اور سورج کے تعلق سے بھی زیادہ آشکار و روشن ہے ۔ یوں تو سب کے ساتھ آپ کا حسن سلوک فرزانوں کا سا ہے (؟) لیکن خصوصاً میرے ساتھ آپ نے اس طرح پیمان الفت باندھ رکھا ہے جیسے ہم میں کوئی خونی رشتہ ہو ۔

سخن نے جو ہمیشہ اپنی فرسودگی و کہنگی پر خود ھی ھنسا کرتا تھا، آپ ایسے فاضل گرامی کے ھاتھوں جامۂ خسروی اور پیرایۂ نوی (نیا) حاصل کیا ۔ آپ ایسے بے مثل آزاد مرد اور کارگزار پر صدھا آفرین ھے کہ آپ نے اس مبارک کام (یعنی گزرے ھوئے لوگوں کے احوال و کردار کا بیان اور آنے والی نسلوں کی معلومات میں اضافہ کرنا) سے لا تعلق ھونے کے باوجود اس کا بیڑا اٹھایا اور اس میں اس طرح سخن آرائی کی کہ جہاں گزرے ھوئے لوگوں کو اپنا سپاس گزار بنایا وھاں آنے والوں سے آفرین کہلوائی ۔

اس حیرت افزا وقت میں (؟) کھدر پوش بوریا نشین غالب ، کہ اپنی موجودہ بے وقعت نمود کے ھوتے ھوئے بھی خود کو ایسا سمجھتا ھے جیسے وہ (اس دنیا میں) 'نہ آنے والوں' میں سے ھو، اور آئندہ . . . . . ظاھر ھے کہ وہ خود 'گزرے ھوئے لوگوں' میں سے ھوگا ، یقیناً اس عمدہ کتاب کے لیے (جو ایک رھبر ھے اور جس میں گذشتگاں کا تذکرہ ھے)، 'کردار پسندی' اور 'سپاس پذیری' میں رفتگاں کا ھم خیال اور 'کردار ستائی' و ''آفرین خوانی'' میں آیندگان (آنے والوں) کا ھمنوا ھے ۔ یوں سمجھو کہ اس بصیرت افروز کتاب کے آخر میں میری گفتار ، رفتگاں کے سننے کے لیے ''دیر تک ٹھہر اور جلدی آ'' کے آوازہ کا جواب اور آیندگاں کی نغمہ سرائی کے لیے ''جلدی آئیں اور دیر تک ٹھہریں'' کا زمزمہ ھے ۔

بے حد مسرت کا مقام ھے کہ تحریر سعادت و خوش اسلوبی سے انجام پذیر ھوئی اور قلم کو جنبش سے نجات ملی ۔ نہیں نہیں ! خوش بختی و سعادت پر تو اس وقت میرا ناز بجا ھو گا اور خاص مسرت و شادمانی اس وقت روا ھوگی جب روح شبگیرِ خیال میں روشنائی خرد (کہ فرہ ایزدی کی روشنی ھے) کی وساطت سے پندار وجود کے دشوار گزار ٹیلے کو درمیان سے کنارے تک طے کر لے اور مجھے اس شاھراہ سے میخانۂ نیستی کے دروازے پر پہنچا دے گی ۔ کاشکے اس میخانے کی مردافگن شراب (بادۂ تند) کے چند قطرے میرے جام سفالین میں ٹپکائے جائیں تا کہ

اس بادۂ روشن کی سیہ مستی میں کچھ لوگ خواہش و آرزو کی 'نمائش' کو بھی چھوڑ کیں (؟) - اور بے وقعت نمود سامنے سے اٹھ جائے - نہ سعادت تا دیر رہے نہ خوشی و مسرت کی کوئی جھلک ، اور نہ مستی کا کوئی نام رہے اور نہ ہستی کا کوئی نشان :

غالب بریدم ازهمه خواهم گزین سپس
کنجی گزینم و پرستم خدای را

(غالب میں سب سے کٹ گیا ہوں ؛ چاہتا ہوں کہ اس کے بعد گوشہ نشینی اختیار اور خدا کی عبادت شروع کروں -)

(کلیات نثر غالب)

(٦)

ولیم فریزر[۱۵] کے واقعے کے متعلق

شیخ امام بخش ناسخ[۱٦] کے نام (خط) :

حضرت سلامت !! محبت و یگانگت اور دوستی و الفت کی خوش بو سے معطر آپ کا گرامی نامہ ملا - چار ماہ سے راقم گوشہ نشینی اختیار اور اپنوں اور بیگانوں پر آمد و رفت کا دروازہ بند کیے ہوئے ہے - اگرچہ زندان میں نہیں ہوں لیکن زندگی زندانیوں ہی کی طرح بسر ہو رہی ہے - جس قدر آلام و مصائب میں نے اس تھوڑے سے عرصے میں جھیلے ہیں ، خدا شاہد ہے کہ سو سال تک جہنم کی عقوبت جھیلنے والا کافر بھی اس کا نصف نہیں برداشت کر سکتا - بہ قول عرفی :

از بوی تلخ سوخت دماغی امید و یاس
زهری که در پیالهٔ ما کرد روزگار

(زمانے نے جو زہر ہمارے پیالے میں ڈالا اس کی بوے تلخ سے امید و یاس کا دماغ جل کے رہ گیا -)

اپنے صبر و ثبات کا پہلا امتحان اس طرح لیا گیا کہ میرے دو قرض خواہوں نے انگریزی عدالت کے قانون کے مطابق میرے خلاف

ڈگری حاصل کر لی ۔ اس (ڈگری) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو ڈگری میں مرقوم رقم ادا کی جائے یا پھر قید و بند کو قبول کیا جائے ، اور اس سلسلے میں شاہ و گدا برابر ہیں ۔ البتہ معزز و نام آور لوگوں کے لیے اتنی رعایت ہوتی ہے کہ عدالت کا پیادہ ان کے گھر نہیں جا سکتا اور جب تک وہ سر راہ نہ ملیں انھیں گرفتار نہیں کیا جاتا ۔ چوں کہ (قرض کی) رقم ادا کرنے کی گنجائش نہ تھی ، اس لیے پاس آبرو کی خاطر خود کو گھر میں مقید اور نشاط سواری کو ترک کیا ۔ چناں چہ آج تک اپنے وامانده پاؤں اور اقامت گزین دل پر وہی خودداری کی زنجیر پڑی ہوئی ہے ۔ اسی گوشہ نشینی و تنگ دلی کے دوران میں ، ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کسی ظالم و ستم گر نے کہ وہ عذاب ابدی میں مبتلا رہے ، ولیم فریزر صاحب بہادر کو ، جو دھلی کے ریذیڈنٹ اور مجھ غالب مغلوب کے مربی تھے ، تاریک رات میں گولی کا نشانہ بنا دیا ، جس کے سبب مجھے والد کی وفات کا غم تازہ ہو گیا ؛ دل کی بری حالت ہوئی اور بے پناہ اندوہ و غم نے آن گھیرا ؛ آرام و سکون کا خرمن بالکل جل کے رہ گیا ۔ اور اُمید کا نقش پورے طور پر ضمیر کے صفحے سے دھل گیا ۔ اتفاق سے کھوجیوں کے بتائے ہوئے نشانات کے مطابق ، جو غلط نہ تھے ، والیٔ فیروزپور (جھرکہ) کے ایک ملازم سوار کو اس ستودہ خصال حاکم کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا ۔

جب یہ حادثہ رونما ہوا تو شہر کے مجسٹریٹ صاحب بہادر نے ، جس سے میرے پرانے تعلقات اور دوستانہ مراسم تھے ، اور اس گوشہ نشینی کے دوران مَیں کبھی کبھی الوؤں کی مانند رات کے وقت اس کے یہاں جایا اور چند لمحے ہنسی خوشی میں گزارا کرتا تھا ، اس کی تفتیش کے لیے مجھے اپنے ساتھ شریک کر لیا ۔ آخر والئی فیروز پور کو مجرم قرار دے دیا گیا ۔ وہ اپنے چند خواص کے ساتھ گرفتار ہوا اور پولیس اس کی جاگیر میں متعین ہوئی ۔ چوں کہ میرے اور اس (والیٔ فیروزپور) کے تعلقات اچھے نہ تھے اور لوگ اس امر سے بہ خوبی آگاہ تھے ، اس لیے سب (لوگ) مجھ سے اُلجھ پڑے اور اس حاکم کش کافر نعمت کی

گرفتاری کا ذمہ دار مجھے ٹھہرایا ۔ یعنی دھلی کے خاص و عام میں یہ چرچا ہو رہا ہے کہ ''شمس الدین خاں[۱۷] بے گناہ ہے ؛ فتح اللہ بیگ خاں[۱۸] اور اسد اللہ خاں (غالب) نے ذاتی عناد کے سبب دروغ گوئی سے کام لیا اور حکام کو گمراہ کیا ہے ، اور اس طرح اس بے چارے کو مصیبت میں پھنسایا ہے ۔'' مزے کی بات تو یہ ہے کہ خود فتح اللہ بیگ خاں والئی فیروز پور کا چچا زاد بھائی ہے ۔

قصہ مختصر! معاملہ یہاں تک پہنچا کہ دھلی کے یاوہ گو ہر گھڑی مجھ پر نفرین بھیجنے لگے ۔ اگرچہ شروع میں صرف یہی تھا کہ دل ولیم فریزر بہادر کی موت پر کڑھتا تھا ، لیکن اب قابل مشخص (؟) بھی ہوا اور شہر کے بد گمان لوگوں نے بھی مجھے ملول و عاجز کیا ۔ اس ستم گروں کے مٹانے والے اور مظلوموں کے فریاد رس خدا سے صبح کی دعا میں یہ التجا کرتا ہوں کہ یہ بے شرم اور کم بخت (والئی فیروزپور) جلد تر کیفر کردار کو اور پایۂ دار پر پہنچے—اور یہ مجھے معلوم ہے کہ ھمت میری ظفریاب اور دعا میری مستجاب ہے ۔

کل بروز سوموار سترہ صفر، الٰہ آباد کا ایک حاکم یہاں پہنچا ہے۔ نواب گورنر جنرل بہادر نے اسے اس بات پر مامور کیا ہے کہ وہ حکام دھلی کے خلاصۂ تحقیقات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرے اور جرم ثابت ہونے کے بعد سزا درجہ بہ درجہ مقرر کرکے معاملے کو نپٹائے ۔ اور ظاہر ہے کہ اس ھنگامے کے ختم ہونے میں ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگے گا ۔

یہ تھا اس جواب کا خلاصہ جس کا تعلق ملازموں کے سوال سے تھا ، جو کچھ میرے خط کے جواب کے متعلق سبحان علی خاں کی گوھر فشاں زبان سے رقم پذیر ہوا ہے وہ ٹھیک نہیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خان والا شان گمناموں کی طرف متوجہ نہ ہوئے اور انھوں نے اپنے 'تنگ مایہ' خاکساروں پر نظر التفات نہ کی (؟) ورنہ ذرا غور کرنے پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ میرا ،قصد صرف یہ تھا کہ قطعہ بادشاہ فلک جاہ کے بندگان کی نظر سے گزرے اور میری خاکساری

و بے اعتباری کے بارے میں کچھ کہا جائے ۔ اور یہ سب کچھ اتنا مشکل تو نہ تھا ۔ سبحان اللہ والحمد للہ !

حریف منت احباب نیستم غـالب
خوشم کہ کارمن از سعئی چارہ گرگزرد

(غالب میں احباب کے احسان کا حریف نہیں ہوں ۔ میں خوش ہوں کہ میرا معاملہ چارہ‌گر کی سعی سے باہر ہے ۔)

(کلیات نثر غالب)

مولوی حمیدالدین خاں بہادر

[بنگال کے فضلاء میں سے تھے ۔ احادیث الخوانین یا تاریخ حمید کے مصنف ہیں ۔ ''جس میں چٹاگانوں کے تاریخی حالات ہیں ۔ یہ کتاب ۱۸۷۱ع میں کلکتے سے طبع ہوئی ۔'' ذیل کے اقتباسات اسی کتاب سے لیے گئے ہیں ۔]

دور حاضر کے لوگ

پرانے لوگوں کے اکثر آثار سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ادوار گذشتہ میں اگر کسی کے پاس دولت آ جاتی تو وہ نیک لوگوں کی تربیت اور صحبت کے اثر کے سبب اسے نیک اور خیراتی کاموں مثلاً پل، مسجد اور حوض وغیرہ کی تعمیر پر صرف کرتا اور اس طرح اپنے لیے سامان آخرت بہم پہنچاتا اور اسی کی برکت سے نیک نامی و نیک سیرتی وغیرہ میں شہرت حاصل کرتا ۔ لیکن آج یہ زمانہ آن لگا ہے کہ اگر کسی کو دولت ہاتھ لگتی ہے تو وہ کچھ تو اس زمانۂ آخریں کی خاصیت کے سبب اور کچھ یار دوستوں کی بری صحبتوں کے باعث اسے یا تو رقص و سرود کی محفلوں میں یا پھر گلچھرے اڑانے، قسم قسم کا لباس پہننے، پینے اور پلانے، سامان زر و زیور اور آرائش خانہ وغیرہ میں اڑا دیتا ہے، جس کے باعث روز قیامت اس کا حشر جانوروں کا سا ہوگا ۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ ایسا شخص جلد ہی فاقہ کشی و عسرت کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے رسوائی و بد نامی سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے اور تھوڑی ہی مدت میں اس کا برا انجام ہوتا ہے ؟

(احادیث الخوانین)

اس زمانے کے اُستاد

اس دور کے بیشتر استادوں (پیروں) کی طبیعت میں انقلاب زمانہ کے باعث جہل و غرور اور نادانی بلکہ بدعت و شرک اور بے ایمانی ایسی برائیاں راہ پا گئی ھیں۔ ان میں پہلے جیسے فضائل کا فقدان ھے۔ اور پیری کی علامتوں میں سے صرف یہ کچھ باقی رہ گئی ھیں کہ وہ اپنے سر اور کندھوں پر بوجھ نہیں اٹھاتے، اپنے ھاتھوں سے ھل نہیں چلاتے اور پاجامے کے کونے کو پچھلی طرف نہیں رکھتے۔ اور چونکہ انھیں شروع سے حرفت و زراعت اور تجارت کی عادت اور محنت و مشقت کی تاب نہیں ھوتی اور یونہی بیکاری میں وقت گزارتے ھیں، اس لیے لذات و شہوات کے حصول کی خاطر مختلف حیلوں وسیلوں سے کام لیتے اور مکر و بداندیشی کی راہ اختیار کرتے ھیں۔ اس دور کے پیروں کا زیادہ تر پیشہ مسئلہ گوئی، بد خواھی، قرآن فروشی اور جادو ٹونا ھے۔ علاوہ ازیں بے حیائی، حسد، خصومت اور سنگ دلی جیسے امراض بھی ان میں پیدا ھو چکے ھیں۔ اس سے پیشتر جب تیرہ، روشن آباد، بھلوہ اور جکدیہ کے نواح کے اکثر لوگ جاھل و سادہ دل اور جہل بسیط کا شکار تھے، تو یہ عیار اُستاد وھاں جاکر ان بے چاروں کو زیادہ تر گم راھی و ضلالت اور تباھی و فساد ھی کی طرف لے جاتے۔ چناں چہ جانور کے ذبیحے کو اپنی موجودگی کے بغیر ناجائز قرار دیتے اور یہ کہتے کہ یہ کام پیروں کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ از راہ فریب چھری یا خنجر وغیرہ پر کچھ پڑھ کر پھونکتے اور سادہ لوح عوام کو دے دیتے، اور (عوام) اس چھری کے علاوہ کسی اور چھری وغیرہ سے ذبیحے کو جائز نہ سمجھتے۔ ان پیروں میں بعض ایسے بھی ھوتے جو اپنی غیر موجودگی میں نماز باجماعت، امامت، خطبہ اور عیدین کی نمازوں کی اجازت نہ دیتے۔ اور پیچ دار نے کی نلکی میں فاتحہ پڑھ کر پھونکتے اور اس کے منہ کو بند کرکے ان جاھلوں کو دے دیتے کہ پیر صاحب کی غیر موجودگی میں اسے عیدوں اور دوسری تقریبات وغیرہ کے کھانوں پر کھول کر پھیر دیا کریں۔

اس کے بغیر کھانا کھانے کو جائز نہ قرار دیتے ۔ اور اسی طرح کی بے شمار دوسری بیہودگیاں سادہ لوح عوام کو سکھاتے ۔

بہر حال خدا کے فضل اور حاجی و غازی ، زاهد و عالم ، فاضل اور عابد و مجاهد ، مولانا امام الدین مرحوم اور بہت بڑے پرهیزگار ، زبدۂ اصفیا ، غازی ، حاجی ، فاضل ، عامل اور زاهد حضرت پیر و مرشد صوفی نور محمد رحمۃاللہ علیہ اور ان کے پیروکاروں کی هدایت و برکت سے اس قسم کی تمام بیہودہ رسمیں اس علاقے سے ختم هوگئیں اور لوگ علم و عمل کے زیور سے آراستہ هو گئے ۔ اور اب یہ عالم ہے کہ اس جگہ کسی کا بے نماز هونا تو ایک طرف ، جاهل سے جاهل آدمی بھی نماز قضا کرنے کا روادار نہیں هوتا ۔ چناں چہ جب نماز کا وقت هوتا هے تو لوگ خواہ کتنا هی ضروری کام کیوں نہ کر رهے هوں فوراً چھوڑ چھاڑ کر نماز میں مشغول هو جاتے هیں ۔ یہاں تک کہ بھیڑ کے موقع پر بھی اپنی خرید و فروخت کی اشیاء کھلی هی چھوڑ کر ذکر خداوندی کے لیے نماز میں کھڑے هو جاتے اور آیۂ کریمہ ''لاتلهیہم تجارة ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوۃ[١]'' کے معنی کا مظہر بنتے هیں ۔ اور خدا تعالیٰ کی طرف سے کیے گئے وعدۂ صادق ''لیجزیہم اللہ احسن ما عملوا ویزیدهم من فضلہ ، واللہ یرزق من یشاء بغیر حساب[٢]'' سے پہنچنے والے نفع کے حصول کی خاطر کوشش و سعی کرتے هیں ۔ یہاں کے اکثر جاهل بھی مسائل صوم و صلواۃ اور دوسرے امور خیر وغیرہ سے بہ خوبی آگاہ هیں ۔ والحمد للہ علیٰ ذالک وهواعلم ۔

(احادیث الخوانین)

همارے دور کے دولت مند

آج کے بیشتر ثروت مند اٹھنے بیٹھنے ، کھانے پینے اور کلمہ کلام کے آداب سے نا واقف هیں ۔ ان کی محفلیں اصحاب علم و دانش اور ارباب هوش و بصیرت کے لیے مقام خندہ اور جائے عبرت هیں ۔ یعنی کوئی پاؤں دراز کیے هوئے هے تو کوئی هاتھ اٹھائے هوئے ؛ کوئی تکیے کے دونوں جانب پاؤں لٹکائے اس پر اس طرح بیٹھا هے جیسے گھوڑے پر سوار هو ؛

ایک اٹھ کر ادھر آدھر خراماں خراماں چل رہا ہے تو دوسرا مزے سے ٹہل رہا ہے ۔ کسی نے انگریزی طرز کی قمیض پہن رکھی ہے ، تو کسی نے عجیب وضع قطع کی قبا اوڑھی ہوئی ہے ۔ ایک صاحب دوسرے کو گالی دے کر یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے لطیفہ کہا ہے ؛ کوئی کسی کی مکوں اور لاتوں سے خاطر کرکے یہ خیال کرتا ہے کہ یہ بھی از قسم ظرافت ہے ۔ ان کا ایک گروہ آپس میں ہاتھا پائی کر رہا ہے تو دوسرا باہم گتھم گتھا ہو رہا ہے ۔ کچھ ان میں کے بظاہر دوست نظر آتے ہیں لیکن باطن میں دشمن ہیں ، پیٹھ پیچھے صلواتیں سنانے والے اور عیب جو ہیں ۔ ان کی باتیں سراسر لاف و گزاف سے پر اور ان کے تمام قول اقوال جھوٹ اور مکر پر مبنی ہیں ۔ یہ لوگ وعدہ خلافی اور فریب کو تدبیر و مآل اندیشی سمجھتے اور خیانت و طیش کو معیشت روزگار کا ذریعہ جانتے ہیں ۔ پھر کچھ ایسے خطا کار اور غلط قسم کے لوگ بھی ہیں جو علم کو فضول اور متاع خرد کو فاسد جانتے ہوئے تعلیم و تعلم کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور اسے روزی کمانے کا وسیلہ بلکہ حماقت شعار بےوقوفوں کا حیلۂ مکر و فریب خیال کرتے ہیں ۔

(احادیث الخوانین)

علاول۔ بنگالی زبان کا شاعر

دکھن کول کے اکثر مسلمان 'رخنگی' کہلاتے ہیں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ فتوحات اسلامی سے پیشتر 'رخنگ' میں جا کر اقامت گزیں ہو گئے اور عہد فتح شاہ[۳] کے بعد وہاں سے نکل آئے تھے ۔ یا پھر فتح شاہ اور نصرت شاہ[۳] بادشاہ کے بعد دوبارہ قوم 'مگہ' کی رعایا بن کر ان میں گھل مل گئے تھے ۔ بہر حال پہلا خیال زیادہ قرین قیاس ہے ۔ واللہ‌اعلم ۔ مانگن نامی وزیر اور علاول — جو بنگلہ کی ایک شاخ گوڑی کا شاعر ، مذکورہ وزیر کا ہمدم و ندیم اور قصص و داستان کی کئی ایک کتب کا مصنف تھا جو زبان گوڑی اور بنگالی اشعار میں تھیں اور فصاحت و بلاغت کے سبب خاصی شہرت کی حامل — انہی رخنگیوں میں سے تھے ۔

علاول کی بنگلہ تصانیف سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ نصرت شاہ کے بعد (فتح عالمگیری سے پیشتر) انتشار اور افراتفری کے دنوں میں جب رخنگ کے 'مگھوں' نے چاٹگام پر تسلط جما لیا اور اُس کے باپ کو چند حرامی سواران سپاہ نے قتل کر دیا تھا تو وہ فتح آباد کے مقام سے (جو اس وقت چاٹگام کا مستقر تھا) رخنگ آ کر مقیم ہو گیا تھا جہاں وہ مانکن وزیر اور مجلس قطب جیسے ملت اسلامیہ کے بعض رؤسا کے توسل سے، جو بڑا جاہ و دبدبہ اور مال و دولت رکھتے تھے، اپنی فصاحت و بلاغت سے پر بنگلہ تصانیف کو ان (مگھوں) کے نام معنون اور عزت کی زندگی بسر کرتا رہا۔ لیکن چوں کہ وہ شاہ شجاع کے ہم راہیوں میں سے تھا، اس لیے ایک موقع پر کسی نے راجا کے پاس اس کی چغلی کھائی جس کے سبب راجا اس سے متنفر ہوگیا اور اسے ایک عرصے تک، زمین اور مال و دولت ضبط ہو جانے کے باعث، بڑی پریشانی اور ذلت و خواری کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر مذکورہ چغل خور اپنے برے اعمال کی پاداش میں بڑی خواری سے جہنم رسید ہوا اور ''لا یحیق المکر السیی الا باھلہ[5]'' کا مصداق بنا، اور علاول نے اپنے علم و فضل کی بدولت اور امرائے مذکور کی وساطت سے دوبارہ عزت و منزلت حاصل کر لی۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جب شاہ زادہ شجاع ابن شاہ جہاں، عالم گیر علیہ الرحمۃ کے سپہ سالار میر جملہ[6] نواب معظم خان خاناں کے ہاتھوں شکست کھا کر فرار ہوا اور رخنگ پہنچا ہے تو اس وقت علاول وہاں موجود تھا، واللہ اعلم۔ کہتے ہیں کہ فتح آباد میں ابھی تک ایک بہت بڑا تالاب 'دیگھی علاول' کے نام سے اور ایک اور دیگھی (تالاب) مجلس قطب کے نام سے بے حد مشہور ہیں۔

علاول مذکور بنگال کے گوڑی زبان کے شعرا میں سب سے زیادہ فصیح اور نغزگو شاعر تھا۔ کئی تصانیف اس سے یادگار ہیں۔ اس نے نظامی رح کی مثنویات سکندر نامہ اور ہفت پیکر کو لفظ بہ لفظ بنگلہ شعر کے روپ میں ڈھالا؛ کئی ایک قصے اور داستانیں لکھیں جو ہندوؤں کی بعض مشہور خرافات پر مشتمل تھیں اور جن میں فصاحت و بلاغت کے خوب خوب جوہر دکھائے تھے۔ ان داستانوں میں اس نے بڑی آزادہ روی

اور بے پروائی کا مظاہرہ کیا ہے - بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ فارسی میں بھی شعر کہا کرتا تھا - چناں چہ یہ بات اس کی تشبیہات ، اس کے طرز گفتار اور اشتراک مضامین سے بھی ظاہر ہوتی ہے - لیکن میری نظر سے اس کے فارسی اشعار نہیں گزرے - شاید اس وقت کے فارسی‌جاننے والوں کی قلت کے سبب محفوظ نہیں رہے اور نہ قید تحریر ہی میں آئے - واللہ اعلم - (احادیث الخوانین)

سید احمد خاں

[سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ع–۱۸۹۸ع) علی گڑھ تحریک کے علمبردار تھے ۔ پاک و ہند کے مسلمانوں میں تعلیمی اور معاشرتی بیداری پیدا کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے ۔ یہ بیداری اردو ادب میں مغربی اثرات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی ۔ کئی اردو کتابوں کے مصنف تھے ۔ فارسی کی بعض اہم کتابیں مثلاً توزک جہانگیری ، آئین اکبری اور برنی کی تاریخ فیروز شاہی انھوں نے ایڈٹ کیں]

حاجی سید محی الدین خان رضوی کے نام مکتوب

محبی و مکرمی ! آپ کا گرامی نامہ تحیر و حیرانی کا باعث ہوا ۔ کئی بار اسے پڑھا ۔ خود مکتوب اپنے لکھنے والے کی عظمت و بزرگی کا پتا دے رہا تھا ۔ حیرانی اس بات پر تھی کہ اس کا مخاطب کون ہے ؟ پہلے تو غلطی میں خود کو (اس کا مخاطب) سمجھا لیکن پھر خیال آیا کہ جو اس میں مرقوم ہے وہ مجھ ایسے گناہ گار ، حقیر پر تقصیر ، کم ترین اور 'گم کردہ راہ' کے بارے میں نہیں ہو سکتا ۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ نے اپنے کسی خیالی شخص کو یا خود اپنے اوصاف کو مخاطب کیا ہو ۔ اس کے علاوہ میں کوئی دوسری بات نہیں سوچ سکتا ۔ اور اگر اس سے ذرا فروتر آؤں اور خود کو مخاطب سمجھوں تو یہ جبھی ممکن ہو سکتا ہے کہ میں 'وحدت وجود' کا مذہب اختیار کروں ۔ یعنی 'میں' کہ خود اپنا حجاب ہوں ، درمیان سے اٹھ جاؤں اور 'من و تو' اور 'تو و من' کا فرق مٹ جائے اور جو کچھ بھی لکھا جائے اس کے مصداق خود آپ ہوں ۔

"تو خود حجاب خودی احمد از میان برخیز"
(تو اپنا حجاب آپ ہے احمد درمیان سے اٹھ جا)

یہ آپ نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ 'رضویت' 'یک گوہری' کا ذریعہ ہے، 'یک جہتی' کا وسیلہ نہیں۔ مگر الحمد للہ کہ ہمارے اور آپ کے معاملے میں یک گوہری اور یک جہتی دونوں طے شدہ ہیں۔ گو آپ کے ساتھ میری یہ نسبتیں آپ کے لیے باعث ننگ و عار ہیں اور میرے لیے سبب عز و افتخار۔ خدا جانتا ہے کہ میں 'محبت پیشہ' ہوں اور قدرت کی طرف سے مجھے صرف محبت ہی کی دولت عطا ہوئی ہے۔ آپ کے الطاف و عنایات کا تہ دل سے شکر گذار اور اس الفت و محبت کا بے حد ممنون ہوں۔

بورڈنگ ہاؤس کی تعمیر کے لیے آپ نے جو ڈیڑھ ہزار روپیہ ارسال فرمایا تھا، مل گیا ہے۔ یہ خطیر رقم قوم کی عزت افزائی اور میرے دل کی تقویت کا باعث بنی، اور اس سے ہماری سعی و کوشش میں اور بھی اضافہ ہوا۔ اس ناسپاس قوم کی طرف سے آپ ایسوں کا شکریہ کار دشوار ہے، ہاں 'اجرکم علی اللہ' ہی اس کا صلۂ کافی ہو سکتا ہے۔ اس عطیے کے لیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ایک دن ایسا آئے گا (اور وہ دور نہیں) جب پوری قوم اور آئندہ نسلیں آپ ایسے بزرگوں کی شکرگذاری میں ہر گھڑی رطب اللسان رہا کریں گی کہ جنھوں نے قوم کی اصلاح و فلاح کی خاطر تن من دھن کی بازی لگا دی۔

یہ جو آپ نے میرے حال زار پر اپنے دلی رنج و افسوس اور حسرت کا اظہار کیا ہے تو یہ آپ ایسے مخدوم کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ دلی رنج و تاسف اور حسرت کا کوئی موقع نہیں ہے کہ :

حسن شہرت، عشق رسوائی تقاضا می کند
جرم معشوق و گناہ عاشق بیچارہ نیست؟

اگر ہماری قوم صاحب بصیرت اور عاقبت اندیش ہوتی تو پھر ہمیں اور آپ کو اس کوشش و سعی کی ضرورت در پیش نہ آتی۔ اب جب

صورت حال یہ ہے تو اس قوم سے سوائے بدگوئی و افتراپردازی اور
نادانی کے، اور ہم سے صبر اور تسلیم و رضا کے سوا اور کس بات کی
توقع ممکن ہے ؟......... میں انصاف کو ہاتھ سے نہیں دیتا اور میرے
نزدیک کسی سے بدظن ہونا اچھا نہیں - سچی بات یہ ہے کہ میرے
'دشمن نما' دوست برے نہیں ہیں - وہ بھی حق بہ جانب ہیں کیوں کہ
وہ ایسی بات سن اور ایسی راہ دیکھ رہے ہیں جو انھوں نے اپنے اسلاف
سے نہ کبھی سنی اور نہ دیکھی تھی - ہماری دیرینہ غلط باتیں رفتہ رفتہ
آیات قرآنی کا سا استحکام حاصل کرچکی بلکہ ان سے بھی زیادہ مستحکم
ہو چکی ہیں - لہٰذا جو بھی شخص اس قسم کی غلطیوں کو آشکار کرتا ہے
وہ ان لوگوں کے غیظ و غضب اور سب و شتم سے کیوں کر محفوظ و
مصئون رہ سکتا ہے ؟ یہ لوگ دوسری قوموں کے ان مناقشات سے آگاہ نہیں
ہیں کہ جنھیں ہماری ان دیرینہ غلطیوں پر منطبق کرکے اسلام سے
نسبت دی جاتی ہے - اور نہ ان مشکلات ہی سے واقف ہیں جو جدید
علوم اور تحقیقات حدیثہ کے اعتبار سے ہمارے قدیم محدثوں ، مفسروں اور
فقیہوں کے مقرر کردہ اصولوں پر ، نہ اصلِ اسلام پر ، واقع ہوتی ہیں -
انھوں نے اور ان کے اسلاف نے اپنی باتوں کے جواب میں 'آمنا و صدقنا'
کے سوا اور کوئی بات ہی نہیں سنی ہے - عباسی خلفاء کے زمانے میں
یونانی فلسفے کے تراجم کے باعث کچھ خلفشار پیدا ہوا تھا جس کے
سبب علما اسلام کی مدافعت میں اٹھے تھے لیکن تعجب کی بات یہ ہے
کہ وہ لوگ خود ہی معترض تھے اور خود ہی جواب دینے والے،
ان کی مخالفت میں کوئی نہ تھا - چناں چہ انھوں نے خود ہی کہا اور
خود ہی سنا - اس پر بھی وہ یہ سمجھے کہ "ہم نے فتح پائی ہے -"
میں یہ مان لیتا ہوں کہ انھوں نے فتح پائی - لیکن اب نہ وہ
مدعی رہے اور نہ وہ دعویٰ ——— نہ وہ جام رہا نہ وہ ساقی ، وہ شراب
نہیں رہی وہ مینا ٹوٹ چکی ——— خود وہ فلسفہ بے جان ہو چکا ہے ،
یعنی وہ جام و مینا ٹوٹ چکے ، اب تو نئی بنیاد پر نئی عمارت کھڑی
ہو چکی ہے - سو جو شخص اسلام کا دعوے دار بنتا ، اسے سچا مذہب
جانتا اور اس میں کسی قسم کی بھی غلط بات کو ناممکن سمجھتا ہے وہ

ایسی غلط باتوں کو کیوں کر باور کرے اوراسلام اور اہل اسلام کو کس طرح*رسوا ہوتا دیکھے؟ اس وجہ سے ایسا شخص ان باتوں کے انکار میں اور وہ لوگ اس (شخص) کی تکفیر میں معذور ہیں۔ اور یہ ایک ایسا امر ہے جو انسانی فطرت کو اس پر مجبور کرتا ہے۔ اس بنا پر ہمارے لیے یہ لازم ہے کہ ہم تمام لعن طعن کرنے اور کفر کا فتویٰ لگانے والوں کو مجبور سمجھیں اور ان کی دشنام طرازی سے رنجیدہ نہ ہوں۔ صدق و صفا کا پیشہ اختیار کریں اور سب کو معاف کر دیں تاکہ وہ آخرت کے مواخذہ اور اس وحدہٗ لاشریک کی گرفت سے بھی محفوظ رہیں۔ جہاں تک مدرسة العلوم کی، کہ جس میں قوم کی فلاح و بہبود مضمر ہے، مخالفت کا تعلق ہے تو اس معاملے میں عفو و درگزر میرے بس میں نہیں*، کیوں کہ حقوق عباد ان لوگوں کی گردن پر ہیں لہٰذا وہ جانیں اور ان کا خدا۔ ''قل کفی باللہ بینی و بینکم شہیدا یعلم ما فی السموات والارض والذین آمنو بالباطل و کفروا باللہ اولئک ہم الخسرون۲۔'' والسلام علیکم و رحمة اللہ و برکاتہ۔

علی گڑھ:	حقیر و ناچیز
۱۳ اگست ۱۸۸۱ع	سید احمد

تمت المتن بالخیر

---

* یہاں عبارت غیر واضح ہے غالباً کچھ الفاظ چھوٹ گئے ہیں۔

تعلیقات و حواشی

جزو اول

دورۂ سلاطین

میثاق برهمنا باد (ص ۳)

۱۔ اس عبارت کا ترجمہ 'چچ نامہ' کے اردو مترجم محمد حفیظ الرحمان حفیظ بہاول پوری نے یوں کیا ہے: ''لیکن باقی لوگ اپنے مذہب کو بچانے کے لیے بھاگ گئے، ان کے گھوڑے، خانگی سامان اور دوسرا مال ان سے لے لیا گیا۔'' (صفحہ ۲۱۴)۔ مذکورہ ترجمہ چچ نامہ کے انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے جو مرزا قلیچ بیگ نے کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے انگریزی کے مترجم نے لفظ 'گزید' جس کے معنی جزیہ اور ٹیکس کے ہیں، 'گریز' بہ معنی فرار پڑھا، اور اس طرح بقیہ عبارت کا بھی حلیہ بگاڑ دیا۔

۲۔ اردو 'چچ نامہ' میں اس عبارت کا ترجمہ یوں ہے: ''اس کے بعد برہمنوں نے تجار اور دوسرے کافروں اور ٹھاکروں سے اپنا معمول لیا اور انھوں نے اپنے بتوں کی آزادی کے ساتھ پوجا کی۔ اس طرح سے وہ خوشی کی زندگی بسر کرنے لگے، لیکن مندروں کے پجاری غریب اور محتاج ہوگئے۔'' (صفحہ ۲۱۸)، جو غلط ہے۔

۳۔ اس کا تلفظ الرور بھی ہے اور الور بھی (لیکن وہ الور نہیں جو بھارت میں واقع ہے)۔ اس جگہ کے کھنڈر بہ قول صاحب تاریخ مسلمانان پاکستان و بھارت روہڑی کے جنوب میں موجود ہیں (صفحہ ۸۹)۔ اور بہ قول ڈاکٹر داؤد پوتہ مرحوم مرتب 'چچ نامہ' یہ جگہ موجودہ حیدرآباد سندھ میں واقع تھی۔

۴۔ حفیظ (صفحہ ۲۲۰) ''اور اس میں اناج جمع کرسکتے ہیں اور اس اناج کو جس مصرف میں لانا چاہیں لا سکتے ہیں۔''

۵- ایضاً (صفحہ ۲۲۱) ''اور ان کے معاملات کو اسی طریقے سے مستقل طور پر طے کر دیا جس طرح یہودیوں، آتش پرستوں اور عراق و سیریا کے مجوسیوں کے بارے میں کیا گیا تھا۔''

علی ہجویری لاہور (ص ۱۱)

۱- آپ جلابی، ثم ہجویری اور ثم لاہوری تھے۔

۲- اگر یہاں 'خواص حضرت حق' ہو تو اس کے معنی 'خدا کے خاص بندے' ہوں گے۔

۳- طارق صاحب کے یہاں اس عربی شعر کا ترجمہ اس طرح ہے: ''نجات دی اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان لوگوں کو جو دنیا سے انس و محبت رکھنے والے ہیں۔ پس ہر دوری کا ارادہ رکھنے والا (خواہشات کو بڑھانے والا) یہاں عذاب دیا گیا ہے'' (صفحہ ۱۴)۔ معلوم ہوتا ہے ان کے زیر نظر نسخے میں مذکورہ شعر کسی اور شکل میں ہے۔

۴- طارق صاحب کے یہاں کچھ اور ہی عبارت آ گئی ہے جو غالباً متن میں اختلاف کے سبب ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۳ کے آخر اور صفحہ ۳۱۴ کے شروع کی سطور۔

۵- یعنی مجرد لوگ عبادت و ریاضت میں تم سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تم بھی اس میں زیادہ سے زیادہ کوشش کرو۔

۶- بعض جگہ خفیف الحاد اور خفیف الحاذ بھی لکھا ہے۔

۷- ایرانی نسخہ میں 'وحبہا' کی بجائے 'و الجہاد' ہے۔ اس صورت میں ترجمہ ہوگا 'ایک فقر اور دوسرا جہاد'۔

۸- ہاروت و ماروت کی طرف اشارہ ہے۔

۹- نسخۂ دیگر میں استقلال ہے۔

سدید الدین محمد عوفی (ص ۱۸)

۱- فتح نامے میں مسعود تین سال محبوس رہا۔ اس کا ذکر ایک

جگہ اس نے یوں کیا ہے :

هفت سالم بکوفت سوو دهک ۔ پس از آنم سه سال قدمهٔ تای
(ملاحظہ هو تاریخ ادبیات در ایران جلد ۲ صفحه ۷۸۳
از دکتر ذبیح الله صفا) ۔

۲۔ لاهور

۳۔ ترجمہ اشعار :

(۱) ثقة الملک جب کرسی وزارت پر بیٹھا تو زمانہ اس کی خدمت میں بہ‌رضا و رغبت کھڑا هوگیا ۔

(۲) جب اس نے مبارک دوات سامنے رکھی تو آسمان نے اس کے 'الف' کو 'ت' سے ملا دیا ۔

(۳) جب اس مبارک هاتھوں والے نے اسے گھسا تو دشمن کا دکھ دوست کا مداوا بن گیا ۔

(۴) اب تم ایک نئی عجیب بات دیکھو کہ اس میں لفظ 'درد و دارو' دونوں هیں ۔

۴۔ ترجمہ اشعار :

(۱) دنیا کے احوال کو فانی سمجھو ، اور میری یہ بات یاد رکھو۔

(۲) جب اس دنیا کی فطرت هی الٹی هے تو اس کے سارے کام بھی الٹے هی هوں گے ۔

(۳) معزز لوگ تو خوار هیں اور جو ذلیل هیں انھیں عروج حاصل هے ۔

(۴، ۵) انسان کے چشم و گوش اس (دنیا) کے حوض و بیابان میں پانی اور هوا کو دیکھ اور سن کر متحیر هوتے هیں کہ (یہ عجیب بات هے کہ) دیوانۂ شوریدہ تو هوا هے لیکن زنجیر پانی کو ڈالی جاتی هے ۔ (هوا کے تیز چلنے کو شوریدگی اور پانی کی موجوں کو زنجیر سے تشبیہ دی هے) ۔

۵- ترجمہ اشعار :

(۱) جب میں اپنے اشعار کا دفتر ظاہر کرتا ہوں (کھولتا ہوں) تو پہلے میں دیوان کے آغاز میں تیرا نام پاتا ہوں ۔

(۲) اے نام آور (ممدوح) یہ مناسب ہے؟ کہ تو میرا نام فراموشی کی بیاض میں غفلت کے قلم سے لکھے ۔

(۳) میری طبع کو گراں اور میرے ہنر کو سبک نہ کر کہ میں طبع گراں کے ساتھ سبک سایہ نہیں ہوں ۔

(۴،۵،۶) جب تک اس دنیا میں جوہر ، عرض سے اور عناصر اربعہ (آگ ، مٹی ، پانی ، ہوا) رنگوں سے خالی نہیں ہوتے اور جب تک آسمان کی طرف سے سات ستاروں (مشتری ، شمس ، قمر ، زہرہ ، عطارد ، مریخ ، زحل) میں ، حواس خمسہ میں اور چار ارکان (اربعہ عناصر) میں اچھی اور بری دو حالتیں پیدا ہوتی رہیں ، اس وقت تک (اے ممدوح) تو سرو و لالہ کی طرح ناز کرتا اور باغ اور صبح کی مانند مسکراتا رہ ، اس وقت تک آفتاب و ماہتاب کی طرح درخشاں اور عقل و روح کی مانند قائم رہ ۔

(۷) تمام سال تیرا فرخندہ بخت اور مبارک سلطنت ، آفتاب کی مانند روشن اور بہار کی طرح تازہ و جوان رہے ۔

(۸) مجھے خرید لے اور میرے ساتھ اچھائی (احسان) کر کہ میں ہر اچھائی کا سزاوار اور ہر قیمت پر ارزاں ہوں ۔

۶- شروع کے کچھ اشعار کتاب سے نقل کرنے کی بجائے دیوان مسعود سعد مرتبہ رشید یاسمی مرحوم سے نقل کیے گئے ہیں جس کے سبب ان کی ترتیب وغیرہ میں قدرے اختلاف نظر آئے گا ۔

۷- ترجمہ اشعار :

(۱) کب تک دل خستہ کو گمان میں لگاؤں اور جو خطا خود مجھ سے سرزد ہوئی اسے دوسروں کے سر تھوپوں ۔

(۲) کب تک تکلیف کا ذمہ دار گردش آسمان و زمانہ کو ٹھہراؤں ، جو خود میری وجہ سے مجھے پہنچتی ہیں ۔

(۳) اگر میں خاک دان کی جڑ میں پانی دوں تو ممکن نہیں کہ وہ بوستان بنے (بے حد محرومی و بد نصیبی مراد ہے)۔

(۴) میں تو گرا پڑا تنکا ہوں ، پھر کیوں سرو بوستان کے قد و قامت کی اتنی ہوس کروں ؟ (میں ایک کم تر درجہ کا ہوں ، اعلیٰ درجہ کی ہوس کیوں کروں)۔

(۵) اور اس گم راہ بوڑھے گدھے کے لاشہ کو کارواں رفتہ کی دم میں باندھوں ۔

(۶) اس بوڑھے نصیبے کی مستی کو ہر دل جوان کی قوت میں باندھوں۔

(۷) کب تک وصل کے لیے فراق کے صدمے اٹھاؤں ، اور نفع کے لیے نقصان سے دل لگاؤں ۔

(۸) اور عجز کے سبب صبح تک چوکیدار کے نعروں پر اپنے دونوں کان بند رکھوں ۔

(۹) جب میں اپنے چہرے پر اشک بہاتا ہوں تو خزاں کے موسم میں بھی بہار کی بارش کا سماں پیدا کر دیتا ہوں ۔

(۱۰) (کب تک) اس ندی کو ، جو سرخ لالہ (چہرہ) سے جاری کرتا ہوں ، اپنے کم زور و ناتواں جسم میں بند رکھوں ۔

(۱۱ ، ۱۲) جس وقت بھی میں آنکھوں سے انار دانہ کی طرح سرخ لعل (آنسو) پرشکن چہرے پر گراتا ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے میں عمدہ موتی درفش کاویانی کے چمڑے پر باندھ رہا ہوں۔

(۱۳) میں غم اندوہ اور حاجت دل کو کیوں اس قدر اپنے ناتواں جسم میں جگہ دوں ۔

(۱۴) میرا جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا ہے (تو اس حالت میں) اس جسم سے کوئی امید کس طرح رکھوں ۔

(۱۵) اس کے بعد اگر کوئی کمر میرے ہاتھ لگ جائے تو میں اسے کلک کمر کی طرح ہڈی (ڈھانچا) پر باندھوں گا ۔

(۱۶) اور کم زوری کے سبب میری یہ حالت ہوگئی ہے کہ اگر

تم چاہو تو میں اپنے جسم کو بید کی مانند گرہ (گانٹھ) دے دوں۔

(۱۷) طعنے میں ، میں نیزے کی مانند ہوں کیوں نیزے کی طرح رائیگاں کمر باندھوں۔

(۱۸) سخن کی وجہ سے معاملہ ناروا ہے ، کب تک دل کو ناروا باتوں میں لگائے رکھوں ۔

(۱۹) میرے لیے یہ عین مناسب ہوگا اگر میں شراب کی صراحی کی طرح اپنے منہ پر ڈھکنا دے دوں ۔

(۲۰) ایک تیر نہیں رہا اور میں کماں بن گیا ہوں (یعنی مجھ میں ذرا طاقت نہیں رہی اور میں کماں کی طرح جھک گیا ہوں) کب تک پنجے (ہاتھ) کا چلا کماں پر چڑھاؤں ۔

(۲۱) جب بھی کبھی میں بہت بڑے غم میں مبتلا ہوتا ہوں تو میرا دل اس کے اندیشے سے ملول نہیں ہوتا ۔

(۲۲) یہ مناسب ہے کہ میں اس وحید عصر ممدوح کی مدح کرنے کے لیے اپنا دل اس دنیا سے اٹھا لوں ۔

(۲۳) (میرے اس ممدوح کا نام) منصور ہے کہ جس کی مدح کا تعویذ میں ہمیشہ طبع و جاں اور عقل کی گردن پر باندھتا ہوں ۔

(۲۴) اے ممدوح میں تیری مدح و ستایش قلم کے ساتھ تیز چلنے والی ہوا پر باندھتا ہوں ۔

(۲۵) وہ بند جو میں اپنی فکرنہاں سے باندھتا ہوں میری درج (ڈبیا) پر واضح طور پر مکمل کھل جاتا ہے ۔

(۲۶) تیری توصیف میں میں بہرماں (یاقوت سرخ ، کسم کا پھول) کی شکل بناتا ہوں اور تیری تعریف سے بہرماں کا نقش باندھتا ہوں۔

(۲۷) تیری مدح کے اس مرصع ساز کو میں بہت ہی تیز رفتار گھوڑے پر باندھتا ہوں ۔

(۲۸) جب بھی کوئی اچھوتا مضمون میرے ذہن میں آتا ہے تو میں فوراً تیرے نام سے اس پر نشان لگا دیتا ہوں ۔

(۲۹ ، ۳۰) میں ہمیشہ تیرے جاہ و مرتبہ کے آوازہ کا بادبان بے کراں سمندر کی کشتی پر باندھتا ہوں تاکہ سمندر کے بیش بہا موتی کو کان کے قیمتی گوہر میں باندھوں ۔

(۳۱) جب میں اپنی کمر ہمت باندھ لیتا ہوں تو آسمان تمام مبہم چیزوں کو (میرے لیے) واضح کر دیتا ہے ۔

(۳۲) جب میں دل کو آزمایش میں ڈالتا ہوں تو بہت سے دل اس کا امتحان (آزمایش) کرتے ہیں ۔

(۳۳) جب میں کلک (قلم ، نے) کی آگ دھوئیں میں باندھتا ہوں تو دھوئیں والی سینکڑوں آگیں بلند کرتا ہوں ۔

(۳۴ ، ۳۵) اگر میں تیری مدح و ثنا کا تعویذ کسی خشم ناک درندے کے بازو پر باندھ دوں تو یہ سمجھو کہ اس کے بعد میں نے گویا جنگلی جانوروں کے گرد امن و سلامتی کا بند باندھ دیا ہے ۔

(۳۶) میں گوہر ہوں لیکن ہر وقت مہرۂ سلیمانی کی طرح تیری خدمت میں کمر بستہ رہتا ہوں ۔

(۳۷) میرے پاس (مدح کے بے شمار) پھول ہیں، لیکن صحیح سمجھو (تو بات یہ ہے کہ) میں تمھاری ہوا (آرزو) کے ہاتھوں زباں بند ہوں ۔

(۳۸) جب میں خود ہی اس کج رو آسمان سے کوئی امید وابستہ کروں گا تو ظاہر ہے میری وہ امید بھی کج رو ہی ہوگی (یعنی پوری نہ ہوگی) ۔

(۳۹) تو یہ بہتر ہوگا کہ میں اپنی تمام مرادیں اور امیدیں اپنے خوش بخت آقا کے احسان سے وابستہ رکھوں ۔

۸۔ درفش کاویانی : ایرانی روایت کے مطابق جمشید ، جس کی حکومت انسانوں کے علاوہ جنوں ، دیووں اور پرندوں وغیرہ پر بھی تھی ، نے مغرور ہو کر خدائی کا دعویٰ کیا ، تو اس موقع پر ضحاک نے اسے قتل کرکے تخت پر قبضہ کر لیا ۔ اس ضحاک کے دونوں کندھوں

پر دو سانپ تھے جن کی خوراک انسان کا مغز تھی - ایک تو یہ خود ظالم تھا ، پھر ان سانپوں کے لیے اسے آدمی قتل کرنے پڑتے - اس نے ایک ہزار سال حکومت کی - لوگ اس سے تنگ آ چکے تھے - آخر کاوہ نامی ایک لوہار کی تحریک پر لوگ اکٹھے ہوئے ۔ اس کی چمڑے کی پھنکنی سے کچھ چمڑا لے کر اس کا جھنڈا بنایا گیا - اور اس طرح ضحاک پر حملہ کرکے اسے ختم کر دیا گیا - اس جھنڈے کو بعد میں آزادی کا علم قرار دیا گیا - (ملاحظہ ہو تاریخ ادبی ایران جلد اول از براؤن فارسی ترجمہ از علی پاشا صالح ایران ، صفحہ ۱۷۳ تا ۱۷۶)-

۹- ترجمہ اشعار :

(۱) اے کہ تیرے آذر (چہرہ) نے خوش بو کی چادر تان رکھی ہے اور تیرے آذر (چہرہ) نے عشاق کے دلوں میں آذر (آگ) لگا رکھی ہے -

(۲) نہ تو سیدھا سرو ہی تیری طرح ہے اور نہ خود رو لالہ ہی تیری برابری کر سکتا ہے - نہ چین کا نقش تیری طرح ہے اور نہ آذر (بت تراش) کی تصویر(بت) تیرا مقابلہ کر سکتی ہے - (چین کے نقش مشہور ہیں ، آذر یا آزر حضرت ابراہیم کے والد جو بت تراش تھے) -

(۳) تیری دونوں زلفیں ریحان (نازبو) ہیں اور تیرے عشاق کا دل جنت ہے - تیرا دیدار خورشید ہے اور تیرے عشاق کا دیدہ (آنکھیں) مشرق ہے -

(۴) تیرے عشق کی وجہ سے تیرے عشاق کے دلوں میں وہ کچھ ہو رہا ہے جو بادشاہ سلامت کے حاسدوں کے دلوں میں خنجر سے ہوتا ہے -

(۵) وہ بادشاہ (میرا ممدوح) کہ سلطنتوں کی تلوار ہے ، ایسا ہے کہ جس کی بلند عقل سے دنیائے ہنر و جواں مردی روشن ہے -

(۶)-میرا وہ ممدوح سخی ہاتھوں والا ہے کہ جس کی سخاوت کے

موقع پر اس کے الفاظ موتی بکھیرنے اور اس کے ہاتھ زر و گوہر لٹاتے ہیں ۔

(۷) اے بادشاہ تو خورشید ہے کیوں کہ تیرا نور خورشید کی طرح تمام عالم میں پھیلا ہوا ہے ۔

(۸) تیری تلوار کی نوک سے فغفور (چین کا بادشاہ) کانپ اٹھا ہے اور تیرے گرز کے ہول سے قیصر (روم کا بادشاہ) ڈر رہا ہے ۔

(۹) تیرے چتر کو فتح و تائید ایزدی حاصل ہے اور تیری تلوار کو نصرت و سعادت کی مدد حاصل ہے ۔

(۱۰) بہت زیادہ مدح کرنے والا شاعر تیری مدح کرنے سے عاجز ہے اور سخن ور دانا تیری توصیف میں متحیر ہے (عاجز ہے) ۔

۱۰۔ ترجمہ اشعار :

(۱) میرا محبوب مجھ سے برافروختہ ہوگیا اور میں اس کی اس برافروختگی سے پیچ و تاب میں ہوں ۔ اب اس کا عتاب برداشت کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں رہی ۔

(۲) اس کے چہرے پر پڑے ہوئے نقاب کے رشک میں میرا یہ جسم اس کے تار نقاب کی مانند باریک (ضعیف) ہوگیا ہے ۔

(۳) اگرچہ وہ زہر سا جواب دیتا ہے لیکن میرے لیے وہ جواب شہد کی مانند ہے ۔ کیوں کہ اس کا جواب برلب راہ ہے ۔

(۴) میرا محبوب یہ جانتا ہے کہ میرا دل اس کی زلفوں میں بندھا ہے ، (اس لیے) وہ ہر لحظہ اپنی زلفوں کے پیچ و تاب میں اضافہ کرتا ہے ۔

(۵) میں نے اس کے عشق کی شراب کا ایک جام پیا تھا ، سو اب تک میرے سر میں اس کی شراب کا خمار ہے ۔

(۶) اس کے خورشید درخشاں سے (میرا) چہرہ زر پختہ کی مانند اور اس کی مشک خالص (زلفیں) سے جسم مشک خام کی طرح ہوگیا ۔

(۷) اگر زر (سونا) آفتاب سے زیادہ ہو جاتا ہے ، تو پھر میرا زر (رنگ) اس کے آفتاب (چہرہ) سے کیوں کم (آڑ) ہوجاتا ہے ۔

(۸) اس کی زلف عقاب کا پنجہ اور اس کا چہرہ تذرو کا چہرہ ہے ۔ اس کے عقاب (زلف) کے پنجے سے اس کا تذرو (ایک خوش نما پرندہ) ایسا چہرہ محفوظ ہے ۔

(۹) اس محبوب کا چہرہ سفید باز ہے اور اس کی زلفیں سیاہ کوا ہیں ۔ اس کے باز (چہرہ) کے خوف سے اس کا کوا (زلفیں) لرزاں ہیں (یعنی پریشان زلفیں) ۔

۱۱ - ترجمہ اشعار :

(۱) اس ممدوح کا تخت آسمان ہے اور اس میں اس کے ستارے اس کی رعایا ہیں ۔ اس کی آنکھ فلک نہم (۹) ہے اور اس میں اس کا تیر اس (آسمان) کا شہاب ہے ۔

(۲) وہ بادل کی ہتھیلی والا ہے اور اس سے باغ ملک سر سبز و شاداب ہے ۔ اس کے بادل میں بجلی نے زحمت نہیں دیکھی (پائی) ۔

(۳) جب اس کی عنان سبک ہو گئی (تو سمجھو کہ) اس وقت ہوا بوجھل ہو گئی اور جب اس کی رکاب بوجھل ہو جائے تو زمین اس وقت سبک ہو جاتی ہے ۔

(۴) اس کی تلوار لڑائی کے موقع پر آب بھی ہے اور آتش بھی ۔ زمین اور آسمان اس کی موج و تاب (یعنی کاٹ اور چمک) سے پر ہے ۔

(۵) جلالت (بزرگی) کا پانی اس کی آگ سے مصفا ہو گیا ہے اور اس کے آب سے اس کی آتش ہیبت بھڑک اٹھی ہے ۔

۱۲ - ترجمہ اشعار :

(۱) اے کہ تو نے اپنے قمر (چہرہ) پر مشک ایسی سیاہ و خوش بو دار زلفیں پریشان کر رکھی ہیں ، تیرے شکر ایسے رسیلے ہونٹ شکر کی ہنسی اڑاتے ہیں ۔

(۲) کوئی بھی سرو خراماں (حسین) تیرے جیسا راست قد نہیں ، (اور) زمین میں کوئی بھی سرخ پھول تیرے چہرے جیسا نہیں

(۳) گلاب نے تیرے چہرہ سے سبقت لے جانے کے لیے اپنا چہرہ خون سے دھو لیا ہے اور سرو تیرے قد کے حسد میں دست بسر ہے (اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیا ہے)۔

(۴) جب سے میرے سر میں یہ سمایا ہے کہ میں تجھے اپنی بغل میں بھینچوں ، اس وقت سے کبھی تو میں ہاتھ سر پر مارتا ہوں اور کبھی پہلو (بغل) پر ۔

(۵) دل میں اس قدر غم و اندوہ کا ہجوم ہو گیا ہے کہ غم و اندوہ کے تودوں کے تودے ایک دوسرے پر لگ گئے ہیں ۔

(۶) تیری مژہ کی ہیبت سے میرا دل جان کی ڈھال بن گیا ہے تاکہ جب تیری مژہ کوئی زخم لگائے تو وہ ڈھال پر آئے ۔

(۷) جب سے ہجر تیرے نزدیک ساکن ہو کر بیٹھ رہا ہے ، اس وقت سے وصل دروازے پر سراسیمہ ہو کر رہ گیا ہے ۔

(۸) میں جتنی بھی کوشش کرتا ہوں ، میرا ہاتھ تجھ تک نہیں پہنچتا ۔ (ہاں) اے رشک قمر ! بھلا کسی کا ہاتھ قمر پر بھی کبھی پہنچا ہے ؟

فخر مدبر (صفحہ ۲۹)

۱۔ یہ اضافہ خود مصنف کی طرف سے ہے۔

۲۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

۳۔ اردشیر پاپکان یا بابکان یا اردشیر اول کا باپ ساسان ، شاہ فارس پاپک کا گڈریا تھا ۔ کچھ عرصے کے بعد پاپک نے ایک خواب کی بنا پر اسے عزت بخشی اور اپنی لڑکی کی شادی اس سے کر دی جس سے اردشیر پیدا ہوا ۔ جوان ہوا تو اس کی بہادری کا شہرہ دور دور تک پہنچا ۔ چناں چہ اشکانی خاندان کے آخری بادشاہ اردوان نے اسے اپنے دربار میں بلایا ۔ وہاں ایک موقع پر بادشاہ سے بگڑ جاتی ہے اور و ایک حسین کنیز کی وساطت سے اور اس کی معیت میں فارس کی طرف

پہنچ جاتی ہے۔ ۲۲۶ھ میں پورے طور پر ایران پر قابض ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو 'خلاصہ تاریخ ایران' از محمد حجازی مطبوعہ ایران صفحہ ۴۳ اور 'تاریخ ادبی ایران' براؤن جلد اول ترجمہ علی پاشا صالح ایران صفحہ ۲۰۴، ۲۰۵)۔

۴- آتش پرستوں کے مذہبی رہنماؤں کا سر براہ۔ لیکن معلوم نہیں یہاں فخر مدبر کا اشارہ کون سے موبد موبدان کی طرف ہے۔

۵- اس کا ذکر کسی اور جگہ ملاحظہ ہو۔

۶- خلف بن احمد ایران کے صفاری خاندان کا آخری بادشاہ تھا جس کی حکومت سیستان تک محدود تھی۔ اس نے ۳۵۲ھ سے ۳۹۳ھ تک حکومت کی۔ بڑا صاحب عقل و دانش تھا۔ لیکن اس کی غلط تدبیر، سختی اور اکل کھرے پن کی وجہ سے سیستان میں شورش و بغاوت کے آثار پیدا ہوئے جو سیستان پر محمود غزنوی کے غلبے پر منتج ہوئے۔ خلف بڑا علم دوست، ہنر پرور اور ادبا، شعرا و علما کا مربی تھا۔ اس نے اپنے وقت کے جید علما و فضلا کو جمع کیا اور انہیں تفسیر قرآن لکھنے پر مامور کیا۔ بہ قول صاحب تاریخ یمینی یہ تفسیر بہت زیادہ تفصیل کے ساتھ اور سو جلدوں پر مشتمل تھی۔ اس تفسیر کے مؤلفین پر اس نے بیس ہزار دینار خرچ کیے۔ (تاریخ ادبیات در ایران از ذبیح اللہ صفا، جلد اول صفحہ ۲۰۳، ۲۰۴)۔

حسن نظامی (صفحہ ۱۴)

۱- سورۂ توبہ پارہ ۱۰۔

۲- ایضاً۔

۳- ایضاً۔

۴- سورۂ نساء پارہ ۵۔

۵- وہ لکڑی جس پر قیمہ کوٹا جاتا ہے۔

۶- سورۂ رعد پارہ ۱۳۔

۷- سورۂ الحجر پارہ ۱۴۔

۸- سورۂ توبہ۔

۹- یہاں سے محمد بن سام کے القاب شروع ہوتے ہیں۔

۱۰- عراق اور خراسان کے بادشاہ سلطان غیاث الدین غوری کا چھوٹا بھائی تھا - غزنی میں اپنے بھائی کے نائب السلطنت کی حیثیت سے تخت نشین ہوا - اپنے بڑے بھائی کے ایما پر اس نے ہند و پاکستان پر حملہ کیا - (اس سے پہلے غیاث الدین نے غزنی پر مسلسل حملے کر کے جب اسے فتح کیا تو معزالدین کو شہاب الدین کا لقب دے کر وہاں تخت نشین کیا تھا) - اسی کے عہد حکومت میں دلی فتح ہوئی اور ہند و پاکستان میں مستقل اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالی گئی تھی - کچھ اوپر ۳۲ سال حکومت کر کے شعبان کی تیسری تاریخ ۶۰۰ھ کو غزنی کے راستے میں ایک فدائی کھوکھر کے ہاتھوں شہید ہوا - (منتخب التواریخ، اردو ترجمہ از احمد فاروق صفحہ ۵۰ تا ۵۷) -

۱۱- ایبک کو دیے گئے القاب کا آغاز -

۱۲- ایبک یا آی بک شہاب الدین غوری (معز الدین محمد بن سام) کا خاص غلام تھا - قطب الدین لکھ بخش بھی کہلاتا تھا - شہاب الدین جب پورے ہند و پاکستان پر قابض ہوگیا تو اس نے ایبک کو یہاں انتظام و انصرام کے لیے رکھا - اس کی شہادت کے بعد اس کے بھتیجے نے ایبک کو چتر اور خلعت شاہی بھیجی اور سلطان کے خطاب سے مخاطب کیا - چناں چہ یہ ۶۰۲ھ میں دہلی سے لاہور جا کر بہ روز منگل ۱۶- ذیقعد کو تخت نشین ہوا اور ۶۱۷ھ میں لاہور ہی میں چوگان کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر جان بہ حق ہوا - اس کا مزار انارکلی کے قریب ایبک روڈ پر واقع ہے - (اردو منتخب التواریخ صفحہ ۵۸ - ۵۹) -

۱۳- یہ شعر متنبی کا ہے اور اس کے اس قصیدے سے ہے جو اس نے سیف الدولہ حمدانی کی مدح میں کہا -

۱۴- گویا ان کا وجود ہی نہ تھا -

۱۵- آب بہ معنی پانی اور تیزی تلوار وغیرہ کی -

۱۶- ''اس کی تلوار سے صلیب اور گرجے کی جگہ کفرستان میں مسجد، محراب اور منبر ہے اور جہاں اس سے پہلے مشرکوں کے نعرے گونجتے تھے وہاں اب اللہ اکبر کی بلند صدائیں سنائی دے رہی ہیں۔''

۱۷- سپیدہ مہرہ یعنی مہرۂ سفید بہ معنی ناقوس، سنکھ۔

قاضی حمید الدین ناگوری دہلوی (صفحہ ۷۴)

۱- وہ ان سے محبت کرتا ہے وہ اس محبت کرتے ہیں۔

۲- تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے (سورۂ مجادلہ)۔

۳- ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں (سورہ ق)۔

۴- تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد رکھوں گا (سورہ بقرہ پارہ ۲)۔

۵- یاد کر اپنے رب کو جب تو بھول جائے (سورہ کہف)۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جب آں حضرت صلعم سے اصحاب کہف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا 'فلاں دن بتا دوں گا۔' لیکن وہ دن گزر گیا آپ نہ بتا سکے۔ آخر وحی نازل ہوئی کہ چوں کہ آپ نے 'ان شاء اللہ' نہیں کہا تھا۔ اس لیے یہ کیفیت ہوئی۔

۶- سورۂ بقرہ پارہ اول۔

۷- ہرچیز فانی ہے، صرف تیرے رب کا، جو صاحب جلال و اکرام ہے، چہرہ باقی رہے گا (سورۂ رحمان)۔

۸- ان کے رب نے ان کو شراب طہور پلائی (سورہ دہر)۔

۹- آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی ہے (سورہ مائدہ)۔

۱۰- ہم نے انسان کو تکلیف میں پیدا کیا۔ (سورۂ بلد پارہ ۳۰)۔

۱۱- ذات سے مراد خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔

۱۲- اس 'ذات' کی قدرت کے آثار 'صفات' ہیں۔

۱۳- میں ساقیوں کا مشتاق ہوں۔

۱۳- ہماری آنکھیں کسی وقت بھی تیرے دیدار سے سیر نہ ہوئیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اس معاملے میں ہم بڑے حریص بھوک منگے ہیں ۔

مولانا منہاج سراج (صفحہ ۵۲)

۱- فرقۂ قرامطہ اسماعیلیہ فرقے ہی کی شاخ ہے اور اس کا بانی کوفہ کا حمدان الاشعث عرف قرمط تھا۔ چھوٹا قد ہونے کے سبب جب وہ چلتا تو دونوں پاؤں قریب قریب رکھتا ۔ اس لیے قرمط مشہور ہوا ۔ بعض اس کا انتساب محمد الوراق سے کرتے ہیں جو 'خط مقرمط' بڑا اچھا لکھتا تھا اور جس نے اسماعیلی فرقے کی تبلیغ قرامطہ میں بہت زیادہ کی تھی ۔ اس فرقے کا زور چوتھی صدی ہجری میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا ۔ ۲۸۰ھ تک تو حمدان بہ طور اسماعیلی مبلغ ہی کے (عراق وغیرہ میں) کام کرتا رہا ، لیکن بعد میں اھواز کے اسماعیلی تبلیغی مرکز کے سلسلے میں اس کی اپنے داماد سے ٹھن گئی ، اور یہ نزاع اس فرقے کی تاسیس کا باعث بنا ۔ قرامطہ بہ ظاہر تو مسلمان تھے، لیکن در حقیقت مسلمانوں کے دشمن ۔ انھوں نے بے شمار مسلمانوں کو (جو اس فرقہ میں شامل نہ ہونا چاہتے) قتل کروا دیا ۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے ۹۳۰ع میں مکے پر حملہ کرکے تیس ہزار کے قریب مسلمانوں کو قتل کیا اور حجر اسود اٹھا کر لے گئے اور بیس سال کے بعد اسے واپس اپنی جگہ پر رکھا ۔ یہ لوگ فقط ایمان کو نجات کا وسیلہ اور اخلاقی قیود سے رہائی کا سبب جانتے تھے ۔ بعض مؤرخین ان لوگوں کو مجوسی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چوں کہ یہ لوگ کھلم کھلا اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے سے ڈرتے تھے ، اس لیے انھوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر یہ کام کیا ۔ یہ ثنویت کے قائل تھے اور اسی طرح مسجدوں میں آگ روشن رکھنے کے معتقد ۔ چوتھی صدی ہجری کے آخر اور پانچویں کے آغاز میں محمود غزنوی نے اسماعیلی فرقے کی تمام شاخوں ، جن میں قرامطہ بھی شامل ہیں ، کا زور توڑا ۔ بہت سے قرامطہ ڈر کے مارے ایران سے باہر مختلف علاقوں میں چلے گئے ۔ ملتان والے قرامطی بھی اسی فرقے کے

پیرو کار تھے - (ملاحظہ ہو صفا ، جلد اول ، صفحہ ۲۵۰ تا ۲۵۴ ، براؤن ترجمہ صالح ، جلد اول صفحہ ۵۸۴ ، ۵۸۵)

۲ - ملا بدایونی نے منتخب التواریخ میں اسے پرشور لکھا ہے - اس سے مراد غالباً پشاور ہے -

۳ - لاہور پر غزنویوں کا عمل دخل تو محمود ہی کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا ، لیکن لاہور میں ان کی باقاعدہ حکومت اس وقت شروع ہوئی جب سلجوق خاندان سارے ایران پر پورے طور پر قابض ہو گیا - خسرو شاہ بن بہرام شاہ جب شکست کھا کر لاہور آیا تو یہیں ۵۵۵ھ میں اس کی وفات واقع ہو گئی - چناں چہ لاہور کے تخت پر اس کا بیٹا خسرو ملک غزنوی بیٹھا - اس نے ۲۸ سال حکومت کر کے ۵۸۳ھ میں غیاث الدین غوری کی قید میں وفات پائی - اور اس طرح یہ خاندان ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا -
(اردو ترجمہ ، منتخب التواریخ ، صفحہ ۳۶ - ۵۳ ، خلاصہ تاریخ ایران از حجازی ، صفحہ ۸۷ - ۹۴)

۴ - غیاث الدین غوری جو محمد بن سام شہاب الدین غوری کا بڑا بھائی تھا -

۵ - اردو ترجمہ ، منتخب التواریخ میں اسے توکلی لکھا ہے جو غلط ہے - (ملاحظہ ہو صفحہ ۵۶)

۶- منتخب التواریخ میں اسے کھندی رائے لکھا ہے -
(ایضاً صفحہ ۵۶)

۷ - بہ قول ملا بدایونی خلجی ، سلطان کے بیٹے کا نام تھا اور سلطان اس موقع پر اس کے گھوڑے کے پیچھے بیٹھا تھا -
(منتخب التواریخ اردو ، صفحہ ۵۶)

۸ - یہاں منہاج نے لفظ 'معارف' استعمال کیا ہے جو بہ معنی نامور اور شناسا کے بھی استعمال ہوتا ہے -

۹ - فوج کا درمیانی حصہ -

۱۰ - دایاں حصہ -

۱۱ - بایاں حصہ -

۱۲ - پچھلا حصہ -

۱۳ - آگے کا حصہ -

۱۴ - یہ 'عارض ممالک' کا محکمہ تھا جو فوجی محکمے کا کنٹرولر جنرل ہوتا تھا - اس کے محکمے کا کام یہ تھا کہ وہ گھوڑوں اور آدمیوں کی تفصیلی اور توصیفی فہرست تیار کر کے اس کا ریکارڈ رکھے - جب کہ خود عارض (یعنی افسر) افواج کا انسپکٹر جنرل ہوتا - یہ افسر یا اس کے علاقائی نائب نئے سپاہی بھرتی اور ان کی تنخواہیں مقرر کرتے - اس محکمے کے فرائض اتنے اہم تھے کہ خود سلطان کو عارض ممالک کے کچھ فرائض سرانجام دینے پڑ جاتے - (ایڈمنسٹریشن آو سلطانیٹ آو ڈھلی از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، صفحہ ۸۵ ، ۸۶ ، ۱۳۷)

امیر خسرو دھلوی (صفحہ ٦٣)

۱ - اس انتخاب میں موسیقی کی اصطلاحات کی کثرت کے علاوہ الفاظ کی جادوگری بھی ہے ، جس کے سبب وہ الفاظ ایسے ہی رہنے دیے گئے ہیں اور ان کا ترجمہ یا تشریح حاشیے میں دے دی ہے -

۲ - موسیقاروں کا گانا بجانا وغیرہ -

۳ - نم کی صفائی -

۴ - ہر لحظہ -

۵ - گانے کی قسم -

٦ - موسیقی کی ایک قسم اور بہ معنی حیران ہونے والا -

۷ - ساسانی بادشاہ خسرو دوم کے دربار کا ایک گویا -

۸ - یہ بھی اسی بادشاہ کے دربار کا ایک استاد مغنی تھا ، اس کا وطن 'مرو' تھا اسے مقرب کا درجہ حاصل تھا - روایت کی رو سے ایرانیوں کی موسیقی کا موجد یہی ہے - اس کی موسیقی نے ساسانیوں کی موسیقی پر

بڑا اثر ڈالا ، جو عہد اسلامی میں عربوں اور ایرانیوں کے فن موسیقی کا سب سے بڑا منبع تھی۔ (ایران بہ عہد ساسانیاں ترجمہ از ڈاکٹر محمد اقبال ، صفحہ ۹۴۹ تا ۹۵۳ ، تاریخ ادبی ایران ، جلد اول ترجمہ صالح صفحہ ۲۵ تا ۳۰)

۹ - یہ فقرہ خبر ہے اور اس کا مبتدا آغاز میں پہلی سطر میں (بزم آراؤں کی نوازش نے) ہے - درمیان میں گانے والوں کی صفات اور خوبیاں ہیں -

۱۰ - ایک شکاری جانور کا نام -

۱۱ - ایک گویے کا نام اور بہ معنی چڑیا -

۱۲ - ایک گویے کا نام اور بہ معنی پرندہ یا چھوٹا پرندہ -

۱۳ - آسمان ، موسیقی کی ایک اصطلاح -

۱۴ - باریکی -

۱۵ - ایک راگ جو زوال کے بعد گایا جاتا ہے ، بعض لوگ اسے 'توڑی' راگ کہتے ہیں -

۱۶ - بال سلجھانے والی -

۱۷ - موسیقی کی اصطلاح ، راگ وغیرہ -

۱۸ - ترمتی خاتون -

۱۹ - چوبیس راگنیاں -

۲۰ - 'ترمتی خاتون' مبتدا ہے اور یہ فقرہ خبر یعنی ''ترمتی خاتون کو ہم نے شاہانہ نواخت کی طرف راہ دی -'' درمیان کی تمام عبارت میں اس کی خوبیاں بیان کی گئی ہیں -

۲۱ - نوازنا اور گانا بجانا وغیرہ -

۲۲ - موسیقی کی ایک اصطلاح اور بہ معنی راستہ یعنی ہم نے اسے شاہی اعزاز سے نوازا -

۲۳ - ایران کا ایک شہر -

۲۴ - ایران کا ایک شہر ۔

۲۵ - ایک مغنیہ کا نام (معرفت اور معروفک میں رعایت لفظی ہے) اور ایک آلۂ موسیقی ۔

۲۶ - موسیقی کی ایک قسم ۔

۲۷ - ایک ساز کا نام ۔

۲۸ - ایک موسیقار ، مومن کی رعایت سے زنار استعمال کیا ہے ۔

۲۹ - بوڑھے کی موت ۔

۳۰ - ساز کا نام ۔

۳۱ - ساز کا نام ۔

۳۲ - ساز کا نام ۔

۳۳ - آواز کا نہ ہونا ۔

۳۴ - بوڑھے ۔

۳۵ - دوسرے معنی ساز کا بجانا ہیں ۔

۳۶ - ایک ساز ۔

۳۷ - راگ ، سر وغیرہ ۔

۳۸ - ساز کا نام اور بہ معنی پنجہ ۔

۳۹ - ایک ساز جو منہ سے بجایا جاتا ہے ۔

۴۰ - بے معنی ۔

۴۱ - تمام سازوں کے نام ہیں ۔

۴۲ - راہ ، موسیقی کی اصطلاح یعنی ترانہ بجانا اور دوسرے معنی لوٹنا ۔

۴۳ - آشنائی ۔

۴۴ - دولت و دین کا ماہتاب ۔

۴۵ - گانا -

۴۶ - وہ گویے جو بے سر ہوں ، دوسرے معنی واضح ہیں -

۴۷ - جو صحیح طور پر ساز نہ بجا سکیں -

۴۸ - پنجہ ، سارنگی -

۴۹ - پھونک ، پھونک مارنا - دوسرے معنی واضح ہیں -

۵۰ - پہاڑ کا رہنے والا -

۵۱ - ایک ساز کا نام ، دوسرے معنی خشک ندی -

۵۲ - باریک کپڑے میں چھاننا -

۵۳ - چھلنی سے چھاننا -

۵۴ - ہوا ، پیٹ میں ہوا ہو جانا -

۵۵ - ایک ساز جو منہ سے بجایا جاتا ہے -

۵۶ - ایک ساز -

۵۷ - بجانا

۵۸ - جسے دق کا مرض ہو -

۵۹ - حکمت کی ایک مشہور کتاب اور موسیقی کی ایک اصطلاح -

۶۰ - پیالہ -

۶۱ - ندی ، باجا -

۶۲ - کھائی ، حاشیہ -

۶۳ - ساز -

۶۴ - ساز -

۶۵ - ساز کے تار -

۶۶ - تال کی ایک قسم -

۶۷ - تال کی قسم -

۶۸ - ایک راگ جو پانچ نغموں سے مرکب ہوتا ہے اور زوال کے وقت گایا جاتا ہے -

۶۹ - باریک آواز -

۷۰ - بوسلیک اور نوا موسیقی کے مقاموں کے نام -

۷۱ - اصطلاحات موسیقی -

۷۲ - سر سے بند ہونا -

۷۳ - ساز اور بہ معنی گدھا -

۷۴ - تانت -

۷۵ - موسیقی کا ایک مقام اور مشہور ملک -

۷۶ - ایک ساز ، دوسرے معنی واضح ہیں -

۷۷ - موسیقی کا ایک مقام اور ایک مشہور شہر -

۷۸ - ایک جگہ کا نام -

۷۹ - سویا ہوا اور بہ معنی ٹیڑھا -

۸۰ - جو ایک ہی جگہ پر پڑا ہو -

۸۱ - ساز کے تار اور بہ معنی ریشم -

۸۲ - ریشم کی چٹائی ، فرش ، دسترس -

۸۳ - یہاں گدھے کی رعایت سے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اس کے متعلقات سے بھی ہیں اور جن کے دوسری معانی بھی ہیں - آخر (یا آخور) بہ معنی گھاس کے جو گھوڑے ، گدھے کو ڈالی جاتی ہے -

۸۴ - گننا ، شمار کرنا اور بہ معنی انگلیوں سے بجانا -

۸۵ - لڑائی کرانا دو فریقوں کے درمیان بہ معنی مضراب چلانا -

۸۶ - بے حد مشہور ہونا ، رسوا ہونا -

۸۷ - جیسے دو ہاتھوں سے بجایا جائے -

۸۸ - ایک هاتھ سے بجایا جانے والا -

۸۹ - تالیاں بجاتے ھیں -

۹۰ - حجاز ، راہ ، عراق - موسیقی کی اصطلاحیں بھی ھیں - (اس سے پہلے فقرے میں پرندوں سے مراد موسیقار ھیں -)

۹۱—۹۳ - تینوں لقب ھیں بہ معنی چڑیا ، پرندہ اور مرغی کا بچہ -

۹۴ - پرندوں یعنی موسیقاروں کا سردار -

۹۵ - ایک فرضی پرندہ ، لغوی معنی ۳۰ پرندے -

۹۶ - فرضی پرندہ -

۹۷ - مشہور پرندہ -

۹۸ - مشہور پرندہ -

۹۹ - طائر کی رعایت سے طیرہ استعمال کیا ھے ، بہ معنی سبکی ، شرمندہ کرنا -

۱۰۰ - بال بہ معنی بازو ، پر -

امیر حسن سجزی (صفحہ ۹۷)

۱- 'فوائد الفوائد' اردو ترجمہ (اللہ والوں کی قومی دکان لاھور) کے مترجم نے ایک ھندو کی بجائے ''ھندوی'' لکھ دیا ھے جیسے یہ کوئی نام ھو - (صفحہ ۱۴۷)

۲- اس فقرے کا ترجمہ اسی مترجم نے یوں کیا ھے : ''میں نے دونوں ھفتے اس کا ذکر کیا - ایک روز اس کا ذکر کرتے کرتے یہ رباعی پڑھی'' (صفحہ ۱۵۵) - یہ ترجمہ سراسر غلط ھے -

۳ - ان کا ذکر کہیں دوسری جگہ آ چکا ھے -

۴ - بدر الدین غزنوی حضرت خواجہ قطب الدین بختیار رح کے خلیفہ تھے - مشائخ وقت آپ کی بزرگی کے معترف تھے - وعظ بھی

فرمایا کرتے تھے - آپ کا پیرایۂ بیان بہت جاذب تھا - شیخ فرید الدین گنج شکر آپ کی مجلس وعظ میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے - پہلے غزنی سے لاہور وارد ہوئے ، پھر دهلی جا کر حضرت کاکیؒ کے مرید ہوئے - سماع کے قائل تھے اور اکثر رقص کیا کرتے تھے - آپ کا مزار کاکیؒ کے مزار کے پائین ہے - (اخبار الاخیار ، صفحہ ۵۰ ، ۵۱)

۵- مولانا برهان الدین محمود بلخی اپنے زمانے کے جید عالم تھے - بہ‌قول صاحب 'نزهة الخواطر' نحو ، لغت ، فقه ، حدیث اور علوم عقلی میں ان کے زمانے میں هندوستان میں ان سے بڑا عالم کوئی دوسرا نہ تھا - جب هندوستان میں وارد ہوئے تو سلاطین اور امرا نے بڑی قدر و منزلت کی - سلطان بلبن ان کا بڑا احترام کرتا - جمعه کے روز نماز کے بعد وہ اپنی پوری شاهانہ شوکت و عظمت کے ساتھ مولانا کے گھر پر جاتا اور ان سے مؤدب ہو کر ملتا - مولانا نے ۶۸۷ھ میں وفات پائی - ان کی قبر حوض شمسی کے پورب جانب ہے - مؤلف اخبار الاخیار کے مطابق لوگ ان کے مزار کی خاک اپنے لڑکوں کو اس لیے کھلاتے ہیں کہ علوم کے دروازے ان کے لیے کھل جائیں -

(اخبار الاخیار ، صفحہ ۴٦ ، ۴۷ - بزم مملوکیہ صفحہ ۲۳۰ ، ۲۳۱)

٦ - یعنی مولانا برهان الدین بلخی -

۷ - ابوالحسن علی بن ابی بکر مرغینانی متوفی ۵۹۳ھ -

۸ - یعنی مولانا برهان الدین بلخی -

۹ - آپ کا نام محمد بن عطا ہے - هندوستان کے قدیم مشائخ اور خواجہ قطب الدین کے مصاحبوں میں سے تھے - آپ شہاب الدین سہروردی کے مرید اور خلیفہ اور سماع کے بہت مشتاق تھے - اور اس دور میں کسی کو بھی سماع میں اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ آپ کو - بہ قول شیخ نظام الدین اولیا دهلی میں سماع کا سکہ آپ ہی نے بٹھایا - آپ کی وفات ۶۰۵ھ میں ہوئی - آپ کی قبر خواجہ قطب الدین کے مزار کے پائین ایک اونچے چبوترے پر ہے - (اخبار الاخیار صفحہ ۳۷ ، ۳۸)

۱۰ - مشہور صوفی قطب الدین بختیار کاکی - فرشتہ نے آپ کا نام

قطب الدین ولد کمال الدین احمد ، دار اشکوہ نے بختیار بن احمد بن موسیٰ لکھا ہے ۔ قصبۂ اوش (فرغانہ ، کہ ماوراء النہر میں ہے) میں پیدا ہوئے ۔ بہ قول فرشتہ ابھی ڈیڑھ برس کے تھے کہ آپ کے والد فوت ہو گئے ۔ والدہ ماجدہ نے آپ کی پرورش کی ۔ پانچ برس کے تھے کہ ایک خضر صورت بزرگ انھیں اوش کے ایک معلم ابوحفص کے پاس لے گئے اور اس سے کہا کہ یہ شخص اولیاء میں سے ہو گا ، اس پر نظر شفقت رکھنا اور تربیت میں کوئی کوتاہی نہ رہنے پائے ۔ ۲۰ سال کی عمر میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی رح کے مرید ہوئے ۔ چشتی علیہ الرحمۃ ان دنوں اصفہان میں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے ۔ مرید ہونے سے پہلے بھی آپ نے بڑی ریاضت و مجاہدت کی ۔ شروع شروع میں جب آپ پر نیند کا غلبہ طاری ہوتا تو قدرے سو لیا کرتے ۔ لیکن آخری عمر میں یہ وقت بھی بیداری میں تبدیل ہو گیا ۔ آپ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ دن رات میں کوئی ۲۵۰ رکعت نماز بڑے خشوع و خضوع سے ادا کرتے اور کوئی دو تین ہزار بار آپ صلعم پر درود بھیجتے ۔ جن دنوں آپ بغداد میں مقیم تھے تو وہاں اکثر شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحدالدین کرمانی سے آپ کی صحبتیں رہیں ۔ خواجہ معین الدین چشتی کے دہلی چلے جانے پر آپ بھی ان کے پیچھے ہو لیے ۔ پھرتے پھراتے ملتان آ پہنچے ۔ یہاں شیخ بہاءالدین زکریا رح سے چندے صحبت رہی ۔ یہیں شیخ فریدالدین گنج شکر نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی ۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ دہلی پہنچے تو حضرت معین الدین ان دنوں اجمیر میں تھے ۔ آپ نے ان سے وہاں ملنے کی اجازت چاہی ، لیکن چشتی رح نے فرمایا کہ اگرچہ ظاہر میں دوری ہے ، لیکن بہ باطن قرب ہے ، اس لیے بہتر یہی ہے کہ فی الحال وہیں قیام کرو ۔ فرشتہ نے آپ کے دہلی ٹھہرے رہنے کی ایک اور وجہ بتائی ہے ۔

آپ کے نام کاکی کی وجہ تسمیہ کے متعلق تذکروں میں ایک داستان ملتی ہے اور وہ یہ کہ آپ ایک بقال سے کبھی کبھار ادھار لیا کرتے تھے ۔ کسی موقع پر اس نے آپ کی غیرت کو ٹھیس پہنچائی ۔

آپ نے قرض لینا بند کر دیا ۔ اس کے بعد آپ اپنے مصلے کے نیچے ہاتھ ڈال کر حسب ضرورت پکے ہوئے نان (کاک) نکال لیتے ۔ فرشته نے یہ داستان آپ کی زوجہ اور بقال کی بیوی سے منسوب کی ہے ۔ آپ نے آخری عمر میں قرآن مجید حفظ کیا ، پھر دن میں دو بار کلام مجید ختم کرتے ۔ آخر میں آپ نے شادی بھی کر لی تھی جس سے دو فرزند پیدا ہوئے ۔ آپ اکثر سماع فرماتے ۔ ایک مرتبہ ایک محفل میں قوال حضرت احمد جام کی ایک غزل گا رہے تھے ۔ جب وہ اس شعر پر پہنچے ؛

کشتگان خنجر تسلیم را   هر زمان از غیب جانے دیگر است

تو آپ پر وجد طاری ہو گیا اور اس شدت سے طاری ہوا کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے ۔ چناں چہ قاضی حمید الدین ناگوری رح اور شیخ بدرالدین غزنوی آپ کو گھر لے آئے ۔ چار پانچ دن آپ پر یہی کیفیت طاری رہی ۔ قوال یہی شعر بار بار پڑھتے اور آپ سر دھنتے ۔ آخر اسی حالت میں سوموار ۱۴ ربیع الاول ۶۳۳ھ کو آپ رحلت فرما گئے ۔ ابو الفضل نے یوم و صال بدھوار بتایا ہے ۔ فرشتہ اور صاحب سیر الاقطاب نے تاریخ اور مہینہ وھی دیا ہے ، لیکن سنہ علی الترتیب ۶۳۴ اور ۶۳۵ دیا ہے ۔

سر سید نے آپ کے مزار کے متعلق لکھا ہے : ''آپ کا مزار مبارک کچا ہے اور قبر شریف بھی صرف مٹی کا ڈھیر ہے ۔ سبحان اللہ کیا خاکساری ہے کہ فخر بادشاہی ہے اور گنبد وغیرہ بھی نہیں ہے ۔ صرف کھلے آسمان کے نیچے ہے ، اس پر وہ نور اور رعب اور مرتبہ شان و شوکت ہے کہ دیکھنے سے علاقہ رکھتی ہے ۔ ہر دم انوار الٰہی نازل کہ دل عقیدت مندوں کا نورانی ہوتا ہے ۔'' شیر شاہ سوری نے آپ کے مزار کے قریب چار دیواری بنائی تھی ۔ اس کے مٹنے پر مختلف بادشاہوں کے عہد میں چاردیواری کو مختصر کر کے دروازے بنائے گئے ۔ پھر ۱۲۵۲ھ میں بہادر شاہ ظفر نے آپ کے مزار کے گرد صندل کا کٹہرا لگوایا ۔ (تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۳۷۸ - ۳۸۳ ، سیرالاقطاب ، صفحہ ۱۴۲ ببعد ۔ آئین اکبری جلد سوم ، صفحہ ۲۷۸ ، ۲۷۹ ۔ سفینة الاولیا ،

صفحہ ۹۳-۹٦ - اخبار الاخیار ، صفحہ ۲۵ ، ۲٦ - آثار الصنادید ، صفحہ ۷۵ ، ۷٦ ، پہلا باب ، مطبوعہ نولکشور)

امیر خورد کرمانی (صفحہ ۸۵)

۱ - قاضی حمیدالدین ناگوری : آپ کا نام محمد اور والد کا نام عطاء اللہ بخاری ہے - بخارا میں پیدا ہوئے - معزالدین سام بادشاہ کے زمانے میں اپنے والد کے ساتھ دھلی میں وارد ہوئے - تین برس ناگور کے قاضی رہے ، پھر ایک دم ترک علائق کر کے بغداد روانہ ہوئے - بہ قول دارا شکوہ ترک دنیا کا سبب یہ تھا کہ ایک روز آپ نے 'واقعہ' میں دیکھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو اپنی طرف بلا رہے ہیں - اس کے دوسرے ہی روز آپ نے ترک علائق کیا -

بغداد میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید ہوئے اور خرقۂ خلافت پایا - وہیں خواجہ قطب الدین بختیار سے ملاقات و دوستی ہوئی - بغداد سے حجاز پہنچے اور وہاں سے ہوتے ہوائے وارد دھلی ہوئے -

آپ کا شمار پاکستان و ہندوستان کے مشائخ متقدمین میں ہوتا ہے - بہ قول عبدالحق محدث آپ علم ظاہر و باطن کے جامع اور قطب الدین بختیار کاکی رح کے مصاحبوں میں سے تھے - آپ کے مشرب میں وجد و سماع بہت زیادہ تھا ، آپ کے زمانے میں کوئی بھی آپ جتنا سماع نہ سنتا تھا - خواجہ نظام الدین اولیا رح سے منقول ہے کہ آپ کے سماع کا شہرہ ہوا تو بہت سے مخالفوں نے آپ پر فتوے لگائے اور جواب سنے - ایک فقیہ نے ، جس سے قاضی صاحب کا میل جول تھا ، اس سلسلے میں کچھ لکھا - قاضی صاحب نے اس سے پوچھا ''کیا آپ نے بھی اس کا جواب لکھا ہے؟'' اس نے کہا 'ہاں' آپ نے فرمایا ''وہ تمام مفتی جنھوں نے جواب لکھے ہیں ، میرے مقابلے میں ابھی ماں کے شکم سے پیدا ہی نہیں ہوئے اور تو پیدا تو ہوا ہے ، لیکن ابھی بچہ ہے -''

آپ اپنے احباب سے مزاح بھی کیا کرتے تھے - ایک مرتبہ آپ خچر

پر اور شیخ برہان الدین اور قاضی کبیر ، کہ اپنے وقت کے جید عالم تھے ، قد آور گھوڑوں پر سوار جا رہے تھے - قاضی نے کہا کہ ''آپ کا گھوڑا صغیر (چھوٹا) ہے'' آپ نے کہا ''لیکن کبیر (بڑا) سے بہتر ہے -''

قطب الدین بختیار کاکی کے علاوہ شیخ فرید الدین گنج شکر سے بھی آپ کی دوستی تھی - آپ نے بہ قول ابوالفضل ۵ رمضان ۶۶۴ھ کو ، بہ قول دارا شکوہ ۶۶۳ھ میں اور بہ قول عبدالحق محدث دہلوی ۶۰۵ھ میں وفات پائی اور وصیت کے مطابق خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمہ کے مزار (دہلی) کے پائنتی اونچے چبوترے پر دفن ہوئے - لیکن خدا معلوم صاحب سیرالمتاخرین نے کہاں سے یہ لکھا ہے کہ آپ نے ۲۹ ربیع الآخر ۶۷۳ھ کو ناگور میں وفات پائی اور مزار بھی وہیں ہے - سرسید احمد خاں مرحوم نے آپ کے مزار کی لوح کی جو عبارت لکھی ہے ، اس کے مطابق آپ نے شب دوشنبہ ۱۱ رمضان ۶۹۵ھ میں وفات پائی - (واللہ اعلم) سرسید نے آپ کے مزار کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے - آپ کی کئی ایک تصانیف ہیں ، جن میں 'طوالع شموس' خاص طور پر قابل ذکر ہے - (فوائد الفواد اردو ترجمہ ، صفحہ ۱۹۵ ، ۱۹۶ - آئین اکبری جلد ۳ ، صفحہ ۲۸۱ - اخبار الاخیار ، صفحہ ۳۷ ، ۳۸ - سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۱۱۳ ، ۱۱۴ - سیرالمتاخرین مطبوعہ لاہور ، صفحہ ۱۲۸ - آثار الصنادید مطبوعہ نولکشور ، پہلا باب ، صفحہ ۷۷ - تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۵۲)

۲ - جوزجانی یا جرجانی - ان کا ذکر دوسری جگہ ملاحظہ ہو -

۳ - شیخ نظام الدین اولیا رحمہ -

۴ - ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی پانچویں صدی ہجری کے وسط میں پیدا ہوئے - جوانی کے آغاز میں غزنوی دربار سے منسلک ہوئے اور بہرام شاہ غزنوی کی مدح سرائی کی - شروع میں دوسرے درباری شاعروں کی طرح آپ نے بھی بڑی طرب آمیز زندگی بسر کی ، لیکن پھر ایک دم زندگی میں انقلاب آ گیا اور آپ ایک مستغنی شاعر ہو گئے اور اللہ کی طرف لو لگائی ، حج بھی کیا اور چند ایک شہروں کی سیاحت

بھی کی ۔ دربار سے علیحدہ ہو کر گوشہ نشینی اختیار کی اور مرتے دم تک عزلت ہی میں وقت گزارا ۔ آپ کا سنہ وفات بعض کے نزدیک ۵۳۵ھ اور بعض کے نزدیک ۵۴۵ھ ہے ۔ (تاریخ ادبیات ایران از شفق ، صفحہ ۱۲۰ ۔ صفا ، جلد دوم صفحہ ۵۵۲ - ۵۵۹) ۔

۵ ۔ ترجمۂ اشعار :

(۱) اس جگہ سے نغمے پھوٹ رہے ہیں تو اس جگہ سے بانسری کی آواز آ رہی ہے ۔ اس جگہ عاشق کا خروش ہے تو اس جگہ محبوب کا عیش و نشاط ہے ۔

(۲) ہر طرف ایک بہشت ہے اور ہر بہشت میں حور ہے ، ہر چمن میں ایک معشوق ہے اور ہر معشوق یار ہے ۔

(۳) روے زمین بے شمار پھولوں کی وجہ سے نقش و نگار سے سجی ہوئی ہے اور شاخ شجر پھولوں کے سبب یوں معلوم ہوتی ہے جیسے دلھنوں کے کان بندوں سے سجے ہوں ۔

(۴) ہر درخت پر ایک پرندہ بیٹھا ہوا ہے اور ہر طرف نغمے اور چہچہے ہیں ۔ ہر راہ گزر پر معشوق ہے اور ہر بغل میں دلھن ۔

۶ ۔ ''بار خدایا مجھے'' الخ ۔

۷ ۔ متن میں 'رسیدہ است' لکھا ہے ، لیکن سیاق و سباق کے لحاظ سے یہ مقام منفی کا ہے ۔

۸ ۔ علاءالدین خلجی ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ کو دھلی میں تخت نشین ہوا ، اکیس سال حکومت کر کے ۷۱۶ھ میں فوت ہوا ۔ (منتخب التواریخ)

۹ ۔ قطب الدین خلجی ۷۱۷ھ میں تخت پر بیٹھا ۔ اس کا انجام بڑا درد ناک ہوا ۔ خسرو خاں نے ایک رات ، جب کہ دونوں مے نوشی میں مصروف تھے ، اپنے آدمیوں کے ذریعے محل پر حملہ کرایا ۔ جب یہ بھاگنے لگا تو ایک آدمی نے بادشاہ کو سر کے بالوں سے پکڑ لیا ۔ بادشاہ نے چھڑانے کی کوشش کی ، لیکن ایک دوسرے

آدمی نے بھرپور وار کر کے اسے قتل کر دیا اور سر کاٹ کر چھت کے نیچے پھینک دیا ۔ یہ واقعہ ۷۲۰ھ کا ہے ۔ (منتخب التواریخ)

۱۰ ۔ غازی الملک ۷۲۰ھ میں غیاث الدین تغلق کے لقب سے تخت پر بیٹھا ۔ بڑا منتظم اور مدبر بادشاہ تھا ۔ ایک ہی ہفتے کے اندر مملکت کے درھم برھم کارخانہ کو سنوار کے رکھ دیا ۔ بنگالہ کی مہم سے واپسی پر افغان پور میں ایک نئے تعمیر کردہ محل میں ٹھہرا ۔ اسی رات اس کی چھت گر پڑی اور یہ نیچے دب کر مر گیا ۔ یہ واقعہ ۷۲۵ھ میں درپیش آیا ۔ (اردو ترجمہ منتخب التواریخ صفحہ ۱۲۰ بعد)

۱۱ ۔ ملاحظہ ھو حاشیہ نمبر ۱۹ ۔

۱۲ ۔ مولانا وجیہہ الدین پائلی اپنے وقت کے استاد اور متبحر عالم تھے اور زھد و پرھیزگاری میں ممتاز ۔ آخر میں شیخ نظام الدین اولیا کے مرید ھو گئے اور ان کی خدمت میں کمال اعتقاد پیدا کیا ۔ نقل ھے کہ ایک مرتبہ شیخ رح نے آپ سے فرمایا "مولانا ھمارے اور تمھارے درمیان اور خدا کے درمیان صرف یہی زبان باقی رہ گئی ھے ۔" مولانا کی قبر حوض شمسی پر قاضی کمال الدین صدر جہاں اور قتلغ خاں کے حظیرہ میں ھے جو مولانا موصوف سے نسبت شاگردی رکھتے تھے ۔ (اخبار الاخیار ، صفحہ ۹۹)

۱۳ ۔ عبور ۔

۱۴ ۔ قاضی محی الدین کاشانی ، خواجہ نظام الدین اولیا رح کے مریدوں میں سے تھے ۔ اپنے علم وافر ، زھد اور تقویٰ کے سبب مشہور اور شہر میں استاد مانے جاتے تھے ۔ ابتدائے ارادت ھی سے دنیاوی تعلقات سے کنارا کشی اختیار کی اور وظائف کی سندوں کو ، جو دانشمندی کا سرمایا ھوتی ھیں ، حضرت شیخ رح کی خدمت میں لا کر پھاڑ ڈالا اور فقر و مجاھدہ کی زندگی بسر کی ۔ آپ نے حضرت شیخ کی زندگی ھی میں رحلت فرمائی ۔ سلطان علاء الدین خلجی آپ کا معتقد تھا ۔ شروع شروع میں جب اس تک آپ کا حال پہنچا تو اس نے حکم دیا کہ اودھ کی قضا ، جو آپ کے خاندان میں رھی ھے ، آپ کو

دے دی جائے اور ساتھ ہی بہت سے انعام و قربات پیش کیے جائیں - قاضی بادشاہ کا یہ حکم نامہ لے کر خواجہ کی خدمت میں حاضر ہوئے - خواجہ نظام الدین کو اس کا بہت رنج ہوا ، قاضی سے فرمانے لگے "ضرور تیرے دل میں ایسی بات آئی ہو گی جو تیرے پاس یہ حکم نامہ لے کر آئے ہیں -" خواجہ نظام الدین اپنے اعلیٰ مریدوں اور خلفا کو سرکاری ملازمت کی اجازت نہیں دیتے تھے ، اسی وجہ سے انہیں قاضی سے شکایت پیدا ہوئی ، اور نہ صرف اپنا خلافت نامہ آپ سے واپس لے لیا بلکہ سال تک آپ کی طرف سے کبیدہ خاطر رہے - (اخبار الاخیار از عبدالحق دہلوی مطبوعہ دہلی ، صفحہ ۹۸ - سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات از خلیق احمد نظامی ، صفحہ ۲۳۹ ، ۲۳۰) -

۱۵ - ان کا ذکر کسی اور جگہ ملاحظہ ہو -

۱۶ - سید الطائفہ حضرت شیخ جنید بغدادی رحہ کی کنیت ابوالقاسم تھی - آپ کے والد ماجد محمد بن جنید آبگینہ فروش تھے - نہاوند کے باشندے تھے ، لیکن آپ کا وطن مالوف اور مولد بغداد ہے - مذہب طریقت میں آپ حضرت سفیان ثوری کے پیرو تھے - حضرت سری سقطی کے بھانجے بھی تھے اور مرید بھی - اکابر مشائخ کی نظر میں آپ انوار سعادت کا مطلع اور حقائق و اسرار کا بحر بیکراں تھے - طریقت و حقیقت میں سرگروہ اہل صفا اور اپنے دور کے امام السادات تھے - آپ سماع و وجد سے احتراز کرتے اور ظاہر و باطن میں کبھی خلاف شریعت فعل آپ سے سرزد نہ ہوتے تھے - آپ تیس سال تک ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ذکر و فکر میں مشغول رہے - ہفتہ کے روز ۲۷ رجب ۲۹۷ھ کو وفات پائی - وصال کے وقت آپ کی زبان پر تسبیح جاری تھی - چار انگلیاں بندھی ہوئی تھیں اور شہادت کی انگلی کھلی تھی ، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی ، آنکھیں بند کیں اور اپنے مولا سے جا ملے -

(سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۳۷ - ۳۹)

۱۷ - نام جعفر بن یونس اور کنیت ابوبکر - آپ حضرت جنید بغدادی رحہ کے مرید خاص تھے ، آپ مالکی مذہب پر کاربند تھے -

بعض آپ کو اصل کے اعتبار سے خراسانی کہتے ہیں اور مولد بغداد شریف ہے۔ بعض کے نزدیک آپ کا مقام پیدائش سامرہ ہے۔ وفات جمعہ ۲۷ ذی الحجہ ۳۳۴ھ کو بغداد میں ہوئی۔ (ایضاً، صفحہ ۱۰۳۹م)

۱۸- امام ابو حنیفہ رض : اسم گرامی نعمان بن ثابت ہے۔ آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، ائمہ اربعہ میں پہلے جلیل القدر امام ہیں۔ امام جعفر صادق رض سے آپ کو شرف ملاقات حاصل رہا ہے۔ منقول ہے کہ امام اعظم جب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر حاضر ہوتے تو عرض کرتے ''السلام علیکم یا سید المرسلین'' اور گنبد خضرا سے آواز آتی ''و علیک السلام یا امام المسلمین۔'' روایت ہے کہ آپ ہر رات ایک ہزار رکعت نماز ادا کرتے تھے۔ آپ نے پورے تیس برس تک عشا کے وضو سے صبح کی نماز ادا کی۔ کہتے ہیں کہ جب تک آپ اس دنیا میں رہے، حضرت امام شافعی رض پیدا نہ ہوئے، حالاں کہ مدت حمل چار سال تک رہی۔ امام اعظم ۸۰ھ میں متولد ہوئے اور ستر برس کی عمر میں واصل بہ حق ہوئے، آپ کا مزار بغدادمیں ہے۔ (سفینۃ الاولیا از دارا شکوہ، مطبوعہ نولکشور ۱۸۷۸ء، صفحہ ۳۲، ۳۳)

۱۹ - فخر الدین زرادی : اپنے وقت کے بزرگ تھے۔ علم و تقویٰ اور ذوق و عشق کے جامع اور عظمت وافر کے حامل تھے۔ شروع شروع میں مولانا فخرالدین ہانسوی سے دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ جوش طبعی، دقت سخن اور فصاحت عبارت میں اہل شہر میں بے حد ممتاز تھے۔ آخر میں حضرت نظام الدین اولیا کے مرید ہو گئے اور شاگردی وغیرہ چھوڑ چھاڑ کر درویشوں کے حلقے میں آ گئے۔ اکثر سفر میں رہتے اور صحراؤں اور ویرانوں میں خدا کی عبادت میں مصروف رہتے۔ کچھ عرصہ غیاث پور میں مقیم رہے۔ پھر مرشد کی وفات کے بعد جمنا کے کنارے فیروز آباد (دہلی) میں مصروف عبادات رہے۔ خواجہ معین الدین چشتی کے مزار کی زیارت کے لیے اجمیر بھی گئے۔ اس کے بعد فرید الدین گنج شکر کی زیارت کے لیے پاک پٹن پہنچے۔ ہمیشہ روزے سے رہتے۔ جن دنوں محمد تغلق نے دہلی کی بجائے دیو گیر کو پایۂ تخت بنایا اور لوگوں کو وہاں منتقل ہونے کا حکم دیا تو

مولانا بھی وہاں چلے گئے، وہاں سے زیارت خانہ کعبہ کے لیے تشریف لے گئے۔ زیارت سے فارغ ہو کر بغداد گئے اور علم حدیث میں مشغول ہوئے۔ کچھ عرصہ بعد دھلی کا ارادہ کیا۔ کشتی میں بیٹھے، وہ کشتی راستے ہی میں ڈوب گئی اور مولانا کو شہادت کا درجہ نصیب ھوا۔ (اخبار الاخیار، صفحہ ۹۱۔ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۱۶۰)

۲۰۔ آپ کی کنیت ابوعبداللہ تھی اور لقب شافعی۔ اسم گرامی محمد بن ادریس تھا۔ آپ کا تعلق قبیلۂ قریش سے ھے۔ والد کی طرف سے آپ کا نسبی سلسلہ آٹھویں پشت میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت عبد المطلب سے ملتا ھے۔ آپ حضرت امام مالک رض کے شاگرد تھے۔ آپ کی پیدائش ایک روایت کے مطابق غزہ میں اور دوسری کے مطابق عسقلان یا منا میں ۱۵۰ھ میں ہوئی اور وفات بہ روز جمعہ آخر ماہ رجب ۲۰۴ھ میں ہوئی۔ آپ کا مزار عالیہ مصر کے مضافات میں ھے۔ (سفینۃ الاولیا، صفحہ ۳۳)

۲۱۔ تاریخ فیروز شاھی کے مؤلف اور شیخ نظام الدین اولیا کے مرید تھے۔ آپ کی ذات گرامی مجموعہ لطائف و ظرافت تھی۔ اپنی لطافت طبع اور فن ندیمی کے سبب مستقل طور پر سلطان محمد تغلق کے ندیموں میں داخل ہو گئے۔ فیروز شاہ کے عہد میں گوشہ گیر ہوگئے اور دنیا سے مجرد و منزہ ہو کر رحلت کی۔ کہتے ھیں کہ آپ کے جنازے پر بوریا کے سوا کچھ نہ تھا، شیخ نظام الدین اولیا کے روضہ کے قرب میں مدفون ہوئے۔ (اخبار الاخیار، صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴)

۲۲۔ امیر خسرو برصغیر پاکستان و ہند کے سب سے بڑے فارسی گو شاعر، جن کا لوھا ایران والوں کو بھی ماننا پڑا، ۶۵۱ھ میں پٹیالی کے مقام پر پیدا ھوئے۔ آپ کے والد امیر سیف الدین محمود ترکستان کے رھنے والے تھے۔ حملۂ مغول کے موقع پر بھاگ کر ھندوستان آ گئے اور یہیں امیر خسرو کی ولادت ھوئی۔ کہتے ھیں آپ کی پیدائش کے وقت آپ کے والد آپ کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنے محلے کے ایک مجذوب اور صاحب نعمت بزرگ کے پاس لے گئے۔

انھوں نے بچے کو دیکھتے ھی فرمایا ''تم ایسے بچے کو لائے ھو جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے ھوگا ۔'' لڑکپن ھی سے شعر و شاعری کا لپکا پڑ گیا تھا ۔ آٹھ سال کے تھے کہ والد ایک معرکے میں شہید ھو گئے ، جس کے سبب اپنے نانا عماد الملک کی نگرانی و سرپرستی میں آ گئے اور یہ سرپرستی ان کے لیے بڑی نعمت ثابت ھوئی ۔ عماد الملک امراء بلبنی میں سے تھے ۔ ان کی مجلس میں علما ، شعرا اور ارباب نشاط سبھی شریک ھوتے تھے ۔ ایسی محفلوں میں خسرو کو علم و ادب اور موسیقی کے ذوق کی نشو و نما کا موقع ملا ، جس کے سبب صغر سنی ھی میں بڑے بڑے اساتذہ کے تتبع میں شعر کہنے شروع کر دیے تھے ۔ آپ حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے اور اپنے مرشد سے انھیں والہانہ لگاؤ تھا ۔ خسرو مختلف سلاطین کے درباروں سے بھی وابستہ رہے ، جن میں شہزادہ بغرا خان اور سلطان بلبن وغیرہ قابل ذکر ھیں ۔ ایک موقع پر جب یہ غیاث الدین کے بیٹے محمد قاآن ، جو خان شہید کے نام سے مشہور اور ملتان کا حاکم تھا ، سے وابستہ تھے ، منگولوں نے ملتان پر حملہ کر کے جہاں شہزادہ مذکور کو شہید کردیا وھاں خسرو کو بھی گرفتار کر کے لے گئے ۔ یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں رونما ھوا ۔ دو برس ان کی قید میں رہ کر دھلی آئے اور بعد میں بھی اسی طرح سلاطین کے ندیم وغیرہ رہے ۔ وفات سے پہلے غیاث الدین تغلق کے ساتھ بنگال کا سفر کیا ۔ ابھی وھیں تھے کہ حضرت نظام الدین اولیا کے وصال کی خبر ملی ۔ خبر سنتے ھی دھلی کا رخ کیا ۔ یہاں پہنچ کر ماتمی لباس پہنا اور مرشد کے مزار پر مجاور بن بیٹھے ۔ اس واقعہ کے چھ ماہ بعد ۷۲۵ھ میں خود بھی جہان فانی سے کوچ کیا ۔ شبلی اور وحید مرزا نے مہینے کا نام ذیقعد لکھا ھے ، لیکن اخبارالاخیار کے مؤلف کے مطابق خسرو نے ۱۸ شوال سنہ مذکور کو وفات پائی ۔ نظام الدین اولیا کے مزار کے پائین دفن ھوئے ۔ بے شمار تصنیفات کے مالک ھیں ۔ نثر میں ایک ضخیم تصنیف 'اعجاز خسروی' کے علاوہ 'خزائن الفتوح' یا 'تاریخ علائی' اور 'افضل الفوائد' (حضرت نظام الدین اولیا کے ملفوظات) وغیرہ ھیں ۔ پانچ دیوان (۱) تحفۃ الصغر (۲) وسط الحیات

(۳) غرة الکمال (۴) بقیہ نقیہ اور (۵) نہایۃ الکمال ۔ دس گیارہ مثنویاں لکھیں، جن میں پانچ نظامی کے خمسہ کے جواب میں ہیں ۔ (۱) مطلع الانوار (۲) شیرین و خسرو (۳) آئینۂ سکندری (۴) ہشت بہشت (۵) مجنون و لیلیٰ (۶) قران السعدین (۷) مفتاح الفتوح (۸) عشیقہ (۹) نہ سپہر (۱۰) تغلق نامہ وغیرہ ۔

(شعر العجم ، لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو ، اخبار الاخیار ، سفینۃ الاولیا ، تذکرہ علمائے ہند ، مفتاح التواریخ)

ضیاء الدین نخشبی (صفحہ ۴۹)

۱ ۔ جس ہستی نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے ، وہ مجھے میری روزی بھی پہنچائے گی ۔

۲ ۔ بلی کا سا انداز ۔

۳ ۔ یعنی شیر کی کھال ۔

۴ ۔ دولت مندی ، فخر و مباہات وغیرہ ۔

۵ ۔ نماز فجر ۔

۶ ۔ حملۂ مغول کے اسباب اس سے پہلے ایک حاشیہ میں دیے جا چکے ہیں ۔ یہاں بادشاہ سے مراد سلطان محمد خوارزم شاہ ہے ۔

۷ ۔ لغوی معنی نگہداشت ، حفاظت ۔

۸ ۔ شیخ الرئیس ابو علی حسین بن عبداللہ بن سینا صرف ایران ہی نہیں ، تمام دنیا کے دانش‌مندوں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ۳۷۰ھ کے قریب بخارا کے ایک قصبہ خرمیثن میں پیدا ہوئے ۔ جوانی میں علوم قرآن اور ادب میں مہارت بہم پہنچائی ۔ پھر فقہ ، منطق ، نجوم ریاضی اور طب وغیرہ کے علوم حاصل کیے ۔ جب شہرت بڑھی تو سامانی خاندان کے بادشاہوں نوح بن منصور وغیرہ کے معالجے پر مامور ہوئے اور کامیاب ٹھہرے ۔ پہلے آپ بخارا رہے پھر کرکانج میں خوارزم شاہیوں کے یہاں صدرنشین رہے ۔ ۴۰۵ھ اور ۴۱۲ھ کے درمیان

همدان اور اصفہان میں دیلمی حکومت کی وزارت پر مامور رہے۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد ۱۰۰ سے اوپر ہے، جن میں سے شفا اور قانون اور اشارات زیادہ مشہور ہیں۔ ۴۲۸ھ میں همدان میں فوت ہوئے۔
(شفق ۱۰۴-۱۰۶، صفا جلد اول، صفحہ ۳۰۳، ۳۰۵)

۹ - مشہور صوفی شاعر شیخ ابو سعید فضل اللہ بن ابی الخیر ۳۵۷ھ میں مہنہ (خراسان) میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شمار اولین صوفی شعرا میں ہوتا ہے۔ آپ کی وفات بھی مہنہ ہی میں ۴۴۰ھ میں ہوئی۔ کہتے ہیں کہ بیماری کے موقع پر آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے تابوت کے سامنے قرآن شریف میں سے کیا پڑھا جائے؟ آپ نے فرمایا کہ قرآن شریف اس سے کہیں زیادہ عظیم ہے کہ وہ مجھ پر پڑھا جائے، بس یہی شعر کافی ہے:

بہتر از این در جہان همه چه بود کار
دوست بر دوست رفت یار بر یار
آن همه اندوه بود و این همه شادی
آن همه گفتار بود و این همه کردار

(شفق صفحہ ۱۱۵ - ۱۱۷)

ضیاء الدین برنی (صفحہ ۱۱)

۱ - ملتزمین، ہر وقت ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے اور غیرملتزمین اس کے برعکس۔

۲ - التمش یا ایلتتمش کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ چاند گرہن کی رات کو پیدا ہوا اور ترک ایسے بچے کو اس نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا باپ قبائل ترکستان البری کا سردار تھا۔ یہ اپنے باپ کا چہیتا تھا، جس کے سبب اس کے بھائی اس سے حسد کرتے تھے۔ چناں چہ انہوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو حضرت یوسف کے بھائیوں نے آپ کے ساتھ کیا تھا، یعنی کسی بہانے گھر سے باہر لے جا کر کسی تاجر کے پاس فروخت کر دیا۔ تاجر نے بخارا میں اسے

صدر جہاں کے کسی عزیز کے ہاتھ فروخت کر دیا ۔ اس گھرانے میں اس کی بڑی اچھی پرورش ہوئی - یہاں سے یہ پھر بکتے بکاتے بغداد پہنچا ، جہاں اسے مشہور زمانہ مشائخ کے پاس پہنچنے کا موقع ملا ۔ اس کے آخری آقا نے اسے قطب الدین ایبک کے ہاس فروخت کر دیا ۔ یہاں اپنی غیر معمولی ذہانت کے سبب بہت جلد ترقی کر گیا ۔ کئی ایک مہات میں اس نے بہادری کے جوہر دکھائے ۔ شہاب الدین غوری کے ایما پر ایبک نے اسے پروانۂ آزادی دے دیا اور پھر یہ امیرالامرا کے خطاب سے نوازا گیا ۔ بہ قول فرشتہ ایبک نے اپنی لڑکی بھی اس کے نکاح میں دی ۔ قطب الدین ایبک کی وفات کے وقت ایلتتمش حکومت بدایون پر متمکن تھا ۔ چناں چہ سپہ سالار امیر علی اسماعیل ، امیر داؤد دیلمی اور دیگر اعیان ملک کی استدعا پر یہ اپنے لشکر کے ساتھ بدایون سے دھلی پہنچا اور تخت سلطنت پر قابض ہو گیا اور سلطان شمس الدین کے خطاب سے ۶۰۷ھ میں تخت نشین ہوا ۔ جن سرداروں نے اطاعت قبول کی انھیں اچھی طرح نوازا اور جو مخالفت پر آمادہ ہوئے انھیں شکست دے کر ختم کیا ۔ ۶۱۸ھ میں جب ایران کا سلطان جلال الدین خوارزم شاہ ، چنگیز خاں سے منہزم ہو کر لاہور کی طرف آیا تو التمش بے شمار لشکر لے کر اس کے مقابلے میں نکلا ۔ جلال الدین جنگ کی تاب نہ لا کر سندھ اور سیوستان کی جانب بھاگ گیا ۔ ۶۲۶ھ میں خلیفۂ وقت کی طرف سے اسے جامۂ خلافت بھیجا گیا ۔ اس موقع پر اس نے بڑی شادمانی و مسرت کا مظاہرہ کیا ۔ امرا وغیرہ کو خلعتیں عطا کیں اور شہر کو آراستہ و پیراستہ کیا گیا ۔ آخر میں جب اس نے ملتان پر لشکر کشی کی تو راستے ہی میں بیمار ہوگیا اور ۲۰, شعبان ۶۳۳ھ (۱۲۳۶ ع) کو عالم بقا کو سدھارا ۔

التتمش ایک خدا ترس ، قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا ۔ اس نے اپنی جرأت و دلیری سے اس برصغیر کو منگولوں کی تباہی سے بچائے رکھا ۔ صوفیا کا بڑا معتقد اور پابند صوم و صلواۃ تھا ۔ ہر جمعہ جامع مسجد میں جا کر نماز ادا کرتا ۔ ایک موقع پر دھلی کے ملحدوں نے ، جن کا سردار نور نامی شخص تھا ، اسے مسجد میں عین اس

موقع پر قتل کرنا چاہا جب وہ نماز پڑھ رہا تھا ۔ لیکن بروقت پتا چل جانے سے الٹا وہ ملحد قتل کر دیے گئے ۔

(تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۶۳-۶۷ ۔ منتخب التواریخ ، اردو ترجمہ صفحہ ۶۴-۶۵ ۔ بزم مملوکیہ ۶۱-۶۷ ۔ آب کوثر ، صفحہ ۱۱۲)

۳ ۔ ایلتتمش کا وزیر ، یہ اپنے تدبر ، علم و فضل کے علاوہ علم دوستی اور علم پروری کے لیے بھی اس عہد میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا اور اس کا دربار علما ، فضلا اور شعرا سے مزین رہا ۔ شعرا اس کی شان میں قصیدے کہہ کر اس کے جود و کرم سے فیض یاب ہوتے تھے ۔ (بزم مملوکیہ صفحہ ۱۲۰-۱۳۱)

۴ ۔ غیاث الدین بلبن (۶۶۴ھ-۶۸۶ھ مطابق ۱۲۶۶ع-۱۲۸۷ع) کی زندگی کی ابتدا غلامی سے ہوئی ، لیکن بعد میں اپنے دبدبۂ شاہی ، شوکت و حشمت اور جلال و عظمت کے سبب سلاطین دہلی میں سب سے زیادہ ممتاز رہا ۔ یہ ترکستان کے قبیلۂ البری کے ایک بڑے گھر کا فرزند تھا ۔ اس کا باپ اس قبیلہ کے دس ہزار خاندانوں کا سردار تھا ۔ منگولوں کے حملے میں بلبن کسی منگول سپاہی کے ہاتھوں گرفتار ہوا ۔ اس نے اسے بغداد میں لے جا کر ایک متقی و پرہیزگار شخص خواجہ جمال الدین کے ہاتھ فروخت کر دیا ، جس نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پرورش کیا ۔ اس کی مذہبی تربیت اسی گھر میں ہوئی ۔ بعد میں خواجہ جمال نے بلبن کو دوسرے غلاموں کے ساتھ ہندوستان لا کر ۶۳۰ھ ایلتتمش کے پاس فروخت کر دیا ۔ ایلتتمش نے اسے اپنا ذاتی محافظ بنا لیا ۔ بلبن کا بھائی ایلتتمش کے دربار میں پہلے ہی پہنچ چکا اور ترقی کر کے امیرحاجب کے عہدے پر مامور ہو چکا تھا ۔ اس نے اپنے بھائی کو پہچان لیا ۔ اسی کے بعد بلبن کی عزت دربار میں اور بڑھ گئی اور وہ رفتہ رفتہ ایلتتمش کے چہل گانی امرا میں داخل ہو گیا ۔ ایلتتمش کی وفات کے بعد یہ گرفتار ہوا ۔ لیکن جلد ہی رہا ہو کر میر شکار کے عہدے پر مامور ہوا ۔ معزالدین بہرام شاہ ، علاء الدین مسعود اور ناصرالدین کے عہد میں روز بروز ترقی کرتا گیا ۔ ناصرالدین نے اسے اپنا داماد بنا لیا ۔

اس کے مرنے کے بعد امرا نے اسے بالاتفاق اپنا بادشاہ بنا لیا ۔
(بزم مملوکیہ ، صفحہ ۲۲۱-۲۲۲)

۵ ۔ ایک کام اور کام لینے والا ۔

۶ ۔ جاندار ۔ یہ بادشاہ کے ذاتی محافظ ہوتے ۔ صرف خوب صورت ، دلیر اور کڑیل جوان اس فوج میں بھرتی کیے جاتے اور انھیں پوری فوجی تربیت دی جاتی ۔ (ایڈمنسٹریشن ... صفحہ ۶۳)

۷ ۔ سہم الحشم اور چاؤش فوجی افسر ہوتے تھے ، جن کا کام فوجی دستوں اور فوجیوں کو لڑائی وغیرہ کے لیے صفوں میں ترتیب دینا ہوتا تھا ۔ نقیب ہلکے درجے کے ہوتے تھے ۔ ان کا کام فوجوں اور عوام کو احکام شاہی بہ آواز بلند سنانا تھا ۔
(ایڈمنسٹریشن آف دی سلطانیٹ آف ڈھلی ، صفحہ ۶۲ ، ۱۵۴)

۸ ۔ سلطان معزالدین ابوالحارث احمد سنجر ، سلجوقی خاندان کا نامور بادشاہ اور سلطان ملک شاہ کا بیٹا تھا ۔ ۴۷۹ھ میں بہ مقام سنجار (بلاد جزیرہ) پیدا ہوا ۔ ۴۹۰ھ میں خراسان و ماوراءالنہر کا حاکم بنا دیا گیا ۔ ۲۰ - ۲۱ برس وہاں حکومت کرنے کے بعد ۵۱۱ھ میں ایران کے تخت پر متمکن ہوا ۔ دوران حکومت کئی ایک فتوحات کیں ۔ اس کے دور کا سب سے بڑا واقعہ ترکان غز کا حملہ اور اس کی ان کے ہاتھوں گرفتاری ہے ۔ یہ واقعہ ۵۴۸ھ کے آخر میں وقوع پزیر ہوا ۔ غز لوگ ہر سال ۲۴ ہزار بھیڑ بکریاں سنجر کے مطبخ کے لیے بہ طور خراج دیا کرتے تھے ۔ ایک موقع پر شاہی ملازم نے ان لوگوں کی توہین کی اور ان سے رشوت چاہی ۔ انھوں نے اس شخص کو خفیہ طور پر ہلاک کر دیا ۔ بعد میں بلخ کے والی نے سلطان سے اجازت لے کر اپنا شحنہ ان کے پاس بھیجا ۔ پھر بھی انھوں نے پروا نہ کی ۔ آخر والی بلخ نے ان پر لشکر کشی کی ۔ لیکن وہ اور اس کا بیٹا دونوں مارے گئے ۔ سلطان یہ خبر سن کر اس طرف متوجہ ہوا ۔ غزوں نے سنا تو اپنے آدمی اس کے پاس بھیجے کہ ہم آپ کے مطیع و فرماں بردار ہیں ۔ قماج (والئی بلخ) نے ہمارے گھر کا قصد کیا تھا ، اس لیے

ہم نے اپنی عزت کے بچاؤ کے لیے مقابلہ کیا ، قصداً اسے نہیں مارا ۔ ہم ایک لاکھ دینار اور ایک ہزار غلام دیتے ہیں ، سلطان ہمیں معاف کر دے ۔ سنجر اس بات پر راضی تھا ، لیکن امرا نہ مانے ۔ جب غز نا امید ہو گئے تو انھوں نے مقابلے کی ٹھانی ۔ اس لڑائی میں سلطان سنجر گرفتار ہوا ۔ غز اسے مرو لے آئے اور اپنے آدمی متعین کیے۔ اس کے بعد غزوں نے مرو اور نیشا پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بے پناہ ظلم و ستم کیا ۔ سنجر دو سال ان کی قید میں رہا ۔ آخر ایک روز موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلنےمیں کام یاب ہوگیا ۔ اس کے تین ماہ بعد کسی مرض میں مبتلا ہو کر ۵۵۱ھ میں عالم بقا کو سدھارا ۔ مرو میں مدفون ہوا ۔ اس کی وفات سے ایک سال بعد تک اس کے نام کا خطبہ اطراف میں پڑھا جاتا رہا ۔ راحۃ الصدور کے مؤلف کے مطابق سنجر خدا ترس اور خجستہ لقا بادشاہ تھا ۔ علماے دین کا بڑا احترام کرتا ، زہاد اور ابدال کے ساتھ خلوت میں بیٹھتا ، لباس میں تکلف نہ برتتا ، ہمیشہ تخت پر بیٹھتا اور سلطنت کے تمام خصائص پورے کرتا ۔ آل سلجوق میں کوئی بادشاہ بھی طول عمر میں اس سے زیادہ متمتع نہ ہوا اور نہ کسی کو اس جیسا عیش و مال وغیرہ ہی نصیب ہوا ۔ اس کا زمانہ فارسی ادب کے لیےسنہری زمانہ تھا ، فارسی کے چوٹی کےشعرا اس کے دربار سے متعلق تھے۔ وہ شعرا کو انعام میں توڑوں کے توڑے دیا کرتا تھا۔ (’راحۃ الصدور و آیۃ السرور‘ از محمد بن علی بن سلیمان الراوندی ، مرتبہ محمد اقبال ، تصحیحات لازم از مجتبیٰ مینوی مطبوعہ تہران ۱۳۳۳ش ، صفحہ ۱۶۸ ‘ ۱۷۱ ‘ ۱۷۷ ببعد ، صفا جلد ۲ خلاصۂ تاریخ ایران ، صفحہ ۱۱۶ ۔ شعرالعجم ، جلد اول ، مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۶۱-۱۶۳)

۹ ۔ علاءالدین محمد بن علاءالدین تکش خوارزم شاہ (۵۹۶ھ-۶۱۸ھ) ، ۔ یہ وہ ہستی ہے جس کے غرور و نادانی کے باعث ایران والوں کو منگولوں کے ہاتھوں بہت بڑی ہلاکت کا سامنا کرنا پڑا ۔ چنگیز خان کےملک کے کچھ تاجر ایران آئے ، ایران کے سرحدی حاکم نے انھیں قتل کروا دیا ۔ چنگیز خان نے اپنا ایک ایلچی سلطان کے پاس بھیجا کہ اترار کے حاکم کو ہمارے سپرد کر دو ۔ سلطان نے اس ایلچی کو بھی

قتل کروا دیا اور نتیجے کے طور پر ۶۱۶ھ میں چنگیز خاں نے ایران پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ۔ سلطان کا شمار بہت بڑے فاتحین میں ہوتا ہے ۔ بڑا عابد ، عالم اور ادب پرور تھا ، لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا بے رحم اور بے سیاست تھا ۔ اس کی موت ، بیماری اور اندوہ کے عالم میں ہوئی ، جب کہ یہ چنگیزی فوجوں سے بھاگ کر نہرگرگان کے قریب پناہ لے رہا تھا ۔ (حجازی ، صفحہ ۱۱۱- روضۃ الصفا از میر خواند ، مطبوعہ نولکشور ، جلد چہارم ، صفحہ ۱۴۰)

۱۰ - دو (۲) نمازوں کے درمیان جتنا وقت ہوتا ہے ۔

۱۱- فصل مشبع ، بہ قول جناب پروفیسر رشید احمد صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی ، یہ ایک خاص اصطلاح ہے یعنی کسی کے آنے پر 'بسم اللہ' پڑھی جاتی ۔ اس 'بسم اللہ' کے پڑھے جانے کی رسم کو فصل یا فصل مشبع کہتے تھے ۔

۱۲ - اگر تو قدم ہماری آنکھوں پر رکھے تو میں راستے میں آنکھیں بچھاؤں گا تاکہ تو ان پر چلے ۔

۱۳ - نکیسا ، مشہور چنگ نواز جو قبل از اسلام ایران میں پیدا ہوا ۔ بہ قول براؤن اس کے حالات زندگی دست یاب نہیں ہیں ۔

۱۴ - یہ سب سازوں کے نام ہیں ۔

۱۵ - ایک خاص قسم کی شلوار ۔

۱۶ - یہ کیقباد کا دادبک تھا ۔ دادبک یا امیرداد ایک بہت بڑا عہدہ تھا ، جس پر بہت بڑے صاحب علم ، پرہیزگار اور عالی خاندان کے فرد کو متعین کیا جاتا ۔ اس کا کام دیوان مظالم میں گورنروں اور سالاروں وغیرہ کے خلاف شکایات سننا تھا ۔ سلطان کی غیرموجودگی میں دادبک ہی دیوان مظالم کی صدارت کرتا ۔ (ایڈمنسٹریشن...صفحہ ۱۶۱)

۱۷ - امیر خسرو ، ان کا ذکر کسی دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ ہو ۔

۱۸ - علاء الدین خلجی ، ۲۲ ذی الحجہ ۶۹۵ھ (۳ اکتوبر ۱۲۹۶ع)

کو دہلی میں تخت نشین ہوا ۔ جلال الدین فیروز خلجی کا بھتیجا تھا ، اسی نے اس کی پرورش بڑے احسن طریقے سے کی اور جوان ہونے پر اسے اپنا داماد بنا لیا ۔ جب جلال الدین تخت نشین ہوا تو اس نے اسے کڑہ کا حاکم بنا کر بھیج دیا ۔ بعد میں اودھ کی جاگیر بھی دے دی ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اس کے سر میں بادشاہت کا سودا سمایا ۔ اس نے اپنے بھائی الماس بیگ کی وساطت سے بادشاہ کو ورغلایا کہ وہ اسے (علاء الدین) ملے ، کیوں کہ بادشاہ کی ہیبت اس کے جی پر چھائی ہوئی ہے اور وہ خود ملنے سے ڈر رہا ہے ۔ جلال الدین جھانسے میں آ گیا ۔ جب علاء الدین کے پاس پہنچا تو اس نے اسے قتل کروا دیا اور خود دہلی کی طرف بڑھا ۔ اس وقت تک قدر خان تخت نشین ہو چکا تھا ۔ اسے شکست دے کر تخت پر متمکن ہوا ۔ اس نے سلطنت کو بہت وسیع کیا ۔ اکیس سال حکومت کرنے کے بعد مختلف بیماریوں مثلاً استسقا وغیرہ میں مبتلا ہو کر ۷۱۶ھ (۲ جولائی ۱۳۱۶ع) میں فوت ہوا ۔ (منتخب التواریخ ، صفحہ ۹۲ - ۱۰۸ - این ایڈوانس ہسٹری آف انڈیا ، صفحہ ۲۹۷ ، ۳۰۹)

۱۹ ۔ اس کا اصلی نام تموچین تھا ۔ ۵۴۹ھ کے قریب پیدا ہوا ۔ اس کا تعلق زرد رنگ کی اس قوم سے تھا جو مغول اور تاتار کے نام سے پکاری جاتی اور چین ، منچوری اور سائبیریا کے درمیان آباد تھی ۔ اس کا باپ یسوکای بہادر اپنے قبیلے کا سردار تھا ۔ باپ کی وفات پر اس کی عمر تیرہ سال کی تھی ۔ شروع میں تو یہ مغلوں کو اپنے قابو میں نہ لا سکا ، لیکن بعد میں ایک دو لڑائیوں میں کامیاب ہونے کے سبب اس کا سکہ بیٹھ گیا اور اسے چنگیز خاں کا لقب دیا گیا ۔
(روضۃ الصفا ، براؤن جلد سوم)

۲۰ ۔ چنگیز خاں نے ۶۱۶ھ میں ایران پر حملہ کیا ۔ اس کی وجوہات اکثر تواریخ میں یہ بیان کی گئی ہیں کہ سلطان محمد خوارزم شاہ نے اپنے کچھ آدمی چنگیز کے پاس چین کے متعلق تحقیق کرنے کے لیے بھیجے ۔ چنگیز نے ان کی بڑی عزت و تکریم کی اور ان کے ہاتھ

سلطان کو پیغام بھیجا کہ ہم صلح و دوستی کے شائق ہیں اور چاہتے ہیں کہ دونو مملکتوں کے درمیان تجارت کا دروازہ کھولا جائے۔ کچھ عرصے کے بعد چند مسلمان تاجر چنگیز کے پاس گئے- چنگیز نے ان کا سامان بڑی بڑی قیمتیں دے کر خریدا اور ان کے ساتھ اپنے چند تاجر ایران بھیجے ، جن کے ھاتھ خوارزم شاہ کو تحفے تحائف بھی ارسال کیے۔ لیکن جب وہ ایران کی سرحد اترار پر پہنچے تو حاکم اترار نے انھیں جاسوس قرار دے کر قتل کروا دیا ۔ چنگیز خان نے سلطان سے مطالبہ کیا کہ وہ حاکم اترار کو اس کے حوالے کر دے ، لیکن سلطان نے اس ایلچی کو بھی قتل کروا دیا ۔ اس پر چنگیز خان نے طیش کھا کر اپنے جرگہ کو طلب کیا اور صلاح مشورہ کے بعد ایران پر حملہ کر دیا ۔ اس کے بعد ایران کا جو حشر ھوا ، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی ۔ (روضۃالصفا جلد ۴)

۲۱ - سب سے پہلے جس منگول حکمران نے اسلام قبول کیا اس کا نام تکودار یا نکودر تھا ۔ اس نے اپنے نام کے ساتھ احمد کا اضافہ کر لیا ۔ یہ ۶۸۱ھ میں تخت نشین ھوا ۔ لیکن اس کے مسلمان ھونے سے سب منگول بگڑ گئے اور انھوں نے سازش کر کے اسے ۶۸۳ھ میں قتل کر دیا ۔ یہ چنگیز کے پوتے ھلاکو کا ساتواں بیٹا تھا ۔ اس کے بعد ۶۹۴ھ میں محمود غازان نے جو احمد تکودار کے بھتیجے ارغون کا بیٹا تھا ، جبری طور پر منگولوں کا سرکاری مذھب اسلام قرار دے دیا ۔ اس کے متعلق مشہور ھے کہ اس نے اپنی دس ہزار فوج سمیت مسلمان ھونے کا اعلان کر دیا تھا ۔ علامہ اقبال کا مشہور مصرع ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے'' اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ھے ۔ (روضۃ الصفا ، براؤن جلد چہارم)

۲۲ - محصّل کا کام کسانوں سے مالیہ نقدی یا جنس کی صورت میں وصول کرنا تھا ۔ (ایڈمنسٹریشن...صفحہ ۲۰۹)

۲۳ - مقدم ، گاؤں کا چوھدری یا مکھیا ھوتا تھا ۔ خوط ایک قسم کے ھندو ایجنٹ ھوتے تھے ، جن کا کام ماتحت علاقوں سے مالیہ وصول

کرنے اور مالیہ کی تعیین میں حکومت کی مدد کرنا تھا۔
(ایڈمنسٹریشن.........صفحہ ۲۰۷)

۲۴ - کری اور چرائی دونو تقریباً ملتے جلتے ٹیکس تھے جو مویشیوں کے چرانے اور ان میں اضافہ پر لگائے جاتے تھے -
(ایضاً ، صفحہ ۲۴۸ ، ۲۴۹)

۲۵ - متصرف ، سلطانی دور میں شاہی امور خانہ داری کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا - ہر شعبہ 'کارخانہ' کہلاتا ، مثلاً جس شعبہ کا کام خوراک اور چارا وغیرہ مہیا کرنا ہوتا اسے 'راتبی' کہتے - ایسے ہر شعبے میں ایک متصرف ہوتا جو حسابات کا ذمہ دار ہوتا اور بہ طور نگران اول کے کام کرتا -   (ایڈمنسٹریشن...صفحہ ۶۹)

۲۶ - دس امیروں پر ایک ملک ہوتا اور ہر ملک کو پچاس سے ساٹھ ہزار تنکہ تک تنخواہ ملتی - ملک نائب یا نائب الملک سر لشکر کو کہتے تھے - قریشی صاحب نے انگریزی میں اس کے لیے ''لارڈ لفٹیننٹ آف دی ایمپائر'' کے لفظ استعمال کیے ہیں - وکیل در ، شاہی امور خانگی کا سربراہ - اور ملک خاص حاجب ، منتخب دربان ہوتا تھا -
(ایڈمنسٹریشن...صفحہ ۱۰ ، ۶۱ ، ۶۲)

۲۷ - فوج کے کنٹرولر جنرل کا محکمہ تھا ، کسی گزشتہ حاشیے میں اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے -

۲۸ - اس فقرے کا مطلب آگے چل کر واضح ہو جاتا ہے ، وہ یہ کہ جو سوار یا سپاہی تنخواہ تو وصول کرتا رہے ، لیکن اپنے متعلقہ لشکر میں حاضر نہ ہو ، اس سے تین سال کی تنخواہ وصول کر لی جائے -

۲۹ - نظام الدین اولیا ، آپ کا نام محمد بن احمد بن دانیال تھا (خسرو آپ کو قطب زمن ، جنید ثانی اور پناہ ایمان کے القاب سے یاد کرتے ہیں) آپ کے آبا و اجداد اور نانا خواجہ عرب ، بخارا سے وارد ہند ہوئے - پہلے لاہور میں کچھ عرصہ رہے ، پھر بدایوں پہنچ کر مستقل سکونت اختیار

کر لی - یہیں خواجہ نظام الدین ۶۳۲ھ میں پیدا ہوئے (دارا شکوہ نے ۶۳۰ھ، فرشتہ نے ماہ صفر ۶۳۴ھ اور صاحب تصوف اسلام نے ۲۷ صفر ۶۲۶ھ تاریخ ولادت لکھی ہے) - صغر سنی ھی میں والد کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے۔ جب ذرا بڑے ہوئے تو والدہ نے مکتب میں بٹھا دیا - کلام اللہ کے علاوہ ظاہری علوم کی کئی کتب پڑھیں - ابھی ۱۲ برس کے تھے کہ کتاب لغت کا مطالعہ کرنے لگ گئے - علوم و فنون میں بحث و گفتگو کا بڑا شوق تھا ، جس کے سبب آپ کو ''نظام بحّاث و محفل شکن'' کہا جانے لگا - ۲۵ برس کی عمرمیں والدہ کے ساتھ دہلی آئے - یہاں فاضل اجل خواجہ شمس الدین خوارزمی (جنھیں غیاث الدین بلبن نے آخر میں شمس الملک کا خطاب دے کر منصب وزارت سونپا تھا) کے شاگرد ہوئے - اسی جگہ شیخ فرید الدین گنج شکر کے بھائی شیخ محیب الدین متوکل سے دوستی ہوئی - جب تھوڑے عرصے کے بعد آپ کی والدہ وفات پا گئیں ، تو تنہائی کے سبب متوکل رحہ سے آپ کی دوستی و اتحاد میں اور بھی اضافہ ہوا - اسی دوران میں شیخ فرید الدین گنج شکر سے ملاقات کا اشتیاق پیدا ہوا - اجودھن (پاک پٹن) پہنچے - مولانا عبد الماجد لکھتے ہیں : ''عمر کے بیسویں سال ۱۵ رجب ۶۵۵ھ کو اس سفر کی آخری منزل ختم ہوئی -'' (مولانا نے آپ کی تاریخ ولادت ۶۲۶ھ دی ہے ، اس لحاظ سے آپ کی عمر ۲۹ - ۳۰ بنتی ہے) - بروز جمعرات وقت نماز ظہر ملاقات سے فائز ہوئے - کہتے ہیں کہ جب گنج شکر کی خدمت میں پہنچے تو ہر چند آپ نے چاہا کہ شرح اشتیاق و اخلاص کریں ، لیکن کچھ ایسی دہشت طاری ہوئی کہ کسی صورت بھی کچھ بیان نہ کر سکے - حضرت فرید رحہ نے یہ حالت دیکھی تو کہا کہ یہاں جو بھی داخل ہوتا ہے اس پر دہشت طاری ہو جاتی ہے ''مرحبا ، خوش آمدی و صفا آوردی -'' آخر آپ ان کے مرید ہوئے اور ان سے خلعت خلافت پائی - جب مرتبۂ کمال کو پہنچے تو مرشد کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ اب دوسروں کی تکمیل کے لیے دہلی جاؤ - دہلی پہنچ کر مجاہدوں اور ریاضتوں میں مصروف ہو گئے - اخفائے حال کا اس قدر اہتمام کرتے کہ

جہاں ایک جگہ قیام فرمانے کے بعد لوگوں کو آپ کی بزرگی کا کچھ پتا چل جاتا ، وہاں سے نقل مکانی کر جاتے ۔ آخر جب خلقت کا ھجوم زیادہ رھنے لگا تو اشارۂ غیب پا کر شہر سے باھر جنوب میں غیاث پور میں سکونت پزیر ھو گئے اور مرتے دم تک اسی جگہ مقیم رھے ۔

ایک مرتبہ سلطان علاء الدین نے آپ سے ملاقات کرنا چاھی ۔ آپ نے فرمایا ''یہاں آنے کی ضرورت نہیں ۔ میں دعاے غیب میں مشغول ھوں ، اس کا زیادہ اثر ھے ۔'' سلطان نے پھر عاجزی کی تو آپ نے کہلا بھیجا ''غریب خانے کے دو دروازے ھیں ۔ ایک دروازے سے آپ آئیں گے تو دوسرے دروازے سے میں باھر نکل جاؤں گا ۔''

بہ قول فرشتہ ، غیاث الدین تغلق اگرچہ بہ حسب ظاھر آپ سے کچھ نہ کہتا تھا ، لیکن رنجش خاطر رکھتا تھا ۔ آخری عمر میں جب وہ بنگالہ سے عازم دھلی ھوا تو آپ کو کہلا بھیجا کہ ''میرے آنے تک دھلی نہ ٹھہریں ، غیاث پور سے باھر چلے جائیں ۔'' آپ اس وقت بیمار تھے ، آپ نے جواب کہلا بھیجا کہ ''ھنوز دلی دور است ۔'' چناں چہ اسے دھلی پہنچنا نصیب نہ ھوا اور راستے میں بہ مقام تغلق آباد اس کے اوپر محل گرا اور وہ جاں بحق ھو گیا ۔

منقول ھے کہ وفات سے پہلے چالیس روز کھانا نہ کھایا اور آخری وقت فرمایا کہ ''وقت نماز ھو گیا ھے ، میں نے نماز پڑھ لی ھے؟'' اگر لوگ کہتے کہ آپ نے نماز پڑھ لی ھے تو فرماتے ''ایک بار پھر پڑھ لوں ۔'' چناں چہ ھر نماز دو مرتبہ پڑھتے اور فرماتے ''ھم جا رھے ھیں ، ھم جا رھے ھیں ۔''

بہ قول فرشتہ جب ۹۵ برس کے ھوئے تو کوئی سات ماہ تک حبس بول وغیرہ میں مبتلا رھے ۔ آخری وقت میں اپنے خادم اقبال سے فرمانے لگے ''گھر میں جو کچھ ھے ، لوگوں میں بانٹ دے ۔'' اس نے کہا کہ نقدی وغیرہ تو ھر روز لنگر پر صرف ھو جاتی ھے ، البتہ غلہ پڑا ھے ۔ آپ نے فرمایا ''فوراً مستحقین میں بانٹ دے ۔'' پھر کپڑے وغیرہ جو کچھ موجود تھا ، اپنے مریدوں اور خلفا میں بانٹ دیا ۔

آپ نے بروز بدھ ۱۸ ربیع الآخر ۷۲۵ھ کو وفات پائی ۔ 'شہنشاہ دین' آپ کی تاریخ رحلت ہے ۔ (مولانا ماجد نے پھر یہاں ٹھوکر کھائی ہے ، انھوں نے آپ کا سنہ وفات ۷۳۵ھ دیا ہے ، جب کہ آپ کی عمر ۸۹ سال لکھی ہے ۔ اگر آپ کا سال ولادت مولانا کے مطابق ۶۲۶ھ ہو تو ۷۳۵ھ کے لحاظ سے آپ کی عمر ۱۰۹ ہو گی نہ کہ ۸۹)۔ موضع غیاث پور میں مدفون ہوئے ۔

آپ کے مریدوں میں نصیرالدین چراغ دھلی ، امیر خسرو ، حسن سجزی اور مولانا فخرالدین خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔
(اخبارالاخیار ، صفحہ ۵۳-۵۸ ۔ تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۳۹۱ ، ۳۹۲ ، ۳۹۸ ، جلد دوم ۔ آئین اکبری ، جلد سوم صفحہ ۲۷۹ ۔ سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۹۷ ۔ سیرالمتاخرین ، مطبوعہ لاهور ، صفحہ ۱۲۶ ۔ تذکرۂ علمائے ہند ، صفحہ ۲۳۰ ۔ تصوف اسلام ، طبع سوم ، صفحہ ۱۳۸ ، ۱۳۰ ، ۱۳۶ ، ۱۳۷ ۔ آثار الصنادید ، پہلا باب ، صفحہ ۳۴ ۔ مفتاح التواریخ ، صفحہ ۸۰ ، ۸۱ ۔ مجنون و لیلیٰ مرتبہ طاہر احمد اوغلی محرم اوف مطبوعہ ماسکو ۱۹۶۵ع ، صفحہ ۲۲)

۳۰ ۔ قوت القلوب ، تصوف کی کتاب تھی ، اس کے مصنف ابوطالب مکی (متوفی ۳۸۶ھ) تھے ۔

۳۱ ۔ احیاء العلوم الدین ، جو فقہ ، احکام ، اخبار ، کلام ، مذاهب اور خاص طور پر اخلاق اسلامی کے متعلق ہے ، حجۃ الاسلام امام ابوحامد محمد بن محمد بن محمد بن احمد غزالی (۴۵۰ھ - ۵۰۵ھ) طوسی نے شام میں بیٹھ کر لکھی ۔

۳۲ ۔ احیاء العلوم جو عربی میں تھی ، اس کا فارسی میں ترجمہ اور خلاصہ ہے ، اس کا نام کیمیائے سعادت ہے ۔

۳۳ ۔ عوارف ، سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ، ابوحفص شہاب الدین عمر سہروردی (متوفی ۶۳۲ھ) کی تالیف ہے ۔

۳۴ ۔ کشف المحجوب ، علی بن عثمان جلابی هجویری المعروف داتا گنج بخش (متوفی ۴۶۵ھ) کی ، تصوف پر ایک نہایت اہم کتاب ہے ۔

۳۵ - شرح تعرف یا ''نورالمریدین و فضیحة المدّعین'' ابوبکر بن ابو اسحاق محمد بن ابراهیم بن یعقوب بخاری (م ۳۸۰) کی مشہور عربی تالیف ''التعرف لمذهب التصوف'' کی فارسی شرح ہے ۔ اس شرح کے مؤلف امام ابو ابراهیم اسماعیل بن محمد بن عبد اللہ المستملی البخاری (م ۴۳۴ھ) هیں۔ یه شرح چار جلدوں میں ہے ۔

۳۶ - رساله قشیری ، شیخ ابوالقاسم عبدالکریم قشیری نیشاپوری (م ۴۶۵ھ) کی تالیف ۔

۳۷ - ''مرصاد العباد من المبداء الی المعاد'' فارسی میں تصوف کے عقاید و معانی پر شیخ نجم الدین ابوبکر عبداللہ بن محمد رازی معروف به 'دایه' (م ۶۶۵ھ) کی تالیف ہے ۔

۳۸ - عین القضاۃ ابوالفضائل عبد اللہ بن محمد میانجی همدانی مشہور عارف ، ادیب اور احمد غزالی کے پیرو تھے، ۵۲۵ھ میں آپ پر الحاد کی تہمت لگا کر آپ کو قتل کر دیا گیا ۔

۳۹ - مولانا نورالدین عبدالرحمان جامی (متوفی ۸۹۸ھ) مشہور صوفی شاعر کی ایک مختصر سی تالیف ہے ، جس میں تصوف و عرفان کے متعلق چند ایک چھوٹے چھوٹے مقالات اور لطیف و عارفانه رباعیات هیں ۔

۴۰ - قاضی حمید الدین ناگوری (متوفی ۶۰۵ھ) شمس الدین ایلتتمش کے عہد کے بہت بڑے صوفی اور شیخ شہاب الدین سہروردی کے مرید و خلیفه کی تالیف ہے ۔ اخبار الاخیار اور تذکرۂ علماے هند میں آپ کی جس اهم تصنیف کا ذکر کیا گیا ہے وہ 'طوالع شموس' ہے ، اس میں اسماے حسنیٰ کی شرح بیان کی گئی ہے ۔

۴۱ - امیر حسن سجزی ، امیر خسرو کے هم عصر اور حضرت نظام الدین اولیا کے مرید تھے ۔ فواید الفواد میں آپ نے حضرت شیخ رح کے ملفوظات نہایت متانت الفاظ و لطافت معانی سے جمع کیے هیں ۔ یه کتاب حضرت رح کے خلفا اور مریدوں میں دستور العمل ہے ۔

کہتے ہیں کہ امیر خسرو فرمایا کرتے تھے کہ کاش میری تمام تصنیفات حسن کے نام سے ہوتیں اور یہ کتاب میرے نام سے ہوتی - امیر حسن کی وفات ۷۲۷ھ میں ہوئی -

سراج عفیف (صفحہ ۱۶۰)

۱ - سلطان فیروز شاہ ۷۰۹ھ میں پیدا ہوا - غیاث الدین تغلق کا بھتیجا تھا - اس کے والد خراسان سے دھلی وارد اور علاء الدین کے دربار میں شاہانہ نوازشوں سے سرفراز ہوئے - سلطان کی ماں دیپال پور کے راجے رانا مل بھٹی کی لڑکی تھی - اس لڑکی کا نام بی‌بی نالہ تھا ، لیکن جب اس کا نکاح سلطان کے والد سپہ سالار رجب سے ہوا تو اس کا نام کد بانو رکھا گیا - فیروز سات سال کا تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا ، چناں چہ سلطان تغلق اور سلطان محمد نے اس کی پرورش کی - سلطان تغلق کی وفات کے بعد جب سلطان محمد نے دھلی کی عنان حکومت سنبھالی تو اس نے فیروز کو نائب امیر حاجب مقرر کر کے نائب باربک کا خطاب عطا کیا اور بارہ ہزار سوار اس کے ماتحت مقرر کیے - سلطان محمد اس پر بے حد مہربان تھا - جب اس نے سلطنت دھلی کو چار حصوں میں تقسیم کیا تو ایک حصہ فیروز کے سپرد کر دیا ، تاکہ وہ آئین و قواعد جہاں داری میں پختہ کار ہو جائے - سلطان محمد کی وفات پر اس کی عمر پنتالیس سال کی تھی - اس وقت منگولوں نے اودھم مچا رکھا تھا - چناں چہ اس صورت حالات کے تحت ملک کے خوانین و ملوک اور علما و مشائخ نے مجلس شوریٰ منعقد کر کے اسے اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا - یہ ۷۵۲ھ میں تخت پر بیٹھا - (تاریخ فیروز شاھی ازسراج عفیف ، صفحہ ۳۵-۴۳ ، منتخب التواریخ ، صفحہ ۱۴۸)

۲ - سلطانی دور میں شاھی محل کے معاملات خانہ داری کو مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاتا تھا اور ہر شعبہ کارخانہ کہلاتا تھا -
(ایڈمنسٹریشن ، صفحہ ۹۶)

۳ - فیروز شاہ کا وزیر تھا - یہ تلنگی تھا اور جاھلیت کے ایام میں

تلنگانہ کے راجا کا مقرب اور اس کا نام کنو کے تھا ۔ راجا کی وفات کے بعد محمد تغلق کے دربار میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا ۔ بادشاہ نے اس کا اسلامی نام مقبول رکھا اور اسے بے حد نوازا ۔ جوھر قابل دیکھ کر سلطان نے اسے دھلی کا نائب وزیر مقرر کیا ۔ تھا تو یہ ان پڑھ ، لیکن عقل و فراست میں بے مثل تھا ۔ سلطان محمد کے ابتدائی عہد میں اسے قوام الملک کا خطاب ملا ۔ پہلے ملتان کا جاگیردار اور پھر نائب وزیر بنایا گیا ۔ یہ اس عہدے کا صحیح طور پر اھل ثابت ھوا ۔ سلطان مذکور کی وفات کے بعد یہ فیروز شاہ سے مل گیا ۔ فیروز شاہ نے اسے مسند وزارت عطا کی ۔ یہ بڑے رعب و دبدبہ اور جاہ و حشمت کے ساتھ مسند پر جلوس کرتا ۔ جاگیرداروں اور اھل معاملات سے بے حد سختی اور تاکید کے ساتھ حساب لیتا ۔ جب کبھی فیروز شاہ کسی مہم یا شکار کے لیے سفر کرتا تو خان جہان کو بہ طور نائب شہر میں متعین کرتا ۔ اور فیروز شاہ اپنے ابتدائی عہد حکومت کے سات سالوں میں صرف تیرہ روز شہر میں مقیم رہا ۔ گویا اتنا عرصہ خان جہان ھی کی حکومت رھی ۔ اس نے ۷۷۰ھ میں بہ عمر اسی (۸۰) سال وفات پائی ۔

(تاریخ فیروز شاھی از سراج عفیف اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۶۷-۲۸۲)

۴ ۔ نوروز (یا نوگ روز) ، ایرانیوں کا سب سے مقبول تہوار ھے ۔ یہ قبل از اسلام بھی بڑی دھوم سے منایا جاتا تھا اور آج بھی اسی زور شور سے منایا جاتا ھے ۔ اسی سے سال کا آغاز ھوتا ھے ۔ پہلوی کتاب دین کرت کے مطابق اس روز تمام بادشاہ اپنی اپنی رعیت کو خوش کرتے تھے ۔ اور کام کرنے والے لوگ یہ دن خوشی اور آرام سے بسر کرتے تھے اس دن وصول شدہ مالیات کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا تھا ۔ صوبوں کے نئے گورنر مقرر کیے جاتے تھے ۔ نئے سکے ڈھالے جاتے تھے اور آتش کدوں کو پاک کیا جاتا تھا ۔ نو روز کا جشن چھ دن تک رھتا ۔ ان ایام میں شاھان ساسانی باضابطہ دربار کرتے تھے ، جس میں امرا اور شاھی خاندان کے افراد ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ باریاب ھوتے تھے اور انھیں انعام و اکرام سے نوازا جاتا تھا ۔ چھٹے دن بادشاہ کا ذاتی جشن ھوتا تھا ،

جس میں صرف اس کے مقربین شامل ہوتے ۔ اس جشن کی جتنی بھی مقبول رسوم تھیں ، وہ خاص طور پر پہلے اور آخری دن منائی جاتی تھیں ۔ پہلے دن لوگ بہت سویرے اٹھ کر نہروں اور ندیوں پر چلے جاتے ، نہاتے اور ایک دوسرے پر پانی چھڑکتے ، آپس میں ایک دوسرے کو مٹھائیوں کے تحفے دیتے ۔ ہر شخص صبح بیدار ہوتے ہی کلام کرنے سے پہلے شکر کھاتا یا تین مرتبہ شہد چاٹتا ۔ بیماریوں اور مصیبتوں سے محفوظ رہنے کے لیے بدن پر تیل کی مالش کی جاتی اور موم کے تین ٹکڑوں کی دھونی لی جاتی ۔ اسلامی عہد میں یہ جشن اعتدال ربیعی کے دن منایا جاتا رہا ۔ لیکن قمری حساب کے سبب اس کی تاریخ ہر سال بدلتی رہتی تھی ۔ اب ایران میں پھر سے تقویم شمسی کا رواج ہے اور سال کا آغاز نو روز ہی سے ہوتا ہے ۔ آج کل جشن نو روز تیرہ دن تک منایا جاتا ہے ۔ آخری دن کو 'سیزدہ بہ در' کہتے ہیں ۔ اس دن تمام ایرانی اپنے گھروں سے نکل کر سبزہ زاروں میں چلے جاتے ہیں ، جہاں عیش و نشاط اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی ہیں اور لوگ سبزہ سے کہتے ہیں ''زردی من مال تو ، سبزی تو مال من ۔'' یہ ایرانیوں کا گویا جشن ملی ہے ۔ برصغیر پاک و ہند میں بھی تمام سلاطین اور خاص طور پر مغلیہ خاندان والے نو روز کا جشن مناتے رہے ہیں ۔ صرف اورنگ زیب عالمگیر نے اس جشن کو ختم کیا ۔ اس سلسلے میں تفصیل کے لیے معاصر تواریخ کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے ۔ (ایران بہ عہد ساسانیاں اردو ترجمہ از ڈاکٹر محمد اقبال ، صفحہ ۲۲۵ ، ۲۲٦ ۔ فرہنگ آموزگار مطبوعہ ایران ، صفحہ ۳۳۳ ، ۳۳۴ ۔ نو روز پر مضمون از ڈاکٹر محمد اقبال مطبوعہ 'اورینٹل کالج میگزین' ایڈوانس ہسٹری...صفحہ ۳۹٦)

۴ (ا) ۔ آپ کا لقب مخدوم جہانیاں ہے ، آپ شب برات ۷۰۷ھ میں بہ مقام اوچ پیدا ہوئے ۔ شیخ الاسلام رکن الدین ابو الفتح قریشی کے مرید اور حضرت شیخ نصیرالدین محمود کے خلیفہ تھے ۔ مکہ معظمہ میں آپ نے امام عبد اللہ یافعی کی صحبت پائی ۔ خزانۂ جلالی میں جو آپ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے ، آپ سے بہت سی روایات منقول ہیں ۔ آپ نے

بہت سیر و سیاحت کی اور اکثر اولیاء اللہ سے نعمت و برکت حاصل کی۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہوئے، لیکن کچھ عرصہ کے بعد آپ نے سب کچھ ترک کر کے مکہ معظمہ کا سفر اختیار کیا۔ آپ کی وفات عید قربان کے دن ۷۸۵ھ میں بہ عمر ۷۸ سال ہوئی۔ (اخبار الاخیار، ۲۹۶، ۲۹۸)

عین الملک ماہرو۔(صفحہ ۱۹۵)

۱۔ سورۂ مائدہ پارہ ۶۔

۲۔ سورۂ بنی اسرائیل پارہ ۱۵۔

۳۔ سلطان غیاث الدین بلبن کا بڑا لڑکا سلطان محمد، اس کا لقب قاآن ملک تھا۔ بلبن نے اسے فتنۂ مغول کے تدارک کے لیے عصائے اختیار اوز سلطنت کے دیگر امتیازی نشانات اور ساز و سامان دے کر اپنا ولی عہد بنایا اوز سندھ مع توابع اس کے سپرد کر کے ملتان بھیجا۔ امیر خسرو اور میر حسن ملتان میں ان کے پاس پانچ سال تک رہے۔ جب منگول سردار ایثمر یا سمر نے تیس ہزار سواروں کے ساتھ دریائے راوی کو لاہور کے پل کے ذریعے عبور کیا اور اس شہر میں فتنۂ عظیم برپا کیا تو حاکم لاہور نے اس کی اطلاع اسے دی۔ یہ ایک کثیر لشکر کے ساتھ بڑی تیزی سے راوی کے کنارے پر واقع باغ سریر (غالباً بادامی باغ) پہنچا اوز یہیں کفار سے جنگ کرتے ہوئے شہید ہوا۔ یہ واقعہ بہ قول بدایونی ماہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ اور بہ قول فرشتہ کے ۶۸۴ھ کا ہے (۹ مارچ ۱۲۸۵ع)۔ یہ بڑا علم پرور، شعردوست، شعر فہم اور فیاض تھا۔ یہی وہ شہزادہ ہے جس نے دو مرتبہ ملتان سے بے شمار زر نقد شیراز بھیجا تھا اور سعدی رحمہ سے ملتان آنے کی درخواست کی تھی، جس پر سعدی نے بڑھاپے کا عذر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ امیر خسرو کی اچھی طرح دیکھ بھال اور خاطر مدارات کرے۔

(منتخب التواریخ، ۸۰ - ۸۱ - بزم مملوکیہ، صفحہ ۲۴۷ - ۲۴۸ - ''این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا'' صفحہ ۲۹۰-۲۹۱)

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری (صفحہ ۱۷۱)

۱ - آپ کا سنہ وفات ۷۸۲ھ ہے - (تذکرۂ علمائے ہند ، صفحہ ۸۴)

۲ - یعنی جو کوئی بھی آں حضرت صلعم کی پیروی کرتا ہے -

۳ - یمن کی بنی ہوئی چادر -

۴ - جس پر سواری کی جائے ، گھوڑا وغیرہ -

۵ - محنت سے حاصل کیے جانے والے -

حضرت نور قطب عالم (صفحہ ۱۷۸)

۱ - مولانا جلال الدین محمد ، آپ کے والد کا نام بہاء الدین محمد تھا - بہ قول شفق ۶۰۴ھ اور بہ قول صفا ۶۰۶ھ میں بلخ میں پیدا ہوئے - آپ کے والد بعض کے نزدیک علاء الدین خوارزم شاہ کی لڑکی کے نواسے تھے - چوں کہ یہ عوام میں بے حد مقبول تھے ، اس لیے خوارزم شاہ بعض لوگوں کے بھڑکانے پر آپ کا دشمن ہو گیا - اس کے علاوہ بلخ کے لوگوں نے بھی آپ سے اچھا سلوک نہ کیا ، جس کے سبب آپ اپنے بیٹے جلال الدین کے ساتھ جو اس وقت کوئی چودہ سال کے تھے ، وہاں سے حج کے ارادے سے نکل کھڑے ہوئے - نیشاپور میں آپ کی ملاقات شیخ فریدالدین عطار سے ہوئی - انھوں نے جلال الدین (رومی) کو گود میں اٹھایا اور دعا دی - اس کے بعد اپنی ایک مثنوی اسرار نامہ بہ طور ہدیہ دی - یہاں سے یہ لوگ ہوتے ہواتے قونیہ چلے گئے اور پھر وہیں کے ہو رہے - مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی - والد کی وفات (۶۲۸ھ) کے ایک سال بعد آپ سید برہان الدین محقق ترمذی (جو بہاء الدین ہی کے ایک شاگرد تھے) کے حلقۂ ارادت میں آ گئے اور اکتساب رشد و ہدایت کیا - یہ سلسلہ نو سال تک رہا - اس کے بعد رومی رحہ نے سیاحت اور کسب معرفت کی خاطر شام کا سفر اختیار کیا - کچھ عرصہ حلب اور دمشق میں رہنے کے بعد واپس قونیہ لوٹ آئے اور یہاں اپنے والد کی طرح علوم شرعی کی درس و تدریس

میں مشغول ہوگئے۔ اسی دوران میں آپ کی ملاقات ایک ایسی ہستی سے ہو گئی جس نے آپ کی کایا پلٹ دی ۔ یعنی شمس الدین بن علی بن ملک داد جو تقریباً ۶۴۲ھ میں وارد قونیہ ہوئے اور تمام زندگی رومی کے روحانی قائد اور مرشد رہے ۔ کہتے ہیں کہ شمس تبریزی عوام کے عقائد کے خلاف باتیں کیا کرتے تھے اور سماع کے بے حد رسیا تھے جس کے سبب لوگوں نے انہیں ۶۴۵ھ میں قتل کر دیا ۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ویسے ہی غائب ہو گئے تھے ۔ مولانا روم دو سال تک دن رات ان کے فراق میں روتے رہے ۔ اس واقعہ کے بعد مولانا عالم عرفان کے بلند مقام پر پہنچ گئے۔ آپ نے دیگر صوفیا کی طرح اپنا ایک خلیفہ بنایا ۔ پہلا خلیفہ صلاح الدین زرکوب تھا اور دوسرا حسام الدین حسن ۔ مؤخرالذکر ہی کی تشویق پر رومی نے اپنی شہرۂ عالم مثنوی لکھی ۔ اس کا آغاز ۶۵۷-۶۶۰ھ کے درمیان ہوا ۔ مثنوی کے بعد آپ کی سب سے بڑی تصنیف آپ کا مجموعۂ غزلیات ہے جو 'دیوان شمس' کے نام سے مشہور ہے ۔ مولانا روم نے ۶۷۲ھ (مطابق ۱۲۷۳ع) میں قونیہ ہی میں وفات پائی ۔ (شفق ، صفحہ ۲۹۲-۲۹۸ ۔ ''مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی'' از دکتر صفا اردو ترجمہ ، صفحہ ۱۰۲- براؤن جلد ۳ اردو ترجمہ ، صفحہ ۱۷۳ ۔ سوانح مولانا روم از علامہ شبلی)

۲ ۔ نام محمد ہے ، فریدالدین لقب اور فرید و عطار تخلص ۔ ان کے سنہ ولادت کے متعلق بہت اختلاف ہے ۔ بعض کے نزدیک ۵۱۲ھ یا ۵۱۳ھ ہے اور بعض کے مطابق ۵۳۷ھ ہے ۔ حالات زندگی بھی کم ملتے ہیں ۔ نیشا پور میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد نیشا پور کے ایک قصبے شادیاخ میں عطاری کی دوکان کرتے تھے ۔ ان کے مرنے کے بعد عطار اس دکان پر بیٹھے ۔ ان کا خاندان نہایت مذہبی تھا ، اسی مذہبی ماحول میں ان کی تربیت اور نشو و نما ہوئی ۔ مولانا شبلی نے شعرالعجم میں ان کے حالات میں کسی فقیر کے اچانک مرنے کا ذکر کیا ہے جس سے متاثر ہو کر شیخ فرید الدین نے اپنی طبابت کی دوکان لٹا دی اور اس طرح ان کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا ۔ لیکن یہ واقعہ صحیح معلوم نہیں ہوتا ، کیوں کہ جیسا کہ انہوں نے اپنی تصنیف

تذکرۃ الاولیا میں خود لکھا ہے ، وہ شروع سے صوفیا کے معتقد اور سلوک و عرفان کی منازل کے سالک تھے ۔ شیخ نے فقر و تصوف کے ساتھ ساتھ مطب اور دارو خانہ (عطاری) کا سلسلہ بھی جاری رکھا ۔ اس کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی مصروف رہے ۔ ان کی شہرت کا باعث ان کی مثنویاں ہیں جن میں انھوں نے اخلاق اور تصوف کو ملا کر لکھا ہے ۔ ان مثنویوں میں جگہ جگہ حکایات بیان کی گئی ہیں ۔ ان میں بعض یہ ہیں :

منطق الطیر (یہ سب سے زیادہ مقبول ہے) ، الٰہی نامہ ، اسرار نامہ مصیبت نامہ وغیرہ ۔ اس کے علاوہ نثر میں ان کی سب سے بڑی کتاب تذکرۃ الاولیا ہے ۔ ان کے سنہ وفات کے متعلق بھی تذکرہ نویسوں میں اختلاف پایا جاتا ہے ۔ مثلاً دولت شاہ کا کہنا ہے کہ عطار دسویں جمادی الثانی ٦٢٧ھ کو ایک منگول کے ہاتھوں مارے گئے ۔ بعض نے یہ واقعہ ٦٣٢ھ اور ٦١٦ھ کا لکھا ہے ۔ لیکن زیادہ قرین قیاس ٦٢٧ھ ہی ہے ۔ ان کا مقبرہ نیشا پور کے قریب موجود ہے ۔ عطار بہت بڑے صوفی شاعر مانے گئے ہیں ۔ اس سلسلے میں ان کی بزرگی کا اعتراف مولانائے روم نے بھی کیا ہے ۔ (تنقید شعرالعجم از حافظ محمود شیرانی ، صفحہ ٣٥٣ - ٣٥٣ ، ٣٦١ - ٣٦٢ ۔ صفا جلد دوم ، صفحہ ٨٥٨ - ٨٦٥ - شفق ، صفحہ ١٢٨ ۔ سفینۃ الاولیا ، صفحہ ٢١٣ ۔ شعرالعجم ، جلد دوم ۔ تذکرۃ الاولیا مرتبہ لکلسن ، صفحہ ۵ ۔ براؤن جلد دوم ۔ جستجو در احوال و آثار فرید الدین عطار نیشا پوری از سعید نفیسی ۔ تذکرۃ الشعرا از غنی فرخ آبادی ، صفحہ ٩٠ تذکرۃ الشعرا از دولت شاہ سمرقندی مطبوعہ لاہور ١٦٣)

٣ ۔ مردار ، ''الدنیا جیفۃ و طالبہا کلاب'' ۔ (دنیا ایک مردار ہے اور اس کے طالب کتے)

٤ ۔ کسی گزشتہ حاشیے میں آپ کا ذکر کیا جا چکا ہے ۔

۵ ۔ سیہ گلیم ، کالی گدڑی مجازاً بہ معنی بد بخت ۔

٦ ۔ وہ چیزیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ۔

۷ - قرآنی ، سنت اور اجماع کے علاوہ کوئی چیز -
۸ - طریقت کی ناپاکی دور کرنے والا غسل -

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (صفحہ ۱۹۱)

۱ - یعنی کوھیچ -
۲ - کوھیچ پاس بھی بیٹھے اور محفلوں میں بھی جائے -
۳ - جس کے ھاں کوھیچ پیدا ھو -
۴ - جامع ملفوظات -

۵ - حسان رضہ ، ابوالولید حسان رضہ بن ثابت ، انصار مدینہ کی شاخ خزرج سے تھے - مدینہ میں پیدا ھوئے - زمانۂ جاھلیت میں پرورش پائی - بڑے ھوئے تو شاعری کو پیشہ بنایا - آپ شعرائے مخضر (جس نے زمانۂ جاھلیت اور اسلام دونوں دیکھے ھوں) میں سے تھے - زمانہ جاھلیت میں غسّان اور حیرہ کے بادشاھوں کی مدح سرائی کی - غسان میں سب سے زیادہ آل جفنہ کی مدح کی اور زیادہ تر انھی کے پاس مدد مانگنے کے لیے جاتے - وہ بھی دل کھول کر اپنی بخششوں سے نوازتے - خود عیسائی مذھب پر رھنے اور حسان رضہ کے اسلام قبول کر لینے کے باوجود انھوں نے اپنے برتاؤ میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور ان کے قاصد قسطنطنیہ سے ھدیے اور تحفے لے کر آپ رضہ کے پاس آتے رھتے تھے -

جب آں حضرت (صلعم) ھجرت کر کے مدینہ پہنچے تو انصار کے ساتھ حسان بھی مسلمان ھو گئے اور اپنی زندگی آں حضرت (صلعم) کی مدح و حمایت میں وقف کر دی - پھر جب آں حضرت (صلعم) پر قریشیوں کی ھجو گراں گزرنے لگی تو آپ (صلعم) نے صحابہ کرام رضہ سے فرمایا ”جن لوگوں نے اللہ و رسول کی مدد اپنے ھتھیاروں سے کی ھے انھیں کیا چیز روکے ھوئے ھے کہ وہ اپنی زبانوں سے ان کی مدد نہ کریں ؟“ فوراً ھی حسان نے کہا ”میں اس خدمت کے لیے حاضر ھوں“ پھر اپنی لمبی زبان کو ناک کی نوک پر مارتے ھوئے بولے ”اس زبان

کے عوض اگر مجھے بصریٰ سے لے کر صنعا کے برابر لمبی زبان ملے تو بھی اسے قبول نہ کروں - بہ‌خدا اگر میں اسے چٹان پر رکھ دوں تو اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں اور بالوں پر رکھ دوں تو یہ بال مونڈ ڈالے -'' اس پر آں حضرت (صلعم) نے فرمایا ''مگر تم ان کی ھجو کیوں کر کرو گے؟ میں بھی تو انھی کے خاندان سے ھوں -'' حسان نے جواب دیا ''میں آپ کو ان میں سے اس طرح نکال دوں گا جس طرح گندھے ھوئے آٹے میں سے بال -'' آپ (صلعم) نے فرمایا ''اب تم ان کی ھجو کرو اور روح القدس تمھارے ساتھ ھیں -'' چناں چہ حسان نے ان کی ھجو کہہ کر انھیں سخت تکلیف پہنچائی اور ان کی زبانوں کو بند کر دیا - کفار کی اس ھجو نے آپ کو بڑی مقبولیت بخشی - بقیہ ساری عمر نہایت عزت کے ساتھ گزاری - بیت المال سے ان کی ضرورتیں پوری ھوتی رھیں ، تا آں کہ ۵۴ھ میں بہ عمر ۱۲۰ برس وفات پائی -

آخری عمر میں آپ بینائی سے محروم ھو گئے تھے - بزدل تھے ، کبھی کسی جنگ میں شریک نہیں ھوئے -

آپ کا دیوان تیونس اور اس برصغیر (پاکستان و ھند) سے شائع ھو چکا ھے - (تاریخ آداب اللغة العربیه از جرجی زیدان مطبوعه قاھرہ ، جزء اول ، صفحہ ۱۷۱ ، ۱۷۳ - تاریخ ادب عربی از استاذ احمد حسن زیات اردو ترجمہ از عبد الرحمان طاھر سورتی ، صفحہ ۲۶۲ ، ۲۶۳)

۶ - تمام نشہ آور چیزیں حرام ھیں -

۷ - حضرت امیر حمزہ رض ، عبد المطلب کے بیٹے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا اور رضاعی بھائی تھے - نبوت کے چھٹے سال مشرف بہ اسلام ھوئے - آں حضرت (صلعم) نے آپ کو اسد اللہ کا خطاب عنایت فرمایا - بڑے ھی با ھمت اور جری تھے - دین مہدی کا پہلا علم 'رایت الاسلام' آپ ھی کے ھاتھ میں دیا گیا - شوال ۳ھ (مارچ ۶۲۵ء) جنگ احد میں شہید ھوئے - سردار قریش ابو سفیان کی بیوی ھندہ نے آپ کا دل و جگر نکال کر دانتوں سے چبایا اور آپ کے کان ، ناخن اور جلد کے ٹکڑے کاٹ کر اور دھاگوں میں پرو کر بازوؤں اور

کانوں میں پہنچے ۔

آپ کو ابو عمر بھی کہا جاتا تھا ۔

(قاموس المشاہیر از نظامی بدایونی ، جلد اول ، صفحہ ۲۱۲)

۸ - حضرت فاطمہ رض ، حضرت خدیجہ رض کے بطن سے آں حضرت (صلعم) کی صاحب زادی تھیں ۔ فاطمہ رض نام اور زہرا لقب تھا ۔ سنہ ولادت میں اختلاف ہے ۔ بہ ہر حال اس پر اکثر متفق ہیں کہ نبوت سے ۵ برس پیشتر پیدا ہوئیں ۔

۱۵ برس کی تھیں کہ آپ کا نکاح حضرت علی رض سے کر دیا گیا ۔ حضرت علی رض نے آپ کی زندگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا ۔

آپ نے آں حضرت (صلعم) کی وفات سے چھ ماہ بعد ۳ رمضان ۱۱ھ (۲۳ نومبر ۶۳۲ع) کو وفات پائی ۔

آپ کے پانچ بچے تھے جن میں حضرت امام حسن رض ، حضرت امام حسین رض اور حضرت ام کلثوم رض مشہور ہیں ۔

(قاموس المشاہیر جلد دوم ، صفحہ ۱۱۷)

۹ - یعنی آپ کا شہید ہونا اور ہندہ کا آپ کے دل و جگر کو چبانا ۔

سید اشرف جہانگیری (صفحہ ۱۹۹)

۱ - تیمور کے حملۂ ہندوستان کے بعد اس برصغیر میں جو انتشار پھیلا اس سے فائدہ اٹھا کر خواجہ جہاں نے سلطنت دہلی سے کٹ کر جون پور میں آزاد حکمرانوں کے خاندان کی بنیاد ڈالی ۔ اس خاندان کا نام اس نے اپنے لقب 'ملک الشرق' کی مناسبت سے 'خاندان شرقی' رکھا ۔ خواجہ جہاں ۱۳۹۹ع میں فوت ہوا ۔ اس کے بعد اس کا لےپالک ملک قرنفل مبارک شاہ شرقی کے لقب سے تخت نشین ہوا ۔ ابراہیم شرقی اسی مبارک شاہ کا چھوٹا بھائی تھا ۔ ابراہیم ، مبارک شاہ کی وفات پر تخت نشین ہوا ۔ اس نے کوئی ۳۴ سال حکومت کی ۔ یہ شرقی خاندان کا سب سے زیادہ لائق حکمران ، ادب و ہنر کا مربی اور دلدادہ تھا ۔

اس کی اسی علم پروری کے سبب جون پور اسلامی علم و ادب کا ایک اہم مرکز بن گیا تھا۔ اس نے ۱۴۳۶ء میں وفات پائی۔ (این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا، صفحہ ۳۴۷ - ۴۸ - آب کوثر، صفحہ ۳۵۱)

۲ - نور الحق المعروف نور قطب عالم، شیخ علاء الحق کے فرزند اور مرید تھے۔ صاحب مفتاح التواریخ نے ان کا نام نورالدین احمد اور مقام ولادت لاہور لکھا ہے۔ ان کا شمار برصغیر ہند و پاک کے معروف و بزرگ صوفیا میں ہوتا ہے۔ جس طرح ان کے والد نے اپنے مرشد کی بے حد خدمت کی تھی، اسی طرح انھوں نے اپنے والد کی (جن کا شمار کبھی امرا و اراکین سلطنت میں ہوتا تھا لیکن بعد میں سب کچھ ترک کر کے شیخ سراج الدین عثمان کے مرید ہو گئے تھے) بہت زیادہ خدمت کی۔ بعد میں بھی والد کی خانقاہ کے درویشوں کی خدمتیں بجا لاتے، ان کے کپڑے دھوتے۔ پانی گرم کر کے انھیں دیتے۔ کوئی بیمار ہوتا تو پورے طور پر تیمارداری کرتے۔ آٹھ سال تک اس خانقاہ کے لیے لکڑیاں کاٹیں۔ ان کے بڑے بھائی اعظم خان وزیر سلطنت تھے۔ انھیں اس حالت میں دیکھ کر افسوس کرتے اور اپنے پاس آنے کی تلقین کرتے، لیکن یہ ہنس کر ٹال دیتے اور کہتے کہ خانقاہ کی ہیزم کشی میرے لیے وزارت سے بہتر ہے۔ ان کے مزاج میں درد و خلوص بہت تھا اور طبیعت میں بے حد مسکینی اور کسر نفسی تھی۔ یہ صرف ایک بڑے خدا رسیدہ اور خادم خلق بزرگ اور صاحب طرز اہل قلم نہ تھے؛ بلکہ واقعات نے انھیں ملکی معاملات میں بھی اہم حصہ لینے پر مجبور کیا۔ ان کی تاریخ وفات بعض کے نزدیک ۸۰۸ھ، بعض کے مطابق ۸۴۸ھ یا ۸۵۱ھ یا ۸۱۳ ہے۔ مؤخرالذکر تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ مزار مبارک پنڈوہ ضلع مالدہ میں ہے۔ (اخبار الاخیار صفحہ ۱۵۲، ۱۵۴ - مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۰۹ - آب کوثر صفحہ ۳۴۵، ۴۷، ۴۸، ۳۵۰-۳۵۴)

۳ - راجہ کنس یا گنیش رائے دیناج پور کا ایک ہندو زمیندار تھا۔ جس نے سازش کر کے سلطان غیاث الدین کو قتل کروا دیا تھا۔

غیاث الدین کے بعد تھوڑی سی مدت کے لیے دو بادشاہ تخت نشین ہوئے۔ لیکن بعد میں گنیش رائے برسر اقتدار آ گیا ۔ مسلمان مؤرخین نے لکھا ھے کہ اس نے بنگال میں باقاعدہ بادشاھت کی ، لیکن ایڈوانس ھسٹری کے مؤلفین کا خیال ھے کہ وہ باقاعدہ بادشاہ نہ تھا ۔ بلکہ مسلمان بادشاہ اس کے ھاتھوں میں کٹھ پتلی بن گئے تھے۔ بہ ھرحال اس نے مسلمانوں پر بڑا ظلم و ستم کیا - بہت سے علما و مشائخ کو مروا ڈالا ، یہاں تک کہ اس نے اس علاقہ سے اسلام کا نام و نشان ھی مٹا ڈالنا چاھا ۔ اس کی ان حرکات اور ظلم و ستم نے حضرت نور قطب عالم کو مجبور کیا کہ وہ ابراھیم شرقی کو مدد کے لیے لکھیں ۔ گنیش کو معلوم ھوا تو وہ ڈر کر حضرت کی خدمت میں حاضر ھوا ۔ لیکن آپ نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا کہ ''میں ایک کافر ظالم بادشاہ کی بادشاہ اسلام سے کس طرح سفارش کر سکتا ھوں ۔ اگر مسلمان ھوجاؤ تو کوئی بات ھے ۔'' چناں چہ گنیش اسلام قبول کرنے پر تیار ھوگیا لیکن اس کی بیوی مانع آئی ۔ آخر اس نے کہا کہ میں تو بوڑھا ھو گیا ھوں میں تو ترک دنیا کرتا ھوں ، آپ میرے بیٹے (جدو) کو مسلمان کر لیں ۔ چناں چہ جدو آپ کے ھاتھ پر مسلمان ھوا اور آپ کی سفارش پر جون پور کی فوج واپس چلی گئی ۔ بعد میں یہی جدو ، سلطان جلال الدین ابو مظفر محمد شاہ کے نام سے تخت نشین ھوا ۔ (این ایڈوانسڈ ھسٹری آف انڈیا ، صفحہ ۳۴۴-۴۵ - آب کوثر صفحہ ۳۵۱-۵۲)

۴ - تیمور (بہ معنی لوھا) ماوراءالنہر میں کش کے مقام پر ۲۸ شعبان ۷۳٦ھ کو پیدا ھوا ۔ باپ کا نام ترغائی تھا ۔ بعض مؤرخین نے اس کا سلسلۂ نسب چنگیز خاں سے ملایا ھے ۔ لیکن ابن عرب شاہ اس کے باپ کو اور اسے گڈریا بتاتا ھے اور یہ کہ دونوں بدمعاشوں کی ایک ٹولی سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس کے شروع کے حالات تفصیل سے نہیں ملتے ۔ جب وہ ۲۴-۲۵ سال کا ھوا تو اس کے جوھر کھلے ۔ پہلے وہ ماوراء النہر کے فرماں روا کے پاس رھا ۔ ۷٦۲ھ میں بھاگ کر کاشغر کے بادشاہ تغلق خاں سے متعلق ھو گیا ۔ جس نے اسے کش کا علاقہ دے دیا ۔ ۷۷۱ھ میں اس نے سلطان حسین کو (جو اس کا سالا تھا اور

ماوراء النہر پر مسلط ہو چکا تھا) قتل کر دیا اور خود ماوراء النہر کا حکمران بن بیٹھا - یہیں سے اس کی خود مختاری کا آغاز ہوتا ہے اور اسی موقع پر اس نے صاحب قران کا لقب پایا - چھ سات سال اس نے ماوراء النہر پر اپنا تسلط مضبوط کرنے میں صرف کیے - ۱۳۸۱ع میں ایران کی طرف پہلی مرتبہ توجہ کی - ایران پر کئی ایک یلغاروں کے بعد حلب اور دمشق کو تسخیر کیا - بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجائی - ۱۴۰۲ع میں ترکی سلطان بایزید کو انگورہ کے مقام پر شکست دی - ۸۰۱ھ میں برصغیر ہند و پاک پر حملہ آور ہوا اور پانی پت کے میدان میں تغلق سلطان محمود دوم کو شکست دے کر فاتح کی حیثیت سے واپس سمرقند لوٹا - غرض اسی طرح اس نے بڑی بڑی دور تک لشکر کشی کی - لاکھوں آدمیوں کو مروا ڈالا اور مقتولین کی کھوپڑیوں سے مینار بنوائے - اس نے ۷۱ سال کی عمر میں ۸۰۷ھ میں وفات پائی - (براؤن جلد سوم اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۶۸ ، ۳۰۱-۲۷۵ - خلاصہ تاریخ ایران از محمد حجازی صفحہ ۱۴۹-۱۴۳ - مفتاح التواریخ ، ۱۰۶)

۵ - رسول مقبول (صلعم) کے چار یار ، حضرت ابوبکر رض ، حضرت عثمان رض ، حضرت عمر رض اور حضرت علی رض -

۶ - دوازدہ (۱۲) امام ، (۱) حضرت علی رض (۲) امام حسن رض (۳) امام حسین رض (۴) امام زین العابدین رض (۵) امام محمد باقر رض (۶) امام جعفر صادق رض (۷) امام موسیٰ کاظم رض (۸) امام علی موسی رضا رض (۹) امام محمد تقی رض (۱۰) امام محمد نقی رض (۱۱) امام حسن عسکری رض (۱۲) امام مہدی عم -

۷ - اولیاء اللہ -

۸ - جہاد بالنفس -

۹ - اللہ کی طرف سے مدد ہے اور فتح قریب ہے -

۱۰ - ہم نے تمھیں ایک واضح و روشن فتح دی -

۱۱ - شہاب الدین سہروردی دو ہو گزرے ہیں - ایک تو

شہاب الدین یحیٰی بن حبش بن امیرک (مقتول ۵۸۷ھ) جو 'شیخ اشراق' کے لقب سے مشہور ہیں اور دوسرے ابوحفص محمد بن محمد شہاب الدین۔ متن میں جن کا نام آیا ہے وہ مؤخرالذکر شہاب الدین ہی ہیں۔ آپ کا عام لقب شیخ الشیوخ تھا۔

آپ قصبۂ سہرورد (زنجان) میں ماہ رجب ۵۳۹ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب بارہ واسطوں سے حضرت صدیق اکبر رض تک پہنچتا ہے۔ آپ سب سے پہلے اپنے چچا شیخ ابوالنجیب کے مرید ہوئے، جو خود مشہور صوفی اور صاحب نسب بزرگ تھے۔ پرورش بھی انھی کے سایۂ عاطفت میں پائی، لیکن آپ کا رجحان علم کلام کی طرف تھا۔ اس فن کی متعدد کتب یاد کر لی تھیں۔ آپ کے چچا آپ کو اس سے روکتے، لیکن آپ کی طبیعت نہ مانتی۔ آخر ایک دن وہ آپ کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح کی خدمت میں لے گئے۔ اس وقت آپ کی عمر تقریباً ۲۰ یا ۲۱ برس تھی۔ وہاں آپ کے چچا نے حضرت جیلانی سے عرض کی کہ میرا یہ بھتیجا علم کلام میں بڑا مشغول رہتا ہے۔ حضرت نے آپ سے پوچھا کہ کون کون سی کتابیں پڑھی ہیں؟ آپ نے سب نام گنوا دئے۔ کہتے ہیں انھوں نے نام سن کر اپنا دست مبارک آپ کے سینے پر پھیرا۔ ہاتھ کا پھیرنا تھا کہ سب کچھ ذہن سے محو ہو گیا اور آپ کا دل علم لدنی سے لبریز ہو گیا۔

آپ کی عمر کا بیشتر حصہ بغداد میں گزرا، جہاں عباسی خلیفہ الناصر لدین اللہ کی توجہ و احترام کے مورد ٹھہرے۔

آپ نے محرم ۶۳۲ھ میں بہ عمر ۹۳ سال وفات پائی۔ مزار بغداد ہی میں ہے۔

آپ اپنے دور کے بہت بڑے صوفی اور مرجع خلائق تھے۔ صوفیہ حضرات میں ایک مسلم امام سمجھے گئے ہیں اور دیگر صوفی فرقوں کی طرح ایک سلسلۂ سہروردیہ کے بانی ہیں۔ قصر عارفاں کا مؤلف آپ کو ''حضرت شیخ الشیوخ سالک راہ شریعت و طریقت سرتاج عارفاں مفتی صوفیاں'' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے۔

آپ کے مریدین و خلفا بے شمار اور نامور ہیں ۔ ان میں حضرت بہاء الدین زکریا ، شیخ حمید الدین ناگوری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

تصوف کی مشہور کتاب عوارف المعارف ، جو ۵۶۰ھ میں تصنیف ہوئی ، آپ ہی کی کتاب ہے ۔ یہ کتاب بہ قول مولانا عبدالماجد دریا بادی ، ہر طبقہ میں مستند سمجھی گئی ہے ؛ بلکہ اسے متاخرین کے سلوک کے علمی حصے کا بڑا ماخذ کہنا چاہیے ۔ یہ کتاب عربی میں ہے اور اس کے فارسی اور اردو میں کئی تراجم ہو چکے ہیں ۔ (سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۱۱۲-۱۱۳ ۔ شفق ، صفحہ ۳۶۵ ۔ صفا جلد دوم ، صفحہ ۲۷۷ ۔ تصوف اسلام از عبدالماجد دریا بادی ، صفحہ ۱۱۸-۱۲۰ ۔ قصر عارفاں از مولوی احمد علی مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۶۵ء ، صفحہ ۹۷ ۔ تاریخ ادبیات ایران از جلال الدین ہمائی ، چاپ دوم ، صفحہ ۱۹۳)

۱۲ ۔ جلالیہ فرقہ سے مراد غالباً شیخ جلال الدین تبریزی کے پیرو کار ہیں ۔ یہ بزرگ شمالی ہندوستان کے راستے بنگال میں وارد ہوئے ۔ ایرانی النسل تھے ۔ اپنے پہلے مرشد کی وفات کے بعد شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا ۔ انھوں نے مرشد کی بہت خدمت کی ۔ سیر و سیاحت کے دوران شیخ فرید الدین عطار سے ملاقات کی ۔ سب سے پہلے وارد دہلی ہوئے ۔ یہاں سے کچھ عرصہ بعد بدایوں اور پھر بنگالہ کا رخ کیا ۔ یہاں لوگ بہت بڑی تعداد میں ان کے مرید ہوئے ۔ اس جگہ انھوں نے ایک خانقاہ تعمیر کی اور لنگر کے لیے باغات خرید کر وقف کیے ۔ یہ جگہ بندر دیوہ محل کہلاتی ہے ۔ یہیں ان کا مزار ہے ۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ نے شیخ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے ۔ دیوتلہ میں ان کا چلہ خانہ ہے ۔ سنہ وفات کے متعلق صحیح معلوم نہیں ۔ سیرالعارفین ، آئین اکبری اور خزینۃ الاصفیا میں سنہ ۶۴۲ھ ہے ، لیکن ابن بطوطہ نے اپنی جس ملاقات کا ذکر کیا ہے ، وہ ۷۴۶ھ میں ہوئی ہے ۔ (آب کوثر ، صفحہ ۳۱-۳۳۶ ۔ سفرنامہ ابن بطوطہ (اردو ترجمہ) جلد دوم ، صفحہ ۳۸۵)

۱۳ - اس سے مراد غالباً شیخ علاء الدین علاء الحق کے پیروکاروں کا سلسلہ ھے ، جو مشہور بنگالی صوفی نور قطب عالم کے والد اور خود بہت بڑے صوفی تھے - ان کا شمار امرا و اراکین سلطنت میں ہوتا تھا - بعد میں سب کچھ ترک کرکے شیخ سارج الدین عثمان کے مرید ہوئے اور اپنے مرشد کی اتنی خدمت کی کہ دیکھنے والے متعجب ہوتے - مرشد کا کھانا گرم رکھنے کے لیے انگیٹھی اپنے سر پر اٹھائے رہتے تھے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے سر کے بال جل گئے - آپ ۱۳۹۸ء میں فوت ہوئے - مزار مبارک پنڈوہ میں ھے ، جو بنگال کے قدیمی دارالخلافہ گوڑ سے سات میل کے فاصلے پر بڑی زیارت گاہ ھے - (آب کوثر ، صفحہ ۳۴۵-۴۶)

محمود گاوان (صفحہ ۲۰۶)

۱ - جامی ، نورالدین عبدالرحمان جامی ، بہ قول صاحب رشحات آپ کا اصل نام عماد الدین تھا - مشہور نام نورالدین ہو گیا - آپ کے والد کا نام بعض کے مطابق احمد بن دشتی اور بعض کے مطابق نظام الدین احمد دشتی تھا -

آپ ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ کو جام کے ایک قصبے خرجرد میں پیدا ہوئے - (تصوف اسلام میں تاریخ ولادت ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ لکھی ھے - سنہ میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ھے - اسی طرح سنہ وفات ۱۹۴۲ع اور ۱۹۰۱ع دیا ھے - تعجب ھے کہ فاضل مؤلف نے ، کہ جن کی فضیلت و علمیت مسلم ھے ، ان فاحش غلطیوں کی طرف توجہ کیوں نہیں دی) - آپ نے اپنا تخلص ایک تو اسی علاقۂ جام کی مناسبت سے اور دوسرے شیخ الاسلام احمد جام سے عقیدت کے سبب جامی رکھا -

خرد سالی میں اپنے والد کے ہمراہ ہرات گئے اور پھر سمرقند پہنچے - وہیں علم و ادب کے حصول میں مشغول ہوئے ، اور علوم دینی اور تاریخ و ادب میں کمال حاصل کیا - اس کے بعد تصوف و عرفان کی طرف مائل ہوئے - اس سلسلے میں آپ نے سعد الدین احمد کاشغری

اور خواجه علی سمرقندی ایسے مرشدوں کی پیروی کی ، خواجه محمد پارسا سے ، جنھیں آپ نے اپنی چھوٹی عمر میں دیکھا تھا ، عقیدت تھی اور به قول مولانا عبدالماجد ''مگر سب سے زیاده ارتباط و اختصاص شاید خواجه عبیدالله احرار کے ساتھ تھا ۔''

طالب علمی کے زمانے میں بڑے ذہین اور قوی حافظه کے مالک تھے ۔ آپ کی ذکاوت ، جودت ذہن اور قوت حافظه وغیره کے عجیب و غریب واقعات تذکروں میں ملتے ہیں ۔ طبیعت میں شوخی و ظرافت بھی تھی ۔ جو ہمیں آپ کی تصنیف 'بہارستان' کے 'باب مطایبه' میں نظر آتی ہے ۔

آپ بہت زیاده ریاضت کر کے خود مرتبۂ ارشاد پر پہنچے ۔ آپ کا تعلق سلسلۂ نقشبند سے تھا ، لیکن طبیعت پر ذوق و وجد چشتیه کا غالب تھا ۔ آپ کے مرتبۂ کمال کا اندازه اس سے ہو سکتا ہے که خود آپ کے مرشد فرمایا کرتے تھے که ''شہباز ہمارے چنگل میں آ پھنسا ہے ۔'' خواجه عبیدالله احرار اتنی تعظیم کرتے که اپنے خطوط کو لفظ 'عرض داشت' سے تعبیر کرتے اور اکثر فرمایا کرتے ''خراسان میں تو آفتاب موجود ہے ، لوگ اسے چھوڑ کر ماوراءالنہر کے چراغ (عبیدالله) کے پاس کیوں آتے ہیں ۔'' اپنے احوال و کرامات کو لوگوں سے چھپانے کی پوری کوشش کرتے ۔ جہاں تک ہو سکتا کسی پر مرتبۂ کمال کو ظاہر نه ہونے دیتے ۔ ان سب باتوں کے باوجود آپ کی شہرت آپ کی زندگی ہی میں بہت دور دور تک پہنچ گئی تھی اور آپ مرجع خلائق تھے ۔

آپ نے حج بیت الله بھی کیا ۔ ایک مرتبه دمشق میں مقیم تھے که سلطان روم نے اپنے قاصد کے ہاتھ پانچ ہزار اشرفیوں کی نذر بھیجی که ہماری سرزمین کو بھی مشرف فرمائیں ۔ آپ قاصد کی خبر پا کر اس کے ورود سے پہلے ہی تبریز چل کھڑے ہوئے ۔ یہاں حاکم کردستان نے حد سے زیاده نیازمندی کا مظاہره کیا ۔ آخر به مشکل تمام اجازت لے کر خراسان پہنچے ۔ یہاں بھی بے شمار نذرانے آپ کی خدمت میں پیش کیے گئے ۔

آپ نثر کے علاوہ شعر پر بھی قادر تھے ۔ مثنوی ، غزل اور قصیدہ وغیرہ میں آپ نے اپنے قلم کے جوہر خوب خوب دکھائے ھیں ۔ سب سے زیادہ رنگ نعت کا تھا ، جس زور کی آپ نے نعتیں لکھی ھیں ، فارسی کے کسی دوسرے شاعر کے ھاں ویسی کم نظر آتی ھیں ۔ بہ قول براؤن آپ ان نادر طباعوں میں سے ھیں جو خاک ایران نے پیدا کیے ، کہ بہ یک وقت ایک عظیم شاعر ، اعلیٰ فاضل اور زبردست صوفی تھے ۔

آپ نے بروز جمعہ ۱۳ یا ۱۸ محرم ۸۹۸ھ بہ مقام ھرات وفات پائی۔ (میرخواند نے آپ کی عمر ۸۱ برس لکھی ھے ، لیکن سنہ ولادت ۸۱۰ھ دیا ھے ۔ غالباً سات کا لفظ چھپائی میں رہ گیا ھے) بہ قول میر خواند ھفتہ کی صبح کو سلطان بایقرا اور علی شیر نے آپ کے دولت خانہ پر پہنچ کر تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا ۔

تین دیوانوں اور سات مثنویوں (جنھیں ھفت اورنگ بھی کہا جاتا ھے) کے علاوہ نثر میں بھی آپ کی کئی ایک تصنیفات ھیں ۔ مثلاً نفحات الانس ، لوائح ، بہارستان (سعدی کی گلستان کے جواب میں) ۔ مثنویات ، یوسف و زلیخا ، لیلیٰ و مجنوں ، خرد نامہ اسکندری ، سبحۃ الابرار ، تحفۃ الاحرار ، سلامان و ابسال اور سلسلۃ الذھب ھیں ۔

آپ نے اپنے قصائد میں جن بادشاھوں کا ذکر کیا ھے ، ان میں ابوسعید تیموری (۸۵۵ھ-۸۷۲ھ) سلطان یعقوب آق قوینلو (۸۸۳ھ-۸۹۶ھ) سلطان محمد فاتح عثمانی (۸۵۵ھ-۸۸۶ھ) اور ابوالغازی سلطان حسین بایقرا خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ مؤخرالذکر کا وزیر میر علی شیر نوائی آپ کا بے حد معتقد تھا ۔ (روضۃ الصفا جلد ھفتم ، صفحہ ۸٦ ، ۸۷ ۔ رشحات از فخرالدین علی بن حسین واعظ کاشفی مطبوعہ نولکشور ، صفحہ ۱۳۳ ، ۱۳۷ ۔ مجالس العشاق ، صفحہ ۱۸۱ ۔ سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۸۲-۸۳ ۔ براؤن جلد سوم اردو ترجمہ از داؤد رھبر ، صفحہ ۔ شفق ، صفحہ ۳۵۰-۳۵۵ ۔ مفتاح التواریخ ، صفحہ ۔ مختصر تاریخ ادبیات فارسی از صفا اردو ترجمہ از ڈاکٹر نذیر میرزا برلاس ، صفحہ ۱۱۸-۱۱۹ ۔ تصوف اسلام از مولانا عبدالماجد دریا بادی طبع سوم ، صفحہ ۱۸۱-۱۸۵)

۲ - کرمان کا زیرہ مشہور ہے - فارسی میں ضرب المثل ہے ، ''زیرہ بکرمان بردن'' یعنی الٹے بانس بریلی -

۳ - بصرہ کی کھجوریں شہرت رکھتی ہیں -

۴ - جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اسے کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے -

۵ - مولانا جامی -

٦ - یہاں ''دیدار میسر کرے'' کی تکرار دانستہ کی گئی ہے - تاکہ عبارت کا تسلسل نہ ٹوٹنے پائے - ورنہ اس فقرے کا مبتدا ''خدائے مطلق اور......کا حکم نافذ کرنے والا سلطان'' ہے -

۷ - قوت ذائقہ -

۸ - جو میرے قریب ایک گز آیا ، میں اس کی طرف دو گز بڑھوں گا -

۹ - خوش خبری پہنچانے والی -

۱۰ - نقش الفصوص جو شیخ محی الدین عربی (متوفی ٦۲۸ھ) کی کتاب فصوص الحکم کا اختصار اور شیخ کے عقائد کی شرح و تفسیر ہے - اس کی شرح جامی رہ نے نقد النصوص کے نام سے کی -

۱۱ - نہ ہمیں تھکوٹ چھوئے گی اور نہ ہمیں اس میں بھوک کی تنگی ہو گی -

۱۲ - 'اپنے جوتے اتار دے' ، جب حضرت موسٰی علیہ السلام سے طور پر اللہ تعالٰی ہم کلام ہوا تھا ، تو انہیں یہ حکم دیا گیا تھا -

۱۳ - جس طرح کہ شرابخوار شراب سے علاج کرتا ہے -

۱۴ - میر تقی میر کا ایک شعر ہے :

متصل روتے ہی رہئیے تو بجھے آتش دل
ایک دو اشک تو اور آگ لگا جاتے ہیں

۱۵ - سورۂ 'الفجر' پارہ ۳۰، ''جس وقت زمین کو توڑ کر پارہ پارہ کر دیا جائے گا۔''

۱۶ - لوگوں کو ان کا صحیح مقام دو۔

۱۷ - اشارہ ہے قرآن شریف کی اس آیت کی طرف :
''لا صدقاتکم بالمن والاذیٰ'' ؟

۱۸ - ہمت کے بازو رکھنے والا۔

جزو دوم

دورۂ تیموریان ہند

ظہیرالدین بابر (صفحہ ۲۲۷)

۱ - یہاں لفظ ہدایا آیا ہے - اگر یہ ہدیہ کی جمع ہو تو تحفہ کے معنی ہوں گے - اگر ہَدِیَ کی جمع ہو تو اس کے معنی دلہن کے ہوں گے -

۲ - سورۂ یوسف -

۳ - یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے جسے چاھتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے -

۴ - تمام معاملات اپنے وقت کے مرہون ہوتے ہیں -

۵ - ''کیا اہل ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے جھک جائیں -'' (سورۂ عنکبوت)

۶ - جو دروازہ کھٹکھٹاتا ہے وہ داخل ہوتا ہے -

۷ - اے خدا مجھے اپنی رحمتوں سے مالا مال کر دے اور میں تیرا سب سے پہلا ماننے والا ہوں -

۸ - نیکی کی طرف راہ نمائی کرنے والا اس کے انجام دینے والے کی مانند ہوتا ہے -

۹ - جون لیڈن اور ولیم ارسکن نے لفظ نُوّاب (جمع نائب) کو نواب پڑھا ہے - ان کا ترجمہ ملاحظہ ہو :

And hopes are entertained..........that the blessing of these acts will terminate in the good fortune and greatness of the Nawab whose undertakings are successful, the emperor.

(میائرز آف ظہیرالدین محمد بابر ، صفحہ ۲۸۴)

۱۰ - ڈرو ، شاید تم کام یاب ہو جاؤ اور ان فتوحات پر شکر کرو اور سچی توبہ کرنے والے بادشاہ کے قول پر یقین کرو ۔

۱۱ - سورۂ بقرہ ، اور جنھوں نے سننے کے بعد اسے بدل دیا اس کا گناہ ان کے سر پر ہو گا ۔

۱۲ - مذکورہ بالا مترجمین نے ''چون توقیع اشرف اعلی رسد'' کا ترجمہ کیا ہے :

"And as soon as it reaches the seal.............."

(میائرز آو ظہیرالدین محمد بابر ، صفحہ ۲۸۵)

۱۳ - دیا جلانے والا ۔

۱۴ - فارسی عبارت میں لفظ 'پاے برہنہ' ہے ، لیکن ترکی سے انگریزی ترجمہ (از جون لیڈن وغیرہ) میں naked بہ معنی ننگا ہے اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے ۔ انگریزی ترجمہ کے لیے دیکھیں 'میائرز آو بابر' از جون لیڈن و ولیم ارسکن مطبوعہ ۱۹۲۱ء ، صفحہ ۲۴۲ ۔

ابو الفضل علامی (صفحہ ۲۳۴)

۱ - وہ مالی امداد جو خشک سالی کے موقع پر حکومت کی طرف سے کسانوں کو دی جاتی ہے تاکہ وہ اس سے بیج وغیرہ خرید سکیں ۔

۲ - تل ، روئی ، گنا وغیرہ ۔

۳ - جنجال ، بے موقع جھگڑے ۔

۴ - یعنی گم شدہ اور متوفی کا مال بحق سرکار ضبط ہو جاتا ہے ۔

۵ - شرف آفتاب ، منزل بطین میں برج حمل کے انیسویں درجے میں ہے -

۶ - آج کل اسے صرف اسفند یا اسفند ماہ کہتے ہیں -

۷ - ظفر نامہ ، تیمور کی ولادت سے وفات تک کی مفصل تاریخ دو جلدوں میں اور مؤلف شرف الدین علی یزدی (متوفی ۸۵۸ھ) ہے -

۸ - فردوسی طوسی کی مشہور و معروف کتاب اور ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے - فردوسی نے اس پر ۳۵ سال صرف کیے - جیسا کہ خود کہتا ہے - :

''سی و پنج (۳۵) سال از سرائے سپنج
بسی رنج بردم بامید گنج.........''

بہ قول حافظ محمود شیرانی ۳۶۵ھ سے پہلے اس نے شاہ نامہ شروع کر دیا تھا - فردوسی کی وفات ۴۱۱ھ یا ۴۱۶ھ میں ہوئی -

۹ - اخلاق ناصری ، فلسفۂ اخلاق سے متعلق مشہور کتاب ہے - نصیرالدین طوسی (متوفی ۶۷۲ھ) نے ۶۳۳ھ کے قریب لکھی -

۱۰ - کسی گزشتہ حاشیے میں ان کا ذکر ہو چکا ہے -

۱۱ - خاقانی سے مراد خاقانی کی مشہور مثنوی 'تحفة العراقین' ہے - یہ مثنوی ۵۵۱-۵۵۲ھ کے قریب لکھی گئی -

۱۲ - حدیقة الحقیقه ، ابوالمجد مجدود بن آدم سنائی (متوفی ۵۴۵ھ) نے ۵۲۵ھ میں تمام کی - یہ دس ہزار اشعار اور مطالب تصوف و عرفان پر مشتمل ہے -

۱۴ - اس فقرے کے آخری حصے کا ترجمہ بلوخمن نے یوں کیا ہے -

''......out of necessity make choice of the path of rectitude''

۱۵ - بلوخمن نے 'پرستار' کا ترجمہ Worshipper کیا ہے - حالاں کہ اس کے معنی صرف خدمت گار یا لونڈی باندی کے ہیں - (ملاحظہ ہو غیاث اللغات ، صفحہ ۱۳۳)

۱۶ - یعنی جب وہ کوئی کام کرتا ہے تو اس کا حقیقی فاعل خدا کو جانتا ہے اور خود کو ذریعہ ۔

۱۷ - بلوخمن نے 'سبک سری' کا ترجمہ 'Inconsiderateness' کیا ہے -

۱۸ - یعنی اپنی نرم طبعی کے سبب -

۱۹ - یعنی body politic -

۲۰ - عناصر اربعہ (۴) تو یہ ہیں : آب و آتش ، خاک و باد ، لیکن یہاں چوں کہ 'مزاج' کا ذکر ہے - اس لیے چار اخلاط مراد ہیں : سودا ، صفرا ، بلغم ، خون ۔

۲۱ - بلوخمن کے الفاظ ملاحظہ ہوں :

"And in the same manner that the equilibrium of the animal constitution depends upon an equal mixture of the elements, so also does the political constitution become well tempered by a proper division of ranks."

۲۲ - بہ طور نمائندۂ عدالت ۔

۲۳ - جس میں گھر کے افراد اور گزرگاہوں کے ناموں وغیرہ کی تفصیل ہو ۔

۲۴ - جو لوگ کسی مسافر کے وارد ہونے کے وقت وہاں موجود ہوں ۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مختلف تفتیش کنندوں کی وساطت سے مسافروں کے کردار و سیرت وغیرہ کی چھان بین کرائے ۔

۲۵ - کھود ، کرید ، تلاش ، جستجو ۔

۲۶ - یہاں لفظی ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "گز میں ، کہ سطور بعد میں جس کا ذکر آئے گا کمی بیشی نہ آنے دے ۔"

۲۷ - متن میں صرف 'بند کردن' ہے ۔ جیرٹ نے اس کا ترجمہ "......forbid the restriction of personal liberty" کیا ہے - اوپر کا ترجمہ اسی سے ماخوذ ہے ۔

۲۸ - 'آسیب رساندن' کا ترجمہ جیرٹ نے amputate کیا ہے -
جس کا مطلب یہ ہو گا کہ ''........کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں''
لیکن راقم کے خیال میں جلاد سے محض دوستی رکھنے کی اتنی کڑی سزا
کا تصور ابوالفضل کے ذہن میں نہ ہوگا - آسیب رساندن کے معنی
تکلیف یا صدمہ پہنچانے کے ہیں (ملاحظہ ہو بہار عجم ، صفحہ ۳۱) -
اسی لیے راقم نے یہ ترجمہ کیا ہے -

۲۹ - دین الہی ، یہ دین اکبر کے ساتھ ہی ختم ہوگیا - پیشترازایں
اکبر علمائے دین کا بے حد معتقد تھا - احکام شرع کو ادب کے کانوں
سے سنتا اور صدق دل سے بجا لاتا تھا - جماعت سے نماز پڑھتا ، خود
اذان کہتا اور مسجد میں اپنے ہاتھ سے جھاڑو دیا کرتا تھا - لیکن بعد
میں جب اس کے دربار میں علما کا زور و اقتدار حد سے زیادہ بڑھ گیا اور
انھوں نے دنیاوی حب و جاہ اور مال و دولت کی غرض سے بعض نازیبا
باتیں کیں ، علاوہ ازایں روز بروز ان میں آپس میں اختلافات بڑھتے گئے ،
دوسری طرف ملحدوں کی دراندازی میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا گیا
تو نتیجے کے طور پر اکبر کی نظروں میں اسلام اور علمائے اسلام کی
وقعت کم ہوتی گئی - آخر اس نے یہ سوچ کر کہ چوں کہ ہر
قوم و ملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کمی نہیں
رہی ہے ، اس لیے 'حق' ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر
موجود ہے اور حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں
محدود و منحصر کر دینا ضروری نہیں جو نسبتاً نیا ہے اور جس کے
نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں ، اس صورت میں
ایک مذہب کا انکار یا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا مناسب و معقول
نہیں ہے ، ایک نئے دین کی بنیاد ڈالی -

اس دین میں تمام مذاہب کی اہم باتوں کو یک جا کیا گیا -
مثلاً مسئلہ تناسخ پر اعتقاد ، وحدت الوجود کا اثر ، انسان کامل کا تصور
(یہ تصور شیخ تاج الدین نے پیش کیا - اس نے انسان کامل کو
خلیفۂ وقت سے تعبیر کر کے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا -

اور بعد میں اس سے بھی زیادہ درجہ دے کر بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا -) خیر و شر کی اضافیت (اسے یعقوب کشمیری نے پیش کیا - یہ فلسفہ یوں تھا کہ محمد رسول اللہ صلعم ، اللہ کے اسم 'الھادی' کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم 'المضل' کا - اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انھی دو اسما کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونو مظہر اپنے اپنے کام میں مصروف ہیں -) عقیدۂ تثلیث کا اثبات (یہ عسائیوں کا عقیدہ ہے -) آفتاب پرستی ، آتش کدہ کا قیام (آفتاب اور آگ کی پرستش) وغیرہ -

اب اس دین کے متعلق ملا بدایونی کا بیان ملاحظہ ہو - وہ جلوس کے اٹھائیسویں سال (۹۹۰ھ) کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ ھجرت پر ابھی پورے ھزار سال نہیں ھوئے تھے - مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ھجرت سے نہ سہی حضور اکرم صلعم کی بعثت سے تو پورے ھزار سال ھو چکے ھیں اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لائے ھوئے دین کی مدت ختم ھو چکی ہے - اس لیے وہ وقت آ چکا ہے کہ ھم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کریں - اس وقت ایسے کسی دعویٰ اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رھی تھی - سب سے بڑی رکاوٹ علما اور مشائخ کی تھی - جن کے اثر و اقتدار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا - ان علما کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا - اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوخی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلہ میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکہ پر الفی تاریخ (ھزارواں سنہ) ثبت کی جائے اور یہ ھزار سنہ بعثت ھجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے - اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیے گئے کہ انھیں دیکھ کر عقل حیران و سر بہ گریبان ھو جاتی تھی (اس سلسلے میں کئی ایک بدعتوں کا ذکر پہلے ھو چکا ہے) شراب نوشی جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر جائز قرار دی گئی - ذبیحہ گاؤ پر پابندی لگا دی گئی -

اس کی وجہ یہ تھی کہ اکبر کو شروع ھی سے رند مشرب ھندوؤں سے وابستگی تھی۔ علاوہ ازایں شاھی حرم میں جو ھندو عورتیں تھیں وہ اس کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ جو لوگ ڈاڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا، جس کے سبب ڈاڑھی منڈانے کا عام رواج ھو گیا۔ کتے اور سور کو پاک قرار دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو شاھی محل کے نیچے رکھا گیا۔ بادشاہ ھر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا۔ اس لیے کہ ھندوؤں کے نزدیک سور ان دس مظاھر میں سے ھے جن میں اللہ تعالیٰ نے حلول کیا ھے۔ نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کر دی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفہ سے ھے جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ھے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ھے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ھوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کر دیتا ھے۔ بلکہ مناسب تو یہ معلوم ھوتا ھے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانے کو لغو قرار دیا۔ اس لیے کہ مردہ جمادات میں شامل ھو جاتا ھے اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ھے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کر کے کھانا پکوانا چاھیے۔ اکبر نے ایسے کھانے کا نام 'آش حیات' رکھا۔ سونا اور ریشم پہننا فرض عین قرار دیا۔ عربی کے سنہ ھجری کو اکبر نے موقوف کرا دیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سنہ سے شروع کرایا جو ۹۶۳ھ میں ھوا تھا۔ مہینوں کا تعین عجمی بادشاھوں کے طریقے پر کیا گیا۔ عربی مہینوں کی مخالفت کی گئی۔ فقہ، حدیث اور تفسیر وغیرہ کی جگہ ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانہ وغیرہ کی تحصیل فرض ھو گئی۔ عربی کے خاص حرف مثلاً ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ لغت سے خارج کر دیے گئے۔ چناں چہ عبداللہ کو ابداللہ اور احدی کو اھدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ھوتا۔ غرض اکبر نے دین کے مسئلہ اور عقیدہ پر طرح طرح کے شبہات وارد کیے اور ھر ایک کا تمسخر اڑایا۔ (منتخب التواریخ، صفحہ ۲۹۶ ببعد، ۳۶۶ ببعد، دربار اکبری)

۳۰ - یعنی ان پانچوں چیزوں کے بارے میں طالب علم سے پوچھ گچھ کرتا رہے ۔

شیخ مبارک (صفحہ ۲۵۶)

۱ - شیخ مبارک ، اکبری دور کے بہت بڑے عالم تھے ۔ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق یمن سے تھا ۔ جن میں سے شیخ موسیٰ سندھ میں آ کر بس گئے تھے ۔ دسویں صدی کے آغاز میں ان کے والد خضر ناگور میں آ کر سکونت پزیر ہو گئے، یہیں ۹۱۱ھ میں شیخ مبارک پیدا ہوئے ۔ ان کا نام مبارک اللہ رکھا گیا ۔ ۹ برس کی عمر میں سرمایۂ کمال بہم پہنچایا ، ۱۴ برس کی عمر میں علوم رسمی حاصل کر لیے ۔ بہت سے بزرگوں سے اکتساب فیض کیا ۔ خاص طور پر شیخ عطن ، ابوالفضل کازرونی اور مولانا عماد طارمی سے کسب علوم کیا ۔ فن شعر و معما اور دیگر فضائل خصوصاً علم تصوف میں خوب مہارت حاصل کی ۔ بہ قول بدایونی توکل ، تقویٰ اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے ۔ پہلے پہل انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ۔ امر معروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رکھتے تھے ۔ اگر ان کی محفل وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی ، ریشم ، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آ جاتا تو اسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے ۔ نغمہ راگ وغیرہ سے کنی کترایا کرتے تھے، لیکن آخیر میں یہ حال ہو گیا تھا کہ کوئی راگ یا گانا سنے بغیر انھیں چین نہ پڑتا تھا ۔ کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے ۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے ۔ ان کی بذلہ گوئی اور نقلیں خاصی مشہور تھیں ۔ آخر عمر میں بینائی کمزور ہونے کے سبب گوشہ نشین ہو گئے اور اس فرصت میں قرآن کی تفسیر لکھی جو چار جلدوں پر مشتمل تھی ۔ ملا بدایونی نے اس کا نام 'العیون'، صاحب تذکرۂ علمائے ہند نے 'منبع العلوم' اور آزاد نے 'منبع نفائس العلوم' لکھا ہے ۔ اس تفسیر میں بڑی اچھی معلومات و مضامین درج ہیں ۔ بہ قول ملا عبدالقادر بدایونی انھوں نے اس کے دیباچہ میں ایسا مضمون لکھا ہے ۔ جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا ۔

ایک موقع پر بعض حاسدوں کے اکسانے پر اکبر ان سے ناراض ہو گیا - جس کے سبب انہیں اور فیضی و ابوالفضل کو بھاگنا پڑا ۔ کچھ عرصہ تک در در کی ٹھوکریں کھائیں ، لیکن جب اکبر کا دل ان کی طرف سے صاف ہوگیا تو انہیں طلب کر لیا گیا ۔ بعد میں دین اللہی اور محضر وغیرہ کا جو سلسلہ ہوا ، وہ رد عمل کے طور پر تھا ۔

پچاس برس تک آگرہ میں اپنے فیض سے طلبا کو سیراب کیا ۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے نادۂ روزگار اور فخرزمانہ انہی کے فرزند تھے۔

۱۷ ذی قعد ۱۰۰۱ھ کو لاهور میں اس جہان فانی سے کوچ کیا ۔ بدایونی لکھتے ہیں ''بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا ، لیکن افسوس دنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کا نہ رکھا ۔ لباس تو درویشی بنا رکھا تھا ، لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی واسطہ نہ رہا تھا ۔'' (منتخب التواریخ ، صفحہ ۶۰۲ - ۶۰۳ - تذکرۂ علمائے ہند ، صفحہ ۱۷۴ - دربار اکبری)

۲ - اهل علم کے درجات ہیں ۔

۳ - اللہ ، اس کے رسول صلعم اور حاکم وقت کی اطاعت کرو ۔

۴ - قیامت کے روز اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب شخص حاکم عادل ہوگا ۔ جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی ۔

۵ - جلال الدین اکبر ، امرکوٹ کے مقام پر بروز اتوار ۵ رجب ۹۴۹ھ کو پیدا ہوا ۔ یہ وہ وقت ہے جب ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سوری سے شکست کھانے کے بعد مختلف علاقوں میں سرگرداں رہ کر بھکر کی طرف گیا ہوا تھا ۔ تردی بیگ نے اسی منزل میں ہمایوں کو فرزند کی ولادت کی خبر دی ۔ ہمایوں نے اس کا نام اکبر رکھا اور جب وہ چول کے مقام پر پہنچا تو بیٹے کو بلوا کر اس کے دیدار سے آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی ۔ اس وقت ہمایوں کے لشکر میں بڑا انتشار تھا ۔ اس نے ایسے موقع پر هند میں رهنا مناسب نہ سمجھا اور قندھار کی ٹھانی ۔

لیکن اس کے بھائیوں نے اسے راستے ہی میں گرفتار کرنے کی سازش کی ۔ ہمایوں کو اس سازش کا علم ہو گیا اور اس نے قندھار کی بجائے عراق کا ارادہ کیا ۔ اس وقت اکبر کی عمر ایک سال تھی ۔ گرمی سخت پڑنے کے سبب ہمایوں نے اکبر کو اتکہ خاں کے سپرد کرکے لشکرگاہ ہی میں چھوڑ دیا ۔ ہمایوں کے جاتے ہی مرزا عسکری نے حملہ کر کے اس لشکر کو لوٹ لیا اور اکبر کو اپنے ساتھ قندھار لے جا کر اپنی بیوی کے سپرد کر دیا ۔ ۹۵۲ھ میں جب ہمایوں نے کابل کو فتح کیا تو اس وقت اس نے اکبر کو حاصل کیا ۔ ہمایوں کی وفات کے بعد اکبر ۲ ربیع الاول ۹۶۳ھ (۱۴ فروری ۱۵۵۶ع) کو باغ کلانور میں بیرم خاں خانخاناں کے مشورہ اور تائید سے تخت نشین ہوا ۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے کئی ایک مہمات سر کیں ۔ جن میں سے پانی پت کی دوسری لڑائی ، فتح مالوہ اور دکن کی مہمات قابل ذکر ہیں ۔ اکبر کی وفات ۱۷ اکتوبر ۱۶۰۵ھ کو ہوئی ۔ اکبر بڑا نڈر سپاہی ، فیاض اور دانا حکمراں تھا ۔ اپنی بے مثال روشن خیالی کے سبب تاریخ ہند و پاکستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتا ۔ بڑا علم پرور ، شعر دوست اور مربی فن تھا ۔ اس کا دور جہاں دیگر اصلاحات کے سبب ایک بے نظیر دور ہے وہاں فارسی ادب کے لیے سنہری دور تھا ۔ اس نے جو چند ایک مذہبی بدعتیں کیں وہ دراصل اس کے درباری علما کی تنگ نظری کا رد عمل تھیں ۔
(منتخب ۔ دربار اکبری ۔ این ایڈوانسڈ)

۶ ۔ محض اللہ کی خاطر ۔

ملا عبد القادر بدایونی (صفحہ ۲۵۸)

۱ ۔ عبد القدوس گنگوہی : آپ حضرت امام اعظم رض کی نسل سے اور شیخ محمد بن عارف بن شیخ احمد عبد الحق ردولوی کے مرید تھے ۔ آپ بہت بڑے صاحب علم و عمل اور اکابر علمای صوفیہ میں شمار ہوتے ہیں ۔ ظاهری و باطنی علوم پر گہری نظر رکھتے تھے ۔ شیخ احمد عبد الحق کی روحانیت پر آپ کو اعتقاد کامل تھا ۔

وجد و سماع کی محافل میں شرکت کیا کرتے ۔ آپ کی اولاد بہ کثرت ہوئی اور ان کے حصے میں علم بھی آیا اور عمل بھی ۔ خصوصاً شیخ زین رح فقر و سلوک کی راہ میں اپنے والد کے نقش قدم پر چلے ۔ آپ سے بے شمار کرامات ظہور میں آئیں ۔ کتاب انوار العیون آپ کی تصانیف میں سے ہے ۔ آپ کی وفات ۹۴۵ھ میں ہوئی ۔ دھلی کے مضافات میں گنگوہ نام کے ایک قصبے میں آپ کا مزارعالیہ ہے ۔ (سفینۃ الاولیا ،صفحہ ۱۰۱ تذکرۂ علماے ھند ، صفحہ ۱۳۰)

۲ ۔ ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔

۳ ۔ تمام جاھل جاہ طلب ہیں لیکن خود کو عالم کہلواتے ہیں ۔

۴ ۔ ان کا ذکر کسی گزشتہ حاشیے میں ہو چکا ہے ۔

۵ ۔ شبہات سزاؤں میں کمی کر دیتے ہیں ۔

۶ ۔ امام مالک ، مالک نام عبد اللہ کنیت ، امام دارالھجرۃ لقب ، والد کا نام انس تھا ۔ آپ کی ولادت ۹۳ھ مین ہوئی ۔ آپ کا تعلق ایک خالص عرب خاندان سے تھا جو جاھلیت و اسلام دونو میں معزز تھا ۔ بزرگوں کا وطن یمن تھا ۔ مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کی ۔ امام یمن کے اخیر خاندان شاھی یعنی حمیر کی شاخ 'اصبح' سے تعلق رکھتے تھے ۔ جس وقت آپ نے ہوش سنبھالا اس وقت تمام اکابر صحابہ جو علوم شریعت کے امین اور قرآن و سنت کے خزینہ دار تھے، اسی شہر اقدس میں سکونت پزیر تھے ۔ پھر خود آپ کا گھرانہ علم و فضل کا مخزن تھا ۔ آپ نے اپنے وقت کے اکثر فقہاے بزرگ سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ اب صرف ایک سینہ میں مجتمع ہو گیا ۔ اس لئے آپ کا لقب دارالھجرت ٹھہرا ۔آپ کے شیوخ کی تعداد یوں تو بہت ہے ، لیکن موطا میں آپ نے جن شیوخ سے روایت کی ہے ، وہ چند کے علاوہ سب کے سب مدینہ کے رہنے والے ہیں ۔آ پ کے چچا ابوسہیل نافع روایت اور حدیث کے شیخ تھے ۔ آپ نے ان سے حدیثیں سیکھیں ۔ آپ نے قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء ابو ردیم نافع بن عبد الرحمن

(متوفی ۱۶۹ھ) سے حاصل کی ۔ آپ کے دیگر شیوخ میں سے ، جن سے آپ نے حدیث سیکھی یہ ھیں ۔ محمد بن شہاب الزہری ، جعفر صادق بن محمد ، محمد بن منکدر ، محمد بن یحییٰ الانصاری ، ابوحازم ، یحییٰ بن سعید ۔

آپ کی لیاقت و استحقاق کا شہرہ جلد ھی پھیل گیا تھا ۔ جس کے سبب خود آپ کے شیوخ کی موجودگی میں ھی استفادہ کرنے والوں کا الگ حلقہ قائم ھو چکا تھا ۔ شیخ الفقہ ربیعہ (متوفی ۱۳۶ھ) ابھی زندہ ھی تھے کہ آپ فقہ و فتویٰ کے مرجع بن گئے اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو فقہ داری و اجتہاد کے مجمع علیہ آپ ھی تسلیم کر لیے گئے ۔ حضرت نافع کی وفات کے بعد آپ ان کے جانشین ھوئے ۔ اس لحاظ سے آپ نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلس درس قائم کی ۔

آپ کی محفل درس ھمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رھتی تھی ۔ جس پر آپ صرف املائے حدیث کے موقع پر رونق افروز ھوتے ۔ جا بہ جا شرکائے مجلس کے لئے پنکھے پڑے رھتے تھے ۔ جب حدیث کا درس ھوتا تو مجمع میں عود اور لوبان جلایا جاتا ۔ صفائی و نزاھت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بار خاطر ھوتا تھا ۔ جب حدیث نبوی صلعم کے املا کا وقت آتا پہلے وضو یا غسل کرکے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے ، بالوں میں کنگھی کرتے ، خوشبو لگاتے اور اس اھتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لئے باھر تشریف لاتے ۔ حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باھر نہیں کرتے تھے ۔ مہدی اور ھارون دونو نے خیمۂ خلافت میں املا کی خواھش کی لیکن آپ نے انکار کر دیا ۔ جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ھوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ یہ سوء ادب ھے ۔

۱۴۷ھ میں جعفر والیٔ مدینہ نے مسئلۂ طلاق کے بارے میں اختلاف کے سبب آپ کو ستر کوڑے مارنے کا حکم دیا ۔ آپ کو محکمۂ امارت میں گنہ گاروں کی طرح لایا گیا ۔ کپڑے اتارے گئے اور آپ کے کندھوں پر ستر کوڑے پورے کیے گئے ۔ آپ کی تمام پیٹھ خون آلود

ہوگئی ۔ دونو ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے ۔ اس کے بعد آپ کو اونٹ پر بٹھا کر آپ کی تشہیر کی گئی ۔ آپ جہاں سے گزرتے یہ فرماتے ''جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں فتویٰ دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں'' ۔ بعد ازاں آپ اسی طرح خون آلود کپڑوں کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف لائے ۔ پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی ۔ جب اس واقعہ کا علم خلیفہ منصور کو ہوا تو اس نے فوراً جعفر کو معزول کرکے بذات تمام گدھے پر سوار اور بغداد طلب کیا اور آپ کو معذرت کا خط لکھا ۔ آپ نے ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو بعمر ۸۶ برس وفات پائی ۔ آپ کو جنة البقیع (مدینہ میں ایک مقام) میں دفن کیا گیا ۔

آپ بڑے فیاض تھے ۔ ایک بار آپ امام شافعی کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے ۔ امام شافعی نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی ۔ آپ نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا ۔ ہر سال آپ امام شافعیؒ کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے ۔ آپ مہمان نواز بھی حد سے زیادہ تھے ۔ آپ کا رنگ سرخ و سپید ، قد بالا ، بدن بھاری ، پیشانی کشادہ آنکھیں بڑی ، ناک اونچی ، ڈاڑھی بڑی اور گھنی ، سر میں قدرتاً بال نہ تھے ۔ مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے ۔ خضاب کا استعمال نہ کرتے ۔ خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے ۔ ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے ۔ بعض لوگ اس پر ٹوکتے تو آپ فرماتے ''کہ میں مدینہ کے جس عالم سے ملا ، اس کو خوش پوشاک پایا'' ۔

(بہ حوالہ سیرت ائمہ اربعہ از سید رئیس احمد جعفری)

۷ ۔ ہمایوں چہارم ، ذیقعد ۹۱۳ھ منگل کی شام کو کابل میں پیدا ہوا ۔ اس کی ماں ماہم بیگم خراسان کے اشراف کی نسل سے تھی ، جن کا نسب احمد جام تک پہنچتا ہے ۔ اپنے باپ بابر کی وفات کے وقت یہ سنبھل میں تھا ۔ وفات کی خبر سنتے ہی آگرہ پہنچا اور وکیل سلطنت و وزیر مطلق امیر خلیفہ کے مشورہ و حمایت سے ۹ جمادی اول ۹۳۷ھ کو

به عمر ۲۳ سال تخت نشین ہوا ۔ جلوس کے موقع پر اس نے سونے سے بھری ہوئی کشتیاں تقسیم کرائیں جس کے سبب کسی نے اس کی تاریخ جلوس 'کشتیٔ زر' سے بھی نکالی ۔ انتظام سلطنت سے فراغت کے بعد ہی اسے مختلف مہمات میں مصروف ہونا پڑا ۔ جن میں مرزا عسکری کی سرکشی ، کامران میرزا کی بغاوتیں ، شیرشاہ سوری کا فتنہ اور اسی قسم کے دیگر واقعات ہیں ۔ انھی واقعات کے سبب اسے آرام میسر نہ ہو سکا ۔ شیر شاہ سے شکست کھا کر ایران بھاگ گیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد شاہ طہماسپ کی مدد سے دوبارہ ہندوستان پہنچا اور مختلف معرکوں کے بعد ۹۶۲ھ میں دھلی میں داخل ہوا اور ہندوستان کے ایک بڑے علاقے میں اس کے نام کا خطبہ و سکہ جاری ہو گیا ۔ بہ قول ملا بداپونی ہندوستان کے بادشاہوں میں بہت کم کو یہ نصیب ہوا کہ ایک مرتبہ شکست کھانے کے بعد دوبارہ ان کو سلطنت مل جائے ۔ ہمایوں نے ۱۵ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو وفات پائی ۔ اس کی وفات کا واقعہ اس طرح ہے کہ ۷ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو یہ دھلی کے قلعۂ دین پناہ میں اپنے بنائے ہوئے کتب خانہ کی چھت پر گیا ۔ جب واپس اترنے لگا تو اذان کی آواز سن کر احترام کے طور پر سیڑھیوں ہی میں بیٹھ گیا ۔ جب وہاں سے اٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا اور اس کا پیر پھسل گیا ، جس کے سبب چند سیڑھیوں سے پھسل کر زمین پر آ رہا ۔ آخر اسی صدمہ کے آٹھویں روز فوت ہو گیا ۔

ہمایوں نے اکیاون برس کی عمر پائی - ۲۵ سال سے کچھ اوپر حکمرانی کی ۔ امور سلطنت میں بڑی گہری نظر رکھتا تھا ۔ بہت سے ظاہری اور باطنی کمالات و ہنر سے آراستہ اور نجوم و ہئیت کے علاوہ دوسرے مروجہ علوم میں بھی ماہرانہ دست گاہ رکھتا تھا ۔ خود شاعر ہونے کے علاوہ بڑا شاعر دوست اور علم پرور تھا ۔ کتب بینی کا شوق اس قدر حد سے بڑھا ہوا تھا کہ میدان جنگ میں بھی چھوٹا سفری کتب خانہ ساتھ رہتا تھا ۔ ہمایوں ہمیشہ با وضو رہتا اور خدا اور رسول اکرم صلعم کا نام کبھی بے وضو نہ لیتا ۔ اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آتی تھی ۔ جب وہ بہت غصے میں ہوتا تو زبان سے 'ہے نادان'

کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا ۔ اس کی حیا کا یہ عالم تھا کہ وہ کبھی قہقہہ مار کر نہیں ہنسا اور کسی کی طرف گھور کر نہیں دیکھا ۔ فیاضی کا یہ عالم تھا کہ بہ قول ملا بدا یونی اس کے لیے سارے ہندوستان کا خراج بھی کافی نہیں دکھائی دیتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ محکمہ مالیات کے کارکن اس کے سامنے نقد روپیہ نہیں لایا کرتے تھے ۔ اس کی ذاتی خوبیاں اتنی ہیں کہ ان کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے ۔
(بہ حوالہ منتخب التواریخ ، توزک جہاں گیری ، مفتاح التواریخ از ولیم تھامس بیل ، این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا) ۔

۸ - یعنی قتل کر دیے گئے ۔

۹ ۔ شیخ ابو الفضل ، شیخ مبارک کا بیٹا تھا ۔ ۶ محرم ۹۵۸ھ کو پیدا ہوا ۔ والد ہی سے تعلیم و تربیت حاصل کی ۔ اپنی ابتدائی تعلیم کا ذکر اس نے اکبر نامہ کے تیسرے دفتر میں کیا ہے ۔ پانچ برس ہی کی عمر میں ایسی باتیں سمجھنے لگا جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتیں ۔ جب بڑا ہوا تو اس کی لیاقت و ذہانت کا چرچا پھیل گیا ۔ بڑا بھائی فیضی تو پہلے ہی دربار اکبری میں موجود تھا اس نے کہہ کہلوا کر اسے بھی دربار میں ملازم کروا دیا ۔ یہ واقعہ ۹۸۱ھ کا ہے ۔ جب پہلے پہل دربار میں حاضر ہوا تو آیۃ الکرسی کی تفسیر لکھ کر بادشاہ کو گزرانی - اہل قلم ہونے کے ساتھ ساتھ تلوار کا بھی دھنی تھا ۔ کئی ایک مہمات میں حصہ لیا ۔ اپنی فطانت و ذہانت کے سبب جلد ہی بادشاہ کا منظور نظر بن گیا ۔ (اگرچہ اس سے پہلے اسے بھی اپنے والد اور بھائی کے ساتھ جب کہ ان پر شاہی عتاب نازل ہوا تھا ، جگہ جگہ گھومنا اور بھاگنا پڑا تھا) بہت جلد اسے چار ہزاری کا منصب ملا اور آخر وزارت عظمیٰ کے عہدہ تک پہنچا ۔ اکبر کو ابو الفضل کی نیک نیتی اور عقل و تدبیر پر ایسا اعتبار تھا کہ اس کے کہنے کو اپنا کہا سمجھتا تھا اور جس معاملہ میں یہ کسی سے اقرار کرتا تھا ، اکبر اسے اپنی زبان کا اقرار سمجھتا تھا ۔ فرشتہ نے اس کی وفات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دکن کی مہم سے واپس آ رہا تھا کہ راستے میں ڈاکوؤں نے اسے مار ڈالا ۔ لیکن حقیقت کچھ اور

ہے ۔ جیسا کہ خود جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے ابو الفضل گویا اکبر کے سامنے اس کی چغلیاں کھایا کرتا تھا۔ جس کے سبب اس نے اسے مروا ڈالا - وہ اس طرح کہ جب وہ دکن کی مہم سے واپس آ رہا تھا تو جہانگیر نے نر سنگھ دیو کو ، جس کا علاقہ راستے میں تھا ، لکھا کہ اس فتنہ کو ختم کر ڈالے ۔ اس نے ابو الفضل کو مارنے کے بعد اس کا سر جہانگیر کے پاس الہ آباد بھیج دیا ۔ اکبر کو اس کا بے حد رنج ہوا - یہ واقعہ چہارم ربیع الاول ۱۰۱۱ ہجری کو پیش آیا (منتخب التواریخ ، سیرالمتاخرین ، مفتاح التواریخ ، توزک جہانگیری ، تذکرہ علمائے ہند ، دربار اکبری) ۔

۱۰ ۔ حاجی سلطان تھانیسری ، اکبر کے حکم پر جن لوگوں نے ہندوؤں کی مشہور کتاب مہا بھارت کا فارسی میں ترجمہ کیا ، ان میں سے ایک یہ بھی تھے ۔ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت کا انھیں شرف حاصل ہوا ۔ علوم نقلی میں بڑی مہارت پیدا کی تھی ۔ عرصہ دراز تک شاہی خدمت پر مامور رہے ۔ جیسا کہ پہلے مذکور ہوا مہابھارت کے ترجمے پر انھوں نے چار سال صرف کیے ۔ آغاز نقیب خان نے کیا تھا مکمل انھوں نے کیا ۔ یہ ترجمہ ۹۹۰ھ میں مکمل ہوا ۔ بہ قول بدایونی ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چغلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤ کشی کے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں ۔ اس پر بادشاہ نے انھیں جلا وطن کرکے بھکر کی طرف خارج کر دیا ۔ اس زمانہ میں بھکر کا نظم و نسق خان خاناں کے ہاتھ میں تھا ، اس نے مہربانی والتفات سے کام لیا اور جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو انھیں اپنے ساتھ لیتا آیا اور معافی و رہائی دلانے کا بھی وعدہ کیا ۔ یہ پوشیدہ طور پر وطن چلے گئے ۔ آسیر اور برہان پور کی فتح کے بعد خان خاناں نے ان کی رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی ۔ اکبر نے ابو الفضل کو حکم دیا کہ انھیں تھانیسر اور کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے ۔ چناں چہ مرتے دم تک اسی خدمت پر مامور رہے ۔ (منتخب التواریخ صفحہ ۵۰۹ ، ۵۰۸ ، ٦٢٧ ، تذکرہ علمائے ہند صفحہ ۸۰) ۔

۱۱ - امام شافعی ، آپ کا نام محمد ، کنیت ابو عبد اللہ ، لقب ناصر الحدیث ہے - شافعی ان کے جد اعلیٰ شافع کی جانب نسبت ہے - سلسلۂ نسب آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہے - آپ ہاشمی اور مطلبی تھے - آپ کے جد امجد شافع اور ان کے والد صحابی تھے - حضرت امام کی ولادت ماہ رجب ۱۵۰ھ ، میں غزہ کے مقام پر ہوئی - والد کا انتقال آپ کی ولادت سے کچھ روز پہلے ہو چکا تھا - اپنے ماموں کے پاس آٹھ برس گزارے ، وہیں سات برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا - دس برس کی عمر میں والدہ نے آپ کو آپ کے چچا کے پاس مکہ معظمہ بھیج دیا ، تاکہ شہر میں رہ کر علم الانساب حاصل کریں - یہاں کچھ عرصہ کے بعد مسلم بن خالد زنجی سے فقہ و حدیث کی تکمیل کی - پھر آپ مدینہ منورہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ سے ملے - ان کے علاوہ وہاں کے دیگر شیوخ سے کسب فیض کیا - مکہ مکرمہ کے علاوہ آپ نے دیگر مقامات کا بھی سفر کیا - تیر اندازی میں بڑے ماہر تھے اور اس مہارت پر آپ کو فخر تھا - فن لغت میں بیس سال صرف کیے - حافظے کا یہ عالم تھا کہ ھزیل کے دس ہزار اشعار مع غرائب لغت کے حفظ کر لیے تھے - علم ہیئت و نجوم سے دل چسپی رہی - بہترین طبیب تھے - یونان و روم کے تمام بڑے بڑے حکما کی کتب پر آپ کی وسیع نظر تھی -

ایک مرتبہ آپ کو خلیفہ ہارون رشید نے کسی غلط فہمی کی بنا پر گرفتار کر لیا - لیکن جب وہ ایک علمی مباحثہ میں آپ کی قوت استدلال اور تبحر سے بے حد متاثر ہوا تو اس نے آپ کو انعام و اکرام سے نوازا اور رہا کر دیا - بے حد قناعت پسند تھے - خود فرماتے ہیں کہ میں نے بیس سال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا - میں نے طمع اور لالچ کو کبھی پاس نہیں آنے دیا - بہت سخاوت کیا کرتے تھے - اپنی آمدنی میں سے بالکل قلیل رقم اپنے لیے رکھتے اور بقیہ رقم رات کی تاریکی میں غریب و معذور علما و فقہا اور نادار طلبا ، بیواؤں اور یتیموں میں تقسیم فرما دیتے - فن مناظرہ میں آپ کو بہت دست گاہ حاصل تھی -

آپ میانہ قد ، موزوں اندام تھے ۔ ہاتھ بہت لمبے تھے ۔ آپ کے شاگرد کہتے ہیں کہ گھٹنوں تک پہنچتے تھے ۔ کشادہ پیشانی چہرہ زیادہ پُر گوشت نہ تھا ۔ تبسم ہمیشہ نمایاں رہتا ۔ بھویں بھری ہوئیں ، مگر علیحدہ علیحدہ ۔ دانت چھوٹے مگر کشادہ ۔ ڈاڑھی متوسط ، آخر عمر میں مہندی کا خضاب لگاتے تھے ۔ ناک لمبی اور اس پر ہلکے ہلکے چیچک کے نشان ، چہرہ پر وقار نمایاں تھا ۔

آپ کو بواسیر کی شکایت رہتی تھی ۔ اس مرض کے علاوہ بالعموم جو واقعہ مشہور ہے اس کے مطابق امام مالک رض کے ایک پیرو فیتان نے ایک مباحثہ کے بعد ایک اندھیری رات میں آپ کے سر پر گرز مارا تھا جس کے سبب سر پھٹ گیا ۔ ادھر آپ بواسیر کی وجہ سے بہت کم زور تھے ۔ مرض الموت شروع ہو گیا ۔ آخر ۳ رجب بروز جمعرات ۲۰۴ھ کو عصر کے وقت آپ کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی ۔ اسی عالم میں آپ نے مغرب اور عشا کی نمازیں پڑھیں ۔ نماز سے فارغ ہو کر گڑ گڑا کر دعا مانگی ۔ دعا کے بعد لیٹے ہی تھے کہ روح مبارک قفس عنصری سے پرواز کر گئی ۔ آپ کو قاہرہ کے باہر کے قبرستان قرافتہ الصغریٰ میں جو جبل مقطم کے پاس ہے دفن کیا گیا ۔ (بہ حوالہ سیرت ائمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری) ۔

۱۲ ۔ اور اگر مرتضیٰ کا مقام ظاہر ہو جائے تو تمام لوگ ان کو سجدہ کرنے والے ہو جائیں ۔ ہمارے مولا علی بزرگی میں کا مقام رکھتے ہیں اور یہ شک واقع ہوتا ہے کہ وہ خدا ہیں ۔

۱۳ ۔ حضرت طلحہ رض ، طلحہ رض بن عبید اللہ بن عثمان بن عمرو بن کعب بن سعد بن تیم ۔۔۔ آپ طلحۃ الجواد یا طلحۃ الجود کے نام سے مشہور تھے ۔ آپ کی کنیت ابو محمد تھی ۔ آپ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابۂ جلیل اور عشرہ مبشرہ میں سے تھے ۔ اس کے علاوہ آپ ان 'اصحاب ششگانہ' میں سے تھے جنھیں حضرت عمر رض کی شہادت کے بعد خلیفۃ المسلمین کی تعیین کے لیے مقرر کیا گیا تھا ۔ بہ قول ابن ندیم آپ عرب کے خطبا میں سے تھے ۔ جن آٹھ حضرات نے سب سے پہلے اسلام

قبول کیا ان میں سے ایک آپ بھی تھے ۔ صاحب 'عقد الفرید' کے مطابق جب اسلام کا ظہور ہوا تو سوائے چند آدمیوں کے کوئی بھی لکھنا نہ جانتا تھا ۔ ان میں حضرت علی رض ، حضرت عمر رض ، حضرت عثمان رض وغیرہم کے علاوہ آپ بھی ایک تھے ۔ آپ نے کئی ایک غزوات میں بھی حصہ لیا ۔ مثلاً غزوۂ اُحد ، غزوۂ تبوک وغیرہ ۔ غزوۂ احد میں آپ بڑی بے جگری سے لڑے ۔ اس جنگ میں آپ کی ایک انگلی بھی کٹ گئی تھی ۔ اسی غزوہ میں جب آں حضرت صلعم ایک گڑھے میں گر گئے اور کعب بن مالک انصاری نے آپ صلعم کو پہچان لیا تو حضرت طلحہ رض نے اس گڑھے میں داخل ہو کر اپنی پشت خم کی ۔ آں حضرت صلعم نے اپنے پائے مبارک آپ کی کمر پر رکھے اور حضرت علی رض نے آپ صلعم کا دست مبارک پکڑ کر آپ صلعم کو باھر نکالا ۔ غزوۂ تبوک میں آپ نے اخراجات جنگ کے لیے کچھ مالی امداد بھی دی تھی ۔ حجۃ الوداع میں آپ نے رسول اکرم صلعم کی ہم راھی کی ۔ مجمل التواریخ والقصص میں ھے کہ حضرت عثمان رض کی شہادت (۱۸ ذی الحجہ ۳۵ھ) کے بعد جب مختلف علاقوں کے لوگ مختلف صحابہ رض کے پاس بیعت کرنے کے لیے پہنچے (مثلاً مصر و مدینہ کے لوگ حضرت علی رض کے پاس آئے اور کوفی حضرت زبیر رض کے پاس) تو حضرت علی رض نے انکار کیا ۔ جب حضرت طلحہ رض کے پاس لوگ پہنچے تو آپ نے بھی حضرت علی رض کی طرح جواب دیا اور بیعت لینے سے انکار کیا ۔ آخر حضرت علی رض کو راضی کر لیا گیا کہ ان کے ھاتھ پر بیعت کی جائے ۔ لوگ ان کو مسجد میں لائے تاکہ بیعت کریں ۔ حضرت طلحہ رض و حضرت زبیر رض موجود نہ تھے ۔ انہیں بلایا گیا ۔ کچھ بحث و تمحیص ہوئی آخر دونو حضرات بیعت پر راضی ہو گئے ۔ سب سے پہلے حضرت طلحہ آگے بڑھے اور آپ نے حضرت علی رض کے ھاتھ پر ھاتھ رکھا ۔ ایک بدوی وھاں موجود تھا اس نے کہا 'ید شلا و بیعتہ لا یتم' (ناقص ھاتھ کی بیعت ناقص یا نامکمل ھے ۔ یہ اس لیے کہ آپ کی ایک انگلی کٹ چکی تھی) اس کی یہ بات ضرب المثل بن گئی ۔ آپ ایک موقع پر مسلمانوں کے دو گرھوں میں لڑائی میں تیر کھا کر زخمی ھوئے اور وھی زخم جان لیوا ثابت ھوا ۔

مجمل التواریخ کے مطابق آپ کا مزار بصرہ میں ہے ۔ بہ قول صاحب 'نزہت القلوب' آپ بے حد مال دار تھے ۔ ہزار درم روزانہ آمدنی تھی ۔ مرتے وقت چار بیویاں تھیں ۔ ہر ایک کو ربع و ثمن سے اسی ہزار درم ملے ۔ (لغت نامہ از علی اکبر دھخدا شمارہ مسلسل ۳۳ صفحہ ۲۹۴ بیعد مطبوعہ تہران ۔)

۱۴ ۔ ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل ۔

۱۵ ۔ غزوۂ احد ۔ احد (ایک پہاڑی کا نام) کے مقام پر تیسری ہجری (۶۲۵ع) میں یہ جنگ آں حضرت صلعم اور ابو سفیان کے درمیان ہوئی۔ اس سے پہلے بدر کے مقام پر مسلمانوں کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔ یہ جنگ کفار نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے لڑی ۔

ابو سفیان ہاشمیوں کا بہت بڑا دشمن تھا ۔ وہ مکہ کی بہت بڑی فوج اور دیگر لوگوں کے ساتھ ۶۲۵ع میں مسلمانوں کے علاقوں میں داخل ہوا ۔ مسلمانوں کی فوج اس کے مقابلے میں نہایت ہی قلیل تھی ۔ نتیجہ کے طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کو شکست ہوئی ۔ بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ زخم بھی آگے ۔ تاہم دشمن کا نقصان چوں کہ بہت زیادہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے مدینہ میں داخل ہونے کی جرأت نہ کی ۔ اور واپس مکہ چلا گیا ۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی شکست کا ایک سبب منافقوں کی یہ شرارت بھی تھی کہ وہ (ان کی تعداد تین سو تھی) جنگ میں شرکت کرنے سے پہلے ہی راستے سے کسی بہانے واپس آ گئے تھے ۔ اس لڑائی میں در اصل مسلمانوں کو پہلے تقریباً فتح ہو چکی تھی۔ کیوں کہ کفار میدان جنگ سے پسپا ہو چکے تھے ، لیکن جو دستہ گھاٹی پر متعین تھا ، اس نے کفار کے تعاقب کے شوق میں بلا اجازت اپنی جگہ چھوڑ دی ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خالد بن ولید نے جو دشمن کے لشکر کے دستۂ میمنہ کے افسر تھے ، ایک میل کا چکر کاٹ کر اسی گھاٹی سے نکل کر یک لخت مسلمانوں پر حملہ کر دیا ۔ یہ حملہ روکا نہ جا سکا ۔ مسلمانوں میں پریشانی سی پیدا ہو گئی ۔ ادھر دشمن نئے سرے سے اپنے فوجیوں کو سمیٹ کر حملہ

آور ہوا ۔ لڑائی کا رنگ بدل گیا - مسلمان ہر طرف سے نرغہ میں آگئے اور بہت تعداد میں شہید ہوئے ۔ نتیجتاً انہیں شکست ہوئی - (اے شارٹ ہسٹری آف دی سیرا سینس صفحہ ۱۲ ، ہسٹری آف دی عیربز از فلپ کے ۔ حتی صفحہ ۱۱۷ ، تاریخ اسلام از مولانا اکبر شاہ خاں جلد اول صفحہ ۱۶۷ بعد) -

۱۶ - مولانا روم ، مولانا جلال الدین محمد ، سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین الخطیبی کے فرزند اور بزرگ ترین صوفی شعرا میں سے تھے - آپ کی ولادت ۶۰۴ھ میں بہ مقام بلخ ہوئی ۔ آپ کے والد ، علاء الدین خوارزم شاہ کے نواسے تھے - شیخ نجم الدین کبریٰ کے اکسانے پر خوارزم شاہ آپ (بہاء الدین) کا دشمن ہو گیا تھا جس کے سبب آپ جلال الدین کو لے کر وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ یہ مسافرت تقریباً ۶۱۷ھ میں وقوع پذیر ہوئی ۔ گویا اس وقت مولانا روم کی عمر چودہ برس تھی ۔ کہتے ہیں کہ رومی رح کے والد جب نیشا پور میں شیخ فرید الدین عطار سے ملے تو انھوں نے رومی کو اپنی آغوش میں لیا ، دعا دی اور اپنی مثنوی اسرار نامہ آپ کو ھدیہ کے طور پر دی ۔ رومی کے والد کئی ایک مقامات پر رہنے کے بعد آخر ایشیائے کوچک کے سلجوقی بادشاہ سلطان علاء الدین کیقباد (۶۱۷--۶۳۴) کی دعوت پر قونیہ چلے گئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ مولانا روم نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت اپنے والد ہی سے حاصل کی ۔ ان کی وفات کے بعد جو ۶۲۸ھ میں ہوئی ، آپ نے سید برہان الدین محقق ترمذی سے ، جو بہاء الدین کے شاگرد رہ چکے تھے، کسب فیض کیا ۔ اس کے بعد حصول معرفت کے لیے آپ نے شام ، دمشق اور حلب وغیرہ کا سفر اختیار کیا ۔ آخر بہت سے باطنی تجارب کے ساتھ آپ واپس قونیہ لوٹے اور وہاں اپنے والد کی طرح درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا ۔ کچھ عرصہ کے بعد اسی شہر میں آپ کی ملاقات شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی سے ہوئی ۔ اس ملاقات نے آپ کی کایا ہی پلٹ دی ۔ آپ نے شمس تبریزی کو اپنا مرشد و قائد روحانی بنا لیا اور ہر وقت ان کے گن گانے لگے - اس کا اظہار آپ کی مثنوی میں جگہ جگہ ہوا ہے - آپ کی وفات ۶۷۲ھ

میں قونیہ میں ہوئی اور وہیں آپ کو اپنے والد کے مقبرے میں جو سلطان کے حکم سے بنایا گیا تھا ، دفن کیا گیا ۔

آپ کی سب سے مشہور تصنیف مثنوی معنوی ہے ۔ جس کے بارے میں کہا جاتا ہے 'ہست قرآن در زبان پہلوی' ۔ یہ مثنوی بہ قول شفق ۲۶ ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں آپ نے بڑے بڑے ادق فلسفیانہ مسائل کو بڑے عمدہ انداز اور آسان و دلچسپ کہانیوں کے رنگ میں حل کیا ہے ۔ ان اشعار و حکایات کی فصاحت کے متعلق ایران کے ایک بڑے عالم آقای فروزانفر 'خلاصۂ مثنوی' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ مثنوی کے کسی شعر یا حکایت کو اس کے دوسرے اشعار یا حکایات سے فصیح تر یا جامع تر سمجھنا عدم تدبیر و تامل کے سبب بلکہ بہ منزلہ کفر کے ہے اور کوئی بھی منصف سخن شناس جو مثنوی سے مانوس ہے ایسی گستاخ بات نہیں کر سکتا جب کہ ایسے لوگوں کا تو ذکر ہی کیا جو مولانا کے 'وحی آسا' بیان کے والہ و شیدا اور مثنوی کو آسمانی کتب کا قائم مقام اور عالم انسانی کے مقدسات میں سے سمجھتے ہیں ۔ (تاریخ ادبیات ایران از شفق ، خلاصۂ مثنوی از آقای بدیع الزمان فروزا نفر مطبوعہ سیکنڈری بورڈ لاہور صفحہ ج ، مختصری از...... صفا صفحہ ۱۰۲) ۔

۱۷ ۔ تابعین ، جنھیں صحابۂ کرام رض کی صحبت نصیب ہوئی ۔

۱۸ ۔ نزاری ، فاطمی خلیفہ مستنصر کی وفات کے بعد اس کے دو بیٹوں المصطفیٰ لدین اللہ عرف نزار اور المستعلی باللہ ابو القاسم احمد کہ دونوں اپنے باپ کی جا نشینی کے دعوے دار تھے ، کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ۔ جس کے باعث فاطمیۂ مصر کے پیرو دو دستوں میں منقسم ہو گئے ۔ عراق ، شام ، قومس ، خراسان اور لرستان کے اسماعیلی نزار کی امامت کے طرف دار تھے ، جب کہ بلاد مغرب اور مصر کے اسماعیلی امامت مستعلی کے حامی تھے ۔ اسی نزار کے حامی نزاریہ کہلائے ۔ یہ فرقہ پانچویں صدی ھجری کے آخر میں وجود میں آیا ۔ (ذبیح اللہ صفا جلد دوم صفحہ ۱۶۸) ۔

۱۹ - صبّاحی یا صبّاحیہ ، ان کا تعلق بھی فرقہ اسماعیلہ سے ہے - اس فرقے کا بانی حسن بن صباح ہے - اس کا باپ یمن کا رہنے والا تھا جو کوفہ و قم سے ہوتا ہوا رے پہنچا اور یہیں حسن پیدا ہوا - پہلے حسن کا تعلق اثنا عشری فرقے سے رہا - پھر اسماعیلی فرقے کی جانب مائل ہوا۔ اور بڑی سرگرمی سے اس فرقے کی تبلیغ شروع کی - کئی ایک مقامات اصفہان ، آذر بائیجان کا سفر کیا - ۴۷۱ھ میں مصر پہنچا - ڈیڑھ سال وہاں رہا - یہ وہ وقت ہے جب نزار اور مستعلی میں اختلاف شروع ہو چکا تھا - اس نے نزار کی حمایت کی - ۴۷۳ھ میں خوزستان ، اصفہان ، کرمان، یزد ، دامغان اور دیگر علاقوں میں خوب خوب تبلیغ کی اور بہت سے لوگوں کو اپنا پیرو بنا لیا۔ جب اس کے پیروؤں کی تعداد حد سے بڑھ گئی تو اس کے حوصلے بڑھ گئے۔ اس نے کسی نہ کسی طرح قلعۂ الموت تین ہزار دینار میں حاکم دامغان سے خرید لیا - چھ رجب ۴۸۳ھ کو یہ وہاں پہنچا - اگرچہ اس وقت تک ہزاروں لوگ اس کے مقلد ہوچکے تھے ، لیکن اس تاریخ کے بعد سے اس کی تبلیغ اور شدت اختیار کر گئی اور اسی دن سے اسے اہمیت حاصل ہونا شروع ہوئی - اس نے اپنی مقصد برآری کے لیے بڑے بڑے علما کو اپنے فدائیوں کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا - جن لوگوں نے بھی اس فرقہ سے ذرا سی دشمنی کا اظہار کیا وہ مروا ڈالے - (اس کی ان تمام کارروائیوں کو عبدالحلیم شرر نے ناول کے رنگ میں پیش کیا ہے) - یہاں تک کہ سلطان سنجر جیسا بادشاہ بھی ان سے خوف کھانے لگا - یہ شخص بہت سی کامیابیوں کے بعد بدھ کی رات ۲۶ ربیع الآخر ۵۱۸ھ کو فوت ہوا - بڑا زاہد ، پاک دامن اور دین دار شخص تھا - اس نے اپنے دو بیٹوں کو صرف شراب خوری کے معمولی سے جرم پر قتل کر ڈالا تھا - اسی صباح کے پیرو صباحیہ کہلائے - جنھیں حشیشین یا حشیشیون بھی کہا جاتا ہے - (ملاحظہ ہو صفا جلد دوم صفحہ ۱۶۸—۱۷۱ براؤن فارسی ترجمہ جلد اول صفحہ ۲۵۵ ، ۳۶۳) - نظام الملک طوسی (متوفی ۴۸۵ھ) نے اپنی کتاب سیاست نامہ میں اس فرقہ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے - اس وقت اس قسم کے جتنے بھی فرقے تھے وہ چوں کہ سب باطنیہ فرقہ ہی کی شاخیں تھے

اس لیے جہاں بھی نظام الملک نے باطنیہ ، بد مذہب وغیرہ کا ذکر کیا ہے اس سے یہی نزاریہ اور صباحیہ وغیرہ مراد ہیں ۔ سیاست نامہ کے چوالیسویں باب میں لکھتے ہیں : ''......دنیا کے کسی ملک میں بھی بادشاہوں اور پیغمبروں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والوں میں سے کوئی گروہ بھی اتنا بد بخت ، اتنا بد دین اور بد عمل نہ تھا ، جتنی یہ قوم ...... یہ لوگ زبانی تو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں ، لیکن حقیقتاً عمل کافروں کا سا ہے ۔ ان کا باطن (خدا ان پر لعنت کرے) ان کے ظاہر کے بالکل بر عکس ہے......دین مصطفیٰ صلعم کا کوئی دشمن ان سے زیادہ بد بخت اور قابل نفرت نہیں......'' ۔ اور اس کے بعد کے ابواب میں انہوں نے اس فرقہ کے آغاز کا کھوج لگاتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ خود کو شیعہ کہتے ہیں ، لیکن در اصل ان کا تعلق قبل از اسلام کے ایک فرقہ مزدکی سے ہے اور ان کے خیالات و افکار مزدکیوں کے خیالات و افکار سے ملتے ہیں ۔ (ملاحظہ ہو اردو ترجمہ سیاست نامہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور صفحہ ۲۰۵ ببعد) ۔

۲۰ ۔ اس تفسیر کا نام سواطع الالہام ہے ۔ بہ قول مولانا آزاد یہ تفسیر ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی اور یہ اس کے علم و فضل کے ساتھ زور طبع اور حدت فکر کا زمانہ ہے ۔ یہ کتاب پچھتر (۷۵) جزو پر مشتمل اور حروف مہملہ (بے نقطہ حروف) میں لکھی گئی ہے ۔ شروع میں ایک ہزار اشعار کا منظوم دیباچہ ہے ۔ آخر میں خاتمہ کے طور پر ننانوے فقرے لکھے ہیں جن میں ادائے مطلب کے ساتھ ساتھ ہر فقرہ سے تاریخ اختتام نکلتی ہے ۔ بہ قول بدایونی اس تفسیر کے چند اجزا اس نے اشاعت کے لیے عراق بھجوائے ۔ اکثر عالموں نے اس تفسیر پر تقریظیں لکھی ہیں ۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی میں تقریظ لکھی ۔ میاں امان اللہ سرہندی نے ان الفاظ سے ''ولا رطب و لا یابس الا فی کتاب مبین ۔'' میر محمد حیدر معمائی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۂ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی ۔ خود ملا بدایونی نے ''من احسن التفاسیر بسم اللہ الرحمن الرحیم علم القرآن'' کے الفاظ سے تاریخ نکالی اور اس کے ساتھ اس پر ایک تقریظ بھی لکھی اور کوئی تیس تاریخی فقرے نکالے ۔ (منتخب التواریخ (اردو) صفحہ ۵۵۲ ، ۵۵۳ ، دربار اکبری) ۔

۲۱ - منتخب التواریخ کے اردو مترجم نے ''و این معنی را خود بر سر دیوان نقل می فرمودند'' کا ترجمہ ''یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے'' کیا ہے (ملاحظہ صفحہ ۷۲۹) جو اس عاجز کے نزدیک غلط ہے - در اصل مترجم موصوف کو 'دیوان' اور 'نقل' کے الفاظ نے الجھایا ہے ، حالاں کہ دیوان کے معنی فارسی میں صرف مجموعۂ غزلیات ھی نہیں بلکہ عدالت اور ملوک کے بیٹھنے کی جگہ وغیرہ بھی ہیں اور نقل بہ معنی لکھنا صرف اردو میں ہے ، فارسی میں اس کے معنی ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا یا بیان کرنا ہے - (ملاحظہ ھو غیاث اللغات صفحہ ۲۸۶ و صفحہ ۷۰۳) - اس کے علاوہ ملاحظہ ھو دربار اکبری صفحہ ۳۹۷ -

۲۲ - جب فیضی بے دین مرا تو فصیح نے اس کا سال وفات 'سگی......الخ ، (ایک کتا برے حال میں دنیا سے گیا) کے الفاظ سے نکالا -

۲۳ - مردار فیضی کا سال وفات 'بجار مذھب نار' مقرر ھوا -

۲۴ - نبی کریم صلعم کا دشمن منحوس فیضی جب مرا تو داغ لعنت اپنے ساتھ ھی لے گیا - وہ ایک کمینہ کتا اور دوزخی تھا - اس لیے اس کی تاریخ وفات ''سگ پرستی مرد'' (سگ پرست موا) ٹھہری -

۲۵- ''چوں کہ وہ ناچار گیا ، اس لیے مجبوراً اس کی تاریخ وفات 'خالد فی النار' (ھمیشہ آگ میں رھنے والا) ٹھہری -'' یہ اور اس سے پہلی تمام تاریخیں ملا بدایونی کی خود ساختہ معلوم ھوتی ھیں ، کیوں کہ کسی کے بھی اعداد ایک دوسرے سے نہیں ملتے - مثلاً پہلی تاریخ ''سگی ازجہاں رفتہ بحال قبیح'' کے اعداد ۱۰۰۳ ھیں ، دوسری کے ۱۲۰۴ ، تیسری ''سگ پرستی مرد'' کے ۹۹۶ ، چوتھی ''قاعدہ.....'' کے ۱۰۰۴ ، پانچویں ''بود فیضی ملحدے'' کے صرف ۲۹۴ اور آخری ''خالد فی النار'' کے ۱۰۰۷ - ملا بدایونی نے محض دشمنی کی بنا پر فیضی بے چارے کو مرنے کے بعد بھی زیادہ سے زیادہ رسوا کرنے کے لیے اس قسم کی ناھنجار تاریخیں کہیں - جو..............اس کے دامن پر ھمیشہ ھمیشہ کے لیے ایک بد نما دھبہ بن کر رھیں گی ، کیوں کہ ایک جاھل سے جاھل

مسلمان بھی اپنے بڑے سے بڑے دشمن کی وفات کے بعد اس کے بارے میں ایسے نازیبا اور تلخ کلمات استعمال نہیں کرتا ۔

۲۶ - فیضی کے کلام کے متعلق بدایونی کی یہ آراء بھی مذکورہ دشمنی کے سبب ہیں ۔ ورنہ دیگر مؤرخوں اور تذکرہ نویسوں نے اس کی شاعری کی بے حد تعریف کی ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ دور کے ناقد اور مؤرخ ادب مولانا شبلی مرحوم کا نام لیا جا سکتا ہے ، جنھوں نے شعرالعجم کی تیسری جلد میں اس کا ذکر کیا ہے ۔ ایرانی نقاد جنھوں نے اس برصغیر کے تین چار فارسی شعرا کے علاوہ کسی اور کو فارسی کا شاعر ہی نہیں مانا ، وہ بھی اس کی شاعری کے مداح ہیں ۔ ذیل میں اس دور کے تین بڑے ایرانی ادیبوں کی آراء درج کی جاتی ہیں :

ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا جو تہران یونیورسٹی میں فارسی ادب کے پروفیسر اور کئی دوسری کتب کے علاوہ ضخیم تصنیف 'تاریخ ادبیات در ایران' کے مصنف ہیں اپنی کتاب 'مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر فارسی' میں فیضی کے بارے میں لکھتے ہیں : ''صفوی دور کے فارسی زبان کے مشاہیر شعرا میں سے ایک اور شاعر ہے جو ایرانی تو نہیں مگر شاعری میں اپنے زمانے کے ایرانی استادوں سے کسی طرح کم نہ تھا اور وہ تھا ملک الشعرا فیضی......... - فیضی بھی عرفی کی طرح اپنے زمانے میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ قصیدہ ، غزل اور مثنوی میں استاد تھا اور بہت سی ادبی یادگاریں چھوڑی ہیں۔'' (مختصر تاریخ ادبیات فارسی ، اردو ترجمہ کتاب مذکورہ از ڈاکٹر نذیر میرزا برلاس پشاور ، صفحہ ۱۵۶) -

سعید نفیسی نے مجلہ 'رادیو ایران' کے ایک شمارے میں اس پر ایک مضمون لکھا اور ارمغان پاک کے مقدمہ میں اس طرح ذکر کیا ہے : ''اما بعضی دیگر از شعرا باصطلاح ظرفا شراب خانہ ساز بودند و از مہم ترین آنہا می توان در اینجا نام فیضی و غالب را ذکر کرد۔ فیضی ملک الشعرای دربار اکبر بود و اشعار وی آئینۂ حقیقی زمان خود بیشمار میرود.........اشعار فیضی مملو از حماسہ و نشاط و اعتماد بنفس است ۔'' (ارمغان پاک تالیف شیخ محمد اکرام با مقدمۂ استاد سعید نفیسی مطبوعہ تہران ، صفحہ ہ ، و) - تہران یونیورسٹی کے فلسفہ کے پروفیسر

ڈاکٹر رضا زادہ شفق اپنی مشہور تالیف 'تاریخ ادبیات ایران' میں عرفی کے ذکر میں لکھتے ہیں : ''شیوۂ شعر عرفی نسبت بمعمول خصوصیتی دارد که میتوان آنرا شیوۂ فارسی هندوستانی گفت و از این حیث عرفی طرز سخنش شباهتی بسبک امیر خسرو و فیضی سرهندی دارد ۔ این طرز بجای خود شیرین و متین است و شاید بتاثیر همین عذوبت بیان باشد که عرفی صیت سخن خود را شنیده و بخود بالیده و خویش را ستوده ...... '' (تاریخ ادبیات ایران با حواشی و ملحقات مطبوعه اصفهان ، صفحه ۳۷٦) ۔ یعنی ''عرفی کی شاعری ایک خاص خصوصیت کی حامل ہے جس کے سبب وہ امیر خسرو اور فیضی کے طرز سے ملتی جلتی ہے ۔ اور یہ طرز بذات خود شیرین و متین ہے ۔'' یہ وہی عرفی ہے جس کے بارے میں بدایونی نے لکھا ہے کہ اس کی شہرت اس کی زندگی ہی میں دور و نزدیک پہنچ گئی ہے اور لوگ اس کا دیوان ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں ۔ اور شفق کے بیان کے مطابق یہی عرفی فیضی کے طرز سے متاثر ہے ۔ اس سے فیضی کی قادر الکلامی اور بڑے شاعر ہونے کی تصدیق ہوتی ہے ۔

۲۷ ۔ منتخب کے اردو مترجم نے اس فقرے کا ترجمہ اس طرح کیا ہے : ''.........اس کے کسی شعر نے کبھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی'' (صفحہ ۳۰۷) ، جو تسلسل عبارت کے لحاظ سے غلط ہے ۔ مولانا آزاد نے یہ ترجمہ کیا ہے : ''.........مگر اس کی بجھی ہوئی طبیعت کی طرح ایک بیت بھی شعلہ نہیں...'' (دربار اکبری ، صفحہ ۳٦۷)

فیضی (صفحہ ۲٦۹)

۱ ۔ مولانا عبدالحق محدث دہلوی ۔ آپ سیف الدین بن سعد اللہ بن الزاک کے بیٹے تھے ۔ کنیت ابوالمجد اور تخلص حق تھا ۔ آپ کے اجداد کا تعلق بخارا سے تھا جو بعد میں دہلی میں آکر سکونت پزیر ہوگئے تھے ۔ آپ کی ولادت دہلی ہی میں محرم کے مہینے ۹۵۸ھ میں ہوئی ۔ آپ کی تاریخ ولادت 'شیخ اولیا' کے الفاظ سے نکلتی ہے ۔ علوم عقلی و نقلی دونو سے بہرہ یاب اور ہنر و کمال کا مجموعہ تھے ۔ تصوف میں بھی

آپ کا درجہ بلند تھا ۔ بائیس سال کی عمر میں فضائل و کمالات سے فارغ ہو کر قرآن کریم حفظ کیا ۔ آپ بہت بڑے محدث تھے اور ہندوستان میں علم حدیث آپ ہی کی بدولت پھیلا ۔ آپ کو خدا داد مقبولیت حاصل تھی ۔ کوئی بھی بڑے سے بڑا عالم آپ کا منکر نہ تھا ۔ آپ عنفوان شباب میں حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہاں ایک مدت تک مقیم رہ کر علمائے وقت کی صحبت سے فیض یاب ہو کر فن حدیث کی تکمیل کی ۔ آخر برکات فراواں کے ساتھ واپس وطن کو لوٹے ۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد سو سے متجاوز ہے ۔ آپ نے شاعری بھی کی اور بہ قول صاحب تذکرہ علمائے ہند آپ کے اشعار کی تعداد تقریباً پانچ لاکھ ہے ۔ آپ قادری سلسلے کے پیرو موسیٰ قادری کے مرید تھے ۔ شروع شروع میں آپ کو شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی سے کچھ اختلاف تھا ، لیکن آخر میں آپ نے ان سے تصفیہ کر لیا تھا ۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے آپ کے قدیم روابط تھے اور کچھ عرصہ تک ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں بھی رہے ، لیکن دین الٰہی کا قضیہ پیدا ہونے کے سبب دوستی اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا اور آپ کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے ۔ آپ کی تصنیفات میں سب سے زیادہ مشہور 'تاریخ مدینہ سکینہ' ، 'اخبارالاخیار' وغیرہ ہیں ۔ آپ کی وفات ۱۰۵۲ھ میں ہوئی ۔ آپ کا مرقد قطب صاحب کے مقبرے میں حوض شمسی کے کنارے واقع ہے ۔ (منتخب التواریخ ، صفحہ ۶۲۴ ، ۶۲۵ ۔ تذکرہ علمائے ہند ، صفحہ ۱۰۹)

۲ ۔ شیخ موسیٰ ۔ شیخ موسیٰ پاک شہید ملتانی ، شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مرشد تھے ۔ اگرچہ علمی دنیا میں آپ کی کوئی شہرت نہ تھی ، لیکن روحانی اور اخلاق میدان میں دوسروں سے آگے تھے ۔ آپ اوچ کے قادری بزرگ تھے ۔ آپ کے والد مخدوم شیخ حامد جیلانی نے اپنی زندگی میں آپ کو اپنا جانشین منتخب کر لیا تھا ، لیکن بڑے بھائی کو اختلاف تھا ، جس کے سبب آپ اوچ چھوڑ کر دربار اکبری میں آ گئے ۔ یہاں آپ کو پانچ سو کا منصب ملا اور آپ ایک عرصہ تک شاہی لشکر میں رہے ، آپ بڑی جرأت کے ساتھ دربار میں آمد و رفت

کیا کرتے تھے ۔ بہ قول بدایونی ''بادشاہ کے حضور عین دیوان خانۂ خاص و عام میں اگر نماز کا وقت آ جاتا تو آپ خود اذان کہہ کر خلیفۂ وقت کی موجودگی میں نماز با جماعت ادا کرتے اور کوئی بھی کچھ نہ کہہ سکتا ۔'' عبدالحق محدث نے اخبارالاخیار میں اپنے مرشد کا تذکرہ بڑی عقیدت و احترام سے کیا ہے ۔ اس سے بھی پتا چلتا ہے کہ آپ اکبری دور میں احیاے اسلام کے سرگرم ترجمان تھے ۔ شیخ محدث لکھتے ہیں : ''میرا اعتماد ایک صاحب قدم پر ہے جو رقاب اولیا کا مالک ہے ۔ کوئی راہ رو ایسا نہیں جو ان کی خدمت میں سر کے بل نہ جائے اور ان کے قدموں پر سر نہ ڈالے ۔ اور یہ خود ان کی سرفرازی کی وجہ سے ہے ۔ جن کا قدم مصطفیٰ کے قدم پر ہو ، بلکہ دم بہ دم قدم رکھتے ہوں ان کے قدم کے نیچے پائمال ہونا سر کی سعادت ہے ۔ ... اگر اور قطب ہیں تو وہ قطب الاقطاب ہیں ، اگر اور سلاطین ہیں تو وہ سلطان السلاطین محی الدین ہیں جنھوں نے دین اسلام کو زندہ کیا اور ملت کفر کو ختم کیا ۔'' آپ ایک عرصہ تک لشکر شاہی سے منسلک رہ کر کسی سلسلے میں ملتان تشریف لے گئے اور وہیں ۱۰۰۲ھ میں وفات پائی ۔ ملتان میں پاک دروازہ کے اندر آپ کا مزار ایک مشہور زیارت ہے ۔ (اخبارالاخیار ، صفحہ ۳۱۵ - رودکوثر ، صفحہ ۳۰۰ ببعد)

۳ ۔ اس خط کے پس منظر کے طور پر بدایونی کی یہ چند سطور ملاحظہ ہوں : ''شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا اور گرمئی محفل کی خاطر دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا ، لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا ۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خطوط لکھے ، لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا (جیسا کہ گزشتہ حاشیہ میں مذکور ہوا ، اس رنج کا سبب غالباً وہی دین الٰہی کا قضیہ تھا) اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیے ۔ شیخ فیضی نے اس سلسلے میں انھیں یہ رقعہ لکھا تھا ۔''

(ملاحظہ ہو منتخب التواریخ ، صفحہ ٦٢٦)

۴ ۔ میاں بہلول یا شیخ بہلول دہلوی ۔ آپ دور اکبری میں علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر و فنا کی صحبت میں رہے اور آخری دم تک فقر و توکل کے راستے پر نہایت ثابت قدمی سے قائم رہے ۔ دنیا اور اہل دنیا سے آپ نے کوئی تعلق نہ رکھا ۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہے ۔
(منتخب التواریخ ، ۶۲۴ - تذکرہ علمای ہند ۳۳-۳۴)

۵ ۔ نل و دمن ۔ یہ مثنوی بہ قول بدایونی ۱۰۰۲ھ میں بادشاہ کے کے حکم سے لکھی گئی ۔ فیضی نے تقریباً پانچ ماہ کی مدت میں ہندوستان کی اس عشقیہ داستان کو چار ہزار کچھ کم دو سو اشعار میں مرتب کر کے بادشاہ کے حضور میں گزرانا ۔ یہ مثنوی اکبر کو بے حد پسند آئی ۔ اس کی کتابت اور تصویریں بنوانے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا ۔ بدایونی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ واقعتاً یہ ایک مثنوی ہے کہ ان تین سو سالوں میں امیر خسرو کے بعد شاید ھی کسی نے ہندوستان میں ایسی عمدہ مثنوی لکھی ہو ۔ (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۵۵۴ ۔ شعرالعجم جلد سوم ، صفحہ ۵۵-۵۶)

۶ ۔ مثنوی مرکز ادوار ۔ شبلی لکھتے ہیں : ''۳۰ جلوس (۹۹۳ھ) میں فیضی کو 'خمسہ' کا خیال پیدا ہوا ۔ سب سے پہلے 'مرکز ادوار' شروع کی اس کے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے ، لیکن چوں کہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے ، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی ۔ ۱۰۰۲ھ میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ 'خمسہ' کو پورا کرنا چاہیے اور سب سے پہلے نل و دمن انجام پائے'' جس کے سبب یہ مثنوی تاخیر میں پڑ گئی ۔ تاہم اسے مکمل ضرور کیا ۔ اس کی ترتیب ابوالفضل نے فیضی کی وفات کے بعد کی ۔ یہ مثنوی اس نے مخزن خیال کی زمین میں کہی ۔
(منتخب التواریخ ، صفحہ ۳۱ے ۔ شعر العجم جلد سوم مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ، ۵۵ ، ۵۶)

۶ (ا) - یہاں عبارت واضح نہیں ہے - متن میں یہ فقرہ اس طرح ہے ''از نـل و دمـن اوائـل بـه بیند کـه خـالی نیست -'' اصل کتاب حیات شیخ عبد الحق محدث دهلوی میں بھی یہ عبارت اسی طرح ہے -

۷ - عبد الرحیم خان خان خاناں ، بیرم خان خان خاناں کا بیٹا تھا - ۱۴ صفر ۹۶۴ ھ کو بہ مقام لاہور پیدا ہوا - اس کی والدہ سلیمہ سلطان بیگم جمال خان میواتی کی بیٹی اور حسن میواتی کی بھتیجی تھی - بڑی بہن اکبر کے حرم میں تھی - اکبر نے اس کا نام عبد الرحیم رکھا - بیرم خان کے مرنے کے بعد اس کی ماں اسے لے کر احمد آباد پہنچی - چار ماہ بعد اکبر نے انہیں فتح پور بلا لیا - سلیمہ بیگم سے اکبر نے نکاح کر لیا جس کے سبب اس کی پرورش شاہی طور طریقوں سے ہوئی - اس نے کئی ایک زبانوں مثلاً عربی ، سنسکرت ، فارسی اور ترکی وغیرہ میں مہارت بہم پہنچائی - بڑا خوب رو جوان تھا - اکبر اسے مرزا خان کہا کرتا تھا - اکبر نے مرزا عزیز کوکلتاش خان اعظم کی بہن ماہ بانو بیگم سے نکاح کرا دیا - ۹۸۰ ھ میں جب اکبر احمد آباد گجرات گیا تو اس وقت اس کی عمر تیرہ سال کی تھی - اس کے باوجود اس نے بڑی بہادری سے اس معرکے میں حصہ لیا - ۹۸۸ ھ میں اسے عرض بیگی کا عہدہ ملا - اس کے دو سال بعد شہزادہ سلیم (جہانگیر) کی اتبالیقی پر مقرر ہوا - ۹۹۱ ھ میں سالار لشکر بن کر ایک معرکے میں فتح پائی اور اپنے والد کا خطاب 'خانخاناں' حاصل کیا - چھ سال تک گجرات کی حکومت پر فائز رہا - ۹۹۸ ھ میں وکیل مطلق کا عہدہ پا کر باپ کی پرانی گدی حاصل کی - ۹۹۹ ھ میں ملتان اور بھکر کی جاگیر پائی - ۱۰۰۳ ھ میں شاہزادہ مراد کے ساتھ دکن کی مہم پر گیا - لیکن چاند بی بی سے شکست کھائی - ایک موقع پر مراد سے کچھ اختلاف ہو گیا اور اسی جھگڑے میں اکبر سے رنجش ہو گئی - ۱۰۰۷ ھ میں اس کی لڑکی جانا بیگم سے شہزادہ دانیال کا نکاح ہوا - اس کے بعد خانخاناں دانیال کے ساتھ دکن کی مہم پر گیا - چاند بی بی کی شہادت کے سبب یہ احمد نگر پر قابض ہو گیا - اس کے دو سال بعد تلنگانہ کے علاقے فتح کیے - جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس وقت یہ دکن ہی میں تھا - ۱۰۱۸ ھ میں جہانگیر کے دربار میں پہنچا - مہابت خاں

کا زور ٹوٹنے کے بعد اس کے تعاقب میں لشکر لے کر روانہ ہوا۔ اس وقت بہتر کے پیٹے میں تھا۔ شاہجہان کی بغاوت کے بعد جہانگیر نے اس کے بیٹے داراب، جس نے شاہجہان کا ساتھ دیا تھا، کا سر کاٹ کر اس کے پاس بھیجنے کا حکم دیا۔ یہ سر ایک خوان میں کھانے کی طرح لگوا کر اس کے پاس بھیج دیا گیا، اور بہ قول مولانا آزاد ''مہابت خاں کے یزیدیوں نے بموجب اس کے حکم کے کہا کہ حضور نے یہ تربوز بھیجا ہے۔ خونی جگر باپ نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ درست! شہیدی ہے۔'' ۱۰۳۶ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

خان خاناں بڑا علم دوست، ایک عمدہ منتظم اور فارسی کا ایک قادرالکلام شاعر تھا۔ اس کی فیاضی کے قصے بے شمار ہیں۔ یہ قصے مولانا آزاد نے 'دربار اکبری' میں بڑی تفصیل سے دیے ہیں۔ مثلاً ایک مرتبہ مشہور شاعر نظیری نیشاپوری نے کہا کہ میں نے ایک لاکھ روپیہ کا ڈھیر نہیں دیکھا۔ اس نے فوراً ایک لاکھ روپے کا ڈھیر لگوا دیا۔ نظیری کہنے لگا کہ شکر ہے آپ کی بدولت ایک لاکھ روپے کا ڈھیر دیکھ لیا۔ خان خاناں نے وہ روپیہ اس کے گھر بھجوا دیا۔ ایک موقع پر جب برہان پور جا رہا تھا، پہلے ہی پڑاؤ پر شام کے وقت شامیانے کے باہر بیٹھا تھا کہ ایک فقیر سامنے سے یہ شعر

''منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست
ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت''

پڑھتے ہوئے گزرا۔ چوں کہ منعم خاں بھی اس کا خطاب ہو چکا تھا، اس نے خزانچی کو حکم دیا کہ لاکھ روپیہ دے دو۔ فقیر دعائیں دیتا چلا گیا۔ وہ فقیر اسی طرح سات دن برابر آتا رہا اور لاکھ لاکھ روپیہ وصول کرتا رہا۔ لیکن آٹھویں دن کچھ سوچ کر نہ آیا۔ خانخاناں حسب معمول نئے پڑاؤ پر شامیانے کے باہر بیٹھا تھا۔ جب معمول سے زیادہ وقت گزرا، دربار برخاست نہ کیا۔ شام ہوئی تو کہنے لگا کہ ''آج وہ ہمارا فقیر نہ آیا، خیر برہان پور آگرہ سے ستائیس منزل ہے ہم نے تو پہلے دن ستائیس لاکھ روپیہ خزانہ سے منہا کر دیا تھا۔ تنگ حوصلہ تھا،

خدا جانے دل میں کیا سمجھا۔'' خانخاناں بڑا خوش مزاج ، خوش اخلاق اور صحبت میں نہایت گرم جوش تھا ۔ اپنے دل ربا اور دل فریب کلام سے یگانہ و بیگانہ کو غلام بنا لیتا تھا ۔ شیریں کلام ، لطیفہ گو ، بذلہ سنج اور نہایت طرار و فرار تھا ۔ وہ ایک عمدہ انشا پرداز بھی تھا ۔ توزک بابری جو ترکی زبان میں تھی ، کا ترجمہ سلیس اور عام فہم عبارت میں (فارسی) ۹۹۷ھ میں کیا ۔ (منتخب التواریخ ۔ اکبر نامہ ، توزک جہانگیری ۔ ماثرالامرا ۔ مفتاح التواریخ ۔ تذکرۂ علماے ہند ۔ دربار اکبری)

۸ ۔ یعنی ملا بدایونی صاحب منتخب التواریخ ۔

۹ ۔ یہ تین دفتروں پر مشتمل ہے ۔ دفتر اول میں تیموری سلسلے کا مختصر حال ہے ۔ بابر اور ہمایوں کے حالات قدرے تفصیل سے ہیں ۔ اس کے علاوہ اکبر کا ۱۷ برس کا حال ہے ۔ دفتر دوم ۱۸ جلوس سے شروع اور ۴۶ جلوس ۱۱۱۰ھ پر ختم کیا ہے ۔ تیسرا دفتر بقول آزاد آئین اکبری ہے ۔ یہ جلد ۱۰۰۶ھ میں مکمل کی ۔

۱۰ ۔ بقول مولانا آزاد یہ عریضہ بر وقت نہ پہنچ سکا تھا ۔ مگر جب بادشاہ نے لاہور آ کر پڑھا تو سفارش کا انداز بہت پسند آیا ۔ لہذا ابوالفضل کو اسے اکبر نامہ میں داخل کرنے کا حکم دیا ۔
(دربار اکبری ۳۵۵)

۱۱ ۔ ملا عبد القادر کے باپ کا نام ملوک شاہ اور تخلص قادری تھا ۔ امام اکبر شاہ کہلاتے اور علماے عصر میں فضیلت کا درجہ رکھتے تھے ۔ ترجمہ اور تالیف میں اکبر کی فرمائشوں کو عمدہ طور پر سرانجام دیا ۔ ان کی ولادت ۱۷ ربیع الثانی ۹۴۷ھ کو ہوئی ۔ بقول آزاد اگرچہ یہ بدایونی مشہور ہیں مگر ٹونڈہ میں ، جو آگرہ اجمیر کے راستے میں ہے ، پیدا ہوئے ۔ ۱۲ برس کے تھے جب تحصیل علم کے لیے والد کے ہمراہ 'سنبھل' گئے ۔ عربی علوم کی تحصیل اپنے نانا مخدوم اشرف سے کی ۔ ان کے ددھیال اور ننھیال دونو صاحب علم اور دین دار گھرانے تھے ۔ ملا بدایونی نے بقول خود ان کے بہت سے علوم شیخ مبارک ناگوری

(فیضی ، ابوالفضل کے والد) سے سیکھے تھے - ۹۶۶ھ میں باپ بیٹا بساور سے آگرہ چلے آئے - یہاں دو سال کے بعد ان کے والد فوت ہو گئے اور ان کی نعش بساور لے جا کر دفنائی گئی - ۹۷۵ھ میں بدایوں میں ان کی شادی ہوئی اور ۹۸۱ھ میں دربار اکبری میں ملازمت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سے پہلے بدایوں میں حسین خاں کی سرکار میں تھے - آگرہ میں جلال خاں قورچی وغیرہ کے وسیلے سے بادشاہ کے ہاں باریاب ہوئے۔ ماہ رمضان ۹۸۷ھ میں قاضی علی کی کوششوں سے ان کے نام ہزار بیگھہ اراضی کی مدد معاش منظور کی گئی - اکبر نے انہیں ترجمہ اور تصنیف و تالیف کے کام اور کتابوں کے انتخاب پر مامور کیا - ہندی کی ایک کتاب اتھروں وید کا ترجمہ خاطر خواہ نہ کر سکے جس کے سبب اکبر نے یہ کام فیضی کے سپرد کر دیا - اس کے علاوہ چند ایک تراجم و تالیفات یہ ہیں : 'الاحادیث' - اس میں تیراندازی اور جہاد کے سلسلے کی چالیس احادیث جمع کی گئی ہیں - 'تاریخ الفی' - اس کی تصنیف پر سات آدمی مقرر ہوئے جن میں ایک بدایونی بھی تھے - چوتھی کتاب مہابھارت کا ترجمہ ہے جس کا نام 'رزم نامہ' رکھا جسے انہوں نے نقیب خاں کے ساتھ مل کر ترتیب دیا - رامائن کا ترجمہ ۹۹۷ھ میں کیا - ایک کتاب جامع رشیدی کا ترجمہ ہے جسے ابوالفضل کے مشورہ سے کیا - اسی طرح کئی ایک اور تراجم و تالیفات مرتب کیے - سب سے زیادہ اہم تصنیف منتخب التواریخ ہے جو غزنوی دور سے لے کر اکبری دور تک پھیلی ہوئی ہے - زیادہ تر احوال اکبر کے ہیں - تیسری جلد اکبری دور کے علما، حکما اور شعرا وغیرہ کے حالات کے متعلق ہے - جیسا کہ فیضی نے لکھا ہے بدایونی علوم معقولات و منقولات کے فاضل ، عربی فارسی کے انشا پرداز ، حساب ولایتی اور ہندی راگوں سے واقف تھے - ۱۰۰۴ھ میں فوت اور اپنے وطن ہی میں مدفون ہوئے۔

(منتخب التواریخ ، تذکرۂ علمائے ہند ، دربار اکبری)

۱۲ - میر فتح اللہ - یہ پہلے حاکم دکن عادل خاں کے پاس تھا - اکبر نے ماہ ربیع الثانی ۹۹۰ھ میں مذکورہ حاکم کو فرمان بھیج کر

اسے بلایا ۔ بڑا جلیل القدر فاضل اور شیراز کے ایک سید گھرانے سے تعلق رکھتا تھا ۔ تحصیل علم کے بعد ہی شہرۂ کمال دور دور تک پھیلا ۔ دکن میں وارد ہوا تو والی بیجا پور کے دربار میں منصب وکالت پایا ۔ بقول فرشتہ علی عادل شاہ نے اس کا شہرہ سن کر لاکھوں روپے اور خلعت وغیرہ بھیج کر شیراز سے بلوایا تھا ۔ بدایونی لکھتے ہیں کہ جب بادشاہ کے فرمان پر یہ دکن سے فتح پور پہنچا تو اکبر کے حکم سے خان خاناں اس کے استقبال کے لیے گئے ۔ میر فتح اللہ الٰہیات ، ریاضیات ، طبیعیات ، طلسمات اورنیز نجات اور دوسرے علوم عقلی و نقلی میں اپنے زمانے کا ماہر فن شخص تھا ۔ بادشاہ نے اسے منصب صدارت عطا کیا ۔ بادشاہ ہی نے اس کا نکاح مظفر خاں کی چھوٹی لڑکی سے کرا دیا اور اسے وزارت کے عہدے پر ٹوڈرمل کا شریک بنا دیا ۔ وزارت کے ساتھ ساتھ امرا کے بچوں کو بڑے شوق سے درس دیا کرتا ۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم ، حدیث ، تفسیر اور کلام وغیرہ میں بھی بڑی مہارت تھی ۔ کئی ایک اچھی تصنیفات کا مالک ہے ۔ بادشاہ کی طرف سے عضد الدولہ کا خطاب ملا تھا ۔ بقول بدایونی میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت با اخلاق ، منکسر المزاج اور نیک نفس تھا ، لیکن جس وقت پڑھانے بیٹھتا تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتا ۔ ۹۹۷ھ میں بادشاہ کے ساتھ کشمیر گیا ۔ وہاں جاتے ہی بیمار ہو گیا ۔ بیماری نے طول کھینچا تو بادشاہ خود عیادت کو گیا ۔ بہت تسلی دی ۔ اپنے ساتھ لے جانا چاہا لیکن ضعف قویٰ کے سبب ایسا نہ ہو سکا ۔ آخر تھوڑے عرصے کے بعد وفات پائی ۔ کشمیر میں تخت سلیمان کے مقام پر مدفون ہوا ۔ تاریخ وفات 'فرشتہ بود' کے الفاظ سے نکلتی ہے ۔

(منتخب التواریخ ، تاریخ فرشتہ ، اکبر نامہ ، تذکرہ علمائے ہند ، دربار اکبری)

۱۳ ۔ ذرا ملاحظہ ہو کہ فیضی نے ملا عبد القادر کے لیے کیا کچھ لکھا اور کیا ، اور ملا صاحب نے اس کے بدلے میں اسے مرتے وقت بھی کن کن برے الفاظ سے یاد کیا ۔

اسد بیگ قزوینی (صفحہ ۲۷٦)

١ - اجین ۔ یہ شہر سپراندی کے کنارے قبل مسیح سے آباد چلا آ رہا ہے ۔ پہلے یہ مالوہ کے راجاؤں کا پایۂ تخت تھا ۔ راجا بکرماجیت کا یہی دارالخلافہ تھا ۔ اس کا قدیم نام 'ادنت کا پوری' ہے ۔ اس کا تذکرہ مہابھارت میں بھی آیا ہے اور اس کا شمار ہندوؤں کے سات مشہور تیرتھوں میں ہوتا ہے ۔ شمس الدین ایلتتمش نے ٦٣١ھ میں اسے پہلی مرتبہ فتح کیا تھا ۔ یہاں کے حکم رانوں نے شہر مانڈو کو پایۂ تخت بنا لیا ۔ اکبر کے زمانے میں یہ دھلی کا صوبہ بن گیا ۔ تیرھویں صدی میں یہ مہاوا جی سندھیا اور دولت راؤ سندھیا مرھٹوں کے قبضے میں رہا ۔ اب یہ ایک معمولی قصبہ ہے جس کی آبادی انگریزی عہد میں ۳۵ ھزار سے زائد نہیں رھی ۔ ایک دروازہ 'چوبیس کھنبا' نام کا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ اسے راجا بکرماجیت نے بنایا تھا ۔ برھمنوں کی روایت کے مطابق اس عمارت میں ٦٤ جوگی رہتے تھے جو ہر روز ایک شخص کو راجا بنا کر شام کے وقت اس کا خون پی لیتے تھے ۔ بکرماجیت نے ان جوگیوں کو قتل کروا دیا ۔ اس کی یادگار میں اس جگہ دسہرہ اور اشٹمی کے دن بھگوتی کا بڑا میلہ لگتا ہے ۔ ایک قدیم مندر مہاکالی مہا دیو کا مندر ہے ۔ یہ بھی بکرماجیت کی یادگار ہے ۔ اسے ایلتتمش نے گرا دیا تھا ۔ موجودہ مندر بعد کی تعمیر ہے ۔ اس کے علاوہ سپرا ندی کے گھاٹ رانی کا باغ ، بھرتری کا گپھا ، کالیادہ کا محل ، بے نیو کی مسجد اور جامع مسجد مشہور مقامات ھیں ۔ (بہ حوالہ حاشیہ منتخب التواریخ اردو ترجمہ از محمود احمد فاروقی صفحہ ۳۰۵) ۔

۲ - حکیم عین الملک شیرازی متخلص بہ دوائی ، علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ اور اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا ۔ اسے اکبر نے راجا علی خاں والیٔ برھان پور کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا ۔ وہاں سے یہ اپنی جاگیر ھندیہ میں لوٹ آیا ۔ پانچ ماہ بیمار رہ کر ۲۷ ذی الحج ۱۰۰۳ھ کو فوت ھوا ۔

(منتخب التواریخ صفحہ ۵۵۷ ، ٦۵۲ ، طبقات اکبری صفحہ ۳۹۵)

۳ - حکیم علی ، حکیم الملک کا بھانجا اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد تھا - شیخ عبدالنبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی - علوم شرعی پر اچھی نگاہ تھی - بہ قول بدایونی زیدیہ مذہب کا کٹر معتقد تھا - بدایونی اس کے متعلق لکھتے ہیں : ''اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے - مریضوں کا علاج معالجہ بھی کرتا رہتا ہے لیکن نوجوان اور خود پسند ہے - ابھی علمی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں - اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں -'' بہ قول صاحب اقبال نامہ جہانگیری اس نے اپنے گھر میں ایک حوض بنایا تھا - اس کے کونے میں زیر آب ایک کمرہ بنایا جو نہایت روشن تھا - اس کمرے میں اس نے کچھ سامان اور کتابیں وغیرہ رکھیں - ہوا کا دباؤ ایسا رکھا کہ پانی کا ایک قطرہ بھی اس میں داخل نہ ہوتا تھا - بہت سے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے وہاں جاتے - (منتخب التواریخ اردو ، صفحہ ۶۵۳ - اقبال نامہ ، صفحہ ۳۵ و ۳۶ - طبقات اکبری ، صفحہ ۳۹۶) -

۴ - یعنی اسد بیگ قزوینی -

۵ - چوب چینی ، ایک مشہور دوا ، گل عباسی کی جڑ -

خواجہ ہاشم کشمی (صفحہ ۲۸۰)

۱ - حسن سجزی ، نجم الدین حسن ، امیر خسرو کے یار غار تھے - ان کے والد کا نام علاء تھا - اسی وجہ سے انھوں نے فوائد الفواد کے دیباچے میں اپنے آپ کو حسن علاء سجزی لکھا ہے - ان کے آباؤ اجداد سجستان یا سیستان کے رہنے والے تھے ، اسی لیے سجزی کہلائے - نسباً ہاشمی تھے - بہ قول مسعود علی محوی مرتب دیوان حسن ، ان کا مولد بدایوں ہے - لیکن نشو و نما دھلی میں ہوئی - اس لیے ان کے نام کے ساتھ دھلوی لکھا جاتا ہے - ۶۵۲ھ میں ان کی ولادت ہوئی -

یہ تو نہیں معلوم کہ ان کا مبلغ علم کیا تھا لیکن ان کے دیوان اور فوائد الفواد کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ فارسی اور عربی پر

پورا پورا عبور رکھتے تھے - فارسی کے تو ایسے شاعر ہوئے کہ سعدی ہندوستان کے لقب سے مشہور ہوئے - عربی میں قواعد النحو کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بہت مشہور ہوئی - بہ قول برنی سلاطین ، اکابر اور دھلی کے اولیاء اللہ کے بارے میں ان کا علم بڑا حاضر تھا - مولانا شبلی نے شعرالعجم میں حسن کے جمال و حسن اور امیر خسرو کی ان سے دوستی کی جو روایت بیان کی ھے وہ اگرچہ تاریخ فرشتہ سے ماخوذ ھے ، لیکن جدید تحقیق نے اسے غلط ٹھہرایا ھے - اس لیے کہ حسن کے معاصر برنی نے ان کی دوستی کا تو ذکر کیا ھے لیکن ان کی داستان عشق کا تذکرہ نہیں کیا - اور ڈاکٹر وحید مرزا لکھتے ھیں کہ وہ معاشرتی طور پر تو ایک دوسرے کے اچھے دوست تھے لیکن ان میں پیشہ ورانہ رقابت تھی - حسن ، شہزادہ محمد سلطان کے ساتھ وا بستہ رھے - یہ اس کے دوات دار تھے - پانچ سال تک اس کے ساتھ ملتان میں رھے اور اس کے ندیم کی حیثیت سے اس سے وظیفہ اور انعام پاتے رھے - جب شہزادہ مذکور چنگیزخانیوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ھوا تو یہ دھلی آ کر گوشہ نشین رھے اور پھر کچھ عرصے کے بعد سلطان علاءالدین خلجی کے دربار سے وابستہ ھو گئے - حضرت نظام الدین اولیا کے مریدوں میں قرب و عنایت شیخ سے ممتاز تھے - بہ قول عبدالحق محدث ''آپ کو امیر خسرو کی نسبت ایک گونہ تقدم حاصل ھے ، اگرچہ دونوں ایک دوسرے کے مصاحب و معاصر تھے - آپ نے سلطان غیاث الدین بلبن کی مدح میں قصیدے لکھے ھیں ، لیکن امیر خسرو کے کلام میں اس بادشاہ کی تعریف میں کوئی چیز نہیں ملتی اور انھوں نے اکثر اشعار اس کے بیٹے خان شہید کی مدح میں لکھے ھیں جو حاکم ملتان تھا اور امیر خسرو اس کی ملازمت میں تھے -''

محدث مذکور آخر میں لکھتے ھیں : ''امیر حسن کا مولد و منشا دھلی ھے - تمام زندگی مجردانہ بسر کی - آخری عمر میں دیو گیر (دولت آباد) تشریف لے گئے اور وھیں مدفون ہوئے - روضۂ مبارک بھی اسی جگہ ھے -'' انھوں نے اپنے مرشد نظام الدین اولیا کے ملفوظات 'فوائد الفواد' کے نام سے جمع کیے - آپ کی وفات ۷۳۷ھ میں ہوئی (اخبار الاخیار

صفحہ ۱۰۱-۱۰۳ ، شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۱۶ ، بزم مملوکیہ صفحہ ۳۱۹ بیعد ، لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از ڈاکٹر وحید مرزا مطبوعہ پنجاب یونیورسٹی صفحہ ۵۰ ، مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر فارسی از ڈاکٹر صفا کا اردو ترجمہ صفحہ ۱۰۵ ، ارمغان پاک از شیخ محمد اکرام مطبوعہ ایران صفحہ ۶۰ ، دیوان حسن سجزی مرتبہ مسعود علی محوی مطبوعہ دکن صفحہ ۱۶ بیعد ، فوائد الفوائد اردو ترجمہ صفحہ ۱) ۔

۲ ۔ آپ کا ذکر کسی اور جگہ ملاحظہ ہو ۔

۳ ۔ سلسلۂ نقشبندیہ ، اس کے بانی خواجہ بہاء الدین نقشبند تھے ۔ رسالہ بہائیہ میں ، جو آپ کے مقامات کے سلسلے میں لکھا گیا ہے ، ہے کہ آپ اور آپ کے والد ماجد دونوں کمخواب کے کپڑے بنتے اور ان پر نقوش بنایا کرتے تھے جس کی وجہ سے آپ کا یہ لقب مشہور ہو گیا ۔ اس سلسلے کے جتنے بھی مشائخ گزرے ہیں وہ سب حنفی المشرب تھے ۔ ایک مرتبہ خواجہ نقشبند سے سلسلۂ نقشبندیہ میں جہر و خلوت اور سماع کے جائز ہونے کے بارے میں پوچھا گیا جس کا جواب آپ نے نفی میں دیا ۔ پھر پوچھا گیا کہ اس سلسلے کی اساس کس چیز پر ہے تو آپ نے فرمایا ، ظاہر میں خلق خدا پر اور باطن میں حق تعالیٰ پر ۔ اسی طرح ایک مرتبہ سماع کے بارے میں آپ کی رائے دریافت کی گئی تو آپ نے جواب دیا کہ نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کام کرتا ہوں ۔ (سفینۃ الاولیا صفحہ ۷۸) ۔

۴ ۔ خواجہ حسام الدین حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلیفوں میں سے تھے ۔ ان کے والد قاضی نظام بدخشانی علوم سخن دانی کا مجموعہ تھے ۔ قاضی مذکور ہندوستان کے امرا میں شمار ہوتے تھے ۔ انھوں نے ۹۹۲ھ میں وفات پائی ۔ خواجہ حسام الدین نے کچھ عرصہ اپنے والد کی طرح امارت و جاہ کی زندگی بسر کی ۔ لیکن چوں کہ انھیں صوفیا سے بہت لگاؤ تھا ، اس لیے وہ ہمیشہ ان کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے ۔ اسی طرح وہ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں بھی پہنچ گئے ۔ آپ کی صحبت کی برکت سے ان پر گوشہ نشینی کا غلبہ ہوا اور پھر ایک وقت

ایسا آیا کہ انھوں نے موٹا کھردرا کپڑا پہن لیا اور تمام مال اموال سے ہاتھ اٹھا لیا ۔ اس موقع پر حضرت خواجہ ماوراء النہر تشریف لے گئے ہوئے تھے ۔ جب وہ واپس آئے تو انھوں نے آپ (خواجہ باقی) سے تعلیم اذکار مراقبات وغیرہ لی ۔ کہتے ہیں کہ ابوالفضل چاہتا تھا کہ یہ فقیری ترک کرکے پھر سے امارت کی طرف آئیں ، لیکن یہ نہ مانے ، جس پر ابوالفضل نے انھیں خاصی سزائیں دیں ۔ انھوں نے اس کا ذکر حضرت خواجہ سے کیا ۔ انھوں نے فرمایا کہ خاطر جمع رکھو ، انہی دنوں میں اس کا معاملہ درہم برہم ہو جائے گا ۔ چناں چہ آپ نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا ، اور ابو الفضل انہی ایام میں قتل کر دیا گیا ۔ خواجہ حسام کا یہ دستور تھا کہ مسجد فیروز آباد میں صبح کی نماز کے بعد چند گھنٹے مراقبہ کرتے ۔ اس کے بعد اشراق کی نماز ادا کرکے اپنے مرشد کے مزار پر جو شہر سے دو میل دور تھا ، جاتے اور تمام دن تلاوت ، عبادت اور مراقبے میں گزارتے ۔ ہر روز قرآن پاک کے پندرہ جزو تلاوت کرتے اور ساتھ ہی حدیث کا مطالعہ بھی کرتے ۔ عصر کی نماز وہاں ادا کرکے شہر کی طرف لوٹتے ۔ ۱۰۴۰ھ میں ان کی عمر کچھ اوپر ساٹھ برس تھی ۔ تاریخ وفات کا پتا نہیں چل سکا ۔ (زبدۃ المقامات مطبوعہ کان پور صفحہ ۷۸-۸۶)

۵ - یہ شعر سعدی کے دیوان 'طیبات' میں مندرج غزل ذیل کا ہے :

تو از هر در که باز آئی بدین خوبی و زیبائی
دری باشد که از رحمت بروی خلق بگشائی
ملامت گوی بیحاصل ترنج از دست نشناسد
دران معرض که چون یوسف جمال از پرده بنمائی
بزیورها بیارایند وقتی خوب رویان را
تو سیمین تن چنان خوبی که زیورها بیارائی
چو بلبل روی گل بیند زبانش در حدیث آید
مرا در رویت از حسرت فرو بستست گویائی
تو با این حسن نتوانی که روی از خلق درپوشی
که همچون آفتاب از جام و خور از جامه پیدائی

تــو صاحب منصبی جــانا ز مُسکینان نیندیشیٔ
تو خواب آلوده ای بر چشم بیداران نبخشائی
گرفتم سرو آزادی نــه از مــاء معین زادی
مــکن بیگانگی با مــا چــو دانستی که از مائی
دعــائی گر نمی گوئی بــدشنامی عــزیزم کن
که گر تلخست ، شیرینست ازآن لب هرچه فرمائی
گــمان از تشنگی بــردم که دریا تــا کمر باشد
چو پایانم برفت اکنون بدانستم که دریائی
تو خواهی آستین افشان و خواهی روی درهم کش
مگس جــائی نخواهد رفتن از دکان حــلوائیٔ
قیامت می کنی سعدی بدین شیرین سخن گفتن
مسلم نیست طوطی را در ایامت شکر خائی
(کلیات شیخ سعدی ، مطبوعه ایران ۱۳۳۸ش صفحه ۶۵۷)

۶ - مولانا روم نے مثنوی کے پانچویں دفتر کے شروع میں آں حضرت صلعم اور آپ صلعم کے ایک کافر مہمان کی کہانی بیان کی ہے ، اس میں یہ شعر آیا ہے - کہانی اس طرح بیان کی ہے کہ چند کافر شام کے وقت آپ صلعم کے پاس آتے ہیں - آپ کے صحابہ کرام رض جو اس وقت وہاں موجود ہوتے ہیں ، ایک ایک کافر مہمان اپنے ذمے لے لیتے ہیں - ایک موٹے سے مہمان کو آپ صلعم لے جاتے ہیں اور حجرے میں ٹھہراتے ہیں - ایک کنیز غصے میں باہر کی کنڈی چڑھا دیتی ہے - صبح کے وقت جب اس مہمان کو حاجت ہوتی ہے تو اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا ، جس کے نتیجے میں اس کا پائجامہ گندگی سے بھر جاتا ہے - صبح آں حضرت صلعم کنڈی کھول کر چھپ جاتے ہیں تاکہ وہ چپکے سے نکل جائے کیوں کہ آپ صلعم کو اس واقعے کا پتا چل چکا تھا - وہ چلا جاتا ہے - اتنے میں ایک شخص اس کا وہ پائجامہ آں حضرت صلعم کے پاس لے کر آتا ہے - آپ صلعم اسے اسی حجرے میں اپنے دست مبارک سے دھونے بیٹھ جاتے ہیں - اس کافر کی کوئی چیز وہاں رہ گئی ہوتی ہے - وہ لینے آتا ہے ، لیکن اس چیز کے

لالچ میں وہ اس حجرے میں داخل ہوتا ہے ۔ وہاں جب آپ صلعم کو وہ پلید پائجامہ دھوتے دیکھتا ہے تو سر پیٹ لیتا ہے ۔ اپنی چیز اسے بھول جاتی ہے :

مسی زد او دو دست را بر رو و سر
کلہ را می کوفت بر دیوار و در
آن چنانکہ خون ز بینی و سرش
شد روان و رحم کرد آن مہترش

آں حضرت صلعم کو اس کی اس حالت پر رحم آ گیا ۔ اسی طرح وہ پیٹتا رہا ، کبھی سجدہ کرتا ، کبھی شرمساری کا اظہار کرتا ، کبھی کہتا کہ میں بڑا ظالم ہوں ۔ وغیرہ

یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد مولانا رح لکھتے ہیں :

چون ز حد بیرون بلرزید و طپید
مصطفٰی اش درکنار خود کشید
ساکنش کـرد و بسی بنواختش
دیدہ اش بکشاد و داد اشناختش

یعنی جب وہ بہت تڑپا اور بہت کانپا تو آں حضرت صلعم نے اسے اپنی بغل میں لے لیا ۔ اسے تسلی دی اور اچھی طرح نوازا ۔ یہاں آ کر مولانا فرماتے ہیں :

تـا نگریـد ابـر کی خندد چمن
تـا نگریـد طفل کی جوشد لبن

(اس نسخے میں پہلے مصرعے میں 'نگرید' کی بجائے 'بگرید' ہے)
(ملاحظہ ہو دورۂ کامل مثنوی معنوی مرتبہ رینولدالین نیکلسون تہران ، صفحہ ، ۸۲۳ تا ۸۲۶)

۷ ۔ یعنی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ (مجدد الف ثانی)

حضرت خواجہ باقی باللہ (صفحہ ۲۸۹)

۱ ۔ محمد صادق حضرت مجدد الف ثانی کے فرزند اکبر تھے ۔ آپ ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے ۔ بچپن ہی سے پیشانی سے ذکاوت و صفا کے آثار

نمایاں تھے ۔ شروع میں آپ کے دادا نے آپ کی تعلیم و تربیت کی ۔ حضرت مجدد رح کہا کرتے تھے کہ ہمارے والد فرمایا کرتے تھے ''تمہارا یہ فرزند ہم سے کیفیت و حقیقت اشیا کے بارے میں ایسی عجیب باتیں پوچھتا ہے کہ جن کا جواب بڑی دشواری سے دیا جا سکتا ہے ۔''

آپ کی وفات جوانی کے عالم میں سوموار ۹ ربیع الاول ۱۰۲۵ھ کو ہوئی ۔ ان دنوں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی ، جب اس کا زور بڑھ گیا تو آپ نے فرمایا کہ یہ وبا لقمۂ چرب مانگتی ہے ، جب تک ہم نہیں جاتے یہ کم نہ ہوگی ۔ چناں چہ آپ کو بخار ہوا اور آپ وفات پا گئے ۔ آپ کی وفات کے بعد بہت سے لوگ جنھیں طاعون کے آثار پیدا ہو گئے تھے ، صحت یاب ہو گئے ۔ (زبدة المقامات ، صفحہ ۳۰۰-۳۰۸)

۲ - علم و تعقل ۔

۳ - کشف و شہود ۔

۴ - شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ۔ آپ شیخ عبد الاحد فاروق کے بیٹے تھے ۔ ۹۷۱ھ میں سرہند میں ولادت ہوئی ۔ اٹھائیس واسطوں سے آپ کا نسب حضرت عمر رض تک پہنچتا ہے ۔ صغر سنی ہی میں حفظ کلام پاک کی سعادت حاصل کی ۔ کچھ علوم متداولہ والد ماجد سے حاصل کیے ۔ پھر سیالکوٹ چلے گئے اور وہاں مولانا کمال الدین کشمیری سے کتب معقول کا مطالعہ کیا ۔ علم حدیث مولانا یعقوب کشمیری سے حاصل کیا ۔ بعد ازیں مولانا عبدالرحمان محدث ، جو اپنے وقت کے بہت بڑے محدث تھے ، کی خدمت میں حاضر ہو کر تکمیل علم حدیث کی ۔ اس طرح سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہر سے فراغت پائی اور درس و تصنیف میں مصروف ہو گئے ۔ سلسلۂ چشتیہ کی خلافت اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی ، قادریہ سلسلہ کی بیعت کی اجازت شیخ سکندر کیتھلی سے لے کر حجاز کا رخ کیا ۔ جب دھلی پہنچے تو وہاں حضرت خواجہ باقی باللہ سے ملاقات ہوئی ۔ ان کے ہاتھ پر طریقۂ نقشبندیہ کی بیعت کی ۔ آپ کی شہرت بہت جلد دور دراز کے علاقوں

تک پہنچ گئی - چناں چہ برصغیر ہند و پاکستان سے لے کر ماوراءالنہر، روم، شام و مغرب کے علما و امرا آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے - حضرت شیخ نے علما اور صوفیہ کے درمیان ایک ہزار سال سے جو نزاع چل رہا تھا، اسے ختم کیا - یعنی آپ علما اور صوفیا کے درمیان 'صلہ' تھے - شہنشاہ جہانگیر کے زمانے میں بہت سے علما نے آپ کے خلاف اس کے کان بھرے - چناں چہ ایک مرتبہ اس نے آپ کو دربار میں طلب کیا - جب آپ کی باتیں سنیں تو عتاب سے ہاتھ اُٹھا لیا، لیکن حاضرین میں سے کسی نے کہا ''شیخ متکبر ہے اس نے آپ (جہانگیر) کو سجدہ نہیں کیا - حالاں کہ آپ ظل اللہ ہیں اور خدا کے خلیفہ ہیں -'' اس پر بادشاہ نے آپ کو قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا - آپ تین سال وہاں محبوس رہے - جہانگیر آپ کی رہائی کے متعلق اپنی تزک میں لکھتا ہے: ''میں نے شیخ احمد سرہندی کو جو زہد فروشی، بیہودہ گوئی کے سبب کچھ عرصے سے قید کاٹ رہا تھا طلب کیا ہوا تھا، اس دن کو اس کے حاضر ہونے پر اسے خلعت اور ہزار روپے عنایت کرکے آزاد کر دیا - ساتھ ہی اسے اختیار دے دیا کہ چاہے سرہند واپس چلا جائے یا میرے حضور میں رہے - اس نے از روئے انصاف کہا کہ یہ سزا سرزنش حقیقت میں ایک طرح کی ہدایت تھی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی - وہ حاضر خدمت رہنے میں ہی بھلائی دیکھتا ہے'' (یہ واقعہ اس نے اپنے پندرھویں سال جلوس کے تحت لکھا ہے) - لیکن بعد میں جہانگیر آپ کا بے حد معتقد ہوگیا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے کو زیادہ تر ان ہی کی خدمت بابرکت میں دیکھنا چاہتا تھا - روزانہ مغرب کے بعد وہ آپ سے ملاقات کرتا - ان ملاقاتوں میں حضرت مجدد رح کے سرچشمہ علم و فضل سے اس کے قلب کی جو تطہیر ہوئی ہے، اس کا ذکر خود حضرت نے اپنے ایک مکتوب میں جو ان کے صاحب زادے کے نام ہے، کیا ہے - جہانگیر کے اس تزکیۂ باطن کے بعد آپ نے اسلامی شریعت کی فلاح و بہبود کے لیے جو چاہا اس سے کرایا - مشہور ہے کہ جہانگیر اکثر کہا کرتا تھا کہ میرے پاس ایک دستاویز نجات ہے اور وہ حضرت شیخ کا ارشاد مبارک ہے کہ ''اگر اللہ تعالیٰ ہم کو جنت میں

لے جائے گا تو ہم تیرے بغیر نہ جائیں گے ۔''

آپ نے منگل وار ۲۸ صفر ۱۰۳۴ھ کو سرھند میں وفات پائی اور وھیں آپ کا مزار مرجع خلائق ہے ۔ (زبدۃ المقامات ، صفحہ ۸۸ ببعد ۔ تزک جہانگیری اردو ترجمہ ، صفحہ ۶۳۳ ۔ تذکرۂ علمائے ہند ، صفحہ ۱۰-۱۲ ۔ مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۳۰ ۔ بزم تیموریہ ، صفحہ ۱۶۶-۱۶۸)

۵ ۔ ان کا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔

۶ ۔ یعنی علی بن جعفر بن شیخ ابوالحسن خرقانی ، آپ قزوین کے ایک موضع خرقان کے رھنے والے اور اپنے زمانے کے غوث تھے ۔ تصوف میں آپ کا انتساب شیخ بایزید بسطامی سے ہے ۔ آپ کی وفات ۴۲۵ھ میں ہوئی ۔ (سفینۃ الاولیا مطبوعہ ۱۸۷۸ع لکھنؤ ، صفحہ ۱۷۴)

۷ ۔ امیر صالح ، غالباً اس سے مراد محمد صالح کولابی ھیں جو حضرت مجدد الف ثانی رح کے پرانے اصحاب میں سے تھے ۔ یہ بڑے صاحب انکسار و افتقار تھے ۔ بہ قول خود ان کے وہ ایک مدت تک مختلف مشائخ سے ملتے رہے ، لیکن کوئی کشش حاصل نہ ہوئی ۔ آخر ایک جمعہ کو جامع مسجد آگرہ میں ان کی ملاقات حضرت مجدد رح سے ہوئی ۔ آپ کو دیکھتے ھی ان کے دل مین کشش پیدا ہوئی اور یہ آپ (مجدد رح) کے قدم بوس ہوئے ۔ پھر آپ رح کے مکان پر جا کر ذکر اذکار کی تعلیم کے لیے درخواست کی ، جو منظور ہوئی ۔ ایک مدت تک آپ کے آستانے پر رہے ، لیکن استعداد کی کمی کے سبب ویسی کشادگی حاصل نہ ہوئی جیسی کہ دوسرے خادموں کو حاصل تھی ۔ آخر ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں حضرت مجدد رح اعتکاف کیے بیٹھے تھے ، طشت و آفتابہ کی خدمت مولانا کے سپرد تھی ۔ ایک شب جب حضرت نے ھاتھ دھوئے تو مولانا اس پانی کو ایک طرف لے جا کر غٹا غٹ پی گئے ۔ اس پانی کا پینا تھا کہ انھیں کشایش حاصل ہو گئی ۔ جب حضرت مجدد کی توجہ و عنایت سے درجۂ کمال کو پہنچے تو پھر آپ رح کی اجازت سے تعلیم طریقت میں ممتاز ہوئے ۔ انھوں نے کئی طلبا کو فیض پہنچایا ۔ مولانا نے ۱۰۳۸ھ میں وفات پائی ۔ (زبدۃ المقامات مطبوعہ کانپور ، صفحہ ۳۷۰-۳۷۲)

۸ - آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی امام عبدالجمیل ھے - آپ کی والدہ محترمہ شاھان روم کی نسل سے تعلق رکھتی تھیں - سلسلہ خواجگان کے سرگروہ تھے - حضرت خواجہ بہاءالدین نقشبند رح کی نسبت خصوصیت کے ساتھ آپ کی جانب راجع ھے - علوم ظاھری و باطنی میں کامل دست‌گاہ رکھتے تھے - سنت کی اتباع اور شریعت کی پیروی آپ کی امتیازی خصوصیت تھی - حضرت خضر علیہ السلام نے آپ کو اپنی فرزندی میں قبول فرما لیا تھا - عرفان الٰہی کے بحر بیکراں کی غوّاصی اور ذکر الٰہی میں ھمہ تن مشغولیت کا گر آپ نے حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے سیکھا - جب خواجہ یوسف ھمدانی بخارا پہنچے تو آپ ان کی صحبت میں رھنے لگے - انھی سے آپ نے خرقۂ ولایت پہنا - ولایت کے اس مقام پر پہنچے ھوئے تھے کہ نماز کے لیے کعبۃ اللہ جاتے اور چشم زدن میں واپس آ جاتے -

آپ غنجدوان میں پیدا ھوئے تھے - غنجدوان توابع بخارا میں سے ایک بڑا قصبہ ھے - اسی قصبہ میں آپ کی تربیت ھوئی - آپ نے فرمایا کہ ھمارے طریقہ میں ''ھوش در دم ، نظر بر قدم ، سفر در وطن اور خلوت در انجمن'' پر نظر رھتی ھے -

آپ نے ۵۷۵ھ میں غنجدوان ھی میں وفات پائی اور وھیں مدفون ھوئے - (سفینۃالاولیا ، اردو ترجمہ صفحہ ۹۸)

۹ - مرزا حسام‌الدین ، غالباً ان سے مراد خواجہ حسام‌الدین ھیں ، جن کا ذکر کسی دوسرے حاشیہ میں گزر چکا ھے -

۱۰ - مولانا یوسف ، سمرقند کے رھنے والے اور حضرت خواجہ باقی باللہ کے اصحاب میں سے تھے - فضائل میں بہرۂ وافی رکھتے تھے - حسن اخلاق کی کان تھے - حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں سرھند پہنچے - کچھ عرصہ وھاں رہ کر آپ (مجدد رح) سے فیض حاصل کیا - ابھی سلوک کی منزل طے کر رھے تھے کہ موت آ پہنچی - نزع کے وقت حضرت مجدد ان کے سرھانے موجود تھے - مولانا نے بڑی حسرت و تضرع

سے آپ سے کہا کہ آخری وقت آ پہنچا ۔ آپ نظر اور توجہ فرمائیں کہ جس سے مجھے مقصد اقصیٰ حاصل ہو ۔ آپ تھوڑی دیر متوجہ ہوئے اور پھر سر اٹھا کر فرمایا ''ہاں ، مولانا یوسف بگوئید کہ چہ شد ۔'' مولانا نے آپ کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کہا کہ الحمدللہ دل جس کا طالب تھا وہ جلوہ گر ہو گیا ۔ یہ کہہ کر جان جان آفرین کے سپرد کر دی ۔

(زبدۃ المقامات ، صفحہ ۳۶۷-۳۶۸)

۱۱۔ میاں شیخ اللہ داد ، حضرت شیخ باقی باللہ کے یاران مخصوص اور اصحاب اجازت یافتہ میں سے تھے ۔ حضرت خواجہ کے لاہور سے ماوراءالنہر کوچ کرنے سے پہلے آپ کی خدمت میں پہنچے تھے ۔ اور آپ سے نظر عنایت اور طریقت و مراقبہ حاصل کیا ، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر آپ کے ساتھ سفر میں نہ جاسکے ؛ البتہ حضرت خواجہ نے جاتے وقت اپنے مخلصین کو جو ھند میں تھے ، ان کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا اور اس سلسلے میں اپنے ایک خط میں لکھا کہ اگر ان کی ملازمت میسر آ جائے تو غنیمت ھے ۔ جب حضرت خواجہ سفر سے لوٹے تو شیخ بڑی ھی عقیدت و شکستگی کے ساتھ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے ۔ مسافروں کی دیکھ بھال اور خوراک اور خانقاہ حضرت خواجہ کے لوازم کی خدمت گاری انھی کے سپرد تھی ۔ ان مصروفیات کے ہوتے ہوئے بھی شیخ نے کبھی اذکار اور احوال باطن میں تساہل نہ برتا ۔ چناں چہ اپنے مرشد حضرت خواجہ کی توجہات خاصہ سے نسبت ھاے شایستہ کو پہنچے ۔ ان پر بےخودی و رفتگی طاری رھتی تھی ۔ ایک مرتبہ شیخ مسجد فیروز آباد کی چھت پر اپنے چند احباب کے ساتھ بیٹھے تھے کہ اچانک ان پر کیف و بےخودی طاری ھو گئی ۔ شکر و جوش سے بڑے زور کا نعرہ مارا اور دوڑ پڑے ۔ قریب تھا کہ چھت سے نیچے زمین پر گر پڑتے کہ ایک دوست نے ان کی کمر کو مضبوطی سے پکڑ لیا ۔ شیخ 'خوبان روزگار' اور ارباب فنا و نیستی و انکسار میں سے تھے ۔ غیبت خیر و شریر اور عیب جوئی سے بالا اور حضرت خواجہ کے مزار کے مجاوروں میں سے تھے ۔ خواجہ حسام الدین اور شیخ میں

بڑی دوستی تھی - اگر کوئی طالب خواجہ حسام کے پاس ذکر و مراقبہ کی التماس کرتا تو وہ اسے شیخ کے پاس بھیج دیا کرتے -

(زبدۃ المقامات ، صفحہ ۸۶ - ۸۸)

امام ربانی مجدد الف ثانی (صفحہ ۲۹۵)

۱- شیخ فرید - یہ اکبر کا بخشی اور ہزار و پانصدی امرا کے زمرے میں تھا - اسی نے جہانگیر کے بڑے لڑکے شاہ زادہ سلطان خسرو کی بغاوت کو دبایا تھا - جس پر بادشاہ نے اسے مرتضیٰ کے خطاب سے نوازا - پھر اس کی التماس پر پرگنہ بیروال میں ، جہاں کہ شیخ مذکور نے فتح حاصل کی تھی ، ایک شہر آباد کیا اور سرائے تعمیر کی گئی - اس شہر کا نام فتح آباد رکھا گیا اور یہ پرگنہ اسی مرتضیٰ خان کو مرحمت ہوا - ایک موقع پر ، اکبر کے اٹھائیسویں سال جلوس میں ، خان اعظم نے اسے اڑیسہ کی سفارت پر ، وہاں کے حاکم سے مصالحت کے لیے بھیجا ، لیکن وہاں کے حالات بگڑ گئے ، جس کے سبب اسے جان بچا کر وہاں سے نکلنا پڑا -

شیخ فرید موسوی سادات میں سے اور اکبر کا تربیت یافتہ تھا - جہانگیر نے تخت نشین ہوتے ہی اسے پنج ہزاری ذات کے منصب اور میر بخشی کے بلند مرتبہ پر سرفراز کیا - اور آخر میں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا ، اسے مرتضیٰ کے خطاب سے نوازا اور جاگیر دی - جہانگیر نے اپنی تزک میں اس کا ذکر کیا ہے - اس کی وفات جہانگیر کے گیارھویں سال جلوس (۱۰۲۵ھ) میں ہوئی - اس کی وفات پر وہ لکھتا ہے ''۳ ماہ خور داد کو مرتضیٰ خان کی وفات کی خبر ملی - وہ اس سلطنت کے پرانے ملازموں میں سے تھا - والد بزرگوار نے اس کی پرورش کی تھی اور اس پر اعتماد رکھتے تھے - میری سلطنت کے دوران میں اس نے خسرو کو شکست دینے میں نمایاں خدمات انجام دی تھیں - اس کا منصب شش ہزاری ذات و پانچ ہزار سوار تک پہنچ گیا تھا - پچھلے دنوں صوبۂ پنجاب کا صوبہ دار ہونے کی وجہ سے اس نے قلعہ کانگڑہ کو

جو کوہستان پنجاب میں واقع ہے ، فتح کرنے کا ذمہ لیا تھا اور یہاں سے رخصت ہو کر اس قلعے پر جس کی مضبوطی کی مثال دنیا میں کم ہے ، قبضہ کرنے کی مہم میں مصروف ہوگیا تھا - اس غم انگیز خبر سے نہایت افسردگی ہوئی - سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کے اس جیسے اچھے خادم کی وفات سے غم زدہ ہونا قدرتی امر ہے - چوں کہ اس کی زندگی سلطنت کی بہی خواہی میں گزری تھی اور سلطنت کی خدمت گزاری ہی میں اس کی جان گئی اس لیے میں نے اللہ تعالیٰ سے اس کے لیے دعاے مغفرت کی -'' (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۵۱۰ - طبقات اکبری ، صفحہ ۳۸٦ - تزک جہانگیری اردو ترجمہ ، صفحہ ۹۵ ، ۳۰۰ ، ۳۴۲ ، ۳۴۳ - سیر المتاخرین مطبوعہ لاہور ، صفحہ ۱۳۷-۱۳۹)

۲ - ایک سکے کا نام ، جس کی قیمت مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے - تقریباً نئے پیسے کے برابر سمجھ لیجیے -

۳ - اصل -

۴ - وہ چیز جو کسی دوسری چیز کے سبب سے قائم ہو -

۵ - اوامر : جمع امر ، یہاں بہ معنی وہ کام جن کے کرنے کا شرع حکم دیتی ہے - (نیک کام ، عبادت وغیرہ)

نواہی : جمع ناہی و نہی ، یہاں بہ معنی وہ کام جن کے کرنے سے شرع روکتی ہے - (برے کام)

٦ - رائے گوبند وال : مکتوبات امام ربانی مطبوعہ امرتسر میں یہ عبارت اس طرح ہے 'گوبند و آل او' یعنی 'گوبند اور اس کی اولاد' - اور مرتب مکتوبات نے حاشیے میں لکھا ہے کہ گورو نانک کا دسواں نائب تھا - اس نے اورنگ زیب عالم گیر کے زمانے میں بغاوت کی اور مارا گیا - وغیرہ - (ملاحظہ ہو دفتر اول حصہ سوم صفحہ ۸۲) تعجب ہے کہ مرتب کو اتنا پتا نہیں ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کس دور کی شخصیت تھے - اس نے نہ صرف صحیح لفظ گوبند وال کو بدل دیا بلکہ حاشیہ بھی غلط چڑھایا - دراصل 'راے گوبند وال'

کا مطلب ہے گوبند وال کا راجہ ۔ اور گوبند وال جیسا کہ جہاں گیر نے لکھا ہے دریائے بیاس کے کنارے واقع تھا ۔ یہاں امام ربانی رح نے گوبند وال کے جس راجہ کا ذکر کیا ہے وہ گورو ارجن مل ہے جسے جہاں گیر نے مروا دیا تھا ۔

اس کی تفصیل خود جہاں گیر کی زبانی سنیئے ۔ اپنے پہلے سال جلوس کے واقعات میں وہ لکھتا ہے ''گوبند وال میں جو دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے ، ارجن نام کا ایک ہندو پیری و بزرگی کا روپ دھارے ہوئے سادہ لوح ہندوؤں اور احمق و نادان مسلمانوں کی کثیر تعداد کو اپنے فریب کے دام میں پھنسا کر اپنی ولایت کا ڈنکا بجائے ہوئے تھا ۔ اس کے معتقد اسے گورو کہتے تھے اور اطراف و جوانب کے بے وقوف اور حماقت پرست اس سے رجوع کرکے اظہار عقیدت کرتے تھے ۔ اس طرح تین چار پشتوں سے اس کی پیری اور ولایت کی دکان چل رہی تھی ۔ ایک مدت سے میرے جی میں تھی کہ کفر و باطل کی اس دکان کو اٹھا دیا جائے ۔ یا اس شخص کو مسلمانوں کے زمرہ میں لے آیا جائے ۔ خسرو کی بغاوت اور شورش کے دنوں میں خسرو کا گوبند وال کی طرف سے گزر ہوا تو اس نامعقول آدمی نے خسرو کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا ۔ اتنے میں جہاں اس کا مقام تھا وہاں خسرو کا نزول ہوا ۔ ارجن نے جا کر خسرو کو دیکھا اور کچھ باتیں جو اس تک پہنچی تھیں ، خسرو کے کانوں تک پہنچا کر اس کی پیشانی پر آنگلی سے زعفران کی ایک لکیر کھینچی جسے ہندو قشقہ کہتے ہیں ۔ اور اچھے شگون کے طور پر کھنچتے ہیں ۔ جب مجھے اس بات کی خبر ہوئی تو میں نے ارجن کے ولایت کے دعویٰ کو جھٹلانا نہایت ضروری سمجھتے ہوئے حکم دیا کہ اسے میرے سامنے حاضر کیا جائے ۔ جب وہ میرے سامنے لایا گیا تو اس کا گھر بار اور آل اولاد مرتضیٰ خاں (فرید بخشی) کو عنایت کرکے اس کے مال و دولت کو ضبط کرتے ہوئے اسے مغل قانون کے مطابق قتل کی سزا دی'' ۔

ارجن مل کا ذکر 'دبستان مذاھب' کے اقتباس میں بھی آئے گا ۔

(تزک جہانگیری اردو ترجمہ صفحہ ۹۹)

۷ - جہانگیر بادشاہ سے مراد ہے -

۸ - آپ کا اسم گرامی سید جلال بخاری اور لقب مخدوم جہانیاں ہے - آپ کے جد امجد جلال بخاری (ان کا بھی یہی نام تھا) بخارا سے ہندوستان آئے تھے - یہاں آ کر انہوں نے ملتان میں حضرت بہاءالدین زکریا ملتانی کے ہاتھ پر بیعت کی - مخدوم جہانیاں شیخ الاسلام شیخ رکن الدین ابوالفتح قریشی قدس سرہ کے مرید اور حضرت شیخ نصیر الدین محمود رح کے خلیفہ تھے - مکہ معظمہ میں امام عبداللہ یافعی کے صحبت یافتہ تھے - آپ کے لقب مخدوم جہانیاں کی وجہ داراشکوہ نے یہ لکھی ہے کہ ایک مرتبہ آپ عید کے روز حضرت شیخ بہاء الدین زکریا اور شیخ صدر الدین عارف کے مزارات پر حاضر ہوئے اور دعا کی - اندر سے آواز آئی کہ حق تعالیٰ نے تجھے مخدوم جہانیاں بنا دیا ہے - تیری عید یہی ہے - جب آپ حضرت شیخ رکن الدین کے مزار پر آئے تو وہاں سے بھی یہی آواز آئی - جب آپ ان مزارات کی زیارت سے فراغت کے بعد باہر نکلے تو ہر شخص کی زبان پر مخدوم جہانیاں کا خطاب تھا - اور 'جہاں گرد' اس لیے کہتے ہیں کہ آپ نے تمام روے زمین کی سیر کی ہے -

آپ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں شیخ الاسلام کے منصب پر فائز ہوئے اور آپ کے لیے سیوستان اور اس کے مضافات کی مسند خانقاہ محمدی مخصوص ہوئی - کچھ عرصہ کے بعد آپ نے سب کچھ ترک کرکے کعبہ شریف کا سفر اختیار کیا -

آپ چودہ خاندانوں کے خلیفہ تھے - سلطان فیروز کے عہد میں کئی مرتبہ اُچھ سے دہلی تشریف لائے اور سلطان فیروز آپ کی خدمت میں بہت شائستہ طریقے سے اعتقاد اور اخلاص کے مراسم بجا لاتا - آپ کو حضرات قادریہ سے کمال محبت تھی - آپ نے سات مرتبہ حج ادا کیا - ایک مرتبہ خلیفہ مکہ سے آپ آں حضرت صلعم کا قدم مبارک لائے - جب دہلی پہنچے تو سلطان فیروز استقبال کے لیے چند منازل تک آگے پہنچا اور قدم مبارک آپ کے سر سے اٹھا کر اپنے سر پر رکھا

اور دھلی لے آیا ۔ بعد میں یہ قدم مبارک سلطان نے اپنے بیٹے فتح خان کی قبر پر نصب کرا دیا ۔

آپ کی ولادت آچہ کے مقام پر شب برات (بقول دارا شکوہ شب جمعہ یکم شعبان) ۷۰۷ھ میں ہوئی ۔ اور وہیں بہ عمر ۷۸ سال ۷۸۵ھ میں فوت ہوئے ۔ (اخبارالاخیار اردو صفحہ ۲۹۶ ، ۲۹۸ - سفینۃ الاولیا اردو، صفحہ ۱۳۲ ، ۱۳۳ ، مفتاح التواریخ صفحہ ۹۷-۹۸)

۹ - خان اعظم : عزیز کوکلتاش کا لقب اعظم خان یا خان اعظم خان تھا ۔ والد کی وفات کے بعد اعظم خان کا خطاب اور عہدۂ پنج ہزاری پایا ۔ اس کی والدہ جیجی کا دودھ اکبر نے پیا تھا ۔ اکبر اور یہ دونو ہم عمر اور ہم بازی (اکٹھے کھیلنے والے) تھے ۔ اکبر نے اپنے سولھویں سال جلوس میں اسے یہ خطاب دے کر دینال پور کی جاگیر بھی عطا کی ۔ اکبر کے بتیسویں سال جلوس میں اس کی شادی شاہزادہ سلطان مراد کی لڑکی سے ہوئی ۔ ۱۰۰۲ھ میں بقول مؤلف مفتاح التواریخ ، بادشاہ کو اپنی طرف سے ناراض دیکھ کر اس نے حج کا ارادہ کیا ، لیکن سیرالمتاخرین میں ہے کہ وہ باوجود شاھی عنایات کے اکبر سے آزردہ خاطر رہتا تھا ، اور ابوالفضل کے ساتھ اسے پرخاش تھی ۔ چناں چہ اسی آزردہ خاطری کے سبب طواف بیت اللہ کے ارادے سے عازم گجرات ھوا ۔ سومنات میں چند شاھی ملازمین کو محبوس کر کے اپنے بال بچوں سمیت جہاز میں سوار ھوا ۔ اکبر نے اسے روکنا چاھا ، لیکن وہ روانہ ھوگیا ۔ مکہ سے وہ دوسرے سال واپس ھوا۔ واپسی پر احمدآباد گجرات میں سکونت اختیار کی ۔ پھر اکبر کے حکم سے پایہ تخت پہنچا ۔ اکبر نے اسے وکالت کے منصب عالی پر سرفراز کیا اور اپنی مہر اس کے حوالے کی ۔ آخر میں اسے ھفت ھزاری کا منصب ملا ۔ دانش و فرزانگی اور شجاعت و مردانگی میں بے نظیر تھا ۔ جہانگیر کے ۱۹ ویں سال جلوس یعنی ۱۰۳۳ھ میں وفات پائی ۔ گجرات سے اس کی نعش دھلی لائی گئی اور وھاں اپنے باپ کے مقبرہ کے متصل مدفون ھوا ۔ اس کی قبر پر عالی شان عمارت سنگ مرمر سے بنائی گئی ، جس میں چونسٹھ ستون ھیں ۔ یہ جگہ اسی وجہ سے چونسٹھ کھنبہ کے نام سے مشہور ہے ۔ (طبقات اکبری ، منتخب التواریخ ، سیرالمتاخرین ، مفتاح التواریخ)

۱۰ - یہ شعر حافظ کی مندرجہ ذیل غزل کا ہے :

اگرچہ عرض هنر پیش یار بی ادبی ست
زبان خموش و لیکن دهان پر از عربیست
پری نهفته رخ و دیو در کرشمهٔ حسن
بسوخت دیده ز حیرت که این چه بوالعجبیست
درین چمن گل بی خار کس نچید آری
چراغ مصطفوی با شرار بولهبیست
سبب مپرس که چرخ ازچه سفله پرور شد
که کام بخشی او را بهانه بی سببیست
به نیم جو نخرم طاق خانقاه و رباط
مرا که مصطبه ایوان و پای خم طنبیست
جمال دختر رز نور چشم ماست مگر
که در نقاب زجاجی و پردهٔ عنبی ست
هزار عقل و ادب داشتم من ای خواجه
کنون که مست خرابم صلاح بی ادبی ست
بیار می که چو حافظ هزارم استظهار
بگریهٔ سحری و نیاز نیم شبی ست

(دیوان حافظ مرتبہ محمد قزوینی و دکتر قاسم غنی تہران صفحہ ۳۵)

۱۱ - ان کا ذکر اللہ تعالی نے قرآن مجید میں سورۂ کہف میں فرمایا ہے - (حضرت عباسؓ اور ابو مسعودؓ کے قول کے مطابق یہ سات نوجوان تھے) - یہ لوگ خدائے واحد کی پرستش کرنے والے تھے - اپنی بت پرست قوم سے تنگ آ کر ایک غار میں جا چھپے - ان کے ساتھ ان کا ایک کتا بھی تھا - غار میں ایک کشادہ میدان تھا جس میں وہ رہے - ان کا کتا دھلیز پر اپنے دونو ھاتھ پھیلائے ہوئے تھا - ان پر نیند کا غلبہ طاری ہوا اور وہ ایک طویل مدت تک سوئے رہے - اللہ تعالی فرماتا ہے ''اے مخاطب تو ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا حالاں کہ وہ سوتے تھے اور ہم ان کو کبھی داھنی اور کبھی بائیں

طرف کروٹ بدل دیتے تھے........اگر تو ان کو جھانک کر دیکھتا تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑا ہوتا اور تیرے اندر ان کی دھشت سما جاتی'' ۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انھیں بیدار کر دیا ۔ اب وہ آپس میں پوچھنے لگے کہ ہم کتنی دیر سوئے ھیں ۔ کسی نے کہا ایک دن بلکہ اس سے بھی کم ۔ کسی نے کہا خدا ھی بہتر جانتا ھے ۔ آخر انھوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو روپیہ دے کر شہر کی طرف بھیجا تاکہ وہ حلال کھانا لے آئے ۔ لیکن جب وہ شہر میں آیا تو سکہ بدل چکا تھا ۔ کیوں کہ یہ لوگ در اصل اس غار میں تین سو نو (۳۰۹) برس تک سوئے تھے ۔

مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ھو مولانا ابو الکلام آزاد کی تصنیف 'اصحاب کہف' ۔

(القرآن الحکیم مع ترجمہ شاہ رفیع الدین و مولانا اشرف علی تھانوی مطبوعہ تاج کمپنی لاھور صفحہ ۳۲۱-۳۲۳) ۔

۱۲ ۔ خواجہ عبید اللہ احرار ، ماہ رمضان ۸۰۶ھ میں تاشقند کے ایک قریہ باغستان میں متولد ہوئے ۔ اپنے لقب ناصر الدین احرار کے نام سے مشہور تھے ۔ والد بزرگوار کا نام خواجہ محمود بن شہاب الدین ھے ۔ آپ کے جد امجد کا شمار عالی قدر بزرگان دین میں ھوتا ھے ۔ حضرت خواجہ مولانا یعقوب چرخی کے بلند مرتبہ مریدوں میں سے تھے ۔ احراریہ سلسلہ کے سرگروہ ھیں ۔ ماوراء النہر اور خراسان کے باشندے آپ کی بڑی قدر و منزلت کرتے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ۔ مولانا جامی آپ کے عقیدت کیش و ارادت مند تھے ۔ چناں چہ انھوں نے اپنی بعض تصانیف بھی آپ سے معنون کی ھیں ۔ سطان ابو سعید مرزا اور عمر شیخ مرزا (ایلخانی بادشاہ) کو بھی آپ سے بہت ارادت و عقیدت اور نیاز مندی تھی ۔ کہتے ھیں کہ آپ بڑے دولت مند تھے اور آپ کی زمینداری کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ۔ فیاضی کا یہ عالم تھا کہ آپ اپنا مال راہ مولا میں خرچ کر دیا کرتے ، اس کے باوجود جب سال ختم ہونے کے قریب آتا تو لوگ انبار کے انبار لے جاتے تھے ۔ یہ بھی

حضرت خواجہ کی کرامات میں سے ایک کرامت تھی۔ بروز ہفتہ ۲۹ ربیع الاول ۸۹۵ھ کو بہ عمر ۹۰ سال وفات پائی۔ امیر علی شیرنوائی نے جو سلطان حسین مرزا کا وزیر تھا 'خلد برین' (۸۹۶) کے الفاظ سے تاریخ نکالی۔ لیکن مخبرالواصلین میں سال وفات ۸۹۵ھ ہی ہے۔ آپ کا مزار سمرقند میں واقع ہے۔ (سفینۃ الاولیا صفحہ ۱۰۳، ۱۰۴، مفتاح التواریخ صفحہ ۱۳۳، ۱۳۴)۔

۱۳۔ جوہر ادب شرح گنجینۂ ادب کے مصنفین نے 'دو کتاب شہا رسید' کا ترجمہ 'دو کتاب' ہی کیا ہے حالاں کہ یہاں مراد 'دو خطوط' ہے۔ ملاحظہ ہو جوہر ادب صفحہ ۲۰۱)۔

۱۴۔ اس فقرے کا ترجمہ مترجمین گنجینۂ ادب نے اس طرح کیا ہے ''کوئی ایسا زمانہ نہیں جو اس کا پیدا کیا ہوا نہ ہو کوئی ایسی جگہ نہیں جو اس کی بنائی ہوئی نہ ہو'' (جوہر ادب صفحہ ۲۰۱)۔ یہاں لفظ 'زمانی یا زمانے'، 'مکانی یا مکانے' میں یاے نسبتی ہے یاے نکرہ نہیں۔ اس لیے یہ ترجمہ درست نہیں ہے۔

۱۵۔ ہرگز ہرگز ایسا نہیں۔

۱۶۔ پہلے وہ خود گمراہ ہوئے پھر دوسروں کو گمراہ کیا۔

۱۷۔ پورا شعر اس طرح ہے۔

صلاح کار کجا و من خراب کجا ببین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
(حافظ)

۱۸۔ ان کا ذکر آگے کسی حاشیے میں آئے گا۔

۱۹۔ جو شخص اچھا طریقہ اختیار کرتا ہے اس کو اس طریقے پر عمل کرنے والوں کا اجر ملے گا۔

۲۰۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو مشکور (کام یاب) فرمائے۔

۲۱۔ جس نے خود کو کسی قوم سے مشابہ کیا پس وہ اسی قوم سے ہو گیا۔

۲۲۔ بدنامی کے موقعوں (جگہوں) سے پرہیز کریں۔

۲۳ - ابو الحسن اشعری - نام ابو الحسن علی بن اسماعیل الاشعری - ۲۶۰ھ میں ان کی ولادت ہوئی - ابو موسیٰ اشعری کے اعقاب میں سے تھے - ابو علی جبائی (فرقه معتزله کے عالم) کے شاگرد تھے - چالیس سال تک معتزله هی کے درمیان تربیت پائی - اس کے بعد اس فرقه سے قطع تعلق کر کے معتزله هی کے خلاف نبرد آزما ہوئے اور بقیه تمام عمر ان سے بر سر پیکار رہے - مذهب اشعری جو معتزله کے ضعف کا باعث بنا ، کے بانی آپ هی تھے - (صفا جلد اول صفحه ۲۴۰) -

۲۴ - امام ذهبی ، شمس الدین ابو عبداللہ محمد بن احمد بن عثمان بن قیماز بن عبداللہ الترکمانی الفارق الدمشقی الشافعی ؒ - آپ کی ولادت ۶۷۳ھ مطابق ۱۲۷۴ع میں به مقام میافارقین ہوئی - آپ عرب کے نہایت مشہور محدث و مؤرخ تھے - ابتدا میں دمشق میں تعلیم حاصل کی - پھر بعلبک ، حلب ، نابلس ، اسکندریه اور قاهره کے اساتذه سے استفاده کیا - ابوالفدا اور الوردی آپ کے هم عصر تھے - جب ۷۴۳ھ مطابق ۱۳۴۲ع میں آپ کی بینائی جاتی رهی تو آپ نے اپنے هم عصر اکابر کے حالات بھی قلم بند کئے - آپ کی وفات ۷۴۸ھ مطابق ۱۳۴۸ع میں دمشق کے مقام پر ہوئی - آپ کی بعض مشہور تصانیف یه هیں - طبقات الحفاظ ، المشتبهه فی اسماء الرجال ، تجرید اسماء الصحابه ، تاریخ اسلام ، الطب النبوی ، طبقات القراء ، مختصر العبر ، معجم ، کتاب العلوم ، مختصر المستدرک وغیره (بدایع الزهور ، کتاب التبیان ، فوات الوفیات ، تاریخ ابو الفداء به حواله نگار لکھنؤ سال نامه ۵۵ع صفحه ۹۴ ، ۹۵) -

۲۵ - بخاریؒ ، محمد بن اسماعیل ابو عبد اللہ الجعفی بہت بڑے جامع حدیث تھے - آپ کی ولادت بخارا کے مقام پر ۱۹۴ھ مطابق ۸۱۰ع میں ہوئی - آپ نے بہت کم سنی سے مطالعه حدیث شروع کیا اور سولھویں سال کی عمر میں مکه و مدینه کے مشہور ائمه حدیث کے لکچروں میں شریک ہونے لگے - اس کے بعد مصر گئے اور تمام ایشیا کی سیاحت کر کے وطن واپس آ گئے - 'جامع الصحیح' آپ کا بہت مشہور مجموعۂ احادیث ہے - آپ نے احادیث کے راویوں پر بھی ایک کتاب 'تاریخ الکبیر' کے نام سے

اور ایک تفسیر قرآن لکھی ۔ علاوہ ازیں ایک کتاب 'تنویر العینین برفع الیدین فی الصلواۃ' بھی آپ سے منسوب ہے ۔ آپ کی وفات ۲۵۶ھ مطابق ۸۷۰ع میں ہوئی ۔ (طبقات الشافعیہ (سبکی) بحوالہ ماہنامہ نگار لکھنؤ سال نامہ ۵۵ع علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر صفحہ ۸۲) ۔

۲۶ ۔ مراد سامانہ کا خطیب جس نے خطبے میں خلفاء راشدین کا ذکر نہ کیا ۔

۲۷ ۔ مہدوی فرقہ ، مہدوی تحریک کا آغاز پندرھویں صدی عیسوی میں اضلاع پورب میں ہوا ۔ شروع میں اس تحریک کا مقصد تجدید دین اور احیائے ملت تھا ۔ چناں چہ اس وقت اس تحریک نے نہایت مخلص اور قابل افراد کو متاثر کیا ۔ لیکن جلد ھی بانئ تحریک کے شخصی دعووں ، عوام کی مخالفت اور اصلاح کے چند نہایت خاص طریقوں تک محدود ھو گئی ۔ اس تحریک کے بانی سید محمد جون پوری ۱۴۴۳ع میں پیدا ھوئے ۔ ظاھری و باطنی علوم میں بے مثال تھے ۔ آپ کے مرشد شیخ دانیال چشتی جون پوری تھے اور دوسرے لوگوں نے آپ کو نوجوانی ھی میں اسد العلما کا خطاب دے رکھا تھا ۔ ملا بدایوانی آپ کے متعلق لکھتے ھیں کہ ''یہ بڑے پایہ کے بزرگ اور ولی کامل تھے انھوں نے امام مہدی ھونے کا بھی دعویٰ کیا تھا'' ۔ آپ کا انتقال ۹۰۰ھ میں ، جب آپ حج سے واپس لوٹ رھے تھے، بہ مقام فرہ ھوا ۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ حالت سکر میں آپ نے 'انا مہدی' کا نعرہ لگایا تھا ۔ لیکن ھوش میں آنے کے بعد اس دعویٰ سے توبہ کر لی اور مہدی موعود کی آمد کا اقرار کر لیا تھا ۔ اس کے باوجود آپ کے کچھ پیرو کاروں نے آپ کو مہدی موعود بنا لیا ، جس کے سبب یہ نیا فرقہ وجود میں آیا ۔ بعض کے مطابق آپ نے جو خود کو مہدی کہا تو اس سے آپ کی مراد خود کو صرف ھادی اور رھنما کہنا تھا ۔ اس فرقہ کی ایک خصوصیت تو ، بہ قول جناب شیخ محمد اکرام ، سید محمد جون پوری کے دعاوی پر ایمان ہے ۔ لیکن اس کے علاوہ بھی بعض چیزیں انھیں نمایاں کرتی ھیں ۔ مہدویوں کا عقیدہ ہے کہ فرائض و واجبات قرآنی دو قسم کے ھیں ۔ پہلی

قسم میں وہ احکام شامل ہیں جن کا تعلق نبوت اور شریعت سے ہے۔ ان احکام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شریعت کی زبان سے مفصل بیان فرما دیا۔ دوسری قسم میں وہ احکام ہیں، جن کا تعلق خاص ولایت محمدیہ سے ہے۔ اب مشیت الٰہی کو منظور ہوا کہ ان احکام کی بھی تبلیغ ہو جائے۔ لہٰذا حضرت سید محمد مہدی موعود مبعوث ہوئے۔ جو دافع ہلاکت امت محمدیہ صلعم اور ناصر شریعت محمدی و مبلغ احکام ولایت محمدی ہیں۔ مقام ولایت میں جو امور فرض ہیں اور ارکان دین کا درجہ رکھتے ہیں یہ ہیں: (۱) ترک دنیا (۲) صحبت صادقین (۳) عزلت از خلق (۴) توکل (۵) طلب دیدار خدا (۶) عشر (۷) ذکر کثیر (۸) ھجرت۔

ان اصولوں کی پیروی نے مہدویوں کی عملی زندگی کو ایک خاص رنگ دے دیا تھا، جس کے سبب ان کی حکومت وقت سے بھی کئی ایک مرتبہ کشمکش ہوئی۔ شروع میں یہ تحریک گجرات، خاندیش اور احمد نگر میں زوروں پر تھی اور بڑے قابل اور مخلص لوگ اس میں شامل تھے، لیکن بعض وجوہ کی بنا پر بعد میں یہ تحریک دکن میں منتقل ہو گئی۔ پھر ان لوگوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ مہدویت کی تنظیم و اشاعت کا بڑا ذریعہ ان کے 'دائرے' تھے، جو مختلف مقامات پر قائم ہوئے۔ ان میں یہ لوگ مل کے رہتے۔ جو کچھ ایک کے پاس ہوتا سب میں برابر بانٹ دیا جاتا۔ شرع کی سختی سے پیروی ہوتی۔ سب مل کر ذکر میں شریک ہوتے جس پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ جماعت کا نظام بڑا سخت تھا۔ جب یہ جماعت گجرات میں طاقتور ہو گئی تو ان لوگوں نے منکرین مہدی کو کافر کہنا شروع کر دیا اور انہیں یہاں تک جرأت ہو گئی کہ جو کوئی اس کا انکار کرتا اس کو قتل کر ڈالتے، اور ہر ایک ان میں سے اپنی جان قربان کرنے کو مذہب کی خدمت اور کار ثواب سمجھتا تھا۔ سلطان محمود بن لطیف خان (۹۴۴ھ) کے عہد میں جب ان لوگوں نے زیادہ ہی فساد برپا کیا تو سنی حاکموں نے سختی اور حکمت عملی سے اس فرقے کو دبا دیا،

اگرچہ اب بھی گجرات ، جے پور ، حیدر آباد میں یہ لوگ موجود ہیں اور کراچی میں بھی ایک 'ذکری مہدوی انجمن' ہے ۔

اس سے پہلے بھی کئی ایک اسلامی ممالک میں کچھ لوگ ایسے اٹھے ہیں جنھوں نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کیا اور اپنے وقت کے سیاسی انتشار سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے ۔ مثلاً ۵۱۴ھ میں بلاد مغرب میں محمد بن تومرت مغربی نے عبدالمومن کوفی کی حمایت سے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا ۔ اس شخص نے کچھ لوگوں کو قبروں میں چھپا کر بٹھا دیا تھا ۔ اس کے حکم سے یہ نقلی مردے قبروں سے نکلے اور اس کے مہدی ہونے کی تصدیق کی ۔ سلطان صلاح الدین ایوبی کے عہد میں محمد بن عبداللہ میمون نے شام میں یہی دعویٰ کیا تھا اور ایک شہر 'مہدیہ' بھی بسایا تھا ۔ کردستان میں بھی ایک شخص آزبک نامی نے شہرزور سے مہدی ہونے کا دعویٰ کیا تھا ۔ اسے ایک کرد سردار امیر احمد خان نے قتل کر دیا ۔ ۷۰۰ ہجری میں بلاد مغرب ہی سے ایک کیمیا گر سید محمد نامی یہی دعویٰ لے کر اٹھا ۔ ۹۱۷ھ میں محمد بن عبداللہ نے مصر میں اسی دعوے پر بغاوت کی ۔ سلطان بایزید (رومی) کے عہد کے نامور صوفی شیخ اویس رومی کے متعلق بھی مشہور ہے کہ انھوں نے خود کو مہدی سمجھا تھا ۔ لیکن دعویٰ کرنے سے پہلے ہی انھیں معلوم ہو گیا کہ یہ محض شیطانی وسوسہ تھا ۔ (آئین اکبری مطبوعہ نول کشور ۱۸۶۹ع جلد سوم صفحہ ۲۸۶ ، صفحہ ۳۳۴ ببعد ، منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۲۱۰ و صفحہ ۲۷۱ ، ۲۷۲ (حاشیہ) رود کوثر از جناب شیخ محمد اکرام صفحہ ۱۹ ببعد) ۔

۲۸ ۔ ان کا ذکر کسی گذشتہ حاشیے میں آ چکا ہے ۔

۲۸(الف) ۔ میر محمد نعمان ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کے اصحاب و خلفا میں سے تھے ۔ آپ کے والد شمس الدین یحیٰی معروف بہ 'میر بزرگ' تھے جو اپنے فضل و تقویٰ ، نسبت والا اور حضور و صفا میں بدخشاں و ماوراءالنہر کے مشاہیر میں سے تھے ۔ میر نعمان کی ولادت سمرقند میں ۹۷۷ھ میں ہوئی ۔ ولادت سے پہلے آپ کے والد ماجد نے حضرت امام اعظم

ابو حنیفہ رح نعمان بن ثابت کو خواب میں دیکھا جو فرما رہے تھے کہ ''تمہارے گھر سعادت مند فرزند پیدا ہوگا اس کا نام ہمارے نام پر رکھنا۔'' آغاز شباب میں آپ بلخ کے عارف آگاہ امیر عبید اللہ بلخی عشقی کے پاس پہنچے اور ان کے اشارے پر آپ نے انابت (برے کاموں سے رکنا) کی۔ جب وارد ہندوستان ہوئے تو یہاں بھی اپنے وفور شوق کے سبب بعض درویشوں سے آپ نے اذکار کی تعلیم لی۔ تا آں کہ آپ حضرت خواجہ باقی باللہ کے پاس پہنچے اور سلسلۂ نقشبندیہ کے ذکر و مراقبہ سے مشرف ہوئے۔ اور ان کے حضور میں اپنے فرزندوں اور عزیزوں کے ساتھ فقر و فاقہ کی زندگی گزارنی شروع کی۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کی زندگی ہی میں آپ ان کے ایما پر حضرت مجدد الف ثانی سے منسلک ہو گئے تھے۔ پہلے آپ دھلی میں رہے پھر حضرت خواجہ باقی کی وفات کے بعد حضرت مجدد سے درخواست کی کہ وہ آپ کو سرھند لے جائیں، جو منظور ہوئی۔ حضرت مجدد فرمایا کرتے تھے کہ حضرت خواجہ باقی کے اصحاب میں میر نعمان کو 'ہم سے مناسبت دیگر' ہے۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو حضرت مجدد رح نے طلبہ کی ھدایت کے لیے برھان پور بھیجا۔ آپ دو مرتبہ وھاں گئے۔ چوں کہ دوسرے سلسلوں کے بڑے بڑے بزرگ وھاں موجود تھے۔ اس لیے آپ اس سلسلۂ نقشبندیہ کی ترویج نہ کر سکے۔ آخر تیسری مرتبہ حضرت مجدد نے پھر بھیجا۔ اس دفعہ آپ کو بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ علوم ظاھر کی تحصیل بہت کم تھی، لیکن 'حدت بصر' تھی۔ اور آپ کی اس 'حدت بصر' کے حضرت مجدد بھی مداح تھے۔

(زبدة المقامات، صفحہ ۳۲٦ ببعد)

۲۹۔ ولایت، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی دو قسمیں ھیں۔ ایک ظاھری اور دوسری باطنی۔ متابعت ظاھری مرتبۂ نبوت سے متعلق ھے، جب کہ متابعت باطنی مرتبۂ ولایت سے۔ نبوت سے ان احکام شریعت کی جانب اشارہ ھے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم عالم قدس سے بہ واسطۂ جبرئیل علیہ السلام حاصل فرما کر خلق کو پہنچاتے ھیں۔ ولایت وہ فیضان اسرار توحید ھے جو حضور سرور کائنات مقام 'لی مع اللہ' میں بلا وساطت جبرئیل براہ راست حق سبحانہ تعالیٰ

سے اخذ فرماتے ہیں ۔ عارفین کے اس قول میں کہ ''ولایت نبوت سے افضل ہے'' اسی امر کی جانب اشارہ ہے ، ہر نبی ولی ہوتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر ولی نبی ہو ۔ وہ ولی جو نبی نہیں ہوتا ، انوار ولایت کا استفاضہ کمالات نبی سے کرتا ہے ، لیکن ہر نبی نور نبوت اور کمالات نبوت کو اپنی ہی ولایت کے آفتاب سے اخذ کرتا ہے ، اور کسی غیر کا محتاج اور تابع نہیں ہوتا ۔ نبی مثل آفتاب کے ہے جو خود بھی روشن ہے اور دوسروں کو بھی روشنی بخشتا ہے ۔ ولی مثل ماهتاب کے ہے جو آفتاب نبوت سے نور اخذ کرتا ہے اور متابعت آفتاب اس پر لازم ہوتی ہے ۔ تا وقتیکہ ولایت کمال کو نہیں پہنچتی ، نبوت ظاہر نہیں ہوتی ۔ قوت نبوت حسب قوت ولایت ہوتی ہے ۔ آدم علیہ السلام جنت میں ولی تھے ۔ جب دنیا میں آئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو نبوت عطا فرمائی ، کیوں کہ نبوت تشریع و تکلیف کا نام ہے اور دنیا تکلیف کا گھر ہے ۔ برخلاف جنت کہ وہ کرامت و مشاہدہ کی جگہ ہے ۔

بیشتر لوگ آں حضرت صلعم کی متابعت ظاہری سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں ، یہ اہل ظاہر ہیں ۔ کچھ لوگ ''یهدی اللہ لنورہ من یشاء'' کی دستگیری سے اسرار ولایت تک رسوخ پاتے ہیں ، یہ اہل باطن ہیں ۔ نبوت کا تعلق ظاہر سے ہے اور نبوت کا باطن ولایت ہے ۔ ظاہر کو باطن سے مدد ملتی ہے ، باطن ہی سے ظاہر کی پرورش ہوتی ہے اور باطن ہی کی جانب سے ظاہر کو فیضان پہنچایا جاتا ہے ۔ باطنی پہلو یہ ہے کہ اللہ سے تعلق قوی ہو اور اس میں استغراق و فنائیت حاصل کی جائے ، اسی کا نام ولایت ہے ۔ ظاہری پہلو یہ ہے کہ اس باطنی تعلق کی بنا پر جو کچھ عالم قدس سے حاصل کیا گیا ہے ، اسے خلق تک بطریق مناسب و مفید پہنچایا جائے ، یہ نبوت ہے ۔

ولایت کی دو قسمیں ہیں : (۱) ولایت عامہ جو تمام ایمان والوں ، اہل اسلام و اہل عمل کے لیے ہے ، اللہ ولی الذین آمنو ۔ (۲) ولایت خاصہ واصلین حق کے لیے ہے ، ''ولکل و جہۃ ہو مولیہا ۔'' ہر شخص کو ایک جہت خاص حاصل ہوتی ہے جب وہ شخص حق تعالیٰ کی جناب مطلق میں

حضور تام حاصل کر کے اس جہت کو تقویت پہنچاتا ہے تو وہ جہت خاص اس کی خلقیت پر غالب آ جاتی ہے اور بشریت کو مقہور کر دیتی ہے اسی کو فنائیت کہتے ہیں جو ولایت کا لازمہ ہے ۔ یہ فنا مقدمہ ہے اور سبب بن جاتا ہے واسطے بقا بالحق کے ۔ در اصل مقام فنا فی اللہ میں پہنچنا ولایت خاصہ کا ادنیٰ مرتبہ ہے ۔ ورنہ اس ولایت کے اعلٰی مراتب بقا باللہ اور ظہور من اللہ ہیں ۔ جسے مرتبۂ فناء الفناء کی عمر میں ایک بار بھی تجلی ہو گئی وہ ولایت خاصہ سے نواز لیا گیا ۔ مگر اعلٰی مراتب ولایت خاصہ کے یہ ہیں کہ حق تعالٰی اپنے بندہ پر اپنے اسماء و صفات بہ طور علم و یقین و حال کے ظاہر فرما کر اسے ان کے ذریعہ تاثیرات و تصرفات کی قوت عطا فرما دے اور اپنے اسماء و صفات کا اس بندہ کو متولی کر دے ۔ یہ مرتبہ حقائق الٰہیہ کے ثابت ہوئے بغیر نہیں حاصل ہوتا اور اس کے حصول کے لیے نہایت ضروری ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ علیہ و آلہ وسلم کا صحیح اتباع کیا جائے اور تمام صالحین کے آداب کی پیروی کی جائے ۔

ولایت خاصہ کی دو قسمیں ہیں : (۱) ولایت (بہ‌فتح واؤ) اس سے مراد وہ ولایت ہے جس میں بندہ کو حق تعالٰی کی جانب سے وہ تصرفات عطا ہوتے ہیں جن سے طلب الٰہی کی استعداد رکھنے والوں پر اثرات ڈالے جاتے ہیں اور سالکان راہ طریقت کو مقامات قرب تک پہنچایا جاتا ہے ۔ (۲) ولایت (بہ کسر واؤ) اس سے مراد وہ ولایت ہے جس میں تصرفات عطا ہوتے ہیں جو خلق میں مقبولیت کا باعث ہوں ۔ مثلاً خوارق و تصرفات تکوینی ۔

کمالات ولایت کی کوئی انتہا نہیں ۔ کیوں کہ نزول کی تو ایک حد ہے جو جسم پر آ کر رک جاتی ہے ، مگر عروج کی کوئی حد نہیں ۔ اس لیے اولیاء اللہ کے مراتب غیر متناہی ہیں ۔ .... بہ قول صاحب لطائف اشرفی ولایت کی چار قسمیں حسب ذیل ہیں :

(۱) ولایت باطن نبوت مطلقہ : ہر ولایت کے ایک ایک خاتم ہیں ۔ اس ولایت کے خاتم امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ ہیں ۔

(۲) ولایت مقیدۂ ہر نبی : ولایت مقیدۂ محمدیہ کے خاتم بہ قول خود شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن عربیؒ ہیں ۔

(۳) ولایت متعلقہ ہر نبی : جو کہ ولایت محمدی ہے ۔ اسے ولایت مطلقہ محمدیہ بھی کہتے ہیں ۔ اس کے خاتم امام آخر الزماں حضرت مہدی علیہ السلام ہیں جو کہ نسل آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم میں سے ہوں گے ۔

(۴) ولایت جو مخصوص بہ نبوت نہ ہو ۔

بہ قول صاحب 'فتوحات مکی' ولایت کی حسب ذیل چار قسمیں ہیں :

(۱) ولایت محمدی جو کہ جامع ہے ، درمیان تصرفات صوری و معنوی کے اور مقرون بہ خلافت ہے ۔ خاتم اس کے علی کرم اللہ وجہہ ہیں ۔ آپ کو خاتم کبیر کہتے ہیں ۔

(۲) ولایت محمدی جو کہ جامع ہے درمیان تصرفات صوری و معنوی کے لیکن مقرون بہ خلافت نہیں ۔ خاتم اس کے امام مہدی علیہ السلام ہیں ۔ آپ کا ظہور آخر زمانہ میں ہوگا ۔ آپ کے بعد کوئی ولی سلطان نہ ہوگا ۔ آپ خاتم صغیر ہیں ۔

(۳) ولایت محمدی جس میں تصورات معنوی کے ساتھ تصورات صوری جمع نہ ہوں گے ۔ خاتم اس نوع کے حضرت محی الدین ابن عربیؒ ہیں ۔ آپ کو خاتم اصغر کہتے ہیں ۔

(۴) ولایت عامہ جس کے خاتم عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے آپ کے بعد اصلاً کوئی ولی نہ ہوگا ۔ آپ خاتم اکبر ہیں ۔ آپ کے بعد بس قیامت ہے ۔ (سر دلبراں از سید محمد ذوقی اجمیر شریف ، صفحہ ۳۴۵-۳۴۹)

۳۰ ۔ جن سے خلاف قیاس باتیں ظاہر ہوں ۔ اگر کافر سے ہوں تو اسے استدراج کہتے ہیں ۔

۳۱ ۔ ابو حفص عمر سہروردی متوفی ۶۳۲ھ ۔ سلسلۂ سہروردیہ آپ ہی سے منسوب ہے ۔ آپ کے شاگردوں میں شیخ سعدی شیرازی اور اوحد الدین کرمانی کے نام آتے ہیں ۔ (تاریخ ادبیات در ایران از صفا جلد دوم ، صفحہ ۲۲۱)

۳۲ - خواجہ عبداللہ انصاری رح ، کنیت ابو اسماعیل لقب شیخ الاسلام ہے - والد ابومنصور محمد الانصاری رح تھے - ہرات میں بروز جمعہ ماہ شعبان ۳۹۶ھ میں پیدا ہوئے - اپنے والد ماجد کے ہاتھ سے خرقۂ طریقت پہنا - ہرات کے باشندے تھے - حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں سے تھے - آپ کے مورث اعلیٰ عہد عثمانی میں احنف بن قیس رح کے ہمراہ خراسان آئے اور ہرات میں مستقل سکونت اختیار کر لی - آپ کا شمار مشائخ کبار میں ہوتا ہے - آپ سے متعدد خوارق و کرامات کا ظہور ہوا -

اپنے زمانے میں بے مثل و بے مثال شخصیت کے حامل تھے - آپ کے ارشاد کے مطابق آپ چودہ سال کی عمر میں درس گاہ ادب میں داخل ہوئے - اس درس گاہ میں سب سے کم عمر آپ کی تھی - آپ عربی میں شعر کہتے - لوگ حسد کی نگاہ سے آپ کو دیکھتے - آپ کے کلام کا مجموعہ چند ہزار ابیات سے زیادہ پر مشتمل ہے - آپ کے بیان کے مطابق آپ کو ایک لاکھ اشعار حفظ تھے - تین لاکھ حدیثیں نوک زباں تھیں - جو آپ نے ہزاروں اساتذۂ فن سے حاصل کی تھیں - فرماتے ہیں ''کسی نے بھی میرے زمانے میں وہ کچھ نہیں کیا جس کا ظہور مجھ سے ہوا ہے - اگر کوئی اپنے جسم پر ہاتھ رکھ دیتا اور مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ یہ کیا ہے ؟ تو میں اس کے جواب میں حدیث سے استشہاد کر سکتا ہوں -''

ربیع الآخر کے وسط میں ۴۸۱ھ میں بہ عمر ۸۵ سال وفات پائی - مزار گاذر گاہ ہرات میں ہے -

آپ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں - جن میں سے 'تفسیر قرآن' جو 'کشف الاسرار وعدۃ الابرار' کے نام سے موسوم ہے ، خاصی مشہور ہے - چند رسائل بھی ہیں - مثلاً مناجات نامہ ، نصایح ، زاد العارفین ، کنزالسالکین ، قلندر نامہ ، محبت نامہ وغیرہ - مسجع و مقفیٰ نثر کو آپ ہی نے عروج کمال پر پہنچایا - (تاریخ ادبیات در ایران از صفا جلد دوم ، صفحہ ۸۸۲ ، ۹۱۱ ، ۹۱۲ - سفینۃ الاولیا ، صفحہ ۱۹۹-۲۰۰)

۳۳ - براؤن اور صفا کے یہاں اس کتاب کا ذکر نہیں ملتا ۔

۳۴ - ان کا نام محمد بن محمد بن محمود البخاری اور لقب پارسا ہے ۔ خواجہ بہاء الدین نقشبند نے یہ لقب عطا کیا تھا ۔ ایک موقع پر خواجہ نقشبند نے جب کہ وہ مرض الموت میں مبتلا تھے ، ان کی غیر موجودگی میں اپنے مریدوں سے ان کے متعلق فرمایا کہ ''ہمارے وجود کی غرض و غایت دراصل ان کی ہستی ہے ۔ انھیں ہم نے جذب و سلوک کی راہوں سے منازل طے کرائی ہیں ۔ ان کے وجود کی روشنی سے ساری دنیا منور ہو سکتی ہے ۔'' محرم ۸۲۲ھ میں جب بیت الحرام کے طواف اور آں حضرت صلعم کے روضہ مقدس کی زیارت کے لیے انھوں نے ارادۂ سفر کیا تو راستے میں مختلف مقامات پر علما و مشائخ نے بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا ۔ مکہ معظمہ پہنچ کر ارکان حج ادا کرنے کے بعد بیمار ہوگئے ۔ اسی حالت میں بدھ ۲۳ ذی الحجہ کو مدینہ پہنچے اور دوسرے ہی دن رحلت فرمائی ۔ جمعہ کی شب تجہیز و تکفین عمل میں آئی ۔ مزار ان کا جنت البقیع میں حضرت عباس رض کے قرب و جوار میں ہے ۔ ۷۳ برس کی عمر پائی ۔

(سفینۃ الاولیا اردو ، صفحہ ۱۰۱-۱۰۲)

۳۵ ــــــــــــــــــ

۳۶ - انھی کے سبب آن پر (اہل زمین) بارش برسائی جاتی ہے اور انھی کے سبب وہ رزق دیئے جاتے ہیں ۔

۳۷ - وہ خدا کے ہم نشین ہیں اور وہ ایسی قوم ہیں کہ جن کے ساتھ بیٹھنے والے بد بخت نہ ہوں گے اور ان کا محب زیاں کار نہ ہوگا ۔

۳۸ - حق سے نسبت رکھنے والے (اہل حقیقت)

۳۹ - آخری فقرے کا ترجمہ اس طرح بھی ہو سکتا ہے ''چناں چہ اس روز مسلمان طعام پکاتے ہیں نہ بیچتے ہیں'' ۔ لیکن متن کی رو سے یہ کچھ دور معلوم ہوتا ہے ۔ احتیاطاً اسے حاشیہ میں لکھ دیا ہے ۔

۴۰ - امیر تیمور : تیمور ترکی کا لفظ ہے اس کے معنی لوہے کے ہیں ۔ تیمور ۲۸ شعبان ۷۳۶ھ (۱۱ اپریل ۱۳۳۶ع) کو ماوراءالنہر

میں کش کے مقام پر پیدا - اس کے شاگردوں نے اس کا سلسلۂ نسب چنگیز کے شاہی گھرانے سے ملانے کی کوشش کی ہے - لیکن ابن عربشاہ کا کہنا ہے کہ اس کا باپ اور دادا ، جن کے نام ترغائی اور ابغائی تھے ، دونوں گڈریئے تھے اور بدمعاشوں کی ایک ٹولی سے تعلق رکھتے تھے - جن کے پلے نہ عقل تھی نہ دین تھا - بہ‌قول اس کے اس کے لنگ کا سبب ایک زخم تھا جو اس نے بھیڑیں چراتے ہوئے کھایا - ۷۶۱ھ میں بہ عمر ۲۴ سال پہلی مرتبہ اس نے نمود حاصل کی - ۷۷۱ھ میں اپنے حریف سلطان حسین کو مار کر صاحب قران کا لقب پایا - اس کے بعد چھ سات برس اس نے ماوراءالنہر میں اپنا تسلط مضبوط کرنے میں صرف کیے - اور پھر اس کی فتوحات کا سلسہ شروع ہو گیا - کئی ایک جگہ اس نے دشمنوں کی کھوپڑیوں کے مینار بنوائے - جہاں کہیں گیا ہزاروں شہری تہ تیغ کر ڈالے - ایران ، حلب ، دمشق ، بغداد ، انگوریہ ، مصر اور چین تک لشکر کشی کی - ۱۴۰۴ء میں جب چین کی طرف لشکر کشی کا ارادہ کر رہا تھا تو سخت جاڑے کے سبب ۱۴ جنوری ۱۴۰۵ء کو اترار جا اترا - ایک مہینے کے بعد بیماری نے آ لیا - آخر ۱۸ فروری ۱۴۰۵ء کو بہ عمر ۷۱ برس وفات پائی - کل ۳۶ برس حکومت کی - اخیر دم تک حواس بجا تھے - مرتے وقت کلمہ شہادت اس کی زبان پر تھا -

(براؤن جلد سوم اردو ترجمہ صفحہ ۲۷۵ تا ۳۰۲)

۳۴ - خواجہ نقشبند - خواجہ بہاءالدین نقشبند فرقہ نقشبندیہ کے بانی ، آپ کا نام محمد بن محمد البخاری تھا - رسالہ بہائیہ میں جو آپ کے مقامات کے سلسلے میں لکھا گیا ہے ، لکھا ہے کہ آپ اور آپ کے والد ماجد دونوں کمخواب کے کپڑے بنتے اور ان پر نقوش بناتے تھے - اس لیے آپ کو نقشبند کے لقب سے شہرت ہوئی - مولانا جامی کے مکتوبات میں بھی یہی روایت ملتی ہے - حضرت میر کلال رح سے آپ کو بیعت کا شرف حاصل ہے - آپ کی نسبت اویسی بھی ہے - اور خواجہ عبدالخالق غنجدوانی سے بھی آپ روحانی رابطہ رکھتے تھے - اپنے دور میں غوثیت کے منصب پر فائز رہے - اولیاے وقت کے امام و مخدوم تھے .. خاص و عام کو آپ سے بے حد عقیدت تھی -

شریعت مطہرہ کی پابندی آپ کا شعار تھا - حنفی المذہب شیخ تھے - اور امام اعظم ابوحنیفہ سے آپ کو خصوصی عقیدت تھی - آپ کے سلسلے میں جہر و خلوت اور سماع جائز نہیں ہیں - سماع کے بارے میں آپ نے ایک موقع پر فرمایا کہ نہ میں انکار کرتا ہوں اور نہ یہ کام کرتا ہوں - آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے طریقے کی اساس کس چیز پر ہے تو آپ نے فرمایا ظاہر میں خلق خدا پر اور باطن میں حق تعالیٰ پر - آپ کے خوارق و کمالات انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں -

آپ کی ولادت قصر عارفان میں محرم ۷۱۸ھ میں ہوئی - اور ۷۳ برس کی عمر میں وصال ہوا - مزار قصر عارفاں (بخارا) ہی میں ہے - (سفینۃ الاولیا اردو صفحہ ۱۰۰-۱۰۱ رشحات از فخر الدین علی بن واعظ کاشفی مطبوعہ کانپور صفحہ ۴)

۴۲ - تیمور مر گیا اور ایمان لے گیا -

۴۳ - شیخ بدیع الدین : حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ اور ہندوستان کے بزرگ زادوں میں سے تھے - شروع میں آپ سے جب توضیح و تلویح پڑھا کرتے تھے تو درویشوں پر اعتقاد نہ رکھتے تھے - بلکہ نماز کی طرف بھی کم توجہ دیتے - اسی تحصیل علوم کے دوران میں کسی صاحب جمال پر فریفتہ ہو گئے - خود کہتے ہیں کہ درس کے دوران میں میرا دل تڑپا کرتا تھا کہ جلد یہاں سے فارغ ہو کر اس کا نظارہ کروں - ایک روز حضرت مجددؒ نے ان سے کہا کہ میاں نماز پڑھا کرو اور شرعی جنایات سے بچو - کیوں کہ برے کاموں کے ساتھ علم ظاہر 'بے برکت' پھل ہے - اس پر شیخ نے کہا کہ میں نے بہت سے لوگوں سے ایسی نصیحتیں سنی ہیں اگر آپ کوئی جذب فرمائیں اور کرامت دکھائیں کہ جس سے میں صالحین کے زمرہ میں آ جاؤں ، تو ٹھیک ہے ورنہ یہاں نصیحت سے کام نہیں بنتا - آپ ایک لحظہ کے لیے خاموش ہو گئے پھر فرمایا ''تم کل اس نیت سے ہمارے پاس آؤ ، دیکھیں کیا ہوتا ہے ''- اتفاقاً دوسرے روز وہی حسین شیخ کے گھر آ گیا - جس کے سبب یہ حضرت مجددرح کے پاس نہ جا سکے - تیسرے روز

پہنچے تو آپ نے فرمایا تم نے وعدہ خلافی کی ، اچھا نہ کیا - بہر حال اب بھی تمہارا آنا مبارک ہے - جاؤ وضو کرکے نماز دوگانہ ادا کرو اور میرے پاس آؤ - یہ ایسا ھی کرکے گئے تو آپ انہیں خلوت میں لے گئے، اور ذکر دل کی تعلیم اور توجہ کی- بقول خود شیخ کے ایسا ہوا کہ مستی و بے خودی سے یہ خاک پر گر پڑے - آپ اسی طرح انہیں اٹھا کر اپنے گھر لے گئے - ایک دن کے بعد انہیں افاقہ ہوا - اس کے بعد ان کا دل اس گرفتاری اور تمام علائق سے سرد ہو چکا تھا - جس کے نتیجے میں یہ آپ کے ملازم خدمت ہو گئے - شیخ نے سالہا آپ کے آستانہ پر بسر کئے - تا آں کہ آپ نے انہیں طریقت کی تعلیم کی اجازت دے دی - یہ سہارنپور ، جو ان کا وطن مالوف تھا ، پہنچ کر طالبوں کے ارشاد ہدایت میں مصروف ہوگئے - کچھ عرصہ بعد شیخ حضرت مجدد کے ارشاد پر آگرہ چلے گئے - وہاں پہنچ کر انہیں قبول عظیم حاصل ہوا - حضرت نے انہیں کہا تھا کہ میری اجازت کے بغیر وہاں سے نہ نکلنا - لیکن ایک موقع پر یہ بعض امور کی اصلاح کے لیے وطن لوٹ آئے - یہ بات آپ (حضرت مجدد رح) کو ناگوار گزری - انہیں پتا چلا تو آپ سے کہا کہ میں دوبارہ آگرہ چلا جاتا ہوں ، لیکن آپ نے قبول نہ کیا اور کہا کہ وہ وقت مبارک تھا - اب اگر جاؤ گے تو تم جانو اور تمہارا کام - چناں چہ جب یہ آگرہ گئے تو وہاں پہلے والی بات نہ رہی - ایسی باتیں ہو گئیں جن کے سبب وہاں ٹھہر نہ سکے اور وطن واپس لوٹ آئے - گوشہ نشینی اختیار کی اور ذکر و مراقبت میں لگ گئے - اگرچہ اس وقت ان کی عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی ، پھر بھی انہوں نے قرآن حفظ کیا - اور طالبان علوم دینی و یقینی کے افادہ وافاضہ میں مصروف رہے - (زبدة المقامات صفحہ ۳۴۶-۳۵۱)

۴۴ - صبر ، تصوف کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے کسی معاملہ میں خالق کی مخلوق سے نہ تو زبان سے شکایت کرنا نہ دل میں اس شکایت کا پیدا ہونے دینا - اللہ تعالیٰ حضرت ایوب ع کے صبر کی تعریف فرماتا ہے اور فرماتا ہے - کہ وہ اچھے بندے تھے - اور یہ کہ وہ اواب (تسبیح خواں) تھے - یعنی اپنے حالات کو اللہ کی طرف رجوع کرتے

تھے ۔ رفع تکلیف کے لیے آپ اسباب کی جانب التفات نہ فرماتے تھے ، بلکہ حق تعالیٰ سے دعا کرتے تھے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا سے صبر میں کوئی قباحت نہیں واقع ہوتی ۔ غیر اللہ سے استغاثہ کرنے سے دل و زبان کو روکنا صبر ہے ۔ اور غیر اللہ سے مراد حق تعالیٰ کی وہ جملہ جہات ہیں جو اس کی اس جہت خاص کے علاوہ ہیں جسے ہویت کہتے ہیں ۔ عارف باللہ ہویت حق سے اپنی رفع تکلیف کے لیے دعا کرتا ہے ۔ اپنے نفس کو ایسا کرنے سے باز رکھنا گویا حق تعالیٰ کے سامنے گستاخی سے پیش آنا ہے ۔ عبدیت اور انکسار اس میں ہے کہ اپنی ہر تکلیف پر بارگاہ الٰہی میں گریہ و زاری اور لجاجت و عاجزی سے سوال کرے ، کیوں کہ اس تکلیف کا ازالہ بارگاہ الٰہی سے ہوتا ہے......... (سر دلبراں از سید محمد ذوقی صفحہ ۲۶۵ ، ۲۶۶) ۔

۴۵ ۔ رضا ، اللہ تعالیٰ پر اعتماد کلی رکھنا اور اس کے ہر برتاؤ سے خوش رہنا ۔ اس کا ادنیٰ مرتبہ صبر ہے اور اعالی مرتبہ تسلم (ایضاً صفحہ ۲۰۱) ۔

۴۶ ۔ جمال و جلال ، تصوف میں ان الفاظ کے استعمال سے جمال الٰہی اور جلال الٰہی کی جانب اشارہ ہوتا ہے ۔ اس کائنات میں حقیقتاً حسن مطلق ہی کا ظہور ہے ۔ اس بنا پر فی الاصل ہر چیز ملیح ہے ۔ وجود مع اپنے کمال کے ایک صورت حسنہ ہے اور تمام چیزیں اسی کے حسن و جمال کی صورتیں اور اسی کے کمالات کا پرتو ہیں ۔ برائی کا وجود مطلقاً مفقود ہے ۔ کوئی چیز اپنی ذات کے لحاظ سے بری نہیں ۔ برائی کا جب اس پر حکم لگایا جاتا ہے تو محض اعتباری ہوتا ہے ۔ کسی وجہ سے وہ برائی اس چیز پر عارض ہوتی ہے ۔ جب وہ وجہ جاتی رہتی ہے تو برائی کا حکم بھی اٹھ جاتا ہے ۔

اسماء و صفات کو جمال و جلال میں جو تقسیم کیا گیا ہے ، اس میں بھی اعتبارات کو دخل ہے ورنہ ہر اسم جلالی بھی ہے اور جمالی بھی ۔ بعض اعتبارات سے جلالی ہے اور بعض اعتبار سے جمالی ۔ جلال اور جمال میں ابرے اور استر کا تعلق ہے ۔ ہر جلال کے لیے جمال اور ہر جمال کے لیے جلال لازمی ہے ۔ ہر جمال شدت ظہور سے جلال اور ہر

جلال خفت ظہور سے جمال ہو جاتا ہے ۔ آفتاب کی روشنی میں نسبتاً جلال ہے مگر جب آفتاب میں کسی قدر بعد ہو جاتا ہے اور اس کی روشنی زیادہ فاصلہ سے چل کر آتی ہے؛ اور چاند کے پردہ میں سے اپنا منہ دکھلاتی ہے تو اس روشنی میں جو اب چاندنی کے نام سے موسوم ہو گئی ہے ایک جمال پیدا ہو جاتا ہے ۔ انگارہ دور سے کس قدر خوشنما نظر آتا ہے اور اس میں کیسا جمال چمکتا ہے ، جب قریب آ کر ھاتھ کو اس سے متصل کر دیا جائے تو یک لخت جلال چمک اٹھتا ہے ۔ ان مثالوں سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ جلال کو ذات حق سے زیادہ قرب ہے بہ نسبت جمال کے ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ '' میری رحمت میرے غضب پر سبقت لے گئی'' ۔ یہ اس طور پر ہے کہ اسمائے جلالی بعض موجودات کے ساتھ مخصوص ہیں اور بعض کے ساتھ نہیں ۔ برخلاف اسمائے جمالی کے کہ وہ جملہ موجودات کے لیے عام ہیں ۔ موجودات میں سے بعض چیزیں مظہر جلال ہیں اور ہر چیز مظہر جمال ہے ۔ صرف انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مظہر ہے 'اسمائے ذاتیہ' کا مع جملہ اسمائے مشترکہ کے جو جمالی بھی ہیں اور جلالی بھی ۔ کبھی ظہور ذات کو جمال اور اخفائے ذات کو جلال سے تعبیر کرتے ہیں ۔ کمال معشوقیت کا اظہار بہ غرض کشش عاشق ، انوار ایمان کا کشف ، الہام کا سالک کے دل پر وارد ہونا ، اور دیگر اقسام کی دل نوازیوں کو بھی جمال سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔

بے نیازی کی شان کا اظہار ، استغنائے معشوقیت کے اظہار سے عاشق کو کچلنا ، معشوقانہ بزرگی کا اس شان سے اظہار فرمانا کہ ہم تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی اور ہم تک نظروں کا پہنچنا محال ہے اور ہم کو سوائے ہمارے کوئی نہیں جان سکتا ، اور عاشقوں کا دل توڑنے والی اس نوعیت کی باتوں کو عموماً جلال سے موصوف کیا جاتا ہے ۔ صفات قہاری و جباری اور وہ اسماء جو کہ اهل ضلالت اور اهل حجاب سے متعلق ہیں سب جلال کے تحت آتے ہیں ۔ (ایضاً صفحہ ۱۴۵-۱۴۶) ۔

۴۷ ۔ ذوق ، وہ مستی جو عاشق میں شراب (معرفت) پینے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور وہ شوق جو کلام محبوب سن کر اس میں بھڑکتا ہے اور

وہ از خود رفتگی جو جمال یار کے مشاہدہ سے اس میں پیدا ہوتی ہے۔ اس مستی و شوق اور از خود رفتگی سے عاشق وجد میں آتا ہے۔ بے خودی اس پر طاری ہوتی ہے۔ شعور اس سے جاتا رہتا ہے اور بے نامی اور بے نشانی میں محو ہو جاتا ہے۔ مشاہدۂ حق کا پہلا اثر ذوق ہے اور انتہائی اثر وہ ہے جس کے بیان کی اس قلم میں قدرت نہیں۔

(ایضاً صفحہ ۱۹۳) ۔

۴۸ ۔ حال ، حق تعالیٰ کی جانب سے جو واردات سالک کے دل پر مثل قبض و بسط یا حزن و طرب یا ہیبت و انس یا مستی و بے خودی یا از اقسام دیگر اچانک وارد ہوں ، حال ہے۔ سالک کی بے عملی اور بے التفاتی سے حال زائل ہو جاتا ہے۔ جب حال دائمی ہو جاتا ہے اور سالک کا ملکۂ راسخہ بن جاتا ہے تو اسے مقام کہتے ہیں۔ حال آتا ہے اور جاتا ہے۔ مقام میں استقلال ہوتا ہے۔ حال سے سابقہ اصحاب تلوین کو رہتا ہے اور مقام اصحاب تمکین کا حصہ ہے۔ اس لیے حال سے مقام اعلیٰ ہوتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۲) ۔

۴۹ ۔ دیدار خدا وندی ، بعض صوفیا کا عقیدہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا۔

۵۰ ۔ بادشاہ سلامت ۔

۵۱ ۔ خدا کا شکر ہے جس نے اس بات کی طرف ہماری رہنمائی کی ہے۔ اگر وہ ہمیں ہدایت نہ فرماتا تو ہم اس طرف راہ نہ پا سکتے۔ اللہ کے رسول یقیناً سچائی کے ساتھ آئے۔

۵۲ ۔ سستی و ضعف ، دو پیغمبروں کا درمیانی وقفہ ۔

۵۳ ۔ خواجہ محمد سعید ، حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے ۔ ان کی ولادت ماہ شعبان ۱۰۰۵ھ میں ہوئی۔ حسن مکارم اخلاق ، وفور احوال اور کثرت فضائل اور نرمی گفتار و صفائے کردار سے آراستہ تھے۔ حضرت مجدد فرماتے تھے کہ ”محمد سعید ابھی چار پانچ سال کا تھا کہ کسی تکلیف کے سبب ضعف میں مبتلا ہو گیا۔ اس سے

پوچھا گیا کہ کیا چاھتے ھو تو بے اختیار بول اٹھا حضرت خواجہ (باقی باللہ) کو چاھتا ھوں ۔ میں نے یہ بات حضرت خواجہ سے کہی ، انھوں نے فرمایا تمھارے محمد سعید نے رندی و حریفی دکھائی ھے اور غائبانہ ھم سے نسبت لے اڑا ھے'' ۔ حضرت خواجہ باقی نے اپنے اکثر خطوط میں انھیں بڑی شفقت و رحمت سے یاد کیا اور شجرہ طیبہ کہا ھے ۔ سعید سن تمیز کو پہنچ کر علوم صوری کی تحصیل میں معروف ہوئے ۔ کچھ حصہ علوم کا والد ماجد سے اور کچھ بڑے بھائی کی ملازمت میں حاصل کیا اور بقیہ شیخ طاھر لاھوری کی خدمت میں مکمل کیا ۔ اس طرح علوم عقلی و نقلی کے مختلف انواع میں مہارت تامہ بہم پہنچائی ۔ والد ماجد کی توجہ سے ترقیات معنوی کی بھی تکمیل کی ۔ سترہ اٹھارہ برس ھی کی عمر میں بلوغ طبع اور بلاغت معنوی ان میں گویا توام ھوگئی تھیں ۔ اس کے بعد انھوں نے معقول و منقول علوم کی کتب کا درس بڑی مہارت سے دینا شروع کیا اور بعض کتب معتبرہ پر حواشی و تعلیقات رقم فرمائے ۔ ایک موقع پر جب حضرت مجدد رح اجمیر کے سفر پر تھے تو آپ نے فرمایا کہ ''یہ سفر گویا محمد سعید کے لیے تھا وہ بڑی ترقی کر گیا ھے'' پھر ایک موقع پر فرمایا ''زندگی کا کوئی بھروسا نہیں ۔ روانگی کا وقت قریب نظر آتا ھے میں چاھتا ھوں محمد سعید اتنا ھو جائے کہ اس مسند پر بیٹھ سکے'' ۔ مؤلف زبدۃ المقامات لکھتے ھیں کہ جب میں نے ان سے اس بات کا ذکر کیا تو بڑی ھی عاجزی و انکساری سے کہنے لگے کہ ''میں ناچیز اپنے آپ کو اس کے بالکل اھل نہیں سمجھتا ۔ حضرت والد جہاں کہیں بھی جائیں میرے بھائی محمد معصوم (جو ان سے چھوٹے تھے) کو اپنی جگہ بٹھا دیں اور مجھے خدمت و متابعت میں حکم دیں ۔ اگر میری یہ التماس قابل قبول نہ ھو تو پھر مجھے اجازت دیں کہ میں اپنے جد بزرگوار کے مزار پر گوشہ نشینی اختیار کروں اور مسند داری محمد معصوم کو دے دیں'' ۔ کئی مرتبہ جنوں نے ان پر قابو پانے کی کوشش کی ۔ لیکن ناکام رھے ۔ (زبدۃ المقامات صفحہ ۳۰۸-۳۱۵) ۔

۵۳ ۔ خواجہ محمد معصوم ، حضرت مجدد الف ثانی رح کے بیٹے اور

اپنے بھائیوں میں تیسرے درجے پر تھے ۔ ان کی ولادت گیارہ ماہ شوال ۱۰۰۷ھ کو ہوئی ۔ حضرت مجدد فرماتے ہیں کہ ''معصوم کی ولادت ہمارے لیے بہت ہی مبارک ثابت ہوئی ۔ کیوں کہ ان کی ولادت کے بعد چند ماہ میں ہم حضرت خواجہ باقی باللہ کی ملازمت سے مشرف ہوئے اور وہ کچھ دیکھا جو کچھ کہ دیکھا'' ۔ تین سال ہی کی عمر میں ان کی علو استعداد ظاہر ہو گئی تھی ۔ اس عمر میں انھوں نے حقیقت تجلی ذاتی اور حرف توحید کے متعلق لب کشائی کی اور یہ کہا کرتے کہ ''میں آسمان ہوں ، میں زمین ہوں ، میں فلاں ہوں ، میں فلاں ہوں ۔'' انھوں نے علم معقول و منقول بھی حاصل کیا ۔ سولہ برس ہی کی عمر میں تحصیل علوم سے فراغت پائی ۔ اگرچہ 'تحصیل قال' کے ساتھ ساتھ تحصیل حال میں بھی سرگرم رہے لیکن علوم ظاہری (تحصیل قال) سے فراغت کے بعد پورے طور پر احوال باطن کی طرف متوجہ ہوگئے اور اس طرح اپنے والد ماجد کے احوال و اسرار خاصہ سے بہرہ فراواں حاصل کیا ۔ مؤلف زبدۃ المقامات لکھتے ہیں کہ اس واقعہ کے تحت ، جو انھوں نے دیکھا اور حضرت مجدد نے اس کی تعبیر بتائی ، انھیں مرتبۂ قطب حاصل ہوا ۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے والد بزرگوار کو بتایا کہ ''میں نے خود میں ایک نور پایا کہ جس سے تمام دنیا منور ہے اور وہ نور ہر ذرہ میں جاری و ساری ہے ۔ آفتاب کی مانند اگر وہ نیچے چلا جائے (غروب ہو جائے) تو دنیا تاریک ہو جاتی ہے'' ۔ حضرت مجدد نے بشارت فرمائی کہ تم اپنے وقت کے قطب ہوگے ۔ میری یہ بات یاد رکھو ۔ (زبدۃ المقامات صفحہ ۳۱۵ ببعد) ۔

۵۵ ۔ وہ معاملات جن میں خود انسان کو اختیار حاصل ہو ۔

۵۶ ۔ اہل فراغت ، جنھیں ہر طرح کا آرام و آسائش مہیا ہو ۔ اربابِ بلا ، جنھیں مصیبتوں اور آفتوں سے الفت ہو ۔

۵۷ ۔ آگ پھانکنے والا پرندہ دانے میں کب لذت پاتا ہے ۔

مولانا عبدالحق محدث (صفحہ ۳۳۰)

۱ ۔ حاصل کیا ہوا علم ۔

۲ - یہ شعر مولانائے روم کی مثنوی معنوی کے تیسرے دفتر میں 'حکایت مارگیر' میں آیا ہے۔ ملاحظہ ہو مثنوی معنوی مرتبہ رینالڈ نکلسن مطبوعہ تہران از روے نسخہ طبع در لیڈن صفحہ ۳۳۱ - دوسرے مصرعے میں 'خیز' کی بجائے 'غیژ' ہے - غیژ کا مصدر غژیدن اور غیژیدن ہے - جس کے لغوی معنی گھسنے کے ہیں - یہاں بہ معنی دوڑنا ہے - یعنی ہر حالت میں اس خالق حقیقی کی طرف رجوع کر -
(خلاصہ مثنوی از آقای بدیع الزمان فروزانفر مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۹۹)

۳ - گلستان شیخ سعدی کی تصنیف ہے - بوستان کے ایک سال بعد ۶۵۶ھ میں لکھی - یہ دونو کتابیں انہوں نے اپنی تیس چالیس سالہ سیاحت کے بعد لکھیں ۔ اس کتاب میں کہانیوں کے ذریعے درس اخلاق دیا گیا ہے - جن میں سے کچھ تو شیخ کی آپ بیتی ہیں اور کچھ محض کہانی کے طور پر - یہ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے - در سیرت پادشاہان ، در اخلاق درویشان ، در فضیلت قناعت ، در فواید خاموشی در عشق و جوانی ، در ضعف و پیری ، در تاثیر تربیت ، اور در آداب صحبت ۔ اگرچہ اس کتاب کا جواب بہت سے ادیبوں نے لکھنے کی کوشش کی ، لیکن وہ اس جیسا رنگ نہ پیدا کر سکے ۔ ملک الشعرا بہار ، محمد علی فروغی ، صفا ، شفق ، براؤن غرض تمام مؤرخین و ناقدین ادبیات فارسی اس بات پر متفق ہیں کہ تمام دنیا کے ادب میں اس کتاب کی نظیر نہیں ملتی اور یہ کہ فارسی نثر کی یہ زیبا ترین کتاب ہے - (ملاحظہ ہو براؤن جلد دوم ، صفا مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی ، شفق تاریخ ادبیات ایران ، گلستان (برای دبیرستانہا) از محمد علی فروغی ، سبک شناسی از بہار وغیرہ) ۔

۴ - بوستان ، سعدی نے ۶۵۵ھ میں تصنیف کی ۔ گلستان کے برعکس یہ نظم میں ہے اور اس میں دس باب ہیں ۔ اس میں بھی اخلاق درس دیا گیا ہے ۔

۵ - خواجہ حافظ ، آپ کا نام شمس الدین محمد ہے - بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کو 'لسان الغیب' کا لقب دیا ہے - ۷۲۶ھ میں شیراز میں پیدا ہوئے ۔ آپ کے والد بہاء الدین شیراز کے مالدار تاجر تھے -

ان کی وفات کے بعد حافظ کے بھائیوں نے باپ کی تمام دولت فضول خرچی میں ضائع کرکے شیراز کو خیر باد کہہ دیا ۔ لیکن حافظ کمسنی کے سبب اپنی والدہ ھی کے پاس رہ گئے ۔ جب گھر میں فاقہ کشی تک نوبت پہنچی تو آپ کی والدہ آپ کو محلے کے ایک شخص کے پاس لے گئیں تاکہ وہ آپ کو خدمت گار بنا کر آپ کی روٹی وغیرہ کا کفیل ہو ۔ حافظ جب سن رشد کو پہنچے تو یہ خدمت ترک کر دی اور ایک نانوائی کی دکان پر خمیرگوندھنے پر ملازم ہوگئے۔ حافظ کو بچپن ھی سے تعلیم کا شوق تھا ۔ چناں چہ اس کام کے ساتھ وہ مکتب میں بھی داخل ہوگئے اور اس طرح کچھ تعلیم حاصل کی ۔ مولانا شبلی نے حافظ کی شاعری کے آغاز کے متعلق جو دل چسپ واقعہ شعرالعجم میں لکھا ھے ، موجودہ ایرانی تذکرہ نگاروں اور مؤرخین ادب نے اسے صحیح تسلیم نہیں کیا ھے ۔

بہ قول شفق آپ نے علوم و کمالات شیراز ھی میں حاصل کیے ، اور بڑے بڑے علما و فضلاے وقت کے درسوں میں شامل ہوا کرتے تھے ۔ اور اس طرح علوم میں انھوں نے ایک بلند مقام حاصل کیا ۔ اسی طرح محمد گلندام نے جو دیوان حافظ کا سب سے پہلا مرتب ھے ، لکھا ھے کہ حافظ نے عربی شعرا کے دواوین کے مطالعے کے علاوہ اور کئی ایک عربی کتب مثلاً کشاف و صباح پر حاشیےلکھے تھے۔ حافظ نے بہ قول شفق قرآن کریم کا بہت مطالعہ کرنے کے علاوہ اسے حفظ بھی کیا تھا اور آپ کے تخلص کا سبب بھی یہی امر ھے ۔ براؤن نے بھی آپ کی عربی دانی کا ذکر کیا ھے اور حفظ قرآن کا ثبوت آپ کے اس شعر سے دیا ھے :

ندیدم خوشتر از شعر تو حافظ بقرآنے کہ اندر سینہ داری

شبلی لکھتے ھیں کہ جب حافظ کی شاعری کا چرچا عام ہوا تو دور دور سے سلاطین و امرا نے آپ کو بلانے کے لیے خطوط لکھے ۔ چناں چہ شاہ دکن (ہندوستان) کے سلطان شاہ محمود بہمنی نے بھی آپ کو بلا بھیجا ۔ یہ روانہ ہوئے لیکن راستے ھی سے واپس چلے گئے اور وھاں سے ایک غزل لکھ کر بھیج دی جس کا مطلع یہ ھے :

دمی با غم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد
بہ می بفروش دلق ما کزین بہتر نمی ارزد

اسی طرح بنگالہ کے فرماں روا سلطان غیاث الدین نے آپ سے مراسلت کی۔ جس کے جواب میں حافظ نے مطلع ذیل والی غزل لکھ بھیجی :

ساقی حدیث سرو و گل و لالہ می رود
وین بحث با ثلاثۂ غسالہ می رود

حافظ کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ آپ کسی 'شاخ نبات' نامی دوشیزہ پر عاشق ہو گئے تھے اور پھر اسی سے شادی کر لی تھی۔ لیکن براؤن کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں کوئی شہادت موجود نہیں۔ البتہ حافظ نے شادی ضرور کی تھی، اور اس سے آپ کے یہاں کچھ اولاد بھی ہوئی۔ حافظ کی زندگی میں ملک میں بہت سے انقلاب ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں کئی ایک بادشاہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ ان میں سے کئی ایک نے آپ کی تربیت و سرپرستی کی۔ ایسے بادشاہوں میں ابو اسحاق انجو اور شاہ شجاع وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ جب تیمور نے شیراز کو دوبارہ فتح کیا تو اس وقت وہ حافظ سے بھی ملا تھا۔ لیکن اب یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ اس وقت حافظ فوت ہو چکے تھے۔ اس لیے تیمور سے ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

حافظ کی تاریخ وفات کے متعلق مختلف تذکرہ نگاروں نے مختلف سنین دیے ہیں۔ لیکن زیادہ مستند ۷۹۱ھ ہے۔ آپ کی وفات شیراز ہی میں واقع ہوئی۔ وہیں آپ کا مقبرہ ہے جسے شہنشاہ ایران نے بنوایا تھا۔ جس جگہ یہ عالی شان مقبرہ ہے وہ حافظیہ کے نام سے موسوم ہے۔

حافظ نے چند ایک قصیدے بھی کہے ہیں، لیکن آپ کا زیادہ تر میدان غزل ہے۔ آپ کی غزل میں تصوف کے علاوہ رندی اور عشق و محبت کے مضامین بھی ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہ قول گنندام، صوفی اور رند دونوں آپ کے اشعار پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سعید نفیسی نے حافظ کے اشعار کو 'بانگ فرشتگان' سے تعبیر کیا ہے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ "یہ عموماً مسلم ہے کہ عالم وجود میں آج تک کوئی شخص غزل میں

ان کا هم سر نه هو سکا'' اور یه که ''ان جیسا انداز کسی کو نه نصیب هوا'' ۔ حافظ کے کلام میں اپنے دور کے اثرات بھی نمایاں ھیں ۔

(شعرالعجم جلد دوم از شبلی ، تاریخ ادبیات ایران از شفق ، اے هسٹری آف پرشین لٹریچر از براؤن جلد سوم ، مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی از دکتر صفا مطبوعه ایران ۔ تذکره دولت شاه سمرقندی مطبوعه لاهور ، در پیرا مون آثار و احوال حافظ از سعید نفیسی مطبوعه ایران ، تاریخ فرشته جلد اول مقاله سوم روضه اول مطبوعه لکھنؤ) ۔

۶ ۔ شمسیه فلسفے کی کتاب ھے جسے کاتبی نے لکھا ۔ اس کی کئی شرحیں لکھی گئیں ۔

۷ ۔ شاه ابوالمعالی ، آپ کا اصلی نام شاہ خیرالدین تھا ۔ بھیره (سرگودھا) کے رھنے والے تھے ۔ ولادت سوموار دھم ذی‌الحجه ۹۲۰ھ کو ھوئی ۔ شیخ داؤد شیر گڑھی کے جانشین ، بھتیجے اور داماد تھے ۔ احوال و واقعات میں نہایت تیز رس اور بلند پایه تھے ۔ به قول بدایونی اپنے هم عصروں میں ممتاز ، بلکه بزرگوں سے بھی آگے تھے ۔ اپنے پیر کی محبت میں آپ نے خود کو بالکل ھی مٹا دیا اور همیشه پیر کے اتباع میں مصروف رھے ۔ کہتے ھیں جب آپ پیدا ھوئے تو آپ کو شیخ داؤد رح کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا گیا ۔ حضرت شیخ نے فرمایا ''ان کا نام شاہ ابوالمعالی رکھو ۔'' بدایونی لکھتے ھیں ۔ که اس زمانه میں ایسے نام هندوستان میں نہیں ھوا کرتے تھے ۔ کیوں که یه مغلوں کے نام کے مشابه تھا ۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال سمجھا ۔ چناں چه ایک برس بھی نہیں ھوا تھا که ھمایوں هندوستان میں (واپس) آگیا اور اس نے اپنے محبوب ابوالمعالی کو پنجاب کی حکومت عنایت کی ۔ بدایونی کے مطابق آپ کی تاریخ پیدائش 'ابوالمعالی حق پرست' کے الفاظ سے نکلتی ھے اس کے اعداد ۹۶۱ھ ھیں ۔ لیکن دارا شکوه نے ۹۲۰ھ لکھی ھے ۔ بہرحال قرین صحت اول الذکر (۹۶۱) ھی معلوم ھوتی ھے ۔

دارا شکوه کے مطابق آپ سادات صحیح النسب سے اور صاحب کرامات و خوارق تھے ۔ آپ کا تعلق سلسله قادریه سے تھا ۔ تیس سال کی ریاضت

و مجاهدت کے بعد شہر لاهور میں سکونت اختیار کی ۔ شیخ عبدالحق محدث دهلوی آپ کی سطوت روحانی کے بڑے قائل تھے ۔ شیخ محدث کی تصنیفی زندگی میں بھی آپ کو دخل تھا ۔ شیخ نے کئی ایک کتب آپ هی کے اصرار پر لکھیں ۔ حضرت خواجه باقی بالله کی وفات کے بعد شیخ محدث اپنی روحانی مشکلات کے حل کے لیے آپ هی سے رجوع کرتے ۔ آپ کے نام شیخ کے کئی خطوط هیں ، جو ان تعلقات پر روشنی ڈالتے هیں ۔ آپ شاعر بھی تھے اور غربتی تخلص کرتے تھے ۔ آپ کی وفات سولھویں ربیع الاول ۱۰۲۳ھ کو هوئی ۔ (به قول لطیف ۱۰۲۵ھ)

آپ کا مزار لاهور میں قلعه گوجر سنگھ سے گوالمنڈی کی جانب آنے والی چھوٹی سی سڑک پر واقع هے ۔ آپ نے اپنے مقبرے کا بہت سا حصه اپنی زندگی هی میں تعمیر کر لیا تھا ۔ باقی حصه آپ کے فرزند نے آپ کی وفات کے بعد مکمل کیا ۔ آپ کی قبر کے ساتھ تین اور قبور هیں جن میں سے ایک محمد باقر فرزند کلاں کی (جنھوں نے بقیه مقبره تعمیر کرایا) ایک شاه محمد فاضل کی (یه بھی آپ کے فرزند تھے) اور ایک شاه محمد رضا ولد شاه محمد فاضل کی ۔ ان کے علاوه دوسری چار دیواری میں بھی آپ کی اولاد کی بہت سی قبور هیں ۔

آپ کے یوم وصال پر بہت بڑا عرس هوتا هے ۔ اس کے علاوه عام دنوں میں بھی بہت سے لوگ زیارت و فاتحه خوانی وغیره کے لیے آتے رهتے هیں ۔ (منتخب التواریخ اردو ترجمه ، صفحه ۶۱۸ ، ۶۱۹ ۔ سفینة الاولیا مطبوعه نولکشور ، صفحه ۱۹۵ ، ۱۹۶ ۔ تحقیقات چشتی ، صفحه ۱۰۲ ۔ لاهور از سید محمد لطیف مطبوعه لاهور ، بار دوم ، صفحه ۶۳ ، ۲۰۳ ۔ رود کوثر ، صفحه ۳۲۰ ببعد)

۸ ۔ مکتوبات کے مترجم نے اس عبارت کا ترجمه یه دیا هے ، جو راقم کے نزدیک صحیح نہیں هے :

''......(یه باتیں) صفائی وقت کا باعث بن گئیں'' (مکتوبات حضرت شیخ عبدالحق محدث دهلوی ، حصه دوم ، صفحه ۲۰۳ ، مترجمه قاضی احمد عبد الصمد فاروقی مطبوعه کراچی)

۹ ۔ اسی طرح مذکوره بالا ٹکڑے سے لے کر یہاں تک کی عبارت کا ترجمه ملاحظه هو :

''اس جواب کے بعد سے اب تک وهی صورت هے ۔کوئی ایسی بات نہیں آئی که وه آپ کے لائق هو به طور حکایت هی بیان کر دی جائے ، لیکن کوئی صورت نه بن آئی ۔'' (ایضاً)

۱۰ - لے جو کچھ که میں نے تجھے دیا اور شکر گزاروں میں سے هو ۔

۱۱ - کلمنی ، مجھ سے بات کر ۔

۱۲ - حضرت موسیٰ نے طور پر کہا تھا 'رب ارنی' (اے رب مجھے اپنا جلوه دکھا) ۔

۱۳ - اسی طرح دکھلائے هم نے ابراهیم کو آسمان و زمین کے قدرتی نشان ۔

۱۴ - جب تک که خدا هم سے هم کلام نه هو یا همارے پاس نشانی نه آئے ۔

۱۵ - تاکه میرے دل کو اطمینان هو جائے اور همارے دل مطمئن هو جائیں ، اور هم اس پر گواه بن جائیں ۔

۱۶ - بہت زیاده جاننے والا اور صاحب حکمت ۔ مولانا روم فرماتے هیں:

پس دعاها کان زیانست و هلاک وز کرم می نشنود یزدان پاک
مصلحست و مصلحت را داند وا کاندعارا باز می گرداند او
و آن دعا گوینده شاکی می شود می برد ظن بد و آن بد بود
می نداند کو بلای خویش خواست وز کرم حق آن بدو ناورد راست

(کتاب مثنوی مولانا جلال الدین محمد بلخی رومی مطبوعه ایران ، جلد دوم صفحه ۱۰۹) ۔

۱۷ - الله جو چاهتا هے ، کرتا هے اور جو اراده فرماتا هے وه حکم دیتا هے ۔

۱۸ - جس کو چاهتا هے دیتا هے اور جسے چاهتا هے روک لیتا هے ۔

۱۹ - اے همارے پروردگار هم نے اپنے اوپر ظلم کیا ، اور اگر تو هم کو معاف نه فرمائے اور رحم نه فرمائے تو هم یقیناً خساره پانے والوں میں سے هوں گے ۔

۲۰ - سلسلۂ نقشبندیہ -

۲۱ - ایک نسخے میں 'دوست' کی جگہ 'درست' ہے - اس لحاظ سے ترجمہ یہ ہوگا ''لیکن ابھی تک ایک درست بات بھی تو ہاتھ سے نہیں نکلی -''

۲۲ - اللہ تعالیٰ آن کو اپنی مدد سے محروم فرمائے اور اللہ کے بغیر مدد کا کوئی راستہ نہیں ، وہی عزت والا اور حکمتوں والا ہے -

۲۳ - یعنی خود شاہ ابوالمعالی -

۲۴ - حضرت غوث الاعظم ، غوث الثقلین محی الدین ابو محمد عبد القادر الحسنی الحسینی جیلانی رح - آپ عبداللہ محض بن حسن بن مثنی بن حسن رض بن علی رض کی اولاد میں سے تھے - آپ کی والدہ ماجدہ حسینی تھیں - لقب محی الدین ہے - اس لقب کا سبب یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ''ایک موقع پر میں سیر و سیاحت کر کے جمعہ کے روز بغداد آ رہا تھا کہ اچانک میری نظر ایک نہایت ہی نحیف و نزار بیمار پر پڑی - اس نے مجھے سلام کیا - میں نے سلام کا جواب دیا - پھر وہ کہنے لگا میرے نزدیک آؤ - میں نزدیک گیا - کہنے لگا مجھے بٹھا دو - میں نے اٹھا کے بٹھا دیا - اس کے ساتھ ہی اس کا جسم پھر سے تندرست ہو گیا اور اس کی شکل و صورت اچھی ہو گئی اور رنگ نکھر آیا - میں ڈر گیا - کہنے لگا مجھے پہچانتے ہو ؟ میں نے نفی میں جواب دیا - اس پر وہ کہنے لگا میں تیرے دادا کا دین ہوں ، میں ضعیف ہو چکا تھا اور اب جیسا کہ تو نے دیکھا ، مجھے خدا نے تیری وساطت سے پھر سے زندہ کردیا ہے - تو محی الدین ہے - میں اسے چھوڑ کر جامع مسجد میں گیا - ایک شخص نے نعلین میرے پاؤں کے پاس رکھے اور کہا 'یا شیخ محی الدین' جب میں نماز پڑھ چکا تو ہر طرف سے لوگ میری طرف بڑھے اور میرے ہاتھ پاؤں چومنا شروع کر دیے اور مجھے 'یا محی الدین' کہہ کر پکارتے -''

آپ کی ولادت باسعادت بعض کے نزدیک ۴۷۰ھ اور بعض کے نزدیک ۴۷۱ھ میں بہ مقام جیل (اسے جیلان اور گیلان بھی کہتے ہیں) ہوئی - صاحب روضۃ النواظر کے مطابق آپ کی ولادت اس مقام پر تو نہیں ہوئی ،

البتہ آپ کی اصل اسی علاقے سے ہے ۔ صاحب معجم البلدان نے آپ کو موضع بشتیز (از مضافات گیلان) سے منسوب کیا ہے ۔ آپ نے تینتیس سال تدریس و فتویٰ میں گزارے اور چالیس سال تک لوگوں کو راہ ہدایت دکھاتے رہے ۔ آپ نے نوے برس کی عمر پا کر ۵۶۱ھ میں وفات پائی ۔ ۴۸۸ھ میں بہ عمر ۱۸ سال آپ بغداد میں تشریف لائے اور یہاں علما و شیوخ اور ائمہ کی طرف رجوع کیا ۔ اول قرآن کریم روایت و درایت کے ساتھ پڑھا اور علمائے محدثین سے حدیث کا درس لیا ۔ پھر اصول و فرع اور مذہبی و اخلاق علوم کی تکمیل کی ۔ اس کے بعد آپ کے جوہر لوگوں پر کھلنے شروع ہو گئے اور آپ کی مقبولیت روز بروز بڑھتی چلی گئی ۔ بڑے بڑے فقیہ ، علما ، طلبہ اور فقرا آپ کی طرف متوجہ ہوئے ۔ تمام اولیا ، کیا موجود ، کیا غائب ، کیا دور ، کیا قریب ، سب آپ کے مطیع و منقاد ہو گئے ۔ آپ نحیف البدن اور عریض الصدر تھے ۔ گفت گو کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے کے دل پر ایک رعب و ہیبت چھا جاتی تھی ۔ جس وقت آپ بات کر رہے ہوتے اس وقت کسی دوسرے کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی ۔ اگر کوئی قسی القلب بھی آپ کے جمال با کمال کو دیکھ لیتا تو فوراً اس پر خشوع و خضوع طاری ہو جاتا ۔ جس وقت آپ جامع مسجد میں داخل ہوتے تو تمام حاضرین دست بدعا ہو جاتے اور اپنی حاجات قاضی الحاجات سے مانگتے۔

آپ حنبلی مذہب تھے اور امام شافعی رض اور امام احمد حنبل کے مذہب پر فتویٰ دیتے تھے ۔ شیخ بقای بن بطو کہتے ہیں کہ ”ایک روز امام احمد حنبل کے مزار پر گئے ۔ میں نے دیکھا کہ امام اپنی قبر سے باہر نکلے اور آپ کو اپنی بغل میں لے کر کہا کہ اے شیخ عبد القادر میں علم شریعت ، علم حقیقت اور علم طریقت میں تیرا محتاج ہوں ۔“

آپ کی والدہ ماجدہ فرماتی ہیں کہ ”جب آپ پیدا ہوئے تو رمضان کے مہینے میں دن کے وقت ہرگز دودھ نہ پیتے ۔ (آپ کی ولادت رمضان کی پہلی رات ہوئی تھی) ۔ ایک مرتبہ ہلال رمضان بادلوں کی

وجہ سے نظر نہ آیا ۔ لوگوں نے اس سلسلے میں مجھ سے پوچھا ۔ میں نے کہا کہ میرے بیٹے نے آج دودھ نہیں پیا ۔ آخر معلوم ہوا کہ اس روز روزہ تھا ۔"

آپ کے متعلق لکھنے کے لیے دفتر درکار ہے ۔ یہاں اسی پر اکتفا کی جاتی ہے ۔ (اخبارالاخیار مطبوعہ دھلی ، صفحہ ۹ ببعد ۔ سفینۃ الاولیا مطبوعہ لکھنؤ ، صفحہ ۴۳ ببعد)

۲۵ - اس کا ذکر کسی گذشتہ حاشیے میں آ چکا ہے ۔

۲۶ - خدا کی پناہ ہے اس سے ۔

۲۷ - ایمان والو ایسی چیزوں کے بارے میں مت سوال کرو کہ جو اگر ظاہر ہوں تو تم برا مناؤ ۔

۲۸ - (اے رب) مجھے اپنا جلوہ دکھا ۔

۲۹ - جب تک ہم دیکھ نہ لیں ۔

۳۰ - عظیم فریاد رسی ۔

۳۱ - یعنی صبر کی زرہ ۔

۳۲ - یہ شعر حافظ کی مندرجہ ذیل غزل کا مطلع ہے :

دل میرود ز دستم صاحب دلان خدارا
دردا کہ راز پنہان خواہد شد آشکارا
کشتی شکستگانیم ای باد شرطہ برخیز !
باشد کہ باز بینیم دیدار آشنا را
دہ روزہ مہر گردون ، افسانہ است و افسون
نیکی بہ جای یاران ، فرصت شمار یارا
در حلقۂ گل و مل خوش خواند دوش بلبل
ہات الصبوح ہبوا یا ایہا السکارا
ای صاحب کرامت ، شکرانۂ سلامت
روزی تفقدی کن درویش بینوارا

آسایش دو گیتی تفسیر این دو حرف است
با دوستان مروت با دشمنان مدارا
در کوی نیک نامی مارا گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضارا
آن تلخ وش که صوفی آم الخبائثش خواند
اشهی لنا و احلی ، من قبلة العذارا
هنگام تنگ دستی در عیش کوش و مستی
کاین کیمیای هستی ، قارون کند گدارا
سرکش مشو که چون شمع از غیرتت بسوزد
دلبر که در کف او ، موم است سنگ خارا
آئینهٔ سکندر جام می است بنگر
تا بر تو عرضه دارد احوال ملک دارا
خوبان پارسی گو بخشندگان عمرند
ساقی بده بشارت ، رندان پارسا را
حافظ بخود نپوشید این خرقهٔ می آلود
ای شیخ پاک دامن ، معذور دار مارا

(دیوان حافظ مرتبہ دکتر قاسم غنی و قزوینی مطبوعہ ایران)

فرشتہ (صفحہ ۳۳۹)

۱ - سیرالاولیا اور سید مذکور کے لیے ملاحظہ ہو دربار ملی ، تعارفی نوٹ صفحہ ۵۷-

۲ - اس کا ذکر کسی گذشتہ حاشیئے میں گزر چکا ہے -

۳ - شیخ فرید الدین گنج شکر : آپ کا نام مسعود بن عزالدین محمود ہے - سیرالاقطاب میں ہے کہ آپ کا نام پہلے مسعود تھا پھر حضرت فرید الدین عطار رح نے ایک تقریب پر اپنا نام آپ کو عنایت فرمایا - آپ والد کی طرف سے حضرت امیرالمومنین عمر خطاب رض کی اولاد میں سے اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے خلیفہ تھے -

آپ نے حضرت معین الدین چشتیؒ رح سے بھی اکتساب فیض کیا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد کابل میں بلند مرتبہ رکھتے تھے - اور چنگیزی حملہ کے دوران وہاں سے ھجرت کر کے ھندوستان تشریف لائے۔ آپ کے دادا ملتان کے نزدیک کھوتوال میں قاضی مقرر ہوئے اور یہیں آپ کی ولادت ہوئی ۔ کھوتوال میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ ملتان تشریف لے گئے اور حصول تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا - ۱۸ سال کی عمر میں خواجہ قطب الدین سے ملاقات ہوئی ۔ ان کے ساتھ آپ دھلی چلے گئے ۔ کہتے ھیں کہ آپ نے آن کے ساتھ تین منزلیں طے کی تھیں کہ انھوں نے آپ کو فرمایا کہ پہلے علوم ظاھری کی تکمیل کر لیں اور پھر ان کے پاس دھلی آئیں ۔ آپ نے اسی طرح کیا ۔ پانچ سال تکمیل تعلیم کے لیے خطہ قندھار میں گزارے اور پھر دھلی آئے ۔ تھوڑے ھی دنوں میں آپ کو شیخ قطب الدین نے روحانی نعمتوں سے مالا مال کر دیا ۔ جب آپ کو دھلی میں ھجوم مردمان کے سبب یکسوئی حاصل نہ ہوئی ، تو مرشد سے اجازت لے کر ھانسی چلے گئے ۔ لیکن وہاں سے دھلی آتے جاتے رہے ۔ چناں چہ اسی طرح جب حضرت معین الدین چشتیؒ دھلی تشریف لائے ہوئے تھے تو آپ نے ان سے بھی استفادہ کیا ۔ خواجۂ اجمیر آپ کی روحانی استعداد اور ذوق و شوق سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے حضرت خواجہ بختیار سے فرمایا کہ ''بابا بختیار تم نے ایک عظیم شاہ باز مقید کیا ہے کہ سدرۃ المنتہٰی کے سوا کہیں آشیاں نہیں بناتا ۔ یہ فرید ایک ایسی شمع ہے جو درویشوں کے خاندان کو منور کرے گی ۔'' اور ایسا ھی ہوا ۔ آپ نے نہ صرف مغربی پنجاب میں اشاعت اسلام کی بلکہ سلطان المشائخ اور شیخ صابر جیسے صاحب سلسلہ بزرگوں کی تربیت کرکے چشتیہ سلسلے کو پہلی مرتبہ وسیع اور مستحکم بنیادوں پر کھڑا کیا ۔

مرشد کی وفات کے بعد آپ پہلے ھانسی پھر کھوتوال اور بالآخر پاک پٹن چلے گئے ۔ اپنی وفات تک وھیں رہے اور بیعت و ارشاد اور یاد الٰہی میں ساری عمر گزاری ۔ آپ سے بہت سی کرامات منسوب نہیں لیکن

آپ کی سب سے بڑی کرامت بے حرصی اور پاک زاہدانہ زندگی تھی - آپ کی تاریخ ولادت بہ قول فرشتہ ۵۸۴ھ اور بہ قول الہدیہ صاحب سیر الاقطاب ۵۹۵ھ ہے - لیکن اخبار الاخیار اور سفینۃ الاولیا میں ہے کہ آپ نے پچانوے برس کی عمر میں پانچویں محرم ۶۶۴ھ کو وفات پائی - اس لحاظ سے سنہ ولادت ۵۶۹-۷۰ھ بنتا ہے - فرشتہ نے بھی آپ کی عمر ۹۵ برس ہی لکھی ہے لیکن سال وفات ستین و سبع مأۃ (۷۶۰) لکھا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اس سے پہلے اس نے لکھا ہے کہ حضرت نظام الدین ۶۶۹ھ شوال کے مہینے میں آپ سے جب مل کر واپس دہلی جانے لگے تو اس وقت آپ بیماری میں مبتلا تھے اور آپ نے فرمایا تھا ''جاؤ تمہیں خدا کے سپرد کیا'' اس وقت آپ کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔ پھر بہ قول فرشتہ آپ پنجم ماہ محرم کو فوت ہوئے (دراصل فرشتہ کے مطابق ۶۷۰ھ ہونا چاہیے جسے کاتب یا مصحح نے ۷۶۰ھ کر دیا) - سیر الاقطاب میں دن تو وہی ہے لیکن سنہ وفات ۶۹۰ھ ہے - واللہ اعلم - گنج شکر کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ساٹھ روز تک افطار نہ کی جس کے سبب آپ بے حد نحیف ہوگئے - اسی حالت میں اپنے مرشد کی طرف جا رہے تھے کہ راستے میں پاؤں لڑکھڑایا اور آپ گر گئے جس کے سبب آپ کے دہن مبارک میں کچھ مٹی پڑ گئی (اخبار الاخیار اور سیر الاقطاب میں ہے کہ جب آپ بے طاقتی سے زمین پر گرے تو چند سنگریزے آپ کے ہاتھ میں آ گئے) اور وہ تمام شکر بن گئی - جب آپ مرشد کے پاس پہنچے تو انہوں نے فرمایا ''فرید یہ جو مٹی تیرے منہ میں پڑی ہے اس سے خدا نے تیرے وجود کو گنج شکر بنا دیا ہے - تو ہمیشہ میٹھا رہے گا -''
(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۸۳ ، ۳۸۸ ، ۳۹۰ - اخبار الاخیار صفحہ ۵۲-۵۴ - سیر الاقطاب مطبوعہ لکھنؤ ۱۹۱۳ء صفحہ ۱۶۱ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵ ، ۱۷۷ - سفینۃ الاولیا صفحہ ۹۶-۹۷ - سیر المتاخرین مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۲۵ - آب کوثر بار سوم صفحہ ۲۴۴ ، ۲۴۵)

۴ - شیخ عثمان سیاح : شیخ وحید الدین عثمان - آپ کا اصلی وطن دہلی ہے - اپ نے بہت سیاحت کی - کئی مرتبہ شیخ نصیر الدین چراغ

کی مجلس میں حاضر ہوئے اور سماع کیا ۔ چراغ دھلی (شیخ نصیر الدین) سے روایت ھے کہ جب آپ شیخ رکن الدین ابوالفتح کے مرید ہوئے تو آپ نے اس قدر ترک و تجرید کی کہ سوائے ایک معمولی سی لنگوٹی کے اور کچھ نہ پہنتے ۔ اسی حال میں آپ اپنے مرشد کے ساتھ ملتان گئے اور عوارف ان سے پڑھی اور قرآن مجید حفظ کیا ۔ آپ نے اسی حالت میں حج بھی کیا ۔ ایک سال مدینہ میں رہے ۔ پھر حج کے موقع پر مکہ معظمہ گئے اور طواف میں مشغول ہو گئے ۔ کہتے ھیں کہ چوں کہ اس وقت موسم بڑا گرم تھا ، حضرت خضر حاضر ہوئے اور انہوں نے اپنی آستین سے ان پر سایہ کیا ۔ اگرچہ آپ نے نہ پہچانا لیکن ان سے کوئی بات نہ کی ، جب واپس ملتان پہنچے تو مرشد نے کہا کہ تم نے اچھا کیا جو جلد آ گئے وگرنہ فتنۂ خلق کا موجب بنتے ۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا خاص لباس آپ کو پہنایا اور اپنے سر سے پگڑی اتار کر آپ کے سر پر رکھ دی ۔ بادشاہ وقت غیاث الدین تغلق ایک موقع پر آپ سے ناراض ہو گیا تھا اور وہ آپ کو بہت بڑی سزا دینا چاھتا تھا ، لیکن بعد میں ناراضگی دور ہو گئی ۔ (اخبار الاخیار صفحہ ۱۳۱ ۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۴۱۴-۴۱۵) ۔

۵ ۔ شیخ رکن الدین ابوالفتح : آپ شیخ صدرالدین بن بہاء الدین زکریا رح کے فرزند تھے ۔ آپ کی کنیت ابوالفتح اور لقب فضل اللہ ھے بہ قول دارا شکوہ آپ نے نویں جمادی الاول (فرشتہ نے ۱۸ رجب لکھا ھے اور سنہ کوئی نہیں دیا) ۷۳۵ھ کو بہ عمر ۸۸ سال وفات پائی ۔ اس لحاظ سے آپ کی تاریخ ولادت ۶۴۷-۴۸ھ بنتی ھے ۔ کہتے ھیں کہ آپ ابھی ماں کے شکم میں ہفت ماھہ تھے کہ ایک دن آپ کی والدہ حضرت خواجہ بہاء الدین زکریا کو سلام کرنے کے لیے آئیں ۔ حضرت خواجہ نے اٹھ کر تعظیم کی ۔ آپ کی والدہ کو اس پر بڑا تعجب ہوا ۔ حضرت خواجہ نے فرمایا کہ یہ تعظیم اس شخص کے لیے ھے جو تمھارے شکم میں ھے ۔ وہ ھمارے خاندان کا چراغ اور شفیع ھے ۔ جب آپ چار برس کے تھے ، تو ایک روز حضرت خواجہ اپنی دستار پلنگ کے ایک پائے پر رکھ کر اس پلنگ پر آرام فرما رہے تھے اور آپ کے والد

شیخ صدر الدین نیچے بیٹھے تھے۔ اسی اثنا میں آپ نے یکایک وہ دستار اٹھا کر اپنے سر پر رکھ لی۔ آپ کے والد مضطرب ہوئے اور زور سے بولے، رکن الدین بے ادبی نہ کر اور حضرت کی دستار اتار دے۔ حضرت خواجہ بولے، صدر الدین اسے منع نہ کرو کیوں کہ اس نے یہ پگڑی باستحقاق پہنی ہے اور یہ دستار میں اسے بخشتا ہوں۔ آپ ۱۲۸۵ء میں اپنے والد کی وفات پر ان کے جانشین ہوئے۔ آپ کے حسن خلق اور پرہیزگاری کی سب تاریخیں گواہ ہیں۔ اپنے زمانے میں آپ کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ سلطان علاء الدین خلجی باوجود اپنے تکبر و غرور کے آپ کا بڑا معتقد تھا۔ اس کی زندگی میں آپ دو مرتبہ دھلی آئے۔ بادشاہ نے بڑی عقیدت سے استقبال کیا اور رخصت کے وقت کئی لاکھ ٹنکے نذر کیے۔ آپ نے وہ رقم مستحقین میں تقسیم کر دی۔ جب خواجہ نظام الدین اولیا رح کا وصال ہوا تو اس وقت آپ دھلی میں موجود تھے، چناں چہ آپ ہی نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ نے ملتان ھی میں وفات پائی۔ آپ کا مزار قلعہ ملتان کے اندر ایک بڑے عالی شان روضے میں ہے۔ یہ روضہ سو فٹ بلند ھے۔ پچاس فٹ کے قریب بنیاد اور ۵۰ فٹ بلندی۔ یہ روضہ دراصل غیاث الدین تغلق نے اپنے لیے بنوایا تھا تاکہ خواجہ بہاء الدین زکریا کے قریب دفن ہو سکے۔ لیکن وہ دھلی میں فوت اور وھیں دفن ھوا۔ اس کے بیٹے محمد تغلق نے یہ روضہ آپ کی تدفین کے لیے دے دیا۔ (اخبار الاخیار صفحہ ۶۳۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴۱۱ جلد دوم۔ سفینۃ الاولیاء صفحہ ۱۱٦۔ آب کوثر صفحہ ۳۰۳، ۳۰۵)

٦۔ سلطان غیاث الدین: اس کا نام غازی الملک تھا۔ اس کے باپ کا نام تغلق تھا جو غیاث الدین بلبن کا غلام تھا۔ خسرو شاہ پر فتح حاصل کرنے اور اسے قتل کرنے کے بعد یکم شعبان ۷۲۱ھ (بدایونی نے ۷۲۰ھ لکھی ھے) کو سلطان غیاث الدین کے لقب سے تخت دھلی پر متمکن ھوا۔ بہ قول فرشتہ اس کی ماں جاٹ قوم میں سے تھی۔ اس لحاظ سے یہ دوغلا ٹھہرا۔ یہ بڑا منتظم اور مدبر شخص تھا۔ اس نے ایک ھفتے کے اندر ھی سلطنت کے تمام درھم برھم کارخانہ کو کمال عمدگی سے سنوار

کر رکھ دیا - بہ قول بدایونی جس تیزی اور ہوشیاری سے اس نے نظم و نسق کی اصلاح کی وہ شاید دوسروں سے سالہا سال میں بھی نہ ہوتی - بہ قول فرشتہ یہ بڑا حلیم و کریم اور عاقل و سلیم تھا اور عصمت و پاکیزگی گویا اس کی جبلت میں پیدا کی گئی تھی - پانچ وقت نماز با جماعت ادا کرتا اور صبح سے شام دیوان میں بیٹھ کر لوگوں کے احوال اور ملکی و مالی معاملات میں مشغول رھتا - اس نے ماہ ربیع الاول ۷۲۵ھ میں وفات پائی - وفات کا واقعہ اس طرح ھے کہ یہ مہم بنگالہ سے جب واپس دھلی آ رھا تھا تو راستے میں افغان پور کے مقام پر اس کے بیٹے الغ خاں نے ایک قلعہ نما محل تین دن میں تیار کروایا تا کہ بادشاہ جب وھاں سے گزرے تو اس محل میں قیام کرے اور دوسرے روز صبح تغلق آباد میں داخل ھو - چناں چہ بادشاہ کی آمد پر الغ خاں استقبال کے لیے بڑھا - بادشاہ نے وھیں قیام کیا - اس کی ضیافت کا بڑا شاھانہ انتظام کیا گیا تھا - بادشاہ نے محل کے اندر ھی کھانا کھایا - دوسرے لوگ اس خیال سے کہ بادشاہ کھانا کھانے کے فوراً بعد سوار ھو جائیں گے ، کھانا کھاتے ھی انتظام کے لیے باھر نکل آئے - سلطان البتہ ھاتھ دھونے کے انتظار میں بیٹھا رھا - لیکن اچانک چھت گر پڑی اور وہ جاں بحق ھو گیا - اس سلسلے میں مختلف قیاسات ھیں - مثلاً بدایونی اور ابوالفضل کے خیال میں الغ نے یہ محل کھوکھلا بنوایا ھوگا - ابن بطوطہ کے مطابق اس محل کی بنیاد لکڑی کے ستونوں پر اس طرح رکھی گئی تھی کہ اگر اس کے ایک خاص موقع پر ھاتھی کھڑا کیا جائے تو تمام مکان گر پڑے - فرشتہ نے لکھا ھے کہ بہ قول حاجی محمد قندھاری جس وقت بادشاہ ھاتھ دھونے میں مصروف تھا آسمان سے بجلی گری اور محل کی چھت پھاڑ کر اس کے سر پر گری - بعض کہتے ھیں کہ الغ خاں اپنے باپ کو مارنا چاھتا تھا اس لیے اس نے اس قسم کا محل بنوایا - فرشتہ اس پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھتا ھے کہ الغ خاں اس وقت خود بادشاہ کے دسترخوان پر موجود تھا - اس وقت یہ کرامت کہاں سے پیدا ھوئی کہ جونہی وہ اٹھ کر جائے تو محل کی چھت بادشاہ پر گر پڑے - وہ بجلی والے واقعے کو قرین صحت جانتا ھے -

لیکن ابن بطوطه کے مطابق محل دانستہ طور پر ایسابنایا گیا تھا کہ جس وقت اس پر ھاتھی چڑھے تو وہ گر پڑے ۔ بعض نے اس صنعت کو طلسم سے تعبیر کیا ھے ۔ بعض کہتے ھیں کہ بادشاہ جب نماز پڑھنے لگا تو تمام لوگ باھر آ گئے ۔ محل میں صرف بادشاہ اور اس کا چہیتا شہزادہ محمود رہ گیا ۔ پھر ایک ھاتھی خاص مقام پر لایا گیا ۔ جونہی ھاتھی وھاں پہنچا تمام محل دھاکے کے ساتھ گر پڑا ۔ یہ سارا ڈرامہ جوناخاں نے کھیلا ۔ اس نے ملبہ نکالنے میں بھی تاخیر کی ۔ جب ملبہ کھودا گیا تو بادشاہ اپنے بیٹے پر جھکا ھوا تھا جیسے اسے بچانے کے لیے اٹھانے لگا ھو ۔ بعض کہتے ھیں کہ بادشاہ اس وقت زندہ تھا لیکن اس کا کام تمام کردیا گیا اور اسے راتوں رات تغلق آباد سے مقبرے میں لے جا کر دفن کر دیا گیا ۔ واللہ اعلم ۔ (تاریخ فرشتہ جلد اول مطبوعہ نول کشور صفحہ ۱۳۰-۱۳۲ ۔ منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۰ ، ۱۲۳ ۔ مفتاح التواریخ از ولیم تھامس بیل صفحہ ۸۲)

۷ ۔ خسرو خاں : ناصر الدین خسرو خاں ، یہ سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی کا محبوب تھا ، پہلے اس کا نام حسن پردازبچہ تھا ۔ مبارک شاہ اس پر اس قدر فریفتہ تھا کہ اس نے اسے وزارت کے منصب پر ، جس کا وہ اھل نہ تھا ، فائز کیا ۔ ۷۲۱ھ میں جب بادشاہ مارا گیا (بقول بدایونی اس میں خسرو کا ھاتھ تھا) تو یہ اپنے قبیلے والوں کی مدد سے ناصر الدین کے لقب سے تخت پر بیٹھا ۔ بقول بدایونی و فرشتہ اس کے تخت پر بیٹھتے ھی ھندوستان میں اسلامی شعائر کا زوال ھونے لگا ۔ ھندوؤں کے رسم و رواج ترقی کرنے لگے ۔ ھندوؤں نے یہاں تک کیا کہ کھلے بندوں بت پرستی کرتے اور قرآن شریف کو کرسی کی جگہ استعمال میں لاتے اور اس پر بیٹھتے ۔ اس نے عوام و خواص کی تالیف قلب کے لیے ان خزانوں کا منہ کھول دیا جو علاء الدین اور قطب الدین کے وقت سے جمع تھے ۔ لیکن اس کی نمک حرامی اور بے دینی کی وجہ سے لوگ اس سے برگشتہ خاطر ھی رھے ۔ اسے غازی الملک نے ۷۲۱ھ میں شکست دے کر قتل کر دیا (بقول بدایونی ۷۲۰ھ) ۔ ابن بطوطہ کے مطابق اسے گرفتار کرکے غازی الملک کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے

کھانا مانگا ۔ اسے کھانا کھلایا گیا ۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے رسوا نہ کرو اور میرے ساتھ شاہانہ سلوک کرو ۔ غازی الملک نے اسی جگہ جہاں قطب الدین مبارک شاہ قتل ہوا تھا ، لے جا کر اسے قتل کروا دیا اوراس کی لاش چھت پر سے نیچے پھنکوا دی ۔

(تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۲۴ ، ۱۲۸ - منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۱۱۶ ، ۱۱۹ - مفتاح التواریخ صفحہ ۷۹)

۸ - آپ کا ذکر کسی گزشتہ حاشیے میں گزر چکا ہے ۔

۹ - یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ، کیوں کہ اس موقع پر جیسا کہ صاحب سیرالاولیا نے لکھا ہے ، مولانا فخرالدین زرادی (جن کا ذکر اس سے پہلے کسی حاشیے میں گزر چکا ہے) موجود تھے ، فخر الدین رازی نہیں (ملاحظہ ہو دربار ملی صفحہ ۶۰) ۔ تاریخ فرشتہ میں انہی مولانا زرادی کو کئی ایک جگہ پر 'ارادی' بھی لکھا ہوا ہے (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ چاپ نول کشور ، جلد دوم صفحہ ۳۹۷ سطور ۱۲ ، ۱۳) - یہاں صحیح لفظ زرادی ھی ہے ۔

(ملاحظہ ہو اخبار الاخیار صفحہ ۹۱ ۔ تذکرۂ علمائے ھند صفحہ ۱۶۰)

۱۰ - کسی کے قول پر بغیر دلیل کے عمل کرنے والا ۔

۱۱ - امام ابو حنیفہ رض : آپ کا نام نعمان اور کنیت ابو حنیفہ ہے ۔ والد کا نام ثابت ہے ۔ آپ کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی ۔ آپ اھل کوفہ کے قبیلہ تیم اللہ کے مولیٰ تھے ۔ آپ کے آبا و اجداد کابل کے فارسی تھے ۔ پہلے آپ ریشمی کپڑے کی سوداگری کرتے تھے ، پھر علوم دین حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوئے ۔ جن صحابہ رض سے ملے ان سے اکتساب علوم دینیہ کیا اور روایات نقل کیں ، حتیٰ کہ علوم دینیہ میں ایسی شہرت حاصل کر لی کہ خلیفہ منصور نے آپ کو عہدہ قضا پیش کرنا چاہا ۔ لیکن آپ نے قبول نہ کیا ۔ آپ کا رنگ گندمی اور قد میانہ تھا ۔ نہایت خوش الحان ، بلند آواز اور خوش مقال تھے ۔ بڑے خشوع و خضوع کرنے والے ، غور و فکر کرنے کی وجہ سے دیر تک خاموش رہنے والے اور قانع مزاج تھے ۔ لوگوں کی غیبت سے کوسوں دور رہتے

اور اپنے دشمن کا بھی کبھی برائی سے ذکر نہ کرتے ۔ امام مالک رض آپ کے علم و عمل کے بارے میں فرماتے ھیں ''وہ ایک ایسی قوت استدلال کے مالک ھیں کہ اگر میں ان سے اس ستون کو سونے کا بتانے کے لیے کہوں تو وہ نہایت مضبوط دلائل سے اسے ثابت کر دیں گے ۔'' آپ نے ۱۵۰ھ میں بہ مقام بغداد وفات پائی ۔ بہ قول دارا شکوہ آپ کا مزار پرانے شہر بغداد کے متصل ھے ۔ آپ سے یہ کتب منسوب ھیں : الفقہ الاکبر فی اصول الدین ، المخارج فی الحیل ۔ نیز ایک وصیت نامہ جو آپ نے اپنے اصحاب کو اصول میں کیا ھے ۔ (تاریخ ادب عربی از استاذ احمد حسن زیات ، اردو ترجمہ از عبدالرحمان طاھر سورتی صفحہ ۵۵۶ ، ۵۵۷ ، سفینۃ الاولیا صفحہ ۳۳) ۔

۱۲ - بہاء الدین زکریا : شیخ الاسلام بہاء الدین ابو محمد زکریا ملتانی قرشی ۔ کنیت ابو محمد و ابو البرکت ۔ آپ وجیہ الدین محمد بن کمال الدین علی شاہ قریشی کے فرزند تھے ۔ بہ قول فرشتہ آپ کے جد بزگوار کمال الدین علی شاہ قریشی مکہ معظمہ سے خوارزم آئے اور وھاں سے ملتان پہنچے ۔ آخر میں کوٹ کرور (ملتان ۔ دارا شکوہ نے کوٹ گرد لکھا ھے) میں آ کر سکونت پذیر ھو گئے ۔ یہیں آپ بہ قول فرشتہ ۵۷۸ھ ، بہ قول دارا شکوہ ۵۶۶ھ اور بہ قول ابو الفضل ۵۶۵ھ میں پیدا ھوئے ۔ بارہ برس کے تھے کہ آپ کے والد فوت ھو گئے ۔ سن رشد کو پہنچے تو خراسان کا سفر اختیار کیا اور تحصیل علوم ظاھری میں مصروف ھو کر عظیم شہرت پائی ۔ ۱۵ برس وھاں تدریس وافادۂ علوم میں مصروف رھے ۔ وھاں سے کچھ عرصہ بعد مکہ چلے گئے اور حج کیا ۔ بعض کے مطابق مدینہ میں ۵ برس مجاور رھے اور شیخ کمال الدین محمد یمنی محدث کبیر سے درس حدیث لیا ۔ پھر بیت المقدس کا سفر اختیار کیا ۔ وھاں سے بغداد تشریف لائے ۔ یہاں شیخ شہاب الدین سہروردی کے ھاتھ پر بیعت کی ۔ خواجہ نظام الدین اولیا رح سے منقول ھے کہ آپ نے شیخ سہروردی رح سے ۱۷ روز میں خرقۂ خلافت پایا ، اور وہ دولت حاصل کی جو دوسروں کو سالوں میں نصیب نہیں ھوئی ۔ جب شیخ سہروردی رح کے پرانے خادموں نے ان سے شکایت کی کہ زکریا رح کو

اتنی تھوڑی مدت میں آپ نے کیوں خرقۂ خلافت دیا ہے تو شیخ نے فرمایا ، تم لوگ گیلی لکڑی لائے ہو ، وہ سوکھی لکڑی لایا ہے ۔

آپ اپنے مرشد کے حکم پر ملتان تشریف لائے تاکہ لوگوں کو راہ ہدایت دکھائیں ۔ یہاں آ کر آپ نے شادی کی جس سے آپ کے اولاد ہوئی ۔ آپ کے مرید بہت نامور ہیں ، جن میں سید جلال بخاری ، فخرالدین ابراہیم عراقی اور امیر حسین صاحب نزہت الارواح خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔ کہتے ہیں جب آپ بغداد سے ملتان تشریف لائے تو ارباب حسد نے یہ بتانے کے لیے کہ یہاں آپ کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ، دودھ کا بھرا ہوا پیالہ آپ کے پاس بھیجا ۔ آپ نے اس بھرے ہوئے پیالے کے اوپر پھول رکھ دیا ، جس کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے لیے اسی طرح اس شہر میں جگہ ہے ۔ اس سے حاسد لوگ خاموش ہو گئے ۔

آپ کی وفات کا واقعہ عجیب ہے ۔ تذکروں میں ہے کہ ایک روز ایک نورانی شخص (خواجہ نظام الدین اولیا کے مطابق ایک مرید) نے ایک خط لا کر آپ کے فرزند شیخ صدرالدین کو دیا کہ وہ یہ خط آپ کو اندر پہنچا دے ۔ آپ اس وقت حجرے میں عبادت میں مصروف تھے۔ شیخ صدر الدین نے خط کا عنوان دیکھا تو متحیر ہوئے ۔ وہ خط والد کو جا کر دیا ۔ آپ نے وہ خط پڑھا تو اسے لپیٹ کر نعرہ مارا اور اسی رات آپ کا انتقال ہو گیا ۔ یہ واقعہ بہ قول ابو الفضل ۷ ماہ صفر ٦٦۵ھ ، بہ قول فرشتہ ۱۷ صفر ٦٦٦ھ ، بہ قول دارا شکوہ جمعرات ۷ صفر ٦٦٦ھ اور بہ قول عبدالحق محدث ۷ صفر ٦٦۱ کو رونما ہوا ۔ ملتان میں دفن ہوئے ۔

آپ بہت بڑے صوفی تھے ۔ تمام تذکرہ نگار آپ کا ذکر بڑے احترام سے کرتے ہیں ۔ فرشتہ نے آپ کو 'زبدة الاتقیا و خلاصة الاولیا' لکھا ہے ۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ آپ علوم ظاہر و باطن ، فقہ ، حدیث ، اصول و فروع میں عالم و کامل اور قطب و غوث وقت تھے ۔ بہ قول صاحب اخبار الاخیار ''آپ صاحب کرامات ظاہرہ و مقامات باہرہ و برکات

شامله توے'' ۔ صاحب سلسلة الذهب نے آپ کو 'رئیس اولیاے ہند' لکھا ہے ۔

خواجه نظام الدین اولیا رح سے منقول ہے کہ اگر آپ کسی کو کوئی چیز دیتے تو عمدہ چیز دیتے۔ جو معلم آپ کے فرزندوں کو پڑھایا کرتے آپ ان پر بڑی عنایت کرتے ، اور ان کے دامن سونے چاندی سے بھر دیتے ۔ (آئین اکبری جلد ۳ صفحه ۲۷۸ ۔ اردو ترجمه فوائد الفواد صفحه ۳۴ ، ۱۸۰ ، ۱۸۱ ۔ تاریخ فرشته جلد ۲ صفحه ۳۰۴ ، ۳۰۵ ، ۳۰۹ ۔ اخبار الاخیار صفحه ۲٦-۲۸ ۔ سلسلة الذهب به حواله اخبار الاخیار صفحه ۲۷ ۔ سفینة الاولیا صفحه ۱۱۴ ۔ سیر المتاخرین مطبوعه لاهور صفحه ۱۲۴ ۔ تذکره علماے هند صفحه ۳۲ ، ۳۳) ۔

ملا ظہوری (صفحه ۳۵۱)

۱ ۔ وہ علما جو اوقات عزیز قیل و قال میں صرف کرتے ہیں ۔

۲ ۔ حجاز شہر کا نام اور موسیقی کا ایک مقام ۔

۳ ۔ گھونگرو ، موسیقی کا ایک مقام ۔

۴ ۔ عراق شہر کا نام اور موسیقی کا ایک مقام ۔ تال ہندی ساز ہے اور طنبوره ترکی ۔ اس فقرے میں رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے ۔

۵ ۔ وہ جو گانے میں دوسرے کی پیروی کرے ۔

٦ ۔ دف اندر سے خالی اور اوپر سے کھال کے سبب بند یعنی بھری ہوئی ہوتی ہے ۔ مطلب یه که دف میرے اس قول کو (جو پہلے مصرع میں ہے) صحیح ثابت کرتی ہے (دف سے نغمے نکلتے ہیں) ۔

۷ ۔ نوازنے والا ، دوسرے معنی ساز بجانے والا ۔

۸ ۔ قانون ایک عام معنی میں ، دوسرے معنی ایک باجا کے ہیں ۔

۹ ۔ گانے میں دوسرے کی آواز کو مدد دینا ۔

۱۰ ۔ موسیقی کی اصطلاح به معنی راگ ۔

۱۱ - ستارے کا نام -

۱۲ - مریخ ، خورشید ، مشتری ، زهره ، منشی فلک سب ستارے هیں -

۱۳ - نوشیروان یا انوشیروان یعنی انوشگ روان جس کے معنی صاحب روح جاوید کے هیں - اس کا نام خسرو (اول) تها - اس کا دور ایران میں ساسانی عہد حکومت کا ایک زریں دور سمجھا جاتا ہے - یہ ایک دهقان کی لڑکی سے تها ، جس سے اس کے باپ قبادنے بلاش (جو قباد کا بهائی اور تخت کا دعوے دار تها) سے فرار کے موقع پر نیشاپور میں شادی کی تهی - یہی وہ بادشاہ ہے جس کے عہد میں آں حضرت (صعلم) کی ولادت هوئی اور اس کے محل میں اس موقع پر شگاف پڑ گئے تهے - ۵۳۱ء میں جب اس کا باپ بیمار پڑا تو اس نے اس کی جا نشینی کا اعلان کر دیا - اس نے تخت نشین هوتے هی مزدکیوں کا خاتمہ کیا - اس طرح ملک میں امن و امان قائم هوا - اس نے اپنے حکام کو ، بہ قول نظام الملک طوسی ، یہ تاکید کر دی تهی کہ لوگوں کے ساتھ ایمان داری اور مہربانی سے برتاؤ کریں - لیکن وہ باز نہ آئے اور انهوں نے ظلم و جور روا رکھا تو اس نے پهر انهیں بلا کر نصیحت کی اور پهر بهی جب حالات نہ بدلے تو اس نے بڑے بڑے حکام کو سزا دینے سے گریز نہ کیا - اس سلسلے میں کئی ایک حکایات ملتی هیں - خسرو پہلا ساسانی بادشاہ تها جس نے مذهبی علما کو اپنے تابع فرمان کیا ورنہ اس سے پہلے بادشاہ ان کا کہنا مانا کرتے تهے - ان یتیم بچوں کو جن کے باپ مزدکی فتنہ میں مارے گئے تهے اور وہ عسرت کی زندگی بسر کر رہے تهے، اپنے بچے بنا لیا - لڑکیوں کو ان کے رتبے کے مطابق شریف گهرانوں میں بیاها اور شاهی خزانے سے انهیں جهیز دیے - لڑکوں کی شادیاں نجیب خاندانوں میں کیں اور خزانے سے مہر دلوائے - اس نے تمام اراضی مزروعہ کی پیمائش کرکے لگان کی نئی شرحیں مقرر کیں - اور یہ کام اس نے ایسے لوگوں سے کروایا جو منصف اور ایمان دار تهے - داخلی امور میں بہت سی اصلاحات کے بعد اس نے

خارجی پالیسی میں بھی تبدیلی کی ۔ مثلاً روم سے ، جس سے آئے دن ایران کی لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں ، صلح کی ، اگرچہ آخر میں بعض اسباب کے تحت اسے پھر روم سے ٹکر لینی پڑی ۔ اس نے کئی ایک مہمیں سرانجام دیں جن میں لازیکا کی مہم ، انطاکیہ کی فتح وغیرہ شامل ہیں ۔ مشرقی روایات میں خسرو اول ایک ایسا بادشاہ مانا گیا ہے جو عدل و انصاف کا نمونہ ہے ۔ عربی اور فارسی کی تصنیفات میں ایسی بے شمار حکایتیں ملتی ہیں جو اس کی عدل گستری کی مثالیں پیش کرتی ہیں ۔ سیاست نامہ میں ایک حکایت ہے کہ خسرو نے اپنے محل میں گھنٹی لٹکا رکھی تھی اور زنجیر بندھوا دی تھی تاکہ جس کسی پر کوئی ظلم ہو ، وہ بادشاہ سے شکایت کرنے کے لیے زنجیر کو کھینچے ۔ ساڑھے سات برس تک اس کو کسی نے نہ کھینچا ۔ اس مدت کے بعد ایک دن گھنٹی بجی ۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک خارشی گدھا زنجیر کے ساتھ اپنا جسم رگڑ رہا تھا ۔ خسرو نے اسی وقت اس کے مالک کو بلا کر تاکید کی کہ اس کو اچھی طرح رکھے ۔ ایک موقع پر اس کی مملکت کے ایک حصے میں ترکستان سے بہت سے بھیڑیے آ گئے ۔ اسے بتایا گیا کہ یہ اس وجہ سے ہے کہ اس مملکت میں ظلم ہو رہا ہے ۔ اس نے فوراً تحقیق کے لیے اپنے تیرہ آدمی مقرر کیے ۔ انھوں نے اطراف و اکناف سلطنت میں پہنچ کر عمال کی بدکرداری کی اطلاع دی ۔ چناں چہ اس نے نوے حکام کی گردنیں اڑا دیں جنھوں نے عوام پر ظلم و جور پھیلا رکھا تھا ۔ ان باتوں سے قطع نظر اس کی عیاری کی مثالیں بھی اکثر تواریخ میں ملتی ہیں جن میں سے کچھ کرسٹن سین نے اپنی کتاب میں درج کی ہیں ۔ اس نے ۵۷۹ء میں تیسفون کے مقام پر وفات پائی ۔ (سیاست نامہ از نظام الملک طوسی اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۳۵ ببعد ، روضۃ الصفا مطبوعہ ۱۹۱۴ء لکھنؤ جلد اول صفحہ ۲۵۸-۲۶۰ ، ایران بعہد ساسانیاں صفحہ ۴۸۴ ببعد ، خلاصہ تاریخ ایران صفحہ ۴۴-۴۷ ، تاریخ ساسانیاں صفحہ ۱۱۷)

۱۴ - تتار: یہاں کی مشک بہت مشہور ہے ۔ مطلب یہ کہ اس کے بال بے حد خوشبودار ہیں ۔

۱۵ - یعنی جس طرح دوسرے سلاطین اہل ہنر کے محتاج ہیں ہمارا ممدوح محتاج نہیں ہے -

۱۶ - زر لٹانے میں بے حد سخی ہے لیکن دلوں کو اپنے قبضے میں رکھتا ہے یعنی ''دل بدست آور......'' کے مقولے پر عمل کرتا ہے -

۱۷ - افلاطون: مشہور یونانی فلسفی - یہاں اس لفظ کا استعمال دانائی کے لیے ہوا ہے -

۱۸ - مشہور اسکندر اعظم یونانی بادشاہ جس نے ایک دنیا کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا - یہاں بہ معنی 'بادشاہ' کے استعمال ہوا ہے -

۱۹ - باربد کا لفظ مغنی کے معنوں میں ہے - خسرو دوم (خسرو پرویز متوفی ۶۲۸ء) کا درباری گویا تھا - بقول ثعالبی اس کا وطن مرو تھا - اس کا ایک رقیب سرکش نامی تھا - اس نے بڑی کوشش کی کہ اس کی دربار تک رسائی نہ ہو ، لیکن اس نے کسی نہ کسی ڈھنگ سے اپنے گانے کی آواز بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دی اور اس کے بعد وہ اس کا مقرب بن گیا - روایت کی رو سے ایرانیوں کی موسیقی کا موجد باربد ہی ہے - کرسٹن سین لکھتے ہیں کہ ''دراصل ایرانیوں کی موسیقی تو اس سے زیادہ پرانی ہے - لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس با کمال استاد نے ساسانیوں کی موسیقی پر بہت بڑا اثر ڈالا ہے ، جو عہد اسلامی میں عربوں اور ایرانیوں کے فن موسیقی کا سب سے بڑا منبع تھی اور غالباً وہ اثر اب بھی اسلامی ممالک میں باقی ہے جہاں اس فن کی حفاظت میں حد سے زیادہ قدامت پسندی برتی گئی ہے -'' ثعالبی کے مطابق اس نے ایک موقع پر بادشاہ کو ایک ایسی راگنی سنائی جسے سن کر بادشاہ کو اتنی خوش ہوئی جتنی کہ ایک شخص کو افلاس کے بعد دولت مند بننے سے ہوتی ہے - ایک روایت کی رو سے اس نے بادشاہ کی مجالس کے لیے تین سو ساٹھ راگنیاں تصنیف کی تھیں تاکہ سال میں ہر روز ایک نئی راگنی سنا سکے - اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات استادان موسیقی کے لیے قانون کا حکم رکھتی تھی جو سب کے سب اس کے خرمن کے خوشہ چین تھے - (ایران بعہد ساسانیان از پروفیسر آرتھر کرسٹن سین اردو ترجمہ از پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال مطبوعہ دھلی صفحہ ۶۴۹-۶۵۱ ، خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۹۴ ، تاریخ ساسانیاں صفحہ ۱۵۶)-

۲۰ ۔ پرویز بہ معنی بادشاہ ۔ خسرو پرویز یا خسرو دوم اپنے باپ کے بعد ۵۹۰ء میں تخت نشین ہوا ۔ جس وقت اس کے باپ ہرمز چہارم کو معزول کیا گیا اس وقت یہ اپنی فوج کے ساتھ آذر بائیجان میں تھا ۔ فوراً وہاں سے طیسفون روانہ ہوا ، اور وہاں پہنچ کر تاج شاہی سر پر رکھا ۔ تخت نشینی کے کچھ عرصہ بعد اسے بہرام چوبیں سے ، جو اس کے باپ کا سپہ سالار تھا ، شکست کھا کر بھاگنا پڑا ۔ بھاگ کر یہ سلطنت روم میں جا پہنچا اور خود کو وہاں کے قیصر ماریس کی پناہ میں دے دیا ۔ بعد میں خسرو نے قیصر روم کی فوجوں کی مدد سے بہرام کو شکست دی اور تخت پر متمکن ہوا ، لیکن موبد (مذہبی علما) اب اس سے خوش نہ تھے کیوں کہ عیسائی مملکت میں رہنے کے سبب وہ ہر قسم کے عیسائی توہمات کی طرف مائل ہو گیا تھا اور ایک عیسائی بیوی شیریں (یہ وہی شیریں ہے جسے ہمارے شعرا نے فرہاد کی محبوبہ کہا ہے) جو اس کی چہیتی بیوی تھی ، اس قسم کے عقاید میں اس کی موید تھی ۔ خسرو نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے اپنے بعض امرا پر عتاب کیا ۔ ایک کو قتل کروا دیا ، دوسرے نے بغاوت کر دی ۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی مغلوب ہوا ۔ ماریس کے مرنے کے بعد اس نے روم پر حملہ کر دیا اور کچھ علاقوں کو زیر نگیں لے آیا ۔ روم سے جو آخری لڑائی اس نے لڑی اس میں اس نے راہ فرار اختیار کی ۔ لیکن چوں کہ اس کا سلوک عوام و خاص سے اچھا نہ تھا ، اس لیے اسے ٦٢٨ء میں قتل کر دیا گیا ۔ طبری اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''اقبال مندی نے اسے متکبر اور خود پسند بنا دیا ۔ وہ تباہ کن حرص میں مبتلا ہو گیا اور لوگوں کے مال و جائداد پر حسد کرتا تھا ۔ اس نے خراج وغیرہ وصول کرنے کے لیے ایک موذی شخص کو مقرر کر رکھا تھا جو لوگوں کو سخت سزائیں دیتا ۔ خراج نہ دینے پر جبر و تعدی کے ساتھ ان کا مال و اسباب چھین لیتا تھا ۔ خسرو لوگوں کو ذلیل سمجھتا تھا ۔ اس کی سیاہ دلی اور ناخدا ترسی اس درجہ تھی کہ اس نے اپنے محافظ کو جیل خانوں کے تمام قیدی جو تعداد میں

۳٦ هزار تھے،قتل کرنے کا حکم دے دیا ۔ لیکن وہ ٹال مٹول کرتا رہا۔'' (ایران بعہد ساسانیاں صفحہ ۵۹۸ ببعد ، خلاصہ تاریخ ایران صفحہ ۴۸ و ۴۹ ، تاریخ ساسانیاں صفحہ ۱۴٦ ببعد)۔

۲۱ ۔ اصل کتاب میں 'انگشت' اضافت کے ساتھ ہے ۔ (ملاحظہ ہو سہ نثر ملا نور الدین ظہوری مطبوعہ نامی پریس کانپور ۱۲۷۵ھ صفحہ ۳۵) اگر اضافت نہ ہو تو ترجمہ اس طرح ہوگا ''جس کے مسرت افزا نغمے انگلی کے سرے سے رنج و غم کے کان ملتے ہیں ۔''

۲۲ ۔ چمن چمن یعنی بہت زیادہ ۔

۲۳ - Table of the taste of his presnce

۲۴ ۔ ایک ساز کا نام ۔

۲۵ ۔ نوازش بہ معنی بجانا ، دوسرے معنی عنایت و مہربانی ۔

۲٦ ۔ مشہور ساز ہے ۔

۲۷ ۔ ایک ساز ۔

۲۸ ۔ جنتروبین ، ترازو کی مانند ایک بین ۔

۲۹ ۔ منڈل ، ایک قسم کا ڈھول ۔

۳۰ ۔ بہرام : یہاں مصرع اس طرح ہے :

''سزد رقصد اگر در گور بہرام''

یہاں گور بہ معنی قبر کے ہیں ، لیکن اس میں رعایت لفظی بھی ہے ۔ یعنی اشارہ ہے بہرام گور کی طرف جوگور خر کا شکار کرنے کے سبب اس لقب سے مشہور ہوا ۔

بہرام گور یا بہرام پنجم یزد گرد (ساسانی بادشاہ) کا لڑکا تھا ۔ اسے اس کے باپ نے بچپن ہی میں حیرہ کے عرب بادشاہ کے ہاں ، جو ساسانی بادشاہ کا باج گزار تھا ، بھیج دیا تھا ۔ اسی سبب سے وہ اپنی چال ڈھال اور حرکات و سکنات میں بجائے ایرانی کے عرب معلوم ہوتا تھا ۔ باپ کی وفات کے بعد (۴۲۰ء) اس کے بھائی شاپور نے تخت پر

قبضہ کرنے کی کوشش کی ، لیکن وہ مروا دیا گیا ۔ اس کے بعد درباریوں نے خسرو کو جو یزدگرد کا رشتہ دار تھا ، تخت پر بٹھا دیا ۔ وہ بھی بہرام کے مقابلے میں زیادہ عرصہ تخت پر نہ بیٹھ سکا ۔ بہرام کو عرب بادشاہ کی حمایت حاصل تھی ۔ کہتے ہیں کہ یہ طے پایا کہ شاہی تاج کو دو شیروں کے درمیان رکھا جائے ، جو لے جائے بادشاہت اس کی ہوگی ۔ چناں چہ بہرام کام یاب ہو گیا اور اسے تخت مل گیا ۔

بہرام نے تخت نشین ہونے کے بعد سفید ہونوں کو جو تمدن ایران اور دنیا کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ تھے ، مغلوب کیا اور ان کے بادشاہ کے (جو مارا گیا تھا) تاج کو آذر بائیجان کے ایک آتش کدہ کی زینت بنا دیا ۔ پھر اس نے رومیوں سے جنگ کی ۔ ۴۲۲ء میں ان کے ساتھ صد سالہ صلح کا پیمان باندھا ۔

بہرام ایک تنو مند اور شہ زور آدمی تھا اور ہر شخص کو زندگی کا لطف اٹھانے کی ترغیب دیتا تھا ۔ وہ بہت سی زبانوں میں گفتگو کر سکتا تھا ۔ اسے موسیقی سے بے حد شغف تھا اور اس نے دربار میں موسیقی دانوں اور گویوں کو بڑے عہدے دے رکھے تھے ۔ اس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ یہ گور خر کا بہت شکار کیا کرتا تھا ۔ اسی لیے اسے بہرام گور کہتے ہیں ۔ لیکن کرسٹن سین کے مطابق وہ اپنی سر کش اور تیز طبیعت کی بدولت 'گور' کے لقب سے ملقب تھا ۔
اس نے ۴۳۸ء میں شکار کے دوران ایک دلدل میں پھنس کر جان دی ۔ (ایران بعہد ساسانیاں ، صفحہ ۳۵۹ ببعد ۔ خلاصۂ تاریخ ایران ، صفحہ ۴۰-۴۱)

۳۱ ۔ بہ معنی ارادہ ، لے ، نغمہ وغیرہ ۔

۳۲ ۔ خوبی و لطافت سے مملو عقل ۔

۳۳ ۔ کور سواد ، جن کی آنکھوں کی سیاہی ڈھل گئی ہو ۔ یہاں بہ معنی علم کے اندھے ۔ دوسرا ترجمہ اس فقرے کا یہ ہوگا کہ اس کا خط دیکھنے سے نہ صرف ظاہری آنکھ ، بلکہ چشم دل بھی روشن ہو جاتی ہے ۔

۳۴ - مراد چہرے کا سبزہ -

۳۵ - مرغولہ مو ، گھونگریالے بال والے - دوسرے معنی گویوں کی ایک خاص آواز جسے گٹکری کہتے ہیں -

۳٦ - شاہی فرمان -

۳۷ - ستارہ عطارد ، اسے دبیر فلک بھی کہتے ہیں -

۳۸ - اسے مطربۂ فلک اور رقاصۂ فلک بھی کہتے ہیں - اس کے متعلق مشرقی ادبی روایت یہ ہے کہ یہ زمین پر اتری تھی - ہاروت و ماروت دو فرشتوں نے اس کی محبت میں دنیا تیاگ دی اور اس کی یہ سزا پائی کہ ایک کنوئیں میں الٹے لٹک رہے ہیں اور ساری دنیا کا دھواں ان کے نتھنوں میں جاتا ہے - زہرہ کو پھر آسمان پر بلا کر سیارہ بنا دیا گیا - رقص و سرود ، عشق و محبت اور ناز و نیاز کے چونچلے اسی دیوی سے منسوب ہیں - فارسی میں اسے ناہید کہتے ہیں - اور اس کی اصل شکل اناھیتہ یا اناھیتا ہے جس کے معنی پلید اور ناپاک کے ہیں - اس کے دیگر نام یہ ہیں : وینس ، استرتی البستر ، افرودیتی ، زائیدۂ کف دریا وغیرہ - پہلے یہ دھرتی ماتا کی علامت تھی - زرخیز ، ثمر آور اور حیات بخش - پھر تولید و تناسل اور عشق و محبت کی دیوی ہو گئی - کیوپڈ نے اس کے احکام کے مطابق انسانوں کو اس جذبۂ پراسرار سے آگاہ کیا ہے جس کے مختلف نام ہیں -

(بہ حوالہ تلمیحات اقبال ، صفحہ ۱۳۹ ، ۲۱۴)

۳۹ - موسیقی کا ایک مقام ، راگ -

۴۰ - طاقت -

۴۱ - اس فقرے میں ایک لفظ 'منتسخ' آیا ہے جس کے معنی غیاث اللغات میں 'نسخہ گیرندہ' 'نسخہ خوانندہ' وغیرہ ہے - اس کے بعد مؤلف کہتا ہے کہ بعض نے اس کے معنی 'رد کردہ شدہ' کے بھی لکھے ہیں (یہ اس صورت میں جب 'س' پر زبر ہو) - لیکن 'پرشین لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ' کے مصنف نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے

"His writing cancels the face of the sun" (ملاحظہ ہو صفحہ ۳۳۵) - اگرچہ 'مہر' کے معنی محبت کے علاوہ سورج کے بھی ہیں، لیکن اس عاجز کو اپنا ترجمہ اصل کے زیادہ نزدیک معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ تحریر کے ساتھ نسخے (کسی کتاب کا) کا زیادہ تعلق ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۴۲ - حلقہ غلامی کی نشانی ہے۔

۴۳ - یا اس کی تعظیم کے سبب سورج روشن ہے۔

۴۴ - جو نقاشی و مصوری کا گھر ہے۔

۴۵ - وہ چیز جو دلہن کا منہ دیکھنے پر اسے دی جائے۔

۴۶ - مانی، ایک مشہور ایرانی مصور و نقاش اور مذہب مانیت کا بانی - یہ ایرانی نسل اور عالی خاندان سے تھا۔ روایت کے مطابق اس کی ماں اشکانی خاندان سے تھی اور جب مانی کی پیدائش ہوئی تو اس وقت یہ خاندان ہنوز سلطنت ایران پر حکومت کر رہا تھا۔ یہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں مقام میسین (بابل) کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا۔ اس نے بڑے ہو کر زمانے کے بڑے بڑے مذاہب سے گہری واقفیت کی۔ بعد ازاں اپنے مغتسلہ عقائد کو ترک کر دیا۔ اسے متعدد دفعہ کشف و الہام ہوا جس میں ایک فرشتے 'توم' نے اس کو حقائق ربانی سے آگاہ کیا۔ باآخر اس نے اپنے مذہب کی تعلیم دینی شروع کر دی اور فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیا، جس کے آنے کی خبر حضرت عیسیٰ نے دی تھی۔ اس نے اپنا سب سے پہلا وعظ شاپور اول کی تاج پوشی کے دن بہ تاریخ یکم نیسان بروز اتوار ۲۴۲ء کو کیا۔ اس نے خود کو خاتم النبیین کہا اور یہ دعویٰ کیا کہ ''میں سابقہ مذاہب کے اکمال کے لیے آیا ہوں۔'' اس نے متعدد کتابیں اور رسائل چھوڑے ہیں، جن میں اس کی مذہبی تعلیم کے اصول درج تھے۔ ہمارے مسلمان مصنفین نے اس کے متعلق کئی افسانہ آمیز باتیں لکھی ہیں، جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خطاطی اور مصوری میں بے حد ماہر تھا اور یہ کہ اس نے ایک کتاب بنائی جس میں ہر قسم کی تصویریں تھیں۔ اس کا نام

ارژنگ مانی تھا - مانی کو ۲۷۶ء میں بہرام اول کے زمانے میں بہ جرم الحاد سزا دی گئی اور قید خانے میں اسے وہ وہ عذاب دیے گئے کہ وہ جان بحق ہو گیا - بعض کے نزدیک اسے سولی پر چڑھایا گیا یا زندہ کھال کھینچی گئی اور سر کاٹ کر شہر کے دروازے پر لٹکا دیا گیا۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایران بہ عہد ساسانیاں)

۴۷ - بہ معنی چرچا ، دوسرے معنی نمک کے ہیں۔

۴۸ - کھول کر نہ کہنا -

۴۹ - یعنی اس میں ہزاروں موضوع پوشیدہ ہیں -

۵۰ - دو ستارے -

۵۱ - یہ بھی ایک ستارے کا نام ہے -

۵۲ - یعنی یہ شرف صرف میرے ممدوح کو حاصل ہے کہ وہ صاحب حشمت بھی ہے اور صاحب سخن بھی -

۵۳ - متن میں 'بجام شوق' ہے - اس لیے یہ ترجمہ کیا گیا ہے - لیکن 'پرشین لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ' کے مؤلف نے 'شوق' کے لیے 'fluency' کا لفظ استعمال کیا ہے -

۵۴ - دوسرا ترجمہ یہ ہوگا ''جو ان شعروں میں کہ ان پر موتی نثار ہوں........الخ''

۵۵ - بادشاہ دکن کے سبب دنیا مسرت سے مالا مال ہو گئی ہے - غم کی گرد اس کے نغمے کے پانی سے بیٹھ گئی ہے - موسیقار اس کے پرانے شاگرد ہیں - جو نیا نیا اس کا شاگرد بنا ہے اس کا طرز بھی استادانہ ہے - (دوسرے مصرعے میں خاک ، آب ، باد میں رعایت لفظی بھی ہے) -

۵۶ - نورس (تازہ پکا ہوا پھل) -

۵۷ - تازہ وارد -

۵۸ - ایک قسم کی گھاس جسے زلف سے بھی تشبیہ دیتے ہیں -

۵۹ - سازندوں کی اصطلاح میں گرمی ساز اور سازوں کو آگ سے گرم کرنا ۔

٦٠ - دوسرے مصرعے میں صرف 'خلیل' آیا ہے اور یہ اشارہ ہے حضرت ابراہیم کی طرف جن کا لقب 'خلیل اللہ' اور جنھیں نمرود کے حکم سے آگ میں ڈالا گیا تھا ، لیکن یہ آگ حکم خداوندی سے گلزار بن گئی تھی ۔ اس شعر میں شاعر نے ایہام سے کام لیا ہے ، کیوں کہ اس کے ممدوح کا نام بھی ابراہیم ہے ۔

٦١ - آگ ۔

٦٢ - انار کے پھول ۔

٦٣ - عادل شاہ کی رعایت سے ۔

٦٤ - نفس بہ معنی دم ، پھونک ۔

٦٥ - راگ ۔

٦٦ - موسیقی کی ایک اصطلاح بہ معنی راگ وغیرہ ۔

٦٧ - یہ لفظ ذو معنی ہے ۔ ایک معنی مجموعۂ اشعار کے ہیں اور دوسرے معنی عدالت کے ۔

٦٨ - جملہ : 'تمام' ، دوسرے معنی 'فقرہ' کے ہیں ۔

٦٩ - ہم پشت : ایک دوسرے کے پیچھے ، مدد گار ۔

٧٠ - اعتراض نہ کر سکے ۔

٧١ - ادائے سخن کو صحیح جگہ پر لانے کے سبب ۔

٧٢ جنھوں نے کبھی غلطی نہ کی ہو ۔

٧٣ - کشادہ ہونا ، کشادگی ۔

٧٤ - یہاں لفظ قیر آیا ہے ۔ یہ ایک سیاہ روغن ہوتا ہے جسے لوگ رال بھی کہتے ہیں ۔ ایک قسم کی سریش ۔

٧٥ - سفید ہوتا ہے ۔

٧٦ - ایک کڑوا پھل ۔

۷۷ - ظل اللہ ، بادشاہ کو خدا کا سایہ کہتے ھیں ۔

۷۸ - نُقل ، وہ چیز جو شراب پینے کے بعد منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کھاتے ھیں ۔

۷۹ - عقول ، عقل کی جمع ۔ فرشتوں کو عقول کہتے ھیں ۔ یہاں عقل کی جمع کے طور پر ھی یہ لفظ استعمال ھوا ھے ۔

۸۰ - انداز ، طرز ادا ۔

۸۱ - آگاھی ، غیر محسوس اشیا کو دریافت کرنا ۔

۸۲ - نازک و لطیف ۔

۸۳ - اھتزاز ، ھلنا ۔

۸۴ - مطلب یہ کہ تاروں کو ذرا چھیڑ کر ھی وہ بڑے بڑے نغمے پیدا کر دیتا ھے ۔

۸۵ - عظیم کے معنوں میں ۔ کوتاہ کی رعایت سے بلند کا لفظ استعمال کیا ھے ۔

۸۶ - یعنی لوگوں کے دل اوھام کا شکار ھیں ۔

۸۷ - نوروز ، یہ دن یا تہوار ایران میں قبل از اسلام بھی منایا جاتا رھا ھے ۔ چناں چہ ساسانی دور میں (جس کے دوران اسلام کا ظہور ھوا) سال کے تہواروں میں سب سے زیادہ مقبول یہی تہوار تھا ۔ اس روز تمام بادشاہ اپنی اپنی رعیت کو خوش کرتے تھے ۔ اس دن وصول شدہ مالیات کو بادشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا تھا ۔ صوبوں کے نئے گورنر مقرر کیے جاتے تھے ۔ نئے سکے مضروب ھوتے تھے اور آتش کدوں کو پاک کیا جاتا تھا ۔ یہ جشن چھ دن تک رھتا ۔ ان ایام میں شاھان ساسانی باضابطہ دربار کرتے جس میں امرا اور خاندان شاھی کے افراد ایک مقررہ ترتیب کے ساتھ باریاب ھوتے تھے اور انھیں انعامات ملتے تھے ۔ چھٹے دن بادشاہ کا ذاتی جشن ھوتا تھا جس میں صرف اس کے مقربین شریک ھوتے ۔ در اصل اس جشن کی جس قدر

مقبول عام رسوم تھیں ، وہ خاص طور پر پہلے اور آخری دن ادا کی جاتی تھیں - پہلے دن لوگ بہت سویرے اٹھ کر نہروں اور ندیوں پر جاتے ، نہاتے اور ایک دوسروں پر پانی چھڑکتے تھے - آپس میں ایک دوسرے کو مٹھائیوں کے تحفے دیتے تھے - ہر شخص صبح سویرے بیدار ہوتے ہی کلام کرنے سے بیشتر شکر کھاتا تھا یا تین مرتبہ شہد چاٹتا تھا - بیماریوں اور مصیبتوں سے محفوظ رهنے کے لیے بدن پر تیل کی مالش کی جاتی اور موم کے تین ٹکڑوں کی دھونی لی جاتی تھی - جشن نوروز عہد اسلامی میں بھی اعتدال ربیعی کے دن منایا جاتا رہا ، لیکن تقویم عربی میں جو چاند کے حساب سے چلتی ہے ، اس کی تاریخ ہر سال بدلتی رهتی تھی - اب چوں کہ ایران میں کچھ مدت سے دوبارہ تقویم شمسی کا رواج ہو گیا ہے اس لیے مقررہ موقع پر ہی یہ جشن منایا جاتا ہے - یعنی اب ہر سال نوروز ہی سے شروع ہوتا ہے - قدیم زمانہ کے برعکس آج کل جشن نوروز تیرہ دن تک رهتا ہے اور پہلے اور آخری دن زیادہ خوشی منائی جاتی ہے - تیرھواں دن اختتام جشن کا دن ہے - اس دن کو 'سیزدہ بدر' کہتے ہیں - یعنی اس روز تمام ایرانی اپنے گھروں سے باہر نکل جاتے ہیں اور سیرگاھوں یا دیگر مقامات پر یہ دن گزارتے ہیں -

اس برصغیر پر چوں کہ ایرانی اثرات بہت زیادہ تھے اس لیے یہاں کے بادشاہ بھی ایسے جشنوں میں ایرانیوں کی پوری پوری نقل کرتے تھے - چناں چہ جہاں شمالی ہندوستان میں مغلیہ شہنشاہ ، کہ خود جن کا تعلق ایران سے تھا ، یہ جشن بڑے طمطراق سے مناتے تھے وہاں جنوبی ہند کے فرماں روا بھی اس میں پیش پیش تھے - (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ایران بعہد ساسانیاں از کرسٹن سن - سخندان پارس از آزاد)

۸۸ - لکھنے والا ، سجانے والا یعنی خدا -

۸۹ - معنیٔ معروف ، دوسرے معنی 'سبزۂ معشوق' -

۹۰ - ریحان ، خط کی ایک قسم - ناز بو ، گھاس کی ایک قسم -

۹۱ - سیاہ رنگ کی خوشبو - یہاں بہ معنی سیاہ بال ، زلفیں -

۹۲ - ایک سفید پھول ، چہرہ -

۹۳ - بچانے والا ، بخشنے والا -

۹۴ - بچانا ، مہربانی -

۹۵ - یعنی اس کی مدح سے کماحقہ عہدہ برآ نہیں ہو سکتا -

۹۶ - موسیقی کی ایک اصطلاح -

حکیم ابوالفتح گیلانی (صفحہ ۳۷۳)

۱ - میر شریف آملی، جہانگیر اس کے بارے میں لکھتا ہے : یہ شخص بہت پاکباز اور نیک مزاج ہے - مروجہ علوم و فنون سے بے بہرہ ہونے کے باوجود اکثر اوقات بلند اور عارفانہ باتیں کرتا ہے - فقر و درویشی کی حالت میں بہت سے مقامات کی سیر کرتا رہا ہے اور بلند پایہ بزرگان دین کی صحبت سے فیض یاب ہوتا رہا ہے...... والد بزرگوار کے زمانہ میں فقر و درویشی کا لباس اتار کر دربار کے امیروں اور سرداروں کے زمرے میں شامل ہوگیا - اس کی گفتگو بہت موثر ہوتی ہے - عربی زبان سے ناواقف ہونے کے باوجود اس کی باتیں با محاوہ اور فصاحت و بلاغت سے بھرپور ہوتی ہیں - اس کی تحریر بھی چاشنی سے خالی نہیں ہوتی (توزک جہانگیری اردو صفحہ ۷۶) - لیکن بدایونی نے اس پر بہت کیچڑ اچھالا ہے - ۹۸۴ھ کے واقعات میں لکھتا ہے : انھی دنوں شریف آملی دیبال پور کی منزل میں آ کر باریاب ہوا (اکبر نے ۲۳ویں سال جلوس کا جشن نو روز مالوہ کے قریب موضع دیبال پور میں منایا تھا اور یہ واقعہ اس کے فوراً بعد کا ہے) - یہ مردود و نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تھا - بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا - انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کرکے الحاد و بے دینی کو اپنا شعار بنایا - کچھ عرصہ تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے ہوتے

مولانا محمد زاهد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا رہتا تھا۔ تنگ آ کر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا......بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا۔ وہاں کے لوگ بھی جب اس کی خباثتوں سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس کا قصہ ہی پاک کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کہ گدھے پر سوار کرکے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کی تشہیر کرا دی......وہاں سے پھر یہ مالوہ پہنچا اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا۔ نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا........اس نے خود کو مجدد (دسویں صدی کا) کہلوایا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا۔ اکبر کو خبر ہوئی تو اس نے اسے ایک رات اپنی مجلس میں بلا بھیجا اور اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل ناگوار ہیئت کذائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے ہوئے...... کھڑا رہا......کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کرکے اونٹ کی طرح دو زانو بیٹھ گیا۔ اکبر اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑا ہونے کی اجازت نہ تھی۔ ......خدا کی شان، دیکھو کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جمایا کہ اب وہ ہزاری منصب دار بنا بیٹھا ہے اور بنگالہ میں 'مذہب حق' کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے۔ مریدوں اور معتقدوں کے سامنے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ (منتخب التواریخ اردو صفحہ ۳۶۰، صفحہ ۳۶۱)۔

۲۔ ملا حیاتی، عراق و خراسان میں قسمت آزمائی کرنے کے بعد ہندوستان آیا تو پہلے حکیم ابوالفتح گیلانی کے دربار سے منسلک ہوا اور اسی کی وساطت سے اکبر کے دربار میں پہنچا۔ اکبر نے اس کی بڑی

پذیرائی کی اور منصب ، علوفہ اور جاگیر عطا کی ۔ بہ قول صاحب مآثر رحیمی اسے اکبر کی ملازمت میں اس قدر قرب و منزلت حاصل ہوئی کہ اس سے زیادہ متصور ھی نہ تھی ۔ جب عبد الرحیم خان خاناں مہم دکن پر روانہ ھوا ھے تو یہ بھی اس کے ساتھ گیا ۔ خان خاناں نے اس کی بڑی قدر دانی کی اور اسی کی سفارش پر اکبر نے اسے (حیاتی کو) منصب ہزاری بخشا ۔ خان خاناں بزم اور رزم دونوں میں اسے ساتھ رکھتا تھا ۔ حیاتی نے اس کے شکریے میں اس کی شان میں لمبے لمبے قصیدے کہے ۔ حیاتی اکبر کے بعد جہانگیر کے دربار سے بھی متعلق رھا ۔ مآثر رحیمی کا مؤلف اس کی علمی اور شاعرانہ صلاحیت پھر ذاتی اوصاف کا بہت مداح ھے ۔ حیاتی آخر عمر تک جہانگیر کے جود و کرم سے فیض یاب ہوتا رھا ۔ جہانگیر اسے ھمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتا ۔ بہت پُرگو شاعر تھا ۔ سات ہزار اشعار اس سے منسوب کیے جاتے ھیں ۔ اس نے قصۂ سلیمان و بلقیس لکھ کر جہانگیر کی خدمت میں پیش کیا ۔ جہانگیر نے خوش ھو کر اس کو سونے میں تلوا کر سونا انعام دیا ۔ ملا بدایونی اس کے متعلق لکھتے ھیں کہ بڑا درد مند اور مخلص دوست ھے ۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف و توصیف سے بالا ھے ۔ .....اس کے کلام میں اکابر شعرا کا رنگ جھلکتا ھے ۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ لکھا پڑھا نہیں لیکن ذکاوت و ذھانت فطری ھے ۔ (منتخب التواریخ اردو صفحہ ۶۸۵ ، بزم تیموریہ صفحہ ۱۰۸ ، ۱۵۶) ۔

۳ ۔ عرفی ۔ محمد جمال الدین ، تخلص عرفی ۔ باپ کا نام زین الدین ملوی ۔ اس کا باپ چوں کہ شیراز میں ایک معزز عھدے پر فائز تھا اور وھاں ان محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذھبی صیغے سے تعلق نہیں رکھتیں ، عرف کہتے ھیں ، اس لیے عرفی نے اسی مناسبت سے یہ تخلص رکھا - شیراز ھی میں اس کی ولادت ھوئی ۔ تعلیم و تربیت بھی وھیں ھوئی ۔ ایران میں بھی اگرچہ اس کی قدردانی کا کچھ کم سامان نہ تھا تاھم ھندوستان میں چوں کہ اس سے بھی زیادہ توقع تھی اس لیے وہ ھندوستان چلا آیا ۔ یہاں آ کر سب سے پہلے فیضی سے ملا ۔ فیضی نے بڑی قدردانی کی ۔ لیکن عرفی چوں کہ کچھ نخوت پرست تھا اس لیے

صحبت برآر نہ ہو سکی اور وہاں سے اسے قطع تعلق کرنا پڑا ۔ اس کے بعد حکیم ابوالفتح گیلانی سے منسلک ہوا ۔ حکیم مذکور بڑا نکتہ شناس اور نقاد تھا ۔ عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی ۔ حکیم ابوالفتح ۹۹۷ھ میں فوت ہوگیا جس کے سبب یہ عبدالرحیم خان خاناں کے درباریوں میں داخل ہوا ۔ یہ خود شعر گوئی اور ہنر پروری میں بے نظیر تھا ۔ چناں چہ یہاں بھی عرفی نے خاصی ترقی کی ۔ یہاں نظیری کے علاوہ اور بھی کئی ایک شعرا تھے جس کے سبب پردے پردے میں چوٹیں ہوتی تھیں ۔ عرفی نے خان خاناں اور پھر شاہی خاندان کے سوا اور کسی کے آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا ۔ اس نے ۹۹۹ھ میں بہ عمر ۳۶ برس لاہور میں وفات پائی ۔ ابو الفضل نے اس کے مرنے پر لکھا کہ اگر وہ خود نگر نہ ہوتا تو زندگی شائستگی سے گزارتا ۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی متقدمین اور متأخرین تمام اساتذۂ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس کی تاریخ وفات یہ ہوئی 'گفت عرفی جوانہ مرگ شدی' اور دوسری تاریخ ہے 'دشمن خدا'۔ اگرچہ عرفی نے قصیدے کی صنف کو اپنے مقام سے کم تر سمجھا اور مدح بھی مجبوری کے عالم میں کی اور وہ بھی اس طرح کہ ممدوح کے ساتھ اپنی تعریف بھی کر جاتا تھا ، لیکن اس کی شہرت قصیدے ہی کے باعث ہے ۔ اس کے دیوان کے بارے میں ملا بدایونی کا کہنا ہے کہ ہر گلی کوچے میں اس کا دیوان بکتا ہے اور عراق اور ہندوستانی سب اس کا دیوان خریدتے ہیں ۔ (منتخب......صفحہ ۵۳۰ ، ۷۲۲ ، شعرالعجم جلد ۳ مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ۷۳ ببعد ، شفق صفحہ ۳۷۶ ، براؤن جلد ۴ مطبوعہ کیمرج ۱۹۳۰ صفحہ ۲۴۱ ، تلمیحات اقبال صفحہ ۱۳۹) ۔

۴ ۔ ایک قسم کی معجون جس میں افیون بھی ڈالی جاتی ہے ۔

۵ ۔ ایک خوش مزہ ، خوشبودار اور شیریں مرکب دوا جو مقوی دل و جگر ہوتی ہے ۔

۶ ۔ ہم نے تیری یاد میں بہت ہی خون جگر پیا ہے ، تو بھی جب دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر مے نوشی کرے تو اس وقت ہمیں بھی یاد کر لینا ۔ اسی سے ملتا جلتا شعر حافظ کا ہے ۔

چو با حبیب نشینی و بادہ پیمائی بسیاد آر محبان بساد پیما را

۷ ۔ احدی وہ منصب دار ہوتا تھا جس کے تحت کوئی شاہی پیادہ اور سوار نہیں ہوتا تھا ۔ (توزک جہانگیری اردو حاشیہ صفحہ ۴۲) ۔

نورالدین جہانگیر (صفحہ ۳۷۵)

۱ ۔ بہزاد ، ایران کا مشہور نقاش ۔ اس کا نام کمال الدین تھا ۔ ۸۴۴ھ میں بہ مقام ہرات پیدا ہوا ۔ اٹھانوے برس کی عمر پا کر ۹۴۲ھ میں وفات پائی ۔ تاریخ وفات 'خاک قبر بہزاد' ہے ۔ سلطان حسین بایقرا (تیموری فرمانروا) کے دربار سے منسلک تھا ۔ ترکی ماخذ کے مطابق اس کا استاد سید احمد تبریزی تھا ۔ بایقرا کے زمانے میں ایرانی نقاشی نے اسی نقاش کی بدولت عروج پایا ۔ جب صفوی بر سر اقتدار آئے تو اس وقت یہ تبریز میں اقامت گزیں ہو گیا ۔ روایت کے مطابق شاہ اسمٰعیل نے اسے اپنے کتب خانے کا مہتمم بنا دیا ۔ بہ قول ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی ان دنوں مصوری کے دو مشہور دبستان قائم تھے : عراق اور وسط ایشیائی ۔ بہزاد نے دونو دبستانوں کی روایت کے تال میل سے خالص ایرانی مصوری کی داغ بیل ڈالی ۔ مستشرقین کے مطابق بہزاد سے نقاشی کے جو نمونے منسوب ہیں ، ان کی نسبت کی صحت سخت مشکوک ہے ۔ وہ مدعی ہیں کہ بہزاد کے معاصرین میں قاسم علی اور آقا میرک ایسے اونچے پائے کے فنکار تھے کہ ان کی تخلیقات اور بہزاد کی تخلیقات میں امتیاز قائم کرنا دشوار ہے ۔ بہ قول ڈاکٹر ولسن (جنھوں نے ایران کے فنون لطیفہ کی تاریخ لکھی ہے) بہزاد خطوط کے معاملے میں نہایت دقت نظر سے کام لیتا تھا ۔ چہرہ ایسا بناتا تھا کہ جس میں صاحب تصویر کی انفرادیت ٹپکتی تھی ۔ تصویر کے تمام نقش زندہ اور متحرک معلوم ہوتے اور علامات و اشارات کا فنی مفہوم بالکل واضح ہوتا تھا ۔ سورج کی شعاعوں کی تابانی دکھانے میں ، پھولوں اور درختوں کی لطافت کے اظہار میں اور عموماً مناظر فطری کے حسن کے ابلاغ میں وہ بے نظیر زماں تھا ۔ رنگ آمیزی ایسی اعلی درجے کی تھی کہ مختلف سلسلوں کے رنگ کسی نے آج تک اس لطافت سے استعمال

نہیں کیے - سرمئی ، سبز ، فیروزی ، زیتونی ، زرد اور قہوہ‌ای رنگوں کے استعمال میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی - سونے اور چاندی کا کام بھی بہت اچھا کرتا تھا - اس سے پہلے مصوری میکانکی فارمولوں کی پابند تھی - بہزاد نے سب سے پہلے تصاویر کے افراد کی انفرادیت کا اظہار کیا - چہروں پر جذبات و تأثرات کی لہریں دکھائیں ، رنگ آمیزی کے ذریعے جذبات و احساسات کا اظہار کیا اور خطوط ایسے نفیس لگائے کہ چینی مصوری کے شاہکار ماند پڑ گئے -

بہزاد کی مصوری کی ایک شاخ ہندوستان میں پھلی پھولی کہ مغل فرماں رواؤں نے ایرانی مصوروں کو اپنے دربار میں آنے کی دعوت دی اور اس طرح ہندوستانی فن اور ایرانی روایت کے امتزاج سے ایک نیا دبستان قائم ہوا - بابر بہزاد کی تصاویر پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گو وہ ریش دار چہرے خوب کھینچتا تھا ، لیکن بے ریش لڑکوں اور لڑکیوں کی تصاویر میں اسے ایسی کام یابی نہیں ہوئی - ان میں وہ ٹھوڑیوں کو غیر متناسب حد تک بڑا کر دیتا ہے - (تاریخ ادبیات ایران از براؤن اردو ترجمہ از داؤد رہبر، جلد سوم صفحہ ۶۵۳ ، میراث ایران از آربری اردو ترجمہ سید عابد علی عابد تعلیقات صفحہ ۶۵۳ ببعد ، اردو انسائیکلوپیڈیا صفحہ ۱۴۳) -

۲ - مجدد الف ثانی ، جن کا ذکر کسی دوسرے حاشیے میں گزر چکا ہے - جیسا کہ اسی حاشیے میں ہے جہانگیر بعد میں آپ کا معتقد ہو گیا تھا -

۳ - زندقہ ، مجازاً بے دینی کے معنوں میں ہے - یہ لفظ زندیق یا زندیک سے ہے جس کے معنی ہیں زند کا پیرو - زند پارسی پیغمبر زردشت کی کتاب مقدس کی شرح و تفسیر ہے - زندیق جس کی جمع زنادقہ ہے ، کا اطلاق در اصل مانی (جس کا ذکر کسی گزشتہ حاشیے میں کیا جا چکا ہے) کے پیرووں پر ہوتا تھا - بعد میں اسلامی ممالک میں ان لوگوں کو زندیق کہا جانے لگا جو ملحد تھے یا دوسرے گم راہ فرقوں مثلاً اسماعیلیہ ، باطنیہ وغیرہ کے سرو کار تھے - خلافت عباسیہ میں

(۸ویں صدی عیسوی تک) مانوی تبلیغ میں مصروف رہے - لیکن ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ اسلام کے لباس میں مانویت کا پرچار کرتے تھے۔ ان زنادقہ کے وهی اصول تھے جو پیروان مانی کے تھے ، یعنی یہ لوگ بھی ثنویت کے قائل تھے - یہ لوگ جملہ یاران رسول صلعم کو برا جانتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کو برے الفاظ سے یاد کرتے - نماز ، روزہ ، حج ، زکواۃ کے منکر تھے ، اور خدا اور اس کے رسول صلعم کو برا بھلا کہتے وغیرہ - تقریباً تمام باطنی فرقے زندیقی تھے - بہ قول طبری خلیفہ المہدی (۷۸۲ع - ۷۸۰ع) اور خلیفہ الہادی (۷۸۷ع - ۷۸۶ع) کے عہد میں زندیقیوں (مانویوں) کو بہت سزائیں دی جاتی تھیں - ہارون الرشید کے عہد خلافت میں ایک قاضی خاص ، جسے 'صاحب الزنادقہ' کہتے تھے ، اس کام پر مامور تھا کہ وہ ان کا پتا چلائے اور انھیں سزائیں دے - زنادقہ نہ صرف ایرانی تھے بلکہ بعض خالص عرب بھی ان میں شمار ہوتے تھے - (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو سیاست نامہ از نظام الملک طوسی ، تاریخ ادبیات ایران از براؤن جلد اول) -

۴ - ذی النورین یا ذوالنورین (حضرت عثمان رضؓ بن عفان) - چوں کہ رسول صلعم کی دو صاحب زادیاں آپ کے نکاح میں آئیں اس لیے ذوالنورین لقب پڑا - ابو عمر آپ کی کنیت تھی - مسلمان ہونے کے بعد ابو عبداللہ کہلائے - ایک متمول گھرانے کے چشم و چراغ اور تجارت پیشہ تھے - علوم مروجہ سے واقف تھے - بہت سخی ہونے کے سبب عثمان غنی کہلائے - آپ کے والد کا نام عفان تھا - قریش کے خاندان بنو امیہ سے تعلق تھا - حضرت رسول اکرم صلعم کے اعلان نبوت کے وقت ۳۴ برس کے تھے ، اور اسی سال مسلمان ہوئے - چھتیسویں (۳۶) فرد تھے جو دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے - مکہ میں بت پرست اقربا کے مظالم سے تنگ آ کر حبشہ کو ہجرت کر گئے - پانچ سال کے بعد واپس آئے تو پھر مدینہ کی جانب ہجرت کرنا پڑی - آپ کی بیوی رقیہ ہر سفر میں آپ کے ہمراہ رہیں - آپ ۶۴۴ عیسوی میں خلیفہ منتخب ہوئے اور بارہ برس تک حکومت کرکے ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ھ کو (مطابق

۶۵۶ع) بیاسی برس کی عمر میں شہید ہوئے۔ آپ کے خلافت ہاتھ میں لینے کے چھ ماہ بعد ہمدان ، رے ، آذر بائیجان اور مصر میں بغاوت اور شورش پھیل گئی جو فوراً فرو کر دی گئی اور ۲۸ھ میں جزیرہ قبرص فتح ہوا ۔ اس جزیرے پر حملے کے لیے بحری بیڑا لازمی تھا ۔ چناں چہ اسلامی سامان جنگ میں یہ پہلی بحری فوج تھی جو حضرت امیر معاویہ نے تیار کی ۔ حضرت عثمان رض کے زمانے میں ساسانی خاندان کا آخری بادشاہ یزد گرد مارا گیا اور ایران کی پوری مملکت میں اسلامی پرچم لہرانے لگا ۔ بلکہ مکران ، بلخ اور ارمینیا تک حکومت پھیل گئی ۔ ۳۵ھ میں بصرہ کے ایک منافق عبد اللہ بن سبا نے یہ فتنہ اٹھایا کہ خلافت خاندان رسالت کا حق ہے ، اس لیے حضرت عثمان غنی رض کو معزول کر کے حضرت علی رض کو خلیفہ ہونا چاہیے ۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان اس دام فریب میں مبتلا ہو گئے اور ان کی جماعت بڑھتی گئی ۔ حضرت عثمان غنی رض نے باوجود لوگوں کے مشورے کے اپنی نیکی اور رحم دلی کے سبب اس فتنے کو دبانے کے لیے کوئی مؤثر قدم نہ اٹھایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مفسدین نے آپ کے گھر میں گھس کر آپ کو اس وقت شہید کر دیا جب آپ صبح کی نماز کے بعد تلاوت قرآن پاک فرما رہے تھے ۔ حضرت عثمان رض کے عہد میں قرآن کریم کی مصدقہ نقول باہر کے ممالک میں بھیجی گئیں ۔ مسجد نبوی میں حضرت عمر رض نے جو توسیع کی تھی اس میں مزید اضافہ کیا گیا اور وہ اس مرتبہ پتھر اور چونے سے تعمیر ہوئی ۔ آپ مسلمانوں میں پہلے حافظ قرآن تھے اور آپ ہی آں حضرت صلعم کی وحی کی کتابت کیا کرتے تھے ۔ (اردو انسائیکلو پیڈیا مطبوعہ فیروز سنز لاہور صفحہ ۲۶۱ ، خلاصہ تاریخ ایران صفحہ ۵۸) ۔

۵ ۔ حضرت عمر فاروق رض ، آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلعم سے آٹھویں پشت میں جا کر ملتا ہے ۔ آپ کے دادا نفیل بن عبدالعزی تھے جن کے پاس بڑے عالی مرتبہ لوگوں کے مقدمے فیصلے کے لیے پیش ہوتے تھے ۔ آں حضرت صلعم کے جد امجد عبدالمطلب اور حرب بن امیہ میں جب ریاست کے دعوے پر جھگڑا ہوا تو دونوں نے نفیل ہی کا حکم مانا ۔ نفیل نے عبدالمطلب کے حق میں فیصلہ دیا ۔ حضرت عمر رض

کے والد خطاب تھے جن کا شمار قریش کے ممتاز آدمیوں میں ہوتا تھا۔ خطاب نے کئی ایک شادیاں اونچے اونچے گھرانوں میں کی تھیں۔ چناں چہ حضرت عمر کی والدہ جن کا نام غنمۃ تھا ، ہشام ابن المغیرہ کی بیٹی تھیں ، جو بڑے رتبے کے آدمی تھے اور قریش کی فوج کا اہتمام (لڑائی کے موقعے پر) انھی سے متعلق ہوتا تھا۔

حضرت عمر رض مشہور روایت کے مطابق ہجرت نبوی صلعم سے چالیس برس قبل پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت اور بچپن کے حالات بالکل نا معلوم ہیں۔ آپ جب سن رشد کو پہنچے تو آپ کے والد نے اونٹ چرانے کی خدمت آپ کے سپرد کی۔ آپ کے والد آپ سے بڑی بے رحمی سے پیش آتے اور سارا سارا دن آپ سے یہ خدمت لیتے اور جب کبھی آپ تھک کر دم لینا چاہتے تو سزا دیتے۔ جوانی میں آپ نے نسب دانی اور پہلوانی وغیرہ کے فن میں کمال حاصل کیا۔ آپ شاعری کا بھی عمدہ مذاق رکھتے تھے۔ مذکورہ فنون سے فارغ ہو کر آپ نے تجارت اختیار کی اور اس سلسلے میں کئی ایک ملکوں میں گئے۔

آپ ستائیس برس کے تھے کہ آن حضرت صلعم مبعوث ہوئے۔ آپ پہلے اسلام دشمنی میں پیش پیش تھے ، لیکن بعد میں اسلام لے آئے۔ آپ کے اسلام لانے کا واقعہ بہت مشہور ہے۔ آپ کے اسلام لانے کے بعد تاریخ اسلام نے نئی کروٹ لی۔ اس وقت تک اگرچہ ۴۰—۵۰ آدمی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے ، لیکن پھر بھی وہ مذہبی فرائض علانیہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ آپ نے علانیہ اسلام ظاہر کرکے کھلم کھلا فرائض ادا کیے اور کفار کی سخت مخالفت کے باوجود مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کعبہ میں جا کر نماز ادا کی۔ آپ کے اسلام لانے کا واقعہ سنہ نبوی کے چھٹے سال میں ہوا۔ ایران آپ ہی کی خلافت میں فتح ہوا۔ آپ نے حضرت ابو بکر رض کے بعد ۱۳ھ میں عنان خلافت سنبھالی تھی۔ آپ نے بہت سی فتوحات کیں۔ آپ نے دس برس چھ ماہ اور چار دن خلافت کی۔ ۲۶ ذوالحج ۲۳ھ کو ایک پارسی ، فیروز نے آپ کو نماز پڑھتے میں شہید کر دیا۔ آپ کو رسول اللہ صلعم کے پہلو میں دفن

کیا گیا ۔ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الفاروق از شبلی نعمانی ، حضرت ابو بکر صدیق رض و فاروق اعظم رض از ڈاکٹر طه حسین) ۔

۶ ۔ حضرت ابو بکر صدیق رض ، حضرت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کے یار غار اور صحابہ کرام رض میں سب سے پہلے اسلام قبول کرنے والے ، نبی اکرم صلعم کے وصال کے بعد مسلمانوں کے خلیفۂ اول اور اپنے صدق و ایثار کے سبب صدیق کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کی ولادت پر آپ کے والد ابو قحافه نے آپ کا نام عبد الکعبه رکھا ، لیکن قبول اسلام کے بعد آپ نے اس غیر اسلامی نام کو ترک کر کے اپنا نام عبداللہ رکھا ۔ آپ سرداران قریش میں سے اور کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے ۔ آپ نے اپنی تیرہ سال کی مکی زندگی میں ہمیشہ نبی اکرم صلعم کا ساتھ دیا اور جب حضور صلعم نے ہجرت کی تو آپ ہی ان کے رفیق سفر تھے ۔ غار ثور میں تین دن آپ صلعم کی رفاقت کے باعث یار غار کہلائے ۔ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ کتنے ہی مسلمان غلاموں کو ان کے کافر مالکوں سے خرید کر آزاد کیا ۔ ہر موقع پر تن من دھن سے اپنی خدمات پیش کیں ۔ حضور صلعم فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہر ایک کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے مگر ابو بکر صدیق رض کے احسانات کا بدلہ خدا ہی قیامت کے روز دے گا ۔ آپ رض کے ایثار و خلوص کا یہ عالم تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے دنیا و ما فیہا کی کوئی ضرورت نہیں ، میرے لیے خدا اور اس کا رسول صلعم کافی ہیں ۔ حضرت عائشہ رض آں حضرت صلعم کی زوجۂ محبوب ، آپ ہی کی دختر تھیں ۔

نبی اکرم کے وصال پر آپ خلیفہ منتخب ہوئے ۔ اس وقت سارے عرب میں بڑی شورش پھیلی ہوئی تھی ۔ کئی مدعیان نبوت پیدا ہو گئے تھے ۔ بعض نو مسلم قبائل نے زکواۃ دینے سے انکار کر دیا تھا ۔ آپ نے اس شورش کو بڑے حوصلے ، قابلیت اور جرأت ایمانی سے فرو کیا ۔ آپ صرف سوا دو سال منصب خلافت پر متمکن رہے ۔ اس مدت میں جہاں آپ نے سارے عرب میں کامل امن و امان قائم کر دیا ، وہاں

اسلامی افواج کے فاتحانہ قدم عراق سے ایران اور شام تک پہنچ چکے تھے - قرآن کریم آپ ھی کے حکم سے جمع ھوا اور آں حضرت صلعم کی زوجہ حضرت حفصہ رض (جو حضرت عمر رض کی صاحبزادی تھیں) کو سپرد کیا گیا -

جیسا کہ پہلے بیان ھوا ھے آپ نے ۱۱ھ سے ۱۳ھ تک خلافت کی - آپ نے ۲۲ جمادی الثانی ۱۳ھ (مطابق ۲۳ اگست ۶۳۴ع) بروز شنبہ تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی اور رسول اکرم صلعم کے پہلو میں دفن ھوئے - (ھسٹری آف دی سیراسینس صفحہ ۲۶ ، اردو انسائیکلو پیڈیا صفحہ ۶۳ ، خلاصۂ تاریخ ایران مطبوعہ تہران صفحہ ۵۶-۵۷) -

۷ - مقام محبوبیت ، مؤلف سر دلبراں 'رجال اللہ' یعنی اولیاء اللہ کی مختلف اقسام بتاتے ھوئے ایک قسم 'مفرداں' کا ذکر کرتے ھیں - مفرداں کے ذیل میں انھوں نے مقام محبوبیت کی کچھ تشریح کی ھے - لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے مناسب ھوگا کہ مفرداں کے بارے میں مؤلف مذکور کا بیان یہاں دھرایا جائے - مفرداں ، افراد کو کہتے ھیں - جب قطب عالم ترقی کرتا ھے ، تو فرد ھو جاتا ھے - فردانیت میں پہنچ کر وہ تصرفات (تصرفات کی تشریح کسی دوسرے حاشیے میں کر دی گئی ھے) سے کنارا کش ھو جاتا ھے - قطب مدار عرش سے ثریٰ تک متصرف ھوتا ھے اور فرد متحقق ھوتا ھے - تصرف اور تحقق میں بڑا فرق ھے - قطب مدار علی الدوام تجلیٔ صفات میں رھتا ھے ، فرد تجلی ذات میں - قطب مدار خاص ھے اور فرد اخص - فردانیت مقام انبساط و موانست ھے اور یہاں آ کر مراد باقی نہیں رھتی - بعض اولیاء کو تجلی افعالی ھوتی ھے ، بعض کو تجلی اسمائی ، بعض کو تجلی آثاری - بعض مقام صحو میں ھوتے ھیں بعض مقام سکر میں اور بعض دونوں میں - مقامات اولیاء اللہ خارج از حد و حصر ھیں مگر اھلِ فردانیت ان جملہ مقامات سے برتر ھیں - تنزل کی تو ایک حد ھوتی ھے مگر عروج و ترقی کی کوئی حد و انتہا نہیں - افراد جب مزید ترقی کرکے فردانیت میں کامل ھو جاتے ھیں تو محبوبیت کا مرتبہ پاتے ھیں - پھر محبوبیت میں بھی بعض

مقبولان بارگاہ الٰہی ایک خاص امتیازی شان سے نوازے جاتے ھیں - جیسے حضرت غوث الثقلین سید عبدالقادر جیلانی رض اور سلطان المشائخ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاء رحہ..... (سر دلبران از سید محمد ذوقی اجمیر شریف صفحہ ۱۹۹ - ۲۰۰) -

۸ - آپ کا ذکر کسی دوسرے حاشیے میں گزر چکا ھے -

۹ - یعنی اخبار الاخیار فی اسرار الابرار -

محسن فانی صفحہ (۳۷۹)

۱ - بابر ۱۴۸۳ء میں فرغانہ (جو اب چینی ترکستان کا صوبہ ھے) کے مقام پر پیدا ھوا - ماں کی طرف سے سلسلہ نسب چنگیز تک اور والد کی طرف سے تیمور تک پہنچتا ھے - باپ کا نام عمر شیخ مرزا تھا - اس کا نانا یونس خان علم دوست بھی تھا اور عالم بھی - موسیقی اور مصوری سے بھی شغف رکھتا تھا - بابر کا باپ بھی عالم اور علم دوست تھا - گویا شروع ھی سے اس نے ایسے ماحول میں تربیت پائی جہاں علم دوستی کا چرچا تھا - ابتدائی تعلیم بڑے اچھے پیمانے پر ھوئی - اس کے اتالیقوں میں بابا قلی علی اور قاضی عبد اللہ کے نام آتے ھیں - تزک کے مطالعے سے معلوم ھوتا ھے کہ اس کو فارسی ادبیات پر خاصہ عبور تھا - گیارہ برس (بعض کے نزدیک بارہ برس) کی عمر میں بہ تاریخ پنجم ماہ رمضان بروز منگل وار ۸۹۹ھ (۱۴۹۴ء) باپ کی وفات کے بعد، تخت پر بیٹھا - لیکن بہت جلد مخالف امرا نے اسے فرغانہ سے نکال دیا - اس کے بعد اس نے سمرقند وغیرہ کو فتح کیا بھی، لیکن اوزبکوں نے اس کی دال نہ گلنے دی اور کچھ عرصہ اسے ادھر آدھر گھومنا پڑا - آخر یہ بدخشاں اور کابل وغیرہ کی طرف بڑھا اور ۹۱۰ء میں کابل پر قابض ھو گیا - افغانستان کے بہت سے علاقے فتح کرنے کے بعد اس نے ھندوستان کی طرف قدم بڑھائے - چناں چہ ۹۳۰ھ میں لاھور، دیپالپور اور دیگر علاقوں کو فتح کیا - ۹۳۲ھ میں پانی پت کے مقام پر ابراھیم لودھی سے سامنا ھوا اور

فتح پائی (تفصیل کسی دوسرے حاشیے میں ملاحظہ ہو) - اس کے بعد تمام ہندوستان اس کے زیر نگیں آ گیا - بابر ۱۲ ماہ رجب ۹۳۲ھ بروز بدھ دھلی میں داخل ہوا اور تخت پر بیٹھا - پانی پت کے بعد اس نے رانا سانگا وغیرہ کو شکست دے کر راجپوتوں کے خطرے کو ختم کر دیا - زندگی کے آخری تین چار سال اس نے سلطنت کے استحکام میں صرف کیے - ۱۵۳۰ء میں ۲۶ دسمبر (مطابق سوموار ٦ جمادی الاول ۹۳۷ھ) کو بہ عمر سنتالیس برس وفات پائی - مقبرہ کابل میں ہے جسے شاھجہان نے بلخ و بدخشان کی فتح کے بعد ۱۰۵٦ھ میں تعمیر کرایا - اس پر دو برس کا عرصہ اور چالیس ہزار روپیہ صرف ہوا - بابر نے اپنی زندگی کے حالات ترکی زبان میں لکھے ہیں - اس کتاب کا ترجمہ اکبر کے عہد میں عبدالرحیم خان‌خاناں نے فارسی میں کیا - اس کی تزک کا شمار آج بھی ان کتب میں کیا جاتا ہے جن کے مندرجات ہر طرح درست ہیں - بابر شاعر بھی تھا - اس نے ہر طرح سے بھر پور زندگی بسر کی - بزم عیش و نشاط میں ہوتا تھا تو ایسے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی اسے فکر ہی نہیں - میدان جنگ میں لڑائی کی چالیں سوچتا تھا تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ساری عمر فوج کو لڑانے میں گزری ہے - علم دوستی اور ہنر پروری میں تیمور کی اولاد کا سچا وارث تھا - اس نے فنون لطیفہ کی طرف بھی بہت توجہ دی - اسے باغ لگانے کا بہت شوق تھا - (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۲۷ بیعد - مفتاح التواریخ ، صفحہ ۱۴۵ بیعد - این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا ، صفحہ ۴۲٦ - تاریخ ادبیات ایران بہ عہد مغولاں از براؤن اردو ترجمہ صفحہ ۵۴۴ بیعد - تلمیحات اقبال مرتبہ سید عابد علی عابد حصہ فارسی ، صفحہ ۳۲۷ بیعد)

۲ - دولت خاں لودھی ، پنجاب میں ابراہیم لودھی کا بے حد طاقت ور امیر تھا - بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والوں میں ایک یہ بھی تھا (بدایونی کے مطابق دولت خاں کے بیٹے خان خاناں نے ، جو ابراہیم کے رویے سے بھاگ کر کابل چلا گیا تھا ، بابر کو اس حملہ کے لیے آمادہ کیا تھا اور اسے لے کر ہندوستان آیا تھا) - اس کی وجہ

یہ تھی کہ اسلام خاں کی بغاوت کے بعد ابراہیم اپنے امرا سے بدظن ہو گیا تھا اور اس نے اپنے رویے میں بے حد سختی اختیار کر لی جس کے نتیجے میں دولت خاں اور ابراہیم کے چچا عالم خاں نے بابر کو مدعو کیا تھا ۔ لیکن جب بابر نے حملہ کیا تو دولت خاں وغیرہ منحرف ہو گئے ، اور با قاعدہ فوج کے ساتھ پہلے کلانور پر قبضہ کیا ، پھر لاہور کی طرف کوچ کیا ؛ لیکن جب بابر نے خود پیش قدمی کی اور کلانور پر پڑاؤ کرنے کے بعد قلعہ ملوت کے نواح میں پہنچا تو دولت خاں خود لشکر میں پہنچ گیا ۔ لوگوں نے اس کو باندھ کر اس کی گردن میں دو تلواریں ڈال دیں اور بابر کے سامنے اسے دربار عام میں پیش کیا ۔ بابر نے جب یہ دیکھا تو لوگوں کو اس سلوک سے منع کیا اور دولت خاں کو نہایت تعظیم سے بلایا اور اپنے قریب بیٹھنے کو جگہ دی ، لیکن اس کا سارا مال و اسباب لشکریوں میں بانٹ دیا ۔ ملوت پر بابری لشکر نے قبضہ کر لیا اور دولت خاں چند دن کے بعد قید ہی میں انتقال کر گیا ۔

(منتخب التواریخ صفحہ ، ۲۱۷-۲۱۹ ۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری......، صفحہ ۴۲۶-۴۲۷)

۳ ۔ ابراہیم خاں ، یہ وہی ابراہیم لودی ہے جس سے بابر نے پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن جنگ لڑی ۔ باپ کی وفات کے بعد ۲۱ نومبر ۱۵۱۷ء کو تخت آگرہ پر متمکن ہوا ۔ (مفتاح التواریخ میں تاریخ ۹۱۵ھ دی ہے ، لیکن بدایونی نے سکندر لودی کی تاریخ وفات ۱۷ ذی قعدہ ۹۲۳ھ دی ہے ۔ ملاحظہ ہو منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۱۳) ۔ سکندر لودی کا بڑا بیٹا تھا ۔ اس کی تخت نشینی کے بعد بعض امرا نے سلطنت کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی اور اس کے چھوٹے بھائی جلال خاں کو جون پور کے تخت پر بٹھا دیا ، لیکن اسے جلد بھاگنا پڑا ۔ بعد میں ابراہم کے حکم سے اسے قتل کر دیا گیا ۔ بدایونی کے مطابق جب اسے پکڑ کر ابراہیم کے پاس لایا گیا تو اس نے حکم دیا کہ اسے بھی دیگر شہزادوں کے ساتھ قلعہ ہانسی میں قید رکھا جائے ، لیکن کسی دشمن نے اسے راستے ہی میں قتل

کر دیا ۔ جلال خاں سے فارغ ہو کر اس نے گوالیار کے زیریں حصار بادل گڑھ کی تسخیر کی ۔ اس زمانہ میں ابراہیم اپنے امرا سے بدظن ہو گیا اور مختلف مقامات پر ان کے تبادلے کر کے ان کو منتشر کر دیا ۔

گوالیار پر ابھی اعظم ہمایوں محاصرہ کیے ہوئے پڑا تھا کہ اس نے اسے بلا کر اس کے بیٹے سمیت گرفتار کر لیا ۔ اس پر اعظم ہمایوں کے دوسرے بیٹے اسلام خاں نے بغاوت کر دی ۔ شاہی امرا نے اس بغاوت کو کچلنے کے لیے بڑی دیانت داری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا تھا ۔ لیکن ابراہیم کا دل اپنے امرا کی طرف سے پھر بھی صاف نہ ہوا اور وہ بہ دستور ان سے بدظن رہا ، جس کے باعث امرا بھی دل برداشتہ ہو گئے اور ہر طرف سے اس کی مخالفت شروع ہو گئی اور آخر دولت خاں اور ابراہیم کے چچا عالم خاں لودی وغیرہ نے تنگ آ کر بابر سے ساز باز کی اور اسے ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی اور جب بابر نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ۹۳۲ھ میں پانی پت کے مقام پر دونوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا جس میں بابر کو عظیم فتح ہوئی (تفصیل کسی دوسرے حاشیہ میں ملاحظہ ہو) اور ابراہیم اسی لڑائی میں مارا گیا ۔ اس کا سر کاٹ کر بابر کے سامنے پیش کیا گیا ۔ بہ قول بدایونی جس جگہ سلطان ابراہیم قتل ہوا تھا ، وہاں پانچ چھ ہزار مقتولین کا ڈھیر لگا ہوا تھا ۔

'این ایڈوانسڈ ہسٹری......' کے مؤلفین کے مطابق :

"....(Ibrahim) possessed military skill, but lacked good sense and moderation, and this ultimately brought about his ruin." (page 342)

(منتخب التواریخ ، صفحہ ۲۱۵ ببعد ۔ مفتاح التواریخ ، صفحہ ۱۴۴ ۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری......، صفحہ ۳۴۱-۳۴۲)

۴ ۔ متن میں 'گوشت و خوک' لکھا ہے ۔ اگر 'گوشت خوک' ہو تو ترجمہ 'سور کا گوشت' ہوگا ۔

۵ ۔ یہ اشارہ ہے پانی پت کی پہلی لڑائی کی طرف جو ۹۳۲ھ میں

لڑی گئی (بابر کے حملۂ ہندوستان کے اسباب کسی پچھلے حاشیے میں گزر چکے ہیں) - ۹۳۰ھ میں بابر نے جب لاہور اور دیپالپور کو فتح کر لیا تو دولت خاں اور عالم خاں لودی جنھوں نے خود بابر کو ہندوستان پر حملے کی دعوت دی تھی ، اس کے خلاف صف آرا ہو گئے جس کے سبب بابر کو واپس کابل لوٹنا پڑا جہاں اس نے مزید فوج اکٹھی کی تاکہ ہندوستان پر ایک مرتبہ بھرپور حملہ کر سکے - چناں چہ ۱۵۲۵ء (یکم صفر ۹۳۲ھ بروز جمعہ) میں تسخیر دھلی کے ارادے سے اس نے دریائے سندھ کو عبور کیا - نومبر ۱۵۲۵ء میں اس نے پنجاب پر قبضہ کیا اور دولت خاں مجبور ہو کر اس کے پاس پہنچا (تفصیل دی جا چکی ہے) - اس کے بعد بابر دھلی کی طرف بڑھا اور راستے میں پانی پت کے تاریخی مقام پر ۲۱ اپریل ۱۵۲۶ء کو (جمعہ ۷ رجب ۹۳۲ھ) اس کا سامنا ابراھیم لودی سے ہوا - (بہ قول بدایونی بابر نے بروز جمعرات ۳۰ جمادی الآخر کو پانی پت کے قریب کیمپ لگایا) - سلطان ابراھیم کا لشکر بابری لشکر سے چھ کوس کے فاصلے پر تھا - بابر کے پاس صرف پندرہ ہزار سوار اور پیادے تھے - اس کے مقابلے میں ابراھیم کے پاس ایک لاکھ سوار اور ایک ہزار ہاتھی تھے - (سید عابد علی عابد نے تزک کے حوالے سے بابری لشکر کی تعداد آٹھ ہزار اور دشمن کی پچاس ہزار اور ایک ہزار ہاتھی ، دی ہے - ایڈوانسڈ ہسٹری میں بابر بارہ ہزار ، دشمن ایک لاکھ) - بابر کے پاس توپیں بھی تھیں جو وہ ترکستان سے لایا تھا - بابر کے لشکری ہر روز افغانوں پر چھاپے مار کر سپاھیوں کے سر کاٹ کر لے جاتے تھے - لشکر لڑنے کے لیے بے چین تھا ، لیکن ابراھیم اپنی جگہ چپ چاپ ٹھہرا رھا اور کوئی حرکت نہ کی - ایک موقع پر بابریوں نے شب‌خون بھی مارا اور کئی افغان قتل کر کے صحیح سلامت لوٹ آئے - آخر جمعہ ۷ یا ۸ رجب سنہ مذکور کو ابراھیم نے صف بندی کی - ادھر بابر نے بھی فوج کو منظم کیا - جب لڑائی چھڑی تو داھنی طرف پٹھانوں کا زیادہ دباؤ تھا - بابر نے امیر عبدالعزیز کو بھی اسی لیے ادھر روانہ کر دیا - اس نے جاتے ہی یک بارگی حملہ کر دیا - خوب گھمسان کا رن پڑا -

کشتوں کے پشتے لگ گئے اور خون کی ندیاں بہنے لگیں ۔ (بدایونی لکھتے ہیں کہ اس لڑائی کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو چلا ہے ، لیکن اب بھی اس میدان سے 'بکش' 'بزن' کی آوازیں آتی ہیں ۔ چناں چہ ۹۹۷ھ میں جب میرا گزر اس طرف سے ہوا تو چاروں طرف سے یہ آوازیں سنائی دیں اور میرے ہمراہیوں کو یہ شبہ ہوا کہ شاید کوئی دشمن حملہ کرنے پہنچ گیا ہے) ۔ بابر جیسے تجربہ کار جرنیل کے مقابلے میں ، جیسا کہ خود بابر نے لکھا ہے ، ابراہیم ایک غیر تجربہ کار ، چالوں سے بے خبر اور لاپروا تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اس جنگ میں بری طرح شکست ہوئی اور وہ ترکوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔ (منتخب التواریخ ، صفحہ ۲۲۰،۲۱۹ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۴۷ ۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری .... صفحہ ۴۲۷ ۔ تلمیحات اقبال ، صفحہ ۳۲۷ ، حصۂ فاسی)

۶ ۔ راستی اختیار کر تا کہ تو نجات پائے ۔ تیری طرف سے راستی ہو تو اللہ تجھے فتح مندی دے گا ۔

۷ ۔ قربانی ، نذر و نیاز ۔

۸ ۔ نذر و نیاز ۔

۹ ۔ تارک دنیا ۔

۱۰ ۔ جہانگیر اکبر کا بیٹا تھا ، بدھ کے روز ۱۷ ربیع الاول ۹۷۷ھ کو بہ مقام فتح پور پیدا ہوا ۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ میں اور توزک جہانگیری کے مرتب و مؤلف محمد ہادی نے اس کی ولادت کے بارے میں کچھ تفصیلات بتائی ہیں ۔ وہ یہ کہ اکبر کے چند ایک فرزند اللہ کو پیارے ہو چکے تھے ، اب وہ دن رات دعا کرتا کہ خدا اسے ایسا فرزند دے جو تخت و تاج کے شایان شان اور علم و دانش کی مسند آرائی کے قابل ہو ۔ چناں چہ اس آرزو کو پورا کرنے کے لیے وہ اولیا کرام رح اور مقربین بارگاہ خداوندی کا وسیلہ پکڑے ہوئے تھا ۔ ایک روز اسے شیخ سلیم چشتی کا پتا بتایا گیا جو اس وقت سیکری میں درویشانہ زندگی بسر کر رہے تھے ۔ اکبر ان کے پاس پہنچا اور ان سے اپنے یہاں ولادت فرزند کی دعا کے لیے کہا ۔ شیخ نے اسے فرزند کی خوش خبری

منائی ۔ اکبر نے منت مانی کہ اگر لڑکا پیدا ہوگا تو اس فرزند کو وہ شیخ کے دامان تربیت میں رکھے گا تاکہ شیخ کی ظاہری و باطنی برکات کی بدولت بزرگی کی نعمت سے مالا مال ہو ۔ شیخ نے یہ منت قبول کی اور کہا کہ مبارک ہو ہم نے بھی دولت و اقبال کے اس نونہال کو اپنا ہم نام بنایا - تھوڑی ہی مدت میں آرزو کا درخت بارور ہوا ۔ جب وضع حمل کا وقت قریب آ پہنچا تو جہانگیر کی والدہ کو از روے عقیدت شیخ سلیم رح کے گھر بھیج دیا گیا جہاں وہ مذکورہ تاریخ کو پیدا ہوا ۔ اس وقت اکبر کا چودھواں سال جلوس تھا اور وہ آگرہ میں تھا ۔ اکبر نے یہ خبر سن کر ایک زبردست جشن شادمانی کا انتظام کیا اور تمام قیدیوں کو رہا کر دیا ۔ یہ جشن سات روز تک منایا گیا ۔ جمعہ ۱۲ شعبان کو اکبر شکرانہ ادا کرنے کے لیے آگرہ سے پیدل اجمیر کو روانہ ہوا ۔ وہاں سے خواجہ معین الدین کی زیارت کرنے کے بعد رمضان میں واپس لوٹا ۔ نومولود کا نام سلیم رکھا گیا ۔ سلطان سلیم کی ماں راجا بھاڑا مل کی بیٹی اور راجا مان سنگھ کی پھوپھی تھی ۔ بروز بدھ ۲۲ رجب ۹۸۱ھ کو جہانگیر کو پڑھنے کے لیے بٹھایا گیا ۔ اس کی خوشی میں بھی ایک زبردست جشن منایا گیا اور لوگوں میں زر و جواھر تقسیم کیے گئے ۔ مولانا امیر کلاں ہروی اس کے معلم اور قطب الدین محمد خان اتالیق مقرر ہوئے ۔ ۹۸۵ھ میں اس کو دس ہزاری کا منصب دیا گیا ۔

پندرہ برس کی عمر میں راجا بھگوان داس کی لڑکی سے اس کی شادی ہوئی ۔ اس کے ایک سال بعد ۹۹۴ھ میں راجا اودے سنگھ کی لڑکی سے اس کا عقد ہوا ۔ مؤخرالذکر کے بطن سے خسرو کی ولادت ہوئی ۔ ۱۰۰۷ھ میں جہانگیر کو اجمیر کے صوبہ کی جاگیر ملی ۔ اسی سال رانا کی مہم پر روانہ ہوا ۔ اس مہم کو ناتمام چھوڑ کر اسے الہ‌آباد آنا پڑا ۔ اسی دوران میں باپ بیٹوں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں ۔ سلیم نے سمجھا کہ اس کا ذمہ دار ابو الفضل ہے ۔ چناں چہ جب ابو الفضل دکن کی مہم سے واپس آ رہا تھا تو اس نے اسے راستے میں اپنے دوست کی وساطت سے قتل کروا دیا ۔ بعد میں

باپ بیٹے میں صفائی ہوگئی ۔ جہانگیر دربار میں حاضر ہوگیا ۔ اکبر کی وفات (بدھ ۱۳ جمادی الآخر ۱۰۱۴ھ) کے بعد تخت نشین ہوا ۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کی تاریخ جمعرات آٹھ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ دی ہے ۔ اس وقت اس کی عمر ۳۸ برس کی تھی ۔ تخت نشینی کے بعد کے حالات اس نے توزک جہانگیری میں لکھے ہیں ۔ مئی ۱۶۱۱ء میں نورجہاں سے شادی کرنے کے بعد جہانگیر نے حکومت کی زیادہ تر باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے رکھی تھی۔ جہانگیر اپنے بائیسویں سال جلوس میں کشمیر گیا ہوا تھا ۔ وہاں اس پر بیماری کا حملہ ہوا ، لیکن صحت یاب ہوگیا ۔ واپسی پر پھر طبیعت بگڑ گئی اور راستہ میں موضع چکرھتی میں بروز اتوار ۲۸ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ کو اس نے وفات پائی ۔

(منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۳۹۲ ۔ توزک جہانگیری اردو ترجمہ ، صفحہ ۲-۱۰ ، ۸۵۳ ۔ مفتاح التواریخ ، ۲۱۱-۲۱۳)

۱۱ ۔ شہزادہ خسرو ، اس کی ماں اودے سنگھ کی لڑکی تھی ۔ خسرو جہانگیر کا سب سے بڑا لڑکا تھا ۔ اکبر کے بتیسویں سال جلوس (رمضان ۹۹۵ھ) میں بہ مقام لاہور پیدا ہوا ۔ اکبر نے اس کا نام خسرو رکھا ۔ یہ اعظم خاں کا داماد اور راجا مان سنگھ کا بھانجا تھا ۔ اکبر کے مرنے کے بعد اس کے سر میں بادشاہت کی ہوا سمائی ۔ کچھ اعظم خاں اور راجا مان سنگھ نے اس سلسلے میں متفق ہو کر کوشش کی ، لیکن جہانگیر نے اسے محبوس کر دیا ۔ بعد میں یہ پھر باغی ہو گیا اور ۸ ذی الحجہ ۱۰۱۵ھ اتوار کی شب کو اکبر کے مقبرہ کو اپنے ساتھیوں کا مقام ملاقات معین کر کے ساڑھے تین سو سواروں کے ساتھ آگرہ کے قلعے کے اندر سے نکل کر مقررہ مقام کی طرف روانہ ہوا ۔ جہانگیر کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے شیخ فرید بخشی کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور اس کے بعد خود بھی روانہ ہو گیا ۔ اس دوران خسرو کے ساتھ اور لوگ بھی مل گئے تھے اور وہ پنجاب کی طرف یلغار کرتے ہوئے روانہ ہو گیا ۔ (شروع شروع میں جب خسرو نے اپنے والد سے برھمی اختیار کی تھی تو اس کی ماں نے اسے کئی خطوط لکھے تھے کہ وہ تمام شبہات کو ترک کر کے باپ سے

خلوص و محبت سے پیش آئے ، لیکن جب وہ باز نہ آیا تو اس کی ماں جودھ بائی نے ۲۶ ذی الحجہ ۱۰۱۳ کو کافی مقدار میں افیون کھا کر خودکشی کر لی تھی) لیکن بعد میں اسے شیخ فرید نے شکست دی اور اسے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اس کے دو ساتھیوں حسن بیگ بدخشی اور عبد الرحیم سمیت (ان تینوں کو سودھرہ کے مقام پر گرفتار کیا گیا تھا) جمعرات ۳ محرم ۱۰۱۵ھ کو باغ کامران میرزا میں جہانگیر کے سامنے پیش کیا گیا ۔ خسرو کو محبوس کر دیا گیا ۔ کچھ عرصہ بعد یہ قید سے بھاگ نکلا اور الہ آباد پہنچ گیا ، جہاں ۱۰۳۱ھ ۱۳ ربیع الاول کو اس نے وفات پائی ۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ خرم (شاہجہان) کے ساتھ تسخیر دکن کے لیے گیا تھا ، وہاں اسے مار دیا گیا ۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے کہ ۸ اسفند ماہ ۱۰۳۱ھ کو خرم نے اطلاع دی کہ خسرو درد قولنج میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا ہے ۔ لیکن مفتاح التواریخ میں ہے کہ خسرو کا مدفن الہ آباد میں ہے ۔ چناں چہ اس کتاب میں ہے کہ اگر جہانگیر کی بات درست ہے تو پھر تعجب کی بات ہے کہ اس کا مزار الہ آباد میں کیوں کر تعمیر ہوا ۔ (توزک جہانگیری اردو ۹۵-۹۷ ، ۲۰۲ ۔ مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۲۸ ۔ این ایڈوانسڈ...... ، صفحہ ۴۶۴)

۱۲ ۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں اس سلسلے میں قدرے تفصیل دی ہے ۔ وہ لکھتا ہے ، گوبند وال میں ، جو دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے ، ارجن نام کا ایک ہندو پیری و بزرگی کا روپ دھارے ہوئے سادہ لوح ہندوؤں اور احمق و نادان مسلمانوں کی کثیر تعداد کو اپنے دام فریب میں پھنسا کر اپنی ولایت کا ڈنکا بجائے ہوئے تھا ۔ اس کے معتقد اسے گورو کہتے اور اطراف و جوانب کے بے وقوف اور حماقت پرست اس سے رجوع کر کے اظہار عقیدت کرتے تھے ۔ اس طرح تین چار پشتوں سے اس کی پیری و ولایت کی دوکان چل رہی تھی ۔ ایک مدت سے میرے دل میں تھی کہ کفر و باطل کی اس دوکان کو اٹھا دیا جائے یا اس شخص کو مسلمانوں کے زمرے میں لے آیا جائے ۔ خسرو کی بغاوت اور شورش کے دنوں میں خسرو کا گوبند وال کی طرف

سے گزر ہوا تو اس نامعقول آدمی نے خسرو کی خدمت میں جانے کا ارادہ کیا ۔ اتنے میں جہاں اس کا مقام تھا وہاں خسرو کا نزول ہوا ۔ ارجن نے جا کر خسرو کو دیکھا اور کچھ باتیں جو اس تک پہنچی تھیں، خسرو کے کانوں تک پہنچا کر پیشانی پر انگلی سے زعفران کی لکیر کھینچی جسے ہندو قشقہ کہتے اور اچھے شگون کے طور پر کھینچتے ہیں ۔ جب مجھے اس بات کی خبر ہوئی تو میں نے ارجن کے ولایت کے دعوے کو جھٹلانا نہایت ضروری سمجھتے ہوئے حکم دیا کہ اسے میرے سامنے حاضر کیا جائے ۔ جب وہ میرے سامنے لایا گیا تو اس کا گھر بار اور آل اولاد مرتضیٰ خاں کو عنایت کر کے اس کے مال و دولت کو ضبط کرتے ہوئے اسے مغل قانون کے مطابق قتل کی سزا دی ۔ اس کے دو چیلے راجو اور انبا، دولت خاں خواجہ سرا کی پشت پناہی کی وجہ سے لوگوں پر ظلم و ستم کرتے رہے تھے ۔ جن دنوں خسرو نے لاہور کا محاصرہ کیا ہوا تھا، انہوں نے لوگوں پر دست درازی اور زیادتی کی ہوئی تھی، اس لیے میرے حکم سے راجو کو پھانسی دے دی گئی اور انبا سے جو امارت میں مشہور تھا، ایک لاکھ پندرہ ہزار روپیہ جرمانہ وصول کیا گیا جسے میں نے سرکاری لشکر خانوں اور خیراتی امور میں صرف کرنے کا حکم دیا (توزک جہانگیری اردو ترجمہ از سلیم واحد سلیم، صفحہ ۹۹)۔ اس لحاظ سے مؤلف دبستان مذاہب کا یہ قول کہ ''جہانگیر نے گورو ارجن مل سے بہت بڑی رقم کا تقاضا کیا تھا، گورو وہ رقم نہ دے سکا جس کے نتیجے میں اسے باندھ کر لاہور کے ریگستان میں ڈال دیا گیا'' غلط ٹھہرتا ہے، کیوں کہ جہانگیر نے واضح طور پر رقم کا ذکر کیا ہے اور یہ رقم اس نے گورو کے چیلے سے لی تھی، خود گورو سے نہیں ۔ 'این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا' کے مؤلفین کے مطابق گورو ارجن نے خسرو کی روپے سے مدد کی تھی اور بعض کے نزدیک اسے اپنی بے حد خود سری و نافرمانی کے سبب یہ سزا بھگتنا پڑی ۔ (کتاب مذکورہ، صفحہ ۴۶۴)

۱۳ - شیخ نظام تھانیسری، والد کا نام شیخ عبدالشکور عمری تھا جو تھانیسر کے رہنے والے تھے ۔ شیخ نظام علوم ظاہری و باطنی کے جامع

کمالات صوری و معنوی پر حاوی اور شریعت و حقیقت و طریقت و معرفت کے رموز سے آگاہ تھے۔ نظام شیخ جلال الدین تھانیسری کے خلیفہ اور کیمیا وغیرہ علوم سے واقف تھے - چوں کہ آپ کا خرچ آمدنی سے زیادہ تھا اس لیے حاسدوں نے اکبر کے سامنے لگائی بجھائی کی جس کے سبب آپ کو دو مرتبہ ہندوستان سے جلا وطن ہونا پڑا - پہلی مرتبہ حرمین شریفین پہنچ کر زیارت سے مشرف ہوئے اور ہندوستان واپس لوٹے - جب برہان پور پہنچے تو سید شیخ عیسیٰ سندھی اپنے اعیان سمیت، پا برہنہ استقبال کو آیا اور آپ سے مستفید و مستفیض ہوا - دوسرے اخراج کے موقع پر آپ بلخ چلے گئے - والیٔ بلخ آپ کا مرید ہو گیا -

آپ نے کئی ایک کتب لکھیں جن میں شرح سوانح امام غزالی، شرح لمعات، تفسیر نظامی، رسالہ حقیقت اور رسالہ بلخیہ وغیرہ شامل ہیں -

آپ نے ۱۰۲۴ھ میں بلخ میں وفات پائی - آپ کا مزار وہیں ہے - (تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۲۴۱)

۱۴ - یہاں متن میں کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ عبارت مبہم سی ہے۔ تاہم سیاق کے اعتبار سے راقم کے نزدیک یہ ترجمہ زیادہ مناسب ہے -

۱۵ - جہانگیر -

۱۶ - شاہجہان : اس کا نام خرم تھا - جہانگیر کا لڑکا اور راجا اودے سنگھ کی لڑکی کے بطن سے تھا - ماہ ربیع اول کی آخری تاریخ ۱۰۰۰ھ بروز جمعرات لاہور میں پیدا ہوا۔ جہانگیر نے لکھا ہے میرے والد بزرگوار کے ۳۶ویں سال جلوس بہ مطابق ۹۹۹ھ میں پیدا ہوا - غروب آفتاب کے پانچ گھنٹے اور بارہ منٹ (تقریباً رات کے ایک بج کر بارہ منٹ) گزرنے پر عالم وجود میں آیا۔ ولادت کے تیسرے دن اکبر جہانگیر کے دولت کدے پر گیا اور جہانگیر کے اس نو مولود لڑکے کے 'جہاں افروز جمال' سے اپنی آنکھیں روشن کیں اور ایسا جشن منایا گیا کہ زمانہ کی آنکھوں نے حیرت سے دیکھا - چوں کہ اکبر اسے

دیکھ کر بے حد خوش ہوا تھا اس لیے اس کا نام خرم رکھا گیا ۔ چار سال چار ماہ اور چار روز کا جب ہوا تو قرآن کریم کی تعلیم دی گئی - پھر قاسم بیگ تبریزی اور حکیم دوائی گیلانی کو اس کی تعلیم پر مامور کیا گیا ۔ ان دونوں کے ساتھ ابو الفضل کے بھائی ابو الخیر کو بھی شامل کیا گیا ۔ درس و تدریس سے فارغ ہو کر تیراندازی کی مشق کرائی جاتی ۔

جہانگیر اس کی ولادت کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ ''اس کی عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس کی اقبال مندی کے آثار ظاہر ہوتے رہے ۔ خرم میری تمام اولاد سے بڑھ کر میرے والد بزرگوار کی خدمت بجا لاتا رہا اور والد بزرگوار بھی اس کی خدمت اور سعادت مندی سے بہت راضی اور خوش تھے ۔ انہوں نے اس کی تعریف کرتے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ میری (جہانگیر) اولاد میں سے کوئی بھی اس کے پلے کا نہیں اور میں (اکبر) اسے اپنے پوتے کی بجائے اپنے حقیقی بیٹے کی طرح سمجھتا ہوں ۔'' (توزک اردو ترجمہ صفحہ ۵۱)

۱۰۲۵ھ میں جہانگیر نے اسے تسخیر دکن کے لیے بھیجا تو اسے شاہجہان کا لقب عنایت کیا ۔ جہانگیر ۱۰۲۴ھ کے واقعات میں لکھتا ہے : ''جمعہ ۲۵ ماہ دی کو خرم بیٹے کو تلوانے کی محفل منعقد ہوئی ۔ اس دن تک جب کہ وہ اپنی عمر کے ۲۴ویں سال میں داخل ہو گیا تھا ، کئی بیویوں کا شوہر اور متعدد بچوں کا باپ ہو چکنے کے باوجود اس نے شراب چکھی تک نہ تھی ۔ میں نے مجلس میں اس سے کہا کہ بیٹے تو اب خیر سے صاحب اولاد ہو گیا ہے اس لیے یہ دیکھتے ہوئے کہ ہمیشہ شاہوں اور شاہزادوں نے شراب پی ہے آج کہ تجھے تولنے کے جشن کا دن ہے میں تجھے شراب پلاتا ہوں اور تجھے اجازت دیتا ہوں کہ جشن کے ایام ، نوروز کے دنوں اور بڑی بڑی مجلسوں میں پی لیا کرنا ۔ لیکن اعتدال برقرار رکھنا......(توزک صفحہ ۳۲۵) ۔ جس وقت جہانگیر نے وفات پائی اس وقت شاہجہان باپ سے بغاوت اختیار کیے ہوئے دکن میں مقیم تھا ۔ اس کی وفات کے تین ماہ آٹھ روز

بعد وہاں سے روانہ ہوا اور ۸ جمادی الثانی ۱۰۳۷ھ کو لاہور میں سریر آرائے سلطنت ہوا - لیکن توزک جہانگیری کے تکملہ نویس کے مطابق اتوار ۲۲ ماہ جمادی الاول ۱۰۳۷ھ کو اس کے نام کا خطبہ پڑھا اور تخت سلطنت پر اس کے جلوہ افروز ہونے کا اعلان کیا گیا - اس کے لاہور پہنچنے سے پہلے نور جہاں کے داماد شہزدہ شہریار نے بادشاہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا لیکن شاہجہان کے خسر (ممتاز محل کے والد) آصف خان نے بڑی ہوشیاری سے دارالخلافہ کو اپنے کنٹرول میں رکھا اور شاہ جہاں کو اطلاع کر دی - جب تک شاہجہان پہنچتا آصف خان نے خسرو کے بیٹے شہزادہ داور بخش کو ، جسے بعض مؤرخین 'قربانی کا دنبہ' کہتے ہیں ، وقتی طور پر تخت پر بٹھا دیا - شاہجہان کے پہنچنے پر (فروری ۱۶۲۸ع) اسے قید میں ڈال دیا گیا - پھر یہ رہا ہو کر ایران چلا گیا - توزک کے تکملہ نویس کے مطابق شاہجہان نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے دشمنوں ، مثلاً طہمورث و ہوشنگ (دانیال کے بیٹے) شہریار وغیرہ کے ساتھ اسے بھی مروا دیا تھا - شاہجہان ، ابوالمظفر شہاب الدین محمد صاحب قران ثانی کے لقب سے تخت پر بیٹھا - تخت نشینی کے بعد اس نے خان جہاں لودھی اور جھجر سنگھ بنڈیلہ کی بغاوتوں کو فرو کیا - پرتگالیوں نے بڑا ہنگامہ برپا کر رکھا تھا - وہ مسلمان اور ہندو بچوں لڑکیوں کو اغوا کرکے لے جاتے اور انہیں عیسائی بنا لیتے تھے - شاہجہان کے حکم پر ہگلی کو تسخیر کرنے کے لیے ۲۴ جون ۱۶۳۲ع کو محاصرے میں لیا گیا اور تین ماہ بعد اس کی تسخیر ہوئی - اس کے زمانے میں دکن اور گجرات میں دو سال ۱۶۳۰—۱۶۳۲ع بڑا زبردست قحط پڑا - شاہجہان کے آخری ایام بڑے دردناک گزرے - ستمبر ۱۶۵۷ع میں وہ بیمار ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بیٹوں دارا شکوہ ، اورنگ زیب اور مراد وغیرہ میں تخت نشینی کے لیے جنگ شروع ہو گئی جس میں اورنگ زیب کو فتح ہوئی - اورنگ زیب نے اسے قید رکھا اور اسے کئی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا - آخر کچھ دن بیمار رہ کر اس نے ۱۰۷۶ھ ششم رجب سوموار کے دن وفات پائی - آگرہ میں ممتاز محل کے پہلو (تاج محل) میں مدفون ہوا - اس نے کچھ اوپر سات سال محبوسی و معزولی میں دن گزارے -

شاہجہان کا زمانہ مغلیہ دور کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے ۔ اس نے کئی ایک عمارات بنوائیں ، جن کی نظیر ملنا مشکل ہے ۔ ان میں خاص طور پر روضہ تاج محل دنیا کے اعجوبوں میں شمار ہوتا ہے ۔ (توزک جہانگیری اردو ترجمہ مقدمہ صفحہ ۱۰ ، صفحہ ۸۶۲—۸۶۱ شاہجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور جلد اول صفحہ ۶ ، ۷ ، جلد سوم صفحہ ۳۴۴ ، ۳۲۵ ، مفتاح التواریخ صفحہ ۲۳۴ ، ۲۳۵ ، ۲۶۳ ، ۲۷۱ ، این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۷۲—۳۷۰ ، ۳۸۱ ، ۳۸۷) ۔

۱۷ - پرہ کیوان یزدانی ، یا فرہ ایزدی ۔ جلالت مقدسہ (آتش پرستوں کے نزدیک پانچ قسم کی آگ تھی ۔ پانچویں کا نام سپنشت ہے جو بہشت میں اہورا مزدا کے سامنے جلتی ہے ۔ اس آگ یعنی آتش بہشت کا مظہر شاہان قدیم ایران کا شکوہ و جلال ہے جو ہمیشہ ان کے گرد ایک ہالے کی شکل میں رہتا ہے اور جسے اوستا میں خورنہ ، پہلوی میں خور اور فارسی میں فر کہتے ہیں) ۔ فر کے معنی سعادت کے بھی ہیں ۔ یہاں مؤلف کی اس سے مراد جلالت مقدسۂ ایزدی ہے ۔ فرہ کیانی کا ذکر بہت سے مؤرخین نے کیا ہے ۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مزدیسنا تصنیف محمد معین تہران ۔ ایران بعہد ساسانیاں از کرسٹنسین) ۔

۱۸ - مجھے اپنے پیر کی سیکڑوں باتوں میں صرف ایک بات یاد ہے اور وہ یہ کہ جب تک مے کدہ آباد ہے ، دنیا ویران نہ ہوگی ۔ بھلا جان کون دے سکتا ہے اور کون دل اڑا سکتا ہے ۔ یہ دونوں چیزیں ، جان دینا اور دل اڑانا ، تو خدا داد ہیں ۔

۱۹ - متن میں ''پسران شیخ بہاء الدین زکریا......'' ہے ۔ اس سے اس کی مراد شیخ مذکور کے اعقاب ہیں ۔

۲۰ - پس جس طرف تم منہ کرو اسی طرف اللہ کا چہرا ہے ۔ یعنی اسی طرف اللہ ہے ۔

۲۱ - آب ، آتش ، خاک اور باد ۔

۲۲ - موذی کو قتل کرو پیشتر اس کے کہ وہ تمھیں آزار پہنچائے -

۲۳ - جو لوگ خود کو پہچانتے ہیں ان کے مخالفین -

۲۴ - وہ جانوروں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے -

۲۵ - نصیر الدین محمد ہمایوں ، ظہیر الدین بابر کا بیٹا تھا - بروز منگل ۴ ذی قعدہ ۹۱۳ھ کابل میں پیدا ہوا - ماں کا نام ماہم بیگم ہے جو خراسان کے اعیان و اشراف کی نسل سے تھی اور جس کا نسب شیخ احمد جام رح تک پہنچتا ہے - یہ وہ وقت تھا جب بابر اپنی قوت و اقتدار کی خاطر ایک مقام سے دوسرے مقام کو پریشان حال پھر رہا تھا - اگرچہ توزک بابری ہمایوں کے ایام طفولیت و تعلیم و تربیت کے بارے میں خاموش ہے تاہم تواریخ سے اتنا پتا چلتا ہے کہ ہمایوں جب چار سال چار ماہ اور چار روز کا ہوا تو رسم مکتب کی تقریب ادا کی گئی - اس کے اتالیق خواجہ کلاں اور شیخ زین الدین رہے - یہ دونو بابر کے درباری امرا میں سے تھے - ہمایوں کی تعلیم کے تفصیلی حالات تو کہیں نہیں ملتے مگر بابر نامہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود بابر کی تالیفات اس کی اولاد کے زیر مطالعہ رہیں - اس نے کامران کی تعلیم کے لیے مثنوی مبین لکھی تھی - بہ ظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ہمایوں کو بھی جو کامران سے صرف ایک یا دو سال بڑا تھا ، اس مثنوی کے ذریعے سے مذہب و اخلاق کا درس نہ دیا گیا ہو - تمام مورخین ہمایوں کی اعلی مذہبی و اخلاقی تربیت کے مداح ہیں - چناں چہ بہ قول بدایونی وہ ہمیشہ با وضو رہتا - خدا اور رسول صلعم کا نام کبھی بغیر وضو کے نہیں لیتا تھا - اس کی زبان پر کبھی گالی نہ آتی - جب بہت غصے میں ہوتا تو زبان سے صرف 'سفیہ' کا لفظ نکلتا -

شہزادگی کے زمانے میں اس نے کئی ایک مہموں میں شرکت کی - پانی پت کی فتح کے بعد بابر نے سنبھل کی جاگیر ہمایوں کو عطا کی - ہمایوں نے سنبھل پر حملہ کرکے قاسم سنبھلی کو گرفتار کر لیا اور بابر کے حضور میں بھیج دیا - ۹۳۷ھ میں جب بابر نے وفات پائی تو ہمایوں اپنی مذکورہ جاگیر سے آگرہ پہنچا اور وکیل سلطنت و وزیر

مطلق امیر حنیفه کے مشورہ و حمایت سے چوبیس برس کی عمر میں ۹ جمادی اول ۹۳۷ھ کو تخت نشین ہوا ۔ تخت نشینی کے فوراً بعد اس نے اپنے بھائیوں کامران ، عسکری اور هندال وغیرہ کو جاگیریں عطا کیں ۔ ان بھائیوں ، خاص طور پر کامران نے ہمایوں کو بہت پریشان رکھا ۔ ہمایوں نے سلطنت کے نظم و نسق سے فراغت پا کر کئی ایک بغاوتوں کو فرو کیا اور گجرات پر فتح پائی ۔ ۹ ماہ صفر ۹۴۶ھ اور پھر ۱۰ محرم ۹۴۷ھ کو ہمایوں نے دو مرتبہ شیر شاہ سوری سے شکست کھائی ۔ آخر اس نے شاہ طہماسپ سے مدد لے کر پھر هندوستان پر چڑھائی کی ۔ راستے میں کئی ایک فتوحات کرتا ہوا ماہ رمضان ۹۶۲ھ میں وارد دهلی هوا اور هندوستان کے ایک بڑے علاقے میں اس کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری ہو گیا ۔ لیکن اس کے ۷ ماہ بعد ہی ہمایوں وفات پا گیا ۔ بہ قول بدایونی وہ ۷ ربیع الاول ۹۶۳ھ کو اپنے کتب خانے کی چھت پر گیا ۔ واپسی پر سیڑھیوں ہی میں تھا کہ اذان کی آواز سنائی دی ۔ احترام کے طور پر وهیں بیٹھ گیا ۔ جب اٹھنے لگا تو عصا اچٹ گیا جس کے سبب اس کا پاؤں پھسلا اور وہ سیڑھیوں پر سے پھسلتا ہوا زمین پر آ رہا ، اور اس کے آٹھویں دن ۱۵ ربیع الاول کو وفات پا گیا ۔ (مفتاح التواریخ میں ہے کہ جس دن گرا اس کے دو روز بعد ۱۱ ربیع الاول کو فوت ہو گیا ۔ صفحہ ۱۶۵) ۔ اسے گیلو کھری (دهلی شہر سے دو کوس کے فاصلے پر) دفنایا گیا ۔

ہمایوں کو علم ہیئت و نجوم سے خاص شغف تھا اور اس فن میں بہت اچھی استعداد بہم پہنچائی تھی ۔ علم ریاضی میں بھی اسے خاصی دست گاہ تھی ۔ وہ فضلا ، بزرگوں اور شاعروں کی دل سے قدر کرتا تھا ۔ خود بھی بڑے اچھے شعر کہتا تھا ۔ بہ قول بدایونی ہمایوں کی ذاتی خوبیاں اتنی ہیں کہ ان کے لکھنے کے لیے ایک دفتر درکار ہے ۔ (منتخب التواریخ صفحہ ۲۳۳ ، ۲۳۶ ، ۳۰۶ ، ۳۰۸ ، ۳۰۹ ، مفتاح التواریخ صفحہ ۱۵۲ ، ۱۶۲ ، ۱۶۳ ، ۱۶۵ ، بزم تیموریہ صفحہ ۲۴ ، ۴۷ ، ۵۲ ، این ایڈوانسڈ ......صفحہ ۴۴۴ ، ۴۴۵) ۔

۲۶ - میرزا محمد حکیم ، ہمایوں کا بیٹا تھا ۔ ۱۵ جمادی الاول ۹۶۱ھ

کو کابل میں پیدا ہوا ۔ تاریخ ولادت 'ابوالمفاخر' اور 'ابو الفضائل' سے نکلتی ہے ۔ اکبر کی طرف سے اسے کابل کی حکومت ملی ہوئی تھی ۔ خان زماں علی قلی خاں کے اکسانے پر باغی ہوا ۔ اور ۹۷۴ھ میں جمادی الثانی کے مہینے میں ہندوستان کی تسخیر کے ارادے سے لاہور تک پہنچ گیا ۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اکبر اس پر لشکر کشی کر رہا ہے تو وہ لاہور سے واپس کابل چلا گیا ۔ ۹۸۹ھ میں اس نے اپنے ماموں فریدوں خاں کے بہکانے پر پھر ہندوستان پر حملہ کر دیا ۔ اکبر نے اس موقع پر میرزا حکیم سے مقابلے کے لیے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں ، اور خود فتح پور سے پنجاب کی طرف روانہ ہوا ۔ اس دوران میں میرزا نے لاہور پہنچ کر راجا بھگوان داس ، راجا مان سنگھ وغیرہ کو محاصرے میں لے لیا ۔ شاہی لشکر سرہند کے راستے سے کلانور اور رہتاس پہنچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر ڈیرے ڈال دیے ۔ مرزا کو جب اس کی خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو عبور کرکے فرار ہو گیا اور کابل تک اپنی باگ نہ روکی ۔ اکبر کے ۳۰ویں سال جلوس میں (۱۲ ماہ شعبان ۹۹۳ھ) کابل ہی میں اس کی وفات ہوئی ۔ یہ شراب کا بے حد رسیا تھا اور اسی کثرت مے نوشی کے سبب مختلف امراض کا شکار ہوا ۔ اس کی وفات رعشہ کے عارضہ میں ہوئی ۔ اس کے مرنے کے بعد اکبر کے حکم سے راجا بھگوان داس اور کنور مان سنگھ کابل پر متصرف ہو گئے ۔

میرزا محمد حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا ۔ اس کی ماں کا نام ماہ جوجک بیگم تھا ۔ یہ عورت شاہی خاندان کی نہیں تھی بلکہ کنیزوں میں سے تھی اور ہمایوں اسے اپنے عقد میں لے آیا تھا ۔ میرزا حکیم کے پیدا ہونے پر ہمایوں نے اسے بیگم کا خطاب دیا ۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی ۔ (منتخب التواریخ صفحہ ۳۷۲ ، ۹۱م حاشیہ صفحہ ۳۵۵ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۹۰) ۔

۲۷ ۔ رود کوثر میں پانچ بیٹے لکھے ہیں ۔ پانچویں کا نام اخیرالدین تھا (صفحہ ۵۰) ۔

۲۸ - اکبر، جلال الدین محمد اکبر بن نصیرالدین محمد ھمایوں ۔ امر کوٹ میں بروز اتوار ۵ رجب ۹۴۹ھ مطابق ۱۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء (این ایڈوانسڈ ھسٹری......کے مطابق ۲۳ نومبر ۔ ملاحظہ ھو صفحہ ۴۴۴) پیدا ھوا ۔ یہ وہ وقت ھے جب ھمایوں ، شیر شاہ سے شکست کھا کر در بدر کی ٹھوکریں کھا رھا ھے ۔ امر کوٹ جب وہ پہنچا تو وھاں کے راجا نے اس کی آؤ بھگت کی ۔ بعد میں ھمایوں کے لیے ایک بڑی جمعیت فراھم کی اور ھمایوں اپنا ساز و سامان وھیں چھوڑ کر بھکر کی طرف بڑھا ۔ وھاں سے اس نے سندھ عبور کر کے قندھار کی راہ لی ، لیکن بھائیوں کی سازش کے سبب عراق کا ارادہ کیا اور اکبر کو منگوا بھیجا ۔ اکبر کی عمر اس وقت ایک سال تھی ۔ سخت گرمی اور راستہ میں پانی نہ ملنے کے سبب ھمایوں نے اسے لشکر گاہ میں چھوڑ دیا اور خود آگے بڑھ گیا ۔ اس کے جاتے ھی مرزا عسکری نے اکبر کو گرفتار کر لیا اور قندھار لے جا کر اپنی بیوی کے سپرد کر دیا ۔ جب ھمایوں نے شاہ طہماسپ سے مدد لے کر ۹۵۲ھ میں کابل کو فتح کیا تو اس وقت اسے اکبر کو دیکھنا نصیب ھوا ، لیکن جب ھمایوں کابل سے بدخشاں کی تسخیر کے ارادے سے نکلا تو کامران نے کابل کو خالی پا کر حملہ کر دیا اور اکبر کو پھر گرفتار کر لیا ۔ جب ھمایوں یہ واقعہ سن کر کابل کو لوٹا تو کامران پسپا ھو کر قلعہ میں محصور ھو گیا ۔ سخت محاصرے کے سبب اس کے حالات بگڑ گئے تو اس نے اس دوران میں کئی مرتبہ اکبر کو قلعے کے اس کنگرے پر بٹھا دیا جو بندوقوں اور توپوں کا نشانہ تھا ، لیکن اکبر ھر بار بچ گیا ۔ آخر جب کامران بھاگ نکلنے میں کامیاب ھو گیا تو ھمایوں کو اکبر پھر مل گیا ۔ ۹۵۸ھ میں جب ھندال مرزا کامران کے ھاتھوں قتل ھوا تو ھمایوں نے اس کا سارا مال و اسباب اکبر کو دے دیا اور ساتھ ھی غزنی اور اس کے توابعات بھی اس کو جاگیر میں دے دیے ۔ ۹۶۲ھ میں جب ھمایوں دوبارہ ھند پر قابض ھوا تو اکبر کو اس نے حصار فیروزہ جاگیر میں دیا ۔ اس سے پہلے سکندر سور کے مقابلے میں اکبر نے ایک لشکر کی کمان کی تھی ۔ پھر جب ۹۶۲ھ کے بعد سکندر کی دست درازیاں بڑھیں

تو ہمایوں نے اکبر کو بیرم خاں کی اتالیقی میں اس کے مقابلے میں بھیجا۔ ۹۶۳ھ میں جب ہمایوں نے سیڑھیوں سے گر کر جان دی (۷ ربیع الاول کو گرا اور ۱۵ ربیع الاول کو فوت ہوا) تو اس وقت اکبر پنجاب ہی میں تھا۔ چناں چہ وہیں باغ کلانور میں بیرم خاں خان خاناں کے مشورے اور تائید سے بروز جمعہ ۲ ربیع الثانی ۹۶۳ھ کو تخت نشین ہوا۔ (منتخب التواریخ میں ۲ ربیع الاول ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے یا سہو مؤلف ہے۔ طبقات اکبری کے مؤلف نے ایک جگہ ۲ ربیع الاول اور دوسری جگہ ۲ ربیع الثانی لکھا ہے۔ مآثر رحیمی میں ۷ ربیع الثانی ہے۔) اس کے بعد اس نے سکندر کو شکست دی۔ پھر پانی پت کے مقام پر ہیموں بقال سے زبردست معرکہ ہوا۔ غرض جس طرف بھی اس نے توجہ کی (آغاز جلوس سے آخر تک) کامیاب و کامران لوٹا۔ استحکام حکومت کے لیے سب سے پہلے یہ کیا کہ ملک میں جو صوبے خود مختار ہو گئے تھے انہیں پھر حکومت دھلی کے تابع کیا۔ کشمیر جو شروع سے آزاد تھا اسے فتح کر کے دھلی سے وابستہ کیا۔ اکبر اپنے خاص دائرۂ عمل یعنی ملک‌گیری اور ملک رانی میں بے نظیر تھا اور بہ قول شیخ اکرام ، اسلامی حکومت کو جس طرح اس نے مستحکم کیا ، کسی اور ھندوستانی بادشاہ سے نہیں ہوا ، لیکن افسوس کہ اس نے اپنے صحیح دائرۂ عمل کو چھوڑ کر مذہبی معاملات میں بھی دخل دیا اور خوشامدی درباریوں کی واہ واہ میں بعض بوالفضولیوں کا مرتکب ہوا کہ آج اس کے سیاسی احسانات بھی فراموش ہو گئے ہیں۔ شروع میں یہ پابند مذہب تھا ، لیکن بعد میں سارا معاملہ بگڑا۔ برصغیر ھند و پاک میں فارسی ادبیات کو سب سے زیادہ فروغ اکبر ہی کے دور میں ہوا۔ اسی لیے اس کا دور فارسی ادب 'کا سنہری زمانہ کہلاتا ہے۔ اکبر نے ۵۲ سال حکومت کرنے کے بعد بدھ کی رات ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ کو وفات پائی اور سکندرہ باغ میں ، جو آگرہ سے تین کوس پر ہے مدفون ہوا۔ اس کے استادوں میں ملا عصام‌الدین ابراہیم اور مولانا بایزید کے علاوہ مولانا پیر محمد خاں ، نقیب خاں ،

مولانا عبدالقادر اور مولانا پیر عبداللطیف قزوینی کے نام بھی لیے جاتے ہیں۔ (منتخب التواریخ، طبقات اکبری، توزک جہانگیری اردو ترجمہ، مفتاح التواریخ، رود کوثر، این ایڈوانسڈ ہسٹری...، بزم تیموریہ)

۲۹ - جعفر بیگ قزوینی، مرزا قوام الدین جعفر بیگ جہانگیر کے دربار کا ایک ممتاز اہل قلم تھا۔ اکبر کے بائیسویں سال جلوس میں عراق سے ہندوستان آیا اور اپنے چچا مرزا غیاث الدین علی آصف خاں بخشی کی وساطت سے شاہی دربار میں روشناس ہوا۔ رفتہ رفتہ ترقی کر کے جہانگیر کے عہد میں پنج ہزاری اور عہدۂ وکالت پر مامور ہوا۔ ۳ صفر بروز بدھ (۱۰۱۶) جہانگیر نے اسے وزارت کا عہدہ سونپا۔ اس کا ذکر کرنے کے بعد جہانگیر لکھتا ہے: ''حسن اتفاق سے آج سے اٹھائیس سال پہلے اسی منزل (ظاہر بساول، افغانستان کا ایک موضع) میں میرے والد نے اسے میر بخشی کا عہدہ دیا تھا۔'' (توزک صفحہ ۱۲۸)۔ اس کے متعلق مآثر الامرا کا مؤلف لکھتا ہے: ''یکتائے روزگار تھا۔ ہر فن میں یگانہ اور ہر ہنر میں کامل۔ اس کے فہم کی تیزی اور فطرت کی بلندی کی بڑی شہرت تھی۔ وہ خود کہا کرتا کہ جس چیز کو میں فوراً نہ سمجھوں وہ بے معنی ہے۔ ایک نگاہ سے تمام سطروں کو پڑھ لیتا تھا۔ اس کو ملکی و مالی معاملات میں بھی غیر معمولی مہارت تھی۔ اس کا ظاہر و باطن آراستہ تھا۔ شعر و انشا میں کمال پختگی حاصل تھی۔'' (کتاب مذکورہ جلد ۱ صفحہ ۱۱۲)۔ آصف خاں جعفری تخلص کرتا تھا۔ اس نے اپنی سخن وری کی شہ زوری میں نظامی گنجوی کے تتبع میں ایک مثنوی خسرو شیریں لکھی جس کا نام اس نے بہ قول جہانگیر اس کے نام پر نور نامہ رکھا۔ تذکرہ نصر آبادی میں ہے کہ نظامی کے بعد کسی نے مذکورہ مثنوی اس سے بہتر نہیں لکھی۔ جہانگیر نے بھی اس کی شعر گوئی کی تعریف کی ہے۔ اس نے ۱۰۲۱ھ میں وفات پائی۔ جہانگیر اس کی وفات کے ذکر میں لکھتا ہے: ''ایک مدت سے آصف خاں کی بیماری کی خبریں آ رہی تھیں، اس کا مرض بار بار ہٹ جانے کے بعد پلٹ پلٹ آتا تھا۔ یہاں تک کہ برہان پور میں ۶۳ سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم اعلیٰ درجے کی ذہانت و قابلیت

کا مالک تھا - اس کی طبیعت میں نہایت درجے کی روانی تھی - شعر خوب کہا کرتا تھا......میری شاہزادگی کے زمانے میں اس سے کئی مرتبہ ناواجب حرکات سر زد ہوئی تھیں جن کی وجہ سے اسے ......اندیشہ تھا کہ میں (اس سے)... اپنی تخت نشینی کے بعد سخت برتاؤ کروں گا، لیکن میں نے اسے پنج ہزاری ذات و سوار کے منصب پر بڑھا کر نوازا تھا اور اس کے بعد جب کہ وہ مدتوں میرا صاحب استقلال وزیر رہا تو میں اس سے پوری پوری طرح سے حسن سلوک سے پیش آتا رہا اور اب اس کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں پر عنایتیں کیں ....تو بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کی نیت کبھی بھی ٹھیک نہیں تھی - اس نے کبھی بھی مجھ سے خلوص نہیں برتا......میرے سفر کابل کے دوران میں شورش کی جو کوشش ہوئی تھی، کہا جاتا ہے کہ وہ اس سازش سے نہ صرف باخبر تھا، بلکہ اس نے باغیوں کو تقویت پہنچائی تھی، لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ اس سے اتنی عنایت و شفقت برتنے کے باوجود وہ ایسی بدخواہی اور بدظنی کا مرتکب ہوا ہو۔'' (توزک، صفحہ ۲۴۳-۲۴۴ - مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۲۲ - بزم تیموریہ، صفحہ ۱۴۹، ۱۵۰) - منتخب التواریخ کے مترجم نے اس آصف خاں کو دوسرے آصف خاں سے خلط ملط کر دیا ہے - (ملاحظہ ہو کتاب مذکورہ، صفحہ ۵۴۴)

۳۰ - فرقہ روشنیہ والوں کو اس وقت کے کئی مؤرخ 'تاریکی' لکھتے ہیں - چناں چہ ملا بدایونی پیر روشن کی لوٹ مار کے ذکر میں لکھتے ہیں: ''......اب تو وہ روشن نہیں بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے'' (منتخب التواریخ اردو، صفحہ ۵۲۳) - جلال الدین یا جلالہ نے اکبری دور میں بہت فتور مچائے رکھا جس کے سبب اکبر کو اس کی سرکوبی کرنا پڑی - ملا بدایونی ۹۹۴ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں: ''پچیس سال پہلے ایک ہندوستانی سپاہی، پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا، اس نے وہاں پیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنا لیا تھا اور پٹھانوں میں الحاد و بے دینی پھیلاتا رہا تھا - ... اس کا ایک لڑکا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر (۹۸۹ھ) میں

جب کہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، خدمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ عنایت آمیز سلوک کیا تھا۔ لیکن اپنی موروثی بدبختی کی وجہ سے وہ شاہی لشکر سے بھاگ کر دوبارہ پٹھانوں کے قبیلے میں چلا گیا تھا۔ وہاں اس نے ایک بڑی مخلوق کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندوستان اور کابل کا راستہ بالکل مسدود ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقہ نے بڑا زور باندھ رکھا تھا۔ ان کی سرکوبی کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تاکہ وہ ان سرکشوں کا بہ خوبی قلع قمع کر دے" (صفحہ ۵۲۴)۔ اسی سال انھوں نے اٹک کی طرف پیش قدمی کی۔ اکبر نے شاہزادہ مراد اور راجا ٹوڈر مل کو دریائے سندھ عبور کرا کے ان سرکشوں کی سرکوبی پر مامور کیا۔ بعد میں شاہزادہ واپس بلا لیا گیا۔ راجا ٹوڈرمل نے اس کوہستان میں کئی ایک قلعے بنوا لیے۔ ادھر راجا مان سنگھ نے جو اس قبیلہ پر مامور تھا، اس قبیلہ کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک و اسیر کیا۔ پھر ایک موقع پر (اسی سال) ان لوگوں نے شاہی آدمیوں کا راستہ روکنے کی کوشش کی، لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔ ۹۹۵ھ کے شروع میں اس فرقہ کے پٹھانوں نے بیس ہزار پیادہ فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری پر حملہ کر دیا، وہ لڑائی میں مارا گیا۔ اس پر اکبر نے زین خاں کوکہ اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا۔ ادھر مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور اس نے درۂ خیبر پر ان پٹھانوں کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس آ کر پھر حملہ کیا اور چوطرفہ لڑائی لڑنے لگے، لیکن شاہی فوجوں کی تازہ کمک آ جانے کے سبب پٹھان میدان چھوڑ کو بھاگ گئے اور ان کے تقریباً دو ہزار آدمی مارے گئے۔ اس کے بعد ۱۰۰۰ھ میں 'جلالہ تاریکی' پر فوج کشی کی گئی۔ بہ قول بدایونی "جلالہ اس وقت عبداللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل کی طرف آ رہا تھا۔" بادشاہ نے پہلے آصف خاں کو اس کی سرکوبی بر مامور کیا تھا۔ پھر شعبان کے مہینے میں

زین خاں کوکہ کو آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں (روشنیہ فرقہ) کے مکمل استیصال کے لیے اور سوات اور بجوڑ کے علاقے کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا ۔ (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، ۵۲۵ ، ۵۲۷ ، ۵۴۴) اور بعد میں جیسا کہ دبستان مذاہب میں ہے ، جلالہ ۱۰۰۷ھ میں مارا گیا ۔

۳۱ - اس نے جہانگیر کے زمانے میں بہت اودھم مچائے رکھا ۔ چناں چہ جہانگیر نے اپنی توزک میں کئی ایک جگہ اس کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے : ''ہفتہ ۲ ماہ صفر ۱۰۲۰ھ کو...بدفطرت احداد نے یہ معلوم کر کے کہ کابل میں کوئی صاحب وجاہت سردار موجود نہیں ہے اور خان دوران کے باہر جانے کی وجہ سے کابل میں فقط معزالملک مذکورالصدر کے چند ایک ملازموں ہی کے ساتھ ہے ، موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے بے شمار سوار و پیادہ ہم راہیوں کے ساتھ چپکے سے کابل پر حملہ کر دیا ۔ معزالملک نے اپنی کم طاقت اور اس وقت کی کمزور حالت کے باوجود وقت کے تقاضا کے مطابق جواں مردی دکھائی ۔ اھل کابل اور اس شہر کے قزلباشوں نے اپنے اپنے گلی کوچوں کی حد بندی کر کے اپنے اپنے گھروں میں مضبوط مورچے بنا لیے ۔ احداد کے افغان ساتھی چند گروھوں میں بٹ کر شہر کے اطراف سے بازاروں اور گلیوں میں داخل ہو گئے ۔ اھل شہر نے اپنے گھروں کی چھتوں پر سے حملہ آوروں کو تیروں اور بندوقوں سے مارنا شروع کر دیا ۔ حملہ آوروں کی اچھی خاصی تعداد ماری گئی.........بالآخر یہ حملہ آور کئے اپنے اسی آدمیوں کے جہنم رسید ہونے اور دو سو گھوڑوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے ۔'' ۱۰۲۳ھ کے واقعات میں جہانگیر لکھتا ہے: ''اس سال کے آخری دنوں میں ملک کے مختلف اطراف سے شاھی افواج کی فتوحات کی خبریں پہنچیں ، جن میں سب سے بڑھ کر احداد افغان پر....فتح پانے کی خبر ہے ۔ احداد افغان عرصہ دراز سے کابل کے پہاڑی علاقوں میں بغاوت و سرکشی پھیلانے میں مصروف ہے جہاں کے بہت سے افغان اس کے گرد جمع ہوگئے ہیں ۔ والد بزرگوار کے زمانہ سے لے کر آج تک کہ میری تخت نشینی کو

دس سال ہو گئے ہیں ، اس کے خلاف شاہی فوجیں مصروف پیکار ہیں ۔ اس نے کئی بار شکست کھا کر پریشانیاں اٹھائیں جن کے نتیجے میں اس کے لشکری بکھرتے اور مارے جاتے رہے ہیں ۔ ایک مدت سے اس نے جرخی (پہاڑی مورچہ) میں جس کی مضبوطی اس کے نزدیک قابل اعتماد تھی، پناہ لی ہوئی تھی اور خان دوران نے چاروں طرف سے گھیرا ڈال کر آنے جانے کے راستے بند کر دیے تھے ۔ جب اس پناہ گاہ میں اس کے حیوانات کے لیے چارہ اور خوراک باقی نہ رہی تو وہ اپنے مویشیوں کو رات کے وقت پہاڑ کے اوپر سے نیچے لا کر وادی میں چرانے لگا ...... اس کا یہ طریقہ جاری رہا یہاں تک کہ خان دوران کو اس کی خبر ہو گئی جس پر ایک رات اس نے اپنے تجربہ کار سرداروں اور لشکریوں کا ایک گروہ متعین کیا جو جرخی کے قرب و جوار میں گھات میں بیٹھ جائے اور موقع پا کر حملہ کر دے ...... دن کے وقت خان دوران بھی سوار ہو کر اسی طرف بڑھا ۔ احداد اور اس کے بد باطن ساتھی اپنے مویشیوں کو چرانے کے لیے ہانکتے ہوئے گھات میں چھپے ہوئے لشکریوں سے آگے نکل گئے تو انہیں سامنے سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی ۔ انھوں نے غور سے دیکھا تو انہیں خان دوران آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیا ۔ وہ بدحواس ہو کر پلٹنا ہی چاہتے تھے کہ خان دوران کے فوجی مخبروں نے خان دوران کو خبر دی کہ احداد ان لوگوں میں موجود ہے ، جس پر اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور احداد کے پاس پہنچ گیا ۔ ادھر گھات میں بیٹھے ہوئے لشکریوں نے بھی باہر نکل کر احداد کا راستہ روک لیا اور اس پر حملہ آور ہو گئے ۔ مقام جنگ کی ناہمواری ، شکستگی اور گھنے جنگل کی موجودگی کی وجہ سے دوپہر تک جنگ جاری رہی ۔ بالآخر افغان شکست کھا کر پہاڑ میں گھس گئے......احداد اپنے مورچے تک واپس پہنچ کر حفاظتی اقدامات نہ کر سکنے کی وجہ سے قندھار کی طرف نکل گیا ۔ شاہی لشکر نے جرخی میں پہنچ کر ان کے مسکنوں اور گھروں کو توڑ پھوڑ کر جلا دیا اور زمین سے ہموار کر دیا ۔''

س کے بعد بھی ایک مرتبہ اسے شاہی فوجوں نے شکست دی ۔

آخر ۱۰۳۵ھ میں جب یہ تیراہ کے علاقے میں گھس کر لوٹ مار میں مصروف ہوا تو شاہی فوجوں نے اسے نواغر (یا اواغر) میں گھیر لیا اور ۷ جمادی الاول کو یہ شکست کھا کر مارا گیا ۔ احسن ظفر خاں نے اس کا سر کاٹ کر جہانگیر کو بھیجا جسے دیکھ کر اس نے خدا کی بارگاہ میں سجدۂ شکرانہ ادا کیا اور خوشی کے نقارے بجانے کا حکم دے کر اس باغی و بد اندیش کے سر کو لاهور کے شاهی قلعه کے دروازے میں لٹکانے کی هدایت کی ۔ (توزک جہانگیری ، صفحه ۲۱۹ ، ۲۲۰ ، ۳۲۹ ، ۳۳۰ ، ۵۷۲ ، ۸۱۵ ، ۸۱٦)

۳۲ ۔ با یزید کو پیر روشن یا پیر روخان بھی کہتے تھے ۔ دبستان مذاهب کے مؤلف کے برعکس مخزن اسلام (پشتو) کے مؤلف نے جو پیر رو کا مخالف تھا ، اس کے بارے میں بڑے سخت الفاظ لکھے ہیں ۔ اور بہ قول جناب شیخ محمد اکرام ''اگرچه اخوند درویزه (مخزن اسلام کا مؤلف) کی معلومات پیر رو خان کے ابتدائی حالات کی نسبت سنی سنائی باتوں پر مبنی ہوں گی ، لیکن معلوم هوتا هے که اخوند صاحب نے بیان واقعات میں صحت اور تحقیق سے کام لیا هے اور هارا خیال هے که ان واقعات کی نسبت جن کا دوسری جگه ذکر نہیں ملتا ان کے بیان پر اعتاد کیا جا سکتا هے ۔'' (رود کوثر ۳۴۳-۳۴۴) ۔ اخوند کے مطابق با یزید کالنجر (جالندهر) میں ملا سلیمان ملحد کی صحبت میں رها ۔ اس صحبت اور دم نشینی سے با یزید کے دل میں خیالات فاسد جانشین هوئے ، حتٰی که وهاں سے وہ ایک 'کافر مطلق' اور 'منکر دین برحق' هو کر واپس هوا ۔ به قول اخوند اس پر هندو اثر بھی تھا اور اس کے مریدوں میں هندو بھی تھے جنھیں وہ 'به زبان هندوی' ذکر کی تعلیم دیتا تھا اور ان کے عقیدۂ تناسخ کو تو اس نے اپنی تعلیمات کا جز بنا لیا تھا ۔ وہ مردوں اور عورتوں کو یکجا بٹھاتا اور سرود و رقص اور دستک کا آغاز کرتا ۔ شعر پڑھے جاتے اور ذکر هوتا ۔ جب وہ کسی کو اپنا معتقد بناتا تو اسے خلوت میں کچھ 'ذکر' دیتا ، لیکن یه ذکر الله تعالٰی کے اسما سے نه هوتا ، بلکه افغانوں کو افغانی میں کچھ موزوں فقرے دیتا ، 'جہلائے فارس' کو فارسی میں اور هندوؤں کو

هندوی میں ۔ اس کی تلقین تھی کہ جو کچھ زور و قوت اور نوک شمشیر سے حاصل ہو حلال ہے ۔ اس نے بہت سے لوگوں کو ساتھ ملا کر کاروان لوٹنے شروع کیے۔ ایک مرتبہ محسن خان غازی نے کابل سے آ کر اس پر یلغار کی اور اسے گرفتار کر کے اس کی تشہیر کی ، لیکن اس نے اپنے عقائد سے توبہ کر لی ۔ اسے آزاد کر دیا گیا اور یہ کوہ طوطی میں آ کر مقیم ہو گیا ۔ یہاں اس نے پھر وہی پرانے ہتھکنڈے شروع کر دیے ۔ محسن خان نے پھر کابل سے آ کر اس کے لشکر کو شکست دی ۔ اسے راہ فرار اختیار کرنا پڑی ۔ وہ موسم انتہائی گرمی کا تھا ۔ اسے گرم ہوا لگی اور اس کے اثر سے وہ چل بسا اور اسنغر میں دفن کیا گیا ۔ ادبیات سرحد کے مؤلف رضا ہمدانی لکھتے ہیں کہ ''پیر رو خاں بہت بڑی شخصیت کا مالک تھا ۔ ادب ، فلسفہ ، تبلیغ و اشاعت اور قومیت سب میں ماہر تھا ۔ اگرچہ پیر رو خاں زندگی کے تمام شعبوں میں دسترس کامل رکھتا تھا ، لیکن اس کی ادبی زندگی بہت نمایاں تھی ، بلکہ پشتو ادب کی ترقی کا باعث ہی پیر رو تھا ۔ اس نے نثر کے ذریعے پشتو ادب کی بہت بڑی خدمت کی اور ایک نئے مکتب فکر کی بنیاد رکھی ......'' لیکن بہ قول صاحب رود کوثر رضا صاحب نے اپنے بیان کا مآخذ نہیں بتایا ۔ پشتو ادب کے دوسرے اور قدیمی عالم پیر رو خاں کو وہ درجہ نہیں دیتے جو رضا صاحب نے دیا ہے ۔ بہر حال اس میں شک ہے کہ اس نے پشتو ادب کی سرپرستی کی ۔

(رود کوثر ، صفحہ ۴۵ ، ۴۶ ، ۴۹ ، ۵۰ ، ۵۴)

۳۳ ۔ خواجہ ابوالحسن تبریزی : کسی نے خواجہ ابوالحسن تربتی لکھا ہے تو کسی نے قزوینی ۔ یہ اکبر کے زمانے میں خراسان سے وارد ہند ہوا ۔ اور شہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا ۔ جب جہانگیر سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے اسے دکن سے بلوا بھیجا ۔ پہلے اسے میر بخشی کی خدمت سپرد کی ۔ پھر وزارت اعلیٰ پر اسے فائز اور پنج ہزاری کے منصب سے ممتاز کیا ۔ ۱۰۳۳ھ میں اسے وزارت کے ساتھ ساتھ کابل کا حاکم بھی بنا دیا گیا ۔ توزک جہانگیری میں ۱۰۳۰ھ کے واقعات میں ہے ''اس دن (۴ اسفند ماہ) خواجہ ابوالحسن کو دیوان کل کے

اعلیٰ عہدے پر فائز کیا گیا'' (اردو ترجمہ صفحہ ۷۰۱)۔ اس کو کابل کا صوبہ تفویض کیے جانے کا سبب تکملہ نویس تزک نے یہ دیا ہے کہ ''والیٔ بلخ نے تحریر کیا تھا کہ... پلنگپوس اس خیر اندیش کی اجازت کے بغیر غزنی پر حملہ کی بے ادبی و گستاخی کا مرتکب ہوا اور اللہ کا شکر ہے کہ اس کی مناسب سرزنش ہو گئی۔ لیکن چوں کہ اس واقعہ سے کابل کے شاہی لشکر اور سلطنت بلخ کی سپاہ کے مابین کشیدگی پیدا ہو گئی ہے اس لیے نیاز مند امیدوار ہے کہ آں جناب خان زاد خان کو حکومت کابل سے ہٹا کر کسی اور کو وہاں کا حاکم مقرر کریں گے۔'' چناں چہ جہانگیر نے اس کی اس التجا کے مطابق صوبہ کابل مدارالمہام خواجہ ابوالحسن کو تفویض کر کے اس کے بیٹے احسن اللہ کو اس کا قائم مقام مقرر کیا۔ (توزک جہانگیری صفحہ ۸۰۱)۔ شاہ جہان کے دور میں خواجہ کو شش ہزاری شش ہزار سوار کا منصب عطا ہوا۔ ۱۰۴۲ھ میں صوبہ کشمیر کی حکومت ملی۔ آخر ۱۹ رمضان ۱۰۴۲ھ کو بہ عمر ۷۰ سال وفات پائی۔

(مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۷۳ بہ حوالہ مآثر الکرام صفحہ ۹۵)

۳۴۔ احسن ظفر خان: میرزا احسن اللہ نام، احسن تخلص تھا۔ سرو آزاد کے مطابق اس کے باپ کا نام خواجہ ابوالحسن تربتی تھا۔ کلمات الشعرا میں قزوینی لکھا ہے۔ اس کا باپ اکبر کے دور میں خراسان سے ہندوستان وارد ہوا۔ اور شہزادہ دانیال کا وزیر اور دکن کا دیوان مقرر ہوا۔ جہانگیر کے عہد میں میر بخشی بنا۔ پھر وزارت اعلیٰ اور پنج ہزاری کے منصب سے نوازا گیا۔ ۱۰۳۳ھ میں اسے وزارت کے ساتھ کابل کی حکومت بھی مل گئی۔ اور ظفر خان اپنے باپ کی طرف سے کابل کا حاکم مامور ہوا۔ شاہ جہان کے زمانہ میں ابوالحسن کو شش[۶] ہزاری شش[۶] ہزار سوار کا منصب ملا۔ اور ۱۰۴۲ھ میں صوبۂ کشمیر مرحمت ہوا۔ اس کے ساتھ ظفر خان بھی کشمیر چلا گیا۔ شاہجہان نے اسے حکومت کشمیر کی نیابت عطا کی۔ اور جب ۱۹ رمضان ۱۰۴۲ھ کو ابوالحسن فوت ہوا تو صوبہ کشمیر پورے طور پر ظفر خان کو تفویض ہوا، اور منصب سہ ہزاری اور علم و نقارہ ملا۔ ظفر خان نے تبت کو

فتح کیا ۔ کچھ دنوں ٹھٹھ کا حاکم بھی رہا ۔ زندگی کا آخری حصہ لاهور میں گزارا ۔ اور ۱۰۷۳ھ میں فوت ہوا ۔

ظفر خاں کو شاہ جہانی دور کا عبدالرحیم خان خاناں جاننا چاہیے ۔ مجمع النفائس کے مؤلف کے مطابق خان خاناں کے بعد امرائے ہند میں اس جیسا کوئی امیر نہیں ہے ۔ یہ جہاں شعردوست اورہنر پرور تھا وہاں خود بھی ایک شاعر تھا ۔ مرزا صائب سے مشق سخن کرتا... رفتہ رفتہ اس کا ذوق اتنا بڑھا کہ خود مرزا صائب اس کی سخن دانی کا مداح ہو گیا ۔ وہ جب صائب کے کلام پر نکتہ چینی کرتا تو خود صائب اس کی داد دیتا ۔ مآثر الامرا میں ہے کہ ظفر خاں ایرانیوں کو بہ کثرت روپیہ دیتا تھا ۔ خصوصاً شعرا کے ساتھ خوب بذل و کرم کرتا ۔

ظفر خاں کے ذوق شاعری کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے دور کے تمام شعرا مثلاً صائب ، کلیم ، قدسی ، سالک یزدی ، سالک قزوینی وغیرهم کے کلام کو ایک بیاض میں ہر ایک کے دست خاص سے لکھوایا تھا ۔ اور ہر ایک کے کلام کے صفحے کی پشت پر اس کی تصویر بنوائی تھی ۔ وہ خود بھی صاحب دیوان تھا ۔ اس نے دو مثنویاں بھی لکھیں ۔ ایک لاهور پنجاب ، کشمیر اور آگرہ وغیرہ کی تعریف میں تھی اور دوسری کا نام میخانہ راز تھا ۔

(توزک جہانگیری صفحہ ۸۰۱ ، سرود آزاد مطبوعہ لاهور صفحہ ۹۵ ، ۹۶ ۔ کلمات الشعرا مطبوعہ لاهور صفحہ ۴ ، ۵ ۔ بزم تیموریہ صفحہ ۱۸۴-۱۸۶)

۳۵ - جہانگیر نے اپنے بارهویں سال جلوس (۱۰۲۶ھ) کے واقعات میں لکھا ہے کہ ۲۳ ماہ شہریور کو اللہ داد افغان کو رشید خاں کاخطاب دے کر ایک پرم نرم (پشمینہ) خاصہ عنایت کیا ۔ (توزک اردو صفحہ ۴۱۲) ۔ چودھویں سال جلوس کے واقعات میں وہ رقم طراز ہے: ''ان دنوں کا ایک اہم واقعہ اللہ داد افغان کی بغاوت ہے ۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بنگش کے علاقہ کا نظم و نسق درست کرنے اور سرکش افغانوں کی سرکوبی کے لیے مہابت خاں کو حکم دیا گیا تھا تو وہ بدبخت اللہ داد کو

یہ سوچتے ہوئے کہ شاید شاہی عنایات و نوازشات سے متاثر ہوتے ہوئے معاونت کی قابل قدر خدمت سر انجام دے گا ، التجا کرکے اپنے ساتھ لے گیا تھا ۔ چوں کہ میں جانتا تھا کہ کفران نعمت اور حق نا شناسی ان (افغانوں) کی فطرت میں ہوتی ہے ، اس لیے میں نے احتیاطاً مہابت خاں کو ہدایت کی تھی کہ اللہ داد کے بیٹے اور بھائی کو دربار میں بھجوا دے ، تاکہ انھیں یرغمال کے طور پر رکھا جائے ۔ جب وہ دربار میں بھیج دیے گئے ، تو میں نے اللہ داد کے اطمینان خاطر کے لیے ان سے طرح طرح کی مہربانیاں اور نوازشیں کیں لیکن وہ اس شعر

گلیم بخت کسی را کہ بافتند سیاہ
بآب زمزم و کوثر سفید نتوان کرد

کے مصداق اپنی بد فطرتی سے باز نہ آیا ۔ جیسے ہی اپنی سرزمین میں پہنچا ، اس کے اطوار سے سلطنت کی بد خواہی اور بیوفائی کے آثار ظاہر ہونے لگے ۔ مہابت خاں پھر بھی نظم و نسق کو برقرار رکھنے کی خاطر اس سے لطف و مدارات سے پیش آتا رہا ۔ پچھلے دنوں مہابت خاں نے اپنے بیٹے کی سر کردگی میں افغانوں کے ایک سرکش گروہ کا قلع قمع کرنے کے لیے ایک لشکر روانہ کیا تو اسے بھی اس کے ہمراہ کیا ۔ لیکن جب یہ لشکر منزل مقصود پر پہنچا تو اس کی منافقت و بدخواہی کی وجہ سے شورش خاطر خواہ طریق سے دبائی نہیں جا سکی اور لشکر کو بے نیل مرام واپس لوٹنا پڑا ۔ اس موقع پر اللہ داد نے یہ سوچا کہ کہیں مہابت خاں نے سارے واقعات کی تحقیقات کر لی تو حالات کی تہہ تک نہ پہنچ جائے اور اسے اس کے کیفر کردار تک پہنچا دے ۔ چناں چہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا اور نمک حرامی و بغاوت کی خواہش کو ، جو وہ ایک عرصے سے اپنے جی میں دبائے ہوئے تھا ، اس نے بروئے کار لاتے ہوئے کھلم کھلا بغاوت کر دی ۔ مہابت خاں کی ایک عرض داشت سے مذکورہ واقعات و حالات کا علم ہوا تو میں نے اللہ داد کے بیٹے اور بھائی کو گوالیار میں قید کیے جانے کا حکم دیا ۔ اتفاق سے اللہ داد کا باپ بھی حضرت عرش آشیانی (اکبر) کے حضور سے فرار ہو گیا تھا اور سالہا سال تک چوریاں کرتا

اور ڈاکے ڈالتا رہا تھا ، یہاں تک کہ شامت اعمال سے گرفتار ہو کر اپنے کیفر کردار تک پہنچ گیا ۔ امید ہے کہ یہ بے فیض بہت ہی جلد اپنے کیے کی سزا پائے گا ۔'' (صفحہ ۵۵۵ ، ۵۵٦) ۔ اور اسی سال جلوس (۱۰۲۹ھ کے آغاز میں) کے آخر میں وہ لکھتا ہے : ''گذشتہ اوراق میں شاہی لشکر میں سے اللہ داد ولد جلالہ باریکی (توزک کے مترجم نے باریکی لکھا ہے حالاں کہ یہ 'تاریکی' ہے جیسا کہ کسی گذشتہ حاشیہ میں منتخب التواریخ وغیرہ کے حوالے سے لکھا گیا ہے) کے فرار ہونے اور اس کے بد بختی و بربادی میں پھنس جانے کا ذکر کر چکا ہوں ۔ پچھلے دنوں اس نے اپنے کیے پر پشیمان ہو کر باقر خاں کے توسط سے اعتماد الدولہ سے التجا کروائی کہ میں اس کی خطاؤں سے درگزر کر کے اسے معاف عنایت کروں ۔ جب اعتماد الدولہ نے مجھ سے یہ درخواست کی تو میں نے حکم دیا کہ اگر وہ دربار میں حاضر ہو کر اپنی پشیمانی کا اظہار کرے تو میں اس کی ذلالت و جرم سے درگزر کرتے ہوئے اسے معاف کر دوں گا ۔ چناں چہ اس دن (۴ ماہ بہمن) کو باقر خاں اسے دربار میں لے آیا ، تو میں نے اعتماد الدولہ کی شفاعت پر اس کو معاف کرکے جرم وخطا اور خجالت و ندامت کا داغ اس کے ماتھے سے دور کر دیا ۔'' (صفحہ ۵۹۲ ، ۵۹۳) ۔

محمد صالح کنبوہ (صفحہ ۳۹۴)

۱ ۔ پنڈلی ، درخت کا تنہ ۔

۲ ۔ البرز ۔ ایران کا ایک پہاڑ ۔ یہاں بہ معنی پہاڑ کی مانند ۔

۳ ۔ قلعہ کی دیوار کا سوراخ جو دشمنوں کو دور رکھنے کے لیے ہوتا ہے ۔

۴ ۔ متن میں 'کنگر' ہے ۔ اس سے مراد کنگرہ ہوگا ۔

۵ ۔ اس خاکدان (دنیا) میں اس کی مضبوط بنیاد ، آسمان کی کشتی کا گویا لنگر ہے ۔

٦ ۔ یہ دنیا اس کے سبب قوی دل ہے ۔ اس سے (انسان کے) غور ادراک کا پتا چلتا ہے ۔

۷ - پرانی دنیا کی نظر اس پر اس بوڑھے کی طرح ہے جس کا صرف ایک ھی بیٹا ھو -

۸ - اس کی بلندی سے گویا ایک اور آسمان وجود میں آ گیا ، جس کا خورشید بحر و بر کا بادشاہ (شاھجہان) ہے -

۹ - وہ (بادشاہ) بخشش کا سمندر اور دنیا کا بادشاہ ہے - وہ جہان بخشنے والا اور دوسرا صاحب قران ہے -

۱۰ - (میرا ممدوح) عدل کا مذھب ، فرشتوں کی خصلت ، سلیمان کا سا جلال اور افلاطون کا سا کمال رکھنے والا ہے -

۱۱ - کیوان : ایک ستارہ جسے زحل بھی کہتے ھیں -

۱۲ - دنیا ، تاریکی و روشنی -

۱۳ - سفید و سیاہ مہرے یعنی دن رات -

۱۴ - مراد قیامت تک -

۱۵ - حوالت کدہ ، وہ تفریح گاہ یا تفرج گہ جو شہر یا پہاڑ کے گرد ھو -

۱۶ - کلیم ، ابو طالب کلیم شاھجہانی دور کا بے مثل شاعر تھا - ھمدان میں پیدا ھوا - کاشان میں زیادہ وقت گزرا - ھندوستان میں پہلی مرتبہ جہانگیر کے عہد میں وارد ھوا اور یہاں میرزا رستم صفوی کے بیٹے شاہ نواز خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی - مؤخرالذکر جہانگیری امرا میں سے اور عالم گیر کا خسر تھا - یہاں کچھ عرصہ رھنے کے بعد جب دل نہ لگا تو وطن کو ۱۰۲۸ھ میں مراجعت کی - اس کی تاریخ اس نے 'توفیق رفیق طالب' نکالی - وطن میں دو برس سے زیادہ نہ ٹھہر سکا اور پھر ھندوستان کا رخ کیا - پہلی مرتبہ جب ھندوستان سے گیا تو دل میں حسرتوں کا طوفان لیے ھوئے تھا جس کا اظہار اس نے کئی جگہ کیا ہے - مثلاً

ز شوق ھند زانسان چشم حسرت بر قفا دارم
کہ رو ھم گر براہ آرم نمی بینم مقابل را

اسیر ہندم و زین رفتن بیجا پشیمانم
کجا خواهد رساندن پر فشانی مرغ بسمل را
به ایران می رود نالان کلیم از شوق همراهان
بپای دیگران همچون جرس طی کرده منزل را

دوبارہ جب ہندوستان آیا تو میر جملہ شہرستانی سے، جو پنج ہزاری کے منصب پر فائز تھا، منسلک ہو گیا - اس کی اور شاہ نواز کی مدح میں اس نے قصائد کہے - بعد میں شاہجہان کے دربار سے متعلق ہو گیا اور وہاں اسے ملک الشعرا کا خطاب ملا - بہ قول مؤلف عمل صالح اگرچہ اس منصب جلیل کا حق دار حاجی محمد جان قدسی تھا لیکن چوں کہ حاجی کے آنے سے پیشتر ہی اسے یہ خطاب مل چکا تھا، اس لیے آخری وقت تک یہ اس پر فائز رہا - جمعہ ۳ شوال ۱۰۴۴ھ کو جب شاہجہان تخت طاؤس پر، جو ایک کروڑ روپے کی لاگت سے اور سات سال میں تیار ہوا، بیٹھا تو کلیم نے قصیدہ لکھا جس کے صلے میں شاہجہان نے اسے روپے میں تلوایا - پانچ ہزار پانچ سو روپے وزن میں آئے جو اسے دے دیے گئے - ۱۰۴۹ھ میں جب کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی رنگینی اور آب و ہوا کی دل آویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ وہیں کا ہو کر رہ گیا اور بادشاہ سے درخواست کی کہ کشمیر ہی میں بیٹھ کر فتوحات شاہی لکھنے کی اجازت مرحمت ہو جو منظور ہوئی - ۱۰۵۵ھ میں جب شاہجہان پھر کشمیر گیا تو اس نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر پیش کیا اور خلعت اور دو سو اشرفیاں انعام میں پائیں - اسی سال ۴ شعبان کو جب بادشاہ کشمیر سے واپس ہونے لگا تو کلیم کو ایک قصیدے کے صلے میں دو سو مہریں عطا کیں - اس نے کشمیر ہی میں ۱۵ ذی الحجہ ۱۰۶۱ھ کو وفات پائی - غنی کشمیری نے تاریخ وفات کہی 'طور معنی بود روشن از کلیم' (۱۰۶۱ھ) - کلیم نہایت صاف دل سیر چشم اور فیاض طبع تھا - سر خوش لکھتا ہے کہ ''مرزا محمد علی ماہر نقل می کرد کہ (کلیم) عجب مرد خلیق خوش محاورہ بود، ہر کہ در صحبتش می رسید فیضیاب می شد و محظوظ بر میخواست'' (کلمات الشعرا صفحہ ۹۶) - معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا اور

گرم جوشی سے ملتا تھا ۔ اگرچہ اس نے قصائد کے علاوہ مثنویاں وغیرہ بھی لکھی ھیں لیکن به قول علامه شبلی اس کا اصلی کمال غزل گوئی ھے ۔ ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا لکھتے ھیں : ''یه شاعر عرفی کی پیروی کرتا ھے اور اسی کے انداز میں شعر کہتا ھے ۔ سبک ھندی کے بلند مقام شاعروں میں گنا جاتا ھے ۔ اس کی غزلوں کا دیوان مشہور ھے ۔'' اس کے یه دو قطعه بند شعر ملاحظه ھوں ۔

بد نامی حیات ، دو روزی نبود بیش
آن هم کلیم با تو بگویم چسان گذشت
یک روز صرف بستن دل شد به این و آن
روزی دگر به کندن دل زین و آن گذشت

(عمل صالح جلد سوم مطبوعه لاھور صفحه ۳۹۴ ، ماثرالکرام (موسوم به) سرو آزاد صفحه ۷۶—۸۰ ، کلمات الشعرا صفحه ۹۶ ، مفتاح التواریخ صفحه ۲۵۸ ، شعرالعجم جلد سوم صفحه ۱۸۴—۱۸۷ ، ۱۹۵ ، ۲۰۵ ، مختصر تاریخ ادبیات فارسی (از ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا) اردو ترجمه مطبوعه پشاور صفحه ۱۴۷ ، ۱۵۷ ، براؤن جلد ۴ صفحه ۲۵۸ ، ۲۵۹ ، بزم تیموریه صفحه ۱۸۲)

۱۷ ۔ اس کی دیوار میں تم پتھر کی درز نہیں دیکھو گے کیوں که تنگ درز (چمٹ کر اختلاط کرنے والا) کی صحبت چسپاں ھوتی ھے ۔

پتھر کے آئینے میں سنگ تراش نے آفتاب کی طرح ھنر فاش کیا ھے ۔ اس کی بنیادوں سے لے کر کنگروں تک پتھر اس طرح لگا ھوا ھے جیسے یه ایک ھی پتھر کا ٹکڑا کاٹ کر لگایا گیا ھو ۔

یه مضبوط فطرت اور پاکیزگی پھیلانے والا ھے ۔ یه آئینه بھی ھے اور سد سکندر بھی ۔

اس طرح یه فلک شکوه عمارت گویا ایک ھی سرخ پتھر سے مکمل ھوئی ۔

۱۸ ۔ باغ حیات بخش ، شاہ محل اور دیگر عمارات ۹ سال ۳ ماه کی

مدت میں لاکھوں روپے کے خرچ سے ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ کو تکمیل پذیر ہوئیں ۔ یہ عمارتیں اور قلعہ عزت خاں ، الہہ وردی خاں اور مکرمت خاں کے زیر نگرانی تعمیر ہوئیں ۔ (مفتاح التواریخ صفحہ ۲۵۳) ۔

۱۹ ۔ مولانا جامی : ملا نور الدین عبدالرحمان جامی ۲۳ شعبان ۸۱۷ھ کو (مطابق ۷ نومبر ۱۴۱۴ع) خراسان کے ایک علاقہ جام کے موضع خرجرد میں پیدا ہوئے ۔ جام کے علاقہ سے نسبت کے سبب جامی تخلص رکھا ۔ آپ کے والد نظام الدین اور دادا شمس الدین اصفہان کے ایک محلہ دشت کے رہنے والے تھے ۔ بعد میں وہ جام کی طرف ہجرت کر گئے ۔ جامی بچپن ہی میں اپنے باپ کی ہم راہی میں پہلے ہرات اور پھر سمرقند گئے اور اس جگہ ، کہ علوم اسلامی اور ایرانی ادبیات کا مرکز تھی ، علم و ادب کے حصول میں مصروف ہوئے اور علوم دینی اور تاریخ و ادب میں کمال حاصل کیا ۔ پھر عرفان و معرفت کی طرف رجوع کیا اور سیر و سلوک میں قدم رکھا ۔ اس سلسلے میں اساتذۂ وقت اور مرشدان عصر مثلاً سعد الدین محمد کاشغری ، خواجہ علی سمرقندی اور قاضی زادہ رومی کی پیروی اختیار کی اور اس طرح عبادت و ریاضت کی طرف مائل ہوئے تا آں کہ مرتبۂ ارشاد تک پہنچے اور سلسلۂ نقش بندی کے سربراہوں میں شمار ہوئے ۔ سعدالدین کاشغری ، کہ نقش بندی خلیفہ تھے ، کی وفات کے بعد یہ خلافت آپ کو ملی ۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور ہر کس و ناکس آپ کا احترام کرنے لگے ۔ اور باوجود اس بات کے کہ آپ امرا وغیرہ کی مدح نہیں کرتے تھے وہ لوگ آپ کی تعریف کرتے اور انہیں اپنا صدر مجلس بناتے ۔ دوسری مرتبہ جب آپ نے سفر کیا تو زیارت حج سے مشرف ہوئے اور دمشق سے ہو کر تبریز اور وہاں سے ۸۷۸ھ میں ہرات پہنچے ۔ اس سفر میں چند اہل بغداد نے آپ کو تنگ کیا جس کا ذکر آپ نے ایک قصیدہ میں کیا ہے ۔ سلطان حسین بایقرا اور اس کا دانش مند وزیر علی شیر نوائی دونوں آپ کے بڑے مداح تھے ۔ نوائی کی تو آپ سے خاص دوستی تھی ۔ براؤن جامی کے متعلق لکھتے ہیں : ''وہ ان نادر ترین طباعوں میں سے ہیں جو

خاک ایران نے پیدا کیے کہ بہ یک وقت ایک عظیم شاعر ، اعلیٰ فاضل اور زبردست صوفی تھے۔ اپنی شاعری کے علاوہ جو چھوٹی چھوٹی تالیفات کو چھوڑ کر غزلیات کے تین دیوانوں اور سات عشقیہ اور موعظتی مثنویوں پر مشتمل ہے ، انھوں نے تفسیر قرآن ، آں حضرت صلعم کی نبوت کی شہادت ، حدیث ، سیرالاولیا ، تصوف ، صرف و نحو عربی ، قافیہ ، عروض ، موسیقی ، معمات اور دیگر مضامین پر قلم اٹھایا ۔ تحفۂ سامی میں ان کی ۴۶ تالیفات کی فہرست دی گئی ہے ۔ اور میرا خیال نہیں کہ یہ فہرست مکمل ہے ۔ ان کے معاصروں کے دلوں میں ان کا حد درجہ احترام تھا اور یہ احترام صرف ان کے ہم وطنوں تک محدود نہ تھا ، بلکہ...... عثمانی سلطان بھی اس تعظیم میں شریک تھا اور اس نے مولانا کو اپنے دربار میں بلانے کی ناکام کوشش کی ۔ ان کے مشہور ترین معاصرین ان کو اتنا رفیع المرتبت سمجھتے تھے کہ ان کے نزدیک وہ مدح و ستائش سے بالا ہیں اور اس قدر مشہور ہیں کہ ان کی مفصل سیرت لکھنا غیر ضروری ہے ۔ چناں چہ بابر یہ بیان کرنے کے بعد کہ علوم ظاہر و باطن میں ان کے عہد کا کوئی شخص ان کا درجہ نہ رکھتا تھا ، کہتا ہے کہ ان کا مرتبہ احتیاج تعریف سے بالا ہے اور توزک میں ان کا مذکور صرف 'از جہت تیمن و تبرک' کیا جاتا ہے ۔ بہ قول شفق ، ''جامی کو نویں (۹) صدی ہجری کا سب سے بڑا شاعر و ادیب اور آخری عظیم صوفی شاعر کہا جا سکتا ہے کہ جو انوری ، سعدی ، رومی اور حافظ و خیام اور فردوسی (جیسے عظیم شعرا) کی صف میں آتا ہے ۔ اور اس کے بعد ایران میں عظیم شعرا کم ہی پیدا ہوئے ہیں ۔''

جامی نے ۱۸ محرم (بروز جمعہ) ۸۹۸ھ کو (مطابق ۹ نومبر ۱۴۹۲ء) ھرات کے مقام پر وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

(تاریخ ادبیات ایران از رضازادہ شفق صفحہ ۳۵۰ ، ۳۵۱ ، ۳۵۸ - مفتاح التواریخ صفحہ ۱۳۴ ، ۱۳۵ - براؤن جلد سوم اردو ترجمہ صفحہ ۲۱۱ ، ۲۱۲) -

۲۰ - الخفی ، اللہ تعالیٰ کے اسماء میں سے ہے۔ پوشیدہ رہنے والا ۔

۲۱ - لفظی ترجمہ ، یہ میری چھولداری میں ہیں ، انہیں میرے بغیر کوئی نہیں جانتا - مطلب یہ کہ آپ ایسے گوشہ نشین تھے کہ بس اللہ تعالیٰ ہی آپ کو جانتا تھا -

۲۲ - فقر : فنا فی اللہ ہو جانا - دارین سے منہ موڑ لینا - (سردلبران صفحہ ۳۰۲) -

فنا : فنائیت عدم شعور کو کہتے ہیں - ذات احد میں اس درجہ استغراق کہ اپنا بھی ہوش نہ رہے - بے خودی یعنی اپنی خودی کا ہوش نہ رہنا......اس ہوش نہ رہنے کا بھی ہوش نہ رہے تو اسے فناء الفنا کہتے ہیں (اس کی دیگر اقسام یہ ہیں) -

فنائے افعالی : اپنے افعال اور خلق کے افعال کو افعال حق میں فنا کر دینا -

فنائے صفاتی : اپنی صفات کو اور خلق کی صفات کو صفات حق میں فنا کر دینا -

فنائے ذاتی : اپنی ذات اور خلق کی ذات کو ذات حق میں فنا کر دینا وغیرہ (ایضاً صفحہ ۳۰۳) -

۲۳ - یعنی جب تک کوئی ما سوا اللہ یا علائق دنیوی کو ترک نہ کرتا اس کی راہ نمائی نہ کرتے -

۲۴ - تصرف یا تصرفات ، ''اولیاء اللہ صفات الٰہیہ کی قوت سے خلق میں تصرفات کرتے ہیں - مگر سب سے قوی اور سب سے وقیع تصرفات ان کے وہ ہوتے ہیں جو قلوب طالبین میں ان سے سرزد ہوں - ان تصرفات کے ذریعہ سے گم راہوں کو وہ راہ راست پر لاتے ہیں - بد شوقوں کو صحیح ذوق و شوق کا فیضان کرتے ہیں - ناقصوں کو کامل بناتے ہیں اور جن لوگوں پر جہل کی مردنی چھائی ہو انہیں علم کی حیات میں لا کر زندگیٔ جاوید بخشتے ہیں -'' سر دلبراں کے مصنف شیخ (مرشد) کی کرامتوں کی دو قسمیں بتاتے ہیں : (۱) کرامت فی اللہ (۲) تصرف فی الخلق - مؤخرالذکر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''اور کرامت فی الخلق جو بندوں سے بھی کسی قدر متعلق ہے، اس کی بھی دو اقسام ہیں: (۱) تصرف فی الخلق (۲) اظہار خرق و عادات۔ تصرف فی الخلق طالبان حق کے لیے مفید اور کار آمد ہے ۔ اس کی بدولت مریدین کے قلوب اور طبائع و افعال و حرکات و اخلاق کی اصلاح ہوتی رہتی ہے۔ یہ قلب ماہیت چوں کہ بتدریج واقع ہوتی ہے اس کااظہار عوام پر نہیں ہوتا...........'' (سر دلبراں صفحہ ۵۱ - ۳۵۰ ، ۲٦۴) -

۲۵ - شہود ، حق تعالیٰ کا مشاہدہ اس طور سے کہ سالک مراتب تعینات اور موہومات صوریہ سے عبور کرکے توحید عیانی کے مقام میں پہنچے اور جمیع صور موجودات میں حق تعالیٰ کا مشاہدہ کرے اور غیریت کو دور کر دے ۔ جس چیز پر نظر ڈالے حق ہی کو دیکھے اور غیر کو نہ دیکھے - کیوں کہ وجود حق کے سوائے موجودیت غیر محال ہے - پس حق کو حق دیکھے کیوں کہ حق کا غیرحق ہونا محال ہے (سر دلبراں صفحہ ۲٦۳ - ۲٦۴) -

۲٦ - جب میں تنہا ہوتا ہوں تو کسی کی یاد میری ہم نفس ہوتی ہے - جب میں کسی کا ہم نفس ہوتا ہوں تو گویا تنہا ہوتا ہوں ۔ مومن دہلوی کہتا ہے -

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

۲۷ - شیخ فضل اللہ : نائب رسول اللہ صلعم کے لقب سے مشہور تھے ۔ اصلی وطن جون پور تھا ۔ برہان پور میں آ کر مقیم ہوگئے تھے - برہان پور میں انہوں نے ایک مدرسے کی بنیاد رکھی جس میں فقہ و تفسیر اور حدیث و تصوف کا درس دیا کرتے تھے اور صوفیانہ ارشاد و ہدایت سے باطنی راہ نمائی اور تزکیۂ نفس کا اہتمام کرتے۔ بادشاہ وقت مدرسہ اور طلبا کا بار خرچ اٹھاتا تھا ۔ انہوں نے ۱۰۰۵ھ (مطابق ۱۵۹٦ع) میں بہ مقام برہان پور میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ (تذکرۂ علمائے ہند صفحہ ۱٦۲ ، رود کوثر صفحہ ۳۴۱) - شاہجہان کی ولادت ۱۰۰۰ھ (مطابق ۱۵۹۲ع) میں ہوئی - شیخ مذکور کی وفات کے وقت

اس کی عمر ۵ یا ۶ برس کی ہوگی - تعجب ہے کہ اسے اس چھوٹی سی عمر میں شیخ کے مذکورہ اوصاف کا کیوں کر پتا چل گیا جب کہ اس عمر کے بچوں میں معمولی سی بات کو بھی پرکھنے جانچنے کی اہلیت نہیں ہوتی ، چہ جائے کہ کسی کی خدا شناسی کو سمجھنا - معلوم ہوتا ہے شیخ کے سنہ وفات میں مؤلفین کتب بالا سے سہو ہوا ہے - افسوس کہ اس وقت کوئی دوسرا مستند ماخذ راقم کے پاس نہیں ہے ورنہ تاریخ وفات کی صحت کے بارے میں کچھ تحقیق کی جاتی -

۲۸ - معلم اول ارسطو ، کیوں کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے علم حکمت کو باقاعدہ قید تحریز میں لا کر اپنے شاگردوں کو اس کی تعلیم دی - جب کہ اس سے پہلے حکما شاگردوں کو حکمت کی زبانی تعلیم دیا کرتے تھے (بہار عجم جلد ۲ صفحہ ۴۰۳ غیاث صفحہ ۶۵۰) -

معلم ثانی -- کنایہ از ابو نصر فارابی کیوں کہ ارسطو وغیرہ کی کتب حکمت کو انھوں نے پہلی مرتبہ یونانی سے عربی میں ترجمہ کرکے ان کی تعلیم دی (غیاث اللغات صفحہ ۶۵۲) - تو ثالث معلمین یا معلم ثالث سے یہاں مراد بہت زیادہ عالم و دانا ہے -

۲۹ - دس فرشتوں پر حاوی عقل -

۳۰ - بو علی سینا کی ایک تصنیف -

۳۱ - یعنی ان (اصحاب دانش وغیرہ) کا افلاطون کو ہجی خواں اور عقل کو طالب علم وغیرہ کہنا -

۳۲ - برج اسد میں دو ستاروں کا نام -

۳۳ - بہ معنی بادشاہ ، مراد خسرو دہلوی مشہور فارسی شاعر - ان کا ذکر کسی گذشتہ حاشیہ میں آ چکا ہے -

۳۴ - اس کا اشارہ کمال الدین اسماعیل 'خلاق المعانی' کی طرف ہے - اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا -

۳۵ - جس کسی کی زبان کج ہے وہ کم رتبہ ہے - کنگھی کی زبان چوں کہ سیدھی ہے اس لیے لوگ اس کو سر پر جگہ دیتے ہیں -

اگر رازدار حق کے پاس سامان نہیں ہے تو اس کی کوئی قدر نہیں ہے - اس کی مثال ایسی ہے کہ خوشخط نہ لکھے ہوئے قرآن کا تحفہ کم وقعت ہوتا ہے -

۳۶ - دم بہ معنی نفس، تلوار کی دھار وغیرہ - جوہر بہ معنی اصل، تلوار کی کاٹ اور دھار وغیرہ - اس شعر میں رعایت لفظی ہے، ترجمہ: مرد باحق کی ہر بات حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتی ہے - (اس کی مثال یہ ہے کہ) تلوار کی زبان پر جو بھی بات آئے گی وہ 'کاٹ' کی بحث میں ہو گی -

اے عزیز! (مخاطب) اگر تم عزت کے طلب‌گار ہو تو ایک جگہ پابند ہو کر نہ رہو - کیوں کہ ایک جگہ رہنے سے، وہی حالت ہوتی ہے جو زمین میں چھپے ہوئے سونے کی ہوتی ہے کہ ہمیشہ اس کے سر پر خاک پڑی رہتی ہے (اور جب یہ سونا زمین سے باہر آتا ہے تو اس کی بے حد قدر ہوتی ہے)-

۳۷ - جب وہ حسین و جوان سرو (محبوب) چمن میں ندی کے کنارے پر سے گزرا تو پانی اس کی چال دیکھ کر ٹھٹک گیا اور (چلنے سے رک گیا) گلاب کا پھول اس کی رنگت دیکھ کر اپنا رنگ و بو بھول گیا -

اس 'غزال چشم' سے میں نے امید نگاہ رکھی، (لیکن) اس نے دور سے گوشۂ چشم دکھایا اور کہا ''اب موقع نہیں رہا -''

پائے چوبیں (لکڑی کے پاؤں - یہ محاورہ ان لوگوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو صوفیا کے نظریہ کے برعکس استدلال سے خدا کی معرفت کے قائل ہیں - مولانا روم رح فرماتے ہیں: پای استدلالیان چوبین بود کے لیے باریک راستہ (معرفت ایزدی) چلنا مشکل ہے - میں حیران ہوں کہ کنگھی کس طرح ان زلفوں میں سے گزر گئی -

۳۸ - جلوہ کے وقت ناز سے اپنی زلفوں کو بکھیر دے (اور پھر) تار گیسو سے ابرو کی کمان کو چلہ چڑھا -

منیر کے سوا، کہ جو سخن دانی میں ماہر ہے، کوئی بھی بیت ابرو کے مضمون کو نہیں سمجھ سکتا -

۳۹ - رونے کی سرگذشت ہماری پلکوں سے سنی جائے - موج کی زبان سے تیراک یا تیراکی کی بات سننی چاہیے -

میں نے بد مستی کے سبب تیری زلفوں میں ہاتھ مارا تھا - اب (اپنی اس حرکت و جرأت کے سبب) مجھے کنگھی کی زبان سے کیا کیا کچھ نہ سننا پڑے گا -

۴۰ - ترجمہ اشعار :

(۱) میں وہ ہوں کہ میرے سلطان ضمیر نے نکتہ دانی کے سبب سلطنت معانی میں دانش کا ڈنکا بجایا ہے -

(۲) جب میرے قلم کے بادل کی رگ گوہر فشانی کرتی ہے تو اس وقت صفحے کا چہرہ آب گوہر سے دھل جاتا ہے -

(۳) میری شاعری (میرا کلام) نسیم نو بہار کی مانند تر و تازہ ہے اور میری سانس صبح کے وقت چلنے والی ہوا (باد نسیم) کی طرح خوشبو بکھیرتی ہے -

(۴) میرے تمام الفاظ و معانی اپنی پختگی اور فصاحت و روانی کے سبب ایسے ہیں جیسے کہنہ سالی میں عقل و تجربہ اور نوجوانی میں ہوس ہو -

(۵) جب میں گلستان کا رخ کرتا ہوں تو تمام بلبلیں مزاج دانی کے طور پر میری غزل گاتی ہیں -

(۶) ایک میں ہوں کہ سراپا آتش محبت ہوں اور ایک تو ہے کہ سراسر آتش جوانی ہے - میں ہوں اور عشق جاودانہ، اور تو ہے تو حسن جاودانی ہے -

(۷) جو کوئی تیرے عارض سے مسودہ نہ پڑھے خدا کرے کہ وہ غبار سینہ سے تمام عمر تیرہ چشم رہے -

(۸) اپنی جادوگر پلکوں کو ناز و کرشمہ کا درس دے کہ وہ شوخی میں تیرے ابرو کی برابری نہیں کر سکتیں -

(۹) میری پلکوں نے خون گرم رونے سے میرے سوز کی تفصیل تجھ سے

بیان کر دی ہے ۔ اسی طرح میری نگاہ نے اپنی تر زبانی (رونا) سے تجھے میرے اشکوں کا حال بتا دیا ہے ۔

(۱۰) جب تیرے ابرو مجھ سے پیام ناز زبانی کہتے ہیں تو اس وقت کان سراپا آنکھ اور آنکھ سراپا کان بن جاتی ہے ۔

(۱۱) نہ تو میری زبان شکوہ کرنے کا یارا رکھتی ہے اور نہ (کبھی) تیرا دھن خنداں ہوا ہے (جس کا نتیجہ یہ ہے کہ) میں ہوں اور بے زبانی کا دکھ ہے ۔ اور تو ہے تو 'بے دھانی' کی قید ہے ۔ (شعرا کے نزدیک معشوق کا دھن جتنا چھوٹا ہو اتنا ہی وہ حسین ہے ۔ چناں چہ اس میں اتنا مبالغہ ہوا کہ معشوق کا دھن سرے سے غائب کر دیا) ۔

منیر لاہوری (صفحہ ۲۰۴)

۱ ۔ غالباً اس سے مراد میرزا صفی مخاطب بہ سیف خاں ہے جو عہد شاہجہان میں ناظم الہ آباد تھا اور جس کے دربار سے منیر متعلق تھا ۔ یہ سیف خاں دور جہانگیر کے میرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ طہرانی کے فرزند میرزا ابوالحسن مخاطب بہ آصف خاں کا داماد تھا ۔

(سرو آزاد ، صفحہ ۶۰)

۲ ۔ نواب شائستہ خاں ، نواب آصف خاں کا بیٹا تھا ۔ شاہجہان اور عالمگیر کے ادوار میں منصب وزارت پر فائز رہا ۔ اس کا اصل نام ابو طالب تھا ۔ ۹۳ سال کی عمر میں بتاریخ ۱۶ شوال ۱۱۰۵ھ میں فوت ہوا ۔ (مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۸۸)

۳ ۔ جب نا انصاف بادل نے حرف 'خویش' کو پانی دیا تو میرے اشعار تر ہو گئے اور میں بھی اپنے اشعار کی طرح تر (بھیگ) ہو گیا ۔ میں شاعری سے ہاتھ دھو لوں گا کہ میرے اشعار کے منتخب نقطے پانی کے قطرے بن گئے ہیں ۔

۴ ۔ جو کچھ بھی ہو دیکھا جائے گا ۔

۵ - مال ، مالیدن سے ہے - بہ معنی پاؤں سے ملنا - یعنی دشمن کو روندنے والا زر بخش - خصال کے قافیہ اور زر کی رعایت سے یہ لفظ استعمال کیا - دوسرے معنی دشمن مال و دولت کے ہو سکتے ہیں -

۶ - اعتقاد خاں ، میرزا غیاث بیگ اعتماد الدولہ طہرانی کا بیٹا اور میرزا ابوالحسن آصف خاں کا چھوٹا بھائی تھا - (سرود آزاد ، صفحہ ۶۰)

۷ - ترجمہ اشعار :

(۱) کہ اس (نواب اعتقاد خاں) کی عنایت و مہربانی امید کا چہرہ چمکانے والی ہے - اس کی محبت سے سلطنت کی صبح سفید رو ہے (معزز و ممتاز ہے) -

(۲) خوش نصیبی کے لیے اس کا بخت ، نیک فال ہے - ہما اس کے سائے کا ایک مشت پر ہے - (ہما ایک فرضی پرندہ ہے ، جس کسی کے سر پر بیٹھ جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے) -

(۳) اس کے لشکر کا غبار گرد سے تیر فلک (عطارد) کو تیر خاکی مارتا ہے (تیر خاکی ، تیر کی ایک قسم جس کی انی ہڈی کی ہوتی ہے اور یہ تیر بہت اونچا جاتا ہے -

(۴) جب وہ جنگ کے وقت چار آئینہ (ایک جنگی لباس) پہنتا ہے تو خانۂ زین ، آئینۂ خانہ بن جاتا ہے -)

(۵) اس کے خنجر کی زبان بجلی کی سی چمک رکھتی ہے - اس کی تلوار کی کاٹ حاضر جواب (تیز) ہے -

۸ - میرا چہرہ عیش کے جام سے سرخ ہو گیا - میرا ستارہ (مقدر) آسمان کی آنکھ کا نور بن گیا - نصیبے نے میری کامیابی کی فال نکالی اور توفیق نے میری ہم راہی کی -

۹ - اگر تو کہے کہ میرے دروازے پر بستر (سامان) جما لے تو یہ میری عین خوش نصیبی اور خوش بختی ہو گی - اور اگر تو مجھے بیداد سے اپنے دروازے سے دھتکار دے تو یہ میرے بخت نارسا کا قصور ہوگا -

۱۰ - پاک اصل و نسل والے یعنی عمدہ اشعار۔

۱۱ - تمام اہل معنی تیرے دروازے کی طرف متوجہ ہوئے ہیں کیوں کہ در فیض ہمیشہ سب پر کھلا رہتا ہے۔

۱۲ - رودکی : فارسی شاعری کا باوا آدم ، سامانی دور کا سب سے بڑا شاعر - ابو عبد اللہ جعفر بن محمد رودکی سمرقند کے ایک قصبہ رودک میں پیدا ہوا - بقول عوفی (صاحب لباب الالباب) یہ مادر زاد اندھا تھا ، لیکن ایتھے نے اس کے اس قول کو صحیح نہیں مانا ہے - رودکی نہ صرف ایک شیریں مقال شاعر تھا ، بلکہ ایک بڑا خوش گلو موسیقار اور چنگ و عود بجانے میں ماہر تھا - شاعری میں اس کی عظمت کو نہ صرف اس کے معاصرین نے تسلیم کیا ہے ، بلکہ بعد میں آنے والے عظیم شعرا بھی اس کے قائل رہے ہیں - شعرا کے علاوہ علما و فضلا نے بھی اس کی تعریف و ستائش کی ہے - چناں چہ اسماعیل سامانی کے وزیر ابوالفضل بلعمی نے کہ خود ایک ادیب و فاضل تھا ، لکھا ہے کہ عرب و عجم میں اس کا کوئی ثانی نہیں - اس کا ایک مشہور واقعہ ہے جو تقریباً تمام تذکروں میں ملتا ہے - ایک مرتبہ نصر بن احمد سامانی بخارا سے ہرات گیا اور ایک مدت وہاں مقیم رہا - اس کے درباری جو اس کے ساتھ تھے اپنے وطن کو جانے کے لیے بے قرار تھے - انھوں نے ہر چند کوشش کی کہ بادشاہ کو پایۂ تخت واپس جانے پر مائل کیا جائے ، لیکن کوئی بات نہ بن سکی - آخر امرا وغیرہ رودکی کے پاس آئے تا کہ وہ اسے واپس جانے پر آکسائے - چناں چہ اس نے ایک قصیدہ لکھا جس کا مطلع ہے :

بوی جوی مولیان آید همی   یاد یار مهربان آید همی

اور بادشاہ کے حضور میں جا کر گا کے سنایا - بادشاہ پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ اس نے موزے بھی نہ پہنے اور بخارا کی طرف روانہ ہو گیا - بقول عوفی اس کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ اس کے پاس دو سو غلام تھے اور سو اونٹوں پر اس کا سامان لادا جاتا تھا - لیکن بعد میں چوں کہ بعض وجوہ کی بنا پر بادشاہ کی نظروں سے گر گیا ، اس لیے زندگی کے آخری ایام بڑی عسرت و تنگ دستی میں گزارے - اس کی وفات

۳۲۹ھ میں واقع ہوئی ۔ (لباب الالباب ، صفا جلد اول ، براؤن جلد اول، شعر العجم جلد اول ، شفق ، تنقید شعر العجم ۔)

۱۳ ۔ امیر نصر بن احمد ، سامانی خاندان کا بادشاہ اور رودکی کا ممدوح ۔ اپنے باپ کے قتل کے بعد جب کہ یہ آٹھ برس کا تھا ، سامانی امرا کے اتفاق سے تخت نشین ہوا ۔ بعض سرداروں اور عزیزوں حتٰی کہ اس کے تین بھائیوں نے اس کی مخالفت کی لیکن وہ مغلوب ہوئے ۔ اس نے کئی اور فتوحات بھی کیں جن کے سبب سامانی سلطنت کی حدود عراق و عرب تک جا پہنچیں ۔ اس کے دور میں اسماعیلی مذہب کا خاصا چرچا تھا ۔ خود نصر بھی اس مذہب کی طرف مائل تھا ، لیکن اپنے ترک غلاموں کی مخالفت کے باعث اس مذہب سے کھلم کھلا بے زاری کا اظہار کیا اور تخت اپنے بیٹے نوح کے سپرد کیا ۔ ۳۳۱ھ میں اس نے ۳۸ سال کی عمر میں مرض سل سے وفات پائی ۔ یہ بڑا نیک سیرت ، کریم اور عادل تھا ۔ اپنی انھی صفات کے سبب امیر سعید کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔ (خلاصۂ تاریخ ایران از حجازی مطبوعہ ایران صفحہ ۸۴)

۱۴ ۔ فردوسی : اس کے نام کے متعلق تذکرہ نگاروں اور مؤرخوں میں اختلاف ہے ۔ لیکن بقول حافظ محمود شیرانی مرحوم اس سلسلے میں سب سے بہتر مدار علیہ دیباچہ قدیم شاہ نامہ ہے جس کے مطابق فردوسی کا نام حکیم ابوالقاسم المنصور الفردوسی تھا ۔ فردوسی ۳۲۲ھ - ۳۲۹ھ کے درمیان طابران (طوس) کے ایک قصبہ باژ میں پیدا ہوا ۔ آغـاز میں یـہ زمیندار تھا اور اس کی زندگی فارغ البالی میں گزرتی تھی ۔ ایک باغ میں رہایش تھی جس میں اکثر اس کے یار و ندیم موجود رہتے ۔ یہیں یہ شعر و شاعری کرتا ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس نے محمود غزنوی کے کہنے پر شاہ نامہ لکھنا شروع کیا تو یہ غلط ہے ۔ کیوں کہ موجودہ تحقیق کے مطابق اس نے اپنے وطن ھی میں اس کا آغاز کر دیا تھا اور جب وہ بقول شیرانی مرحوم ۳۸۸ھ میں غزنی آیا ہے تو اس وقت کئی اشعار لکھ چکا تھا ۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ محمود نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے ایک شعر کے بدلے

ایک اشرفی دے گا ۔ البتہ جیسا کہ شفق نے لکھا ہے خود فردوسی نے آخری عمر میں تنگ دستی سے مجبور ہو کر انعام و صلہ کی امید میں شاہ نامہ محمود کے نام معنون کرنا چاہا تھا ۔ لیکن اس کے بد خواہوں نے اس کے خلاف بادشاہ کو بدظن کر دیا جس کے سبب بادشاہ نے اس اہم کتاب کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی ۔ فردوسی پر خارجی ہونے اور محمود کی ہجو وغیرہ کہنے کے الزامات عاید کیے جاتے ہیں ، لیکن شیرانی مرحوم نے 'فردوسی پر چار مقالے' ، 'مقالات شیرانی' اور 'تنقید شعر العجم' میں ایسے کئی ایک الزامات کو خود فردوسی کے کلام سے شواہد دے کر غلط ثابت کیا ہے ۔

فردوسی کو اپنی زندگی میں جو سب سے بڑا صدمہ پہنچا وہ اس کے جوان سال بیٹے کی موت تھی ۔ اس وقت فردوسی کی عمر ٦٥ سال کی تھی ، جب کہ لڑکے کی عمر ۳۷ برس تھی ۔ فردوسی نے ۴۱۱—۴۱٦ کے درمیان وفات پائی اور اس کی یادگار اس وقت صرف ایک لڑکی تھی ۔ (براؤن جلد دوم ، صفا جلد اول ، شفق ، شعر العجم جلد اول ، تنقید شعر العجم ، فردوسی پر چار مقالے ، مقالات شیرانی) ۔

۱۵ ۔ شاہ نامہ : اس پر فردوسی نے ۳۰ ۔ ۳۵ برس صرف کیے ۔ اشعار کی کل تعداد ساٹھ ہزار ہے ۔ اس ضخیم مثنوی کی تصنیف کے لیے فردوسی نے کئی ایک ماخذ کھنگالے ۔ علاوہ ازیں بخارا اور ہرات وغیرہ شہروں کا بھی سفر کیا ۔ تاریخی سرمایہ کے لیے چوں کہ اسے قدیمی ذرائع بھی درکار تھے اس لیے اس نے اس ضرورت کے پیش نظر اپنے آپ کو زردشتی روایت کا پابند کر لیا ۔ چناں چہ ایسی ہی کتاب پسند کی جس کے راوی اور مدون مجوسی و پارسی تھے ۔ اس قسم کی کتب میں اوستا ، بندھشن اور دینکرت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ بقول شفق اس کا سب سے اہم ماخذ شاہ نامہ ابو منصوری ہے جو طوس کے فرماں روا (چوتھی صدی ہجری کے وسط میں) ابو منصور محمد بن عبدالرزاق طوسی کے ایما پر کئی ایک دانش مندوں نے مل کر نثر میں لکھا تھا ۔

شاہ نامہ فردوسی کا آغاز خدا کی حمد ، 'سخن در وصف دانش و خرد' ، نعت رسول صلعم اور خلفاے راشدین رض وغیرہ سے ہوتا ہے ۔

سب سے پہلی داستان کیومرث کی ہے جو ایران کے اولین بادشاہوں میں سے تھا ۔ شاہ نامہ کے اختتام تک پچاس بادشاہوں کا ذکر آتا ہے ۔ آخری حصے میں مسلمانوں کی ایران میں فتوحات کا تذکرہ ہے ۔ رستم و سہراب اس کی اہم داستانوں میں سے ایک ہے ۔ بادشاہوں کی جنگوں ، ان کے ہتھیاروں ، جنگ لڑنے کے طریقوں اور فوجی و شاہی لباسوں کے بارے میں فردوسی نے بڑی تفصیل سے بحث کی ہے ۔ علاوہ ازیں ہر دور کے طرز بود و باش ، رسوم ، تہذیب وغیرہ کے بارے میں تفصیلات دی ہیں ۔ اس لحاظ سے ایران قدیم کے متعلق یہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہے ۔ بہ ظاہر تو شاہ نامہ ایک رزمیہ داستان ہے ، لیکن شاعر کو جہاں بھی موقع ملا ہے اس نے اس میں بڑے بلند فلسفیانہ ، اجتماعی اور اخلاقی مضامین کھپائے ہیں ۔ بڑی سحر آمیز نصیحتوں اور عبرت انگیز باتوں سے اسے سجایا ہے ۔ شاہ نامہ ۴۰۰ھ میں مکمل ہوا ۔ (ایضاً) ۔

۱۶ ۔ محمود : یمین الدولہ ابو القاسم محمود ، سبکتگین کا بیٹا تھا ۔ سبکتگین ، الپتگین کا ایک ترک غلام تھا ، جو خود ایک ترک غلام تھا جسے سامانی بادشاہ احمد بن اسماعیل نے خریدا اور اپنی ملازمت میں رکھا تھا ۔ الپتگین نے محمود کے والد کو نیشا پور میں خریدا اور بعد میں اسے اپنا داماد بنا لیا تھا ۔ الپتگین کی وفات کے وقت غزنی خاندان (جس کا بانی یہی الپتگین تھا) کے پاس غزنہ کا مختصر سا علاقہ تھا جس پر اسحاق بن الپتگین حکم ران تھا ۔ اسحاق ۳۵۵ھ میں فوت ہو گیا ۔ اس کے ایک سال کے بعد سبکتگین اس کا جانشین بنا ۔ اس نے کئی ایک علاقے فتح کرکے غزنوی سلطنت کو وسعت دی ۔ ۳۸۷ھ میں جب یہ فوت ہوا تو محمود اس وقت نیشاپور میں تھا ۔ محمود کے چھوٹے بھائی اسماعیل کو باپ کی وصیت کے مطابق تخت نشین کیا گیا ۔ محمود نے اس سے جنگ کرکے اس پر فتح پائی ، لیکن اسے حکومت میں شریک کر لیا ۔ اس طرح محمود اپنے باپ کا جانشین بنا ۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے سامانی حکم رانوں کو شکستیں دے کر ان کے علاقے بھی ہتھیا لیے ۔ ابتدائی ایام حکومت میں

اس کی خلیفۂ وقت القاضی باللہ سے ٹھن گئی ، لیکن خود خلیفہ نے اس معاملہ کو ٹھنڈا کیا ، اسے خلعت فاخرہ بھیجی اور خطاب 'امیر الملت یمین الدولہ' سے نوازا ۔ ماہ شوال ۳۹۱ھ مطابق ۱۰۰۰ع اس نے ہندوستان کا رخ کیا ۔ یہاں جے پال سے مقابلہ ہوا ۔ فتح محمود کو ہوئی ۔ یہ فتح بروز ہفتہ ۸ محرم الحرام ۳۹۲ھ مطابق ۱۰۰۱ع کو ہوئی ۔ اس طرح اس نے ہندوستان پر کئی حملے کیے۔ ان حملوں میں سب سے زیادہ اہم حملۂ سومنات ہے ۔ آخر میں اس پر دق کا حملہ ہوگیا تھا جس کے سبب اس نے ساٹھ برس کی عمر میں بروز منگل ۲۳ ربیع الاول ۴۲۱ھ کو وفات پائی اور غزنی میں مدفون ہوا ۔ بدایونی اس کے متعلق لکھتا ہے کہ ''سلطان محمود نے بارہ مرتبہ ہندوستان پر چڑھائی کی اور ہر مرتبہ وہ بے پناہ جذبۂ جہاد کے ساتھ سرگرم عمل تھا ۔'' محمود غزنوی صرف ایک فوجی ہی نہیں تھا ، بلکہ علما و فضلا و شعرا وغیرہ کا بہت بڑا مربی تھا ۔ ملا بدایونی اور بعض دیگر مؤرخین نے اسے کنجوس لکھا ہے ، لیکن یہ محض غلط فہمی یا تعصب کی بنا پر ہے ۔ محمود کے بارے میں تو بہ قول شیرانی مرحوم ، یہ ہے کہ ''وہ ہاتھی بھر بھر کر انعامات دینے کا عادی تھا ۔ ایسی تلمیحیں موجود ہیں جن میں محمود کے ایسے ہاتھیوں کا ذکر آتا ہے ۔ سلطان محمود شعرا پر چار لاکھ دینار سالانہ صرف کیا کرتا تھا ۔ ہر نئے شاعر کو اس کے دربار میں عزت کے ساتھ جگہ دی جاتی تھی ۔ وہ شاعروں کو دیکھ کر مسرور ہوتا تھا ۔'' چار سو شعرا کے علاوہ کئی ایک بڑے بڑے عالم و دانش مند ، (ابو ریحان بیرونی وغیرہ) بھی اس کے دربار سے وابستہ تھے ۔ محمود مربی شعر و شعردوست ہونے کے علاوہ خود بھی شاعر تھا ۔ چناں چہ ذیل کی غزل اور قطعہ اسی کے ہیں ۔

غزل

من گرد دل خویش ہوای تو تنیدم
با مہر تو پیوستم و از خویش بریدم
دیگر ز بتان چون تو ندیدم ز پی آنک
بت نیست بجای کہ من آنجا برسیدم

با من بچخیه آن که چو او کس نه گرفتم
نگرفت سر زلف تو هر چند چخیدم
چون زلف شدم دست و چو بتخانه شدم روی
چون زلف تو کاویدم و چون روی تو دیدم
گفتم که یکی بنده خریدم بدرم من......
نی نی غلط است این که خداوند خریدم

قطعه ذیل اس نے اپنی وفات سے قریب زمانے میں لکھا تھا :

ز بیم تیغ جهانگیر و گرز قلعه کشای
جهان مسخر من شد چو تن مسخر رای
گهی بعزو بدولت همی نشستم شاد
گهی ز حرص همی رفتمی ز جای بجای
بسی تفاخر کردم که من کسی هستم
کنون برابر بینم همی امیر و گدای
اگر دو کلهٔ بوسیده بر کشی ز دو گور
سر امیر که داند ز کله گرّای[1]
هزار قلعه کشادم بیک اشارت دست
بسی مصاف شکستم بیک فشردن پای
چو مرگ تاختن آورد هیچ سود نکرد
بقا بقای خدایست و ملک ملک خدای

(منتخب التواریخ اردو ترجمه ، صفحه ۳۶-۴۱ - تنقید شعر العجم ، صفحه ۵۷ ، ۶۰ - خلاصهٔ تاریخ ایران ، صفحه ۸۶-۸۹)

۱۷- فرّخی : غزنوی دور کے بزرگ شعرا میں سے اور ابوالحسن علی نام تھا - باپ کا نام جولوغ تھا - سیستان کا رہنے والا تھا - بہ قول شیرانی مرحوم ۳۷۰ھ سے کچھ پہلے پیدا ہوا - اس کا باپ والی سیستان امیر خلف بالو کے ہاں ملازم تھا - فرخی محمود کے دربار میں پہنچنے سے پیشتر سیستان ہی میں کسی زمیندار کی نوکری کرتا تھا - جب اس کی شادی ہوئی تو اس کے لیے اس تنخواہ میں گزارا کرنا مشکل

۱ - گرای - حجام ، غلام

ہو گیا ۔ چوں کہ اسے قدرت کی طرف سے ذوق لطیف ، عمدہ آواز اور قریحۂ خوش ودیعت ہوا تھا ، اور یہ اچھے شعر کہہ اور گا سکتا تھا ، اس لیے یہ اس ٹوہ میں رہنے لگا کہ کسی مربیٔ شعر کا پتا چلے تو اس کی طرف رجوع کرے ۔ چناں چہ اسے چغانیاں کے حاکم ابوالمظفر احمد بن محمد کا پتا دیا گیا ۔ یہ ایک قافلہ کے ہمراہ اس طرف ہو لیا اور چند اشعار امیر ابوالمظفر کی مدح اور اپنی شاعری کی توصیف میں لکھے ۔ چغانیاں پہنچا تو امیر اس وقت بچھیروں کو داغنے کے لیے داغ گاہ کو جا چکا تھا اس نے اپنا قصیدہ امیر کے پیش کار امیر اسعد کو پیش کیا ۔ وہ اسے داغ گاہ میں لے گیا اور ساتھ ہی اسے یہ کہا کہ داغ گاہ کی صفت میں کچھ لکھو ۔ اس نے اسی رات ایک قصیدہ تیار کیا ۔ دوسرے روز وہ قصیدہ امیر کے سامنے پڑھا ۔ امیر بڑا شعر شناس تھا ۔ یہ قصیدہ سن کر بڑا متحیر ہوا اور فرخی کو خوب انعام و کرام سے نوازا اور اسے دربار میں بلند مقام حاصل ہوا ۔ بے حد ثروت مندی اور جاہ و جلال نے اس کا استقبال کیا ۔ محمود کے بیشتر حملہ ہائے ہندوستان میں یہ اس کے ہمراہ رہا ۔ ان تمام باتوں کے باوجود کئی ایک مرتبہ اس پر شاہی عتاب بھی نازل ہوا ۔ فرخی نے ۴۲۹ھ میں وفات پائی ۔ بہ قول صفا اس کا شمار میدان بلاغت کے شاہ سواروں میں ہوتا ہے ۔ وہ اپنے قصیدوں کی تشبیب (تغزل) ، احساسات کی گہرائی ، زبان کی سادگی اور سخن کی شیرینی اور مٹھاس کے لیے قصیدہ سرا شعرا میں ویسا ہی بلند مقام رکھتا ہے جیسا سعدی کو غزل کے شعرا میں حاصل ہے ۔ (چہار مقالہ از عروضی سمرقندی مطبوعہ ایران ۔ صفا جلد اول ۔ براؤن جلد دوم ۔ تنقید شعرالعجم ۔ شعرالعجم جلد اول ۔ مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی اردو ترجمہ)

۱۸ - امیر ابوالمظفر : اس کے باپ کا نام احمد تھا ۔ یہ چغانی خاندان سے تھا جو امیر نصر سامانی (متوفی ۳۳۱ھ) کے عہد سے چغانیاں میں حکم ران رہا ہے ۔ یہ خاندان سامانیوں کے عہد میں سامانیوں کا برائے نام مطیع تھا ۔ غزنویوں کے دور میں یہ برقرار اور برسر حکومت رہا ۔ آل غزنہ سے ان کے اچھے مراسم تھے ۔ فرخی نے اپنے اس ممدوح

کا ذکر ایک آزاد اور مطلق العنان فرماں روا کی حیثیت سے کیا ہے ۔ چغانیان ، جہاں کا ابوالمظفر فرماں روا تھا ، ماوراء النہر میں ترمذ اور قبادیان کے درمیان واقع ہے ۔ (تنقید شعرالعجم ، صفحہ ٦٧-٦٨ - براؤن جلد دوم فارسی ترجمہ از آقای فتح اللہ مجتبائی ، صفحہ ١٧٩)

۱۹ - منوچہری : ابوالنجم احمد نام ، منوچہری تخلص ۔ اپنے پہلے ممدوح فلک المعالی منوچہر بن قابوس وشمگیر ، جو آل زیار (یہ خاندان ۳۰۳ھ سے ۴۳۰ھ تک طبرستان و جرجان کے اطراف میں برسر حکومت رہا) کا پانچواں حکم ران تھا ، کے نام پر تخلص منوچہری رکھا ۔ اگرچہ اس نے دور محمود میں ترقی کے تمام مراحل طے کیے ، لیکن اسے محمود کے دربار کے شعرا میں شمار کرنا مشکل ہے ۔ اس لیے کہ اس کے اشعار میں محمود کا نام کہیں نہیں آتا ۔ دامغان کا رہنے والا تھا ۔ منوچہر کی وفات (۴۱۱ھ) کے بعد مسعود غزنوی کے دربار سے وابستہ ہوا اور اس کی مدح میں کئی ایک قصائد لکھے ۔ عربی ادب میں اس کی مہارت غیر معمولی تھی ، تاریخ عرب اور تاریخ عجم سے خوب واقف تھا ، نجوم و ہیئت اور موسیقی کا بھی عالم تھا ۔ غیر معمولی حافظے کا مالک ہونے کی وجہ سے شعرائے عرب کا کلام اس کے ورد زبان رہتا تھا ۔ اس کی غیر معمولی علمیت ، فنی ، ادبی اور تاریخی تلمیحات نے اس کے دیوان کو مشکل اور ادق بنا دیا ہے ۔ شیرانی لکھتے ہیں ''منوچہری کو اس نئی صنف شاعری کا موجد کہنا چاہیے جس کی ابتدا اور نشو و نما شمال مغرب ایران میں ہوئی اور جس نے قطران تبریزی ، خاقانی اور نظامی جیسے شعرا پیدا کیے ۔'' اس نے اپنی شاعری میں عرب شعرا کی تقلید کی ہے ، اور منظر نگاری کے وقت بھی بیشتر عرب ماحول کو مد نظر رکھا ہے ۔ منوچہری نے ۴۳۲ھ کے لگ بھگ وفات پائی ۔ (کتب مذکورہ)

۲۰ - سبکتگین کا ذکر محمود کے تذکرہ میں گزر چکا ہے ۔ جیسا کہ منوچہری کے ذیل میں لکھا جا چکا ہے ، اس کا محمود سے کوئی تعلق نہ تھا ، منیر نے یہاں ٹھوکر کھائی ہے ۔

۲۱ - انوری ، اوحد الدین محمد نام ، انوری تخلص ۔ ابی ورد (خراسان)

کے ایک قصبہ بدنہ میں پیدا ہوا ۔ اس کا باپ محمد ایک شہزادی کریمۃ النسا رضیۃ الدین کی سرکار میں ایک قابل اعتماد منصب پر سرفراز تھا ۔ اس نے پہلے خاوری تخلص کیا ۔ لیکن بعد میں انوری رکھا ۔ سلجوقی دور کے عظیم شعرا میں اس کا شمار ہوتا ہے ۔ سب سے زیادہ ترقی اس نے سلطان سنجر کے زمانے میں کی ۔ ۵۴۲ھ میں جب سنجر نے دوسری مرتبہ خوارزم پر حملہ کیا تو وہ انوری کو اپنے ہمراہ لے گیا ۔ ۵۴۸ھ میں جب غز ترکوں نے بغاوت کی اور سلطان کو مغلوب و گرفتار کر لیا ، اور خراسان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو یہ بھی دوسرے علما و فضلا کی مانند خوف و پریشانی کا شکار ہوا اور بڑی مشکل سے جان بچائی ۔ اس نے خراسان کے کئی شہروں کا سفر بھی کیا اور ایک مدت تک بلخ میں مقیم رہا ۔ انوری علم نجوم کا ماہر تھا ۔ کہتے ہیں ۵۸۲ھ میں اس نے پیشین گوئی کی کہ ستاروں کے برج میزان میں اقتران کے موقع پر (جو ۵۸۲ھ میں ہوا) طوفانی ہوا چلے گی جس سے عمارات بنیادوں سے ہل جائیں گی ۔ چناں چہ لوگ خوف و دہشت کے سبب گھروں سے باہر نکل گئے اور جنگلوں میں ڈیرے ڈال دیے ، لیکن جب اقتران ہوا تو ہوا معمول کے مطابق رہی ۔ اس پر لوگوں نے اسے خوب مورد طعن و استہزا بنایا ۔ چناں چہ یہ مجبور ہو کر مرو سے نکل کھڑا ہوا ۔ وہاں سے نیشاپور اور پھر بلخ پہنچا ۔ اسی واقعہ کے بعد اس نے شاعری ترک کر دی اور گوشہ نشین ہو گیا ۔ اس کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف ہے ۔ کسی نے ۵۸۳ھ لکھی ہے تو کسی نے ۵۸۷ھ ۔ بہ قول شفق مؤخرالذکر تاریخ زیادہ قرین صحت ہے ۔ شیرانی مرحوم انوری کے علم و دانش کے متعلق لکھتے ہیں ''نجوم میں استاد ہونے کے علاوہ منطق ، فلسفہ اور ہیئت میں ماہر تھا ۔ حکمت اور فلسفہ میں اس کا پایہ نہایت بلند تھا ۔ طبیعیات اور الٰہیات میں کافی لیاقت رکھتا تھا ۔ شاعری جس کی بنا پر وہ دنیا میں مشہور و معروف ہے ، اس کے کمالات کا ایک ادنیٰ پایہ ہے ۔ نثر میں بھی صاحب قدرت تھا ۔''

(کتب مذکورہ)

۲۲ - سنجر: سلطان معز الدین ابوالحارث احمد سنجر سلجوقی دودمان

کا سب سے زیادہ علم پرور بادشاہ تھا ۔ پہلے ۴۹۰ھ سے خراسان و ماوراءالنہر کی حکومت اس کے پاس تھی ۔ ۵۱۱ھ میں جب غیاث الدین ابو شجاع محمد فوت ہوا تو ایران کے تخت پر اس کا چودہ سالہ فرزند محمود بیٹھا ۔ سنجر اس کے زیر فرمان نہ رہا (محمود سنجر کا بھتیجا تھا) اور خود کو سلطان کہلایا ، لیکن محمود کو کچھ نہ کہا اور مغربی علاقوں کو اپنے تصرف میں لے آیا ۔ مرو میں جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو محمود اس کی مخالفت میں اٹھا ۔ ۵۱۳ھ میں ساوہ کے مقام پر اس نے محمود کو شکست دی ۔ محمود اصفہان کی طرف بھاگ گیا ، لیکن سنجر نے اپنی والدہ تاج الدین خاتون (محمود کی دادی) کی وساطت سے اسے اپنا ولی عہد بنا لیا اور پانچ سال بعد اس کی شادی اپنی لڑکی سے کر دی ۔ اس کے دور کے اہم واقعات میں سے ایک جنگ قطوان ہے جس میں زرد پوست ترکوں نے ۵۳۶ھ میں اسے شکست دی اور اس کی بیوی ترکوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئی ۔ پھر غز ترکمانوں نے بغاوت کی ۔ ان سے دو لڑائیاں ہوئیں ۔ پہلی میں غزوں نے بلخ کو غارت کیا ، دوسری ۵۴۸ھ میں ہوئی ۔ اس میں سنجر اور اس کی بیوی شکست کھا کر غزوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے ۔ اب کے انھوں نے خراسان کو خوب تاخت و تاراج کیا ۔ سنجر تین سال تک گرفتار رہا ۔ اگرچہ غز اس کا بڑا احترام کرتے تھے ، لیکن اس پر کڑی نگرانی رکھتے تھے ۔ وہ بھی اس خیال سے کہ اس کی بیوی غزوں کے پاس نہ رہ جائے ، بھاگنے کا خیال دل میں نہ لاتا ۔ تا آنکہ اس کی بیوی فوت ہو گئی اور وہ ایک موقع پر شکار کے بہانے سے جیحوں تک چلا گیا ۔ وہاں سے ایک کشتی کے ذریعے جو پہلے ہی اس مقصد کے لیے رکھی گئی تھی ، ترمذ پہنچ گیا اور مرو میں آ کر پھر تخت نشین ہو گیا ۔ لیکن بڑھاپے اور بیوی کی موت کے غم کے سبب زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکا اور بہتر سال کی عمر میں ۶۱ برس تک حکومت و سلطنت کر کے ۵۵۲ھ میں فوت ہو گیا ۔ سنجر کا شمار ایران کے بہترین سلاطین میں ہوتا ہے ۔ یہ بڑا دلیر ، سخی اور رعیت پرور تھا ۔ ملک کی آبادی اور رعایا کی آسائش کے لیے اس نے بڑی کوششیں کیں ۔ شعرا کے ساتھ اس کی فیاضی کے قصے بہت سے

تذکروں میں بکھرے پڑے ہیں - شبلی مرحوم لکھتے ہیں ''سلطان سنجر کی قدر دانی اور حاتمانہ فیاضی نے پھر وہی محمودی دربار قائم کر دیا -'' شعرا کو اکثر ایک ایک رباعی فی البدیہہ کہنے پر ہزاروں کا انعام دے دیا کرتا تھا - (خلاصہ تاریخ ایران ، صفحہ ۱۰۳ - ۱۰۶ - شعرالعجم جلد اول مطبوعہ اعظم گڑھ ، صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹)

۲۳ - خاقانی : افضل الدین بدیل ابراہیم خاقانی شروانی ، باپ کا نام علی تھا - ایران کے نامور شعرا اور درجہ اول کے قصیدہ سراؤں میں شمار ہوتا ہے - ۵۲۰ھ کے لگ بھگ شروان میں پیدا ہوا - پہلے اس نے حقایقی تخلص رکھا ، بعد میں جب خاقان اکبر منوچہر بن فریدوں شروان شاہ سے وابستہ ہوا تو اس کی مناسبت سے خاقانی تخلص رکھا - اس کا باپ ایک ترکھان تھا اور ماں ایک عیسائی عورت تھی ، جس کا تعلق عسائیوں کے نسطوری فرقے سے تھا - (نسطور ایک ترسا دانش مند تھا ، ۳۸۰ء سے ۴۴۰ھ ، جس نے کئی پیرو پیدا کر لیے تھے) لیکن بعد میں مسلمان ہو گئی تھی - خاقانی کی شروع کی زندگی تنگ دستی و عسرت میں گزری - باپ کے مرنے کے بعد یہ ماں کا محتاج رہا جو باورچن اور جولاہوں کا کام کرکے اپنا پیٹ پالتی تھی - شروان میں اسے کوئی ہمدرد دوست بھی نہ ملا تھا ، جس کے سبب اس کا غم ہی غلط ہوتا - البتہ اس کے چچا کافی الدین عمر بن عثمان نے بڑے اچھے طریقے سے اس کی سرپرستی کی - اس کا یہ چچا حکمت و فلسفہ میں خاصی دسترس رکھتا تھا - اس نے ادب و دانش میں اس کی پرورش کی - ابو العلا گنجوی نے جو اس کا استاد بھی تھا اور خسر بھی ، اسے خاقان کبیر کے دربار میں پہنچایا - لیکن بعد میں خسر اور داماد کی آپس میں نہ بنی ، اور دونوں نے ایک دوسرے کی خوب خوب ہجویں کہیں -

خاقانی ایک فاضل و دانش مند آدمی تھا جس کا اعتراف خود اس کے معاصر شعرا نے بھی کیا ہے - اسے فنون ادب ، فلسفہ ، علوم دینی اور عربی زبان وغیرہ پر خاصا عبور تھا - خاقان اکبر کے دربار میں اسے بڑا درجہ حاصل تھا اور یہ گران بہا انعام و اکرام سے نوازا گیا - لیکن اپنی طبع آزاد کے سبب جلد ہی شروان شاہ کی خدمت

سے ملول ہو گیا ۔ چناں چہ اس نے اساتذہ ایران سے ملاقات کرنے اور دیگر درباروں تک رسائی پانے کے خیال سے یہ خدمت ترک کرنا چاہی لیکن شروان شاہ اس کے جانے پر راضی نہ تھا ۔ آخر اسے جانے کا موقع مل گیا ۔ عراق سے ہوتا ہوا رے تک پہنچا ، لیکن وہاں بیمار ہو گیا ۔ اسی دوران میں خراسان پر غزوں کے حملے کی خبر ملی جس کے سبب شروان چلا گیا ۔ تھوڑی ہی مدت یہاں ٹھہرا تھا کہ پھر حج کی اجازت لے کر نکل کھڑا ہوا ۔ جب واپس آیا تو پھر شروان شاہ (خاقان اکبر) کے دربار سے متعلق ہو گیا ، لیکن اس مرتبہ کسی وجہ سے خاقان کا معتوب ہوا اور قید میں ڈال دیا گیا ، جہاں سے ایک سال کے بعد رہائی ہوئی ۔ ۵۶۹ھ میں پھر حج کرنے گیا ۔ شروان میں واپسی کے بعد ۵۷۱ھ میں اس کا ۲۰ سالہ بیٹا رشید الدین فوت ہو گیا ۔ اس قسم کی مصیبتوں نے اس کا دل توڑ دیا جس کے سبب وہ تبریز میں گوشہ نشین ہو گیا اور وہیں ۵۹۵ھ کے لگ بھگ فوت اور تبریز کے محلہ سرخاب کے مقبرۃ الشعرا میں مدفون ہوا ۔ خاقانی کا شمار فارسی کے بزرگ ترین قصیدہ سراؤں میں ہوتا ہے ۔ چوں کہ اسے کئی ایک علوم پر عبور تھا اس لیے اس نے اپنے کلام میں بیشتر مواقع پر ان علوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں جس سے اس کے اشعار میں خاص علمی مضامین آ گئے ہیں جو اس سے پہلے شعرا میں نہیں ملتے ۔ چناں چہ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ نئی نئی دقیق تراکیب کے سبب اس کا کچھ کلام خاصا مشکل ہو گیا ہے ۔ (کتب مذکورہ)

۲۴ ۔ خاقان کبیر ، منوچہر بن فریدون شروان کا بادشاہ تھا ۔ شروان کے حکمرانوں کو شروان شاہ کہا جاتا ہے ۔ شروان شاہ کا لقب ایران میں ظہور اسلام کے ساتھ ہی وجود میں آیا ہے ۔ مسلمانوں کے ایران پر غلبہ کے بعد شروان کے امرا خلیفہ کی طرف سے متعین کیے گئے حکام کے تحت ہوتے تھے ۔ لیکن یہ لقب ہمیشہ ان کے ساتھ رہا جو وہاں حکومت کرتے ۔ چوتھی صدی ہجری کے اوائل میں ایران شاہ محمد بن یزید نے ، جو خود کو ساسانی نسل سے سمجھتا تھا ، شروان پر قبضہ کر لیا ، اور شروان شاہ کا لقب اپنے ساتھ مختص کر لیا ۔ اس طرح

شروان میں شاہان ایرانی کا ایک نیا خاندان وجود میں آیا ۔ ان لوگوں نے شماخہ (شماخی) کو پایہ تخت بنایا اور پھر یہ ہمیشہ ان کا پایہ تخت رہا ۔ شروان شاہوں کو اگرچہ مخالفین کا بھی سامنا کرنا پڑا ، تاہم وہ سلجوق دور تک اسی طرح حکومت پر قابض رہے اور سلجوقیوں کے ساتھ ان کے مراسم بھی رہے ۔ ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۵ھ) کے دور میں فریبرز شروان شاہ تھا ۔ اس نے ملک شاہ کی اطاعت قبول کر لی ۔ پھر سلطان محمود سلجوق (۵۱۱ھ - ۵۲۵ھ) کے زمانے میں سلجوقیوں نے شروان پر قبضہ کر لیا ۔ سلطان خود شروان گیا ۔ فریبرز اس خیال سے کہ اپنی سلطنت واپس لے ، سلطان سے ملا ۔ لیکن اسے قید کر لیا گیا جہاں وہ ۵۱۷ھ میں مر گیا ۔ فریبرز کے بعد اس کے بیٹے منوچہر کو سلطنت ملی ۔ اس کے بعد اس کا بھائی افریدون تخت پر بیٹھا ، لیکن وہ ۵۱۴ھ میں گرجیوں کے ہاتھوں مارا گیا ۔ افریدون کے بعد اس کا بیٹا منوچہر ثانی تخت پر بیٹھا ۔ یہی منوچہر ثانی خاقان اکبر ہے اور خاقانی کا ممدوح ۔ شروان شاہوں کا سب سے اہم دور اسی منوچہر ثانی کا دور ہے ۔ اس نے شروان شاہ کے لقب کے ساتھ خاقان اکبر کے لقب کا اضافہ کر لیا ۔ بڑا علم پرور اور شعر دوست تھا ۔ (صفا جلد دوم صفحہ ۴۲ ، ۴۳) ۔

۲۵ - معزی ، ابو عبداللہ محمد بن عبد الملک معزی ۔ نیشاپور کا رہنے والا اور ملک شاہ سلجوقی کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ اس کا والد بھی شاعر تھا اور برہانی تخلص کرتا تھا ۔ اس نے اپنے ممدوح معزالدین والدنیا ملک شاہ سے اختصاص کے سبب اپنا تخلص معزی رکھا ۔ اس کا باپ برہانی اس ملک شاہ کا ملک الشعرا تھا ۔ باپ کے مرنے کے بعد یہ اس کے دربار سے وابستہ ہوا ۔ لیکن ایک سال تک اسے کچھ بھی نہ ملا ۔ آخر شاہزادہ علاء الدولہ امیر علی فرامرز کی وساطت سے اس کی رسائی بادشاہ تک ہوئی جب کہ وہ رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے اپنے سراپردہ سے باہر نکل رہا تھا ۔ سلطان نے سب سے پہلے چاند دیکھا ۔ اس پر اس نے فی البدیہہ ایک رباعی کہی جس پر اسے ایک قیمتی گھوڑا انعام میں ملا اور اس طرح کئی مواقع پر اس نے فی البدیہہ اشعار

کہہ کر انعام و اکرام حاصل کیا ۔ سلطان نے اسے امیر کا لقب دیا اور یوں یہ سلطان کا ندیم بن گیا اور اس کے دن پھر گئے ۔ اس دن سے ۴۸۵ھ (وفات ملک شاہ) تک یہ ملک شاہ کے دربار سے متعلق رہا ۔ اس کے بعد کچھ عرصہ تک ہرات ، نیشاپور اور اصفہان وغیرہ میں رہا اور مختلف سلجوقی امرا کی مدح سرائی کی ۔ جب سلطان سنجر تخت نشین ہوا تو معزی اس کے پاس آ گیا اور تا حین حیات اس کی ملازمت میں رہا ۔ ایک روایت کے مطابق سنجر نے اسے روم کی سفارت پر بھی بھیجا تھا ۔ اس کی وفات کے متعلق عوفی نے لکھا ہے کہ ایک روز سلطان تیر اندازی کر رہا تھا کہ اچانک نشانہ خطا ہونے سے ایک تیر اسے آ لگا (یہ اس وقت قریب ہی کھڑا تھا) ، جس سے اس کی موت واقع ہو گئی ۔ لیکن خود شاعر کے کلام سے پتا چلتا ہے کہ وہ اس حادثہ کے کچھ عرصہ بعد تک زندہ رہا ۔ اس لحاظ سے اس کی وفات ۵۲۰ھ کے قریب واقع ہوئی ۔ معزی ایران کے بڑے شعرا میں گنا جاتا ہے ۔ اس کی استادی و عظمت کو سراہا گیا ہے ۔ اس کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اس کی سادگی ہے ۔ بہت سے مطالب کو سادہ اور تکلف سے عاری الفاظ میں ادا کرتا ہے ۔ اس کے کلام میں تعقید اور ابہام نہیں ہے ۔ (کتب مذکورہ و دیوان امیر الشعرا معزی با مقدمہ و حواشی بہ سعی و اہتمام عباس اقبال ، تہران ۱۳۱۸ ش) ۔

۲۶ ۔ ملک شاہ ، جلال الدین ابو الفتح حسن ملک شاہ ۔ سلجوقی بادشاہ الپ ارسلان کا بیٹا تھا ۔ خلیفۂ وقت کی طرف سے اسے 'معزالدین و الدنیا' کا لقب عطا ہوا تھا ۔ ۴۶۵ھ میں اپنے باپ کے مرنے کے بعد تخت نشین ہوا ۔ اس وقت اس کی عمر ۱۷ - ۱۸ برس سے زیادہ نہ تھی ۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے اپنے چچا قاورد کو جو سلطنت کا دعوے دار تھا ، شکست دینے کے بعد قتل اور اس کے دو بیٹوں کو اندھا کر دیا ۔ اس کے بعد اس نے اور بھی کئی ایک فتوحات کیں ۔ اس کے دور کا ایک اہم کارنامہ رصد خانہ ہے جسے عمر خیام اور دیگر دانش مندوں نے مل کر ۴۶۷ھ میں تیار کیا ۔ اور تاریخ جلالی ، جس کا ملک شاہ بڑا شائق تھا ، کا آغاز نو روز ۴۷۱ھ (۱۰۷۹ع) سے انھی لوگوں کے ہاتھوں

ترتیب پذیر ہوا - ۴۷۳ھ میں ملک شاہ نے اپنی ایک لڑکی خلیفہ المقتدی کے حرم میں دے دی - انھی دنوں اس کا بیٹا داؤد فوت ہو گیا - اس کا اسے بے حد صدمہ ہوا - شاید خود کو ہلاک کر لیتا - لیکن دوسرے فرزند (سنجر) کی ولادت کے سبب یہ غم کم ہو گیا - اپنی سلطنت کے دوران میں یہ دو مرتبہ بغداد گیا - دوسری مرتبہ اپنی وفات سے ایک سال قبل وہاں گیا - اس نے ماہ شوال ۴۸۵ھ میں وفات پائی - اس کے دور میں سلجوقی خاندان کی عظمت و جبروت اپنے اوج کو پہنچ گئی تھی - اس سلطنت کی حدود چین و ختا و ختن تک پھیل گئی تھیں - وہ ذاتی طور پر فریاد سنتا اور دادخواہوں اور مظلوموں سے چہرہ نہ چھپاتا - مذہبی معاملات میں اس کی دل چسپی کا پتا اس سے چلتا ہے کہ اس کے حکم سے حاجیوں کے راستے میں بہت سے کنویں کھودے گئے اور حاجیوں کو جو خاص رقم امیر الحرمین کو دینا پڑتی تھی ، وہ بھی انھیں معاف ہو گئی - اس نے ہرنوں اور گورخروں کے سموں اور سروں سے مینار بنوائے - شکار کا بڑا شائق اور ماہر تھا - ابن الاثیر کے مطابق بے حد شکار مارنے کے سبب یہ آزردہ و نادم ہوتا تھا - ایک مرتبہ اس نے کوئی دس ہزار جانور شکار کیے - بعد میں دس ہزار دینار صدقہ کے طور پر درویشوں میں بانٹ دیے - اس کے علاوہ بے حساب مال و لباس اپنے ہمراہیوں میں بانٹ دیا - اس کے بعد جب بھی وہ کوئی شکار کرتا ، اس کے صدقہ میں ایک دینار دے دیتا - اسے تمام شہروں میں اصفہان زیادہ پسند تھا - اسی وجہ سے وہیں مقیم رہتا - اس شہر کو اس نے بہت سی عمارات و باغات عمدہ سے سجا رکھا تھا - (راحة الصدور و آیة السرور بہ حوالہ براؤن جلد دوم فارسی ترجمہ از آقای مجتبائی صفحہ ۲۶۵ - ۲۷۰ ، خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۰۰ ، ۱۰۱ ، سیاست نامہ نظام الملک طوسی اردو ترجمہ صفحہ ۱۷۲) -

۲۷ - ظہیر ، ظہیر الدین ابوالفضل طاہر بن محمد - تخلص ظہیر - فاریاب کا باشندہ ہونے کے سبب فاریابی کہلایا - تاریخ ولادت کا صحیح علم نہیں - تاہم قیاس غالب ہے کہ چھٹی صدی ہجری کے نصف اول کے وسط میں پیدا ہوا ہوگا - ایام جوانی فاریاب اور نیشا پور میں گزرے -

اس دوران میں مختلف علوم و فنون حاصل کیے ۔ سب سے پہلے اس نے نیشاپور میں عضدالدین طغان شاہ کی مدح میں شعر کہے ۔ نیشا پور میں اس کا قیام ۵۷۷ھ سے ۵۸۲ھ تک رہا ۔ اسی دوران میں ظہیر نے ، جب کہ وہ ادب کے علاوہ علوم عقلی میں بھی خاصی دسترس بہم پہنچا چکا تھا ، علم نجوم کی طرف توجہ کی ۔ انوری کے ذکر میں یہ کہا جا چکا ہے کہ اس نے طوفان کے بارے میں پیشین‌گوئی کی تھی ، جو غلط ثابت ہوئی ۔ جن لوگوں نے انوری کی پیشین گوئی کا بطلان کیا تھا ، ان میں سے ایک ظہیر بھی تھا ۔ ۵۸۲ھ سے بعد تک اس نے عراق میں قیام کیا ۔ نیشاپور سے نکلنے کے بعد وہ کچھ عرصہ اصفہان میں ٹھہرا جہاں اس نے صدر خجند کی مدح میں قصیدے کہے ۔ اس وقت تک اس کی زندگی کچھ تنگ دستی ہی میں گزری ۔ اصفہان سے وہ تقریباً ۵۸۵ھ میں نکلا ۔ خروج اصفہان سے بعد اس نے کئی ایک وزرا و رجال کی مدح میں قصیدے کہے۔ ان وزرا وغیرہ کی طرف سے یہ انعام و اکرام سے نوازا گیا ۔ پھر یہ اتابک قزل ارسلان کی خدمت میں آ گیا ۔ قزل ارسلان ۵۸۱ھ سے ۵۸۷ھ تک آذر بائیجان پر حکمران رہا ۔ اس سے پہلے وہ آذر بائیجان ہی میں اپنے بھائی کی اتابکی پر مامور تھا ۔ ظہیر نے اکثر قصائد اسی کی مدح میں کہے ہیں ، اور اس کا یہ مشہور شعر اسی قزل ارسلان کی مدح میں ہے :

نُہ کرسیٔ فلک نہد اندیشہ زیر پا   تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

اس کے بعد وہ اتابک ابوبکر سے متعلق ہو گیا ۔ سب سے زیادہ قصائد اس نے ابوبکر ہی کی مدح میں کہے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس کا زیادہ تر تعلق ابوبکر ہی سے رہا ۔ کہتے ہیں آخری عمر میں اس نے ملازمت ترک کر دی اور علم و عبادت میں مشغول ہو گیا ۔ تبریز میں اقامت اختیار کی ۔ ۵۹۸ھ میں وہیں فوت اور مقبرۂ سرخاب میں مدفون ہوا ۔ ظہیر کا شمار چھٹی صدی ہجری کے بزرگ شعرا میں ہوتا ہے (کتب مذکورہ) ۔ ظہیر کے دیوان مطبوعہ لکھنؤ پر یہ شعر مرقوم ہے 'دیوان ظہیر فاریابی ۔ در مکہ بدزد اگر بیابی' ۔ جس سے اس کے قاری کے دل پر دیوان کھولے اور پڑھے بغیر ہی اس کی بے پناہ عظمت

کا رعب سا بیٹھ جاتا ہے ۔ لیکن حقیقت میں اس شعر کا پس منظر کچھ اور ہے ۔ واقعہ یوں ہے کہ جامی رح کا ایک ہم عصر شاعر ، کہ خود تیسرے درجے کا شاعر تھا ، جامی رح کو شاعر نہیں مانتا تھا اور کہتا تھا کہ جامی دوسروں کے معانی چرا کر اپنے اشعار میں کھپا دیتے ہیں ۔ چناں چہ ایک موقع پر ، جب کہ جامی رح حج کو جا رہے تھے ، اس نے ایک قطعہ لکھا جس میں ہے کہ تم شعر کہنا کیا جانو ، دوسرے شعرا کے مضمون چرا کر اپنا گھر پورا کرتے ہو وغیرہ ، اور آخر میں مذکورہ شعر تھا جس سے اس کی مراد یہ تھی کہ ایک ظہیر تم سے بچ گیا ہے ، سو اب تم کعبہ جا رہے ہو وہاں اگر اس کا دیوان مل جائے تو اسے چرا لینا یعنی اب اس کے مضامین چرا کر شعر لکھنا ۔

۲۸ ۔ قزل ارسلان ۔ اس کا تعلق اتابکان آذربائیجان سے ہے ۔ سلجوقی سلاطین اپنی سپاہ میں عموماً ترکوں کو رکھا کرتے تھے ۔ ان میں سے جو لوگ شاہزادوں کی تربیت اور مختلف علاقوں میں حکمران شہزادوں کی سرپرستی پر مامور ہوتے انہیں وہ اتابک (پدر بزرگ) کا لقب دیتے ۔ جب سلجوقی خاندان رو بہ زوال ہوا تو کئی ایک اتابک خود مختار ہو گئے اور انہوں نے باقاعدہ حکومت تشکیل کرلی ۔ چناں چہ دمشق ، موصل ، فارس وغیرہ کے علاوہ آذربائیجان میں بھی اتابکوں نے اپنی ایک علیحدہ سلطنت قائم کر لی ۔ ان میں سب سے پہلے شمس الدین ایلدگز کا نام آتا ہے ۔ یہ مظفرالدین عثمان قزل ارسلان اسی ایلدگز کا بیٹا تھا ۔ یہ پہلے اپنے بھائی کے زمانے میں جب کہ وہ عراق میں تھا ، آذربائیجان کا حاکم تھا ۔ ۵۸۱ھ میں اس کے مرنے کے بعد اس کا جانشین بنا ۔ اس کا بھائی محمد جہان پہلوان ، طغرل بن ارسلان کا ، جسے پہلوان مذکور نے سات سال کی عمر میں تخت پر بٹھایا تھا ، سرپرست تھا ۔ جب قزل ارسلان اس کی جگہ آیا تو کچھ عرصہ بعد طغرل کو امرا وغیرہ کی مخالفت کے سبب عراق سے آذربائیجان کی طرف بھاگنا پڑا ۔ چوں کہ قزل ارسلان خود سلطنت کا خواہاں تھا ، اس نے موقع غنیمت جانا اور سلطان کے تمام ساز و سامان کو غارت کر دیا جس کے سبب سلطان طغرل مملکت سے بھاگ کھڑا ہوا ۔ اسی دوران میں

خلیفۂ بغداد نے خلعت سلطنت قزل ارسلان کے نام ارسال کر دی لیکن یہ حکومت اُسے راس نہ آئی اور وہ اسی سال یعنی ۵۸۷ھ میں اپنے خیمہ میں امرا کے ہاتھوں قتل ہوا۔ (صفا جلد دوم ، صفحہ ۲۷ ، ۲۸ - خلاصہ......صفحہ ۱۰۷)

۲۹ سیف - مولانا سیف الدین الاعراج ، اسفرنگ (ماوراء النہر) کا رہنے والا تھا ، اسی لیے سیف اسفرنگی کہلایا - خطۂ خوارزم میں نشو و نما پائی - مختلف علوم سے آراستہ تھا - بہ‌قول ہدایت ، ایل ارسلان خوارزم شاہ کے زمانے میں بخارا سے خوارزم گیا - دولت شاہ کے مطابق جب یہ ایل ارسلان کے پاس گیا تو اس نے اسے نوازا - بیشتر تذکرہ نویسوں کے اقوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سیف خوارزم شاہی عہد (ایل ارسلان کے عہد ۵۵۱ھ - ۵۶۷ھ سے عہد سلطان محمد خوارزم‌شاہ تک) کا شاعر تھا اور جیسا کہ کہا گیا ہے کہ اس نے پچاسی سال کی عمر میں ۶۷۲ھ میں وفات پائی ، تو اس لحاظ سے اس نے منگولوں کے عہد کا بھی بہت بڑا‌حصہ دیکھا ہے - لیکن اس کے کلام سے اس کی تردید ہوتی ہے - کیوں کہ یہاں اس کے یہاں سنجر (متوفی ۵۵۲ھ) اور محمود خان (م۵۵۸) کی مدح میں قصیدے ملتے ہیں - جب کہ اس کی اپنی تاریخ ولادت (پچاسی برس عمر، وفات ۶۷۲ھ کے لحاظ سے) ۵۸۷ھ ٹھہرتی ہے - بہر حال اس کی کی تاریخ وفات کے سلسلہ میں تذکرہ نویسوں نے ٹھوکر کھائی ہے - اس کی تاریخ وفات دراصل چھٹی صدی ہجری کے آخر میں ہونی چاہیے - سیف کے ممدوحین میں مذکورہ دو اشخاص کے علاوہ خسرو ملک غزنوی (۵۵۵ھ - ۵۸۲ھ) کا نام بھی آتا ہے (صفا جلد دوم ، صفحہ ۷۹۳-۷۹۷) - اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ منیر نے سیف کے ساتھ الپ ارسلان کا نام (بحیثیت ممدوح کے) غلط طور پر وابستہ کیا ہے - دراصل یہ ایل ارسلان ہونا چاہیے تھا -

۳۰ - الپ ارسلان - عضد الدولہ محمد الپ ارسلان جغری - ابن اثیر نے اس کی تاریخ ولادت دو جگہ پر مختلف دی ہے - ایک جگہ ۱۰۲۹ء (۴۲۰ھ) اور دوسری ۱۰۳۳ء (۴۲۴ھ) - لیکن مؤلف راحة الصدور ۴۳۱ھ

لکھتا ہے - ۴۵۵ھ (مطابق ۱۰۶۳ء) میں تخت نشین ہوا - اس نے تھوڑی ہی مدت میں اپنی سلطنت بہت وسیع کر لی - ۴۵۶ھ میں اس نے پورے ارمنستان اور گرجستان کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا - یہ وہ علاقے تھے جن پر مشرقی روم کے شہنشاہوں کی نظریں لگی رہتی تھیں - اس کے علاوہ ختلان ، ہرات اور صغانیان کے علاقے اپنی مملکت میں شامل کیے - فارس و کرمان کی شورشوں کو فرو کیا - خلفاے فاطمی کی طاقت ختم کرنے کے لیے حلب اور مکہ و مدینہ کے شہروں پران کا قبضہ ختم کیا - اس کا سب سے بڑا کارنامہ سپاہ روم پر فتح پانا اور قیصر روم دیوجانس رومانوس کو گرفتار کرنا ہے - اس کے پاس بارہ ہزار سوار تھے جب کہ دوسری طرف دو لاکھ فوج تھی اور اس میں یونانی ، رومی ، ترکی، گرجی ، قفقازی ، ارمنی اور فرنگی شامل تھے- یہ بڑا کارنامہ اس نے ۴۶۳ھ میں سر کیا - ۴۶۵ھ (نومبر ۱۰۷۲ء) میں یہ توران کے بادشاہ شمس الملک نصر کی سرکوبی کے لیے نکلا - اس کے ساتھ دو لاکھ لشکری تھے - جب یہ ساحل جیحون تک پہنچا تو اس کی فوج کو اس پار اترنے میں تین ہفتے لگ گئے - اس دوران میں ایک قلعہ کے محافظ یوسف خوارزمی (یا برزمی وغیرہ) کو پکڑ کر اس کے پاس لایا گیا - یوسف نے اس کے ساتھ گفتگو میں کچھ گستاخی کا مظاہرہ کیا - جس کے سبب اس نے طیش میں آ کر یوسف کے محافظوں کو اشارہ سے دور ہٹایا اور تیر سے خود اس کا نشانہ باندھا ، لیکن نشانہ خطا گیا - یوسف نے فوراً اپنی چھری سے اس پر وار کر دیا جس سے اسے مہلک زخم آیا اور وہ اس واقعہ کے چار روز بعد فوت ہو گیا - صاحب راحة الصدور (یہ کتاب ۵۹۹ھ میں تصنیف ہوئی) کے مطابق "الپ ارسلان کا قد دراز تھا - اس کی ڈاڑھی اتنی لمبی تھی کہ تیر اندازی کرتے وقت اسے گرہ دے لیتا - اسی طرح اس کی ٹوپی بھی بڑی لمبی ہوتی - چناں چہ ڈاڑھی کے سرے سے ٹوپی کے سرے تک دو گز کا فاصلہ ہوتا - وہ بڑا طاقت ور ، داد گستر اور سخی بادشاہ تھا - ظالموں اور غاصبوں کو کڑی سزائیں دیتا - غریبوں ، کمزوروں اور ناداروں میں ہر رمضان کے آخر میں پندرہ ہزار دینار تقسیم کرتا - اسے مطالعۂ تاریخ سے بڑا

لگاؤ تھا ۔'' (براؤن جلد دوم فارسی ترجمہ ، صفحہ ۲۵۹-۲۶۳ -
خلاصہ تاریخ ایران ، صفحہ ۹۹—۱۰۰)

۳۱ - کمال - کمال الدین اسماعیل بن جمال الدین محمد بن عبد الرزاق اصفہانی - خلاق المعانی لقب تھا - مذہبی علوم حاصل کرنے کے علاوہ شاعری کا مذاق خاندانی تھا جس کے سبب اسی کی طرف توجہ کی اور اسی میں کمال پیدا کیا - دولت شاہ کے مطابق اسے خلاق المعانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کے اشعار میں معانی دقیق پوشیدہ ہیں جو کئی ایک مرتبہ مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہوتے ہیں - اپنے باپ کی طرح اس نے بھی اکابر اصفہان اور شاہان معاصر کی مدح میں وقت گزارا - اس کے ممدوحین میں بہت سے اشخاص کے نام آتے ہیں ، جن میں اصفہن کے صاعدیہ خاندان کے رکن الدین مسعود کا نام بھی شامل ہے - اس خاندان کا تعلق کسی شاہی خاندان سے نہ تھا ، بلکہ یہ اصفہان کے قضاۃ میں سے تھے - کمال نے منگولوں کی تمام غارت گری کو دیکھا ہے اور اصفہان کے قتل عام کو تو اس نے بہ چشم خود دیکھا ہے جو اوکتائی کے ہاتوں ۶۳۳ھ میں ہوا - اس کے دو سال بعد (۶۳۵ھ) یہ ایک منگول کے ہاتھوں مارا گیا - دولت شاہ نے اس کے قتل کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے کہ جب اوکتائی قاآن اصفہان میں پہنچا تو یہ اس زمانے میں گوشہ نشین ہو چکا تھا اور شہر کے باہر ایک گوشہ میں رھتا تھا - چوں کہ لوگوں میں اس کا احترام تھا اور کوئی بھی اس سے تعرض نہیں کرتا تھا ، اس لیے بہت سے لوگ اس کے پاس اپنی امانتیں اور نقدی وغیرہ رکھ دیا کرتے - اس کے گھر میں ایک کنواں تھا جس میں ایسی امانتیں رکھ دی جاتیں - منگولوں کے قتل و غارت اور لوٹ مار کے دوران میں ایک منگول اس جانب سے نکل آیا اور اس نے کسی پرندے کو غلیل سے مارنا چاہا - اتفاقاً زہ گیر اڑ کر کنویں میں جا گری - وہ مغل اس کی جستجو میں کنویں میں اترا - وہاں جو اتنا زر و مال دیکھا تو باہر آ کر کمال سے مزید مال و دولت کا پتا پوچھا - اس نے اس سلسلے میں لا علمی ظاہر کی جس پر اس مغل نے طیش کھا اسے شکنجہ دے کر مار ڈالا - شبلی کے بقول کمال کی شاعری قدما اور

متأخرین کی مشترک سرحد ہے یعنی اس کا ایک سرا قدماء اور دوسرا متاخرین سے ملا ہوا ہے ۔ قدماء کی متانت ، پختگی ، استواری اور متاخرین کی مضمون بندی ، خیال آفرینی ، نزاکت مضمون دونوں یک جا جمع ہو گئے ھیں ۔ یہی وجہ ہے کہ متوسطین اور متاخرین دونوں اس کے معترف ھیں ۔ (کتب مذکوہ)

۳۲ ۔ رکن سعد ۔ خواجہ رکن الدین نام ۔ جیسا کہ کہال کے تذکرہ میں بیان ہوا ہے ، اس کا تعلق اصفہان کے صاعدیہ خاندان سے تھا ۔ یہ لوگ اصفہان میں حنفیوں کے قضاۃ تھے ۔ رکن الدین کے والد کا نام خواجہ جہال الدین صاعدیہ بن مسعود تھا ۔ اسی مناسبت سے اس کے نام کے ساتھ مسعود کا لفظ آتا ہے ۔ اس خاندان کی اصل نیشاپور ہے ۔ یہ سارا خاندان علما ، فضلا اور شعرا کا مربی تھا ۔ (صفا جلد دوم صفحہ ٦١)

۳۳ ۔ سعدی کا ذکر کسی گزشتہ حاشیے میں گزر چکا ہے ۔

۳۴ ۔ سعد زنگی ، سعد بن زنگی ۔ اس کا تعلق فارس کے اتابکان سلغری سے تھا ۔ سلغر ان کے جد امجد کا نام تھا جو غزتر کہانوں کے ایک دستے کا سربراہ تھا ۔ غزوں نے جب خراسان پر حملہ کیا (جس کا اجمالی ذکر انوری کے بیان میں گزر چکا ہے) تو سلغر نے بھی وھاں پہنچ کرگڑبڑ مچائی اور جب سلجوقیوں نے غزوں کو وھاں سے بھگا دیا تو یہ ان سے مل گیا اور اسے طغرل کے دربار میں حاجب بنا دیا گیا ۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی سلجوقی دربار میں صاحب قدرت و اعتبار رھی ، تاآنکہ ملک شاہ بن محمد بن محمود سلجوقی کے زمانے میں ایک سلغری سنقر بن مودود نے سر کشی کی اور ۵۴۳ھ میں فارس پر قابض ہو گیا اور اس طرح اس نے اتابکان سلغری یا اتابکان فارس کے خاندان کی بنیاد ڈالی ۔ یہ خاندان فارس پر ۵۴۳ھ سے ٦٨٦ھ تک حکمران رھا ۔ سعد بن زنگی کا دور حکومت ۵۹۹ سے ٦٢٣ھ ہے ۔ اس کا دور ایران پر چنگیزی حملے کا دور ہے (چنگیز نے ایران پر حملے کی ابتدا ٦١٦ھ میں کی تھی) ۔ اس نے اپنی حکومت کے آخری سال فارس میں بسر کیے ۔

اس نے دانائی سے کام لیتے ہوئے خوارزم شاہی سلاطین سے بنائے رکھی جس سے اس کی سلطنت برقرار رہی۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس نے کئی ایک مساجد و مدارس بنوائے اور دیگر کارہائے خیر کی طرف بھی توجہ کی۔ ۶۲۳ھ میں فوت ہوا۔

(صفا جلد دوم صفحہ ۲۸، ۲۹ جلد سوم صفحہ ۱۷)

اگرچہ سعدی اس خاندان سے وابستہ رہا ہے، لیکن جیسا کہ شفق نے لکھا ہے سعدی اس سعد کے زمانے میں ابھی کم عمر اور گمنام تھا۔ (موجودہ تحقیق کے مطابق سعدی کی تاریخ ولادت ۶۰۶ھ کے لگ بھگ ٹھہرتی ہے) اور سب سے اہم یہ کہ اس کے کلیات میں سعد بن زنگی کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ اس لحاظ سے متیر کا سعدی کو سعد زنگی سے وابستہ کرنا غلط ٹھہرتا ہے۔ البتہ سعدی کے تعلقات سعد کے بیٹے ابوبکر سے ضرور تھے۔ اور اس خاندان کے جس فرد سے سعدی کے زیادہ روابط رہے ہیں اور جس کے نام کی مناسبت سے اس نے اپنا تخلص سعدی رکھا وہ سعد بن ابوبکر بن زنگی ہے۔ اسی کے نام پر اس نے گلستان معنون کی ہے۔ یہ سعد، ابوبکر کی وفات (۶۵۸ھ) کے وقت ہلاکو کے دربار میں تھا اور پیشتر اس کے کہ شیراز پہنچے اور باپ کا جانشین بنے، خود بارہ روز بعد فوت ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو گلستان مرتبہ محمد علی فروغی، تہران ۱۳۳۸ش مقدمہ صفحہ ۳۔ خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۴۳۔ شفق صفحہ ۲۷۱)

۳۵۔ خسرو کا ذکر کسی گذشتہ حاشیہ میں گزر چکا ہے۔

۳۶۔ خضر خاں۔ سلطان علاءالدین خلجی کا بیٹا تھا۔ اسے گجرات کے راجہ رائے کرن کی ایک بیوی دیول (دول) رانی سے عشق ہو گیا تھا۔ علاءالدین جب تمام قلمرو ہند کو سلطنت دھلی کے تحت لے آیا اور دیگر مہمات سے فارغ ہو گیا تو اس نے اپنے بیٹوں کی شادیاں کرائیں۔ چناں چہ خضر خاں کی شادی اس کی محبوبہ دول رانی سے ہوئی جو بے حد حسین و جمیل تھی۔ خضر خاں ہی نے خسرو سے اپنے اس معاشقہ کو منظوم کرنے کے لیے کہا تھا۔ اس نے خود یہ تمام حالات

یاد داشت کے طور پر لکھ رکھے تھے - چناں چہ اس کی فرمائش پر خسرو نے اسے نظم کا جامہ پہنایا اور اس کا نام عشقیہ رکھا - خضر کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے انہیں بھی نظم کیا - پہلے اس میں ۴۲۰۰ شعر تھے - پھر ۳۱۹ کا اضافہ کیا - ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی - شادی کے بعد سلطان علاء الدین نے خضر خاں کو 'چتر' اور 'دور باش' عطا کرکے اپنا ولی عہد بنایا اور اسے ہستناپور کے کوہستانی علاقہ کی طرف بھیج دیا - اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد علاء الدین تپ دق میں مبتلا ہو گیا - خضر خاں کو جب اس کی علالت کی خبر ملی تو اس نے باپ کی صحت کے لیے منت مانی تھی - جب درمیان میں سلطان کو کچھ افاقہ ہوا تو خضر اپنے علاقہ سے دھلی بزرگوں کی زیارت کے ارادے سے ننگے پاؤں آیا - ملک کافور (ملک دینار ، جو خواجہ سرا اور سلطان کے امرا میں سے تھا) کو خضر خاں سے دلی عداوت تھی اس نے اس کی آمد کو بادشاہ کے سامنے غلط رنگ میں پیش کیا - سلطان جھانسے میں آ گیا اور اس نے خضر خاں کو حکم دیا کہ وہ امروھہ چلا جائے اور جب تک اسے بلایا نہ جائے وہ وھاں شکار میں مصروف رہے - خضر خاں نے مجبوراً حکم کی تعمیل کی - کچھ دنوں کے بعد خضر نے باپ کے پاس عرضی بھیجی کہ مجھے میرا قصور بتائیں ؟ عرضی بھیجنے کے بعد بے اختیار وہ اپنے باپ سے ملنے چلا آیا - سلطان نے محبت پدری کے جوش میں اسے سینے سے لپٹا لیا اور اسے ماں کے سلام کے لیے رخصت کیا - ملک کافور نے پھر سلطان کے کان بھرے اور اسے یہ باور کرا دیا کہ خضر خاں پھر برے ارادے سے آیا ہے - چناں چہ وہ خضر سے بدگماں ہو گیا اور اسے اس کے بھائی شادی خاں کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قید کرا دیا - ۷۱۶ھ میں سلطان فوت ہو گیا - ملک کافور نے شہاب الدین کو تخت پر بٹھایا جو خضر کا سوتیلا بھائی تھا ، اور خضر خاں اور شادی خاں کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی - پھر شہاب الدین کے قتل (۷۱۷ھ) کے بعد اس کا بھائی مبارک شاہ قطب الدین خلجی ۷۱۷ھ (بہ قول خسرو ۷۱۶ھ ، ملاحظہ ہو مثنوی عشقیہ یا دول رانی) میں سریر آرائے سلطنت ہوا - اس نے ۷۱۸ھ میں اپنے کوتوال کو گوالیار

بھیج کر خضر خاں وغیرہ کو قتل کروا دیا اور اس کی محبوبہ دول رانی کو اپنے حرم میں داخل کر لیا (منتخب التواریخ اردو ، صفحہ ۱۰۰ ، ۱۰۷- ۱۱۰ - شعرالعجم جلد دوم ، صفحہ ۱۲۷) ۔ امیر خسرو رحہ نے خضر کے قتل کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ مبارک شاہ نے اسے پیغام بھیجا تھا کہ میں تجھے کسی علاقے کا حاکم بنا دوں گا اگر تو دیول رانی کو میرے پاس بھیج دے ، لیکن خضر نے انکار کر دیا جس پر اسے قتل کر دیا گیا ۔ (بحوالہ حاشیہ صفحہ ۱۱۱ ، منتخب التواریخ اردو ترجمہ)

۳۷ - سلمان ، جمال الدین سلمان بن علاء الدین محمد جو سلمان ساوجی کے نام سے مشہور ہے ، ۷۰۰ھ (۱۳۰۰ء) میں یا اس کے لگ بھگ ساوہ میں پیدا ہوا ۔ اس کا خاندان شروع سے معزز چلا آتا تھا اور سلاطین وقت اس کا بہت احترام کرتے تھے ۔ اس کے والد دربار شاہی میں ملازم تھے ۔ اس کی ابتدائی تعلیم بھی اسی حیثیت سے ہوئی تھی ۔ چنانچہ یہ دفتر کے کاروبار اور علم سیاق میں نہایت کمال رکھتا تھا ۔ سلمان جلایر خاندان (جس کا پایۂ تخت بغداد تھا اور جس نے چھیاسی برس حکومت کی) کے پہلے فرماں روا حسن ایلکانی اور اس کے فرزند سلطان اویس جلایر کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ اول الذکر کی حرم دلشاد خاتون نہایت قابل اور لائق عورت اور شعرا کی بڑی قدردان تھی ۔ اسی وجہ سے وہ سلمان کی بڑی قدر دانی کرتی تھی اور سلمان نے بھی اس کی مدح میں جی کھول کر زور طبع دکھایا ہے ۔ سلمان جب بہت ضعیف ہو گیا تو اس نے ملازمت سے استعفیٰ دینا چاہا اور مسلسل چار قطعے لکھ کر پیش کیے جس پر سلطان نے اس کی تنخواہ اور جاگیر کو بحال رکھتے ہوئے اس کا قرض بھی ادا کر دیا ۔ سلمان نے گوشہ نشینی اختیار کی اور جب تک زندہ رہا ہر قسم کے تعلقات سے آزاد رہا ۔ براؤن لکھتے ہیں کہ سلمان کی وفات غالباً ۷۷۸ھ میں ہوئی (دولت شاہ نے ۷۶۹ھ اور آزاد بلگرامی نے ۷۷۸ھ دی ہے ۔ مؤخر الذکر زیادہ قرین صحت ہے) ۔ اس نے ۷۷۷ھ میں شاہ شجاع کی فتح پر دو قصیدے لکھے ۔ ''اس سے ظاہر ہے کہ اپنی طویل عمر کے آخر تک اس نے شعرو سخن کا مشغلہ جاری رکھا ۔ دولت شاہ نے یہ جو بیان کیا ہے کہ

اس نے عزلت گزینی اختیار کی ، واقعاً درست نہیں ، گو یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنی ایک نظم میں استعفا کی خواهش ظاهر کی ۔'' (شاہ شجاع کا تعلق مظفری خاندان سے تھا ۔ اس نے ۷۷۷ھ میں تبریز جلایریوں سے واپس چھین لیا ۔ اس وقت سلمان تبریز هی میں تھا ۔ چناں چہ اس نے شاہ شجاع کی مدح میں قصیدہ لکھ کر گزرانا تھا) ۔ سلمان کے بیشتر قصائد میں تاریخی اشارات ملتے هیں جس کے سبب ان کی بڑی اهمیت ہے ۔ سلمان بہ قول شفق ، درجہ اول کا قصیدہ سرا ہے اور اسے صفوی دور سے پہلے کے مشہور قصیدہ سراؤں میں آخری قصیدہ گو سمجھا جا سکتا ہے ۔ (شعرالعجم جلد دوم ۔ براؤن جلد سوم اردو ترجمہ از داؤد رهبر ، شفق)

۳۸ ۔ داستان اولین ، غالباً اشارہ ہے اس کی مثنوی فراق نامہ کی طرف جس کا موضوع ممکن ہے حضرت آدم کا قصہ هو ۔ افسوس کہ اس بارے میں تفصیل میسر نہ آ سکی ۔

۳۹ ۔ زمانے میں اگر کسی چیز کے ذریعے سے زندۂ جاوید رها جا سکتا ہے تو وہ شاعری هی ہے ۔ اس کے علاوہ باقی سب باتیں هی باتیں هیں ۔

۴۰ ۔ عقل روشن رکھنے والوں کی زندگی سخن هی سے ہے ۔ شمع کا خاموش هو جانا اس کی موت ہے ۔

۴۱ ، ۴۲ ۔ پہلے اس نے 'از میان جان' کہا پھر 'جان درمیان دارم' تو پہلے کا مطلب هوگا دل و جان سے یا پورے وثوق سے اور دوسرے کے معنی هیں کسی چیز کو بہت عزیز سمجھنا اور اس کے لیے جان تک کی پروا نہ کرنا ۔

۴۳ ۔ جنس سخن مجھ سے سستی خرید ۔ اس سودے میں ذرا گھاٹا نہیں ہے ۔

۴۴ ۔ سخن کو بقا ہے اور باقی سب یونہی ہے ۔

۴۵ ۔ هوا ، یعنی فضول ۔ دم کی رعایت سے 'باد' کا لفظ استعمال کیا ہے ۔

۴۶ - صاف اور میٹھا پانی -

۴۷ - پانی -

۴۸ - ایک مدت سے افسردہ دلوں کی سرد مہری کے سبب سخن کی قیمت ایک مشت باد بھی نہیں پڑ رہی ، ہائے سخن -

۴۹ - میں نے ایسا سخن (بات) کہا ہے جو زر سے خوب تر ہے - اس سخن کو زر (سونے) سے لکھنا چاہیے -

۵۰ ، ۵۱ - ان دونوں کا ذکر گزر چکا ہے -

۵۲ - ثنائی ، خواجہ حسین نام تخلص ثنائی - باپ کا نام غیاث الدین علی تھا - مشہد کا رہنے والا تھا - ایران میں اسے اپنے کلام کی رنگینی و پرکاری کے سبب بڑی شہرت حاصل تھی - وہاں ایک مدت تک سلطان ابراہیم مرزا کی مدح میں قصائد لکھے - بدایونی لکھتا ہے ''ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا ، لیکن اس کی شہرت پہنچ چکی تھی - چناں چہ یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو 'طرح' بنا کر محفل سخن منعقد اور ہر مشاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کیا کرتے تھے - بلا اختلاف سب اس کی استادی کے قائل تھے -'' ہندوستان آیا تو اکبر نے بڑی پذیرائی کی اور وہ آخر عمر تک اس کے خسروانہ مراحم سے مستفید ہوتا رہا - تمام تذکرہ نگار اس کے شاعرانہ کمال کے معترف ہیں - عبد النبی صاحب 'مے خانہ' اسے ''عندلیب گلستان نکتہ سرائی'' کہتا ہے اور اس کی شاعری کو رنگ و بو سے رنگین پاتا ہے - بدایونی کے مطابق یوں تو اس کے ورود ہند سے پہلے اکابر وغیرہ سب اس کے قائل تھے ، لیکن جب وہ ہندوستان آ گیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کو جھلسا کر رکھ دیا اور وہ بے چارہ گوشۂ گمنامی میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا -

بدایونی ہی کے مطابق ''اس کا دیوان مشہور ہے - ایک بہت اچھی مثنوی بھی لکھی ہے ، کوئی بڑا عالم نہیں ہے - چناں چہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح جاندار نہیں - شاعرانہ ذوق بہت بلند ہے - بجز توحید و منقبت کے تمام اصناف سخن میں بڑی مہارت رکھتا ہے -''

صاحب طبقات اکبری نے بھی اس کی تعریف کی ہے کہ اقسام شعر خوب اور استادانہ کہتا اور شعرائے عصر میں صاحب امتیاز تھا ۔ مے خانہ میں اس کی مثنوی کا نام سکندر نامہ لکھا ہے ۔ اس نے عبدالرحیم خانخاناں کی مدح میں بڑے لمبے لمبے قصائد کہے ۔ قصیدہ گوئی کو اس کی شاعری سے بھی بڑی ترقی ہوئی ۔ (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۶۷۸ ۔ بزم تیموریہ ، ۱۰۳-۱۰۴)

۵۳ ۔ نظیری ۔ محمد حسین نام ، نظیری تخلص ۔ نیشا پور کا رہنے والا تھا ۔ شاعری کا ابتدا سے شوق تھا ۔ آغاز مشق ہی سے شہرت پائی ۔ خراسان میں نام پیدا کر کے کاشان میں آیا اور وہاں کے استاد شعرا کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتیں ، ان میں طبع آزمائی کرتا ۔ آخر عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضیوں کی داستان سن کر ہندوستان کا رخ کیا اور آگرہ میں خانخاناں سے ملاقات کی اور اس کی مدح میں قصیدے کہے ۔ جس پر خانخاناں نے اسے گراں مایہ صلے اور انعامات دیے ۔ بہ قول شبلی رح نظیری غالباً ۹۹۲ھ میں آگرہ پہنچا ہے اور پھر غالباً خانخاناں ہی کی تقریب کرنے سے اس کی رسائی اکبر کے دربار تک ہوئی اور یہ تقریباً ۹۹۶ھ کا واقعہ ہے ۔ اکبر کی مدح میں اس نے جو پہلا قصیدہ لکھا ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے کئی حاسد پیدا ہو گئے تھے ۔ بعد میں بھی اس نے اکبر کی ستایش میں وقتاً فوقتاً کئی قصیدے لکھے اور غالباً مقبول بھی ہوئے ، لیکن دربار میں اس کو کوئی خاص امتیاز حاصل نہ ہوا جس کے سبب وہ مستقلاً خانخاناں سے وابستہ ہو گیا اور احمد آباد (گجرات) میں سکونت اختیار کر لی ۔ یہیں سے وہ کچھ عرصہ بعد حج کے لیے گیا ۔ سرو آزاد میں ہے کہ حج کرنے کے بعد جب واپس آیا ہے تو پھر مذکورہ شہر میں مقیم ہوا ۔ بہ قول علامہ شبلی مآثر رحیمی میں جو اس کا سفر ۱۰۱۲ھ میں لکھا ہے وہ بعض قرائن سے غلط ٹھہرتا ہے ۔ " قیاس یہ ہے کہ نظیری نے ۱۰۰۲ھ میں حج کیا ہے ۔ " حج سے واپسی پر مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی ۔ ۱۰۱۴ھ میں اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا ۔ وہ بڑا سخن شناس اور صاحب ذوق تھا ۔ اس نے جب اس کا شہرہ سنا تو اسے دربار میں

طلب کیا ۔ چناں چہ وہ تزک میں اپنے پانچویں سال جلوس (۱۰۱۹ھ) کے واقعات میں لکھتا ہے : ''فن شعر و شاعری میں مشہور روزگار نظیری نیشا پوری کو جو گجرات میں تجارت کے ذریعے زندگی بسر کر رہا ہے ، میں نے دربار میں طلب کیا تھا ۔ انھی دنوں اس نے یہاں پہنچ کر آستان بوسی کا شرف حاصل کیا ، وہ انوری کے اس قصیدہ :

باز این چہ جوانی و جمالست جہان را

کی زمین میں میری مدح لکھ کر لایا تھا جسے پیش کرنے پر میں نے صلے میں ہزار روپے ، گھوڑا اور خلعت عنایت کیا ۔'' بہ قول آزاد ایک مرتبہ جہانگیر نے اسے ایک عمارت کا کتبہ لکھنے کے لیے کہا جس پر اس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی :

این خاک دوت صندل سر گشتہ سران را
بادا مـژہ جاروب رہت تاجوران را

جہانگیر نے اس کے انعام میں کوئی تین ہزار بیگہ زمین عطا کی ۔ شیخ محمد مندوی غوثی ، گلزار ابرار میں لکھتے ہیں کہ وہ درویش طبیعت ، صوفی سیرت اور مہذب الاخلاق تھا ۔ آخری عمر میں 'صوفیان وحدت گزار' کی مانند شعر کہنے لگا تھا ۔ مرنے سے بارہ سال قبل احمد آباد میں مقیم ہو کر علوم دینی حاصل کیے اور تفسیر و حدیث کے لیے مولانا حسین جوہری وارہ کی شاگردی اختیار کی ۔ ۱۰۲۳ھ میں فوت ہوا ، لیکن شبلی ، شفق اور صفا نے ۱۰۲۱ھ لکھا ہے ۔ قبر تاج پورہ احمد آباد میں ہے اور اس پر ایک گنبد بھی تعمیر کیا ہوا ہے ۔ بہ قول علامہ شبلی اسے زرگری میں کمال تھا ، پھر تجارت بھی کرتا تھا ۔ شاعری کی فتوحات الگ تھیں ۔ اس بنا پر امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا اور امرا میں اس کا شمار ہوتا تھا ۔ بخلاف دیگر شعرا کے مذہب میں سخت تھا ۔ اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے ان سے بہت جلتا تھا ۔ ایک مرتبہ اس نے خان خاناں سے کہا کہ ''لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا ؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا'' خانخاناں نے لاکھ روپے کا ڈھیر لگوا دیا ۔ نظیری نے کہا ''خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لیے ۔''

خان‌خاناں نے روپے اس کے گھر بھجوا دیے ۔ بدایونی اس کے متعلق لکھتا ہے ''لطافت طبع اور نفاست ذوق میں دوسرا شکیبی اصفہانی ہے ۔'' (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۷۶۳ ۔ تزک جہانگیری اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۰۹ ۔ سرو آزاد ، صفحہ ۲۳ ۔ شعرالعجم جلد سوم ، صفحہ ۱۲۰-۱۲۳ ، ۱۲۸ ۔ شفق ، صفحہ ۳۷۹ ۔ مختصری......، صفحہ ۱۵۶)

۵۳ ۔ شکیبی ۔ محمد رضا بن خواجہ عبد اللہ اصفہانی ، تخلص شکیبی ۔ خواجہ عبد اللہ امامی کی ، جس کا ذکر جامی رحمہ نے 'نفحات الانس' میں کیا ہے ، اولاد میں سے تھا ۔ یہ امامی ، خواجہ امین الدین حسن کے بیٹے تھے جن کا ذکر حافظ نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے :

برندی شہرہ شد حافظ پس از چندین ورع لیکن
چہ غم دارم کہ در عالم امین الدین حسن دارم[1]

شکیبی ۹۶۳ھ میں پیدا ہوا ۔ شیراز اور اصفہان میں تحصیل علم کی ۔ ہندوستان کی سیر کے ارادے سے بندرگاہ چیول تک پہنچا ۔ وہاں سے خان خاناں کے پاس جو ان دنوں گجرات میں تھا ، جانے کے لیے گجرات کا رخ کیا ،وہ اس دوران میں آگرہ جا چکا تھا ۔ وہاں سے شکیبی آگرہ پہنچ گیا ، اور اس سے ملاقات کی ۔ خان خاناں کے ساتھ سندھ اور دکن کی سیر کی ۔ کچھ عرصہ بعد (۱۰۰۶ھ میں) خان خاناں سے علیحدگی اختیار کی اور سرونج (مالوہ) میں سخت بیمار ہوگیا ۔ شفا ہوئی تو ۱۰۱۲ھ میں زیارت حرمین شریفین کو گیا ۔ تین سال بعد بندرگاہ سورت کے راستے سے واپس پہنچا ۔ اور برہان پور میں خان خاناں سے ملا ۔ ۱۰۱۸ھ میں خان‌خاناں سے گوشہ نشینی کی التماس کی ۔ خان خاناں نے اس کے لیے جہانگیر

---

۱ ۔ دیوان حافظ مرتبہ قزوینی مرحوم وغیرہ میں یہ شعر اس طرح ہے ۔ اور حاشیے میں لکھا ہے کہ کئی نسخوں میں 'امین الدین...' ہے ۔

برندی شہرہ شد حافظ میان ہمدمان لیکن
چہ غم دارم کہ در عالم قوام الدین حسن دارم

(دیوان مذکور مطبوعہ تہران ، صفحہ ۲۲۴)

کے دربار سے منصب صدارت دهلی کے ساتھ کچھ جاگیر بھی لے دی ۔ صاحب بزم تیموریه کے مطابق (بحواله میخانه) ورود هند کے بعد کچھ دنوں خان خانان سے متعلق رها ، پھر مهابت خان کی وساطت سے جهانگیر کے دربار میں پهنچا اور ایک قصیده پیش کیا ۔ جهانگیر بڑا محظوظ هوا اور اس سے لطف و کرم سے پیش آیا ۔ اسے یه توقع هوئی که جهانگیر کے حضور میں اس کی روز باریابی هوگی ، لیکن کسی سبب سے یه توقع پوری نه هوئی اور کبیده خاطر هو کر ایران واپس جانے کا اراده کیا ۔ جهانگیر کو جب علم هوا تو اس نے اسے طلب کر کے کہا ''مولانا شکیبی! چاهیے تها که آپ کچھ دنوں بموجب اپنے تخلص کے شکیبائی کرتے اور هم سے کبیده خاطر نه هوتے ۔'' اس پر اس نے اس لطف خسروانه کو ایک رباعی میں قلمبند کر کے بطور معذرت پیش کیا :

گفتی بشکیبی که ز ما کیبیدی
یعنی که ز قبلهٔ دعا کیبیدی
حدنیست مرا که گویم این بهتانست
گویند بسگ که از وفا کیبیدی

اس رباعی کو سن کر جهانگیر خوش هوا ، پھر اس سے کہا که ''آپ کی ایک رباعی مجھ کو بہت پسند آئی هے جو میں نے اپنی بیاض میں اپنے هاتھ سے لکھ لی هے :

نردیست جهان که بردنش باختن است
نرادی آن بداو کم ساختن است[1]
دنیا بمثال کعبتین و نرد است
برداشتنش برای انداختن است

منصب صدارت ملنے کے بعد شکیبی آخری عمر تک دهلی میں رها اور وهیں ۱۰۲۳ھ (میخانه کے مطابق ۱۰۲۲ھ) وفات پائی ۔ دیوان کے علاوه ایک مثنوی خسروشیرین یادگار چھوڑی ۔ خانخانان کے لیے ایک ساقی نامه

---

۱ ۔ یه مصرعه سرو آزاد میں اس طرح هے :
نرادی او شش دو کم ساختن است

لکھا جس کے صلے میں دس ہزار روپیہ ملا ۔ ''شاعر خوش طبیعت صاف فکر'' تھا ۔ بہ قول بدایونی ''سلیقۂ شعر سے بہرہ مند'' تھا ۔
(سرو آزاد ، صفحہ ۲۹-۳۱ - بزم تیموریہ ، صفحہ ۱۵۶-۱۵۷ - منتخب... صفحہ ۲۰۵)

۵۵ - انیسی - انیسی شاملو یولقلی بیگ ایران کا رہنے والا تھا ۔ دور اکبری میں وارد ہند اور خانخانان کے دربار سے متعلق ہوا ۔ بہ قول آزاد بلگرامی 'نکتہ سنج یگانہ' اور 'انیس معانی بیگانہ' تھا ۔ قصہ محمود و ایاز نظم کرنا شروع کیا تھا ، لیکن ملک الموت نے مہلت نہ دی ۔ ۱۰۱۳ھ میں بہ مقام برہان پور وفات پائی ۔
(سرو آزاد ، صفحہ ۴۱)

۵۶ - نوعی ، ملا رضا نوعی خبوشان (خراسان) کا رہنے والا تھا ۔ چھوٹی عمر میں والد کے ساتھ وارد ہند ہوا ، مگر کچھ ہی عرصہ بعد واپس وطن لوٹ گیا ۔ باپ کی وفات کے بعد پھر ہندوستان کا رخ کیا اور مرزا یوسف خان کے دربار میں ملازمت اختیار کی ۔ اس کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی بہشت زار میں اس کی طبیعت میں بھی رنگ و بو پیدا ہوا اور طبع آزمائی شروع کر دی ۔ نوعی تخلص رکھا اور جلد ہی شہرت حاصل کر لی ۔ اکبر کے بیٹے دانیال کو جب اس کا پتا چلا تو اس نے نوعی کو مرزا یوسف خاں سے لے کر اپنے دربار سے منسلک کرلیا ۔ چناں چہ اس نے اس کی مدح میں کئی قصائد لکھے ۔ ایک موقع پر اس نے شاہزادۂ مذکور کی فرمائش پر اکبری دور کے ایک ستی کے واقعہ کو مثنوی 'سوز و گداز' کے نام سے منظوم کیا ۔ (وہ یہ کہ ایک ہندو عورت کا شوہر بیاہ کے دن ایک چھت کے گر جانے سے دب کر ہلاک ہو گیا ۔ وہ ستی ہونے لگی تو اکبر نے اسے روکنا چاہا ، لیکن شوہر کے عشق میں وہ آگ میں کود پڑی) ۔ دانیال کے مرنے پر خانخاناں کے دربار سے وابستہ ہو گیا اور اس کی مدح میں قصائد وغیرہ کہے ۔ ایک ساقی نامہ لکھا جس کے صلے میں خانخاناں نے دس ہزار روپیہ نقد ، خلعت فاخرہ ، ایک ہاتھی اور عراقی گھوڑا عطا کیے ۔

اس کے علاوہ بھی کئی ایک مواقع پر گراں بہا انعام و اکرام سے نوازا گیا ۔ اس کی وفات بہ مقام برہان پور ۱۰۱۹ھ میں ہوئی ۔ بہ قول آزاد اس کا کلام جنس عالی ہے اور اس کے رشحات قلم موتیوں کی مانند ہرارزش ہیں ۔ بدایونی اپنے حسب عادت اسے بھی لتاڑ گئے ہیں ۔ لکھتے ہیں ''اپنے آپ کو شیخ حاجی محمد خبوشانی کا پوتا بتاتا تھا ، لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعوئ کو جھٹلاتے تھے ۔نہایت شوخ طبع آدمی تھا ۔'' (منتخب التواریخ ، صفحہ ۲۶۰ - سرو آزاد ، صفحہ ۲۲-۲۳ - بزم تیموریہ ، صفحہ ۳۸۸-۳۸۹)

۵۷ - کفری - میر حسن کفری خراسان کا رہنے والا تھا ۔ مغلیہ فرماں رواؤں کی علم نوازی کا شہرہ سن کر ہندوستان آیا اور شاہزادہ دانیال کے دربار سے وابستہ ہو گیا ۔ بہ قول صاحب مآثر رحیمی ایک مدت تک دانیال کی ملازمت میں رہا اور پورے طور پر قربت و نزدیکی حاصل کی ۔ شاہزادہ کی مدح میں قصائد غرا لکھے ۔

دانیال کی وفات کے بعد عبدالرحیم خانخاناں کی فیاضیوں سے مستفیض ہوا ۔ خانخاناں کی مدح میں بہت سے قصائد اور رباعیات لکھیں ۔ ایسی ایک رباعی ملاحظہ ہو :

ای گوہر خور ز آئینۂ بارگہت
وین ظلمت شب نشان گرد سپہت
یعقوب ز مصر و موسیٰ از طور نیافت
آن بہرہ کہ من یافتم از خاک رہت

۵۸ - خان خاناں معنی پرور اور نکتہ سنج شعرا پر کس کس طرح سے احسان کیا کرتا تھا ۔ (اے ممدوح) زمانے میں تو بھی سخاوت اور سخن میں خان خاناں سے کمتر نہیں ہے ۔

۵۹ - اشعار : دوسرے معنی کھر ۔

۶۰ - بحر : عروض کی اصطلاح ، دوسرے معنی سمندر ۔

۶۱ - آب : بہ معنی پانی ، چمک ، روانی ۔

٦۲ - وہ آلہ جس سے معمار وغیرہ لکڑی اور عمارت کا ٹیڑھا پن اور سیدھاپن دیکھتے ہیں ۔

٦۳ - تخت : مکان کی بنیادوں کی بلندی ۔

٦۴ - میری صورت کیا دیکھتے ہو میرے معنی کی طرف دیکھو ۔ میں ویران ہوں ، لیکن میرا دل آباد ہے ۔

٦۵ - کوکبہ - ستارہ ، شان و شکوہ ، شاہی جلوس ۔

٦٦ - مشتری - ایک ستارے کا نام ، گاہک ۔

٦۷ - جب 'فیض' نے معانی کا منشور تیرے نام پر لکھ دیا تو پھر صرف تیری مدح ہی کی تحریر طغرائے سخن کے شایان ہے ۔

٦۸ - چوں کہ تیری نورانی رائے روشن ہے اس لیے تجھ پر پیشانی کی تحریر روشن ہے - یعنی تو پیشانی دیکھ کر حال جان جاتا ہے ۔

٦۹ - اگرچہ حجاب کے سبب میری آنکھیں پشت پا پر لگی ہیں ، لیکن یہ جان لو کہ میری طبع فیض کے سرور سے خالی نہیں ہے اور ہمارا سرنگوں پیمانہ ، حباب کی طرح عالم آب سے آشنا ہے ۔

۷۰ - اس پیرے میں چوں کہ منیر نے زیادہ تر شعرا کے ناموں کی رعایت سے فائدہ اٹھایا ہے ، اور ان اسماء کے ترجمہ سے وہ بات نہیں بن سکتی تھی ، اس لیے انھیں ویسے ہی رہنے دیا ہے اور تعلیقات میں ان کی تشریح وغیرہ کر دی ہے ۔

۷۱ - شمس - شمس بہ معنی سورج اور اشارہ ہے شمس تبریزی کی طرف جو مولانا جلال الدین محمد رومی کے مرشد تھے - ان کا نام شمس الدین بن علی بن ملک داد تھا - بہت بڑے صوفی تھے - شہر بہ شہر گھومتے اور اہل راز و ریاضت اور درویشوں اور عارفوں سے انس و الفت سے پیش آتے - ٦۴۲ھ میں قونیہ پہنچے اور پہلی ہی نظر میں مولانائے روم کو اپنا شیفتۂ معنوی کر لیا اور تمام عمر ان کے مرشد و قائد روحانی رہے ۔ کہتے ہیں کہ شمس وجد و شوق میں آ کر عنان اختیار ہاتھ سے دے دیتے اور رازہائے نہانی زبان پر لے آتے ، اور سماع و طرب عارفانہ بڑے

بے باکانہ طریقے سے کرتے - جس کے سبب ان کے کئی دشمن پیدا ہو گئے اور آخر ۶۴۵ھ میں ایک روز اہل قونیہ ان پر ٹوٹ پڑے اور بر سر عام انہیں قتل کر دیا - اس داروگیر میں مولانا روم کے بڑے بیٹے علاء الدین بھی سخت مجروح ہو کر فوت ہو گئے - لیکن مولانا روم رح کی بعض غزلوں سے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک روز غائب ہوگئے اور دو سال تک مولانا ان کی تلاش میں رہے لیکن ان کا کچھ پتا نہ چلا - (شفق صفحہ ۲۹۴ - ۲۹۵)-

۷۲ - بدر - بدر بہ معنی پورا چاند اور اشارہ ہے بدر چاچ کی طرف جو سلطان محمد تغلق کے دور کا ایک شیریں کلام قصیدہ گو شاعر اور ماوراء النہر کے شہر چاچ یا شاش کا باشندہ تھا جو آج کل کا تاشقند ہے - ایران میں جتنا گم نام ہے اتنی ہی اسے بر صغیر پاک و ہند میں خاصی شہرت حاصل ہے - محمد تغلق کے عہد سلطنت میں آیا - اور بادشاہ نے اسے فخرزماں کے لقب سے نوازا - براؤن لکھتے ہیں ''اس کا کلام جو میں نے نہیں پڑھا ، لیکن جس کے مترجمہ نمونے سرابچ ایلیٹ نے اپنی تاریخ ہند میں دیے ہیں بہت مشکل ہے - یہ خصوصیت ان تمام لوگوں کے کلام میں بالعموم پائی جاتی ہے جو ترکی النسل ہیں یا جنھوں نے ترکی اثر یا سرپرستی کے زیر شاعری کی -'' اس کی تاریخ وفات معلوم نہیں ، لیکن اس نے ایک کتاب کے اختتام پر جو تاریخ کہی ہے وہ ۷۴۵ھ ہے جس کا مطلب ہے کہ اس کی وفات اس سنہ کے بعد واقع ہوئی - (مفتاح التواریخ صفحہ ۸۸-براؤن جلد سوم اردو ترجمہ صفحہ ۱۸۱-۱۸۲)-

۷۳ - سنائی - حکیم ابو المجد مجدود بن آدم سنائی چھٹی صدی ہجری کے عالی مرتبہ شاعر ، بلند مقام صوفی اور عارفانہ مثنویاں لکھنے والے تین بڑے ایرانی شعرا میں پہلے شاعر - آپ کی ولادت کا صحیح سنہ معلوم نہیں ، تاہم قرائن کے مطابق آپ پانچویں صدی ہجری کے دوسرے نصف میں بہ مقام غزنین پیدا ہوئے - جوانی میں شاعری وغیرہ میں جب مہارت حاصل کر لی تو غزنوی دربار سے وابستہ ہو گئے - اور اس دور کے بڑے بڑے امرا وغیرہ سے روابط پیدا کیے - بہرام شاہ

غزنوی سے پہلے جس کی مدح میں سنائی رحہ نے قصائد کہے وہ مسعود بن ابراہیم (۴۹۲–۵۰۸ھ) ہے ۔ مسعود کے بعد اول الذکر (۵۱۱-۵۵۲ھ) کے دربار سے منسلک ہوئے ۔ شروع میں تو اسی طرح مداحی کرتے رہے لیکن جیسا کہ صفا نے لکھا ہے ، باوجود درباری شعرا کی سی طرب آمیز زندگی بسر کرنے کے آپ اپنی خواہشات کے مطابق مطمئن نہ تھے ۔ آخر ایک وقت ایسا آ گیا کہ بالکل ہی کایا پلٹ گئی ۔ مادیت سے ہٹ کر روحانیت کی طرف آئے ۔ حرص و ہوس سے چھٹکارا پا کر جمال ایزدی کے والہ و شیدا ہو گئے ۔ طبیعت میں کمال کا استغنا پیدا ہوا اور وہ مقام حاصل کیا کہ علامہ شبلی رحہ کے الفاظ میں ''یا تو بہرام شاہ کے دربار میں بھٹی کرتے تھے یا بہرام شاہ نے اپنی بہن کو ان کے عقد نکاح میں دینا چاہا اور انہوں نے انکار کر دیا'' ۔ دولت شاہ وغیرہ نے آپ کے اس انقلاب طبع کا جو سبب داستان کے رنگ میں پیش کیا ہے ، براؤن اور دیگر مؤرخین ادب اسے درخور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ (یہ داستان علامہ شبلی کے الفاظ میں اس طرح ہے ۔ ''توبہ کا سبب ایک دل چسپ قصہ ہے ۔ بہرام شاہ[1] ہندوستان کی مہم پر جا رہا تھا ۔ حکیم سنائی نے چاہا کہ اس تقریب سے قصیدۂ مدحیہ لکھ کر پیش کریں ۔ قصیدہ تیار کرکے دربار کے قصد سے چلے ۔ راہ میں ایک حمام تھا ، یہاں ایک پاگل رہا کرتا تھا ، اس کا معمول تھا کہ شراب خانوں سے شراب کی تلچھٹ مانگ لایا کرتا اور پی کر مست پڑا رہتا ، اسی لیے اس کو 'لاے خوار' کہتے تھے ۔ حکیم سنائی حمام کے برابر سے نکلے تو غنغنانے کی آواز سنی ، ٹھہر گئے دیکھا تو لاے خوار ساقی سے کہہ رہا ہے کہ ابراہیم[2] شاہ کے اندھے پن کے صدقے میں ایک پیالہ دینا ۔

---

۱ ۔ نفحات الانس میں سلطان محمود غزنوی کا نام ہے ۔ لیکن بہ قول صفا اس کی بجائے مسعود یا ارسلان کا نام ہونا چاہیے ۔ (صفا جلد دوم حاشیہ صفحہ ۵۵۴) ۔

۲ ۔ مولانا شبلی نے شروع میں تو بہرام شاہ لکھا ہے ، لیکن بعد میں ابراہیم شاہ کا نام لے آئے ہیں ۔ یا تو مولانا مرحوم نے اس کی طرف توجہ نہیں دی یا پھر یہ کتابت کی غلطی ہے ۔

ساقی نے کہا کیا لغو بکتے ہو ، ابراہیم شاہ نہایت عادل بادشاہ ہے۔ پاگل نے کہا ابھی غزنین کے انتظام سے عہدہ برآ نہیں ہوا ، دوسرے ملک کا ارادہ کرتا ہے اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی ۔ یہ کہہ کر پیالہ اٹھایا اور پی گیا پھر ساقی سے کہا کہ سنائی کے اندھے پن کے صدقہ میں ایک پیالہ اور لانا ، ساقی نے کہا ، سنائی نہایت خوش فکر اور خوش طبع شاعر ہے اس کی برائی کیوں کرتے ہو ؟ پاگل نے کہا اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ دو چار جھوٹ سچ باتیں جوڑ کر کسی بے وقوف رئیس کے پاس جاتا ہے ، ادب سے دست بستہ کھڑا ہوتا ہے اور اس کو سناتا ہے ۔ قیامت میں اگر سوال ہوا کہ دربار میں کیا لایا ہے تو کیا جواب دے گا ۔ حکیم سنائی پر یہ اثر ہوا کہ اسی وقت سب چھوڑ چھاڑ گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے) ۔

جہاں تک بہرام شاہ کا اپنی بہن کو آپ کے عقد نکاح میں دینے اور آپ کے انکار کرنے کا سوال ہے ، مرحوم حافظ محمود شیرانی کو ''اس قصے پر یقین لانے میں بہت کچھ تامل ہے اس لیے کہ یہ اشعار (جو بادشاہ کے جواب میں انہوں نے کہے) حدیقہ سے تعلق رکھتے ہیں اور حدیقہ حکیم سنائی نے ساٹھ سال کی عمر میں تصنیف کیا ہے.....عمر کی زیادتی بجائے خود اہم مانع ہونے کے علاوہ جس موقع پر ان (اشعار) کا ایراد ہوا ہے وہاں متن میں کوئی ایسا ایما نہیں پایا جاتا جس سے یہ گمان کیا جائے کہ ان اشعار کا مخاطب سلطان بہرام شاہ غزنوی ہے ...... یہ اشعار 'قناعت' کے عنوان کے ذیل میں آتے ہیں اور زیادہ تر ایسا پایا جاتا ہے کہ ان میں کسی خاص بادشاہ کی طرف خطاب نہیں ہے...... ۔

اس تغییر حال کے بعد سنائی رح غزنین سے نکل کر مختلف شہروں ، مثلاً بلخ ، سرخس ، ہرات اور نیشاپور وغیرہ میں گھومے اور وہاں کے عرفا کی صحبت میں رہے ۔ پھر حج کو چلے گئے ۔ جو قصیدہ اس موقع پر لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس وقت بال بچوں سمیت خراسان میں بسر کر رہے تھے اور آپ کے والدین بقید حیات تھے ۔ اس لحاظ سے

آپ حج کے موقع پر ابھی بڑھاپے کو نہیں پہنچے تھے حج سے واپسی پر ایک عرصہ تک بلخ میں رہے ۔ وہاں سے سرخس ، مرو اور نیشا پور گئے ۔ پھر ۵۱۸ھ کے لگ بھگ غزنین لوٹے ۔ یہاں تنہائی میں زندگی بسر کی ۔ جس قصیدے میں یہ حالات دیے ہیں اس میں یہ کہیں نہیں لکھا کہ آپ کے بال بچے اور والدین جو بلخ میں آپ کے ساتھ تھے وہ غزنین میں آپ کے پاس کیوں نہیں رہے ۔ بہر حال یہاں پھر آپ تا حین حیات گوشہ نشین رہے ۔ اور اگرچہ غزنوی دربار آپ کو لینے پر تیار تھا لیکن آپ نے دنیوی جاہ و جلال پر گوشۂ تنہائی اور روحانی کمالات کو ترجیح دی ۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں آپ نے اپنی مشہور عارفانہ مثنوی 'حدیقة الحقیقة' لکھی ۔

آپ کی تاریخ وفات میں سخت اختلاف ہے ۔ مرحوم علامہ قزوینی نے ۵۴۵ھ کو قرین صحت مانا ہے اور دلیل یہ دی ہے کہ آپ نے امیر معزی کی وفات پر مرثیہ لکھا ہے جو ۵۴۲ھ میں فوت ہوا ۔ لیکن عباس اقبال آشتیانی مرحوم (مرتب دیوان معزی) کی تحقیق کے مطابق معزی ۵۲۱ھ کے بعد زندہ نہ تھا ۔ بہر حال بہ قول صفا ہمیں آقاے مدرس رضوی (مرتب دیوان سنائی) کے استدلالات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ تصور کرنا ہوگا کہ ۵۲۵ھ کی بجائے شاید ۵۳۵ھ صحیح ہو آپ کا مقبرہ غزنین میں زیارت گاہ خاص و عام ہے ۔

آپ کی تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں بہ قول شبلی تیس ہزار شعر ہیں ۔ سات مثنویاں ہیں ، حدیقہ ، سیر العباد ، کارنامہ بلخ ، طریق التحقیق ، عشق نامہ ، عقل نامہ اور بہروز بہرام ہے ۔ صفا نے ساتویں کا نام تجربة العلم لکھا ہے ۔ حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں :

شاعری کی ایک اور اہم خدمت جو سنائی نے کی ہے ، تغزل ہے ۔ سنائی کے عہد سے پیشتر غزل کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں ، لیکن اس صنف سخن نے ان کے ہاں مستقل شان پیدا کرلی ہے ۔ بہ لحاظ زبان ان کی غزل ، قطعہ اور قصیدے میں متقدمین کی طرح کوئی تفاوت نہیں دیکھا جاتا ۔ تخلص کا رواج ، غزل کے مقطع میں سب سے پیشتر انھی کے ہاں

پایا جاتا ہے ۔ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں ادا کرنا انھی سے شروع ہوتا ہے ۔ اگرچہ مذاق میں زھدیت غالب ہے تاھم تغزل کو خرابات کا راستہ بتانے والے حکیم سنائی ھیں ۔ عرفان اور رندی کی آمیزش کے قدیم ترین نمونے ان کے کلام میں ملتے ھیں ۔ عطار رح اور مولانا روم رح ان ھی کی بنیادوں پر قصر و ایوان تعمیر کرتے ھیں ۔ قصہ مختصر سنائی کے ھاں شاعری بلحاظ غزل ایک نئی کروٹ لیتی ہے ۔ زھد خشک کا خاتمہ ھوتا ہے ۔ رندی اور مستی کی داغ بیل ڈالی جاتی ہے ۔ صومعہ چھوڑا جاتا ہے ۔ میخانہ آباد کیا جاتا ہے......''

(صفا جلد دوم صفحہ ۵۵۲ ، ۵۵۰ ، ۵۵۹ ، ۵٦۳ ۔ تنقید شعرالعجم صفحہ ۱٦۸ ، ۱۷۳ ۔ براؤن مطبوعہ کیمرج جلد دوم صفحہ ۳۱۷ ۔ شعرالعجم حصہ اول صفحہ ۲۱٦ ، ۲۱۷ ، ۲۱۹ ۔ شفق صفحہ ۱۲۲ ۔ علاوہ ازیں ملاحظہ ھو حکیم سنائی از خلیل اللہ خلیلی مطبوعہ کابل)

۷۳ ۔ قاسم انوار ۔ روشنیاں تقسیم کرنے والا ۔ یہاں اشارہ ہے صوفی شاعر سید قاسم الانوار ملقب بہ معین الدین علی کی طرف جو سراب یا سراد (تبریز) میں ۷۵۷ھ (مطابق ۱۳۵٦ء) میں پیدا ھوا ۔ اس کے پہلے مرشد صفویوں کے ایک مورث شیخ صدرالدین اردبیلی تھے ، اور ان کے بعد شیخ صدرالدین یمنی جو خود شیخ اوحد الدین کرمانی کے مرید تھے ۔ قاسم کچھ عرصہ گیلان میں رھا ۔ پھر خراسان چلا گیا اور ھرات میں اقامت گزیں ھوا ۔ تیمور اور اس کے بیٹے شاہ رخ میرزا فی وقایعمیں بسر کیا ۔ اس جگہ اس کے پاس اس کثرت سے مرید فرا جمع ھونے لگے اور اس کا رسوخ اس قدر بڑھ گیا کہ بادشاہ کو ہے ۔ ھوا ۔ بقول صاحب 'مطلع السعدین' ۸۳۰ھ میں جب احمد بر نامی ایک شخص نے شاہ رخ پر قاتلانہ حملہ کیا تو میرزا بایسغر نے سید قاسم پر الزام لگایا کہ اس نے مذکورہ شخص کو اپنے ھاں چھپائے رکھا تھا ۔ چناں چہ قاسم کو ھرات چھوڑ کر سمرقند کا رخ کرنا پڑا ۔ وھاں سے کچھ عرصہ بعد واپس خراسان چلا آیا اور ضلع جام کے شہر خرجرد میں رھائش اختیار کی اور وھیں ۸۳۷ھ میں فوت ھوا ۔ مفتاح التواریخ میں مرات الخیال کے حوالے سے اس کا سن وفات ۸۳۵ھ دیا ہے ۔ مخبرالواصلین میں تاریخ وفات 'قاسم بخلد قاسم خلد' (۸۳۵) دی ہے ۔

'سلسلة النسب الصفویه' میں اس کا ذکر اس حیثیت سے آیا ہے کہ وہ شیخ صدرالدین کے سب سے زیادہ پرجوش مریدوں میں سے تھا۔ اس نے سخت ریاضت کی تھی جس کے ذریعے اردبیل کی مسجد میں اس نے ایک کشف دیکھا کہ اپنے ساتھی مریدوں کو نور بانٹ رہا ہے۔ اس سے اس نے قاسم الانوار کا لقب پایا۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان شبہات کی طرف اشارہ کیا ہے جو شاہ رخ پر قاتلانہ حملہ ہونے کے سلسلے میں اس پر کیے گئے اور جن کی بنا پر یہ شہر بدر کیا گیا۔ مولانا جامی کے مطابق اس کی سیرت کے بارے میں اختلاف رائے ہے۔ لیکن اس کے جن مریدوں سے جامی ذاتی طور پر واقف تھے وہ اسلام کی پابندیوں کو ترک کر چکے تھے اور انھوں نے ایک طرح کی اشتہالی زندگی اختیار کر رکھی تھی۔ چناں چہ بہ قول براؤن "پس اس اشتباہ کی بنا خاصی معقول ہے کہ قاسم اگر ان صفویوں کے جو ہنوز بے تاج و تخت تھے، شیعہ حمایتیوں کے ساتھ یا ان سے زیادہ نا قابل مصالحت حروفی ملحدین کے ساتھ نیم سیاسی تعلقات نہیں رکھتا تھا تو بھی کم سے کم وہ ان لوگوں میں سے تھا جو شریعت کے ساتھ تہاون (خوار سمجھنا) برتتے ہیں۔"

ایک دیوان اس کی یادگار ہے جس میں غزلیات کے علاوہ کچھ مثنویاں ہیں۔

(براؤن جلد سوم اردو ترجمہ ۶۶۹—۶۷۲ - مفتاح التواریخ، صفحہ ۱۰۱ شبلی)

۷۵ - ازرقی - بہ معنی نیلگوں، اور اشارہ ہے پانچویں صنامہ بلخ، کے مشہور فارسی شاعر ابوبکر زین الدین اسماعیل وراق ازرقی؟ صفا نے جو ہرات کا رہنے والا تھا۔ اس کا باپ اسماعیل وراق تھا کہتے ہیں:
فردوسی غزنین سے فرار کے بعد چھ ماہ تک چھپا رہا تھا۔ اس کے باپ کا پیشہ وراق (کتاب فروشی) تھا جو اس کے امور ادبی سے لگاؤ کا سبب بنا۔ جس دربار سے یہ سب سے پہلے وابستہ ہوا وہ شمس الدولہ وزین الملة ابوالفوارس طغان شاہ بن الپ ارسلان (سلجوقی بادشاہ) کا دربار ہے، جو اپنے باپ کے دور حکومت میں خراسان کا حاکم تھا۔ طغان شاہ کے یہاں اسے خاص مرتبہ و مقام حاصل تھا، یہاں تک کہ جب

طغان شاہ ہرات میں نہیں ہوتا تھا تو اسے خطوط کے ذریعے یاد کیا کرتا تھا ۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اس کے تقرب کے بارے میں ایک حکایت دی ہے جو مختصراً یہ ہے کہ کسی موقع پر چوپڑ کھیلتے ہوئے طغان شاہ بازی ہار جاتا ہے ۔ اس کے اس خشم کو دور کرنے کے لیے ازرق نے ایک رباعی کہی جس سے بادشاہ اتنا خوش ہوا کہ اُس نے اس کی آنکھوں کو چوما اور دینار منگوا کر اس کے منہ میں دیے ۔ کوئی پانسو دینار منہ میں آئے جو اُس نے خوشی میں آ کر اسے (ازرق) بخش دیے ۔ طغان شاہ کے علاوہ ازرق نے کرمان کے سلجوقی فرماں روا امیران شاہ بن قاورد کی مدح میں بھی قصائد کہے ۔ اس کے ساتھ اس کے بڑے اچھے تعلقات تھے ۔

ازرق نے قصیدہ کے علاوہ کچھ مثنویاں بھی لکھیں جن میں سے ایک الفیہ شلفیہ اور دوسری سند باد نامہ ہے ۔ اس کی تاریخ وفات تقی الدین کاشی نے ۵۲۷ھ اور ہدایت نے ۵۲۶ھ دی ہے ۔ لیکن بہ قول صفا یہ دونوں غلط ہیں ۔ بہر حال صفا اور شفق کے مطابق اس کا سال وفات ۴۶۵ھ کے لگ بھگ ہونا چاہیے ۔ ازرق ایک زبردست اور ماہر شاعر تھا ۔ اسے دقیق مضامین پیدا کرنے ، نازک خیالات لانے ، دقیق اشیاء کے وصف و عکاسی اور منظر کشی میں بڑی مہارت تھی ۔ (صفا جلد دوم صفحہ ۳۳۲—۳۳۶ ۔ شفق صفحہ ۱۹۱ ۔ براؤن جلد دوم ، صفحہ ۳۲۳ ۔ نیز اس کے بیشتر قصائد کے لیے ملاحظہ ہو 'تاریخ افضل' یا 'بدیع الازمان فی وقایع کرمان' تصنیف افضل الدین ابو حامد احمد بن حامد کرمانی ، فراہم آوردہ دکتر مہدی بیانی ، انتشارات دانش گاہ تہران ۱۳۲۶ ش)

۷۶ ۔ نشاہ عنصری ۔ نشاہ بہ معنی کیف و مستی اور جہان و عالم ۔ عنصری بہ معنی مادی ، یعنی جس کا تعلق عنصر یا عناصر سے ہو ۔ یہاں اشارہ ہے غزنوی دور کے مشہور شاعر ابوالقاسم حسن بن احمد المتخلص بہ عنصری کی طرف ۔ یہ سلطان محمود کے دربار کا ملک الشعرا تھا ۔ عوفی اسے 'مقدم شعرائے عہد' اور 'پیشوائے فضلائے زمان' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے ۔ بلخ کا رہنے والا تھا ۔ بہ قول شفق ۳۵۰ھ کے قریب پیدا ہوا ۔ اس کے شروع کے حالات کے بارے میں بعض مؤرخین لکھتے ہیں

کہ باپ کے مرنے کے بعد اس کا مال و دولت لے کر تجارت کی خاطر گھر سے نکلا ۔ سفر کے دوران راهزنوں نے لوٹ لیا اور تمام دولت هاتھ سے جاتی رهی ۔ اس کے بعد اس نے دولت علم اکٹھی کرنے کا ارادہ کیا ۔ اس سے اتنا پتا چلتا ہے کہ عنصری کا تعلق ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تھا اور اس نے اس تنعم میں شعر و ادب کی طرف توجہ کی ۔ اس نے علوم متداولہ حاصل کیے اور شاعری کے سبب شہرت پائی ۔

عنصری نے محمود غزنوی کے چھوٹے بھائی امیر نصر کی وساطت سے دربار محمودی میں رسائی پائی ۔ کچھ تو اس سبب سے کہ خود محمود کا بھائی اس کا معترف تھا اور کچھ علم و ادب و شعر میں برتری ہونے کی وجہ سے اسے جلد هی سلطان محمود کا تقرب حاصل هو گیا اور یہ اس کے ندیموں کی صف میں آ گیا ۔ اس تقرب اور شعرا پر فوقیت ہونے کے سبب اس نے بڑی دولت و ثروت فراهم اور بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کی ۔ چناں چہ کہتے هیں کہ ''چار سو زرین کمر غلام رکاب میں ساتھ چلتے تھے اور جب سفر کرتا تو اس کا ساز و سامان ، جو عموماً طلائی و نقرئی هوتا تھا ، چار سو اونٹوں پر بار کیا جاتا تھا ۔ انتہا یہ کہ دیگیں بھی طلائی اور نقرئی هوتی تھیں ۔''

سلطان محمود کے دربار میں چار سو شعرا ملازم تھے ، جن کو حکم تھا کہ وہ اپنا کلام عنصری کو اصلاح کی غرض سے دکھایا کریں ۔ اور جو کوئی اپنا کلام پیش کرے ، عنصری کی اصلاح کے بعد پیش کرے ۔ بڑے بڑے شعرا عنصری کی مدح میں قصائد لکھ کر پیش کرتے اور گران بہا صلے پاتے ۔

عنصری اکثر غزوات هند اور دیگر جنگی سفروں میں محمود کے همراہ رها اور اس کے کئی ایک قصائد انھی جنگی سفروں کے بارے میں هیں ۔

اس نے ۴۳۱ھ میں وفات پائی ۔ عنصری جیسا کہ اس کے اشعار سے واضح ہے ، ایک بلند همت اور بزرگ منش شخص تھا ۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ اس نے قصائد مدحیہ کہے هیں ، لیکن ان میں اکثر جگہ اخلاقی مضامین اور ایسے اشعار لانے سے گریز نہیں کیا جو اس کی علو طبع کے نمائندہ تھے ۔ اس کا یہ وقار و متانت اس کی غزلوں میں بھی

نمایاں ہے ۔ اس کا دیوان تین ہزار اشعار پر مشتمل تھا ، لیکن اب جو اس کے اشعار ملتے ہیں ان کی تعداد کچھ اوپر دو ہزار ہے ۔ عنصری نے دیوان کے علاوہ چند ایک مثنویاں بھی کہی تھیں جن کے نام یہ ہیں : 'شاد بہر و عین الحیوۃ' ، 'وامق و عذرا' اور 'خنگ بت و سرخ بت' ۔ (صفا جلد اول، صفحہ ۵۵۹-۵۶۱ ۔ شعرالعجم جلد اول، صفحہ ۵۸ ، ۵۹ ۔ شفق ، صفحہ ۵۸ ۔ براؤن جلد دوم ، فارسی ترجمہ ، صفحہ ۱۲۴)

۷۷ ۔ فردوسی ۔ فردوس سے متعلق ، فردوس کی مانند اور مشہور شاعر فردوسی جس کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے ۔

۷۸ ۔ حسینی ۔ غالباً اس سے مراد موسیقی کا وہ راگ ہے جسے اصطلاح موسیقی میں حسینی کہتے ہیں اور جو رات کے آخری حصے میں گایا جاتا ہے ۔ شرف الدین فضل اللہ حسینی قزوینی (متوفی ۷۴۴ھ) ایک شاعر و ادیب بھی تھا ۔ (ملاحظہ ہو مختصری در تاریخ......اردو ترجمہ ، صفحہ ۹۴)

۷۹ ۔ بہ کمال جمال ۔ پورے حسن کے ساتھ ۔ لیکن ساتھ ہی اشارہ ہے کمال الدین اسماعیل خلاق المعانی ولد جمال الدین اصفہانی کی طرف ۔ اول الذکر کا تذکرہ کیا جا چکا ہے ۔ جمال الدین بھی اپنے دور (چھٹی صدی ہجری) کے نام آور شعرا میں سے تھا ۔ یہ ایک زرگر تھا اور اس نقش بندی کے سبب اسے جمال نقاش بھی کہتے تھے ۔ زیادہ تر عمر اصفہان میں گزاری ۔ روزی کے سلسلے میں آذر بائیجان ، گنجہ اور مازندران وغیرہ کا سفر کیا ۔ گنجہ میں نظامی سے ملاقات کی ۔ اس نے ۵۸۸ھ میں وفات پائی ۔ جمال نے اپنے دور کے کئی ایک رؤسائے اصفہان ، سلاطین و امرا اور دیگر بڑے بڑے لوگوں کی مدح میں قصائد کہے ہیں ، جن میں سے زیادہ تر آل صاعدیہ کے لوگ ہیں ۔ ان کے علاوہ ارسلان بن طغرل سلجوق (۵۵۵ھ - ۵۷۱ھ) نصرۃ الدین جہان پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸ھ - ۵۸۱) اور طغرل بن ارسلان سلجوق (۵۷۱ھ - ۵۹۰ھ) کے نام قابل ذکر ہیں ۔ اس نے اپنے دور کے بعض شعرائے بزرگ مثلاً خاقانی ، انوری ، رشید الدین وطواط اور ظہیر فاریابی سے بھی رابطہ و تعلق رکھا ۔

جمال نے آغاز جوانی میں شاعری شروع کی اور ابتدا ھی میں وہ ایک ماہر شاعر تھا ۔ اس کے اشعار بناوٹ سے خالی اور سادہ و رواں ھیں ۔ اپنے قصائد میں اس نے کبھی سنائی اور کبھی انوری کی پیروی کی ہے ، لیکن ہر موقع پر روانی و آسانیٔ شعر کا دھیان رکھا ہے ۔
(صفا جلد دوم ، صفحہ ۷۳۱-۷۳۳ - شفق صفحہ ۱۹۷)

۸۰ - فرخار - ترکستان کا ایک علاقہ جہاں کے حسین مشہور ھیں ۔

۸۱ - فلکی - فلک سے متعلق ، آسمانی - دوسرا مطلب فلکی شروانی - ابوالنظام محمد تخلص فلکی جو چھٹی صدی ھجری کے شعرائے بزرگ میں سے تھا - شماخی (شروان) میں مذکورہ صدی کے اوائل میں پیدا ھوا ۔ علم نجوم میں اسے خاصی دسترس تھی - اسی سبب سے فلکی تخلص رکھا ۔ شروان شاھوں کا مداح اور خاقان اکبر منوچہر اور اس کے بیٹے اخستان کا ھم عصر تھا ۔ شعر و ادب میں ابوالعلا گنجوی کی شاگردی اختیار کی ۔ اسے بھی خاقانی کی مانند کچھ عرصہ قید و بند کی صعوبت برداشت کرنا پڑی ۔ اس دوران میں اس نے جو اشعار کہے ان میں ایک خاص لطف و اثر ہے - اس کی تاریخ وفات بعض کے نزدیک ۵۸۷ھ اور بعض کے نزدیک ۵۷۷ھ ہے ۔ اس کے اشعار کی تعداد سات ھزار بتائی جاتی ہے ، لیکن جو اس وقت دست یاب ھیں ان کی تعداد بہ مشکل دو ھزار ہے ۔ شفق نے بارہ سو لکھی ہے ۔ اس کے اشعار سادہ و رواں ھیں اور اگرچہ ان میں کوئی جدت و ابتکار نہیں ، تاھم شیرین و دل کش ھیں ۔ شعرائے خراسان سے بے حد متاثر تھا ۔ (صفا جلد دوم صفحہ ۷۷۴ - شفق ، صفحہ ۲۳۷ - ۲۳۸)

۸۲ - ظہیر - یار و مدد گار ، پشت پناہ ۔ دوسرا مطلب ظہیر فاریابی مشہور شاعر جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ۔

۸۳ - ادیب - ادب سکھانے والا ، اھل قلم - چوتھی صدی ھجری کا مشہور شاعر شہاب الدین شرف الادبا صابر بن اسماعیل ترمذی ، جو ادیب صابر کے نام سے مشہور ہے - ترمذ ھی میں اس کی شاعری کا آغاز ھوا ۔ لیکن بعد میں مرو ، بلخ اور خوارزم وغیرہ میں وقت گزارا اور

سلطان سنجر کی مداحی میں قصائد کہے۔ شاعری کے علاوہ دربار کی دیگر خدمات بھی سرانجام دیتا تھا ۔ جب سنجر اور اتسز خوارزم شاہ کی آپس میں ٹھنی ہے تو اول الذکر نے جب اتسز کو مخالفت پر آمادہ ہی پایا تو اسے اتسز کے دربار میں بہ طور ایلچی کے بھیجا ۔ یہ کچھ دن خوارزم میں رہا ۔ اتسز نے دو آدمیوں کو سنجر کے قتل پر آمادہ کر کے روانہ کیا* ۔ ادیب کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے تمام واقعہ اور ان دو آدمیوں کی شناخت لکھی اور ایک بڑھیا کی جرابوں میں رکھ کر اسے مرو روانہ کیا ۔ سلطان سنجر کو جب وہ خط ملا تو اس نے ان آدمیوں کو تلاش کروا کے قتل کرا دیا ۔ جب اتسز کو ان کے قتل کا پتا چلا تو اس نے ادیب کو دریائے جیحوں میں پھینکوا دیا ۔ یہ واقعہ ۵۳۸ھ اور ۵۴۲ھ کے درمیان پیش آیا ۔ ادیب جب تک خوارزم میں رہا ، اس نے اتسز کی مدح میں بھی قصیدے کہے ۔

ادیب کا کلام سادہ و رواں ہے ۔ اس سلسلے میں وہ اپنے دور کا فرخی ہے ۔ بلاغت میں اسے بڑی شہرت حاصل تھی ، یہاں تک کہ انوری جیسا شاعر بھی اپنے آپ کو اس کے سامنے کم تر سمجھتا ہے ۔

---

* ۔ تاریخ بخارا کے مؤلف نے اس کے برعکس لکھا ہے ۔ متن میں یہ لکھ کر کہ ''جب تک مؤخرالذکر (سنجر) کا ستارۂ قسمت بلند رہا اٹیز (مذکورہ تاریخ کے مترجم نے ہر جگہ اتسز کی بجائے اٹیز ہی لکھا ہے جو قطعاً غلط ہے) نے اتنی ہی وفا داری اور عقیدت کا اظہار کیا جتنی سنجر کی بد نصیبی کے وقت مخالفت اور دشمنی کی۔'' اس پر یہ حاشیہ جمایا ہے ''جب سنجر بخارا میں تھا اور تمغاج کی بغاوت فرو کر رہا تھا تو سازشیوں نے اسے شکار گاہ میں قتل کرنے کا منصوبہ بنایا ۔ اٹیز نے خواب دیکھا ۔ بیدار ہو کر فوراً شکار گاہ پہنچا ۔ اس کے آنے سے قاتلوں کا منصوبہ ناکام ہوا ۔ سنجر اس عجیب خواب اور بر وقت انتباہ کا حال سن کر حیران ہوا اور اٹیز کی وفا داری سے بھی متاثر ہوا ۔'' (ملاحظہ ہو تاریخ بخارا از آرمینیس ویمبرے مترجمہ نفیس الدین احمد ایم ۔ اے بہ نظر ثانی عبد المجید سالک ، مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور، صفحہ ۱۳۱)۔

چناں چه وه اپنے ایک قصیده میں ایک جگه کہتا ہے : ع

''چون سنائی هستم آخر گر نه همچون صابرم''

(اگر میں صابر کی مانند نہیں تو سنائی کی طرح تو ہوں) ۔ اسے عربی زبان میں بڑی مہارت تھی ۔ (صفا جلد دوم ، صفحه ۶۴۳-۶۴۴ ۔ شفق ، صفحه ۱۹۱-۱۹۲)

۸۴ ۔ مغربی پیشه ۔ مغربی ایک صوفی شاعر تھے ۔ اس لحاظ سے مطلب ہوگا صوفی پیشه بن ۔ محمد شیرین مغربی تبریز کے رہنے والے تھے ۔ ۷۵۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ۔ دیگر تذکره نگاروں کے برعکس رضا قلی خاں کا کہنا ہے که وه اصفہان کے قریب قریۂ نائین میں پیدا اور فارس میں اصطهبانات کے مقام پر دفن ہوئے ۔ تخلص مغربی کی وجه یه بتائی جاتی ہے که انہوں نے مغرب (شمال مغربی افریقه) کی سیاحت کی ۔ وہاں ایک شیخ نے انھیں خرقه پہنایا جو اپنے نسب روحانی کا سلسله مغرب کے نامور صوفی شیخ محی الدین ابن العربی سے ملاتا تھا ۔ کمال خجندی مشہور غزل گو شاعر سے ان کے روابط تھے ۔ براؤن لکھتے ہیں که ''اگر ریو کے کہنے کے مطابق یه بات درست ہے که کمال نے میراں شاه پسر تیمور والئی آذر بائیجان کا التفات مغربی سے چھین لیا تو ممکن ہے که دونوں شاعروں کے تعلقات بہت مخلصانه اور صمیمانه نه ہوں ۔'' مغربی نے به عمر ساٹھ برس ۸۰۹ھ میں تبریز کے مقام پر وفات پائی ۔ ان کی شاعری میں سرتاپا 'همه اوست' کا عقیده کارفرما ہے ۔ شبلی کے مطابق ''مغربی کا کلام سرتا پا مسئلۂ وحدت کا بیان ہے اور چوں که تخیل اور جدت کم ہے اس لیے طبیعت گھبرا جاتی ہے ۔ ایک ہی بات کو سو سو بار کہتے ہیں اور ایک ہی انداز میں کہتے ہیں ۔'' (براؤن ، جلد سوم اردو ترجمه ، صفحه ۴۵۶-۴۵۸ ۔ شعرالعجم جلد پنجم صفحه ، ۱۲۲) ۔

۸۵ ۔ خسروی ۔ بادشاهت ، اور اشاره ہے خسرو کی طرف جن کا ذکر گزر چکا ہے ۔

۸۶ ۔ کوس خاقانی ۔ کوس شہنشاهی (خاقان ترکی لفظ ہے جس کے معنی بادشاه بزرگ کے ہیں ۔ قدیم میں یه چین و ترکستان کے بادشاهوں

"کا لقب ہوتا تھا) ۔ اور دوسرا مطلب آذربائیجان کا مشہور شاعر خاقانی جس کا ذکر پہلے گزر چکا ہے ۔

۸۷ ۔ چار رکن رفیع ۔ چار رکن ، چار عنصر (آب و آتش، خاک و باد) بہ معنی عالم موجودات ۔ رفیع : بلند اور غالباً اشارہ ہے رفیع مروزی کی طرف جو چھٹی صدی ہجری اور سلجوق دور کا شاعر تھا ۔ اس کے حالات زندگی پر پردہ پڑا ہوا ہے ۔ سوائے اس کے اور کچھ معلوم نہیں کہ عوفی نے لباب الالباب میں اسے شعرائے سلجوق میں شمار کیا ہے ۔ بہ قول صفا جو اشعار اس سے منسوب کیے جاتے ہیں وہ غزل میں اس کے کمال ذوق ، لطف سخن اور نازک خیالی کا پتا دیتے ہیں ۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں : ع

ای روی خوب تو سبب زندگانیم
یک روزہ وصل تو طرب جاودانیم
جز با جمال تو نبود شادمانیم
جز با وصال تو نبود کامرانیم
بی یادگار روی تو گر یک نفس زنم
محسوب نیست آن نفس از زندگانیم
درد نہانیست مرا از فراق تو
ای شادی و سلامت و درد نہانیم
یک رہ بگو کہ عاشقم از بندگان ماست
تا من کسی شوم چو بدین نام خوانیم

(بہ حوالہ صفا جلد دوم ، صفحہ ۶۳۸)

۸۸ ۔ عبید خادم ۔ عبید خادم ، خادم یا نوکر کے غلام ۔ عبید ایک شاعر بھی ہے ۔ جسے اپنی ہجو گوئی کے سبب بڑی شہرت حاصل تھی ۔ بہ قول مرحوم عباس اقبال آشتیانی اس کے حالات زندگی پورے طور پر نہیں ملتے ۔ حمد اللہ مستوفی کے مطابق اس کا تعلق خاندان زاکانیاں سے تھا ۔ (اسی لیے یہ عبید زاکانی کہلاتا ہے) ۔ زاکانی عرب کے ایک قبیلہ بنی خفاجہ کی ایک شاخ تھے جو ہجرت کرکے

قزوین میں سکونت پذیر ہوگئے تھے ۔ زاکانیوں میں کچھ لوگ تو علم و حدیث اور علوم منقول و معقول میں ماہر تھے اور کچھ وزارتوں پر فائز رہے ۔ اسی دوسرے گروہ سے ''صاحب معظم نظام الدین عبید اللہ'' (عبید) کا تعلق تھا ۔ لیکن مستوفی نے یہ نہیں واضح کیا کہ عبید کون سے دربار میں اور کس بادشاہ کا وزیر تھا ، تاہم بہ قول آشتیانی یہ واقعہ (یعنی عبید کا وزیر ہونا) ۷۳۰ھ سے پہلے کا ہوگا ۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا اس کا نام عبید اللہ اور لقب نظام الدین تھا ۔ اگرچہ یہ قزوین کا باشندہ تھا لیکن بہ قول براؤن مرحوم ، معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر سے اسے کوئی دل بستگی نہ تھی ، کیوں کہ برابر وہ اس کے باشندوں کے حمق کی پھبتیاں اڑاتا رہتا ہے ۔ شیخ ابو اسحاق اینجو (مقتول ۷۵۷ھ) کے عہد میں عبید شیراز میں مقیم رہا ۔ اس شہر سے اسے بڑی الفت تھی ۔ دولت شاہ نے سلمان ساوجی سے اس کی پرخاش اور جہان خاتون (یہ خاتون شاعرہ اور ابو اسحاق انجو کے ایک وزیر خواجہ امین الدین کی منکوحہ تھی) سے مشاعرات کا ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں ایک آدھ حکایت بھی دی ہے لیکن جیسا کہ آشتیانی نے لکھا ہے ان کے تاریخی ہونے پر اطمینان کامل نہیں ہے ۔ اس نے ۷۷۲ھ (۱۳۷۱ء) میں وفات پائی ۔ براؤن اس کے متعلق لکھتے ہیں ''عبید زاکانی ہزلیہ تحریف (Parody) اور ہجو گوئی میں شاید ایران کا سب سے زیادہ قابل ذکر شاعر ہے ۔ گو بیشتر فارسی ، عربی اور ترکی ہجو نویسوں کی طرح اس کی زبان بھی اکثر اتنی فحش ہے کہ اس کی نگارشات کے بہت بڑے حصے کو ناقابل ترجمہ بنا دیتی ہے، لیکن اس کی اخلاق الاشراف جہاں اس عیب سے اتنی مکدر نہیں ، طنز کا ایک لطیف پارہ ہے ۔ اس کے علاوہ اس کی بعض سنجیدہ نظمیں جن سے تذکرہ نگاروں نے حد درجہ بے اعتنائی برتی ہے حیرت انگیز دل کشی کی حامل ہیں''۔ براؤن نے اپنی کتاب میں اسے خاصی جگہ دی ہے ۔ اس کی توجیہ وہ یہ دیتے ہیں کہ ''وہ پھکڑ اور تمسخر پیشہ سہی ، لیکن اس کی زوردار اپج اور بے باکئی کلام ایسی صفات ہیں کہ جتنی توجہ اسے یہاں دی گئی ہے اس سے زیادہ کا اسے مستحق بناتی ہیں'' ۔

عباس اقبال آشتیانی نے عبید کا جو کلیات مرتب کیا ہے اس میں قصائد و غزلیات و مثنویات وغیرہ کے علاوہ نثر کے رسائل بھی ہیں جن میں اخلاق الاشراف ، ریش نامہ ، صد پند ، تعریفات وغیرہ شامل ہیں ۔

(کلیات عبید زاکانی مرتبہ عباس اقبال آشتیانی، مطبوعہ تہران ۱۳۳۴ش مقدمہ صفحہ اُ۔ھ، براؤن جلد سوم، اردو ترجمہ، صفحہ ۳۳۷-۳۳۸، ۳۷۶)۔

۸۹ ۔ وطواط ۔ صاحب غیاث اللغات نے اسے ابابیل اور فرہنگ عمید کے مؤلف نے خفاش (چمگادڑ) لکھا ہے وطواط ایک شاعر بھی تھا ۔ امیر امام رشید الدین سعدالملک محمد بن محمد بن عبدالجلیل عمری کہ خواجہ رشید وطواط کے نام سے مشہور ہے ، عبداللہ بن حضرت عمر رضی‌اللہ تعالیٰ‌عنہ ، بن الخطاب کی اولاد میں سے تھا ۔ اس کا سلسلہ نسب گیارہ واسطوں سے حضرت عمر رض تک پہنچتا ہے ۔ بلخ میں پیدا ہوا ۔ اسی شہر کے مدرسۂ نظامیہ میں تعلیم پائی ۔ پھر عربی و فارسی میں مہارت حاصل کرنے کے لیے خوارزم چلا گیا ۔ جہاں کچھ عرصہ بعد علاء الدولہ اتسز خوارزم شاہ کے دربار سے وابستہ ہو گیا ۔ اور آخری عمر تک خوارزم شاہی دربار ہی میں رہا ۔ دربار میں 'صاحب دیوانی رسائل' کے منصب پر فائز اور مقرب سلطان تھا ۔ سفر و حضر میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا ۔ اتسز اس کی صحبت سے بڑا محظوظ ہوتا ۔

اس کے تخلص وطواط کی وجہ اس کی کوتاہ جسمی تھی ۔ چناں چہ اس کی یہ کوتاہ بدنی کئی ایک لطیفوں کا باعث بھی بنی ۔ دولت شاہ کے مطابق ایک روز اتسز کی محفل میں علما کے درمیان مناظرہ ہو رہا تھا ۔ رشید وطواط بھی اس محفل میں موجود تھا ۔ اس مناظرہ میں یہ بھی اپنی تیز زبانی کے جوہر دکھا رہا تھا اور اس کے آگے ایک دوات پڑی تھی ۔ اتسز نے اس کی طرف دیکھا اور از راہ ظرافت کہا ۔ ''دوات ہٹاؤ تاکہ معلوم ہو اس کے پیچھے کون بیٹھا باتیں کر رہا ہے ۔'' وطواط سمجھ گیا فوراً اٹھا اور بولا ''المرء با صغریہ قلبہ ولسانہ'' (آدمی اپنی دو چھوٹی چیزوں ، دل اور زبان ، سے ہے) ۔ ایک موقع پر جب سنجر اتسز کی سر کوبی کے لیے خوارزم کی طرف بڑھا اور قصبہ 'ہزار سف' یا ہزار

اسب پر دو ماہ تک محاصرہ کیے رکھا تو اس موقع پر انوری نے ایک رباعی لکھ کر تیر کے ذریعے اندر پھینکی ۔ وطواط اس وقت ہزار سف میں تھا ۔ اس نے اس کے جواب میں رباعی تیر پر لکھ کر باہر پھینکی ۔ جب سنجر نے اس قصبہ پر قبضہ کر لیا تو اس نے اس جواب اور دیگر اشعار سے جو وطواط نے اتسز کی مستقل حکومت کے لیے اور اس کی بادشاهی کی تہنیت میں کہے تھے ، آزردہ خاطر ہو کر یہ قسم کھائی تھی کہ جس وقت بھی وطواط اس کے ہاتھ لگا وہ اسی وقت اس کے سات ٹکڑے کر ڈالے گا ۔ وطواط اس خوف سے چھپا رہا ۔ اور جب اس نے دیکھا کہ فرار ممکن نہیں تو خفیہ طور سے ارکان سلطنت کو اپنا وسیلہ بنایا ۔ آخر کچھ عرصہ بعد سنجر کے مشہور کاتب (سیکرٹری) منتجب الدین* بدیع کے پاس پناہ گزین ہوا ۔ ایک روز کاتب مذکور حسب عادت صبح کے وقت سلطان کی خدمت میں پہنچا ۔ پند و نصائح کی باتیں کرتے کرتے اس نے رخ پلٹا اور بادشاہ کو مذاحیہ باتوں کی طرف لے آیا ، اور موضوع بتدریج وطواط کا ذکر ٹھہرا ۔ منتجب اٹھا اور سلطان سے کہنے لگا کہ بندہ کی ایک حاجت ہے اگر اجازت ہو تو بیان کروں ۔ سلطان نے اس حاجت کو پورا کرنے کا وعدہ کیا ۔ اس پر وہ بولا کہ وطواط ایک کمزور سا پرندہ ہوتا ہے اس میں اتنی طاقت نہیں ہوتی کہ اس کے سات ٹکڑے کیے جائیں ۔ اگر آپ فرمائیں تو اس کے دو ٹکڑے کر دئے جائیں ۔ سلطان یہ سن کر ہنس پڑا اور وطواط کی جان بخشی کر دی ۔

اس کے بعد وطواط اسی طرح اتسز سے وابستہ رہا ۔ ۵۴۷ھ میں حاسدوں کی لگاوٹ سے اتسز نے اسے دربار سے نکال دیا ۔ اس نے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے بہت سے قصیدے کہے ۔ آخر اتسز مہربان ہو گیا اور اسے دوبارہ اپنے پہلے عہدہ پر بحال کر دیا ۔ اتسز کی وفات (۵۵۱ھ) کے بعد وطواط اس کے بیٹے ایل ارسلان کے دربار سے منسلک ہو گیا ۔ اور ۵۶۸ھ میں جب علاء الدین تکش تخت نشین ہوا تو اس کی عمر اسی

---

* ۔ تاریخ بخارا کے اردو ترجمہ میں مہتاب الدین لکھا ہے جو بالکل غلط ہے ۔

سے اوپر ہو چکی تھی۔ اس کے عہد کے شروع تک یہ اپنے عہدے پر رہا۔ پھر زیادہ ہی بڑھاپے کے سبب اس خدمت سے الگ ہو گیا۔

وطواط نے ۵۷۳ھ میں وفات پائی۔ دولت شاہ اور تقی‌الدین کاشی نے اس کی تاریخ وفات ۵۷۸ھ دی ہے۔ دیوان کے علاوہ اس نے نثر میں بھی کئی ایک یادگاریں چھوڑی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور اور قابل ذکر 'حدائق السحر فی دقایق الشعر' ہے جو شعری صنایع بدایع سے متعلق ہے۔ وطواط کا شمار عربی و فارسی زبان کے بہت بڑے ادبا و بلغاء میں ہوتا ہے۔ یاقوت نے اسے 'نوادر زمان و عجایب زمان' میں سے شمار کیا ہے۔ (صفا جلد دوم ، صفحہ ۶۲۸-۶۳۲ ، تاریخ بخارا ، اردو ترجمہ حاشیہ صفحہ ۱۳۰)

۹۰ - حجت - حجت ، دلیل ، برہان ، اور اشارہ ہے ناصر خسرو ملقب بہ 'حجت' کی طرف۔ حکیم ابو معین ناصر بن خسرو بن حارث القبادیانی ، البلخی‌المروزی حجت لقب۔ ایران کے بہت بڑے اور درجۂ اول کے شعرا میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ذیقعدہ ۳۹۴ھ میں قبادیان (بلخ) میں پیدا ہوا اور ۴۸۱ھ میں بمقام یمگان (بدخشاں) فوت ہوا۔ اس کا تعلق اسماعیلیہ فرقے سے تھا۔ حجت کا لقب ، جو اسماعیلیہ فرقے کا ایک مذہبی درجہ ہے ، اسے فاطمی خلیفہ نے دیا تھا۔

ناصرخسرو کا تعلق ایک بہت بڑے ثروت مند خاندان سے تھا۔ بچپن ہی سے علم و ادب میں مشغول ہوا۔ جوانی میں سلاطین و امرا کے درباروں میں رسائی پا کر مراتب عالی سے سرفراز ہوا۔ محمود غزنوی اور اس کے بیٹے مسعود غزنوی کے درباروں میں رہا۔ اس لحاظ سے ۲۷ برس کی عمر میں اس کا تعلق‌دربار سے ہو گیا تھا۔ ۴۳ سال کی عمر تک ، جب کہ یہ سفر کعبہ پر روانہ ہوتا ہے ، سیکرٹری جیسے بلند عہدہ پر پہنچ چکا تھا۔ اپنے ہم عصروں میں یہ 'ادیب' اور 'دبیر فاضل' کے الفاظ سے یاد کیا جاتا تھا۔ بادشاہ نے اسے 'خواجۂ خطیر' کا خطاب دے رکھا تھا۔ گویا شروع ہی سے اسے دربار بلخ میں ، جو غزنویوں کا موسم سرما کا پایۂ تخت تھا ، خاصا اقتدار و نفوذ حاصل تھا۔ جب سلجوقیوں نے اس شہر پر قبضہ کیا تو اس کے اعتبار و نفوذ میں اور بھی اضافہ ہوا۔

۴۳۲ھ میں ناصر خسرو مرو چلا گیا اور وہاں سلجوقی حکمران ابو سلیمان جغری بیگ کے دربار میں خدمت دیوانی پر مامور ہوا ۔ اس نے ایک عرصہ کسب مال و جاہ اور لہو و لعب میں بسر کیا ۔ اس دوران میں آہستہ آہستہ اس کی طبیعت میں تبدیلی پیدا ہوتی رہی اور 'معرفت حقایق' کی جستجو میں یہ علمائے عصر سے بحث و مذاکرہ کرتا رہا ۔ لیکن اس کی طبیعت تقلید پر مائل نہ ہوتی ۔ اسے اپنے سوالات کے تسلی بخش جواب نہ ملتے جس کے سبب یہ مضطرب سا رہتا ۔ غالباً اسی جستجو کے سلسلے میں اس نے ایک مدت تک ترکستان اور سندھ و ہند کا سفر اختیار اور مختلف مذاہب کے راہنماؤں سے بحث و مذاکرہ کیا ۔ غرض اسی طرح یہ کئی ایک شہروں میں گھوما ۔

آخر ایک خواب سے متاثر ہو کر جمعرات ۶ جمادی الاخریٰ ۴۳۷ھ کو سفر حجاز پر روانہ ہوا ۔ ۴۴۴ھ میں واپس بلخ پہنچا ۔ اس سات سال کے عرصہ میں اس نے چار مرتبہ حج کیا ۔ اور ایشیائے کوچک ، حلب ، طرابلس ، شام ، فلسطین ، مصر ، سوڈان ، جزیرۃ العرب ، ارمنستان اور ان کے علاوہ دیگر کئی ایک ممالک کی سیاحت کی ۔ مصر میں تین سال رہا اور یہیں اسماعیلی مذہب کی طرف مائل ہوا ۔ فاطمی خلیفہ المستنصر باللہ ابو تمیم معد بن علی (۴۲۷-۴۸۷) کی خدمت میں پہنچا اور پھر مختلف مراحل و مدارج طے کر کے 'حجت' کا مرتبہ حاصل کیا ۔ اس خلیفہ کی طرف سے جزیرۂ خراسان کے 'مقام حجت' اور اسماعیلی فرقہ کی تبلیغ و اشاعت پر مامور ہوا ۔ چنانچہ ۴۴۴ھ میں بلخ پہنچ کر اس نے اسماعیلی فرقہ کی دعوت و تبلیغ شروع کر دی اور اپنے اعیان مختلف اطراف وجوانب میں بھیجے اور اہل سنت علما کے ساتھ مناظرے وغیرہ کیے ۔ جس کے سبب اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ۔ اس پر الحاد کی تہمت لگا کر اس کے قتل کے فتوے بھی دئے گئے ۔ چونکہ خود سلجوق شیعوں کے مخالف تھے ، اس لیے اسے مجبوراً ترک وطن کرنا پڑا ۔

بلخ سے نکل کر نیشا پور پہنچا ۔ وہاں سے مازندران اور آخرکار یمگان میں پناہ لی ۔ درۂ یمگان کے پہاڑوں کے درمیان اس نے سکونت اختیار کی اور اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں اسی طرح مصروف رہا ۔ اپنی زندگی کے

آخری بیس پچیس برس اس نے یہیں بسر کیے - چناں چہ یہیں ۴۸۱ھ میں فوت اور مدفون ہوا - ناصر خسرو حافظ قرآن ہونے کے علاوہ اپنے عہد کے علوم متداولہ ، کیا علوم معقول و منقول اور کیا حکمت یونان وغیرہ ، سب میں بڑی دسترس رکھتا تھا - علم کلام و علم الٰہیات سے بہ خوبی آگاہ تھا - کتابوں سے اسے اس قدر لگاؤ تھا کہ سفر و حضر میں اپنی کتب اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا - حتیٰ کہ عربستان سے ایران واپس آتے ہوئے کئی ایک دشوار موقعوں پر اسے کتابیں اونٹ پر لاد کر خود پیدل چلنا پڑا -

دیوان کے علاوہ نثر میں سفرنامہ اس کی قابل ذکر یادگار ہے - اس کی شاعری دربار کی شاعری نہیں ہے اور اگر اس نے کچھ ایسے اشعار کہے بھی ہوں گے تو وہ دست یاب نہیں ہیں - اپنے قصائد میں اس نے پند و موعظت کے موتی بکھیرے ہیں - (دیوان اشعار حکیم ابو معین حمید الدین ناصر بن خسرو قبادیانی با تصحیح حاجی سید نصراللہ تقوی... مقدمہ از تقی زادہ... ، مطبوعہ تہران ۱۳۳۹ شمسی ، صفا جلد دوم)

۹۱ - سیف : بہ معنی تلوار اور اشارہ ہے مشہور شاعر سیف کی طرف جس کا ذکر قبلاً گزر چکا ہے -

۹۲ - ذوالفقار - حضرت علی کرم اللہ وجہ کی تلوار کا نام -

۹۳- روحانی - بہ معنی روح سے متعلق، اورغالباً اشارہ ہے ابوبکر بن محمد بن علی روحانی کی طرف جو چھٹی صدی ہجری کے استاد شعراء میں سے تھا - عوفی اسے ''الاجل الافضل تاج الحکماء عطارد الثانی'' کے الفاظ سے یاد کرتا ہے - دولت شاہ نے اسے مشہور شاعر رشیدی سمرقندی کا شاگرد بتایا ہے - گویا یہ بھی سمرقندی ہی تھا - اس کی تاریخ ہاے ولادت و وفات معلوم نہیں ہیں - تاہم رشیدی سمرقندی کا شاگرد ہونے کے سبب اس کی زندگی کا دور پانچویں صدی کے نصف آخر سے چھٹی صدی کے نصف اول تک متعین کیا جا سکتا ہے - یہ سلطان بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲-۵۴۷) کا مداح تھا - بعض تذکرہ نگاروں نے اسے دیگر سلاطین کا مداح بھی بتایا ہے ، جن میں سلطان محمد خوارزم شاہ کا نام بھی آتا ہے - لیکن مذکورہ سلطان ۵۹۶ھ میں تخت خوارزم پر بیٹھا تھا ، اس لیے یہ

بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے کہ روحانی اتنا عرصہ تک زندہ رہا ہو۔ ممکن ہے اس سے پہلے کے سلاطین خوارزم شاہی کی اس نے مدح کی ہو۔

روحانی کے جو اشعار موجود ہیں ان سے اس کی شعر میں مہارت و استادی اور غزل و تغزل وغیرہ میں اس کی لطافت طبع کا پتا چلتا ہے۔ (صفا جلد دوم ، صفحہ ۶۱۰-۶۱۱)

۹۴ - ابوالمفاخر۔ ابوالمفاخرخواجۂ حکیم سراج الدین ابوعمر و عثمان بن محمد (یا عمر) مختاری چھٹی صدی ہجری کے شعرائے بزرگ میں سے تھا۔ وہ ابراہیم بن مسعود غزنوی (۴۵۰—۴۹۲ھ) ، مسعود بن ابراہیم غزنوی (۴۹۲-۵۰۸) عضدالدولہ شیرزاد بن مسعود بن ابراہیم (۵۰۸—۵۰۹) اور ابوالملوک ارسلان بن مسعود بن ابراہیم (۵۱۱—۵۵۲) کا ہم عصر تھا۔ غزنوی سلاطین کے علاوہ اس نے کرمان کے سلجوق حکمرانوں کی بھی مدح کی ، جن میں سے سلطان ارسلان شاہ بن کرمان شاہ (۴۹۴—۵۳۶) کے ساتھ اس کا تعلق خاص طور پر رہا۔

مختاری ، مسعود بن سعد بن سلمان ، سنائی اور ابوالفرج رونی کا معاصر تھا۔ مسعود سعد کی مدح میں تو اس نے شعر بھی کہے ہیں اور سنائی نے اس (مختاری) کی مدح میں قصیدۂ غرا لکھا ہے جس میں اس کے نئے نئے اور تازہ مضامین کی تعریف کرتے ہوئے اسے (مختاری کو) 'امیر سخنان' کہا ہے۔

بہ قول شفق اس نے ۵۵۴ھ میں غزنہ میں وفات پائی ، لیکن صفا کے مطابق مختلف تذکرہ نویسوں نے اس کا سال وفات ۵۴۴ھ یا ۵۴۹ھ لکھا ہے۔ بقول ہمائی ۴۵۸—۴۶۹ھ کے درمیان پیدا اور ۵۱۲—۵۴۸ھ کے درمیان فوت ہوا۔ اس کا دیوان تقریباً آٹھ ہزار اشعار پر مشتمل بتایا گیا ہے۔ ایک مثنوی شہر یارنامہ بھی اس سے یادگار ہے۔ قصائد میں 'معانی نو و بکر' لانے اور مضامین تازہ پیدا کرنے میں اور کلام فصیح کے سبب اپنے معاصرین میں اسے بڑی شہرت حاصل تھی۔ (صفا جلد دوم ، صفحہ ۵۰۱ ، ۵۰۲ ، ۵۰۳ - شفق ، صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹ - دیوان عثمان مختاری مرتبہ جلال الدین ہمائی تہران صفحہ ۱۲)۔

۹۵ - بخت سعد مسعود - بخت سعد مسعود=مسعود کی خوش بختی - ممکن ہے اس کا اشارہ سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی کی طرف ہو۔ جس کی مدح میں ابوالمفاخر نے قصائد کہے - مشہور شاعر مسعود بن سعد بن سلمان کی طرف یہ اشارہ بعید معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس بے چارے نے تو اپنی عمر کا ایک حصہ قید و بند کی صعوبتوں میں گزارا تھا -

بہ ہرحال مسعود بن ابراہیم اپنے باپ کے بعد ۴۹۲ھ میں تخت نشین ہوا - اس نے اپنے بیٹے امیر عضد الدولہ شیر زاد کو ہندوستان کا حکمران بنا کر بھیجا - اس نے ہندوستان میں بہت سی فتوحات کیں جس کے سبب وہ ان حدود تک پہنچ گیا ، جن تک غزنوی محمود کے زمانے میں پہنچ گئے تھے -

مسعود کی بیوی سلطان ملک شاہ سلجوقی کی بہن تھی - اس نے سترہ سال حکومت کی اور ۵۰۹ھ (بدایونی نے ۵۰۸ھ لکھا ہے) میں وفات پائی - (منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۴۹ - خلاصہ تاریخ ایران ، صفحہ ۹۲)

۹۶ - مختار - فارسی متن میں 'مختاری' ہے جس کا مطلب ہے 'تو مختار ہے' یا 'تجھے اختیار ہے' - اور مختاری ایک شاعر بھی تھا جس کا ذکر اس سے پہلے 'ابوالمفاخر' کے ذیل میں ہو چکا ہے -

۹۷ - صابر - صبر کرنے والا اور اشارہ ہے مشہور شاعر ادیب صابر کی طرف جس کا تذکرہ ادیب کے ذیل میں ملاحظہ ہو -

۹۸ - کاتبی : کتابت - کاتبی نیشاپوری تیموری دور کا ایک شاعر بھی تھا - ۸۳۸ھ میں فوت ہوا - بعض لوگ اسے نیشاپوری کی بجائے ترشیزی بھی لکھتے ہیں - میر علی شیر نوائی اس کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ اپنے زمانے میں بے نظیر تھا ، اور جس کسی صنف سخن میں اس نے طبع آزمائی کی اس میں اور خصوصاً قصائد میں اس نے حیرت انگیز معانی ادا کیے - نئی نئی صنعتیں بھی ایجاد کیں جو پورے طور پر کامیاب رہیں - اس نے چند ایک مثنویاں بھی لکھیں - مثلاً حسن و عشق ، ناظر و منظور اور بہرام و گلندام وغیرہ - ان میں کئی ایک صنائع ہیں ،

لیکن اس کا غزلوں اور قصیدوں کا دیوان ، بہ قول نوائی زیادہ مشہور اور بہتر ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں اس نے نظامی کے خمسہ کی تقلید کرنا چاہی ، لیکن اس کی تکمیل میں ناکام رہا ۔ میر علی شیر نوائی لکھتا ہے ''میری حقیر رائے میں اس کی شاعرانہ قابلیت ایسی تھی کہ اگر ایسے فرماں روا کی تربیت نصیب ہوتی جو ہمارے بادشاہ بلند اقبال (سلطان حسین میرزا بایقرا ۸۷۵ھ تا ۹۱۱ھ) کی طرح اچھے شعر کا قدر دان ہوتا ۔ اور اس کے ساتھ ہی اس شاعر کی زندگی بھی زیادہ عرصہ قائم رہتی تو وہ اپنے رشحات سے سب کے دلوں کو تسخیر کر لیتا ۔ لیکن اپنی بدنصیبی کے باعث اس نے ان دونوں بادشاہوں میں سے، جن کا یہاں ذکر ہے ، کسی کا زمانہ بھی نہ دیکھا اور اس سے پہلے ہی دنیا سے رخصت ہو گیا ۔''

بہ قول دولت شاہ ، کاتبی ترشیز اور نیشاپور کے درمیان ایک گاؤں میں پیدا ہوا ۔ اسی لیے کبھی اسے ترشیزی کہتے ہیں اور کبھی نیشا پوری ۔ اس نے خطاطی کا فن ایک شاعر سیمی سے سیکھا جو بعد میں اس سے حسد کرنے لگا ۔ چناں چہ یہ نیشاپور چھوڑ کر ہرات چلا آیا ۔ یہاں کے دربار میں جب اس کی قدر نہ ہوئی تو استر آباد اور پھر شروان کا رخ کیا ۔ وہاں امیر شیخ ابراہیم کی سرپرستی میں کچھ عرصہ رہا ۔ اس نے اسے انعام میں بڑی بڑی رقمیں دیں جو اس نے تھوڑی ہی مدت میں اڑا دیں ۔ بعد ازیں یہ آذر بائجان گیا ۔ وہاں کے ترکمان حاکم نے قدر نہ کی ۔ وہاں سے اصفہان کا قصد کیا ۔ جہاں اس کی طبیعت میں تبدیلی ہوئی اور اس نے مداحی چھوڑ کر صوفیوں کا انداز نظر اختیار کیا ۔ اصفہان سے پھر وہ دوبارہ استرآباد چلا گیا اور یہیں اس نے وفات پائی ۔

جامی اس کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگرچہ اس کے کلام میں معانئی خاص بہت ہیں اور ان معانی کے بیان میں بھی اس کا ایک خاص اسلوب ہے لیکن اس کے اشعار ہموار و یک دست نہیں ہیں ۔ (بہ حوالہ براؤن ، جلد سوم اردو ترجمہ ، صفحہ ۶۸۴ ، ۶۸۷ - خلاصۂ تاریخ ایران ، صفحہ ۱۵۳)

چندر بھان برھمن (صفحہ ۱۸م)

افضل خاں علامی شکر اللہ شیرازی ، شاھجہاں کا دیوان کل تھا۔ جب وہ اس عہدہ پر فائز ھوا تو کسی شاعر نے اس کی تاریخ اس طرح نکالی

" شد فلاطون وزیرا سکندر " (۱۰۳۸ ھ)

بڑا فاضل شخص اور معقول، منقول ، ھیئت اور ھندسہ وغیرہ علوم میں بڑی دسترس رکھتا تھا ۔ اپنی فصاحت و بلاغت کے سبب اپنے زمانے کا حسان سمجھا جاتا تھا ۔ اس کے حالات زندگی کے لیے ملاحظہ ھو مآثرالامرا ، جلد اول صفہ ۷۵۵ - (وحید قریشی)

عبدالحمید لاھوری (صفحہ ۲۱م)

۱۔ ممتاز الزمانی ۔ ملکہ نورجہاں کے بھائی آصف خاں کی دختر تھی ۔ اصل نام ارجمند بانو بیگم، لقب ممتاز محل اور ممتاز زماں، عرف تاج بی بی ھے - ۱۰۰۰ھ میں پیدا ھوئی - اور ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ع) میں اس کی شادی شاھجہاں سے ھوئی - شادی کے بعد کچھ اوپر ۱۹ سال رہ کر جہان فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا ۔ وفات کا واقعہ اس طرح ھے کہ اس کے ایک بچی (دھر آرابیگم) ھونے والی تھی ۔ ولادت سے پہلے ھی اس نے ماں کے پیٹ میں رونا شروع کر دیا ، جس سے خادمائیں وغیرہ سب حیران ھوئیں ۔ ماں کو ھر لحظہ درد زہ ھوتا ، پھر کم ھو جاتا اور بچی کے رونے کی آواز اسی طرح آتی ۔ اگرچہ دایہ عورتوں اور دیگر داناؤں نے معالجہ وغیرہ میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا ، لیکن کوئی فائدہ نہ ھوا ۔ اور بچی کے پیدا ھونے کے ایک گھنٹے بعد ممتاز محل فوت ھو گئی ۔ چونکہ وہ بچی کی ولادت سے پہلے ھی اپنی زندگی سے مایوس ھو چکی تھی ، اس لیے اس نے مرنے سے تھوڑی دیر پیشتر بادشاہ کو بلوا کر دو وصیتیں کیں ، ایک تو یہ کہ دوسری شادی نہ کرنا ، اور دوسرے ، میرے مرنے کے بعد میرے مزار پر بے مثال عمارت بنوانا ، شاہ جہاں نے دونو وصیتیں قبول کیں ۔

ممتاز محل کی وفات ۱۷ ذی الحجہ ۱۰۴۰ھ (۱۶۳۱ع) کو بہ مقام

برہان پور واقع ہوئی ۔ جہاں اسے زین آباد کے باغ میں بطور امانت سپرد خاک کیا گیا ۔ وہاں سے اس کی نعش آگرہ لائی گئی ۔ اور چھ ماہ تک اسے روضہ کے باہر دروازہ چوک پر بطور امانت رکھا گیا ۔ اس دوران میں بہت سے ماہر نقشہ نویسوں نے روضہ کے لئے نقشے تیار کئے ۔ جن میں سے ایک بادشاہ کے پسند خاطر ٹھہرا ۔ اس نقشہ کے مطابق پہلے لکڑی کا نقشہ تیار کیا گیا ۔ پھر اس سے تاج محل کی صورت تیار ہوئی ۔ جہاں اس نعش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاک کے سپرد کر دیا گیا ۔

شاہ جہان کو ممتاز محل سے بے پناہ محبت تھی ۔ وہ بھی اس کی بہترین و وفادار ساتھی اور اس کے برے دنوں میں اس کی دانا مشیر تھی ۔ شاہ جہان نے اس کی تاریخ وفات لفظ 'غم' ۱۰۴۰ سے نکالی ۔ ممتاز محل کے بطن سے دارا شکوہ ، سلطان محمد شجاع ، اورنگ زیب اور مراد کے علاوہ انجمن آرا ، گیتی آرا ، جہاں آرا اور دھر آرا شہزا دیاں بھی ہوئیں ۔ (مفتاح التواریخ ۲۳۸ ، ۲۳۹ ، این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا ۴۸۸)

۲ ۔ مثمن بغدادی ۔ آٹھ پہلوؤں والی عمارت کی ایک قسم ۔

۳ ۔ یہاں لفظ نشیمن استعمال ہوا ہے ۔ اس کے معنی خلوت خانہ اور آرام گاہ کے ہیں ۔

۴ ۔ لپٹی ہوئی ۔ جس کے گرد کچھ لپٹا ہوا ہو ۔

۵ ۔ سلطان بہادرگجراتی ۔ گجرات کا علاقہ اپنی بےحد دولت کے سبب ہمیشہ بیرونی حملہ آوروں کو اپنی طرف متوجہ کرتا رہا ہے ۔ پہلے اس پر ہندو راجہ حکومت کرتے تھے ۔ چنانچہ ۴۱۶ ھ میں جب محمود غزنوی نے گجرات فتح کیا تو اس نے بھی ایک ہندو ہی کو وہاں کا گورنر مقرر کیا ۔ ۱۲۹۷ع میں علاء الدین خلجی نے اسے اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا ۔ اس کے بعد ایک مدت تک اس علاقہ پر مسلمان گورنر حکمرانی کرتے رہے ۔ تا آن کہ ۱۴۰۱ع میں (ایک نو مسلم راجپوت کے بیٹے) ظفر خان نے ، جو محمد شاہ بن فیروز شاہ تغلق کی طرف سے ۱۳۹۱ع میں وہاں کا حاکم مقرر ہوا تھا ، باقاعدہ آزادی اختیار کر لی ۔ اور سلطان مظفر شاہ کے لقب سے تخت پر بیٹھا ۔ اس کے بعد اس کا پوتا احمد شاہ اس کا

جانشین ہوا (یہی احمد شاہ در حقیقت گجرات کی آزاد حکومت کا بانی ہے) ۔ اس کے بعد اس (احمد شاہ) کا بیٹا محمد شاہ آیا پھر دو اور حکمران تھوڑا عرصہ رہے ۔ ان کے بعد احمد شاہ کا ایک پوتا ابوالفتح خاں تخت نشین ہوا ۔ اس نے محمود کا لقب اختیار کیا ۔ (یہ عام طور پر محمود بیکرہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) ۔ محمود بیکرہ کے بعد اس کا بیٹا مظفر شاہ ثانی ماہ رمضان ۹۱۷ ھ (۱۵۱۱ ء) میں تخت نشین ہوا ۔ سلطان بہادر اسی مظفر ثانی کا بیٹا تھا ۔ جب مظفر ثانی (۹۳۲ ھ میں) فوت ہوا اس وقت سلطان بہادر جونپور کی جانب گیا ہوا تھا ۔ مظفر کے بعد اس کے دو دیگر بیٹوں نے تھوڑے دنوں کے لیے حکومت کی ۔ جب سلطان بہادر کو معلوم ہوا تو وہ جلدی سے گجرات پہنچا اور اسی سال عید الفطر کے روز اپنے پنج سالہ بھائی عمادالملک کو تخت سے اتار کر (جسے بعد میں اس نے مروا دیا) خود تخت پر بیٹھا ۔

یہ بڑا بہادر اور جنگجو حکمران تھا ۔ اس نے کئی ایک فتوحات کیں ۔ جن میں چتوڑ کی فتح (۱۵۳۴ع-۱۵۳۵ع) خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔ اس نے ہمایوں سے بھی ٹکر لی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس کے ایک باغی محمد زمان میرزا کو پناہ دی تھی اور ہمایوں کے بار بار لکھنے پر کہ اسے روانہ کر دو، اس نے دو ٹوک جواب دیا تھا ۔ جس پر ہمایوں نے گجرات کی تسخیر کا ارادہ کیا ۔ بدایونی لکھتا ہے ' ہمایوں نے گجرات پر حملہ کا ارادہ کیا تھا لیکن وہ یہ سوچ کر سارنگ پور میں ٹھہر گیا کہ ایسے وقت میں جب کہ غنیم چتوڑ کے محاصرہ میں لگا ہوا ہے اس پر فوج کشی کر کے اس محاصرہ سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر لینا شیوۂ مردانگی نہیں بلکہ باعث رسوائی ہے ۔

سلطان بہادر چتوڑ کی مہم سے فارغ ہو کر ہمایوں کے مقابلے میں آیا ۔ مند سور کے نواح میں فریقین کے درمیان دو ماہ تک حالت جنگ رہی ۔ اسی دوران میں بہادر کے لشکر میں غلہ کی رسد بند ہو گئی، اس کے سپاہی اور مویشی بھوکوں مرنے لگے ۔ یہ وہاں سے کسی طرح بھاگ کر مند سور پہنچا ۔ اس کا تعاقب کیا گیا ۔ ایک دن مغلوں نے اسے سوتے

ہوئے گھیر لیا۔ لیکن وہ بیدار ہو کر پھرتی سے نکل گیا ۔ ہمایوں اس کے تعاقب میں احمد آباد پہنچا۔ یہ احمد آباد سے کھنبایت اور وہاں سے بندر دیپ کی طرف نکل گیا۔ جب مغل فوجیں واپس ہو گئیں تو اس نے دوبارہ اپنی سلطنت حاصل کر لی (جس کا علاقہ پہلے کی نسبت اب بہت کم رہ گیا تھا) ۔ اب یہ پرتگیزوں کی طرف متوجہ ہوا جن سے اس نے مغلوں کے خلاف بے سود مدد مانگی تھی ۔ اس نے پرتگیزی گورنر کو اپنی طرف بلوایا لیکن جب وہ نہ آیا تو سلطان بہادر خود (فروری ۱۵۳۷ع) اس سے ملنے کے لیے اس کے سمندری جہاز پر پہنچا۔ مگر پرتگیزیوں نے دھوکے سے اسے سمندر میں ڈبو دیا اور اس کے تمام ساتھیوں کو قتل کر ڈالا ۔ اس کی تاریخ ہائے وفات 'فرنگیان بہادر کش ۹۴۳ھ' اور 'سلطان البر شہیدالبحر ۹۴۳' کے الفاظ سے نکالی گئیں ۔

بقول بدایونی سلطان بہادر گلقند کے عرق کا بہت شوقین تھا۔ جس کے سبب ہمیشہ گلقند کے چھکڑوں کے چھکڑے اس کے ساتھ رہتے تھے۔ چناں چہ ایک موقع پر جب مذکورہ باغی محمد زمان میرزا کو اختلاج قلب کا دورہ پڑا اور اس کا علاج گلقند ٹھہرا تو اس نے بہادر سے تھوڑا سا گلقند منگوایا ۔ سلطان بہادر نے اپنے شربت دار کو بلا کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ بیس سے زیادہ چھکڑے گلقند کے بھرے ہوئے موجود ہیں ۔ سلطان نے وہ سارے چھکڑے محمد زمان کے پاس بھجوا دئے اور معذرت بھی کی کہ از راہ کرم معاف فرمائیں حالت سفر میں لشکر کے ساتھ فقط اتنا ہی گلقند موجود تھا ۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سلطان بہادر کے لیے گلقند کا عرق کشید کیا جاتا تھا ۔ اسی وجہ سے اس قدر گلقند ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا ۔

(منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۲۳۴-۲۳٦ - مفتاح التواریخ ، صفحہ ۱۵۰ - این ایڈ وانسڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۳۵۱-۳۵۳)

٦ - شیخ محمد غوث ۔ گوالیار کے رہنے والے تھے ۔ ان کا تعلق شطاری فرقے سے تھا [شطاری فرقہ کو شیخ با یزید بسطامی رح سے منسوب کیا جاتا ہے ۔ یہ لوگ خود کو شطاری اس لیے کہتے ہیں کہ سلوک اور طریقت میں وہ دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے زیادہ

تیز اور سرگرم (شطار) ہوتے ہیں ۔] اس فرقے میں سب سے زیادہ شہرت کے حامل شیخ مذکور ہی ہیں ۔ یہ شیخ فریدالدین عطار کی نسل سے تھے ۔ شیخ ظہور عرف حاجی حمید نے انہیں فرزندی میں لے کر سلوک و باطن کی پوری تعلیم دی ۔ دو سال کے عرصے میں پوری طرح تعلیم و تلقین فرما کر مزید فیضان کے لیے انہیں کوہ چنار کے جنگلات میں چھوڑ دیا ۔ جہاں انہوں نے ۱۲ - ۱۳ برس تک بناسپتی (سبزی وغیرہ) کھا کر بڑی ریاضتیں کیں اور یاد الٰہی کرتے رہے ۔

شیخ نے شروع ہی سے مغل سلاطین سے روابط قائم کر لیے تھے ۔ جب بابر بادشاہ نے قلعہ گوالیار فتح کرنے کے لیے فوج بھیجی تو شیخ ان دنوں قلعہ کے اندر تھے ۔ انہوں نے مغلوں کو ایک ترکیب بتائی جس سے قلعہ بآسانی فتح ہو گیا ۔ بابر کے بعد ہمایوں بھی ان کا معتقد رہا ۔ جب شیر شاہ تخت دہلی پر بیٹھا تو وہ شیخ کے درپے ہوا جس کے سبب یہ اپنے اہل و عیال اور مریدوں اور ساز و سامان کے ساتھ گجرات ہجرت کر گئے ۔ کوئی ۱۸ برس وہاں گزارے ۔ کچھ وقت بھڑوچ اور کچھ عرصہ احمد آباد وغیرہ میں رہے ۔ وہاں بھی انہیں بڑا اقتدار حاصل ہوا ۔ لیکن ان کی تصنیفات کے سبب ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ۔ بادشاہ وقت سلطان محمود گجراتی نے ایک دوسرے عالم شیخ وجیہ‌الدین سے اس سلسلے میں پوچھا ۔ لیکن وہ ان کی روحانیت سے متاثر ہو کر خود ان کے مرید ہو گئے ۔ جس کے سبب ان کا اثر اور بھی بڑھ گیا ۔

جب ہندوستان دوبارہ مغلوں کے قبضۂ اقتدار میں آ گیا تو اس وقت شیخ نے مغل دربار کا رخ کیا ۔ ہمایوں اس دوران میں فوت اور اکبر تخت نشین ہو چکا تھا ۔ بدایونی لکھتا ہے ۹۶۶ھ میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے ۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی ۔ شیخ گدائی (عہد اکبری کا پہلا صدر اور شیخ محمد غوثؒ کے خلاف تھا) کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا کیونکہ شیخ محمد غوثؒ کی وجہ سے اس

کی مشیخت کی دوکان پھیکی پڑ رہی تھی ۔ شیخ گدائی نے ان کے خلاف بیرم خاں، جس کے سپرد امور ملکی تھے، کے کان بھرے ۔ چناں چہ علما و مشائخ کے جلسے کیے گئے جس میں ان کی تصنیف رسالہ معراجیہ پر بحث ہوئی اور ان پر اعترض کیے گئے ۔ آخر آزردہ دل ہو کر انہوں نے گوالیار کا رخ کیا ۔ اکبر کی طرف سے ان کے لیے گراں بہا جاگیر مقرر کی گئی ۔ اس روپے سے انہوں نے گوالیار میں ایک خانقاہ تعمیر کرائی ۔ جہاں ہر وقت سماع و سرور اور وجد کا شغل رہتا ۔ شیخ خود بھی معرفت کے گیت بنواتے اور گنواتے تھے ۔ چناں چہ بقول عبدالحمید لاهوری مؤلف بادشاہ نامہ ہندوستان کا مشہور گویا تان سین ان کا منظور نظر تھا ۔ شیخ نے کئی تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں ۔ مثلاً رسالہ معراجیہ ، جواھر خمسہ ، کلید مخازن ، کنزالواحدۃ ، ضمائر و بصائر ۔ ایک کتاب بحرالحیواۃ میں ہندو یوگیوں اور سنیاسیوں کے اطوار و اشغال دئے ہیں ۔ یہ در اصل امرت کنڈ کا ترجمہ ہے ۔

شیخ نے بعمر ۸۰ سال ۱۴ محرم ۹۷۰ھ (۱۵۶۲ء) کو وفات پائی اور گوالیار ھی میں اپنے عالی شان روضہ میں دفن ہوئے ۔ (رود کوثر صفحہ ۳۳ ، ۳۶ - ۴۰ منتخب التواریخ صفحہ ۳۴۲ ، مفتاح التواریخ صفحہ ۱۷۳ ، دربار اکبری صفحہ ۷۷۵) ۔

طغرا مشہدی (صفحہ ۳۳۴)

۱ ۔ آشنائی ۔ واقفیت ، شناسائی ، تیرنا وغیرہ ۔ اس بات کو کہ تخت طاؤس کے موتیوں کی آب (چمک) ایسی زبردست ہے کہ وہ کبھی نہیں اتر سکتی (پھیکی یا ھلکی نہیں پڑ سکتی) ، اس طرح ادا کیا ہے کہ اگر اس کے موتیوں کی موج نے طوفان نوح سے ذرا سا بھی تعلق پیدا کیا ھوتا تو چونکہ وہ خود 'تنزل آب' (چمک کا پھیکا پڑنا ، پانی کا اترنا) سے نا آشنا ہے ، اس لیے وہ اس طوفان کو بھی کبھی نہ اترنے دیتی ، یعنی آب ہمیشہ اس کی طرح بلندی پر رہتا ۔

۲ ۔ اس تخت کا کہ آسمان جس کی پا بوسی کرتا ہے ، گوھر

شرف ستاروں سے مانوس ہے ۔ اگر عرش کے مرغ کا تاج سورج بن جائے تو بھی یہ محال ہے کہ وہ اس (تخت) کے مور کی زینت کا مقابلہ کر سکے ۔

۳ ۔ اس میں اتنی روشنی اور چمک ہے کہ دن کے وقت اگر اس کا سرپوش اٹھا جائے تو سورج اس کے سامنے ایک ستارے کی مانند معلوم ہوتا ہے ۔

۴ ۔ یعنی سیلانی یاقوت تخت سے قربت کے سبب اسے حقیر سمجھتا ہے ۔

۵ ۔ نسخہ کے معنی مسودہ یا کتاب کے بھی ہیں ۔ کیمیاے سعادت بہ معنی خوش بختی کا کیمیا اور اشارہ ہے امام غزالی رح کی مشہور کتاب 'کیمیاے سعادت یہ' کی طرف ۔ اس اقتباس میں کچھ اسی قسم کا لفظوں کا کھیل ہے ۔ اس فقرے میں مصنف کا مقصود تخت طاؤس میں استعمال کیے گئے سونے کو دیگر اقسام زر سے افضل قرار دینا ہے ۔

۶ ۔ جواهرالتفسیر ۔ ملا حسین واعظ کاشفی کی تالیف اور فارسی میں قرآن کریم کی تفسیر ہے جو اس نے ۸۹۹ھ (۱۴۹۳ء) میں اپنی موت سے گیارہ برس قبل لکھی ۔ یہ تفسیر اس نے اپنے ممدوح میر علی شیر کے لیے لکھی تھی اور اس وجہ سے اس کا نام اپنے ممدوح کے نام کی رعایت سے 'مواهب علیه' رکھا ۔ شروع میں اس کا خیال تھا کہ چار جلدوں میں ایک مبسوط و مفصل تفسیر موسوم بہ 'جواهرالتفسیرلتحفةالامیر' لکھے ۔ لیکن پہلی جلد کے اختتام پر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ۔ اور اس کی جگہ مختصر و محدود تفسیر لکھنے کا خیال کیا ۔ جس کا نام ، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ، مواهب علیه رکھا ۔ جواهرالتفسیر (یا مواهب علیه) ایران میں کم ہی مطالعہ کی جاتی ہے جبکہ بقول براؤن برصغیر پاکستان و ہند میں اس کی خاصی مانگ ہے ۔ یہ کتاب سورۂ فاتحہ سے لے کر سورۃالنساء کی ۸۴ویں آیت تک کی تفسیر پر مشتمل ہے ۔ اس کے بے شمار نسخے پاک و ہند ، یورپ اور استانبول کے کتب خانوں میں موجود ہیں ۔ یہ کتاب ایک مرتبہ کلکتہ سے ۱۲۴۷ھ میں ، چار مرتبہ بمبئی اور تین مرتبہ لکھنؤ سے شائع ہو چکی

هے - ۱۳۱۷ش میں اسے سید محمد رضا جلالی نائینی نے بڑے اہتمام کے ساتھ چار جلدوں میں مرتب کرکے تہران سے شائع کیا ۔

(از سعدی تا جامی براؤن جلد سوم فارسی ترجمہ از علی اصغر حکمت حاشیہ صفحہ ۶۴۳ ، ۶۴۴)

۷ - سورۂ نور - قرآن کریم کی ۲۴ویں سورت ہے جو مدینہ میں نازل ہوئی - اس میں ۶۴ آیات اور نو رکوع ہیں ۔ اس میں زنا کرنے والوں کے لیے سزا کا ذکر ہے ۔ علاوہ ازیں حضرت صدیقہؓ پر بہتان طرازی کرنے والوں کی سزا کا تذکرہ کیا گیا اور مسلمانوں کو تسلی دی گئی ہے کہ وہ اس (طوفان یعنی بہتان طرازی) کو اپنے حق میں برا نہ سمجھیں ، بلکہ یہ باعتبار انجام کے ان کے حق میں بہتر ہی بہتر ہے وغیرہ ۔

۸ - حضرت موسیٰ کا معجزہ ۔ جب وہ جیب میں ہاتھ ڈال کر باہر نکالتے تو وہ بے حد روشن ہوتا ۔

۹ - بادشاہ کے چہرہ سے فضا کیوں کر نہ روشنی حاصل کرے کہ ظل سبحانی سرتاپا نور ہی نور ہیں ۔ آپ کا اس نورانی تخت پر بیٹھنا ''نور'' علیٰ نور' کے معنی کی تشریح ہے ۔

۱۰ -

(۱) شاہی تخت جب یاقوت و جواہر سے آراستہ ہوگیا تو بخت نے کہا کہ تجھ (بادشاہ) سے تخت گوہر نگار (جس سے خود جواہر کو زیبائی ملے) بن گیا ہے ۔

(۲) اے بادشاہ تو تخت پر بیٹھ تا کہ خاص و عام تیری خدمت میں کھڑے ہوں ۔ اور تیری اس با برکت نشست کے سبب تخت بھی اپنے بخت پر نازاں ہو ۔

(۳) جب بادشاہ کے حکم سے تخت طاؤس دارالقرار (بہشت ، باغ ، پایۂ تخت ؟) میں آیا تو تاج اور تخت نے تخت گاہ کی مبارکباد کہی ۔

(۴) پیشتر اس کے کہ تخت اس (بادشاہ) کی تکیہ گاہ بنے اس کے جلال کے سرہانے ہی سے تخت نے قدر و منزلت پائی ۔

(۵) جب تک اس کی مسند تخت کی ہمدم نہ بنی تخت نے تاج کی طرح شہرت کے پھول نہ چنے۔

(۶) تخت گاہ کے باغ میں ، کہ جہاں تخت نے اپنے شان و شکوہ کے پایہ سے چتر پر شاخ چنار کی سی شان و شوکت ڈالی ہے ۔

(۷) اس نے تخت نشین بادشاہ کے سبب تمکنت پائی ہے ، اسی لیے وہ (تخت طاؤس) شاہی جلوس کے ساز پر مور کی طرح نہیں ناچا ۔

(۸) اس کا چتر جب اوج تخت سے نور پاش ہوا تو چونکہ اس کا تاج نہ تھا اس لیے تخت اس کے مقابل ہوا ۔(؟)

(۹) بادشاہ کی تخت گاہ کی ہوا اور فضا اس کی ضامن ہیں کہ تخت طاؤس گرد حادثات کا غبار نہ دیکھے گا ۔ (حادثات و انقلابات اس پر اثر انداز نہ ہو سکے)

جلالاے طباطبائی (صفحہ ۹۳۴)

۱۔ ملا شیدا ۔ اس کا مولدومنشا فتح پور(آگرہ) ہے ۔ لیکن کلمات الشعرا میں ہے کہ یہ جہانگیر کے اواخر عہد اور شاہجہان کے اوائل جلوس میں وارد ھند ہوا ۔ قبیلۂ تکلو سے تعلق ہونے کے سبب شیدائے تکلو کے نام سے مشہور ہوا ۔ اس کا خاندان مشہد سے واردھند ہوا ۔ لیکن جیسا کہ پہلے مذکور ہوا کہ یہ ھندوستان میں پیدا ہوا ، اس لیے ایرانی شعرا اسے ھندوستانی سمجھتے تھے ۔ پہلے یہ خانخانان کے ساتھ رہا ۔ پھر جہانگیر کے لشکر میں احدی کی حیثیت سے مامور ہوا ۔ جہاں اسے دستور کے مطابق جاگیر اور علوفہ ملتا تھا ۔ جب خانخانان نے دکن کی تسخیر کی تو اس نے اس کی مدح میں انوری کے طرز پر قصیدہ کہا ۔ کچھ عرصہ شہزادہ شہریار سے بھی متعلق رہا اور آخر میں شاہجہان کے دربار سے وابستہ ہو گیا ۔ بقول آزاد بلگرامی ''صاحب ذھن رسا و فکر آسان پیما'' تھا ۔ شعر بڑی سرعت سے کہتا اور چشم زدن میں 'جواھر فراواں' (شعر) پرو دیتا تھا ۔ اس کے ساتھ ہی وہ لکھتے ہیں کہ سخن طرازی میں اگرچہ اس کی طبع صحیح چلتی تھی لیکن 'ازجادۂ حسن خلق انحراف داشت' ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی اپنے معاصرین سے نہ بنتی تھی ۔ تمام شعرا اس کی خردہ گیری ، عیب جوئی اور ہجو گوئی

سے عاجز تھے ۔ حتیٰ کہ ملک الشعرا طالب آملی کو بھی اپنے طنز و استہزاء سے نخچیر کیا ۔ ایک مرتبہ اس کا یہ مطلع شاہجہان کے کانوں تک پہنچا :

چیست دانی بادۂ گلگون مصفا جوہری
حسن را پروردگاری عشق را پیغمبرے

تو اسے بڑا غصہ آیا کہ اس نے ام الخبائث کو کیوں اتنی وقعت دی ہے ۔ چنانچہ اس نے حکم دیا کہ اسے ممالک محروسہ سے نکال دیا جائے ۔ اس پر شیدا نے معذرت کے طور پر ایک قطعہ لکھا اور جامی کا ایک شعر استشہاد کے طور پر پیش کیا ۔ بادشاہ نے اسے معاف کر دیا ۔ آخر عمر میں وہ کشمیر میں گوشہ نشین ہو گیا تھا جہاں اس کو شاہجہان کی طرف سے وظیفہ ملتا تھا ۔ ایک لاکھ اشعار کے دیوان کے علاوہ ایک مثنوی دولت بیدار بھی اس سے یادگار ہے ۔ اس نے ۱۰۴۲ھ میں وفات پائی ۔ مراۃالخیال کے مؤلف کے مطابق یہ بہت ھی ذی استعداد شاعر تھا ۔ علم عروض میں اس کی مہارت کاملہ ضرب‌المثل تھی ۔ وہ ایسے شعرا کو خاطر میں نہ لاتا تھا جو مقبول خاص و عام تو ہوتے تھے مگر فن شاعری سے بیگانہ تھے ۔ ان کے کلام کے عیوب و نقائص کو بہت بیباکانہ طریقہ سے آشکارا کرتا تھا ۔ اسی لیے اس کی بھی ہجو کہی گئی ۔ (سرو آزاد ۸۲-۸۳ ، کلمات الشعرا ۵۶ ، تذکرۃالشعرا مؤلف محمد عبدالغنی غنی مطبوعہ علی گڑھ ۷۸ ، بزم تیموریہ ۱۶۰ - ۱۶۲ ، ۲۰۰ ، ۲۰۱)

۲- (۱) کون ہے وہ شخص جو توجہ کے طور پر تیزی سے یہ خط اس بے سروپا تک پہنچا دے ۔ (۲) جو یہ بل کھاتا ہوا شعلہ ، جو قلم کی نے سے نکلا ہے ، اس سوختہ سامان کے خرمن تک پہنچا دے (۳) جو اس سوختہ صفرا سے ، کہ جو قلم کے سر میں گرا ہے ، ایک قطرہ اس مایۂ سودا تک پہنچا دے ۔ (۴) جو ہمارے شعلہ‌کش قلم کے شہاب کے تیر سے ایک مد اس مقوی مہادیو تک پہنچا دے ۔ (۵) کب تک یہ بات در پردہ کہتا رہوں ۔ باد صبا سے کہو کہ یہ سربستہ خط شیدا تک پہنچا دے ۔

۳- و انه لقسم لو تعلمون عظیم - یہ ۷۶ویں آیت ہے سورۂ الواقعہ کی ، کہ فرقان حمید کی ۵۶ویں سورت ہے - سورۂ واقعہ میں قیامت کا اور جزا و سزا کا تذکرہ ہے - مذکورہ آیت سے پہلے اور بعد کی آیات کا ترجمہ یہ ہے : ''سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی ، اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے کہ یہ ایک مکرم قرآن ہے جو ایک محفوظ کتاب ،(یعنی لوح محفوظ) میں درج ہے کہ اس کو بجز پاک فرشتوں کے کوئی ہاتھ نہیں لگانے پاتا - یہ رب العالمین کی طرف سے بھیجا ہوا ہے ، سو کیا تم لوگ اس کلام کو سرسری بات سمجھتے ہو ، اور تکذیب کو اپنی غذا بنا رہے .... الخ'' (القرآن الحکیم مترجم ، ترجمہ.......... مولانا اشرف علی تھانوی)

دارا شکوہ (صفحہ ۴۴۵)

۱- ملا شاہ - حضرت میاں میر رح لاہوری کے خلفا میں سے اور دارا شکوہ کے مرشد تھے - بقول صاحب عمل صالح بدخشاں کے رہنے والے تھے - والدین کی زندگی میں طلب علم میں مشغول ہوئے - علوم رسمی اور فنون عقلی و نقلی کے حصول کے بعد درد طلب دامن گیر ہوا تو وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور وہاں سے کابل پہنچے - پھر ایک تاجر کے ہمراہ کابل سے لاہور آ گئے جہاں میاں میر رح کے ہاتھ پر بیعت کی - (صالح کے مطابق آپ ۱۰۲۳ھ میں یہاں آئے تھے) - یہاں آپ نے بہت ریاضت کی - چنانچہ کہتے ہیں کہ آپ مسلسل تیس سال تک بالکل نہیں سوئے - واللہ اعلم بالصواب - صالح کا کہنا ہے کہ مرشد کے کہنے پر کشمیر گئے لیکن ولیم بیل لکھتا ہے کہ میاں میر رح کی وفات کے بعد وہاں گئے - بہر حال بعد میں آپ نے گرمیوں کا موسم کشمیر میں اور سردیوں کا موسم لاہور میں گزارنا شروع کیا -

شاہجہان ، دارا شکوہ اور کئی ایک امرا کو آپ پر بہت اعتقاد تھا - چنانچہ بقول مؤلف 'ظفر نامہ رنجیت سنگھ' جب دارا شکوہ اورنگ زیب کے خوف سے آپ کے پاس آیا تو آپ نے اس سے کہا ''ترا دولت اخروی است ، چشم بر بند'' - جب اس نے آنکھ بند کی تو عالمگیر

کو بادشاہ بنے اور خود کو جنت میں دیکھا ۔ بقول بیل شاہجہان کہا کرتا تھا کہ ''ہندوستان میں دو شاہ ہیں ایک شاہجہان اور دوسرے ملا شاہ'' ۔ شاہجہان کے محبوس ہونے اور دارا شکوہ کے قتل کے بعد الحاد سے متہم ہوئے ۔ اور عالمگیر نے آپ کو جبراً کشمیر سے طلب کیا ۔ مجبور ہو کر لاہور پہنچے ۔ اثنائے راہ میں عالمگیر کی تخت نشینی کی تاریخ کہہ کر دہلی بھجوائی :

صبح دل من چون گل خورشید شگفت　　حق ظاهر شد و غبار باطل را رفت
تاریخ جلوس شاه اورنگ مرا　　'ظل الحق' گفت الحق این را حق گفت

بادشاہ نے جب یہ رباعی پڑھی تو دربار میں حاضر ہونے سے معاف کر دیا اور حکم دیا کہ وہیں لاہور میں رہیں ۔ مراۃ جہاں نما میں ہے کہ ۱۰۷۰ھ میں بمقام لاہور وفات پائی ۔ اور وہیں مدفون ہوئے ۔ مخبرالواصلین میں ۱۰۶۹ھ اور عمل صالح میں ۱۰۷۲ھ سنہ وفات دیا ہے (مؤخرالذکر زیادہ مستند ہے ۔)

ملا شاہ نے تقریباً ہر صنف سخن (قصیدہ ، غزل ، رباعی اور مثنوی وغیرہ) میں طبع آزمائی کی ہے ۔ بقول صالح آپ کے اشعار بڑے آبدار ہیں اور بقول تھامس ولیم بیل عارفانہ اور موحدانہ اشعار کہتے تھے ۔ آپ کی مثنویات اور رباعیات کے مخطوطہ‌جات پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہیں ۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں :

از شش جهتم روی نمودی آخر　　از هر طرف دام ربودی آخر
بیرون و درون جلوه گری میدیدم　　بر تحقیق آمدم تو بودی آخر
ای بند بپای وقفل بر دل هشدار　　وی دوخته چشم ، پای در گل هشدار
عزم سفر مغرب و رو به مشرق　　ای راهرو پست بمنزل هشدار

(راقم کا مضمون 'لاہور کے فارسی گو شعرا' مطبوعہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۸۷۳ ، ۸۷۳)

۲۔ انہ لقرآن ۔ یہ چار آیات بھی سورۂ واقعہ میں ہیں ۔ ان کا اور ان کے بعد کی آیات کا ترجمہ 'وانہ لقسم' ...... میں دیا چکا ہے ۔ ان سے پہلے کی دو آیات کا ترجمہ بھی اسی حاشیہ میں ملاحظہ ہو ۔

اورنگ زیب عالمگیر (صفحہ ۹۳۳)

۱۔ محمد معظم ۔ عالمگیر کا دوسرا فرزند تھا ۔ ماہ رجب ۱۰۵۰ھ میں ایک ہندوعورت نواب کے بطن سے بمقام برھانپور پیدا اور ایام شاھزادگی میں بہادر شاہ کے خطاب سے نامور ھوا ۔ اپنے چھوٹے بھائی اعظم شاہ کے جنگ میں مارے جانے کے بعد ۱۹ ربیع الاول بروز سوموار ۱۱۱۹ھ اپنے باپ کی جگہ آگرہ میں شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ھوا ۔ اپنی تخت نشینی کی تاریخ خود ھی کہی 'ما آفتاب عالمتابیم' (۱۱۱۹ھ) ۔ اس نے ایام طفلی میں کلام اللہ حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی ۔ اور بعد میں قرأت و تجوید کا ماھر ثابت ھوا ۔ بقول صاحب مآثر عالمگیری جب وہ قرآن پاک پڑھتا تو سامعین بہت محظوظ ھوتے تھے ۔ علم حدیث سے اسے خاص دلچسپی تھی اور اس میں اسے اتنا درک تھا کہ علمائے حدیث اسے سردار محدثین کے لقب سے یاد کرتے تھے ۔ عربی ، فارسی اور ترکی زبانوں میں بہترین اھل زبان کے ھم پلہ تھا ۔ فن خوش نویسی میں یکتائے زمانہ تھا اور مختلف قسم کے خطوط میں کمال حاصل کیا تھا ۔ مفتاح التواریخ کے مؤلف کے مطابق بہادر شاہ عالم و فاضل ، با مروت ، صالح ، عابد اور کثیرالاولاد شخص تھا ۔ اس کے بےحد عزم و شجاعت کے سبب تمام خدام ، حکام اور زمینداران قریب و بعید اس کے مطیع و منقاد تھے ۔ اس کے عہد میں تمام شاھزادے مطلق العنان اور فارغ البال زندگی بسر کرتے تھے ۔ چنانچہ اس کے سترہ شہزادے دربار میں اس کے دائیں بائیں بیٹھا کرتے تھے ۔

۱۱۲۰ھ میں جب اس کے چھوٹے بھائی محمد کام بخش نے ، کہ اپنے باپ کی طرف سے بیجاپور کا والی تھا ، اپنےنام کا سکہ و خطبہ جاری کیا تو بہادر شاہ ایک عظیم لشکر کے ساتھ اس کی طرف بڑھا ۔ حیدر آباد کے نزدیک جنگ ھوئی جس میں کام بخش مارا گیا ۔ اس نے ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ کو کچھ عرصہ بیمار رہ کر بعمر ۷۱ برس لاھور میں وفات پائی ۔ مرنے کے بعد اس کا لقب 'خلد منزل' قرار پایا ۔ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے جوار میں متصل موتی مسجد ، جو سنگ مرمر کی اور اسی کی بنائی ھوئی ہے ، مدفون ھوا ۔ (مفتاح التواریخ ۲۹۷ ، ۲۹۸ ، بزم تیموریہ ۲۹۵)

۲- بخشی (میر بخشی) - لفظ 'بخشی' غالباً سنسکرت لفظ 'بھکشو' سے ماخوذ ہے جس کا استعمال ابتداءً مشرقی ترکی اور فارسی میں عہد مغلیہ میں نظر آتا ہے - اولاً یہ لفظ بدھ مت کی پیشوائیت کو ظاہر کرتا ہے - ان معنی میں وہ چین کے ھوشنگ، تبت کے لاما اور 'اوغرتوئین' (Uighur Toin) کا مترادف ہے - ترکی النسل محررین کو بھی 'اوغر' رسم الخط میں ایسی دستاویزات لکھنا پڑتی تھیں جو منگول اور ترک آبادی کے لیے ہوتی تھیں -

ہندوستان کی مغل سلطنت میں بخشی ایک بہت اونچے درجے کا عہدہ دار ہوتا تھا - ایک فوجی دستے کا بھرتی کرنا اور اس کے مصارف بھی ادا کرنا اس کی ذمہ داری تھی -

سلطنت مغلیہ میں میر بخشی اپنے محکمے کا اعلیٰ ترین عہدہ دار ہوتا تھا - اور اسے دیوان عرض کے تمام اختیارات حاصل تھے - لیکن اس کا عمل دخل اپنے ہی محکمے تک محدود نہ تھا - دربار میں بادشاہ کا قرب حاصل رہنے کی وجہ سے اس کا وقار بہت بڑھ گیا تھا - فوجی اصولوں کے مطابق ملازمین کی بھرتی، سپاہیوں کی مقررہ تعداد برقرار رکھنے پر عہدہ داروں کے منصب کے قائم رہنے کا انحصار اور ہر سال معینہ مدت گزر جانے پر، مقررہ تعداد میں سواروں کو معائنے کے لیے پیش کرنے کے بعد ان کی تنخواہ کا ادا کیا جانا، یہ تمام امور ایسے تھے جن کی وجہ سے وزیر کے اختیارات کا تقسیم ہو جانا بالکل قدرتی تھا چنانچہ یہی ہوا اور میر بخشی، وزیر کے فرائض و وقار میں برابر کا شریک بن گیا -

تمام درجوں کے مناصب پر نیز مملکت کے اعلیٰ عہدوں مثلاً وکالت، وزارت اور صدارت کے عہدوں پر تقررات کے تمام احکام میر بخشی کی معرفت گزرا کرتے - ایسا حکم تقرر جس میں عطائے جاگیر وغیرہ کا بھی ذکر ہوتا، نیز گھوڑوں کو داغ کرنے کی شرط ہوتی، اسی کے پاس بھیجا جاتا - چناں چہ اس نوعیت کے معاملے میں تمام شرائط پر عمل در آمد وہی کراتا - گھوڑے اسی کی نگرانی میں داغے جاتے -

وھی سپاھیوں کی مقررہ تعداد کا معائنہ کرتا اور اس کی بنیاد پر ماھوار تنخواہ کا تعین کرتا ۔ جو تعلیقہ (خلاصہ) اس کے پاس آتا اسے وہ اپنے پاس رکھ لیتا اور اس کی بجائے اپنے دستخط اور نشان مہر کے ساتھ ایک صداقت نامہ جاری کر دیتا تھا جسے سرخط کہتے تھے ۔ اسی صداقت نامے کی بنیاد پر دیوان اپنے کاغذات میں اندراجات کرتا اور پھر انھی کاغذات کو بادشاہ کے سامنے بہ غرض منظوری پیش کرتا ۔ اس طرح جو منظوری حاصل ہوتی اس کی اطلاع میر بخشی کو پھر دی جاتی اور اس کے دستخط اور نشان مہر کے بعد ھی دیوان اسے وکیل کے پاس بھیجا کرتا ۔ فرمانوں کی طرح پروانچے اور برات نامے بھی اسی کی معرفت بھیجے جاتے اور تمام مذکورہ احکام پر بعد تکمیل وہ (بخشی) دیوان سلطنت کی مہر کے برابر اپنی مہر ثبت کرتا ۔ اس کے اثر کا دائرہ مرکزی حکومت کے تمام محکموں تک وسیع تھا اور ان سب سے وہ یکساں معاملت کرتا ۔

محکمہ فوج کے سربراہ کی حیثیت سے اس کا تعلق ھر منصب دار سے رھتا ۔ للہذا دربار میں اس کی حاضری اس کے مستقل فرائض میں داخل تھی ۔ اس حیثیت سے وہ تخت کے داھنی طرف کھڑا ہوتا اور اپنے محکمے سے متعلق امور بادشاہ کے سامنے پیش کرتا ۔ ملازمت کے امیدواروں کو وھی پیش کرتا ۔ وغیرہ (مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ھو دولت مغلیہ کی ھیئت مرکزی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاھور) ۔

۳ ۔ دیوان اعلیٰ ۔ ایرانی لفظ 'دیوان' کا تعلق لفظ 'دبیر' بہ معنی تحریر کنندہ سے ھے اور یہ سریانی لفظ 'دیپ' (؟) سے مشتق ھے جو جمع و خرچ کے ان سرکاری رجسٹروں کے لیے استعمال ہوتا تھا جن میں اندراجات ابتدائی فتوحات کے زمانے میں شام و مصر میں تو بہ زبان یونانی اور ایران میں بہ زبان پہلوی کیے جاتے تھے ۔ پھر اس لفظ کا عربی میں ترجمہ ھوا اور یہ اس زبان میں رائج ھو گیا .... اس کے بعد یہ نام سرکاری خزانے کے دفتروں کے لیے استعمال ھونے لگا ۔ اور بالآخر خلفاء عباسیہ کی حکومت نے بھی اسے اختیار کر لیا ...... ابن خلدون

کے مطابق مال گزاری اور مالیات کے افسروں کی رہبری کے لیے وقتاً فوقتاً جو قواعد و ضوابط بنائے جاتے تھے ان کے رجسٹر کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا کرتا تھا ۔ اور بعد میں اس کا اطلاق نہ صرف خود ان افسروں پر بلکہ ان کے بیٹھنے کے ایوان پر بھی ہونے لگا ۔ ایرانیوں کے پاس یہ طریقہ زمانہ قدیم سے چلا آتا تھا اور اس پر بڑی باقاعدگی سے عمل ہوا کرتا تھا ۔ مذکورہ رجسٹر میں ان کی کل آمدنی اور کل مصارف درج ہوا کرتے تھے اور کوئی بات چھوڑی نہ جاتی تھی ۔ وظیفہ پانے کے مستحق اشخاص کے نام اس میں درجہ وار لکھے جاتے تھے تاکہ غلطی کا کوئی امکان نہ رہے ۔

سلطنت دھلی کے زمانے میں یہ لفظ عموماً وزیر مال گزاری و مالیات کے محکمے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ نیز یہ لفظ محکمہ فوج کے لیے بھی استعمال ہوتا تھا جو ابتداً وزیر مذکور کے محکمے کے ساتھ ملحق تھا ۔ دور مغلیہ میں اس اصطلاح کے مفہوم میں زیادہ قطعیت پیدا ہوگئی اور یہ صرف مالگزاری و مالیات کے سربراہ کے لیے مختص ہوگئی ۔ اکبر کے عہد میں اس عہدے کے لیے لفظ وزیر کا استعمال بہت کم نظر آتا ہے ۔ اس کے بجائے لفظ 'دیوان' زیادہ ملتا ہے ۔ عہد جہانگیری میں اس کے برعکس عمل کیا گیا اور لفظ وزیر کم و بیش مسلسل استعمال ہوتا رہا ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اس لفظ کے معنی زیادہ قطعی ہو گئے اور وزیر کو 'دیوان کل' اور اس کے شرکائے کار کو دیوان کہنے لگے ۔

محکمہ مال کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے دیوان اعلیٰ مملکت کے ہر اس عہدہ دار پر نظر رکھتا تھا جو جاگیر سے اپنی تنخواہ وصول کرتا ۔ چوں کہ مملکت میں سب سے زیادہ عاملانہ اختیارات اسی کو حاصل رہتے تھے ، اس بنا پر اختیارات محکمۂ مال کے علاوہ اسے صوبوں اور عہدہ داران صوبہ پر بھی اختیارات حاصل تھے ۔ ان عہدہ داروں میں حاکم صوبہ سے لے کر عامل اور پٹواری تک سب ھی شامل تھے۔ وزیر مالیات کی حیثیت سے اس کی نظر ایک ایک پائی پر رہتی تھی جو شاھی خزانے میں داخل ہوتی یا اس سے باھر جاتی تھی ۔ اس طرح مذکورہ

فرائض سہ گانہ (۳) کی بدولت اس کا تعلق اپنے ذاتی محکمے کے علاوہ مرکزی حکومت کے تینوں محکموں سے، امراء و عمائد سلطنت سے، خواہ وہ کسی عہدے پر فائز ہوتے یا نہ ہوتے، اور صوبائی نظم و نسق کے ہر شعبے سے قائم رہتا۔ اس عام نگرانی کے باعث اسے وزرائے مملکت میں قطعی طور پر اعلیٰ ترین مقام حاصل تھا۔

صدر مقام میں صوبے دار، فوج دار، دیوان، کروڑی، امین اور داروغے وغیرہ عہدے داروں کا تقرر اس کی معرفت ہوتا، اسی طرح صوبائی مقام میں مشرف، تحویل داران دیہات (جو دفتر خزانہ میں تعینات رہتے تھے)، خزانچی، خزانے کے داروغے، محرران دفتر خزانہ، تحصیل دار (جو بقایاجات کی وصولی کے لیے مقرر ہوتے) اور زمیندار (جو مال گزاری وصول کرکے سرکاری خزانے میں داخل کرتے) وغیرہ بھی اسی کی معرفت مقرر ہوتے۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی')

۴۔ دیوان تن۔ دیوان کا دفتر متعدد شعبوں میں منقسم ہوتا تھا تاکہ مذکورہ فرائض اچھی طرح انجام پا سکیں۔ چناں چہ محکمۂ دیوان، دیوان اعلیٰ یا وزیر کے علاوہ حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ہوتا تھا:

دیوان خالصہ، دیوان تن، مشرف اور مستوفی۔ دیوان تن کا کام تنخواہوں سے متعلق تھا۔ وہ دیوان کا رفیق کار نہیں بلکہ اس کے ماتحت ہوتا تھا۔ (ایضاً ص ۲۹۸، ۲۹۹)

۵۔ علی مردان خان۔ شاہ جہان کے دربار کا امیرالامرا اور تجربہ کار خوانین میں سے تھا۔ باپ کا نام گنج علی خان زیک تھا۔ جو کرد قبیلے کا ایک فرد اور شاہ عباس کی طرف سے خانی کے مرتبہ پر فائز تھا۔ 'ارجمند بابا' کا لقب پا کر اس (گنج علی) نے تیس سال تک استقلال سے کرمان پر حکم رانی کی۔ ۱۰۳۴ھ میں بہ مقام قندھار سوتے میں ایوان سے نیچے گر کر ہلاک ہو گیا۔

باپ کے مرنے کے بعد علی مردان بیگ، خطاب خانی اور ریاست قندھار سے نوازا گیا۔ اس کے ساتھ ہی شاہ عباس نے اسے 'بابائے ثانی' کا

لقب عطا کیا ۔ عباس کے مرنے کے بعد جب اس کا پوتا صفی تخت نشین ہوا تو اس نے عباس کے اعالی ملازمین کے ساتھ برا سلوک کیا۔ علی مردان نے ڈر کر شاہ جہان کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے کابل کے صوبہ دار سعید خاں سے خط و کتابت شروع کی ۔

۱۰۴۷ھ میں جب سعید خاں اور صوبہ دار لاہور قلیج خاں نے قندھار میں صفی کے آدمیوں سے لڑائی کی تو علی مردان مغلیہ فوج کے ساتھ مل گیا ۔ قزلباش کو شکست ہوئی ۔ جب قلیج خاں قندھار کا حاکم ہو کر گیا تو علی مردان بارھویں سال (جلوس) میں لاہور پہنچا ۔ دربار میں پہنچنے سے پہلے ھی ۵ هزاری ذات و سوار کا منصب اور علم و نقارہ پایا ۔ دربار میں پہنچا تو شش ہزاری ذات و سوار کے مرتبہ پر فائز ھوا ۔ اور اعتمادالدولہ کی حویلی مل گئی ۔ پھر اسے (آب و ہوا راس نہ آنے کے سبب) کشمیر کا صوبہ دار بنا دیا گیا ۔ ۱۰۴۹ھ میں شاہ جہان کے لاہور آنے پر یہ بھی لاہور پہنچا اور ھفت ہزاری ھفت ہزار کا منصب پایا ۔ اور کشمیر کے علاوہ صوبہ داری پنجاب بھی ملی ۔ تاکہ گرمیوں اور سردیوں میں آرام سے رہے ۔

۱۰۵۰ھ میں صوبہ کابل ملا ۔ سولھویں سال میں آگرہ پہنچا تو امیر الامرا کا خطاب اور ایک کروڑ دام کا انعام ملا ۔ ساتھ ھی اعتقاد خاں کی حویلی ملی جو امرا کی سب سے عمدہ رھائش گاہ تھی ۔

۱۰۵۷ھ میں شاھزادہ اورنگ زیب کو بلخ و بدخشاں کی جاگیریں عطا ہوئیں تو یہ بھی اس کے ساتھ گیا ۔ تیئیسویں سال جلوس کابل سے آیا اور تیول داری صوبۂ لاہور پر مامور ہوا ۔ آب و ھوا راس نہ آنے کے باعث کشمیر کی رخصت لی ۔ اور پھر اسے صوبگی کشمیر مل گئی ۔ تیسویں سال جلوس ۱۰۶۷ھ شاہ جہان کے حسب الطلب خدمت میں پہنچا۔ لیکن یہاں مرض اسہال کا شکار ھوا اور اکتیسویں سال جلوس (۱۰۶۷ھ) کے آغاز میں بادشاہ سے کشمیر جانے کی اجازت لی ۔ لیکن ضعف و ناتوانی کے سبب راستے ھی میں بہ مقام ماچھی وارہ فوت ھو گیا ۔ اس کی نعش لاہور لائی گئی ۔ اور اس کا نقد و جنس ایک کروڑ روپیہ ضبط ھوا ۔

مآثر الامرا کے مؤلف کے مطابق اس نے اگرچہ ایران میں نمک حرامی کا مظاہرہ کیا لیکن ہندوستان میں وہ اپنے ''حسن اخلاص ، شگرفی عقیدت ، اور وفور دانائی و مردانگی'' میں تمام امرا سے برتر تھا ۔ اسے شاہ جہان کے مزاج میں اتنا دخل تھا کہ وہ (شاہ جہان) اکثر اسے 'یار وفادار' کے الفاظ سے خطاب کیا کرتا تھا ۔

اس نے لاہور میں دریاے راوی سے ایک نہر نکالی جو لاہور کے لیے 'آبرو' کا باعث بنی ۔ صوبہ داری لاہور کے دوران اس نے صوم و صلواۃ کے تارک فقرا کو ، جو خود کو 'بے قید' کہتے اور فسق و فجور کے مرتکب ہوتے تھے، مقید کرکے کابل بھیج دیا ۔ اس کی دولت و مکنت اور 'ساز و سر انجام' کو بڑی شہرت حاصل تھی ۔
(مآثرالامرا جلد دوم ، صفحہ ۷۹۵ ببعد ، مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۶۱)

۶ ۔ داراشکوہ ۔ شاہجہان کا بڑا لڑکا تھا ۔ سوموار ۲۹ صفر ۱۰۲۴ھ کو بہ مقام اجمیر ممتاز محل کے بطن سے تین لڑکیوں کے بعد پیدا ہوا ۔ اس وقت شاہجہان کی عمر بہ قول داراشکوہ ۲۴ برس کی ہو چکی تھی اور اس نے خواجہ اجمیر کے مزار پر لڑکے کے لیے دعا کی تھی جو خدا نے منظور کر لی تھی ۔ ۲ شعبان ۱۰۴۳ھ کو شاہزادہ پرویز کی دختر نادرہ بانو سے اس کا نکاح ہوا ۔ اس نے ملا شاہ بدخشی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی ۔

عربی و فارسی زبان پر مثل اہل زبان کے عبور تھا ۔ سنسکرت کی تعلیم بنارس میں بہترین پنڈتوں سے حاصل کی تھی ۔ علمی ذوق سے بہرہ ور تھا ۔ اس نے کئی ایک کتب لکھی ہیں ، جن میں سفینۃ الاولیا ، سکینۃ الاولیا اور مجمع البحرین وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔ صوفی مزاج اور 'ہمہ اوست' عقیدے کا قائل تھا جس کے سبب علماے شریعت اس کے مذہبی عقائد سے بدظن تھے ۔ نہایت فیاض اور سیرچشم ، لیکن ساتھ ہی مغلوب الغضب اور کینہ پرور اور متانت و سنجیدگی سے کوسوں دور تھا ۔ بہ قول ڈاکٹر برنیر وہ بڑا ہی خود پسند اور خود راے تھا اور اس کو گھمنڈ تھا کہ عقل کی رسائی اور خوش تدبیری سے ہر

امر کا بندوبست اور انتظام کر سکتا ہوں اور کوئی بشر ایسا نہیں جو مجھے صلاح مشورہ دے سکے۔ وہ ان لوگوں سے ، جو اسے ڈرتے ڈرتے کوئی صلاح دینے کی جرأت کر بیٹھتے تھے ، تحقیر و اہانت سے پیش آتا۔ چناں چہ اس ناپسندیدہ سلوک ھی کے سبب سے اس کے دلی خیر خواہ بھی اس کے بھائیوں کی پوشیدہ و مخفی بندشوں سے اسے آگاہ نہ کر سکے۔ وہ ڈرانے اور دھمکانے میں بڑا تیز تھا ، یہاں تک کہ بڑے بڑے امرا کو برا بھلا کہہ بیٹھتا اور ان کی ھتک کر ڈالتا ، لیکن اس کا غصہ اور بدمزاجی ایک آن کی آن میں جاتی رہتی تھی ۔

تخت نشینی کے لیے اس کے اور اورنگ زیب وغیرہ کے درمیان جو جنگ ہوئی ، اسے تاریخ میں خاصی اھمیت حاصل ھے۔ داراشکوہ ، شاھجہان کا چہیتا بیٹا تھا ، لیکن اورنگ زیب اسے دھریہ سمجھتا تھا ۔ اور نہیں چاھتا تھا کہ اس قسم کے غیراسلامی عقائد رکھنے والا اسلامی سلطنت کا فرماں روا بنے ۔ چناں چہ اس جنگ میں جو ۱۰۶۷ھ میں بہ مقام سموگڑھ ہوئی ' اس نے شکست کھائی اور بھاگ نکلا ۔ پھر ۱۰۶۹ھ میں اجمیر کے قریب اسے اورنگ زیبی فوجوں سے شکست ہوئی ۔ وھاں سے بھکر بھاگ گیا ۔ قندھار کی طرف جانا چاھتا تھا کہ گرفتار کر لیا گیا ۔ ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ کو اسے دھلی لایا گیا ۔ جہاں عالم گیر کے حکم سے خضر آباد کے قلعہ میں محبوس اور اس کے فوراً ھی بعد ـــــ بعض کے نزدیک ۲۱ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ اور بعض کے مطابق یکم محرم ۱۰۷۰ھ کو ـــــ قتل کر دیا گیا ۔

علمی حیثیت سے دارا شکوہ تیموری شاہ زادوں کا گل سرسبد تھا ۔ وہ ایک باکمال مصنف ، شاعر اور خطاط تھا ۔ اس کو شروع میں تصوف اور بعد میں ہندو مذھب سے گہرا شغف ہو گیا تھا ۔ نثر میں اس کی تصانیف ان ھی دو موضوعات پر ھیں ۔ (مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۴۱ ، ۲۶۷ - برنیر بہ حوالہ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر ، صفحہ ۱۰۱ - وقائع عالم گیر مرتبہ چوھدری نبی احمد سندیلوی ، صفحہ ۱۶۱-۱۶۳ - بزم تیموریہ ، صفحہ ۳۹۶ - سفینۃ الاولیا مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۸ ، صفحہ ۹۴)

۷ - شجاع - شاهجہان کا دوسرا بیٹا تھا - اتوار ۴ جمادی الاول ۱۰۲۵ھ کو بہ مقام اجمیر پیدا ہوا - ۱۰۴۲ھ میں مرزا رستم صفوی کی لڑکی سے اس کا نکاح ہوا - داراشکوہ کے شکست کھانے کے بعد یہ اورنگ زیب سے لڑنے کے لیے بنگالہ سے ، جہاں کا یہ حاکم تھا ، روانہ ہوا - اورنگ زیب بھی اس کے مقابلے میں نکلا - کھجوہ (نزدیک الہ‌آباد) کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی - شجاع نے شکست کھائی اور بنگالہ کی طرف بھاگ گیا ، لیکن میر جملہ وغیرہ نے تعاقب کیا ، جس کے سبب وہ بنگالہ سے بھی بھاگ نکلا اور اراکان جا پہنچا - کچھ عرصہ یوں ہی پریشان و سرگردان رہا - تا آنکہ ۱۰۷۱ھ میں راجا اندیار نے اسے مع عیال و اطفال کشتی میں سوار کر کے دریا میں غرق کرا دیا -

شجاع ایک صاحب علم و ذوق اور علم نواز شاہزادہ تھا - اس کی علمی قابلیت اس کے رقعات سے ، جو مختلف کتب میں جستہ جستہ ملتے ہیں اور اس کی علم نوازی کا حال اس کے درباری شعرا و متوسلین سے معلوم ہو سکتا ہے - اس کے رقعات کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ وہ اورنگ زیب اور داراشکوہ کی طرح گو بلند پایہ ادیب اور انشا پرداز تو نہ تھا ، پھر بھی اس کی تحریروں میں اس زمانہ کے ذوق ادب کی پوری چاشنی ضرور ہے - شجاع شعرا اور ارباب کمال کا قدر دان اور سرپرست تھا - اس نے جب شاہجہانی دور کے بہت ہی ممتاز عالم ملا محمود جونپوری کے فضل و کمال سے فیض یاب ہونا چاہا تو انہیں اپنے دربار میں آنے کی دعوت ایسے الفاظ میں دی جس سے اس کے دل میں ان کی عزت و احترام کا اندازہ ہوتا ہے - فارسی شعرا میں شیخ منعم لاھوری اور ہندی شعرا میں چنتا من ، جو اپنے عہد کا بہت ہی مشہور سنسکرت کا عالم تھا ، اس کے مقربین خاص میں سے تھے -
(مفتاح التواریخ ، صفحہ ۲۶۶ ، ۲۶۷ - بزم تیموریہ ، صفحہ ۳۱۸ ، ۳۱۹)

۸ - مراد بخش - شاہجہان کا سب سے چھوٹا فرزند تھا - صالح کے مطابق بدھ کی رات ۲۵ ذی الحجہ ۱۰۳۳ھ کو (انیسویں سال جلوس

جہانگیری) کو ممتاز الزمانی (ممتاز محل) کے بطن سے قلعہ رھتاس میں پیدا ھوا ۔ مراد بخش نام رکھا گیا :

''مراد شاہ جہان بادشاہ دین و دول''

۱۰۳۳ھ تاریخ ولادت ہے ۔

شاھجہان کے پندرھویں سال جلوس کے آخر میں اتوار کے روز ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۵۲ھ کو اس کی شادی شاہ نواز خان صفوی (صوبہ دار اوڑیسہ) کی دختر سے ھوئی ۔ قاضی اسلم نے نکاح پڑھایا اور چار لاکھ روپیہ مہر قرار پایا ۔

مراد بخش نے ، جسے باپ کی طرف سے گجرات کی صوبہ داری ملی ھوئی تھی ، تخت سلطنت کے لیے جنگ میں اورنگ زیب کا ساتھ دیا ۔ وہ ایک بہادر ، سادہ دل ، رند مشرب نوجوان تھا ۔ لیکن اس کے ساتھ ھی زود اعتقاد اور سب سے زیادہ خود رائے تھا ۔ اپنی مشتعل و غیر مستقل طبع کے سبب وہ ھر کام میں ناکام رھا ۔ اپنی کئی ایک خوبیوں کے باوصف وہ سخت شرابی اور عیاش بھی تھا ۔ دارا سے اسے انتہائی عداوت تھی ۔ چناں چہ جب اسے شاھجہان کی علالت کا پتا چلا تو اس نے اپنے علاقے میں اورنگ زیب کی نصیحت کے باوجود بادشاہ ھونے کا اعلان کر دیا ۔ بعد میں اورنگ زیب کے ساتھ اس کا معاھدہ ھو گیا ۔ شاھجہان کے مرنے پر جب دارا نے عنان حکومت سنبھالی تو مراد ، اورنگ زیب اور شجاع نے ایک دوسرے سے استصواب شروع کیا ۔ لیکن پھر جلد ھی بادشاھت کا اعلان کر دیا اور آگرہ کا قصد کیا ۔ بہ ھر حال بعد میں اس نے اورنگ زیب کا ساتھ دیا ۔ لیکن پھر اپنے مشیروں کے اکسانے پر وہ اورنگ زیب کے خلاف اٹھ کھڑا ھوا ۔ اس نے اس سے گستاخی شروع کر دی اور خود کو بادشاہ ھند سمجھ کر اپنے افسروں کو شاھی خطاب بانٹنے شروع کر دیے ۔ ادھر شاھجہان سے ساز باز شروع کر دی اور شاھجہان کے اکسانے پر اسے (اورنگ زیب) ختم کرنے کی سکیم بنائی ۔ لیکن اس سلسلے میں شاھجہان کا خط اورنگ زیب کے ھاتھ لگ گیا اور اس نے حفاظت خود اختیاری میں مراد کو گرفتار

کر لیا - گرفتاری کے بعد اسے گوالیار بھیج دیا گیا ، جہاں وہ قلعے میں چار سال رہا -

مراد نے شاھجہان کی علالت کی خبر سن کر اپنے مشیر خاص علی نقی کو اس لیے قتل کر دیا تھا کہ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ وہ دارا کا حامی ہے - اورنگ زیب کے تخت نشین ہونے کے کچھ عرصہ بعد علی نقی کے بیٹے نے اپنے باپ کے قصاص کی درخواست گزرانی - عالمگیر نے اسے منع کیا ، لیکن وہ نہ مانا - مجبوراً اسے گوالیار کے قاضی کے پاس بھیجا - قاضی نے بھی لڑکے کو خون بہا لینے پر بہت زور دیا ، لیکن وہ نہ مانا - آخر قاضی کے حکم سے مراد بخش کو علی نقی کے خون کے بدلے میں بدھ کے روز ۲۱ ربیع الثانی ۱۰۷۲ھ کو قتل کر دیا گیا اور اس کی نعش قلعۂ گوالیار ھی میں دفن کی گئی -

مراد ارباب کمال اور شعرا کا قدر دان و سرپرست تھا -

(شاھجہان نامہ از محمد صالح کنبوہ ، مطبوعہ لاھور جلد اول ، صفحہ ۱۳۲ ، جلد دوم ، صفحہ ۲۸۲-۲۸۳ ، جلد سوم ، صفحہ ۳۴۰ - مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی ، صفحہ ۳٦۷ ، ۳۸۸ ، ۳۸۹ ، ۴۰۰ ، ۴٦۵-۴٦٦ ، ۴٦۸ ، ۴٦۹ - واقعات عالمگیری از عاقل خان رازی ، مطبوعہ لاھور ، صفحہ ۱۱ - بزم تیموریہ ۴۱۸)

۹ - مرد آخر بیں....الخ

یہ مصرع مثنوی مولانا روم کا ہے - پورا شعر اس طرح ہے - ع :

از پی ہر گریہ آخر خندہ ایست
مرد آخر بین مبارک بندہ ایست

یہ شعر دفتر اول میں اس جگہ آیا ہے جہاں مولانا نے ایک ایسے گستاخ شخص کے منہ ٹیڑھے ہونے کا ذکر کیا ہے جو آں حضرت صلعم کا نام مبارک تمسخر سے لیتا تھا - اس شعر سے ما قبل اور ما بعد چند اشعار ملاحظہ ہوں :

آن دهن کژ کرد و از تسخر بخواند
نام احمد (صلعم) را ، دهانش کژ بماند
باز آمد کای محمد (صلعم) عفو کن
ای ترا الطاف علم من لدن
من ترا افسوس میکردم ز جهل
من بدم افسوس را منسوب و اهل
چون خدا خواهد که پردهٔ کس درد
میلش اندر طعنهٔ پاکان برد
ور خدا خواهد که پوشد عیب کس
کم زند درعیب معیوبان نفس
چون خدا خواهد که مان یاری کند
میل مارا جانب زاری کند
ای خنک چشمی که او گریان اوست
ای همایون دل که او بریان اوست
از پی هر گریه آخر خنده ایست
مرد آخر بین مبارک بنده ایست
هر کجا آب روان ، سبزه بود
هر کجا اشک روان ، رحمت شود
باش چون دولاب نالان چشم تر
تاز صحن جانت بر روید خضر
مرحمت فرمود سید (صلعم) عفو کرد
چون ز جرأت توبه کرد آن روی زرد
رحم خواهی ، رحم کن بر اشک بار
رحم خواهی ، بر ضعیفان رحمت آر

(کتاب مثنوی مولانا جلال الدین بلخی رومی ، مطبوعه دارالکتابۂ میرخانی ایران ، صفحہ ۲۳)

۱۰ - سادات بارھه - قطب الملک سید عبداللہ خان اور امیر الامرا سید حسین علی - ان کا تعلق بارھه کے سادات سے تھا - سید عبداللہ ،

بہادر شاہ کے زمانے سے الہ آباد کا صوبہ دار اور حسین علی بہار کا صوبہ دار تھا ۔ فرخ سیر جب باپ کا انتقام لینے کے لیے پٹنہ سے روانہ ہوا تو دونوں کو ساتھ لیتا آیا اور انھی کی کوشش سے وہ جہاندار شاہ پر غالب آیا ۔ فرخ سیر نے سید عبداللہ خاں کو خلعت کے ساتھ وزارت کا منصب اور قطب الملک بہادر یار وفادار ظفر جنگ کا خطاب دیا اور حسین علی خان امیرالامرا بنا دیا گیا ۔ اول الذکر ایک فوجی تھا اور انتظامیہ کا اسے کوئی تجربہ نہ تھا ، جس کے سبب انتظامیہ کا سارا بوجھ مؤخرالذکر پر پڑا ۔ اس کے بعد طاقت ان دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں آ گئی ۔

فرخ سیر تخت نشین ہوتے ہی سید بھائیوں سے بد ظن ہو گیا ۔ انھوں نے اسے اپنی راہ کا روڑا سمجھتے ہوئے نہ صرف اسے تخت سے اتار اور اندھا کرا دیا ، بلکہ بعد میں بڑی رسوائی کے ساتھ ختم بھی کروا دیا ۔ فرخ سیر کے بعد سید برادران نے چند ماہ میں یکے بعد دیگرے دو تین کٹھ پتلی بادشاہ تخت پر بٹھائے ۔ اسی سبب سے وہ 'بادشاہ گر' مشہور ہوئے ۔ پھر انھوں نے جہان شاہ (بہادر شاہ کا چوتھا لڑکا) کے لڑکے روشن اختر محمد شاہ کو تخت پر بٹھایا ۔ لیکن وہ ان کی مرضی کے مطابق ان کے اشاروں پر نہ چلا ۔ اس کے کئی حامی و طرف دار پیدا ہو گئے جو سید بھائیوں کے سات سالہ دور میں ان کے سخت دشمن بن چکے تھے ۔ ان طرف داروں میں سب سے زیادہ طاقت ور دکن کا نظام الملک تھا (جس نے بعد میں دکن میں خود مختار ریاست قائم کر لی تھی) ۔

چناں چہ محمد شاہ کے اشارے پر حسین علی کو اس وقت راستے میں قتل کر دیا گیا ، جب وہ نظام کی گوشمالی کے لیے مالوہ جا رہا تھا ۔ اس کا قتل ۲۷ ذی القعدہ ۱۱۳۲ھ کو وقوع پذیر ہوا ۔

چھوٹے بھائی کے مارے جانے کے بعد عبداللہ نے اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لیے ایک اور کٹھ پتلی بادشاہ محمد ابراہیم بن رفیع الشان کو تخت پر بٹھانا چاہا ، لیکن ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ کو محمد شاہ نے سخت جنگ لڑی ۔ جس کے نتیجے میں قطب الملک زخمی ہو کر گرفتار ہوا ۔ بادشاہ نے

اس کی جاں بخشی کرتے ہوئے اسے زندان میں بھیج دیا ۔ جہاں اسے ذی‌الحجه ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۲ع) کے آخر میں زهر دے دیا گیا ۔

حسین علی اجمیر میں اور قطب الملک دهلی میں مدفون هوا ۔

(مفتاح التواریخ ، صفحه ۳۰۱ ، ۳۰۲ ، ۳۰۵ ، ۳۰۶ - این ایڈوانسڈ... انڈیا ، صفحه ۵۲۸ ، ۵۲۹)

۱۱ - سیوا جی ۔ اس کے خاندان کا تعلق مہارانا اودےپور سے تھا ۔ اس خاندان کا ایک شخص سورسین ، چتوڑ سے کسی باعث ریاست دکن کے ایک پرگنه میں چلا آیا ۔ اس کے خاندان میں سے مالو جی ، ایلوره (دولت آباد) میں آ کر آباد هو گیا ۔ دولت آباد اس وقت نظام شاهی خاندان سے متعلق تھا ۔ مالو جی نے وهاں کے تحصیل‌دار کی سرکار میں ملازمت اختیار کی ۔ مالو جی کے دو بیٹے تھے ۔ چوں که وه شاه شریف صاحب کا (جن کی قبر احمد نگر میں ھے) معتقد تھا ، اس لیے اس نے بیٹوں کا نام شاه صاحب کے تعلق سے شاه جی اور شرف جی رکھا ۔ یہی شاه جی آگے چل کر ساهو جی کے لقب سے مشہور هوا ۔ اور یہی ساهو جی ، سیوا جی کا باپ تھا ۔

۱۰۳۰ھ میں جب نظام شاه کی فوجوں نے نربدا اتر کر مالوا کو غارت کیا اور جهانگیر نے اس کے دفعیه کے لیے لشکر کشی کی تو نظام شاه کے فوجی سرداروں میں ساهوجی بھی تھا ۔ بعد میں یه نظام شاه سے ناراض هو کر شاه جهان کے دربار میں چلا آیا اور پانچ هزاری منصب پایا ۔ ساتھ خلعت ، اسلحه مرصع ، علم ، نقاره ، اسپ ، فیل اور دو لاکھ نقد انعام میں ملے ۔ یہاں سے ۱۰۴۱ھ میں شاهجهان سے ناراض هو کر عادل شاه والی بیجا پور سے جا کر مل گیا ۔ اور بے شمار فوج کے ساتھ دولت آباد کی طرف بڑھا ۔ اسی سنه میں اس کے اهل و عیال گرفتار هوئے ۔ اس نے شاهی اضلاع پر غارت گری کی ۔ جس کے سبب اورنگ زیب اس کی بیخ کنی پر مامور هوا ۔ ۱۰۴۵ھ میں شاه جهان نے اس کے مستقر کو برباد کر دیا ۔ یه بیجا پور بھاگ گیا ۔ ۱۰۴۶ھ میں اسے نظام شاهی علاقے سے بھی نکال دیا گیا ۔ اس نے عادل شاه کے دربار میں ملازمت اختیار کی ۔ اور پونه اورسوپه جاگیر میں پائے ۔

اسی دوران میں اس کا بیٹا سیوا جی ، جو تحصیل دار لکھی جادو کی اکلوتی لڑکی سے تھا ، جوان ہو چکا تھا ۔ اس نے ان اضلاع کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا ۔ جا بجا قلعے تعمیر کرنے اور پندرہ ہزار فوج اکٹھی کرکے اپنے علاقے وسیع کرنے شروع کر دئے ۔ عادل شاہ کے بیمار پڑنے پر جب اس کے دربار میں ابتری پھیلی تو اس نے آس پاس کے علاقوں پر ہاتھ مارنے شروع کیے ۔ طاقت حاصل ہوئی تو پھر ہر اس قصبہ یا شہر پر چھاپہ مارنے اور لوٹنے لگا جو ذرا خوش‌حال نظر آتا ۔ جب وہاں کا حاکم اس کی خبر عادل شاہ کو دیتا تو ساتھ ہی اس (سیوا) کی عرضی پہنچتی کہ ''اس ضلع کی آمدنی میں بہت اضافہ ہو سکتا ہے ، اضافہ کی شرط پر میری جاگیر میں دے دیا جائے'' ۔ چونکہ دربار میں ابتری پھیلی ہوئی تھی ، اس لیے جاگیرداروں کی تحریر پر کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا ، اور رشوت خور عمال سیوا کو جاگیر کی سند لکھ کر بھیج دیتے ۔

ان دنوں اورنگ‌زیب دکن کی مہم پر مامور تھا ۔ جب شاہجہان بیمار ہوا اور حصول تخت کی کوشش میں اورنگ زیب دکن سے چلا تو سیوا جی کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ۔ دست درازی کے علاوہ چالیس قلعے بنائے اور بحری طاقت کا سامان کیا ۔ تا آنکہ بیجا پور کے اکثر اضلاع پر قابض ہو گیا ۔ علی عادل شاہ کے سپہ سالار افضل خاں کو بہانے سے بلا کر مار ڈالا ۔ اب اور بھی حوصلہ بڑھ گیا ۔ اور مغلوں کی حدود میں بھی دست درازیاں شروع کر دیں ۔

عالمگیر نے اپنی تخت نشینی کے تیسرے سال ۱۰۷۰ھ میں شائستہ خاں کو اس کی بیخ کنی کے لیے دکن بھیجا ۔ شائستہ خاں نے اس کا محاصرہ کیا ۔ یہ ادھر اُدھر بھاگتا پھرا ۔ ۱۰۷۳ھ میں اس نے شائستہ خاں پر شبخون مارا ۔ جس پر عالمگیر نے شائستہ کو اس کی غفلت کے سبب معزول کرکے شاہزادہ معظم کو مامور کیا ۔ سیوا جی کا حوصلہ بڑھ چکا تھا ، اس نے اب حجاج کے جہاز لوٹنے شروع کر دئے ۔ عالمگیر نے ۱۰۷۵ھ میں مہاراجہ جے سنگھ (راجہ جے پور) کو اس پر

مامور کیا ۔ اس نے اس (سیوا) کے تمام علاقے پامال کر دیے[۱]۔ جس سے ڈر کر اس نے اطاعت کے لیے سلسلہ جنبانی کی ۔ مہاراجہ اس کی مکاری سے آگاہ تھا ۔ اس نے اور بھی حملہ و یورش کے سامان بڑھا دیے ۔ پتا چلا کہ سیوا قلعہ پورندھر سے تنہا نکل کر آ رہا ہے ۔ ساتھ ہی چند برھمن معتمد راجہ کے پاس پہنچے اور نہایت عجز و زاری کے ساتھ قسمیں کھائیں ۔ چناں چہ اس نے آنے کی اجازت دی ۔ اس کے گلے ملا ۔ پھر سیوا نے معافی کی درخواست کی ۔ محاصرہ اٹھا لیا گیا ۔ معافی کے لیے مہاراجہ نے دربار میں لکھا تھا ۔ وہاں سے فرمان اور خلعت آیا ۔ سیوا نے ۳۵ میں سے ۲۳ قلعے شاہی آدمیوں کے حوالے کر دیے ۔ اس کے بیٹے سنبھا کو پانچ ہزاری منصب ملا ۔ جب سیوا جی دربار میں حاضر ہوا تو اسے بھی پانچ ہزاری منصب ملا جو اسے پسند نہ آیا ۔ اور موقع پا کر وہاں سے بھاگ نکلا ۔ یہ واقعہ ۲۷ صفر ۱۰۷۷ھ کو رونما ہوا ۔ بہ قول مؤلف 'مفتاح التواریخ' بھاگتے وقت اس نے بھیس بدل لیا اور اس کا لڑکا بھی اس کے ساتھ تھا ۔

دکن پہنچ کر اس نے پھر سے غارت گری شروع کر دی ۔ ۱۰ویں سال جلوس معظم شاہ صوبہ دار دکن ہوا تو سیوا کی درخواست پر اس کا بیٹا سنبھا ، معظم کی خدمت میں آیا ، اور معظم نے اسے پانچ ہزاری منصب پر بحال کیا ۔ لیکن بعد میں بھی سیوا مغلیہ علاقوں میں غارت گری کرتا رہا ۔ اور متعدد قلعوں پر قابض ہو گیا ۔ عالمگیر نے وقتاً فوقتاً اس کی تنبیہ کے لیے فوجیں متعین کیں ، جنھیں کبھی فتح ہوتی تھی تو کبھی شکست ۔ بالآخر ۲۴ ربیع الآخر ۱۰۹۱ھ (عالمگیر کے ۲۳ویں سال جلوس) کو یہ جہنم رسید ہوا ۔ اس کے مرنے (۱۶۸۰ء) کے بعد بھی عالمگیر کو دکن کے معاملے میں سکون میسر نہ آیا ۔ سیوا کے بعد اس کے بیٹے سنبھا نے ہر پرزے نکالے اور ہنگامہ آرائی کی ۔ آخر وہ ۱۰۹۹ھ میں گرفتار ہو کر عالمگیر کے حکم سے قتل ہوا ۔ اس کی تاریخ کسی نے ان الفاظ میں کہی ۔

کافرے جہنمی رفت (۱۰۹۹ھ)

(اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر از شبلی نعمانی مطبوعہ سٹیم پریس امرتسر ۱۹۱۳ء ، صفحہ ۱۵ - ۳۰ - مفتاح التواریخ صفحہ ۲۸۲ - این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا ، صفحہ ۵۰۵) -

۱۲ - سیف خاں - سیف خاں میرزا صفی ، امانت خاں کا بیٹا تھا - آصف خاں یمین الدولہ کی بڑی لڑکی ملکہ بانو (احکام عالمگیری میں اس کا نام صالحہ بانو ہے - ملاحظہ ہو دربار ملی ، صفحہ ۲۹۵) اس سے منسوب تھی - ہفت صدی سہ صد سوار کے منصب پر فائز تھا - پھر صوبہ گجرات کی دیوانی پر مامور ہوا - چونکہ وہ صوبہ شاہزادہ ولی عہد شاہجہان کی تیول (جاگیر) میں تھا ، اس نے اپنی طرف سے راجہ بکرماجیت کو وہاں کا حاکم مقرر کر رکھا تھا - جن دنوں جہانگیر کا مزاج شاہزادے سے منحرف ہوا ، اور شاہزادہ مصلحت کے طور پر فوج لے کر آگرہ و دہلی کی طرف بڑھا تو شاہزادہ کے اور شاہی آدمیوں کے درمیان جو جھڑپیں ہوئیں ان میں میرزا صفی نے کارہائے نمایاں سر انجام دیے - جن کے صلے میں اسے بادشاہ کی طرف سے ایک دم سہ ہزاری دو ہزار سوار کے منصب کے ساتھ سیف خاں کا خطاب ملا - اور ساتھ ہی علم و نقارہ عطا ہوا اور گجرات کی صوبہ داری ملی -

جس قطعہ زمین کو اس نے فتح کیا تھا اس میں اس نے ایک باغ بنایا جس کا نام 'جنت باری' رکھا - کہتے ہیں جب اس کے تبادلے پر خان جہاں لودی احمد آباد پہنچا تو خان مذکور (سیف) نے اس کو ضیافت پر بلا کر فرش و طعام میں بے حد تکلف برتا - خوان سے لے کر لنگری تک سب سونے اور چاندی کا تھا -

جب خان جہاں ، مہابت خاں کی جگہ شاہزادہ پرویز کی ہمراہی میں متعین ہوا تو سیف خاں پھر گجرات کی صوبہ داری پر مامور ہوا - جہانگیر کے مرنے پر شاہ جہان نے اسے نظر بند کرنے کا حکم دیا - لیکن چوں کہ اس کی بیوی ملکہ بانو شاہجہان کی بیوی ممتاز محل کی سگی بڑی بہن تھی اس لیے ممتاز محل کا دل رکھنے کے لیے شاہ جہان نے ایک آدمی احمد آباد بھیجا کہ سیف خاں کو کوئی تکلیف نہ پہنچنے پائے اور اسے

احتیاط سے حضور میں لایا جائے - چناں چہ جس وقت شاہ جہاں دریائے نربدا سے گزر کر احمد آباد جا رہا تھا تو 'خدمت پرست خاں' اسے (سیف) لے کر حضور میں پہنچا - اس وقت یہ سخت بیماری میں مبتلا تھا - آخر ممتاز محل کی سفارش پر اسے معاف کر دیا گیا - پھر شاہ جہاں نے تخت نشین ہونے کے بعد بیگم (ممتاز محل) ہی کی التماس پر اسے چارہزاری ذات و سوار کے منصب سے نوازا - اور صوبہ داری بہار پر مامور کیا - (پٹنہ میں اس نے بڑی عالی شان عمارات بنائیں) -

شاہ جہاں کے پانچویں سال جلوس میں الہ آباد کا حاکم بنایا گیا - آٹھویں سال گجرات کا ناظم مقرر ہوا - وہاں سے تبدیل ہو کر اکبر آباد (آگرہ) کا گورنر بنا - بارھویں سال (جلوس) جب شہزادہ محمد شجاع کو بنگالہ کی سلطنت ملی تو اسے اس کی خدمت میں مامور کیا گیا تاکہ اس وسیع صوبے کا بندوبست چلائے -

تیرھویں سال جلوس (۱۰۴۹ھ کے آخر) میں بنگالہ ھی میں وفات پائی - شاھجہان اس کی وفات پر اس کی بیگم ملکہ بانو کے پاس تعزیت کے لیے گیا اور اس کی دل جوئی کی - ملکہ بانو اس وقت رکاب بادشاھی میں تھی -

(مآثر الامرا ، جلد دوم صفحہ ، ۴۱۶ ببعد) -

۱۳ - آصف خاں - آصف خاں مشہور بہ آصف جاھی - مرزا ابوالحسن نام ، اعتماد الدولہ کا بیٹا اور نور جہاں بیگم کا بڑا بھائی تھا - جب نور جہاں جہانگیر کے عقد میں آئی تو اسے اعتقاد خاں کے خطاب اور خانسامانی سے نوازا گیا -

۱۰۲۰ھ میں اس کی لڑکی ارجمند بانو بیگم (ممتاز محل) شہزادہ خرم (شاھجہان) سے بیاھی گئی - نویں سال آصف خاں کا خطاب ملا اور منصب میں پے در پے اضافے ہو کر شش ہزاری شش ہزار سوار تک پہنچا -

جن دنوں خرم اور جہانگیر میں رنجش تھی ، بعض لوگوں نے آصف خاں کو خرم کی طرف داری پر متہم کیا - جس کے سبب نور جہاں

کا مزاج اس سے بگڑ گیا - چناں چہ اسے خزائن لانے کے لیے آگرہ بھیجا گیا - لیکن شاہزادہ کے فتح پور پہنچنے کے سبب اس نے آگرہ جانا مناسب نہ سمجھا اور واپس لوٹ آیا - ابھی متھرا کے نواح میں نہ پہنچا تھا کہ بزم شاہی کے ارباب مشورت نے عرض کیا کہ ایسے موقع پر آصف خاں جیسے سردار کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے - آخر جب شاہزادہ مالوہ کی طرف چلا گیا تو یہ تیرھویں سال جلوس میں صوبہ بنگالہ کا صوبہ دار مقرر ہوا - لیکن شاہزادہ خرم کے بنگالہ کی طرف روانہ ہونے کے باعث راستے ہی سے واپس بلا لیا گیا -

اکیسویں سال جلوس (۱۰۳۵ھ) میں جب مہابت خاں نے جہانگیر کو روک لیا تو یہ قلعہ اٹک میں ، جو اس کی جاگیر میں تھا قلعہ بند ہوگیا - بعد میں پنجاب کا صوبہ دار بنا اور 'وکالت' کے بلند منصب پر فائز ہوا - پھر سات ہزاری سات ہزار سوار کا منصب پایا - جہانگیر کی وفات پر نور جہاں نے شہر یار کو بادشاہ بنانا چاہا - اس نے آصف کو قید کرنے کے لیے بہانے سے اسے بلایا - لیکن آصف نہ گیا - اورخرم (شاہجہان) کے پاس آدمی بھیج دیے کہ جلد پایہ تخت پہنچے - شاہجہان کی آمد تک تمام امرا آصف کے فرمان پذیر رہے - اس نے احتیاطاً لوگوں کو نورجہاں کے پاس آنے جانے سے منع کر دیا - اتوار ۲۲ ربیع الاول ۱۰۳۷ھ کو داور بخش کو ، جسے اس نے وقتی طور پر تخت نشین کر دیا تھا ، گرفتار کرکے شاہجہان کے نام کا خطبہ پڑھا - جب شاہجہان آگرہ پہنچا تو یہ دارا شکوہ ، اورنگ زیب ، شجاع اور دیگر امرا کے ساتھ لاھور سے آگرہ پہنچا -

۲ رجب ۱۰۳۷ھ کو یمین الدولہ آصف خاں کے خطاب سے نوازا گیا - بادشاہ اسے 'عمو' کے الفاظ سے خطاب کرتا - پھر وکالت کے بلند عہدہ کے ساتھ آٹھ ہزاری آٹھ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کے منصب پر ، کہ اس وقت تک کوئی امیر اس عہدے پر نہ پہنچا تھا ، سرفراز ہوا - بعد ازاں نو ہزاری نو ہزار سوار ہوا اور پچاس لاکھ روپیہ کی جاگیر پائی - شاہجہان کے پانچویں سال جلوس کے آغاز میں محمد عادل شاہ بیجا پور کی گوشمالی کے لیے گیا -

بعد میں شاہجہان اور اس کے درمیان کسی سبب سے رنجش ہو گئی ، لیکن اس کے عہدوں میں کمی نہ کی گئی ۔ بلکہ مہابت خان کے مرنے کے بعد 'خان خانان' کے خطاب سے نوازا اور سپہ سالار بنا دیا گیا ۔

۱۰۵۱ھ میں بہ مقام لاہور استسقا کی بیماری میں فوت ہوا ۔ کہتے ہیں پُرخوری میں مشہور تھا ۔ جب بیماری طول پکڑ گئی تو چنے کے شوربے کے ایک پیالے پر اکتفا کرتا ۔ 'زہے افسوس آصف خان' (۱۰۵۱ھ) تاریخ اور جہانگیر کے مقبرہ کے نزدیک مدفون ہے ۔

ہر قسم کے علم خصوصاً معقولات سے بہرہ ور تھا جس کے سبب دفاتر شاہی میں اس کے جو القاب لکھے جاتے تھے ان میں یہ فقرہ بھی داخل تھا ۔ ''شعلہ افروز فطرت اشراقیان دانش آموز طبیعت مشائیان ۔'' اعلیٰ درجے کا خوش نویس اور معاملہ فہم سیاق دان تھا ۔ اس کی سرکار میں جو اخراجات و مصارف تھے ان کا حد و شمار عقل سے باہر ہے ۔ کھانے پینے وغیرہ میں بے پناہ تکلفات کرتا ۔ باپ کی طرح ملائم طبع اور متواضع تھا ۔ اس کے بعد اس کی اولاد بھی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئی ۔ (مآثر الامرا ، جلد اول ، صفحہ ۱۵۱ ببعد) ۔

۱۴ - مرشد قلی خان ۔ خراسان کا رہنے والا اور سپاہی پیشہ ترکوں میں سے تھا ۔ کاردانی و معاملہ فہمی میں صاحب امتیاز تھا ۔ شروع میں علی مردان خان زیک ، حاکم قندھار کا نوکر ہوا ۔ جب علی مردان نے وہ قلعہ شاہ جہانی آدمیوں کے سپرد کر دیا اور خود اپنے اعلیٰ ملازمین کے ساتھ بادشاہ (شاہ جہاں) کے ملازموں میں آ گیا تو مرشد بھی اس کے ساتھ آ پہنچا اور منظور نظر ٹھہرا ۔

شاہ جہان کے ۱۹ویں سال جلوس کوہ کانگڑہ کی فوجداری پر متعین ہوا ۔ جب شاہزادہ اورنگ زیب بلخ و بدخشاں کا صوبہ دار بنا تو یہ اس کی فوج کی بخشی گری پر مامور ہوا ۔

۲۲ویں سال جلوس میں 'آختہ بیگی' بنا ۔ ۲۳ویں سال لاہور کا بخشی ہوا ۔ ۲۶ویں سال جب اورنگ زیب صوبہ دار دکن ہوا تو اسے

هزار و پانصدی پانصد سوار کا منصب ملا ، اور بالا گھاٹ دکن کی دیوانی پا کر شاہ زادہ مذکور کے همراہ گیا ۔

۲۷ویں سال جلوس شاہ زادہ کی التماس پر پانصدی کا اضافہ ھوا ۔ اور خطاب خانی پایا ۔ ۲۹ویں سال میں پانصد سولر کا اضافہ ھوا اور ساتھ هی 'پایان گھاٹ' کی خدمت دیوانی ملی ۔

دارا شکوہ کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے اس نے اورنگ زیب کے ایما پر تھوڑی هی مدت میں نمایاں لشکر اور توپ خانہ ترتیب دیا ۔ پھر میر ضیاءالدین حسین اسلام خان کے تبادلے پر سرکار شاهی کی جلیل‌القدر خدمت دیوانی پر مامور ھوا ۔ اور منصب میں اضافہ پا کر سہ هزاری تک پہنچا ۔

۲۲ رجب ۱۰٦۸ھ کو شاہ زادہ اورنگ زیب کی مہاراجہ جسونت سنگھ کے ساتھ ایک جھڑپ میں بڑی بہادری کے ساتھ لڑتا ھوا مارا گیا ۔ اس وقت یہ شہزادے کے توپ خانے کا مہتمم تھا ۔

بہادری و دلیری اور 'نشۂ سپاہ گری' سے آراستہ تھا ۔ دیانت و خدا ترسی گویا اس کی گھٹی میں پڑی تھی ۔ دیوانی دکن کے دوران اس نے رفاہ عام اور آبادی ملک کے لیے بہت کوشش کی ۔ کار شناسی و جز رسی سے اراضی کی تقسیم کرکے هر جنس کا ۱/۴ حصہ لیا ۔ اور ٹوڈر مل کی طرح اسے ایک دستور العمل قرار دیا ۔ کہتے هیں کہ اس خیال سے کہ کسی کی طرف کمی بیشی نہ ھو جائے اکثر جریب کی رسی خود ھاتھ میں لے کر زمین کی پیمائش کرتا ۔ اس دستورالعمل کے سبب اس نے زندگی' جاوید پائی ۔

دکن میں هر بیگھے پر جمع مال کی تشخیص ، جریب سے اراضی ناپنے، زمینوں کی تفریق اور تقسیم اجناس حبوب و بتول (دالیں ، ترکاریاں وغیرہ) کا سلسلہ نہ تھا ۔ کاشتکار اور مزارع پرگنوں اور شہروں میں فرق کے با وصف دو ایک بیلوں پر جو کچھ لاد کر لا سکتا اور جو جنس چاھتا حاکم کو لا کر دے دیتا ۔ کمی بیشی کے متعلق کوئی باز پرس نہ ھوتی ۔ جب مغلوں نے دکن پر فوج کشی شروع کی تو بہت

سے لوگ وطن چھوڑ کر چلے گئے - کچھ بارش کی کمی کے باعث قحط سالی بھی ہوئی ، جس سے اس ملک کو خاصی ویرانی سے دو چار ہونا پڑا - اور شاہ جہان کو ۳۴ ویں سال جلوس میں کروڑ دام صوبۂ خاندیس کی آمدنی سے کم کرنے پڑے - پھر بھی یہاں کی حالت نہ بدلی - جب مرشد قلی خاں وہاں گیا تو اس نے اپنی دقت نظر اور صوابدید سے راجہ ٹوڈر مل کے دستورالعمل کو نئے سرے سے رائج کیا - اول رعایا کو اکٹھا کیا اور جا بجا متدین عمال اور سمجھ دار آدمی لگائے جنہوں نے اکثر پرگنوں کی اراضی کی پیمائش کی اور زراعت کوہ و نالہ میں امتیاز کیا - جس گاؤں میں مقدم (چوھدری) نہ تھا وہاں اس علاقے کے لائق آدمی کو مقدمی پر لگایا - اسے کھیتی باڑی میں سرگرم کیا اور بیل اور کاشتکاری کی دیگر ضروری اشیاء وغیرہ کی خرید کے لیے اپنی سرکار سے رقم دی جسے 'تقاوی' کہتے ہیں -

(مآثرالامرا جلد سوم ، صفحہ ۴۹۳ ببعد)

۱۵- شاہ نواز خاں ، میرزا بدیع‌الزماں نام مشہور بہ میرزا دکنی - میرزا رستم قندھاری کا بڑا فرزند تھا - جہانگیری عہد میں دولت و امارت کے مرتبوں پر پہنچا اور شاہ نواز خاں کے خطاب سے نوازا گیا - ٹھٹھہ اور بہار کے صوبوں میں شاہی خدمات سر انجام دیتا رہا - جہانگیر کے بعد شہر یار کے خلاف آصف جاہی سے مل گیا اور کارہائے نمایاں سر انجام دئے -

شاہ جہان کے تیسرے سال جلوس میں خواجہ‌ابوالحسن تربتی کی ہمراہی میں ناسک اور تربنگ کے علاقے واپس لینے پر متعین ہوا -

نویں سال جلوس مُلک عادل شاہی کی تسخیر و تخریب وغیرہ کے لیے دوسرے اعلیٰ سرداروں کے ساتھ اس کی بھی نامزدگی ہوئی - چناں چہ یہ سید خان جہان بارھہ کی ہمراہی میں مامور ہو کر ہمیشہ ہراول سے متعلق رہا اور خان جہان اور اس نے مل کر دشمن کی بیخ کنی کی -

چونکہ اس کا تعلق ایک اعلیٰ خاندان سے تھا اس لیے ۲۳ ذی‌الحج دسویں سال جلوس کو اس کی لڑکی کی شادی شاہزادہ محمد اورنگ زیب

سے ہوئی ۔ شاہ جہاں شادی کے موقع پر کشتی میں سوار ہو کر اس کے گھر گیا ۔ اس کے سامنے چار لاکھ روپیہ مہر قرار پایا ۔ ابو طالب کلیم نے اس کی تاریخ کہی ۔ ''دو گوہر بیک عقد دوران کشیدہ'' ۱۰۳۷ء پندرھویں سال اس کی دوسری لڑکی کا رشتہ شاہزادہ محمد مراد بخش سے طے پایا ۔ اس وقت یہ صوبۂ اوڑیسہ کے انتظام میں مشغول تھا ، اس لیے حسب الحکم شاہ اس کی بیوی نورس بانوبیگم اپنی لڑکی کو لے کر حضور میں پہنچی اور شادی کے مراسم پورے کیے ۔ اس کے بعد اسے جونپور کا حاکم بنایا گیا ۔ بیسویں سال مالوہ کا صوبہ دار بنا ۔

اسلام خاں ناظم دکن کے مرنے کے بعد اسے وہاں کی حفاظت کے لیے بھیجا گیا ۔ ۲۲ویں سال جب شہزادہ مراد کو صوبۂ دکن کی حکومت ملی تو یہ اس کا اتالیق و وکیل بنایا گیا ۔ شروع میں اس نے اس مملکت کے انتظام میں بڑی سر گرمی دکھائی لیکن بعد میں شہزادہ کی خودسری و نا تجربہ کاری کے سبب دونوں میں کچھ ناراضگی ہوگئی جس کی وجہ سے معاملات ملکی بری طرح متاثر ہوئے اور ۲۳ویں سال شاہزادہ کو واپس بلا لیا گیا ۔

جنگ تخت نشینی کے موقع پر اس نے غیرجانب‌دار اور برھان‌پور میں رھنے میں مصلحت جانی ۔ لیکن اورنگ زیب نے اسے قلعہ ارک میں نظر بند کر دیا اور جب وہ دارا شکوہ کو شکست دے کر تخت نشین ہوا تو شاھنواز کو گجرات کی صوبہ داری عطا کی اور ساتھ ھی منصب میں اضافہ کرکے ۶ ہزاری ۶ ہزار سوار تک پہنچا دیا ۔ لیکن ابھی اس نے گجرات میں قدم نہیں جمائے تھے کہ دارا شکوہ عالمگیری افواج کے تعاقب میں ملتان اور ٹھٹھہ وغیرہ سے ہوتا ہوا احمد آباد کے نواح میں پہنچا ۔ اس (شاھنواز) نے اس کا استقبال کیا ، بڑی آؤ بھگت کی اور اسے (داراشکوہ) شاہی جھروکہ میں بٹھایا ۔ پھر جب داراشکوہ نے آگرہ کا رخ کیا تو شاھنواز خاں کو اپنا رفیق و مشیر بنا کر فوج اکٹھی کرنے کو کہا ۔ اس نے کوئی بیس ہزار سوار فراہم کیے اور ۱۰۶۹ھ میں داراشکوہ اور اورنگ زیب کی لڑائی میں دارا کا ساتھ دیا ۔

اسی سال ۲۹ جمادی‌الثانی کو عین لڑائی میں ایک تیر اس کی ناف میں آ کر لگا - اورنگ زیب نے سابقہ تعلق کی بنا پر اس کی نعش کو بڑے احترام سے اٹھوا کر صحن روضۂ معینیہ قدس سرہٗ (معین‌الدین چشتی رح) اجمیر میں دفن کیا -

شروع ھی سے بڑا خوش معاش اور آرائش و پیرائش کا دلدادہ اور یاروں کا یار تھا - امور دنیاوی اور تدابیر ملکی میں اسے خاصی رسائی حاصل تھی اور جزوی و کلی امور کو خود ھی نپٹاتا - شکار کا رسیا اور راگ اور نغمہ کا دلدادہ تھا - جس قدر گوبے اور سازندے اس کی سرکار میں تھے اتنے اس وقت کسی اور سرکار میں نہ تھے -
(مآثرالامرا جلد دوم ، صفحہ ۶۷۰ بیعد)

نعمت خان عالی (صفحہ ۶۹۸)

۱ ابوالحسن - سلطان ابوالحسن قطب‌الملک فرمانروائے حیدر آباد جو عوام میں تانا شاہ کے نام سے مشہور ھے ، بقول صاحب مفتاح‌التواریخ ایران کے نجیب زادوں میں سے تھا - ھمدان سے لباس فقر میں سیاحت کرتا ھوا حیدر آباد پہنچا - اس وقت کے فرمانروا قطب‌الملک عبداللہ شاہ کا چونکہ کوئی بیٹا نہ تھا اس نے اس کی فطنت و ذکاوت سے متاثر ھو کر اسے اپنی دامادی میں لے لیا - عبداللہ شاہ کے مرنے کے بعد ارکان سلطنت نے اسے قطب‌الملک کا خطاب دے کر تخت نشین کیا - لیکن مولانا شبلی کے مطابق عبداللہ شاہ سے اس کا دور کا واسطہ تھا اور چوں کہ اس کا کوئی قریبی عزیز نہ تھا اور نہ اولاد ذکور ھی تھی اس لیے اسے تخت نشین کیا گیا - مولانا ھی کے لفظوں میں یہ "بچپن سے قلندروں کے ساتھ آوارہ پھرتا تھا اس لیے تخت نشینی کے بعد بھی یہ شان قائم رھی" - اس نے مادنا برھمن کو وزارت دی اور سید مظفر کو جو ایک اولوالعزم امیر تھا اور جس نے اسے سلطنت دلائی تھی معزول کر دیا - حکومت کے تمام اختیارات مادنا کے سپرد کیے - جب سیوا جی عالمگیرؒ کے دربار سے بھاگ کر دکن گیا تو اس کے کہنے پر ابوالحسن

نے اُس (سیوا) کی فوج اور روپے سے مدد کی ۔ سیوا جی کے مرنے کے بعد اُس کے بیٹے سنبھا کی بھی اس نے اسی طرح مدد کی ۔

عالمگیر جب بیجا پور کے محاصرے میں مشغول تھا اس نے اپنے ایک سردار کی جانب خط لکھا کہ ''ایک طرف سے سنبھا بے شمار فوج لے کر بڑھتا ہے دوسری طرف سے میں ۴۰ ہزار جرار فوج بھیجتا ہوں، دیکھوں حضرت (عالمگیر) کس کس کا مقابلہ کرتے ہیں'' ۔ عالمگیر نے یہ خط پڑھا تو کہا ''ہم نے اب تک اس بندر نچانے والے کو چھوڑ رکھا تھا، لیکن جب مرغی نے خود آواز دی تو اب کیا باقی رہا'' ۔

۱۰۹۷ھ میں جب عالمگیر نے حیدر آباد فتح کیا تو یہ بھاگ کر قلعۂ گولکنڈہ کی طرف چلا گیا ۔ شاہی افواج نے حیدر آباد کے بعد گولکنڈہ کا محاصرہ کر لیا ۔ یہ محاصرہ تیسویں سال جلوس (۱۰۹۸ھ) ۲۵ ربیع‌الاول سے لے کر ۲۴ ذیقعدہ تک یعنی آٹھ ماہ رہا ۔ قلعہ فتح ہونے پر ابوالحسن گرفتار ہوا اور مرتے دم تک قلعہ دولت آباد میں محبوس رہا ۔ اورنگ زیب نے پچاس ہزار روپیہ سالانہ اس کی پنشن مقرر کی ۔

اس کی عیش پرستی کے بہت سے قصے مشہور ہیں ۔ اس نے پندرہ برس کی حکومت میں اپنی انتہائے عیش پرستی کے سبب حیدر آباد سے باہر قدم نہیں رکھا، بجز اس کے کہ گولکنڈہ گیا تھا، جو حیدر آباد سے ایک کوس کے فاصلے پر ہے ۔ اسے روزانہ کی سواری بھی دشوار تھی ۔ اس کی عیش پرستی نے تمام ریاست کو اس رنگ میں رنگ دیا اور ہر طرف علانیہ بدمعاشی اور شراب خواری پھیل گئی ۔ بقول خافی خاں ''ابوالحسن نے ملک کو مادنا اور آکنا کے ہاتھ میں دے دیا جو سخت متعصب کافر تھے، اور اس وجہ سے مسلمانوں پر سخت ظلم ہوتا تھا، اور علانیہ فسق و فجور اور شراب خواری اور ناچ و رنگ ملک میں پھیل گیا ۔

(مفتاح‌التواریخ صفحہ ۲۸۴ عالمگیر پر ایک نظر صفحہ ۶، ۷ مآثرالامرا جلد اول صفحہ ۳۵۶، این ایڈوانسڈ ...... صفحہ ۵۰۶)

۲ - جس کی دعا قبول ہو۔

۳ - بلند جگہ پر بیٹھ کر پہرہ دینے والا۔

۴ - نظر بد لگنا ، نقصان پہنچنا۔

۵ - بصر پر نقطہ لگانے سے نصر بن جاتا ہے۔

۶ - نصرت صرف اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

۷ - فیروز جنگ - میر شہاب الدین نام ، مخاطب بہ غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ - اس کا والد عابد خان مشہور بہ قلیچ خان عالم گیر کا صدر الصدور تھا اور محاصرۂ گولکنڈہ (۱۰۹۸ھ) میں توپ کے گولے سے زخمی ہو کر فوت ہوا۔

فیروز جنگ ، عالمگیر کے بارھویں سال جلوس توران سے آ کر اس کے ملازموں میں شامل اور تین صدی ستر سوار کے منصب پر سرفراز ہوا۔اس کا والد اس سے پہلے ہی عالمگیر کے دربار میں تھا۔ جب اس نے اس برصغیر میں آنے کا ارادہ کیا تو والئی توران سبحان قلی خان نے اجازت نہ دی - آخر کہہ کہلوا کر اجازت حاصل کی - کہتے ہیں کہ جب یہ روانہ ہونے لگا تو خان مذکور نے فاتحہ پڑھا اور کہا کہ 'تو ہندوستان جا رہا ہے' 'مرد عمدہ خواہی شد۔'

تئیسویں سال جلوس عالمگیر نے اسے حسن علی خان بہادر کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے آدھی رات کو بلایا ، جو رانا اودے پور کی گوشمالی کو گیا ہوا تھا اور جس کی ایک مدت سے کوئی خبر نہیں آ رہی تھی ، فیروز جنگ نے دو روز کے بعد اس کی خبر لا کر دی۔ جس کے صلے میں اسے 'خان' کے خطاب اور دیگر عنایات سے نوازا گیا۔ پھر اسے راٹھوروں کی سرکوبی کے لیے سروہی بھیجا گیا - ان راٹھوروں نے شاہزادہ محمد اکبر کو ساتھ ملایا ہوا تھا - اس نے انہیں شکست دی۔ بعد میں ساٹھ کوس کا فاصلہ دو روز میں طے کر کے دربار میں پہنچا اورمورد تحسین ٹھہرا اور 'عرض مکرر' کا داروغہ بنایا گیا۔

جب عالمگیر دکن کی طرف گیا تو چھبیسویں سال یہ جنیر کے

نواح کے سرکشوں پر مامور ہوا۔ پھر اسے گرز برداروں کی داروغگی ملی۔ اپنے انھی کارناموں کی وجہ سے غازی الدین خان بہادر کے خطاب سے نوازا گیا۔ اٹھائیسویں سال قلعۂ راہیری (سنبھا کا مسکن) کی تسخیر اس کے سپرد ہوئی۔ اس نے اس قلعے کو آگ لگا دی۔ کئی کفار قتل کیے اور اس طرح فتح مندی سے ہمکنار ہوا۔ اس پر فیروزجنگ کا خطاب اور نقارا پایا۔

جب بیجا پور کے محاصرے میں شاہزادہ محمد اعظم شاہ کے لشکر میں غلہ وغیرہ کا قحط ہوا تو اسے سامان رسد پر متعین کیا گیا۔ اس نے دشمن کو پہنچنے والی خفیہ کمک کو، جو چھ ہزار پیادوں پر مشتمل تھی، راستے میں ہی آن لیا اور سب کو تہ تیغ کر دیا۔ جس کے سبب بیجا پور جلد فتح ہو گیا۔ خلد مکاں (عالم‌گیر) نے اس فتح کو، جس کی تاریخ 'سد سکندر گرفت' سے نکلتی ہے اس کے نام پر مقرر کیا اور دستخط خاص سے یہ فقرہ لکھ کر واقع نگارِ کُل کو بھیج دیا کہ وقائع میں داخل کرے:

"بدستیاری فرزند بی ریو و رنگ غازی الدین خان بہادر فیروزجنگ مفتوح شد۔"

اپنی دیگر بہادریوں کے صلے میں سات ہزاری سات ہزار سوار منصب کو پہنچا۔ بتیسویں سال سنبھا کی بیخ کنی پر مامور ہوا۔ طاعون پھیلنے کے سبب اس کی بینائی جاتی رہی اور اگرچہ ضابطہ کی بنا پر دربار میں حاضر نہ ہوتا تھا، لیکن سرداری و فوج کشی کے مراتب میں کوئی فرق نہ آیا۔ تینتالیسویں سال دیوگڑھ (اسلام گڑھ) کی تسخیر پر متعین ہوا اور اس پر قبضہ کیا۔ شاہ عالم بہادر شاہ کی تخت نشینی (۱۱۱۹ھ) کے بعد گجرات کی صوبہ داری پر مامور ہوا اور چوتھے سال احمد آباد میں فوت ہو گیا۔ (مفتاح التواریخ میں سنہ وفات ۱۱۲۲ھ ہے) اس کی نعش دھلی لائی گئی اور اجمیری دروازہ کے قریب اس کے اپنے بنائے ہوئے مقبرہ میں اسے دفن کیا گیا۔

تورانی امرا میں سب سے زیادہ صاحب خوبی، خوش خلق، باوقار

فتح نصیب اور صاحب نسق تھا ۔ اس کی سرکار آباد و خوش حال تھی ۔ گزشتہ ادوار میں ایسا کم ہی ہوا ہے کہ کسی شاہی ملازم کی بینائی جاتی رہی ہو اور پھر بھی وہ سرداریٔ فوج کشی اور کارفرمائی پر مامور رہا ہو ۔

بہ قول مؤلف مآثرالامرا یہ بات کہ عالم‌گیر نے کسی سبب سے اس کی بینائی ختم کر دینے کا اشارہ کیا تھا ، جب‌کہ یہ آشوب چشم میں مبتلا تھا ، غلط ہے ۔ کیوں‌کہ عالم‌گیر بڑا 'غضوب و کینہ پرور' تھا ۔ اگر وہ اس میں سرکشی وغیرہ کے کچھ بھی آثار دیکھتا تو اس کو یہ عزت و توقیر ہرگز نہ بخشتا ۔ اس کی نیک اندیشی و خیرخواہی بادشاہ کے دل پر نقش تھی ۔ (مآثرالامرا جلد دوم، صفحہ ۸۷۲ ببعد ۔ مفتاح‌التواریخ صفحہ ۴۸۴، ۲۹۷، ۳۲۸)

۸ - یعنی وہ جگہ جس پر عالم‌گیری سپاہی چار ماہ کی مدت میں قابض ہوئے تھے ۔

۹ - بہادر ۔ شیخ مقبول عالم عبدالعزیز خاں بہادر ۔ شیخ فریدالدین گنج شکر قدس سرہ کی اولاد سے تھا ۔ اس کے آبا و اجداد کا وطن موضع اسنی (اسنی) متصل قصبۂ بلگرام اور والد کا نام عبدالرسول خاں تھا اور دادا شیخ علاء الدین معروف بہ شیخ الہدیہ ۔

بہادر کو فیروزجنگ بہادر نے عالم‌گیر رح کے زمانے میں شاہی ملازمت میں پہنچایا ۔ بعد میں مناسب منصب اور خطاب خانی سے سرفراز اور رفتہ رفتہ خدمت 'طلب خاں' سے مخاطب ہوا ۔ پھر نلدرک صوبہ بیجاپور وغیرہ کی قلعہ داری اس کے سپرد ہوئی ۔ اپنی لیاقت کے سبب نظام الملک آصف جاہ کی حکومت میں جنیر کی قلعہ داری پر مامور اور بہت سی مہربانیوں کا مورد ہوا ۔

جن دنوں آصف جاہ مذکور ناصر جنگ شہید کو دکن میں چھوڑ کر خود 'فردوس آرام گاہ' (محمد شاہ بادشاہ) کے پاس پہنچا اور ادھر مرہٹہ سردار باجی راؤ نے فساد برپا کر رکھا تھا تو ناصر جنگ نے اس کی جرأت و دلیری اور مرہٹوں کے روبہ سے آشنائی کے سبب اسے

جنیر سے طلب اور مشورہ میں شامل کیا۔ جنگ مرہٹہ سے فارغ ہونے پر دھلی (؟) کا نائب صوبہ دار بنا دیا گیا۔ ۱۱۵۶ھ میں مرہٹوں کے ساتھ ایک لڑائی میں شہید ہوا۔

بہ قول صاحب مآثر الامرا بڑا جرأت مند اور کارکرد عمل داری سے شناسا تھا۔ اور

"در گرفت و گیر زر از حساب و بے حساب پروائے نداشت۔"
(مآثرالامرا جلد دوم ، صفحہ ۸۳۶ ببعد)

۱۰ - اور لشکری آگے بڑھنے کے بعد تتر بتر ہو گئے (؟)

۱۱ - جو اپنا گوھر آبرو گم کر بیٹھے ہوں ، بے ننگ و عار۔ گوھر کا لفظ آب (چمک کاٹ وغیرہ) کی رعایت سے استعمال کیا ہے۔

۱۲ - آنکھوں کو نظر آنا بند ہو گیا اور معاملہ بگڑ گیا۔

۱۳ - بہ الماس کو سجانے والا (رشک الماس) تاج برق۔

۱۴ - مرقع : البم - فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اھل قلعہ کو اس بارش سے ذرا سا بھی نقصان نہ پہنچا۔

۱۵ - یعنی محاصرین (بھیگنے کے سبب) آزردہ خاطر ہو رہے تھے اور محصورین شوخ۔

۱۶ - ماوراء النہری : نہر کے اس پار والے - ماوراء النہر ایک جگہ کا نام ہے۔

۱۷ - دل پر ہونا - دلیر ہونا یعنی قلعہ والے دلیر ہو گئے اور شاھی لشکریوں کے دل غصے سے بھر گئے۔

۱۸ - زخم پریشانی کو اور بڑھانے والے ھیں اور سفید رنگ سے حیرت نمایاں ہے۔

۱۹ - پورے زور سے دھاوا بول دو۔

۲۰ - یعنی وہ آمادہ ھو گئے کہ اس سختی و شدت سے جلد رہائی پائیں۔

۲۱ - چمک ، پانی -

۲۲ - ایک باجے کا نام - دائرہ عام معنی -

۲۳ - موسیقی کا ایک مقام -

۲۴ - کسی اسلحہ کا نام -

۲۵ - موسیقی کی اصطلاح بہ معنی تال سر - دوسرے معنی مارنا ، آواز -

۲۶ - موسیقی کی اصطلاح - مقام یعنی سینہ کو زخمی کرنا -

۲۷ - ایک ساز کا نام -

۲۸ - نفس بہ معنی لمحہ ، سانس ، پھونک - بانسری کی رعایت سے یہ لفظ استعمال کیا -

۲۹ - مصاحبت -

۳۰ - ایک راگ کا نام -

۳۱ - سرے ، راگ کا نام اور بہ معنی ایک سر -

۳۲ - دوگاہ ، ایک راگ رام کلی - یعنی سر کو کبھی ہاتھوں میں اور کبھی پاؤں میں گراتا تھا - عالی نے چوں کہ ہتھیاروں وغیرہ کی جگہ موسیقی کے آلات کے نام لکھے ہیں - اس لیے جنگی معاملات کو بھی موسیقی ہی کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے -

۳۳ - زنبورک زنبورہ کا اسم تصغیر ہے - زنبورہ ایک ساز اور زنبورک چھوٹی توپ -

۳۴ - چمڑے کا ڈبہ جس میں مٹی کا تیل یا بارود بھر کر آگ لگا کر دشمن کی طرف پھینکتے ہیں -

۳۵ - ایک باجے کا نام جو نے اور چمڑے سے بنتا ہے -

۳۶ - مرگ پیچ - بہادر لوگ پگڑی باندھ کر اس کے ایک سرے کو بل دے کر گردن اور کان کی طرف لٹکا دیتے ہیں - پگڑی باندھنے

کے اس خاص طریقے کو مرک پیچ اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے باندھنے والا ہر وقت اپنے آپ کو موت کے لیے تیار رکھتا ہے ۔

۳۷ - گوش پہن کردن - کان پھیلانا - کسی چیز کی امید رکھنا ۔

۳۸ - نقیر - گریزاں ' بانسری ' کرنا ۔

۳۹ - بے آزرم - بے حیا ۔

۴۰ - رزم ' جنگ ۔

۴۱ - لڑائی ۔

۴۲ - جرعہ : گھونٹ ۔ درد کش : تلچھٹ پینے والا ۔

۴۳ - قتل و غارت ۔

۴۴ - پہلے جو دو نقبیں لگائی گئیں تھیں ان سے کچھ حاصل نہ ہوا ۔ بلکہ آلتا نے بے شمار جانیں ضائع کئی تھیں ۔

۴۵ - ظاہر ہے کہ اس لشکر سے غلہ گم ہو گیا ۔ تمام لوگ اپنی جان سے سیر ہوگئے ۔ زن و مرد کھلیان کی طرح باہم گرے پڑے ہیں ۔ (آخری مصرح عریاں ہے)

۴۶ - (۱) اہل قبول کا دل موتیوں کا مخزن ہے ۔ دوسرے مصرعے میں عروضی تقطیع ہے ۔

(۲) فلک کے بارہ حصے کر کے برج بنائے گئے تا کہ ان سے ۱۲ مہینوں کا حساب ہو ۔

۴۷ ۔

(۳) (یہ سب برجوں کے نام ہیں) حوت ، حمل ، عقرب ، میزان ، ثور ، دیو اور ان کے بعد سرطان ضرور آتا ہے ۔

(۴) جدی ، اسد ، سنبلہ ، جوزا اور قوس ، ان میں سے ہر تین برج ایک عنصر میں شور مچاتے ہیں ۔ عنصر چار ہیں آگ ، پانی ، مٹی ، ہوا ۔ یعنی یہ بارہ برج چار عناصر میں منقسم ہیں اور وہ اس طرح کہ آگ سے متعلق حمل ، اسد اور قوس ہیں ۔ انہیں مثلثہ

آتشی کہا جاتا ہے ۔ مثلثہ مائی (پانی) سرطان ، عقرب اور حوت ہیں ۔ مثلثہ خاکی (مٹی) ثور ، سنبلہ اور جدی اور مثلثہ بادی (ہوا) جوزا ، میزان اور دلو ہیں ۔ اب ان برجوں کے معنی اور شکلیں ملاحظہ ہوں ۔ حوت : مچھلی ۔ حمل : بھیڑ کا بچہ ۔ عقرب : بچھو ۔ میزان : ترازو ۔ ثور : بیل ۔ دلو : ڈول ۔ سرطان : کیکڑا ۔ جدی : بکری کا بچہ ۔ سنبلہ : خوشہ ۔ جوزا : آدمی کی شکل والا برج ۔ اسد : شیر اور قوس : کمان ۔

(۵) آتشی (مثلثہ) نے لوگوں کو تباہ کر دیا اور دور و نزدیک کو بارود سے اڑا دیا ۔

(۶) (ان برجوں کے) آبی مثلثہ نے بارش اور سیلاب سے گزرنے والوں کے لیے سامانِ رسد کا راستہ بند کر دیا ۔

(۷) خاکی اور بادی مثلثہ نے بہم مل کر حملہ کے وقت لشکریوں کی آنکھیں اندھی کر دیں ۔

(۸) ان برجوں سے ستاروں کا اثر پیدا تھا ۔ یعنی کسی وقت خوشی ماتم بن جاتی اور کبھی عزا مسرت میں تبدیل ہو جاتا ۔

(۹) اب تمام سیاروں سے فرحت و عیش و سرور کی خاصیت جاتی رہی ہے ۔

(۱۰) ماہ (چاند) برج عقرب سے باہر پاؤں نہیں نکالتا اور سورج برج اسد کو بزور نہیں چھوڑ رہا ۔ (چاند کا عقرب میں اور سورج کا اسد میں ہونا بہت منحوس ہوتا ہے) ۔

(۱۱) بست و طریقہ (منحوس گھڑی ، جب کہ چاند برج عقرب میں ہوتا ہے) تحت‌الشاع (منحوس ساعت ، جب کہ قمر آفتاب کی شعاع کے نیچے ہوتا ہے) یعنی منحوس گھڑیاں اب تو دنوں ، سالوں اور مہینوں کا لازمہ بن گئی ہیں ۔ (ہر لمحہ اپنے ساتھ ایک نئی نحوست لاتا ہے) ۔

(۱۲) طرب و خوشی کا چاند ، رنج و غم اور فرحت و مسرت کا سورج (قلعہ والوں کے) شور و شر سے گہنا گیا ۔

(۱۳) راس و ذنب (دو ستارے ۔ راس کی شکل سر کی اور ذنب کی شکل دم کی ہے ۔ جب یہ دونوں کسی مبارک ستارے کے ساتھ مل جاتے ہیں تو زیادہ مبارک ہو جاتے ہیں اور جب کسی منحوس ستارے سے ان کا ملاپ ہوتا ہے تو منحوس تر ہو جاتے ہیں ۔) فوج کے دو سردار راس و ذنب بن گئے ۔ ایک بزرگی سے اور دوسرا سعادت سے گریزاں ۔

(۱۴) مریخ (منحوس ستارہ جسے جلاد فلک بھی کہتے ہیں) ، جس کا پیشہ خوں ریزی ہے ، قلعہ کے ہر برج سے ظاہر ہو رہا ہے ۔

سجان رائے (صفحہ ۴۷۷)

۱ ۔ سجان رائے بٹالوی ، ذات کا کھتری اور متصدی پیشہ تھا ۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس کے خاندان میں قانون گوئی وراثۃً رائج تھی ۔ بعض اوقات سجان رائے (س ج ا ن) کو لوگ غلطی سے سبحان رائے (س ب ح ا ن) ، سحاب رائے اور سنجان رائے وغیرہ بھی پڑھ دیتے ہیں ۔

اس کی مشہور تالیف 'خلاصۃ التواریخ' سے اس کے بارے میں صرف اتنا پتا چلتا ہے کہ وہ بٹالہ میں پیدا ہوا ۔ کابل کا سفر کیا ۔ ٹھٹھہ اور پنجور کی سیر و سیاحت کی ۔ خاندانی پیشہ منشی گری تھا ۔ اور یہ کہ اس کا ایک بیٹا رائے سنگھ تھا ۔ اور مولانا امان اللہ حسینی ، کہ اس عہد کے ایک بڑے فاضل تھے ، اس کے دوست تھے ۔ یہ ۱۱۱۰ھ تک شاہی ملازمت سے مستعفی ہو چکا تھا ۔

خلاصۃ التواریخ کے علاوہ اس کی ایک اور کتاب ہے 'خلاصۃ المکاتیب' جو فن انشا و نثر میں ایک مبسوط کتاب ہے اور رائے سنگھ کی خاطر لکھی گئی تھی ۔

ہندوؤں کی تمام تاریخوں میں سے صرف اس کی خلاصۃ التواریخ کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس پر مشرق اور مغرب کے متعدد فضلا نے اپنی توجہ مبذول کی ہے ۔

(ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ صفحہ ۶۲ از ڈاکٹر سید عبد اللہ مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی ، ۱۹۴۲ء)

۲ - ایاز - فارسی و اردو شاعری کا بہت بڑا موضوع - ایاز' اس کا پورا نام امیر ابوالنجم ایاز بن ایماق ہے - ایاز ترکی کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں خوشگوار دھوپ یا وہ شبنم جو کسی صاف صاف رات کو پڑے - ایماق یا اویماق انگشتانہ کے علاوہ ایک مشہور ترکی قبیلے کا نام ہے - ترکی النسل تھا - نظامی عروضی سمرقندی مؤلف چہار مقالہ کے مطابق یہ ترک تھا - فرشتہ نے ختنی الاصل لکھا ہے - مجالس العشاق کے مؤلف کا کہنا ہے کہ یہ ایک غلام تھا جسے محمود نے بازار سے خریدا تھا - اغلب ہے کہ اس کی تعلیم محمود نے کی ہو - اس کا سنہ پیدائش تقریباً ۳۹۲ھ ہے -

سلطان محمود غزنوی ، مسعود غزنوی اور مودود غزنوی کے دربار کے مشاہیر میں اس کا شمار ہوتا ہے - سلطان محمود کے دربار میں اسے بڑا مقام اور محبوبیت حاصل تھی ، اور سلطان اس سے بڑی مرحمت سے پیش آتا تھا - اسی سبب سے اس کا نام شعرا کے یہاں تلمیح کے طور پر استعمال ہونے لگا -

محل کے غلاموں کا سردار تھا - سلطان کا معتمد ہونے کے علاوہ سرداروں اور سپاہیوں کے نزدیک محترم تھا - سطان اس کے اخلاق ، ذکاء اور موقع شناسی سے بے حد متاثر تھا - عوفی نے 'جوامع الحکایات و لوامع الروایات' میں لکھا ہے کہ سلطان محمود کو جس بات نے ایاز کی محبت پر اکسایا وہ یہ تھی کہ ایک روز کسی شکار گاہ میں ایک ہما اڑا - سب لوگ اس کی طرف بھاگے تاکہ اس کے سائے میں کھڑے ہوں (مشہور ہے کہ جس کے سر پر ہما کا سایہ ہو جائے وہ بادشاہ بن جاتا ہے) - ایاز نے اچھل کر سلطان کی رکاب تھام لی - سلطان نے کہا یہ کیا کر رہے ہو - ایاز بولا کہ سب لوگ سایۂ ہما کے طالب ہیں اور میں سایۂ خدا کا - (بادشاہ کو سایۂ خدا ، ظل اللہ ، کہتے ہیں) - عوفی نے ابی نصر مشکان کے حوالے سے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے ایاز کی بہن سے شادی کی تھی -

بعض مؤرخین کے مطابق محمود نے اسے پنجاب کا گورنر بنایا تھا -

لیکن بیہقی کے مطابق (جو زیادہ مستند ہے) حسن میمندی نے اس کے لیے مسعود سے سفارش کی تھی کہ اسے پنجاب کا گورنر بنا دے۔ جس پر مسعود نے کہا کہ وہ محل سے باہر نہیں نکلا اور ابھی ناتجربہ کار ہے۔

محمد بن محمود کی تخت نشینی کے بعد وہ شاہی غلاموں کے دستے کو لے کر مسعود کے پاس چلا گیا۔ مسعود نے اسے اس خدمت کے صلے میں بہت نوازا، اس پر اکرام و انعام کی بارش کی اور اعلیٰ مرتبوں پر فائز کیا۔ چنانچہ ایک موقع پر ۳۰ خروار دینار ایک ہی بخشش میں عطا کئے۔ بست کے صوبہ کی تمام آمدنی اسے بخش دی۔ اور مکران اور خزدار کا خراج اسے عطا کیا۔ مسعود اپنے زمانۂ حکومت میں اسے ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔

بہ قول فرشتہ یہ مجدود بن مسعود کے ساتھ لاہور میں آیا (جس کے ورود لاہور کا سال تقریباً ۴۲۷ یا ۴۲۸ھ ہے) - اور اس کا اتالیق بنا - چوں کہ مجدود ابھی چھوٹی عمر کا تھا اس لحاظ سے ایاز ہی لاہور کا حاکم ٹھہرا۔ لاہور کو اس نے نئے سر سے آباد کیا اور یہیں بقول ریورٹی ربیع الاول ۴۴۹ھ میں وفات پائی۔

ایاز شائستگی کے اصول اور آداب محفل سے پورے طور پر واقف تھا - وہ شاہی محافل میں ہر وقت شریک رہتا۔ ان اوصاف کے علاوہ وہ ایک دلیر سپاہی، شہسوار اور قادر تیرانداز بھی تھا - مردانہ اوصاف سے پوری طرح متصف تھا۔

فرمان برداری میں بے مثل تھا - عطار نے منطق الطیر میں اس کی فرمان برداری کا ایک واقعہ لکھا ہے - ایک روز سلطان محمود نے اسے سونے کا جام، جس میں وہ شراب پیتا تھا، توڑنے کو کہا اس نے فوراً زمین پر پھینک کر توڑ دیا - تمام درباری بڑے متحیر ہوئے۔

بہ قول عروضی سمرقندی یہ اتنا خوبصورت نہ تھا لیکن 'سبز چہرہ ای شیرین بودہ است' - اور 'متناسب اعضا و خوش حرکات و خرد مند' تھا اور 'آداب مخلوق پرستی' سے بے حد بہرہ ور - ان اوصاف کے باعث 'نادرات زمانۂ خویش' میں سے تھا - محمود کے درباری شعرا نے اس کی

مدح میں کئی قصیدے لکھے ۔ اس ضمن میں فرخی کے ایک قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ۔

امیر جنگجو سالار ایماق ‏ ‏ ‏ دل و بازوی خسرو روز پیکار
سواره کز در میدان در آید ‏ ‏ ‏ زپای اندر فتند دلهای نظار
یکی گوید که آن سرویست بر کوه ‏ ‏ ‏ دگر گوید گل تازه است ُپر بار
زنان پارسا ازشوی گردند ‏ ‏ ‏ بکابین دیدن اورا خریدار
دلیران در نهیبش روز کوشش ‏ ‏ ‏ همی لرزند چون برگ سپیدار
اگر برسنگ خارا بزند تیر ‏ ‏ ‏ بسنگ اندر نشاند تابسوفار
نه ُپر خیره بدو دل داد محمود ‏ ‏ ‏ دل محمود را بازی مپندار

اس کا مزار لاهور میں آج تک محفوظ ھے ۔ مقامی تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ھے ۔ عوام اسے ملک الیاس کی خانقاہ کہتے ھیں ۔

یہ مزار رنگ محل بازار میں تانگوں کے اڈے کے نزدیک چھوٹی سی مسجد کے بالمقابل ، جو عین سڑک کے درمیان اکیلی کھڑی ھے ، ایک خانقاہ کی شکل میں ھے ۔ اس مزار کے گردو نواح کا علاقہ اس سے متعلق تھا ۔ لیکن سکھوں کے زمانے میں یہ مکان چھن گئے ۔ اور جن کی بازیابی کے لیے بعض مسلمان سرکار انگریزی کے عہد میں مقدمہ بازی کرتے رھے ۔

اس مزار پر آج بھی بے شمار لوگ حاضری دیتے ھیں ۔ (چہار مقالہ از نظامی عروضی سمرقندی چاپ اقبال تہران صفحہ ۴۴ تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۴۴ ۔ سلطنت غزنویاں مرتبہ استاد خلیلی ، مطبوعہ کابل ۱۳۳۳ھ ، صفحہ ۳۰۲ - ۳۰۳ ۔ اورئینٹل کالج میگزین اگست ، نومبر ۱۹۴۳ع مقالہ 'ملک ابوالنجم ایاز بن اویماق' از مشتاق احمد بھٹی صاحب ریسرچ سکالر)

۳ ۔ خسرو شاہ ۔ بہرام شاہ غزنوی کا بیٹا تھا ۔ اپنے باپ کی وفات (۵۴۷ھ) کے بعد غزنی میں تخت نشین ہوا ۔ انہی دنوں علاء الدین غوری کے پہنچنے کی خبر موصول ہوئی تو اس نے اهل و عیال سمیت لاهور کی طرف فرار کیا ۔ جب علاء الدین غوری غزنین کی اینٹ سے اینٹ بجا کر

اور قتل و غارت کر کے واپس ہوا تو خسرو شاہ جو موقع کی تلاش میں تھا سلطان سنجر کی امداد کے بھروسے پر لاہور سے پھر غزنی کی طرف بڑھا اور دوبارہ قابض ہو گیا ۔ جب ترکان غز نے سلطان سنجر کو گرفتار کر کے غزنین کا رخ کیا تو یہ تاب مقاومت نہ لا کر پھر لاہور کی طرف بھاگا (بہ قول بدایونی علاء الدین نے ادھر کا رخ کیا تھا جس کے سبب خسرو شاہ پھر لاہور بھاگ گیا) ۔ یہاں اس نے ۵۵۵ھ میں وفات پائی ۔ بدایونی کے مطابق قاضی بیضاوی نے اس سے اختلاف کیا ھے اور اپنی تاریخ میں لکھا ھے کہ خسرو شاہ کا انتقال غزنی ھی میں ہوا تھا ۔ علاء الدین نے غزنی کو برباد کر کے اپنے بھتیجوں کو وھاں چھوڑا تھا ۔ جنھوں نے مختلف حیلوں اور ترکیبوں سے خسرو شاہ کو اپنی امن پسندی اور وفاداری کا اطمینان دلایا تھا ، مگر ۵۵۵ھ میں انہی کے ھاتھ سے وہ گرفتار ھوا اور اسی سال فوت ھوگیا ۔ روضۃ الصفا کے مطابق اور بہ قول بدایونی اس نے ۸ سال حکومت کی ۔ بہ قول فرشتہ ۷ سال ۔ طبقات اکبری میں بست (۲۰) سال لکھا ھے جو طباعت کی غلطی معلوم ھوتی ھے ۔ (روضۃ الصفا جلد چہارم ، صفحہ ۵۰ ۔ طبقات اکبری ، صفحہ ۱۷ ۔ تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۵۲ جلد اول ۔ منتخب التواریخ اردو ترجمہ ، صفحہ ۵۲ ۔ آئین اکبری جلد سوم ، صفحہ ۲۶۳ مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۹ع)

۳ ۔ خسرو ملک ۔ خسروشاہ کا بیٹا تھا ۔ باپ کی وفات کے بعد لاھور میں تخت نشین ھوا ۔ صاحب روضۃ الصفا کے مطابق وہ پرلے درجے کا عیاش تھا ۔ جس کے سبب تمام ملک ابتری اور انتشار کا شکار ھوا ۔ امرا اور ارکان دولت اس سے آزردہ تھے ۔ اور اس کے زمانے میں عورتیں اور خادم فرماندھی کے مرتبے تک پہنچے ھوئے تھے ۔ بقول بدایونی غزنوی حکومت جو پہلے ھی کمزور ھو چکی تھی خسرو ملک اس کی مردہ لاش کو بس درے مار مار کر گھسیٹتا رھا ۔

۵۸۳ھ میں جب سلطان غیاث الدین محمد سام غوری نے جو اب غزنین کے تخت پر متمکن تھا ، لاھور کا رخ کیا تو خسرو ملک نے اس سے امان چاھی ۔ سلطان غیاث الدین اسے اپنے ساتھ غزنی لے گیا (ملا بدایونی اور فرشتہ نے غیاث الدین کی بجائے شہاب الدین لکھا ھے) اور کچھ عرصہ

بعد اسے ختم کر دیا گیا ۔ بقول بدایونی خسرو ملک نے ۵۸۳ھ ہی میں وفات پائی ۔

وہ غزنوی خاندان کا آخری بادشاہ تھا ۔ اس نے اٹھائیس برس تک حکومت کی ۔

بقول مؤلف مآثر لاہور اگرچہ خسرو ملک عیاشی کے پھندوں میں گرفتار تھا ، لیکن ہماری دل چسپی کا سامان یہ ہے کہ اس کی ذاتی غفلت اور زوال آمادگی کے باوجود نئے پایۂ تخت لاہور میں ہم کئی اول درجے کے صاحبان علم و فضل اور معیاری شعرا کے نام سنتے ہیں جو دربار خسرو ملک کے متوسل تھے ۔ (روضۃ الصفا جلد چہارم ، صفحہ ۵۰ ۔ منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۵۳ ۔ طبقات اکبری ، صفحہ ۱۷ ، ۱۸ ۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ، صفحہ ۵۲ ۔ آئین اکبری از ابوالفضل مطبوعہ نولکشور ۱۸۶۹ع جلد سوم ، صفحہ ۲۶۴ ۔ مآثر لاہور از سید ہاشمی فرید آبادی ، صفحہ ۱۶۴)

۵۔ سلطان بہلول لودی ۔ باپ کا نام ملک کالا تھا ۔ آباؤ اجداد افغانی سوداگر تھے جو ہندوستان آیا جایا کرتے تھے ۔ اس (بہلول) کا دادا ملتان آ کر حاکم ملتان کے پاس ملازم ہو گیا ۔ کچھ عرصہ بعد فیروز شاہ کے عہد میں خضر خاں ملتان کا حاکم ہوا تو ملک کالا کا ایک بھائی سلطان شاہ کا نوکر ہو گیا ۔ خضر خاں نے اس کی خاصی قدر و منزلت کی ۔ اسلام خاں کا خطاب دیا اور سرھند کی حکومت سے نوازا ۔ ملک کالا اور دیگر بھائی بھی اس کے پاس آ گئے ۔ ملک کالا اپنے بھائی کی وجہ سے پرگنہ دورالہ کا حاکم بنا ۔ چچا کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی جو بہلول کی والدہ تھی ۔

بہلول ماں کے پیٹ ہی میں تھا کہ مکان گرنے کے سبب وہ ہلاک ہو گئی ۔ چونکہ وضع حمل کا وقت قریب تھا اس لیے اس کا پیٹ چاک کر کے بہلول کو نکال لیا گیا ۔ اس کی زندگی بچ گئی ۔

کچھ عرصہ بعد اس کا باپ ملک کالا ایک جنگ میں مارا گیا تو بہلول اپنے چچا اسلام خاں کے پاس سرھند چلا گیا ۔ اور وہیں تربیت

پائی ۔ ایک جنگ میں اس نے بہادری کے جوہر دکھائے، جس پر چچا نے اپنی لڑکی سے شادی کر دی ۔

اسلام خاں نے بہ وقت رحلت اسے اپنا قائم مقام بنانے کی وصیت کی تھی ۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد مسند کے لیے دوسرے دعویدار پیدا ہو گئے ۔ جنگ و جدل کے بعد سرہند ملک سکندر تحفہ کے سپرد ہوا ۔ بہلول لودی نے لوٹ مار شروع کر دی ۔ جس کے نتیجے میں بہت سے افغان اس کے ساتھ مل گئے ، اور کچھ عرصہ بعد ، سلطان محمد شاہ کے زمانے میں وہ سرہند پر متصرف ہو گیا ۔ پھر سلطان کے آدمیوں کو شکست دی ۔ لیکن بعد میں سلطان کی اطاعت کا دم بھرنا شروع کیا ، اور سرہند اس کی جاگیر مقرر ہوئی ۔ دو ایک مواقع پر مردانگی کے جوہر دکھانے کے سبب سلطان نے اسے خان‌خاناں کا خطاب دیا ۔ سلطان محمد شاہ کے مرنے کے بعد وہ حمید خاں کے تعاون سے ۸۵۵ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا ۔

تخت نشینی کے بعد اسے کئی ایک جنگیں لڑنی پڑیں ۔ آخری مرتبہ دھلی سے گوالیار کی طرف کوچ کیا ۔ وھاں کے راجہ مان سے اسی لاکھ ٹنکے بطور پیشکش وصول کر کے گوالیار کی حکومت اسی کے نام کر دی اور واپس ھوا ۔ گوالیار سے اٹاوہ کی راہ دھلی جانا چاھتا تھا ، لیکن بیماری کے سبب راستہ ھی میں قصبہ بھدوالی (توابع سکیٹ) میں راھئی ملک عدم ھوا (۸۹۴ھ) ۔ اس نے ۳۸ برس آٹھ ماہ اور ۷ دن حکومت کی ۔

بقول فرشتہ ، بہلول لودی متابعت شریعت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) سے آراستہ تھا ۔ حضر و سفر میں اس کی علما و مشائخ سے صحبتیں رھتیں ، اور بیشتر اوقات ان کے ساتھ بسر کرتا ۔ افغان رؤسا کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتا اور ان کی موجودگی میں تخت پر نہ بیٹھتا ، بلکہ ایک ھی بساط پر ان کے ساتھ بیٹھتا ۔ کھانا اپنے یہاں سے نہ کھاتا ، بلکہ ھر روز کھانا اپنے کسی امیر کے گھر سے منگوا کر کھاتا ۔ سواری کے وقت ان کے گھوڑوں پر سوار ھوتا اور کہتا

”مرا از بادشاھی ،ھمین نام کافی ست“

عاقل و شجاع اور متفرس و مشہور تھا ۔ قاعدہ و رسوم جہان داری سے به خوبی آگاہ تھا ۔ معاملات میں جلد بازی سے کام نہ لیتا ، اور خلق کے ساتھ عدل و انصاف سے پیش آتا ۔

(تاریخ فرشتہ جلد اول ، صفحہ ۱۷۳ ، ۱۷۴ ، ۱۷۸ - ۱۷۹ منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۱۹۹ ، ۲۰۴)

۶ ۔ تاتار خان ۔ دریا خان لودی کا بیٹا اور سلطان بہلول لودی (متوفی ۸۹۴ھ) کے امرا میں سے تھا ۔ اسے لاہور کی صوبہ داری ملی ہوئی تھی ۔ بعد میں یوسف خان صوبہ دار ملتان کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی ۔ اور دونوں بعض پرگنات خالصہ پر متصرف ہو گئے ۔ بہلول لودی کا بیٹا شاہزادہ نظام خان اس وقت پانی پت میں تھا ۔ بہلول لودی نے شیخ سعید قرملی کو لکھا کہ تاتار خان سے علاقہ واپس لو ۔ اس نے شہزادہ نظام کو تیار کیا ۔ شاہزادہ کے پاس اس وقت اڑھائی ہزار سوار تھے ۔ اس نے پانچ سو سواروں کو تاتار خان کے علاقہ میں تاخت و تاراج کیلئے بھیجا ۔ تاتار خان کو پتا چلا تو وہ لشکر گراں کے ساتھ حرکت میں آیا ۔ ادھر شاہزادہ انبالہ پہنچا ۔ تاتار خان کے بے شمار سپاہی مارے گئے ۔ آخر میں تاتار خان بھی مارا گیا ۔

(لغت نامہ از علی اکبر دھخدا ، مطبوعہ ایران ، جلد ۲۸ صفحہ ۳۶ ، تاریخ فرشتہ ، جلد اول صفحہ ۱۷۴)

۷ ۔ کامران میرزا ۔ بابر کا لڑکا اور ہمایوں کا بھائی تھا ۔ مغل شہزادوں میں اس کی شخصیت دوسروں سے زیادہ عجیب اور دلچسپ ہے ۔ اس کی عمر عزیز کا بیش قیمت حصہ ہمایوں جیسے نیک دل بھائی کے ساتھ لڑائی اور ھیر پھیر کرتے گزرا ۔ خود اس کی بہن گلبدن بیگم اسے ان الفاظ سے یاد کرتی ہے :

''میرزا کامران ظالم برادرکش بیگانہ پرور بے رحم'' ایک اور جگہ کہتی ہے :

''از بہادری میرزا کامران ظالم بے رحم ، ھندال شہید شد'' ۔

لیکن بہ قول بدایونی وہ شجاع ، صاحب ہمت عالی و جواد ، خوش طبع ، پاک مذہب اور پاکیزہ اعتقاد بادشاہ تھا ۔

ایک وقت اس پر ایسا آیا کہ اس نے اپنی پرہیزگاری کے سبب اپنی قلمرو سے انگور کی بیلیں تک اکھڑوا دیں اور پھر اتنا مے خوار ہوا کہ رنج خمار اٹھانا دشوار ہوا ۔ لیکن پھر بدایونی کے لفظوں میں ''عاقبت تائب و پارسا از عالم رفت'' ۔

کامران کابل پر حکمران تھا ، اس نے ، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا ، ہندوستان کا تخت حاصل کرنے کے لیے بیسیوں مرتبہ اپنے بھائی سے ٹکر لی ۔ کئی ایک مرتبہ شکست کھا کر فرار ہوا تو کئی ایک مرتبہ گرفتار بھی ہوا ۔ لیکن ہمایوں ہمیشہ در گزر کرتا اور اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا ۔ چناں چہ ایک موقع پر اس نے کامران کو کابل کے علاوہ پنجاب کا علاقہ بھی دے دیا ۔ جس کے شکریے میں کامران نے ایک غزل لکھ بھیجی جس کا مطلع یہ ہے :

حسن تو دمبدم افزون بادا
طالعت فرخ و میمون بادا

اس غزل پر ہمایوں نے اسے حصار فیروزہ انعام میں دیا ۔

۹۵۳ھ میں ہمایوں نے کابل پر قبضہ کر لیا اور کامران اہل و عیال سمیت بھکر کی طرف فرار ہو گیا ۔ ۹۵۴ھ میں اس نے پھر کابل کا رخ کیا ۔ اور بہ قول جوہر آفتابچی کابل تک پہنچتے پہنچتے اس نے کئی ایک امرا وغیرہ کو قتل یا اندھا کر دیا ۔ کابل کا حاکم محمد علی تغائی بھی اس کے ہاتھوں قتل ہوا ، اور یہیں شہزادہ اکبر (ہمایوں کا بیٹا جلال الدین اکبر) دوسری مرتبہ اس کے ہاتھ لگا ۔ ہمایوں نے اس کا محاصرہ کیا ۔ جب توپوں سے مقابلہ شروع ہوا تو کامران نے اپنے لوگوں سے کہا کہ ''بادشاہ کے بیٹے محمد اکبر کو گولوں کے مقابلے میں بٹھا دیا جائے ۔'' جب بادشاہ کو یہ خبر ملی تو حکم دیا کہ گولہ باری موقوف کر دی جائے ۔ تین ماہ تک محاصرہ رہا ۔ آخر ایک رات کامران قلعہ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا ۔

هندال اس کے تعاقب میں نکلا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ میرزا کامران ایک آدمی کی پشت پر سوار ہو کر جا رہا ہے۔ ہندال نے اسے گرفتار کرنا چاہا لیکن اس نے کہا کہ اگر تم مجھے گرفتار کرکے بادشاہ کے پاس لے جاؤ گے تو وہ مجھے قتل کر دے گا مگر اس سے تمہیں کیا فایدہ ہوگا۔ اس سے میرزا ہندال کا دل بھر آیا۔ اسے ایک گھوڑا دیا اور وہیں سے واپس ہوا۔

اسی سال کامران نے پھر حملہ بولا۔ اس میں اس کے بہت سے آدمی مارے گئے۔ ہمایوں نے خون خرابے سے بچنے کے لیے ایک نجومی نصیب نامی کو خط دے کر کامران کے پاس بھیجا۔ لیکن بجائے صلح صفائی کے اس نے لڑائی کی ٹھانی۔ بادشاہ نے مورچہ بندی سخت کر دی۔ آخر عاجز آ کر اس نے بادشاہ سے صدر صاحب کو بھیجنے کے لیے کہلا بھیجا۔ ہمایوں نے اپنے خانساماں خواجہ جلال الدین محمود کے ہاتھ ایک گھوڑا مع رکاب، خلعت، زرہ بکتر، ایک شطرنجی اور دوسری اشیا بطور تحفہ اس کے پاس بھجوائیں۔ کامران نے یہ تمام چیزیں تعظیم کے ساتھ قبول کیں۔ خلعت زیب تن کی۔ بعد میں میرزا کامران ہمایوں کی خدمت میں باریاب ہوا۔ ہمایوں نے بڑی خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔ دونوں بھائی بغل گیر ہو کر روئے۔ پھر چاروں بھائیوں (ہمایوں، ہندال، عسکری اور کامران) نے مل کر کھانا کھایا۔ لیکن بعد میں پھر کسی بنا پر یہ بگڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ ۹۵۷ھ میں اس نے درۂ قبچاق میں ہمایوں سے جنگ کی۔ اس جنگ میں ہمایوں کے سر پر تلوار کا زخم لگا۔ اور اس نے پھر کابل پر قبضہ کر لیا۔

آخری بار ۹۵۸ھ میں پھر شترکران کے قریب ہمایونی فوجوں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ لیکن اس نے شکست کھائی اور بھاگ کر افغانوں کی پناہ میں چلا گیا۔ ۹۶۱ھ میں ہمایوں نے افغانوں کو شکست دی تو کامران، سلطان آدم کے پاس پناہ گزیں ہوا۔ سلطان مذکور نے ہمایوں کو اس کی اطلاع دے دی۔ ہمایوں سلطان آدم کے علاقے میں پہنچا اور پانچویں صفر ۹۶۲ھ کو کامران نہایت ادب کے ساتھ باریاب ہوا۔

ھمایوں نے اشارے سے اپنی دائیں جانب بٹھایا ۔ پھر رات کو جشن شاھانہ منایا ۔ چوتھے روز امرا کے کہنے پر ھمایوں نے کامران کے آدمیوں کو اس سے جدا کر دیا ۔ اور چند ایک آدمی ، جن میں جوھر آفتابچی بھی تھا ، اس کی خدمت پر متعین ھوئے ۔ امرا نے ھمایوں کو اسے (کامران) ختم کر دینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جب تک وہ زندہ رہے گا ملک میں امن قائم نہ ھوسکے گا ۔ لیکن ھمایوں نے اپنی فطری رحم دلی کے سبب یہ نہ مانا ۔ البتہ مجبوری کے عالم میں یہ حکم دیا کہ اس کی آنکھوں میں نشتر لگایا جائے ۔ جب ھمایوں کا آدمی اس حکم کے ساتھ اس کے پاس پہنچا تو اس (کامران) نے کہا ''پھر مجھے قتل کیوں نہیں کر دیتے'' ۔ بعد میں مقررہ آدمی نے رومال لپیٹ کر گیند بنائی اور مرزا کے منہ میں اس زور سے ٹھونسی کہ اس نے بے اختیار ھو کر ھاتھ پھیلا دیے ۔ پھر اسے گرفتار کرکے خیمے سے باھر لایا گیا اور لٹا کر اس کی آنکھوں میں نشتر چبھو دیا گیا ۔ بہ قول جوھر کم و بیش پچاس نشتر لگائے گئے ، لیکن میرزا نے زبان سے اف تک نہ کی ۔ نشتر کے بعد آنکھوں میں نمک چھڑکا گیا جس کے سبب شدت درد سے اس کی زبان سے 'اللہ اللہ' نکلا ۔

اس کے کچھ عرصہ بعد کامران نے ھمایوں سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی ۔ جوھر کے مطابق وہ ۹۶۲ھ میں مکہ معظمہ روانہ ھوا ۔ بہ قول فرشتہ اس نے تین حج کیے ، اور ۱۱ ذی الحج ۹۶۴ھ کو وھیں فوت ھوا ۔ بدایونی نے چار حج لکھے ھیں ۔

کامران شاعر بھی تھا ۔ بہ قول بدایونی ''اس کے شعر کافی مشہور ھیں'' ۔ مدت ھوئی اس کا دیوان پروفیسر محفوظ الحق نے مرتب کرکے مبسوط مقدمہ کے ساتھ کلکتہ سے شائع کیا تھا ۔

(تذکرۃ الواقعات یا ھمایوں نامہ از جوھر آفتابچی اردو ترجمہ مطبوعہ کراچی صفحہ ۱۵۲ ببعد ، ھمایوں نامہ از گلبدن بیگم مرتبہ پروفیسر سالک مطبوعہ لاھور صفحہ ۱۴۷ ، تاریخ فرشتہ جلد اول صفحہ ۲۴۱ ، منتخب التواریخ از بدایونی ، اردو ترجمہ منتخب التواریخ صفحہ ۳۰۲ ، راقم کا مضمون 'کامران میرزا کا کلام' مطبوعہ سنڈے امروز لاھور ۱۴ فروری ۱۹۶۰ع) ۔

۸ - اعتمادالدوله - میرزا غیاث بیگ تہرانی - باپ کا نام خواجه محمد شریف اور تخلص هجری تها - خواجهٔ مذکور شروع میں تاتار سلطان ولد محمد خان شرف‌الدین اوغلی تکلو (خراسان کا بیگلر بیگی تها) کا وزیر تها - شاه طہماسپ صفوی نے اسے یزد کی وزارت پر ، پهر اصفهان کی وزارت پر مامور کیا - یه (خواجه) ۹۸۳ھ میں فوت هوا -

اعتمادالدوله جس کا نام میرزا غیاث‌الدین محمد (معروف به غیاث بیگ) تها ، اپنے باپ کے مرنے کے بعد ناسازگاریٔ زمانه کے سبب بیوی ، دو بیٹوں اور ایک بیٹی کے ساتھ وارد هند هوا - راسته میں سامان لٹ گیا اور صرف دو خچر سواری کے ره گئے ، جن پر باری باری سوار هو کر یه لوگ قندهار پہنچے - یہاں دوسری لڑکی مہرالنساء (نور جهاں) پیدا هوئی - کچھ عرصه بعد ملک مسعود تاجر قافله باشی نے اعتماد کو اکبر کے دربار میں ملازمت دلوا دی -

اپنے حسن خدمت کے سبب جلد هی تین صدی منصب کو پہنچا - اکبر کے ۴۰ ویں سال جلوس دیوانیٔ کابل پر نامزد هوا - پهر بتدریج هزاری اور دیوانی بیوتات کے منصب حاصل کیے - جب جهاں گیر تخت نشین هوا تو اس نے آغاز هی میں اسے اعتمادالدوله کا خطاب عطا کیا - اور میرزا جانی بیگ وزیرالملک کے ساتھ دیوانئی سرکار میں شریک کیا -

۱۰۱۶ھ میں اس کے بیٹے محمد شریف نے شهزاده خسرو کو قید سے رهائی دلانے کے لیے کچھ لوگوں کا ساتھ دیا - راز کهلنے پر جهاں گیر نے شریف کو مروا ڈالا - اعتماد ، دیانت خاں کے گهر میں محبوس هو گیا - آخر دو لاکھ روپیه جرمانه دے کر چهٹکارا پایا -

۱۰۲۰ھ میں جهاں گیر نے مہرالنسا سے شادی کی ، تو اس نسبت خاص کی تقریب میں اسے وکالت کل کے علاوه ۶ هزاری ۳ هزار سوار منصب اور علم و نقاره عطا کیا - ۱۰۳۱ھ میں اس پر بیماری کا حمله هوا - حالت خراب هوئی تو جهاں گیر اس کی عیادت کو گیا - سکرات کا عالم طاری تها ، کبهی بے هوش هوجاتا تو کبهی افاقه - نور جهاں نے جو اس وقت

جہاں گیر کے ساتھ تھی ، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باپ سے کہا ، انھیں پہچانتے ہیں ؟ اس (اعتماد) نے جواب میں انوری کا یہ شعر پڑھا :

آنکه نا بینای مادر زاد اگر حاضر شود
در جبین عالم آرایش به بیند مہتری

اور کوئی دو تین گھنٹے بعد فوت ہو گیا ۔ اس کے ۱۴ فرزندوں اور عزیزوں وغیرہ کو ماتمی خلعت عطا ہوئے ۔

اعتمادالدولہ اگرچہ شعر نہیں کہتا تھا لیکن شعراء متقدمین کا بڑا تتبع کرتا تھا ۔ انشا میں اسے یدطولیٰ حاصل تھا ۔ خط شکستہ کو 'متین و آبدار' لکھتا ۔ بڑا زندہ دل ، رنگین صحبت اور شگفتہ رو تھا ۔ جہاں گیر کہا کرتا تھا کہ "اس کی صحبت ہزار مفرح یاقوتی سے بڑھ کر ہے" ۔ معاملہ فہم و نیک اندیش ، خوش سلوک ، پسندیدہ معاش ، بڑا عاقبت بیں اور سلیم النفس تھا ۔ دشمن کے ساتھ بھی کبھی عداوت نہ کرتا ۔ غصہ و طیش تو اس میں گویا تھا ھی نہیں ۔ زنجیر و بند ، تازیانہ اور دشنام وغیرہ کا اس کے گھر میں کوئی نشان بھی نہ تھا ۔ اگر کوئی شخص واجب‌القتل بھی ہوتا تو جیسے ہی وہ اس سے التجا کرتا یہ اسے معاف کر دیتا ۔ آسائش طلب نہ تھا ۔ اس کا تمام دن 'جز رسی' اور لکھنے میں گزر جاتا ۔ بادشاہی عمال کے محاسبے جو مدت سے التوا میں پڑے تھے اس کی دیوانی میں فیصل ہوئے ۔

(ماثرالامرا جلد اول صفحہ ۱۲۷ بعد)

۹ ۔ بادشاہ غازی عالم گیر ۔ شاہ جہان کے سولہ بچوں میں (جن میں سے ۱۴ ممتاز محل سے تھے) چھٹے درجے پر تھا ۔ مالوہ و گجرات کی انتہائی سرحد پر بمقام دوحد پیدا ہوا ۔ تاریخ پیدایش عاقل خاں رازی نے اتوار کی شب ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ ، صاحب مفتاح التواریخ نے ۱۱ ذیقعدہ ۱۰۲۸ھ (مطابق ۱۰ اکتوبر ۱۶۱۹ء) اور سید نجیب اشرف ندوی نے ۱۵ ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ (مطابق ۲۴ اکتوبر ۱۶۱۸ء) دی ہے ۔ یہی تاریخ تزک جہاں گیری میں ہے ۔ شاہ جہان اس وقت جہاں گیر کے ساتھ تھا جو احمد نگر کے سپہ سالار ملک عنبر کو شکست دے کر آ رہا تھا ۔ اورنگ زیب کی

ولادت پر شاہ جہان نے جہان گیر کو ایک ہزار اشرفی کی نذر گزرانی ۔ اس نے قبول کرتے ہوئے نومولود کا نام اورنگ زیب رکھا ۔ وہ جگہ چوں کہ جشن و ضیافت کے لائق نہ تھی اس لیے اوجین پہنچ کر جشن ولادت پوری شان و شوکت سے منایا گیا ۔ ابو طالب کلیم نے تاریخ نکالی :

داد ایزد بشاہ شاہ جہان	خانی همچو مہر عالم تاب
تاج ، صاحب قران ثانی یافت	گوہر بحر ازو گرفتہ حساب
نامش اورنگ زیب کرد فلک	تخت زین پایہ گشت عرش جناب
چون باین مژدہ آفتاب انداخت	افسر خویش بر ہوا چو حباب
طبع دریاب سال تاریخش	زد رقم "آفتاب عالم تاب"

۱۰۲۸

اسے دودھ پلانے کی خدمت میر ابوالمعالی خوافی خاں کی اہلیہ کے سپرد ہوئی ۔ تعلیم و تربیت کے متعلق مؤرخین خاموش ہیں ۔ البتہ یہ ہے کہ خرم شاہزادہ (شاہجہان) کی باغیانہ حرکات کے سبب ایک جگہ رہنا نصیب نہ ہوا ۔ ممتاز محل ساتھ ہی رہی ، جس کے سبب خانہ بدوشوں کی طرح رہے ۔ ۱۰۳۶ھ کی ابتدا میں خرم اور جہانگیر میں مصالحت ہوئی تو اورنگ زیب اور دارا شکوہ دادا کے پاس لاہور بھیج دیے گئے ۔ شاہجہان کی تخت نشینی (۱۰۳۷ھ) پر انہیں آگرہ بلا لیا گیا ۔

اورنگ زیب کے تبحر علمی سے پتا چلتا ہے کہ اس کی تعلیم اعلیٰ پیمانے پر ہوئی تھی ۔ اس نے تمام متداول کتب کا مطالعہ کیا تھا ۔ عربی اور فارسی میں اسے پوری پوری مہارت حاصل تھی ۔ ہندی میں بھی کچھ نہ کچھ شد بد تھی اور ترکی سے بھی بیگانہ نہ تھا ۔ اس کے اساتذہ میں مولانا عبداللطیف سلطان پوری ، ہاشم گیلانی ، ملا موہن بہاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ کئی دیگر علما و فضلا سے بھی استفادہ کیا ۔ ۴۳ برس کی عمر میں قرآن کریم حفظ کیا ۔ حفظ

کی ابتدا کی تاریخ آیت کریمہ 'سنقرئک فلاتنسی' ۱۰۷۱ھ (۱۶۶۱ء) اور اختتام 'لوح محفوظ' ۱۰۷۲ھ (۱۶۶۲ء) ہے -

صاحب 'عالمگیر نامہ' کا کہنا ہے کہ "اس نے علوم دینیہ مثلاً حدیث ، فقہ ، تفسیر عربیہ ، فقہ شریف حنفیہ وغیرہ کے تتبع میں کمال حاصل کیا اور احیاءالعلوم ، کیمیائے سعادت اور اس قسم کی دیگر تصانیف کا مطالعہ کیا" - صحیح تعلیم ہونے کے سبب اس نے اسلام کی حقیقی روح کو پا لیا تھا - شریعت کے ساتھ طریقت کی راہ اختیار کی - چنانچہ بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق مجددؒ کے خلیفہ اور صاحبزادہ حضرت محمد معصوم سے شرف بیعت حاصل تھا -

اس کے لڑکپن کا مشہور واقعہ ایک مست ہاتھی سے اس کی لڑائی ہے - ۲۹ ذیقعدہ ۱۰۴۲ھ (۲۸ مئی ۱۶۳۳ء) کو شاہجہان مست ہاتھیوں 'سدھکر' اور 'صورت سندر' کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا - اس وقت ۱۴ سالہ اورنگ زیب ، اور دارا و شجاع بھی موجود تھے - مؤخرالذکر ہاتھی بھاگ کھڑا ہوا - سدھکر نے اس کا تعاقب کرتے ہوئے مجمع کی طرف رخ کیا - ہجوم میں سب سے آگے اورنگ زیب کا گھوڑا تھا - جونہی ہاتھی اس کے پاس پہنچا اس (اورنگ زیب) نے اس پر زور کا وار کیا - ہاتھی چوٹ کھا کر غصے میں لپکا ، دوسرے لوگوں کے پہنچنے کے باوجود اس نے اس کے گھوڑے پر دانتوں سے حملہ کر دیا ، گھوڑا لڑکھڑا کر گرا - اورنگ زیب اچک کر کھڑا ہوا اور تلوار نیام سے کھینچ لی - اتنے میں دوسرے لوگ بھی پہنچ گئے - ادھر سندر نے عقب سے آ کر حملہ کر دیا ، جس سے سدھکر بھاگ کھڑا ہوا - جس وقت اورنگ زیب باپ کے پاس پہنچا تو اس نے اسے آغوش شفقت میں لے لیا اور بہت زیادہ عنایت اور خطاب بہادری سے نوازا -

۱۰۴۴ھ میں ۱۰ ہزاری ذات و ۴ ہزار سوار منصب کے ساتھ علم ، نقارہ ، تومان طوغ اور خیمہ سرخ پایا -

پہلی لڑائی بندیل کھنڈ میں لڑ کر وہاں کے حکمران ججھار سنگھ کو شکست دی - جب شاہ جہان نے دکن کے معاملات ٹھیک کر لیے

تو اسے ۱۰۴۵ھ میں وہاں کی نظامت دے دی ۔ آٹھ سال تک وہاں رہا ، اور اس علاقے کو باغیوں اور رہزنوں سے پاک کیا اور بکلانہ وغیرہ کا اضافہ کیا ۔ اندرون ملک کے انتظام و آبادی کی کوشش میں کامیاب ہوا اور ترقی پا کر ۱۵ ہزاری ذات و ۱۰ ہزار سوار ، شش ہزار سوار دو اسپہ و سہ اسپہ تک پہنچا ۔

۲۳ ذی الحجہ ۱۰۴۶ھ کو نواب شاہنواز کی لڑکی 'دل رس بانو' سے شادی ہوئی ۔ چار لاکھ روپیہ مہر مقرر ہوا ۔ اس محل خاص کے علاوہ دیگر بیگمات یہ ہیں : (۱) نواب بائی، اس کا نام رحمت النسا بیگم تھا اور کشمیر کی ریاست رجوری کے راجہ کی صاحبزادی تھی ۔ (۲) اورنگ آبادی محل اور (۳) اودے پوری محل ۔ چاروں بیگمات سے اولاد تھی ۔ ان بیگمات کے علاوہ تین 'پرستاران قدیم' بھی تھیں ، جن میں زیادہ اہم زین آبادی محل ہے جو چند ماہ بعد ہی فوت ہو گئی ۔

۱۰۵۴ھ میں اسے کسی بات پر معزول کر دیا گیا ۔ پھر جہاں آرا کی سفارش پر اس کے قصور معاف ہوئے ، اور پہلے منصب پر پہنچا اور بہت سا انعام پایا ۔ اسی سال گجرات کا صوبہ دار بنایا گیا ۔ ۱۰۵۵ھ میں احمد آباد پہنچا اور ایک سال رہ کر ۱۰۵۶ھ میں لاہور آیا ۔ منصب میں ترقی ہوئی اور بدخشاں کا گورنر مقرر ہوا ۔ ۱۰۵۹ھ میں سندھ کا صوبہ ملا ۔ ۱۰۶۳ھ میں پھر دکن کا صوبہ دار بنا ۔ پھر بھائیوں کے ساتھ تخت نشینی کے لیے جنگ کی ۔

ابتدا ہی میں اس نے بھائیوں کے خلاف بادشاہ ہونے کا اعلان نہیں کیا تھا ، بلکہ شاہجہان کو دارا کے ہاتھ سے آزاد کرکے اس کو صاحب اختیار بنانا چاہتا تھا ۔ جب شاہجہان کو اپنا دشمن پایا تو مجبوراً یکم ذیقعدہ ۱۰۶۸ھ بروز جمعہ (۲۱ ، ۲۳ جولائی ۱۶۵۸ء) شالامار باغ (دہلی) میں سرسری طور پر تخت نشینی کے مراسم ادا کیے ۔ بعد ازاں پنجاب کی طرف روانہ ہوا ۔ شاہجہان سے مایوس ہو کر ۲۴ رمضان ۱۰۶۹ھ (۵ جون ۱۶۵۹ء) کو رسم تخت نشینی تزک و احتشام سے منائی ۔

تخت نشینی کے بعد اس کا زیادہ تر وقت دکن کی مہمات پر صرف ہوا ۔

خاص طور پر مرہٹوں نے (سیوا جی کے حال میں اس کا ذکر آ چکا ہے) اسے خاصا پریشان رکھا ۔ اس نے بہت سی اصلاحات کیں ۔ مثلاً

(۱) بہت سے ناجائز ٹیکس موقوف کیے ۔

(۲) اکبر کے بندوبست اراضی و قانون مالگزاری میں ترمیم و اصلاح کرکے ایک جدید دستورالعمل تیار کیا ۔

(۳) عہدہ داروں کے مرنے پر ان کی جائداد و مال کی ضبطی سرے سے موقوف کی ۔

(۴) ۱۰۸۲ھ میں فرمان نافذ کیا کہ تمام اضلاع میں سرکاری وکیل مقرر کیے جائیں اور عام منادی کرا دی جائے کہ جس کسی کو بادشاہ پر کوئی دعویٰ ہو، پیش کرے اور سرکاری وکیل اس کی جواب دہی کرے اور اس کا حق ثابت ہو تو سرکاری وکیل سے اپنا مطالبہ وصول کرے ۔

(۵) واقعہ نگار اور پرچہ نویس مقرر کیے جو کونے کونے کی خبر پہنچاتے ۔

(۶) پیشکش اور نذرانہ کی رسم ختم کی ۔

(۷) عدل و انصاف قائم کیا ۔ اس میں عزیز و بیگانہ ، غریب ، امیر ، دوست ، دشمن کی کچھ تمیز نہ تھی ۔

(۸) بادشاہ پرستی (سجدہ وغیرہ) ختم کی ۔

(۹) درشن کا طریقہ ۱۰۷۹ھ میں قطعاً بند کیا ۔

(۱۰) شاعری کے عہدے کی تخفیف کی ۔

(۱۱) تکلفات سلطنت ہٹائے ۔

(۱۲) دربار میں کسی کو سلام کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا تھا ، اس لیے لوگ صرف سر پر ہاتھ رکھ دیتے تھے ۔ ۱۰۸۲ھ میں حکم دیا کہ اس کی بجائے ' السلام علیکم ' کہا جائے ۔

(۱۳) جیب خاص کے مصارف کم کیے ۔ اس نے بڑی سادہ اور زاہدانہ زندگی بسر کی ۔

(۱۴) تعلیم کی ترقی کے لیے ہر شہر اور قصبے میں علما و فضلا کے وظیفے روزانے مقرر کیے جس کے سبب وہ مطمئن ہو کر تعلیم و تعلم میں مصروف رہتے ۔ طلبا کے لیے بھی وظائف مقرر کیے ۔

(۱۵) پارسیوں کی تقلید میں پہلے سنہ خورشیدی رائج تھا ۔ اس نے سنہ قمری رائج کیا ۔

(۱۶) گانا بجانا بند کیا ۔

(۱۷) اماموں وغیرہ کو سرکاری خزانے سے تنخواہیں دیں ۔

(۱۸) تخت نشینی کے ایک سال بعد (۱۰۶۹ھ) فتاویٰ کی کتاب تیار کرائی ۔ پروفیسر جدو ناتھ سرکار اس کے عہد حکومت کے متعلق رقم طراز ہیں :

" (اورنگ زیب کا دور حکومت (۱۶۵۸–۱۷۰۷ء) ہمارے ملک کا اہم ترین تاریخی زمانہ ہے ۔ یہ اسی بادشاہ کا ورود مسعود تھا جب کہ حکومت مغلیہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچی ۔ اور ابتدائے عہد تاریخ سے برطانوی حکومت کے قیام تک کے زمانہ میں شاید یہ واحد حکومت ہے جس نے اتنی وسعت حاصل کی ۔ غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے لے کر کرناٹک تک تمام ملک ایک ہی فرمانروا کے زیر نگیں تھا ، اور لادک و مالابار کے دور دراز مقامات پر بھی اسی بادشاہ کا خطبہ پڑھا جاتا تھا ۔ اسلام کی آخری سب سے بڑی ترقی کا یہی زمانہ تھا ۔ اس طرح سے جو حکومت قائم ہوئی تھی ایک سیاسی وحدت تھی ، اس کے مختلف قطعات پر ماتحت حکمرانوں کا تسلط نہ تھا ، بلکہ بلاواسطہ بادشاہ کے ماتحت تھے اور اس حیثیت سے اورنگ زیب کی ہندوستانی حکومت اشوک ، سمدر گپت کی حکومت سے وسیع تر تھی ۔ اس وقت تک کسی صوبہ کے گورنر نے سر نہ اٹھایا تھا ۔ اگرچہ کہیں کہیں علم بغاوت بلند کیا گیا ، لیکن کسی صوبہ میں بھی کوئی شخص ایسا پیدا نہ ہوا جو شہنشاہ دھلی کے حکام سے سرتابی کر سکتا ۔"

' این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا ' کے مؤلفین کے مطابق " بعض لوگ صرف اس کی خامیوں ہی کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ وہ بہت سی

خوبیوں کا مالک تھا ۔ بھائیوں کے ساتھ جنگ میں وہ قصوروار نہیں ، کیونکہ کوئی بھی بھائی معاملہ نپٹانے کو تیار نہ تھا ، جس کے سبب یہ جنگ ناگزیر تھی ۔ اگرچہ اس نے اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ سخت برتاؤ کیا ، لیکن انصاف کی رو سے دیکھا جائے تو کم از کم وہ ' پدر کش ' نہ تھا ، جس کی مثالیں ہمیں تاریخ میں بے شمار ملتی ہیں ۔ یہ بھی یاد رہے کہ جہاں شاہجہاں نے تخت کے لیے اپنے تمام متوقع حریفوں کو اپنی راہ سے ہٹا دیا ، وہاں اورنگ زیب نے اپنے تمام بھتیجوں کو قتل نہیں کیا ۔ اس کی زندگی سادہ ، ریاضت کش اور زاہدانہ تھی ۔ وہ اپنے نفس کا غلام نہ تھا ۔ وہ کھانے پینے اور پہننے والی ان تمام اشیاء سے دور رہتا جو مذہب میں حرام تھیں ۔ جرأت و بے باکی ، عزم بالجزم اور انتھک فعالیت اس کی نمایاں خصوصیات ہیں......... ۔''

اس کے متعلق حکیم الامت علامہ اقبال فرماتے ہیں :

درمیان کارزار کفر و دین — ترکش ما را خدنگ آخرین
کور ذوقان داستانہا ساختند — وسعت ادراک او نشناختند
برق تیغش خرمن الحاد سوخت — شمع دین در محفل ما بر فروخت
شعلۂ توحید را پروانہ بود — چون براہیم اندرین بتخانہ بود
در صف شاہنشہان یکتا ستی — فقر او از تربتش پیدا ستی

عالم گیر نے جمعہ ۲۸ ذی القعدہ ۱۱۱۸ھ کو احمد نگر (دکن) میں وفات پائی ۔ اس کی لاش اورنگ آباد (جسے اس نے دوران شاہزادگی ۱۰۳۸ھ میں آباد کیا تھا) لا کر قلعہ دولت آباد کے قریب دفن کی گئی ۔

(توزک جہانگیری ، اردو ترجمہ صفحہ ۵۲ ۔ واقعات عالمگیری از عاقل خاں رازی مرتبہ محمد عبداللہ مطبوعہ لاہور صفحہ ۳ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۲٦۳ ، ۲۹۳ ، ۲۹۴ ۔ 'اورنگ زیب' از پروفیسر جادوناتھ سرکار بحوالہ مقدمہ رقعات عالمگیر ، صفحہ ۱۱۸ ۔ مقدمہ رقعات عالمگیر از سید نجیب اشرف ندوی مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ۱۲۰ ۔ ۳۸٦ ۔ اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر صفحہ ۱۱٦—۱۱۸ ۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری ... ... ، صفحہ ۵۰۸ ، ۵۰۹ ۔ اسرار و رموز از علامہ اقبال صفحہ ۱۱۲ ، ۱۱۳)

۱۰- سد سکندری - سکندر ذوالقرنین نے یہ دیوار بنوائی - اگرچہ بعض ایرانی شعرا نے سکندر رومی کو ذوالقرنین کہا ہے ، لیکن در حقیقت ذوالقرنین ایک دوسری شخصیت ہیں جو بقول عبد اللہ بن عمر رض انبیائے مرسل میں سے تھے - اور بعض کا کہنا ہے کہ وہ حضرت صالح ؑ کے بعد اور حضرت ابراہیم ؑ سے پہلے مبعوث ہوئے -

ان کا محل اقامت 'دیار فرنگ' تھا - بڑی وسیع و عظیم سلطنت کے مالک تھے - کفار کے ساتھ کئی محاربات کیے - پہلے بیت المقدس پہنچے ، وہاں سے مشرق کا رخ کیا اور یاجوج و ماجوج کے علاقے کے قریب آ پہنچے - اس علاقے کے لوگ یاجوج و ماجوج کے ظلم و ستم سے تنگ آئے ہوئے تھے - انہوں نے ان سے شکایت کی - ذوالقرنین نے ان دو پہاڑوں کے درمیانی راستے میں جو یاجوج و ماجوج کی گزر گاہ تھی ، ایک سد بنانے کو کہا - اس کی بنیادوں میں بڑے بڑے پتھر ڈال کر زمین کے برابر ہموار کیا گیا - پھر لوہا ، تانبا اور سیسہ وغیرہ اینٹوں کی مانند ایک دوسرے پر رکھ کر پگھلایا گیا جو ایک دیوار کی طرح بن گیا اور یہ دیوار ان پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ گئی - پھر اسی طرح یہ تینوں دھاتیں پگھلائی گئیں اور دیوار میں جہاں جہاں کوئی رخنہ وغیرہ رہ گیا تھا ، اسے ان سے پر کیا گیا - اس کی لمبائی ۳۵۰ فرسخ ، چوڑائی ۵۰ میل اور ارتفاع ۲ ہزار آٹھ سو 'ارش' ہے - لیکن روضۃ الصفا کے مؤلف کے مطابق محمد منجم فرغانی اور کچھ حکمائے متاخرین نے اس قول کو دلائل کے ساتھ جھوٹا ثابت کیا ہے -

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانے میں اس دیوار میں کچھ شگاف پڑ گئے تھے - نیز یہ کہ یہ جو منگول وغیرہ تھے ، تو یہ یاجوج و ماجوج ہی کی اولاد سے تھے -

(روضۃ الصفا جلد اول صفحہ ۳۱ ، ۳۲)

۱۱- پتھر کی مسجد - اس سے مراد شاہی مسجد ہے جو قلعۂ لاہور کے بالمقابل واقع ہے - اسی کے قریب حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے - یہ مسجد عالمگیر نے مکہ کی مسجد

'الولید' کے نمونے پر ۱۰۸۲ھ (۱۶۷۳ء) میں بنوائی تھی - فدائی خاں کوکہ کی زیر نگرانی اس کی تعمیر ہوئی - اس پر کوئی چھ لاکھ روپیہ خرچ آیا -

اس مسجد کے لیے عبری نام کا پتھر کابل سے منگوایا گیا تھا - دروازے میں داخل ہوتے ہی اوپر بالا خانے کے ایک کمرے میں آنحضرت صلعم ، حضرت علی رض اور حضرت فاطمۃ الزہرا رض وغیرہم کے کچھ تبرکات ہیں جو بقول فقیر سید عزیزالدین ، تیمور ۸۰۳ھ میں دمشق سے لایا تھا - پھر یہ تبرکات بابر ہندوستان لایا اور اس طرح مختلف مرحلے طے کرکے یہ تبرکات لاہور پہنچے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو لاہور از سید لطیف حاشیہ صفحہ ۱۱۶)

(لاہور از لطیف صفحہ ۱۱۳)

۱۲ - وزیر خاں - حکیم علیم الدین نام ، چنیوٹ (پنجاب) میں پیدا ہوا - طبابت میں بڑی مہارت تھی -

عنفوان جوانی میں شاہزادہ خرم (شاہجہاں) کے ملازموں میں شامل ہوا - طب میں مہارت کے سبب جلد ہی شاہزادہ کی قربت حاصل ہوئی - شاہزادہ نے عدالت عسکر کی داروغگی پر مامور کیا - اپنی دیانت و معاملہ فہمی سے شاہزادہ کے دل میں گھر کر لیا - رانا کی مہم میں ، جو دیوان بیوتات تھا ، کارہائے نمایاں سرانجام دیے اور اس طرح 'پایۂ عمدگی و ترق' پایا - جن دنوں شاہزادہ اور جہانگیر کی آپس میں کچھ چپقلش تھی ، یہ شاہزادہ کے ہمرکاب رہا - اس دوران میں اس نے شاہزادہ سے کسی چیز کا بھی مطالبہ نہ کیا ، بلکہ جو کچھ اس مدت میں اکٹھا کیا تھا ، یعنی تقریباً دس بارہ لاکھ روپیہ ، شاہی خرچ کے لیے اس کے سپرد کر دیا - اقامت جنیر کے دوران سرکار شاہزادہ کی دیوانی پائی اور اس وقت مہابت خاں کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی امیر نہ تھا -

شاہجہاں کی تخت نشینی کے دن ۵ ہزاری ذات ، ۳ ہزار سوار منصب ، علم ، نقارہ اور ایک لاکھ روپیہ انعام ملا - پانچویں سال جلوس منصب

میں مزید اضافہ پا کر ۵ ہزاری، ۵ ہزار سوار تک پہنچا ۔ پھر قلعۂ دولت آباد کی تسخیر کے لیے برہان پور گیا ۔ وہاں سے واپسی کے بعد صوبۂ پنجاب کا ناظم مقرر ہوا ۔ سات سال سے زیادہ وہاں رہا ۔ ۱۳ویں سال اکبر آباد (آگرہ) کی صوبہ داری پر سرفراز ہوا ۔ وہاں دس ماہ رہا ۔

۱۰۵۰ھ میں قولنج کی بیماری سے وفات پائی ۔ کہتے ہیں ایک روز بیرون شہر سے قلعے میں جا رہا تھا ۔ جب دروازہ 'ہتیا پول' پہنچا تو گھوڑے کا پاؤں پھسلا اور یہ گر گیا اور اس کی حالت غیر ہو گئی ۔ اسی حالت میں اس نے اپنا تمام 'مال ناطق و صامت' طومار میں درج کرکے بادشاہ کے پاس بھجوا دیا ۔

بہت سے 'آثار خیر' اس سے یادگار ہیں ۔ لاہور میں حمام، بازار اور متعدد حویلیاں بنائیں ۔ جامع مسجد بنائی جس کا نام رہتی دنیا تک قائم رہے گا ۔ یہ مسجد، مسجد وزیر خاں کے نام سے مشہور اور پرانی کوتوالی کے نزدیک واقع ہے ۔ مشہور شہر وزیر آباد بھی اسی کا بنا کردہ ہے ۔ چنیوٹ میں پختہ اینٹوں کا قلعہ اور پتھر کی عمارات وغیرہ بنوائیں ۔ علاوہ ازیں وہاں مساجد، سرائے، مدرسہ، دارالشفا اور کنوئیں وغیرہ بنوا کر لوگوں کے لیے وقف کیے ۔ اپنے وطن (چنیوٹ) کو اس نے اس طرح آراستہ کیا کہ بر صغیر کے کسی دوسرے امیر کو یہ سعادت نصیب نہ ہوئی ۔ لیکن اسے اپنا وطن دیکھنا نصیب نہ ہوا ۔ اگرچہ ہمیشہ اس آرزو میں رہا ۔

بڑا سلیم النفس اور 'یک پہلو' (منافقت سے پاک) تھا ۔ تمام زندگی سادگی اور بے تکلفی میں بسر کی ۔ اس کا بیوتات و پوشاک کا خرچ بہت کم تھا ۔ لاہور میں ہر قسم کی خرید و فروخت اکثر اس کی سرکار سے ہوتی تھی جس کے سبب اس نے خاصی دولت کمائی ۔ لیکن 'افسوس کہ کرم و جود نداشت' اور ایک ہی حرف سے اس کا حال متغیر ہو جاتا ۔ اور غصہ بھی جلد ہی اتر جاتا ۔ بہت زیادہ ارادت و دولت خواہی کے سبب کار بادشاہی کو عبادت الٰہی کی مانند جانتا تھا ۔
(مآثرالامرا جلد سوم صفحہ ۹۳۳ ببعد)

۱۳ - جامع مسجد (وزیرخاں)۔ یہ مسجد لاہور میں دھلی دروازہ کے اندر چوک پرانی کوتوالی کے نزدیک واقع اور مسجد وزیر خاں کے نام سے مشہور ہے۔ علم الدین (مآثرالامرا میں علیم‌الدین ہے) انصاری مخاطب بہ وزیر خاں نے ۱۰۴۴ھ(۱۶۳۴ء) میں بنوائی۔ بہ قول چشتی ۱۰۵۱ھ میں مکمل ہوئی۔

اگرچہ خود وزیر خاں کا تعلق پنجاب سے تھا ، لیکن اس مسجد کا طرز تعمیر ایرانی اور مغلیہ طرز کا امتزاج ہے۔ بقول سید لطیف یہ مسجد شہر کا سب سے بڑا زیور اور فن تعمیر کا حسین‌ترین و پرعظمت نمونہ ہے۔ چشتی لکھتے ہیں ''اب تک معائنہ مسجد سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ابھی معمار فراغت کرکے اترے ہیں۔ کیوں‌کر نہ ہو نیت بانی اس قدر بالخیر تھی کہ بتلاش تمام کارگزاراں یعنی معمار و مزدور وغیرہ ایسے بہم پہنچائے تھے کہ جنھوں نے مدت العمر ایک نماز بھی دیدہ و دانستہ قضا نہ کی تھی۔'' مسجد سے لے کر دھلی دروازہ تک دونوں طرف تمام دکانیں اور مکان وزیر خاں کی ملکیت تھے جو اس نے مسجد کے لیے وقف کر رکھے تھے۔

اس کے علاوہ ایک سرائے اور حمام کی ، جو دھلی دروازہ کے نزدیک تھے ، آمدنی بھی اسی مقصد کے لیے تھی۔ بعد میں یہ مکانات وغیرہ لوگوں نے خرید لیے۔ اب صرف مسجد کے نیچے جو دکانیں وغیرہ ہیں ان کی آمدنی اس پر صرف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جب سے محکمۂ اوقاف وجود میں آیا ہے ، اس کی دیکھ بھال اس محکمہ کے سپرد ہے۔

('لاہور' از سید لطیف مطبوعہ ۵۷ - ۱۹۵۶ء صفحہ ۲۱۴ ، ۲۱۶ - تحقیقات چشتی صفحہ ۶۶۵)

۱۴ - علی ھجویری۔ آپ کا نام علی اور والد کا نام عثمان بن ابو علی جیلانی غزنوی ہے۔ کنیت ابوالحسن اور عرف عام میں 'داتا گنج بخش' کے لقب سے مشہور ہیں۔ اصل آپ کی غزنین سے ہے۔ غزنیں میں دو محلے تھے جلاب اور ھجویر۔ چونکہ آپ ان دونو محلوں میں رہے ، اس لئے ان کی نسبت سے جلابی اور ھجویری بھی کہلائے۔ پھر چونکہ آخر میں لاھور میں سکونت پذیر ہوگئے اور یہیں فوت ہوئے تھے ، اس واسطے آپ کو لاھوری بھی کہا جاتا ہے۔

آپ حسنی سید تھے - آپ کا شجرہ نسب حضرت امام حسن بن علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے - شیخ ابوالفضل بن حسن الختلی (آئین اکبری میں جبلی اور تصوف اسلام میں قتلی لکھا ہے) سے بیعت تھی - ان کے علاوہ دیگر کئی بزرگوں سے بھی استفادہ کیا تھا - کشف المحجوب میں آپ نے اکثر جگہ ان مشائخ کا ذکر کیا ہے - اسی طرح بعض مشہور صوفیا مثلاً شیخ ابوالقاسم قشیری ، شیخ ابوسعید ابوالخیر وغیرہ سے آپ کی ملاقات ہوئی -

حنفی مذہب ہونے کے سبب آپ کو امام ابوحنیفہؒ سے خاص عقیدت تھی - ان کا نام ''امام امامان و مقتدائے سنیّاں ، شرف فقہا و عز علما'' کی حیثیت سے لیا اور ان کے کمالات کا بالتفصیل ذکر کیا ہے -

آپ نے مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی - شام سے لے کر ترکستان تک اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانے کی تقریباً ساری اسلامی عملداری میں گھومے - اپنے سفر عراق کے بارے میں کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ میں حدود عراق میں دنیا حاصل کرنے اور اس کے لٹا دینے میں بے طرح مشغول تھا اور بہت قرضدار ہو گیا تھا - جس کو جس چیز کی بھی خواہش ہوتی بس میری ہی طرف رخ کرتا - اور میں اس فکر میں رہتا تھا کہ کیسے سب کی خواہش پوری کروں کہ شیوخ وقت میں سے ایک شیخ نے مجھے لکھا کہ 'اے فرزند تمہیں اپنے دل کو مشغولی خدا سے ہٹا کر اس کی طرف مشغول نہ کر لینا جو مشغول ہوائے نفس ہے - ہاں اگر کوئی ایسا شخص ملے جس کا دل تم سے برتر ہو جب تو اس کی تشفی خاطر کرو ورنہ سب کے لئے اپنا دل حیران و پریشان نہ رکھو - اللہ خود ہی اپنے بندوں کے لئے کافی ہے' - بس اس وقت سے میرے دل کو قرار آگیا -''

بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی ''قید ازدواج سے معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ہمیشہ آزادی رہی - البتہ ایک مقام پر آپ بیتی یوں بیان کرتے ہیں کہ جیسے غائبانہ کسی سے تعلقات محبت قائم ہو گئے تھے اور

یہ ایک سال تک اس زخم لطیف کے بسمل بنے رہے ۔ پھر آخر اس سے نجات مل گئی'' اس سلسلے میں آپ کا بیان اتنا مجمل ہے کہ تفصیلات کا پتا نہیں چل پاتا ۔

آپ کے استعداد علمی کے متعلق تذکرہ نگاروں نے صرف اتنا لکھا ہے کہ آپ علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے ۔ بہر حال کشف المحجوب کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ دونوں قسم کے علوم پر آپ کی گہری نظر تھی ۔

بعض تذکرہ نگاروں کے مطابق آپ نے مرشد کے کہنے پر لاہور کا رخ کیا تھا ۔ چنانچہ خواجہ نظام الدین اولیا سے منقول ہے کہ آپ (خواجہ) نے فرمایا شیخ علی ھجویری اور شیخ حسین زنجانی ایک ھی پیر کے مرید تھے اور وہ اپنے زمانے کے قطب تھے ۔ حسین زنجانی مدت سے لاہور (فوائد الفواد کے مترجم نے سہاور لکھا ہے جو در اصل لہاور ہے) میں رہتے تھے ۔ کچھ مدت بعد ان کے پیر نے خواجہ علی ھجویری کو فرمایا کہ لہاور میں سکونت اختیار کرو ۔ آپ (علی ھجویری) نے عرض کی کہ شیخ حسین زنجانی جو وھاں ھیں ۔ فرمایا 'تو جا' ۔ شیخ علی ھجویریؒ فرمان کے مطابق لاھورپہنچے تو رات تھی ۔ دوسری صبح شیخ حسین کا جنازہ اٹھا ۔

آپ کے لقب 'گنج بخش' کے متعلق روایت ہے کہ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے آپ کے مزار پر چلہ کشی کی اور جب فیض و برکت سے مالا مال ہو کر رخصت ہونے لگے تو مزار کے رخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا ۔

''گنج بخش ھر دو عالم مظہر نور خدا
کاملاں را پیر کامل ناقصاں را رہنما''

(آپ کے مزار مبارک پر اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح کندہ ہے :

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا)

آپ کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے ۔ بقول دارا شکوہ ۴۵۶ھ اور

بعض کے مطابق ۴۶۴ھ ہے۔ لیکن مزار پر جو قطعۂ تاریخ درج ہے اس میں ۴۶۵ھ درج ہے۔ آپ لاہور ہی مدفون ہوئے۔

آپ کے مزار پر ہزاروں کی تعداد میں لوگ ہر روز حاضری دیتے ہیں۔ دارا شکوہ لکھتا ہے کہ ''جمعہ کی شب بہت لوگ وہاں آتے ہیں۔ مشہور ہے جو کوئی مسلسل چالیس جمعہ کی راتوں یا دنوں کو وہاں طواف کرے اس کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔'' چند برسوں سے جب سے کہ محکمہ اوقاف وجود میں آیا ہے، اور آپ کے مزار کا انتظام اس محکمہ نے سنبھالا ہے، مزار کی حالت میں نمایاں تبدیلی ہوئی ہے۔ عورتوں کے لئے بالکل الگ انتظام کر دیا گیا ہے۔ جمعرات کے روز وہاں اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ آسانی سے مزار تک نہیں پہنچا جا سکتا۔ مزار سے باہر بیسیوں قوال اپنی اپنی باری پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

آپ کے مزار سے ملحق ایک مسجد ہے جو آپ نے بنائی تھی۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوب کی طرف مائل ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت کے علما نے اس سلسلے میں آپ پر اعتراض کیا۔ آپ نے ایک روز سب کو جمع کیا، خود امام بنے، اور اس مسجد میں نماز پڑھائی۔ نماز کے بعد حاضرین سے کہا کہ 'دیکھو کعبہ کس سمت ہے'۔ حجاب درمیان سے اٹھ گئے اور کعبہ سامنے نظر آگیا۔

۱۹۶۴ء میں آپ کے سالانہ عرس کے موقع پر اس مسجد کا ایک مینار زبردست آندھی کے سبب گر گیا تھا، جس کے سبب چند جانوں کا اتلاف ہوا۔ اس مسجد میں تقریباً ہر روز، خاص طور پر جمعرات کے دن بعد از نماز عصر مختلف علما وعظ کرتے ہیں۔

آپ نے تصوف پر کئی ایک کتب لکھیں۔ لیکن اس وقت صرف کشف المحجوب ملتی ہے باقی سب ناپید ہیں۔

(فوائد الفواد اردو ترجمہ مطبوعہ اللہ والوں کی قومی دکان صفحہ ، ۲۷۔ آئین اکبری، جلد ۳ صفحہ ۲۷۸ سفینۃالاولیا، صفحہ ۱۶۴، ۱۶۵ -

سیر المتاخرین ، مطبوعہ لاہور ، صفحہ ۱۲۳ - تصوف اسلام از مولانا عبدالماجد دریا بادی صفحہ ۴۲ - ۵۰)

(۱ - شالا مار باغ - لاہور سے مشرق کی طرف ساڑھے تین میل کے فاصلے پر واقع عظیم‌الشان باغ جسے شاہ جہان نے ۱۰۵۲ھ میں بنوایا تھا - لفظ 'شالا مار' کے متعلق مختلف توجیہات بیان کی جاتی ہیں - نور الدین چشتی کا کہنا ہے ''بعضوں کے نزدیک نام اس کا شہلا باغ یعنی خوب صورت باغ اور بعضوں کے نزدیک شالا مار - شالا مار زبان پنجابی میں خدا کو کہتے ہیں ، اور بعضوں کے نزدیک شعلہ ماہ یعنی چاند کا شعلہ......... '' وغیرہ - لطیف لکھتے ہیں کہ لفظ 'شالا' سنسکرت کا لفظ ہے جس کا مطلب ہے 'گھر' - 'مار' ترکی لفظ ہے بہ معنی 'خوشی' - یہ ترکی اور سنسکرت الفاظ کا جوڑ ہے یعنی 'خوشی کا گھر' - بہ قول ان کے رنجیت سنگھ کے دربار میں اس نام پر بڑی بحث ہوئی تھی - اس نے اسے 'شہلا باغ' کا نام دیا جس کا مطلب ہے "The garden of sweet hearts" - چناں چہ مہاراجہ کے حکم پر تمام پبلک خط و کتابت میں یہی نام لکھا جاتا -

یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کہ اس باغ کو 'شالا مار' کا نام کب سے دیا گیا - معاصر تواریخ عمل صالح اور مآثر عالمگیری وغیرہ میں ، اس کے سب سے اونچے طبقے کو 'فرح بخش' اور درمیانی نچلے طبقوں کو 'فیض بخش' کے اسما سے یاد کیا گیا ہے - بہ قول ڈاکٹر محمد باقر پہلی مرتبہ عالمگیر کا ہم عصر سجان رائے اپنی تصنیف خلاصۃ التواریخ میں اسے شالا مار کے نام سے یاد کرتا ہے -

اس کی تعمیر وغیرہ کے متعلق مختلف مؤرخین نے مختلف تواریخ دی ہیں - تحقیقات چشتی میں ۱۰۴۸ھ ہے - لطیف نے ۱۶۳۴ء لکھی ہے - بعض کے نزدیک ۱۶۶۷ء اور بعض کے نزدیک ۱۶۲۸ء ہے ، جو غلط ہیں - لیکن بادشاہ نامہ اور عمل صالح کے مؤلفین کے مطابق ۱۰۵۲ھ ہے اور یہی صحیح ہے - ان کا کہنا ہے کہ یہ باغ ایک سال پانچ ماہ اور چار دن میں تکمیل پذیر ہوا - ۷ شعبان ۱۰۵۲ھ (۳۱ اکتوبر

۱۶۴۲ء) کو شاہ جہان نے اس کی رسم افتتاح ادا کی ۔ چھ لاکھ روپیہ اس پر اٹھا ۔

اس باغ کو سیراب کرنے کے لیے ۲ لاکھ روپے کے خرچ سے ایک نہر مادھو پور کے مقام سے لائی گئی تھی ۔ اس نہر کو 'شاہ نہر' بھی کہا جاتا تھا ۔ یہ ۱۰۵۵ھ (۱۶۴۵ء) میں تکمیل کو پہنچی ۔

چشتی اور بعض دیگر مؤرخین کے مطابق ''اس باغ کے سات طبقے تھے، جو بہشت کے سات درجوں کے نمونے پر بنائے گئے تھے ۔ ان میں سے رفتہ رفتہ چار زمانے کی دست برد کی نذر ہو گئے ، اور صرف موجودہ تین بچ رہے'' ۔ لیکن معاصر مؤرخین کے بیان کو دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس باغ کے کبھی سات طبقے نہیں بنائے گئے ۔ ان مؤرخین نے ، جیسا کہ پہلے بیان ہوا ، صرف تین طبقوں کا ذکر کیا ہے ۔ پہلا طبقہ 'فرح بخش' اور درمیانی اور آخری 'فیض بخش' کے نام سے موسوم تھا ۔

اس باغ میں مغلیہ عہد کی عمارات کے علاوہ ایک نہایت حقیر سی عمارت رنجیت سنگھ کے زمانے کی بھی ہے ۔ یہ اینٹوں کی بنی ہوئی ایک چھوٹی سی بارہ دری ہے ، جو بالائی تختے میں کنوئیں کے قریب ابھی تک قائم ہے ۔ اس کی غربی دیوار پر سنگ مرمر کا (انگریزی میں لکھا ہوا) ایک کتبہ لگا ہوا ہے ۔

شالا مار باغ کے اصلی دروازے دو تھے جو نچلے طبقہ میں باغ کی شرقی اور غربی دیواروں میں بنائے گئے تھے ۔ غربی دیوار کا دروازہ اس قدیم شاہراہ پر کھلتا ہے جو قلعۂ لاہور کو باغ سے ملاتی تھی ۔ یہی دروازہ شاہی داخلے کے لیے مخصوص تھا ۔

اس وقت باغ کا جو دروازہ جرنیلی سڑک پر بنا ہوا ہے وہ لاہور کے ایک ڈپٹی کمشنر میک گریگر کا بنایا ہوا ہے ۔ پرانے دروازے عدم ضرورت کے باعث بند پڑے ہیں ۔ لیکن اس وقت بھی ان پر کاشی کا جو بچا کھچا آرائشی کام موجود ہے ، وہ دیکھنے کے قابل ہے ۔ اس میں

دو زبردست میلے منعقد ہوتے ہیں - (۱) میلہ چراغاں جو مارچ کے آخری ہفتہ اور اتوار کو ہوتا ہے - پہلے یہ اپریل کی صرف ایک اتوار کو منعقد ہوا کرتا تھا - (۲) پہلی پیر : یہ میلہ صرف خواتین کے لیے مخصوص ہے - میلہ چراغاں کے بعد جو پیر آتی ہے ، اس روز عورتوں کی بے پناہ تعداد یہاں جمع ہوتی ہے - اس کے بعد دو تین ماہ تک ہر ماہ کی پہلی پیر کو عورتوں کا یہ میلہ لگتا ہے -

بیرونی دنیا کے جتنے بڑے بڑے لوگ لاہور آئے وہ اس عظیم الشان باغ کو دیکھنے ضرور گئے ہیں - ان میں پرنس او ویلز (جو بعد میں ایڈورڈ ہفتم بنے ، جنوری ۱۸۷۶ء میں سیر کے لیے آئے) امیر حبیب اللہ والئی افغانستان (مارچ ۱۹۰۷ء) شہنشاہ ایران (مارچ ۱۹۵۰ء پہلی مرتبہ) صدر ناصر (مصر) ، جلال بایار (ترکی) ، شاہ حسین (اردن) اور شاہ سعود (سعودی عرب) وغیرہ قابل ذکر ہیں -

(تحقیقات چشتی از نور الدین چشتی ، صفحہ ۷۰۸ ببعد - لاہور از سید محمد لطیف مطبوعہ ۵۷-۱۹۵۶ ، صفحہ ، ۲۳۶ ، ۵۶ - 'شالا مار' از ڈاکٹر محمد باقر مطبوعہ اورئینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۵۰ء ، فواید متفرقہ ایضاً ، مجلہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۶۷) -

۱۶ - ''ہر نفسے کہ فرو میرود.........مفرح ذات'' - یہ ٹکڑا گلستان سعدی کی ابتدائی سطور سے ہے جن میں خدا کی حمد بیان کی گئی ہے - گلستان کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے :

''منت خدای را عز و جل کہ طاعتش موجب قربتست و بشکر اندرش مزید نعمت ، ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیاتست و چون بر می آید مفرح ذات پس در ہر نفسی دو نعمت موجودست و بر ہر نعمت شکری واجب......... -''

(کلیات شیخ سعدی، چاپخانہ محمد علی علمی، تہران صفحہ ۲۷- گلستان، چاپ وزارت فرہنگ تہران صفحہ ۲۵) -

۱۷ - کورنش - مغلیہ بادشاہوں میں سب سے پہلے ہمایوں نے کورنش و تسلیم کا رواج شروع کرایا -

کورنش میں درباری تخت کے پاس آ کر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو پیشانی پر رکھ کر اپنا سر جھکاتے اور تسلیم میں دائیں ہاتھ کی پشت کو زمین پر رکھ کر اس کو اٹھاتے اور سیدھے کھڑے ہو کر دائیں ہاتھ کی ہتھیلی کو سر پر رکھتے۔

اس کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ ایک مرتبہ ہمایوں نے اکبر کو اپنی کلاہ دی جو اکبر کے سر پر بہت بڑی تھی۔ اکبر نے کلاہ کو سر پر رکھ کر سلام کرنا چاہا۔ کلاہ بڑی تھی اس لیے اس نے دائیں ہاتھ سے کلاہ پکڑ لی اور جھک کر سلام کیا۔ ہمایوں کو اکبر کی یہ ادا پسند آ گئی۔ اس لیے اس کو اپنے دربار میں تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ 'کورنش و تسلیم' کے نام سے رواج دیا۔

(آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۱۰۷۔ بحوالہ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے صفحہ ۱۴)۔

۱۸۔ افراسیاب۔ افراسیاب کے معنی ہیں 'چکی کا پاٹ'۔ ترکستان کے والی پشنگ کا بڑا لڑکا تھا۔ جب منوچہر والئی تہران فوت اور اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہوا تو وہ چونکہ نرم طبیعت تھا، اس لیے وہ ملکی معاملات کو صحیح طور پر نہ چلا سکا، جس کے سبب اس کی سلطنت میں ایک عظیم خلل برپا ہوا۔ ترکستان کے حکمران پشنگ نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس نے اپنے بیٹوں وغیرہ کو اکٹھا کرکے مشورہ کیا۔ چوں کہ اس واقعہ سے پہلے افراسیاب ایران پہنچ کر منوچہر کا محاصرہ کر چکا تھا، اس لیے اس مہم پر بھی اسی کو بھیجا گیا۔ وہ چار لاکھ پیادہ و سوار لے کر ایران کی طرف بڑھا۔ اس جنگ میں اسے شکست ہونے والی تھی، لیکن ترکوں نے پتھروں کا استعمال شروع کر دیا اور کچھ سیاہ بادل آنے کے سبب لڑائی رک گئی، اور پانسہ پلٹ گیا۔ اسے فتح ہوئی اور نوذر قتل کر دیا گیا۔ بعد میں اس نے قتل و غارت کرکے ایران کا تخت حاصل کر لیا۔ رعایا پر اس نے بڑا ظلم کیا۔ ملک میں قحط بھی پڑ گیا۔ اس کے خلاف پیشدادی پہلوانوں نے باہم مشورہ کیا اور زابلستان کے فرماں روا زال کے پاس

ایلچی بھیجے کہ ترکوں سے ایران کی سر زمین کو آپ ہی بچا سکتے ہیں ۔ (افراسیاب کا بھائی اغریرث ایرانیوں کا طرف دار تھا ، جب اُسے پتا چلا تو اس نے اغریرث کا جوڑ جوڑ کاٹ کے رکھ دیا)۔ زال نے یہ بات سنی تو اس نے جنگ کا ساز و سامان فراہم کیا ۔ فارس کے علاقے سے باہر زال اور اس کے ساتھی زاب بن طہماسپ بن منوچہر کی فوجوں کا افراسیاب کی افواج سے مقابلہ ہوا ۔ بہ قول حافظ ابرو دن کو خوب لڑائی ہوتی اور رات کو دونوں فوجیں اپنے اپنے مقامات پر لوٹ جاتیں ۔ سات ماہ تک اسی طرح لڑائی ہوتی رہی ۔ اس اثنا میں زبردست قحط پڑا ۔ دونوں نے کہا کہ یہ ظلم و زیادتی کے سبب ہے ۔ آؤ ترک جنگ کریں ۔

فیصلہ یہ ہوا کہ افراسیاب اپنے علاقے کو واپس چلا جائے۔ چناں چہ وہ توران چلا گیا ۔

بعض مؤرخین کے مطابق افراسیاب نے ایران میں بارہ سال حکومت کی ۔ جس وقت اس نے ایران کی مملکت پر قبضہ کیا اس وقت وہ اسی برس کا تھا ۔

(روضۃ الصفا جلد اول صفحہ ۱۸۷ ، ۱۸۸ تاریخ معجم صفحہ ۲۰۲ ، ۲۰۳ ۔ براؤن جلد اول فارسی ترجمہ صفحہ ۱۷۷) ۔

۱۹ ۔ زال ، سام کا بیٹا اور رستم کا باپ تھا ۔ پیدائش کے وقت اس کے بال سفید تھے (جو بدشگونی کی علامت تھے) اس لیے اسے باپ کے حکم پر کوہ البرز کی چوٹی پر چھوڑ دیا گیا ۔ شاہ نامہ کی روایت کے مطابق البرز سے سیمرغ اسے اپنے بچوں کے پاس لے گیا اور اس کی پرورش کی ۔ آخر کئی سالوں کے بعد سام کو اس کا خیال آیا اور وہ اس کی جستجو میں نکلا ۔ سیمرغ نے زال کو اس کے سپرد کر دیا اور اپنا ایک پر زال کو دیا کہ جب کبھی ضرورت پڑے اسے آگ دکھانا اور مجھ سے مدد طلب کرنا ۔

اب زال ، جسے سیمرغ نے 'دستان' کا لقب دیا تھا ، اپنے بزرگوں کے پاس دانش آموزی میں مصروف ہوا اور کچھ عرصے بعد ایک دانش ور اور طاقت ور پہلوان بن گیا ۔

اس کی زندگی کے واقعات میں اس کا سہراب کابلی کی بیٹی رودابہ سے عشق ہے ، جو بعد میں اس کی بیوی بن گئی ۔ رستم اسی سے پیدا ہوا ۔ (شاھنامہ جلد اول صفحہ ۷۵ ۔ راھنمای ادبیات فارسی صفحہ ۱۹۰، ۱۹۱) ۔

۲۰ ۔ قلیچ خان ۔ توران کا رھنے والا اور شروع میں عبداللہ خان زخمی کا ملازم تھا ۔ وھاں سے شاھزادہ خرم (شاہ جہان) کی ملازمت میں آ گیا ۔ کئی ایک معرکوں میں شاھزادہ کے ساتھ رھا ۔ جب شاہ جہان تخت نشین ہوا تو اسے منصب ۲ ہزار و پانصدی ، دو ہزار سوار سے نوازا ۔ بعد میں دھلی کا صوبے دار بنایا گیا ۔ دوسرے سال جلوس الہ آباد کا حاکم ہوا ۔ پانچویں سال صوبگی ملتان ملی ۔

گیارھویں سال جلوس ، جب علی مردان خان زیگ نے ، جو شاہ ایران کا ملازم تھا ، قندھار کا قلعہ شاہ جہان کے سپرد کر دیا تو قلیچ خان کو پانچ ہزاری کا منصب دے کر وھاں کا گورنر نامزد کیا گیا ، جہاں یہ ایک مدت رھا اور سرکشوں کی بیخ کنی اور دیگر قلعے فتح کرتا رھا ۔

کہتے ھیں جب اس نے زمین دادر کی تسخیر کے بعد قلعۂ بست کی طرف توجہ کی تو محراب خان نے ، جو غلامان شاہ (ایران) میں سے اور جسارت و دلیری میں ان کا سرگروہ تھا ، قلعۂ مذکور کی پوری پوری حفاظت کی ، اور مسلسل گولہ باری اور تفنگ اندازی کے علاوہ دیگر آلات آتش بازی استعمال کرتا رھا ۔ قلیچ کو جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو وہ جرأت و دلیری سے یورش کرتا ہوا سب سے پہلے خود قلعہ میں داخل ہو گیا اور بے شمار قزلباشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ محراب خان کچھ آدمیوں کو لے کر قلعہ میں محصور ہو گیا ۔ جب قلعہ میں نقبیں لگانے سے راستہ پیدا ہو گیا تو محراب امان مانگتا ہوا باہر آ گیا ۔ اس نے اس کی خواھش کے مطابق ایران کی رخصت دے دی ۔

۱۳ویں سال قندھار کے زمیندار عیدل کا قلع قمع کیا ، جس نے اس علاقے میں بے حد شورش برپا کر رکھی تھی ۔ ۱۴ویں سال قندھار سے حضور میں پہنچا اور دوبارہ ملتان کی حکومت پائی ۔ ۱۷ویں سال

سعید خان ظفر جنگ کی تبدیلی پر پنجاب کا صوبہ دار بنا اور بلخ و بدخشاں کی مہم میں کارھائے نمایاں سر انجام دئے۔

۲۳ویں سال جلوس شاھزادہ اورنگ زیب کی همراھی میں قندھار کی مہم پر متعین ھوا جہاں خوب شجاعت و شہامت کا مظاھرہ کیا جس کے سبب منصب میں اضافہ پا کر ۵ ھزاری ۵ ھزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ تک پہنچا اور ساتھ ھی کابل کی نظامت پر مامور ھوا۔

۲۷ویں سال جلوس (۱۰۶۳ھ) اپنی جاگیر بہرہ (متعلقہ دوآبہ سندھ ساگر) میں فوت ھوا۔ اس کا کوئی فرزند نہ تھا۔ بادشاہ کی طرف سے اس کے پسماندگان کے لیے یومیہ مقرر کیا گیا۔

کہتے ھیں کہ ھزار اوزبک سوار همیشہ اس کی ملازمت میں رھتے۔ اور جس طرح اس کے لشکر میں نماز روزہ بہت تھا، اسی طرح جوا، لواطت اور شرب و زنا کی بھی کثرت تھی۔

لاھور سے ملتان تک سرائیں بنوائیں۔ اور حضرت شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریاؒ کے روضۂ مبارک کو جو بہت تنگ تھا، اردگرد کے مکانات خرید کر وسیع کیا۔

(مآثر الامرا۔ جلد سوم صفحہ ۹۲ ببعد)۔

۲۱۔ شیخ عنایت اللہ عمل صالح کے مؤلف نے اسے اپنا بڑا بھائی، استاد، ولی نعمت صوری و معنوی لکھا ھے۔ سجان رائے نے بھی اسے اس کا بھائی لکھا ھے۔ لیکن عمل صالح (مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاھور) کے دیباچہ نگار بھائی کے رشتہ کو صحیح قرار نہیں دیتے اور اس کی دلیل یہ دیتے ھیں کہ محمد صالح نے ھر جگہ اپنے نام کو 'آل محمد' کے لقب سے زینت دی ھے جو صرف سادات کر سکتے ھیں۔ جب کہ عنایت اللہ کو ھر جگہ 'شیخ عنایت اللہ' لکھا ھے۔ مؤلف تحقیقات چشتی نے اسے محمد صالح کا داماد لکھا ھے جو سراسر غلط ھے۔

بہ قول صالح اس کی اصل 'ارض مقدس لاھور' سے ھے، لیکن مولد برھان پور ھے۔ آغاز میں شاھی ارباب مناصب میں داخل ھوا۔ (لاھور

میں شاہ جہان کی طرف سے میر منشی کے عہدے پر فائز تھا) ۔ صالح کا کہنا ہے کہ اس نے ایک تاریخ موسوم بہ 'تاریخ دل کشا' لکھی تھی جس میں حضرت آدم[ؑ] سے لے کر شاہ جہان کے عہد تک کے واقعات تھے ۔ بہار دانش بھی اسی کی تصنیف ہے ۔ اس کے متعلق چشتی لکھتے ہیں کہ جب وہ یہ کتاب مکمل کرکے بادشاہ کے پاس لے گیا تو اس نے دیکھ کر کہا ''اے عنایت اللہ افسوس ہے کہ تو نے موتیوں کو رسی میں پرو دیا ہے یعنی آراستگی عبارت تو ایسی کہ اس سے بہتر ممکن نہیں اور قصص ایسے ناکارہ ہیں کہ جن سے سوائے شہوت انگیزی اور کچھ فائدہ حاصل نہیں'' ۔ صالح نے شیخ مذکور کو ان الفاظ سے یاد کیا ہے ''سر حلقۂ صفا کیشاں و فروغ بخش دلہائے ایشاں'' ''آئین سخنوری میں صاحب طراز ، تازہ نویسان سخنور کا سر آمد'' اور یہ کہ اس کی نثر بڑی بامزہ ، متین ، پر معنی اور عبارت شستہ و صاف و رنگین ہے ۔

آخر آخر میں تحصیل علم حقیقت اور معرفت الٰہی میں مصروف ہوا اور شیوۂ سخنوری کو بالکل ترک کرکے گوشہ نشینی اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی[رح] کی خانقاہ کے خادموں کی خدمت اختیار کر لی ۔ اسی سبب سے صالح نے اس کا تذکرہ صوفیا کے زمرے میں بھی کیا اور اسے ''عارف کامل ، حقائق آگاہ ، بیدار دل ، معنی پناہ'' لکھا ہے ۔

بہ قول صالح اس نے بروز جمعرات ۱۹ جمادی الاول ۱۰۸۲ھ کو بہ عمر ٦۵ سال وفات پائی (اس کی تاریخ پیدائش بھی ۱۹ جمادی الاول ہے) ۔ عمل صالح کے دیباچہ نگار نے صالح کی جو عبارت درج کی ہے اس میں سال وفات ۱۰۸۰ھ ہے ۔ لطیف اور چشتی نے بھی ۱۰۸۰ھ (۱٦٦۹ء) لکھا ہے ۔ کسریٰ منہاس نے اپنے مقالہ 'مؤرخین لاہور' میں ۱۰۷۵ھ ، (۱٦٦۴ء) بیان کیا ہے ، جو غلط ہے ۔

اس کی قبر بہ قول صالح ''حضرت قطب الاقطاب خواجہ قطب الدنیا والدین'' کے مزار کے متصل اپنی بنا کردہ خانقاہ میں ہے ۔ بہ قول لطیف و چشتی گنبد کنبوھاں والا میں مدفون ہوا ۔ یہ گنبد ایمپریس روڈ (لاہور) پر واقع ہے ۔

(عمل صالح جلد اول دیباچہ صفحہ ۸ - جلد سوم صفحہ ۳۲۳-۳۲۵ ، صفحہ ۳۲۹ ، ۳۳۰ - تحقیقات چشتی صفحہ ۵۹۲ - لاہور از سید لطیف صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹ - مجلہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۹۶۸) -

۲۲ - محمد صالح - محمد صالح کنبو 'عمل صالح' یا 'شاہ جہان نامہ' کا مؤلف لاہور میں پیدا ہوا - شیخ عنایت اللہ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسائی حاصل کی - اپنی قابلیت کے سبب جلد ہی صوبۂ لاہور کے دیوان کے عہدہ پر مامور ہوا - اسی زمانے میں اس نے ۱۰۷۰ھ (۱۶۵۹ء) میں موچی دروازہ کے اندر ایک مسجد بنوائی جو مسجد محمد صالح کے نام سے آج بھی وہاں موجود ہے - اسی مسجد کے ساتھ اس کی رہائش گاہ تھی - یہ مسجد موچی دروازے سے شہر میں داخل ہوں تو سامنے ہی نظر آتی ہے - کنہیا لال مؤلف تاریخ لاہور کے لفظوں میں یہ ''چھوٹی سی مسجد نہایت مقطع و خوب صورت بنی ہوئی ہے -''

صالح کی کتاب 'عمل صالح' تاریخی لحاظ سے خاصی اہمیت کی حامل ہے - اس میں شاہ جہان کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے تمام واقعات آ گئے ہیں - اس کتاب کے علاوہ اس نے 'بہار سخن' کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ، جو خطوط ، دہلی ، آگرہ اور لاہور کی عمارات کے ذکر اور اس دور کی 'تصانیف پر تقاریظ' پر مشتمل ہے -

چشتی نے اس کی تاریخ وفات ۱۰۷۵ھ اور لطیف نے ۱۰۸۵ھ دی ہے - لیکن محمد عبد اللہ قریشی صاحب نے ان سے اختلاف کیا ہے اور بعض دلائل کی روشنی میں اس کی وفات ۱۱۲۰ھ کے بعد ثابت کی ہے -

صالح بھی گنبد کنبواں میں مدفون ہوا - یہ مقبرہ اب ''سینٹ اینڈ ریوز پارش چرچ'' کے نام سے موسوم ہے -

(دیباچہ عمل صالح جلد اول صفحہ ۲ ببعد - لاہور از لطیف صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹ - تحقیقات چشتی صفحہ ۵۹۲ - مجلہ نقوش لاہور نمبر صفحہ ۹۶۸ ببعد) -

۲۳ - شیخ ابوالبرکات منیر - ابوالبرکات نام ، منیر تخلص - ۱۲ رمضان‌المبارک ۱۰۱۹ھ کو لاهور میں پیدا هوا - والد کا نام 'سرو آزاد' میں عبدالحمید ملتانی لکھا ھے ، لیکن محمد صالح کنبوہ کے مطابق عبدالجلیل ابن حافظ ابو اسحاق تھا - منیر پانچ برس کی عمر میں مکتب میں بھیجا گیا - بچپن ھی میں طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل تھی - حافظہ بلا کا پایا تھا - چودہ سال کی عمر سے خود شعر کہنے لگا - فلکی، ثنائی اور انوری کی پیروی کی - شروع کا کلام چوں کہ خامیوں سے پر تھا ، اس لیے کوئی پندرہ ھزار اشعار کے قریب ضائع کر دیے - موجودہ کلیات پچاس ھزار کے قریب اشعار پر مشتمل ھے -

۱۰۳۵ھ میں اکبر آباد گیا اور سیف خان کے یہاں ملازم ھو گیا - دو سو بیس روپیہ ماھوار تنخواہ مقرر ھوئی- سیف خان نے اس کی بے حد قدردانی کی، اور اس کا وقت سیف کی صحبت میں نہایت مسرت و فارغ البالی سے گزرا -

سیف خان جب بنگال گیا تو منیر بھی اس کے ساتھ تھا ، اور وھیں اس نے 'مثنوی در صفت بنگالہ' لکھی - ۱۰۴۹ھ میں سیف خان کے فوت ھونے پر پٹنہ چلا گیا - وھاں سے الہ‌آباد آیا - پھر اعتقاد خان نے اسے جونپور بلوا لیا ، جہاں چار روپیہ روزانہ مشاھرہ مقرر ھوا - لیکن جلد ھی اس کا دل یہاں سے آچاٹ ھو گیا - کچھ اعتقاد خان نے بھی اچھا سلوک نہ کیا اور تنخواہ کم کر دی - آخر وھاں سے آگرہ چلا آیا اور یہاں دربار شاھی کے شعرا میں داخل ھو گیا -

۱۰۵۰ھ میں اس نے اپنے رقعات کا مجموعہ شائع کیا - ۱۰۵۲ھ میں شعرائے پاک و ھند کے حالات میں ایک تذکرہ لکھا - اس میں کچھ خامیاں رہ گئی تھیں - ان کی اصلاح کسی اور موقع پر اٹھا رکھی - ۱۰۵۴ھ میں اصلاحیں کی گئیں - دیباچہ باقی تھا جسے محمد صالح مؤلف شاھجہان نامہ نے ۱۰۷۰ھ میں پورا کر دیا - یہ تذکرہ بقول حافظ محمود شیرانی مرحوم بالکل مفقود ھے -

منیر نے عین عالم شباب میں بعمر ۳۶ سال ۱۰۵۵ھ میں بمقام

اکبر آباد وفات پائی (آزاد نے ۱۰۵۴ھ لکھا ہے) بقول آزاد بلگرامی نعش وہاں سے لا کر لاہور میں دفن کی گئی۔

اس کی شاعری کے بارے میں صالح لکھتا ہے کہ اگرچہ وہ لاہور میں پیدا ہوا، لیکن اس کا کوکب بخت، معانی کی دقیقہ سنجی میں اہل ایران سے بھی ہزار درجہ ارتقا پذیر ہوا۔ تذکرۂ حسینی میں مرقوم ہے کہ عالمگیر کی تخت نشینی پر دوسرے شعرا کی مانند اس نے بھی سکہ کہا جو بہت پسند کیا گیا:

"سکہ زد در جہان چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

پھر اشرفی کی خاطر لفظ 'بدر' کی بجائے 'مہر' داخل کیا۔ عالمگیر جب اس سے محظوظ ہوا تو منیر کو انعام کی توقع ہوئی۔ لیکن عالمگیر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اس کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ میرے سکے میں تم نے اپنا نام داخل کر لیا۔

منیر کی انشاء بہت مشہور ہے۔ شاعری میں بھی اسے خاصی شہرت حاصل تھی۔ اس کی مثنوی در صفت بنگالہ ادارۂ مطبوعات حکومت پاکستان کی طرف سے شائع کی جا چکی ہے۔
(راقم کا مقالہ 'فارسی گو شعرا' مطبوعہ نقوش 'لاہور نمبر' صفحہ ۸۷۱، ۸۷۲)

۲۴ - ملا طغرا: مشہد کا رہنے والا تھا۔ وارد ہند ہونے کے بعد شاہزادہ مراد بخش (ابن شاہ جہان) کے دربار سے منسلک ہو گیا۔ جب شاہزادہ مراد دکن گیا تو یہ بھی اس کے ساتھ وہاں پہنچا۔ آخر میں کشمیر میں گوشہ نشین ہو گیا اور یہیں وفات پائی۔ ابو طالب کلیم کی قبر کے نزدیک دفن ہوا۔

بقول آزاد بلگرامی اس نے نثر میں طرح نو ڈالی، اور عبارات کے جواہرات کو جلاء تازہ بخش کر جوہریوں کے لیے نظر فریب بنایا۔
سرخوش نے اسے 'شاعر خوش فکر و معنی یاب و منشی طبیعت' لکھا ہے۔

مجمع النفائس کے مؤلف کے مطابق ہندوستان میں اس کا کلیات بہت مشہور تھا - ایک دیوان بھی ہے جو دس ہزار اشعار پر مشتمل ہے - لیکن یہ چیزیں اب ناپید ہیں -

اس کا زیادہ تر نام اس کے نثری رسائل کے سبب ہے جن میں اس نے اپنی قلم کے جوہر دکھائے ہیں اور جو 'رسائل طغرا' کے نام سے ایک جلد میں چھپ چکے ہیں - یہ تعداد میں سترہ ہیں - جن میں سے کچھ کے نام یہ ہیں فردوسیہ ، الہامیہ ، جلوسیہ ، تجلیات ، تحقیقات چشمۂ فیض وغیرہ - ان کے آخر میں اس کے رقعات منسلک ہیں -

[سرو آزاد صفحہ ۱۲۴ - کلمات الشعرا صفحہ ۷۰ - رسائل طغرا مطبوعہ نول کشور ۱۸۸۵ء - مجمع النفائس (بحوالہ رسائل طغرا مرتبہ محمد تقی گلشن شادانی مطبوعہ لاہور ۱۹۲۷ء صفحہ ۱)]

۲۵ - نگار نامہ لعل چند ملتانی - نگار نامہ ملک زادہ منشی (۱۰۹۰ھ) کی تصنیف ہے - یہ عہد شاہ جہانی کا ایک زبردست منشی تھا - غالباً مصنف کا نام منشی لعل چند تھا ، لیکن عام طور پر اسے ملک زادہ ہی کہا جاتا ہے - منشی مذکور ایک عرصہ تک شاہزادہ معظم کے یہاں ملازم رہا - کچھ عرصہ بشارت خاں کا متصدی رہا - اس نے اپنی تصانیف نگارنامہ اور کارنامہ میں اپنے حالات تفصیل سے دیے ہیں - نگارنامہ دو دفاتر پر مشتمل ہے - پہلے دفتر میں اس کی اپنی منشات ہیں اور دوسرے میں دوسرے منشیوں کی تحریریں ہیں - اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے دیباچے میں بعض اہم مضامین پر بحث ہے - مثلاً انشا کا مقصد ، اس کی غرض و غایت ، اس کی ترقی و عروج ، ہندوستان کے بہترین منشی ، عہد شاہ جہانی و عالمگیری کے اعلیٰ انشا نگار ، منشی کے فرائض ، اس کی ضروریات وغیرہ پر پوری بحث ہے - نگارنامہ میں عہد عالمگیری کی بعض اہم دستاویزات محفوظ ہیں ، جس کی وجہ سے یہ نسخہ بہت قابل قدر بن گیا ہے -

(ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ صفحہ ۷۹ ، ۸۰)

۲٦ - لیلاوتی - ھندوؤں کے فن ریاضی کی کتاب تھی - فیضی نے فارسی میں اس کا ترجمہ کیا - منتخب‌التواریخ کے اردو مترجم نے حاشیہ میں اس کتاب کا اصل نام 'لعلدوتہ' دیا ھے -

(بزم تیموریہ صفحہ ٦۴ - منتخب‌التواریخ اردو ترجمہ از محمود احمد فاروقی صفحہ ۵۴۱)

۲۷ - یوسف و زلیخا جامی - مولانا جامی نے سات مثنویاں لکھیں، جو 'ھفت اورنگ' کے نام سے مشہور ھیں - یہ مثنوی یوسف اور زلیخا کی عشقیہ داستان اور ان کی پانچویں مثنوی ھے - دیگر مثنویات کی نسبت یہ زیادہ مشہور اور مقبول ھے - اس کا قصہ قرآن کی سورۂ یوسف پر مبنی ھے - اگرچہ اس قصہ کو بہت سے ایرانی شعرا کے علاوہ ترکی شعرا نے بھی منظوم کیا ھے ، لیکن ان تمام منظومات میں مولانا جامی کی مثنوی ، بقول براؤن سب سے اونچے درجے کی ھے - اور اسی پر بڑی حد تک ان کی شہرت کا دار و مدار ھے - اس مثنوی کے منظوم انگریزی تراجم بھی ھو چکے ھیں - یہ مثنوی ۸۸۸ھ میں لکھی گئی - اس مثنوی کا آغاز اس شعر سے ھوتا ھے :

الٰہی غنچۂ امید بکشای　　　گلی از روضۂ جاوید بکشای

(براؤن جلد ۳ اردو ترجمہ صفحہ ۴۳۸-۳۹ - شفق صفحہ ۳۴۸ ، مثنوی یوسف زلیخا صفحہ ۲)

۲۸ - تحفة الاحرار (دربار ملی میں تحفة الاسرار ھے جو غلط ھے) مولانا جامی کی تیسری مثنوی ھے جو ۸۸٦ھ میں نظامی کی مخزن‌الاسرار کے وزن پر لکھی گئی - یہ مثنوی دینی اور اخلاق مضامین کی ایک موعظتی اور معنوی نظم ھے - جس میں تحمیدات ، نعتوں اور مناجاتوں کے بیس مقالات ھیں - آخری مقالے میں جامی نے اپنے چھوٹے فرزند یوسف ضیاءالدین سے خطاب کیا ھے جو اس وقت صرف چار سال کا ھوا تھا جب کہ خود جامی کی عمر ساٹھ برس تھی - شفق نے براؤن کے برعکس مثنوی کے مقالوں کی تعداد بارہ دی ھے - اس مثنوی میں ناصرالدین

عبیداللہ معروف بہ خواجہ احرار جو نقشبندی فرقہ کے ایک بہت بڑے بزرگ اور مولانا جامی کے معاصر تھے، مولانا کے ممدوح واقع ہوئے ہیں۔

اس مثنوی میں ہر مقالے کے بعد قاعدۃً ایک یا زیادہ تمثیلی حکایتیں دی گئی ہیں۔ بقول براؤن یہ مثنوی مجموعی طور پر بے لطف اور یک آہنگ ہے اور مولانا کی تصانیف کی مفید مطلب اور صحیح مثال نہیں سمجھی جا سکتی۔

اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہست صلای سر خوان کریم''

(براؤن جلد ۳ اردو ترجمہ صفحہ ۷۴۳ - شفق صفحہ ۳۴۷)

۲۹ - سبحۃ الابرار - مولانا کی چوتھی مثنوی ہے۔ یہ مثنوی بھی دینی، صوفیانہ اور اخلاق مضامین کی ایک نصائحی نظم ہے۔ اور تحفۃالاحرار سے ملتی جلتی ہے۔ یہ مثنوی انہوں نے سلطان حسین کے نام معنون کی۔ اس میں بقول شفق 'حکایات لطیف و تمثیلات ظریف' ہیں۔ تمام مثنوی چالیس عقدوں پر مشتمل ہے۔ گوناگوں عرفانی موضوعات سے بحث کی ہے۔ مثلاً 'وصف دل'، 'شرح سخن'، 'استدلال از آثار بوجود پروردگار' اور یہ کہ حق تعالیٰ حقیقت وجود ہے اور شرح تصوف وغیرہ۔ شرح کے بعد ہر 'عقد' میں دو حکایتیں بطور تمثیل کے دی گئی ہیں۔

بقول براؤن یہ مثنوی بھی تحفۃالاحرار کی مانند بے ربط ہے اور طرز رفتار اور مضمون میں اس سے بھی کم جاذب ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے:

ابتدای بسم اللہ الرحمن الرحیم المتوالی الاحسان

(براؤن جلد ۳ صفحہ ۷۳۶ - شفق صفحہ ۳۴۷)

۳۰ - مولانا نظام الدین گنجوی - حکیم جمال الدین ابو محمد الیاس نام، نظامی تخلص - فارسی کے بہت بڑے مثنوی گو شاعر - گنجہ (آذربائیجان) کے رہنے والے تھے - ۵۳۵ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔

اہل گنجہ کثر اہل سنت تھے اور ان میں علماء و فضلاء کی بھی کثرت

تھی ۔ اس ماحول میں نظامی نے آنکھیں کھولیں اور جوانی میں اس سے خاصے متاثر ہوئے ۔ تصوف سے لگاؤ تھا ۔ زندگی بڑی زاہدانہ بسر کی ۔ بقول صفا 'التزام دربارهای ملوک' سے دور رہے ۔ شفق لکھتے ہیں کہ اگرچہ انہوں نے اتابکان آذربائیجان وغیرہ کی مدح کی اور وہ بھی انہیں احترام کی نظروں سے دیکھتے اور انعام وغیرہ میں فروگذاشت نہ کرتے تھے ، لیکن اس کے باوجود انہوں نے مدح میں کبھی مبالغہ نہ کیا ، اور حکمرانوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے شعر نہ لکھے ، اور خاص طور پر آخری عمر گوشہ نشین ہو کر آزاد زندگی بسر کی اور کسی امیر کے سامنے گردن نہ جھکائی ۔

اسی طرح مولانا شبلی نے بھی لکھا ہے کہ ''اگرچہ ان کو مختلف درباروں سے تعلق تھا اور جس قدر مثنویاں لکھیں سب کسی نہ کسی فرماں روا کے نام پر لکھیں ، تاہم قصیدے کو انہوں نے مداحی سے آزاد رکھا ....'' ۔ لیکن ایک جگہ شبلی لکھتے ہیں ، ''مثنویوں میں اس زور کی مدحیں لکھیں جن کے آگے قصائد کی کوئی ہستی نہیں... پادشاہوں کے سامنے اپنے آپ کو جس حیثیت سے پیش کرتے ہیں ، وہی ہوتی ہے جو گدا پیشہ شاعروں کا انداز ہے ....'' ۔ چناں چہ اسی بات پر تبصرہ کرتے ہوئے مرحوم حافظ شیرانی لکھتے ہیں ''جب مثنوی کے میدان ہی میں شیخ نظامی سلاطین کی مدح سرائی سے باز نہیں آتے تو قصائد کے میدان میں خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے ہوں گے'' ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی کہتے ہیں کہ آیا انہوں نے قصائد لکھے بھی یا نہیں ۔ عوفی کے مطابق ''مثنویاں یادگار ہیں باقی جنس کلام سنی نہیں گئی ۔ خود نظامی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ غزلیں اور ضرورتاً قصائد بھی لکھے ہیں ۔ انہوں نے اپنے دیوان کا ذکر بھی کیا ہے لیکن آج سب ذخیرہ ناپید ہے'' ۔ چونکہ قصیدے نہیں ملتے ''اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا انداز مداحیہ تھا یا حکمیہ'' ۔

بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا ۔ والدہ ایک کرد خاندان کی رئیسہ تھیں اور آن ہی نے ان کی تعلیم و تربیت کی ۔ بقول شیرانی ان

کی تین بیویاں تھیں ، اور اگر زائد بھی ہوں تو تعجب نہیں ۔ لیکن یہ سب کنیزیں تھیں اور سب کا انتقال ان کی زندگی میں ہوا ۔ زیادہ بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ مثنویاں بیویوں کے حق میں منحوس ثابت ہوئیں ۔ یعنی ہر مثنوی کے دوران ایک بیوی فوت ہوئی ۔ اولاد میں صرف ایک فرزند کا انہوں نے ذکر کیا ہے جس کا نام محمد تھا ۔ ان کے سوا کوئی اور اولاد نہ تھی ۔

ان کی تاریخ وفات کے متعلق اختلاف ہے ۔ تاہم بقول صفا اگر ہم ان کی تاریخ ولادت ۵۳۰ھ کے لگ بھگ اور عمر ۸۴ برس قبول کر لیں تو پھر ٦۱۴ھ تاریخ وفات جاننا چاہیے اور شفق کے مطابق ۵۹۹ھ بعمر ساڑھے تریسٹھ برس (سعید نفیسی کے مطابق ۵۹۸ھ) گنجہ ھی میں وفات پائی اور وھیں مدفون ہوئے ۔ ان کا مدفن قاچاری عہد کے وسط تک موجود تھا ، اس کے بعد ویرانی کی حالت سے دو چار ہوا ۔ آخر آذر بائیجان (روسی) کی مقامی حکومت نے اس کی مرمت وغیرہ کروائی ۔ ان کا ایک مجسمہ بھی باکو شہر میں نصب ہے ۔

نظامی کی شہرت ان کی پانچ مثنویوں کے سبب ہے جنھیں 'خمسۂ نظامی' یا 'پنج گنج' کہا جاتا ہے ۔ (ان کا ذکر آگے آئے گا) ۔ ان کے علاوہ ایک دیوان بھی تھا جس کے کچھ شعر مختلف بیاضوں وغیرہ سے دستیاب ہوئے ہیں ۔ وحید دستگردی مرحوم نے ان اشعار کو گنجینۂ گنجوی کے نام سے فراہم کیا ہے ۔ آقاے سعید نفیسی نے بھی ان کا 'دیوان قصاید و غزلیات' شائع کیا ہے ۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو : تاریخ ادبیات در ایران از دکتر ذبیح اللہ صفا جلد دوم ۔ شعرالعجم جلد ۱ ، تاریخ ادبیات ایران از شفق ، تہران ۱۳۴۲ شمسی ، دیوان قصاید و غزلیات نظامی گنجوی ، شامل احوال و آثار نظامی ، از استاد سعید نفیسی مطبوعہ تہران ۱۳۳۸ش ، تنقید شعر العجم از حافظ محمود شیرانی) ۔

۳۱۔ سکندر نامہ ۔ یہ نظامی کی پانچویں مثنوی اور دس ہزار پانچ سو اشعار(نفیسی کے مطابق ۱۰۸۰۰ اشعار) اور دو حصوں پر مشتمل ہے ۔

پہلے حصے کا نام 'شرف نامہ' (۱۰۰۰۷ اشعار) اور دوسرے کا اقبال نامہ (۳۷۰۰ اشعار) ہے - انھیں 'سکندر نامہ بری' اور 'سکندر نامہ بحری' بھی کہتے ہیں - یہ کتاب انھوں نے اتابک اعظم نصرۃ الدین ابوبکر بن محمد جہان پہلوان کے نام ،جو آذر بائیجان کا اتابک تھا ، معنون کی - سکندر نامہ کے بعض نسخوں میں دو دیگر امیروں کا بھی ذکر آیا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ مثنوی دو تین مرتبہ دو تین امرا کے نام معنون ہوئی ، لیکن بعد میں وہ اشعار باہم مخلوط ہوگئے - اس کی تاریخ تصنیف ۵۹۹ھ کے لگ بھگ ہے -

داستان اسکندر پہلے فردوسی نے شاہنامہ میں منظوم کی تھی - اس نے جو کچھ چھوڑا تھا، اسے نظامی نے منظوم کیا - شرف نامہ میں اسکندر کی ولادت سے لے کر اس کی فتوحات اور روم کو واپسی تک کے واقعات مندرج ہیں - اقبال‌نامہ میں اسکندر کے علم و حکمت ، اس کی پیغمبری ، بڑے بڑے حکما کے ساتھ اس کی مجالس ، انجام زندگانی اور اس کی مجالس میں شریک ہونے والے حکما کے 'انجام روزگار' کا تذکرہ ہے - سکندر نامہ کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

''خدایا جہان بادشائی تراست ز ما خدمت آید خدائی تراست''

(سکندر نامہ صفحہ ۲ مطبع حسنی میر حسن رضوی لکھنؤ مطبوعہ ۱۲۷۳ھ - صفا جلد دوم صفحہ ۸۰۳ ببعد - شفق صفحہ ۲۳٦ - دیوان قصائد و غزلیات نظامی گنجوی صفحہ ۷۳)

۳۲ - مخزن اسرار - نظامی کی سب سے پہلی مثنوی جو کوئی ۲۲٦۰ (نفیسی کے مطابق ۲۳۰۰) اشعار پر مشتمل اور فخر الدین بہرام شاہ بن داؤد کے نام معنون ہے، جو ارزنگان کا حکمران اور سلجوق بادشاہ قلج ارسلان کا باجگذار تھا - فخر الدین نے اس کے عوض نظامی کو پانچ ہزار دینار اور پانچ خچر انعام میں دیے - یہ مثنوی ۵۷۰ھ (نفیسی کے مطابق ۵۵۲ھ) کے لگ بھگ لکھی گئی اور بیس مقالوں پر مشتمل ہے جن میں پند و موعظت و حکمت کا بیان ہے - بقول صفا یہ مثنوی ''از آمہات مثنویہای فارسی ...... است'' - اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

ھست کلید در گنج حکیم   بسم اللہ الرحمن الرحیم

(صفا جلد دوم صفحہ ۸۰۱ ، ۸۰۲ - شفق صفحہ ۲۳۳ ، ۲۳۴ - مخزن اسرار مطبوعہ نول کشور صفحہ ۲ - دیوان....نظامی گنجوی صفحہ ۴۷)

۳۳ - ھفت پیکر - ھفت پیکر یا بہرام نامہ یا ھفت گنبد ، نظامی کی چوتھی مثنوی ھے جو ۵۱۳۶ (نفیسی کے مطابق ۵۶۰۰) اشعار پر مشتمل اور مراغہ کے حکمران علاء الدین کرپ ارسلان کے نام منسوب ھے - (شفق نے اشعار کی تعداد ۴۶۰۰ دی ھے) ۵۹۳ھ میں لکھی گئی - یہ مثنوی ساسانی دور کے بادشاہ بہرام پنجم (جسے بہرام گور بھی کہا جاتا ھے) کی داستان پر مشتمل ھے - یعنی پہلے اس کے بچپن اور جوانی سے لے کر تخت نشینی تک کا تذکرہ ھے - پھر ھفت اقلیم کے بادشاھوں کی سات لڑکیوں سے اس کی شادی کی داستان ھے - بہرام نے ھر ایک کے لیے علیحدہ علیحدہ ایک خاص رنگ کا گنبد بنوایا تھا - ھر روز وہ ایک دلہن کے پاس مہمان رھتا اور وہ دلہن اسے ایک کہانی سناتی - یہ سات داستانیں جو سات دلہنوں کی زبانی بیان ھوئی ھیں ، خاصی دلچسپ ھیں - ان داستانوں کے بعد بہرام کی غفلت کے سبب اس کی سلطنت کے انتشار کا ذکر ، ایران پر چین کے حملے ، اور رعیت پر بہرام کے وزیر کے ظلم کا بیان ھے - آخر میں بتایا ھے کہ کس طرح وہ ایک گورخر کا پیچھا کرتے ھوئے ایک غار میں گھسا اور پھر واپس نہ آیا -

اس مثنوی کا پہلا شعر یہ ھے -

"ای جہان دیدہ بود خویش از تو   ھیچ بودی نبودہ پیش از تو

(صفا جلد دوم صفحہ ۸۰۳ ، ۸۰۴ - شفق صفحہ ۲۳۵ - ھفت پیکر صفحہ ۲ - دیوان ....نظامی گنجوی صفحہ ۱۰۱)

۳۴ - شیرین و خسرو - نظامی کی دوسری مثنوی ھے - ۵۷۶ھ میں مکمل ھوئی - نفیسی کے مطابق ۵۷۶ میں شروع اور ۵۸۷ میں مکمل ھوئی - اس مثنوی میں نظامی نے دو تین امرا کے نام لیے ھیں - بظاھر یہ مثنوی شمس الدین محمد جہان پہلوان بن ایلدگز کے نام معنون اور ۶۵۰۰ اشعار پر مشتمل ھے - نفیسی نے اشعار کی تعداد ۷۷۰۰ لکھی ھے -

ساسانی دور کے بادشاہ خسرو پرویز اور شیریں کے معاشقہ کی داستان ہے ۔ اس سے پہلے فردوسی اس داستان کو شاہنامہ میں منظوم کر چکا ہے ۔ علاوہ ازیں جاحظ نے 'المحاسن و الاضداد' اور ثعالبی نے 'غرر اخبار ملوک الفرس' میں بھی یہ داستان بیان کی ہے ۔ ان کتب کے مطابق شیریں ایک ارمنی کنیز تھی اور ان کے عشق کا آغاز ہرمز (خسرو کا باپ ۔ ۵۷۹ء میں تخت نشین ہوا ۔ ۵۹۰ء میں مارا گیا) کے عہد میں شروع ہو گیا تھا ۔ لیکن نظامی کی 'خسرو و شیریں' میں اس شیریں کو ارمنی شہزادی بتایا گیا ہے ۔

اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

خداوندا در توفیق بکشای　　　نظامی را رہ تحقیق بنمای

(صفا جلد دوم صفحہ ۸۰۲ ۔ شفق صفحہ ۲۳۴ ۔ خسرو و شیریں صفحہ ۲ ۔ خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۴۷ ، ۴۸ ۔ دیوان...نظامی گنجوی صفحہ ۸۷ ، ۹۲)

۳۵ ۔ لیلی و مجنوں ۔ نظامی کی تیسری مثنوی ، ۵۸۴ھ میں شروانشاہ ابوالمظفر اخستان کے فرمان پر لکھی گئی ۔ اس نے یہ نام لکھ کر نظامی کے پاس قاصد بھیجا تھا ۔ چناں چہ نظامی نے یہ عشقیہ داستان منظوم کرکے اسی کے نام منسوب کی ۔ یہ مثنوی ۴۷۰۰ (نفیسی نے ۵۱۰۰ اشعار اور شفق نے چار ہزار لکھا ہے) ابیات پر مشتمل ہے اور چار ماہ سے بھی کم مدت میں لکھی گئی ۔ اس میں وہ بعد میں بھی تجدید نظر کرتا رہا ۔ اور اس طرح ۵۸۸ھ تک اس میں کاٹ چھانٹ وغیرہ ہوتی رہی ۔

یہ داستان مجنوں (قیس بن ملوح بن مزاحم) جو قبیلۂ بنی عامر سے تھا ، اور اسی قبیلے کی لیلیٰ بنت سعد کی عشقیہ اور عرب کی قدیم داستان ہے ۔ نظامی سے پہلے بھی عرب و عجم کے کئی ایک آدبا نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ نظامی نے اس داستان میں کئی ایک تصرفات کئے ۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے :

''ای نام تو بہترین سر آغاز　　　بی نام تو نامہ کی کنم باز''

(صفا جلد دوم صفحه ۸۰۳ - شفق صفحه ۲۳۴ ، ۲۳۵ - لیلیٰ مجنون صفحه ۲ - دیوان نظامی گنجوی صفحه ۹۳)

۳۶ - قران السعدین - امیر خسرو کی سب سے پہلی مثنوی ہے جو انہوں نے ۶۸۸ھ میں ۳۶ برس کی عمر میں تصنیف کی - اس مثنوی میں معزالدین کیقباد (۶۸۶ھ — ۶۸۸ھ) اور اس کے باپ نصیرالدین محمود بغرا خاں بن غیاث الدین بلبن کا قصہ ہے ، جو بقول مولانا شبلی نہایت بیہودہ ہے یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط و کتابت -

قصہ یوں ہے کہ بلبن کے مرنے پر کیقباد تخت نشین ہوا - اس وقت اس کا باپ لکھنوتی میں خود مختار آزاد حکمران بنا رہا - تخت نشینی کے بعد جب کیقباد عیش و نشاط میں مشغول ہوا تو باپ نے اسے شفقت آمیز خطوط لکھ کر غفلت سے بیدار کرنا چاہا - لیکن بیٹے نے باپ کی نصیحتوں کا کچھ خیال نہ کیا - باپ نے صورت حال بگڑتے دیکھی تو بیٹے کو راہ راست پر لانے کے لیے لشکر لے کر لکھنوتی سے اودھ کی طرف آیا - ادھر بیٹے کا مختار کل نظام الدین باربک دهلی سے فوج لے کر ادھر بڑھا - باربک نے دریائے سرجو کے قریب ڈیرے لگائے - یہیں بعد میں کیقباد بھی پہنچ گیا - دریا کے دوسری جانب بغرا خاں کی فوج تھی - ایک روز باپ نے بیٹے کو سیر و تفریح کرتے دیکھا تو غایت محبت پدرانہ میں اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور ایک حاجب کو کشتی میں بھیجا کہ اس کی طرف سے بیٹے کو شوق ملاقات کا پیام دے - اس طرح کبھی ادھر سے کوئی گیا کبھی ادھر سے کوئی آیا اور آخر دوسرے روز بغرا خاں اپنے بیٹے کے یہاں گیا - کیقباد نے باپ کی آمد میں اپنا دربار خوب آراستہ کیا اور جب دونوں ایک دوسرے سے مل کر بغلگیر ہوئے تو دیر تک زار و قطار روتے رہے - پھر باپ نے اصرار کر کے بیٹے کو تخت پر بٹھایا اور خود درباری رسم کے مطابق دست بستہ تخت کے سامنے کھڑا ہوا ، لیکن کیقباد تخت سے فوراً اتر آیا - پھر امراء نے دونوں بادشاہوں پر لعل و گہر نچھاور کیے - بعد ازیں جشن منائے گئے -

آخر باپ نے بیٹے کو بہت سی نصیحتیں کیں اور رموز حکمرانی بتائے۔ پھر اس سے وداع ہو کر لکھنوتی کا رخ کیا ۔ کیقباد دھلی کی طرف چلا گیا ۔ دھلی پہنچ کر اُس نے امیرخسرو کو بلا کر اس تاریخی ملاقات کو منظوم کرنے کی فرمائش کی ۔

مولانا شبلی کے مطابق اس مثنوی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ''نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں ۔ اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھ کر ان باتوں کو نہ لکھتا ''۔

بقول سید حسن برنی ، پوری مثنوی عشرت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور سراپا مرقع عیش ہے ۔ لیکن اس سے اس زمانہ کے تمدنی حالات اِس قدر معلوم ہوتے ہیں کہ اس عہد کی تہذیب و ثقافت کا بھی یہ مرقع ہے ۔ یہ مثنوی فارسی لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی اور اپنے رنگ میں بالکل انوکھی کتاب ہے ۔ اس مثنوی کے لیے خسرو کے سامنے کوئی نمونہ موجود نہ تھا اور خسرو کے بعد اس کا جواب بھی نہیں لکھا گیا ۔

اس مثنوی کی بحر وہی ہے جو نظامی کی ''مخزن الاسرار'' کی ہے ۔ لیکن خسرو نے اس میں اتنی مختلف قسم کی نئی باتیں پیدا کر دی ہیں کہ یہ اپنے رنگ کی ایک خاص مثنوی ہو گئی ہے ۔ مثنوی میں غزل اور قصیدہ کا لطف بھی پیدا کیا گیا ہے ۔ ''جہاں خشکی پیدا ہونے لگتی ہے وہاں موقع سے اس طرح مختلف بحروں کی غزلیں آ جاتی ہیں کہ یہ خشکی رنگینی میں بدل جاتی ہے ۔ مثنوی کی ابتدا قصیدہ کے رنگ کے اشعار سے ہوتی ہے۔'' پہلا شعر یہ ہے :

شکر گویم کہ بتوفیق خداوند جہان
بر سر نامہ ز توحید نوشتم عنوان

(لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو از محمد وحید مرزا صفحہ ۱۶۳ - قرآن‌السعدین ۱۲۸۷ھ صفحہ ۲ - بزم مملوکیہ صفحہ ۳۲۴ — ۳۲۶ ، ۳۳۹ ، ۳۴۰ - شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۲۵ ، ۱۳۹ ، ۱۴۱)

۳۷ - مطلع الانوار - امیر خسرو نے خمسۂ نظامی کا جو جواب لکھا، اس سلسلے کی سب سے پہلی مثنوی اور نظامی کی 'مخزن الاسرار' کا جواب ہے - یہ مثنوی امیر نے سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر لکھی - دو ہفتوں میں انجام پذیر ہوئی - سال اختتام ۶۹۸ھ ہے -

اس مثنوی میں تصوف کے مضامین ہیں - یہ بیس ابواب پر اور ہر باب ۱۲۵ اشعار پر مشتمل ہے - ہر مضمون کے بیان کے بعد آخر میں ایک داستان ہے - تمام ابواب اور حمد و ثنا وغیرہ کے اشعار کی تعداد ۳۳۱۰ ہے - آغاز اس شعر سے ہوتا ہے ;

بسم اللہ الرحمن الرحیم خطبۂ قدس ست بملک قدیم

(شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۲۵ - لائف اینڈ ورکس آف امیر خسرو صفحہ ۱۹۳ - مطلع الانوار مطبوعہ نولکشور ۱۳۰۳ھ صفحہ ۲)

۳۸ - ہشت بہشت - امیر خسرو کی سب سے آخری مثنوی اور 'ہفت پیکر' نظامی کا جواب ہے' اور اس میں اس کی شاعری پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے - اس میں جو خاص بات ہے وہ بقول شبلی واقعہ نگاری کا کمال ہے - ساری مثنوی فرضی حکایات سے پر ہے - لیکن خسرو نے اس میں یہ التزام کیا ہے کہ ''جو واقعہ لکھا جائے اس کے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات، جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے، ادا کیے جائیں - تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی''۔

مثال کے طور پر اس میں ایک قصہ ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اسے بادشاہ نے کسی جرم کی پاداش میں ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا - حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، تو حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لے آؤ - جب وہ دونوں چیزیں لے آئی تو وہ اوپر سے بولا کہ ''ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منہ میں، جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو، دے دو، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جاؤ''۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا - چیونٹی

تار کو لیے ہوئے اوپر بڑھتی چلی گئی - جب حسن کے قریب پہنچی تو اس نے تار کو لے کر اس سے رسی بٹی اور پھر ایک خاص تدبیر سے اسی کے سہارے نیچے اترا - وغیرہ -

یہ مثنوی ۷۰۱ھ میں مکمل ہوئی اور ۳۳۸۲ اشعار پر مشتمل ہے (وحید مرزا کے مطابق ۳۳۵۰) - قبل از اسلام ایران کے ساسانی بادشاہ بہرام گور کی عشقیہ داستان ہے -

اس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے :

ای کشایندۂ خزانۂ جود　　　نقش پیوند کارگاہ وجود

(شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۲۶ - صفحہ ۱۳۶ — ۱۳۷ - لائف اینڈ ورکس ...... صفحہ ۲۰۱ ، ۲۰۲ - ہشت بہشت امیرخسرو مطبوعہ نولکشور ۱۲۹۰ھ صفحہ ۲)

۳۹ - اعجاز خسروی - امیر خسرو نے ۷۱۹ھ میں لکھی - اسے رسائل الاعجاز بھی کہتے ہیں - تین جلدوں پر مشتمل ہے - اس میں نثر نویسی کے اصول و قواعد منضبط کیے اور سیکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں - علاوہ ازیں یہ کتاب صنایع و بدایع پر مشتمل ہے - اس میں پانچ رسالے (یا ابواب) ہیں - جن میں سے چار ۶۸۲ھ میں مکمل ہو چکے تھے - پانچواں رسالہ جو خطوط پر مشتمل ہے ، بعد میں اس کتاب میں شامل کیا -

(شعرالعجم جلد دوم صفحہ ۱۲۷ - نگار، علوم اسلامی ... نمبر صفحہ ۱۵۰ - لائف اینڈ ورکس آف امیرخسرو صفحہ ۲۱۶)

۴۰ - مجیر الدین بیلقانی - ابو المکارم مجیر الدین ، تخلص مجیر - آذر بائیجان کے شمال میں بیلقان، کا رہنے والا اور ماں کی طرف سے حبشی نژاد تھا - اس کی زندگی کے حالات معلوم نہیں - اتنا مسلم ہے کہ وہ شاعری وغیرہ میں خاقانی کا شاگرد تھا - لیکن بعد میں کسی بناء پر دونوں میں ٹھن گئی اور دونوں نے ایک دوسرے کی ہجو میں اشعار کہے - اس معاملے میں مجیر اپنے استاد سے دو قدم آگے ہی رہا -

مجیر آذر بائیجان کے اتابکوں ، یعنی شمس الدین ایلدگز (۵۵۵ – ۵۶۸ھ) نصرۃالدین جہاں پہلوان محمد بن ایلدگز (۵۶۸ – ۵۸۱ھ) اور قزل ارسلان عثمان بن ایلدگز (۵۸۱ – ۵۸۷ھ) وغیرہ کے درباروں سے وابستہ رہا۔

بقول دولت شاہ اُسے ایلدگز کا تقرب حاصل اور وہ نیابت پر مامور تھا - لیکن درباری شعرا اس سے حسد کھانے لگے جس کے سبب اُسے اصفہان کے دیوان سے مالیہ وغیرہ کی رقوم حاصل کرنے کے لیے اصفہان بھیجا گیا - وہاں وہ اُس شہر کے شعرا سے اُلجھ پڑا اور اصفہان کی ھجو کہی - جواب میں وہاں کے شعرا نے اس کی ھجو کہی اور اسے تکلیف بھی پہنچائی -

قزل ارسلان نے شروع شروع میں اس کی بڑی قدر کی - لیکن بعد میں کسی بنا پر اُسے چھوڑ کر دوسرے شعرا اثیر اخسیکتی اور جمال‌الدین وغیرہ کو دربار میں جگہ اور مجیر پر برتری دی -

اس کی تاریخ وفات میں اختلاف ہے - ھدایت نے ۵۷۷ھ لکھا ہے - کسی نے ۵۸۶ اور کسی نے ۵۶۸ وغیرہ - بہر حال صفا اور شفق کے قریب ۵۸۶ھ زیادہ قرین صحت ہے - بعض تذکرہ نویسوں کے مطابق اُسے اصفہان کے عوام اور اوباشوں نے قتل کر دیا تھا -

اُس کا دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے - وہ اپنے دور کا خوش ذوق اور 'نیکو سخن' شاعر تھا - تذکرۃ الشعرا میں ہے کہ امیر خسرو نے اُسے خاقانی پر ترجیح دی ہے -

(صفا جلد دوم صفحہ ۷۲۱ – ۷۲۳ - شفق صفحہ ۲۲۵ ، ۲۲۶ - تذکرۃالشعرا مؤلفہ عبدالغنی غنی مطبوعہ علی‌گڑھ صفحہ ۱۱۹)

۱۴ - صائب - مرزا محمد علی نام ، صائب تخلص - اُس کا تعلق ایک معزز خاندان سے تھا اور اُس کا باپ مرزا عبدالرحیم ایک مشہور تاجر تھا - بقول شبلی ولادت تبریز میں ہوئی - صاحب آتشکدہ کے مطابق وہ اصفہان کے پاس ایک دیہات عباس آباد میں پیدا ہوا تھا - اُسی

سبب سے اُسے اصفہانی بھی کہتے ہیں اور تبریزی بھی۔ سال ولادت ۱۰۱۰ھ کے لگ بھگ ہے۔ نشو و نما اور تربیت اصفہان ہی میں ہوئی۔ شعر و شاعری سے اُسے قدرتی مناسبت تھی۔ اُس کے باوجود مذہبی خیالات اُس پرغالب تھے۔ چنانچہ آغاز شباب میں مکہ کا سفر کیا۔ واپسی پر مشہد مبارک کی زیارت کی۔

شاعری کی باقاعدہ تعلیم مشہور شاعر حکیم رکنا مسیح کاشی اور حکیم شفائی سے حاصل کی۔ کم عمری ہی میں وارد ہند ہوا اور شاہجہان کے دربار میں رسائی حاصل کی۔ شاہجہان نے اُسے ہزاری منصب کے علاوہ مستعد خان کا خطاب بھی دیا تھا۔ شاہجہان ہی کے دربار میں اس کی ملاقات مشہور تیموری امیرظفرخان دیوان دکن وغیرہ (اُس کا ذکر کسی دوسرے حاشیے میں ملاحظہ ہو) سے ہوئی۔ اس نے اُس کی شاگردی اختیار کی۔ اُن کے تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ دونوں کے نام ساتھ ساتھ لیے جاتے ہیں۔

ظفر خان اور دوسرے امرائے دربار کے خوان کرم سے فیض یاب ہوا۔ ہند میں آئے اسے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا تھا کہ اُس کا ستر سالہ باپ اُسے ایران واپس لےجانے کے لیےوارد ہند ہوا۔ اس موقع پر صائب کو اپنے ممدوح و محسن ظفر خان سے مجبوراً رخصت لینا پڑی۔ اُس کا اظہار اُس نے ایک مدحیہ قصیدہ میں کیا جس کا مطلع یہ ہے :

”شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند
افتادہ است توسن عزم مرا گزار“

اصفہان واپس پہنچا تو شاہ عباس ثانی نے اُسے اپنے دربار کا ملک‌الشعرا مقرر کیا۔ لیکن جب سلیمان صفوی عباس کا جانشین بنا تو وہ کسی بات پر اُس سے ناراض ہو گیا اور تمام عمر اُس سے خطاب نہ کیا۔ اُس نے آخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہ نکالا اور بظاہر ایک پرسکون زندگی بسر کرنے کے بعد ۱۰۸۰ھ میں اصفہان میں وفات پائی۔ ”صائب وفات یافت“ (۱۰۸۰) مادۂ تاریخ ہے۔

صائب بڑا خوددار، پابند وضع، پاکیزہ خو اور منکسرالمزاج تھا۔

وہ اپنے معاصر ہندی شعرا کے نام اپنی غزلوں کے مقطعوں میں لایا اور اُس نے اُن کی غزلوں پر غزل لکھنا گوارا کیا، جب کہ دوسرے ایرانی شعرا ہندوستانی شعرا کو درخوراعتناهی نہ جانتے تھے ۔

بقول علامہ شبلی ایران کی شاعری اُس پر ختم ہو گئی ۔ اگرچہ اُس کے بعد بھی شعرا گزرے ہیں ، لیکن وہ شمار کے قابل نہیں ۔ اس کے برعکس مجمع الفصحا کے مؤلف کا یہ کہنا ہے کہ شاعری میں یہ ایک عجیب طرز کا مالک تھا جو اب پسندیدہ نہیں ۔

براؤن کے لفظوں میں ''مختصر یہ کہ عرفی کی طرح صائب بھی ان شعرا میں ہے جن کی ہندوستان اور ترکی میں تو بڑی قدر ہوتی ہے ، لیکن ایران میں انہیں کوئی با وقعت نہیں سمجھتا''۔

اس کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہے ۔

(شعرالعجم جلد ۳ صفحہ ۱۶۹ — ۱۷۵ مطبوعہ اعظم گڑھ ۔ براؤن جلد چہارم اردو ترجمہ از سید وھاج الدین احمد کنتوری صفحہ ۳۷۷ — ۳۷۹ ۔ مجمع الفصحا جلد ۲ ۔ صفحہ ۲۴ ۔ بحوالہ براؤن جلد ۴ ۔ شفق صفحہ ۳۷۰ — ۳۷۱ ۔ ''مختصری در تاریخ ... ...'' اردو ترجمہ صفحہ ۱۵۶)

۴۲ ۔ طوطی نامہ ۔ ضیاء الدین نخشبی کی تصنیف جوان کی حیات دوام کا باعث بنی ۔ یہ کتاب اصل میں سنسکرت میں لکھی گئی ۔ اس کا نام ' شک سپ تتی ' تھا ۔ مولانا کی تصنیف اس سنسکرت کتاب کا براہ راست ترجمہ نہیں ہے ۔ البتہ ہو سکتا ہے طوطی نامہ لکھتے وقت اصل سنسکرت نسخہ اُن کے پیش نظر رہا ہو ۔ شک سپ تتی کا جو فارسی ترجمہ مولانا سے پہلے ہوا تھا ، اس کی عبارت مغلق اور پیچیدہ تھی ۔ مولانا نے صرف یہ کام کیا کہ اس عبارت کو سلیس اور آسان کر دیا ۔ اس ترجمے میں ۷۰ کی بجائے ۵۲ کہانیاں تھیں اور عبارت میں ہندی الفاظ زیادہ تھے ۔ مولانا نے ان میں سے بہت سی فحش کہانیاں نکال دیں اور اُن کی جگہ دوسری کہانیاں لکھ کر شامل کر دیں ۔ اس کتاب سے وہ ۷۳۰ھ (۱۳۳۰ء) میں فارغ ہوئے ۔

سنسکرت کی کتاب میں ھیرو کے باپ کا نام ھردت تھا ، ھیرو کا مدن سین اور ھیروئن کا پربھاوتی ۔ مولانا نے ان کی جگہ علی الترتیب مبارک ، میمون اور خجستہ نام رکھے ۔

دوسری تبدیلی یہ کی کہ سنسکرت کی تصنیف میں قصے کا انجام طربیہ تھا ۔ انھوں نے حزنیہ کر دیا ۔ یعنی وھاں ھیرو اور ھیروئن آخر میں خوشی و آرام کے ساتھ رھنے لگے اور یہاں میمون نے خجستہ کو مار ڈالا اور خود تارک الدنیا ھو بیٹھا ۔

(بحوالہ توتا کہانی ، مقدمہ 'ب' صفحہ ۱۰ ، ۱۲)

۴۳ ۔ نخشبی ۔ضیاء الدین نخشبی ، سلطان محمد تغلق (۷۲۵ھ - ۷۵۲ھ) کے عہد کی ایک بہت با کمال شخصیت تھے ۔ آپ کے بزرگ نخشب سے آ کر بدایوں میں اقامت گزیں ھو گئے تھے ۔ اسی سبب سے یہ ضیاء الدین نخشبی بدایونی کہلائے ۔ صوفی منش اور شیخ فرید الدین ناگوری کے مرید تھے ، جو حمید الدین ناگوری کے خلیفہ و نبیرہ تھے ۔ بقول عبدالحق محدث ، نخشبی خواجہ نظام الدین اولیا کے نہ تو معتقد تھے ، اور نہ منکر ۔

نخشبی بہت اچھے ادیب ، کئی کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ پائے کے شاعر تھے ۔ کئی ایک تصنیفات آپ سے یادگار ھیں ، جن کا تذکرہ اس سے پہلے ھو چکا ھے ۔ لیکن جس کتاب نے آپ کو حیات دوام بخشی وہ ''طوطی نامہ'' ھے ۔

مولانا ضیاء کو طب میں دسترس ھونے کے علاوہ فن موسیقی میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی ۔ مولانا شہاب الدین مہمرہ کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا تھا ۔ عربی اور فارسی کے علاوہ سریانی زبان سے بھی بلد تھے ۔ سنسکرت میں بھی واقفیت بہم پہنچائی تھی ۔

۷۵۱ھ (۱۳۸۰ء) میں بمقام بدایوں وفات پائی اور شہر سے جانب غرب دفن ھوئے ۔

(تحفۃ الفضلاء فی تراجم الکملاء صفحہ ۹۷ ۔ قاموس المشاھیر جلد دوم صفحہ ۴۳ ۔ رسالہ اردو اپریل ۱۹۲۳ء صفحہ ۶۰۴ ۔ رسالہ برھان فروری ۱۹۵۶ء صفحہ ۴۷ ۔ اردوے قدیم صفحہ ۱۲۴ ۔ فہرست مخطوطات

فارسی برٹش میوزیم جلد ۲ صفحہ ۷۶۰-۷۶۱ ۔ بحوالہ توتا کہانی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور مقدمہ ''ب'' از جناب ڈاکٹر وحید قریشی صفحہ ۱۰۹ ۔ اخبار الاخیار صفحہ ۱۰۵) ۔

۴۴ ۔ مولانا حسین واعظ کاشفی ۔ مولانا کمال الدین حسین واعظ ۔ واعظ پیشہ اور سبزوار کے رہنے والے تھے ۔ لیکن سکونت ہرات میں رہی ۔ فقہ : تفسیر ، حدیث ، نجوم ، حکمت اور ادب میں اپنے دور کے بے مثل تھے ۔ صوفی مشرب اور سلسلہ نقشبندیہ کے پیرو تھے ۔

بہ قول صاحب روضۃ الصفا آواز بڑی دل کش اور لطیف پائی تھی ۔ جمعہ کی صبح کو دارالخلافہ (ہرات) میں وعظ کیا کرتے ۔ نماز جمعہ کے بعد مسجد جامع علی شیر میں جاکر یہی کام کرتے ۔ سوموار کو مدرسہ سلطان میں ، بدھ کو پیر محمد خواجہ ابوالولید احمد کے مزار پر جا کر وعظ کرتے ۔ اور ایک زمانے میں جمعرات کے روز حظیرۂ سلطان احمد میرزا میں وعظ کہتے رہے ۔ ۹۱۰ھ میں وفات پائی ۔ کثیر التالیف اہل قلم میں سے ہیں ، اور گونا گوں مسائل پر بیسیوں کتب یادگار چھوڑی ہیں ، ان میں سے انوار سہیلی ، مخزن الاشیا ، روضۃالشہدا، اخلاق محسنی ، مواہب علیہ ، اور لب لباب مثنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

(روضۃ الصفا جلد ۷ صفحہ ۸۹ - ۹۰ ۔ 'مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر پارسی' از صفا اردو ترجمہ مطبوعہ پشاور صفحہ ۱۲۴ ، ۱۲۵ ۔ براؤن جلد ۳ اردو ترجمہ صفحہ ۲۰۶) ۔

۴۵ ۔ انوار سہیلی ۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یہ حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے ۔ یہ کتاب در اصل کلیلہ و دمنہ کا ترجمہ اور اس کا نیا روپ ہے ۔ یہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے ۔ اس کی طرز انشا مصنوع اور متکلف ہے ۔ اس میں اخلاق کے اصولوں کو حکایات کے رنگ اور جانوروں کی زبان میں بیان کیا گیا ہے ۔ یہ کتاب فارسی کی مشہور کتب میں سے ہے ۔

(مختصری در.....اردو ترجمہ صفحہ ۱۲۴ ۔ تاریخ ادبیات ایران

از دکتر شفق مطبوعہ وزارت فرہنگ، صفحہ ۳۵۸ - براؤن جلد ۳ ، اردو ترجمہ صفحہ ، ۶۵۸ - انوار سہیلی مطبوعہ نول کشور ، ۱۸۷۳ء) -

۳۶ - عیار دانش - سنسکرت کی مشہور کتاب کلیلہ و دمنہ کا فارسی ترجمہ جسے ابوالفضل نے ۹۹۶ھ میں مکمل کیا اور عیار دانش نام رکھا - مولانا نیاز فتح پوری کے نزدیک یہ انوار سہیلی کا خلاصہ ہے -

کلیلہ و دمنہ قصے کہانیوں پر مشتمل ایک اخلاق کتاب ہے - جس میں مختلف جانوروں کی زبانی اخلاق درس دیے گئے ہیں - پہلے یہ سنسکرت میں تھی - پھر قبل از اسلام ایران میں اس کا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوا - پہلوی سے اسے ابن المقفع نے عربی میں ڈھالا - اور فارسی میں سب سے پہلے اس کا منظوم ترجمہ فارسی شاعری کے بابا آدم رودکی نے نصر بن احمد سامانی (۳۰۱-۳۳۱ھ) کے حکم سے کیا - پھر چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں ابوالمعالی نصر اللہ بن محمد بن عبدالحمید منشی نے اسے بلیغ فارسی نثر کا روپ دیا - نویں صدی ہجری میں ملا حسین واعظ کاشفی نے اسے انوار سہیلی کے نام سے مصنوع و متکلف فارسی میں لکھا - اس کے بعد ابوالفضل کی باری آتی ہے - ملا حسین واعظ کاشفی کا ترجمہ سخت الفاظ و استعارات کے سبب بے حد پیچیدہ اور مشکل تھا ، جس کے سبب اس کا سمجھنا آسان نہ تھا - اکبر نے ابوالفضل کو حکم دیا کہ اصل سنسکرت کو سامنے رکھ کر ایسی عبارت میں ترجمہ کرے کہ اس کے پندونصائح آسانی سے سمجھ میں آئیں - چناں چہ اس نے ۹۹۶ھ میں یہ ترجمہ مکمل کیا - کتاب کے اختتام پر اس نے ایک خاتمہ لکھا ہے جس میں بعض نادر معانی و نکات بیان کیے ہیں -

صفا نے غلطی سے اسکا نام بہار دانش لکھا ہے -

(صفا جلد دوم ، صفحہ ۹۳۸ - بزم تیموریہ صفحہ ، ۶۵ - شفق صفحہ ۳۵۸ - مختصری در تاریخ تحول نظم و نثر فارسی از دکتر صفا اردو ترجمہ از ڈاکٹر نذیر میرزا برلاس ، صفحہ ۱۶۴ - نگار علوم اسلامی وعلماء اسلام نمبر صفحہ ۱۴۴) -

۴۷ - بہار دانش۔ شیخ عنایت اللہ نے شاھجہان کے عہد میں لکھی۔ یہ کتاب بھی کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ ہے۔ بہ قول محمد صالح کنبوہ یہ کتاب رنگین عبارتوں کے سبب 'سواد ارم' کا نمونہ ہے۔ اس 'گلشن فیض' میں اس نے قدیم ہندوستان کے افسانوں کو فارسی عبارت میں ڈھالا ہے، اور بہت سی 'حکایت ھائے نو آئین' لکھی ہیں کہ ہر ایک اپنی جگہ ایک 'افسانۂ دل پذیر' ہے۔

(عمل صالح جلد سوم صفحہ ۴۲۹)

۴۸ - کیومرث۔ یہ سریانی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی 'حی ناطق' (زندہ گویا) کے ہیں۔

شاہ کیومرث کے نسب میں بے حد اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے وہ مہیائیل کے پوتوں میں سے تھا۔ غزالی[۳] نے 'نصیحۃ الملوک' میں اسے شیث[۴] کا بھائی لکھا ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق وہ امیم بن لادو بن ارم بن سام بن نوح ہے۔ مؤلف غنیہ کا کہنا ہے کہ وہ یافث بن نوح کا ایک بیٹا تھا، جسے عرب عامر کہتے ہیں اور عجم والے کیومرث۔ اور بعض کے نزدیک کیومرث سے مراد 'آدم ابوالبشر' ہے۔ اسے گل شاہ بھی کہتے ہیں۔ صاحب روضۃ الصفا کے مطابق وہ پیشدادی خاندان کا بانی تھا۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ وہ دنیا کا سب سے پہلا بادشاہ ہے جو مسند سلطنت پر بیٹھا۔

اس کے سربراہ بننے سے پہلے ربع مسکون میں ظلم و جور راہ پا گیا تھا۔ اس ظلم و جور کو دور کرنے کے لیے عقلا و اشراف کے ایک گروہ نے سوچ بچار کی اور یہ چاھا کہ دنیا کے نظم و نسق اور اولاد آدم کی فلاح و بہبود کے لیے ایک ایسا مدبر اور صاحب اقتدار شخص ہو، جس کی ذات عدل و انصاف کی صفات سے آراستہ ہو۔ چناں چہ اس سلسلے میں کیومرث کا نام پیش ہوا اور وہ تاج شاہی پہن کر سریر آرائے سلطنت ہوا۔

بادشاہ بننے کے بعد اس نے گردن کشوں کو زیر کیا، خاص و

عام کو انعام و اکرام سے نوازا۔ ظلم کو مٹایا ، ہر کس و ناکس کو اپنے عدل و احسان سے خوش رکھا - محتاجوں کی حاجت پوری کرنے میں پیش پیش رہا ، اور ہیبت و دبدبہ اس طرح پھیلایا کہ کسی کو بھی کسی پر ظلم کرنے کی جرأت نہ رہی - جب وہ تنظیم امور سے فراغت پاتا تو سیر و سیاحت میں مشغول ہو جاتا ، اور اطراف کوہ و دشت میں خالق کی پرستش کرتا ۔

اس نے دیووں کے ایک گروہ سے ، جو پہاڑوں کی چوٹیوں پر مقیم تھے ، لڑائی کی - بہت سے دیو اس کے ہاتھوں قتل ہوئے ۔ اس لڑائی میں اس کا ایک بیٹا سامک بھی مارا گیا ۔

قاضی بیضاوی نے اپنی بعض تالیفات میں لکھا ہے کہ کیومرث نے دو شہر بنائے ۔ اصطخر ، جس میں وہ بیشتر مقیم رہتا ، اور شہر دماوند ، جہاں کبھی کبھار جا کر رہتا ۔ تاریخ جعفری کے مطابق اردبیل ، فلسطین ، بابل ، قومس ، مکران ، نصیبین ، نسا ، جرجان ، حمص اور سیستان بھی اسی نے بنائے ۔ لیکن بعض مؤرخین ان میں سے کچھ شہروں کو دوسروں سے منسوب کرتے ہیں ۔

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ ریشم بننے ، کاتنے اور اس سے کپڑے بنانے کا آغاز اس کے زمانے میں ہوا ، اور کپڑے سینے کا کام اس نے حضرت ادریس[ؑ] سے سیکھا - بعض کے مطابق زین ، لگام اور سواری اس کی اختراعات میں سے ہیں ۔

اس نے ہزار سال سے زیادہ عمر پائی ۔ چالیس سال کے قریب بعض کے نزدیک تیس سال ، حکومت کی ، اور آخر میں تاج و تخت اپنے پوتے ہوشنگ کے سپرد کرکے مرتے دم تک گوشہ نشین رہا ۔

(تاریخ معجم از شرف الدین فضل اللہ، مطبع مفید عام لاہور، ۱۸۹۶ء صفحہ ۱۴ ببعد (یہ کتاب ۷ویں صدی ہجری میں لکھی گئی) - روضۃ الصفا مطبوعہ نول کشور جلد اول ، صفحہ ۱۶۶۔نیز دیکھیں شاہ نامہ فردوسی مطبوعہ نول کشور جلد اول ۔ براؤن ، جلد اول ، فارسی ترجمہ مطبوعہ ایران صفحہ ۱۷۰) ۔

۴۹ - رستم - شاہ نامہ کے مشہور پہلوانوں میں سے ہے - زال اور رودابہ کا فرزند اور مہراب کابلی کا نواسا تھا - منوچہر کے زمانے میں پیدا ہوا اور ہنر و جواں مردی کی تعلیم پائی -

اس کی پہلوانی کی داستان 'پیل سفید' کے مارنے سے شروع ہوئی - اس کے بعد اس نے بے شمار مواقع پر اپنی بہادری کے جوہر دکھائے اور فتح مندیوں سے ہم کنار ہوا ، جن میں سے کچھ یہ ہیں :- اس نے 'کوہ سپند' کے قلعے کو فتح کیا جسے سام اور نریمان ایک مدت تک محاصرہ کر کے فتح نہ کر سکے تھے ، کیقباد کو کوہ البرز سے لا کر تخت پر بٹھایا - 'ہفت خواں' طے کیے (یعنی سات منزلیں طے کرنے کے دوران مختلف موانع اور درندوں دیووں کا مقابلہ کیا -) ، مازندران کو فتح کر کے کاؤس کو 'دیو سفید' کے چنگل سے نجات دلائی' ماوران کے بادشاہ سے جنگ کی اور کاووس کو قید سے رہا کرایا - اپنے بیٹے (سہراب) سے جنگ کر کے اسے پہچانے بغیر ہی مار ڈالا' سیاؤش کا بدلہ لینے کے لیے افراسیاب سے جنگ کی - (روضۃالصفا میں ہے کہ اس جنگ میں رستم صفیں چیرتا ہوا افراسیاب تک پہنچ گیا - افراسیاب اس کے دبدبہ سے ڈر کز بھاگ کھڑا ہوا - رستم نے تعاقب کر کے اسے پکڑ لیا اور گھوڑے سے اتار لیا - پھر اس کے گلے میں رسی ڈال کر کشاں کشاں اپنے لشکر کی طرف لے آیا- افراسیاب نے راستے ہی میں، جب کہ رستم اپنے لشکریوں کی تحسین و آفرین کا جواب دینے میں مصروف تھا ، سحر و افسوں کے زور سے رسی کا بند کھول کر کسی مردے کے گلے میں ڈال دیا ، اور خود اپنے معسکر کی طرف بھاگ گیا - رستم اس مردے کو کھینچ کر شہر کی جانب لے آیا - وہاں پہنچ کر جب اسے پتا چلا کہ افراسیاب کی جگہ کسی مردے کو لے آیا ہے تو کیقباد کے سامنے بے حد شرمندہ ہوا -) تورالیرن سے جنگ کی ، اشکبوس کو مارا ، خاقان چین کو گرفتار کیا ، اکوان دیو سے جنگ کی - بیژن کو کنوئیں سے نکالا ، اور اسفندیار سے جنگ کر کے اسے اندھا کر دیا ، پھر مار ڈالا -

ان تمام بہادریوں کے بعد آخر اپنے بھائی شغاد کی غداری سے کنویں

میں گرا اور شغاد کو مارنے کے بعد خود بھی مر گیا ۔

(شاہنامہ ، جلد اول ، صفحہ ۸۱ ، ۱۰۶ ببعد ۔ روضۃالصفا جلد اول صفحہ ۱۹۰ ۔ راہنمای ادبیات فارسی صفحہ ۱۲۳ ، ۱۲۴)

۵۰ ۔ اسفندیار ۔ اسفندیار یا اسفندیاذ یا سپنددات ۔ گشتاسپ کا بیٹا تھا جو ایران کا بادشاہ اور آتش پرستوں کے سب سے بڑے مذہبی راہنما زردشت (زرتشت) کا پیرو تھا ۔ زرتشت ہی کے کہنے پر اسفندیار نے اس کا مذہب قبول کیا ۔

گشتاسپ ہر سال ترکستان خراج بھیجا کرتا تھا ۔ زردشت نے اسے منع کیا کہ وہ ایک کافر کو خراج نہ دے ۔ پھر گشتاسپ نے ترکستان کے فرماں روا ارجاسب کو مجوسی مذہب قبول کرنے کی دعوت دی تو اس نے غصے میں لکھا کہ اگر تم اپنے مذہب پر واپس نہ آؤ گے تو میں تم پر چڑھائی کر دوں گا ۔ جواب میں گشتاسپ نے مشورہ کرکے ایک سخت خط ترکستان کے فرماں روا کو لکھا ۔ جس پر وہ لشکر لے کر چڑھ آیا ۔ گشتاسپ نے بھی لشکر اکٹھا کیا ، اور اسفندیار سے کہا کہ اگر تم ترکوں پر فتح پا لو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تاج و تخت تمھیں سونپ دوں گا ۔ گشتاسب کے لشکر کو فتح ہوئی ۔ پھر اسفندیار کو آذر بائیجان اور آرمینیہ کی تسخیر کے لیے بھیجا گیا ۔ اسی دوران میں کسی نے چغلی کھائی کہ اسفندیار باپ کا دشمن اور تخت کا تمنائی ہے ، جس کے نتیجہ میں گشتاسپ نے اسے قلعہ گرد کوہ میں محبوس کر دیا ۔

کچھ عرصہ بعد ارجاسب نے پھر ایران پر حملہ کر دیا ۔ اب کے گشتاسپ نے شکست کھائی ، اور ارجاسب اس کی لڑکیوں کو ترکستان لے گیا ۔ اسفندیار کے چچا نے آسے اپنے باپ کی مدد کےلیے آکسایا ۔ چناں چہ اس نے ارجاسب کا مقابلہ کر کے اسے شکست دی ۔ ارجاسب پر حملہ کرنے کے لیے اسے راستے میں کئی منزلیں طے کرنی پڑیں جنھیں 'ھفت خواں' کہتے ھیں ۔ آخر رستم کے ساتھ ایک لڑائی میں مارا گیا ۔ اسفندیار کو روئین تن (کانسی کے جسم والا) بھی کہتے ھیں ۔ کہا جاتا ھے کہ اس کے جسم پر تیر اور تلوار کا اثر نہ ھوتا تھا ۔ اور یہ کہ

رستم نے اس کی آنکھ میں تیر مارا تھا جس کے سبب اس کی موت واقع ہوئی ۔ لیکن بہ قول میرخواند یہ بات بعید از 'صواب' ہے ۔

(روضۃالصفا ، جلد اول صفحہ ۲۰۰-۲۰۲ ، ۲۰۷ - براؤن ، جلد اول، فارسی ترجمہ ، صفحہ ۱۷۸)

۵۱ - شرف‌الدین علی یزدی ۔ تیموری دور کا ایک ادیب اور شاعر تھا ، شرف تخلص ۔ اس کی زیادہ تر شہرت تیمور کے بیٹے شاہ رخ (۸۰۷--۸۵۰ھ) کے زمانے میں ہوئی ۔ ۸۵۸ھ میں اپنے وطن یزد میں فوت ہوا ۔ دولت شاہ نے اس کا ذکر بطور شاعر کے کیا ہے ۔

اسے معما اور چیستان کے نظم کرنے میں خاص کمال حاصل تھا ۔ لیکن اس کی شہرت کا دار و مدار اس کی تاریخی کتاب ظفر نامہ پر ہے جو تیمور کی ولادت سے اس کی وفات (۸۰۷ھ) تک کی تفصیلی تاریخ اور دو جلدوں پر مشتمل ہے ۔ یہ کتاب ۸۲۸ھ میں تالیف ہوئی ۔ 'صنّف فی شیراز' تاریخی مادہ ہے ۔ اس کتاب کا ماخذ زیادہ تر نظام‌الدین شامی کا ظفر نامہ ہے جو تیمور کا معاصر تھا اور تیمور ہی کے کہنے پر اس نے ۸۰۳ھ میں اس کا آغاز کیا تھا ۔

صاحب 'ہفت اقلیم' کے مطابق شرف‌الدین اپنے دور کا 'اشرف فضلا و الطف علماء' تھا ۔ ریو نے لکھا ہے کہ ''شرف‌الدین نے کیا بذریعہ اپنے علم و تقدس کے اور کیا بذریعہ شستہ اسلوب تحریر کے نہایت ممتاز و بلند رتبہ حاصل کیا ، اور مدت تک وہ شاہ رخ اور اس کے فرزند میرزا ابراہیم سلطان کا مقرب رہا''۔ ۸۳۲ھ میں جب میرزا الغ بیگ نے مغولوں کے جوان سال خان ، یونس خان کو گرفتار کیا تو شاہ رخ نے اسے ''شرف‌الدین کی نگرانی اور لائق اتالیقی کے سپرد کیا اور وہ شرف‌الدین کی وفات تک اسی کے پاس رہا ۔'' ''میرزا سلطان محمد عراق کا والی مقرر ہوا تھا اور اس نے قم میں سکونت اختیار کی تھی - ۸۳۶ھ میں اس نے شرف‌الدین کو ، جس سے ان دنوں اس کے وطن یزد میں شاگردوں کا ایک جم غفیر تعلیم پا رہا تھا ، اپنے دربار میں مدعو کیا ۔ اور بطور ایک مہمان عزیز اور مشیر معتمد کے اپنے پاس رکھا''۔ بعد میں

جب سلطان محمد نے بغاوت کی اور شاہ رخ اس کی سر کوبی کے لیے اصفہان پہنچا تو اس نے سلطان کے دیگر غلط اندیش صلاح کاروں کی طرح اسے بھی سزائے موت کا حکم دیا ، لیکن میرزا عبداللطیف کی مداخلت سے یہ بچ گیا اور اسے سمرقند بھیج دیا گیا ۔ شاہ رخ کی وفات کے بعد سلطان محمد نے جو اس وقت خراسان کا حاکم تھا ، اسے واپس یزد چلے جانے کی اجازت دے دی ۔ چناں چہ وہ ۸۵۳ھ میں وطن لوٹ آیا ، اور ایک قریبی گاؤں تفت میں مقیم ہوا ۔ وہیں اس نے ۸۵۸ھ (۱۴۵۴ء) میں وفات پائی اور ایک مدرسے کے احاطے میں مدفون ہوا ، جو خود اسی نے تعمیر کیا تھا ، اور اسی کے نام پر شرفیہ کہلاتا تھا ۔

(تذکرۃالشعرا از دولت شاہ سمرقندی مرتبہ شیخ محمد اقبال صفحہ ۲۵۹ ۔ براؤن جلد سوم 'اردو ترجمہ' صفحہ ۴۹۷—۵۰۰ ۔ شفق صفحہ ۳۵۵ ۔ مختصری در تاریخ....از صفا 'اردو ترجمہ' صفحہ ۱۱۶)

۵۲ ۔ اکبر نامہ ۔ بابر سے اکبر تک مغلیہ خاندان کی تاریخ جسے ابوالفضل نے تین جلدوں میں لکھا ۔ پہلی جلد میں بابر اور ہمایوں کے حالات درج ہیں ۔ دوسری میں اکبر کے عہد حکومت کے تفصیلی احوال مندرج ہیں ۔ تیسری جلد کا نام 'آئین اکبری' ہے ۔ یہ جلد نہایت اہم ہے ۔ اس میں عہد اکبری کے آئین حکومت پر گفتگو کی گئی ہے ۔

بعض مؤرخین کے نزدیک اکبر نامہ کا استناد کچھ مشکوک ہے ۔ ان کے مطابق یہ اکبر کے ایک درباری مؤرخ کی نگارش ہے ، جس میں حد سے زیادہ خوشامد کے پہلو کو مد نظر رکھا گیا ہے ۔ مثلاً بہ‌قول الفنسٹن ''اس کے سنہ و تاریخ اور واقعات کے عمومی بیانات قابل قدر ہیں ، لیکن اس کتاب کو پڑھتے وقت اس کی علانیہ طرف داری سے اپنے کو اتنا محفوظ نہیں رکھنا پڑتا ، جتنا کہ وہ اپنے ممدوحین کی مدح سرائی کرکے ناظرین کی ہمدردی خواہ مخواہ حاصل کرنا چاہتا ہے ، اور پھر بعض موقع پر بے جا اور غیر ایمان دارانہ طریقہ پر ایک قصہ کہہ کر کسی سے بد ظن کر دیتا ہے حالانکہ وہ شخص بالکل معصوم اور قابل معافی ہوتا ہے... ۔'' لیکن اس کے جواب میں ایک دوسرے یورپی

مؤرخ (بلا خمن) نے لکھا ہے کہ ابوالفضل پر خوشامد پرستی کا الزام غلط ہے ، اور یہ الزام بھی غلط ہے کہ اس نے بعض واقعات کو قصداً چھپایا ہے ، کیونکہ اکبر نامہ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بالکل بے بنیاد معلوم ہوتی ہے - اسی طرح مولانا آزاد بھی ان الزامات کو صحیح قرار نہیں دیتے - ان کا کہنا ہے کہ ''جو زبان کے ماہر ہیں اور رموز سخن کے تاڑنے والے ہیں اور کلام کے انداز اور داؤں کو جانتے اور پہچانتے ہیں ، وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ (ابوالفضل نے) کہا اور جس پیرایہ میں کہا کوئی بات آٹھا نہیں رکھی ، اصل حقیقت کو لکھ دیا ہے اور انشا پردازی کا آئینہ آوپر رکھ دیا ہے - یہ اسی کا کام تھا - یہ بھی اسی کا کام تھا کہ سب کچھ کہہ دیا ، اور جن سے نہ کہنا تھا وہ کچھ بھی نہ سمجھے اور اب تک بھی نہیں سمجھتے - خوشامد کی بات ہم نہیں مانتے - ہر زبان کی تاریخیں موجود ہیں کون سا مؤرخ ہے کہ خوشامد شاہ اور حمایت قوم سے پاک ہو...''

(بزم تیموریہ صفحہ ۶۹-۷۱- دربار اکبری از مولانا محمد حسین آزاد صفحہ ۵۰۰ - نگار علوم اسلامی...صفحہ ۱۴۳)

۵۳ - طبقات اکبری - خواجہ نظام الدین احمد کی تالیف ہے - خواجۂ مذکور اکبر کے پنج ہزاری امرا میں سے تھا ، جو اس دور کا بہت بڑا عہدہ تھا - گجرات میں بخشی کے منصب پر فائز اور صاحب ثروت و عزت ہونے کے ساتھ صاحب قلم بھی تھا - یہ کتاب اس نے ۱۰۰۲ھ میں لکھی - (مؤلف کے مطابق 'نظامی' اس کی تاریخ تالیف ہے) - اور یہی اس کی حیات جاوید کا باعث بنی - یہ ایک مقدمہ ، نو طبقہ اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے -

یہ کتاب اس برصغیر کے اسلامی عہد کی بہت ہی جامع تاریخ ہے - مصنف نے اپنی معلومات ان تمام مستند ماخذوں سے حاصل کی ہیں ، جو اس وقت ممکن صورت سے دستیاب ہو سکتے تھے - کتاب کے آغاز میں اپنے ماخذ کے جو نام گنوائے ہیں ، وہ تعداد میں تیس ہیں - اسی سبب سے اس کتاب کا شمار مستند تواریخ میں ہوتا ہے - ملا عبدالقادر بدایونی

نے اپنی 'منتخب التواریخ' کے لیے اسی سے مدد لی ۔ چناں چہ کتاب کے شروع میں 'سبب تالیف کتاب' کے ذیل میں انھوں نے اس کا ذکر کیا ہے ۔ کتاب کا نام انھوں نے ایک جگہ تاریخ نظامی لکھا ہے اور دوسری جگہ نظام التواریخ ۔ (ان دونوں سے بدایونی کی مراد طبقات اکبری ہے) ۔ بعد کے مؤرخین فرشتہ وغیرہ نے بھی اس سے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ۔ وہ اسے ایک مکمل تاریخ بتاتا ہے ۔ یورپی مؤرخین اس کے بہت مداح ہیں ۔ بقول الیٹ یہ ہندوستان کی بہت ہی مشہور کتاب ہے جو جدید طرز پر لکھی گئی ہے ۔

(طبقات اکبری مطبوعہ نول کشور ، صفحہ ۳ ۔ منتخب التواریخ اردو ترجمہ صفحہ ۳۲ ، بزم تیموریہ صفحہ ۸۸ — ۸۹ ۔ تاریخ فرشتہ صفحہ ۴)

۵۴ ۔ اقبال نامہ جہانگیری ۔ جہانگیر کے ندیم خاص محمد شریف مخاطب بہ معتمد خاں نے تیموریوں کی یہ تاریخ تین جلدوں میں لکھی ۔ پہلی جلد میں تیمور سے ہمایوں تک کے حالات تھے ۔ دوسری اکبری عہد کے واقعات پر مشتمل تھی ۔ تیسری میں جہانگیر کے دور کی سیاسی تاریخ ہے ۔ پہلی دو جلدیں مفقود ہیں ، تیسری جلد بنگال ایشیاٹک سوسائٹی سے شائع ہو چکی ہے ۔ معتمد خاں نے تزک جہانگیری لکھنے میں بھی معاونت کی تھی ۔ توزک میں سترھویں جلوس کا کچھ حصہ ، اٹھارھویں اور پھر انیسویں جلوس کا کچھ حصہ ، اسی کا نوشتہ ہے ۔ (بزم تیموریہ ، صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸)

۵۵ ۔ رزم نامہ (مہا بھارت) ۔ مہابھارت ہندوستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے ۔ اس میں بے شمار قصے، نصیحتیں ، مصالح ملکی ، اخلاق و آداب ، علوم و اعتقادیات ، ہندو مذہب اور اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے ۔ یہ تمام موضوعات ہندوستن کے قدیم فرماں روا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں ۔ بعض کے مطابق یہ واقعات آج سے کم از کم چار ساڑھے چار ہزار سال پہلے درپیش آئے تھے ۔ بعض لوگ اس سے بھی بہت زیادہ قدیم بتاتے ہیں ۔ ہندو لوگ اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں ۔ بھگوت گیتا کا ماخذ بھی یہی کتاب ہے ۔

ہندوؤں کی اس مذہبی کتاب کا فارسی ترجمہ اکبر کے ایما پر اس کے ستائیسویں سال جلوس (۹۹۰ھ) میں تکمیل پذیر ہوا۔ نقیب خاں، ملا عبدالقادر بدایونی، سلطان حاجی تھانیسری اور فیضی نے اس ترجمہ میں حصہ لیا۔

ملا عبدالقادر بدایونی کے مطابق اس ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ اکبر نے شاہ نامہ اور امیر حمزہ کے قصہ کو ۱۷ جلدوں اور پندرہ برس کی مدت میں لکھوایا تھا۔ ان کی تصاویر پر کافی روپیہ خرچ ہوا۔ علاوہ ازیں اس نے قصہ ابو مسلم وغیرہ بھی کئی بار پڑھوا کو سنا تھا۔ ان کتب کے متعلق اس کا خیال تھا کہ ان کے تمام واقعات فرضی ہیں۔ اس لیے کیوں نہ ہندوؤں کی ان کتب کو فارسی میں ترجمہ کرا کے اپنے نام منسوب کرایا جائے، جنھیں ہندوؤں کے عبادت گزار دانشوروں نے لکھا ہے اور وہ حقیقی بھی ہیں اور ان کی عبادات و اعتقادات اور مذہب کا سر چشمہ بھی۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے، اس لیے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ علاوہ ازیں ان کی اشاعت دینی و دنیوی سعادت اور شان و شوکت کی بقا کا موجب بھی ہو گی۔

چناں چہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر دلچسپی لی۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر، نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات اس نے ملا بدایونی کو بھی بلایا اور حکم دیا کہ وہ نقیب خاں کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہے۔ تین چار ماہ کے عرصے میں اس کتاب کے اٹھارہ فنون میں سے، جن میں اٹھارہ ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے، صرف دو فن لکھے جا سکے۔ اس سلسلے میں ملا بدایونی کو خاصی طعن و تعریض کا مورد بننا پڑا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خاں نے پورا کیا اور ایک حصہ کی تکمیل تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے

اس کے دو فنون کو نظم و نثر میں ڈھالا - پھر سلطان حاجی ھی نے دو حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ھوئی تھیں ، ان کی تصحیح کی - اس طرح اس کتاب کے سو جزو مکمل ھوگئے -

اکبر نے اس ترجمہ کا نام ''رزم نامہ'' رکھا - تصویروں کے ساتھ اس کے دو نسخے تیار کروائے اور بقول بدایونی ، جب یہ کتاب تیار ھو گئی تو اکبر نے امرا کو حکم دیا کہ وہ اس پر ھاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں - ابوالفضل نے اس کتاب پر دو جز کا مقدمہ لکھا - فرشتہ نے معتقدات اھل ھند کے متعلق جو کچھ لکھا ھے وہ اسی کتاب سے اخذ کیا ھے - اس کا کہنا ھے کہ فیضی کی یہ کتاب معتبرتر اور مبسوطتر ھے - بہ قول اس کے یہ ایک لاکھ سے زیادہ اشعار پر مشتمل ھے -

(منتخب التواریخ ، اردو ترجمہ ، صفحہ ۵۰۸ ، ۵۰۹ - تاریخ فرشتہ مطبوعہ نولکشور ، صفحہ ۵)

۵٦ - شرف‌الدین یحییٰ منیریؒ - آپ یحییٰ بن اسرائیل کے بیٹے تھے ، جو چشتیہ فرقے کے ایک بہت بڑے بزرگ تھے - منیری کا شمار اس برصغیر کے مشہور مشائخ میں ھوتا ھے - خرد سالی ھی سے آپ پہاڑوں ، صحراؤں اور جنگلوں میں جا کر عبادت کیا کرتے تھے -

کہتے ھیں کہ آپ حضرت خواجہ نظام الدین کے دیدار کی آرزو لیے اپنے بڑے بھائی شیخ جلال الدین محمد کے ساتھ دھلی آئے - اتفاق سے جب وھاں پہنچے تو حضرت خواجہ نظام‌الدین اولیا عالم بقا کو سدھار چکے تھے - اب وھاں شیخ نجیب‌الدین فردوسی موجود تھے - منیری ان کے پاس پہنچے - انھوں نے کہا ''درویش! کئی سال سے میں تمھارا منتظر ھوں - تمھاری ایک امانت میرے پاس ھے -'' آپ ان کے مرید ھوگئے اور اس طرح وہ نعمت (خلافت) لے کر اپنے وطن مالوف کو لوٹے - کہتے ھیں کہ واپسی پر آپ کو آگرہ کے راستے میں ایک بیابان میں ٹھہرنا پڑ گیا - اس بیابان میں آپ عبادت کرتے رھے اور کئی برسوں کے بعد وطن (منیر ، جو صوبہ بہار کا ایک قریہ ھے) واپس پہنچے -

آپ نے بہ قول صاحب 'تذکرۂ علماے ہند' ۷۸۲ھ میں وفات پائی۔ آپ کا مزار بہار ہی میں ہے۔

آپ بہت سی تصانیف کے مالک ہیں۔ جن میں 'آدابالمریدین' کی شرح اور مکتوبات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مکتوبات میں بہت سے آداب طریقت اور اسرار حقیقت مندرج ہیں۔ بہ قول مولانا عبدالحق محدث آپ کے اس مشہور مجموعۂ مکتوبات کے علاوہ اور بھی مکتوبات ہیں جو آپ نے اپنے مرید و خلیفہ شیخ مظفر بلخی کو لکھے۔ کہتے ہیں، کہ مظفر بلخی ۲۵ برس تک اپنے واقعات و معاملات وغیرہ، جو انہیں سلوک میں درپیش آتے رہے، آپ کو لکھتے رہے، اور آپ اُن کا جواب دیتے رہے۔ بعض خطوط میں آپ نے انہیں لکھا کہ چوں کہ میرے یہ خطوط سراسر اپنے بھائی (یعنی مظفر بلخی) کی مشکلات و معاملات کا حل ہیں، اس لیے چاہیے کہ کسی کو یہ خطوط نہ دکھائیں، کہ یہ ربوبیت کے بھید کے افشا کا سبب ہو گا۔ چنانچہ مظفر بلخی باوجود مریدوں کے اصرار کے کسی کو یہ خطوط نہ دکھاتے۔ بعد میں اُن کی وصیت کے مطابق یہ خطوط، جن کی تعداد دو سو سے اوپر تھی، اُن کے کفن میں رکھ کر ان کے ساتھ دفن کر دیے گئے۔ کسی خریطہ میں دو چار خطوط رہ گئے تھے، جن میں سے دو تین مکتوب مولانا عبدالحق محدث نے اخبار الاخیار میں درج کیے ہیں۔

ابو الفضل نے اپنی بیاض کے لیے جن جن چیزوں کا انتخاب کیا تھا، اُن میں آپ کے مکتوبات بھی ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اس پر جو کیفیت طاری ہوئی ہے، اس کا ذکر اُس نے تیسرے دفتر میں کیا ہے۔

(آئین اکبری، جلد ۳، صفحہ ۲۸۳۔ ہرسہ دفتر ابوالفضل، مطبوعہ سلطان المطابع، کلاں کوٹھی، لکھنؤ ۱۲۷۰ھ، دفتر سوم صفحہ ۱۶۲۔ اخبارالاخیار صفحہ ۱۱۷، ۱۱۸۔ سیرالمتاخرین، مطبوعہ لاہور، صفحہ ۱۳۰۔ تذکرہ علمائے ہند، صفحہ ۸۴۔)

۵۷ - نزہت الارواح - اس نام کی دو کتب ہیں - یہاں مؤلف کی مراد غالباً دوسری کتاب سے ہے -

(۱) مشہور فلسفی صوفی شیخ شہاب الدین سہروردی (شیخ اشراق) کے ایک شاگرد شمس الدین محمد شہرزوری نے چھٹی صدی ہجری میں ایک کتاب 'تاریخ الحکماء' عربی میں لکھی تھی - اکبر نے شہزادہ سلیم کی تعلیم کے لیے اس کا فارسی میں ترجمہ کرایا - مقصود علی تبریزی نے ترجمہ کیا اور اس کا نام 'نزھۃالارواح و نزھۃ الافراح' رکھا -

(۲) دوسری 'نزھۃ الارواح' رکن الحق والدین میر حسین ابن عالم ابن ابی الحسن الحسینی کی تصنیف ہے، جو ۷۱۱ھ میں لکھی گئی - اس کتاب کا موضوع سلوک و معرفت ہے - شروع میں حمد و سپاس کے بعد نعت سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اور چاروں خلفاء راشدینؓ کی منقبت ہے - اس کے بعد پھر مناجات ہے ، اور پھر کتاب کا اصل موضوع شروع ہوتا ہے ، جو اٹھائیس فصول پر مشتمل ہے - پہلی فصل 'در ابتداء سلوک' دوسری فصل 'در معرفت سلوک' تیسری فصل 'در مقامات سلوک' علی ہذالقیاس - ان فصول میں مصنف نے جگہ جگہ فارسی اشعار کھپائے ہیں - کہیں کہیں عربی اشعار بھی آ گئے ہیں - علاوہ ازیں اپنے مطالب کی وضاحت کے لیے ہر فصل میں چند ایک حکایات دی ہیں - آخری یعنی اٹھائیسویں فصل 'ختم کتاب' کے بارے میں ہے -

امیر حسینی رکن الدین عالم بن ابی الحسین الهروی (ہرات کے رہنے والے) خراسان کے بزرگ عرفا میں سے تھے - غور ہرات کے ایک گاؤں گریوہ میں ۶۷۱ھ میں پیدا ہوئے - طریقت میں شیخ رکن الدین ملتانی کے شاگرد بنے ، جو بہاء الدین زکریا کے خلیفہ تھے - بعض کے نزدیک خود بہاء الدین زکریا کے مرید تھے - فرشتہ کے مطابق بہ تقریب تجارت اپنے والد سید نجم الدین کے ساتھ ملتان میں وارد ہوئے - خراسان واپس لوٹے تو ہرات میں مقیم ہو گئے اور یہیں ۷۱۸ھ میں

داعی اجل کو لبیک کہا - فہرست مخطوطات میں ۲۰ے - ۲۱ے ھ ہے - ہرات کے شمال میں چند میل دور قصبۂ 'مصرخ' کے گورستان میں مدفون ہوئے -

۱۳۳۶ھ میں مرحوم حبیب اللہ خان والئی افغانستان کے حکم پر ان کے مزار کی مرمت اور گچ کاری کی گئی -

نزہۃ الارواح اور زاد المسافرین کے علاوہ آن کی اور بھی کئی ایک تصانیف ہیں -

(فہرست مخطوطات فارسی ، انڈیا لائبریری ، جلد اول ، صفحہ ۹۹۷ ، ۹۹۸ - قاموس المشاہیر، جلد اول، صفحہ ۲۰۶ - بزم تیموریہ صفحہ ۶۶ - صفا جلد دوم، صفحہ ۲۹۹ - نزہت الارواح از حسین بن عالم ابی الحسن الحسینی، مطبع مجتبائی، دہلی ۱۹۱۲ء - از سعدی تاجامی ، براؤن فارسی ترجمہ از علی اصغر حکمت ، چاپ دوم مطبوعہ ایران ، حاشیہ صفحہ ۱۸۸ ، ۱۸۹ ، از حکمت - تاریخ فرشتہ ، جلد دوم صفحہ ۴۰۶ - انوار اصفیا صفحہ ۲۴۳ ببعد)

جزو سوم

دورۂ متاخرین

شاہ ولی اللہ (صفحہ ۳۹۴)

۱ - فقہ حنفی ، فقہ شافعی - اس کی تفصیل 'فقہ' کی ذیل میں ملاحظہ ہو -

۲ - متکلمین - علم کلام کے جاننے والے - علم کلام کی دو قسمیں ہیں - ایک نقلی اور دوسرا عقلی - نقلی یا منقولات سے تعلق رکھنے والا علم کلام تو وہ ہے جو خود اسلامی فرقوں کے باھمی اختلافات سے پیدا ہوا اور دوسرا وہ جو فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ایجاد ہوا -

ابتدا میں اسلام ایک بہت سادہ سا مذھب تھا اور اس کے ماننے والے بغیر کسی جرح و نقد کے عقاید پر ایمان رکھتے تھے ، لیکن جب اسلام کی فتوحات کا دایرہ وسیع ھوا ، اور دوسری اقوام نے اسلام قبول کیا تو وہ اپنے اعتقادات بھی بہت کچھ ساتھ لائیں - اور ان کو سوچنا پڑا کہ اسلام کے بتائے ھوئے عقاید ان کے قدیم عقاید سے کس قدر مختلف ھیں اور کیوں - اس سلسلہ میں خدا ، رسول ، قرآن ، حدیث اور تمام اعتقادی مسائل پر غور ھونے لگا - اس طرح اختلاف خیال کی بنا پر اسلام میں متعدد فرقے پیدا ھو گئے (جن میں شیعہ ، سنی ، خارجی اور معتزلہ خاص طور پر قابل ذکر ھیں) اور ھر ایک نے اپنے اپنے خیال کی تائید میں آیات قرآنی اور احادیث کی تاویلیں کرنا شروع کر دیں -

عقلی علم کلام فلسفہ کے مقابلہ کے لیے ایجاد ھوا - بنو آمیہ کے زمانہ میں مذھبی مناظرے اور مباحثے زیادہ تر خود مسلمانوں ھی کے

مختلف فرقوں تک محدود تھے ۔ لیکن جب عہد بنی عباس میں مجوسی ، یہودی اور عیسائی اسلامی درس گاہوں میں علوم عربیہ کی تعلیم حاصل کرنے لگے اور حکومت نے مذہبی مباحث پر آزادانہ گفتگو کی اجازت دے دی تو پھر اسلامی عقاید پر رد و قدح شروع ہو گئی اور زندقہ و الحاد کے خیالات لوگوں میں پیدا ہونے لگے۔ خلیفہ مہدی نے یہ دیکھ کر حکم دیا کہ مذہب اسلام پر جو شبہات کیے جاتے ہیں ان کے جواب میں کتابیں لکھی جائیں اور یہ تھی ابتدا عقلی کلام کی ۔ لیکن اس فن کا نام 'علم کلام' مامون الرشید کے زمانہ میں رکھا گیا ، جب معتزلہ سامنے آئے ۔

اس فن کا نام علم کلام اس لیے رکھا گیا کہ سب سے پہلا اختلاف 'کلام الٰہی' کے متعلق پیدا ہوا تھا یا اس لیے کہ فلسفہ کی ایک شاخ یعنی منطق کا جو نام تھا وہی اس فن کا بھی رکھا گیا کیوں کہ منطق اور کلام دونو مترادف ہیں ۔

محدثین اور علماء ظاہر ، علم کلام کے بڑے مخالف تھے، لیکن خلفاء عباسیہ ، برمکی وزرا اور دیلمی فرماں رواؤں نے اس فن کی بڑی حمایت کی اور اس کو کافی ترقی ہوئی ۔

سب سے پہلے ابوالہذیل نے اس فن پر کتابیں لکھیں اور پھر بعد کو اس کے شاگرد نظام نے اس کو بہت ترقی دی ۔ یہ دونو معتزلی تھے ۔

علم کلام کی بنیاد دوسری صدی ہجری میں پڑ چکی تھی ، لیکن اس کی ترقی تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں ہوئی ۔ پانچویں صدی ہجری میں اس کا زوال شروع ہوا ، کیونکہ عنان حکومت ترکوں اور دیلمیوں کے ہاتھ آگئی تھی اور یہ لوگ صرف تلوار کے دھنی تھے۔ علمی مسائل سے انہیں کوئی دلچسپی نہ تھی ۔ عہد بنی عباس میں خاص خاص علماء کلام یہ تھے : ہشام بن عبد الملک ، علی بن ہیثم ، ابوالمسالک حضرمی ، ابوالہذیل ، نظام ، معمر بن عیاذ ، جاحظ ، ابوالقاسم بلخی ۔ پانچویں صدی میں بھی جبکہ علم کلام کو زوال شروع ہوگیا تھا بعض

متکلمین بڑے پایہ کے موجود تھے مثلاً ابوالحسین بصری ، ابواسحاق اسفرائنی ، قاضی عبد الجبار معتزلی ۔

علم کلام کا اصل مقصد ان اعتراضات کا جواب دینا تھا جو عقلاً قرآن کے بیانات پر وارد ہوتے تھے اور اس سلسلے میں وجود باری کی حقیقت ، نبوت کا مفہوم ، قصص قرآن ، معجزات اور مسایل حشر و نشر ، دوزخ و جنت وغیرہ سبھی سامنے آئے اور متکلمین نے ان کو مختلف تاویلات کے ساتھ عقلاً صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ۔ چناں‌چہ اسی سلسلے میں قرآن کی تفاسیر بھی عقلی نقطۂ نظر سے لکھی جانے لگیں ۔ ان مفسرین میں ابومسلم اصفہانی ، ابوالقاسم بلخی ، قفال ، خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں ۔

جسیا کہ اوپر بیان ہوا ، اول اول علم کلام کا تعلق زیادہ تر روایات و منقولات سے تھا لیکن بعد میں امام غزالی کے زمانہ سے اس کا تعلق عقل و معقولات سے بھی ہو گیا جسے امام رازی نے بڑی ترقی دی ۔

(سالنامہ نگار لکھنؤ ۱۹۵۵ء 'علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر صفحہ ۴۸ ۔ نیز تفصیل کے لیے دیکھیں ''الکلام'' از مولانا شبلی مرحوم)

۳ ۔ اعتبار ۔ مؤلف 'سردلبران' حضرت سید محمد ذوق شاہ صاحب نے 'اعتبار' کی جو تعریف کی ہے وہ بھی ملاحظہ ہو ۔ ان کے مطابق تصوف میں یہ لفظ عموماً حقیقت کے مقابلے میں استعمال ہوتا ہے ۔ یعنی ہر وہ چیز جو 'حقیقی' نہیں ، 'اعتباری' ہے ۔ ہر وہ چیز جو ظنی ، وہمی اور فرضی ہے ، اعتباری ہے ۔ اس کی مثال اس طرح دیتے ہیں کہ رسی کا ایک ٹکڑا لیں ، اس کا ایک سرا اپنے ہاتھ میں رکھیں اور دوسرے سرے میں ایک شعلہ یا روشن لٹو باندھیں ۔ پھر اس رسی کو تیزی سے گھمائیں تو بے شمار دائرے بنتے چلے جائیں گے ۔ یہ دائرے سب اعتباری ہیں ۔ حقیقت میں نقطہ ایک ہی ہے جو تیزی' حرکت سے دائرے کی صورت میں نمودار ہو کر اعتبارات کا طلسم پیش کرتا ہے ۔ صرف حق سبحانۂ تعالیٰ ہی ذات حقیقی ہے ، اور اس کے سوا جو کچھ ہے ، سب اعتباری ہے ۔ ہر تنزل ، ہر تعین ، مہر، تقید اعتباری ہے ۔ ساری کائنات اعتبارات ہی کا مجموعہ ہے ۔

کائنات کے اعتباری ہونے کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ کائنات میں جو کچھ اب تک ہوا، ہو رہا ہے اور ہونے والا ہے وہ باعتبار زمانہ بس تین ہی حصوں میں منقسم ہو سکتا ہے۔ ''ماضی، حال اور مستقبل۔ ماضی گیا اور وجود نہیں رکھتا۔ مستقبل ابھی آیا نہیں اور اس کا وجود اب تک نمودار ہی نہیں ہوا۔ رہا حال، جس میں تم اپنے کو پاتے ہو اور جس میں تم مقید ہو اور جس پر تمھاری ہستی کا دار و مدار ہے۔ تم جب اور جہاں اور جس حالت میں ہوتے ہو اسی حال کو اپنے اوپر مسلط پاتے ہو۔ ماضی ماضی نہ تھا بلکہ حال تھا جس وقت کہ تمھیں اپنے آغوش میں لیے ہوئے تھا۔ اور مستقبل، مستقبل نہ ہوگا بلکہ حال کی صورت میں آئے گا اور تم سے مصافحہ کرے گا۔ یہی حال وہ نقد وقت ہے جس پر تمھارا قبضہ ہے اور جس کی بنیاد پر تمھیں یہ گمان پیدا ہوتا ہے کہ تم بھی کوئی ہستی رکھتے ہو اور اپنے دور حیات کو پورا کر رہے ہو۔ لیکن ذرا اس حال کی بھی چھان بین کر لو کہ اس کی حقیقت کیا ہے۔ حال، ماضی کی نہایت اور مستقبل کی بدایت ہے۔ دونوں کے درمیان حد فاصل اور دونوں میں مشترک ہے۔ جسے تم حال سمجھے ہوئے ہو اس کے وسط میں ایک باریک سے باریک خط کھینچو تو ایک جانب ماضی اور دوسری جانب مستقبل ہو گا۔ گویا دو موہومات کے اتصال اور انفصال کا نام حال ہے، یعنی حال ایک نقطہ وہمی ہے، جو ایک غیرمتناہی خط مفروضہ پر فرض کر لیا گیا ہے۔ اس نقطۂ وہمی نے تجدد تعینات سے نہر رواں جاری کر رکھی ہے، جو سرعت تجدد سے مثل قطرہ‌ہائے باران کے ایک نہر جاری متوہم ہوتی ہے۔ کائنات کے دیگر پہلوؤں پر بھی اس طرح نظر ڈالی جائے تو مفروضات و موہومات و ظنیات و اعتبارات اور نظری مغالطوں کا ایسا ہی سلسلہ ہر طرف پھیلا ہوا نظر آئے گا اور ثابت ہو جائے گا کہ یہ ساری کائنات ایک عظیم‌الشان خواب ہے، نمود بے بود۔''

''لفظ اعتبار کا ایک اور بھی استعمال ہے جو تصوف کی کتب میں پایا جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عارف کسی وقت کوئی آیت قرآنی یا حدیث نبوی سنتا ہے تو اس کا ذہن کسی معرفت کی جانب

منتقل ہوتا ہے ، اگرچہ بہ ظاہر عبارت نص اور اشارات نص اور ایماے نص سے اُس معرفت کی جانب دلالت وضعی نہ پائی جاتی ہو ۔ اس انتقال ذہنی کو اعتبار کہتے ہیں ۔

مثلاً کوئی شخص لیلیٰ مجنوں کا قصہ پڑھ رہا ہے اور ایک عاشق اُس قصے کو سنتے ہی بے تاب ہو گیا یا اُس پر گریہ طاری ہو گیا یا اُس میں مستی پیدا ہو گئی ، وہ خود مجنوں نہیں ، نہ لیللی پر عاشق ہے ، نہ اُس کے درد و عشق کا قصہ پڑھا جا رہا ہے ، نہ اُس قصے سے کوئی استدلال یا کچھ استنباط کیا گیا ہے ، بلکہ اس قصے سے اُس عاشق کو اپنے واقعات یاد آ گئے ، اور اُن واقعات اور حالات میں اُسے اپنے واقعات اور حالات سے تطبیق یا کسی قدر مناسبت نظر آئی اور دفعۃً اُس کی حالت میں تغیر واقع ہو گیا ۔ گویا یہ تغیر اُس عاشق کی اندرونی کیفیات کے مشتعل ہونے سے وقوع میں آیا اور اُس کے مقام سے پیدا ہوا ۔ اور لوگوں نے بھی اُس قصے کو سنا مگر اُن کے حالات متغیر نہ ہوئے'' ۔ ''یا مثلاً کسی نے یہ حدیث نبوی بیان کی کہ 'جس گھر میں کتا اور تصویر ہو اُس میں رحمت کا فرشتہ نہیں آتا' اور یہ سن کر ایک صوفی جو تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن میں منہمک ہے ، بول اُٹھے کہ سچ ہے جس خانۂ قلب میں حرص دلیا کا کتا اور ماسوائے کی تصویر ہو اس میں قدس کا فرشتہ نہیں آتا ، تو اس قسم کا انتقال ذہنی بالکل جائز ہوگا''......... اور ''اس قسم کے جملہ انتقالات ذہنی اعتبار کے قبیل سے ہیں'' ....

''غرضیکہ اعتبار ایک فن ہے ، بہت بڑا اور عمدہ اور بہت وسیع میدان امید کا کہ تفسیر عرائس ، حقائق سلمی اور اکثر کلام شیخ اکبر اور شیخ الشیوخ سہروردی سب اسی مقولہ اعتبار سے ہیں'' ۔
(سر دلبراں صفحہ ۶۲ ۔ ۶۳ ، ۶۷ ۔ ۶۸)

۴ ۔ فقہ ۔ علم تشریع یا قانون سازی کو اسلام میں فقہ کہتے ہیں، جو عبادت ، عقاید ، اخلاق ، معاملات اور آئین حکومت وغیرہ تمام مسایل پر مشتمل ہے ۔

اسلام میں احکام فقہ اخذ کرنے کے چار ذرائع ہیں : قرآن ، حدیث ، رائے اور اجماع امت ۔ ابتداء اسلام میں جب کوئی مسئلہ سامنے آتا تھا تو سب سے پہلے قرآن میں جستجو کی جاتی تھی کہ اس باب میں خدا کا کیا حکم ہے ۔ اور جب قرآن سے اس کا پتا نہ چلتا تو احادیث رسول (صلعم) کی طرف توجہ کی جاتی ، لیکن اگر اس میں بھی کامیابی نہ ہوتی تو فیصلہ کرنے والا اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کرتا ۔

ایک بار امیر معاویہؓ کو کسی خاص مسئلہ میں نہ قرآن کریم کا کوئی حکم ملا ، نہ کوئی حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم ، تو انھوں نے زید بن ثابت سے رجوع کیا اور انھوں نے خود اپنی رائے سے کام لے کر مشورہ دیا ۔ اسی طرح ایک بار مصر کے قاضی نے حضرت عمرؓ سے کسی مسئلہ میں استصواب کیا تو آپؓ نے ہدایت کی کہ اگر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث موجود نہیں ہے تو اپنی رائے سے کام لے کر فیصلہ کرو ۔

آگے چل کر انھی رایوں اور خلفاء راشدینؓ کے احکام نے نظائر قانونی کی حیثیت اختیار کر لی اور فقہ یا قانون کا جزو بن گئے ۔ اسی کا نام اجماع امت تھا ۔

اول اول اسلام پر صرف شریعت موسوی کا اثر تھا ، لیکن جب بعد میں فتوحات کے باعث مسلمان ایران اور بازنطینی علاقوں تک پہنچے تو فقہ اسلامی پر ان ملکوں کے رسم و رواج اور مروجہ قوانین کا بھی کافی اثر پڑا ، اور مسلمانوں نے ان باتوں کے قبول کر لینے میں جو تعلیم اسلام کے منافی نہ تھیں ، پس و پیش نہ کیا ۔ چناں چہ کہا جاتا ہے کہ عہد بنی امیہ و بنی عباس میں رومی قانون کی بہت باتیں شریعت اسلامی میں داخل ہو گئیں ۔

خلفاء راشدینؓ کے زمانے میں تو علمی حیثیت سے فقہ کی تدوین کا خیال پیدا نہ ہوا تھا ، لیکن عہد بنی امیہ میں وقتاً فوقتاً اس کی کوشش ضرور کی گئی ، اور عہد بنی عباس میں اس نے زیادہ منظم صورت اختیار کر لی ۔

اگرچہ فقہا نے بالاتفاق قرآن ، حدیث ، رائے اور اجماع اُمت کو فقہ کا ماخذ قرار دے دیا تھا ، لیکن استخراج احکام میں ان کے درمیان ضرور اختلاف ہو جاتا تھا ۔ اور یہ اختلاف زیادہ تر احادیث کے سلسلے میں ہوتا تھا ، کیوں کہ جب ایک ہی مسئلہ پر مختلف احادیث ملتیں تو کوئی جماعت ایک حدیث کو ترجیح دیتی اور کوئی دوسری حدیث کو ۔

فقہ کی باضابطہ تدوین دوسری صدی ہجری میں شروع ہوئی اور مدینہ ، شام اور عراق کے علماء نے فقہی تصانیف کی طرف خاص توجہ سے کام لیا ۔

سنیوں میں فقہ کی سب سے پرانی اور اہم کتاب مالک بن انس (۹۷ھ - ۱۷۹ھ) کی موطا ہے ، لیکن اسی وقت جب مالک بن انس مدینہ میں موطا کی تدوین میں مشغول تھے ، شام میں عبدالرحمان الاوزاعی بھی تدوین فقہ کر رہے تھے جو عرصہ تک ہسپانیہ کے مدارس میں مقبول رہی ۔

اس میں شک نہیں فقہ میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ رائے کا ہے ، کیوں کہ رایوں میں ہمیشہ اختلاف ہو سکتا ہے ۔ اور اس لیے بعض علماء نے رائے کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا ۔ لیکن چوں کہ اس کے بغیر کوئی چارہ بھی نہ تھا ، اس لیے آخر کار فقہاء حجاز اور فقہاء عراق دونوں نے اسے تسلیم کر لیا ـــــ ان میں حماد بن ابی سلیمان (وفات ۱۲۰ھ) سب سے پہلے فقیہہ تھے جنھوں نے رائے کی اہمیت پر زیادہ زور دیا ۔ ان کے بعد ابو حنیفہؒ اور ان کے دو شاگردوں (ابو یوسف اور محمد بن الحسن) نے اس کی بنیاد اُستوار کی ، اور سلسلۂ تصانیف باقاعدہ شروع کر دیا ۔

اگرچہ عام طور پر علماء اسلام نے تدوین فقہ میں رائے کی اہمیت کو تسلیم کر لیا تھا ، لیکن پھر بھی بعض علماء اس کے خلاف تھے ۔ اور جب بعد کو فقہائے عراق و حجاز کے درمیان اصول استنباط و تاویل احادیث میں اختلاف پیدا ہوا تو اس جماعت کو جو پہلے ہی سے رائے کی مخالف تھی ، زیادہ موقع مل گیا اور اس نے صاف صاف کہہ دیا

کہ ''ہم رسول اللہ صلعم کی احادیث کے علاوہ کسی اور کی رائے یا اجتہاد کو قابل عمل نہیں قرار دے سکتے ۔'' اس اختلاف کے سب سے بڑے علم بردار یعقوب بن اخشم تھے جو عہد مامون میں بغداد کے عہدۂقضا پر مامور تھےاور جن کی کتاب 'کتاب التنبیہ' نے خاص شہرت حاصل کی ۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فقہ میں 'اصحاب الحدیث' اور 'اصحاب الرائے' کی دو جماعتیں علیحدہ علیحدہ ہو گئیں ۔ ہر چند یہ اختلاف خالص علمی اختلاف تھا ، لیکن اس کا اثر ہیئت اجتماعی اور معاشرہ پر بھی پڑا اور اس کو دور کرنے کے لیے محمد بن ادریس الشافعی نے ان دونوں جماعتوں کو متحد کرنے کے لیے بعض قواعد و ضوابط تدوین فقہ کے ایسے مرتب کیے، جن پر دونوں متفق ہو سکیں ۔ لیکن چوں کہ خود شافعی کا رجحان زیادہ تر روایت و حدیث ہی کی طرف تھا ، اس لیے وہ اپنی مصالحانہ کوشش میں کامیاب نہ ہو سکے ۔

تیسری صدی ہجری تک فقہ کے دو شعبے پیدا ہو چکے تھے : (۱) اصول فقہ یعنی ماخذ فقہ اور اس سے استنباط مسایل کا علم ، (۲) فروع فقہ ، یعنی زندگی کے مختلف مسایل کے متعلق فقہی احکام کی تدوین اور پھر بعد میں انھی دو شعبوں پر تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہو گیا ۔

سُنیوں میں فقہ کے چار دبستان خیال پائے جاتے ہیں جو ان کے چار ائمہ کے نام سے منسوب ہیں جنھوں نے ان کی بنیاد ڈالی تھی :

(۱) فقہ حنفی ۔ اس کے بانی امام ابو حنیفہؒ تھے ۔ اس فقہ کو سب سے زیادہ مقبولت حاصل ہوئی ۔ ترکی ، وسط ایشیا اور پاکستان و ہندوستان کے تمام مسلمان اسی فقہ کے متبع ہیں ۔

(۲) فقہ مالکی ۔ یہ امام مالکؒ سے منسوب ہے اور مغربی افریقہ ، بالائے مصر کے علاقے میں اس کے پیرو زیادہ ہیں ۔

(۳) فقہ شافعی ۔ یہ امام شافعیؒ سے منسوب ہے ، اور اس کے مقلدین زیادہ تر مصر ، جنوبی عرب ، جزائر شرق الہند ، مشرق افریقہ اور شام میں نظر آتے ہیں ۔

(۴) فقه حنبلی - امام حنبلؒ سے منسوب ہے - اس کے پیرو عموماً عراق، مصر ، شام و فلسطین میں زیادہ پائے جاتے تھے ، لیکن اب صرف نجد کے علاقے تک محدود ہے -

ان چار فقہی اسکولوں کے علاوہ اور بھی متعدد دبستان فقہ پیدا ہوئے ، جن میں دبستان اوزعی ، دبستان سفیان ثوری ، دبستان ظاہری ، دبستان جریریہ (طبری کا قائم کیا ہوا) قابل ذکر ہیں ، لیکن یہ سب چند دن چل کر ختم ہو گئے -

خارجیوں اور شیعوں نے بھی اپنی اپنی فقہ علیحدہ مرتب کی جو بعض مسایل میں فقہ حنفی سے مختلف ہے - شیعی جماعت نے تدوین فقہ میں صرف ان احادیث کو سامنے رکھا جو علوئین کے سلسلے سے روایت کی گئی تھیں اور حنفی کتب احادیث پر اعتماد نہیں کیا - شیعوں میں زیدی جماعت کے اصول ، اثناعشری شیعوں سے کچھ مختلف ہیں -

(نگار، علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر، صفحہ ۳۹ - ۴۱)

۵ - قوم مَعَدّ - جس کا تعلق معد بن عدنان بن آد بن آدد بن الهمسیع سے تھا - یہ معد حضرت اسماعیلؑ کے خانوادے سے تھا - حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وعالی آلہ وسلم کے شجرۂ نسب کا زمانۂ جاہلیت تک تتبع کیا جائے تو معد آپ (صلعم) کے اجداد میں سے تھا - سرور کائنات صلعم اپنا شجرہ نسب بیان فرماتے وقت عدنان پر پہنچ کر خاموش ہو جایا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے 'آگے کی باتیں نسب بیان کرنے والوں کی من گھڑت ہیں' -

تاہم علماء نسب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ معد حضرت اسماعیلؑ کے خاندان سے تھا - البتہ اس کے آبا و اجداد کے ناموں اور حضرت اسماعیلؑ سے لے کر اس تک جو پشتیں ہیں ، ان میں سے کچھ افراد کے بارے میں ان علماء میں باہمی اختلاف پایا جاتا ہے -

(الاعلام از خیرالدین زرکلی، مطبوعہ بغداد، جلد ۸، صفحہ ۱۸۰) -

خافی خان (صفحہ ۵۰۵)

۱۔ خان دوراں ۔ ملاحظہ ہو آصف جاہ ، میر قمرالدین قلیج خان ابن فیروز جنگ ۔

۲۔ شاہزادہ عظیم‌الشان ۔ شاہ عالم اول کا فرزند تھا ۔ اپنے دادا عالمگیر کے دور حکومت کے آخری برسوں میں کم و بیش دس سال تک بنگال و بہار کا حاکم رہا ۔ بڑا صاحب فہم و فراست تھا ۔

شاہ عالم کی وفات کے بعد جب عظیم‌الشان اور اس کے بھائیوں میں جنگ تخت نشینی ہوئی تو اس میں تین بھائی ، جہاں دار شاہ ، رفیع‌الشان اور جہاں شاہ ایک طرف تھے اور یہ اکیلا ایک طرف ۔

اس لڑائی کا آغاز ۱۳ مارچ ۱۷۱۲ء سے ہوا ۔ چند روز تک مقابلہ ہوتا رہا ۔ آخر ایک دن لڑائی کے دوران اس کے ہاتھی کی سونڈ پر گولہ لگا ۔ وہ خوف زدہ ہو کر بھاگا اور دریا میں گھس گیا ۔ جہاں وہ اپنے سوار سمیت دلدل میں غرق ہو گیا ۔ اس طرح تخت کے بہترین اور طاقتور وارث کا خاتمہ ہو گیا ۔ فہم و فراست کے علاوہ ، دوسرے بھائیوں کی نسبت زیادہ دولت مند اور صاحب عقل و دانش تھا ۔ اگر اپنی دولت اور طاقت کے گھمنڈ میں نہ رہتا تو دوسرے شاہزادوں کے اس پر حملہ آور ہونے سے پیشتر ہی پانسہ اس کے حق میں ہوتا ۔

('لاہور دور مغلیہ میں' مطبوعہ نقوش ، لاہور نمبر ، صفحہ ۷۸ ، ۷۹ ، ۸۱)

صمصام الدولہ شاہ نواز خان (صفحہ ۵۱۱)

۱۔ صمصام الدولہ شاہ نواز ۔ اصلی نام عبدالرزاق اور اصل اس کی سادات خواف سے ہے ۔ اس کا جد اعلیٰ میر کمال‌الدین ، اکبر کے عہد میں خواف سے وارد ہند اور دربار شاہی میں ملازم ہوا ۔ شاہ نواز کا والد میر حسن ۲۰ برس کی عمر میں وفات پا گیا ۔ اس کی ولادت ۲۹ رمضان المبارک ۱۱۱۱ھ میں بمقام لاہور ہوئی ۔ چوں کہ اس کے

بہت سے اقربا اورنگ آباد میں مقیم تھے ، اس لیے عنفوان شباب میں یہ بھی لاھور سے اورنگ آباد چلا گیا ۔

شروع شروع میں نواب نظام الملک آصف جاہ کے یہاں کسی منصب پر فائز ھوا ۔ کچھ عرصہ بعد برار میں شاھی دیوان مقرر ھوا۔ جب نظام الدولہ نے اپنے باپ نظام الملک سے لڑائی کی ، تو چوں کہ شاہ نواز کی اول الذکر سے گاڑھی چھنتی تھی ، اس نے حتی المقدور اس (نظام الدولہ) کا ساتھ دیا ۔

اس لڑائی میں بیٹے کو شکست ھوئی ، جس کے سبب شاہ نواز نے کنارہ کشی اختیار کی ۔ ایک مدت تک نواب آصف جاہ کا معتوب رھا ۔ آخر گوشہ نشین ھو کر اپنی نہایت اھم اور شہرۂ آفاق کتاب ''مآثر الامرا'' لکھنے میں مصروف ھوا ۔ پانچ برس اسی طرح گزرے ۔ آخر نواب آصف جاہ نے اپنے عہد کے آخر میں اسے معاف کر کے پھر سے ''دیوانی برار'' پر مامور کیا ۔

آصف جاہ کی وفات کے بعد نواب نظام الدولہ نے اسے برار سے طلب کر کے اپنی سرکار کی دیوانی سپرد کی ۔

نظام الدولہ اور مظفر جنگ کے قتل کے بعد جب صلابت جنگ بر سر اقتدار آیا تو اس نے اسے ۱۴ صفر ۱۱۶۷ ھ کو خلعت اور اپنی 'وکالت مطلق' سونپنے کے علاوہ ۷ ھزاری ۷ ھزار سوار کا منصب اور صمصام الدولہ کا خطاب عنایت کیا ۔

۱۱۷۱ ھ میں عبدالرحمن مخاطب بہ حیدر جنگ نے اسے اقربا و متوسلین سمیت اورنگ آباد میں مقید کر دیا ۔ صلابت جنگ کے بھائی نظام علی خاں نے جو حیدر جنگ کا جانی دشمن تھا ، ۳ رمضان ۱۱۷۱ ھ کو حیدر جنگ کو قتل کر دیا ۔ جس کے سبب لشکر میں شور و غوغا مچ گیا ۔ چناں چہ اسی دار و گیر میں چند لوگوں نے شاہ نواز اور اس کے بیٹے میر عبد النبی خاں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ۔ اسے اس کے آبا و اجداد کے قبرستان میں ، جو شاہ نور کی درگاہ کے قریب واقع تھا ، دفن کیا گیا ۔ (مفتاح التواریخ صفحہ ۳۳۸ ، ۳۳۹)

۲ - سید جلال بخاری - سید جلال الدین بخاری - انہیں سید جلال سرخ بھی کہتے ہیں - صحیح النسب سید تھے - شیخ الاسلام بہاءالدین زکریا کے مرید اور سید جلال مخدوم جہانیاں کے جد تھے - بخارا سے بھکر وارد ہوئے اور یہاں سید بدرالدین سے ملے، جو اکابر و اعیان میں سے تھے - سید مذکور کی دختر سے ان کی شادی ہوئی - اس شادی کے متعلق مشہور ہے کہ خود سید جلال اور سید بدرالدین دونوں کو آنحضرت صلعم نے خواب میں اس کی بشارت دی تھی ، جس کے نتیجے میں مؤخرالذکر نے اپنی لڑکی ان کے عقد میں دے دی -

کچھ عرصہ بعد وہاں کے بعض ارباب حسد و نزاع سے تنگ آ کر اوچ تشریف لے گئے ، اور وہیں فوت ہوئے - آپ کا مزار بھی وہیں ہے - (اخبارالاخیار صفحہ ۶۱ - تاریخ فرشتہ صفحہ ۳۱۲)

۳ - امام بزرگ علی نقی الہادی - محمد بن علی بن موسیٰ الرضا کے فرزند تھے - آپ کی کنیت ابوالحسن اور لقب ہادی ہے - اکابر اہل بیت میں سے تھے - 'عسکری' کے نام سے مشہور ہونے کے علاوہ 'زکی' اور 'نقی' بھی کہلاتے ہیں -

۲۱۲ھ میں بمقام مدینہ پیدا ہوئے - (بعض نے ۲۱۳ھ لکھا ہے ، اور بعض نے ۲۱۴ھ) - خلیفہ متوکل آپ کو یحییٰ بن ہرشمہ کے ساتھ سرمن رای (سامرہ) لے آیا جہاں آپ تا حین حیات مقیم رہے -

کہتے ہیں ایک مرتبہ متوکل بیمار پڑا اور اُسے ایسا پھوڑا نکل آیا جس کا کوئی علاج نہ تھا - جب اُس کی حالت بے حد خراب ہو گئی تو اُس کی والدہ نے یہ منت مانی کہ اگر وہ ٹھیک ہو جائے تو میں اپنے مال خاص سے امام ہادی کو بہت کچھ نقدی اور تحفوں کی صورت میں دوں گی - اسی اثنا میں ایک روز کسی نے کہا کہ اس مرض کا علاج 'ہادی' سے کروانا چاہئیے - چناں چہ مشورے کے لیے ایک شخص کو آپ کے پاس بھیجا گیا ، آپ نے کہا فلاں چیز پھوڑے پر رکھو - اہل مجلس نے سنا تو تمسخر اڑایا ، لیکن پھر آزمائش کے طور پر جو وہ چیز پھوڑے پر رکھی تو وہ پھٹ گیا اور متوکل کو شفا

ہو گئی۔ اس کی والدہ نے منت کے مطابق ایک سربمہر تھیلی میں دس ہزار دینار آپ کو بھجوا دئے۔

کچھ دنوں بعد حاسدوں نے چغلی کھائی کہ امام ہادی کے گھر میں اسلحہ و اموال بے شمار ہے۔ متوکل نے اپنے حاجب کو رات کے وقت ہادی کے گھر میں جا کر معائنہ کرنے اور ایسی تمام اشیاء لانے کو کہا۔ جب وہ وہاں پہنچا تو امام جاگ رہے تھے۔ آپ نے وہی سربمہر تھیلی اور ایک تلوار جو مصلے کے نیچے تھی، اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ یہ تمام چیزیں متوکل کے پاس لے گیا۔ متوکل نے جب اپنی والدہ کی مہر والی تھیلی دیکھی تو اس بارے میں استفسار کیا۔ جب تمام واقعہ کا اسے پتا چلا تو اس نے ایک اور تھیلی اس کے ساتھ ملا کر آپ کو اسی حاجب کے ہاتھ بھجوا دی۔

آپ کی ذات اوصاف حمیدہ سے متصف تھی۔ میر خواند کے مطابق آپ نے ۴۱ برس کی عمر میں متوکل کے بیٹے منتصر کے زمانے میں (بروز دو شنبہ آخر جمادی الآخر ۲۵۴ھ) وفات پائی۔ امیر علی نے بھی یہی مہینہ اور سنہ (مطابق جون ۸۶۸ء) دیا ہے۔ لیکن جلال ہمائی کے مطابق بعض آپ کی وفات کا دن ۲۱ جمادی الآخر بتاتے ہیں اور بعض ۳ رجب۔ آپ سرمن رائے (سامرہ) ہی میں مدفون ہوئے۔

(روضۃالصفا جلد سوم، صفحہ ۱۷—۱۸۔ اے شارٹ ہسٹری آف دی سیراسینس از امیر علی، صفحہ ۲۹۱۔ تاریخ ادبیات ایران از جلال‌الدین ہمائی، جلد دوم صفحہ ۳۱۳ چاپ دوم)

۴۔ وزیر خان۔ ہرات کا رہنے والا، شیخ ابوبکر تایبادی کا بیٹا اور آصف خان عبدالمجید کا بھائی تھا۔ اس کا باپ اپنے وقت کے صاحبان کمال میں سے تھا۔ ۹۷۳ھ میں اس کا بھائی آصف خان کسی بات پر ناراض ہو کر جونپور میں خان زمان سے مل گیا تھا۔ خان زمان نے آصف کو افغانوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تو وزیر خان اسی (خان زمان) کے پاس رہا۔ لیکن اس کی نیت میں فتور دیکھ کر دونوں بھائی وہاں سے بھاگ آئے۔ ان کا تعاقب ہوا مگر یہ شکست دے کر

کڑہ مانکپور پہنچ گئے - یہاں سے اس (وزیرخان) کے بھائی نے اسے مظفر خاں تربتی دیوان اعلیٰ کے پاس آگرہ بھجوا دیا - ۹۷۴ھ میں جب کہ اکبر پنجاب میں خیمہ زن تھا ، مظفر آسے ساتھ لے کر وہاں پہنچا اور آس کے تمام قصور معاف کروا دیے۔

اکبر کے اکیسویں سال جلوس میں جب میرزا کوکہ مورد عتاب ہوا تو اسے اس کی جگہ ناظم گجرات بنا دیا گیا - اس کے بعد آسے سپہ سالاری بھی مل گئی -

بائیسویں سال جلوس میں راجہ ٹوڈرمل کو اس کی مدد کے لیے متعین کیا گیا - اسی سال مہر علی کولابی نے شورش برپا کی ، جسے راجہ ٹوڈرمل نے دبا دیا - کچھ عرصہ بعد جب راجہ واپس دربار میں پہنچا تو کولابی نے پھر شورش برپا کی - وزیرخان مقابلے کی تاب نہ لا کر قلعہ بند ہوگیا - لڑائی کے دوران میں مہرعلی تیر لگنے سے مر گیا جس کے سبب آس کے آدمی بھاگ گئے -

وزیرخان جب حکومت کا کاروبار صحیح طور پر نہ چلا سکا تو آسے معزول کر کے دربار میں بلا لیا گیا - پچیسویں سال جلوس میں اسے منصب وزارت ملا - اسی سال حکومت اودھ پر مامور ہوا -

اٹھائیسویں سال جلوس جب خان اعظم ، معصوم خان وغیرہ کی بیخ کنی کے لیے گیا تو اسے آس کی کمک کے لیے بھیجا گیا - کچھ عرصہ بعد خان اعظم ناسازی طبع کے سبب لوٹ آیا تو آسے سپہ سالار بنا دیا گیا -

اکتیسویں سال جلوس جب ہر صوبہ دو امیروں کے سپرد ہوا تو بنگال کی حکمرانی وزیرخان اور محب علی خان کو ملی -

بتیسویں سال جلوس (۹۹۵ھ) اسہال سے فوت ہوا - چارہزاری امرا میں سے تھا -

(مآثر الامرا ، جلد اول ، صفحہ ۷۷ ، ۸۱ ، ۸۲ - جلد سوم ، صفحہ ۹۲۹—۹۳۲ - طبقات اکبری ، صفحہ ۳۸۲)

۵ - خطاب و مناصب - خطاب یا لقب بڑے بڑے درباریوں کو بادشاہوں کی طرف سے ملا کرتے تھے - مثلاً خان خاناں ، خان اعظم ، فیروز جنگ وغیرہ -

غزنویوں کے ابتدائی عہد میں سب سے زیادہ معزز خطاب امیر کا تھا - غزنیں کے فرمانروا امیر ہی کہلاتے تھے - محمود نے تخت نشینی کے بعد سلطان کا لقب اختیار کیا تو امیر کا خطاب اس کے لڑکوں کے لیے مخصوص ہو گیا - مسعود کے زمانے میں یہ لقب ارکان سلطنت اور فوجی سرداروں کو ملنے لگا -

غوریوں نے شروع میں اپنے نام کے ساتھ امیر ہی استعمال کیا ، لیکن بعد میں ملک کا لقب اختیار کیا -

ایلتتمش کے بعد سے خان کا لقب سب سے زیادہ معزز سمجھا جانے لگا - بلبن سے لے کر شیر شاہ سوری تک ہر فرمانروا کے لڑکوں کے نام کے ساتھ یہ لقب استعمال ہوا - بڑے بڑے انتظامی اور فوجی عہدہ داروں کو بھی اسی خطاب سے مخاطب کیا جاتا - فوجی سرداروں کے لیے خان سے پہلے کچھ ایسے اسماے صفت استعمال کیے جاتے تھے ، جن سے ان کی جنگی شوکت و عظمت اور فوجی دبدبہ کا اظہار ہوتا تھا ، مثلاً قتلغ خاں ، الغ خاں وغیرہ - کبھی خان کو زیادہ معزز بنا کر خان خاناں کر دیا جاتا ، اور کبھی خان کو خان اعظم یا خان معظم یا خان جہان بنا کر بھی مؤقر کیا جاتا -

ملک ، خان سے اور امیر ملک سے نسبتہً کم تر درجہ کا لقب تھا -

سادات ، لودیوں اور سوریوں کے زمانے میں ملک اور امیر نظر نہیں آتے ہیں - ان کے دور میں یہ خطابات و القاب ختم کر دیے گئے تھے ، اور ہر فوجی عہدہ دار خان ہی کے لقب سے ملقب ہوتا تھا -

ہمایوں نے بھی ہندوستان کے پیش رو مسلمان فرمانرواؤں کی روایت کے مطابق یہاں کے امرا اور فوجی سرداروں کو خطاب دینے شروع کیے -

ہمایوں کے ہندوستانی فوجی سردار بدستور سابق خان رہے، اور اس کے باپ کے دور کے بعض سرداروں کے نام کے آگے بھی خان کے لقب کا اضافہ ہوا۔ مثلاً عبداللہ خان اوزبک وغیرہ

اکبری دور کے بعد سے خان معزز اور خان خاناں بہت ہی معزز لقب ہو گیا۔ ہر دور میں ایک خان خاناں ہوتا تھا۔ مثلاً اکبر کے عہد میں خان خاناں بیرم خاں، اس کے بعد خان خاناں منعم خاں اور خان خاناں عبدالرحیم تھے۔ جہانگیری عہد میں مرزا عبدالرحیم ہی خان خاناں رہا۔ شاہجہانی حکومت میں مہابت خاں اور یمین الدولہ آصف خاں خان خاناں ہوئے۔ عالمگیری دور میں نواب معظم خاں، جو میر جملہ کے نام سے مشہور تھا۔ بہادر شاہ اول کے وزیر اور سپہ سالار منعم خاں کا لقب خان خاناں بہادر فیروز جنگ ہوا ......

خطابات کے علاوہ اکبر نے مختلف فوجی مناصب قائم کیے جو دوازدہ ہزاری سے دہ باشی تک تھے۔ سب سے چھوٹا عہدہ دار دہ باشی یا دس سپاہی کا سردار کہلاتا تھا۔ اسی طرح دس، بیس، تیس سو، دو سو، ہزار، دو ہزار اور بعد میں بارہ ہزار تک کے سردار نامزد ہوتے اور منصب دار کہلاتے۔ ہر تیموری شاہزادے کے لیے فوجی مہم پر جانا ضروری تھا۔ اس لیے فوجی سرداروں کی طرح اس کے بھی مناصب مقرر ہوتے تھے۔

اکبر کے عہد میں ہفت ہزاری سے اوپر کے مناصب شاہی خاندان کے لیے مخصوص تھے، اور دوسرے مناصب کا اعزاز امرا اور فوجی سرداروں کے لیے تھا۔ شروع میں اکبر کے اعلیٰ فوجی عہدے دار پنج ہزاری سے زیادہ مناصب پر فائز نہیں ہوئے، لیکن آخر میں راجہ مان سنگھ، میرزا شاہ رخ اور عزیز خاں کوکلتاش وغیرہ سات ہزاری منصب سے سرفراز کیے گئے۔

اکبری دور کے بعد مناصب کی تعداد بڑھتی گئی۔ جہانگیر کے عہد میں شہزادہ خرم کا منصب سی ہزاری تھا، اور جب جہانگیر اس سے ناخوش ہوا تو اس نے شہزادہ پرویز کا منصب چالیس ہزاری

کردیا ۔ شاهجهان کے عهد میں دارا شکوه کا منصب شصت هزاری تھا ۔

امرا اور فوجی سرداروں میں کسی کا منصب هفت هزاری سے نہیں بڑھا ۔ البته جہانگیر اور شاهجہان کے خسر اعتماد الدوله اور آصف‌الدوله دونوں کا منصب نه هزاری تھا ۔ وه شاهی خاندان هی کے افراد سمجھے جاتے تھے ۔ (اس کے بعد 'تابیناں' 'ذات' وغیره کا حاشیه بھی ملاحظه هو) ۔

(هندوستان کےعهد وسطیٰ کا فوجی نظام ، صفحه ۱۳—۱۵ ، ۱۹، ۲۰)

٦ - میرزا کوکلتاش ۔ محمد عزیز کوکلتاش لقب اعظم خاں یا (خان اعظم) شمس‌الدین محمد اتکه خان اعظم کا بیٹا تھا جو غزنی کے سرکرده لوگوں میں سے تھا ۔ اس کی ماں نے اکبر کو دودھ پلایا تھا ، جس کے سبب اکبر اس کا بڑا دھیان رکھتا تھا ، اکبر نے اسے بلند ترین امرا کی صف میں شامل کیا ۔ سولھویں سال جلوس میں جب اس کا باپ فوت هو گیا تو اس کا لقب اسے مل گیا ، بعد میں ۵ هزاری کے منصب پر پہنچا ، اور حکومت بنگال پر مامور هوا ۔ چالیسویں سال جلوس اکبر نے اسے وکالت کے عهدۂ جلیله پر فائز کیا ۔ بادشاه کے مزاج میں اسے بڑا دخل تھا ۔

اس کی ایک لڑکی شہزاده خسرو سے بیاهی هوئی تھی ۔ اسی وجه سے وه تخت کے لیے خسرو کا حامی تھا ، اور نہیں چاهتا تھا که جہانگیر تخت پر بیٹھے ۔ لیکن اس کے باوجود جب جہانگیر تخت نشین هوا تو اس نے اسے ''انواع عواطف و اقسام نوازش'' سے سرافراز و ممتاز کیا ۔ جہانگیر کے پہلے هی سال جلوس میں اس کا ایک خط پکڑا گیا جو خاندیس کے حاکم کے نام تھا ، اور جس میں به قول جہانگیر و معتمد خاں ، عرش آشیانی کے متعلق بری بھلی باتیں مرقوم تھیں ۔ جہانگیر لکھتا ہے ''اگر اس کی والده کے دودھ کے حق کا خیال اور لحاظ نه هوتا تو وه اس قابل تھا که اسے (میں) خود اپنے هاتھ سے کیفر کردار تک پہنچاؤں''۔ جہانگیر نے اسے وقتی طور پر صرف یه سزا دی که اسے اس کی جاگیر سے هٹا دیا ۔

تیسرے سال جلوس میں جہانگیر نے اسے مرتضیٰ خاں کی جگہ گجرات کا صوبہ دار مقرر کیا، لیکن ساتھ ہی یہ حکم دیا کہ وہ خود بادشاہ کے حضور میں رہے اور اپنے بڑے بیٹے جہانگیر قلی خاں کو اپنا نائب مقرر کر کے وہاں روانہ کرے۔ پانچویں سال جلوس میں مہم دکن پر متعینہ لشکر کو کمک دینے کے لیے اسے دکن روانہ کیا گیا۔ نویں سال جلوس میں اسے جہانگیر کے حکم سے قلعہ گوالیار میں نظر بند کیا گیا۔ اس نظر بندی کے متعلق جہانگیر لکھتا ہے کہ اس سے ''غرض و غایت محض یہ تھی کہ وہ خسرو سے ربط ضبط اور یک جہتی رکھنے کی وجہ سے کہیں رانا کی مہم میں کوئی گڑ بڑ پیدا نہ کر دے اور اس کی وجہ سے لشکر میں منافقت و فساد پیدا نہ ہو۔ اس وجہ سے میں نے حکم دیا کہ اسے قیدیوں کی طرح نہ رکھا جائے، بلکہ کھانے پینے اور اطمینان و آسائش کی تمام چیزیں مہیا کی جائیں۔''

خان اعظم نے جہانگیر کے انیسویں سال جلوس (۱۰۳۳ھ) میں بہ مقام احمد آباد گجرات وفات پائی۔ اس کی میت کو دہلی لے جا کر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے مزار کے پاس اس کے والد کی قبر کے نزدیک دفن کیا گیا۔

بہ قول معتمد خاں وہ ایک بے نظیر و بے مثال مصاحب تھا۔ مدعا نویسی، مسلسل گوئی اور تاریخ دانی میں سر آمد روزگار تھا۔ خط نستعلیق بہت عمدہ لکھتا تھا۔ اس کا لکھا ہوا خط ریختہ کسی بھی ماہر فن کی تحریر سے کم نہ ہوتا تھا۔ عربی زبان سے نا بلد تھا۔ لطیفہ گوئی میں بے مثل ہونے کے علاوہ اچھے شعر بھی موزوں کر لیا کرتا تھا۔ بدایونی نے اس کا ذکر شعرا کے زمرے میں بھی کیا ہے۔ مذہب کے معاملے میں سخت تھا۔ اس سلسلے میں اس کا اکبر کے ساتھ بحث مباحثہ بھی ہوا۔ ۱۰۰۱ھ میں حج کو گیا، لیکن جب واپس آیا تو بقول بدایونی اس کی شان بے نیازی جاتی رہی تھی اور اپنی پسندیدہ صفات کو خیر باد کہہ کر بادشاہ کو سجدہ بھی کر گزرا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار میں اس کا چراغ جلنے لگا۔

(طبقات اکبری، صفحہ ۳۸۱ - منتخب التواریخ، اردو ترجمہ صفحہ ۳۸۶، ۵۴۸، ۵۵۵، ۷۲۰ - توزک جہانگیری، اردو ترجمہ صفحہ ۱۰۶، ۱۷۳، ۲۰۵، ۲۸۰، ۸۰۶ - جہانگیرنامہ، صفحہ ۵، ۲۰، ۲۱، ۳۶ - دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی، صفحہ ۱۸۷، ۱۸۸ - انتخاب سیرالمتاخرین مطبوعہ لاہور، صفحہ ۲۴)

۷ - راجہ مان سنگھ - راجہ بھگوان داس کچھواھہ کا بیٹا تھا - اس کے دادا بہاری مل، نے جو امبر (جے پور) کا حکمران تھا، اکبر کے ساتھ ۱۵۶۲ء میں دوستانہ مراسم پیدا کر لیے تھے - اس کے بعد وہ اپنے بیٹے بھگوان داس اور پوتے مان سنگھ کے ہمراہ اکبری دربار میں پہنچا - اکبر نے بہاری مل کو ۵ ہزاری کا منصب دیا - اس کے بیٹے اور پوتے کو بھی فوج میں اعلیٰ عہدے دیے - بیل نے 'تذکرۃ الامرا' کے حوالے سے لکھا ھے کہ مان سنگھ اکبر کے چھٹے سال جلوس میں آگرہ پہنچا تھا -

اس نے بہت سے کارھائے نمایاں سر انجام دیے - سترھویں سال جلوس (۹۸۰ھ) میں جب اکبر نے گجرات پر حملہ کرنا چاہا تو راجہ مان سنگھ کو ایک آراستہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف مقرر کیا - بعد میں جب شاھی لشکر نے پٹن (احمد آباد) کے سامنے کیمپ لگایا تو اسی مقام پر پٹھانوں کا تعاقب کرنے کے بعد مان سنگھ کافی مال غنیمت لے کر حاضر ھوا -

اوائل محرم ۹۸۴ھ (اکیسویں سال جلوس) میں اکبر مان سنگھ کو لے کر حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار پر گیا - وھاں دعا کے بعد اس نے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا کیے، اور اسے کوکندہ اور کونبھل میر کے دار الحرب پر (یہ مقام رانا کیکا کی عمل داری میں تھا) فوج کشی کے لیے مامور کیا - اس کے ساتھ کئی دوسرے امرا بھی مقرر کیے گئے - اس لڑائی میں مان سنگھ نے، بہ قول بدایونی، ''جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیے اس سے ملا شیری کے اس مصرع کی تصدیق ھو گئی:

که هندو می زند شمشیر اسلام

(کہ ھندو اسلام کی تلوار چلا رھا ھے'')

چھبیسویں سال جلوس میں اسے شاہزادہ مراد کے ساتھ محمد حکیم میرزا (اکبر کا چھوٹا بھائی) کے مقابلے میں بھیجا گیا، جس نے کابل میں بغاوت کر رکھی تھی۔ اس لڑائی میں بھی یہ فتح مند لوٹا۔ اس کے تین سال بعد جب میرزا حکیم فوت ہو گیا تو مان سنگھ کو اس (میرزا) کے پسماندگان کو لانے کے لیے کابل بھیجا گیا۔ راجہ ان سب کو بخیر و عافیت لے آیا۔ اکتیسویں سال جلوس میں یوسف زئی پٹھانوں کی سر کوبی کے لیے اسے کابل کا ناظم مقرر کیا گیا۔ تینتیسویں سال بہار کا صوبہ دار بنا۔ چونتیسویں سال جلوس میں بھگوان داس کے مرنے کے بعد پنج ہزاری منصب اور راجہ کے خطاب سے نوازا گیا۔ اڑتالیسویں سال جلوس بنگالہ کا ناظم مقرر ہوا۔ چوالیسویں سال جلوس بنگالہ سے بے شمار تحائف لے کر دربار میں پہنچا، اور پیش کر کے واپس اسی صوبہ میں چلا گیا۔

سنتالیسویں سال جلوس دریائے بکرم پور اور سری پور کے مقام پر کارہائے نمایاں کے سبب اسے چار قبائیں عطا ہوئیں۔ پچاسویں سال جلوس اسے ہفت ہزاری کے منصب اور 'فرزند' کے خطاب سے نوازا گیا۔

جہانگیر کے پہلے سال جلوس میں اسے دکن کی مہم پر بھیجا گیا۔ جہانگیر کے زمانے میں بھی اس نے نمایاں کام کیے۔ جہانگیر کے نویں سال جلوس ۱۰۲۳ھ اس نے وفات پائی۔

بدایونی نے لکھا ہے کہ محرم ۹۹۶ھ میں اکبر نے اسے اور خان خاناں کو خلوت میں بلایا اور انہیں اپنے دین (دین الٰہی) کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا "اگر حضور کی مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں، کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشا ہے اور اس کا تعلق دین و مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور

تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے''۔ اس جواب پر اکبر نے یہ معاملہ اسی جگہ ختم کر دیا۔

(منتخب التواریخ ، صفحہ ۳۹۹ ، ۴۰۰ ، ۴۵۰ ، ۴۵۳ ، ۵۳۳ - مفتاح التواریخ صفحہ ۲۲۲ ، ۲۲۳ - این ایڈوانسڈ...... صفحہ ۴۴۹)

۸ ۔ امیر الامرا شریف خان ۔ خان اعظم اتکہ کا بھائی اور اکبری امرا میں سے تھا ۔ جن دنوں نظام الدین احمد نے طبقات اکبری لکھی ، ان دنوں وہ اپنے وطن غزنین کی حکومت پر سرفراز تھا ۔

جہانگیر اپنے پہلے سال جلوس کے واقعات میں اس کے متعلق لکھتا ہے ''شریف خاں ، جو میرے لڑکپن کا ساتھی ہے ، اور جسے شاہزادگی کے زمانے میں خانی کا خطاب دیا تھا اور جب میں الہ آباد سے والد کی کی خدمت میں روانہ ہوا تھا ، تو اسے نقارہ ، توغ (علم) اور تومان (دس ہزار دینار) عنایت کر کے دو ہزار و پانصدی کا منصب دے کر اور صوبہ بہار کا صوبہ دار بنا کر بہار کی طرف روانہ کیا تھا ، میری تخت نشینی کے پندرھویں دن بتاریخ ۴ رجب (یہاں پندرھویں دن کی بجائے پچیسویں دن ہونا چاہیے کیوں کہ خود اس کے اپنے قول کے مطابق وہ آٹھ جمادی‌الثانی ۱۰۱۴ھ کو تخت پر بیٹھا تھا ۔ یزدانی) میرے دیدار کی سعادت حاصل کرنے کے لیے آیا ۔ اس کی آمد سے میں بے انتہا خوش ہوا کیوں کہ وہ میرا ایسا خدمت گزار ہے ، جس کو میں اپنا بھائی ، بیٹا ، مددگار اور دوست سمجھتا ہوں ۔ چوں کہ اس کے خلوص ، دانائی ، عقل مندی اور کارگزاری پر مجھے کلی اعتماد ہے ، اس لیے اسے وکیل السلطنت (وکیل کے عہدے پر تھوڑا عرصہ رہا ۔ کیوں کہ ۲ سنہ جلوس میں وہ سخت علیل ہو گیا اور یہ عہدہ دوسرے شخص کو سونپا گیا) اور وزیر اعظم بنا کر امیرالامرا کا خطاب دیا ۔ ملک خطا میں اس سے بڑھ کر کوئی خطاب نہیں ہوتا ، ساتھ ہی اسے ۵ہزاری کا منصب عطا کیا ۔ اگرچہ اس کے عہدے اور منصب میں اضافہ کی گنجائش تھی لیکن اس نے درخواست کی کہ جب تک وہ کوئی کارنمایاں سرانجام نہ دے اسے مزید منصب اور عہدہ نہ دیا جائے''۔

اس کا والد خواجہ عبدالصمد اکبری دور میں نقاشی اور تصویر کشی کے فن میں بے مثل تھا ۔ اکبر نے اسے 'شیریں قلم' کا خطاب دیا تھا اور اسے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا ۔ طبقات اکبری کے برعکس جہانگیر نے اس کا وطن شیراز لکھا ہے ۔

جہانگیر شاہزادگی کے دنوں میں اپنی شاہی مہر شریف خاں کے پاس رکھا کرتا تھا ۔

اس نے رمضان کے مہینے میں بہ روز اتوار (١٠٢١ھ) نہال پور کے پرگنہ میں وفات پائی ۔ جہانگیر لکھتا ہے ''لاہور میں بیمار پڑ کر صحت یاب ہونے کے بعد سے اس کے ہوش و حواس کم بجا رہتے تھے اور اس کا حافظہ بالکل خراب ہو گیا تھا ۔ بہت خلوص رکھنے والا آدمی تھا ۔ افسوس ہے کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں جسے نوازا جاتا''۔

(طبقات اکبری ، صفحہ ۳۴۸ ۔ توزک جہانگیری ، اردو ترجمہ صفحات ۳۶ ، ۴۵ ، ۴۸ ، ۵۱ ، ۲۵۱ ، ۲۵۲ ۔ دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی ، صفحہ ۱۸۹ ۔ جہانگیر نامہ ، یعنی اقبال نامۂ جہانگیری از معتمد خاں مطبوعہ نولکشور صفحہ ۴ ، ۲۳ ۔ 'ھندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام' از سید صباح الدین عبدالرحمان ، صفحہ ۵ ۔)

۹ ۔ مہابت خاں ۔ اصل نام زمانہ بیگ ، غیور بیگ کابلی کا بیٹا تھا ۔ شروع شروع میں شاہزادہ سلیم (جہانگیر) کی چیزیں اٹھانے اور رکھنے کی خدمات سر انجام دیتا رہا ۔ پھر احدی کے منصب سے پانصدی کے منصب تک پہنچا ۔

جب جہانگیر تخت نشین ہوا تو اس نے اسے مہابت خاں کا خطاب دیا اور اس کا منصب بڑھا کر ھزار و پانصدی بنا دیا ، اور شاگرد پیشوں کی بخشی گری کا عہدہ اسے سونپا ۔

بارھویں سال جلوس میں جہانگیر نے خان دوراں کو تبدیل کر کے اس کی جگہ مہابت خاں کو کابل و بنگش کا صوبہ دار مقرر کیا اور خلعت عطا کی ، اور ھفتہ کی رات ۱۲ ماہ آبان کو اسے گھوڑا اور خاص ھاتھی عنایت کر کے مذکورہ صوبہ کے لیے رخصت کیا ۔

جب شاہزادہ خرم (شاہجہان) نے باپ سے بغاوت کی اور (اٹھارھویں سال جلوس میں) شاہزادہ پرویز کو اس کی بیخ کنی و تعاقب پر مامور کیا گیا تو اس کی رہنمائی اور انتظام لشکر 'موتمن الدولۃ القاہرہ مہابت خاں' کے سپرد ہوا۔ شاہجہان پر فتح پانے کے بعد اسے جہانگیر نے ایک مرصع تلوار عنایت کی۔ علاوہ ازیں شائستہ خدمات سر انجام دینے کے صلے میں اسے سات ہزار ذات و سوار کے منصب سے نوازا۔

انیسویں سال جلوس میں جہانگیر نے اسے (شاہجہان کو پیہم دو تین شکستیں دینے کے سبب) خان خاناں سپہ سالار کا خطاب دے کر سات ہزار پیادوں اور سات ہزار دواسپہ و سہ اسپہ سواروں کے منصب پر بڑھایا۔ علاوہ ازیں اسے تمن اور توغ عنایت کیا۔ اسی سال شاہزادہ پرویز نے صوبہ بنگال اسے اور اس کے بیٹے کو بطور جاگیر تنخواہ دیا۔

اکیسویں سال جلوس (۱۰۳۵ھ) میں مہابت خاں نے جہانگیر سے بغاوت کر دی، جس کا سبب یہ تھا کہ جہانگیر نے اس سے ان ہاتھیوں کا مطالبہ کیا تھا، جو اس نے شاہجہان کی شورش کے دوران بنگال میں اپنے قبضے میں لے لیے تھے، اور اشارتاً دربار میں حاضر ہونے کا بھی حکم دیا تھا۔ در اصل اس طلبی میں آصف خاں کا ہاتھ تھا۔ مہابت خان فوج لے کر دریائے جہلم (ترجمہ تزک میں دوسری جگہ چناب لکھا ہے) کے کنارے پہنچ گیا جہاں شاہی لشکر مقیم تھا۔ جہانگیر کو جب اس کے پہنچنے کی خبر دی گئی تو اس نے کہا کہ پہلے وہ اپنا حساب صاف کرے پھر اسے کورنش بجا لانے کی اجازت ہو گی، لیکن بعد میں حالات نے پلٹا کھایا اور مہابت خان جہانگیر کو اپنے ساتھ لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ نور جہان اور آصف خان نے جہانگیر کو چھڑانے کے لیے مہابت خان پر حملہ کیا، لیکن ناکامی ہوئی۔ مہابت خان جہانگیر کو اپنے ساتھ کابل لے گیا۔

یہاں پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد شاہی احدیوں اور مہابت خان کے راجپوتوں کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو گیا، جس نے دوسرے روز باقاعدہ لڑائی کی صورت اختیار کر لی۔ اس میں بہت سے راجپوت

مارے گئے ۔ مہابت خان کو اس کا پتا چلا تو اس نے حالات دگرگوں دیکھتے ہوئے بادشاہ کے پاس دولت خانہ میں پناہ لی ۔ پھر کچھ دنوں بعد وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا ۔ بادشاہ نے اس کے بائیس لاکھ روپیہ پر قبضہ کر لیا ، جو اس کے وکلا بنگال سے اسے پہنچانے کے لیے لا رہے تھے ۔ مہابت خان فرار کے بعد مختلف علاقوں سے ہوتا ہوا شاہجہان کے ساتھ مل گیا ۔ شاہجہان نے موقع کو غنیمت جانا اور اس کی تمام خطائیں معاف کر دیں ۔

جہانگیر کی وفات (اتوار ۲۸ ماہ صفر ۱۰۳۷ھ) کے بعد شاہجہان تخت نشین ہوا تو اس نے ۱۰۳۸ھ میں اسے دھلی کا صوبہ دار بنا دیا ۔ اس سے پہلے اسے خان خاناں اور سپہ سالار کا خطاب دیا اور ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار دواسپہ و سہ اسپہ کے منصب سے سرفراز کیا ۔ ۱۰۴۴ھ میں اس نے وفات پائی ۔

مہابت خان دولت ، کثرت سپاہ اور اسباب شوکت و جاہ کی فراوانی کے سبب دیگر امراء کی نسبت زیادہ ممتاز تھا ۔

(توزک جہانگیری ، اردو ترجمہ ، صفحہ ۳۲۰ ، ۳۲۵ ، ۷۳۸ ، ۷۵۶ ، ۷۹۷، ۸۰۳ ، ۸۱۸ ببعد ۔ عمل صالح ، جلد اول صفحہ ۲۰۳ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۲۴۳)

۱۰ ۔ شاہ وجیہہ الدین ۔ علوی نسب تھے ، لیکن بہ قول بدایونی اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی ۔ مشرق گجرات کے قدیم شہر چانپانیر میں پیدا ہوئے ۔ اپنے زمانے کے بڑے عابد و متقی عالم اور شریعت کے نہایت پابند تھے ۔ گوشہ نشینی کو شعار بنائے رکھا ۔ ہمیشہ دینی علوم کے درس و تدریس میں مشغول رہے ۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا ، جس کے سبب 'صرف ہوائی' سے لے کر 'قانون' ، 'شفا' 'شرح مفتاح' اور 'عضدی' جیسی کتب میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہو گی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو ۔ بے شمار لوگ ان سے استفادہ کرتے تھے ۔

ان کی دعا بڑی حامل تاثیر و شفا تھی ۔ ہر روز لاتعداد مریض

ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے ۔ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھروں میں نہیں گئے ۔ البتہ دو ایک مرتبہ ، وہ بھی نہایت مجبوری و اکراہ کے ساتھ ، طلب کرنے پر گئے ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا ۔ ان کا گھر ادنیٰ و اعلیٰ سب کا مرکز تھا ۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے ۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ھی قناعت کرتے ، جو کچھ نذر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے ۔

تربیت و ارشاد شیخ محمد غوث شطاری سے حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے ۔ انھی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی ۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی ۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں شیخ محمد غوث کی بعض تصانیف کی بنا پر شیخ علی متقی نے ، جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے ، بلکہ دربار سرکار میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا ، ان پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا ۔ (شیخ ان دنوں گجرات تشریف لے گئے ہوئے تھے)۔ سلطان نے وہ فتویٰ شاہ وجیہہ الدین کے پاس دستخط و تصدیق کے لیے بھیجا ۔ شاہ نے وہ فتویٰ پھاڑ کر پھینک دیا ۔ اس قسم کی تکفیر کی سخت مخالفت کی ، اور اس مسئلہ پر ایک مستقل رسالہ تصنیف کیا ، جس میں مسئلہ تکفیر پر فقہی کتب سے روشنی ڈالنے ، پھر احادیث کی سند سے سب کو مشرح بیان کرنے کے بعد صوفیاے کرام کے احوال سے بحث کی ھے کہ وہ حالت سکر میں جو کہہ جاتے ھیں وہ قابل مواخذہ نہیں ھوتا ۔ پھر سید محمد غوث کی کتاب 'اوراد غوثیہ' پر لوگوں نے جو اعتراضات کئے تھے ، ان کا جواب دیا ھے ۔

ان کا ارشاد یہ تھا کہ ''کسی شخص کی سو باتوں میں سے ایک بات بھی اسلام کی ھو تو اس کو مسلم سمجھو اور کسی کلمہ‌گو اھل قبلہ کو کافر نہ کہو'' ۔

بہ‌قول بدایونی شیخ محمد غوث سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رھی

اس کا سبب شاہ وجیہہ الدین کا رویہ تھا، جو آنھوں نے فتویٰ کے جواب میں اختیار کیا اور اسی کے باعث شیخ پھانسی پانے سے بچ گئے -

شاہ نے ۹۹۸ھ (۱۵۹۰ء) میں وفات پائی - (اخبارالاخیار میں ۹۹۷ھ ہے) 'وجیہہ الدین' سے تاریخ وفات نکلتی ہے - ان کے مزار کے چھپر کٹ پر، جسے نواب مرتضیٰ خان نے تیار کروایا تھا، سیب کا نہایت اعلیٰ درجہ کا کام ہوا ہے - جہانگیر نے اپنے بارھویں سال جلوس میں ان کے مزار کی زیارت کی تھی - بہ‌قول اس کے ان کی خانقاہ اکبر کے ایک اعلیٰ امیر صادق خان نے تعمیر کروائی تھی - ان کے مرتبہ کے متعلق وہ لکھتا ہے کہ وہ شیخ محمد غوث کے ایسے بلند مرتبہ خلیفہ تھے، جن پر خود مرشد کو فخر ہوتا ہے، اور یہ کہ وہ ظاہری و باطنی کمالات و صفات سے آراستہ و پیراستہ تھے -

(منتخب‌التواریخ صفحہ ۵۸۴، ۵۸۵ - رود کوثر صفحہ ۳۳۸–۳۳۹ - اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۳ - سفینۃ الاولیا صفحہ ۱۹۴ - توزک جہانگیری، اردو ترجمہ صفحہ ۳۵۰)

۱۱ - لشکر خان - شروع میں شاہزادہ سلطان مراد کا دیوان تھا - کچھ عرصہ بعد دکن میں شاہزادہ سلطان سلیم کے پاس آ گیا - جہانگیر نے تخت نشین ہونے کے بعد اسے لشکر خان کے خطاب اور اعلیٰ منصب سے نوازا -

ایک عرصہ تک صوبۂ کابل کی دیوانی و بخشی گری پر مامور رہا - پھر افغانوں کی بیخ کنی پر مامور ہوا، جو ہندوستان اور کابل کے راستہ میں لوٹ‌مار مچاتے تھے - جہانگیر نے اپنے چودھویں سال جلوس اسے علم و نقارہ عطا کیا، اور آگرہ کی حکومت دی - جب شاہجہان نے باپ کے خلاف سر اٹھایا تو اسے مہابت خان کے ساتھ شاہزادے کی تنبیہ کے لیے متعین کیا گیا - بعد ازیں ملک عنبر کے استیصال کے لیے اسے بھیجا گیا - لیکن اس کے ساتھ معرکے میں دوسرے امرا کے ساتھ گرفتار اور قلعہ دولت آباد میں محبوس ہوا - سلطان پرویز کی وفات کے بعد وہاں سے رہائی پائی -

شاھجہان جب تخت پر بیٹھا تو اس نے اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ۔ اس نے شاہ زادگی کے دنوں میں لشکر خان سے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا تھا ، تخت پر بیٹھتے ھی اسے ادا کر دیا ، اور دو ھزاری ذات و سوار کا اضافہ کرکے اسے پنج ھزاری چہار ھزار سوار کے منصب پر پہنچایا اور کابل کا صوبہ دار بنا دیا ۔ ابھی کابل پہنچا بھی نہیں تھا کہ بلخ و بدخشان کا والی نذر محمد خان تسخیر کابل کے ارادے سے آگے بڑھ آیا ۔ اس نے کسی کمک کا انتظار کئے بغیر بڑی بہادری سے اس کا مقابلہ کیا ۔ جس کے سبب وہ ۹ محرم ۱۰۳۸ھ کو واپس لوٹ گیا ۔ اور لشکر خان کابل میں داخل ھوا ، جہاں اس نے رعایا کی بڑی دیکھ بھال کی ۔ چوتھے سال جلوس میں بعض وجوہ کی بنا پر معزول ھوا ۔ پانچویں سال جلوس دھلی کا حاکم بنا دیا گیا ۔ چونکہ کبر سنی کے سبب اپنے فرائض صحیح طور پر انجام نہ دے سکتا تھا ، اس لیے چھٹے سال 'لشکر دعا' میں داخل کر دیا گیا اور پھر وہ بیٹوں سمیت دربار میں حاضر ھوا ۔ نوکری سے استعفیٰ کے بعد اس نے حج بھی کیا اور وھاں سے واپس وطن مالوف لوٹ کر رباط و سرا بنوائیں ۔ بے شمار املاک خریدی اور وھیں فوت ھوا ۔ (مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۱۶۳—۱۶۸)

۱۲ ۔ اعتقاد خان ۔ اعتقاد خان میرزا شاپور ۔ اعتماد الدولہ کا بیٹا اور آصف خان کا بھائی تھا ۔

جہانگیر کے سترھویں سال جلوس میں کشمیر کی صوبہ داری پر مامور ھوا ، جہاں کئی برس رھا ۔ پنج ھزاری ذات و سوار کے منصب پر فائز تھا ۔ شاھجہان کے پانچویں سال جلوس میں کشمیر کی صوبہ داری سے معزول کر دیا گیا ۔ چھٹے سال میں بیش بہا تحفے ، نادرات ، شالیں وغیرہ لے کر دربار میں پہنچا ۔ اسی سال ۱۷ شعبان کو لشکر خان کے تبادلے پر صوبہ دھلی کی صوبہ داری اسے مل گئی ۔ سولھویں سال جلوس بہار کا صوبہ دار بنا دیا گیا ۔

بیسویں سال جلوس میں جب شاھجہان نے شاہزادہ شجاع کو بنگال سے طلب کیا تو اعتقاد خان کو اس کی جگہ وھاں مامور کیا گیا

جب شجاع کو دوبارہ بنگال مل گیا تو اس نے دربار کا رخ کیا ۔ ابھی راستہ ھی میں تھا کہ اس کا تقرر بطور صوبہ دار اودھ کے ھوگیا ، اور یہ حکم صادر ھوا کہ راستہ میں جہاں کہیں بھی ھو وھاں سیدھا پہنچے ۔

۱۰۶۰ھ (تئیسویں سال جلوس) میں وہ بوڑاپۓ سے آگرہ پہنچ کر وفات پا گیا ۔

نفیس کھانوں کا بے حد شائق تھا ۔ چناں چہ جب تک کشمیر رھا اس کے لیے خاص قسم کا چاول اور کنگیری پان برھانپور سے وھاں جاتا رھا ۔ علاوہ ازیں 'تکلف ملبوس ، صفاے معاش ، نظافت طبع' وغیرہ میں بھی یکتاے روزگار تھا ۔

آگرہ میں اس نے ایک نفیس و جدید قسم کی حویلی بنائی تھی ، جو اپنی مثال آپ تھی ۔ یہ حویلی شاھجہان کو بے حد پسند آئی ۔ چناں چہ اعتقاد خاں نے اسے پیش کر دی ۔ بعد میں یہ حویلی امیر الامرا علی مردان خاں کو مل گئی ۔

(عمل صالح ، جلد سوم صفحہ ۴۳۹ ۔ توزک جہانگیری اردو ترجمہ صفحہ ، ۱۳ے ۔ مآثر الامرا ، جلد اول صفحہ ۱۸۰-۱۸۲)

۱۳ ۔ محمد امین خاں ۔ میر محمد امین ، معظم خاں میر جملہ اردستانی کا بیٹا تھا ۔ شروع میں قطب شاہ نے اسے گرفتار کر لیا تھا (ملاحظہ ھو ذکر میر جملہ) بعد میں شاہ زادہ اورنگ زیب کی وساطت سے اسے رھائی ملی ۔

شاہ جہان کے تیسویں سال جلوس اپنے باپ کے ساتھ شاھی ملازمت میں آیا ، اور خلعت اور خطاب 'خاں' سے نوازا گیا ۔ اسی سال اس کے منصب میں ھزاری ذات کا اضافہ ھوا اور وہ سہ ھزاری ھزار سوار کے منصب تک پہنچا ۔ جب میر جملہ شاہ جہان کا وزیر مقرر ھوا ، (اور بعض وجوہ کی بنا پر اسے دکن بھیج دیا گیا) تو خان مذکور کو عارضی طور پر باپ کی جگہ نائب مقرر کیا گیا ۔ اکتیسویں سال میر جملہ

کو معزول کیا گیا تو اسے بھی کام کرنے سے منع کر دیا گیا ۔ پھر اس کے منصب میں پانصد سوار کا اضافہ ہوا ، اور قلم دان مرصع کے علاوہ میر بخشی کے عہدے سے نوازا گیا ۔

کچھ عرصہ بعد دارا شکوہ نے اسے بعض شبہات کی بنا پر گھر بلا کر گرفتار کر لیا ، جہاں سے تین چار روز کے بعد اسے رہائی دلائی گئی ۔

عالمگیر نے اسے چار ہزاری سہ ہزار سوار کا منصب عطا کیا ، اور کچھ دنوں بعد میر بخشی کا عہدہ بحال کر دیا ۔ اس کے دوسرے سال جلوس میں پنج ہزاری چہار ہزار سوار کے منصب پر پہنچا ۔ پانچویں سال جلوس ہزار سوار کا اضافہ ہوا ۔

دسویں سال افغانوں کی سرکوبی پر مامور ہوا ۔ واپسی پر لاہور کا صوبہ دار بنایا گیا ۔ تیرھویں سال کابل کا ناظم مقرر ہوا ۔ اسی سال جب جعفر خاں وزیر اعظم فوت ہوا تو اس عہدے کے لیے اسے دربار میں طلب کیا گیا ۔ 'مآثر الامرا' کے مطابق اپنی رعونت کے سبب اس نے قبول وزارت کے لیے کچھ شرائط رکھیں ۔ جو شاہی مزاج کے خلاف تھیں ۔

پندرھویں سال جلوس ۳ محرم ۱۰۸۳ھ کو درۂ خیبر عبور کرنے سے پیشتر افغانوں کی سرکوبی کے لیے آگے بڑھ گیا ۔ اس کی اس بے تدبیری سے افغانوں کو موقع ہاتھ لگا ، اور انہوں نے حلہ بول کر اس کی فوج کو منتشر کر دیا ۔ کئی ہزار آدمی پہاڑوں سے گر گر کر مر گئے ۔

آخر کسی نہ کسی طرح خود پشاور پہنچا ۔ افغانوں نے اس کی ایک خرد سال بچی اور دیگر حرم کو ، جو اُن کے قبضے میں آ گئی تھیں ، بہت بڑی رقم کے عوض واپس کیا ۔ اس کی بے تدبیری کے سبب ، تنبیہ کی خاطر اس کے منصب میں ہزاری ذات کی کمی کر دی گئی ، اور احمد آباد گجرات کا صوبہ دار بنا دیا گیا ۔ جہاں آخری وقت تک رہا ۔

پچیسویں سال جلوس ۸ جمادی الآخر ۱۰۹۳ھ کو وہیں فوت ہوا ۔ اس کا ستر لاکھ روپیہ ، ایک لاکھ ۳۵ ہزار اشرفی ، ۶۰ ہاتھی مع دیگر ساز و سامان کے بحق سرکار ضبط ہوئے ۔

اگرچہ محمد امین خاں میں تکبر و خود رائی بہت تھی ، لیکن دیانت و راستی میں بے مثل تھا ، اور ہمیشہ خیر سگالی و نیک اندیشی میں کوشاں رہتا ۔ بہت تیز حافظے کا مالک تھا ۔ آخری عمر میں بہت ہی کم عرصے میں قرآن پاک حفظ کیا ۔ چناں چہ عالمگیرؒ اسے حافظ محمد امین خاں کہا کرتا تھا ۔ (مآثر الامرا جلد سوم ، صفحہ ۶۱۳ - ۶۲۰)

۱۴ - بنی تمیم - عرب کے مشہور قبائل میں سے ایک قبیلہ ، اور بے شمار شاخوں میں منقسم تھا ۔ ان لوگوں کے مسکن سر زمین نجد میں تھے اور وہ بصرہ اور یمامہ کی حدود تک پھیلے ہوئے تھے ۔ زمانۂ جاہلیت اور دور اسلام کی تاریخ ان کے حالات سے کافی حد تک بھری پڑی ہے ۔

یہ لوگ مذہباً مجوسی تھے ۔ اسلام پھیلا تو یہ بھی اس کی برکات سے بہرہ اندوز ہوئے ۔ ان دنوں بنی تمیم کے قبیلے کا سر زمین عرب میں کوئی اثر باقی نہیں ۔ (اردو انسائیکلوپیڈیا ، فیروز سنز ، صفحہ ۳۳۰) ۔

۱۵ - موسوی خاں صدر ۔ مشہد کے سادات میں سے تھا ۔ یوسف خان رضوی سے قرابت تھی ۔ جہانگیر کے زمانے میں وارد ہند ہوا ، اور شاہی ملازمت میں آ گیا ۔ پندرہ برس 'آبدار خانہ' کا داروغہ رہا ۔ رفتہ رفتہ صدارت کل اور دو هزاری پانصد سوار کے منصب پر پہنچا ۔

جہانگیر کی وفات کے بعد شاہ جہان کے پہلے سال جلوس میں پھر اسے صدارت کل کا منصب ملا اور اصل و اضافہ سے سه هزاری و هفت صد و پنجاه سوار کا منصب پایا ۔ پانچویں سال جلوس میں چہار هزاری و هفت صد و پنجاه سوار کا منصب ملا ۔ سولھویں سال جلوس بادشاہ کو اطلاع ملی کہ وہ اپنے فرائض سے کماحقۂ عہدہ برآ نہیں ہو رہا ، اس لیے اسے معزول کر دیا گیا ۔

سترھویں سال جلوس ۱۸ صفر ۱۰۵۴ھ کو فوت ہوا ۔ مآثر الامرا کے مطابق اس نے زیادہ کسب علم نہیں کیا تھا ۔ اهل کمال علم کے پاس زیادہ اٹھنے بیٹھنے کے سبب 'مجلس و تقریر' میں مہارت بہم پہنچا لی تھی ۔ (عمل صالح ، جلد سوم ، صفحہ ۱۴۴ ۔ مآثر الامرا ، جلد سوم ، صفحہ ۳۴۱ - ۳۴۲) ۔

۱۶ - دولت خانہ - اسے 'خلوت خانہ' یا 'غسل خانہ' بھی کہا جاتا تھا - ابوالفضل نے لفظ 'دولت خانہ' استعمال کیا ہے - لیکن دوسری کتب تاریخ میں یہ لفظ دیوان کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ، اور خلوت خانہ کے لیے بھی - جہانگیر کے عہد میں یہ لفظ قطعی طور پر 'خلوت خانہ' کے لیے استعمال ہوا ہے - مؤلف بادشاہ نامہ اور محمد صالح کنبوہ مؤلف عمل صالح کے مطابق 'خلوت خانہ' کے لیے لفظ 'غسل خانہ' اس لیے استعمال ہونے لگا کہ دیوان خانے اور زنان خانے کے درمیان ایک کمرہ تھا جس میں اکبر غسل کیا کرتا تھا - اس کے بعد وہ چند ایک قابل اعتماد اشخاص کو غسل خانے ھی میں بہ غرض ملاقات طلب کر لیتا بعد میں دیوان بخشی بھی امور مملکت کی انجام دھی کے سلسلے میں وھیں طلب کیے جانے لگے - رفتہ رفتہ بعض امراء دربار کو بھی وھاں آنے کی اجازت مل گئی - اس طرح سلطنت کا کام وھیں انجام دیا جانے لگا اور اس کمرے کو خاص حجرہ غسل سے متصل ہونے کے باعث 'غسل خانہ' کہنے لگے - شاہ جہان نے اس کمرے کا نام 'دولت خانۂ خاص' رکھا اور اس کے زمانے میں یہی نام عام طور پر مشہور ہوگیا -

اکبر کا بیشتر وقت اسی دولت خانہ میں مفید مشاغل میں گزرتا - حکما ، صوفیا اور مؤرخین وغیرہ وھاں باریاب ہوتے -

جہانگیر نے تزک میں اس کے لیے لفظ 'غسل خانہ' استعمال کیا ہے - اس کے عہد میں بھی رات کے وقت اس میں دربار منعقد ہوتے رہے ، لیکن آخری دنوں میں اس کی مسلسل علالت اور پریشانیوں کے سبب ان درباروں کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا - وہ اجنبیوں کو بھی عرض حال کے لیے وھاں طلب کر لیتا -

شاہ جہان روزانہ دو مرتبہ علیحدہ اجلاس کرتا تھا - ان میں سے ایک صبح کے وقت دیوان خاص و عام سے آٹھنے کے بعد ھی منعقد ہوتا - یہاں وکیل اور وزیر کو بادشاہ سے تنہائی میں گفتگو کا موقع ملتا - اور وہ ایسے معاملات و مقدمات بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے ، جن پر بھرے دربار میں گفتگو کا موقع نہ ہوتا تھا - دیوان خالصہ جات اور جاگیروں کے معاملات پیش کرتے تھے -

صوبہ داروں کی طرف سے جو مراسلے موصول ہوتے وہ چند قابل اعتماد امراء کے حوالے کر دیے جاتے۔ وہ ان کا مطالعہ کرتے اور پھر انہیں بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے۔ بادشاہ ان پر احکام صادر کرتا جو وکیل یا وزیر کی معرفت منشیوں کے سپرد کر دیے جاتے تھے اور وہ فرمان شاہی کا مسودہ تیار کرتے تھے۔ ایسے فرامین کے مسودات اسی اجلاس میں بادشاہ کے سامنے پیش ہوتے اور وہ خود انہیں پڑھتا۔ اور ان میں ضروری رد و بدل یا اصلاح کرتا۔ اسی جگہ صدر کل ایسے ضرورت مند اشخاص کو پیش کرتا، جو دیوان میں پیش نہیں کیے جا سکتے تھے، اور ان کے گزارے کے لیے اراضی یا نقد وظائف کے احکام حاصل کرتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ زیورات وغیرہ کے نمونے بھی یہیں ملاحظہ کرتا۔ الماس تراشنے والے اس سے تبادلۂ خیال کرتے۔ یہیں علمی و ادبی تصانیف، ترجمے، مسودات کی نقلیں، نقاشی اور خطاطی کے نمونے اس کے سامنے پیش کیے جاتے۔ اس طرح وہ کوئی دو گھنٹے یہاں صرف کرتا۔ دوسرا اجلاس وہ نماز عصر کے بعد منعقد کرتا۔ اس وقت زیادہ تر وزرا اور سلطنت کے اعلیٰ عہدے داران ہی شریک ہوتے۔ اس اجلاس میں وزرا کو بادشاہ کے حضور میں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع ملتا۔ اس میں خاص طور پر روزمرہ کا معمولی کام انجام دیا جاتا تھا۔ یہاں بادشاہ غروب آفتاب تک امور سلطنت انجام دیتا، پھر نماز مغرب میں، جو وہ ہمیشہ باجماعت ادا کرتا تھا، شریک ہوتا۔ اس میں علماء و مشائخ بھی شریک ہوتے اور بعد نماز بادشاہ کے ساتھ دولت خانۂ خاص میں چلے جاتے تھے۔

بعد نماز مغرب دولت خانۂ خاص میں بڑے ٹھاٹھ سے چراغاں کیا جاتا۔ قیمتی جواہرات سے مرصع سونے چاندی کے شمع دانوں میں معطر شمعیں روشن کی جاتیں۔ اکبر کے عہد میں چراغ جلانے کے وقت مقررہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ جنھیں اس کے جانشینوں نے بھی قائم رکھا۔ مثلاً اکبر کے عہد میں اس موقع پر خدمت گار بارہ شمعیں سونے اور چاندی کے شمع دانوں میں جلا کر بادشاہ کے حضور میں لاتے۔ ان میں سے ایک شیریں نوا مغنی شمع کو ہاتھ میں لیے ہوئے مختلف دل کش

دھنوں میں حمد باری کے گیت گاتا اور اول و آخر میں بقائے سلطنت کے لیے دعا کرتا ، جہانگیر نے خود ایک بیت تصنیف کی تھی ، جو چراغ جلانے کے وقت پڑھی جاتی تھی ۔ شاہ جہاں ہمیشہ اس موقع پر موجود رهتا تھا ۔ خدا کی حمد و ثنا کے بعد باشاہ کی درازئ عمر و بقائے سلطنت کی دعا پر مشتمل اشعار گائے جاتے تھے ، جس کے بعد یہ تقریب ختم ہو جاتی ۔

ان اجلاسوں اور درباروں میں جو بادشاہ 'غسل خانہ' یا 'خلوت خانہ' یا 'دولت خانہ' میں منعقد کرتا تھا ، وزراء حکومت اور اعلیٰ حکام کو بہ آسانی یہ موقع مل جاتا تھا کہ وہ تمام اہم معاملات کے متعلق بادشاہ کو ایسا مشورہ اور رائے دے سکیں ، جس کا اعلان کھلے دربار میں ممکن نہ ہوتا تھا ۔ اس طرح کسی اہم معاملے کے بارے میں بادشاہ کو سرکاری اور دیگر ذرائع سے براہ راست معلومات حاصل کرنے اور اپنی ذاتی رائے قائم کرنے کے کافی مواقع حاصل ہو جاتے تھے ۔

(بہ حوالہ 'دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی' صفحہ ۱۰۹ - ۱۱۶ ، صفحہ ۱۱۸ ، ۱۱۹ ، ۱۲۷) ۔

۱۷ - خانسامانی ۔ خان سامان کو شروع میں میرساماں کہا جاتا تھا لیکن بعد میں کبھی اسے خان ساماں کہا گیا اور کبھی میر ساماں ۔ دیوان اور میر بخشی کی طرح یہ بھی ایک مرکزی وزیر ہوتا تھا جس کے زیر انتظام مرکزی حکومت کا محکمۂ کارخانہ جات یا بیوتات رهتا تھا اور یہ محکمہ ان کارخانوں اور گوداموں پر مشتمل ہوتا تھا جو سرکاری اغراض کے لیے مرکزی حکومت کے زیر نگرانی قائم ہوتے ۔ اس محکمے کا تعلق موتیوں ، قیمتی پتھروں ، تلواروں اور نیمچوں سے لے کر بندوقوں اور بھاری توپوں تک ہر چیز سے تھا ۔ فوج کے لیے گھوڑے اور ھاتھی ، فوجی سامان کے لیے بار بردار جانور اور شاہی شکار کے لیے دوسرے جانوروں کا انتظام رکھنا بھی اسی کے ذمے تھا ۔

محکمۂ خانسامانی یا امیر سامانی نہ صرف ہر قسم کا سامان خریدتا اور اس کا ذخیرہ جمع رکھتا تھا بلکہ ملک میں اسلحۂ جنگ اور سامان

تعیش تیار کرنے والا سب سے بڑا ادارہ بھی یہی تھا ۔ اگرچہ اس کی مالک و منتظم سرکار تھی ، لیکن اس محکمے کو چلانے میں تجارتی اصولوں کی پابندی سختی کے ساتھ کی جاتی تھی ۔

اس محکمہ کا سب سے بڑا انتظامی عہدہ دار میر سامان (یا خان ساماں) ہوتا تھا جو محکمے پر عام نگرانی رکھتا تھا اور اس امر کا ذمہ دار تھا کہ وہ حسب دل خواہ کام کرتا رہے ۔ اس کے علاوہ چند اور عہدۂ داران بھی تھے ۔ مثلاً

دیوان بیوتات — یہ دوسرا عالی مرتبہ عہدہ دار تھا جو خاص طور پر مالیات کے محکمے کا ذمہ دار ہوتا تھا ۔

مشرف کل وجز : صدر محاسب بھی ہوتا تھا ۔ محکمے کے ہر شعبے میں اس کے ماتحت ایک ایک محاسب ہوتا تھا ۔

داروغہ — ہر شعبے یا کارخانے میں ایک داروغہ ہوتا تھا جو براہ راست اپنے شعبے کے کاریگروں سے کام لیتا ، ان میں روزانہ کا کام تقسیم کرتا اور کام ختم ہونے پر روزانہ جو سامان باقی بچ جاتا ، اسے اپنی تحویل میں لے لیتا تھا ۔

تحویل دار — داروغے کی طرح ہر کارخانے میں ایک تحویلدار بھی ہوتا تھا ، اس کی تحویل میں وہ نقد رقم اور سامان رہتا تھا جس کی ضرورت اس کے شعبے کے لیے ہوتی تھی ۔

مستوفی — اس کا کام کارخانہ جات کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنا تھا ۔ وہ اخراجات کی جانچ رسیدوں کی روشنی میں کرتا ، حسابات کی فرد تیار کرتا ، خود اس پر دستخط کرتا ، اسے دیوان محکمہ کے سامنے پیش کرتا اور آخر میں میر سامان کی مہر اس پر ثبت کراتا تھا ۔

داروغۂ کچہری ۔ اس کے ذمے دفتر کے عملے کی عام نگرانی تھی ۔ یہ انتظام بھی اس کے سپرد تھا کہ تمام کاغذات اور رجسٹر ایک عہدہ دار کے پاس سے دوسرے عہدہ دار کے پاس برابر پہنچتے رہیں ، علاوہ ازیں اس امر کی بھی نگرانی کرتا کہ کوئی شخص دفتر کے ملازموں

اور اهلکاروں کے ساتھ بدتمیزی کا سلوک نہ کرنے پائے۔ وہ دفتر کے دروازوں کو افسر متعلقہ کی مہر کے ساتھ مقفل کرتا اور پھر ہر قفل پر اپنی مہر بھی لگاتا تھا۔

ناظر ـــ اس کا درجہ دیوان محکمہ کے بعد تھا۔ (یہ عہدہ ۳۵ سنہ جلوس اکبری میں قائم کیا گیا)۔ اس کا فرض دیوان محکمہ کے ہر کام کو دوبارہ دیکھنا اور اس پر اپنی مہر لگانا تھا۔ اس حیثیت میں وہ ایک ایسا عہدہ دار تھا جو بہتر کارگردگی اور قطعیت کی ضمانت کے لیے ہر کام پر نظر ثانی کیا کرتا تھا۔ محکمے میں عملاً اس کا تعلق انتظامی امور کی بہ نسبت مالی امور سے زیادہ تھا۔ درجے اور منصب میں وہ یقیناً دیوان سے کم تھا، اور کسی جگہ وہ اس کے برابر نظر نہیں آتا۔

(مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو دولت مغلیہ کی ہئیت مرکزی، صفحہ ۳۴۹ ببعد)

۱۸۔ اسلام خاں ۔ میر عبدالسلام مخاطب بہ اختصاص خاں مشہد کا رهنے والا اور شاہ جہاں کی شہزادگی ہی کے دنوں میں اس کا ملازم تھا۔ شروع شروع میں منشی گری کے عہدہ پر مامور رہا۔ ۱۰۳۰ھ (پندرهویں سال جلوس جہانگیری) میں عہدۂ وکالت دربار پر سرفراز ہوا۔ اور اعلیٰ منصب کے علاوہ اختصاص خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

جب ابراہیم عادل شاہ والئی بیجاپور نے وفات پائی تو اس کے بیٹے محمد عادل شاہ کو تسلی وغیرہ دینے کے لیے اسے سفارت پر وہاں بھیجا گیا۔

شاہ جہاں کے پہلے سال جلوس میں چار هزاری دوهزار سوار کے منصب پر پہنچا۔ اسلام خاں کا خطاب پایا۔ اور بخشی دوم اور عرض مکرر کی خدمت پر مامور ہوا۔ پھر آگرہ کی حکومت ملی۔ چوتھے سال جلوس پنج هزاری منصب سے نوازا اور گجرات کا ناظم بنایا گیا۔ چھٹے سال جلوس ۱۰۴۳ھ میں میر بخشی (بخشی ممالک) کے عہدہ پر سرفراز ہوا۔ آٹھویں سال جلوس بنگالہ کا ناظم بنایا گیا۔

تیرھویں سال جلوس دربار میں طلب اور وزارت دیوان اعلیٰ کے

بلند رتبہ پر مامور ہوا۔ جب خان دوراں نصرت جنگ ناظم دکن مارا گیا تو اسے انیسویں سال جلوس کے جشن کے روز شش ہزاری ذات و سوار کا منصب عطا کرکے اس کی جگہ ناظم دکن مقرر کیا گیا۔

بیسویں سال جلوس اس کے منصب میں اضافہ ہوا اور وہ ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کے منصب پر پہنچا۔ محمد صالح نے اس منصب کے علاوہ ۵ ہزار دو اسپہ سہ اسپہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

اکیسویں سال جلوس برہانپور سے اورنگ آباد آ رہا تھا کہ بیمار ہو گیا۔ چنانچہ ۱۴ شوال ۱۰۵۷ھ کو اس نے وفات پائی، اور وصیت کے مطابق وہیں (اورنگ آباد میں) دفن ہوا۔

اس نے علوم معقول و منقول اور انشاء و خط میں خاصی مہارت بہم پہنچائی تھی۔ مہمات بادشاہی میں ''حریص'' تھا اور معاملات کو بڑی شدت و سختی سے انجام دیتا تھا۔

(مآثرالامرا، جلد اول، صفحہ ۶۶۲-۶۶۶- عمل صالح، جلد سوم، صفحہ ۳۷۰، مفتاح التواریخ، صفحہ ۲۷۰)

۱۹ - منصب دار۔ اکبری عہد میں پنج صدی منصب دار اور اس سے اوپر کے منصب دار امیر کہلاتے اور ۵ ہزاری منصب دار امرائے کبار میں شمار ہوتے اور خان کے لقب سے ملقب ہوتے۔ شاہجہانی عہد میں ہزاری منصب دار اور اوپر کے منصب دار امیر کہلانے کے مستحق تھے۔ ہفت ہزاری اور نو ہزاری منصب دار نوئینان والا مکان امرائے عالیشان کے القاب سے یاد کیے جاتے اور مخصوص امرائے کبار کو خان خاناں کا لقب ملتا۔

جو منصب دار صوبہ میں متعین ہوتے، تعیناتیاں کہلاتے، اور دارالسلطنت میں رہنے والے ہمیشہ حاضر رکاب رہتے، وہ ارکان سلطنت بن کر دربار کی شان و شوکت بڑھانے میں معاون ہوتے۔ وہ پوشاک پہن کر گھر سے باہر نکلتے، کبھی ہاتھی پر، کبھی گھوڑے پر اور کبھی پالکی میں سوار رہتے۔ ان کے ساتھ سواروں اور پیدل فوجیوں کا

ایک چھوٹا سا دستہ بھی رہتا ، جوسواری کے آگے آگے راستے سے لوگوں کو ہٹاتے اور مور چھل ہلاتے تھے ۔

(ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام از سید صباح الدین عبدالرحمان صفحہ ۲۱ ، ۲۲)

۲۰ - داغ - سواروں کو بھرتی کرتے وقت ان کے گھوڑوں پر خاص نشان لگا دیے جاتے تاکہ لشکری معائنہ کے وقت لشکر کے گھوڑوں کے علاوہ کوئی دوسرا گھوڑا دکھا کر فریب نہ دے سکیں ۔ علاء الدین سے پہلے سوار اور گھوڑے وغیرہ کا صرف حلیہ لکھ لیا کرتے تھے ۔ سواروں کے گھوڑوں پر داغ لگوانا اس نے شروع کیا ۔ فیروز شاہ نے اپنے زمانے میں حلیہ اور داغ کی پابندی ختم کر دی تھی ، لیکن سکندر لودی نے اپنے عہد میں حلیہ پر پھر زور دیا ، جس کو اصطلاح میں چہرہ نویسی کہتے تھے ۔ شیرشاہ نے داغ کے قانون کو اپنے دور میں از سر نو مرتب کیا ۔

ابوالفضل نے گھوڑوں کے معاملے میں سواروں کی فریب کاریوں کا ذکر کیا ہے ۔ وہ لکھتا ہے کہ لشکریوں میں بڑی بے ایمانی اور خباثت تھی ۔ بعض طمع دار سوار اپنے عمدہ گھوڑے فروخت کر کے یا پیادوں میں شامل ہو جاتے ، یا عمدہ گھوڑے کی بجائے ادنیٰ درجے کے گھوڑے خرید کر سواروں میں شامل ہو جاتے اور پوری تنخواہ طلب کرتے ۔ اگر تنخواہ نہ ملتی تو تشدد پر آمادہ ہو جاتے ۔ ایک دوسرے کو گھوڑا عاریۃً دے دینا عام بات تھی ، اس سے فوج میں بڑی بدانتظامی اور بے قاعدگی پیدا ہوگئی ۔ داغ اندوزی اور چہرہ نویسی سے یہ خرابی جاتی رہی ۔

اس قسم کی بے ایمانی پر یہ بڑا قدغن تھا ، جس کا اہتمام آخر دور تک رہا ۔ داغ شدہ گھوڑوں کے سوار لشکر کے بہترین سپاہی سمجھے جاتے تھے ۔

عالمگیر نے داغ کے لیے خاص خاص نشانات مقرر کیے تھے ۔ مثلاً پنجۂ مرغ (مرغ کے پنجے کا نشان) ، میزان (ترازو کا نشان)

چہار پرھا ، کھڑی اور پڑی لکیریں وغیرہ ۔ جب جنگ، جانشینی کے لیے اورنگ زیب کا لڑکا اعظم شاہ دکن سے روانہ ہوا تو اس کے گھوڑوں پر 'اعظم' منقوش تھا ۔ والا جاہ کے جانوروں پر 'خیل' اور اعلیٰ تیار کے گھوڑوں پر آنکھ کے داغ تھے ۔ بعض امرا نے اپنے نشانات علیحدہ بنا رکھے تھے ۔ مثلاً تیموری سلطنت کے آخری عہد کے مشہور امیر سید عبداللہ کے گھوڑے پر 'عبد' کا نشان تھا ۔

(ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام صفحہ ۲۱۴ ، ۲۲۱ ، ۲۲۸ ، ۲۳۰)

۲۱ ۔ تابیناں ، ذات اور دو اسپہ سہ اسپہ وغیرہ

(خطاب و مناصب کا حاشیہ بھی ملاحظہ ہو)

اکبر کی حکومت کے آخری دور سے منصب میں کچھ ترمیم اور اضافہ بھی ہوتا گیا ۔ مثلاً پہلے صرف پنج ہزاری ، چہار ہزاری ، سہ ہزاری وغیرہ مناصب تھے ، لیکن پھر ان کے ساتھ سوار کے منصب کا بھی اضافہ ہونے لگا ۔ مثلاً پنج ہزاری پنج ہزار سوار ۔ پہلا منصب ذات کہلاتا تھا اور دوسرا منصب سوار ۔ منصب ذات اصلی منصب ہوتا تھا ، جس کے حساب سے منصب دار کو جاگیر اور تنخواہیں ملتی تھیں ۔ منصب سوار کی تعداد کے لحاظ سے منصب دار کو سوار رکھنا پڑتا تھا ۔ اس قسم کے منصب کے تین درجے تھے اول ، دوم ، سوم ۔ اگر سواروں کی تعداد منصب کے عدد کے برابر ہے ، مثلاً پنج ہزاری پنج ہزار سوار ، تو یہ منصب اول درجے کا شمار کیا جاتا تھا ۔ اگر سواروں کی تعداد منصب کے اعداد سے نصف یا نصف سے زیادہ ہے ، مثلاً پنج ہزاری چار ہزار سوار یا پنج ہزاری تین ہزار سوار تو یہ دوسرے درجے کا منصب سمجھا جاتا تھا ، اور نصف سے بھی کم ہو تو یہ تیسرے درجے کا منصب ہوتا تھا ۔ تین ہزاری سے ہفت ہزاری منصب میں ترقی یک ہزار کی ہوتی تھی ۔ مثلاً سہ ہزاری سے چہار ہزاری ہو جاتا تھا ۔ یک ہزاری سے دو ہزاری و پنج صدی منصب میں پنج صدی اور اس سے نیچے والے منصب میں یک صدی کی ترقی ہوتی تھی ۔

جہانگیر کے زمانہ میں سوار کے منصب کے ساتھ دو اسپہ و سہ اسپہ

کے امتیاز کا بھی اضافہ ہوا ، جس سے ایک منصب دار اپنے سواروں کی مقررہ تعداد دو دو اور تین تین گھوڑوں کے ساتھ رکھ سکتا ، لیکن دراصل یہ ایک مزید امتیاز تھا ۔ اس امتیاز کے منصب دار کی تنخواہ بھی دوگنی ہو جاتی ۔ مثلاً پنج ہزاری پنج ہزار کو جتنا ماہانہ ملتا ، اس کا دگنا پنج ہزاری پنج ہزار دو اسپہ سہ اسپہ کو ملتا ۔ اسی کے صلے میں منصب دار کو بھی سواروں اور گھوڑوں کی تعداد دوگنی رکھنی پڑتی ۔ جہانگیر کے زمانے میں دو اسپہ سہ اسپہ منصب داروں میں صرف خان خاناں مہابت خاں ، خان خاناں عبد الرحیم خاں اور خان خاناں آصف خاں تھے ، جن کو سات ہزاری سات ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ کے مناصب تھے ۔ جہانگیر نے دو اسپہ سہ اسپہ کا منصب اپنے شہزادوں کو نہیں دیا ۔ لیکن شاہجہانی عہد میں یہ مناصب شہزادوں کو بڑے بڑے اعداد کے ساتھ ملتے رہے ۔ مثلاً دارا شکوہ کو شصت ہزاری چہل ہزار سوار سی ہزار دو اسپہ سہ اسپہ ، شاہ شجاع کو بیس ہزاری پندرہ ہزارسوار دو اسپہ سہ اسپہ ، اورنگ زیب کو بیس ہزاری پندرہ ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ اور مراد کو پندرہ ہزاری بارہ ہزار سوار آٹھ ہزار دو اسپہ سہ اسپہ کے مناصب ملے ۔

اس کے علاوہ کئی ایک امرا کو بھی اسی طرح بڑے بڑے مناصب سے نوازا گیا ۔

دو اسپہ سہ اسپہ کے اصلی اعداد کے مطابق گھوڑے اور سوار رکھے جاتے ، تو دونوں کی تعداد ناقابل یقین حد تک بڑھ جاتی ، اس لیے شاہجہان نے دو اسپہ سہ اسپہ سواروں کی تعداد بھی مقرر کر دی ۔ شہزادوں کو استثناء کرکے عام منصب دار اپنے منصب سوار کا $\frac{1}{4}$ یا $\frac{1}{5}$ یا $\frac{1}{3}$ حصہ رکھتے۔

تابیناں ، منصب دار کے ماتحت لشکری کو کہتے ۔ منصب دار جب کبھی مرکز کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر سرتابی کرنے پر آمادہ ہوتے ، تو اگرچہ اصولاً تابیناں بادشاہ وقت کے ملازم تھے ، لیکن مرکزی قوت کی کمزوری کے ساتھ منصب دار ان پر اپنی بالا دستی

قائم کر لینے پر کامیاب ہو جاتے، اور یہ تابینان منصب دار کے ماتحت ہونے کی وجہ سے آسانی سے ان کے زیراثر آ جاتے، پھر وہ بادشاہ سے دور اور منصب دار سے زیادہ قریب تر ہو کر ان ہی کے آلۂ کار بن جاتے۔

(ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام از سید صباح الدین عبدالرحمان صفحہ ۲۰—۲۳)

۲۲ - جشن وزن قمری - مغلیہ بادشاہ سال میں دو مرتبہ خود کو مختلف دھاتوں میں تلوایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ شمسی سال کے آغاز پر اور دوسری مرتبہ قمری سال کے آغاز پر۔ مؤخرالذکر جشن وزن قمری کہلاتا تھا۔ اس موقع پر تلادان فقیروں اور حاجت مندوں وغیرہ میں تقسیم کر دیا جاتا۔ چنانچہ جہانگیر اپنے ساتویں سال جلوس کے واقعات میں ایک جگہ لکھتا ہے :

''جمعرات بائیس ماہ شہریور بہ مطابق ۱۷ ماہ رجب ۱۰۲۱ھ دن کے وقت مریم زمانی کے گھر میں وزن شمسی کی محفل مرتب ہوئی۔ اس دستور کے مطابق اپنے آپ کو تلوانا مستحسن ہے۔ صاحب جود و سخا عرش آشیانی (اکبر) اس قاعدے کے مطابق سال میں دو مرتبہ اپنے آپ کو مختلف دھاتوں، سونا، چاندی اور دیگر اقسام کی نفیس و نادر اشیاء سے تلواتے تھے۔ ایک مرتبہ شمسی سال کے آغاز پر اور دوسری مرتبہ قمری سال کی ابتدا میں۔ دونوں مرتبہ کی وزن شدہ اشیاء کی مجموعی قیمت ایک لاکھ روپیہ بنتی تھی، جنھیں وہ فقیروں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔ میں بھی ان کی مثال مدنظر رکھتے ہوئے ان کی پسندیدہ روش کے مطابق اسی طرح اپنے (آپ کو مختلف دھاتوں) سے تلواتا ہوں، اور تلادان فقیروں میں تقسیم کر دیتا ہوں''۔

(توزک جہانگیری، اردو ترجمہ صفحہ ۲۵۱)

۲۳ - ؔپردل خاں - اس کا نام بیرا (یا پیرا) تھا۔ دلاور خاں بریخ کا بیٹا تھا، جو شاہجہان کے دور کا چارہزاری امیر، میوات کا فوج دار اور جونپور کا جاگیردار تھا۔

پردل خاں ، شاهجهان کے چوتھے سال جلوس میں اپنے باپ کے ساتھ جونپور سے برهانپور (بادشاہ کے استقبال کی خاطر) اس وقت پہنچا جس وقت کہ شاهی لشکر نظام شاهیه کے استیصال اور اس مملکت کی تسخیر کے لیے وهاں متعین تها۔ باپ کے منصب میں اضافه کے ساتھ اسے بهی منصب هزاری اور پردل خاں کا خطاب ملا۔

باپ کی وفات کے بعد (جو چوتھے سال جلوس هی میں فوت هو گیا تها) اس کے منصب میں برابر اضافه هوتا رها۔ دسویں سال جلوس اسے دو هزاری دو هزار سوار کا منصب ملا اور بنگش پائین کی تهانیداری پر مامور هوا۔ سترهویں سال جلوس قلعه بست کا ناظم بنا دیا گیا۔ بیسویں سال اس کے منصب میں هزار سوار کا اضافه هوا۔

جب شاہ عباس ثانی نے تسخیر قندهار کے ارادے سے خود ادهر کا رخ اور محراب خاں کو اس مہم پر مامور کیا تو مؤخر الذکر نے بست کا محاصرہ کر لیا۔ ۴۵ روز تک لڑائی هوتی رهی۔ طرفین کے بے شمار آدمی مارے گئے۔ آخر چودہ محرم ۱۰۵۹ھ کو پردل خاں نے عہد و پیمان لے کر محراب خاں سے ملاقات کی۔ محراب خاں نے دهوکه دے کر اس کے تین سو کے قریب همراهیوں کو قتل کروا دیا اور اسے قید کر لیا ، اور بادشاہ کے پاس قندهار لے آیا۔ شاہ عباس اسے ایران لے گیا ، پھر اس کا پته نہیں چلا۔ به قول صاحب مآثرالامرا اگرچه اس کے بعد اس کے حالات کا پتا نہیں چل سکا ، لیکن اتنا ضرور هے که وه اپنے هم عصروں اور دوستوں سے شرم سار و خجل هونے اور آشنا و بے گانه کی سرزنش سے بچ گیا۔ (مآثرالامرا جلد اول صفحه ۴۲۴ — ۴۲۷)

۲۴ - شاہ صفی - اس کا نام سام میرزا تها - صفی میرزا ابن شاہ عباس کبیر کا بیٹا تها - شاہ صفی کے نام سے جمادی الاول ۱۰۳۸ھ (مطابق ۱۶۲۹ء) دادا کے بعد ، اس کی وصیت کے مطابق تخت نشین هوا- صاحب مفتاح التواریخ کے مطابق تخت نشینی کے وقت اس کی عمر اٹھاره برس تهی ، لیکن محمد حجازی نے سات سال لکھی هے۔

اس کے آغاز سلطنت هی میں اوزبکوں نے مشہد پر حمله کیا ، لیکن

شکست کھائی۔ مگر عثمانی ترکوں نے اس کے تمام عہد سلطنت میں (چودہ برس تک) چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔

۱۰۴۸ھ میں سلطان مراد (ترکی) نے ایران پر لشکر کشی کی اور بغداد پر قبضہ کر کے لوٹ مار کی۔ شاہ صفی اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمدان تک آیا، لیکن اسے صلح پر مجبور ہونا پڑا۔ ماہ صفر ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں جب یہ مشہد سے واپس آ رہا تھا تو کاشان کے مقام پر فوت اور قم میں مدفون ہوا۔

یہ بادشاہ نہایت ظالم، سخت دل، بے رحم اور عیاش تھا۔ بہ قول کروسن سکی "یہ امر یقینی ہے کہ ایران میں اس کے عہد سے زیادہ خون ریز اور ظالمانہ کوئی عہد حکومت کبھی نہ ہوا ہو گا"۔ اس کا عہد سلطنت 'مظالم کا ایک لا متناھی سلسلہ تھا'۔ انتظام سلطنت کی طرف سے وہ اتنا بے پروا تھا کہ بہ قول ھین وے، "اگر اس کے ظلم و ستم کے متعدد واقعات نہ پیش آتے رہتے تو ایرانیوں کو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ ان کا کوئی بادشاہ بھی ہے یا نہیں"۔ اس نے عورتوں کو قتل اور اندھا کرنے سے بھی گریز نہ کیا۔

(خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۷۳—۱۷۴۔ براؤن جلد چھارم، اردو ترجمہ صفحہ ۱۷۶۔ مفتاح التواریخ)

۲۵۔ شاہ عباس۔ عباس میرزا صفی ابن صفی میرزا کا بیٹا تھا۔ باپ کے بعد نو برس کی عمر میں (۱۰۵۲ھ مطابق ۱۶۴۲ء) عباس ثانی کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اسی سال شاھجہان نے قندھار (جو اس وقت صفوی حکومت کے قبضے میں تھا) کے صفوی گورنر علی مردان خاں کو اپنے ساتھ ملا کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس قلعہ کو واپس لینے کے لیے شاہ عباس نے اگست ۱۶۴۸ء میں تیاری کی۔ تاکہ برف پڑنے اور شدید سردی کے باعث مغل فوج کو کمک وغیرہ نہ پہنچ سکے۔ ۱۶ دسمبر کو اس نے قندھار کا محاصرہ کیا۔ ۱۱ فروری ۱۶۴۹ء کو مغل حاکم نے قلعہ شاہ عباس کے سپرد کر دیا، بعد میں شاھجہان نے

اس قلعہ کو سر کرنے کے لیے کئی ایک مہمیں بھیجیں ، لیکن شاہ عباس کی طاقت وو فوج کے آگے ایک نہ چلی ۔

شاہ عباس ثانی نے بہ عالم جوانی ۱۰۷۷ھ میں بہ مقام دامغان وفات پائی ، اور قم میں مدفون ہوا ۔ اس نے کئی ایک عمارات بنوائیں جن میں اصفہان کی چہل ستون خاص طور پر قابل ذکر ہے ۔

شاہ عباس ثانی کے متعلق کروسن سکی لکھتا ہے کہ ''شاہان صفویہ میں اسمعیل اول اور شاہ عباس کبیر کے بعد اس سے بہتر بادشاہ ایران کو نصیب نہیں ہوا''۔ اگرچہ وہ بھی اپنے پیش رو اور باپ کی طرح ''شراب کا بڑا دھنی تھا ، اور بعض مظالم بھی اس نے کیے ، لیکن بجز چند الزامات کے جو اس پر واقعۃً عاید ہو سکتے ہیں ، اور دوسری حیثیتوں سے وہ ہر طرح تاج شاہی زیب سر کرنے کا اہل تھا''۔

عباس ثانی بڑا انصاف پسند تھا ۔ وہ ان عمال یا عہدہ داروں کے ساتھ کسی قسم کی رعایت نہ کرتا جو اپنے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر رعایا کو تنگ کرتے تھے ۔ بڑا عالی ظرف اور شریف النفس تھا ۔ اجنبیوں سے بڑی مہربانی سے پیش آتا ۔ غیر مسلموں کی پوری طرح حفاظت کرتا تھا ، جس کے سبب کوئی بھی ان کو (خاص طور پر عیسائیوں کو) تنگ کرنے کی جرأت نہ کر سکتا تھا ۔

(خلاصۂ تاریخ ایران از محمد حجازی صفحہ ۱۷۴ ، ۱۷۵ - این ایڈوانسڈ ...... ۴۷۳ - براؤن جلد ۴ ، اردو ترجمہ صفحہ ۱۷۷ — ۱۷۸ - مفتاح التواریخ صفحہ ۱۴۷ ، ۲۵۵)

۲۶ - نوئینان ۔ 'منصب دار' کے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

۲۷ - خلد منزل ۔ یعنی محمد معظم قطب الدین شاہ عالم بہادر شاہ ، اس کا ذکر کسی دوسرے حاشیے میں گزر چکا ہے ۔

۲۸ - معزالدین محمد جہاندار شاہ ۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول کا بیٹا تھا - ۲-۷۷-۱۰۷۱ھ میں پیدا ہوا ۔ ماں کا نام نظام بائی تھا ۔ بہادر شاہ کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں ، جہاندار شاہ ، عظیم الشان ، جہان شاہ

اور رفیع الشان میں تخت نشینی کے لیے جنگ ہوئی ۔ جہاندار شاہ ، رفیع الشان اور جہان شاہ نے امیرالامرا ذوالفقار خاں کے ساتھ مل کر عظیم الشان کے ساتھ جنگ لڑی ۔ عظیم الشان مارا گیا اور تخت و خزانہ وغیرہ جہان شاہ کے ھاتھ لگا ، لیکن ذوالفقار خاں ، جہاندار شاہ کو تخت پر بٹھانا چاھتا تھا ، جس کے سبب تیسرے ھی دن پھر بھائیوں میں جنگ ھوئی ، اور نتیجہ میں رفیع الشان اور جہان شاہ مع اپنے بیٹے فرخندہ اختر کے مارے گئے ، اور جہاندار شاہ کسی مزاحمت کے بغیر ماہ صفر کے آخر میں (۱۱۲۴ھ) بہ مقام لاھور تخت نشین ھوا ۔

جسوقت فرخ سیر کو ، جو اس وقت عظیم آباد میں مقیم تھا ، اپنے باپ عظیم الشان کے مارے جانے کی خبر ملی تو وہ باپ کا انتقام لینے کے لیے ایک لشکر عظیم کے ساتھ وھاں سے روانہ ھوا ۔ ادھر جہاندار شاہ نے اپنے بڑے بیٹے محمد اعزالدین کو مقابلے کے لیے بھیجا ۔ کھجوہ کے قریب لڑائی ھوئی ۔ مؤخر الذکر نے شکست کھائی ۔ بعد میں فرخ سیر آگرہ کے قریب پہنچا اور جہاندار سے جنگ کی ۔ ۱۷ ذی القعدہ سنہ مذکور کو جہاندار میدان سے بھاگ نکلا اور ڈاڑھی مونچھیں صاف کر کے دھلی پہنچ گیا ۔ فرخ سیر فاتح کی حیثیت سے وارد آگرہ ھوا ، اور ماہ مذکور کی ۱۸ تاریخ کو تخت پر بیٹھا ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اس نے دھلی سے ایک کوس کے فاصلہ پر خضر آباد پہنچ کر جہاندار شاہ اور امیرالامرا ذوالفقار کو موت کے گھاٹ آتار دیا ۔ ان کے سروں کو تن سے جدا کر کے نیزوں پر چڑھایا گیا ، اور جسموں کو پاؤں میں رسی باندھ کر ھاتھی کی پشت پر ایک کو اس طرف اور دوسرے کو دوسری طرف لٹکایا گیا ۔ یہ واقعہ بروز جمعہ ۲۳ ذی الحجہ ۱۱۲۴ھ کو پیش آیا ۔ جہاندار شاہ نے دس ماہ حکومت کی ۔ مرنے کے بعد 'خلد آرام گاہ' اس کا لقب ٹھہرا ۔ خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مقبرہ کے نزدیک اسے دفن کیا گیا ۔

بہ قول خافی خاں اس کے اس مختصر سے عہد حکومت میں لاقانونیت کا دور دورہ رھا ۔ وہ پورے طور پر ایک عورت لال کنوری کے زیر اثر تھا ،

اور اس کے عہد میں مراسیوں ، رقاصاؤں ، بھانڈوں ، گویوں اور اسی قسم کے دوسرے گھٹیا لوگوں کی بن آئی تھی ۔

(مفتاح التواریخ صفحہ ۲۹۹—۳۰۰ ، این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۵۲۷ — ۵۲۸)

شیخ علی حزیں (صفحہ ۵۲۹)

۱ ۔ میرزا عمر شیخ ۔ امیر تیمور کی اولاد سے اور سُلطان ابو سعید مرزا کا بیٹا تھا ۔ ۸۶۰ھ میں بہ مقام سمرقند پیدا ہوا ۔ ابو سعید اپنے دیگر فرزندوں کی نسبت اسے زیادہ چاہتا تھا ۔ باپ کی طرف سے اسے اندجان اور اس کے نواح کے علاقے ملے ہوئے تھے ۔ اس نے اس علاقے کو بڑی مضبوطی سے سنبھالے رکھا ، جس کے سبب اس پر کوئی بیرونی حملہ نہ ہوا ۔

باپ کی وفات (۸۷۳ھ) کے بعد امراء و اعیان نے اسے فرغانہ (اندجان اس کا پایہ تخت تھا) کے تخت سلطنت پر بٹھایا ۔ خدا شناس، درویشوں کا بے حد معتقد اور ان کا احترام کیا کرتا تھا ۔ خاص طور پر خواجہ ناصرالدین عبید اللہ احرار کے ساتھ تو بے حد نیاز مندی اور اخلاص سے پیش آتا ۔ اس نے اخسیکت کو اپنا پایۂ تخت بنایا ، جو ایک پہاڑی پر واقع تھا ۔

۸۹۹ھ میں سوموار ۴ رمضان کو کبوتر خانہ کے قریب جو ایک عمارت کے اوپر بنا ہوا تھا ، بیٹھ کر کبوتروں کا تماشا دیکھ رہا تھا کہ اٹھتے وقت چوٹی سے نیچے گر پڑا ، اور فوت ہو گیا ۔ اس وقت اس کی عمر ۳۹ برس تھی ۔ اس نے ۲۶ سال دو ماہ حکومت کی ۔ اس کے تین بیٹے اور پانچ لڑکیاں تھیں ۔ سب سے بڑا ظہیر الدین بابر تھا جو بعد میں برصغیر پاک و ہند میں مغلیہ خاندان کا بانی بنا ۔

(اکبر نامہ از ابو الفضل ، جلد اول مطبوعہ الہ آباد ۱۹۱۳ء ، صفحہ ۸۱ ، ۸۳ ۔ تاریخ فرشتہ جلد اول ، صفحہ ۱۹۱ ۔ عمل صالح

جلداول ، صفحہ ۱۹ ، ۲۰ - مفتاح التواریخ ، صفحہ ۱۳۴ - مجلہ نقوش آپ بیتی نمبر صفحہ ۳۳۱) -

۲ - شاہ اسماعیل صفوی - صفوی خاندان کا بانی ۲۵ ماہ رجب ۸۹۲ھ (براؤن ۸۹۳ھ) مطابق ۸۸ - ۱۴۸۷ء ، کو پیدا ھوا - اس کے باپ کا نام سلطان حیدر تھا ، جو اپنے وقت کے ایک مشہور عارف شیخ صفی الدین کی پانچویں پشت سے تھا - ابتدا میں اس خاندان کی حیثیت مذھبی تھی ، مگر بعد میں اسماعیل نے باقاعدہ حکومت اور اپنے جد ششم کے نام پر صفوی خاندان کی بنیاد رکھی -

اسماعیل ابھی ایک برس کا تھا کہ اس کا والد طبرستان کے مقام پر شروان شاہ وغیرہ کے ساتھ مقابلہ میں مارا گیا - اس کی وفات کے بعد اسماعیل اپنے دوسرے دو بھائیوں سمیت استخر (فارس) میں نظر بند کر دیا گیا -

جب امیر یعقوب (جو اسماعیل کا ماموں تھا اور جس نے انھیں نظر بند کیا تھا) فوت ھوا تو اس کے بھتیجے رستم نے تینوں کو آزاد کر دیا - دوسرے دو بھائی علی اور ابراھیم تو مارے گئے اور اسماعیل چھ برس تک گیلان کے سادات قوامی کی پناہ میں رھا -

۹۰۵ھ میں وہ اپنے آبا و اجداد کے پیرووں کی مدد سے آستارا کی راہ سے اردبیل پہنچا - ترکمانوں کے ڈر سے اس کے مرید اسے گیلان لے گئے ، اور پھر لاھجان لے آئے - یہاں کے مریدوں ، یعنی صوفیا نے اس کی بے حد عزت کی - براؤن نے ایک گمنام اطالوی تاجر کے حوالے سے لکھا ھے کہ ''اس صوفی (اسماعیل) کی عزت و احترام اس کی رعایا خدا کی طرح کرتی ھے - خصوصاً سپاھیوں کی عقیدت کا تو یہ عالم ھے کہ ان میں سے اکثر بغیر کسی قسم کی زرہ بکتر پہنے ھوئے میدان کار زار میں پھاند پڑتے ھیں اور سمجھتے ھیں ھمارا آقا اسماعیل دوران جنگ میں ھماری حفاظت کرے گا .... سارے ایران میں خدا کا نام تو لوگ بالکل بھول ھی گئے ھیں - فقط اسماعیل کا نام رہ گیا ھے -''

۹۰۶ھ میں اس نے اپنے باپ دادا کے خون کا بدلہ لینے کے لیے مریدوں کو اکٹھا کیا۔ مختلف قبیلوں مثلاً شاملو، استاجلو، قاچار، تکلو اور افشار وغیرہ کے کوئی سات ہزار ترک اکٹھے ہو گئے۔ سب سے پہلے اس نے شروان پر حملہ کیا۔ اس وقت اس کی عمر ۱۳ برس تھی۔ اس حملے میں شاہ شروان فرخ یسار نے گلستان کے مقام پر شکست کھائی اور مارا گیا۔ اسماعیل نے اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لیے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے جلا دیا، اور غنیم کے مقتولین کے سروں کا ایک مینار بنوایا۔ دوسرے شروان شاہوں کی قبریں مسمار کروا دیں۔ یہاں سے اس کی فتوحات کا آغاز ہوا۔ باکو کو فتح کیا۔ آذر بائیجان پر ھلا بولا۔ الوند اور آق قویونلو ترکمانوں کو شکست دے کر شاھانہ ٹھاٹھ سے تبریز میں (۹۰۷ھ) داخل اور شاہ ایران بن کر تخت سلطنت پر متمکن ھوا۔ تبریز کو پایۂ تخت بنایا، اور شیعہ مذھب سرکاری مذھب قرار پایا۔

۹۰۹ھ میں اس نے فارس پر قبضہ کر لیا۔ ۹۱۴ھ میں بغداد اور عراق عرب کو مسخر کیا۔ ۹۱۶ھ میں مشہد پر قابض ھوا اور مرو میں ازبکوں کو شکست دی۔ اس نے بابر (خاندان مغلیہ کا بانی اور شاہ اسماعیل کا ھم عصر) کی بہن کو جو ازبکوں کے ھاتھوں اسیر تھی، ان سے چھڑا کر بابر کے پاس بھجوا دیا اور اس طرح دوستی کی بنیاد رکھی۔ ۹۲۰ھ میں سلطان سلیم خاں اول (عثمانی بادشاہ) سے ٹکر لی، لیکن شکست کھائی۔

اسماعیل بڑا کٹڑ شیعہ تھا۔ جس روز اس نے شروان شاہ کو قتل کیا اس روز اس کا نعرۂ جنگ 'اللہ، اللہ و علی ولی اللہ' تھا۔ اسی طرح اس نے الوند کے سامنے یہ شرط پیش کی تھی کہ اگر وہ شیعیت قبول کر لے اور یہ کلمہ پڑھے تو اس کے ساتھ صلح ھو سکتی ھے۔ اس نے کوشش کی کہ ایران میں صرف شیعہ مذھب ھی باقی رھے۔ اس کے اس ارادے پر جب خود تبریز کے بعض شیعہ مجتہدین نے تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ ''تبریز میں تو سنیوں کی اکثریت ھے۔ آج تک یہاں

ایسا خطبہ برملا نہیں پڑھا گیا ۔ ایسا نہ ہو کہ یہاں کی رعایا خلاف ہو جائے اور کہے کہ ہم شیعہ بادشاہ نہیں چاہتے۔ اور اگر رعایا بگڑ گئی تو اس کا کیا تدارک ہوگا۔" اس پر اس نے کہا کہ "خداے عالم معہ حضرات ائمہ معصومین کے میرے ساتھ ہے۔ میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اگر رعیت نے ایک لفظ بھی کہا تو میں بہ توفیق اللہ تلوار کھینچ لوں گا اور کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا ۔"

اس نے صرف حضرت علی رضؓ اور ان کی اولاد کی منقبت اور فضیلت کو منوانے ہی پر اکتفا نہ کی ، بلکہ حکم دے دیا کہ پہلے تین خلفا حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر عام مجمعوں میں تبرا کہی جائے اور حاضرین جلسہ اسے سن کر بہ آواز بلند 'بیش باد' 'کم مباد' کہیں ۔ اور جو نہ کہے اسے قتل کر دیا جائے ۔ اس نے شیعہ مذہب کو بہ زور شمشیر پھیلایا ۔ کزون کے اہل سنت علما پر بے پناہ مظالم ڈھائے ۔ اکثر کو تہ تیغ کیا ۔ ان کے اسلاف کے مقبرے اور دیگر مذہبی عمارات گرا دیں ۔ اور ان مظالم کے لیے 'رحمۃ للعالمین' (۹۰۹ھ) کا تاریخی مادہ نکلا گیا ۔ بہ قول اطالوی تاجر "نیرو (Nero) کے وقت سے اب تک ایسا جلاد باشاہ نہ پیدا ہوا ہوگا" ۔

شاید وہ ابھی اور بھی مظالم ڈھاتا ، لیکن قدرت نے اسے مزید مہلت نہ دی اور وہ ۹۳۰ھ میں سراب کے نزدیک فوت ہو گیا ۔

(براؤن جلد چہارم اردو ترجمہ ، صفحہ ۹۷ ببعد ، مفتاح التواریخ صفحہ ۱۴۳ - ۱۴۴ ۔ خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۵۹ - ۱۶۲) ۔

۳ ۔ سلطان حسین میرزا ۔ ابو الغازی سلطان حسین میرزا بن منصور بن بایقرا بن عمر شیخ بن امیر تیمور ۔ تیموری سلاطین میں سب سے زیادہ شہرت کا مالک تھا ۔ اس کی ولادت ہرات کے نزدیک تولکی کے پل پر 'دولت خانہ' میں ۸۴۲ھ میں ہوئی ۔

ابتدا میں وہ الغ بیگ (تیمور کے فرزند شاہ رخ کا بیٹا) کی سرکار اور سایۂ عاطفت میں رہا ۔ الغ بیگ اور اس کے بیٹے عبداللطیف کے

مرنے کے بعد ابو سعید (۸۵۵ھ - ۸۷۳ھ) نے اسے قید کر دیا ، لیکن یہ وہاں سے چھپ کر نکلا اور ابو القاسم بابر سے مل کر خوارزم بھاگ گیا - ۸۶۲ھ (۵۸ - ۱۴۵۷ء) میں اس نے استر آباد (پایۂ تخت جرجان) کو مسخر کیا اور وہاں اس کی تاجپوشی ہوئی - لیکن اس نے ابو سعید کو اپنا حکم فرماے اعلی تسلیم کیا - ایک سال کے بعد ابو سعید نے پھر اسے خوارزم بھاگ جانے پر مجبور کیا اور خود استر آباد پر قبضہ کر لیا - لیکن سلطان حسین نے جلد ھی جرجان اور ماژندران کے صوبوں سمیت دوبارہ استر آباد پر قبضہ کر لیا - ابو سعید کی وفات پر ھرات پر قبضہ کیا ، اور وہاں ۱۰ ماہ رمضان ۸۷۳ھ (براؤن ۸۷۲ھ ، حجازی ۸۷۵ھ) کو تخت نشین ھوا - بعد میں میرزا یادگار محمد کو ، جس نے آق قویونلو خاندان کے بانی حسن بیگ کے آکسانے پر اس پر حملہ کیا تھا ، شکست دے کر تمام خراسان پر قابض ھو گیا - اس نے کوئی ۳۸ برس حکومت کی اور ۱۱ ذی الحجہ ۹۱۱ھ بہ روز دو شنبہ (مفتاح التواریخ ماہ محرم ۹۱۲ھ ، طبقات اکبری ۱۶ ذی الحجہ ۹۱۱ھ) وفات پائی - اس وقت اس کی عمر ستر برس تھی -

اس کا دربارِ ھرات فن و ادب اور علم و فضل کے ان درخشندہ ترین مراکز میں سے تھا ، جو ایران میں کبھی پیدا ھوئے - علی شیرنوائی اس کا وزیر تھا ، جو نہ صرف اس کی طرح ادباء و فضلاء وغیرہ کا مربی تھا بلکہ خود بھی نظم و نثر میں (خصوصاً ترکی زبان میں) اعلی پائے کا مصنف تھا - سلطان حسین خود بھی فاضل و شاعر تھا - فضلا و علماء وغیرہ کو جمع کرنے میں بے حد کوشش کرتا - فارسی کے مشہور شاعر مولانا عبدالرحمان جامی ، مشہور نقاش بہزاد اور امیر خوند مؤلف تاریخ روضۃ الصفا وغیرہ اسی کے عہد سلطنت کے نوادر میں سے اور اس کے تاج و تخت کی زینت تھے -

ادبی ذوق کے علاوہ اسے کبوتروں ، پالی کے مرغوں اور دوسرے پرندوں کا بے حد شوق تھا - بہ قول براؤن اپنے خاندان کے دیگر افراد کی طرح کثرت مے نوشی میں مبتلا تھا - اور مفتاح التواریخ میں ھے کہ

اس نے ہرات میں ایک مکان بنوایا جسے 'تخت سفر' کہتے تھے ۔ اس کی بنیاد رکھتے وقت اس نے حکم دیا کہ جو کوئی شراب پیئے اس کی سزا یہی ہوگی کہ وہ اس تخت کی تعمیر کے لیے پتھر اور اینٹیں ڈھوئے ۔ عمر کے آخری بیس سال اس کے جسم کا ایک حصہ مفلوج رہا ۔

(طبقات اکبری مطبوعہ لکھنؤ ، صفحہ ۔ روضۃ الصفا مطبوعہ لکھنؤ جلد ہفتم صفحہ ۲ ، ۳ ۔ براؤن جلد ۳ اردو ترجمہ صفحہ ۵۳۹ ، ۵۴۱ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۱۳۹ ۔ خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۵۳ ، صفحہ ۱۵۴) ۔

۳ ۔ شیبک خاں اوزبک ۔ ابو الفتح محمد شیبک خاں یا شیبانی (بعض ایرانی مؤرخ اسے شاہی بیگ بھی لکھتے ہیں) ازبک قبیلے کا سردار تھا ۔ باپ کا نام بوداق خاں تھا ، جو چنگیز کی نسل سے تھا ۔ ویمبرے کا کہنا ہے کہ "میں ازبکوں کو خالص ترکی نہیں بلکہ ترکی و منگول مخلوط نسل سمجھتا ہوں" ۔ (ازبک کے معنی آزاد و خود مختار کے ہیں) روضۃ الصفا میں اس کی ماں کا نام نوری بیگم لکھا ہے لیکن آرمینیس ویمبرے مؤلف تاریخ بخارا نے قزی بیگم لکھا ہے ۔

روضۃ الصفا ، مطبوعہ لکھنؤ اور مطبوعہ ایران (جو کئی نسخوں کو سامنے رکھ کر مرتب اور شائع کی گئی ہے) میں اس کی تاریخ پیدائش ۹۰۵ھ دی گئی ہے جو غلط ہے ، کیوں کہ اسی کتاب میں ذرا آگے چل کر ۹۰۶ھ میں اس کی فتوحات وغیرہ کا ذکر ہے ۔ در اصل ، جیسا کہ ویمبرے نے لکھا ہے ، ۹۰۵ھ اس کی تخت نشینی کا سال ہے ، اور اس کا سال پیدائش ۸۵۵ھ ہے ۔

ابھی چھوٹا ہی تھا کہ ماں باپ مر گئے ۔ اس کے دادا کے وفادار ملازم قراجہ بیگ نے اسے پرورش کیا ۔ سن رشد کو پہنچا تو کشورستانی کی طرف مائل ہوا اور ازبک امرا وغیرہ کو اکٹھا کرکے فتوحات کی تدابیر سوچنے لگا ۔ اس کی پہلی کوشش ۹۰۵ھ (۱۴۹۹ء) میں سمرقند کے خلاف تھی ، جہاں کے حکمران سلطان احمد میرزا کے پاس یہ ملازم تھا ۔ سلطان احمد میرزا اور عمر شیخ میرزا وغیرہ کی وفات کے بعد جب

ماوراءالنہر میں گڑ بڑ مچی تو اس نے لشکر فراہم کرکے ترکستان کو مسخر کر لیا - ۹۰۶ھ میں ماوراءالنہر کا قصد کیا - (خلاصۂ تاریخ ایران میں ہے کہ اوزبکوں نے ۹۰۴ھ میں ماوراءالنہر پر قبضہ کر لیا تھا) - سمرقند ، بخارا ، تاشقند اور فرغانہ وغیرہ پر قبضہ کرنے کے بعد ۹۱۱ھ میں اس نے خراسان پر ھلا بولا - بابر کے ساتھ اس کے کئی ایک معرکے ھوئے - ایک موقع پر جب شیبانی نے سمرقند کا محاصرہ کیا ھوا تھا ، بابر کو محاصرہ کے طول پکڑ جانے اور رسد نہ پہنچنے کے سبب بڑی مایوسی کا سامنا کرنا پڑا - اس نے ایک طرح کی صلح کر لی اور آدھی رات کے وقت بھاگ کھڑا ھوا - اس بھگدڑ میں اس (بابر) کی بڑی بہن خان زادہ بیگم شیبانی کے ھاتھ لگ گئی -

۹۱۵ھ میں شیبانی نے کرمان کا رخ کیا جو اس وقت شاہ اسماعیل صفوی (اول) کا قلمرو تھا - ۹۱۶ھ میں طاھر آباد کے مقام پر (مرو کے نزدیک) دونوں میں لڑائی ھوئی - خلاصۂ تاریخ ایران میں ھے کہ شیبانی نے اسماعیل کو شیعہ مذھب ترک کرنے کو کہا تھا اور اس ضمن میں اسے تہدید بھی کی تھی ، اور جب شاہ اسماعیل نے یہ بات منظور نہ کی تو شیبانی نے کرمان پر چڑھائی کر دی -

بہر حال اس جنگ میں ازبکوں کو زبردست شکست ھوئی ، اور شیبانی خاں مارا گیا - بہ قول ویمبرے اس وقت اس کی عمر اکسٹھ سال کی تھی جب وہ بہادری کی موت مرا - (۹۱۶ھ مطابق ۱۵۱۰ء) -

شاہ اسماعیل نے اس کی کھوپڑی پر سونا چڑھا کر اسے پیالے کی جگہ استعمال کیا - بعض کا کہنا ھے کہ اس نے یہ کھوپڑی سلطان بایزید کو قسطنطنیہ بھجوا دی تھی - اسماعیل کے حکم پر شیبانی کی لاش کے اعضا کاٹ کر مختلف اطراف میں بھیجے گئے - مثلاً دایاں بازو آقائے رستم ، فرماں روائے مازندران ، کو بھیجا گیا جو ازبکوں کا حامی تھا -

(روضۃالصفا جلد ھفتم مطبوعہ لکھنؤ، صفحہ ۶۵ ، ۶۶ ، ۶۷ ، ببعد - مطبوعہ ایران صفحہ ۱۹۷ - اکبر نامہ جلد اول صفحہ ۸۸ ببعد - توزک بابری بہ حوالہ نقوش 'آپ بیتی' نمبر صفحہ ۳۳۳ - تاریخ فرشتہ صفحہ ۱۹۵

ببعد جلد اول، تاریخ بخارا اردو ترجمہ صفحہ ۳۰۵ ، ۳۰۶ ، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۳ ، ۳۳۷ ، ۳۳۸ - تاریخ کامل ایران از دکتر عبداللہ رازی مطبوعہ تہران صفحہ ۱۴۳ - خلاصۂ تاریخ ایران صفحہ ۱۶۰ ، ۱۶۱ - علاوہ ازیں شیبانی اور بابر کے درمیان معرکوں کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو 'ظہیرالدین بابر اور ان کا عہد' از ولیم ارسکن اردو ترجمہ از حسین انور۔ 'بابر' از ہیرلڈ لیم اردو ترجمہ از سید ہاشمی فرید آبادی) ۔

۵ - منوچہر - ایرج بن فریدون کا بیٹا تھا ۔ اپنے دادا فریدون کی سر پرستی میں پرورش پائی اور ہنر سیکھے ۔ اس کے زمانے میں سلم و تور نے جیحون سے لشکر گزارا ۔ منوچھر لشکر لے کر ان پر حملہ آور ہوا اور سلم و تور کو مار ڈالا ۔ الانان کے قلعہ کو فتح کیا اور فتح مندی کے ساتھ واپس لوٹا ۔ فریدون نے تاج شاہی اس کے سر پر رکھا اور خود گوشہ گیری اختیار کر لی ۔ روضۃ الصفا کے مؤلف نے بعض روایات کی بنا پر لکھا ہے کہ ایرج کے مرنے پر فریدون اس قدر رویا کہ اس کی آنکھوں کا نور بہہ گیا ۔ جب منوچہر سلم و تور کو قتل کرکے دادا کے پاس پہنچا تو اس نے پوچھا تو کون ہے ۔ اس نے جواب دیا ''میں ایرج کا بیٹا اور سلم و تور کا قاتل ہوں''۔ فریدون نے کہا ''اگر یہ سچ ہے تو آگے بڑھ کر میری آنکھوں پر دایاں ہاتھ رکھ تاکہ نور عود آئے ۔'' منوچھر نے ایسا ہی کیا ۔ فریدون کی آنکھیں پھر سے روشن ہو گئیں اور بعد میں اس نے تاج و تخت منوچہر کے حوالے کر دیا ۔

اس نے سام کی راہ نمائی و تدبیر میں بادشاہی کی اور بہ قول فردوسی ایک سو بیس برس تخت سلطنت پر متمکن رہا ۔

(شاہ نامہ از فردوسی مطبوعہ کانپور جلد اول ، صفحہ ۷۵ - روضۃالصفا جلد اول صفحہ ۱۸۳ - راهنمای ادبیات فارسی از دکتر زهرای خانلری (کیا) مطبوعہ ایران صفحہ ۳۷۴) ۔

۶ - سام - نریمان کا بیٹا اور رستم کے آبا و اجداد میں سے تھا - گرشاسپ نامہ کی روایت کے مطابق وہ گرشاسپ کا بھیتجا تھا ، اور بعض کا کہنا ہے کہ اس (گرشاسپ) کا نبیرہ تھا -

اس کے زمانے میں نوذر تخت سلطنت پر متمکن تھا ، جو بڑا ظالم اور ستم گار تھا - اس کے اسی ظلم و جور سے تنگ آ کر لوگوں نے سام سے درخواست کی کہ وہ تخت شاہی پر بیٹھ جائے ، لیکن اس نے قبول نہ کیا ۔
(راهنمای ادبیات فارسی صفحه ۱۹۷)

۷ - نریمان ۔ سام کا باپ تھا ۔ گرشاسپ نامہ کے مطابق گرشاسپ کا بھتیجا اور دوسری روایت کے مطابق اس کا نبیرہ تھا ۔

(راهنمای ادبیات فارسی صفحه ۳۸۷)

۸ - کیقباد ۔ ایران کے کیانی خاندان کا پہلا بادشاہ اور فریدوں کی نسل سے تھا ۔ گرشاسب کی وفات کے بعد جب تخت ایران خالی ہو گیا تو زال نے رستم کو کیقباد کی جستجو میں کوہ البرز کی طرف بھیجا ۔ رستم نے اسے وہاں سے لا کر تخت پر بٹھایا ۔ اپنے عدل و احسان کے سبب اس کا شہرہ دیگر اقالیم تک پہنچا ہوا تھا - خزائن و سپاہ کثرت سے رکھتا تھا اور عقل و کیاست سے بھی مالا مال تھا ۔

کہتے ہیں کہ حضرات الیاس ، ایسع ، اشموئیل اور حزقیل اس کے زمانے میں مبعوث ہوئے تھے ۔ اور اس نے ان کی 'ملت' کو قبول کیا تھا ۔

مؤلف تاریخ گزیدہ کے مطابق اس کا پایۂ تخت اصفہان تھا اور یہ کہ فرسخ (میل وغیرہ) کی تعیین اسی نے کی تھی ۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ وہ ہمیشہ دریائے جیحوں کے کنارے اور ترکوں سے جنگیں کرتا رہا ۔

بعض کے نزدیک اس نے سو برس اور بعض کے نزدیک ایک سو بیس برس غایت حشمت و کامرانی سے بادشاہت کی ۔

(شاہ نامہ از فردوسی مطبوعہ کانپور ، جلد اول صفحہ ۱۳۱ ، ۱۳۳ - روضة الصفا جلد اول صفحه ۱۸۹—۱۹۱ - راهنمای ادبیات فارسی صفحه ۳۲۲ - تاریخ گزیدہ ، نظام لتواریخ بحوالہ روضة الصفا صحفه ۱۹۱)

۹ - اردشیر مامک ۔ اردشیر مامک یا پاپک ۔ اسے اردشیر اول بھی کہتے ہیں ۔ ایران میں ساسانی خاندان کا بانی تھا ۔ باپ کا نام پاپک

یا پابگ تھا جو ساسان کا بیٹا ، کوچ کا مہتمم ، پارس کا شاہزادہ اور اردوان کا نائب تھا - بعض کے مطابق ساسان ، پاپک کے ہاں بطور گڈریے کے ملازم تھا ، اگرچہ وہ دارا بن دارا کی نسل سے تھا - اور یہ کہ پاپک نے اپنی لڑکی کی شادی اس (ساسان) سے کر دی تھی ، جس سے ارد شیر یا ار تخشتر پیدا ھوا -

ساسان کے مرنے کے بعد پاپک نے اس کی پرورش و تربیت شاہزادوں کی طرح کی - تعلیم و تربیت پا کر اردشیر نہایت خوب رو جوان بنا اور اس کی صورت و سیرت کا بہت چرچا ھوا - رفتہ رفتہ اس کی شہرت اردوان تک پہنچی - اس نے اسے اپنے بیٹوں کا ندیم بنانے کے لیے طلب کیا - جب وہ دربار میں پہنچا تو مورد الطاف و احسان ٹھہرا - کچھ عرصہ بعد اس کے دل میں بلند مناصب کے حصول کی خواھش پیدا ھوئی - اردوان کو جب اس امر کا پتا چلا تو اس نے ناراض ھو کر اسے اصطبل کا داروغہ بنا دیا - اس تنزل کا اسے بڑا دکھ ھوا ، لیکن وہ اپنے فرائض پورے طور پر بجا لاتا رھا - اسی دوران میں اس کی ایک کنیز سے راہ و رسم پیدا ھو گئی جو اردوان کی ایک خاص اور مقرب کنیز اور دوسری کنیزوں کی سردار تھی - اردشیر اس سے کچھ عرصہ ملتا اور اردوان کے راز معلوم کرتا رھا - اس کے تھوڑی ھی مدت بعد پاپک کے مرنے کی خبر پہنچی - اس کے تمام خزانے اس کے لیے وقف ھو گئے - اردشیر کو خیال تھا کہ اردوان اب اسے پاپک کی جگہ فارس کا گورنر بنائے گا ، لیکن اس نے اپنے بیٹے کو وھاں بھیج دیا ، جس کے سبب اردشیر نے بددل ھو کر وھاں سے فرار کی سوچی - چناں چہ ایک رات وہ اپنی محبوبہ کنیز کے ساتھ بھاگ کھڑا ھوا - اردوان کو جب اس کی خبر ھوئی تو اس نے ایک دستہ ان کے تعاقب میں بھیجا لیکن وہ گرفتار نہ ھو سکے -

اردشیر بھاگ کر اصطخر پہنچا - وھاں کے سرداران افواج نے تمام اموال و املاک اس کے سپرد کر دئے اور اردوان کے بیٹے کو وھاں سے بھگا دیا -

شہر پر قابض ہونے کے بعد اس نے قرب و جوار کے سرداروں کو اپنا مطیع و منقاد بنایا ، اور اس طرح اصطخر کے بعد فارس کو بھی اپنے تصرف میں لے آیا ۔

ابھی وہ سلطنت کے ابتدائی انتظامات سے بھی فارغ نہ ہوا تھا کہ اسے اپنے بھائیوں کے ارادۂ بغاوت کی خبر ملی ۔ اس نے خبر سنتے ہی اپنے سب بھائیوں اور ان کے پیرو کاروں کو مروا ڈالا ۔ پھر آہستہ آہستہ قدم بڑھا کر دارا بجرد ، کرمان اور کئی ایک ساحلی علاقوں پر قبضہ کر لیا ۔

اس کے بعد اس نے اردوان کے ساتھ ٹکر لی ۔ دونوں کے درمیان ہرمزدگان کے مقام پر (بعض کے نزدیک دجیل جو اصفہان کا ایک شہر تھا) زبردست لڑائی ہوئی ، جس میں اردوان مارا گیا ۔ اس کے بعد اس نے دیگر کئی ایک شہر اہواز ، سیستان ، ہمدان ، آذربائیجان ، نہاوند اور خراسان وغیرہ فتح کیے ۔ اس نے ایران سے باہر ایک شہر اردشیر کی بنیاد بھی رکھی ، جو بعد میں جدہ کہلایا ۔

۲۲۴ء میں اس نے شاہنشاہ کا لقب اختیار کیا ۔ اور رسمی طور پر تاج پہن کر تخت نشین ہوا ۔ تخت نشینی کے بعد اس نے رعایا کی فلاح و بہبود کے منصوبے بنائے اور انہیں عملی جامہ پہنایا ۔ کئی ایک شہر نئے سر سے آباد اور تعمیر کیے ۔ رفاہ عامہ کے کاموں کی طرف توجہ کی ۔

شاہنامہ ثعالبی میں مختلف موضوعات پر اس کے کچھ اقوال درج ہیں جن سے اس کے کاروبار سلطنت کے متعلق رویے کا پتا چلتا ہے ۔ مثلاً ''طاقت بغیر لشکر کے ، لشکر بغیر زر کے ، زر بغیر زراعت کے اور زراعت بغیر عدالت و حسن سیاست کے حاصل نہیں ہوتی''۔

''خلق کی خوراک کو ذخیرہ نہ کرو تاکہ قحط کا شکار نہ بنو ۔''

''مسافروں کے ساتھ مہمان نوازی کرو کہ خود تمہیں دوسری دنیا میں جانا ہو گا''

''دنیا سے زیادہ دل نہ لگاؤ کہ یہ کسی سے وفا نہیں کرتی اور

نہ اسے ترک ہی کرو - کیوں کہ دوسری دنیا کے لیے خیر کا حصول اسی کے ذریعے سے ہے"۔

"جابر سلطان کے ہوتے ہوئے آبادی و خوش حالی نا ممکن ہے - سلطان عادل باران رحمت سے بہتر اور شیر خونخوار سلطان ظالم سے بہتر ہے"۔

"مالیات ملک کی پشتیبان ہے - عدل اسے بڑھاتا اور ظلم گھٹاتا ہے" - وغیرہ

اس نے بعض کے نزدیک چودہ برس اور بعض کے مطابق ۱۷ سال حکومت کر کے ۲۴۱ء میں وفات پائی - اس کے مرنے کے بعد اس کا بیٹا شاپور تخت نشین ہوا -

(ایران بعہد ساسانیاں اردو ترجمہ از ڈاکٹر محمد اقبال صفحہ ۱۰۹ بیعد - تاریخ ساسانیاں صفحہ ۲۲ بیعد)

۱۰ - ضحاک - اس کے بارے میں مؤرخین کے درمیان اختلاف ہے - مؤرخین عرب نے بھی اس کے افسانہ کو مختلف صورتوں میں پیش کیا ہے -

حقیقت میں ضحاک کا نام ، جو اصل میں اژدھاک یا 'دہ آک' غیرہ تھا ، اور عربوں نے اسے ضحاک لکھا ، ایک قدیم آریائی افسانوی نام ہے - اس کی قدامت زمانہ کے متعلق بھی رنگا رنگ افسانے ہیں - اوستا (زرتشتیوں کی مقدس کتاب) کے مطابق 'دھاکہ' ایک عفریت تھا جسے ترتیانہ (فریدون) نے مار ڈالا تھا - یہ نام دھاکہ یا 'دھاکو' اور 'اژی دھاکہ' صورتوں میں بھی ہے - عربوں نے اس کلمہ کو معرب کر کے اژدھاق لکھا ہے - وہ اسے عربی سمجھتے ہیں اور عجمی اسے عجمی کہتے ہیں - فردوسی نے اس کلمے کو بدل کر ضحاک کر دیا ہے -

بہر حال اسے تمام روایتوں میں جمشید کا بھانجا کہا گیا ہے - اس کی ماں کا نام ورک (ودک) تھا -

مؤرخین کے عقیدہ کے مطابق اسے 'دہ آک' اس لیے کہا جاتا ہے

کہ 'آک' کے معنی آفت اور بری رسم کے ھیں اور اوستا میں بھی یہ انھی معنوں آیا ھے ۔ گویا وہ دنیا میں دس آفتیں اور برائیاں لایا ۔

کہتے ھیں کہ اس کے دونوں کندھوں پر دو سانپ آگ آئے تھے، جن کی روزانہ خوراک صرف مغز انسانی تھا ۔ یہ پدر کش ، ستم گر اور شیطان کا آلۂ کار تھا ۔ اس وقت انسان سبزی اور بوٹیوں وغیرہ پر بسر اوقات کیا کرتا تھا ، لیکن ابلیس نے اسے جانوروں کا گوشت کھانے پر فریفتہ کیا اور بعد میں آدم خوری کی ترغیب دلائی ۔ اپنی سلطنت کے ایک ھزار سال تک یہ اپنے کندھے کے سانپوں کو انسانی مغز کھلاتا رھا ۔ آخر لوگ تنگ آ کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ھوئے ، اور ایک لوھار کاوگ (کاوہ) نامی نے اپنا چمڑے کا پیش بند ایک نیزے کے سرے پر باندھا اور اس جھنڈے کے ساتھ باقاعدہ بغاوت کا اعلان کر دیا ، جس کے نتیجے میں ظالم ضحاک کو شکست ھوئی اور نوجوان شاہزادہ فریدن ، جو قدیم شاھی خاندان سے تھا ، تخت نشین ھوا ۔

(ایران بعہد ساسانیان صفحہ ۶۷۷—۶۷۸ ۔ براؤن جلد اول فارسی ترجمہ صفحہ ۱۷۴—۱۷۵ ۔ طبقات ناصری جلد دوم تعلیقات از عبد الحی حبیبی صفحہ ۳۷۳—۳۷۵)

۱۱ ۔ گرشاسپ ۔ رستم کے باپ زال کے اجداد میں سے تھا ، جو زابلستان کا رھنے والا تھا ۔ اسدی طوسی نے اپنی ایک مثنوی ''گرشاسپ نامہ'' میں اس کی بہادریوں کی داستانیں بیان کی ھیں ۔

اس نے نو سال حکومت کی ۔

(شاہ نامہ جلد اول صفحہ ۱۲۸ ۔راھنمای ادبیات فارسی صفحہ ۳۲۴)

۱۲ ۔ استاد اسدی طوسی ۔ حکیم ابونصرعلی بن احمد ، اسدی تخلص ، طوس کا رھنے والا اور پانچویں صدی ھجری کے شعرائے بزرگ میں سے تھا ۔ براؤن نے اسے اسدی خُرد لکھا ھے ۔ اس کے مطابق اس کے باپ کا تخلص بھی اسدی تھا ۔ اس طرح گویا دو اسدی تھے۔ لیکن بعد کے محققین فروزانفر ، صفا وغیرہ نے یہ ثابت کیا ھے کہ اسدی ایک ھی تھا ۔

اس کی ولادت چوتھی صدی کے اواخر یا پانچویں صدی ھجری کے اوایل میں ھوئی ۔ اس کی شاعری کا آغاز اس وقت ھوتا ھے ، جب خراسان انقلابات سے دو چار تھا ، غزنویوں کی سلطنت رو بہ زوال تھی اور سلاجقہ ان کی جگہ لے رھے تھے ۔ ان ناسماعد حالات کی بنا پر اسدی نے خراسان کو ترک کر کے آذربائیجان میں اقامت اختیار کی ۔ جہاں اس وقت چھوٹی چھوٹی حکومتیں موجود اور شعرو ادب کی مربی تھیں ۔ اسدی کا تعلق ذیل کے بادشاھوں سے رھا ۔ امیر ابودلف بادشاہ نخجوان ۔ ابوشجاع منوچھربن شاوور والی ارمنستان ۔

اس کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ ھے ۔ اس کی شہرت کا دار و مدار اس کی کتاب لغت فرس اور مثنوی گرشاسپ نامہ پر ھے ۔

۱۳ ۔ گرشاسپ نامہ ۔ اسدی نے تین سال کی مدت میں ۴۵۸ھ میں مکمل کی ۔ اس کے مختلف نسخوں میں اشعار کی تعداد سات سے دس ہزار تک ھے ۔ یہ مثنوی گرشاسپ کی داستان پر مشتمل ھے ، جو سیستان کا بہت بڑا پہلوان ، رستم کا جد اعلیٰ اور جمشید کی نسل سے تھا ۔ اسدی نے اس مثنوی کو جمشید کے سیستان بھاگ جانے اور کورنگ شاہ کے گھر میں پناہ لینے اور اس کی لڑکی سے عشق کرنے سے شروع کیا ھے ۔ پھر گرشاسپ کی سرگذشت بہ تفصیل بیان کی ھے ۔ یعنی اس کے خطرناک سفرھاے توران ، ھند ، افریقہ وغیرہ ، اس کی جنگیں ، اژدھا ، دیو اور شیر ببر سے لڑائیاں ، اس کا ھندوستان اور اس کے نواحی جزیروں میں عجیب و غریب اور خرق عادت چیزوں کا دیکھنا ۔ داستان کی خشکی کو دور کرنے کے لیے اسدی نے اس مثنوی میں بعض دیگر مبحث کو بھی چھیڑا ھے ۔ مثلاً بحث درستایش خداوند ، چگونگی دین ، نکوھش جہان ، صفت آسمان ، صفت طبایع چہارگانہ ، ستایش انسان ، وصف جان ، نکوھش مذھب دھریان اور بحث در مذھب فلاسفہ وغیرہ ۔ لیکن بہ قول صفا اس کے باوجود اس مثنوی کے لطف میں کوئی اضافہ نہیں ھوا ۔ یہ مثنوی فردوسی کے شاہ نامہ کی طرح حماسی مثنوی ھے ۔ اس کی زبان روان و استوار ھے اور بہ قول شفق شاہ نامہ کی زبان کی نسبت کسی حد تک اس دور کی زبان سے ملتی جلتی ھے

اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان دولو مثنویوں (شاہ نامہ ، گرشاسپ نامہ) میں ایک مدت کا فاصلہ ہو۔

(براؤن جلد دوم فارسی ترجمہ ، از فتح اللہ مجتبائی ، صفحہ ۱۶۹ ، ۳۱۰ ، ۳۱۱ - صفا جلد ۲ صفحہ ۳۰۳ ببعد - تنقید شعر العجم صفحہ ۱۵۲ ، ۱۵۵ - شفق ، صفحہ ۱۳۷ -- ۱۳۹ ، ۱۴۰ - سخن و سخنوران جلد دوم ، صفحہ ۹۴ از آقای فروز انفر)

شیر خان لودھی (صفحہ ۵۳۴)

۱ - قدیم ہونا ، ازلی ہونا اور نیا پیدا ہونا ، نیا پن۔

۲ - ناھد - دختر نارپستان یعنی وہ لڑکی جس کی چھاتیاں تازہ تازہ 'برآمد' ہوئی ہوں (غیاث اللغات صفحہ ۶۹۰)

اگر ناھید ہو تو وہ مشہور ستارہ ہے جسے زہرۂ فلک بھی کہتے ہیں۔

۳ - سلطان حسین شرقی - قدیم مؤرخین والیان جونپور کو ''بادشاہان شرق'' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سلطان حسین ، محمود شاہ شرقی کا بیٹا ، خاندان شرقی کا آخری فرماں روا اور بہلول لودی اور سکندر لودی کا ہم عصر تھا۔ اپنے بھائی سلطان محمد شاہ کے مارے جانے کے بعد تخت پر بیٹھا۔

تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے کئی ایک سرداروں کو ، جو تخت کے خواھش مند تھے ، قید کیا۔ پھر تین لاکھ سوار ۱۴ سو ھاتھی اکٹھے کر کے اڑیسہ کی طرف لشکر کشی کی۔ وھاں پہنچ کر افواج کو قتل و غارت وغیرہ کے لیے اطراف و جوانب پر مقرر کیا۔ اڑیسہ کے رائے نے اطاعت قبول کر لی۔

۸۷۱ھ میں جونپور واپس آ کر بنارس کے قلعہ کی مرمت کرائی۔ اور اسی سال اپنے سرداران بزرگ کو گوالیار کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ وھاں کے راجہ نے بھی محاصرہ سے تنگ آ کر اطاعت قبول کر لی۔ جب شوکت و استقلال حد سے بڑھی تو ۸۷۸ھ میں تسخیر دھلی کے ارادے سے ایک لاکھ چالیس ہزار سواروں اور ۱۴ سو ھاتھیوں کے ساتھ

ادھر متوجہ ہوا ۔ بہلول لودی بھی چند سوار لے کر مقابلے میں نکلا ۔ کچھ عرصہ دونوں افواج دریا کے کناروں پر آمنے سامنے رہیں ۔ آخر لشکر دھلی نے موقع پا کر حملہ کر دیا ۔ سلطان حسین کی غفلت کے سبب اس کی فوج انتشار کا شکار ہوئی ، اور خود اسے بھاگنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ تمام اہل حرم گرفتار ہوئے ، لیکن بعد میں بہلول لودی نے تمام کو اعزاز و اکرام کے ساتھ سلطان حسین کے پاس بھجوا دیا ۔ دوسرے سال اس نے قوت جمع کر کے پھر دھلی کی طرف لشکر کشی کی ، لیکن اس مرتبہ بھی شکست کھائی ۔ اسی طرح تیسری اور چوتھی مرتبہ اس طرف متوجہ ہوا اور ہر بار منہ کی کھائی ۔ چوتھی مرتبہ جب بھاگا تو بہلول جونپور پر متصرف ہو گیا ۔ سلطان حسین نے اپنے ایک چھوٹے سے علاقے پر قناعت کی ۔ بہلول کے مرنے کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا ، لیکن سکندر لودی نے اسے مار بھگایا ۔ اس نے بنگالہ کے فرماں روا علاء الدین شاہ کے پاس پناہ لی ۔ اس طرح ۸۸۱ھ میں خاندان شرقی کی سلطنت منقرض ہو گئی ۔

سلطان حسین شرقی آخری شکست کے بعد چند سال بنگال میں رہ کر دار فانی سے کوچ کر گیا ۔ اس نے ۱۹ برس حکومت کی ۔

(تاریخ فرشتہ جلد دوم صفحہ ۳۰۹-۳۱۰ ۔ طبقات اکبری ، مطبوعہ نول کشور ، صفحہ ۵۳۲-۵۳۳)

مظہر جان جاں (صفحہ ۵۴۰)

۱ ۔ میرزا مظہر جان جاں کالا باغ (مالوہ) میں ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) یا ۱۱۱۲ھ (۱۷۰۰ء) میں پیدا ہوئے ۔ بہ قول صاحب مفتاح التواریخ اصل ان کی آگرہ سے تھی ۔ دھلی میں سکونت اختیار کر لی تھی ۔ اکثر لوگ انھیں ''جان جاناں'' بھی لکھتے ہیں ۔ مظہر ایک مشہور صوفی اور اردو کے شاعر تھے ۔ ترکی نسل سے تعلق تھا ۔ ان کے والد مرزا جان اورنگ زیب کے عہد میں ممتاز عہدہ پر فائز تھے ۔ جب عالمگیر کو ان کی ولادت کی اطلاع ملی تو اس نے کہا کہ مرزا جان کے بیٹے کا نام

جان جاں ہونا چاہیئے - چنانچہ وہ اسی نام سے مشہور ہوئے ، اگرچہ والد نے ان کا نام شمس الدین رکھا تھا -

مرزا نقش بندی خاندان میں سید میر محمد بدایونی کے مرید تھے اور قادریہ سلسلے میں محمد عابد سامی کے -

۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ (۱۸۸۰ء) کو ایک شیعہ نے انہیں شہید کر دیا - دھلی میں مدفون ہوئے -

علم فقہ میں شہرت بہم پہنچائی تھی - شروع ھی سے حسن پرستی کی طرف مائل تھے - چنانچہ ''آب حیات'' میں ہے کہ مرزا کہا کرتے تھے کہ بچپن میں میں اس شخص کی گود میں جایا کرتا جو خوب‌صورت ہوتا ، اگر کوئی بد صورت مجھے گود میں آٹھانا چاھتا تو میں ہرگز نہ جاتا -

اردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہا کرتے تھے - صاحب تذکرۃ الشعرا کے مطابق فارسی میں میرزا بیدل سے استفادہ کیا -

ان کے ملفوظات 'مقامات مظہری' یا 'لطایف خمسہ' کے نام سے ۱۸۹۲ء میں محمد بیگ دھلوی نے جمع کیے - محمد نعیم اللہ بھڑائچی نے ان کے احوال و سوانح پر مشتمل ایک کتاب ''بشارت مظہریہ کے نام سے لکھی -

(سرو آزاد از غلام علی آزاد بلگرامی ، صفحہ ۲۳۱ بعد - تذکرۃ الشعر ، صفحہ ۱۲۵ - مفتاح التواریخ صفحہ ، ۳۵۸ - نگار ، علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر ، صفحہ ۱۵۶ بہ حوالہ گلشن بے خار از شیفتہ ، آب حیات از آزاد ، تاریخ شعراء اردو (کریم الدین) اور حدایق الحنفیہ)

محمد صادق اختر (صفحہ ۳۴۴)

۱ - قاضی محمد صادق نام ، اختر تخلص - ہوگلی کے رہنے والے اور مرزا قتیل کے شاگرد تھے - بہ قول صاحب 'سخن شعرا' لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ میں ہمیشہ عہدۂ عمدہ پر رہے - تذکرہ 'آفتاب عالم تاب' محامد حیدری ، دیوان فارسی و ریختہ اور 'گنج نیرنج' وغیرہ ان سے یادگار ہیں - فارسی خوب جانتے تھے - فن شعبدہ میں کمال حاصل تھا -

کیمیا گری میں شہرت پائی تھی ۔ علاوہ ازیں دیگر کئی ایک فنون میں دخل رکھتے تھے ۔ نساخ جس نے اپنا تذکرۂ 'سخن شعرا' ۱۲۸۱ھ میں لکھا ، ان کے متعلق آخر میں لکھتا ہے 'تھوڑا عرصہ گزرا انتقال کیا ۔' (سخن شعرا مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۶، ۱۷۔)

ان کا قطعہ ذیل خاصہ مشہور ہے :

کل شیخ بن کے مجتہد عصر ساقیا
دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا ز راہ تبختر مجھے بہ طنز
معلوم ہو گا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا
پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں
لیکن نہ کیجیے مجھے مورد عتاب کا
مے اور کنج باغ ہو ، ساقی ہو ماہ وش
اور کوئی بھی مخل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب
یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
کھینچ اس کو اور اپنے ملا کر وہ منہ سے منہ
دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیئے
گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو
گر کچھ بھی خوف کیجیئے روز حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام
قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ وشباب کا

۲ ۔ ان منافق لوگوں سے کنارہ کشی اختیار کر ، کیوں کہ ان میں ہر ایک فریب و دغا میں ماہر ہے ۔ خدا تجھے ان لوگوں کی صحبت سے بچائے ۔ ہر مکر اور ہر فتنہ و بلا سے محفوظ رکھے۔

۳ - قیصری و کسرائی - قیصر و کسریٰ کی مانند یعنی عالی شان۔

۴ - قاب و قاچاق - ممکن ہے اس سے مراد قاب و قاشق ہو یعنی خوان طعام اور چمچہ، جس سے مقصود خوراک وغیرہ ہو۔ لیکن چوں کہ آگے چل کر سفرہ و دسترخوان کا ذکر آ گیا ہے، کہ اس سے بھی مقصود غذا وغیرہ ہے، اس لیے اس کے معنی ٹھاٹھ باٹھ کے کیے ہیں۔

۵ - خاقانی - خاقان بہ‌معنی بادشاہ بزرگ، اور قدیم میں یہ چین و ترکستان کے بادشاہوں کا لقب ہوتا تھا۔ خاقانی یعنی خاقان کی مانند۔

۶ - (۱) خواہ ری (ایران) کا بادشاہ ہے خواہ روم کا، تو ان کے دروازے پر ہزاروں مظلوموں کو دیکھے گا۔

(۲) بگل کی طرح باد جفا سے ہمیشہ ہر ایک کا سر نگہبانی میں گیا ہے۔؟

(۳) بلند و معمور ایوان اور محلات یتیم کا مال اور مزدور کا حق چھین کر بنائے گئے ہیں۔

(۴) وہ شمع جو بزم میں جلاتے ہیں، اُسے ظلم کے تیل سے روشن رکھتے ہیں۔

۷ - (۱) یہ مکر و فریب کی بیاض کے محرر بہ ظاہر آدمی نظر آتے ہیں لیکن خصلت کے شیطان ہیں۔

(۲) جو کچھ بھی اُنھیں مل جائے، لے لیتے ہیں۔ تھوڑے یا زیادہ سے منہ نہیں موڑتے۔

(۳) جب ان کے دل میں کسی کی طرف سے کینہ پیدا ہو جائے تو اس کے معاملے میں قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں۔

(۴) اس مکر و فریب سے پُر گروہ کا ہر فرد رشوت ستانی میں کمی نہیں کرتا۔

(۵) وہ (ہرفرد) دل کی خواہشات کے مطابق نقدی کا بیسواں حصہ طمع کی مد کے تحت منہا کر لیتا ہے۔

(۶) اگر تو اس کے جمع و خرچ کو دیکھے تو تجھے محنت و جفا کی رقم (تحریر) نظر آئے گی ۔

(۷) اگر تو دیوانی حساب کے کھاتے پر نظر ڈالے تو تجھے اس کے ظلم و جور کا پتا چلے گا ۔

(۸) مختصر یہ کہ یہ سب کے سب مکار، فریبی، حیلہ گر اور چغل خور ہیں ۔

(۹) یہ سب بد مذہب، بد معاملہ اور منافقت سے عورتوں کی طرح حاملہ (بھرے ہوئے) ہیں ۔

(۱۰) انھیں مہر و وفا کی کچھ خبر ہی نہیں ۔ وہ سوائے ظلم و ستم کے اور کچھ جانتے ہی نہیں ۔

(۱۱) غربا کا رزق قطع کرنے کے لیے ان کا قلم تلوار کی سی تیزی رکھتا ہے ۔

(۱۲) دیکھنا کہیں ان کی شروع کی محبت کا دھوکا نہ کھانا ۔ معاملے کے انجام سے بچ کر رہنا ۔

۸ ۔ (۱) سب کا خمیر سراسر بدی سے اٹھایا گیا ہے ۔ سب نے اپنے دلوں میں برائی کا بیج بویا ہے ۔

(۲) سب بد زبان، بد شکل اور بد طینت ہیں ۔ ان کی گفتگو میں نرمی نہیں ہے ۔

(۳) شب و روز سب کے سب مال و جان و دین کی گھات میں رہتے ہیں ۔

مرزا محمد حسن قتیل (صفحہ ۵۵۱)

۱ ۔ مرزا محمد حسن قتیل ۔ ابتدائی نام دیوالی سنگھ اور اصلاً پنجابی تھا ۔ آبا و اجداد کھتری بھنڈاری تھے، جن کی بود و باش بٹالہ میں تھی ۔ اس کے پردادا نے آبائی وطن ترک کر کے باغپت میں سکونت

اختیار کر لی - دادا کا انتقال وهیں ۱۱۴۰ھ میں به عہد محمد شاہ هوا۔ والد درگاهی مل باغپت هی میں پیدا هوا اور وهیں پرورش پائی - اپنے باپ کی وفات کے بعد درگاهی مل قصبه داشنه (دهلی سے ۱۲ کوس) میں اٹھ آیا - دو تین سال کے بعد نواب هدایت علی خان اسدالدوله طباطبائی کی سرکار میں ملازم هو کر دهلی آ گیا - نواب نے اس کا مشاهره هزار روپیه مقرر کیا اور اجازت دی که جب چاهے دهلی آئے اور جب چاهے وطن جائے۔

قتیل ۱۱۷۰ھ میں به مقام فرید آباد پیدا هوا - یه مقام مضافات دهلی میں سے هے - ۱۱۸۲ھ کے لگ بھگ اس کے والدین نے فیض آباد میں رهائش اختیار کر لی ، اور یہیں پر یه مرزا باقر شهید اصفهانی کا شاگرد هوا - تعلیم کا یه سلسله ستره، اٹھاره سال کی عمر تک رها - اس دوران میں اس نے صرف ، نحو، منطق، معنی و بیان ، بدیع و ریاضی عروض عربی و فارسی میں کامل دست گاه پیدا کی -

چوده برس کی عمر میں حلقه بگوش اسلام هوا - اسلامی نام محمد حسن اور تخلص قتیل ٹھہرا - لیکن دو سال تک اسے (اسلام لانے کی خبر) چھپائے رکھا - گویا ۱۱۸۸ھ کے قریب اس کا اظہار کرتے هوئے شیعه فرقے سے رشته جوڑا - اس کی غالب وجه اس کے اُستاد کا اثنا عشری هونا هے -

معلوم هوتا هے قبول اسلام کا اعلان کرنے کے بعد یه اپنے خاندان سے الگ هو گیا - کیوں که اپنی تحریروں میں اس نے کہیں بھی اپنے خاندان والوں کا ذکر نہیں کیا - اپنے خاندان سے الگ هونے کے بعد نواب نجف خان کے لشکر میں شامل هوا - جس زمانے میں اس کا تعلق مذکوره لشکر سے تھا، وه دهلی آتا اور مصحفی کے مشاعروں میں (زمانه ۱۱۸۶—۱۱۹۸) شریک هوتا - لیکن دهلی میں اس کا مستقل قیام ۱۱۹۴ھ هی کے قریب هوا - نجف خان کی وفات کے بعد قتیل لکھنؤ چلا گیا - یه زمانه ۱۱۹۶ھ کا هے -

۱۲۰۶ھ کے قریب اس نے سید امان علی کی فرمائش پر شجرة الامانی لکھی - ۱۲۱۱ھ میں اپنا دیوان مرتب کیا - معلوم هوتا هے که قتیل

اس وقت تک نواب آصف الدولہ کے ہاں منشی کے عہدے پر مامور ہو چکا تھا۔ اس دربار سے اُس نے اپنا تعلق بہ طور شاعر کے نہیں بلکہ بہ طور منشی کرایا ہے۔

قتیل شروع شروع میں سعادت علی خاں کے دربار سے منسلک رہا لیکن بعد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر اسے الگ ہونا پڑا۔ دو تین سال اُس نے سیاحت میں بھی گزارے۔ ۱۲۱۷ یا ۱۲۱۸ھ میں سکندر شکوہ کی رکاب سے متعلق ہوا۔

عمر کے آخری سالوں میں معدے کی بیماری میں مبتلا رہا۔ آخر ۲۳ ربیع الاول ہفتہ کے روز ۱۲۳۳ھ میں بہ مقام لکھنؤ استسقا کے مرض میں فوت ہوا۔ مذکورہ دو تصانیف کے علاوہ نہرالفصاحت، چار شربت، رقعات، مظہرالعجائب، دریاے لطافت (انشا کے ساتھ مل کر لکھی)۔ ہفت تماشا، معدن‌الفوائد، ثمرات‌البدائع، قانون مجدد، فرمان جعفری، منشآت قتیل وغیرہ اس سے یادگار ہیں۔

(ماخوذ از اورئینٹل کالج میگزین مئی ۱۹۴۸ء مقالہ 'مرزا محمد حسن قتیل' از جناب وحید قریشی۔)

۲۔ سید اشرف جہانگیری۔ میر سید اشرف سمنانی جہانگیری۔ شیخ علاء الدین علاء الحق بنگالی لاہوری کے خلفا میں سے اور خاص مرتبہ کے بزرگ تھے۔ اکابر علماے ربانی اور اصحاب کرامات و تصرفات میں سے تھے۔ سیاحت میں مشہور صوفی امیر سید علی ہمدانی (متوفی ۷۸۶ھ) کے رفیق رہے۔ آخر آخر میں وارد ہند ہو کر علاء الحق کے حلقۂ ارادت میں آ گئے۔ اس ارادت سے قبل ہی کشف و کرامات کے مقامات عالیہ حاصل تھے۔ حقائق و توحید کے متعلق سخنان عالی آپ سے یادگار ہیں۔ تصنیفات میں مکتوبات ہیں جو تحقیقات غریبہ پر مشتمل ہیں۔ ملفوظات ایک مرید نے جمع کیے۔

آپ کا مزار جونپور کے ایک قریہ کچھوچھہ (یا کچھونچھ) میں اور مرجع خلائق ہے۔ کہتے ہیں کہ اس علاقے میں آپ کا نام جنوں

کو دور رکھنے کے لیے بڑا مؤثر سمجھا جاتا ہے۔ ۱۴۳۶ء میں وفات پائی۔

(اخبار الاخیار صفحہ ۱۶۶ - تذکرہ علماے ہند صفحہ ۲۳، ۱۴۸ - آب کوثر صفحہ ۳۴۶ - دربار ملی صفحہ ۱۳۳)

۳۔ حافظؒ شیرازی کا سفر مکہ۔ یہ سراسر بے پر کی اڑائی ہوئی ہے۔ کیوں کہ تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ حافظ نے شیراز سے باہر قدم نہیں رکھا۔ البتہ ایک مرتبہ انہیں سلطان احمد خواجہ کی طرف سے بغداد آنے کی اور ایک دفعہ بنگالہ کے حکمران غیاث الدین کی جانب سے بنگال آنے کی دعوت ملی تھی۔ لیکن وہ نہ گئے، اور دونوں مواقع پر ایک ایک غزل لکھ کر بھیج دی۔ اسی طرح دکن کے بہمنی فرماں روا سلطان محمود شاہ بن حسن نے دعوت دی، اور راستے کا خرچ بھی بھیج دیا۔ چناں چہ حافظ، شیراز سے نکلے تو سہی لیکن راستے میں جب بندر ہرمز پہنچے تو طوفان آ گیا۔ اسی کو بہانہ بنا کر واپس لوٹ گئے اور شیراز سے غزل لکھ کر دکن بھیج دی۔ جس کا مطلع یہ ہے:

دمی باغم بسر بردن جہان یکسر نمی ارزد
بمی بفروش دلق ماکزین بہتر نمی ارزد

اس سفر کے علاوہ ایک چھوٹا سا سفر یزد کا کیا اور بس۔ حافظ نے اپنے اشعار میں بھی شیراز سے باہر نہ نکلنے کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ مثلاً

نمی دہند اجازت مرا بسیر و سفر
نسیم باد مصلیٰ و آب و رکن آباد

(رکن آباد کی ندی اور مصلیٰ دونوں شیراز میں ہیں۔)

(ملاحظہ ہو براؤن جلد ۳، شعرالعجم جلد ۲، شفق وغیرہ)

۴۔ حضرت علیؓ (کرم اللہ وجہ)۔ آپ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابو طالب کے فرزند تھے۔ آن حضرتؐ نے آپ کو بچپن ہی سے اپنی کفالت میں لے لیا تھا۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنت اسد تھا، اور آپ پہلی ہاشمی خاتون تھیں جو اسلام لائیں اور

ہجرت کر کے مدینے گئیں ۔ حضرت علیؓ مکہ میں آں حضرتؐ ہی کے گھر میں رہتے اور آپؐ کی تربیت و نگرانی میں نشو و نما پا رہے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں اسلام لائے ۔ اس لحاظ سے آپ بچوں میں سب سے پہلے ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے ۔

جب کفار مکہ نے آں حضرتؐ کو قتل کر دینے کا منصوبہ بنایا ، اور اس عالم میں آں حضرتؐ کو خدا کی طرف سے مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم ملا ، تو اس رات حضرت علیؓ آپؐ کے ارشاد پر آپؐ کے بستر پر لیٹ گئے ۔ اور حضور سرور کائناتؐ نے آپؓ کو اپنی چادر اوڑھا دی ۔ اگرچہ خطرہ بہت تھا لیکن آپؓ صبح تک اطمینان سے سوتے رہے ۔ صبح جب مشرکین نے حضورؐ کی جگہ حضرت علیؓ کو سوتے دیکھا تو اپنی غفلت پر نادم ہوئے ۔ آپؓ دو تین دن مکہ میں ٹھہرنے کے بعد حضورؐ کے ارشاد کے مطابق مدینہ پہنچے ۔ یہاں جب آپؐ نے مہاجروں اور انصار کے درمیان مواخاۃ (بھائی چارہ) کرائی تو حضرت علیؓ کو اپنا بھائی بنا لیا ۔

مدینے میں اشاعت اسلام اور ملت کی بنیاد کے استحکام کے لیے جتنے کام ہوئے ، آپؓ ان سب میں شریک رہے ۔ مدینہ میں جب مسجد تعمیر ہونے لگی تو حضرت علیؓ نے اینٹیں ڈھونے اور گارا دینے کی خدمت انجام دی ۔

۲ھ میں آپؓ کا نکاح حضورؐ کی محبوب ترین دختر حضرت سیدہ فاطمۃالزہراؓ سے ہوا اور گیارہ ماہ کے بعد رخصتی ہوئی ۔ آپؓ نے اپنی زرہ فروخت کر کے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا ۔

غزوۂ تبوک کے علاوہ آپؓ نے دیگر تمام غزوات میں اپنی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھائے اور 'اسد اللہ' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ غزوہ احد میں آپؓ کے جسم پر سولہ زخم آئے ۔ خیبر کو بھی آپ ہی نے فتح کیا ۔ جب آپ یمن میں تبلیغ اسلام کے لیے منتخب ہوئے تو حضورؐ نے آپؓ کے سر پر اپنے دست مبارک سے عمامہ باندھا اور اسداللہ کا خطاب عطا فرمایا ، اور یہ بھی فرمایا 'جو علیؓ کا دوست ہے وہ میرا

بھی دوست ہے' ۔پھر دعا فرمائی 'یا اللہ ! جو شخص علیؓ سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ' ۔

آپ کو ابوتراب کا لقب بھی حضورؐ ھی کا عطا کردہ ہے ۔ وہ اس طرح کہ ایک روز آں حضرتؐ مسجد نبوی میں تشریف لائے تو آپ کو فرش خاک پر گہری نیند سوتے پایا ۔ آپؐ نے اپنے ھاتھوں سے آپؓ کو ھلایا اور کہا ''اٹھ ! ابو تراب'' ۔

حضورؐ نے بہ نفس نفیس آپؓ کو قرآن و حکمت کی تعلیم دی ۔ آپؓ کا شمار ان صحابہؓ میں ھوتا ہے جنھوں نے حضورؐ کی زندگی میں نہ صرف یہ کہ پورا قرآن پاک زبانی یاد کر لیا تھا بلکہ اس کی ایک ایک آیت کے معنی اور شان نزول سے آگاہ تھے ۔ آپ نے بچپن سے لے کر وصال حضورؐ تک کوئی تیس برس حضور سرور کائناتؐ کی خدمت و رفاقت میں بسر کیے ۔ اس مسلسل رفاقت و محبت کے سبب آپ اسلام کے احکام فرائض اور ارشادات نبوی کے سب سے زیادہ جاننے والے اور سب سے بڑے عالم تھے ۔ آپ کو فقہ و اجتہاد میں دسترس کامل اورغیر معمولی بصیرت حاصل تھی ۔ اخلاق و تقویٰ میں بھی بے مثل تھے ۔ آپؓ نے اسلام لانے سے پہلے کسی بت کو سجدہ نہیں کیا ، شرک و کفر کا کوئی کلمہ آپ کی زبان سے نہیں نکلا اور نہ شراب ہی کو ھاتھ لگایا ۔

آپؓ کی ذات گرامی زھد و ورع اور فقر و سادگی کا نمونہ تھی ۔ گھر میں کوئی خادم نہ تھا ۔ چکی پیستے پیستے حضرت فاطمۃ الزھراؓ کے مقدس ھاتھوں میں گھٹے پڑ گئے تھے ۔ اوڑھنے کے لیے صرف ایک ھی چادر تھی ۔ معاش کی بے حد تنگی تھی جس کے سبب اکثر فاقوں کی نوبت آ جاتی ۔

آپ ذھن رسا اور روشن فکر کے مالک تھے ۔ فصاحت و بلاغت اور تقریر و خطابت آپ کے گھر کی لونڈیاں تھیں ۔ شعر کا بھی ذوق تھا۔ آپ نے علم نحو کی بنیاد رکھی ۔ بہت سے جلیل القدر مفکروں اور صوفیا کا عقیدہ ہے کہ تصوف کے معارف و رموز کا سرچشمہ آپ کی ذات گرامی ھے۔

آپ کے دور کا ناخوش گوار واقعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ اور آپؓ کے درمیان جنگ ہے ۔ یہ لڑائی جنگ جمل کے نام سے مشہور ہے ۔ اور دوسرا اندوہ ناک حادثہ جنگ صفین ہے جو آپؓ اور حضرت امیر معاویہؓ کے درمیان لڑی گئی ۔ آپ کی خلافت کا دور شورش و اضطراب میں گزرا ۔ آخر ۴۰ھ میں (ماہ رمضان) کوفہ کی جامع مسجد میں ایک خارجی ابن ملجم نے آپؓ پر اس وقت زہر میں بجھی ہوئی تلوار سے وار کیا جب آپ نماز پڑھنے میں مصروف تھے ۔ زخم سر پر آیا ۔ حالت نازک سے نازک تر ہوتی چلی گئی ۔ بالاخر ۲۰ رمضان‌المبارک (۴۰ھ) جمعہ‌کی رات کو ۶۳ برس کی عمر میں جام شہادت نوش کیا ۔

'تجارب السلف' کے مؤلف ہندوشاہ نخجوانی کے مطابق آپ کے بیس لڑکے تھے اور اٹھائیس لڑکیاں ۔ اولاد کا سلسلہ پانچ بیٹوں سے چلا ۔ یعنی حضرات امام حسن ، حسین ، محمد بن حنفیہ ، عمر اطراف اور عباس ۔

(محسن‌اعظمؐ و محسنین‌رض از فقیر سید وحیدالدین نقش ششم اکتوبر ۱۹۶۴ء صفحہ ۱۶۳ ببعد ۔ تجارب السلف بحوالہ تلمیحات اقبال از سید عابد علی عابد ، جلد ۲ صفحہ ۳۴۷)

۵ ۔ حسنؓ ۔ حضرت امام حسن‌رض ۔ حضرت‌علی‌رض کے فرزند اکبر تھے کنیت ابو محمد اور نام شبر و حسن ہے ۔ ۱۵ رمضان ۳ھ (یکم مارچ ۶۲۵ء) کو مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے ۔ سر سے لے کر سینے تک اپنے نانا آں حضرتؐ کے مشابہ اور زھد و سخاوت میں ضرب المثل تھے ۔ بارہ اماموں میں دوسرے امام ھیں ۔

حضرت علی‌رض کے بعد دس روز کم چھ ماہ خلیفہ رہے ۔ خلیفہ ہونے پر کوفہ میں چالیس ہزار آدمیوں سے زیادہ نے آپ کے ھاتھ پر بیعت کی ۔ آپ کی مہر کا نقش 'العزۃ للہ' تھا ۔

شوال ۴۱ھ میں ملک و سلطنت حضرت معاویہ‌رض ابن ابو سفیان کے سپرد کی تاکہ وہ زندگی بھر خلیفہ رهیں ، اور ان کے بعد حضرت امام حسین خلیفہ بنائے جائیں ۔ خلافت چھوڑ کر مدینہ طیبہ میں یاد خدا

میں بقیہ زندگی بسر کی ۔ امیر معاویہؓ ہر سال آپ کو کثیر رقم بھیجا کرتے تھے ۔ کہتے ہیں جعدہ بنت اشعث نے ، جو آپ کی ایک زوجہ تھی ، یزید بن معاویہؓ کے بہکانے پر آپ کو زہر دے دیا ۔ زہر کے چالیس روز بعد ۵ ربیع الاول ۴۹ھ(۶۷۰ء) کو بہ عمر ۴۸ برس ۵ ماہ ۲۰ یوم ، شہادت پائی ۔ مزار جنت البقیع (مدینہ منورہ) میں ہے ۔

(قاموس المشاہیر ، جلد اول صفحہ ۲۰۱ ، ۲۰۲)

۶ ۔ حسینؓ ۔ حضرت امام حسینؓ ، حضرت علیؓ کے فرزند تھے۔ نام شبیر و حسین ، کنیت ابو عبداللہ اور لقب سیدالشہدا ہے ۔ ۳ یا ۵ شعبان ۴ھ (جنوری ۶۲۶ء) کو بروز سہ شنبہ مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے۔ ناف سے لے کر قدم تک آں حضرتؐ کے مشابہ تھے ۔ بارہ اماموں میں تیسرے امام ہیں ۔

امیر معاویہؓ کے بعد جب یزید مسند نشین ہوا تو اس نے آپ سے بیعت چاہی ۔ آپ نے انکار کر دیا ۔ ۶۰ھ میں معہ اہل و عیال مدینہ سے مکہ آگئے ۔ یہاں اہل کوفہ نے درخواستیں بھیجیں کہ یہاں تشریف لائیں اور اپنی بیعت سے ہمیں مشرف کریں ۔ دوستوں نے روکنا چاہا مگر آپ کوفیوں کے وعدوں پر اعتبار کر کے روانہ ہو گئے ۔ کل ساتھی بہتّر تھے ۔ بعد میں کربلا کا واقعہ درپیش آیا ۔ اس لڑائی میں آپ جب زخمی ہو کر گرے تو شمر یا خولی لعین نے تلوار سے آپ کا سر مبارک جدا کر دیا ۔ یہ واقعہ ۱۰ محرم ۶۱ھ (۱۰ اکتوبر ۶۸۰ء) کو بروز جمعہ بعد از نماز جمعہ وقوع پذیر ہوا ۔

آپ کا سر مبارک کوفہ سے لے جا کر عبید اللہ بن زیاد کو پیش کیا گیا ۔ اس نے گستاخی کرتے ہوئے اسے چھڑی سے ٹھکرایا ۔ پھر یزید کے پاس دمشق بھجوا دیا ۔ وہاں سے مدینہ میں لا کر جنت البقیع میں حضرت فاطمۃ الزہراؓ کے مزار اقدس کے پاس دفن کیا گیا ۔

(قاموس المشاہیر جلد اول صفحہ ۲۰۶ ، ۲۰۷ ، ۲۰۸ ۔)

۷ ۔ خواجہ مولود چشتی ۔ نام کے بارے میں غالباً قتیل کو سہو

ھوا ھے یا پھر کتابت کی غلطی ھے ۔ کیونکہ چشتیہ بزرگوں میں خواجہ مودود کا نام آتا ھے ، مولود کا نہیں ۔

خواجہ مودود چشتی ، خواجہ یوسف بن سمعانؒ کے فرزند اور چشت کے رھنے والے تھے ۔ آپ کا لقب قطب‌الدین تھا ۔ سات برس کی عمر میں قرآن مجید کو قرآت کے ساتھ حفظ کیا ۔ پھر تحصیل علوم میں مشغول ھوئے ۔ ۲۳ یا ۲٦ برس کے تھے کہ آپ کے والد فوت ھو گئے ۔ والد کی وصیت کے مطابق ان کے قائم مقام ھوئے ۔ اپنے خصائل ستودہ اور اوصاف حمیدہ کے سبب تمام علاقے میں مشہور تھے اور لوگ آپ سے بڑی عقیدت و ارادت رکھتے تھے ۔

شروع میں اپنے والد بزرگوار کے مرید ھوئے ۔ ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ احمد جام (جب وہ ھرات میں تشریف فرما تھے) سے کچھ عرصہ اکتساب فیض کیا ۔

یکم رجب ۵۲۷ھ کو بہ عمر ۹۷ سال چشت ھی میں وفات پائی اور ''مزار متبرکۂ چشت'' میں دفن ھوئے ۔

بہ قول الھدیہ مؤلف سیرالاقطاب آپ نے ۱۵ برس کی عمر میں منہاج‌العارفین نام کی کتاب لکھی ، جس میں 'روش خواجگان' کا بیان تھا ۔

(سیرالاقطاب صفحہ ۸۷ ، ۸۹ ۔ تاریخ فرشتہ ، جلد دوم صفحہ ۳۷۵ ۔ سفینۃ‌الاولیا صفحہ ۹۰، ۹۱ ۔ انوار اصفیا مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاھور صفحہ ۱۱۲)

۸ ۔ خواجہ معین الدین چشتی ۔ فرشتہ نے آپ کو ''حضرت سلطان المشائخ خواجہ معین الدین محمد حسن سنجری'' اور صاحب اخبارالاخیار نے ''خواجہ بزرگ معین الحق و الملۃ والدین حسن‌الحسینی سنجری'' کے الفاظ سے یاد کیا ھے ۔ والد کا نام غیاث‌الدین حسن تھا ۔

بہ قول ابو الفضل آپ ۵۳۷ھ (۱۱۴۳ء) میں قصبۂ سنجر (سجستان) میں پیدا ھوئے ، اور بہ قول فرشتہ و دارا شکوہ خراسان میں نشو و نما پائی ۔ پندرہ برس کے تھے کہ والد بزرگوار اس جہان فانی سے کوچ کر

گئے - ان کے ترکہ میں ایک میوہ دار درخت اور ایک پن چکی تھی جن سے خواجہ معینؒ اپنی روزی حاصل کرتے رہے ، پھر اچانک جذب طاری ہوا اور دنیا داری سے ہٹ کر اللہ کی طرف لو لگائی - تمام ترکہ فروخت کر کے درویشوں اور فقرا میں تقسیم کر دیا ، اور مسافرت اختیار کی -

ایک عرصہ تک سمرقند و بخارا میں حفظ کلام اللہ کے علاوہ کسب علوم ظاہری کرتے رہے ، پھر تکمیل کے لیے عراق چلے گئے - بعد میں قصبۂ ہارون (آئین اکبری میں ہرون ہے) جو پرگنہ نیشا پور سے ہے ، میں آئے جہاں شیخ عثمان ہارونی کی خدمت میں بیس برس رہے - (اس سے پہلے ، کہتے ہیں ، ابراہیم قندزی مجذوب نے تلاش و معرفت میں آپ کی راہنمائی کی تھی) - شیخ عثمانؒ سے خرقہ خلافت پایا -

کچھ عرصہ بعد سیاحت پر نکل کھڑے ہوئے اور کئی ایک بزرگوں مثلاً شیخ عبد القادر جیلانیؒ وغیرہ سے ملے - شیخ مذکورؒ کے پاس ۵ ماہ ۷ روز مقیم رہے ، پھر لاہور چلے آئے اور حضرت علی ہجویری (داتا گنج بخشؒ) اور حضرت شیخ حسین زنجانی کے مزاروں پر معتکف ہوئے - یہاں سے دھلی کا رخ کیا ، اور دس محرم ۵٦۱ھ کو وارد اجمیر ہوئے تاکہ گوشہ نشینی اختیار کریں - ان دنوں ہندوستان رائے پتھورا کے زیرنگین تھا اور وہ اس وقت اجمیر میں تھا - اس نے آپ کو تنگ کیا لیکن جلد ہی معزالدین سام نے ہندوستان پر قبضہ کرلیا ، اور آپ کو اس کے شر سے نجات مل گئی -

اجمیر میں آپ نے خوب نور اسلام پھیلایا اور ہزاروں کفار آپ کے ہاتھ پر حلقہ بگوش اسلام ہوئے - آپ کے کشف و کرامات کا شہرہ دور دور تک پھیل گیا - یہاں تک کہ سلاطین وقت بھی آپ کے پاس حاضری دیتے -

آپ نے ۹۷ برس کی عمر میں سوموار ٦ رجب ٦۳۳ھ (۱۲۳۵ء) کو اجمیر ہی میں وفات پائی (بعض نے مہینے کا نام ذی الحجہ لکھا ہے ، نزہۃالخواطر میں ایک تاریخ ٦۲۷ھ بھی ہے جو غلط معلوم ہوتی ہے -

کیونکہ زیادہ تر تذکرہ نگاروں نے ۶۳۳ھ ہی تاریخ وفات لکھی ہے)، اور وہیں مدفون ہوئے۔

پہلے آپ کی قبر خشت کی تھی، پھر اس کے اوپر پتھر کا صندوق بنایا گیا، جس کے سبب آپ کی قبر بلند ہو گئی۔ سب سے پہلے جس نے آپ کے مقبرہ میں عمارت بنوائی وہ خواجہ حسین ناگوری ہے۔ اس کے بعد دروازہ اور خانقاہ ہندوستان کے بعض سلاطین نے بنوائی۔

دلیل العارفین آپ کے ملفوظات ہیں جنھیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے جمع کیا تھا۔

(آئین اکبری جلد سوم صفحہ ۲۷۷ - مطبوعہ نول کشور ۱۸٦۹ء، تاریخ فرشتہ، جلد دوم صفحہ ۳۷۵ - اخبار الاخیار صفحہ ۲۲ - سفینۃ الاولیا صفحہ ۹۳ - سیر الاقطاب صفحہ ۱۰۱ بیعد - نزہۃ الخواطر از سید عبدالحی حسنی اردو ترجمہ از ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی جلد اول صفحہ ۲۰٦ — ۲۰۷ - تصوف اسلام از مولانا عبدالماجد دریا بادی طبع سوم صفحہ ۵۱ - ''ہندوستان کے سلاطین، علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر'' از سید صباح الدین عبد الرحمٰن مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ۱۲۷ - سیر المتاخرین مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۲۳، ۱۲۴)

۹ - نواب عبدالصمد خاں - نواب سیف الدولہ عبدالصمد خاں بہادر جنگ - باپ (خواجہ عبدالکریم) کی طرف سے اس کا سلسلۂ نسب خواجہ عبیداللہ احرار تک پہنچتا ہے اور والدہ کی جانب سے قطب عالم مخدوم اعظم تک، جو صحیح النسب سید تھے۔

نواب کا اصلی وطن سمرقند ہے، لیکن اس کی پیدائش اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی۔ صغر سنی میں اپنے باپ کے ہمراہ سمرقند چلا گیا۔ وہیں نشو و نما پائی اور کسب علم کیا۔ باپ کے مرنے کے بعد سبحان علی خاں شاہ توران سے شناسائی پیدا کر کے اس کے دربار میں آمد و رفت شروع کی۔ بادشاہ نے اسے سمرقند کا شیخ الاسلام بنا دیا، جو توران کا بہت بڑا عہدہ تھا۔

عالمگیر کے زمانے میں وارد ہند ہوا۔ شروع شروع میں ۹ صدی کے عہدے پر فائز ہوا۔ کچھ عرصہ بعد ہزار و پانصدی منصب اور عبدالصمد خاں کے خطاب سے نوازا گیا۔

جہاندار شاہ کے عہد میں تخت نشینی کے لیے بھائیوں کی جنگ میں اس نے کارہائے نمایاں سر انجام دیے ، جس کے بدلے میں فتح کے بعد جہان دار شاہ نے اسے سات ہزاری منصب اور عالی جنگ کے خطاب سے سرفراز کیا ، اور اس کا بیٹا زکریا خاں پنج ہزاری منصب پر فائز ہوا۔

فرخ سیر کے زمانے میں سات ہزاری منصب اور صوبہ داری لاہور پر مامور ہوا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد اسے دلیر جنگ کا خطاب دیا گیا۔

محمد شاہ کے دور میں سات ہزاری منصب کے ساتھ صوبہ داری ملتان اور سیف الدولہ کے خطاب سے نوازا گیا ، اور اس کے بیٹے کو لاہور کی صوبہ داری ملی۔

نادر شاہ کے حملے سے ایک سال قبل ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی۔
(مفتاح التواریخ صفحہ ۳۱٦)

۱۰ ۔ نواب زکریا خاں ۔ نواب عبدالصمد خاں کا چہیتا فرزند تھا۔ سترھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں پیدا ہوا۔ علوم مروجہ و اسلامیہ کے علاوہ فنون حرب کی بھی تعلیم پائی تھی۔ اس کی شادی نواب محمد امین خاں وزیر دہلی کی صاحب‌زادی سے ہوئی ، جو اس کا سوتیلا چچا تھا اور جس کی بیگم اس کی حقیقی خالہ تھی۔

اس کا باپ نواب عبدالصمد لاہور کا صوبہ دار تھا۔ اس کی وفات (۱۷۲٦ء) کے بعد اسے لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا۔ ۱۷۲۸ء میں جب نادر شاہ ہندوستان پر حملہ آور اور دریائے اٹک عبور کر کے صوبۂ لاہور میں داخل ہوا ، تو اس نے مرکز کو مدد کے لیے لکھا ، لیکن وہاں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے مقابلہ کی تیاری شروع کی۔ مگر جب خود کو اس کے مقابلے کا نہ پایا تو اس نے دانائی ، معاملہ فہمی

اور دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے نادر شاہ سے صلح کر لی۔ خود اس سے ملا، اور تیس لاکھ روپیہ بطور نذرانہ پیش کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نادر شاہ دہلی کی طرف بڑھ گیا اور یہاں کی رعایا قتل و غارت سے بچ گئی۔

اس کے دور میں پنجاب کے چند ایک سرکشوں نے فتنے برپا کیے، لیکن اس نے کمال تدبر و حکمت سے ان کی سرکوبی کی، اور صوبے میں امن و امان قائم رکھا۔

اس نے ۱۹ برس لاہور کا صوبہ دار رہ کر ۱۷۴۵ء میں یہیں وفات پائی۔ بہ قول انند رام مخلص اس کے جنازے پر اس قدر پھول برسائے گئے کہ شہر میں اس وقت پھول نایاب ہو گئے اور کسی قیمت پر نہ ملتے تھے۔ اسے بیگم پورہ میں ''حضرت ایشاں'' کے قریب کاشی کار مسجد کے شمالی جانب خاندانی احاطہ قبور میں باپ کی قبر کے متصل دفن کیا گیا۔

رعایا پروری اور عدل و انصاف میں بے مثل تھا۔ کہتے ہیں کہ اکثر بھیس بدل کر شہر میں گشت لگایا کرتا تھا۔ اس کے عہد میں لاہور کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کئی مرتبہ چپقلش ہوئی، لیکن اس نے پوری روا داری سے کام لیتے ہوئے صلح کرا دی۔

اس کے دور میں بے شمار علما و فضلا پنجاب کے مختلف شہروں میں مقیم ترویج علوم میں مشغول تھے۔ حضرت حامد قادری جن کا مدرسہ مغلپورہ میں تھا، اور شاہ محمد غوث، جن کا مزار باغ بیرون دہلی دروازہ میں واقع ہے، اس دور کے ممتاز و مقتدر علماء میں سے تھے۔

دیوان لکھپت رائے، جس نے کوٹ لکھپت آباد کیا، اس کا دیوان (مہتمم مالیات) تھا۔

حضرت ایشان خواجہ محمود خاوند (متوفی ۱۵۵۴ء) کے مزار کا موجودہ عالیشان گنبد زکریا ہی کا بنوایا ہوا ہے، اس کے علاوہ مادھولال حسینؒ کے مزار کے متصل ایک مسجد بنوائی، جس پر بہت سے کاشی کار کتبے ہیں۔ بہ قول پروفیسر محمد شجاع الدین مرحوم، یہ مسجد اگرچہ

اب از سرنو تعمیر ہو چکی ہے ، لیکن کاشی کار کتبے اب تک باقی ہیں۔

(مآثرالامرا ، بدائع وقائع از انند رام مخلص ، عبرت نامہ از مفتی علی الدین ، تحقیقات چشتی ، لاہور از لطیف ، تاریخ لاہور از کنہیا لال ، عماد السعادت از غلام علی نقوی بحوالہ ''لاہور مغلیہ دور میں'' از پروفیسر محمد شجاع الدین مطبوعہ مجلہ نقوش ''لاہور نمبر'' صفحہ ۸۵ ببعد)

۱۱ - دربار ملی میں یہاں سے مسعود سالار کا ذکر شروع ہوتا ہے۔ جو غلط ہے۔ یہاں راقم نے اصل کتاب 'ہفت تماشا' کو پیش نظر رکھا ہے۔

۱۲ - بہ قول دارا شکوہ اس نے ۹۱۴ھ میں وفات پائی ، اُس کی وفات کے بعد بہت سی خوارق و کرامات اس سے ظاہر ہوئیں۔
(سفینۃ الاولیا صفحہ ۱۶۱)

غلام حسین (صفحہ ۵۶۶)

۱ - ناصبی مذہب - 'لغت نامہ' دھخدا کے مطابق وہ فرقہ جو حضرت علی رض بن ابی طالب کا دشمن ہے ، اسے ناصبیہ بھی کہا جاتا ہے۔ دیوان ناصر خسرو کے حواشی و تعلیقات میں مجتبٰی مینوی 'ناصبی' کے ذیل میں لکھتے ہیں کہ اصحاب حدیث کو ناصبی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ لوگ بہ قول شہرستانی (مؤلف الملل والنحل) و خوارزمی (مؤلف مفاتیح العلوم) چار گروہوں میں منقسم ہیں (۱) مالکیہ (۲) شافعیہ (۳) حنبلیہ اور (۴) داودیہ - لیکن ابن الندیم (مؤلف الفہرست) اور مقدسی کے مطابق یہ چار فرقے حسب ذیل ہیں :
(۱) حنبلیہ (۲) راھویہ (۳) اوزاعیہ اور (۴) منذریہ -

(لغت نامہ از علی اکبر دھخدا جلد ۹۲ صفحہ ۱۵۲ - دیوان ناصر خسرو بہ کوشش مہدی سہیلی مطبوعہ تہران ۱۳۳۹ش صفحہ ۶۲۷) -

۲ - خجستہ اختر جہان شاہ - بہادر شاہ اول کا فرزند تھا - بہادر شاہ کی وفات کے بعد اس کے بیٹوں کے درمیان مارچ ۱۷۱۲ء میں تخت نشینی

کے لیے جو جنگ ہوئی ، اس میں بہ مقام لاہور قتل ہوا - اس کی لاش دھلی لا کر ہمایوں کے مقبرے میں دفن کی گئی -

جہاں شاہ سمجھ دار اور مستعد تھا - اسی باعث وہ کاروبار سلطنت میں بہت دخیل رہا -

(قاموس المشاہیر از نظامی بدایونی جلد اول ، صفحہ ۱۸۳ - ہندوستان شاہان مغلیہ کے عہد میں صفحہ ۱۵۸ ، ۱۵۹ - سراج الدولہ از محمد عمر صفحہ ۳۶) -

۳ - مہابت جنگ - میرزا محمد علی نام ، علی وردی اور مہابت جنگ خطابات تھے - ترکوں کے افشار قبیلے سے اس کا تعلق تھا - اس کا باپ مرزا محمد ، نواب شجاع الدولہ کا قرابت دار تھا - مرزا محمد پہلے شاہ زادہ اعظم کی ملازمت میں تھا - اس کی وفات کے بعد شجاع کے پاس آ گیا - شجاع نے اس کی خاصی قدر کی - بعد میں اس کا بیٹا (مرزا محمد علی) بھی دھلی سے اس کے پاس اڑیسہ چلا آیا - یہاں آتے ہی اس کے جوہر کھلے - شجاع نے اس کی قابلیت و ذہانت سے متاثر ہو کر اسے بڑے بڑے عہدے عطا کیے اور پھر محمد شاہ بادشاہ سے اس کے لیے علی وردی خاں کے خطاب کی سفارش کی -

جب شجاع بنگالہ کا صوبہ دار بنا ، تو اس کا بڑا مشیر علی وردی تھا - تھوڑے ہی عرصے میں علی وردی کو عظیم آباد کا صوبہ دار بنا دیا گیا - پھر اسے صوبۂ بہار کی حکومت ملی -

شجاع کی وفات (۱۷۳۹ء) کے بعد سرفراز خاں علاء الدولہ حاکم بنگالہ ہوا - علی وردی اور اس کی آپس میں نہ بن سکی ، جس کے نتیجے میں دونوں میں جنگ ہوئی اور علاء الدولہ مارا گیا (۱۷۴۰ء) - اس کے بعد علی وردی مسند نشین ہوا - اس کے دور میں کٹک میں بغاوت ہوئی - مرہٹوں نے یورش کی ، لیکن انہیں پسپا ہونا پڑا - اس طرح انھوں نے دو اور حملے کیے - لیکن ہر مرتبہ انہیں منہ کی کھانی پڑی - اس کے صلے میں اسے (علی وردی) شجاع الملک کا خطاب اور شاہی ملبوس عطا ہوا - ان تین حملوں کے بعد بھی مرہٹے مسلسل یورشیں کرتے رہے

اور علی وردی ان سے به خوبی نپٹتا رها ۔ آخر ۱۶ سال مسند نشین رہ کر اس نے به عمر اسی سال ۹ اپریل ۱۷۵۶ء کو وفات پائی اور مرشد آباد میں اپنے خاندانی قبرستان واقع خوش باغ میں دفن هوا ۔ اس کے بارے میں مزید تفصیل سیر المتاخرین کے اقتباس میں آچکی هے ۔
(مفتاح التواریخ صفحه ۳۳۶ ، ۳۳۷ ۔ سراج الدوله صفحه ۶۱ ببعد)۔

۴ ۔ سراج الدوله ۔ اس کا اصل نام مرزا محمد اور باپ کا نام زین الدین خان تھا ۔ اس کی والده امینه بیگم علی وردی خان کی بیٹی تھی ۔ مفتاح التواریخ میں اسے (سراج) علی وردی کا بھانجا لکھا هے ، جو غلط هے ۔ ۱۷۱۹ء میں پیدا هوا ۔ مہابت جنگ (علی وردی خان) نے اس کی تعلیم و تربیت کی ۔ ایرج کی بیٹی لطف النساء بیگم سے اس کی شادی هوئی ۔ سید محمد میاں کا کہنا هے که ایرج خان کی لڑکی سے اس کی موافقت نه هوئی اور اس نے ایک نو مسلم عورت لطف النساء سے دوسری شادی کی تھی ۔ مہابت جنگ هی نے اسے سراج الدوله کا خطاب دیا تھا۔

مہابت جنگ کی وفات (۹ رجب ۱۱۶۹ھ) کے بعد وه نظامت بنگاله کی مسند پر متمکن هوا ۔

انگریزوں کا جانی دشمن تھا ۔ فتح کلکته کے بعد جو 'حادثهٔ بلیک هول' اس سے منسوب کیا جاتا هے ، اس میں ذره بھر صداقت نہیں هے ۔ یه در اصل انگریز مؤرخین کی افترا پردازی هے ۔ واقعهٔ مذکوره اس طرح بیان کیا جاتا هے که سراج الدوله نے انگریزوں سے کلکته لے لینے کے بعد گرفتار شدگان میں سے ۱۴۶ انگریز مردوں اور عورتوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں ، جو مربع میں چھ گز سے زیاده نه تھا (یا ۲۰ فٹ مربع) رات بھر مقید رکھا ۔ جس کے نتیجه میں سوائے ۲۳ افراد کے باقی تمام دم گھٹنے سے لقمهٔ اجل بن گئے (۲۲ رمضان ۱۱۶۹ھ یا جون ۱۷۵۶ء) ۔

جنگ پلاسی میں غدار اعظم میر جعفر لعنة الله علیه نے اس سے غداری کی ۔ شکست کھا کر بھاگا اور راج محل کے قریب ایک فقیر کے تکیے میں پناه لی ۔ فقیر نے میر جعفر کے آدمیوں کو اس کی خبر کر دی۔

اور اسے مع اهل و عیال گرفتار کر لیا گیا ۔ پھر جعفر کے بیٹے میرن نے اسے اتوار ۱۵ شوال ۱۱۷۰ھ کو قید اور اس کے چند گھنٹوں بعد قتل کر دیا ۔ اس کی لاش کو ھاتھی کے هودے میں رکھ کر تمام شہر میں اس کی تشہیر کی گئی ۔

(مفتاح التواریخ صفحہ ۳۳۷ ۔ سراج الدولہ صفحہ ۶۵ بیعد ۔ ڈوپلے اینڈ کلائیو از هنری ڈوڈویل صفحہ ۱۲۲ ۔ هندوستان شاهان مغلیہ کے عہد میں صفحہ ۲۳۲ ۔ سیر المتاخرین مطبوعہ کلکتہ صفحہ ۲۳۱ ، ۲۳۲ جلد دوم) ۔

۵ ۔ شہامت جنگ ۔ نواب نوازش محمد خان شہامت جنگ ۔ سراج‌الدولہ کا خالو اور چچا ، اور گھسیٹی بیگم کا خاوند تھا ۔ بے اولاد ہونے کے سبب اس نے سراج الدولہ کے بھائی اکرام الدولہ کو اپنا لے پالک بنا رکھا تھا ۔ اس سے شہامت جنگ کو بے پناہ الفت و محبت تھی ۔ جب اکرام الدولہ نے کچھ عرصہ چیچک میں مبتلا رہ کر وفات پائی تو شہامت جنگ کو اس کا بہت ھی صدمہ ھوا اور وہ بیمار پڑ گیا ۔ آخر شب سہ شنبہ ۱۳ ربیع الاول ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) کو ، استسقا کے مرض میں مبتلا رہ کر ، فوت ھوا ، اور باغ موتی جھیل میں اکرام الدولہ کے قریب اسے دفنایا گیا ۔

بڑا صاحب جود و سخا تھا ۔ بوڑھی عورتوں ، مسکینوں اور یتیموں وغیرہ کے ساتھ بڑی اچھی طرح پیش آتا اور ان کی ضروریات پوری کرتا ۔ مہینے میں اس کے ۲۷ هزار روپے خیرات پر صرف ھوتے ۔ اس کے علاوہ ماھانہ وظیفے رکھے ھوئے تھے ۔ مستحق لوگوں کو ان کے گھروں پر روپوں کی تھیلیاں بھجوا دیتا ۔ کسی سے کبھی برا سلوک نہ کرتا ۔ مرشد آباد کے بے یار و مددگار بچوں اور عورتوں کے اخراجات اس نے اپنے ذمے لے رکھے تھے ۔ رسمی تواضع سے دور رھتا ۔ اس نے بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کی ۔

(سیرالمتاخرین مطبوعہ کلکتہ جلد دوم صفحہ ۱۹۰ ، ۱۹۱ ، ۱۹۳ ، ۵۹۶ ۔ مفتاح‌التواریخ صفحہ ۳۳۶ ۔ سراج الدولہ صفحہ ۹۶ ، ۱۲۶)

۶ - بی بی گھسیٹی - علی وردی مہابت جنگ کی بڑی لڑکی تھی - اصل نام مہرالنسا تھا - مگر بعض نا معلوم وجوہ کی بنا پر گھسیٹی بیگم کے نام سے موسوم ہوئی - مہدی بیگم اور موتی جھیل کی بیگم بھی کہلاتی تھی - اس کی شادی اپنے چچا کے لڑکے نوازش محمد سے ہوئی - علی وردی خاں کے خاندان کو تباہ کرنے کا داغ اسی کے ماتھے لگتا ہے - علی وردی کی زندگی ہی میں وہ اپنے لے پالک مرادالدولہ کو صوبہ دار مقرر کرانے کے خبط میں مبتلا تھی - اس مقصد کے لیے اس نے ۲۰ ہزار سپاہی ملازم رکھے - راج بلبھ کو، جو اس کے خاوند کا وفادار ملازم تھا، اپنے ساتھ شریک کیا اور نذیر علی سے تعلقات پیدا کیے - سراج الدولہ نے خط کے ذریعے تنبیہ کی مگر اس نے پروا نہ کی - اس کے باپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے ان حرکات سے باز رکھنے کی کوشش کی، لیکن وہ باز نہ آئی - بلکہ اپنی سازشوں کے حلقے کو اتنا وسیع کیا کہ میر جعفر اور شوکت جنگ بھی اس میں پھنس گئے -

سراج الدولہ جب مسند نشین ہوا تو اس نے اس کے محل کے محاصرہ کرنے اور اس کی جائداد وغیرہ کی ضبطی کا حکم صادر کیا - اس نے گھبرا کر چند امیروں کی وساطت سے معافی مانگ لی - اس کی خطا معاف ہوئی - اسے کسی اور مقام پر بھیج دیا گیا اور مال و متاع خزانے میں داخل ہوا - جب نظر بندی سے آزاد ہوئی تو اس وقت بھی چین سے نہ بیٹھی - سراج الدولہ کے خلاف اندر ہی اندر سازش کرتی رہی، اور خفیہ خزانے میں رکھا ہوا اپنا سونا نکال کر اس کا کچھ حصہ سازش کے اخراجات کے لیے میر جعفر کو دیا - اس لحاظ سے یہ بھی اس ''ننگ آدم، ننگ دیں، ننگ وطن'' سے کسی طور کم نہ تھی - آخر میں میرجعفر نے اسے، اس کی ماں اور دیگر دو بہنوں کے ساتھ ایک بدبو دار کمرے میں قید کرا دیا - کچھ عرصے بعد بڑے برے طریقے سے انہیں ڈھاکہ بھجوا دیا اور بعد میں جعفر کے بیٹے میرن نے اپنے ایک معتبر آدمی کو بھیجا کہ وہ گھسیٹی اور اس کی بہن آمنہ بیگم کو مرشد آباد لانے کے بہانے راستے میں ان کی کشتی غرق کر دے - لیکن کہتے ہیں کہ راستے میں جب انہیں اس بات کا علم ہوا تو انہوں

نے خود ھی دریا میں چھلانگ لگا دی ۔ یہ واقعہ آخر شوال یا اول ذیقعدہ ۱۱۷۳ھ کو پیش آیا ۔

(سراج الدولہ صفحہ ۱۳۳ بیعد ۔ صفحہ ۲۲۳ ، ۲۲۸ ، ۲۲۹) ۔

۷ ۔ صولت جنگ ۔ محمد سعید نام ۔ نصیر الملک، مہام الدولہ، سعیداحمد، خان بہادر ، صولت جنگ اس کے خطابات تھے ۔

۱۷۲۵ء میں جب شجاع الدولہ بنگالہ وغیرہ کا صوبہ دار بنا تو اسے فوجدار رنگ پور بنا دیا گیا ۔ پھر پرینہ (پورینہ) کا حاکم بنا ۔ مہابت جنگ کا بھتیجا تھا ۔ شہامت جنگ اور ھیبت جنگ وغیرہ اس کے بھائی تھے ، اور یہ ان میں منجھلا اور صورت و سیرت میں ان سے ممتاز اور حسن خلق اور علم و فضل میں بڑھ کر تھا ۔

آغاز میں لہو و لعب (رقص اور عورتوں وغیرہ سے دلچسپی) میں مصروف رھا ، لیکن بعد میں ان چیزوں سے تائب ھو گیا ، اور رات کے پچھلے حصے میں بیدار اور حوائج ضروری سے فارغ ھوکر اول صبح کی نماز پڑھتا ، پھر دربار کرتا ۔ ھفتے میں دو مرتبہ بار دیتا اور جمعہ کے دن تعطیل کرتا ۔

اپنے بھائی شہامت جنگ کے مرنے کے ۲ ماہ ۱۲ روز بعد اس نے وفات پائی ۔ شہامت جنگ کی بیماری کے دنوں میں اس (صولت جنگ) کے سر میں ایک چھوٹا سا دانہ (پھنسی) نکل آیا تھا ، جس نے اسے خاصی تکلیف پہنچائی ، یہاں تک کہ اس کے لیے دستار باندھنا دشوار ھو گیا ۔ آخر میں گردن سوج گئی ، اور پھر یہی پھنسی اس کی موت کا باعث بنی ، جو ۲۵ جمادی الاول ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) کو واقع ھوئی ۔ اسے جعفری باغ میں دفن کیا گیا ۔ 'خدایش بیامرزد' تاریخ وفات ھے ۔

سیر المتاخرین کا مؤلف غلام حسین طباطبائی اس کے پاس بھی ملازم رھا ۔

(سیر المتاخرین مطبوعہ کلکتہ جلد دوم صفحہ ۱۹۵ ۔ مطبوعہ نول کشور صفحہ ۵۹۹ ، ۶۰۵ ، ۶۰۶ ۔ مفتاح التواریخ صفحہ ۳۳۶ ، ۳۳۷ سراج الدولہ صفحہ ۶۴ ، ۱۲۷)

۸ - شیخ محمد یعقوب کلینی - ابو جعفر محمد بن یعقوب بن اسحاق کلینی ، رے کا رہنے والا تھا - شیعہ فرقے کا بہت بڑا فقیہ و محدث شمار ہوتا ہے - اثنا عشری مذہب کے رائج کرنے والوں میں سے تھا - ابن اثیر نے اسے اس مذہب کا تیسری صدی ہجری کا مجدد لکھا ہے -

یہ پہلا شخص ہے ، جس نے احادیث کے جمع و نقل اور تبویب کا کام کیا -

اس نے ۳۲۹ھ میں بمقام بغداد وفات پائی - اس کی قبر وہاں کے بازار میں مشہور پل کے نزدیک اور زیارت گاہ عام و خاص ہے -

اس کی تصانیف میں سب سے مشہور 'الکافی' ہے - علاوہ ازیں 'رد قرمطہ' ، 'تعبیرالرویا' ، 'رسائل الائمہ' اور 'کتاب الرجال' اس سے یادگار ہیں -

(کارنامۂ بزرگان ایران ، صفحہ ۵۴ - راهنمای ادبیات فارسی ، صفحہ ۳۱۸ ، ۳۱۹)

۹ - کتاب کافی - الکافی ، محمد بن یعقوب کلینی کی تصنیف ہے - یہ کتاب شیعوں کی چار کتب میں سے ہے ، جس کی تالیف پر کلینی نے بیس برس صرف کیے ، اور جو سولہ ہزار احادیث پر مشتمل ہے -

احادیث کے سلسلے میں علمائے شیعہ ، فقہا اور محدثین اسی سے رجوع کرتے ہیں -

[راهنمای ادبیات فارسی ، صفحہ ۳۱۲ - کارنامۂ بزرگان ایران ، نشریہ ادارۂ کل انتشارات رادیو (ایران) صفحہ ۵۴]

۱۰ - صاحب‌الامر - نام محمد اور کنیت ابو القاسم ہے - حسن عسکری کے فرزند تھے - بہ قول محمد علی خلیلی شیعہ فرقے ان کا نام نہیں لیتے کیوں کہ ان کے مطابق ان کا نام لیتے ہی وہ حاضر ہو جاتے ہیں - اسی لیے وہ انھیں مہدی ، امام عصر ، قائم ، صاحب امر ، حجت وغیرہ کے القاب سے یاد کرتے ہیں - بارھویں امام ہیں -

ولادت ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کو سرمن رائے (سامرہ) میں ہوئی -

بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ ان کی والدہ کا نام نرجس تھا، جو ان کے والد کی پھوپھی حکیمہ‌رض کی زر خرید لونڈی تھی اور جسے ان کے والد نے اپنی پھوپھی سے یہ کہہ کر لے لیا تھا کہ 'قائم آل بیت' اسی سے پیدا ہو گا۔ بعض ان کی والدہ کا نام صقیں بتاتے ہیں، اور بعض مایکہ۔

ان کی ولادت کے بارے میں بہت سی روایات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سوائے چند خاص آدمیوں کے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ بعض کے مطابق وہ جس گھر میں پیدا ہوئے تھے اس میں ۲۶۵ھ یا ۲۶۶ھ میں داخل ہوئے۔ پھر ہر چند ان کی والدہ نے انتظار کیا وہ باہر نہ آئے۔ ان کے اس طرح غائب ہونے کو 'غیبت صغریٰ' کا نام دیا جاتا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ ان کی اس غیبت کے دوران ان کے سفیر کام سر انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ اس طرح کہ لوگوں کی حاجات اور سوالات وہ امام کے پاس لے جاتے اور ان کا جواب وغیرہ امام سے لے کر متعلقہ حاجت مندوں وغیرہ تک پہنچا دیتے۔ سفارت کا یہ سلسلہ ۳۲۶ھ (بعض کے نزدیک ۳۲۹ھ) میں آخری سفیر علی بن محمد کی وفات پر ختم ہو گیا۔ اس کے بعد بہ قول شیعہ حضرات کے، ان کی غیبت کبریٰ شروع ہوتی ہے۔ یعنی اب قیامت کے قریب ان کا ظہور ہو گا اور وہی 'مہدی آخر الزماں' ہوں گے۔ یوں تو اہل سنت کے یہاں بھی 'مہدی آخر الزماں' کا تصور ہے، لیکن دونوں کے تصور میں بڑا فرق ہے۔

اس عقیدہ کے رائج ہونے کے سبب آغاز اسلام ہی سے بہت سے منچلوں نے 'مہدی' ہونے کا دعویٰ کیا، لیکن سب دروغ گو ثابت ہوئے۔
('خاندان پیغمبرؐ یا چہاردہ معصوم' از محمد علی خلیلی مطبوعہ تہران صفحہ ۳۰۷—۳۱۳۔ روضۃ الصفا جلد ۳ صفحہ ۱۸، ۱۹۔ سفینۃ الاولیا صفحہ ۲۹—۳۰۔ قصر عارفان از مولوی احمد علی باہتمام ڈکٹر محمد باقر مطبوعہ اوریئنٹل کالج میگزین صفحہ ۷۹، مئی ۱۹۶۵ء)

۱۱۔ جگت سیٹھ۔ ہیرا نند ساہو (مارواڑی جینی) ریاست جے پور کے ایک چھوٹے سے گاؤں 'نوگو' میں ایک معمولی سی دکان کرتا تھا جب اس پر فاقہ کشی کی نوبت آئی تو وہ ۱۶۵۰ء میں پٹنہ چلا گیا۔

مانک چند اس کا سب سے بڑا بیٹا تھا ۔ وہ (مانک) پٹنہ سے ڈھاکہ گیا، جہاں صوبے کا ناظم رہتا تھا ۔ جب ناظم صوبہ (مرشد قلی خاں) نے مرشد آباد میں سکونت اختیار کی تو مانک بھی وہاں منتقل ہو گیا ۔ یہاں اس نے ساہوکاری شروع کی، اور نواب اس کی پرورش کرنے لگا ۔ رفتہ رفتہ خزانے کا اہتمام، خراج کی ادائیگی اور ٹکسال کی نگرانی اس کے سپرد ہوئی - ۱۷۱۵ء میں نواب (مرشد قلی) کی سفارش پر فرخ سیر شاہ دھلی نے اسے سیٹھ کا خطاب دیا، اور ۱۷۲۳ء میں محمد شاہ نے اسے 'جگت سیٹھ' کے خطاب سے سرفراز کیا، اور بعد میں یہ خطاب ان کی خاندانی وارثت بن گیا ۔

یہاں جس جگت سیٹھ کا ذکر ہے اس کا نام مہتاب رائے تھا اور وہ اسی مانک چند کے پوتوں میں سے تھا ۔ اس خاندان کی سرمایہ‌داری کا یہ عالم تھا کہ ۱۷۴۷ء میں اُنھوں نے انگریزوں کو ۱۲ لاکھ روپیہ بطور قرض دیا ۔ اس سے تین برس پیشتر مرھٹے ان کے محل سے دو کروڑ روپے لوٹ کر لے گیے، اور انھیں اس کی مطلقاً پروا نہ ہوئی ۔ وہ سونے کی تجارت کے اجارہ دار تھے اور انگریزوں میں ان کا بہت اثر و رسوخ تھا ۔ چناں چہ ۱۷۵۹ء میں جب مہتاب رائے کلکتہ گیا تو کمپنی نے اس کی خاطر تواضع پر ۱۷ هزار روپیہ خرچ کیا ۔ اسی مہتاب رائے نے سراج الدولہ کے خلاف سازش میں نمایاں کردار ادا کیا ۔

۲۱ اپریل ۱۷٦۳ء کو میر قاسم نے جگت سیٹھ مہتاب رائے اور اس کے بھائی کو نظر بند کر لیا ۔ پھر ان کی گٹھڑی بنا کر قلعہ سینگر کی فصیل سے دریا میں پھینک کر غرق کرا دیا ۔

(سراج الدولہ صفحہ ۲۴۷، ۲۴۸)

۱۲ ۔ آصف جاہ ۔ میر قمرالدین نواب نظام الملک آصف جاہ بہادر ۔ نواب غازی الدین فیروز جنگ ابن قلیچ خاں کا بیٹا تھا ۔ (مؤخرالذکر باپ بیٹوں کا ذکر گذشتہ حاشیوں میں گذر چکا ہے) ۔

نظام الملک آغاز جوانی میں عالمگیر کے دربار میں ایک چھوٹے منصب پرفائز ہوا، لیکن جلد ھی چہار ہزاری کے منصب تک پہنچ گیا اور عالمگیر

نے اسے 'چین قلیج خان بہادر' کے خطاب سے نوازا - عالمگیر کی وفات کے وقت وہ بیجا پور میں تھا - عالمگیر کے بیٹوں کے درمیان تخت نشینی کی جنگ میں وہ بالکل غیر جانب دار رہا - بہادر شاہ نے اسے دکن سے ہٹا کر اودھ کا صوبہ دار بنا دیا - اس نے کچھ عرصہ کے لیے گوشہ نشینی اختیار کر لی ، لیکن بہادر شاہ کے عہد کے آخر میں پھر شاہی ملازمت میں آ گیا ، اور اپنے والد کے خطاب غازی الدین فیروز جنگ سے نوازا گیا - جہاندار شاہ کے عہد میں اسے نواب نظام الملک کا خطاب ملا - فرخ سیر نے اپنے پہلے سال جلوس میں (۱۷۱۳ء) اسے سات ہزاری کے منصب پر سرفراز کیا اور دکن کا صوبہ دار بنا دیا - اس کے ساتھ خان خانان نظام الملک بہادر فتح جنگ کے خطاب سے نوازا - لیکن دربار میں جماعتی کشمکش کے سبب اسے اسی سال کے آخر میں اس جگہ سے مراد آباد تبدیل کر دیا گیا - فرخ سیر کا عہد ختم ہونے کے بعد رفیع الدرجات کے زمانے میں اسے مالوہ بھیجا گیا - یہاں اس نے کچھ طاقت مجتمع کی ، جس کے سبب سید برادران (سادات بارھہ) اس سے کچھ بدگمان ہو گیے - اور انھوں نے اس کی تبدیلی کے احکام صادر کر دئے - لیکن اس نے احکام پر عمل کرنے کی بجائے باقاعدہ مقابلے کی ٹھانی - چناں چہ اس نے دو ایک دیگر سرداروں کے علاوہ حسین علی (اس کا ذکر سادات بارھہ کی ذیل میں ملاحظہ ہو) کو مروا دیا ، جس کے باعث سید برادران کا زور ٹوٹ گیا ، اور آصفجاہ نے ۱۷۲۰ء کے آخر میں دکن پر پھر قبضہ کر لیا - ۱۱۳۴ھ (فروری ۱۷۲۲ء) میں محمد شاہ بادشاہ نے اسے دکن سے طلب کر کے خلعت وزارت سے نوازا ، لیکن درباریوں کی ریشہ دوانیوں کے سبب اس کا دل دربار سے آچاٹ ہو گیا ، اور وہ بادشاہ کی اجازت لیے بغیر ہی دسمبر ۱۷۲۳ء (۱۱۳۶ھ) میں دکن روانہ ہو گیا - بادشاہ نے درباریوں کے آکسانے پر حیدر آباد کے ناظم مبارز خان کو خفیہ طور پر لکھا کہ نظام الملک سے جنگ کی جائے - نظام الملک نے نہ صرف اسے شکست (۱۱ اکتوبر ۱۷۲۴ء) دے کر قتل کروایا ، بلکہ بادشاہ کو بالواسطہ اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ دکن میں اس کی حکمرانی کو تسلیم کر لے اور اسے آصف جاہ کا خطاب دے - گویا اسی وقت سے دکن میں اس کی خود مختاری کا آغاز ہوتا ہے -

۱۱۵۰ھ میں جب محمد شاہ نے نادر شاہ ابدالی کے آنے کی خبر سنی تو اس نے نظام الملک کو 'بہ مبالغۂ تمام' دکن سے طلب کیا ۔ چناں چہ اس نے اپنے بیٹے نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر کو وہاں چھوڑا اور خود دھلی کی طرف آیا ۔ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کے ساتھ جو جنگ ہوئی اس میں وہ موجود تھا ۔

مؤلف مفتاح التواریخ کے مطابق اس نے ایک سو چار برس کی عمر میں ۳ جمادی الآخر ۱۱۶۱ھ کو بہ مقام برھان پور وفات پائی ۔ 'این ایڈو انسڈ ھسٹری آف انڈیا' کے مؤلفین کا کہنا ھے کہ وہ ۲۱ مئی ۱۷۴۸ء کو بہ عمر ۹۱ برس فوت ھوا ۔ اسے شاہ برھان الدین غریب کے مرقد کے پائین سپرد خاک کیا گیا ۔

آصف جاہ نے دکن میں اپنے دور حکومت میں برھان پور کی فصیل تعمیر کرائی ۔ اس نے جس قابلیت سے سلطنت کے نظم و نسق کو چلایا ، مؤرخین اِس کی بے حد تعریف کرتے ھیں ۔

(این ایڈوانسڈ...صفحہ ۵۳۶—۵۳۸ ، مفتاح التواریخ صفحہ ۳۲۷-۳۲۹)

۱۳ ۔ ناصر جنگ ۔ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ ۔ نواب نظام‌الملک کا دوسرا بیٹا تھا ۔ ۱۱۶۱ھ میں باپ کی وفات کے بعد دکن کی ''مسند ریاست'' پر بیٹھا ۔ ۱۱۶۳ھ میں اس کے بھانجے مظفر جنگ نے بغاوت کی ، تو ناصر جنگ اس کی سرکوبی کے لیے اراکاٹ پہنچا ۔ اس کے بھانجے نے فرانسیسیوں کی مدد سے اس کے ساتھ جنگ کی ، لیکن شکست کھائی ۔

اس کے کچھ عرصہ بعد افغانوں اور فرانسیسیوں نے مظفر جنگ کے ساتھ مل کر شورش برپا کی ، اور ۱۷ محرم ۱۱۶۴ھ کو شب خون مار کر اسے شہید کر دیا ۔ یہ واقعہ پھول چری سے ۲۰ کوس کے فاصلے پر قلعہ جنجی کے قریب در پیش آیا ۔ اس کی لاش اورنگ آباد لا کر شاہ برھان الدین غریب کے مرقد کے پائین اور نواب آصف جاہ کے مرقد کے قریب دفن کی گئی ۔ اس نے دو سال سات ماہ اور چند روز حکومت کی ۔
(مفتاح التواریخ ، صفحہ ۳۳۲)

۱۴ - مظفر جنگ - هدایت محی‌الدین خاں مشهور به مظفر جنگ - ناصر جنگ کا همشیره زاده تها - ناصر جنگ کی شهادت کے بعد افغانوں اور فرانسیسیوں نے اسے 'مسند ریاست' پر بٹهایا - اس لحاظ سے ممالک اسلام میں انگریزوں کے تسلط کی ابتدا مظفر جنگ هی کی وساطت سے هوئی - اسے یه حکومت راس نه آئی یعنی ناصر جنگ کی وفات کے دو هی ماه بعد، ۱۷ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو انهی افغانوں کے هاتهوں ایک جنگ میں مارا گیا - اتفاق کی بات جس روز یه جنگ واقع هوئی اس روز مقتولین کو دفن کرنے کی کسی کو فرصت نه ملی - دوسرے دن انهیں میدان جنگ سے آٹها کر جنگل میں دفن کیا گیا - (ایضاً صفحه ۳۳۴)

۱۵ - صلابت جنگ - سید محمد خاں صلابت جنگ، آصف جاه نظام الملک کا تیسرا بیٹا تها - (آصف جاه کا ذکر اس سے پہلے گزر چکا ہے) - مظفر جنگ کے مارے جانے کے بعد فرانسیسیوں اور افاغنه نے صلابت جنگ کو مسند ریاست دکن پر بٹهایا - ۱۱ ذی الحجه ۱۱۶۴ھ کو بالا جی راؤ مرهٹه کی بیخ کنی کے لیے اورنگ آباد سے پونا کی طرف متوجه هوا - بالا جی راؤ پچاس هزار سوار لے کر مقابله میں آیا - لیکن صلابت جنگ نے لڑائی کرتے هوئے اسے پونا کے قریب پهنچا دیا، اور راستے میں مرهٹوں کی جتنی آبادیاں تهیں، سب کو جلا کر خاک برابر کر دیا - اس جنگ میں فرانسیسیوں نے جو صلابت جنگ کی ملازمت میں تهے، مرهٹوں پر توپوں سے بے پناه گوله باری کی - ۱۴ محرم ۱۱۶۵ھ کو جب که پورا چاند گرهن تها اور مرهٹه لشکری اپنے اکثر سرداروں کے ساتھ اس خاص وقت کی پرستش میں مشغول تهے، انهوں نے شب خون مارا، اور مرهٹوں کو پسپا هونے پر مجبور کر دیا - بعد میں فریقین میں صلح هوگئی -

اس نے گیاره سال حکومت کی - ۴ ذی الحجه ۱۱۷۵ھ کو اس کے بهائی نظام علی خاں نے اسے قید کر دیا، جهاں وه ایک سال تین ماه چھ روز ره کر ۲۰ ربیع الاول ۱۱۷۷ھ کو وفات پا گیا اور شیخ محمد ملتانی کے مزار کے قریب مدفون هوا - (مفتاح التواریخ صفحه ۳۴۵، ۳۴۶)

۱۶- موشیر بوسی (مسٹر بسے) Castelnau, Charels Joseph Patissier Marquies De Bussy. فرانسیسی افسر تھا - ۱۷۳۶ء میں ایک مہم کے سلسلے میں وارد ہند ہوا - بڑا ذی اثر تھا - اسی کے اثر و رسوخ کے سبب صلابت جنگ کو ۱۷۵۱ء میں مظفرجنگ کی وفات کے بعد نظام حیدر آباد بنایا گیا - اس نے نظام کے لیے ایک آدھ لڑائی بھی لڑی جس میں دشمن کو شکست دی ، لیکن بعد میں حسد کے سبب اسے ۱۷۵۶ء میں نظام کے علاقے سے نکل جانے کا حکم ملا - جلد ھی اس نے اپنی پہلی قوت حاصل کر لی - ۱۷۵۷ء میں جب سراج‌الدولہ ، ناظم مرشد آباد نے اس سے مدد مانگی تو اس نے انکار کر دیا -

اس نے وزیگا پٹم کے علاوہ انگریزوں کے کئی دیگر چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کیا ، اور صلابت جنگ کو دولت آباد واپس لے کر دیا - کچھ عرصہ بعد لالی ، فرانس کے نئے گورنر جنرل مقیم پانڈی چری نے اسے واپس بلا لیا - جنوری ۱۷۶۰ء میں جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان وندواش کے مقام پر لڑائی ہوئی تو بسے انگریزوں کے ھاتھ گرفتار ھوا (اس لڑائی میں میجر کوٹ نے لالی کو شکست دی تھی) - پانڈی چری پر انگریزوں کا قبضہ ہونے کے بعد اسے ۱۶ جنوری ۱۷۶۱ء کو رھا کردیا گیا - اس کے بعد ھندوستان میں ۱۷۸۳ء تک اس کے حالات کا پتا نہیں چلتا - اس سال (۱۷۸۳ء) وہ انگریزوں کے خلاف فرانسیسیوں کو جو ایک جگہ محصور ہو گئے تھے ، کمک پہنچانے کے لیے یہاں فرانسیسی فوج کے ساتھ آترا - جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان صلح کا معاھدہ ھوا تو اس نے سلطان ٹیپو کی مدد سے ھاتھ کھینچ لیا -

کہتے ھیں ھندوستان میں اس نے خوب دولت حاصل کی - ڈوپلے اس کی بڑی قدر کیا کرتا تھا - جنوری ۱۷۸۵ء میں اس نے بہ مقام پانڈی چری وفات پائی - (ڈکشنری آو انڈین بیوگرافی ، صفحہ ۶۴،۶۵)

۱۷- فراس ڈانگہ - فراس ڈانگہ یا فرانس ڈانگہ ، چندر نگر کا پرانا نام ھے ، جہاں فرانسیسی آبادی تھی - یہ جگہ کلکتہ سے ۲۰،۳۰ میل پچھم کی طرف ھے - (مغل اور اردو از سید نصیر حسین خاں خیال صفحہ ۹۹)

۱۸ - موشیر لاس (غالباً اس سے مراد مسٹر لالی ہے) Thomas Arthur Lally, Count De—and Baron De Tollen Dal.
فرانسیسی جرنیل تھا - ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوا - اس کا باپ ایک جلا وطن آئرش تھا -

۱۷۴۳ء میں فرانس اور آسٹریلیا کے درمیان فلپس برگ کے مقام پر جو جنگ ہوئی، اس میں نمایاں کام کیا- ۱۷۴۵ء میں غالباً بہ طور جاسوس کے انگلستان گیا - مئی ۱۷۵۶ء میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے درمیان اعلان جنگ ہوا تو اسے بہت بڑا افسر مقرر کیا گیا - پھر ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کی فرانسیسی مہم کو چلانے کے لیے اسے وہاں گورنرجنرل اور سپہ سالار بنا کر بھیجا گیا - اپریل یا مئی میں پانڈی چری پہنچا، اور فوراً ہی کڈولور، قلعہ سینٹ ڈیوڈ اور دیو کوٹا پر قبضہ کر لیا - پھر تنجور پر کامیاب حملہ کیا، اور اکتوبر ۱۷۵۸ء میں اراکاٹ لے لیا - یہاں بسے اس سے آ کر مل گیا - ۱۲ دسمبر ۱۷۵۸ء کو مدراس کا محاصرہ کیا، لیکن فروری ۱۷۵۹ء میں انگریزوں کو کمک پہنچ جانے کے سبب واپس چلا گیا - ۲۲ جنوری ۱۷۶۰ء کو وندواش کے مقام پر آئرکوٹ سے شکست کھائی اور دیگر شہر بھی ہاتھ سے گنوائے- مئی ۱۷۶۰ء میں کوٹ کے ہاتھوں پانڈی چری میں محصور ہو گیا اور ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا - اس طرح ہندوستان میں فرانسیسی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا - لالی کو جنگی قیدی بنا کر مدراس اور پھر انگلستان بھیجا گیا - جب فرانس واپس پہنچا تو اس پر شاہ فرانس کے مفادات کو نقصان پہنچانے کے جرم میں مقدمہ چلایا گیا - اڑھائی سال مقدمہ چلتا رہا - آخر ۹ مئی ۱۷۶۶ء کو سزائے موت کا حکم ہوا اور اسی دن اسے پھانسی دے دی گئی -

(ڈکشنری آو انڈین بیوگرافی صفحہ ۲۴۲، ۲۴۳)

۱۹ - میر جعفر - جعفر علی خاں ۱۶۹۱ء میں پیدا ہوا- علی وردی خاں کے خاندان میں پرورش پائی - پہلے مہابت جنگ کے یہاں داروغۂ باورچی خانہ تھا - رفتہ رفتہ ترقی کی - پھر علی وردی خاں نے اسے

اپنی افواج کا سپہ سالار بنایا ۔ اس کی وفات کے بعد جب سراج الدولہ مسند نشین ہوا تو اس وقت بھی اس عہدے پر رہا ۔ لیکن جلد ہی اس نے سراج‌الدولہ کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کی ۔ چناں چہ جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) میں اگرچہ وہ موجود تھا ، لیکن اس نے بالکل علیحدگی اختیار کیے رکھی ، جس کے نتیجے میں سراج الدولہ نے انگریزوں سے شکست کھائی اور فرار ہوگیا ۔ جب جعفر کے بیٹے میرن نے سراج‌الدولہ کو قتل کیا تو اسے (جعفر) جون ۱۷۵۷ء میں بنگال ، بہار اور اڑیسہ کا نواب بنا دیا گیا ۔ ۱۷۵۹ء میں اس نے انگریزوں کو نکالنے کے لیے ولندیزیوں کے ساتھ سازش کی ، لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور نتیجے کے طور پر اسے مسند سے آتار دیا گیا اور اس کا داماد میرقاسم اس کا جانشین بنا ۔ ۱۷۶۳ء میں جعفر پھر نواب بنا دیا گیا ، اور میرقاسم سے مسند چھین لی گئی ۔ ۱۷۶۵ء تک اس نے خاموشی سے حکومت کی ۔

جنوری ۱۷۶۵ء میں کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو کر وفات پائی اور مرشد آباد میں دفن ہوا ۔

یہ وہی شخصیت ہے جسے حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے ''ننگ آدم ننگ دیں ننگ وطن'' کے الفاظ سے یاد کیا ہے ، اور بہ قول ان کے ملک و ملت سے غداری کرنے والی یہ وہ روح رذیلہ ہے جسے دوزخ نے بھی قبول نہیں کیا ۔ 'جاوید نامہ' میں 'فلک زحل' کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ یہ جگہ ۔

منزل ارواح بے یوم النشور ‌‌ دوزخ از احراق شان آمد نفور
اندرون او دو طاغوت کہن ‌‌ روح قومے کشتہ از بہر دو تن
جعفر از بنگال و صادق از دکن ‌‌ ننگ آدم ، ننگ دیں ، ننگ وطن
نا قبول و نا امید و نا مراد ‌‌ ملتے از کار شان اندر فساد

علاوہ ازیں ہر مؤرخ نے اسے غدار کے لفظ سے یاد کیا ہے ۔ اس کی غداری تاریخ میں ایک ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ۔ بک لینڈ نے اسے غاصب حکومت بنگالہ لکھا ہے ۔ بہ قول اسٹورٹ جعفر

کو لوگ 'کلائیو کا گدھا' کہا کرتے تھے، اور مرتے دم تک وہ اسی نام سے یاد کیا گیا۔

(ڈکشنری آو انڈین بیو گرافی صفحہ ۲۹۲۔ جاوید نامہ از اقبال، طبع دوم صفحہ ۱۶۶ ۔ سراج الدولہ، صفحہ ۲۱۰۔ مغل اور اردو، صفحہ ۱۰۰۔)

۲۰۔ امین چند۔ امین چند یا آومی چند یا امیر چند۔ پنجاب کا باشندہ اور نانک پنتھی تھا۔ شروع میں کلکتہ کے سیٹھ مانک چند وغیرہ کے یہاں ملازم ہوا۔ اس فرم کی ملازمت کے دوران خاصی دولت کما لی اور پھر اپنا علیحدہ کاروبار شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بڑا ٹھیکیدار بن گیا، اور بے پناہ دولت اکٹھی کی۔ کلکتہ میں بیش‌تر عمدہ مکانات اس کی ملکیت تھے۔ ۱۷۵۷ء میں جب انگریزوں نے میر جعفر وغیرہ سے مل کر سراج الدولہ کو مسند سے آتارنے کی سازش کی تو آومی چند چوں کہ اس سازش سے آگاہ تھا، اس نے خاموش رہنے کے لیے انگریزوں سے تیس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا۔ کلائیو نے اس سلسلے میں اس سے چال چلی اور دو عہد نامے، ایک اصلی اور ایک نقلی، تیار کیے۔ دستخطوں کے موقع پر اسے نقلی عہد نامہ دکھایا گیا۔ جس میں مذکورہ انعام کا ذکر تھا، جب کہ اصلی عہد نامہ اس سے خالی تھا۔ کلائیو نے اول الذکر پر ایک رکن کے دستخط بھی جعلی کروا لیے تھے۔ جنگ پلاسی کے بعد اسے اصلی عہد نامہ دکھایا گیا۔ کہتے ہیں جب اسے اس فریب کا پتا چلا تو وہ غش کھا کرگر پڑا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

۵ دسمبر ۱۷۵۸ء کو مالدہ کے مقام پر اس کی موت اچانک واقع ہوئی۔

(ڈکشنری آو انڈین بیوگرافی صفحہ ۳۲۲، ۳۲۳۔ مغل اور اردو از نصیرحسین خیال صفحہ ۱۰۰)

۲۱۔ کرنل کایف (کلائیو) ثابت جنگ Robert Baron Clive بنگال کا گورنر۔ باپ کا نام رچرڈ کلائیو تھا۔ ۲۹ ستمبر ۱۷۲۵ء کو

پیدا ہوا ۔ 'کو سٹاک' وغیرہ میں تعلیم حاصل کی ۔ جوانی میں بڑا حوصلہ مند ، شجاع اور مہم جو تھا ۔ ۱۷۴۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سول سروس میں کلرک بھرتی ہو کر مدراس پہنچا ۔ یہاں سے کچھ عرصے کے بعد بھاگ کر قلعہ سینٹ ڈیوڈ چلا گیا ۔ ۱۷۴۸ء میں فوج کی ملازمت اختیار کی ۔ ۱۷۴۹ء میں اس نے 'دیو کوٹا' کے مقام پر والئی تنجور کی طرف سے لڑائی لڑی ۔ ۳۱ اگست ۱۷۵۱ء کو اس نے اراکاٹ پر قبضہ کیا ۔ بعد میں فرانسیسیوں نے اس کا محاصرہ کر لیا اور وہ قلعہ اراکاٹ میں ۵۰ روز تک محصور رہا ۔ لیکن پھر دشمنوں کو بھگانے میں کامیاب ہو گیا ۔ ۱۷۵۲ء میں کوبری پک کے مقام پر فرانسیسیوں اور راجہ صاحب کو شکست دی ۔ پھر ترچناپلی کے قریب فرانسیسی افواج پر فتح پائی ۔

۱۷۵۳ء میں انگلستان جانے لگا تو اس کی بڑی عزت ہوئی اور کمپنی کی جانب سے اسے بے حد قیمتی تحفے دیے گئے ۔ ۱۷۵۶ء میں انگلستان سے لیفٹیننٹ کرنل ہو کر آیا ۔ ۱۳ فروری ۱۷۵۶ء کو 'گھیریا' (بمبئی) پر قبضہ کیا ۔ ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو قلعہ سینٹ ڈیوڈ کا نائب ناظم بنا کر بھیجا گیا ۔ اس سال کے آخر میں بنگال روانہ ہوا اور سراج‌الدولہ سے کلکتہ اور ہگلی چھینا ۔ بعد میں سراج الدولہ کو شکست دی اور چندر نگر پر قابض ہوا ۔

اومی چند (جسے اس نے جعلی دستاویز تیار کرکے معہودہ رقم دینے سے اجتناب کیا) کی وساطت سے میر جعفر سے سازباز کی اور سراج الدولہ کے ساتھ پلاسی کے مقام پر جنگ کر کے ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو اسے شکست دی ، اور میر جعفر کو نواب بنا کر اس سے خاصی دولت بٹوری ۔ پھر بنگال کا گورنر بنا دیا گیا ۔

۱۷۶۰ء میں انگلستان چلا گیا ، جہاں ۱۷۶۲ء میں اسے ''بیرن (امیر) کلائیو آو پلاسی'' بنایا گیا ۔ ۱۷۶۴ء میں کے ، سی ، بی بنا ۔ ۱۷۶۵ء میں پھر ہندوستان آیا اور ۳ مئی کو دوبارہ گورنر بنگال اور سپہ سالار مقرر ہوا ۔ ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو شاہ عالم سے دیوانی

حاصل کی ۔ شجاع الدولہ کو اودھ واپس کیا اور کئی ایک اصلاحات کیں ۔ ۱۷۶۷ء میں ریٹائر ہو کر انگلستان لوٹ گیا ۔ آخر میں بیماریوں نے اسے آ لیا تھا ، جن سے تنگ آ کر ۲۲ نومبر ۱۷۷۴ء کو اس نے خود کشی کر لی ۔ لیکن بعض کا کہنا ہے کہ اس کی موت افیون کی زیادہ خوراک کھا لینے سے واقع ہوئی تھی ۔ (اس نے غم غلط کرنے کے لیے آخری دنوں میں افیون کا استعمال شروع کر دیا تھا)

(ڈکشنری آو انڈین بیوگرافی صفحہ ۸۵ ، ۸۶) ۔

۲۲ ۔ محمد صادق خاں ۔ محمد صادق خاں عرف میرن ، میر جعفر کا بیٹا اور شاہ خانم کے بطن سے تھا، جو علی وردی خان کی سوتیلی ہمشیرہ یا بہ قول مؤلف 'سراج الدولہ' غالباً اس کی کوئی ملازمہ تھی ۔ میرن ہر لحاظ سے اپنے باپ کا نقش ثانی تھا ۔ ظلم و ستم ، قتل و غارت گری اور اسی قسم کے دیگر فعل گویا اس کی گھٹی میں پڑے تھے ۔ سراج الدولہ کو بھی اسی نے قید کرکے بعد میں قتل کرا دیا تھا ۔ بہ قول محمد عمر ''اس کے عندیے میں رحم و انصاف صرف معاملے کو بگاڑ دیتے ہیں اور کسی مصرف کے نہیں ۔ ایسے جذبات اس کی نگاہ میں قابل نفرت تھے ۔ باوصف ان باتوں کے وہ اپنے آپ کو بہت فہمیدہ ، مدبر اور علی وردی خان ثانی خیال کرتا تھا'' ۔

اس کا حشر بہت برا ہوا ۔ جب شاہ زادہ عالی گوہر نے بنگالہ کی طرف لشکر کشی کی تو پورنیہ کا صوبہ دار خادم حسین ، جو میرن کا دوست بھی تھا ، شاہ زادے سے مل گیا ۔

میرن کو کلائیو کے ہمراہ اس (خادم) کے مقابلے کے لیے عظیم آباد جانا پڑا ۔ ان کے وہاں پہنچنے پر خادم حسین خاں بھاگ گیا ۔ دوسرے دن بہت بارش ہوئی اور فوج کو رکنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ رات کے دس بجے ، جب کہ شدید بارش ہو رہی تھی وہ ، اپنے بڑے خیمے کو چھوڑ کر کسی دوسرے خیمے میں سونے کے لیے چلا گیا ۔ وہاں پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد آسمان سے خوف ناک کڑک کے ساتھ بجلی اس کے سر پر پڑی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا ۔ اس کی لاش بستر پر پائی

گئی ، جس سے معلوم ھوتا تھا کہ وہ ذرہ بھر حرکت نہ کر سکا ۔ صبح جب اس کی لاش کو دیکھا گیا تو اس کے سر میں چھ شگاف تھے اور پشت اور پیٹ پر سات ضربات تھیں ، جو ایسی معلوم ھوتی تھیں جیسے کسی نے غصے میں آ کر چابک سے لگائی ھیں ۔ جو تلوار اس کے سرھانے پڑی تھی ، اس میں بھی شگاف پڑ گئے تھے اور پلنگ چھلنی ھو گیا تھا ۔

(سراج الدولہ از محمد عمر (نور الٰہی) مطبوعہ انجمن ترقی اردو دھلی صفحہ ۲۰۲ ، ۲۰۳ ، ۲۰۵ ، ۲۲۷ ۔ مغل اور اردو صفحہ ۱۰۰ ۔)

۲۳ ۔ مہابت خاں ۔ محمد ابراھیم نام ۔ شروع شروع میں جب وارد ھند ھوا تو سید ابوالحسن والی حیدر آباد کی سرکار میں ملازم ھوا ، اور ترقی کرتے کرتے فوج کے اعلٰی عہدے پر پہنچا ۔ سید ابوالحسن کے وزیر اعظم پنڈت دانا ، جو اصل میں کرتا دھرتا تھا ، کے یہاں اس کی بڑی قدر ھوئی اور خلیل اللہ خاں کا خطاب ملا ۔ آخر میں مذکورہ پنڈت سے چشمک کے سبب دربار عالمگیر کا رخ کیا ۔ یہاں چھ ہزاری منصب اور مہابت خاں کا خطاب ملا ۔ کچھ عرصہ برار کی صوبہ داری پر مامور رھا ۔ اس کے بعد پنجاب کی حکومت پر سرفراز ھوا ۔

عالمگیر کے ۳۳ سال جلوس میں وفات پائی ۔

(بہ حوالہ وقائع عالمگیر مرتبہ چوھدری نبی احمد سندیلوی حاشیہ صفحہ ۹۳) ۔

۲۴ ۔ (۱) اے بڑے آدمی چھوٹوں کو اپنی طاقت کا نشانہ نہ بنا کہ زمانہ ھمیشہ ایک جیسا نہیں رھتا ۔

(۲) دیکھ لوگوں کے پاؤں نہ کھینچ کہ اگر تو گر گیا تو تو عاجز ھو جائے گا (کوئی بھی تجھے اٹھانے والا نہ ھوگا) ۔

(۳) دوستوں کی دل جمعی دولت سے بڑھ کر ھے ۔ رعایا کو تکلیف پہنچنے سے بہتر ھے کہ خزانہ خالی رھے ۔

(۴) کسی کے کام (؟) کو پاؤں میں نہ ڈال کہ ھو سکتا ھے تو اس کے پاؤں میں کئی مرتبہ گرے ۔

(۵) دشمن کو حقیر نہ جاننا چاہیے کہ بڑے بڑے پہاڑوں کو میں نے پتھر سے چور ہوتے دیکھا ہے ۔

(٦) کیا تو نہیں دیکھتا کہ جب چیونٹیاں اکٹھی ہو جاتی ہیں تو جنگی شیروں کو بھی ناک چنے چبوا دیتی ہیں ۔

(۷) ایک بال بھی ریشم کے تار سے کم نہیں ہے ۔ جب یہ اکھٹے باندھے جاتے ہیں تو زنجیر سے بھی زیادہ مضبوط ہو جاتے ہیں ۔

۲۵ ۔ راجہ رام نرائن ۔ بہار کا رھنے والا تھا ۔ علی وردی خان مہابت جنگ نے اسے بنگال کا نائب گورنر بنایا تھا ۔ سراج الدولہ کے دور میں بھی اس عہدے پر مامور رھا ۔ جنگ پلاسی کے بعد کلائیو نے میجر کوٹ کو ۱۷۵۷ء میں اس سے حکومت بہار چھیننے کے لیے بھیجا ۔ اس نے کلائیو کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا جس کے سبب اسے اپنے عہدے پر رھنے دیا گیا ۔

کچھ عرصے بعد میر جعفر نے کوشش کی کہ اسے ہٹا دیا جائے ، لیکن اس مرتبہ بھی یہ کسی نہ کسی طرح بچ گیا ۔ دسمبر ۱۷۵۹ء میں جب شاھزادہ عالی گوھر (عالم شاہ) نے نواب بنگالہ کے خلاف لشکر کشی کی تو رام نرائن نے پٹنہ کے مقام پر اس سے جنگ کی ، لیکن شکست کھائی ۔ پھر جلد ھی انگریزوں نے (۱۷٦۰ء میں) اسے کمک پہنچائی ، جس کے باعث وہ شاھی فوجوں کو بھگانے میں کامیاب ھو گیا ۔ اسی سال جب میرقاسم نواب بنگالہ بنا تو اس نے اسے ہٹا دیا اور بعد میں اسے گرفتار کرکے لوٹ لیا ۔

۱۷٦۳ء میں جب انگریزوں نے میر قاسم کے خلاف لشکر کشی کی اور پٹنہ کی طرف متوجہ ہوئے تو اس (قاسم) کے حکم سے اسے (رام نرائن) اگست ۱۷٦۳ء میں دریائے گنگا میں ڈبو دیا گیا ۔
(ڈکشنری آف انڈین بیو گرافی صفحہ ۳۴۸)

۲٦ ۔ میجر کوٹ (Sir Eyre Coote) ۔ ۱۷۲٦ء میں پیدا ھوا ۔ ۱۷۴۵ء میں فوج میں ملازمت اختیار کی ۔ ۱۷۵۴ء میں ۳۹ رجمنٹ کے

ساتھ اسے ہندوستان بھیجا اور ۱۷۵۵ء (جون ۱۸) میں کیپٹن بنایا گیا۔ جب سراج الدولہ نے کلکتہ پر قبضہ کر لیا تو انگریزوں نے اس کے مقابلے کے لیے جو فوج مدراس سے بنگال بھیجی، اس میں مذکورہ رجمنٹ کی بھی کچھ فوج تھی۔ جب کلکتہ پر انگریزوں نے دوبارہ قبضہ کر لیا، چندر نگر کی تسخیر کی اور جنگ پلاسی میں (۲۳ جون ۱۷۵۷ء) فتح پائی تو ان تمام مواقع پر کوٹ موجود تھا۔

جنوری ۱۷۵۹ء میں وہ ۸۴ رجمنٹ کا گزیٹڈ لیفٹیننٹ کرنل بنا دیا گیا اور مدراس کی افواج کی کمانڈ اس کے سپرد ہوئی۔ کوٹ نے فرانسیسیوں کو بھی کئی ایک موقعوں پر شکست دی اور کئی علاقوں کو فتح کیا۔ چناں چہ جنوری ۱۷۶۱ء میں جب انگریز پانڈی چری پر متصرف ہو گئے تو اس کے سبب ہندوستان میں فرانسیسیوں کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہو گئی۔

۱۷۶۲ء میں وہ انگلستان واپس چلا گیا۔ ۱۷۶۵ء (اپریل) میں کرنل بنایا گیا۔ ۱۷۶۹ء میں دوبارہ افواج مدراس کی کمانڈ پر مامور ہوا، لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد مستعفی ہو کر اکتوبر ۱۷۷۰ء میں انگلستان لوٹ گیا، جہاں ۳۱ اگست ۱۷۷۱ء کو اسے کے بی (K.B.) بنا دیا گیا۔ ۲۹ ستمبر ۱۷۷۵ء کو میجر جنرل بنا۔ ۲۹ اگست ۱۷۷۷ء کو لیفٹیننٹ جنرل اور اس کی تھوڑی ہی مدت بعد افواج ہند کا سپہ سالار (کمانڈر ان چیف) ہوا۔

۱۷۸۱ء میں اس نے حیدر علی والئی میسور کے خلاف لڑائی میں فتح حاصل کی۔ بعد میں خرابئی صحت کے سبب استعفیٰ دے کر تبدیلی آب و ہوا کی خاطر کلکتہ چلا گیا۔ قدرے افاقہ ہوا تو پھر مدراس کا رخ کیا (۱۷۸۳ء)۔ راستے میں فرانسیسیوں نے اس کا پیچھا کیا، جس کی وجہ سے وہ پریشانیوں کا شکار ہوا، اور بیماری عود آئی۔ چناں چہ مدراس پہنچنے کے دو ہی دن بعد ۲۸ اپریل ۱۷۸۳ء کو راہئی ملک عدم ہوا۔ نعش انگلستان لے جا کر راک برن (ہیمپ شائر) میں دفن کی گئی۔

(ڈکشنری آو انڈین بیوگرافی از سی۔ ای بک لینڈ، لندن صفحہ ۹۳)

میر تقی میر (صفحہ ۵۸۴)

۱-میر تقی میر- میر محمد تقی نام، میر تخلص- والد کا نام عبداللہ عرف علی متقی- خود بہ قول میر، ان کے آبا و اجداد کا تعلق حجاز سے تھا- پہلے وہ لوگ ہندوستان میں دکنی ساحلوں کی طرف وارد ہوئے اور وہاں سے پورا قبیلہ احمد آباد (گجرات) میں آ کر بس گیا- وہاں سے ان کے جد امجد اکبرآباد (آگرہ) آ گئے- میر کی ولادت (۱۱۳۷ھ) بھی آگرہ ہی میں ہوئی- ابوالعلا ناطق نے ۱۱۳۵ھ (۱۷۲۳ء) لکھا ہے-

دس برس کے تھے کہ والد وفات پا گئے- اس وقت مالی حالت ٹھیک نہ تھی- کچھ بڑے بھائی نے طوطا چشمی کی- آخر مجبور ہو کر دہلی کا رخ کیا- یہاں صمصام الدولہ کے ہاں سے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ مقرر ہوا، جو نادر شاہی حملے تک ملتا رہا- دہلی سے آگرہ جانے کا ذکر میر نے نہیں کیا البتہ وہاں سے دوبارہ دہلی آنے کا ذکر کیا ہے- دوسری مرتبہ وارد دہلی ہوئے تو اپنے بڑے بھائی (میر کے والد کی پہلی بیوی سے تھے) کے ماموں سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس ٹھہرے- خود میر نے آرزو کو اپنے بڑے بھائی کا ماموں لکھا ہے، لیکن اس کے متعلق تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے- کسی کے مطابق ''آرزو آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے'' اور کسی کے مطابق خالو تھے- بیش تر نے انہیں میر کا ماموں لکھا ہے اور بہ قول حسن وہ میر کے چچا تھے- بہرحال میر کی بات زیادہ مستند ہے- کچھ عرصہ ان کے زیرتربیت رہے- بہ قول آزاد ''خان آرزو کے پاس انہوں نے اور ان کی شاعری نے پرورش پائی''- فارسی میں استعداد اچھی بہم پہنچائی، بعد میں آرزو سے نہ بن سکی- اس کی وجہ بہ قول میر ان کے بڑے بھائی کا اپنے ماموں کو ان کے خلاف اکسانا تھا- اسی دوران میں میر کو جنون ہو گیا، جو چند ماہ کے بعد رخصت ہوا- میر کے مطابق کسی سید سعادت علی نے انہیں ریختہ میں شعر کہنے کی ترغیب دی-

مؤلف تذکرۂ گلشن ہند کے مطابق میر نے ۱۱۹۷ھ میں (جب احمد شاہ ابدالی کے حملوں اور اندرونی خلفشار کے سبب دہلی میں ہنگامے

اورشورشیں برپا تھیں) دہلی کو خیرباد کہا اور لکھنؤ پہنچے، لیکن آزاد نے ۱۱۹۰ھ لکھا ہے۔ لکھنؤ میں آصف الدولہ کے یہاں ملازم ہوئے اور تین سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ ٹھہرا۔ (مؤلف مجموعۂ نغز کے مطابق دو سو روپیہ)۔ نواب کے مرنے کے بعد دیوان مہانرائن کی ملازمت اختیار کی۔ اپنی زود رنجی کے سبب یہ ملازمت بھی ترک کی اور احمد شاہ کے یہاں چلے گئے۔ پھر مہا راجہ ناگرمل کے بیٹے سے متوسل ہوئے، اور اسی طرح یکے بعد دیگرے کئی اور امرا وغیرہ کے یہاں ملازمت اختیار کی۔ مؤلف نظم اردو کے مطابق 'سوائے لکھنؤ کے ہر جگہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہے'۔ ۱۲۲۵ھ (۱۸۱۰ء) میں لکھنؤ ہی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ مشہور شاعر ناسخ نے تاریخ وفات کہی:

"واویلا مرد شہ شاعراں"

بہ قول ناطق "لکھنؤ میں وہاں دفن ہوئے جہاں اب اسٹیشن ڈیوڑھی آغا میر کے قریب ریل کا آہنی پل اور تکیہ ہے۔ اس جگہ کو پہلے بھیم اکھاڑہ کہتے تھے"۔

میر ذات کے سید تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے کئی اشعار میں کیا ہے۔ مثلاً:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی

لیکن تذکرۂ شورش کے مؤلف کا کہنا ہے کہ سید نہ تھے بلکہ میرتخلص ہونے کی وجہ سے سید خیال کیے جانے لگے، مگر رام بابوسکسینہ اس کی اس دلیل کو صحیح نہیں مانتے۔

میر دیر آشنا، زود رنج تھے۔ ان کی بد دماغی مشہور ہے۔ اس کا ذکر تذکرہ نگاروں نے مختلف طریقوں سے کیا ہے۔ مثلاً میر حسن لکھتے ہیں "بسیار صاحب دماغ ست و دماغ او را می زیبد"۔ قدرت اللہ قاسم کا کہنا ہے "ہر شعر کسے، گرہمہ اعجاز باشد وکلام شیخ شیراز (سعدیؒ) باشد، سر ہم نمی جنباند تابہ تحسین خود چہ رسد"۔ مولانا عبدالحی صاحب گل رعنا کو خود میر کی تالیف نکات الشعرا کے مطالعہ سے

جو اُن کے اوصاف نظر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ ''وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضع دار آدمی تھے۔ میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم اور وہ بھی آہستہ، آواز میں نرمی اور ملائمت، مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی۔ صلاحیت کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین، ہر وقت محویت کا عالم طاری......''

میر اردو غزل کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ تقریباً ہر شاعر، ہر تذکرہ نگار اورہر مؤرخ ادب نے انہیں اپنے اپنے انداز میں خراج عقیدت و تحسین پیش کیا ہے۔ مثلاً شیفتہ لکھتے ہیں ''فصح فصحا، اشعر شعرا سخنور عالی مقام''۔ شفیق اورنگ آبادی: ''میر میدان سخنوری و شہنشاہ اقلیم معنی پروری، سرتاج شاعران این عصر و گل سرسبد''۔

میرحسن۔ '' میر شعرائے ہندوستان و افصح فصحائے زماں، شاعر دل پزیر و سخن سنج بے نظیر ... از استادان صاحب قدرت است''۔

قائم۔ ''شمع انجمن عشق بازان، فروغ محفل سخن پردازان، جامع آیات سخن دانی، مجمع کمالات انسانی ...''۔

فتح علی حسینی گردیزی۔ ''سخن سنج بے نظیر ....''

مرزا علی لطف۔ ''نگین خاتم سخن آفرینی ...... نظم غزل میں ید بیضا رکھتا ہے''۔

مصحفی۔ ''شخص صاحب کمال است'' اور یہ کہ ''ہندوستان کے ریختہ گو اس کے کلام سے سند لاتے ہیں''۔

قاسم۔ ''سخن سنج طبع زکی''۔

غالب کہتے ہیں۔

ریختے کے تمہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

اور ذوق۔

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

بہ قول سکسینہ ''ریختہ گویان ہند کے استاد اعظم، شاعران اردو کے رہبر مسلم''۔

جناب مالک رام 'ذکر میر' کے اردو ترجمہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں :

'میر اردو شاعری کے پیامبر' نہیں 'خدا' ہیں ، اور ان کی 'خدائی' کے حضور ایسے ایسے سرکشوں نے اپنی 'بندگی' کا اظہار کیا ہے ، جن کا مسلک ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں ، بلکہ متضاد ہے......''

میر کی تصانیف میں ایک کلیات ہے ، جس میں چھ دیوان ، قصائد ، مخمسات ، مسدسات وغیرہ اور چند ایک مثنویات ہیں ۔ نثر میں ذکر میر (آپ بیتی) اور نکات الشعرا (اردو شعرا کا تذکرہ) وغیرہ فارسی میں ہیں ۔

(میر کی آپ بیتی ، ذکر میر کا اردو ترجمہ از نثار احمد فاروقی صفحہ ۱۱، ۳۱ ، ۸۶ ، ۸۹—۹۸ ۔ مخزن نکات از محمد قیام الدین قائم صفحہ ۳۰ ، ۳۱ ۔ تذکرۂ شعرائے اردو از میرحسن صفحہ ۱۵۱، ۱۵۲۔ چمنستان شعرا از لچھمی نرائن شفیق صفحہ ۲۶۱ ، ۲۶۲ ۔ تذکرۂ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی صفحہ ۲۰۴ ۔ تذکرۂ ریختہ گویان از گردیزی صفحہ ۱۳۷ ۔ مجموعۂ نغز از قدرت اللہ قاسم ، جلد دوم صفحہ ۲۲۹ ، ۲۳۰ ۔ تذکرۂ گلزار ابراہیم از ابراہیم خان خلیل مع تذکرۂ گلشن ہند از مرزا علی لطف صفحہ ۲۰۸ ، ۲۰۹ ۔ گلشن بے خار از نواب مصطفیٰ خان شیفتہ صفحہ ۲۱۰ ۔ سخن شعرا از عبدالغفور خان نساخ صفحہ ۴۷۹ ۔ آب حیات از مولانا محمد حسین آزاد مطبوعہ لاہور صفحہ ۲۰۲ ، ۲۰۳ ۔ گل رعنا از مولانا سید عبد الحی صفحہ ۱۵۰ ، ۱۵۱ ، ۱۵۹ ۔ تاریخ ادب اردو از رام بابو سکسینہ اردو ترجمہ ازمرزا محمد عسکری صفحہ ۱۴۵ ، ۱۵۲۔ نظم اردو از سید ابو العلا حکیم ناطق لکھنوی صفحہ ۱۵۲ ، ۱۵۴ ۔ دلی کا دبستان شاعری از ڈاکٹر نورالحسن صفحہ ۱۶۲ ۔ کلیات میر مرتبہ عبدالباری آسی صفحہ ۶۶۷ ۔ دیوان غالب مطبوعہ تاج کمپنی صفحہ ۳۸ ۔ دیوان ذوق مرتبہ پروفیسر کے ایم سردار مطبوعہ لاہور صفحہ ۱۴۱)

۲ - سورج مل - سورج مل جاٹ ، بدن سنگھ جاٹ کا بیٹا تھا اور بدن سنگھ ، چورامن جاٹ کا بیٹا تھا ، جو عالمگیر کے عہد میں رہزنی کیا کرتا تھا - (''این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا'' کے مؤلفین کے مطابق سورج مل ، بدن سنگھ کا لے پالک اور بدن سنگھ ، چورامن کے بھائی بھاؤ سنگھ کا بیٹا تھا) - چورامن اسی رہزنی کے سبب خاصا متمول ہو گیا تھا اور اس نے قلعہ بھرت پور (آگرہ سے چودہ کوس کے فاصلے پر) کی بنا ڈالی تھی - چورامن ، محمد شاہ کے ابتدائے عہد میں فوت ہوا ، اس کے بعد بدن سنگھ اس کا جانشین بنا - اس نے قلعہ ڈیگ تعمیر کیا - اس کے مرنے کے بعد (۷ جون ۱۷۵۶ء) سورج مل نے اس کی جگہ سنبھالی -

احمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں سورج مل نے نواب صفدر جنگ سے مل کر بہت سے علاقے شاہی سند کے ساتھ حاصل کر لیے - صفدر جنگ کے اپنے صوبے کو واپس چلے جانے کے بعد اور سلطنت کے کمزور ہونے کے باعث اس نے کئی ایک علاقے بغیر سند ہی کے بہ زور شمشیر ھتھیا لیے - پھر قلعہ اکبر آباد کو تسخیر کر لیا ، اور ڈیگ میں عمارات عالی تعمیر کیں - اس کے بیٹوں نے ، جنھوں نے صفدر جنگ کے ساتھ برادرانہ دستار بدلی کی تھی ، قلعہ اکبر آباد کے شاہی محلات وغیرہ کو تباہ کیا - کچھ عرصہ بعد سورج مل نے کوئی نو سو اسی بڑی توپیں ، ایک نادر غالیچہ اور بعض دیگر قیمتی اشیاء جنھیں شاھجہان نے دس ھزار روپیہ کی لاگت سے تیار کروایا تھا ، قلعہ آگرہ سے اٹھوا کر قلعہ ڈیگ اور بھرت پور میں رکھوا دیں - جب احمد شاہ ابدالی ، جہاندار شاہ کو باپ کی جگہ ولی عہد بنا کر واپس چلا گیا تو امیرالامرا نجیب الدولہ دھلی کو روانہ ھوا - سورج مل نے ۱۱۷۵ھ (۲۵ دسمبر ۱۷۶۳ء) میں دھلی کے قریب نجیب سے جنگ کی ، اور اسی جنگ میں وہ جہنم واصل ھوا - اس کے زمانے میں جاٹوں کو بڑی شہرت حاصل ھوئی -
(مفتاح التواریخ صفحہ ۳۴۵ - این ایڈوانسڈ......صفحہ ۵۴۲، ۵۴۳)

درگاہ قلی خان (صفحہ ۵۸۷)

۱ - درگاہ قلی خان - نواب ذوالقدر درگاہ قلی خان سالار جنگ خان دوراں ۲۹ رجب ۱۱۲۲ھ بہ مقام سنگمنیر پیدا ہوا - لڑکپن سے نہایت ذہین اور ذکی الطبع تھا - ابتدا میں اپنے والد خاندان قلی خاں کے زیر تربیت رہا ، مگر حقیقی تعلیم و تربیت نظام الملک آصف جاہ اول کے زیر نگرانی ہوئی - اکثر علوم متداولہ حاصل کیے -

آصف جاہ نے حقوق دیرینہ اور اس کی ذاتی قابلیت پر نظر کرتے ہوئے ۱۱۳۷ھ (چودھواں سال جلوس) میں اسے آبائی منصب و جاگیر سے نوازا - ساتھ ہی مصاحبت میں رہنے کا شرف بخشا ، اور بیسویں سال جلوس ہم رکاب رہنے کی عزت عطا کی - اس نے بہت سے مواقع پر جان فشانی و وفاداری کا مظاہرہ کر کے آصف جاہ کے دل میں اور بھی گھر کر لیا -

محمد شاہ کے بلانے پر جب آصف جاہ دہلی گیا تو نواب بھی اس کے ساتھ وہاں پہنچا - اس وقت اس کی عمر ۲۹ برس کی تھی - ۱۱۵۴ھ میں آصف جاہ کے ہمراہ دکن لوٹا - ۱۱۶۱ھ میں آصف جاہ کی وفات کے بعد ناصر جنگ مسند نشین ہوا تو اس کے دوسرے سال ۱۱۶۳ھ میں (۱۱ جمادی الاول کو) کوتوالیٔ اورنگ آباد کی خدمت اور فوج داری افواج بلدہ (شہر مذکور) پر مامور ہوا - منصب میں ایک سو سوار کا اضافہ پا کر محاصل پرگنہ دھاویرہ سے سرافراز ہوا -

۱۱۶۴ھ صلابت جنگ کے دور میں فیل خانہ کا داروغہ بنایا گیا - ۱۱۶۷ھ میں شش ہزاری کے اضافے ، علم و نقارہ اور موتمن الدولہ کے خطاب سے مفتخر ہوا ، اور جلد ہی اورنگ آباد کی صوبہ داری بھی مل گئی -

۱۱۷۵ھ میں آصف جاہ ثانی تخت نشین ہوا تو اس نے ذی الحجہ کے مہینے میں اسے منصب ہفت ہزاری ، خطاب موتمن الدولہ اور صوبہ داری اورنگ آباد سے سرفراز کیا - کچھ عرصہ بعد خان دوراں

کا خطاب ملا - ۱۱۷۹ھ رجب کے مہینے میں ۵ سال ۷ ماہ اس خدمت پر رہ کر سبکدوش ہوا ، اور اپنی جا گیر نظام آباد میں چلا گیا ، جہاں مرض سرسام کا شکار ہو کر ۱۸ جمادی الاول ۱۱۸۰ھ کو فوت ہوا - نعش اورنگ آباد میں لا کر مقبرہ سالار جنگی میں دفن کی گئی -

(مرقع دھلی از درگاہ قلی مطبوعہ حیدر آباد ، مقدمہ از حکیم سید مظفر حسین صفحات ۱۱ ، ۱۲ ، ۲۰ ، ۲۱ ، ۳۹ ، ۴۱ ، ۴۳ ، ۴۴ ، ۴۹ ، ۵۲ ، ۵۳)

سید احمد شہید بریلوی (صفحہ ۵۸۹)

۱ - سید احمد شہید بریلوی - مولانا سید احمد ۶ صفر ۱۲۰۱ھ (۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء) کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے - ابتدائی حالات زندگی کا پتا نہیں چلتا - اتنا کہتے ہیں کہ لڑکپن میں انہیں تعلیم سے کچھ رغبت نہ تھی ، اور مکتب میں تین چار سال گزارنے کے بعد فقط چند سورتیں قرآن پاک کی یاد کر سکے - ۱۷—۱۸ برس کی عمر میں تلاش روزگار کے لیے لکھنؤ پہنچے ، جہاں چند ماہ ایک امیر کے یہاں قیام کیا - بعد ازیں تحصیل علم کا شوق خود بہ خود پیدا ہوا - چناں چہ شاہ عبدالعزیزؒ کے پاس دھلی پہنچے - آنھوں نے مولانا کو اکبر آبادی مسجد میں اپنے بھائی شاہ عبد القادرؒ کے پاس بھیجا - یہاں انھوں نے کچھ عرصہ صرف و نحو پڑھی - قرآن پاک کا اردو ترجمہ بھی پڑھا - بائیس برس کی عمر میں شاہ عبد العزیزؒ سے سلسلۂ نقشبندیہ میں بیعت کی اور کچھ عرصہ بعد رائے بریلی واپس لوٹ گیے - ۱۸۱۰ء میں ٹونک کے امیر کے پاس سوار بھرتی ہوئے - چھ سات سال فن سپاہ گری کی تکمیل میں بسر کیے - ۱۸۱۶ء میں دوبارہ دھلی گیے ، اور یہاں ھدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا - ۱۸۱۸ء میں چھ ماہ تک دورہ کیا اور واپس دھلی آئے - ۱۸۱۹ء میں وطن کو لوٹے ، اور دو برس تک قیام کیا - اور اطراف و جوانب کے دورے کر کے لوگوں کو راہ ھدایت پر لائے -

مولانا کی وضع قطع سیدھی سادی اور ہر قول تکلف و تصنع سے

خالی ہوتا تھا ۔ کلام میں سیدھی سادی مثالیں دیتے ، جنھیں سامعین آسانی سے سمجھ لیتے ۔ طبیعت میں خلوص تھا ۔ ایثار اور خیر خواہئ خلق رگ و پے میں سمائی ہوئی تھی ۔ مولانا نے طریقت اور شریعت کے باہمی تطابق کی کوشش کی ۔ جا بہ جا معرفت الٰہی اور طریق سلوک کے شرعی اسلوب پر زور دیتے ۔ بیعت کا طریقہ بھی اپنے پیش روؤں سے مختلف تھا ۔ ان کا دستور یہ تھا کہ پہلے طریقہ چشتیہ ، قادریہ ، نقشبندیہ اور سہروردیہ میں بہ آواز بلند بیعت لے کر پھر طریقۂ محمدیہؐ میں بیعت لیتے تھے ۔ اور عوام و علماء ان کے طریق کو طریقۂ محمدیہؐ ہی کہہ کر پکارتے تھے ۔

۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء کو چار سو مردوں ، عورتوں اور بچوں کے ساتھ حج کے لیے رائے بریلی سے روانہ ہو کر کلکتہ پہنچے ۔ راستے میں مختلف مقامات پر ہزاروں آدمیوں کو ہدایت کی ۔ تین ماہ کے قیام کے بعد کلکتہ سے بحری راستے سے جدہ اور مکہ معظمہ تشریف لے گیے ۔ ۱۲۳۷ھ میں حج کیا ۔ مکہ معظمہ میں کئی مصری اور بلغاری عالم مولانا کی بیعت سے مشرف ہوئے ۔ حجاز میں چودہ ماہ رہے ۔ مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ گیے اور ایک ماہ قیام رہا ۔ بعد ازیں جدہ سے جہاز میں بمبئی ہوتے ہوئے کلکتہ پہنچے اور وہاں کچھ دیر قیام کر کے دو سال اور دس ماہ کی غیر حاضری کے بعد ۲۹ اپریل ۱۸۲۴ء کو وطن پہنچے ۔

وطن پہنچ کر مولانا نے سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری شروع کی ۔ اس جہاد کی وجہ سکھوں کے مسلمانوں پر بے پناہ مظالم ، قتل و غارت اور مسلمان عورتوں کی تذلیل وغیرہ تھی ۔

مولانا ۱۷ جنوری ۱۸۲۶ء کو رائے بریلی سے سفر جہاد کو روانہ ہوئے ۔ اس وقت پانچ سات ہزار ہندوستانی ان کی معیت میں تھے ، جنھوں نے جہاد کرنے اور مسلمانان پنجاب و سرحد کو مذہبی آزادی دلانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کا تہیہ کر لیا تھا ۔ مولانا گوالیار ، ٹونک ، اجمیر ، حیدر آباد سندھ ، شکار پور ، درۂ بولان اور قندھار وغیرہ

سے ہوتے ہوئے کابل پہنچے اور وہاں سے براستہ خیبر پشاور میں داخل ہوئے ۔ اور یہاں سے نوشہرہ چلے گیے ۔

جنگ شروع کرنے سے قبل انھوں نے دربار لاہور کو ایک تحریری اعلام نامہ حسب قاعدۂ شریعت بھیجا ، لیکن دربار لاہور نے اس کا کوئی جواب نہ دیا ۔ بلکہ مجاھدوں کے مقابلے میں لشکر بھیج دیا ۔ پہلا معرکہ ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو بہ مقام اکوڑہ (نوشہرہ سے ۷–۸ میل) ہوا ۔ سکھ جرنیل کو پیچھے ہٹنا پڑا ۔ مجاھدین نے حضرو میں شبخون مار کر مال غنیمت حاصل کیا ۔ ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو علاقہ کے علما و رؤساء نے ان کے ھاتھ پر بیعت امامت کی اور انھیں باقاعدہ امیر المومنین چنا تاکہ انھیں انتظام جہاد ، تقسیم غنائم ، اقامت جمعہ اور ترویج شریعت کا پورا اختیار ہو اور ان کے نام کا خطبہ پڑھا جائے ۔

پھر سیدو کے مقام پر سکھوں کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کیں ۔ جس صبح کو جنگ شروع ہونے والی تھی ، اس سے پہلی شام کو ان کے کھانے میں زھر ملا دیا گیا ۔ چناں چہ جب صبح مولوی محمد اسماعیل ان کی خواب گاہ میں تشریف لے گیے تو مولانا بے ہوش پڑے تھے اور ان کے منہ سے قے جاری تھی ، جس سے زھر بتدریج خارج ہو رھا تھا ۔ اس نازک حالت میں بھی انھوں نے اصرار کیا کہ مجھے میدان جنگ میں لے چلو ۔ چناں چہ چند آدمیوں کی مدد سے میدان جنگ پہنچے ۔ اس وقت مجاھدین کی حالت بڑی پتلی تھی ۔ بیشتر بے ہتھیار تھے جب کہ سکھ منظم تھے، جس کے سبب مجاھدوں کو شکست ہوئی ۔

بعد میں راجا رنجیت سنگھ اور جنرل ونٹورا کی سازش سے سردار یار محمد خاں حاکم پشاور جو پہلے سید صاحب کے ساتھ تھا ، ان کے خلاف ہو گیا اور اب سکھوں کی بجائے ان کی ٹکر اس افغان صوبے دار سے ہوئی ۔ ایک معرکے میں سردار یار محمد مارا گیا ۔ سید صاحب کو کامیابی ہوئی ۔ ۱۸۳۰ء کے اخیر میں پشاور فتح ہوا ، لیکن بعد میں ان کے رفقا کی بے اعتدالیوں کے سبب افغانوں نے تنگ آ کر باقاعدہ سازش کے تحت ایک ہی وقت میں مختلف علاقوں میں مجاھدین پر حملہ بول اور ان کا قتل کا ئے

اور بکریوں کے، ذبح کر دیا ۔ مولانا پر اس کا بڑا اثر ہوا ۔ چناں چہ آنھوں نے اس علاقے سے ھجرت کر کے عرب جانے کا فیصلہ کیا ، اور اپنے ساتھیوں کو اپنے اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی ۔ لیکن اکثر مجاھدین نے ساتھ نہ چھوڑا ۔ مولانا چند منزلیں چل کر کاغان میں بہ مقام راج دواری مقیم تھے کہ راجا شیر سنگھ کا لشکر اس طرف آیا ، اور اس کی مدافعت کے لیے سردار حبیب اللہ خاں نے ان کی مدد چاھی ۔ وہ لشکر مجاھدین کے ساتھ بالاکوٹ پہنچے ۔ یہاں جو لڑائی ہوئی اس میں ان کے کسی ساتھی کی غداری کے سبب ان کا سارا لشکر چاروں طرف سے محصور ھو گیا ، جس کے باعث مجاھدین کو شکست ھوئی ۔ اس معرکے میں مولوی اسماعیل شہید ، جو شروع سے ان کے ساتھ رہے تھے ، مولوی خیر الدین اور ارباب بہرام خاں وغیرہ سب شہید ھوئے ۔ سید صاحب کے بعض معتقد جو انھیں مہدی، موعود سمجھتے تھے یہ خیال کرتے رہے کہ وہ غائب ھو گیے ھیں ۔ لیکن زیادہ صحیح روایت کے مطابق وہ اس جنگ میں ۲۴ ذیقعدہ ۱۲۴۶ھ (۱۸۳۱ء) کو بالا کوٹ کے مقام پر شہید ھوئے ۔ 'صراط مستقیم' ان سے یادگار ھے جو ان کے اقوال و ارشادات پر مشتمل ھے ۔ شاہ اسماعیل شہید اور مولانا عبد الحی نے ان اقوال کو فارسی میں منضبط کیا ۔

اگرچہ مولانا کو علوم مروجہ کی مشہور کتب سے غیر معمولی واقفیت نہ تھی ؛ لیکن ان میں تمام مذھبی مسائل کو سمجھنے کی بہت صلاحیت تھی ۔ اور اکثر امور میں ان کی رائے عقل صحیح ، قومی مصلحت اور شعائر اسلامی سے قریب‌تر ھوتی تھی ۔ اس کے علاوہ وہ بعض وھابیوں کی طرح تصوف کے مخالف نہ تھے ، بلکہ اس کی اصلاح چاھتے تھے ۔ (موج کوثر صفحہ ۱۵—۲۳ ۔ طبع پنجم ۱۹۶۳ء)

۲ - پیچھے رہ جانے والے خوش ھوگیے رسول اللہ صلعم کے (جانے کے بعد) اپنے بیٹھے رھنے پر ۔ اور ان کو اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد کرنا ناگوار ھوا ، اور (دوسروں کو بھی) کہنے لگے کہ تم گرمی میں مت نکلو ۔ آپؐ کہہ دیجیئے کہ جہنم کی آگ (اس سے بھی) زیادہ گرم ھے ۔ کیا خوب ھوتا اگر وہ سمجھتے ۔

۳ - آپ کہہ دیجیئے کہ اگر تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بی بیاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکسی نہ ہونے کا تم کو اندیشہ ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو ، تم کو اللہ سے اور اس کے رسولؐ سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دے ۔ اور اللہ تعالیٰ بے حکمی کرنے والوں کو ان کے مقصود تک نہیں پہنچاتا ۔

۴ - اور ہم پر تو صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے ۔

۵ - لعنت ہو خدا کی جھوٹوں پر ۔

۶ - اللہ کی مار ہو ان ظالموں پر جو اللہ کی راہ سے اعراض کیا کرتے تھے اور اس میں کجی تلاش کرتے رہتے تھے ۔

۷ - تہمت کی جگہوں سے بچو ۔

۸ - سورۂ مائدہ - اے ایمان والو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے تو اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو پیدا کر دے گا جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو گی اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو گی ، مہربان ہوں گے وہ مسلمانوں پر ، تیز ہوں گے کافروں پر ، جہاد کرتے ہوں گے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کا اندیشہ نہ کریں گے ۔

۹ - سورۂ توبہ - اے نبی کفار (سے بالسنان) اور منافقین سے (باللسان) جہاد کیجیئے اور ان پر سختی کیجیئے (دنیا میں تو یہ اس کے مستحق ہیں) اور (آخرت میں) ان کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔

۱۰ - جہاد قیامت تک باقی ہے - کسی ظالم کے ظلم یا کسی عادل کے عدل سے یہ باطل نہیں ہو سکتا ۔

۱۱ - یار محمد - سردار یار محمد خان حاکمان پشاور میں سے تھا - جب ۱۱ جنوری ۱۸۲۷ء کو علماء و رؤسائے نوشہرہ وغیرہ نے سید احمد شہید کو باقاعدہ امیرالمومنین چنا تو اس نے بھی ، سردار پیر محمد خان سے ، کہ

وہ بھی حاکمان پشاور میں سے تھا ، مل کر بذریعہ خطوط سید احمد کی امامت قبول کی تھی اور ان دونوں کی درخواست پر سید شہید لشکر مجاہدین وغیرہ کے ساتھ ان کے لشکر کی طرف نوشہرہ تشریف لے گیے تھے اور سیدو کے مقام پر سکھوں کے ساتھ جنگ کی تیاریاں شروع کی تھیں۔ یہاں جو سید شہید کو زہر دیا گیا ، اس کے بارے میں رنجیت سنگھ کی درباری تاریخ 'عمدۃ التواریخ' میں لکھا ہے کہ اٹک پار کے لوگوں کے بیان کے مطابق اسی یار محمد خان نے رنجیت سنگھ کے ساتھ رابطہ اتحاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انھیں زہر دیا تھا۔

سید احمد شہید کے ذیل میں یہ مرقوم ہو چکا ہے کہ رنجیت سنگھ اور جنرل ونٹورا کی سازش سے یار محمد خان ، سید احمد شہید کے خلاف ہو گیا تھا ۔ دراصل جنرل ونٹورا نے یہ چال چلی تھی کہ سید شہید کسی طرح دربار لاہور کے ماتحت عامل بن جائیں (رنجیت سنگھ نے سفیر بھیجے تھے کہ آپ دریائے سندھ کے بائیں طرف کے علاقہ پر قابض رہیں اور دائیں طرف کا قصد نہ کریں) جب دونوں کو اس میں کامیابی نہ ہوئی ، تو رنجیت سنگھ نے ، جو اس وقت پشاور میں تھا ، اب یار محمد کے ساتھ بحال تعلقات کر لیے۔ اس سے خراج کا وعدہ لے کر اسے پھر حاکم پشاور مقرر کیا اور اس کے لڑکے کو بطور یرغمال لاہور لے گیا۔ اس کے بعد سے یار محمد سکھوں سے بھی زیادہ مجاہدین کی مخالفت پر اتر آیا اور اب سکھوں کی بجائے اس نے مجاہدین کا مقابلہ کیا ، لیکن جلد ہی ایک معرکے میں میں مارا گیا۔ (ایضاً صفحہ ۲۶ ، ۲۸ ، ۲۹)

۱۲ - سورۂ مائدہ : '' یہ ان کے لیے دنیا میں سخت رسوائی ہے اور ان کو آخرت میں عذاب عظیم ہو گا'' ۔ اس آیت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ''جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کیے جائیں یا سولی دئے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دئے جائیں یا زمین پر سے نکال دئے جائیں ۔ یہ ان ... الخ ۔

۱۳ - یعنی جو کچھ اوپر بیان ہوا۔

۱۴ - سورۂ الزمر - اور آپ قیامت کے روز ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا - کیا ان متکبرین کا ٹھکانا جہنم میں نہیں ہے -

۱۵ - سورۂ توبہ - وہ لوگ یوں چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور (یعنی دین اسلام) کو اپنے منہ سے بجھا دیں حالاں کہ اللہ تعالیٰ بغیر اس کے کہ اپنے نور کو کمال تک پہنچا دے ، مانے گا نہیں ، گو کہ کافر لوگ کیسے ہی ناخوش ہوں -

۱۶ - سورۂ بقر - جن لوگوں کو ہم نے کتاب (توراۃ و انجیل) دی ہے وہ لوگ رسول (صلعم) کو ایسا پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں اور بعضے ان میں سے امر واقعی کو باوجودیکہ خوب جانتے ہیں (مگر) اخفا کرتے ہیں -

۱۷ - سورۂ الانفال ... تاکہ جس کو برباد (گمراہ) ہونا ہے وہ نشان آئے پیچھے برباد ہو اور جس کو زندہ (ہدایت یافتہ) ہونا ہے (وہ بھی) نشان آئے پیچھے زندہ ہو -

اسد اللہ خاں غالب (صفحہ ۹۰۰)

۱ - اسد اللہ خاں غالب - پورا نام اسد اللہ بیگ خاں اور تخلص غالب - قوم کے ترک سلجوقی تھے - دادا شاہ عالم کے زمانے میں ماوراء النہر سے وارد ہند ہوئے - والد عبداللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ کے ملازم ہوئے - وہاں سے حیدرآباد اور وہاں سے الور پہنچ کر راجا بختاور سنگھ کے نوکر ہوئے - کچھ عرصہ بعد ایک لڑائی میں مارے گئے - غالب کے چچا نصراللہ بیگ نے ، جو آگرہ کا صوبہ دار تھا ، انہیں پرورش کیا -

غالب کی پیدائش ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۷ء) کو آگرہ میں ہوئی - لیکن آغاز شباب ہی میں دہلی آ گئے تھے - ان کا ایک حقیقی بھائی تھا جو 'تیس برس دیوانہ رہ کر مر گیا' - پانچ برس کے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا - آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو چچا دار بقا کو سدھارا -

تعلیم کے متعلق خود لکھتے ھیں ''مجھ کو مبداء فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ھے ۔ عبدالصمد محض ایک فرضی نام ھے ۔ چوں کہ مجھ کو لوگ بے استادا کہتے تھے ، ان کا منہ بند کرنے کو ایک فرضی استاد گھڑ لیا ۔'' لیکن غالب کے سوانح نگاروں کے مطابق ملا عبدالصمد ایک ایرانی تھا اور غالب نے واقعاً اس سے اکتساب فیض کیا تھا ۔ بہ قول مالک رام اگرچہ غالب کی تعلیم سے ھمیں بہت کم واقفیت ھے لیکن مختلف علوم کی جو اصطلاحات ان کے کلام میں بہ کثرت ملتی ھیں ، ان سے معلوم ھوتا ھے کہ ان علوم پر ان کی گہری نظر تھی ۔

۷ رجب ۱۲۲۵ھ (۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو جب کہ غالب کی عمر تیرہ برس تھی ، ان کی شادی لوھارو خاندان کے نواب احمد بخش بہادر کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خان معروف کی گیارہ سالہ لڑکی امراؤ بیگم سے ھو گئی ۔ شادی کے بعد دھلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی ۔

دھلی میں آ کر انہیں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ بعد میں پنشن کے جھگڑے میں گورنر جنرل کی کونسل میں یہ قضیہ پیش کرنے کے لیے انہیں کلکتہ کا سفر کرنا پڑا ۔ ۱۸۲۶ء (اگست) دھلی سے روانہ ھوئے ۔ راستے میں مختلف مقامات ، کانپور ، لکھنؤ ، بنارس وغیرہ میں کچھ عرصہ ٹھہر کر ۱۹ فروری ۱۸۲۸ء (۴ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو کلکتہ پہنچے ۔ وھاں سے ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو دھلی واپس ھوئے ۔ ۱۸۴۲ء میں میرزا کو دھلی کالج میں فارسی کی میر مدرسی کا عہدہ پیش ھوا ، لیکن انھوں نے اپنی تنک مزاجی کے باعث اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا ۔

مئی ۱۸۴۷ء میں انہیں قمار بازی کے جرم میں گرفتار کیا گیا ۔ بہ قول حالی کوتوال شہر ان کا دشمن تھا ، اس لیے یہ واقعہ پیش آیا ۔ لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا کہنا ھے کہ حقیقت یہ ھے کہ غالب کا مکان ان دنوں باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا ۔ چاندنی چوک کے کئی ایک جوھری ان کے مکان پر جوا کھیلنے کے لیے جمع ھوتے تھے ۔ اس سلسلے میں انہیں چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا ھوئی ۔

به هر حال تین ماہ کی قید کاٹ کر ڈاکٹر راس سول سرجن کی سفارش پر رہا کر دیے گئے۔

۱۸۵۰ء میں قلعه کی ملازمت ملی - بہادر شاہ ظفر نے 'نجم الدوله دبیرالملک نظام جنگ' کا خطاب دیا - مالی لحاظ سے کچھ مدت آرام سے گزری تھی که غدر ہو گیا (شروع میں پچاس روپیه ماہانه مشاہرہ مقرر ہوا - ۱۸۵۴ء میں ولی عہد سلطنت مرزا فخرو نے شاگردی اختیار کر کے چار سو روپیه سالانه مقرر کیے - کچھ عرصه نواب واجد علی شاہ نے بھی پانسو روپیه سالانه مقرر کیا)

۱۸۶۰ء (۱۹ جنوری) میں نواب رام پور کے کہنے پر رام پور روانه ہوئے - ۲۴ مارچ کو (۱۸۶۰ء) وہاں سے واپس دہلی پہنچے - رام پور کا دوسرا سفر والئی رام پور نواب محمد یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے نواب کلب علی خاں کے مسند نشین ہونے کے موقع پر ۱۸۶۵ء میں ہوا - ۱۲ اکتوبر کو وہاں پہنچے اور دسمبر میں واپس ہوئے -

آخری عمر میں مسلسل بیمار رہے - مئی ۱۸۵۸ء میں ان پر قولنج کا پہلا حمله ہوا تھا - اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے یه دورے آخر تک ہوا کیے - ۱۸۶۲ء — ۱۸۶۳ء کا بیشتر حصه پھوڑوں اور زخموں کی تکلیف میں بسر ہوا - آخری دو سالوں میں حالت زیادہ خراب ہونے کے سبب باہر آنا جانا بالکل چھوڑ دیا - مرض کی شدت کے باعث موت سے چند دن پہلے غشی کے متواتر دورے پڑتے رہے - آخر سوموار ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء (۲ ذی قعده ۱۲۸۵ ھ) کو دوپہر ڈھلے فارسی و اردو کا یه نیر تاباں غروب ہو گیا -

غالب کی قبر سلطان جی میں چونسٹھ کھمبا کے متصل خاندان لوہارو کے قبرستان میں ہے -

تصنیفات میں کلیات نثر فارسی کے علاوہ ، جس میں پنج آہنگ ، مہر نیم روز اور دستنبو وغیرہ شامل ہیں ، قاطع برہان ، کلیات نظم فارسی ،

سبد چین ، سبد باغ دو در ، اور دعاے صباح وغیرہ ان سے یادگار ہیں۔ اردو میں دیوان ، عود ہندی ، اردوے معلی (دونوں مکاتیب کے مجموعے) مکاتیب غالب اور نادرات غالب وغیرہ تصنیفات ہیں۔

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ذکر غالب از مالک رام ، دوسرا ایڈیشن۔ یادگار حالی از حالی مطبوعہ دائرۂ ادبیہ لکھنؤ - غالب از غلام رسول مہر مطبوعہ لاہور۔ نکات غالب از نظامی بدایونی۔ مکاتیب غالب مرتبہ امتیاز علی عرشی رام پوری بار پنجم۔ غالب نامہ مرتبہ شیخ محمد اکرام طبع ثانی)

۲ - مرگ دل - میر درد کہتے ہیں :

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

۳ - یعنی ہر حسین سے دل لگائیں۔

۴ - بادشاہ - اس سے مراد بہادر شاہ ظفر ، خاندان مغلیہ کا آخری فرماں روا ہے - ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ بروز شنبہ قلعہ دھلی میں پیدا ہوا۔ والدہ کا نام لعل بائی تھا - اپنے دادا شاہ عالم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی - اپنے باپ اکبر شاہ ثانی کی وفات کے بعد ۱۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو تخت نشین ہوا۔

اس کی تخت نشینی سے پہلے ہی اس کے دادا اور پھر والد نے انگریزوں کی سرپرستی قبول کرلی تھی - اسی سبب سے یہ اب برائے نام بادشاہ تھا - ایک لاکھ ماہانہ پنشن اور چند دیہات کی آمدنی پر اس کا گزارا تھا - انگریزی ریذیڈنٹ نے کئی ایک مواقع پر اس کی ذلت کے مختلف طریقے اختیار کیے - رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کے غدر نے نکال دی۔

غدر میں گرفتار ہوئے اور رنگون بھیج دیے ، گئے جہاں نوّے برس کی عمر میں ۱۲۷۹ھ میں وفات پائی۔

شاعری کا بہت لپکا تھا - بہ قول صاحب بزم تیموریہ وہ ''تاج و تخت

کا گو نہ سہی لیکن اقلیم سخن کا بادشاہ ضرور تھا ۔'' چار دیوان یادگار چھوڑے ہیں ۔

(سخن شعرا از نساخ مطبوعہ لکھنؤ ، صفحہ ۳۰۷ - بزم تیموریہ ، صفحہ ۳۲۱ - مومن ، حالات زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر از کلب علی خاں فائق رام پوری ، صفحہ ۲۳ ، ۲۴۹)

۵- ملکۂ عالیہ یعنی نواب زینت محل ۔

۶ - ناروا ردیف - سہرے والے واقعے کی طرف اشارہ ہے ۔ بہادر شاہ ظفر کے بیٹے مرزا جواں بخت (از بطن نواب زینت محل) کی شادی کے موقع پر غالب نے سہرا کہہ کر حضور میں گزرانا جس کا مطلع یہ تھا :

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

اور مقطع تھا :

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بہتر سہرا

مقطع سن کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ اس میں اس پر چشمک ہے ۔ ''گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی کہنے والا نہیں ۔ ہم نے جو شیخ ابراہیم ذوق کو استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے ، بلکہ طرف داری ہے ۔'' چناں چہ اسی دن جب ذوق دربار میں پہنچے تو بہادر شاہ ظفر نے وہ سہرا انہیں دکھایا ۔ ذوق نے پڑھا اور عرض کی 'پیر و مرشد درست' ۔ بادشاہ نے کہا ''استاد! تم بھی ایک سہرا کہہ دو ۔ ابھی لکھو اور ذرا مقطع پر بھی نظر رکھنا ۔'' بہ قول آزاد ذوق وہیں بیٹھ گئے اور یہ سہرا لکھا :

اے جواں بخت مبارک تجھے سر پر سہرا
آج ہے یمن و سعادت کا ترے سر سہرا

اور مقطع میں کہا :

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

آزاد لکھتے ھیں ''ارباب نشاط حضور میں ملازم تھیں ۔ اسی وقت انھیں (یہ سہرا) ملا ۔ شام تک شہر کی گلی گلی ، کوچہ کوچہ میں پھیل گیا ۔ دوسرے دن اخباروں میں مشتہر ھو گیا ۔ مرزا بھی بڑے ادا شناس اور سخن فہم تھے ۔ سمجھے کہ تھا کچھ ، اور ھو گیا کچھ اور ۔ یہ قطعہ حضور میں گزرانا :

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حسن طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رو ھوں اور مرا مسلک ہے صلح کل
ھرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ھوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
استاد شہ سے ھو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جام جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ ، ھاں اس سے مدعا
جز انبساط خاطر حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہ امتثال امر
دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روے سخن کسی کی طرف ھو تو رو سیاہ
سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

(ملاحظہ ہو آب حیات از محمد حسین آزاد مطبوعہ لاہور ، صفحہ ۵۱۰—۵۱۳)

۷ ۔ ذوق کی طرف اشارہ ہے ۔

۸ ۔ گفتار میں جو چیز تیرے لیے باعث فخر ہے وہ میرے لیے باعث ننگ ہے ۔

۹ ۔ بسیج ۔ قصد ۔

زلف سخن میں خم و پیچ کی راہ کھولنے سے مراد ، بیان میں پیچیدگی پیدا کرنی ۔

عالم ، جس کو تو نے کچھ اور سمجھ رکھا ہے وہ صرف ذات واحد ہے ، جو بسیط ہے یعنی مرکب نہیں اور منبسط ہے یعنی تمام فضا میں پھیلی ہوئی ۔ بس اس کے سوا کچھ نہیں ۔

(یادگار غالب از حالی مطبوعہ مجلس ترقی ادب لاہور ، صفحہ ۳۱۷)

۱۰ ۔ قلعہ بھرت پور ۔ لارڈ کمبرمر نے ۱۸ جنوری ۱۸۲۶ء (۹ جمادی الثانی ۱۲۴۱ھ) کو اس قلعہ کو نقب لگا کر اس کا کچھ حصہ اڑا دیا اور وہاں کے راجا درجن سال کو قید کر لیا ۔ اس طرح یہ قلعہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا ۔ (مفتاح التواریخ ، صفحہ ۳۸۲)

۱۱ ۔ نواب احمد بخش خاں ۔ نواب احمد بخش خاں بہادر والئی فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے جاگیر دار میرزا غالب کی بیوی کے حقیقی چچا تھے ۔ انگریزی حکومت میں ان کی بڑی عزت و منزلت تھی ۔ ان کے آبا و اجداد بخارا سے وارد ہند ہوئے تھے ، جہاں وہ حکومت کے اچھے اچھے عہدوں پر فائز رہے ۔ ان کے چچا نواب قاسم جان، شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں ہفت ہزاری کے منصب پر فائز اور شرف الدولہ سہراب جنگ کے خطاب سے مخاطب تھے ۔ ان کے والد نواب عارف جان دیہات جاگیر وغیرہ کا انتظام کرتے تھے ۔

نواب احمد بخش خاں شروع میں راؤ راجہ بختاور سنگھ والئی الور

کی طرف سے معتمد اور وکیل ہو کر لارڈ لیک کے ساتھ ہندوستان کی مہمات میں شامل رہے ، اور اپنی ذات سے بھی رسالہ رکھ کر گورنمنٹ کی خدمت بجا لاتے رہے ۔ اس کے صلے میں انھیں فیروز پور جھرکہ وغیرہ جاگیر سرکار سے عنایت ہوئی ، اور دربار شاہی سے فخرالدولہ دلاور الملک رستم جنگ کا خطاب ریذیڈنٹ دھلی کے وسیلے سے عطا ہوا۔ وفات سے کچھ عرصہ پہلے گوشہ نشین ہو گئے تھے ۔

اکتوبر ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا اور اپنے پیر و مرشد مولانا فخرالدین اورنگ آبادی کے مزار کے پاس دفن ہوئے ۔ ان کے بعد نواب شمس الدین احمد خاں مسند نشین ہوئے ۔ بہ قول مہر ''احمد بخش خاں دور آخر کے نہایت جلیل القدر فرد اور بڑے اعلیٰ درجے کے جرنیل تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ موجودہ ریاست الور کی تاسیس احمد بخش خاں ہی کی مساعی کا نتیجہ تھی ، تو مبالغہ نہ ہوگا ۔''

(آب حیات حاشیہ صفحہ ۴۳۳ ، ۴۳۴ - مکاتیب غالب صفحہ ۷ - ذکر غالب از مالک رام صفحہ ۴۹، ۵۰ - غالب از مہر صفحہ ۴۲، ۴۳)

۱۲ - مرزا علی بخش خاں - نواب الٰہی بخش خاں معروف (غالب کے خسر) کے بیٹے اور نواب احمد بخش خاں والئی فیروزپور جھرکہ و رئیس لوھارو کے بھتیجے تھے۔

بہ قول غالب ، الٰہی بخش (رنجور تخلص) ان سے چار برس چھوٹے تھے۔ اس لحاظ سے ان کی پیدائش ۱۲۰۸ھ کے لگ بھگ ہوئی ۔

غالب سے ان کے تعلقات ہمیشہ بہت اچھے رہے - جب غالب نے کلکتہ جا کر اپنی پنشن کے سلسلے میں چارہ جوئی کی تھی ، تو علی بخش خاص ہم راز و معاون تھے ۔ فارسی نثر کی مشہور کتاب 'پنج آھنگ' غالب نے انہی کے ایما پر لکھی ۔

رنجور کو فیروز پور جھرکہ سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا ، لیکن نواب احمد بخش کے انتقال کے بعد یہ وظیفہ غالباً بند ہو گیا تھا ۔ اس زمانے میں وہ دھلی سے نکل کر لکھنؤ چلے گیے ، وھاں سے کچھ عرصہ بعد جے پور اور حیدر آباد پہنچ گیے - جب نواب شمس الدین ،

ولیم فریزر کے قتل کے سلسلے میں پھانسی پا گئے اور ان کی ریاست ضبط ہو گئی تو سرکار انگریزی نے رنجور کے لیے سو روپے کی بہ جائے پچاس روپے کا وظیفہ مقرر کر دیا ، جو آن کی وفات تک جاری رہا ۔

۳۱ دسمبر ۱۸۶۳ء کو دھلی میں وفات پائی اور غالباً اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے ۔ (غالب از مہر صفحہ ۳۷ ، ۳۹)

۱۳ - سر سید احمد خاں - سر سید احمد ،والد کا نام میر تقی تھا ۔ حسینی سید تھے - ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ء) میں دھلی میں پیدا ہوئے ۔ ان کے آباو اجداد وطن چھوڑ کر پہلے دامغان (ایران) میں آباد ہوئے ۔ پھر ھرات میں مستقل طور پر آباد ھو گئے ۔ ھندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ شاہ جہان کے عہد میں آئے اور ان کے خاندان کے تمام افراد اکبر شاہ کے وقت تک مغلیہ حکومت میں مختلف خدمتوں پر مامور رہے۔

سر سید احمد نے ابتدائی تعلیم فارسی ، عربی کی مختلف اساتذہ سے حاصل کی اور ۱۹ برس کی عمر سے پڑھنا چھوڑ دیا ، لیکن شوق مطالعہ برابر جاری رھا اور صہبائی ، غالب اور آزردہ وغیرہ کی صحبت میں بیٹھ کر اس میں ترق ھو گئی ، ۱۸۳۸ء میں والد کے انتقال کے بعد نوکری کی فکر ھوئی ۔ کیوں کہ قلعہ کی تنخواھیں پہلے ھی بند ھو گئی تھیں - صرف والدہ کی تنخواہ باقی رہ گئی تھی جو ناکاف تھی - ۱۸۴۱ء میں مین پوری کے منصف مقرر ھوئے - ۱۸۴۲ء میں ان کا تبادلہ فتحپور سیکری ھو گیا ۔ اسی زمانہ سے ان کی تصنیفی زندگی شروع ھوئی ۔ یہاں انھوں نے جلاءالقلوب (سیرۃ رسول) تحفۂ حسن (ترجمہ باب دھم و دوازدھم تحفۂ اثنا عشریہ) اور ’تسہیل فی جرالثقیل‘ کا اردو میں ترجمہ کیا ۔

۱۸۴۶ء میں جب دلی تبادلہ ھو گیا تو اپنی نہایت مشہور کتاب آثار الصنادید لکھی اور اسی کے ساتھ چند مذھبی رسائل بھی تصنیف کیے - ۱۸۵۵ء میں صدر امین ھو کر بجنور گئے۔ وھاں تاریخ بجنور لکھی اور آئین اکبری کی تصحیح کی ۔ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں صدر الصدور ھو کر مراد آباد گئے اور یہاں ایک فارسی کا مدرسہ قائم کیا ۔ اسی زمانہ میں اسباب بغاوت ھند تصنیف کی ، جس سے مقصود یہ تھا کہ

مسلمانوں پر جو الزام غدر کا قائم کیا جاتا ہے اسے دور کیا جائے ۔ پھر ضیاء برنی کی تاریخ فیروز شاہی کی تصحیح کی ۔ یہیں انہوں نے ایک یہودی کی مدد سے 'تبیین الکلام' لکھنا شروع کی ۔ ۱۸۶۲ء میں غازی پور تبدیل ہوئے ۔ یہاں انہوں نے ایک سائنٹفک سوسائٹی قائم کی ، اور انگریزی مدرسہ جاری کیا ۔ جب ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ کا تبادلہ ہوا تو سوسائٹی کو بڑی ترقی دی اور ایک اخبار نکالا ، جو بعد میں 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' کے نام سے نکلتا رہا ۔ اسی زمانہ میں انہوں نے حکومت سے طلبی حقوق کے لیے 'برٹش انڈیا ایسوسی ایشن' قائم کی ۔

۱۸۶۷ء میں جج خفیفہ ہو کر بنارس چلے گئے اور ایک ورنیکولر یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک شروع کی اور ۱۸۶۹ء میں مغرب کے اصول تعلیم کا مطالعہ کرنے کے لیے ولایت چلے گئے ۔ یہاں حکومت و اکابر حکومت کی طرف سے ان کی بڑی قدر کی گئی ۔ سی ، ایس ، آئی کا خطاب ملا ۔ ایتھینیم کلب کے ممبر مقرر ہوئے ۔ وطن واپس لوٹے تو مسلمانوں کو روایتی مذہب کے اعتقادات کی اصلاح کی غرض سے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کی (۱۸۷۰ء) ۔ قدامت پرست علماء کی طرف سے انہیں کافر ، ملحد ، دہریہ اور نیچری قرار دیا گیا ۔ ۱۸۷۵ء میں ایک مدرسہ علی گڑھ میں قائم کیا ۔ دو سال کے بعد اسے کالج بنا دیا ۔ اسی زمانے میں قرآن کی تفسیر لکھنا شروع کی ۔ ۱۸۷۸ء میں وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے اور ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی ۔ ۱۸۹۸ء میں حبس بول میں مبتلا ہو کر انتقال کرگئے۔

سر سید کا شمار مصلحین قوم میں سے ہوتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کا عام رواج اور مغربی علوم و فنون کی طرف ان کی دل چسپی محض سر سید کی مساعی جمیلہ کا نتیجہ تھی ۔ مذہبی حیثیت سے وہ بڑے آزاد خیال شخص تھے ، اور وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں میں ذہنی بیداری پیدا ہو اور وہ روایات سے ہٹ کر خود اپنی عقل سے مذہب کی حقیقت کو سمجھیں ۔ اس لحاظ سے تہذیب‌الاخلاق کا اجرا ہوا ۔ خطابات احمدیہ اور تفسیر قرآن ان کی زندگی کے غیر فانی

کارنامے ہیں ۔ تاریخی کتب میں ان کی تصنیف 'آثارالصنادید' نے بین‌الاقوامی شہرت حاصل کی ۔

(مجلہ نگار لکھنؤ صفحہ ۱۵۲ ۔ علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر)

۱۴ ۔ آثار الصنادید ۔ سر سید مرحوم کی ابتدائی اور نہایت اہم تاریخی کتاب ہے ۔ اردو کے تاریخی ادب میں اسے خاصی شہرت حاصل ہے ۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے ۔ پہلے باب میں شہر (دھلی) کے باہر کی عمارتوں کا حال لکھا ہے ۔ جن میں مقبرہ سلطان بہلول لودھی ، درگاہ یوسف قتال ، مقبرہ خان خاناں ، مقبرہ ھمایوں ، درگاہ حضرت شیخ نظام الدین اولیا ، مسجد قوت الاسلام وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

دوسرا باب_'قلعہ معلی کی عمارت کے حال میں' ہے ۔ یعنی قلعہ میں جتنی چھوٹی چھوٹی عمارات ہیں_ مثلاً نقارخانہ ، دیوان عام ، نشیمن ظل الٰہی ، امتیاز محل ، جھروکہ ، اسد برج ، برج طلا ، شاہ محل ، تسبیح خانہ ، ھیرا محل ، باغ حیات بخش وغیرہ_ ان کا تذکرہ ہے ۔

تیسرا باب ''خاص شہر شاھجہان آباد کے حال میں'' ہے ۔ اس میں دیگر عمارات ، بازاروں ، درگاھوں اور مسجدوں وغیرہ کے علاوہ 'غازی بھڑبونجہ کی دکان' وغیرہ کا حال بھی درج ہے ۔

چوتھا باب ۔ ''دلی اور دلی کے لوگوں کے بیان میں'' ہے ۔

۱۸۶۱ء مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ۔ جسے دیکھ کر لندن کی رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سر سید کو اپنا آنریری فیلو مقرر کیا تھا ۔ اس ترجمہ سے پہلے انگریزی میں بھی اس کا ایک نا مکمل ترجمہ ھو چکا تھا ۔

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۶ء میں شائع ھوا (جناب ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ۲۱ ستمبر ۱۸۴۶ء کو مکمل ھوئی اور ۱۸۴۷ء میں چھپی) جو ڈیڑھ سال کے عرصے میں ختم ھو گیا ۔ دوسرے ایڈیشن کے لیے سر سید نے اس پر نظر ثانی کی اور عبارت کو پہلے

کی نسبت سادہ کیا ۔ یہ ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں چھپ کر تیار ہو گیا تھا ۔ لیکن اس کے تقریباً سب نسخے غدر کی نذر ہو گیے ۔ ۱۸۷۶ء میں منشی نولکشور نے اس کے پہلے ایڈیشن کو اپنے مطبع میں شائع کیا ۔

بہ قول مولانا حالی پہلا ایڈیشن مولانا امام بخش صہبائی سے لکھوایا گیا تھا اور سر سید نے خود اس کا اقرار کیا تھا ۔ جب کہ علامہ شبلی کا کہنا ہے کہ ''سر سید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہیں جو انھوں نے میری طرف سے اور میرے نام سے لکھ دیے تھے ۔'' گویا ساری کتاب نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ صہبائی کا لکھا ہوا ہے ۔

اس کتاب کی تالیف میں سر سید نے بڑی تکالیف اٹھائیں اور بڑی مشقتوں سے اس کے لیے مواد جمع کیا ۔ انھوں نے قطب صاحب کی لاٹ کے بعض بلند کتبوں کو پڑھنے کے لیے ایک چھینکا بنوا رکھا تھا ، جس میں بیٹھ کر وہ ہر کتبے کا چربہ آتار لیا کرتے تھے ۔
(تذکرۂ اہل دہلی مؤلفہ سر سید احمد خاں بہ تصحیح و تحشیہ قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو پاکستان ، صفحہ ۱ ، ۲ ۔ آثارالصنادید مطبوعہ نولکشور حیات جاوید حصہ دوم ، صفحہ ۴۸۸ ۔ مقالات شبلی جلد دوم ، صفحہ ۵۸ ۔ ''سر سید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فکری اور فنی جائزہ'' از ڈاکٹر سید عبداللہ ، دوسرا ایڈیشن صفحہ ۳۷)

۱۵ ۔ ولیم فریزر ۔ ولیم فریزر ۱۸۳۰ء میں کچھ عرصہ کے لیے ریذیڈنٹ رہے ۔ اس کے بعد ریذیڈنسی ایجنسی بن گئی اور وہ ۱۸۳۲ء سے لے کر قتل تک ایجنٹ رہے ۔

اس سے پہلے ۱۸۰۵ء میں وہ دہلی میں ڈیوڈ آکٹرلونی کے سیکرٹری رہ چکے تھے ۔ جیسا کہ کسی دوسرے حاشیہ میں مذکور ہوا ، ان کے احمد بخش خاں کے ساتھ نہایت گہرے دوستانہ مراسم تھے اور نواب مذکور کے صاحبزادے انھیں چچا کہتے تھے ۔

فریزر کے قتل کے بارے میں کچھ تفصیل شمس الدین احمد کے ذکر میں دی جا چکی ہے - انھیں ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا ، جب کہ وہ شام کا کھانا دریا گنج میں راجا کشن گڑھ کے ہاں سے کھا کر واپس گھر آ رہے تھے -

(غالب از مہر ، صفحہ ۳۶ - ذکر غالب ، صفحہ ۵۱)

۱۶ - شیخ امام بخش ناسخ - اردو کے مشہور شاعر اور آتش کے مد مقابل شیخ امام بخش ناسخ ، والد کا نام شیخ خدا بخش ، ۱۱۸۵ھ میں بہ مقام لاہور پیدا ہوئے (آبائی وطن لاہور ہی تھا) اور لکھنؤ میں سن رشد کو پہنچے -

طبع موزوں پائی تھی جس کے سبب بیس برس ہی کی عمر میں اردو میں شعر گوئی شروع کی - باپ دادا کی طرح خود بھی تجارت پیشگی اختیار کی -

شعر و سخن میں شروع میں غالباً شیخ محمد عیسیٰ تنہا (متوفی ۱۲۲۲ھ) سے مشورہ لیا -

حاجی قمرالدین (متوفی ۱۲۷۵ھ) ان کے مربی تھے - حاجی مذکور کی جگہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کو ملی تو ناسخ ان کے ہمنوا ہو گئے - کچھ عرصہ بعد کسی بنا پر انھیں لکھنؤ سے نکلنا پڑا - چند روز الہ آباد میں جا کر رہے - پھر لکھنؤ آئے تو شاہ اودھ کے مختار حکیم مہدی سے لگاوٹ کے سبب دوبارہ الہ آباد بھاگنا پڑا - جب حکیم مذکور کو ۱۲۴۸ھ میں دوسری مرتبہ زوال ہوا تو پھر لکھنؤ پہنچے - ۱۲۵۳ھ میں ، محمد علی شاہ کے زمانے میں حکیم مہدی پھر وزارت پر مامور ہوئے تو ناسخ اس مرتبہ بھی فرار پر مجبور ہوئے - بنارس اور عظیم آباد گئے ، لیکن کہیں جی نہ لگا - چندو لال نے حیدر آباد سے زاد راہ بھیج کر حیدر آباد آنے کی ترغیب دی ، لیکن لکھنؤ کے قرب نے انھیں جانے نہ دیا - ۲۶ رمضان ۱۲۵۳ھ کو حکیم مذکور نے وفات پائی تو ان کی بھی سنی گئی - چناں چہ عید الفطر کے تیسرے روز اتوار کو

لکھنؤ پہنچے اور پھر مرتے دم تک یہیں رہے - ۲۳ جمادی الاول ۱۲۵۳ھ کو بہ عمر ۶۹ برس وفات پائی -

(تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو گلشن بے خار - ریاض الفصحا - سراپائے سخن - گل رعنا - آب حیات - سخن شعرا - مومن از فائق رام پوری)

۱۷ - شمس الدین خاں - نواب احمد بخش خاں والئی فیروز پور جھرکہ و رئیس لوہارو کے بڑے فرزند تھے - ان کی والدہ میواتی الاصل تھیں اور ان کا نام مدی بیگم عرف بہو خانم تھا -

نواب احمد بخش نے ۱۸۲۲ء میں انھیں اپنا جانشین قرار دیا - لیکن چوں کہ وہ میواتی بیگم کے بطن سے تھے ، اس لیے خاندان کے دوسرے افراد ، جن میں غالب بھی شامل تھے ، انھیں نسبتاً اپنا ہم پایہ نہیں سمجھتے تھے ، جس کے سبب خاندان میں کشیدگی پیدا ہو گئی تھی - شمس الدین ایک طرف تھے اور باقی سارا خاندان دوسری طرف تھا - غالباً اسی کشیدگی کے پیش نظر نواب احمد بخش نے جاگیر تقسیم کردی - یعنی فیروز پور جھرکہ شمس الدین کو اور لوہارو دونوں چھوٹے لڑکوں (امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں) کو سونپا - یہ تقسیم ۱۸۲۶ء میں ہوئی -

۱۸۳۲ء میں ولیم فریزر دهلی کے ایجنٹ مقرر ہو کر آئے - وہ احمد بخش خاں کے نہایت گہرے دوست تھے - نواب احمد بخش کے فرزندوں میں جاگیر کی تقسیم پر جو نزاع چلا آ رہا تھا ، اس میں انھوں نے چھوٹے بھائیوں کے حق میں باتیں کی تھیں - بعد میں کلکتہ میں امین الدین احمد خاں کے حق میں فیصلہ ہو گیا - شمس الدین نے فریزر کو اس کا ذمہ دار گردانا - چناں چہ بعض لوگوں کے مطابق نواب (شمس الدین) نے کلکتہ سے فیصلے کی اطلاع پاتے ہی فریزر کے قتل کی سکیم تیار کی اور اپنے دو آدمی اس کے قتل پر مامور کیے - وہ دهلی میں تین ماہ تک فریزر کے پیچھے لگے رہے ، لیکن موقع نہ مل سکنے کے سبب واپس چلے گئے - شمس الدین اس پر بہت خفا ہوئے تو دونوں دوبارہ دهلی پہنچے - آخر ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کو ان میں سے ایک (کریم خاں)

نے فریزر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جب کہ وہ ایک دعوت سے فارغ ہو کر گھر واپس جا رہے تھے ۔ خود وہ بچ کو نکل گیا، لیکن شہر سے باہر نہ جا سکا ۔

بعد میں تحقیق و تفتیش پر شمس الدین مجرم ٹھہرے ۔ انہیں دہلی طلب کیا گیا ۔ خاندان کے آدمیوں نے جانے سے روکا، لیکن یہ اپنے خاندان اور امیرانہ علائق کے تکبر میں دس سوار ساتھ لے کر پالکی میں روانہ ہوگئے ۔ وہاں پہنچتے ہی انہیں گرفتار کر لیا گیا ۔ کریم خاں کا دوسرا شریک اینا سلطانی گواہ بن گیا اور اس نے نواب کی شرکت و انگیخت کے متعلق گواہی دی ۔ چناں چہ ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو انہیں کشمیری دروازہ کے باہر نو سو فوجیوں کے پہرے میں پھانسی دے دی گئی ۔ بہ قول مالک رام وفات کے وقت عمر صرف ۲۵ برس تھی ۔ میت کو ان کے خسر نے قدم شریف میں دفن کیا ۔

کہتے ہیں نواب نے بڑی مردانگی سے جان دی ۔ پہلے سبز لباس پہنا ۔ وہ اتروا دیا گیا تو سفید کپڑے پہن لیے ۔ جب پھانسی کے لیے انہیں لے جایا جا رہا تھا تو راستے میں کیسرو کھاتے جاتے تھے اور چھلکے باہر پھینکتے جاتے تھے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے موت کا مردانہ وار مقابلہ کیا ۔

پھانسی پر لٹکنے کے بعد ان کی لاش قبلہ رخ ہوگئی جسے عام لوگوں نے نواب کی بے گناہی کا ثبوت قرار دیا ۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی قبر مدت تک زیارت گاہ عوام رہی ۔

(غالب از مہر، صفحہ ۴۲—۵۲ ۔ ذکر غالب، صفحہ ۵۶)

۱۸ - فتح اللہ بیگ ۔ مرزا فتح اللہ بیگ، محمد بخش خاں کے بیٹے تھے ۔ مؤخرالذکر کے والد قاسم جان تھے جو نواب احمد بخش خاں کے والد عارف جان کے بھائی تھے ۔ علاوہ ازیں فتح اللہ بیگ، نواب شمس الدین احمد خاں کی پھوپھی کے بیٹے تھے ۔ یعنی نواب احمد بخش خاں کی ایک بہن محمد بخش خاں سے بیاہی ہوئی تھی اور دوسری میرزا غالب کے چچا نصراللہ بیگ خاں کے عقد میں تھی ۔

کہا جاتا ہے کہ مرزا فتح اللہ بیگ اور نواب شمس الدین کے درمیان رنجش کی ابتدا ایک گھوڑے کے متعلق مذاق سے ہوئی - اس کے بعد عداوت انتہا کو پہنچ گئی - یہ جو غالب نے لکھا ہے کہ دھلی کے خاص و عام کہتے ھیں کہ اسداللہ اور مرزا فتح اللہ نے دشمنی کے سبب نواب شمس الدین کو فریزر کے قتل میں پھنسایا ہے ، تو اس سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد نے نواب ضمیرالدین احمد خاں عرف ضمیر مرزا ابن نواب علاء الدین احمد خاں کی زبانی بیان کیا ہے کہ ''جب فریزر کی نعش دیوان خانے میں رکھی گئی ، رؤساء شہر اور حکام وھاں پہنچے تو ان میں فتح اللہ بیگ خاں بھی تھے جو فریزر کی نعش کو دیکھتے ھی اس پر گرے اور بے اختیار چیخ پڑے 'ھائے شمس الدین نے تجھے نہ چھوڑا -' یہ بات لوگوں نے پکڑ لی اور پھر گو انھوں نے گریز کرنا چاھا مگر سود مند نہ ھوا -''

(ذکر غالب حاشیہ ، صفحہ ۵۳—۵۴ - غالب از مہر ، صفحہ ۴۹)

مولوی حمید الدین خان بہادر (صفحہ ۶۱۲)

۱ - سورۂ نور - خرید و فروخت انھیں اللہ کی یاد اور نماز سے غفلت میں نہیں ڈالتی -

۲ - ایضاً - اللہ ان کو ان کے اعمال کا بہت ھی اچھا بدلہ دے گا اور ان کو اپنے فضل سے اور بھی زیادہ دے گا اور اللہ تعالیٰ جس کو چاھے بے شمار دے دیتا ہے -

۳ - فتح شاہ - بنگالہ کا بادشاہ تھا - ۸۸۷ھ میں شاہ یوسف شاہ کی وفات کے بعد سکندر شاہ کو وھاں کا بادشاہ بنایا گیا ، لیکن وہ نا اھل ثابت ھوا ، جس کے سبب امرا نے اسے معزول کر کے فتح شاہ کو تخت پر بٹھایا -

فتح شاہ عالم و دانا تھا - اس نے ملوک و سلاطین کی رسوم اختیار کیں اور ھر کسی کو اس کے حسب مرتبہ نوازا - ان خواجہ سراؤں اور حبشی غلاموں کی اصلاح کی ، جو پہلے بادشاھوں کے دور میں بلند مقام

پر پہنچ کر بے اعتدالیوں کے مرتکب ہوتے تھے ۔ خواجہ سراؤں نے جب اپنا اقتدار چھنتے دیکھا تو وہ خواجہ سرا سلطان شہزادہ بنگالی کے پاس گئے جو کرتا دھرتا تھا اور جس کے پاس محلات کی چابیاں تھیں ، اور اپنی شکایات اس سے بیان کیں ۔ اس نے خواجہ سراؤں اور دیگر پہرہ داروں سے مل کر اسے ۸۹۶ھ میں قتل کر دیا اور خود تخت نشین ہو گیا ۔ فتح شاہ نے کل سات سال اور پانچ ماہ حکومت کی ۔

(طبقات اکبری ، صفحہ ۵۲۵ ۔ تاریخ فرشتہ جلد دوم ، صفحہ ۲۹۸ ، ۲۹۹)

۴ ۔ نصرت شاہ ۔ بابر نے بھی اسے نصرت شاہ لکھا ہے ، لیکن تاریخ فرشتہ میں 'نصیب شاہ' اور طبقات اکبری میں 'نصیر شاہ' لکھا ہے جو کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے ۔ بنگالہ کا بادشاہ تھا ۔

نصرت شاہ سلطان علاء الدین شاہ کا فرزند تھا ، جو قوم کا سید تھا ۔ اپنے سترہ بھائیوں میں سب سے بڑا تھا ۔ ۹۲۷ھ میں باپ کے مرنے کے بعد اشراف و اعیان نے اسے تخت نشین کیا ۔ اس نے اپنے بھائیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا اور ہر ایک کو باپ سے بڑھ کر نوازا ۔

۹۳۲ھ میں جب بابر (تاریخ فرشتہ میں 'فردوس مکانی ظہیرالدین محمد ہمایوں' لکھا ۔ ہے 'ہمایوں' کا اضافہ کتابت کی غلطی ہے) ابراہیم لودی کو قتل کر کے ہندوستان پر قابض ہوا تو اس وقت ، جو مسلمان بادشاہ اس برصغیر میں حکمران تھے ، ان میں سے ایک نصرت شاہ تھا ۔ چناں چہ بابر اپنی توزک میں لکھتا ہے ''پانچواں (بادشاہ) نصرت شاہ بنگالہ میں تھا ۔ اس کا باپ بنگالہ کا بادشاہ ہوا تھا جس کا نام علاء الدین تھا اور جس کی قوم سید تھی ۔ نصرت شاہ کو سلطنت ترکہ میں ملی ۔ بنگالہ میں سلطنت ملنے کی یہ عجیب رسم ہے کہ میراثی بہت کم ہوتی ہے............ بادشاہی یوں حاصل ہوتی ہے کہ جو کوئی بادشاہ حال کو مار کر جھٹ پٹ تخت پر بیٹھ جاتا ہے اسی کو امرا ، وزرا ، فوج اور رعیت بادشا سمجھنے لگتی ہے .... نصرت شاہ کے باپ سلطان علاء الدین سے پہلے ایک حبشی ، بادشاہ کو قتل کر کے تخت پر ہو بیٹھا تھا ۔ مدتوں اس نے حکومت کی ۔ حبشی کو سلطان (علاء الدین)

مار کر بیٹھ گیا اور بادشاہ ھو گیا ۔ البتہ علاء الدین کے بعد اس کا بیٹا نصرت شاہ بہ طور وراثت اب بادشاہ ھوا ۔"

بابر کے تسلط کے بعد بہت سے افغان بنگالہ میں اس کے پاس پناہ گزیں ھو گئے ۔ اس نے ھر ایک کو نوازا اور سلطان ابراھیم لودی کی بیٹی سے شادی کر لی ، جو وھاں پہنچ گئی تھی ۔ ۹۳۵ھ میں اس نے بابر کو ، جو اس وقت جون پور کو تسخیر کر چکا تھا ، اس خیال سے کہ وہ بنگالہ کی طرف نہ بڑھے ، تحفے تحائف بھجوائے اور اطاعت و فرماں پذیری کا دم بھرا ۔ بابر نے مصلحت وقت کے پیش نظر اس سے صلح کر لی اور واپس چلا گیا ۔

نصرت شاہ نے دعویٰ سیادت کے باوجود دوران سلطنت میں فسق و فجور اور ظلم سے ھاتھ نہ اٹھایا ۔ آخر ۹۴۳ھ میں اس نے وفات پائی ۔ یہ نہیں معلوم ھو سکا کہ وہ اجل طبیعی سے مرا یا کسی نے اسے مار ڈالا ۔

(توزک بابری بحوالہ مجلہ نقوش 'آپ بیتی نمبر' صفحہ ۳۳۸ ، ۳۳۹ ۔ طبقات اکبری ، صفحہ ۵۲۶ ۔ تاریخ فرشتہ ، صفحہ ۳۰۱ ، ۳۰۲ ، جلد دوم)

۵ ۔ سورۂ فاطرہ ۔ بری تدبیروں کا وبال ان تدبیر والوں ھی پر پڑتا ہے ۔

۶ ۔ میر جملہ ۔ میر محمد سعید میر جملہ ۔ اردستان (اصفہان) کا رھنے والا اور جواھرات وغیرہ کا تاجر تھا ۔ اس تجارت میں اس نے خاصی دولت کمائی تھی ۔

۱۰۳۰ھ میں دیگر ایرانی تجار کی طرح گولکنڈہ پہنچا ۔ جواھرات سے خاص لگاؤ کے سبب جلد ھی اس کی رسائی عبد اللہ قطب شاہ والئی گولکنڈہ کے دربار میں ھو گئی اور اس کی ملازمت میں آ گیا ۔ اس کی غیر معمولی فطانت ، فوجی ذھانت اور تنظیمی لیاقت کو قطب نے سراھا ، اور اسے اپنا وزیر اعظم بنا لیا ۔

جب قطب الملک نے کرناٹک کا علاقہ فتح کرنا چاھا تو اسی کو وھاں کا سردار اور سپہ سالار بھی بنا دیا ۔ اس کے اخلاق نے اس کی

ماتحت فوج کو اس کا گرویدہ بنا دیا ۔ اور یہ اپنی تجارتی دولت ، اپنی حاصل کردہ کانوں کی وسیع مالیت اور اپنی ہر دلعزیزی کے سبب گولکنڈہ کے سیاہ و سفید کا مالک بن گیا اور کرناٹک تک فتوحات کر کے اپنے لیے علیحدہ مملکت بنا لی ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حاسدوں نے قطب‌الملک کے کان بھرنے شروع کر دئے اور وہ اسے دبانے میں مصروف ہو گیا ، اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو مع خاندان کے گرفتار کر لیا ۔ میر جملہ نے حالات سے مجبور ہو کر والی بیجاپور ، شاہ ایران اور شاہجہان وغیرہ سے خط و کتابت کی ۔ شاہجہان نے اس کو ساتھ ملانے میں فائدہ دیکھا ۔ اورنگ زیب نے شاہجہان سے ایک فرمان لیا ، جس میں والئی گولکنڈہ سے کہا گیا تھا کہ وہ میر جملہ کے خاندان والوں کو رہا کر دے ۔ جواب سے پیشتر ھی اس نے شاہجہان کے حکم پر والئی گولکنڈہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ۔ پہلے اورنگ زیب کے بیٹے نے (جنوری ۱۶۵۶ء) حیدرآباد پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کیا ۔ پھر فروری میں خود اورنگ زیب نے گولکنڈہ کا محاصرہ کیا ، لیکن شاہجہان کے کہنے پر مارچ میں یہ محاصرہ اٹھا لیا ۔

اس کے بعد میر جملہ شاہجہان کے پاس آ گیا ۔ شاہجہان نے اسے اپنا وزیر بنا لیا ، اور اسے معظم خاں کا خطاب دیا ۔ اس نے سعداللہ خاں کی وفات کے بعد کام شروع کیا ،لیکن اسی سال وہ دکن بھیج دیا گیا ، اور اس کے بیٹے محمد امین خاں کو اس کی جگہ عارضی طور پر کام کرنے کی اجازت دی گئی ۔ دکن میں اسے زیادہ عرصے تک قیام کرنا پڑا ۔

جیسا کہ پہلے مذکور ہوا اسے ہیروں اور جواہرات سے خاص لگاؤ تھا ، جس کے سبب اس کے پاس بیش قیمت جواہرات رہتے تھے ۔ چنانچہ ۱۰۶۶ھ میں اس نے شاہجہان کو ایک بڑا ہیرا دیا جس کا وزن ۲۱۶ رتی تھا ، اور قیمت دو لاکھ سولہ ہزار روپے تھی ۔ یہی ہیرا آگے چل کر کوہ نور کہلایا ۔ کانوں کا ٹھیکہ لینے کے سبب اس کے پاس ہیروں کی اتنی کثرت تھی کہ وہ ان کا شمار نہ کرتا تھا بلکہ ہیروں سے بھری ہوئی ٹاٹ کی تھیلیوں کو گنوا لیتا تھا ۔

میر جملہ نے کچھ عرصہ بیمار رہ کر عالمگیر کے چھٹے سال جلوس کے آغاز میں ۲ رمضان ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۳ء) کو خضر پور سے دو کوس کے فاصلے پر ایک مقام پر وفات پائی ۔ مآثر الامرا میں ہے کہ بعض گرم دوائیوں کے استعمال سے اسے ضیق النفس اور خفقان کی بیماری ہو گئی تھی ، جو بعد میں استسقاء پر منتج ہوئی ، اور اسی کے سبب وہ راہئی ملک عدم ہوا ۔

(عمل صالح جلد ۳ صفحہ ۲۰۶ ، ۲۰۷ ۔ مآثر عالمگیری از محمد ساقی مستعد خاں اردو ترجمہ از محمد فدا علی طالب صفحہ ۶۱ ۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا صفحہ ۴۷۹ــ۴۸۰ ۔ مقدمہ رقعات عالمگیر صفحہ ۲۷۸ بیعد ۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے صفحہ ۲۹۲ ۔ دولت مغلیہ کی ہئیت مرکزی صفحہ ۲۹۴ ۔ مآثرالامرا جلد سوم صفحہ ۵۵۳)

سید احمد خاں (صفحہ ۶۲۱)

۱ ۔ حسن ، شہرت کا اور عشق ، رسوائی کا طالب ہے (اس میں) نہ تو معشوق کا کوئی جرم ہے اور نہ عاشق ہی کا کوئی گناہ ۔

۲ ۔ سورۂ عنکبوت ۔ کہہ دیجئے کہ میرے اور تمھارے درمیان اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے ۔ اس کو سب چیز کی خبر ہے جو آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے ۔ اور جو لوگ جھوٹی باتوں پر یقین کرتے اور اللہ کے منکر ہیں تو وہ لوگ بڑے زیاں کار ہیں ۔

ضمیۂ تعلیقات

۱ - مولانا منہاج سراج (صفحہ ۵۲ سطر ۱)

مولانا نے اپنی تالیف طبقات ناصری میں اپنا نام مختلف طریقوں سے لکھا ہے - مثلاً ابو عمر و عثمان بن محمد المنہاج سراج الجوزجانی ، عثمان محمد منہاج الجوزجانی اور منہاج سراج جوزجانی -

ان کے آبا و اجداد جوزجان یا گوزگان (بلخ) کے رہنے والے اور اپنے دور کے قابل احترام لوگ تھے - مولانا کی پیدائش فیروز کوہ (غور) میں ۵۸۹ھ کے لگ بھگ ہوئی اور ان کا بچپن سلطان غیاث الدین غوری کی بیٹی ماہ ملک کے سایۂ عاطفت میں گزرا ، جو مولانا کی والدہ کی ہم مکتب و ہم شیر ، فاضل اور صاحب عفت و جمال تھی - گویا شروع ہی سے انہیں علم و ادب کا ماحول میسر آیا -

۶۱۱ھ تک وہ فیروز کوہ میں رہے اور تحصیل علم و دانش کرتے رہے - ۶۱۳ھ میں پہلی مرتبہ فیروز کوہ سے بست کا سفر کیا - وہاں سے بہ طور سفیر ، سیستان بھیجے گیے - ۶۱۸ھ میں اپنے اقربا ہی میں ان کی شادی ہوئی ، جس کے لیے انہیں تمران جانا پڑا - وہاں سے پھر غور لوٹے - اس کے بعد کچھ عرصہ تولک میں رہے - اس دوران میں منگولوں کا ہنگامہ اٹھ کھڑا ، لیکن مولانا اس آفت ناگہانی سے محفوظ رہے -

انہیں دربار غور کی جانب سے کئی ایک حکومتوں میں سفیر بنا کر بھیجا گیا - ۶۲۳ھ کے لگ بھگ مولانا نے تولک کو خیر باد کہا ، ۶۲۴ھ کے اوایل میں غزنہ کے راستے بنوں سے گزرے ، اور کشتی میں بیٹھ کر دریاے سندھ کے راستے سے بروز سہ شنبہ ۲۶ جمادی الاول کو اوچ پہنچے - ماہ رجب تک (قباجہ اور التتمش کے درمیان جنگ کے دوران)

اوچ اور ملتان میں رہے ۔ اسی سال ذی الحجه کے مہینے میں ، به عہد سلطان ناصر الدین قباچه ، اوچ کا 'مدرسۂ فیروزی' ان کے سپرد ہوا ۔ نیز علاء الدین بہرام شاہ بن قباچه کے لشکر کا عہدۂ قضا ملا ۔ لیکن اگلے ہی سال التتمش نے (۲۷ جمادی الاول ۶۲۵ھ بروز سه شنبه) اوچ فتح کر لیا ، اور قباچه کی حکومت وہاں سے ختم ہو گئی ۔ معلوم ہوتا ہے اوچ کے محاصرے میں مولانا ، شمش الدین التتمش کی خدمت میں پہنچ گیے تھے ، جہاں التتمش نے ان کی بڑی تعظیم کی ۔

ماہ رمضان ۶۲۵ھ میں وہ بادشاہ کے ساتھ دہلی چلے گیے - ۶۲۹ھ تک دہلی میں رہے ۔ اسی سال شعبان کے مہینے میں قلعه گوالیار کے نزدیک به حضور لتتمش پہنچے اور بادشاہ کی طرف سے انہیں 'سرائے اعلیٰ' میں وعظ و تذکیر پر مامور کیا گیا ۔ ہفته میں تین مرتبه وعظ فرماتے ۔ ماہ رمضان میں روزانه مجلس وعظ ہوتی - ۱۱ ماہ اس قلعه کے قریب رہے ۔ اس دوران میں آنہوں نے عید الضحیٰ کے موقع پر بادشاہ کے حکم سے خطبۂ عید پڑھا ، اور امامت کرائی ۔ بادشاہ نے انہیں گرانمایه خلعت سے نوازا - ۲۶ صفر ۶۳۰ھ کو جب قلعه گوالیار فتح ہوا تو التتمش نے مولانا کو وہاں کی قضا وخطابت ،' امامت و احتساب' اور تمام امور شرعی پر مقرر کیا - اس خدمت پر گوالیار میں ۶ سال رہے ۔ التتمش کے مرنے کے بعد بھی اس عہدہ پر رہے - ۶۳۵ھ به عہد رضیه سلطانه وہاں سے دہلی آئے ۔

دہلی آ کر مدرسه ناصریه کے سربراہ و شیخ جامعه مقرر ہوئے ۔ اس کے ساتھ ساتھ گوالیار کی قضا بھی سپرد ہوئی ۔ سلطان معز الدین بہرام شاہ برسر اقتدار آیا تو اس نے مولانا کو (بروز ۱۰ جمادی الاول ۶۳۹ھ) پایۂ تخت اور تمام ہندوستان کا قاضی مقرر کیا ۔ اسی سال بروز جمعه ۷ ذی القعده بعض دشمنوں نے ان پر (جامع مسجد میں) حمله کیا ۔ لیکن بچ گیے ۔ سلطان بہرام شاہ کے قتل کے بعد آنہوں نے استعفیٰ دے دیا ۔ دہلی میں اس وقت جو شورش و ہنگامه مچا ہوا تھا ، اس سے بچنے کے لیے مولانا اہل و عیال سمیت ۶۴۰ھ میں لکھنوتی کی طرف متوجه ہوئے ۔

٦٤٣ھ میں دھلی واپس آئے - اس وقت علاء الدین مسعود تخت پر متمکن تھا - پھر مدرسۂ ناصریہ کی سربراھی اور قضاے گوالیار وغیرہ پر مامور ہوئے - ۲۳ محرم ٦٤٤ھ کو سلطان ناصر الدین محمد تخت نشین ہوا - اس کی تخت نشینی کے موقع پر مولانا نے تہنیت کے طور پر اشعار کہے - ٦٤٩ھ میں دوبارہ 'قاضی القضاۃ کل ھند' بنائے گیے اور حاکم دھلی بھی مقرر ہوئے - درباری سیاست کے سبب ٦٥١ میں اس عہدے سے ھٹائے گیے اور ٦٥٣ھ میں تیسری مرتبہ مذکورہ عہدوں پر فائز ہوئے - ٦٩ سال کی عمر میں (٦٥٨ھ) طبقات ناصری مکمل کی - معلوم ہوتا ھے اس تالیف کے بعد زیادہ دیر تک زندہ نہیں رھے - تاریخ وفات میں اختلاف ھے - مدفن صحیح طور معلوم نہیں - لیکن چونکہ آخری عمر دھلی میں گزاری، اس لیے ممکن ھے وھیں دفن ہوئے ہوں -

(طبقات ناصری جلد دوم تعلیقات از عبد الحی حبیبی صفحہ ٧٢٥— ٧٢٨ ، شفق صفحہ ٣٦٠ - بزم مملوکیہ صفحہ ٣٠ ، ١٧٢ ، ١٧٣ ، ١٩٥)

۲ - سراج الدین منہاج - صفحہ ٥٣ ، سطر آخری -

سراج الدین محمد (افصح العجم و اعجوبۃ الزمان) بن مولانا منہاج الدین عثمان - مؤلف طبقات ناصری قاضی منہاج سراج کے والد اور دربار فیروز کوہ و غور کے رجال بزرگ میں سے تھے - عوفی انھیں 'ملک الکلام و فصیح العجم' کے الفاظ سے یاد کرتا ھے - دربار سلاطین میں انھیں بہت بڑا مرتبہ حاصل تھا -

٥٨٢ھ میں جب سلطان معزالدین غوری نے لاھور پر قبضہ کیا تو سراج لشکر ھند کے قاضی مقرر ہوئے - سلطان نے خلعت عطا کی اور ۱۲ اونٹ ان کی کرسی منتقل کرنے کے لیے مقرر ہوئے۔

مولانا سراج کے والد لاھور میں مقیم اور ٥٧٢ھ کے بعد تک وھاں زندہ تھے، اور غالباً یہیں فوت ہوئے - اس لحاظ سے مولانا کی پیدائش بھی لاھور ھی میں ہوئی ہوگی -

آل شنسب کے سلطان بہاء الدین سام (٥٨٧ — ٦٠٢ھ) نے کہ بڑا علم دوست تھا ، مولانا کو، جو ان دنوں سلطان غیاث الدین کے دربار

میں ایک نامور فاضل تھے، اپنے دربار (بامیان) آنے کی دعوت دی ۔ اس نے خفیہ طور پر جب کئی دعوتیں بھیجیں تو مولانا غزنہ سے بامیان چلے گئے ۔ یہ سفر بہاء الدین کے تخت نشین ہونے سے پہلے واقع ہوا ۔ اس وقت بہاء الدین بلوران یا پروان میں تھا ۔ اس نے مولانا کو بہت اعزاز بخشا ۔ معلوم ہوتا ہے اس سفر کے بعد وہ دربار فیروز کوہ و سلطان غیاث‌الدین میں لوٹ آئے، کیوں کہ بعد میں بھی جب (۵۸۷ھ میں) بہاء الدین اپنے باپ سلطان شمس الدین محمد کے مرنے پر تخت بامیان پر متمکن ہوا تو اس نے کئی مرتبہ مولانا کو آنے کی دعوت دی اور جملہ مناصب شرعی عطا کیے ۔ چنانچہ مولانا، غیاث الدین کی اجازت کے بغیر فیروزکوہ سے بامیان چلے گئے، جہاں بہاء الدین نے ان کی بے حد قدر و منزلت کی اور ''قضاے ممالک'' و ''خطابت ممالک'' وغیرہ مناصب کے علاوہ جاگیر سے بھی نوازا ۔ تاہم کچھ عرصہ وہاں رہ کر ۵۹۰ھ کے قریب غیاث الدین کے دربار میں لوٹ آئے ۔ اس کے بعد انھیں دو مرتبہ دربار سیستان میں جانے کا موقع ملا ۔ ایک مرتبہ خلیفہ وقت الناصرلدین اللہ کے دربار میں بہ طور سفیر گئے ۔ اسی دوران میں ۵۹۲ھ کے لگ بھگ انھوں نے مکران (یا کرمان) کے مقام پر وفات پائی ۔

(طبقات ناصری از قاضی منہاج سراج مرتبہ عبد الحی حبیبی جلد دوم صفحہ ۳۰۷–۳۲۷ تعلیقات)

۳ - ترمتی خاتون (صفحہ ۹۵ سطر ۶) -

یہ درباری مغنیہ تھی اور امیر خسرو کی مدد سے دربار میں پہنچی تھی ۔ بعد میں دربار کے تمام ایرانی اور ہندوستانی موسیقاروں کی سردار بنا دی گئی ۔

(دی لائف اینڈ ورکس آو امیر خسرو صفحہ ۲۱۸)

۴ - علم (خبر) (صفحہ ۲۹۰ سطر ۱) -

(نوٹ : متن میں 'علم بعین آمد' ہے جس کا ترجمہ 'خبر' اور 'نظر' کیا گیا ہے ۔ لیکن حاشیہ 'علم' پر ہی رہنے دیا ہے) کسی چیز کو کما حقہ جاننے کا نام علم ہے ۔ حیات جس طرح ذات کے اقرب اوصاف

میں سے ہے ، اسی طرح علم بھی حیات کے اقرب اوصاف سے ہے۔ ہر زندہ کسی نہ کسی علم کو ضرور جانتا ہے ۔ وہ علم خواہ الہامی ہو جیسے کہ حیوانات وغیرہ کو ہوتا ہے ، خواہ بدیہی استدلالی یا تصدیقی ہو جیسے کہ انسان فرشتوں اور جنات کا علم ہے ۔ علم کی چند اقسام ہیں ۔

علم حضوری سے مراد وہ علم ہے جو کسی خارجی ذریعہ کے بغیر حاصل ہو جیسے کہ انسان کو اپنی ذات و صفات کا علم ہوتا ہے۔

علم حصولی ــ جو انسان کو امور خارجی کے ذریعے سے حاصل ہو ، جیسے کہ اپنے غیر کا علم ۔

علم الیقین ــ وہ علم یقینی جو دلائل و براھین سے حاصل کیا گیا ہو ۔ بعض اوقات عیان ثابتہ کی جانب بھی اس سے اشارہ کیا جاتا ہے ۔
(سر دلبران صفحہ ۲۹۶—۲۹۸)

عین ۔ ذات حق تعالیٰ کے ساتھ اتحاد ۔ ہستئی حق میں گم ہونا ۔ سالک کا ذات حق میں محو ہو جانا اور لذت وصال پانا ۔ مقام بقاباللہ میں پہنچنا ۔

عین ثابت ــ آئینہ عالم جو کہ علم الٰہی میں قبل تخلیق عالم موجود تھا اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی موجود رہے گا ۔ وہ حقیقت جو کہ علم الٰہی میں موجود مگر خارج میں معدوم ہے۔

عین الجمع ــ مقام جمع یعنی شہود حق بلا خلق ۔

عین الیقین ــ جب مشاھدہ میں کوئی بات آ جائے تو وہ عین الیقین کی حد تک پہنچ جاتی ہے ، مقام وحدت ۔

۵ ۔ جھروکۂ درشن (صفحہ ۴۵۰ سطر۴) ۔

جھروکہ جس میں بادشاہ بیٹھ کر رعایا کو اپنا دیدار کراتا ۔ یہ رسم اکبر کی ایجاد کردہ ہے ۔ بہ قول ابوالفضل اس رسم کا مقصد یہ تھا کہ ہر خاص و عام کو بادشاہ سلامت کے سامنےحاضر ہونے اور اس کے

حضور میں کسی کی ممانعت یا مزاحمت کے بغیر باریاب ہونے کا موقع مل سکے۔ اس وقت کوئی چوب دار اور چاؤش نہ ہوتا۔

اکبر کے جانشینوں کے زمانے میں بھی اس رسم کی پابندی پوری طرح کی جاتی تھی اور مخلص عقیدت مند روزانہ صبح سویرے 'جھروکے' کے نیچے جمع ہو جاتے تھے، جن میں سپاہی، تاجر، سوداگر، اہل حرفہ اور دیہاتی سبھی ہوتے اور بادشاہ کے 'درشن' کا شرف حاصل کرتے تھے۔ بدایونی کا کہنا ہے کہ اکبر نے یہ طریقہ ہندوؤں بالخصوص برھمنوں کے اثر کی وجہ سے رائج کیا، کیوں کہ عام ہندوؤں کی نظر میں وہ قدیم ہندو حکمرانوں کے نمونے کا حکمران تھا اور برھمن اسے رام اور سری کرشن کا اوتار مانتے تھے۔ ''ادنیٰ طبقے کے لوگ جو دولت خانے میں باریاب نہ ہو سکتے تھے، علی‌الصبح جھروکے کے نیچے جمع ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کے 'رخ اقدس' کا دیدار نہ کر لیتے تھے، کھانے پینے کو ممنوع سمجھتے تھے''۔ ہندو تو مسواک بھی نہ کرتے۔

اکبر جھروکے میں برآمد ہوتا اور 'درشن' دینے کے بعد دربارعام منعقد کرتا، جس میں ہندو، مسلمان، اعلیٰ و ادنیٰ، مرد اورعورت سب کو معروضات پیش کرنے اور اپنے معاملات اصالۃً بیان کرنے کی اجازت تھی اور بادشاہ وہیں اپنا فیصلہ سنا دیتا تھا۔ ''لوگ کثیر تعداد میں وہاں جمع ہوتے تھے جس کی وجہ سے شور اور غل بھی بہت ہوتا تھا۔ اکبر اس دربار میں روزانہ تقریباً ساڑھے چار گھنٹے صرف کرتا''۔

جہانگیر نے بھی یہ رسم جاری رکھی۔ یہاں تک کہ وہ خود ایک موقع پر لکھتا ہے کہ میں نے علالت کے باوجود ناغہ نہیں کیا۔

ڈیلائٹ کے مطابق جہانگیر روزانہ بعد طلوع آفتاب جھروکے کے سامنے آتا، اور خود آفتاب کے درشن کرتا۔ امراء بادشاہ کے درشن کے لیے یہاں جمع ہوتے، وہ کسی اونچی جگہ پر اور عام لوگ صحن میں کھڑے ہوتے اور 'بادشاہ سلامت' (جہاں پناہ زندہ باد) کے

نعروں سے اس کا خیر مقدم کرتے ۔ اس موقع پر جو بھی شخص تحریری درخواست لاتا ، بادشاہ اس کا حال نہایت توجہ سے سنتا ۔

بادشاہ نامہ کا مؤلف عبد الحمید لاھوری لکھتا ھے کہ درشن کی رسم حضرت عرش آشیانی (اکبر) نے ایجاد کی تھی اور اس کی پیروی اعلیٰ حضرت (شاہجہان) بھی کر رھے ھیں تاکہ لوگ اپنا روزمرہ کا کام شروع کرنے سے پہلے ان کے دیدار سے فیض یاب ھو سکیں اور حاجت مند و مظلوم کسی قسم کی مزاحمت اور رسمی لوازم کی پابندی کے بغیر ھی داد رسی اور انصاف حاصل کر سکیں''۔

شاھجہان بالعموم درشن کے بعد کوئی پون گھنٹہ یا اس سے کم و بیش حسب ضرورت جھروکے ھی میں ٹھہرتا تھا ۔ لوگ عرضداشتیں پیش کرتے اور اپنے معاملات اصالۃً حضور شاھی میں عرض کرتے تھے ۔ محکمہ عدل کے اھل کار ان کا حال قلم بند کر لیتے اور بعد میں جب بادشاہ 'دولت خانۂ خاص و عام' یا 'خلوت خانہ' میں رونق افروز ھوتا تو اس کی خدمت میں پیش کرتے ۔

جھروکے میں بعض دیگر امور بھی انجام پاتے تھے ۔ اکبر اور جہانگیر کے عہد میں ھاتھیوں کی لڑائی جھروکے ھی سے دیکھی جاتی تھی ۔ جہانگیر نے متعدد مواقع پر منصب داروں کے سپاھیوں کا معائنہ جھروکے ھی سے کیا تھا ۔

شاھجہان کے عہد میں بھی یہ رسم جاری رھی ، البتہ جمعرات کے روز ، کہ اس کی تاج پوشی کا دن تھا ، ھاتھی نہیں لڑائے جاتے تھے ۔ اس سلسلے میں اس کے زمانے کا سب سے مشہور واقعہ اورنگ زیب پر ایک غضب ناک ھاتھی کے حملے اور اس کے اسے روکنے کا واقعہ ھے ۔

غضب ناک ھاتھیوں اور ایسے گھوڑوں کا معائنہ بھی جھروکے ھی سے کرایا جاتا تھا جو 'دولت خانہ' میں نہیں لائے جا سکتے تھے ۔ اسی طرح منصب داروں کے سپاھی بھی بادشاہ کے ملاحظے کے لیے جھروکے کے میدان ھی سے گزرتے تھے ۔

عالمگیر نے ۱۰۷۹ھ میں اس رسم کو قطعاً بند کر دیا۔ اس رسم کو اکبر، جہانگیر اور شاہجہان نے اس باقاعدگی کے ساتھ جاری رکھا کہ سوائے چند ایک خاص مواقع کے کوئی ناغہ نہیں آنے دیا۔

(اکبرنامہ ، آئین اکبری ، منتخب التواریخ ، تزک جہانگیری ، بادشاہ نامہ ، ایمپائر آف دی گریٹ مغل از ڈیلائٹ بحوالہ 'دولت مغلیہ کی ہیئت مرکزی' از ابن حسن اردو ترجمہ از عبد الغنی نیازی صفحہ ۹۵—۹۸ ' ۱۲۲- 'اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر' صفحہ ۱۱۸- 'ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے' از سید صباح الدین عبدالرحمان' مطبوعہ اعظم گڑھ صفحہ ۱۴)

۶ - اسد (برج صفحہ ۱۵۴ سطر ۱) -

شاہی محل میں بڑے بڑے برج شان و شکوہ کے لیے بنائے جاتے تھے۔ لال قلعہ کے جنوب و مشرق کے کونے میں ایک بہت بڑا برج تھا ، جو اسد برج کہلاتا تھا۔

(ہندوستان کے مسلمانوں حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے صفحہ ۱۳۸)

صحت نامۂ اغلاط

اگرچہ کتاب کے پروف پڑھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا گیا تھا پھر بھی چند اغلاط رہ گئی ہیں۔ قارئین سے التماس ہے کہ کتاب کا مطالعہ کرنے سے پہلے ان اغلاط کی تصحیح کر لیں۔

متن

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸	۲	۱۷۶	۱۱۷۶
۳۸	۱	معلم	معکم
۳۹	۸	بوب	محبوب
۵۳	آخری	الرحمة ،]	الرحمة کہ
۸۵	۱۹	بد این	بہ این
۸۶	۶	لوگ	لوگوں
۸۷	۱	کے	کی مانند
۸۷	۱۳	شہرت	شہرت حاصل
۸۹	۲۳	دنوں کے	دنوں بعد
۹۵	۲۱	میں	نہیں
۹۶	۱۶	کوے	کوفہ
۹۹	۱	برت	برات
۱۰۶	۸	کمرے	گھر
۱۰۶	۲۳	فرار	قرار
۱۰۶	۲۵	قرار	فرار
۱۱۱	۱۵	کہ آسانی	کہ یہ علم آسانی
۱۱۱	۱۸	سے	سے بھرا پڑا ہے
۱۱۲	۱۹	رہے، بھری پڑی ہیں	رہے۔
۱۱۳	۶	اس (علم)	اس
۱۱۷	۲۳	بلبن نے	بلبن
۱۱۹	۲۱	درانوں	دربانوں
۱۳۰	۱۲	ساتیوں	ساقیوں
۱۵۵	۴	برائیوں، بدکاریوں کا	حد برائیوں بدکاریوں کا
۱۶۶	۱۱	کھائیں	کھائی
۱۷۳	۱۶	قص	نقص
۱۷۵	۹	خدری	حذری
۱۸۱	۱۳	ور اسان	اور انسان
۱۸۸	۱۸	صبائے بو	صبا بوے
۱۹۹	۱۳	مکتوب ملا	مکتوب

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۰۴	۴	بہترین برگزیدہ	بہترین و برگزیدہ
۲۱۲	۷	اس کے	ان کے
۲۱۳	۲۷	قدمی	قدسی
۲۱۴	۸	ہے ، اور	ہے ،
۲۱۵	۲۷	برس بعد کا	برس کا
۲۲۲	۲۵	کا پاؤں	پاؤں
۲۳۰	۴	کسی قصبے	کسی بھی قصبے
۲۳۱	۱۲	اسے	اسے (دیوٹ ، دیا)
۲۳۲	آخری	ان	یہاں
۲۵۱	۱	ل ذا	لہٰذا
۲۵۳	آخری	شکاریوں و	شکاریوں ،
۲۵۴	آخری	سیکھے اسے ھ	سیکھے ۔ اسے ھر
۲۶۰	۷	دار	دلیر
۲۷۴	۱۱	بامرادی	نامرادی
۲۸۱	۸	پورا کر	پورا کرنے
۲۹۷	۲۴	بقیہ	موجودہ
۳۱۰	۲۱	دیگو	دیگر
۳۳۵	۱	ہے کم	ہے کہ کم
۳۴۱	۱۷	نہ اس	نہ تو اس
۳۴۷	۲۱	شہر	شہر تھا
۳۴۷	آخری	ہے	ہو
۳۵۱	۲۱	مینحیرے	منجیرے
۳۵۳	۳	ابھری	بھری
۳۵۳	۲۰	جھنڈور	جھنڈوں
۳۶۰	۱۹	مہارت و قدرت	مہارت ، قدرت
۳۶۳	۶	نہ ھوا	ھوا
۳۷۳	۸	منیر	میر
۳۷۴	۸	احدیوں	احدیوں>
۳۸۷	۹	است	است۱۸
۳۹۰	۱۷	پہلے	پہلے اسے
۳۹۶	۵	اول	ازل
۳۹۶	۵	گاہ	گاہ۱۵
۳۹۷	۵	کنگرا از خارا	کنگر از خارہ
۳۹۷	۱۵	ایک	ایک ہی
۴۰۶	۱۵	میں	میر

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۱۲	۲	بجز	بخر
۳۱۳	۱۲	تھے	تھے۔ وہ ہمیشہ اس کی مدح و ستایش کرتے
۳۱۶	آخری	حسیی	حسینی
۳۳۰	آخری	آخر	جب
۳۳۱	۱	سننے کے سبب	سنے تو
۳۳۲	۱۵	ہے۔	ہے،
۳۳۳	۲۲	گرد	گردد
۳۳۶	۱۰	شکر سے ہم رنگ	شکر رنگ
۳۳۹	۲۱	اول اول	اولِ اول
۳۴۳	۱	پھوھڑن	پھوھڑپن
۳۴۵	۱۳	رشتے	فرشتے
۳۵۰	۱۹	جو کہ	جو
۳۶۰	۱۱	ایک	انھوں نے ایک
۳۶۰	۱۸	کرتی	کرتی تھی
۳۶۱	۲۳	سیدھا ہونا	سیدھاپن
۳۷۲	۱۷	دشنوں	دشمنوں
۳۷۳	۸	نیے	نئے
۳۸۲	۱۸	نیچا	نیچہ
۳۹۳	۱۲	صحبتہ	صحبہ
۳۹۷	۵	دیکھے	دیکھے[۱] ہیں
۵۰۲	۲۷	علیہ	۴
۵۰۹	۲	اڑنے	اُڑے رہنے
۵۳۶	۵	نرائن	نارائن
۵۴۰	۱۸	ہدوں	مجتہدوں
۵۵۳	۲۵	ہیں۔"	ہیں
۵۵۶	۵	فغمے	نغمے
۵۵۸	۶	بھڑائچ	بھڑائچ ۱۱
۵۵۸	۷	نظر	نذر
۵۵۸	۱۳	مسعود	مسعود ۱۲
۵۷۹	۱	اس کے	اپنے
۵۹۵	۱۰	سفلوں	عقلوں
۵۹۶	۲۵	نالف	مخالف
۶۰۶	۱۹	حشوزاید	حشو و زاید

(تعلیقات و حواشی)

صفحه	سطر	غلط	صحیح
۲۸	۱۶	دث	محدث
۳۲	۱۳	نہاونه	نہاوند
۳۴	۱۸	نزه	منزه
۴۸	۲	ماجد	عبدالماجد
۶۰	۱	عام	علم
۶۰	۲۰	قلم	قلم هی
۶۵	۴	سارج	سراج
۶۹	۵	لا	لاتبطولوا
۶۹	۵	الازی	الاذی
۸۷	۱۹	کا	کاف
۸۸	۳	ان	ان چند
۹۴	۲۲ ، ۲۳	پانچویں ''بود فیضی ملحدے'' کے صرف ۲۹۴	×
۹۷	۲۴	جیلا	جیلانی
۹۷	۲۷	پانچ سو	پانصدی
۱۰۰	۱۷	اتبالیقی	اتالیقی
۱۰۱	۳	دلراب	داراب
۱۰۲	۱۳	۱۱۱۰	۱۰۱۰
۱۰۳	۲۳	حساب	حساب اور
۱۰۴	۸	نیز نجات	نیرنجات
۱۱۰	آخری	آتا ہے ،	آتا ہے ۔ اگرچه وه بے حد شرمنده هوتا ہے ،
۱۳۱	۱۱	الایه	الٰهه
۱۳۵	۱	پیدا	پیدا هوا
۱۷۸	۵	یه	خانخانان
۱۹۰	۲	دیبالور	دیپالپور
۱۹۹	۱۰	سپنشت	شُوسِنشُتَ
۲۰۱	۱	حنیفه	خلیفه

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۳	۲۱	بود	بود).
۲۳۰	۲۰	برهالی	برهانی -
۲۳۵	۱۵	کہ یہاں	کہ
۲۳۵	۱۷	کی کی	کی
۲۳۷	۱۱	اصفهن	اصفهان
۲۶۷	۱۹	بدیع	بدایع
۲۸۹	۹	سعادت به	سعادت
۳۰۳	۱	کو	×
۳۰۳	۳	۱۰۳۳ھ	(۱۰۳۳ھ)
۳۲۱	۱۵	فرزندز	فرزند
۳۳۷	۱	۱۰۸۰	۱۰۸۴
۳۳۷	۶	وغیرهم	×
۳۳۹	۱۴	دکا	دکانیں
۳۵۲	۲	هی	هی میں
۳۶۹	۲۰	لی	پہلی
۳۸۰	۱۶	لبالب	لباب
۳۸۹	۲۵	دوں	دنوں
۴۲۸	۲۰	ف‌رد	فرد
۴۲۸	۲۱	دستظ	دستخط
۴۵۱	۲	معنوں	معنوں میں
۴۶۰	۷	رکار	سرکار
۴۶۹	۴	جہاقدار	جہاندار
۵۰۱	۱	کے	کے انہیں
۵۰۳	۱۶	بحال تعلقات	تعلقات بحال
۵۱۳	۵	کا تبادلہ	تبادلہ
۵۱۳	۱۵	جاری کی	جاری کیا
۵۱۴	۱۹	۱۸۶۱ء	۱۸۶۱ء میں